معارف القرآن
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
مفتی اعظم پاکستان
مکتبہ معارف القرآن
(Quranic Studies Publishers)

جلد

۶

مریم، طٰہٰ، انبیاء، حج، مؤمنون، نور، فرقان، شعراء، نمل، قصص، عنکبوت، روم

پارہ ۱۶، رکوع ۴ تا پارہ ۲۱، رکوع ۹

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

مہر صاحب مجاز رجسٹریشن نمبر ۲

باہتمام : محمد مشتاق غنی
طبع جدید : ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ - اپریل ۲۰۰۸ء
مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی
ناشر : اِدارۃ المعارف کراچی ۱۴
فون : 5049733 - 5032020
ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

✿ اِدارۃ المعارف کراچی ۱۴
فون: 5049733 - 5032020

✿ مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
فون: 5031565 - 5031566

فہرست مضامین معارف القرآن جلد ششم

سُورۂ فرقان پ۱۹

سورۃ الشعراء پ ۱۹

سورۂ نمل پ۱۹

تمّت

سورۂ مریم

سُوْرَۃُ مَرْیَمَ

سُوْرَۃُ مَرْیَمَ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ ثَمَانٌ وَّتِسْعُوْنَ اٰیَۃً وَّسِتُّ رُکُوْعَاتٍ

سورۂ مریم مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں اٹھانوے آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

كٓهٰيٰعٓصٓ ۝١ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝٢ اِذْ نَادٰى

یہ مذکور ہے تیرے رب کی رحمت کا اپنے بندہ زکریا پر جب پکارا اس نے

رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝٣ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ

اپنے رب کو چھپی آواز سے بولا اے میرے رب بوڑھی ہوگئیں میری ہڈیاں اور شعلہ نکلا

الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝٤ وَاِنِّیْ

سر سے بڑھاپے کا اور تجھ سے مانگ کر اے رب میں کبھی محروم نہیں رہا اور میں

خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ

ڈرتا ہوں بھائی بندوں سے اپنے پیچھے اور عورت میری بانجھ ہے سو بخش تو

لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝٥ يَّرِثُنِیْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ

مجھ کو اپنے پاس سے ایک کام اٹھانے والا جو میری جگہ بیٹھے اور یعقوب کی اولاد کی،

وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝٦ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨاسْمُهٗ

اور کر اس کو اے رب من مانتا اے زکریا ہم تجھ کو خوشخبری سناتے ہیں ایک لڑکے کی جسکا نام ہے

يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝٧ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ

یحییٰ نہیں کیا ہم نے پہلے اس نام کا کوئی بولا اے رب کہاں سے ہوگا مجھ کو

لِیْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ

لڑکا اور میری عورت بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہوگیا یہاں تک کہ

عِتِيًّا ۞ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ

اکڑ گیا کہا یونہی ہوگا فرمادیا تیرے رب نے وہ مجھ پر آسان ہے اور تجھ کو پیدا کیا میں نے

مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ۞ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ

پہلے سے اور نہ تھا تو کوئی چیز بولا اے رب ٹھہرا دے میرے لئے کوئی نشانی فرمایا

اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۞ فَخَرَجَ عَلٰى

تیری نشانی یہ کہ بات نہ کرے تو لوگوں سے تین رات تک صحیح تندرست پھر نکلا اپنے لوگوں

قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۞

کے پاس حجرہ سے تو اشارہ سے کہا اُن کو کہ یاد کرو صبح اور شام

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۞ وَّ

اے یحییٰ اُٹھا لے کتاب زور سے اور دیا ہم نے اس کو حکم کرنا لڑکا پن میں اور

حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ۞ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ

شوق دیا اپنی طرف سے اور ستھرائی اور تھا پرہیزگار اور نیکی کرنے والا اپنے ماں باپ سے اور

يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۞ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ

نہ تھا زبردست خود سر اور سلام ہے اُس پر جس دن پیدا ہوا اور جس دن مرے

وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۞ع

اور جس دن اُٹھ کھڑا ہو زندہ ہوکر

ع ۱۵

خلاصۂ تفسیر

كٓهٰيٰعٓصٓ ۞ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ جو آئندہ قصہ آتا ہے) تذکرہ ہے آپ کے پروردگار کے مہربانی فرمانے کا اپنے (مقبول) بندہ (حضرت) زکریا (علیہ السلام کے حال) پر جبکہ اُنھوں نے اپنے پروردگار کو پوشیدہ طور پر پکارا (جسمیں یہ) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میری ہڈیاں (بوجہ پیری کے) کمزور ہوگئیں اور (میرے) سر میں بالوں کی سفیدی پھیل پڑی (یعنی تمام بال سفید ہوگئے اور اس حالت کا مقتضا یہ ہے کہ میں اس حالت میں اولاد کی درخواست نہ کروں مگر چونکہ آپ کی قدرت و رحمت بڑی کامل ہے) اور (میں اس قدرت و رحمت کے ظہور کا خوگر ہمیشہ رہا ہوں چنانچہ

اس کے قبل کبھی) آپ سے (کوئی چیز) مانگنے میں اے میرے رب ناکام نہیں رہا ہوں (کس بنا پر بعید سے بعید مقصود بھی طلب کرنا مضائقہ نہیں) اور (اس طلب کا مرجح یہ امر خاص ہوگیا ہے کہ) میں اپنے (مرنے کے) بعد (اپنے) رشتہ داروں (کی طرف) سے (یہ) اندیشہ رکھتا ہوں (کہ میری مرضی کے موافق شریعت اور دین کی خدمت نہ بجالاویں گے۔ یہ امر مرجح ہے طلبِ اولاد کے لئے جس میں خاص خاص اوصاف پائے جاویں جن کو توقع خدمتِ دین میں دخل ہو) اور (چونکہ میری پیرانہ سالی کے ساتھ) میری بیوی (بھی) بانجھ ہے (جس کے کبھی باوجود صحتِ مزاج کے اولاد ہی نہیں ہوئی اسلئے اسبابِ عادیہ اولاد ہونے کے بھی مفقود ہیں سو (اس صورت میں) آپ مجھ کو خاص اپنے پاس سے (یعنی بلا توسط اسبابِ عادیہ کے) ایک ایسا وارث (یعنی بیٹا) دیدیجئے کہ وہ (میرے علومِ خاصّہ میں) میرا وارث بنے اور (میرے جد) یعقوب (علیہ السلام) کے خاندان (کے علوم متوارثہ میں اُن) کا وارث بنے (یعنی علومِ سابقہ ولاحقہ اُس کو حاصل ہوں) اور (بوجہ باعمل ہونے کے) اس کو اے میرے رب (اپنا) پسندیدہ (ومقبول) بنائیے (یعنی عالِم بھی ہو اور عامِل بھی ہو۔ حق تعالیٰ کا بواسطہ ملائکہ کے ارشاد ہوا کہ) اے زکریا ہم تم کو ایک فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں جسکا نام یحییٰ ہوگا کہ اسکے قبل (خاص اوصاف میں) ہم نے کسی کو اسکا ہم صفت نہ بنایا ہوگا (یعنی جس علم وعمل کی تم دُعا کرتے ہو وہ تو اس فرزند کو ضرور ہی عطا کریں گے اور مزید برآں کچھ اوصافِ خاصّہ بھی عنایت کئے جاویں گے مثلاً خشیتِ الٰہیہ سے خاص درجہ کی رقّتِ قلب وغیرہ۔ چونکہ اس اجابتِ دُعا میں کوئی خاص کیفیت حصولِ ولد کی بتلائی نہ گئی تھی اس لئے اس کے استفسار کیلئے) زکریا (علیہ السلام) نے عرض کیا کہ اے میرے رب میرے اولاد کس طرح پر ہوگی حالانکہ میری بی بی بانجھ ہے اور (ادھر) میں بڑھاپے کے انتہائی درجہ کو پہنچ چکا ہوں (پس معلوم نہیں کہ ہم جوان ہونگے یا مجھ کو دوسرا نکاح کرنا ہوگا یا بحالتِ موجودہ اولاد ہوگی) ارشاد ہوا کہ حالت (موجودہ) یوں ہی رہے گی (اور پھر اولاد ہوگی اے زکریا) تمہارے رب کا قول ہے کہ یہ (امر) مجھ کو آسان ہے اور (یہ کیا اس سے بڑا کام کرچکا ہوں مثلاً) میں نے تم کو (ہی) پیدا کیا ہے حالانکہ (پیدائش کے قبل) تم کچھ بھی نہ تھے (اسی طرح خود اسبابِ عادیہ بھی کوئی چیز نہ تھے جب معدوم کو موجود کرنا آسان ہے تو ایک موجود سے دوسرا موجود کردینا کیا مشکل ہے یہ سب ارشاد تقویت رجا کے لئے تھا نہ کہ دفع شبہ کے لئے، کیونکہ زکریا علیہ السلام کو کوئی شبہ نہ تھا جب) زکریا (علیہ السلام کو قوی اُمید ہوگئی تو اُنھوں) نے عرض کیا کہ اے میرے رب (وعدہ پر تو اطمینان ہوگیا اب اس وعدہ کے قریب وقوع یعنی حمل کی بھی) کوئی علامت میرے لئے مقرر فرمادیجئے (تاکہ زیادہ شکر کروں اور خود وقوع تو محسوساتِ ظاہرہ ہی میں سے ہے) ارشاد ہوا کہ تمھاری (وہ) علامت یہ ہے کہ تم تین رات (اور تین دن تک) آدمیوں سے بات (چیت) نہ کرسکو گے حالانکہ تندرست ہوگے (کوئی بیماری وغیرہ

نہ ہوگی اور اسی وجہ سے ذکر اللہ کے ساتھ تکلم پر قدرت رہے گی چنانچہ باذن اللہ تعالیٰ زکریا علیہ السلام کی بیوی حاملہ ہوئیں اور حسب اخبار الٰہی زکریا علیہ السلام کی زبان بستہ ہوگئی) پس حجرے میں سے اپنی قوم کے پاس برآمد ہوئے اور اُن کو اشارہ سے فرمایا (کیونکہ زبان سے تو بول نہ سکتے تھے) کہ تم لوگ صبح اور شام خدا کی پاکی بیان کیا کرو۔ (یہ تسبیح اور امر بالتسبیح یا تو حسب معمول تھا ہمیشہ تذکیراً زبان سے کہتے تھے آج اشارہ سے کہا یا اس نعمت جدیدہ کے شکر میں خود بھی تسبیح کی کثرت فرمائی اور اوروں کو بھی اسی طور پر امر فرمایا غرض پھر یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور سن شعور کو پہنچے تو اُن کو حکم ہوا کہ) اے یحییٰ کتاب کو (یعنی توریت کو کہ اسوقت وہی کتاب شریعت تھی اور انجیل کا نزول بعد میں ہوا) مضبوط ہو کر لو (یعنی خاص کوشش کے ساتھ عمل کرو) اور ہم نے ان کو (ان کے) لڑکپن ہی میں (دین کی) سمجھ اور خاص اپنے پاس سے رقت قلب (کی صفت) اور پاکیزگی (اخلاق کی) عطا فرمائی تھی (حکم میں علم کی طرف اور حنان اور زکوٰۃ میں اخلاق کی طرف اشارہ ہوگیا) اور (آگے اعمال ظاہرہ کیطرف اشارہ فرمایا کہ) وہ بڑے پرہیزگار اور اپنے والدین کے خدمت گزار تھے (اسمیں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی طرف اشارہ ہوگیا) اور وہ (خلق کے ساتھ) سرکشی کرنیوالے (یا حق تعالیٰ کی) نافرمانی کرنے والے نہ تھے اور (عنداللہ ایسے وجیہ اور مکرم تھے کہ اُنکے حق میں منجانب اللہ یہ ارشاد ہوتا ہے کہ) ان کو (اللہ تعالیٰ کا) سلام پہنچے جس دن کہ وہ پیدا ہوئے اور جس دن کہ وہ انتقال کریں گے اور جس دن (قیامت میں) زندہ ہو کر اُٹھائے جاویں گے۔

معارف و مسائل

سورۂ کہف کے بعد سورۂ مریم شاید اس مناسبت سے رکھی گئی کہ جیسے سورۂ کہف بہت سے واقعات عجیبہ پر مشتمل تھی اسی طرح سورۂ مریم بھی ایسے واقعات غریبہ پر مشتمل ہے (روح المعانی)

کٓھٰیٰعٓصٓ حروف مقطعہ اور متشابہات میں سے ہے جسکا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے بندوں کے لئے اسکی تفتیش بھی اچھی نہیں۔ نِدَاۤءً خَفِيًّا، اس سے معلوم ہوا کہ دُعار کا آہستہ اور خفیہ کرنا افضل ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ خیر الذکر الخفی وخیر الرزق ما یکفی، یعنی بہترین ذکر خفی (آہستہ) ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو کافی ہوجائے (ضرورت سے نہ گھٹے نہ بڑھے) (قرطبی)

اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا، کمزوری ہڈیوں کی ذکر فرمائی کیونکہ ہی عمود بدن ہیں، جب ہڈی ہی کمزور ہوجائے تو سارے بدن کی کمزوری ہے۔ اشتعال کے لفظی معنی بھڑک اٹھنے کے ہیں اس جگہ بالوں کی سفیدی کو آگ کی روشنی سے تشبیہ دیکر اسکا پورے سر پر پھیل جانا مقصود ہے۔

دُعا میں اپنی حاجتمندی کا اظہار مستحب ہے اس جگہ دُعار سے پہلے حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے

ضعف و کمزوری کا ذکر کیا، اس کی ایک وجہ تو وہ ہے جس کی طرف خلاصہ تفسیر میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ان حالات کا مقتضا یہ تھا کہ اولاد کی خواہش نہ کروں۔ ایک دوسری وجہ امام قرطبی نے تفسیر میں یہ بھی بیان فرمائی کہ دُعا مانگنے کے وقت اپنے ضعف و بد حالی اور حاجتمندی کا ذکر کرنا قبولیتِ دُعاء کے لئے اقرب ہے اسی لئے علماء نے فرمایا کہ انسان کو چاہیئے کہ دُعار کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اپنی حاجتمندی کا ذکر کرے۔

مَوَالِیَ، مولیٰ کی جمع ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے اُن میں سے ایک معنی چچا زاد بھائی اور اپنے عصبات کے بھی آتے ہیں اس جگہ وہی مُراد ہے۔

انبیاء کے مال میں وراثت نہیں چلتی یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ، باتفاق جمہور علماء اس جگہ وراثت سے وراثتِ مالی مراد نہیں، کیونکہ اوّل تو حضرت زکریا کے پاس کوئی بڑی دولت ہونا ثابت نہیں جس کی فکر ہو کہ اسکا وارث کون ہوگا اور ایک پیغمبر کی شان سے بھی ایسی فکر کرنا بعید ہے اس کے علاوہ صحیح حدیث جس پر صحابہ کرام کا اجماع ثابت ہے اُس میں ہے

ان العلماء ورثة الانبياء وان الانبياء لم يورثوا دينارا ولا درهما انما ورثوا العلم فمن اخذه اخذ بحظ وافر رواه احمد وابوداؤد وابن ماجه والترمذی	بیشک علماء وارث ہیں انبیاء کے کیونکہ انبیاء علیہم السلام دینار و درہم کی وراثت نہیں چھوڑتے بلکہ اُن کی وراثت علم ہوتا ہے جس نے علم حاصل کرلیا اُس نے بڑی دولت حاصل کرلی۔

یہ حدیث کتبِ شیعہ کافی، کلینی وغیرہ میں بھی موجود ہے، اور صحیح بخاری میں حضرت صدیقہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا نورث وما ترکنا صدقة	ہم انبیاء کی مالی وراثت کسی کو نہیں ملتی ہم جو مال چھوڑیں وہ سب صدقہ ہے۔

اور خود اس آیت میں یَرِثُنِیْ کے بعد وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ کا اضافہ اسکی دلیل ہے کہ وراثت مالی مُراد نہیں کیونکہ جس لڑکے کی پیدائش کی دُعا کی جارہی ہے اسکا آلِ یعقوب کے لئے مالی وارث بننا بظاہر حال ممکن نہیں۔ کیونکہ آلِ یعقوب کے وارث اُن کے عصبات قریبہ ہونگے اور وہ وہی مَوَالِیَ ہیں جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا وہ بلا شبہ قرابت و عصوبت میں حضرت یحییٰ علیہ السلام سے اقرب ہیں اقرب کے ہوتے ہوئے عصبہ بعید کو وراثت دینا اُصولِ وراثت کے خلاف ہے۔

روح المعانی میں کتبِ شیعہ سے یہ بھی نقل کیا ہے:

روی الکلینی فی الکافی عن ابی البختری عن ابی عبداللہ قال ان سلیمان ورث داؤد وان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم ورث سلیمان	سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سلیمان علیہ السلام کے وارث ہوئے۔

یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی مالی وراثت ملنے کا کوئی احتمال و امکان ہی نہیں، مراد اس سے علوم نبوت کی وراثت ہے اس سے معلوم ہوا کہ وَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ میں بھی وراثت مالی مراد نہیں۔ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا، لفظ سَمِیٌّ کے معنے ہمنام کے بھی آتے ہیں، اور مثل و مشابہ کے بھی، اس جگہ اگر پہلے معنے مراد لئے جاویں تو مطلب واضح ہے کہ ان سے پہلے یَحْیٰی نام کسی شخص کا نہیں ہوا تھا۔ یہ نام کی یکتائی اور امتیاز بھی بعض خاص صفات میں اُنکی یکتائی کیطرف مشیر تھی اسلئے اس کو ان کی صفتِ خاص میں ذکر کیا گیا، اور اگر دوسرے معنے مراد لئے جاویں تو مطلب یہ ہوگا کہ بعض خاص صفات اور حالات اُن کے ایسے ہیں جو پچھلے انبیاء میں کسی میں نہ تھے اُن صفاتِ خاصہ میں وہ بے مثل تھے۔ مثلاً اُن کا حَصُوْر ہونا وغیرہ اسلئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یحییٰ علیہ السلام پچھلے سارے انبیاء سے مطلقاً افضل ہوں کیونکہ اُن میں حضرت خلیل اللہ اور حضرت کلیم اللہ کا ان سے افضل ہونا مسلم و معروف ہے۔ (مظہری)

عِتِيًّا، عتو سے مشتق ہے جس کے اصلی معنے تأثر قبول نہ کرنا ہے مراد اس سے ہڈیوں کا خشک ہو جانا ہے۔ سَوِيًّا، کے معنے تندرست کے ہیں یہ لفظ اس لئے بڑھایا گیا کہ زکریا علیہ السلام پر آں حالت طاری ہونا کہ کسی انسان سے بات نہ کر سکیں کسی بیماری کی وجہ سے نہیں تھا اور اسی وجہ سے ذکر اللہ اور عبادت میں اُنکی زبان ان تینوں دنوں میں برابر کھلی ہوئی تھی بلکہ یہ حالت بطور معجزہ اور علامتِ حمل کے اُن پر طاری کی گئی تھی۔ حَنَانًا، اس لفظ کے لغوی معنے رقتِ قلب اور رحمت و شفقت کے ہیں جو حضرت یحییٰ علیہ السلام کو امتیازی طور پر دی گئی تھی۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا

اور مذکور کر کتاب میں مریم کا جب جُدا ہوئی اپنے لوگوں سے ایک شرقی مکان

شَرْقِيًّا ﴿١٦﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا ۚ فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا

میں پھر پکڑ لیا اُن سے ورے ایک پردہ پھر بھیجا ہم نے اسکے پاس

رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾ قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ

اپنا فرشتہ پھر بن کر آیا اُس کے آگے آدمی پورا بولی مجھ کو رحمٰن کی

بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ

پناہ تجھ سے اگر ہے تو ڈر رکھنے والا بولا میں تو بھیجا ہوا ہوں تیرے

رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتْ أَنّٰى يَكُونُ لِي

رب کا کہ دے جاؤں تجھ کو ایک لڑکا ستھرا بولی کہاں سے ہوگا میرے

غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ۝۲۰ قَالَ كَذٰلِكِ
لڑکا اور چھوا نہیں مجھ کو آدمی نے اور میں بدکار کبھی نہیں تھی بولا یونہی ہے

قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً
فرمادیا تیرے رب نے وہ مجھ پر آسان ہے اور اس کو ہم کیا چاہتے ہیں لوگوں کے لئے نشانی اور مہربانی اپنی

مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝۲۱
طرف سے، اور ہے یہ کام مقرر ہو چکا

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کتاب (یعنی قرآن کے اس خاص حصہ یعنی سورت) میں حضرت مریم (علیہا السلام) کا قصہ بھی ذکر کیجئے (کہ وہ زکریا علیہ السلام کے قصۂ مذکورہ سے خاص مناسبت رکھتا ہے اور وہ اسوقت واقع ہوا) جب کہ وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ (ہوکر) ایک ایسے مکان میں جو مشرق کی جانب میں تھا (غسل کے لئے) گئیں پھر ان (گھر والے) لوگوں کے سامنے سے انھوں نے (درمیان میں) پردہ ڈال لیا (تاکہ اس کی آڑ میں غسل کر سکیں) پس (اس حالت میں) ہم نے اپنے فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) کو بھیجا اور وہ (فرشتہ) اُن کے سامنے (ہاتھ پاؤں اور صورت و شکل میں) ایک پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا (چونکہ حضرت مریم نے اُس کو انسان سمجھا اسلئے گھبرا کر) کہنے لگیں کہ میں تجھ سے اپنے خدا کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو (کچھ) خدا ترس ہے (تو یہاں سے ہٹ جاوے گا) فرشتہ نے کہا کہ (میں بشر نہیں کہ تم مجھ سے ڈرتی ہو بلکہ) میں تو تمہارے رب کا بھیجا ہوا (فرشتہ) ہوں (اس) لئے آیا ہوں) تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں (یعنی تمہارے منھ میں یا گریبان میں دَم کر دوں جس کے اثر سے باذن اللہ حمل رہ جاوے اور لڑکا پیدا ہو) وہ (تعجب سے) کہنے لگیں (نہ کہ انکار سے) کہ میرے لڑکا کس طرح ہو جاویگا حالانکہ (اس کی شرائط عادیہ میں سے مرد کے ساتھ مقاربت ہے اور وہ بالکل مفقود ہے کیونکہ) مجھ کو کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا (یعنی نہ تو نکاح ہوا) اور نہ میں بدکار ہوں، فرشتہ نے کہا کہ (بس بغیر کسی بشر کے چھونے کے) یوں ہی (لڑکا) ہو جاوے گا (اور میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ) تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ بات (کہ بغیر اسباب عادیہ کے بچہ پیدا کر دوں) مجھ کو آسان ہے اور (یہ بھی فرمایا ہے کہ ہم بغیر اسباب عادیہ کے) اس خاص طور پر اس لئے پیدا کریں گے تاکہ ہم اُس فرزند کو لوگوں کے لئے ایک نشانی (قدرت کی) بنادیں اور (نیز اُسکے ذریعہ لوگوں کو ہدایت پانے کے لئے) اس کو باعث رحمت بنادیں اور یہ (بے باپ کے اس بچہ کا پیدا ہونا) ایک طے شدہ بات ہے (جو ضرور ہو کر رہے گی)۔

معارف و مسائل

اِنْتَبَذَتْ، نبذ سے مشتق ہے جس کے اصلی معنے دُور ڈالنے اور پھینکنے کے ہیں۔ انتباذ کے معنی مجمع سے ہٹ کر دُور چلے جانے کے ہوئے۔ مَكَانًا شَرْقِيًّا یعنی گھر کے اندر مشرقی جانب کے کسی گوشہ میں چلی گئیں۔ اُن کا گوشہ میں جانا کس غرض کے لئے تھا اسمیں احتمالات اور اقوال مختلف ہیں بعض نے کہا کہ غسل کرنے کے لئے اُس گوشہ میں گئی تھیں۔ بعض نے کہا کہ حسبِ عادت عبادتِ الٰہی میں مشغول ہونے کے لئے محراب کی مشرقی جانب کے کسی گوشہ کو اختیار کیا تھا۔ قرطبی نے اسی دوسرے احتمال کو حسن قرار دیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ نصارٰی نے جو جانب مشرق کو اپنا قبلہ بنایا اور اس جانب کی تعظیم کرتے ہیں اُس کی وجہ یہی ہے۔

فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا، روح سے مُراد جمہور کے نزدیک حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ اور بعض نے کہا کہ خود حضرت عیسٰی علیہ السلام مُراد ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن کے بطن سے پیدا ہونے والے بشر کی شبیہ اُن کے سامنے کردی۔ مگر پہلا قول راجح ہے بعد کے کلمات سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا، فرشتہ کو اُس کی اپنی اصلی صورت و ہیئت میں دیکھنا انسان کے لئے آسان نہیں، اُس کی ہیبت غالب آجاتی ہے جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو غارِ حرا میں اور بعد میں پیش آیا۔ اس مصلحت سے جبرئیل امین حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے بشکلِ انسانی ظاہر ہوئے۔ جب حضرت مریم نے ایک انسان کو اپنے قریب دیکھا جو پردہ کے اندر آگیا تو خطرہ ہوا کہ اس کا ارادہ بُرا معلوم ہوتا ہے اس لئے فرمایا:

إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ، (میں اللہ رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں تجھ سے) بعض روایات میں ہے کہ جبرئیل امین نے یہ کلمہ سُنا تو اللہ کے نام کی تعظیم کے لئے کچھ پیچھے ہٹ گئے۔

إِن كُنتَ تَقِيًّا، یہ کلمہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی ظالم سے مجبور ہو کر فریاد کرے کہ اگر تو مؤمن ہے تو مجھ پر ظلم نہ کر۔ تیرا ایمان اس ظلم سے روکنے کے لئے کافی ہونا چاہئیے۔ مطلب یہ ہوا کہ تمہارے لئے مناسب ہے کہ اللہ سے ڈرو، غلط اقدام سے بچو۔ خلاصہ یہ ہے کہ إِن كُنتَ تَقِيًّا، استعاذہ کی شرط نہیں بلکہ استعاذہ کے مؤثر ہونے کی شرط برائے ترغیب ہے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ کلمہ بطور مبالغہ کے لایا گیا ہے کہ اگر تم متقی بھی ہو تب بھی میں تم سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اور اسکے خلاف ہو تو معاملہ ظاہر ہے۔ (مظہری)

لِأَهَبَ لَكِ، اس میں عطاء فرزند کو جبرئیل علیہ السلام نے اپنی طرف اس لئے منسوب کیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے بھیجا تھا کہ اُن کے گریبان میں پھونک ماردیں۔ یہ پھونک عطاءِ فرزند کا ذریعہ بن جائے گی، اگرچہ یہ عطاء دراصل فعلِ الٰہی ہے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ

پھر پیٹ میں لیا اس کو پھر یکسو ہوئی اسکو لیکر ایک بعید مکان میں، پھر لے آیا اسکو درد زہ

اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ

ایک کھجور کی جڑ میں بولی کسی طرح میں مر چکتی اس سے پہلے اور ہو جاتی

نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ

بھولی بسری پس آواز دی اسکو اسکے نیچے سے کہ غمگین مت ہو کر دیا تیرے

رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ

رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ اور ہلا اپنی طرف کھجور کی جڑ

تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ

اُس سے گریں گی تجھ پر پکی کھجوریں اب کھا اور پی اور آنکھ ٹھنڈی رکھ

فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ

پھر اگر تو دیکھے کوئی آدمی تو کہیو میں نے مانا ہے رحمٰن کا

صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾

روزہ سو بات نہ کروں گی آج کسی آدمی سے

خلاصۂ تفسیر

پھر (اس گفتگو کے بعد جبرئیل علیہ السلام نے اُن کے گریبان میں پھونک مار دی جس سے) اُن کے پیٹ میں لڑکا رہ گیا، پھر (جب اپنے وقت پر حضرت مریم کو بچہ کی پیدائش کے آثار محسوس ہوئے تو) اس حمل کو لئے ہوئے (اپنے گھر سے) کسی دُور جگہ (جنگل پہاڑ میں) الگ چلی گئیں پھر (جب درد شروع ہوا تو) درد زہ کی وجہ سے کھجور کے درخت کی طرف آئیں (کہ اس کے سہارے بیٹھیں اُٹھیں، اب حالت یہ تھی کہ نہ کوئی انیس نہ جلیس، درد سے بے چین، ایسے وقت جو سامان راحت و ضرورت کا ہونا چاہئیے وہ ندارد، ادھر بچہ ہونے پر بدنامی کا خیال، آخر گھبرا کر کہنے لگیں کاش میں اس (حالت) سے پہلے مرگئی ہوتی اور ایسی نیست و نابود ہو جاتی کہ کسی کو یاد بھی نہ رہتی، پس (اسی وقت خدا تعالیٰ کے حکم سے حضرت) جبرئیل (علیہ السلام پہنچے اور اُن کے احترام کی وجہ سے سامنے نہیں گئے بلکہ جس مقام پر حضرت مریم تھیں اس سے اسفل مقام میں آڑ میں آئے اور

اُنھوں) نے اُن کے (اس) پائیں (مکان) سے ان کو پکارا۔ (جس کو حضرت مریم نے پہچانا کہ یہ اُسی فرشتہ کی آواز ہے جو اوّل ظاہر ہوا تھا) کہ تم (بے سروسامانی سے یا خوفِ بدنامی سے) مغموم مت ہو (کیونکہ بے سروسامانی کا تو یہ انتظام ہوا ہے کہ) تمہارے رب نے تمہارے پائیں (مکان) میں ایک نہر پیدا کر دی ہے (جس کے دیکھنے سے اور پانی پینے سے فرحت طبعی ہو ونیز حسبِ روایت رُوح انکو اس وقت پیاس بھی لگی تھی اور حسب مسئلہ طبیہ گرم چیزوں کا استعمال قبلِ وضع یا بعد وضع مسہلِ ولادت و دافعِ فضلات و مقوی طبیعت بھی ہے اور پانی میں اگر سخونت (گرمی) بھی ہو جیسا بعض چشموں میں مشاہد ہے تو اور زیادہ مزاج کے موافق ہوگا، ونیز کھجور کثیر الغذا مولّدِ خون، مسمّن و مقوی گردہ کمر و مفاصل ہونے کی وجہ سے زچہ کے لئے سب غذاؤں اور دواؤں سے بہتر ہے اور حرارت کی وجہ سے جو اُس کی مضرت کا احتمال ہے سو اوّل تو رطب میں حرارت کم ہے، دوسرے پانی سے اسکی اصلاح ہو سکتی ہے تیسرے مضرت کا ظہور جب ہوتا ہے کہ عضو میں ضعف ہو ورنہ کوئی چیز بھی کچھ نہ کچھ مضرت سے خالی نہیں ہوتی ونیز خرق عادت (کرامت) کا ظہور اللہ کے نزدیک مقبولیت کی علامت ہونے کی وجہ سے موجب مسرتِ روحانی بھی ہے) اور اس کھجور کے تنہ کو (پکڑ کر) اپنی طرف ہلاؤ اس سے تم پر تر و تازہ کھجوریں جھڑیں گی (کہ اس سے پھل کے کھانے میں لذتِ جسمانی اور بطور خرق عادت کے پھل کے آنے میں لذتِ روحانی مجتمع ہے) پھر (اس پھل کو) کھاؤ اور (وہ پانی) پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو (یعنی بچّہ کے دیکھنے سے اور کھانے پینے سے اور علامت قبول عند اللہ ہونے سے خوش رہو) پھر (جب بدنامی کے احتمال کا موقع آوے یعنی کوئی آدمی اس قصہ پر مطلع ہو تو اسکا یہ انتظام ہوا ہے کہ) اگر تم آدمیوں میں سے کسی کو بھی (آتا اور اعتراض کرتا) دیکھو تو (تم کچھ مت بولنا بلکہ اشارہ سے اس سے) کہہ دینا کہ میں نے تو اللہ کے واسطے (ایسے) روزہ کی منت مان رکھی ہے (جس میں بولنے کی بندش ہے) سو (اسوجہ سے) میں آج (دن بھر) کسی آدمی سے نہیں بولوں گی (اور خدا کے ذکر اور دُعا میں مشغول ہونا اور بات ہے بس تم اتنا جواب دیکر بے فکر ہو جانا، اللہ تعالیٰ اس مولود مسعود کو خرقِ عادت کے طور پر بولتا کر دیگا جس سے ظہور اعجاز دلیل نزاہت و عصمت ہو جاویگی غرض ہر غم کا علاج ہو گیا۔)

معارف و مسائل

تمنائے موت کا حکم یہ تمنائے موت اگر غمِ دُنیا سے تھی تب تو غلبۂ حال کو اسکا عذر کہا جاویگا جس میں انسان من کل الوجوہ مکلف نہیں رہتا اور اگر غمِ دین سے تھا کہ لوگ بدنام کریں گے اور شاید مجھے اس پر صبر نہ ہو سکے تو بے صبری کی معصیت میں ابتلا ہوگا، موت سے اس معصیت کی حفاظت رہیگی تو ایسی تمنا ممنوع نہیں ہے اور اگر شبہ ہو کہ حضرت مریم کو جو کہا گیا کہ تم کہہ دینا

کہ میں نے نذر کی ہے سو انھوں نے نذر تو نہ کی تھی، جواب یہ ہے کہ اسی سے یہ حکم بھی مفہوم ہو گیا کہ تم نذر بھی کر لینا اور اس کو ظاہر کر دینا۔

سکوت کا روزہ شریعتِ اسلامیہ میں منسوخ ہو گیا قبل از اسلام یہ بھی عبادت میں داخل تھا کہ بولنے کا روزہ رکھے، صبح سے رات تک کسی سے کلام نہ کرے۔ اسلام نے اس کو منسوخ کر کے یہ لازم کر دیا کہ صرف بُرے کلام گالی گلوچ، جھوٹ، غیبت وغیرہ سے پرہیز کیا جائے۔ عام گفتگو ترک کرنا اسلام میں کوئی عبادت نہیں رہی اس لئے اس کی نذر ماننا بھی جائز نہیں۔ لما رواہ ابوداؤد مرفوعًا لا یتم بعد احتلام ولا صمات یوم الی اللیل وحسنہ السیوطی والعزیزی، یعنی بچہ بالغ ہونے کے بعد باپ کے مرنے سے یتیم نہیں کہلاتا، اس پر احکام یتیم کے جاری نہیں ہوتے اور صبح سے شام تک خاموش رہنا تو (اسلام میں) کوئی عبادت نہیں۔ اور دردِ زِہ میں پانی اور کھجور کا استعمال طبًا بھی مفید ہے اور اکل و شرب کا حکم بظاہر اباحت کے لئے معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

بغیر مرد کے تنہا عورت سے بچہ پیدا ہو جانا خلافِ عقل نہیں اور حمل و تولد بلا توسط مرد کے خارقِ عادت (معجزہ) ہے اور خوارق میں کتنا ہی استبعاد ہو مضائقہ نہیں بلکہ وصفِ اعجاز کا اور زیادہ ظہور ہے لیکن اس میں اس وجہ سے زیادہ استبعاد بھی نہیں کہ حسب تصریح کتبِ طب عورت کی منی میں قوتِ منعقدہ کے ساتھ قوتِ عاقدہ بھی ہے اس لئے مرض رَجا میں اعضاء کی کچھ نا تمام صورت بھی بن جاتی ہے کما صرح بہ فی القانون، پس اگر یہی قوتِ عاقدہ اور بڑھ جائے تو زیادہ مستبعد نہیں ہے۔ (بیان القرآن)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو کھجور کا درخت ہلانے کا حکم دیا، حالانکہ اُس کی قدرت میں یہ بھی تھا کہ بغیر اُن کے ہلانے کے خود ہی کھجوریں اُن کی گود میں گر جاتیں مگر حکمت یہ ہے کہ اس میں تحصیلِ رزق کے لئے کوشش کرنے کا سبق ملتا ہے اور یہ بھی بتلانا ہے کہ رزق کے حاصل کرنے میں کوشش اور محنت کرنا توکل کے خلاف نہیں۔ (رُوح المعانی)

سَرِیًّا، لفظ سری کے لغوی معنی چھوٹی نہر کے ہیں۔ اس موقع پر حق تعالیٰ نے ایک چھوٹی نہر اپنی قدرت سے بلا واسطہ جاری فرما دی یا جبرئیل کے ذریعہ چشمہ جاری کرا دیا، دونوں طرح کی روایتیں ہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ حضرت مریم کی تسلی کے اسباب ذکر کرنے کے وقت تو پہلے پانی کا ذکر فرمایا پھر کھانے کی چیز کھجور کا، اور جب استعمال کا ذکر آیا تو ترتیب بدل کر پہلے کھانے کا حکم فرمایا پھر پانی پینے کا۔ کُلِیْ وَاشْرَبِیْ، وجہ غالبًا یہ ہے کہ انسان کی فطری عادت ہے کہ پانی کا اہتمام کھانے سے پہلے کرتا ہے خصوصًا کوئی ایسی غذا جس کے بعد پیاس لگنا یقینی ہو اُسکے کھانے سے پہلے پانی مہیا کرتا ہے مگر استعمال کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے غذا کھاتا ہے پھر پانی پیتا ہے۔ (رُوح المعانی)

فَاَتَتۡ بِهٖ قَوۡمَهَا تَحۡمِلُهٗ ؕ قَالُوۡا يٰمَرۡيَمُ لَقَدۡ جِئۡتِ شَيۡـئًـا

پھر لائی اس کو اپنے لوگوں کے پاس گود میں وہ اُس کو کہنے لگے اے مریم تو نے کی یہ چیز طوفان

فَرِيًّا ﴿۲۷﴾ يٰۤاُخۡتَ هٰرُوۡنَ مَا كَانَ اَبُوۡكِ امۡرَاَ سَوۡءٍ وَّمَا كَانَتۡ

کی اے بہن ہارون کی نہ تھا تیرا باپ بُرا آدمی اور نہ تھی تیری

اُمُّكِ بَغِيًّا ۖۚ ﴿۲۸﴾ فَاَشَارَتۡ اِلَيۡهِ ؕ قَالُوۡا كَيۡفَ نُكَلِّمُ مَنۡ كَانَ

ماں بدکار پھر ہاتھ سے بتلایا اُس لڑکے کو بولے ہم کیونکر بات کریں اُس شخص سے

فِى الۡمَهۡدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ اِنِّىۡ عَبۡدُ اللّٰهِ ۛؕ اٰتٰٮنِىَ الۡكِتٰبَ وَ

کہ وہ ہے گود میں لڑکا وہ بولا میں بندہ ہوں اللہ کا مجھ کو اُس نے کتاب دی ہے اور

جَعَلَنِىۡ نَبِيًّا ۙ ﴿۳۰﴾ وَّجَعَلَنِىۡ مُبٰرَكًا اَيۡنَ مَا كُنۡتُ ۖ وَاَوۡصٰنِىۡ

مجھ کو اُس نے نبی کیا اور بنایا مجھ کو برکت والا جس جگہ میں ہوں اور تاکید کی مجھ کو

بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمۡتُ حَيًّا ۖ ﴿۳۱﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِىۡ وَلَمۡ

نماز کی اور زکوٰۃ کی جب تک میں رہوں زندہ اور سلوک کرنے والا اپنی ماں سے اور نہیں

يَجۡعَلۡنِىۡ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾ وَالسَّلٰمُ عَلَىَّ يَوۡمَ وُلِدْتُّ وَيَوۡمَ

بنایا مجھ کو زبردست بدبخت اور سلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن

اَمُوۡتُ وَيَوۡمَ اُبۡعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾

مروں اور جس دن اُٹھ کھڑا ہوں زندہ ہو کر

خلاصۂ تفسیر

(غرض مریم علیہا السلام کی اس کلام سے تسلی ہوئی اور عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوگئے) پھر وہ ان کو گود میں لئے ہوئے (وہاں سے بستی کو چلیں اور) اپنی قوم کے پاس لائیں، لوگوں نے (جو دیکھا کہ ان کی شادی تو ہوئی نہ تھی یہ بچہ کیسا، بدگمان ہو کر) کہا اے مریم! تم نے بڑے غضب کا کام کیا (یعنی نعوذ باللہ بدکاری کی، اور یوں تو بدکاری کوئی بھی کرے بُرا ہے لیکن تم سے ایسا فعل ہونا زیادہ غضب کی بات ہے کیونکہ) اے ہارون کی بہن! (تمہارے خاندان میں کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا چنانچہ) تمہارے باپ کوئی بُرے آدمی نہ تھے (کہ ان سے یہ اثر تم میں آیا ہو) اور نہ تمہاری ماں بدکار تھیں (کہ ان سے یہ اثر تم میں آیا ہو، پھر ہارون جو تمہارے رشتہ کے بھائی ہیں جن کا نام ان ہارون نبی کے نام پر رکھا

گیا ہے وہ کیسے کچھ نیک شخص ہیں، غرض جسکا خاندان کا خاندان پاک صاف ہو اُس سے یہ حرکت ہونا کتنا بڑا غضب ہے) پس مریم (علیہا السلام) نے (یہ ساری تقریر سُن کر کچھ جواب نہیں دیا بلکہ) بچہ کی طرف اشارہ کر دیا (کہ اس سے کہو جو کچھ کہنا ہو یہ جواب دیگا) وہ لوگ (سمجھے کہ یہ ہمارے ساتھ تمسخر کرتی ہیں) کہنے لگے کہ بھلا ہم ایسے شخص سے کیونکر باتیں کریں جو ابھی گود میں بچہ ہی ہے (کیونکہ بات اُس شخص سے کی جاتی ہے جو کہ وہ بھی بات چیت کرتا ہو، سو جب یہ بچہ ہے اور بات پر قادر نہیں، تو اس سے کیا بات کریں اتنے میں) وہ بچہ (خود ہی) بول اُٹھا کہ میں اللہ کا (خاص) بندہ ہوں (نہ تو اللہ ہوں جیسا کہ جہلار نصاریٰ سمجھیں گے اور نہ غیر مقبول ہوں جیسا یہود سمجھیں گے اور بندہ ہونے کے اور پھر خاص ہونے کے یہ آثار ہیں کہ) اُس نے مجھ کو کتاب (یعنی انجیل) دی (یعنی گو آئندہ دے گا مگر بوجہ یقینی ہونے کے ایسا ہی ہے جیسا کہ دیدی) اور اس نے مجھ کو نبی بنایا (یعنی بنا دے گا) اور مجھ کو برکت والا بنایا (یعنی مجھ سے خلق کو دین کا نفع پہنچے گا) میں جہاں کہیں بھی ہوں (گا مجھ سے برکت پہنچیگی وہ نفع تبلیغ دین ہے خواہ کوئی قبول کرے یا نہ کرے اُنھوں نے تو نفع پہنچا ہی دیا) اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا جبتک میں (دُنیا میں) زندہ رہوں (اور ظاہر ہے کہ آسمان پر جانے کے بعد مکلف نہیں رہے اور یہ دلیل ہے بندہ ہونے کی جیسا کہ اور دلائل ہیں خصوصیت کے) اور مجھ کو میری والدہ کا خدمتگذار بنایا (اور چونکہ بے باپ پیدا ہوئے ہیں اس لئے والدہ کی تخصیص کی گئی) اور اس نے مجھکو سرکش بدبخت نہیں بنایا (کہ ادائے حق خالق یا ادائے حق والدہ سے سرکشی کروں یا حقوق و اعمال کے ترک سے بدبختی خرید لوں) اور مجھ پر (اللہ کی جانب سے) سلام ہے جس روز میں پیدا ہوا اور جس روز مروں گا (کہ وہ زمانہ قرب قیامت کا بعد نزول من السمار کے ہوگا) اور جس روز میں (قیامت میں) زندہ کر کے اُٹھایا جاؤں گا (اور اللہ کا سلام دلیل ہے خاص بندہ ہونے کی)۔

معارف ومسائل

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ، ان الفاظ سے ظاہر یہی ہے کہ حضرت مریم کو جب غیبی بشارتوں کے ذریعہ اسکا اطمینان ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے بدنامی اور رُسوائی سے بچا دیں گے تو خود ہی اپنے نومولود بچے کو لیکر اپنے گھر واپس آگئیں۔ پھر یہ واپسی پیدائش کے کتنے دن بعد ہوئی۔ ابن عساکر کی روایت ابن عباسؓ سے یہ ہے کہ ولادت سے چالیس روز بعد جب نفاس سے فراغت و طہارت ہو چکی اُس وقت اپنے گھر والوں کے پاس آئیں (رُوح المعانی)

شَيْئًا فَرِيًّا، لفظ فری عربی زبان میں دراصل کاٹنے اور پھاڑنے کے معنی میں آتا ہے، جس کام یا جس چیز کے ظاہر ہونے میں غیر معمولی کاٹ چھانٹ ہو اُس کو فری کہتے ہیں۔ ابو حیان نے فرمایا کہ

ہر امرِ عظیم کو فری کہا جاتا ہے خواہ وہ اچھائی کے اعتبار سے عظیم ہو یا بُرائی کے اعتبار سے۔ اس جگہ بڑی بُرائی کے معنے میں استعمال ہوا ہے اور اس لفظ کا اکثر استعمال ایسی ہی چیز کے لئے معروف ہے جو اپنی شناعت اور بُرائی کے اعتبار سے غیر معمولی اور بڑی سمجھی جاتی ہو۔

يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ ، حضرت ہارون علیہ السلام جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی اور ساتھی تھے حضرت مریم کے زمانے سے سیکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے یہاں حضرت مریم کو ہارون کی بہن قرار دینا ظاہر ہے کہ اپنے اس ظاہری مفہوم کے اعتبار سے نہیں ہوسکتا اسی لئے جب حضرت مغیرہ بن شعبہ رضؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ نجران کے پاس بھیجا تو انھوں نے سوال کیا کہ تمہارے قرآن میں حضرت مریم کو اُخت ہارون کہا گیا ہے حالانکہ ہارون علیہ السلام اُن سے بہت قرنوں پہلے گزر چکے ہیں حضرت مغیرہ کو اس کا جواب معلوم نہ تھا جب واپس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسکا ذکر کیا آپ نے فرمایا کہ تم نے ان سے یہ کیوں نہ کہدیا کہ اہلِ ایمان کی عادت یہ ہے کہ تبرکاً انبیاء علیہم السلام کے نام پر اپنے نام رکھتے ہیں اور اُن کی طرف نسبت کیا کرتے ہیں (رواہ احمد و مسلم والترمذی والنسائی) اس حدیث کے مطلب میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت مریم کی نسبت حضرت ہارون کی طرف اس لئے کر دی گئی کہ وہ اُن کی نسل و اولاد میں سے ہیں اگرچہ زمانہ کتنا ہی بعید ہوگیا ہو جیسے عرب کی عادت ہے کہ قبیلہ تمیم کے آدمی کو اخا تمیم اور عرب کے آدمی کو اخا عرب بولتے ہیں۔ دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہاں ہارون سے مراد ہارون نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق مراد نہیں بلکہ حضرت مریم کے اپنے بھائی کا نام ہارون تھا جو تبرکاً حضرت ہارون نبی کے نام پر رکھا گیا تھا اس طرح مریم کو اُخت ہارون کہنا اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے درست ہوگیا۔

مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ ، ان الفاظِ قرآن سے اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص اولیاء اللہ اور صالحین کی اولاد میں ہو وہ اگر کوئی بُرا کام کرتا ہے تو وہ عام لوگوں کے گناہ سے زیادہ بڑا گناہ ہوتا ہے کیونکہ اس سے اُس کے بڑوں کی رُسوائی اور بدنامی ہوتی ہے اس لئے اولادِ صالحین کو اعمالِ صالحہ اور تقویٰ کی زیادہ فکر کرنا چاہیئے۔

اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ، ایک روایت میں ہے کہ جس وقت خاندان کے لوگوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو ملامت کرنا شروع کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام دودھ پی رہے تھے۔ جب انھوں نے ان لوگوں کی ملامت کو سُنا تو دودھ چھوڑ دیا اور اپنی بائیں کروٹ پر سہارا لیکر اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے یہ الفاظ فرمائے اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ یعنی میں اللہ کا بندہ ہوں، اس پہلے ہی لفظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا کہ اگرچہ میری پیدائش معجزانہ انداز سے ہوئی ہے مگر میں خدا نہیں خدا کا بندہ ہوں تاکہ لوگ میری پرستش میں مبتلا نہ ہوجائیں

اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا، ان الفاظ میں حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اپنی شیر خوارگی کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت اور کتاب ملنے کی خبر دی۔ حالانکہ کسی پیغمبر کو چالیس سال کی عمر سے پہلے نبوت و کتاب نہیں ملتی! اسلئے مفہوم اسکا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ طے فرما دیا ہے کہ مجھے اپنے وقت پر نبوت اور کتاب دیں گے اور یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے نبوت اُس وقت عطا کر دی گئی تھی جب کہ آدم علیہ السلام ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اُن کا خمیر ہی تیار ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب ظاہر ہے کہ اس کے سوا نہیں کہ عطاءِ نبوت کا وعدہ محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے قطعی اور یقینی تھا یہاں بھی اسی یقین کو عطاءِ نبوت کے لفظ ماضی سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ عطاءِ نبوت کا اظہار کرنے سے ان لوگوں کی بدگمانی رفع کر دی گئی کہ میری والدہ پر بدکاری کا الزام لگانا سراسر غلط ہے کیونکہ میرا نبی ہونا اور مجھے رسالت کا ملنا اسکی دلیل ہے کہ میری پیدائش میں کسی گناہ کا دخل نہیں ہو سکتا۔

اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ، کسی چیز کا حکم جب زیادہ تاکید کے ساتھ کیا جائے تو اسکو وصیت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اس جگہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی اسکا مفہوم یہی ہے کہ بڑی تاکید سے ان دونوں چیزوں کا مجھے حکم دیا۔

نماز اور زکوٰۃ، ایسی عبادتیں ہیں کہ آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی و رسول کی شریعت میں فرض رہی ہیں البتہ مختلف شریعتوں میں انکی تفصیلات اور جزئیات مختلف رہی ہیں۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی شریعت میں بھی نماز اور زکوٰۃ فرض تھے۔ رہا یہ معاملہ کہ عیسٰی علیہ السلام تو کبھی مالدار ہی نہیں ہوئے، نہ گھر بنایا نہ کچھ جمع کیا پھر زکوٰۃ کا اُن کو حکم دینا کس بناء پر ہے؟ تو اسکا مقصد واضح یہ ہے کہ انکی شریعت میں قانون یہ بنا دیا گیا تھا کہ جس شخص کے پاس مال ہو اُسپر زکوٰۃ فرض ہے عیسٰی علیہ السلام بھی اسکے مخاطب ہیں کہ جب کبھی مال بقدرِ نصاب جمع ہو جائے تو زکوٰۃ ادا کریں پھر اگر عمر بھر میں کبھی مال جمع ہی نہ ہو تو یہ اُس کے منافی نہیں۔ (روح)

مَا دُمْتُ حَیًّا، یعنی نماز اور زکوٰۃ کا حکم میرے لئے دائمی ہے جب تک زندہ ہوں ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد وہ حیات ہے جو اس عالمِ دُنیا میں زمین پر ہے کیونکہ یہ اعمال اسی زمین پر ہو سکتے ہیں اور یہیں سے متعلق ہیں آسمان پر اُٹھائے جانے کے بعد نزول کے زمانے تک رخصت کا زمانہ ہے۔

بَرًّا بِوَالِدَتِیْ، اس جگہ صرف والدہ کا ذکر کیا والدین کا نہیں۔ اسمیں اشارہ کر دیا کہ میرا وجود معجزانہ طور پر بغیر والد کے ہوا ہے اور بچپن کا یہ معجزانہ کلام اسکے لئے کافی شہادت اور دلیل ہے۔

ذٰلِكَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْهِ

یہ ہے عیسٰی مریم کا بیٹا سچی بات جس میں لوگ

يَمْتَرُوْنَ ۝ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ

جھگڑتے ہیں اللہ ایسا نہیں کہ رکھے اولاد وہ پاک ذات ہے

اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ وَاِنَّ اللّٰهَ

جب ٹھہرالیتا ہے کسی کام کا کرنا، سو یہی کہتا ہے اسکو کہ ہو وہ ہو جاتا ہے اور کہا بیشک

رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝

اللہ ہے رب میرا اور رب تمہارا، سو اسکی بندگی کرو، یہ ہے راہ سیدھی

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ

پھر جُدی جُدی راہ اختیار کی فرقوں نے ان میں سے سو خرابی ہے

كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ اَسْمِعْ بِهِمْ وَ

منکروں کو جس وقت دیکھیں گے ایک دن بڑا کیا خوب سنتے اور

اَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ

دیکھتے ہونگے جس دن آئیں گے ہمارے پاس، پر بے انصاف آج کے دن صریح بہک

مُّبِيْنٍ ۝ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ

رہے ہیں اور ڈرسنا دے ان کو اس پچھتاوے کے دن کا، جب فیصل ہوچکے گا کام

وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اِنَّا نَحْنُ

اور وہ بھول رہے ہیں اور وہ یقین نہیں لاتے ہم وارث ہوں گے

نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ۝

زمین کے اور جو کوئی ہے زمین پر اور وہ ہماری طرف پھر آئیں گے

وقف لازم

ع ۵

خلاصۂ تفسیر

یہ ہیں عیسیٰ بن مریم (جن کے اقوال واحوال مذکور ہوئے جس سے ان کا بندۂ مقبول ہونا معلوم ہوتا ہے نہ جیسے کہ عیسائیوں نے ان کو بندوں کی فہرست سے خارج کر کے خدا تک پہنچا دیا ہے اور نہ ویسے جیسا کہ یہودیوں نے ان کو مقبولیت سے خارج کر کے طرح طرح کی تہمتیں لگائی ہیں) میں (بالکل) سچی بات کہہ رہا ہوں جس میں یہ (افراط و تفریط کرنے والے) لوگ جھگڑ رہے ہیں (چنانچہ

یہود و نصاریٰ کے اقوال اوپر معلوم ہوئے اور چونکہ یہود کا قول ظاہرًا بھی موجب تنقیص نبی تھا جو کہ بداہۃً باطل ہے اس لئے اسکے رد کی طرف اس مقام پر توجہ نہیں فرمائی بخلاف قول نصاریٰ کے کہ ظاہرًا مثبت زیادتِ کمال تھا کہ نبوت کے ساتھ خدا کا بیٹا ہونا ثابت کرتے تھے اس لئے آگے اس کو رَد فرماتے ہیں جسکا حاصل یہ ہے کہ اسمیں حق تعالیٰ کی تنقیص بوجہ انکارِ توحید کے لازم آتی ہے حالانکہ) اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ (کسی کو) اولاد بنائے وہ (بالکل) پاک ہے (کیونکہ اس کی یہ شان ہے کہ) وہ جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو بس اس کو اتنا فرما دیتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے (اور ایسے کمال کے واسطے اولاد کا ہونا عقلاً نقص ہے) اور (آپ اثباتِ توحید کے لئے لوگوں سے فرما دیجئے کہ مشرکین بھی سُن لیں کہ) بیشک اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے سو (صرف) اسی کی عبادت کرو (اور) یہی (خالص خدا کی عبادت کرنا یعنی توحید اختیار کرنا دین کا) سیدھا راستہ ہے سو (توحید پر باوجود ان عقلی اور نقلی دلائل قائم ہونے کے پھر بھی) مختلف گروہوں نے (اس بارہ میں) باہم اختلاف ڈال دیا (یعنی توحید کا انکار کر کے طرح طرح کے مذاہب ایجاد کر لئے) سو ان کافروں کے لئے ایک بڑے (بھاری) دن کے آجانے سے بڑی خرابی (ہونے والی) ہے (مراد اس سے قیامت کا دن ہے کہ یہ دن اپنے زار سال دراز اور ہولناک ہونے کی وجہ سے بہت عظیم ہوگا) جس روز یہ لوگ (حساب و جزا کے لئے) ہمارے پاس آویں گے (اس روز) کیسے کچھ شنوا اور بینا ہو جاویں گے۔ (کیونکہ قیامت میں یہ حقائق پیش نظر ہو جاویں گے اور تمامتر غلطیاں رفع ہو جاویں گی) لیکن یہ ظالم آج (دُنیا میں کیسی) صریح غلطی میں (مبتلا ہو رہے) ہیں، اور آپ ان لوگوں کو حسرت کے دن سے ڈرائیے جبکہ (جنت دوزخ کا) اخیر فیصلہ کر دیا جاویگا (جسکا ذکر حدیث میں ہے کہ جنت اور دوزخ والوں کو موت دکھلا کر اس کو ذبح کر دیا جاویگا اور دونوں کو خلود (یعنی ہمیشہ ہمیشہ اسی حال میں زندہ رہنے کا حکم سُنا دیا جاوے گا، رواہ الشیخان والترمذی۔ اور اسوقت کی حسرت کا بیحد ہونا ظاہر ہے) اور وہ لوگ (آج دُنیا میں) غفلت میں (پڑے) ہیں اور وہ لوگ ایمان نہیں لاتے (لیکن آخر ایک دن مریں گے) اور تمام زمین اور زمین پر رہنے والوں کے وارث (یعنی آخر مالک) ہم ہی رہ جاویں گے اور یہ سب ہمارے ہی پاس لوٹائے جاویں گے (پھر اپنے کفر و شرک کی سزا بھگتیں گے)۔

معارف و مسائل

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہود و نصاریٰ کے بیہودہ خیالات میں افراط و تفریط کا یہ عالم تھا کہ نصاریٰ نے تو تعظیم میں اتنی زیادتی کی کہ انکو خدا تعالیٰ

کا بیٹا بنا دیا، اور یہود نے اُن کی توہین و تذلیل میں یہاں تک کہہ دیا کہ وہ یوسف نجار کی ناجائز اولاد میں ہیں۔ معاذ اللہ، حق تعالیٰ نے ان دونوں غلط کاروں کی غلطی بتلا کر اسکی صحیح حیثیت ان آیات میں واضح فرمادی۔ (قرطبی)

قَوْلَ الْحَقِّ، بفتح لام اس کی واضح ترکیب نحوی یہ ہے کہ اقول قول الحق اسکی اصل ہے اور بعض قراءتوں میں قَوْلُ الحق بضم لام بھی ہے تو اس صورت میں مراد یہ ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام خود قول حق ہیں جیسا کہ ان کو کلمۃ اللہ کا لقب بھی دیا گیا ہے کیونکہ انکی پیدائش بلا واسطہ سبب ظاہری کے صرف اللہ تعالیٰ کے قول سے ہوئی ہے۔ (قرطبی)

يَوْمَ الْحَسْرَةِ، اس روز کو یوم الحسرت اس لئے کہا گیا ہے کہ اہل جہنم کو تو یہ حسرت ہونا ظاہر ہے کہ اگر وہ مومن صالح ہوتے تو ان کو جنت ملتی اب جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں۔ ایک خاص قسم کی حسرت اہل جنت کو بھی ہوگی جیسا کہ طبرانی اور ابو یعلیٰ نے بروایت حضرت معاذ یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کو کسی چیز پر حسرت نہ ہوگی بجز ان لمحات وقت کے جو بغیر ذکر اللہ کے گزر گئے۔ اور بغویؒ بروایت ابو ہریرہؓ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مرنے والے کو حسرت و ندامت سے سابقہ پڑے گا۔ صحابہ کرامؓ نے سوال کیا کہ یہ ندامت و حسرت کس بناء پر ہوگی تو آپؐ نے فرمایا کہ نیک اعمال کرنے والے کو اس پر حسرت ہوگی کہ اور زیادہ نیک اعمال کیوں نہ کرلئے کہ اور زیادہ درجاتِ جنت ملتے اور بدکار آدمی کو اس پر حسرت ہوگی کہ وہ اپنی بدکاری سے باز کیوں نہ آگیا۔ (مظہری)

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ اِذْ
اور مذکور کر کتاب میں ابراہیم کا۔ بیشک تھا وہ سچا نبی جب

قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ
کہا اپنے باپ کو اے باپ میرے کیوں پوجتا ہے کس کو جو نہ سنے اور نہ دیکھے

وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿۴۲﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ
اور نہ کام آئے تیرے کچھ اے باپ میرے مجھ کو آئی ہے خبر ایک

الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾
چیز کی جو تجھ کو نہیں آئی سو میری راہ چل دکھلا دوں تجھ کو راہ سیدھی

يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ
اے باپ میرے مت پوج شیطان کو بیشک شیطان ہے رحمٰن کا

عَصِيًّا ﴿٤٤﴾ يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ
نافرمان اے باپ میرے میں ڈرتا ہوں کہیں آ لگے تجھ کو ایک آفت

الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا ﴿٤٥﴾ قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ
رحمٰن سے پھر تو ہو جائے شیطان کا ساتھی وہ بولا کیا تو پھرا ہوا ہے

عَنْ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ ۖ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ ۖ وَاهْجُرْنِي
میرے ٹھاکروں سے اے ابراہیم اگر تو باز نہ آئے گا تو تجھ کو سنگسار کرونگا اور دُور ہو جا میرے

مَلِيًّا ﴿٤٦﴾ قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ ۖ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ۖ إِنَّهُ
پاس سے ایک مدت کہا تیری سلامتی رہے میں گناہ بخشواؤں گا تیرا اپنے رب سے بیشک

كَانَ بِي حَفِيًّا ﴿٤٧﴾ وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ
وہ ہے مجھ پر مہربان اور چھوڑتا ہوں تم کو اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا

وَأَدْعُو رَبِّي عَسَىٰ أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا ﴿٤٨﴾
اور میں بندگی کرونگا اپنے رب کی، اُمید ہے کہ نہ رہوں گا اپنے رب کی بندگی کر کر محروم

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَهَبْنَا لَهُ
پھر جب جُدا ہوا اُن سے اور جن کو وہ پوجتے تھے اللہ کے سوا بخشا ہم نے اُس کو

إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿٤٩﴾ وَوَهَبْنَا لَهُم مِّن
اسحٰق اور یعقوب اور دونوں کو نبی کیا اور دیا ہم نے اُن کو اپنی

رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾
رحمت سے اور کیا اُن کے واسطے سچا بول اُونچا

ع ۳ / ۶

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اس کتاب (یعنی قرآن) میں (لوگوں کے سامنے حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کا (قصہ) ذکر کیجئے (تاکہ ان کو توحید و رسالت کا مسئلہ زیادہ منکشف ہو جاوے) وہ (ہر قول فعل میں) بڑے راستی والے تھے (اور) پیغمبر تھے (اور وہ قصہ جس کا ذکر کرنا اس جگہ مقصود ہے اُس وقت ہوا تھا) جب کہ انھوں نے اپنے باپ سے (جو کہ مشرک

۴

تھا) کہا کہ اے میرے باپ تم ایسی چیز کی کیوں عبادت کرتے ہو جو نہ کچھ سُنے اور نہ کچھ دیکھے اور نہ
تمہارے کچھ کام آسکے (مُراد بت ہیں حالانکہ اگر کوئی دیکھتا سُنتا کچھ کام آتا بھی ہو مگر واجب الوجود
نہ ہو تب بھی لائق عبادت نہیں چہ جائیکہ ان اوصاف سے بھی عاری ہو تو وہ بدرجۂ اولیٰ لائق
عبادت نہ ہوگا) اے میرے باپ میرے پاس ایسا علم پہنچا ہے جو تمہارے پاس نہیں آیا (مراد
اس سے وحی ہے جس میں احتمال غلطی کا ہو ہی نہیں سکتا پس میں جو کچھ کہہ رہا ہوں قطعاً حق ہے
جب یہ بات ہے) تو تم میرے کہنے پر چلو میں تم کو سیدھا رستہ بتلاؤں گا (اور وہ توحید ہے)
اے میرے باپ تم شیطان کی پرستش مت کرو (یعنی شیطان کو اور اس کی عبادت کو تو تم
بھی بُرا سمجھتے ہو اور بُت پرستی میں شیطان پرستی بالیقین لازم ہے کہ وہی یہ حرکت کراتا ہے۔
اور کسی کی ایسی اطاعت کرنا کہ حق تعالیٰ کے مقابلے میں بھی اسکی تعلیم کو حق سمجھے یہی عبادت ہے
پس بُت پرستی میں شیطان پرستی ہوئی اور) بیشک شیطان (حضرت) رحمان کا نافرمانی کرنے
والا ہے (تو وہ کب اطاعت کے لائق ہوگا) اے میرے باپ، میں اندیشہ کرتا ہوں (اور وہ
اندیشہ یقینی ہے) کہ تم پر رحمان کی طرف سے کوئی عذاب نہ آپڑے (خواہ دُنیا میں یا آخرت میں
پھر تم (عذاب میں) شیطان کے ساتھی ہو جاؤ (یعنی جب اطاعت میں اس کا ساتھ دوگے تو نفس
عقوبت میں بھی اسکا ساتھ ہوگا گو شیطان کو دُنیا میں عذاب نہ ہوا ہو اور اس شیطان کی معیت
اور مشارکت فی العقوبت کو کوئی اپنی بھلائی چاہنے والا پسند نہ کریگا۔

(ابراہیم علیہ السلام کی یہ تمام تر نصائح سنکر) باپ نے جواب دیا کہ کیا تم میرے معبودوں
سے پھرے ہوئے ہو اے ابراہیم (اور اس لئے مجھ کو بھی منع کرتے ہو یاد رکھو) اگر تم (ان بُتوں
کی مذمت سے اور مجھ کو ان کی عبادت سے منع کرنے سے) باز نہ آئے تو میں ضرور تم کو مار پتھروں
کے سنگسار کر دونگا (پس تم اس سے باز آجاؤ) اور ہمیش ہمیش کے لئے مجھ (کو کہنے سُننے) سے
برکنار رہو، ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا (بہتر) میرا سلام لو (اب تم سے کہنا سُننا بے سود ہے)
اب میں تمہارے لئے اپنے رب سے مغفرت کی (اس طرح) درخواست کرونگا (کہ تمکو ہدایت کرے
جس پر مغفرت مرتب ہوتی ہے) بیشک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے (اس لئے اسی سے عرض
کرونگا جسکا قبول فرمانا یا نہ فرمانا دونوں مختلف اعتبار سے رحمت اور مہربانی ہے) اور (تم اور
تمہارے ہم مذہب جب میری حق بات کو بھی نہیں مانتے تو تم میں رہنا بھی فضول ہے اس لئے)
میں تم لوگوں سے اور جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کر رہے ہو اُن سے (بدناً بھی) کنارہ کرتا ہوں
(جیسا قلباً پہلے ہی سے برکنار ہوں، یعنی یہاں رہتا بھی نہیں) اور (اطمینان سے علیحدہ ہوکر)
اپنے رب کی عبادت کرونگا (کیونکہ یہاں رہ کر اس میں بھی مزاحمت ہوگی) اُمید (یعنی یقین) ہے

کہ اپنے رب کی عبادت کر کے محروم نہ رہوں گا (جیسا بُت پرست اپنے باطل معبودوں کی عبادت کر کے محروم رہتے ہیں، غرض اس گفتگو کے بعد اُن سے اس طرح علیحدہ ہوئے کہ ملک شام کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے) پس جب ان لوگوں سے اور جن کی وہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے اُن سے (اس طرح) علیحدہ ہو گئے (تو) ہم نے اُن کو اسحٰق (بیٹا) اور یعقوب (پوتا) عطا فرمایا (جو کہ رفاقت کے لئے اُن کی بُت پرست برادری سے بدرجہا بہتر تھے) اور ہم نے (ان دونوں میں) ہر ایک کو نبی بنایا اور ان سب کو ہم نے (طرح طرح کے کمالات دیکر) اپنی رحمت کا حصہ دیا اور (آئندہ نسلوں میں) ہم نے اُنکا نام نیک اور بلند کیا (کہ سب تعظیم اور ثنا کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور اسحٰق کے قبل اسماعیل ان ہی صفات کے ساتھ عطا ہو چکے تھے)

معارف و مسائل

صِدّیق کی تعریف | صِدِّيقًا نَّبِيًّا، لفظ صِدّیق بکسر صاد قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہے اسکے معنے اور تعریف میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ جس شخص نے عمر میں کبھی جھوٹ نہ بولا ہو وہ صدیق ہے بعض نے فرمایا کہ جو شخص اعتقاد اور قول و عمل ہر چیز میں صادق ہو یعنی جو دل میں اعتقاد ہو ٹھیک وہی زبان پر ہو اور اسکا ہر فعل اور ہر حرکت و سکون اسی اعتقاد اور قول کے تابع ہو۔ روح المعانی اور مظہری وغیرہ میں اسی آخری معنے کو اختیار کیا ہے اور پھر صدیقیت کے درجات متفاوت ہیں۔ اصل صدیق تو نبی و رسول ہی ہو سکتا ہے اور ہر نبی و رسول کے لئے صدیق ہونا وصف لازم ہے مگر اس کا عکس نہیں کہ جو صدیق ہو اسکا نبی ہونا ضروری ہو بلکہ غیر نبی بھی جو اپنے نبی و رسول کے اتباع میں صدق کا یہ مقام حاصل کرلے وہ بھی صدیق کہلائے گا۔ حضرت مریم کو خود قرآن کریم نے اُمُّهٗ صِدِّيقَةٌ کا خطاب دیا ہے حالانکہ جمہور اُمّت کے نزدیک وہ نبی نہیں، اور کوئی عورت نبی نہیں ہو سکتی۔

اپنے بڑوں کو نصیحت کرنے کا طریقہ اور اُس کے آداب | يٰٓاَبَتِ، عربی لغت کے اعتبار سے یہ لفظ باپ کی تعظیم و محبت کا خطاب ہے۔ حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حق تعالیٰ نے جو مقام جامعیتِ اوصاف و کمالات کا عطا فرمایا تھا، اُن کی یہ تقریر جو اپنے والد کے سامنے ہو رہی ہے اعتدالِ مزاج اور رعایتِ اضداد کی ایک بے نظیر تقریر ہے کہ ایک طرف باپ کو شرک کفر اور کھلی گمراہی میں نہ صرف مبتلا بلکہ اسکا داعی دیکھ رہے ہیں جس کے مٹانے ہی کے لئے خلیل اللہ پیدا کئے گئے ہیں، دوسری طرف باپ کا ادب اور عظمت و محبت ہے۔ ان دونوں ضدوں کو حضرت خلیل اللہ نے کس طرح جمع فرمایا اوّل تو يٰٓاَبَتِ کا لفظ جو باپ کی مہربانی اور محبت کا

داعی ہے ہر جملہ کے شروع میں اس لفظ سے خطاب کیا پھر کسی جملہ میں باپ کی طرف کوئی لفظ ایسا منسوب نہیں جس سے اسکی توہین یا دل آزاری ہو کہ اُس کو گمراہ یا کافر کہتے بلکہ حکمتِ پیغمبرانہ کے ساتھ صرف اُن کے بُتوں کی بے بسی اور بے حسی کا اظہار فرمایا کہ ان کو خود اپنی غلط روش کیطرف توجہ ہو جائے۔ دوسرے جملہ میں اپنی اس نعمت کا اظہار فرمایا جو اللہ تعالیٰ نے اُن کو علومِ نبوت کی عطا فرمائی تھی تیسرے اور چوتھے جملے میں اُس انجامِ بد سے ڈرایا جو اس شرک و کفر کے نتیجہ میں آنے والا تھا۔ اس پر بھی باپ نے بجائے کسی غور و فکر یا یہ کہ اُنکی فرزندانہ گزارش پر کچھ نرمی کا پہلو اختیار کرتے پورے تشدد کے ساتھ خطاب کیا، انھوں نے تو خطاب یٰٓاَبَتِ کے پیارے لفظ سے کیا تھا جسکا جواب عرف میں یَا بُنَیَّ کے لفظ سے ہونا چاہئے تھا مگر آزر نے ان کا نام لیکر یٰٓاِبْرٰهِیْمُ سے خطاب کیا اور اُن کو سنگسار کرکے قتل کرنے کی دھمکی اور گھر سے نکل جانیکا حکم دیدیا۔ اسکا جواب حضرت خلیل اللہ کیطرف سے کیا ملتا ہے وہ سُننے اور یاد رکھنے کے قابل ہے فرمایا:

سَلٰمٌ عَلَیْکَ، یہاں لفظ سلام دو معنے کے لئے ہو سکتا ہے اول یہ کہ یہ سلام مقاطعہ ہو یعنی کسی سے قطع تعلق کرنیکا شریفانہ اور مہذب طریقہ یہ ہے کہ بات کا جواب دینے کے بجائے لفظ سلام کہہ کر علیحدہ ہو جائے جیسا کہ قرآن کریم نے اپنے مقبول و صالح بندوں کی صفت میں بیان فرمایا ہے: وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا، یعنی جب جاہل لوگ ان سے جاہلانہ خطاب کرتے ہیں تو یہ اُن سے دو بدو ہونیکے بجائے لفظ سلام کہتے ہیں جسکا مطلب یہ ہے کہ باوجود مخالفت کے میں تمھیں کوئی گزند اور تکلیف نہ پہنچاؤں گا۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہاں سلام عرفی سلام ہی کے معنے میں ہو۔ اسمیں فقہی اشکال یہ ہے کہ کسی کافر کو ابتداءً سلام کرنا حدیث میں ممنوع ہے صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لاتبدأوا الیهود والنصارٰی بالسلام (یعنی یہود و نصاریٰ کو ابتداءً سلام نہ کرو) مگر اس کے بالمقابل بعض روایاتِ حدیث میں ایک ایسے مجمع کو ابتدائی سلام کرنا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے جس میں کفار و مشرکین اور مسلمان سب جمع تھے جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم ہی میں حضرت اُسامہ رضؓ کی روایت سے ثابت ہے۔

اسی لئے فقہاءِ اُمت کا اس کے جواز و عدم جواز میں اختلاف ہوا۔ بعض صحابہؓ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے قول و عمل سے اسکا جواز ثابت ہوتا ہے بعض سے عدم جواز، جس کی تفصیل قرطبی نے احکام القرآن میں اسی آیت کے تحت بیان کی ہے۔ اور امام نخعی نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر تمھیں کسی کافر یہودی نصرانی سے ملنے کی کوئی دینی یا دُنیوی ضرورت پیش آجائے تو اس کو ابتدائی سلام کرنے میں مضائقہ نہیں اور بے ضرورت سلام کی ابتداء کرنے سے بچنا چاہئے۔ اسمیں مذکورہ

دونوں حدیثوں کی تطبیق ہو جاتی ہے واللہ اعلم۔ (قرطبی)

سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ، یہاں بھی یہ اشکال ہے کہ کسی کافر کے لئے استغفار کرنا شرعاً ممنوع و ناجائز ہے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب سے فرمایا تھا کہ وَاللّٰهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ مَالَمْ اُنْهَ عَنْهُ (یعنی بخدا میں آپ کے لئے اسوقت تک ضرور استغفار یعنی دعاء مغفرت کرتا رہونگا جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے منع نہ فرمادیا جائے) اس پر یہ آیت نازل ہوئی مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ (یعنی نبی اور ایمان والوں کے لئے جائز نہیں ہے کہ مشرکین کے لئے استغفار کریں) اس آیت کے نازل ہونے پر آپ نے چچا کے لئے استغفار کرنا چھوڑ دیا۔

جواب اشکال کا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ سے وعدہ کرنا کہ آپ کے لئے استغفار کرونگا یہ ممانعت سے پہلے کا واقعہ ہے اس کے بعد ممانعت کر دی گئی سورۂ ممتحنہ میں حق تعالیٰ نے خود اس واقعہ کو بطور استثناء ذکر فرما کر اس کی اطلاع دیدی ہے اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ اور اس سے زیادہ واضح سورۂ توبہ میں آیت مذکورہ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا کے بعد دوسری آیت میں فرمایا ہے وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ جس سے معلوم ہوا کہ یہ استغفار اور اسکا وعدہ باپ کے کفر پر جمے رہنے اور خدا کا دشمن ثابت ہونے سے پہلے کا تھا جب یہ حقیقت واضح ہوگئی تو انھوں نے بھی برارت کا اعلان کر دیا۔

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ، ایک طرف تو حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے باپ کے ادب و محبت کی رعایت میں یہ انتہاء کر دی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے دوسری طرف یہ بھی نہیں ہونے دیا کہ حق کے اظہار اور اس پر مضبوطی کو کوئی ادنیٰ سی ٹھیس لگے، باپ نے جو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا اس کو اس جملہ میں بخوشی منظور کر لیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ میں تمھارے بتوں سے بیزار ہوں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ، اس جملے سے پہلے جملے میں ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول آیا ہے کہ میں اُمید کرتا ہوں کہ میں اپنے پروردگار سے دعا کرنے میں ناکام و نامراد نہیں ہونگا۔ ظاہر یہ ہے کہ گھر اور خاندان سے جُدائی کے بعد تنہائی کی وحشت وغیرہ کے اثرات سے بچنے کی دُعا مُراد تھی مذکورہ جملہ میں اس دُعا کی قبولیت اس طرح بیان فرمائی گئی ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے لئے اپنے گھر خاندان اور اُن کے معبودوں کو چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے اسکی مکافات اس طرح فرمائی کہ ان کو صاحبزادہ اسحٰق علیہ السلام عطا فرمایا اور ساتھ ہی اس کا

عمر دراز پانا اور صاحب اولاد ہونا بھی لفظ یعقوب بڑھا کر ذکر فرما دیا اور صاحبزادہ کا عطا ہونا اس کی دلیل ہے کہ اس سے پہلے نکاح ہو چکا تھا، تو اسکا حاصل یہ ہوا کہ باپ کے خاندان سے بہتر ایک مستقل خاندان دے دیا جو انبیاء صلحاء پر مشتمل تھا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ

اور مذکور کر کتاب میں موسٰی کا بیشک وہ تھا چُنا ہوا اور تھا

رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ

رسول نبی اور پکارا ہم نے اس کو داہنی طرف سے طور پہاڑ کی اور

وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ

نزدیک بلایا اسکو بھید کہنے کو اور بخشا ہم نے اس کو اپنی مہربانی سے بھائی اُس کا ہارون

نَبِيًّا ﴿۵۳﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ

نبی اور مذکور کر کتاب میں اسمٰعیل کا وہ تھا وعدہ کا

الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ

سچا اور تھا رسول نبی اور حکم کرتا تھا اپنے گھر والوں کو نماز کا

وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ

اور زکوٰۃ کا اور تھا اپنے رب کے یہاں پسندیدہ اور مذکور کر کتاب میں

اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا

ادریس کا وہ تھا سچا نبی اور اُٹھا لیا ہم نے اسکو ایک اونچے

عَلِيًّا ﴿۵۷﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ

مکان پر یہ وہ لوگ ہیں جن پر انعام کیا اللہ نے پیغمبروں میں

مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۤ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ

آدم کی اولاد میں اور ان میں جن کو سوار کر لیا ہم نے نوح کے ساتھ اور ابراہیم کی

اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَاۗءِيْلَ ۡ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۭ اِذَا تُتْلٰى

اولاد میں اور اسرائیل کی اور ان میں جن کو ہم نے ہدایت کی اور پسند کیا جب اُن کو

عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴿۵۸﴾ السجدة

سُنائے آیتیں رحمٰن کی گرتے ہیں سجدہ میں اور روتے ہوئے

خلاصۂ تفسیر

اور اس کتاب (یعنی قرآن) میں موسٰی (علیہ السلام) کا بھی ذکر کیجئے (یعنی لوگوں کو سنایئے ورنہ کتاب میں ذکر کرنے والا تو فی الحقیقت اللہ تعالیٰ ہے) وہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے خاص کئے ہوئے (بندے) تھے اور وہ رسول بھی تھے، نبی بھی تھے اور ہم نے اُن کو کوہِ طور کی داہنی جانب سے آواز دی اور ہم نے اُن کو راز کی باتیں کرنے کے لئے مقرب بنایا اور ہم نے اُن کو اپنی رحمت (اور عنایت) سے اُن کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر عطا کیا (یعنی اُن کی درخواست کے موافق اُن کو نبی کیا کہ اُن کی مدد کریں) اور اس کتاب میں اسماعیل (علیہ السلام) کا بھی ذکر کیجئے بلاشبہ وہ وعدے کے (بڑے) سچے تھے اور وہ رسول بھی تھے نبی بھی تھے اور اپنے متعلقین کو نماز اور زکوٰۃ کا (خصوصاً اور بھی احکام کا عموماً) حکم کرتے رہتے تھے اور وہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ تھے اور اس کتاب میں ادریس (علیہ السلام) کا بھی ذکر کیجئے بیشک وہ بڑی راستی والے نبی تھے اور ہم نے ان کو (کمالات میں) بلند رتبہ تک پہنچا دیا یہ (حضرات جن کا شروع سورت سے یہاں تک ذکر ہوا زکریا علیہ السلام سے ادریس علیہ السلام تک یہ) وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے (خاص) انعام فرمایا ہے (چنانچہ نبوت سے بڑھ کر کونسی نعمت ہوگی) منجملہ (دیگر) انبیاء (علیہم السلام) کے (یہ صفت سب مذکورین میں مشترک ہے اور یہ سب) آدم (علیہ السلام) کی نسل سے (تھے) اور (بعضے ان میں) ان لوگوں کی نسل سے (تھے) جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا (چنانچہ بجز ادریس علیہ السلام کے کہ وہ اجداد نوح علیہ السلام سے ہیں باقی سب ہی یہ وصف ہے) اور (بعضے ان میں) ابراہیم (علیہ السلام) اور یعقوب (علیہ السلام) کی نسل سے (تھے چنانچہ حضرت زکریا و یحیٰی و عیسٰی و موسٰی علیہ السلام دونوں کی اولاد میں تھے اور اسحٰق و اسمٰعیل و یعقوب علیہ السلام صرف حضرت ابراہیم کی اولاد میں تھے) اور (یہ سب حضرات) اُن لوگوں میں سے (تھے) جنکو ہم نے ہدایت فرمائی اور ان کو مقبول بنایا (اور باوجود اس مقبولیت و اختصاص کے ان سب حضرات موصوفین کی عبدیت کی یہ کیفیت تھی کہ) جب ان کے سامنے (حضرت) رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو (غایت افتقار و انکسار و انقیاد کے اظہار کے لئے) سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے (زمین پر) گر جاتے تھے۔

معارف ومسائل

كَانَ مُخْلَصًا، مخلص بفتح لام وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے خالص کرلیا ہو یعنی جس کو غیر اللہ کیطرف التفات نہ ہو، اُس نے اپنے نفس اور تمام خواہشات کو اللہ کی مرضی کے لئے مخصوص کردیا ہو۔ یہ شان خصوصی طور پر انبیاء علیہم السلام کی ہوتی ہے جیساکہ قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ، یعنی ہم نے ان کو مخصوص کردیا ہے ایک خاص کام یعنی دار آخرت کی یاد کے لئے۔ اُمت میں جو حضرات کاملین انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر ہوں اُن کو بھی اس مقام کا ایک درجہ ملتا ہے اسکی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ قدرتی طور پر گناہوں اور بُرائیوں سے بچا دیئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی حفاظت ان کے ساتھ ہوتی ہے۔

مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ، یہ مشہور پہاڑ ملک شام میں مصر اور مدین کے درمیان واقع ہے آج بھی اسی نام سے مشہور ہے حق تعالیٰ نے اسکو بھی بہت سی چیزوں میں ایک خصوصیت و امتیاز دیا ہے الْاَيْمَنِ، طور کی یہ داہنی جانب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتبار سے بتلائی گئی ہے کیونکہ وہ مدین سے چلے تھے جب طور کے بالمقابل پہنچے تو طور انکی داہنی جانب تھا۔ نَجِيًّا سرگوشی اور خصوصی کلام کو مناجات اور جس شخص سے ایسا کلام کیا جائے اُس کو نجی کہا جاتا ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ، ھبہ کے لفظی معنے عطیہ کے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ ان کی امداد کے لئے حضرت ہارون کو بھی نبی بنا دیا جائے یہ دُعا قبول کی گئی اسی کو لفظ وَهَبْنَا سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی ہم نے عطیہ دیدیا موسیٰ علیہ السلام کو ہارون کا۔ اسی لئے حضرت ہارون کو ھبۃ اللہ بھی کہا جاتا ہے۔ (مظہری)

وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ، ظاہر یہی ہے کہ اس سے مُراد حضرت اسمٰعیل بن ابراہیم علیہ السلام ہیں مگر اُن کا ذکر اُن کے والد اور بھائی ابراہیم و اسحٰق کے ذکر کے ساتھ نہیں فرمایا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر درمیان میں آنے کے بعد ان کا ذکر فرمایا۔ شاید اس سے مقصود ان کے ذکر کا خاص اہتمام ہو کہ ضمنی لانے کے بجائے مستقلاً ذکر کیا گیا اور یہاں جتنے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا گیا ہے انمیں انکے زمانۂ بعثت کی ترتیب نہیں رکھی گئی کیونکہ ادریس علیہ السلام جن کا ذکر ان سب کے بعد آرہا ہے وہ زمانے کے لحاظ سے ان سب سے مقدم ہیں۔

كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ، ایفاء وعدہ ایک ایسا خلق حسن ہے کہ ہر شریف آدمی اس کو ضروری سمجھتا ہے اور اس کے خلاف کرنے کو ایک رذیل حرکت قرار دیا جاتا ہے حدیث میں وعدہ خلافی کو نفاق کی علامت بتلایا ہے، اسی لئے اللہ کا کوئی نبی و رسول ایسا نہیں جو

صادق الوعد نہ ہو مگر اس سلسلہ کلام میں خاص خاص انبیاء علیہم السلام کے ذکر کیساتھ کوئی خاص وصف بھی ذکر کیا گیا ہے اسکا یہ مطلب نہیں کہ یہ وصف دوسروں میں نہیں بلکہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انمیں یہ خاص صفت ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے جیسے ابھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ ان کا مخلَص ہونا ذکر فرمایا ہے حالانکہ یہ صفت بھی تمام انبیاء علیہم السلام میں عام ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسمیں ایک خاص امتیاز حاصل تھا اس لئے اُن کے ذکر میں اسکا ذکر فرمایا گیا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا صدقِ وعدہ میں امتیاز اس بنار پر ہے کہ اُنھوں نے جس چیز کا وعدہ اللہ سے یا کسی بندے سے کیا اس کو بڑی مضبوطی اور اہتمام سے پورا کیا، اُنھوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اپنے آپ کو ذبح کرنے کے لئے پیش کر دیں گے اور اُس پر صبر کرینگے اس میں پُورے اُترے۔ ایک شخص سے ایک جگہ ملنے کا وعدہ کیا وہ وقت پر نہ آیا تو اُسکے انتظار میں تین دن اور بعض روایات میں ایک سال اُسکا انتظار کرتے رہے (مظہری) اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ترمذی میں بروایت عبداللہ ابن ابی الحمسار ایسا ہی واقعہ وعدہ کر کے تین دن تک اُسی جگہ انتظار کرنے کا منقول ہے (قرطبی)

ایفائے وعدہ کی اہمیت اور اُس کا درجہ

ایفائے وعدہ انبیاء وصلحاء کا وصفِ خاص اور تمام شریف انسانوں کی عادت ہے اسکے خلاف کرنا فسّاق فجّار رذیل لوگوں کی خصلت ہے۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے العِدَۃُ دَین، وعدہ ایک قرض ہے یعنی جس طرح قرض کی ادائیگی انسان پر لازم ہے اسی طرح وعدہ پورا کرنے کا اہتمام بھی لازم ہے۔ دوسری ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں وأیُ المؤمن واجب یعنی وعدہ مومن کا واجب ہے۔

حضرات فقہاء نے باتفاق یہ فرمایا ہے کہ وعدہ کا قرض ہونا اور ایفاء وعدہ کا واجب ہونا اس معنی میں ہے کہ بلا عذر شرعی اس کو پورا نہ کرنا گناہ ہے لیکن وہ ایسا قرض نہیں جس کی چارہ جوئی عدالت سے کی جاسکے اور زبردستی وصول کیا جاسکے جس کو فقہاء کی اصطلاح میں یوں تعبیر کیا جاتا ہے کہ دیانۃً واجب ہے قضاءً واجب نہیں۔ (قرطبی وغیرہ)

مصلح کا فرض ہے کہ اصلاح کا کام اپنے اہل و عیال سے شروع کرے

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خصوصی اوصاف میں ایک یہ بھی بیان فرمایا کہ وہ اپنے اہل و عیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام تو ہر مومن مسلمان کے ذمہ واجب ہے کہ اپنے اہل و عیال کو نیک کاموں کی ہدایت کرتا رہے۔ قرآن حکیم میں عام مسلمانوں کو خطاب ہے قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔ یعنی بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو

آگ سے پھر اسمیں حضرت اسماعیل کی خصوصیت کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ حکم اگرچہ عام ہے اور سبھی مسلمان اس کے مکلف ہیں لیکن حضرت اسماعیل علیہ السلام اسکے اہتمام و انتظام میں امتیازی کوشش فرماتے تھے جیساکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ خصوصی ہدایت ملی تھی کہ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ یعنی اپنے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے آپ نے اس کی تعمیل میں اپنے خاندان کو جمع کر کے خصوصی خطاب فرمایا۔

دوسری بات یہاں قابلِ غور یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب پوری قوم کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اور وہ سبھی کو پیغام حق پہنچاتے اور امرِ الٰہی کا پابند کرتے ہیں، اہل و عیال کی خصوصیت میں کیا حکمت ہے؟ بات یہ ہے کہ دعوتِ پیغمبرانہ کے خاص اصول ہیں اُن میں یہ اہم بات ہے کہ جو ہدایت عام خلق اللہ کو دی جائے اُس کو پہلے اپنے گھر سے شروع کرے۔ اپنے گھر والوں کو اسکا ماننا اور منوانا نسبۃً آسان بھی ہوتا ہے اُس کی نگرانی بھی ہر وقت کی جاسکتی ہے اور وہ جب کسی خاص رنگ کو اختیار کرلیں اُسمیں پختہ ہوجاویں تو اس سے ایک دینی ماحول پیدا ہو کر دعوت کو عام کرنے اور دوسروں کی اصلاح کرنے میں بڑی قوت پیدا ہوجاوے گی۔ اصلاحِ خلق کے لئے سب سے زیادہ مؤثر چیز ایک صحیح دینی ماحول کا وجود میں لانا ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ہر بھلائی یا بُرائی تعلیم و تعلم اور افہام و تفہیم سے زیادہ ماحول کے ذریعہ پھیلتی اور بڑھتی ہے۔

وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِدْرِیْسَ، حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام سے ایکہزار سال پہلے حضرت نوح علیہ السلام کے اجداد میں سے ہیں (روح المعانی بحوالہ مستدرک حاکم) اور یہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے نبی و رسول ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے تیس صحیفے نازل فرمائے (کما فی حدیث ابی ذر زمخشری) اور ادریس علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں جن کو علم نجوم اور حساب بطور معجزہ عطا کیا گیا (بحر محیط) اور سب سے پہلے انسان ہیں جنھوں نے قلم سے لکھنا اور کپڑا سینا ایجاد کیا ان سے پہلے لوگ عموماً جانوروں کی کھال بجائے لباس استعمال کرتے تھے اور سب سے پہلے ناپ تول کے طریقے بھی آپ نے ہی ایجاد فرمائے اور اسلحہ کی ایجاد بھی آپ سے شروع ہوئی۔ آپ نے اسلحہ تیار کر کے بنو قابیل سے جہاد کیا (بحر محیط۔ قرطبی۔ مظہری۔ روح)

وَرَفَعْنٰهُ مَکَانًا عَلِیًّا، یعنی ہم نے ادریس علیہ السلام کو مقام بلند پر اُٹھالیا۔ معنے یہ ہیں کہ اُن کو نبوت و رسالت اور قرب الٰہی کا خاص مقام عطا فرمایا گیا۔ اور بعض روایات میں جو اُنکا آسمان پر اُٹھانا منقول ہے اُن کے متعلق ابن کثیرؒ نے فرمایا:

ھذا من اخبار کعب الاحبار الاسرائیلیات و فی بعضہ نکارۃ	یہ کعب احبار کی اسرائیلی روایات میں سے ہے اور اُن میں سے بعض میں نکارت و اجنبیت ہے۔

اور قرآن کریم کے الفاظ مذکورہ بہرحال اس معاملہ میں صریح نہیں کہ یہاں رفعتِ درجہ مراد ہے یا زندہ آسمان میں اٹھانا مراد ہے اسلئے انکار رفع الی السماء قطعی نہیں اور تفسیرِ قرآن اس پر موقوف نہیں (بیان القرآن)

فائدہ از بیان القرآن رسول اور نبی کی تعریف میں فرق اور باہمی نسبت

رسول اور نبی کی تعریف میں متعدد اقوال ہیں، آیاتِ مختلفہ میں غور کرنے سے جو بات احقر کے نزدیک محقق ہوئی وہ یہ ہے کہ ان دونوں کے مفہوم میں نسبت عموم وخصوص من وجہ کی ہے۔ رسول وہ ہے جو مخاطبین کو شریعتِ جدیدہ پہنچائے خواہ وہ شریعت خود اس رسول کے اعتبار سے بھی جدید ہو جیسے تورات وغیرہ یا صرف ان کی امت کے اعتبار سے جدید ہو جیسے اسماعیل علیہ السلام کی شریعت وہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قدیم شریعت ہی تھی لیکن قوم جرہم جن کی طرف ان کو مبعوث فرمایا تھا ان کو اس شریعت کا علم پہلے سے نہ تھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کے ذریعہ ہوا۔ اس معنی کے اعتبار سے رسول کے لئے نبی ہونا ضروری نہیں جیسے فرشتے کہ وہ رسول تو ہیں مگر نبی نہیں ہیں یا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرستادہ قاصد جن کو آیتِ قرآن اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ میں رسول کہا گیا ہے حالانکہ وہ انبیاء نہیں تھے۔

اور نبی وہ ہے جو صاحبِ وحی ہو خواہ شریعتِ جدیدہ کی تبلیغ کرے یا شریعتِ قدیمہ کی جیسے اکثر انبیاء بنی اسرائیل شریعتِ موسویہ کی تبلیغ کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک اعتبار سے لفظ رسول نبی سے عام ہے اور دوسرے اعتبار سے لفظ نبی بہ نسبت رسول کے عام ہے جس جگہ یہ دونوں لفظ ایک ساتھ استعمال کئے گئے جیسا کہ آیاتِ مذکورہ میں رَسُوْلًا نَّبِيًّا آیا ہے وہاں تو کوئی اشکال نہیں کہ خاص اور عام دونوں جمع ہو سکتے ہیں کوئی تضاد نہیں لیکن جس جگہ یہ دو لفظ باہم متقابل آئے ہیں جیسے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ میں تو اس جگہ بقرینۂ مقام لفظ نبی کو خاص اس شخص کے معنی میں لیا جائیگا جو شریعتِ سابقہ کی تبلیغ کرتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ، اس سے مراد صرف حضرت ادریس علیہ السلام ہیں وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ، اس سے مراد صرف ابراہیم علیہ السلام ہیں وَمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ، اس سے مراد اسمٰعیل واسحٰق ویعقوب علیہم السلام ہیں وَاِسْرَآءِيْلَ، اس سے مراد حضرت موسیٰ وہارون وحضرت زکریا ویحیٰی وعیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا، سابقہ آیات میں چند اکابر انبیاء علیہم السلام کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے جس میں ان کی عظمتِ شان کو بیان کیا گیا ہے، چونکہ انبیاء کی عظمت میں عوام سے غلو کرنے کا خطرہ تھا جیسے یہود نے حضرت عزیر کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ہی بنا دیا اسلئے اس مجموعہ کے بعد ان سب کا اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ گزار اور خوف وخشیت سے بھرپور ہونا اس آیت میں ذکر فرما دیا گیا تاکہ افراط وتفریط کے درمیان رہیں (بیان القرآن)

تلاوتِ قرآن کے وقت بکا یعنی آب دیدہ ہونا سنتِ انبیاء ہے اس سے معلوم ہوا کہ آیات قرآن کی تلاوت کے وقت بکاء (رونے) کی کیفیت پیدا ہونا محمود اور انبیاء علیہم السلام کا وصف ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ و تابعین اور اولیاء اللہ سے بکثرت اسکے واقعات منقول ہیں۔

قرطبی نے فرمایا کہ علماء نے اس بات کو مستحب قرار دیا ہے کہ قرآن کریم میں جو آیتِ سجدہ تلاوت کی جائے اس کے سجدے میں اس کے مناسب دُعا کیجائے، مثلاً سورۂ سجدہ میں یہ دُعا کریں اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ السَّاجِدِیْنَ لِوَجْهِكَ الْمُسَبِّحِیْنَ بِحَمْدِكَ وَاَعُوْذُبِكَ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ عَنْ اَمْرِكَ اور سُبْحٰنَ الَّذِیْ کے سجدہ میں یہ دُعا کریں اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الْبَاكِیْنَ اِلَیْكَ الْخَاشِعِیْنَ لَكَ اور آیتِ مذکورہ خَرُّوْا سُجَّدًا کے سجدہ میں یہ دُعا کریں اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنْ عِبَادِكَ الْمُنْعَمِ عَلَیْهِمِ الْمَهْدِیِّیْنَ السَّاجِدِیْنَ لَكَ الْبَاكِیْنَ عِنْدَ تِلَاوَةِ اٰیَاتِكَ (قرطبی)

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا

پھر اُن کی جگہ آئے ناخلف کھو بیٹھے نماز اور پیچھے پڑ گئے

الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا ﴿٥٩﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ

مزوں کے سو آگے دیکھ لیں گے گمراہی کو مگر جس نے توبہ کی اور یقین لایا

وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ

اور کی نیکی سو وہ لوگ جائیں گے بہشت میں اور اُن کا حق ضائع نہ ہوگا

شَیْـًٔا ﴿٦٠﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ

کچھ باغوں میں بسنے کے جن کا وعدہ کیا ہے رحمٰن نے اپنے بندوں سے

بِالْغَیْبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِیًّا ﴿٦١﴾ لَا یَسْمَعُوْنَ

اُن کے بن دیکھے بیشک ہے اس کے وعدہ پر پہنچنا نہ سُنیں گے

فِیْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِیْهَا بُكْرَةً

وہاں بک بک سوائے سلام اور اُن کے لئے ہے اُن کی روزی وہاں صبح

وَّعَشِیًّا ﴿٦٢﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ

اور شام یہ وہ بہشت ہے جو میراث دیں گے ہم اپنے بندوں میں جو کوئی

كَانَ تَقِیًّا ﴿٦٣﴾

ہوگا پرہیزگار

خلاصۂ تفسیر

پھر ان (مذکورین) کے بعد (بعضے) ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے نماز کو برباد کیا (خواہ اعتقاداً کہ انکار کیا یا عملاً کہ اس کے ادا کرنے میں یا حقوق و آداب ضروریہ میں کوتاہی کی) اور (نفسانی ناجائز) خواہشوں کی پیروی کی (جو ضروری طاعت سے غافل کرنے والی تھیں) سو یہ لوگ عنقریب (آخرت میں) خرابی دیکھیں گے (خواہ ابدی ہو یا غیر ابدی) ہاں مگر جس نے (کفر و معصیت سے) توبہ کرلی (اور مطلب کفر سے توبہ کرنے کا یہ ہے کہ) ایمان لے آیا اور (معصیت سے توبہ کرنا یہ ہے کہ) نیک کام کرنے لگا سو یہ لوگ (بلا خرابی دیکھے) جنت میں جاویں گے اور (جزا ملنے کے وقت) ان کا ذرا نقصان نہ کیا جاویگا (یعنی ہر نیک عمل کی جزا ملے گی یعنی) ان ہمیشہ رہنے کے باغوں میں (جاویں گے) جنکا رحمٰن نے اپنے بندوں سے غائبانہ وعدہ فرمایا ہے (اور) اس کے وعدہ کی ہوئی چیز کو یہ لوگ ضرور پہنچیں گے اس (جنت) میں وہ لوگ کوئی فضول بات نہ سُننے پاویں گے (کیونکہ وہاں فضول بات ہی نہ ہوگی) بجز (فرشتوں اور ایک دوسرے کے) سلام (کرنے) کے (اور ظاہر ہے کہ سلام سے بہت ہی خوشی اور راحت ہوتی ہے تو وہ فضول نہیں) اور ان کو کھانا صبح و شام ملا کریگا (یعنی یہ تو معین طور پر ہوگا اور یوں دوسرے وقت بھی اگر چاہیں گے ملے گا) یہ جنت (جسکا ذکر ہوا) ایسی ہے کہ ہم اپنے بندوں میں سے اسکا مالک ایسے لوگوں کو بناویں گے جو کہ خدا سے ڈرنے والے ہوں (جو مبنی ہے ایمان اور عمل صالح کا)

معارف و مسائل

خَلْفٌ، یہ لفظ بسکون لام بُرے قائمقام بُری اولاد کے لئے اور بفتح لام اچھے قائمقام اور اچھی اولاد کے لئے استعمال ہوتا ہے (مظہری) مجاہد رح کا قول ہے کہ یہ واقعہ قرب قیامت میں صلحاء اُمت کے ختم ہو جانے کے بعد ہوگا کہ نماز کی طرف التفات نہ رہے گا اور فسق و فجور کھلم کھلا ہونے لگے گا۔

نماز بے وقت یا بلا جماعت پڑھنا اضاعتِ نماز اور گناہِ عظیم ہے

اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ، نماز کے ضائع کرنے سے مُراد جمہور مفسرین عبداللہ بن مسعود۔ نخعی۔ قاسم۔ مجاہد۔ ابراہیم۔ عمر بن عبدالعزیز وغیرہ کے نزدیک نماز کو اُس کے وقت سے مؤخر کر کے پڑھنا ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ نماز کے آداب و شرائط میں سے کسی میں کوتاہی کرنا جسمیں وقت بھی داخل ہے اضاعتِ نماز میں شامل ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اضاعتِ صلوٰۃ سے مُراد بے جماعت کے گھر میں نماز پڑھ لینا ہے (قرطبی۔ بحر محیط)

حضرت فاروق اعظم رض نے اپنے سب عمّالِ حکومت کو یہ ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا تھا:

ان اھم امرکم عندی الصلوٰۃ۔ فمن ضیعھا فھولما سواھا اضیع (موطاء مالک)

میرے نزدیک تمہارے سب کاموں میں سب سے زیادہ اہم نماز ہے تو جو شخص نماز کو ضائع کرتا ہے وہ دوسرے تمام احکام دین کو بھی اور زیادہ ضائع کرے گا۔

حضرت حذیفہ رضؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز کے آداب اور تعدیلِ ارکان میں کوتاہی کرتا ہے تو اُس سے دریافت کیا کہ تم کب سے یہ نماز پڑھتے ہو اُس نے کہا کہ چالیس سال سے، حضرت حذیفہ رضؓ نے فرمایا کہ تم نے ایک بھی نماز نہیں پڑھی اور اگر تم اسی طرح کی نمازیں پڑھتے ہوئے مرگئے تو یاد رکھو کہ فطرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مروگے۔

ترمذی میں حضرت ابو مسعود انصاری رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو نماز میں اقامت نہ کرے۔ مراد یہ ہے کہ جو رکوع اور سجدہ میں اور رکوع سے کھڑے ہو کر یا دو سجدوں کے درمیان سیدھا کھڑا ہونا یا سیدھا بیٹھنے کا اہتمام نہ کرے اس کی نماز نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص نے وضوء اور طہارت میں کوتاہی کی یا نماز کے رکوع سجدے میں یا ان دونوں کے درمیان سیدھا کھڑے ہوتے بیٹھنے میں جلد بازی کی اُس نے نماز کو ضائع کر دیا۔

حضرت حسنؒ نے اضاعتِ صلوٰۃ اور اتباعِ شہوات کے بارے میں فرمایا کہ مسجدوں کو معطل کر دیا اور صنعت و تجارت اور لذات و خواہشات میں مبتلا ہوگئے۔

امام قرطبیؒ ان روایات کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ آج اہل علم اور معروف بالصلاح لوگوں میں ایسے آدمی پائے جاتے ہیں جو نماز کے آداب سے غافل، محض نقل و حرکت کرتے ہیں۔ یہ چھٹی ہجری کا حال تھا جس میں ایسے لوگ خال خال پائے جاتے تھے آج یہ صورتِ حال نمازیوں میں عام ہوگئی، اِلّا ما شاء اللہ۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَاَعْمَالِنَا

وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ، شہوات سے مُراد دُنیا کی وہ لذتیں ہیں جو انسان کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل کریں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ شاندار مکانوں کی تعمیر اور ایسی شاندار سواریوں کی سواری جس پر لوگوں کی نظریں اُٹھیں، اور ایسا لباس جس سے عام لوگوں میں امتیاز کی شان نظر آئے شہواتِ مذکورہ میں داخل ہیں (قرطبی)

فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا، لفظ غیّ عربی زبان میں رشاد کے بالمقابل ہے ہر بھلائی اور خیر کو رشاد اور ہر بُرائی اور شر کو غیّ کہا جاتا ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے منقول ہے کہ غیّ جہنم کے ایک غار کا نام ہے جس میں سارے جہنم سے زیادہ طرح طرح کے عذاب جمع ہیں۔

ابن عباسؓ نے فرمایا کہ غیّ جہنم کے ایک غار کا نام ہے جس سے جہنم بھی پناہ مانگتی ہے

اس کو اللہ تعالیٰ نے اُس زناکار کے لئے تیار کیا ہے جو اپنی زناکاری پر مصر اور عادی ہے اور اُس شرابخور کے لئے جو شراب کا عادی ہے اور اس سودخور کے لئے جو سودخوری سے باز نہیں آتا اور اُن لوگوں کے لئے جو ماں باپ کی نافرمانی کریں اور جھوٹی شہادت دینے والوں کے لئے اور اُس عورت کے لئے جو کسی دوسرے کے بچے کو اپنے شوہر کا بچہ بنا دے۔ (قرطبی)

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا، لغو سے مراد کلام باطل فضول اور گالی گلوچ اور ایذار دینے والا کلام ہے کہ اہل جنت اس سے پاک صاف رہیں گے کوئی کلمہ اُنکے کان میں ایسا نہ پڑیگا جو اُن کو رنج و تکلیف پہنچائے۔

اِلَّا سَلٰمًا، یہ استثناءِ منقطع ہے مراد یہ ہے کہ وہاں جسکا جو کلام سُننے میں آویگا وہ سلامتی اور بھلائی اور خوشی میں اضافہ کرے گا۔ اصطلاحی سلام بھی اس میں داخل ہے جو اہل جنت آپس میں ایک دوسرے کو کریں گے اور اللہ کے فرشتے ان سب کو کریں گے۔ (قرطبی)

وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا، جنت میں یہ نظام شمسی اور طلوع و غروب باللیل والنہار تو نہ ہوگا، ایک قسم کی روشنی ہمہ وقت رہے گی مگر رات اور دن اور صبح اور شام کے امتیازات کسی خاص انداز سے ہونگے۔ اسی صبح و شام میں اہل جنت کا رزق ان کو پہنچے گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اہل جنت کو جس وقت جس چیز کی خواہش ہوگی وہ اُسی وقت بلا تاخیر پوری کیجاوے گی (وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُونَ) اعلان عام ہے پھر صبح شام کی تخصیص کیوجہ انسانی عادت و فطرت کی بنا رپر ہے کہ وہ صبح شام کھانے پینے کا عادی ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں کہ جس شخص کو صبح شام کی غذا پوری ملے وہ آرام و عیش والا ہے

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرما کر کہا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین کا کھانا دن میں دو مرتبہ ہوتا ہے صبح اور شام۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں صبح شام کا لفظ بولکر عموم مراد ہے جیسے رات دن کا لفظ بھی یا مشرق مغرب کا لفظ عموم کے لئے بولا جاتا ہے کوئی خاص وقت یا جگہ مراد نہیں ہوتی تو مطلب یہ ہوگا کہ اُنکا رزق اُن کی خواہش کے موافق ہر وقت موجود رہے گا۔ واللہ اعلم (قرطبی)

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا

اور ہم نہیں اُترتے مگر حکم سے تیرے رب کے اُسی کا ہے جو ہمارے آگے ہے اور جو

خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿۶۴﴾ رَبُّ

ہمارے پیچھے اور جو اسکے بیچ میں ہے اور تیرا رب نہیں ہے بھولنے والا رب

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ

آسمانوں کا اور زمین کا اور جو اُنکے بیچ ہے سو اُسی کی بندگی کر اور قائم رہ اُسکی بندگی پر

هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾ وَيَقُوْلُ الْإِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ

کسی کو پہچانتا ہے تو اُسکے نام کا | اور کہتا ہے آدمی کیا جب میں مرجاؤں

لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ اَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ

تو پھر نکلوں گا زندہ ہوکر | کیا یاد نہیں رکھتا آدمی کہ ہم نے اسکو بنایا

مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ

پہلے سے اور وہ کچھ چیز نہ تھا | سو قسم ہے تیرے رب کی ہم گھیر بلائیں گے اُن کو

وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ثُمَّ

اور شیطانوں کو پھر سامنے لائیں گے گرد دوزخ کے گھٹنوں پر گرے ہوئے | پھر

لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾

جدا کرلیں گے ہم ہر ایک فرقہ میں سے جونسا ان میں سے سخت رکھتا تھا رحمٰن سے اکڑ

ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾ وَاِنْ

پھر ہم کو خوب معلوم ہے جو بہت قابل ہیں اُس میں داخل ہونے کے | اور کوئی نہیں

مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ثُمَّ

تم میں جو نہ پہنچے گا اُس پر | ہوچکا یہ وعدہ تیرے رب پر لازم مقرر | پھر

نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿٧٢﴾

بچائیں گے ہم اُن کو جو ڈرتے رہے اور چھوڑ دیں گے گنہگاروں کو اسمیں اوندھے گرے ہوئے

خلاصۂ تفسیر

شانِ نزول صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے یہ آرزو ظاہر فرمائی کہ ذرا زیادہ آیا کرو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور (ہم آپ کی درخواست کا جبرئیل علیہ السلام کی طرف سے جواب دیتے ہیں سُنیئے وہ یہ ہے کہ) ہم (یعنی فرشتے) بدون آپکے رب کے حکم کے وقتاً فوقتاً نہیں آسکتے اسی کی (ملک) ہیں ہمارے آگے کی سب چیزیں (مکان ہو یا زمان، مکانی ہو یا زمانی) اور (اسی طرح) ہمارے پیچھے کی سب چیزیں، اور جو چیزیں اُن کے درمیان میں ہیں (آگے کا مکان تو جو منہ کے سامنے ہو اور پیچھے کا جو پشت کی طرف ہو اور ما بین ذلک جسمیں یہ شخص خود ہو اور آگے کا زمان جو مستقبل ہو اور پیچھے کا جو ماضی ہو اور ما بین ذلک جو زمانہ حال ہو) اور آپ

کا رب بھولنے والا نہیں (چنانچہ یہ سب اُمور آپ کو پہلے سے معلوم ہیں مطلب یہ ہے کہ ہم تکویناً و تشریعاً مسخر امر ہیں اپنی رائے سے ایک مکان سے دوسرے مکان میں یا جب ہم چاہیں کہیں آجا نہیں سکتے لیکن جب ہمارا بھیجنا مصلحت ہوتا ہے تو حق تعالیٰ بھیجدیتے ہیں یہ احتمال نہیں کہ شاید کسی مصلحت کے وقت بھول جاتے ہوں) وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں سو (جب ایسا عالم و مالک ہے تو اے مخاطب) تو اسکی عبادت (اور اطاعت) کیا کر اور (ایک آدھ بار نہیں بلکہ) اسکی عبادت پر قائم رہ (اور اگر اس کی عبادت نہ کریگا تو کیا دوسرے کی عبادت کریگا) بھلا تو کسی کو اسکا ہم صفت جانتا (یعنی کوئی اسکا ہم صفت نہیں تو لائق عبادت بھی کوئی نہیں، پس اسی کی عبادت کرنا ضرور رہا) اور انسان (منکر آخرت) یوں کہتا ہے کہ میں جب مرجاؤنگا تو کیا پھر زندہ کرکے قبر سے نکالا جاؤں گا (اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ) کیا (یہ) انسان اس بات کو نہیں سمجھتا کہ ہم اس کو اسکے قبل (عدم سے) وجود میں لاچکے ہیں، اور یہ (اسوقت) کچھ بھی نہ تھا (جب ایسی حالت سے حیات کی طرف لانا آسان ہے تو دوبارہ حیات دینا تو بدرجۂ اولیٰ آسان ہے) سو قسم ہے آپ کے رب کی ہم ان کو (قیامت میں زندہ کرکے موقف حشر میں) جمع کرینگے اور (انکے ساتھ) شیاطین کو بھی (جو دُنیا میں ان کے ساتھ رہ کر بہکاتے سکھاتے تھے جیسا دوسری آیت میں ہے قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ أَطْغَيْتُهٗ) پھر ان (سب) کو دوزخ کے گرداگرد اس حالت سے حاضر کریں گے کہ (مارے ہیبت کے) گھٹنوں کے بل گرے ہونگے پھر (ان کفار کے) ہر گروہ میں سے (جیسے یہود و نصاریٰ و مجوس و بت پرست) ان لوگوں کو جُدا کریں گے جو ان میں سب سے زیادہ اللہ سے سرکشی کیا کرتے تھے (تاکہ ایسوں کو اوروں سے پہلے دوزخ میں داخل کریں) پھر (یہ نہیں کہ اس جُدا کرنے میں ہم کو کسی تحقیقات کی ضرورت پڑے کیونکہ) ہم (خود) ایسے لوگوں کو خوب جانتے ہیں جو دوزخ میں جانے کے زیادہ (یعنی اوّل) مستحق ہیں (پس اپنے علم سے ایسوں کو الگ کرکے اوّل اُن کو پھر دوسرے کفار کو دوزخ میں داخل کریں گے اور یہ ترتیب صرف اوّلیت میں ہے، اور آخریت نہ ہونے میں تو سب مساوی ہیں اور جہنم کا وجود ایسا یقینی ہے کہ اسکا معائنہ سب مؤمن و کافر کو کرایا جائے گا گو صورت اور غرض معائنہ کی مختلف ہوگی کفار کو بطور دخول کے اور تعذیب ابدی کے واسطے اور مؤمنین کو بطور عبور پُل صراط اور زیادتِ شکر اور فرح کے واسطے کہ اُس کو دیکھ کر جو جنت میں پہنچیں گے تو اور زیادہ شکر کریں گے اور خوش ہونگے) اور (بعض گنہگاروں کو سزائے محدود کے لئے جو کہ درحقیقت تطہیر ہے اسی عموم معائنہ کی خبر دی جاتی ہے کہ) تم میں سے کوئی بھی نہیں جسکا اس پر گزر نہ ہو (کسی کا دخولاً اور کسی کا عبوراً) یہ (وعدہ کے موافق) آپ کے رب کے اعتبار سے (بطور) لازم (مؤکد کے) ہے جو (ضرور) پورا ہو کر رہے گا پھر (اس جہنم پر عبور سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اسمیں مومن و کافر برابر ہیں بلکہ) ہم ان لوگوں کو نجات دیدیں گے جو خدا سے ڈر کر ایمان لائے تھے،

(خواہ اول ہی دفعہ میں نجات ہو جاوے جیسے مؤمنین کاملین کو اور خواہ بعد کسی قدر تکلیف کے جیسے کہ مؤمنین ناقصین کو) اور ظالموں کو (یعنی کافروں کو) اسمیں (ہمیشہ کے لئے) ایسی حالت میں رہنے دیں گے کہ (مارے رنج و غم کے) گھٹنوں کے بل گر پڑیں گے۔

معارف و مسائل

وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ، لفظ اصطبار کے معنے مشقت و تکلیف پر ثابت قدم رہنا ہے اس میں اشارہ ہے کہ عبادت پر دوام و ثبات مشقت چاہتا ہے عبادتگزار کو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے

هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا، لفظ سمیّ کے مشہور معنے ہمنام کے ہیں اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ مشرکین اور بت پرستوں نے اگرچہ عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت سے انسانوں، فرشتوں پتھروں اور بتوں کو شریک کر ڈالا تھا اور ان سب کو اِلٰہ یعنی معبود کہتے تھے مگر کسی نے لفظ اللہ معبود باطل کا نام کبھی نہیں رکھا۔ یہ ایک تکوینی اور تقدیری امر تھا کہ دنیا میں اللہ کے نام سے کوئی بت اور کوئی الٰہ باطل موسوم نہیں ہوا اس لئے اس معنے کے اعتبار سے بھی مضمون آیت کا واضح ہے کہ دنیا میں اللہ کا کوئی ہمنام نہیں۔

اور اکثر مفسرین مجاہد، ابن جبیر، قتادہ، ابن عباس رض سے اس جگہ اس لفظ کے معنی مثل اور شبیہ کے منقول ہیں اسکا مطلب واضح ہے کہ صفاتِ کمال میں اللہ تعالیٰ کا کوئی مثیل و عدیل یا نظیر نہیں ہے۔

لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ، اس جگہ والشیاطین کا واؤ بمعنے مَعَ ہے اور مراد یہ ہے کہ ہر کافر کو اُس کے شیطان کے ساتھ ایک سلسلہ میں باندھ کر اُٹھایا جائیگا اس صورت میں یہ صرف کافروں کے حشر کا بیان ہوگا، اور اگر مراد عام لیجائے جس میں، مؤمن و کافر سب داخل ہیں تو شیاطین کے ساتھ ان سب کے حشر کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر کافر تو اپنے شیطان کے ساتھ بندھا ہوا حاضر ہوگا اور مؤمنین بھی اس موقفِ حشر میں الگ نہیں ہوں گے اس لحاظ سے سب کیساتھ شیاطین کا اجتماع ہو جائے گا۔ (قرطبی)

حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا، ابتدائے حشر کے وقت مؤمنین و کفار، اور سعداء و اشقیاء سب جہنم کے گرد جمع کئے جاویں گے اور سب پر ہیبت طاری ہوگی سب گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہونگے پھر مؤمنین اور سعداء کو جہنم سے عبور کرا کر جنت میں داخل کیا جائے گا تاکہ اس منظر جہنم کو دیکھنے کے بعد اُن کو مکمل خوشی اور دائمی اور مخالفین دین پر شماتت اور اس پر اللہ کا مزید شکر نصیب ہو۔

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ، لفظ شیعہ اصل لغت میں کسی خاص شخص یا خاص عقیدہ

کے متبعین کو کہا جاتا ہے اس لئے بمعنی فرقہ بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور مُراد آیت کی یہ ہے کہ کفار کے مختلف فرقوں میں جو سب سے زیادہ سرکش ہوگا اس کو ان سب میں ممتاز کرکے مقدم کیا جاوے گا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ جہنم میں اس ترتیب سے داخل کیا جائے گا کہ جس کا جرم سب سے زیادہ ہوگا وہ سب سے پہلے اسکے بعد دوسرے اور تیسرے درجے کے مجرمین داخلِ جہنم کئے جاویں گے۔ (مظہری)

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا، یعنی کوئی انسان مؤمن یا کافر ایسا نہ رہے گا جسکا ورود جہنم پر نہ ہو۔ ورود سے مُراد دخول نہیں بلکہ عبور ہے جیسا کہ ابن مسعودؓ کی ایک روایت میں لفظ مرور بھی آیا ہے۔ اور اگر دخول مُراد لیا جاوے تو مؤمنین متقین کا دخول اس طرح ہوگا کہ جہنم اُن کے لئے برد و سلام بن جائے گی اُن کو اُس کی کوئی تکلیف محسوس نہ ہوگی جیسا کہ حضرت ابو سُمیّہؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی نیک آدمی یا فاجر آدمی باقی نہ رہے گا جو ابتداءً جہنم میں داخل نہ ہو مگر اسوقت مؤمنین متقین کے لئے جہنم برد و سلام بن جائے گی جیسے ابراہیم علیہ السلام کے لئے نارِ نمرود برد و سلام بنادی گئی تھی۔ اس کے بعد مؤمنین کو یہاں سے نجات دیکر جنت میں بیجایا جائے گا یہی معنے آیت کے اس اگلے جملے کے ہیں ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا، یہ مضمون حضرت ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے اور قرآن کریم میں جو لفظ ورود کا آیا ہے اگر اسکے معنے دخول کے بھی لئے جاویں تو دخول بطور عبور کے مُراد ہوگا اسلئے کوئی تضاد نہیں۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

اور جب سنائے اُن کو ہماری آیتیں کھلی ہوئی کہتے ہیں جو لوگ کہ منکر ہیں ایمان والوں کو

اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا

دونوں فرقوں میں کس کا مکان بہتر ہے اور کس کی اچھی لگتی ہے مجلس اور کتنی ہلاک کرچکے

قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿۷۴﴾ قُلْ مَنْ كَانَ

ہم پہلے ان سے جماعتیں وہ ان سے بہتر تھے سامان میں اور نمود میں تو کہہ جو رہا

فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا

بھٹکتا سو چاہیئے اس کو کھینچ لے جائے رحمٰن لمبا یہاں تک کہ جب دیکھیں گے

يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ۭ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ

جو وعدہ ہوا تھا اُن سے یا آفت اور یا قیامت سو تب معلوم کرلیں گے کس کا

شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ﴿۷۵﴾ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ

بُرا ہے مکان اور کس کی فوج کمزور ہے اور بڑھاتا جاتا ہے اللہ سوجھنے والوں کو سوجھ

وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾

اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر رکھتی ہیں تیرے رب کے یہاں بدلہ اور بہتر پھر جانے کو جگہ

خُلاصۂ تفسیر

اور جب ان منکر لوگوں کے سامنے ہماری (وہ) کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں (جنمیں مؤمنین کا حق پر ہونا اور کفار کا باطل پر ہونا مذکور ہوتا ہے) تو یہ کافر لوگ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ (یہ بتلاؤ ہم) دونوں فریقوں میں (یعنی ہم میں اور تم میں دُنیا میں) مکان کس کا زیادہ اچھا ہے اور محفل کس کی اچھی ہے (یعنی ظاہر ہے کہ خانگی اور مجلسی ساز و سامان اور اہل و اعوان میں ہم بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ مقدمہ تو محسوس ہے اور دوسرا مقدمہ عرفی ہے کہ انعام و احسان اور عطاءِ نعمت اُس شخص کے لئے ہوتا ہے جو دینے والے کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہو، ان دونوں مقدموں سے ثابت ہوا کہ ہم اللہ کے محبوب و مقبول ہیں اور تم مغضوب و مخذول۔ آگے اللہ تعالیٰ ایک جواب الزامی اور ایک تحقیقی دیتے ہیں۔ پہلا جواب تو یہ ہے کہ یہ لوگ ایسی بات کہتے ہیں) اور (یہ نہیں دیکھتے کہ) ہم نے ان سے پہلے بہت سے ایسے گروہ (ہیبت ناک سزاؤں سے کہ بالیقین عذاب تھے) ہلاک کئے ہیں جو سامان اور نمود میں ان سے بھی (کہیں زیادہ) اچھے تھے (اس سے معلوم ہوا کہ مقدمہ ثانیہ غلط ہے بلکہ کسی حکمت اور مصلحت سے نعمتِ دنیویہ مبغوض و مردود کو بھی دی جاسکتی ہے، آگے دوسرا جواب ہے کہ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کہ جو لوگ گمراہی میں ہیں (یعنی تم) اللہ تعالیٰ اُن کو ڈھیل دیتا چلا جا رہا ہے (یعنی اس نعمتِ دنیوی میں یہ حکمت ہے کہ مہلت دے کر اتمامِ حجت کر دے جیسا دوسری آیت میں ہے اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ الخ اور یہ مہلت چند روزہ ہے) یہاں تک کہ جس چیز کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے جب اس کو دیکھ لیں گے خواہ عذاب کو (دُنیا میں) خواہ قیامت کو (دوسرے عالم میں) سو (اُس وقت) اُن کو معلوم ہو جاوے گا کہ بُرا مکان کس کا ہے اور کمزور مددگار کس کے ہیں (یعنی دُنیا میں جو اپنے اہلِ مجلس کو اپنا مددگار سمجھتے ہیں اور فخر کرتے ہیں وہاں معلوم ہوگا کہ ان میں کتنا زور ہے کیونکہ وہاں تو کسی کا کوئی زور ہوگا ہی نہیں۔ اسی کو اضعف فرمایا تھا) اور (مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ) اللہ تعالیٰ ہدایت والوں کو (دُنیا میں تو) ہدایت بڑھاتا ہے (یعنی اصل سرمایہ یہ ہے کہ اگر اس کے ساتھ مال و دولت نہ ہو

مضر نہیں) اور (آخرت میں ظاہر ہوگا کہ) جو نیک کام ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں وہ تمہارے رب کے نزدیک ثواب میں بھی بہتر ہیں اور انجام میں بھی بہتر ہیں (پس ان کو ثواب میں بڑی بڑی نعمتیں ملیں گی جن میں مکان اور باغات سب کچھ ہوں گے اور انجام ان اعمال کا ابدیت اور دوام ہے ان نعمتوں کا پس کیفیۃً وکمیۃً مسلمانوں ہی کی حالتِ اخیرہ بہتر ہوگی اور اخیر ہی کا اعتبار بھی ہے)۔

معارف و مسائل

خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا، یہاں کفار نے مسلمانوں کو مغالطہ دینے کے لئے دو چیزیں پیش کیں۔ اول دُنیا کا مال و دولت اور ساز و سامان دوسرے حشم خدم اور اپنا جتھا اور جماعت کہ یہ بظاہر کفار کو بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ حاصل تھی اور یہی دو چیزیں ہیں جو انسان کے لئے نشہ کا کام کرتی ہیں اور اُن کا فخر و غرور اچھے اچھے عقلمند ذہین لوگوں کو غلط راستوں پر ڈالدیتا ہے اور پچھلے دَور کے بڑے بڑے سرمایہ داروں اور حکومت و سلطنت والوں کی عبرت خیز تاریخ سے غافل کر کے اپنے موجودہ حال کو اپنا ذاتی کمال اور دائمی راحت کا ذریعہ باور کرا دیتا ہے۔ بجز اُن لوگوں کے جو قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق دُنیا کے مال و دولت اور عزت و جاہ کسی کو اپنا ذاتی کمال یا دائمی ساتھی نہ سمجھیں اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر زبان سے بھی ادا کریں اور اُس کی دی ہوئی نعمت کو خرچ کرنے میں بھی اسکے احکام کی پابندی کریں اور اسکے فنا یا کم ہوجانے کے خطرہ سے بھی کسی وقت غافل نہ ہوں تو وہی اس شر سے محفوظ رہتے ہیں جیسے انبیاء علیہم السلام میں، حضرت سلیمان اور داؤد علیہما السلام اور صحابہ کرامؓ میں بہت سے اغنیاء صحابہ اور اسی طرح اُمت میں لاکھوں اولیاء، صلحاء جن کو حق تعالےٰ نے دُنیا کا مال و دولت بھی خوب عطا فرمایا اور دین کی دولت اور اپنا خوف بھی بے انتہاء۔

کفار کے اس مغالطہ کو قرآن حکیم نے اس طرح دُور فرمایا کہ دُنیا کی چند روزہ نعمت و دولت نہ اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی علامت ہوسکتی ہے نہ دُنیا ہی میں وہ کسی ذاتی کمال کی علامت سمجھی جاتی ہے کیونکہ بہت سے بے عقل جاہلوں کو دُنیا میں یہ چیزیں عقلاء اور دانشمندوں سے زیادہ مل جاتی ہیں۔ پچھلی تاریخ اُٹھا کر دیکھو تو یہ حقیقت کھل جائے گی کہ ایسی ایسی بلکہ ان سے بھی زیادہ کتنی دولتوں اور شوکتوں کے ڈھیر زمین پر ہوتے دیکھے گئے ہیں۔

رہا حشم و خدم اور دوست و احباب کی کثرت سو اس کی حقیقت بھی اول تو دُنیا ہی میں ظاہر ہوجاتی ہے کہ آڑے وقت میں کوئی کام نہیں آتا۔ پھر اگر دُنیا میں وہ برابر خدمت کرتے بھی رہے تو وہ کے دن کی، اس کے بعد محشر کے میدان میں اُن کا کون ساتھی ہوگا؟

وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا، باقیات صالحات کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں جن کی تفصیل سورۂ کہف میں گزر چکی ہے اور مختار قول یہی ہے کہ اس سے مُراد وہ تمام طاعات اور نیک کام ہیں جن کے فوائد باقی رہنے والے ہیں۔ مَرَدًّا کا لفظ بمعنے مرجع ہے مُراد انجام و عاقبت ہے۔ مُراد آیت کی واضح ہے کہ اعمالِ صالحہ ہی اصل دولت ہیں جن کا ثواب بڑا اور انجام دائمی راحت ہے۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿٧٧﴾

بھلا تو نے دیکھا اُس کو جو منکر ہوا ہماری آیتوں سے اور کہا مجھ کو مل کر رہے گا مال اور اولاد

اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿٧٨﴾ كَلَّا ۭ

کیا جھانک آیا ہے غیب کو، یا لے رکھا ہے رحمٰن سے عہد یہ نہیں،

سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿٧٩﴾ وَّنَرِثُهٗ

ہم لکھ رکھیں گے جو وہ کہتا ہے اور بڑھاتے جائیں گے اس کو عذاب میں لنبا اور ہم لے لینگے

مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿٨٠﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً

اسکے مرنے پر جو کچھ وہ بتلا رہا ہے اور آئیگا ہمارے پاس اکیلا۔ اور پکڑ رکھا ہے لوگوں نے اللہ کے سوا اوروں کو

لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾ كَلَّا ۭ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَ

معبود تاکہ وہ ہوں اُنکے لئے مدد، ہرگز نہیں، وہ منکر ہوں گے اُن کی بندگی سے اور

يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾ ع

ہو جائیں گے اُن کے مخالف

ع ۸

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بھلا آپ نے اس شخص (کی حالت) کو بھی دیکھا جو ہماری آیتوں کے ساتھ (جن کا حق یہ ہے کہ ان پر ایمان لایا جاتا جن میں سے آیاتِ بعث بھی ہیں) کفر کرتا ہے اور (علیٰ سبیل الاستہزاء) کہتا ہے کہ مجھ کو (آخرت میں) مال اور اولاد ملیں گے (مطلب یہ کہ اس کی حالت بھی قابلِ تعجب ہے آگے اسکا رد ہے کہ) کیا یہ شخص غیب پر مطلع ہوگیا ہے یا اس نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد (اس بات کا) لے لیا ہے (یعنی اس دعوے کا علم آیا بلا واسطہ اسباب ہوا ہے

کہ علم غیب ہے یا بواسطہ اسباب ہوا ہے پھر چونکہ وہ دعویٰ حکم عقلی تو ہے نہیں بلکہ امر نقلی ہے۔ اس لئے صرف دلیل نقلی کہ اخبار خداوندی ہے اس کی دلیل ہو سکتی ہے سو دونوں طریق مفقود ہیں اول تو عقلاً بھی ممتنع ہے اور دوسرا وقوعاً منتفی ہے) ہرگز نہیں (محض غلط کہتا ہے اور) ہم اسکا کہا ہوا بھی لکھ لیتے ہیں (اور وقت پر یہ سزا دیں گے کہ) اسکے لئے عذاب بڑھاتے چلے جائیں گے اور اسکی کہی ہوئی چیزوں کے ہم مالک رہ جاویں گے (یعنی وہ تو دنیا سے مرجاوے گا اور اموال و اولاد پر کوئی اسکا اختیار نہ رہے گا ہم ہی سب کے مالک رہیں گے اور قیامت میں ہم اس کو نہ دیں گے بلکہ) وہ ہمارے پاس (مال و اولاد سے) تنہا ہو کر آوے گا اور ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود تجویز کر رکھے ہیں تاکہ ان کے لئے وہ (عند اللہ) باعث عزت ہوں (جیسا اس آیت میں حکایت ہے يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ سوالیا) ہرگز نہیں ہوگا بلکہ وہ تو (قیامت میں خود) اُن کی عبادت ہی کا انکار کر بیٹھیں گے (جیسا سورۂ یونس کے تیسرے رکوع میں گزر چکا قَالَ شُرَكَاۗؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ) اور (اُلٹے) ان کے مخالف ہو جاویں گے، (قالاً بھی جیسا گزرا اور حالاً بھی کہ بجائے عزت کے سبب ذلت ہو جاویں گے ان معبودین میں اصنام بھی ہوں گے سو اُن کا ناطق ہونا جیسا یکفرون کا مقتضا ہے مثل نطق جوارح کے مستبعد و مستغرب نہیں)۔

معارف و مسائل

لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا، بخاری و مسلم میں حضرت خباب بن الارتؓ کی روایت ہے کہ ان کا کچھ قرض عاص بن وائل کے ذمہ تھا یہ اُنکے پاس تقاضہ کے لئے گئے اُس نے کہا میں تو تمہارا قرض اُسوقت تک نہیں دُوں گا جب تک تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کفر و انکار کا معاملہ نہ کرو۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا جبتک کہ تم مرو پھر زندہ ہو۔ عاص بن وائل نے کہا کہ اچھا کیا میں مرکر پھر زندہ ہونگا۔ اگر ایسا ہے تو بس تمہارا قرض بھی اُسیوقت چکاؤں گا جب دوبارہ زندہ ہونگا کیونکہ اُسوقت بھی میرے پاس مال اور اولاد ہونگے۔ (قرطبی)

قرآن کریم نے اس احمق کے جواب میں فرمایا کہ اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ دوبارہ زندہ ہونے کے وقت بھی اُسکے پاس مال اور اولاد ہونگے اَطَّلَعَ الْغَيْبَ، کیا اسنے غیب کی باتوں کو جھانک کر معلوم کرلیا ہے اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا یا اللہ رحمٰن سے اس نے مال و اولاد کے لئے کوئی عہد اور وعدہ لے لیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی کوئی بات ہوئی نہیں۔ پھر اسنے یہ خیال کیسے پکالیا وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ، یعنی جس مال اور اولاد کا یہ ذکر کر رہا ہے آخرت میں ملنے کا معاملہ تو بہت دُور ہے

دُنیا میں بھی جو کچھ اس کو ملا ہوا ہے اس کو بھی چھوڑنا پڑیگا اور اسکے وارث آخر کار ہم ہونگے یعنی یہ مال و اولاد اس سے چھن کر بالآخر اللہ کی طرف لوٹ جائے گا۔

وَيَأْتِيْنَا فَرْدًا، اور قیامت کے روز یہ اکیلا ہمارے دربار میں حاضر ہوگا نہ کوئی اولاد ساتھ ہوگی نہ مال۔ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا، یعنی یہ خود تراشیدہ بُت اور معبود باطل جن کی عبادت اس لئے کرتے تھے کہ یہ اُن کے مددگار ہونگے محشر میں اس کے برعکس یہ اُن کے دشمن ہو جاویں گے اللہ تعالیٰ اُن کو نُطق و زبان عطا فرما دیں گے اور یہ بولیں گے کہ یا اللہ ان کو عذاب و سزا دیجئے کہ انھوں نے تجھ کو چھوڑ کر ہمیں معبود بنالیا تھا۔ (قرطبی)

أَلَمْ تَرَ أَنَّآ أَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا ﴿۸۳﴾

تو نے نہیں دیکھا کہ ہم نے چھوڑ رکھے ہیں شیطان منکروں پر اُچھالتے ہیں ان کو اُبھار کر

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿۸۴﴾ يَوْمَ نَحْشُرُ

سو تو جلدی نہ کر اُن پر ہم تو پوری کرتے ہیں اُن کی گنتی جسدن ہم اکٹھا کرلا ئینگے

الْمُتَّقِيْنَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ إِلٰى

پرہیزگاروں کو رحمٰن کے پاس مہمان بُلائے ہوئے اور ہانک لے جائیں گے گنہگاروں کو

جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ

دوزخ کیطرف پیاسے نہیں اختیار رکھتے لوگ سفارش کا مگر جس نے لے لیا ہے

عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾

رحمٰن سے وعدہ

خلاصۂ تفسیر

(آپ جو ان کی گمراہی سے غم کرتے ہیں تو) کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہم نے شیاطین کو کفار پر (ابتلاءً) چھوڑ رکھا ہے کہ وہ ان کو (کفر و ضلال پر) خوب اُبھارتے (اور اکساتے) رہتے ہیں (پھر جو خود ہی اپنے اختیار سے اپنے بدخواہ کے بہکانے میں آجاوے اسکا کیوں غم کیا جاوے) سو (جب شیاطین ابتلاءً مسلط ہوئے ہیں اور تعجیل سزائے مستحق میں ابتلاء رہتا نہیں تو) آپ اُن کے لئے جلدی (عذاب ہونے کی درخواست) نہ کیجئے ہم اُن کی باتیں (جن پر سزا ہوگی) خود شمار کر رہے ہیں، (اور وہ سزا اُس روز واقع ہوگی) جس روز ہم متقیوں کو رحمٰن (کے دارالنعیم) کی طرف مہمان بنا کر جمع

کریں گے اور مجرموں کو دوزخ کیطرف پیاسا ہانکیں گے (اور کوئی ان کا سفارشی بھی نہ ہوگا کیونکہ وہاں کوئی سفارش کا اختیار نہ رکھے گا مگر ہاں جس نے رحمان کے پاس سے اجازت لی ہے (وہ انبیاء و صلحاء ہیں اور اجازت خاص ہے مؤمنین کے ساتھ پس کفار محلِ شفاعت نہ ہوئے)۔

معارف و مسائل

تَؤُزُّهُمْ اَزًّا، عربی لغت میں لفظ ھَزٌّ، اَزٌّ، فَزٌّ، حَضٌّ، سب ایک معنی میں ہیں یعنی کسی کام کے لئے اُبھارنا اور آمادہ کرنا۔ خفت و شدت اور کمی زیادتی کے لحاظ سے ان میں باہمی فرق ہے۔ لفظ اَزٌّ کے معنی پوری قوت اور تدبیر و تحریک کے ذریعہ کسی شخص کو کسی کام کے لئے آمادہ بلکہ مجبور کر دینے کے ہیں معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ شیاطین ان کو اعمالِ بد پر اُبھارتے رہتے ہیں اور ان کی خوبیاں اُن کے دل پر مسلط کر دیتے ہیں خرابیوں پر نظر نہیں ہونے دیتے۔

اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا، مطلب یہ ہے کہ آپ ان کے عذاب کے بارے میں جلدی نہ کریں وہ تو عنقریب ہونے ہی والا ہے کیونکہ ہم نے اُن کو گنے چُنے ایام اور جو مدت دُنیا میں رہنے کی دی ہے وہ بہت جلد پوری ہونے والی ہے اسکے بعد عذاب ہی عذاب ہے نَعُدُّ لَهُمْ، یعنی ہم ان کیلئے شمار کرتے ہیں اسکا مطلب یہ ہے کہ انکی کوئی چیز آزاد نہیں اُن کی عمر کے دن رات گنے ہوئے ہیں، اُنکے سانس، اُن کی نقل و حرکت کا ایک ایک قدم، اُن کی لذات اُن کی زندگی کا ایک ایک لحظہ ہم گن رہے ہیں، یہ گنتی پوری ہوتے ہی ان پر عذاب ٹوٹ پڑے گا۔

مامون رشید نے ایک مرتبہ سورۂ مریم پڑھی۔ جب اس آیت پر پہنچے تو حاضرین مجلس جو علماء فقہاء تھے اُن میں سے ابنِ سماک کی طرف اشارہ کیا کہ اس کے متعلق کچھ کہیں اُنھوں نے عرض کیا کہ جب ہمارے سانس گنے ہوئے ہیں ان پر زیادتی نہیں ہوسکتی تو یہ کسقدر جلد ختم ہو جائیں گے اسی کو بعض شعراء نے کہا ہے ؎

حیاتك انفاس تعد فکلما ٭ مضی نفس منك انتقصت به جزءا

یعنی تیری زندگی کے سانس گنے ہوئے ہیں، جب ایک سانس گزرتا ہے تو تیری زندگی کا ایک جزء کم ہو جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ انسان دن رات میں چوبیس ہزار سانس لیتا ہے۔ (قرطبی)

اور بعض حضرات نے فرمایا ؎

وکیف یفرح بالدنیا ولذتها ٭ فتی یعد علیه اللفظ والنفس

یعنی دُنیا اور اسکی لذت پر وہ شخص کیسے مگن اور بے فکر ہو سکتا ہے جس کے الفاظ اور سانس گنے جا رہے ہوں (روح)، يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا، لفظ وفد ایسے آنے والوں کے

لئے بولا جاتا ہے جو کسی بڑے بادشاہ یا امیر کے پاس اکرام و اعزاز کے ساتھ جائیں بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ یہ لوگ سواریوں پر سوار ہو کر پہنچیں گے اور سواری ہر شخص کی وہ ہوگی جس کو وہ دنیا میں اپنے لئے پسند کرتا تھا۔ اونٹ، گھوڑا یا دوسری سواریاں بعض حضرات نے فرمایا کہ انکے اعمالِ صالحہ ان کی مرغوب سواریوں کی صورت اختیار کرلیں گے یہ روایاتِ حدیث روح المعانی اور قرطبی نے نقل کی ہیں۔

اِلٰی جَهَنَّمَ وِرْدًا، وِرد کے لفظی معنے پانی کی طرف جانے کے ہیں اور ظاہر یہ ہے کہ پیاس ہی کے وقت کوئی آدمی یا جانور پانی پر جاتا ہے اس لئے وِردًا کا ترجمہ پیاسا کیا گیا۔

مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عہد سے مراد شہادت لا اِلٰہ اِلَّا اللہ ہے، بعض نے فرمایا کہ عہد سے مراد حفظ کتاب اللہ ہے خلاصہ یہ ہے کہ شفاعت کرنے کا حق ہر ایک کو نہیں ملے گا بجز ان لوگوں کے جو ایمان کے عہد پر مضبوط رہے۔ (قرطبی)

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ

اور لوگ کہتے ہیں رحمٰن رکھتا ہے اولاد بیشک تم آ پھنسے ہو بھاری چیز میں ابھی

السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ

آسمان پھٹ پڑیں اس بات سے اور ٹکڑے ہو زمین اور گر پڑیں پہاڑ

هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ

ڈھے کر اس پر کہ پکارتے ہیں رحمٰن کے نام پر اولاد اور نہیں پھبتا رحمٰن کو

اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ

کہ رکھے اولاد، کوئی نہیں آسمان اور زمین میں جو

اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾ وَ

نہ آئے رحمٰن کا بندہ ہو کر اسکے پاس ان کی شمار ہے اور گن رکھی ہے ان کی گنتی، اور

كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

ہر ایک ان میں آئیگا اسکے سامنے قیامت کے دن اکیلا البتہ جو یقین لائے ہیں اور کی ہیں

الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ

انھوں نے نیکیاں ان کو دیگا رحمٰن محبت سو ہم نے آسان کر دیا

بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾ وَكَمْ

یہ قرآن تیری زبان میں اسی واسطے کہ خوشخبری سنادے تو ڈرنے والوں کو، اور ڈرادے جھگڑالو لوگوں کو۔ اور بہت

اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ

ہلاک کر چکے ہم ان سے پہلے جماعتیں، آہٹ پاتا ہے تو اُن میں کسی کی

اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾

یا سُنتا ہے اُن کی بھنک؟

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (کافر) لوگ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ نے اولاد (بھی) اختیار کر رکھی ہے (چنانچہ نصاریٰ کثرت سے اور یہود قلت سے اور مشرکین عرب اس عقیدہ فاسدہ میں مبتلا تھے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) تم نے (جو) یہ (بات کہی تو) ایسی سخت حرکت کی ہے کہ اس کے سبب کچھ بعید نہیں کہ آسمان پھٹ پڑیں اور زمین کے ٹکڑے اُڑ جاویں اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں اس بات سے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں حالانکہ خدا تعالیٰ کی شان نہیں کہ وہ اولاد اختیار کرے (کیونکہ) جتنے کچھ بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہیں سب خدا تعالیٰ کے روبرو غلام ہوکر حاضر ہوتے ہیں (اور) اس نے سب کو (اپنی قدرت میں) احاطہ کر رکھا ہے اور (اپنے علم سے) سب کو شمار کر رکھا ہے (یہ حالت تو ان کی فی الحال ہے) اور قیامت کے روز سب کے سب اسکے پاس تنہا تنہا حاضر ہونگے (کہ ہر شخص خدا ہی کا محتاج اور محکوم ہوگا، پس اگر خدا کے اولاد ہو تو خدا ہی کی طرح وجوب وجود و لوازم وجوب کے ساتھ موصوف ہونا چاہیئے اور خدا کی یہ صفات ہیں جو مذکور ہوئیں، عمومِ قدرت، عمومِ علم۔ اور غیر خدا کی یہ صفتیں ہیں افتقار و انقیاد جو ضد ہیں وجوب کے پھر ضدین کا اجتماع کیونکر ہو سکتا ہے)۔

بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اللہ تعالیٰ (ان کو علاوہ نعم مذکورہ اخرویہ کے دُنیا میں یہ نعمت دیگا کہ) ان کے لئے (خلائق کے دل میں) محبت پیدا کر دیگا سو (آپ ان کو یہ بشارت دید یجئے کیونکہ) ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان (عربی) میں اس لئے آسان کیا ہے کہ آپ اس سے متقیوں کو خوشخبری سُنا دیں اور (نیز) اس سے جھگڑالو آدمیوں کو خوف دلادیں اور (ان خوف کی چیزوں میں سے نقمت دنیویہ کا ایک یہ بھی مضمون ہے کہ) ہم نے ان کے قبل بہت سے گروہوں کو (عذاب و قہر سے) ہلاک کر دیا ہے (سو) کیا آپ ان میں سے کسی کو دیکھتے ہیں یا ان (میں سے کسی) کی کوئی آہستہ آواز سُنتے ہیں (یہ کنایہ ہے بے نام و نشان ہونے سے سو کفار اس نقمت دنیویہ کے بھی مستحق ہیں گو کسی مصلحت سے کسی کافر کے لئے اس کا

وقوع نہ ہو مگر اندیشہ کے قابل تو ہے۔

معارف و مسائل

وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۙ ان آیات سے معلوم ہوا کہ زمین اور پہاڑ اور اُس کی تمام چیزوں میں ایک خاص قسم کا عقل و شعور موجود ہے اگرچہ وہ اس درجہ کا نہ ہو جس پر احکام الٰہیہ مرتب ہوتے ہیں جیسے انسان کی عقل و شعور۔ یہی عقل و شعور ہے جس کی وجہ سے دُنیا کی ہر چیز اللہ کے نام کی تسبیح کرتی ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ، یعنی کوئی چیز دنیا میں ایسی نہیں جو اللہ کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو ان چیزوں کا یہی شعور و ادراک ہے جس کا ذکر ان آیاتِ مذکورہ میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینے خصوصاً اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد قرار دینے سے زمین اور پہاڑ وغیرہ سخت گھبراتے اور ڈرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ نے فرمایا کہ جن و انس کے علاوہ تمام مخلوقات خدا تعالیٰ کے ساتھ شرک سے بہت ڈرتی ہیں اور یہ خطرہ محسوس کرتی ہیں کہ وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ (روح المعانی)

وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۙ یعنی حق تعالیٰ شانہٗ تمام انسانوں کے اشخاص و اعمال کا پورا علم رکھتے ہیں اُنکے سانس اُنکے قدم اُنکے لقمے اور گھونٹ اللہ کے نزدیک شمار کئے ہوئے ہیں نہ کم ہو سکتے ہیں نہ زیادہ۔

سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۙ یعنی ایمان اور عمل صالح پر قائم رہنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کر دیتے ہیں دوستی اور محبت، یعنی ایمان اور عمل صالح جب مکمل ہوں اور بیرونی عوارض سے خالی ہوں تو اُن کا خاصہ یہ ہے کہ مؤمنین صالحین کے درمیان آپس میں بھی اُلفت و محبت ہو جاتی ہے۔ ایک نیک صالح آدمی دوسرے نیک آدمی سے مانوس ہوتا ہے اور دوسرے تمام لوگوں اور مخلوقات کے دلوں میں بھی اللہ تعالیٰ اُن کی محبت پیدا فرما دیتے ہیں۔

بخاری، مسلم، ترمذی، وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ جب کسی بندے کو پسند فرماتے ہیں تو جبرئیل امین سے کہتے ہیں کہ میں فلاں آدمی سے محبت کرتا ہوں تم بھی اُنسے محبت کرو جبرئیل امین سارے آسمانوں میں اسکی منادی کرتے ہیں اور سب آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر یہ محبت زمین پر نازل ہوتی ہے (تو زمین والے بھی سب اس محبوب خدا سے محبت کرنے لگتے ہیں) اور فرمایا کہ قرآن کریم کی یہ آیت اسپر شاہد ہے یعنی اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (قرطبی) اور ہرم بن حیانؒ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے پورے دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ تمام اہل ایمان کے دل اسکی طرف متوجہ فرما دیتے ہیں۔ (قرطبی)

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب اپنی اہلیہ ہاجرہ اور شیر خوار صاحبزادے

اسماعیل علیہ السلام کو مکہ کے خشک پہاڑوں کے درمیان ریگستان میں بحکم خداتعالیٰ چھوڑ کر ملک شام واپس جانے کا ارادہ فرمایا تو ان کے لئے بھی دعا مانگی تھی فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ یعنی یا اللہ میرے بے کس اہل و عیال کے لئے آپ کچھ لوگوں کے قلوب کو مائل اور متوجہ فرما دیجئے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہزاروں سال گزر چکے ہیں کہ مکہ اور اہلِ مکہ کی محبت ساری دنیا کے دلوں میں بھر دی گئی ہے اور دنیا کے ہر گوشے سے بڑی بڑی محنت و مشقت اٹھا کر اور عمر بھر کی کمائی خرچ کر کے لوگ پہنچتے رہتے ہیں اور دنیا کے ہر گوشہ کی چیزیں مکہ معظمہ کے بازار میں دستیاب ہوتی ہیں۔

اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ، رکز وہ مخفی آواز ہے جو سمجھ میں نہ آئے جیسے مرنے والے کی زبان لڑکھڑانے کے بعد جو آواز ہوتی ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ سب حکومت و سلطنت والے اور شوکت و حشمت اور طاقت و قوت والے جب اللہ کے عذاب میں پکڑے گئے اور فنا کئے گئے تو ایسے ہو گئے کہ ان کی کوئی مخفی آواز اور حس و حرکت بھی سنائی نہیں دیتی۔

سورۂ طٰہٰ

سُورَةُ طٰهٰ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّخَمْسٌ وَّثَلٰثُوْنَ اٰيَةً وَّثَمَانُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ طٰہٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو پینتیس آیتیں ہیں اور آٹھ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اس سورت کا دوسرا نام سورۂ کلیم بھی ہے (کما ذکرہ السخاوی) وجہ یہ ہے کہ اسمیں حضرت کلیم اللہ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ مفصل مذکور ہے۔

مسند دارمی میں حضرت ابوہریرہ رضہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے آسمان وزمین پیدا کرنے سے بھی دو ہزار سال پہلے سورۂ طٰہٰ و یٰسٓ پڑھی (یعنی فرشتوں کو سُنائی) تو فرشتوں نے کہا کہ بڑی خوش نصیب اور مبارک ہے وہ اُمت جس پر یہ سورتیں نازل ہونگی اور مبارک ہیں وہ سینے جو ان کو حفظ رکھیں گے اور مبارک ہیں وہ زبانیں جو ان کو پڑھیں گی، یہی وہ مبارک سورت ہے جس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قتل کا تہیہ کرکے نکلنے والے عمر بن خطاب رضہ کو ایمان قبول کرنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں گرنے پر مجبور کر دیا جس کا واقعہ کتب سیرت میں معروف و مشہور ہے۔

ابن اسحٰق کی روایت اس طرح ہے کہ عمر بن خطاب رضہ ایک روز تلوار لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے گھر سے نکلے۔ راستہ میں نُعیم بن عبداللہ مل گئے، پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ عمر بن خطاب رضہ نے کہا کہ میں اس گمراہ شخص کا کام تمام کرنے کے لئے جا رہا ہوں جس نے قریش میں تفرقہ ڈال دیا، اُن کے دین و مذہب کو بُرا کہا اُن کو بیوقوف بنایا اور اُنکے بتوں کو بُرا کہا۔ نُعیم نے کہا کہ عمر تمہیں تمہارے نفس نے دھوکہ میں مبتلا کر رکھا ہے کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کردو گے اور اُن کا قبیلہ بنو عبد مناف تمہیں زندہ چھوڑے گا کہ زمین پر چلتے پھرتے رہو۔ اگر تم میں عقل ہے تو

اپنی بہن اور بہنوئی کی خبر لو کہ وہ مسلمان اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کے تابع ہو چکے ہیں، عمر بن خطاب پر اُن کی بات اثر کر گئی اور یہیں سے اپنی بہن بہنوئی کے مکان کی طرف پھر گئے۔ اُسی مکان میں حضرت خباب بن ارت صحابیؓ ان دونوں کو قرآن کی سُورت طٰہٰ پڑھا رہے تھے جو ایک صحیفہ میں لکھی ہوئی تھی۔

ان لوگوں نے جب محسوس کیا کہ عمر بن خطابؓ آرہے ہیں تو حضرت خبابؓ گھر کے کسی کمرہ یا گوشہ میں چھپ گئے اور ہمشیرہ نے یہ صحیفہ اپنی [illegible] نیچے چھپا لیا مگر عمر بن خطاب کے کانوں میں خباب بن ارتؓ کی اور اُن کے کچھ پڑھنے کی آواز پہنچ چکی تھی اس لئے پوچھا کہ یہ پڑھنے پڑھانے کی آواز کیسی تھی جو میں نے سُنی ہے؟ انھوں نے (اوّل بات کو ٹالنے کے لئے) کہا کہ کچھ نہیں، مگر اب عمر بن خطاب نے بات کھولدی کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم دونوں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تابع اور مسلمان ہوگئے ہو، یہ کہہ کر اپنے بہنوئی سعید بن زیدؓ پر ٹوٹ پڑے اُن کی ہمشیرہ فاطمہؓ نے جب یہ دیکھا تو شوہر کو بچانے کے لئے کھڑی ہوگئیں۔ عمر بن خطاب نے اُن کو بھی [illegible]

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو بہن بہنوئی دونوں نے بیک زبان کہا کہ سُن لو ہم بلاشبہ مسلمان ہو چکے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے ہیں اب جو تم کر سکتے ہو کرلو۔ ہمشیرہ کے زخم سے خون جاری تھا اس کیفیت کو دیکھ کر عمر بن خطابؓ کو کچھ ندامت ہوئی اور بہن سے کہا کہ وہ صحیفہ مجھے دکھلاؤ جو تم پڑھ رہی تھیں تاکہ میں بھی دیکھوں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا تعلیم لائے ہیں عمر بن خطاب لکھے پڑھے آدمی تھے اسلئے صحیفہ دیکھنے کے لئے مانگا۔ بہن نے کہا کہ ہمیں خطرہ ہے کہ ہم نے یہ صحیفہ اگر تمہیں دے دیا تو تم اس کو ضائع کردو یا بے ادبی کرو۔ عمر بن خطاب نے اپنے بتوں کی قسم کھا کر کہا کہ تم یہ خوف نہ کرو میں اس کو پڑھ کر تمہیں واپس کردوں گا۔ ہمشیرہ فاطمہؓ نے جب یہ رُخ دیکھا تو اُن کو کچھ اُمید ہوگئی کہ شاید عمر بھی مسلمان ہوجائیں، اسوقت کہا کہ بھائی بات یہ ہے کہ تم نجس ناپاک ہو اور اس صحیفہ کو پاک آدمی کے سوا کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا اگر تم دیکھنا ہی چاہتے ہو تو غسل کرلو۔ عمرؓ نے غسل کرلیا پھر یہ صحیفہ انکے حوالہ کیا گیا تو اسمیں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی اسکا شروع حصہ ہی پڑھ کر عمرؓ نے کہا کہ یہ کلام تو بڑا اچھا اور نہایت محترم ہے۔ خباب بن ارتؓ جو مکان میں چھپے ہوئے یہ سب کچھ سُن رہے تھے عمرؓ کے یہ الفاظ سُنتے ہی سامنے آگئے اور کہا کہ اے عمر بن خطابؓ مجھے اللہ کی رحمت سے یہ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اپنے رسول کی دُعا کے لئے منتخب فرمالیا ہے کیونکہ گزشتہ کل میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دُعا کرتے ہوئے سُنا ہے کہ اَللّٰھُمَّ اَیِّدِ الْاِسْلَامَ بِاَبِی الْحَکَمِ بْنِ ھِشَامٍ اَوْ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، یا اللہ اسلام کی تائید تقویت فرما ابوالحکم بن ہشام (یعنی ابوجہل) کے ذریعہ یا پھر عمر بن خطاب کے ذریعہ۔ مطلب یہ تھا

کہ ان دونوں میں سے کوئی مسلمان ہو جائے تو مسلمانوں کی کمزور جماعت میں جان پڑ جائے۔ پھر خبابؓ نے کہا کہ اے عمرؓ اب تو اس موقع کو غنیمت سمجھو، عمر بن خطابؓ نے خبابؓ سے کہا کہ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے چلو (قرطبی) آگے ان کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونا اور اسلام قبول کرنا مشہور و معروف واقعہ ہے۔

طٰهٰ ۝۱ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝۲ اِلَّا تَذْكِرَةً
اس واسطے نہیں اُتارا ہم نے تجھ پر قرآن کہ تو محنت میں پڑے، مگر نصیحت کے واسطے

لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝۳ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝۴
اسکی جو ڈرتا ہے اُتارا ہوا ہے اسکا جس نے بنائی زمین اور آسمان اونچے

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝۵ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا
وہ بڑا مہربان عرش پر قائم ہوا اُسی کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور

فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝۶ وَاِنْ تَجْهَرْ
زمین میں اور ان دونوں کے درمیان اور نیچے گیلی زمین کے اور اگر تو بات کہے

بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝۷ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ
پکار کر تو اس کو تو خبر ہے چھپی ہوئی بات کی اور اس سے بھی چھپی ہوئی کی، اللہ ہے جسکے سوا بندگی نہیں کسی کی

لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝۸
اُسی کے ہیں سب نام خاصے

خلاصۂ تفسیر

طٰہٰ (کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں)، ہم نے آپ پر قرآن (مجید) اس لئے نہیں اُتارا کہ آپ تکلیف اُٹھائیں بلکہ ایسے شخص کی نصیحت کے لئے (اُتارا ہے) جو (اللہ سے) ڈرتا ہو یہ اس (ذات) کی طرف سے نازل کیا گیا ہے جس نے زمین کو اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا ہے (اور) وہ بڑی رحمت والا عرش پر (جو مشابہ ہے تخت سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہے (جو کہ اسکی شان کے لائق ہے اور وہ ایسا ہے کہ) اسی کی مِلک ہیں جو چیزیں آسمانوں میں اور جو چیزیں زمین میں ہیں اور جو چیزیں ان دونوں کے درمیان میں ہیں (یعنی آسمان سے نیچے اور زمین سے

اوپر) اور جو چیزیں تحت الثریٰ میں ہیں (یعنی زمین کے اندر جو تر مٹی ہے جسکو ثریٰ کہتے ہیں جو چیز کہ اس کے نیچے ہے، مراد یہ کہ زمین کی تہ میں جو چیزیں ہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت و سلطنت تھی) اور (علم کی یہ شان ہے کہ) اگر تم (اے مخاطب) پکار کر بات کہو تو (اس کے سننے میں تو کیا شبہ ہے) وہ تو (ایسا ہے کہ) چپکے سے کہی بات کو اور (بلکہ) اس سے بھی زیادہ خفی بات کو (یعنی جو ابھی دل میں ہے) جانتا ہے (وہ) اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود (ہونیکا مستحق) نہیں اس کے (بڑے) اچھے اچھے نام ہیں (جو اوصاف و کمالات پر دلالت کرتے ہیں سو قرآن ایسی ذات جامع الصفات کا نازل کیا ہوا ہے اور یقینی حق ہے)۔

معارف و مسائل

طٰہٰ، اس لفظ کی تفسیر میں علماء تفسیر کے اقوال بہت ہیں۔ حضرت ابن عباس رضؓ سے اس کے معنی یا رجل اور ابن عمر رضؓ سے یا حبیبی منقول ہیں، بعض روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ طٰہٰ اور یٰسٓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء گرامی میں سے ہیں اور بے غبار بات وہ ہے جو حضرت صدیق اکبرؓ اور جمہور علماء نے فرمائی کہ جس طرح قرآن کی بہت سی سورتوں کے ابتداء میں آئے ہوئے حروف مقطعہ مثلاً الٓمّٓ وغیرہ متشابہات یعنی اسرار میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا لفظ طٰہٰ بھی اسی میں داخل ہے۔

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی، لِتَشْقٰی، شَقَاء سے مشتق ہے جسکے معنی تعب اور مشقت و تکلیف کے ہیں۔ نزول قرآن کی ابتداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام تمام رات عبادت کے لئے کھڑے رہتے اور نماز تہجد میں تلاوت قرآن میں مشغول رہتے تھے یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدمین مبارک پر ورم آگیا اور دن بھر اس کی فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح کفار کو ہدایت ہو وہ قرآن کی دعوت کو قبول کرلیں۔ اس آیت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں قسم کی مشقت سے بچانے کے لئے ارشاد فرمایا کہ ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت اور تکلیف میں پڑ جائیں تمام رات جاگنے اور تلاوت قرآن میں مشغول رہنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ بن گیا کہ شروع رات میں آرام فرماتے تھے اور آخر شب میں بیدار ہو کر تہجد ادا فرماتے تھے۔

اسی طرح اس آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ آپ کا فرض صرف تبلیغ و دعوت کا ہے جب آپ نے یہ کام کرلیا تو پھر اس کی فکر آپ کے ذمہ نہیں کہ کون ایمان لایا اور کس نے دعوت کو قبول نہیں کیا۔ (تلخیص القرطبی)

اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى، ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ نزولِ قرآن کی ابتدا میں ساری رات تہجد و تلاوت میں مشغول رہنے سے بعض کفار نے مسلمانوں پر یہ آوازے کسے کہ ان لوگوں پر قرآن کیا نازل ہوا ایک مصیبت نازل ہو گئی نہ رات کا آرام نہ دن کا چین۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اشارہ فرمایا کہ یہ جاہل بدنصیب حقائق سے بے خبر کیا جانیں کہ قرآن اور اسکے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا علم خیر ہی خیر اور سعادت ہی سعادت ہے اس کو مصیبت سمجھنے والے بے خبر اور احمق ہیں۔ صحیحین کی حدیث میں بروایت معاویہ رضی آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ، یعنی اللہ تعالیٰ جس شخص کی بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو دین کا علم اور سمجھ بوجھ عطا فرما دیتے ہیں۔

اس جگہ امام ابن کثیرؒ نے ایک صحیح حدیث دوسری بھی نقل فرمائی ہے جو علماء کیلئے بڑی بشارت ہے یہ حدیث طبرانی نے حضرت ثعلبہ بن الحکم رضی سے روایت کی ہے ابن کثیر نے فرمایا کہ اسناد اس کی جید ہے۔ حدیث یہ ہے۔

قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقول اللہ تعالیٰ للعلماء یوم القیامۃ اذا قعد علی کرسیہ لقضاء عبادہ انی لم اجعل علمی وحکمتی فیکم الا وانا ارید ان اغفر لکم علی ما کان منکم ولا ابالی (ابن کثیر ص۱۴۳ ج ۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز جب اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنی کرسی پر تشریف فرما ہونگے تو علماء سے فرما دیں گے کہ میں نے اپنا علم و حکمت تمہارے سینوں میں صرف اسی لئے رکھا تھا کہ میں تمہاری مغفرت کرنا چاہتا ہوں باوجود اُن خطاؤں کے جو تم سے سرزد ہوئیں اور مجھے کوئی پروا نہیں۔

مگر یہ ظاہر ہے کہ یہاں علماء سے مراد وہی علماء ہیں جن میں علم کی قرآنی علامت خشیت اللہ موجود ہو اس آیت میں لفظ لِمَنْ يَّخْشٰى اسی طرف اشارہ کرتا ہے جن میں یہ علامت نہ ہو وہ اس کے مستحق نہیں۔ واللہ اعلم

عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى، استواء علی العرش کے متعلق صحیح بے غبار وہی بات ہے جو جمہور سلف صالحین سے منقول ہے کہ اس کی حقیقت و کیفیت کسی کو معلوم نہیں۔ متشابہات میں سے ہے۔ عقیدہ اتنا رکھنا ہے کہ استواء علی العرش حق ہے اُس کی کیفیت اللہ جل شانہ کی شان کے مطابق و مناسب ہوگی جسکا ادراک دُنیا میں کسی کو نہیں ہو سکتا۔

وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى، ثریٰ، نمناک گیلی مٹی کو کہتے ہیں جو زمین کھودنے کے وقت نکلتی ہے مخلوقات کا علم تو صرف ثریٰ تک ختم ہو جاتا ہے، آگے اس ثریٰ کے نیچے کیا ہے اسکا

علم اللہ کے ۔ کسی کو نہیں، اس نئی تحقیق و ریسرچ اور نئے نئے آلات اور سائنس کی انتہائی ترقی کے باوجود اب سے چند سال پہلے زمین کو برما کر ایک طرف سے دوسری طرف نکل جانے کی کوشش ۔۔ توں تک جاری رہی ۔ ان سب تحقیقات اور انتھک کوششوں کا نتیجہ اخبارات میں سب کے سامنے آچکا ہے کہ صرف چھ میل کی گہرائی تک یہ آلاتِ جدیدہ کام کر سکے، آگے ایک ایسا غلاف حجری ثابت ہوا جہاں کھودنے کے سارے آلات اور سائنس جدیدہ کے سب افکار عاجز ہوگئے یہ صرف چھ میل تک کا علم انسان حاصل کرسکا ہے جبکہ زمین کا قطر ہزاروں میل کا ہے اس لئے اس اقرار کے سوا چارہ نہیں کہ ما تحت الثریٰ کا علم حق تعالٰی ہی کی مخصوص صفت ہے

یَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی ، سِرّ سے مراد وہ چیز ہے جو انسان نے اپنے دل میں چھپائی ہوئی ہے کسی پر ظاہر نہیں اور اخفٰی سے مراد وہ بات ہے جو ابھی تک تمہارے دل میں بھی نہیں آئی آئندہ کسی وقت دل میں آوے گی حق تعالٰی ان سب چیزوں سے واقف و باخبر ہیں کہ اسوقت کسی انسان کے دل میں کیا ہے اور کل کو کیا ہوگا ۔ کل کا معاملہ ایسا ہے کہ خود اس شخص کو بھی آج اسکی خبر نہیں کہ کل کو میرے دل میں کیا بات آوے گی ۔ (قرطبی)

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝٩ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ

اور پہنچی ہے تجھ کو بات موسیٰ کی جب اس نے دیکھی ایک آگ تو کہا اپنے

امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ

گھر والوں کو ٹھہرو میں نے دیکھی ہے ایک آگ شاید لے آؤں تمہارے پاس اس میں سے سلگاکر، یا

اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝١٠ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝١١

پاؤں آگ پر پہنچ کر رستہ کا پتہ پھر جب پہنچا آواز آئی اے موسیٰ

اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ

میں ہوں تیرا رب، سو اتار ڈال اپنی جوتیاں تو ہے پاک میدان طویٰ

طُوًى ۝١٢ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝١٣ اِنَّنِيْٓ اَنَا

میں اور میں نے تجھ کو پسند کیا ہے سو تو سنتا رہ جو حکم ہو میں جو ہوں اللہ

اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝١٤

ہوں کسی کی بندگی نہیں سوا میرے سو میری بندگی کر، اور نماز قائم رکھ میری یادگاری کو

وقف لازم

إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ
قیامت بیشک آنے والی ہے، میں مخفی رکھنا چاہتا ہوں اُس کو تاکہ بدلہ ملے ہر شخص کو

بِمَا تَسْعَىٰ ﴿١٥﴾ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهَا
جو اُسنے کمایا ہے سو کہیں تجھ کو نہ روک دے اس سے وہ شخص جو یقین نہیں رکھتا اُسکا

وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَرْدَىٰ ﴿١٦﴾
اور پیچھے پڑ رہا ہے اپنے مزوں کے پھر تو پٹکا جائے

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ کو موسیٰ (علیہ السلام کے قصہ) کی خبر پہنچی ہے (یعنی وہ سننے کے قابل ہے کہ اسمیں توحید و نبوت کے متعلق علوم ہیں جن کی تبلیغ نافع ہوگی وہ قصہ یہ ہے کہ) جب کہ اُنھوں نے (مدین سے آتے ہوئے ایک رات کو جس میں سردی بھی تھی اور راستہ بھی بھول گئے تھے کوہ طور پر) ایک آگ دیکھی (کہ واقع میں وہ نور تھا مگر شکل آگ کی سی تھی) سو اپنے گھر والوں سے (جو صرف بی بی تھی یا خادم وغیرہ بھی) فرمایا کہ تم (یہاں ہی) ٹھہرے رہو (یعنی میرے پیچھے مت آنا کیونکہ یہ تو احتمال ہی نہ تھا کہ بدون ان کے آگے سفر کرنے لگیں گے) میں نے ایک آگ دیکھی ہے (میں وہاں جاتا ہوں) شاید میں اس میں سے تمہارے پاس کوئی شعلہ (کسی لکڑی وغیرہ میں لگاکر) لاؤں (تاکہ سردی کا علاج ہو) یا (وہاں) آگ کے پاس رستہ کا پتہ (جاننے والا کوئی آدمی بھی) مجھ کو مل جاوے سو وہ جب اس (آگ) کے پاس پہنچے تو (ان کو منجانب اللہ) آواز دی گئی کہ اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں، پس تم اپنی جوتیاں اُتار ڈالو، (کیونکہ) تم ایک پاک میدان یعنی طویٰ میں ہو (یہ اس میدان کا نام ہے) اور میں نے تمکو (نبی بنانے کے لئے منجملہ دیگر خلائق کے) منتخب فرمایا ہے سو (اسوقت) جو کچھ وحی کی جارہی ہے اسکو (غور سے) سُن لو (وہ یہ ہے کہ) میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے لائق) نہیں، تو تم میری ہی عبادت کیا کرو اور میری ہی یاد کے لئے نماز پڑھا کرو (دوسری بات یہ سو کہ) بلاشبہ قیامت آنے والی ہے میں اس کو (تمام خلائق سے) پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں (اور قیامت اس لئے آوے گی) تاکہ ہر شخص کو اسکے کئے کا بدلہ مل جاوے سو (جب قیامت کا آنا یقینی ہے تو) تم کو (قیامت کے لئے مستعد رہنے) سے ایسا شخص باز نہ رکھنے پاوے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی (نفسانی) خواہشوں پر چلتا ہے (یعنی تم ایسے شخص کے اثر سے قیامت کے لئے تیاری کرنے سے

بے فکر نہ ہوجانا) کہیں تم (اس بے فکری کی وجہ سے) تباہ نہ ہوجاؤ۔

معارف و مسائل

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى، سابقہ آیات میں قرآن کریم کی عظمت اور اس کے ضمن میں تعظیم رسول کا بیان ہوا تھا اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ اس مناسبت سے ذکر کیا گیا کہ منصب رسالت و دعوت کی ادائیگی میں جو مشکلات اور تکلیفیں پیش آیا کرتی ہیں اور انبیاء سابقین نے ان کو برداشت کیا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں آجائیں تاکہ آپ اس کے لئے پہلے سے مستعد اور تیار ہو کر ثابت قدم رہیں جیسا کہ ایک آیت میں ارشاد ہے وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ، یعنی رسولوں کے یہ سب قصے ہم آپ سے اس لئے بیان کرتے ہیں تاکہ آپ کا قلب مضبوط ہوجائے اور منصب نبوت کا بار اٹھانے کے لئے تیار ہوجائے۔

اور موسیٰ علیہ السلام کا یہ قصہ جو یہاں مذکور ہے اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ جب وہ مدین پہنچ کر حضرت شعیب علیہ السلام کے مکان پر اس معاہدہ کے ساتھ مقیم ہوگئے کہ آٹھ یا دس سال تک ان کی خدمت کریں گے اور انہوں نے تفسیر بحر محیط وغیرہ کی روایت کے مطابق ابعد الاجلین یعنی دس سال پورے کرلئے تو شعیب علیہ السلام سے رخصت چاہی کہ میں اب اپنی والدہ اور بہن سے ملنے کے لئے مصر جاتا ہوں اور جس خطرہ کی وجہ سے مصر چھوڑا تھا کہ فرعونی سپاہی ان کی گرفتاری اور قتل کے درپے تھے عرصہ دراز گزر جانے کے بعد اب وہ خطرہ بھی باقی نہ رہا تھا۔ شعیب علیہ السلام نے ان کو مع اہلیہ یعنی اپنی صاحبزادی کے کچھ مال اور سامان دے کر رخصت فرما دیا راستہ میں ملک شام کے بادشاہوں سے خطرہ تھا اس لئے عام راستہ چھوڑ کر غیر معروف راستہ اختیار کیا۔ موسم سردی کا تھا اور اہلیہ محترمہ حاملہ قریب الولادت تھیں کہ صبح شام میں ولادت کا احتمال تھا۔ غیر معروف راستہ اور جنگل میں راستہ سے ہٹ کر طور پہاڑ کی مغربی اور داہنی سمت میں جا نکلے، رات اندھیری سردی برفانی تھی اسی حال میں اہلیہ کو درد زہ شروع ہوگیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے سردی سے حفاظت کے لئے آگ جلانا چاہا۔ اس زمانے میں دیا سلائی (ماچس) کے بجائے چقماق پتھر استعمال کیا جاتا تھا جس کو مارنے سے آگ پیدا ہوجاتی تھی اس کو استعمال کیا مگر اس سے آگ نہ نکلی۔ اسی حیرانی و پریشانی کے عالم میں کوہ طور پر آگ نظر آئی جو درحقیقت نور تھا تو گھر والوں سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے وہاں جاتا ہوں تاکہ تمہارے لئے آگ لاؤں اور ممکن ہے کہ آگ کے پاس کوئی راستہ جاننے والا مل جائے تو راستہ بھی معلوم کرلوں۔ گھر والوں میں اہلیہ محترمہ کا ہونا تو متعین ہے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خادم بھی ساتھ تھا وہ بھی اس

خطاب میں داخل ہے بعض روایات میں ہے کہ کچھ لوگ رفیق سفر بھی ساتھ تھے مگر راستہ بھولنے میں یہ اُن سے جُدا ہو گئے تھے۔ (بحر محیط)

فَلَمَّآ اَتٰىهَا، یعنی جو آگ دُور سے دیکھی جب اُس کے پاس پہنچے۔ مسند احمد وغیرہ میں وہب بن مُنَبِّہؒ کی روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اس آگ کی طرف چلے اور اسکے قریب پہنچے تو ایک عجیب حیرت انگیز منظر دیکھا کہ ایک بڑی آگ ہے جو ایک ہرے بھرے درخت کے اوپر شعلے مار رہی مگر حیرت یہ ہے کہ اُس درخت کی کوئی شاخ یا پتہ جلتا نہیں بلکہ آگ نے درخت کے حُسن اور تری و تازگی اور رونق میں اور زیادتی کر دی ہے۔ یہ حیرت انگیز منظر کچھ دیر تک اس انتظار میں دیکھتے رہے کہ شاید کوئی چنگاری آگ کی زمین پر گرے تو یہ اُٹھالیں۔ جب دیر تک ایسا نہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے گھاس وغیرہ کے کچھ تنکے جمع کر کے اُس آگ کے قریب کیا کہ اِنہیں آگ لگ جائیگی تو ان کا کام ہو جائے گا مگر جب یہ گھانس پھونس آگ کے قریب کئے تو آگ پیچھے ہٹ گئی، اور بعض روایات میں ہے کہ آگ اُن کی طرف بڑھی یہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے، بہرحال آگ حاصل کرنے کا مطلب پورا نہ ہوا۔ یہ عجیب و غریب آگ سے حیرت کے عالم میں تھے کہ ایک غیبی آواز آئی (روح) یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ کے دامن میں پیش آیا جو ان کی داہنی جانب تھا اور جس کا نام طُوٰی تھا۔

نُوْدِیَ یٰمُوْسٰىٓ اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ، بحر محیط، روح المعانی وغیرہ میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ آواز اس طرح سُنی کہ ہر جانب سے یکساں آرہی تھی اسکی کوئی جہت متعین نہیں تھی اور سُننا بھی ایک عجیب انداز سے ہوا کہ صرف کانوں سے نہیں بلکہ تمام اعضاء بدن سے سُنا گیا جو ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آواز کا حاصل یہ تھا کہ جس چیز کو آپ آگ سمجھ رہے ہیں وہ آگ نہیں اللہ تعالیٰ کی ایک تجلی ہے اور اسمیں فرمایا کہ میں ہی آپ کا رب ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس آواز کے متعلق یہ یقین کس طرح ہوا کہ حق تعالیٰ ہی کی آواز ہے؟ اسکا اصل جواب تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اُن کے قلب کو اس پر مطمئن کر دیا کہ وہ یقین کریں کہ یہ آواز حق تعالیٰ ہی کی ہے دوسرے اس آگ کے حیرت انگیز حالات کہ درخت کو جلانے کے بجائے اسکی تازگی اور حُسن بڑھا رہی ہے اور آواز بھی عام لوگوں کی آواز کی طرح نہیں کہ ایک سمت سے آئے بلکہ ہر طرف سے یہ آواز یکساں سُنی گئی دوسرے صرف کانوں نے نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء جو سُننے کیلئے وضع نہیں ہوئے سب اسکی سماعت میں شریک تھے اس سے بھی سمجھا گیا کہ حق تعالیٰ کیطرف سے یہ آواز ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کا کلام لفظی بلا واسطہ سُنا

روح المعانی میں بحوالہ مسند احمد وہب کی روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جب ندا یا موسیٰ کے لفظ سے دی گئی

تو انھوں نے لبیک کہہ کر جواب دیا اور عرض کیا کہ میں آواز سن رہا ہوں مگر آواز دینے والے کی جگہ معلوم نہیں، آپ کہاں ہیں تو جواب آیا کہ میں تیرے اوپر، سامنے، پیچھے اور تیرے ساتھ ہوں پھر عرض کیا کہ میں یہ کلام خود آپ کا سن رہا ہوں یا آپ کے بھیجے ہوئے کسی فرشتہ کا؟ تو جواب آیا کہ میں خود ہی آپ سے کلام کر رہا ہوں۔ اس پر صاحب روح فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ کلام لفظی بلا واسطہ فرشتہ کے خود سنا ہے جیسا کہ اہل السنۃ والجماعت میں سے ایک جماعت کا مسلک یہی ہے کہ کلام لفظی بھی قدیم ہونے کے باوجود سنا جا سکتا ہے اس پر جو شبہ حدوث کا کیا جاتا ہے اسکا جواب اُن کی طرف سے یہ ہے کہ کلام لفظی اسوقت حادث ہوتا ہے جبکہ وہ مادی زبان سے ادا کیا جائے جس کے لئے جسم، سمت، جہت شرط ہے، نیز سننے کیلئے صرف کان مخصوص ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس طرح سنا کہ نہ آواز کی کوئی جہت وسمت تھی اور نہ سننے کے لئے صرف کان مخصوص تھے سارے اعضا سن رہے تھے، ظاہر ہے یہ صورت احتمال حدوث سے پاک ہے۔ واللہ اعلم

مقام ادب میں جوتے اُتار دینا ادب کا مقتضا ہے! فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ، جوتے اُتارنے کا حکم یا تو اس لئے دیا گیا کہ مقام ادب ہے اور جوتا اُتار کر ننگے پاؤں ہو جانا مقتضائے ادب ہے اور یا اس لئے کہ جوتے مُردار کی کھال کے بنے ہوئے تھے جیسا کہ بعض روایات میں ہے حضرت علیؓ اور حسن بصریؒ اور ابن جریجؒ سے وجہ اول ہی منقول ہے اور جوتا اُتارنے کی مصلحت یہ تبلائی تاکہ آپ کے قدم اس مبارک وادی کی مٹی سے لگ کر اس کی برکت حاصل کریں اور بعض نے فرمایا کہ یہ حکم خشوع اور تواضع کی صورت بنانے کے لئے ہوا جیسا کہ سلف صالحین طواف بیت اللہ کے وقت ایسا ہی کرتے تھے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بشیر بن خصاصیہ کو قبروں کے درمیان جوتے پہن کر چلتے دیکھا تو فرمایا اذا کنت فی مثل ھذا المکان فاخلع نعلیك یعنی جب تم اس جیسے مکان سے گزرو (جسکا احترام مقصود ہے) تو اپنے جوتے اُتار لو۔

جوتے اگر پاک ہوں تو ان میں نماز درست ہو جانے پر سب فقہاء کا اتفاق ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے پاک جوتے پہن کر نماز پڑھنا صحیح روایات سے ثابت بھی ہے مگر عام عادت و سنت یہی معلوم ہوتی ہے کہ جوتے اُتار کر نماز پڑھی جاتی تھی کہ وہ اقرب الی التواضع ہے۔ (قرطبی)

اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى، حق تعالےٰ نے زمین کے خاص خاص حصوں کو اپنی حکمت سے خاص امتیاز اور شرف بخشا ہے جیسے بیت اللہ۔ مسجد اقصٰی۔ مسجد نبوی

اسی طرح وادیٔ طویٰ بھی اُنہی مقاماتِ مقدسہ میں ہے جو کوہِ طور کے دامن میں ہے (قرطبی)

قرآن سُننے کا ادب فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ ، حضرت وہب بن مُنبہ سے منقول ہے کہ قرآن سُننے کے آداب میں سے یہ ہے کہ انسان اپنے تمام اعضاء کو فضول حرکت سے روکے کہ کسی دوسرے شغل میں کوئی عضو بھی نہ لگے اور نظر نیچی رکھے اور کلام سمجھنے کی طرف دھیان لگائے اور جو شخص اس ادب کے ساتھ کوئی کلام سُنتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکو اسکے سمجھنے کی بھی توفیق دیدیتے ہیں۔ (قرطبی)

إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي ، اس کلام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دین کے تمام اُصول کی تعلیم دیدی گئی یعنی توحید، رسالت، آخرت فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ میں رسالت کیطرف اشارہ ہے اور فَاعْبُدْنِي کے معنی یہ ہیں کہ صرف میری عبادت کریں، میرے سوا کسی کی عبادت نہ کریں یہ مضمون توحید کا ہوگیا آگے إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ میں آخرت کا بیان ہے۔ فَاعْبُدْنِي کے حکم میں اگرچہ نماز کا حکم بھی داخل ہے لیکن اسکو جداگانہ اسلئے بیان فرمادیا کہ نماز تمام عبادات میں افضل و اعلیٰ بھی ہے اور حدیث کی تصریح کے مُطابق دین کا عمود اور ایمان کا نور ہے اور ترکِ نماز کافروں کی علامت ہے۔

أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي کا مطلب یہ ہے کہ نماز کی رُوح ذکر اللہ ہے اور نماز اوّل سے آخر تک ذکر ہی ذکر ہے زبان سے بھی دل سے بھی اور دوسرے اعضاء سے بھی اسلئے نماز میں ذکر اللہ سے غفلت نہ ہونی چاہئیے اور اسکے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ اگر کوئی شخص نیند میں مغلوب ہوگیا یا کسی کام میں لگ کر بھول گیا اور نماز کا وقت نکل گیا تو جب نیند سے بیدار ہو یا بھول پر تنبہ ہو اور نماز یاد آئے اُسی وقت نماز کی قضاء پڑھ لے جیسا کہ بعض روایاتِ حدیث میں آیا ہے۔

أَكَادُ أُخْفِيهَا ، یعنی قیامت کے معاملہ کو میں تمام مخلوقات سے مخفی رکھنا چاہتا ہوں یہاں تک کہ انبیاء اور فرشتوں سے بھی اور اکاد سے اس طرف اشارہ ہے کہ اگر لوگوں کو قیامت و آخرت کی فکر دلا کر ایمان و عمل صالح پر اُبھارنا مقصود نہ ہوتا تو اتنی بات بھی ظاہر نہ کیجاتی کہ قیامت آنے والی ہے جیسا کہ اُوپر آیت میں آیا ہے إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ ، مقصود اس سے اخفائے قیامت میں مُبالغہ کرنا ہے۔

لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ (تاکہ جزاء دیا جائے ہر نفس اپنے عمل کی) اس جملہ کا تعلق اگر لفظ آتِيَةٌ سے ہے تو معنی ظاہر ہیں کہ قیامت کے آنے کی حکمت و مصلحت یہ ہے کہ دُنیا تو دارالجزاء نہیں یہاں نیک و بد عمل کی جزاء کسی کو نہیں ملتی، اور اگر کبھی دُنیا میں کچھ جزاء مل بھی جاتی ہو تو وہ عمل کی پوری جزاء نہیں ہوتی ایک نمونہ سا ہوتا ہے اسلئے ضروری ہے کہ کوئی ایسا وقت آئے جہاں ہر نیک و بد عمل کی جزاء و سزا پوری دی جائے۔

اور اگر جملہ کا تعلق اَکَادُ اُخْفِیْھَا سے قرار دیا جائے تو یہ بھی ممکن ہے اور معنے یہ ہوں گے کہ قیامت اور موت کے وقت اور تاریخ کو مخفی رکھنے میں حکمت یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے عمل اور سعی میں لگے رہیں اپنی شخصی قیامت یعنی موت اور پورے عالم کی قیامت یعنی حشر کے دن کو دُور سمجھ کر غافل نہ ہو بیٹھیں۔ (مظہری)

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا، اسمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے تنبیہ کی گئی ہے کہ ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ آپ کافروں اور بے ایمانوں کے کہنے سے قیامت کے معاملے میں غفلت برتنے لگیں اور وہ آپ کی ہلاکت کا سبب بن جائے، ظاہر ہے کہ کسی نبی و رسول سے جو معصوم ہے یہ غفلت نہیں ہوسکتی اسکے باوجود ایسا خطاب کرنا دراصل اُن کی اُمّت اور عام مخلوق کو سُنانا ہے کہ جب اللہ کے پیغمبروں کو بھی ایسی تاکید کی جاتی ہے تو ہمیں اسکا کتنا اہتمام کرنا چاہیئے۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ﴿١٧﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا

اور یہ کیا ہے تیرے داہنے ہاتھ میں اے موسیٰ بولا یہ میری لاٹھی ہے اس پر ٹیک

عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرٰى ﴿١٨﴾

لگاتا ہوں اور پتے جھاڑتا ہوں اس سے اپنی بکریوں پر اور میرے اسمیں چند کام ہیں اور بھی

قَالَ أَلْقِهَا يٰمُوسٰى ﴿١٩﴾ فَأَلْقٰهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿٢٠﴾

فرمایا ڈالدے اس کو اے موسیٰ تو اُس کو ڈالدیا، پھر اُسی وقت وہ سانپ ہوگیا دوڑتا ہوا

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولٰى ﴿٢١﴾

فرمایا پکڑلے اُس کو اور مت ڈر ہم ابھی پھیر دیں گے اس کو پہلی حالت پر

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ

اور ملالے اپنا ہاتھ اپنی بغل سے کہ نکلے سفید ہو کر بلا عیب

سُوٓءٍ آيَةً أُخْرٰى ﴿٢٢﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ آيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿٢٣﴾

یہ نشانی دوسری تاکہ دکھاتے جائیں ہم تجھ کو اپنی نشانیاں بڑی

اِذْهَبْ إِلٰى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغٰى ﴿٢٤﴾ ع

جا طرف فرعون کی کہ اُس نے بہت سر اُٹھایا

خلاصۂ تفسیر

اور (حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ بھی فرمایا کہ) یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا چیز ہے اے موسیٰ! انھوں نے کہا کہ یہ میری لاٹھی ہے میں (کبھی) اس پر سہارا لگاتا ہوں اور (کبھی) اس سے اپنی بکریوں پر (درختوں کے) پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے اور بھی کام (نکلتے) ہیں (مثلاً کندھے پر رکھ کر اسباب وغیرہ لٹکا لینا یا اس سے موذی جانوروں کو دفع کرنا وغیرہ وغیرہ) ارشاد ہوا کہ اس (عصا) کو (زمین پر) ڈال دو اے موسیٰ سو انھوں نے اس کو (زمین پر) ڈال دیا تو یکایک وہ (خدا کی قدرت سے) ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گیا (جس سے موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے) ارشاد ہوا کہ اس کو پکڑ لو اور ڈرو نہیں، ہم ابھی (پکڑتے ہی) اس کو اس کی پہلی حالت پر کر دیں گے (یعنی یہ پھر عصا بن جاویگا اور تم کو کوئی گزند نہ پہنچے گا، ایک معجزہ تو یہ ہوا) اور (دوسرا معجزہ اور دیا جاتا ہے کہ) تم اپنا (داہنا) ہاتھ اپنی (بائیں) بغل میں دے لو (پھر نکالو) وہ بلا کسی عیب (یعنی بلا کسی مرض برص وغیرہ) کے (نہایت روشن ہوکر) نکلے گا کہ یہ دوسری نشانی (ہماری قدرت اور تمہاری نبوت کی) ہوگی (اور یہ حکم لاٹھی کے ڈالدینے اور ہاتھ کو گریبان میں دینے کا اس لئے ہے) تاکہ ہم تم کو اپنی (قدرت کی) بڑی نشانیوں میں سے بعض نشانیاں دکھلائیں (تو اب یہ نشانیاں لیکر) تم فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے (کہ خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تم اس کو تبلیغ توحید کرو اور اگر نبوت میں شبہ کرے تو یہی معجزے دکھلا دو)

معارف و مسائل

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى، بارگاہِ رب العالمین کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ سوال کرنا کہ آپکے ہاتھ میں کیا چیز ہے موسیٰ علیہ السلام پر لطف و کرم اور خاص مہربانی کا آغاز ہے تاکہ حیرت انگیز مناظر کے دیکھنے اور کلام ربانی کے سننے سے جو ہیبت اور دہشت اُن پر طاری تھی وہ دُور ہو جائے یہ ایک دوستانہ انداز کا خطاب ہے کہ تمہارے ہاتھ میں کیا چیز ہے اس کے علاوہ اس سوال میں یہ حکمت بھی ہے کہ آگے اس عصا کو جو اُن کے ہاتھ میں تھی ایک سانپ اور اژدھا بنانا تھا اس لئے پہلے ان کو متنبہ کر دیا کہ دیکھ لو تمہارے ہاتھ میں کیا چیز ہے جب اُنھوں نے دیکھ لیا کہ وہ لکڑی کا عصا ہے تب اُس کو سانپ بنانے کا معجزہ ظاہر کیا گیا ورنہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ میں رات کے اندھیرے میں شاید لاٹھی کی جگہ سانپ ہی پکڑ لایا ہوں۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال صرف اتنا ہوا تھا کہ ہاتھ میں کیا چیز ہے اسکا اتنا جواب کافی تھا کہ لاٹھی ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس جگہ تین باتیں اصل سوال کے جواب سے زیادہ عرض کیں اول یہ کہ یہ عصا میری ہے، دوسرے یہ کہ میں اس سے بہت سے کام لیتا ہوں ایک یہ کہ اس پر ٹیک لگا لیتا ہوں دوسرے یہ کہ اس سے اپنی بکریوں کے لئے درختوں کے پتے جھاڑتا ہوں تیسرے یہ کہ اس سے اور بھی میرے بہت سے کام نکلتے ہیں، اس طویل اور تفصیلی جواب میں عشق و محبت اور اس کے ساتھ رعایت ادب کی جامعیت کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ عشق و محبت کا تقاضا ہے کہ جب محبوب مہربان ہو کر متوجہ ہے تو بات دراز کی جائے تاکہ اسکا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے مگر ساتھ ہی ساتھ ادب کا مقتضا یہ بھی ہے کہ بہت بے تکلف ہو کر کلام زیادہ طویل بھی نہ ہو۔ اس دوسرے مقتضا پر عمل کرنے کے لئے اخیر میں اختصار کر دیا کہ وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ، یعنی میں اس سے اور بھی بہت سے کام لیا کرتا ہوں اور ان کاموں کی تفصیل بیان نہیں کی (روح و مظہری)

تفسیر قرطبی میں اس آیت سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ ضرورت اور مصلحت سے ایسا کرنا بھی جائز ہے کہ جو بات سوال میں نہ پوچھی گئی ہو اس کو بھی جواب میں بیان کر دیا جائے۔

مسئلہ۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہاتھ میں عصا رکھنا سنتِ انبیاء ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی سنت تھی اور اسمیں بے شمار دینی دنیوی فوائد ہیں۔ (قرطبی)

فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَىٰ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں جو عصا تھی بحکم ربانی اس کو ڈالدیا تو وہ سانپ بن گئی، اس سانپ کے بارے میں قرآن کریم کی آیات میں ایک جگہ تو یہ آیا ہے كَأَنَّهَا جَانٌّ، جان عربی لغت میں چھوٹے اور پتلے سانپ کو کہتے ہیں۔ اور دوسری جگہ آیا ہے فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ، ثعبان کے معنے اژدہا اور بڑے موٹے سانپ کے ہیں، اور اس آیت میں جو لفظ حَيَّةٌ آیا ہے یہ عام ہے ہر چھوٹے بڑے اور پتلے موٹے سانپ کو حیۃ کہا جاتا ہے۔ تطبیق ان آیات کی اس طرح ہو سکتی ہے کہ یہ سانپ شروع میں پتلا اور چھوٹا ہو پھر موٹا اور بڑا ہو گیا، یا یہ کہ سانپ تو بڑا اور اژدہا ہی تھا مگر اس کو جان یعنی ہلکا چھوٹا سانپ اس مناسبت سے کہا گیا کہ یہ عظیم الشان اژدہا سُرعت سیر کے اعتبار سے چھوٹے سانپ کی طرح تھا یعنی عام عادت کے خلاف کہ بڑے اژدہے تیز نہیں چل سکتے یہ بڑی تیزی سے چلتا تھا اور آیت میں لفظ كَأَنَّهَا سے جو تشبیہ کے معنی میں ہے اسطرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے کہ جانّ سے اسکو تشبیہ ایک خاص وصف سرعت سیر میں دی گئی ہے۔ (مظہری)

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ، جناح، دراصل جانور کے بازو کو کہا جاتا ہے

اس جگہ اپنے بازو کے یعنی بغل میں ہاتھ لگا لینے کا حکم ہوا ہے تاکہ یہ دوسرا معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا جاوے کہ جب بغل کے نیچے ہاتھ ڈال کر نکالیں تو آفتاب کی طرح چمکنے لگے حضرت ابن عباسؓ سے تخرج بیضاء کی یہی تفسیر منقول ہے۔ (مظہری)

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ، اپنے رسول کو دو عظیم الشان معجزوں سے مسلح کرنے کے بعد ان کو حکم دیا گیا کہ فرعون سرکش کو دعوت ایمان دینے کے لئے چلے جائیں۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿۲۵﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۲۶﴾

بولا اے رب کشادہ کر میرا سینہ اور آسان کر میرا کام

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾ وَاجْعَلْ

اور کھول دے گرہ میری زبان سے کہ سمجھیں میری بات اور دے مجھ کو

لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿۳۱﴾

ایک کام بٹانے والا میرے گھر کا ہارون میرا بھائی اس سے مضبوط کر میری کمر

وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۳۲﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَّ

اور شریک کر اسکو میرے کام میں کہ تیری پاک ذات کا بیان کریں ہم بہت سا اور

نَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿۳۵﴾ قَالَ

یاد کریں ہم تجھ کو بہت سا تو تو ہے ہم کو خوب دیکھتا فرمایا

قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾

ملا تجھ کو تیرا سوال اے موسیٰ

خلاصۂ تفسیر

(جب موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ مجھ کو پیغمبر بنا کر فرعون کی فہمائش کے لئے بھیجا جارہا ہے تو اس وقت اس منصب عظیم کے مشکلات کی آسانی کے لئے درخواست کی اور) عرض کیا کہ اے میرے رب میرا حوصلہ (اور زیادہ) فراخ کر دیجئے (کہ تبلیغ میں انقباض یا تکذیب مخالفت میں ضیق نہ ہو) اور میرا (یہ) کام (تبلیغ کا) آسان فرما دیجئے (کہ اسباب تبلیغ کے مجتمع اور موانع تبلیغ کے مرتفع ہو جاویں) اور میری زبان پر سے بستگی (لکنت کی) ہٹا دیجئے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں، اور میرے واسطے میرے کنبے میں سے ایک معاون مقرر کر دیجئے یعنی ہارون کو جو میرے بھائی ہیں اُن کے ذریعہ سے میری قوت کو مستحکم کر دیجئے اور اُن کو میرے (اس تبلیغ کے)

کام میں شریک کر دیجئے (یعنی ان کو بھی نبی بنا کر مامور بالتبلیغ کیجئے کہ ہم دونوں تبلیغ کریں اور میرے قلب کو قوت پہنچے) تاکہ ہم دونوں (مل کر تبلیغ و دعوت کے وقت) آپ کی خوب کثرت سے پاکی (شرک و نقائص سے) بیان کریں اور آپ (کے اوصاف و کمال) کا خوب کثرت سے ذکر کریں (کیونکہ اگر دو شخص مبلغ ہونگے تو ہر شخص کا بیان دوسرے کی تائید سے وافر اور مشکا ثر ہوگا) بیشک آپ ہم کو (اور ہمارے حال کو) خوب دیکھ رہے ہیں (اس حالت سے ہماری احتیاج اس امر کی کہ ایک دوسرے کے معاون ہوں آپ کو معلوم ہے) ارشاد ہوا کہ تمہاری (ہر) درخواست (جو کہ رَبِّ اشْرَحْ لِي الخ میں مذکور ہے) منظور کی گئی اے موسیٰ۔

معارف و مسائل

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب کلام الٰہی کا شرف خاص حاصل ہوا اور منصب نبوت و رسالت عطا ہوا تو اپنی ذات اور اپنی طاقت پر بھروسہ چھوڑ کر خود حق تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہوگئے کہ اس منصب عظیم کی ذمہ داریاں اُسی کی مدد سے پوری ہو سکتی ہیں اور اُن پر جو مصائب اور شدائد آنا لازمی ہیں اُن کی برداشت، کا حوصلہ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہو سکتا ہے اسلئے اسوقت پانچ دُعائیں مانگیں، پہلی دُعا اِشْرَحْ لِي صَدْرِي، یعنی میرا سینہ کھول دے اسمیں ایسی وسعت عطا فرما دے جو علوم نبوت کا متحمل ہو سکے اور دعوتِ ایمان لوگوں تک پہنچانے میں جو اُن کی طرف سے سخت سُست سُننا پڑتا ہے اس کو برداشت کرنا بھی اسمیں شامل ہے۔

دوسری دُعا وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي (یعنی میرا کام میرے لئے آسان کر دے) یہ فہم و فراست بھی نبوت ہی کا ثمرہ تھا کہ کسی کام کا مشکل یا آسان ہونا بھی ظاہری تدبیروں کے تابع نہیں یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطیہ ہوتا ہے وہ اگر چاہتے ہیں تو کسی کے لئے مشکل سے مشکل بھاری سے بھاری کام آسان کر دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں تو آسان سے آسان کام مشکل ہو جاتا ہے اسی لئے حدیث شریف میں مسلمانوں کو اس دعا، کی تلقین کی گئی ہے کہ اپنے کاموں کے لئے اللہ تعالیٰ سے اسطرح دُعا مانگا کریں اَللّٰهُمَّ الْطُفْ بِنَا فِي تَيْسِيرِ كُلِّ عَسِيرٍ فَإِنَّ تَيْسِيرَ كُلِّ عَسِيرٍ عَلَيْكَ يَسِيرٌ (یعنی یا اللہ ہم پر مہربانی فرما ہر مشکل کام کو آسان کرنے کے لئے کیونکہ ہر مشکل کام کا آسان کر دینا آپ کے قبضہ میں ہے۔

تیسری دُعا، وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي، یعنی کھول دے میری زبان کی بندش تاکہ لوگ میرا کلام سمجھنے لگیں۔ اس بندش کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دودھ پینے کے زمانے میں تو اپنی والدہ ہی کے پاس رہے اور دربار فرعون سے اُن کو دودھ

پلانیکا وظیفہ اور صلہ ملتا رہا۔ جب دودھ چھڑایا گیا تو فرعون اور اس کی بیوی آسیہ نے ان کو اپنا بیٹا بنالیا تھا اس لئے والدہ سے واپس لے کر اپنے یہاں پالنے لگے۔ اسی عرصہ میں ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی داڑھی پکڑلی اور اسکے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا اور بعض روایات میں ہے کہ ایک چھڑی ہاتھ میں تھی جس سے کھیل رہے تھے وہ فرعون کے سر پر ماری، فرعون کو غصہ آیا اور اس کے قتل کرنے کا ارادہ کرلیا۔ بیوی آسیہ نے کہا کہ شاہا، آپ بچے کی بات پر خیال کرتے ہیں جس کو کسی چیز کی عقل نہیں اور اگر آپ چاہیں تو تجربہ کرلیں کہ اس کو کسی بھلے بُرے کا امتیاز نہیں۔ فرعون کو تجربہ کرانے کے لئے ایک طشت میں آگ کے انگارے اور دوسرے میں جواہرات لاکر موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رکھ دیئے خیال یہ تھا کہ بچہ ہے یہ بچوں کی عادت کے مطابق آگ کے انگارے کو روشن خوبصورت سمجھ کر اُس کی طرف ہاتھ بڑھائے گا جواہرات کی رونق بچوں کی نظر میں ایسی نہیں ہوتی کہ اس طرف توجہ دیں، اس سے فرعون کو تجربہ ہوجائیگا کہ اس نے جو کچھ کیا وہ بچپن کی نادانی سے کیا۔ مگر یہاں تو کوئی عام بچہ نہیں تھا، خدا تعالیٰ کا ہونے والا رسُول تھا جن کی فطرت اوّل پیدائش سے ہی غیر معمولی ہوتی ہے موسیٰ علیہ السلام نے آگ کے بجائے جواہرات پر ہاتھ ڈالنا چاہا مگر جبرئیل امین نے اُن کا ہاتھ آگ کے طشت میں ڈالدیا اور اُنھوں نے آگ کا انگارہ اُٹھا کر منہ میں رکھ لیا، جس سے زبان جل گئی اور فرعون کو یقین آگیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ عمل کسی شرارت سے نہیں بچپن کی بےخبری کے سبب سے تھا۔ اسی واقعہ سے موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں ایک قسم کی تکلیف پیدا ہوگئی اسی کو قرآن میں عُقدہ کہا گیا ہے اور اسی کو کھولنے کی دُعا حضرت موسیٰؑ نے مانگی (مظہری و قرطبی)۔

پہلی دو دُعائیں تو عام تھیں سب کا موں میں اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرنے کے لئے تیسری دُعا میں اپنی ایک محسوس کمزوری کے ازالہ کی درخواست کی گئی کہ رسالت و دعوت کیلئے زبان کی طلاقت اور فصاحت بھی ایک ضروری چیز ہے۔ آگے ایک آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی یہ سب دُعائیں قبول کرلی گئیں جسکا ظاہر یہ ہے کہ زبان کی یہ لکنت بھی ختم ہوگئی ہوگی مگر خود موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون کو اپنے ساتھ رسالت میں شریک کرنے کی جو دُعا کی ہے اُسمیں یہ بھی فرمایا ہے کہ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا، یعنی ہارون علیہ السلام زبان کے اعتبار سے بہ نسبت میرے زیادہ فصیح ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اثر لکنت کا کچھ باقی تھا۔ نیز فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو عیوب لگائے اُن میں یہ بھی کہا کہ وَلَا يَكَادُ يُبِيْنُ یعنی یہ اپنی بات کو صاف بیان نہیں کرسکتے۔ بعض حضرات نے اسکا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود اپنی دُعا میں اتنی ہی بات مانگی تھی کہ زبان کی بندش اتنی کھل جائے

کہ لوگ میری بات سمجھ لیا کریں، اتنی لکنت دور کردی گئی کچھ معمولی اثر پھر بھی رہا ہو تو وہ اس دعا کی قبولیت کے منافی نہیں چوتھی دعا وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ (یعنی بنادے میرا ایک وزیر میرے ہی خاندان میں سے) پہلی تین دعائیں اپنے نفس اور ذات سے متعلق تھیں یہ چوتھی دعا اعمالِ رسالت کو انجام دینے کے لئے اسباب جمع کرنے سے متعلق ہے اور ان اسباب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سب سے پہلے اور اہم اس کو قرار دیا کہ ان کا کوئی نائب اور وزیر ہو جو اُن کی مدد کرسکے۔ وزیر کے معنی ہی لغت میں بوجھ اُٹھانے والے کے ہیں، وزیر سلطنت چونکہ اپنے امیر و بادشاہ کا بار ذمہ داری سے اُٹھاتا ہے اسلئے اسکو وزیر کہتے ہیں۔ اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کمالِ عقل معلوم ہوا کہ کسی کام یا تحریک کے چلانے کے لئے سب سے پہلی چیز انسان کے اعوان و انصار ہیں وہ منشار کے مطابق ملجائیں تو آگے سب کام آسان ہو جاتے ہیں اور وہ غلط ہوں تو سارے اسباب و سامان بھی بے کار ہو کر رہ جاتے ہیں آجکل کی سلطنتوں اور حکومتوں میں جتنی خرابیاں مشاہدہ میں آئی ہیں غور کریں تو ان سب کا اصلی سبب امیر ریاست کے اعوان و انصار اور وزرار و امرار کی خرابی بے عملی یا بدعملی یا عدم صلاحیت ہے۔

اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حق تعالے جب کسی شخص کو کوئی حکومت و امارت سپرد فرماتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ یہ اچھے کام کرے حکومت کو اچھی طرح چلائے تو اُس کو نیک وزیر دیدیتے ہیں جو اس کی مدد کرتا ہے اگر یہ کسی ضروری کام کو بھول جائے تو وزیر یاد دلادیتا ہے اور جس کام کا وہ ارادہ کرے وزیر اس میں اسکی مدد کرتا ہے (رواہ النسائی عن القاسم بن محمد)

اس دعا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو وزیر طلب فرمایا اسکے ساتھ ایک قید مِنْ اَهْلِیْ کی بھی لگادی کہ یہ وزیر میرے خاندان و اقارب میں سے ہو کیونکہ اپنے خاندان کے آدمی کے عادات و اخلاق دیکھے بھالے اور طبائع میں باہم اُلفت و مناسبت ہوتی ہے جس سے اس کام میں مدد ملتی ہے بشرطیکہ اس کو کام کی صلاحیت میں دوسروں سے فائق دیکھ کر لیا گیا ہو۔ محض اقربا پروری کا داعیہ نہ ہو۔ اس زمانے میں چونکہ عام طور پر دیانت و اخلاص مفقود اور اصل کام کی فکر غائب نظر آتی ہے۔ اس لئے کسی امیر کے ساتھ اس کے خویش و عزیز کو وزیر یا نائب بنانے کو مذموم سمجھا جاتا ہے اور جہاں دیانتداری پر بھروسہ پورا ہو تو کسی صالح و اصلح خویش و عزیز کو کوئی عہدہ سُپرد کر دینا کوئی عیب نہیں بلکہ مہماتِ اُمور کی تکمیل کیلئے زیادہ بہتر ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین عموماً وہی حضرات ہوئے جو بیت نبوت کے ساتھ رشتہ داریوں کے تعلقات بھی رکھتے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعا میں پہلے تو عام بات فرمائی کہ میرے خاندان

اہل میں سے ہو، پھر متعین کر کے فرمایا کہ وہ میرا بھائی ہارون ہے جس کو میں وزیر بنانا چاہتا ہوں تاکہ میں اُس سے مہماتِ رسالت میں قوت حاصل کرسکوں۔

حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تین یا چار سال بڑے تھے، اور تین سال پہلے ہی وفات پائی۔ جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا مانگی وہ مصر میں تھے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دُعا پر اُن کو بھی نبی بنا دیا تو بذریعہ فرشتہ اُن کو بھی مصر ہی میں اسکی اطلاع ملگئی جب موسیٰ علیہ السلام کو مصر میں فرعون کی تبلیغ کے لئے روانہ کیا گیا تو اُن کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ وہ مصر سے باہر اُن کا استقبال کریں اور ایسا ہی واقع ہوا۔ (قرطبی)

وَ اَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارونؑ کو اپنا وزیر بنانا چاہا تو یہ اختیار خود اُن کو حاصل تھا تبرکاً حق تعالیٰ کی طرف سے کرنے کی دُعا کی مگر ساتھ ہی وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کو نبوت و رسالت میں اپنا شریک قرار دیں یہ اختیار کسی رسول و نبی کو خود نہیں ہوتا اس لئے اسکی جداگانہ دُعا کی کہ اُن کو میرے کارِ رسالت میں شریک فرمادے آخر میں فرمایا

صالح رفقاء ذکر و عبادت میں بھی مددگار ہوتے ہیں

كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا وَّ نَذْكُرَكَ كَثِیْرًا، یعنی حضرت ہارونؑ کو وزیر اور شریک نبوت بنانے کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم کثرت سے آپ کی تسبیح و ذکر کیا کریں گے۔ یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ تسبیح و ذکر تو ایسی چیز ہے کہ ہر انسان تنہا بھی جتنا چاہے کرسکتا ہے اس کے لئے کسی ساتھی کے عمل کا کیا دخل لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر و تسبیح میں بھی سازگار ماحول اور اللہ والے ساتھیوں کا بڑا دخل ہوتا ہے جس کے ساتھی اللہ والے نہ ہوں وہ اتنی عبادت نہیں کرسکتا جتنی وہ کرسکتا ہے جسکا ماحول اللہ والوں کا اور ساتھی ذاکر شاغل ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص ذکر اللہ میں مشغول رہنا چاہے اسکو سازگار ماحول کی بھی تلاش کرنا چاہیئے۔

دُعائیں یہاں ختم ہوگئیں آخر میں حق تعالیٰ کی طرف سے ان سب دُعاؤں کے قبول ہوجانے کی بشارت دیدی گئی قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ یٰمُوْسٰی، یعنی آپ کی مانگی ہوئی سب چیزیں آپ کو دیدی گئیں۔

وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْكَ مَرَّةً اُخْرٰۤی ﴿۳۷﴾ اِذْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی

اور احسان کیا تھا ہم نے تجھ پر ایک بار اور بھی جب حکم بھیجا ہم نے تیری

اُمِّكَ مَا یُوْحٰۤی ﴿۳۸﴾ اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی التَّابُوْتِ فَاقْذِفِیْهِ

ماں کو جو آگے سُناتے ہیں کہ ڈال اسکو صندوق میں پھر اس کو ڈال دے دریا میں

فِى الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّى وَ

پھر دریا اس کو لے ڈالے کنارے پر اٹھالے اس کو ایک دشمن میرا اور

عَدُوٌّ لَّهُ ۚ وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّى ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى

اس کا اور ڈال دی میں نے تجھ پر محبت اپنی طرف سے اور تاکہ پرورش پائے

عَيْنِىٓ ﴿۳۹﴾ إِذْ تَمْشِىٓ أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلٰى

تو میری آنکھ کے سامنے، جب چلنے لگی تیری بہن اور کہنے لگی میں بتاؤں تم کو ایسا شخص جو اس کو

مَنْ يَّكْفُلُهُ ۖ فَرَجَعْنٰكَ إِلٰىٓ أُمِّكَ كَىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا

پالے پھر پہنچا دیا ہم نے تجھ کو تیری ماں کے پاس کہ ٹھنڈی رہے اسکی آنکھ اور غم

تَحْزَنَ ۚ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ

نہ کھاوے اور تو نے مار ڈالا ایک شخص کو پھر بچا دیا ہم نے تجھ کو اس غم سے اور جانچا ہم نے

فُتُونًا ۚ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِىٓ أَهْلِ مَدْيَنَ ۚ ثُمَّ جِئْتَ

تجھ کو ایک ذرا جانچنا، پھر ٹھہرا رہا تو کئی برس مدین والوں میں پھر آیا تو

عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿۴۰﴾ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِى ﴿۴۱﴾ اِذْهَبْ

تقدیر سے اے موسیٰ اور بنایا میں نے تجھ کو خاص اپنے واسطے جا تو

أَنْتَ وَأَخُوْكَ بِاٰيٰتِى وَلَا تَنِيَا فِى ذِكْرِى ﴿۴۲﴾ اِذْهَبَآ

اور تیرا بھائی میری نشانیاں لے کر اور سستی نہ کریو میری یاد میں جاؤ طرف

إِلٰى فِرْعَوْنَ إِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا

فرعون کی اس نے بہت سر اٹھایا سو کہو اس سے بات نرم

لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾

شاید وہ سوچے یا ڈرے

خلاصۂ تفسیر

ہم تو اور دفعہ اور بھی (اس کے قبل بے درخواست ہی)، تم پر احسان کر چکے ہیں جبکہ ہم نے تمہاری ماں کو وہ بات الہام سے بتلائی جو (بوجہ مہتم بالشان ہونے کے) الہام سے بتلانے کے

(قابل) تھی (وہ) یہ کہ موسیٰ کو (جلاّدوں کے ہاتھ سے بچانے کے لئے) ایک صندوق میں رکھو، پھر ان کو (مع صندوق کے) دریا میں (جس کی ایک شاخ فرعون کے محل تک بھی گئی تھی) ڈالدو پھر دریا اُن کو (مع صندوق کے) کنارہ (کے پاس) تک لے آوے گا کہ (آخر کار) اُن کو ایک ایسا شخص پکڑ یگا جو (کافر ہونے کی وجہ سے) میرا بھی دشمن ہے اور اُن کا بھی دشمن ہے (خواہ فی الحال بوجہ اسکے کہ سب بچوں کو قتل کرتا تھا خواہ آئندہ ان کا خاص طور پر دشمن ہوگا) اور (جب صندوق پکڑا گیا اور تم اسمیں سے نکالے گئے تو) میں نے تمہارے (چہرے کے) اوپر اپنی طرف سے ایک اثر محبت ڈالدیا (تاکہ جو تم کو دیکھے پیار کرے) اور تاکہ تم میری (خاص) نگرانی میں پرورش پاؤ۔ (یہ اسوقت کا قصہ ہے) جبکہ تمہاری بہن (تمہاری تلاش میں فرعون کے گھر) چلتی ہوئی آئیں، پھر (تم کو دیکھ کر اجنبی بن کر) کہنے لگیں (جبکہ تم کسی انّا کا دودھ نہ پیتے تھے) کیا تم لوگوں کو ایسے شخص کا پتہ دُوں جو اس کو (اچھی طرح) پالے رکھے (چنانچہ ان لوگوں نے چونکہ اُن کو تلاش تھی منظور کیا اور تمہاری بہن تمہاری ماں کو بُلا کر لائیں) پھر (اس تدبیر سے) ہم نے تم کو تمہاری ماں کے پاس پھر پہنچا دیا تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور اُن کو غم نہ رہے (جیسے تھوڑے عرصہ تک فراق سے مغموم رہیں) اور (بڑے ہونے کے بعد ایک اور احسان کیا کہ) تم نے (غلطی سے) ایک شخص (قبطی) کو جان سے مار ڈالا (جسکا قصہ سورۂ قصص میں ہے اور مار کر غم ہوا خوفِ عقاب سے بھی اور خوف انتقام سے بھی) پھر ہم نے تم کو اس غم سے نجات دی (خوفِ عقاب سے تو اس طرح کہ استغفار کی توفیق دی اور اس کو قبول کیا اور خوفِ انتقام سے اس طرح کہ مصر سے مدین پہنچا دیا) اور (مدین پہنچنے تک) ہم نے تم کو خوب خوب محنتوں میں ڈالا (اور پھر ان سے خلاصی دی جنکا ذکر سورۂ قصص میں ہے کہ خلاصی دینا بھی منّت ہے اور خود ابتلاء بھی بوجہ اس کے کہ وہ سبب ہے حصولِ اخلاق حمیدہ و ملکاتِ فاضلہ کا مستقل احسان ہے)۔

پھر (مدین پہنچے اور) مدین والوں میں کئی سال رہے پھر ایک خاص وقت پر (جو میرے علم میں تمہاری نبوّت اور ہمکلامی کے لئے مقدر تھا) تم (یہاں) آئے اے موسیٰ اور (یہاں آنے پر) میں نے تم کو اپنے (نبی بنانے کے) لئے منتخب کیا (سو اب) تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں (یعنی معجزات کہ اصل دو معجزے ہیں عصا و ید بیضا اور ہر ایک میں وجوہ اعجاز متعدد ہیں) لے کر (جس موقع کے لئے حکم ہوتا ہے) جاؤ اور میری یادگاری میں (خواہ خلوت میں خواہ تبلیغ کے وقت) سستی مت کرنا (اب موقع جانے کا بتلایا جاتا ہے کہ) دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت نکل چلا ہے پھر (اسکے پاس جاکر) اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ (رغبت سے) نصیحت قبول کرلے یا (عذاب الٰہی سے) ڈر جاوے (اور اس سے مان جاوے)۔

معارف و مسائل

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ ، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو انعامات و عنایاتِ حق اس وقت مبذول ہوئیں کہ شرفِ ہمکلامی سے نوازا گیا، نبوت و رسالت عطا ہوئی، خاص معجزات عطا ہوئے اس کے ساتھ یہاں حق تعالیٰ اپنی وہ نعمتیں بھی اُن کو یاد دلاتے ہیں جو شروع پیدائش سے اسوقت تک زندگی کے ہر دَور میں آپ پر مبذول ہوتی رہیں اور مسلسل آزمائشوں اور جان کے خطروں کے درمیان قدرتِ حق نے کن حیرت انگیز طریقوں سے ان کی حفاظت فرمائی یہ نعمتیں جنکا ذکر آگے آتا ہے زمانہ وقوع کے اعتبار سے پہلی ہیں یہاں جو اُن کو اُخریٰ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ نعمتیں اسکے بعد کی ہیں بلکہ لفظ اُخریٰ کبھی مطلقاً دوسرے کے معنے میں بھی آتا ہے جسمیں مقدم مؤخر کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا یہاں بھی یہ لفظ اسی معنے میں ہے (رح) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ پورا قصہ حدیث کے حوالہ سے تفصیل کے ساتھ آگے آئے گا۔

اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ، یعنی جبکہ وحی بھیجی ہم نے آپ کی والدہ کے پاس ایک ایسے معاملہ کی جو صرف وحی سے ہی معلوم ہو سکتا تھا وہ یہ کہ فرعونی سپاہی جو اسرائیلی لڑکوں کو قتل کرنے پر مامور تھے اُن سے بچانے کے لئے اُن کی والدہ کو بذریعہ وحی الٰہی بتلایا گیا کہ اُن کو ایک تابوت میں بند کر کے دریا میں ڈالدیں اور اُن کے ہلاک ہونے کا اندیشہ نہ کریں ہم اُن کو حفاظت سے رکھیں گے اور پھر آپکے پاس ہی واپس پہنچا دیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں عقل و قیاس کی نہیں، اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور اُن کی حفاظت کا ناقابلِ قیاس انتظام صرف اُسی کیطرف سے بتلانے پر کسی کو معلوم ہو سکتا ہے۔

کیا وحی کسی غیر نبی و رسول کی طرف بھی آسکتی ہے

صحیح بات یہ ہے کہ لفظ وحی کے لُغوی معنے ایسے خُفیہ کلام کے ہیں جو صرف مخاطب کو معلوم ہو، دُوسرے اس پر مطلع نہ ہوں۔ اس لُغوی معنے کے اعتبار سے وحی کسی کے لئے مخصوص نہیں۔ نبی و رسول اور عام مخلوق بلکہ جانور تک اسمیں شامل ہو سکتے ہیں۔ (وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ) میں شہد کی مکھیوں کو بذریعہ وحی تلقین و تعلیم کرنے کا ذکر اسی معنے کے اعتبار سے ہے اور اس آیت میں اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ بھی اسی معنی لُغوی کے اعتبار سے ہے اس سے انکا نبی یا رسول ہونا لازم نہیں آتا، جیسے حضرت مریم علیہا السلام کو ارشاداتِ ربانی پہنچے باوجودیکہ باتفاق جمہورِ اُمت وہ نبی و رسول نہیں تھیں۔ اس طرح کی لُغوی وحی عموماً بطور الہام کے ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ کسی کے قلب میں ایک مضمون ڈالدیں اور اس کو اس پر مطمئن کر دیں کہ اللہ کیطرف سے ہے جیسے عموماً اولیاء اللہ کو اس قسم کے الہامات ہوتے رہے ہیں، بلکہ ابُو حیان اور بعض دوسرے علماء نے کہا ہے کہ اس طرح کی وحی بعض اوقات کسی فرشتے کے واسطے سے بھی ہو سکتی ہے جیسے حضرت مریم کے واقعہ میں اس کی تصریح ہے کہ جبرئیل امین

نے بشکل انسانی متمثل ہو کر ان کو تلقین فرمائی مگر اسکا تعلق صرف اُس شخص کی ذات سے ہوتا ہے جس کو یہ وحی الہام ہوتی ہے۔ اصلاحِ خلق اور تبلیغ و دعوت سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہوتا بخلاف وحی نبوت کے کہ اسکا منشا ہی مخلوق کی اصلاح کے لئے کسی کو کھڑا کرنا اور تبلیغ و دعوت کے لئے مامور کرنا ہوتا ہے اس کے ذمہ لازم ہوتا ہے کہ اپنی وحی پر خود بھی ایمان لائے اور دوسروں کو بھی اپنی نبوت کے ماننے اور اپنی وحی کے ماننے کا پابند بنائے جو اُس کو نہ مانے اُسے کافر قرار دے۔

یہی فرق ہے اس وحی الہام یعنی وحی لغوی میں اور وحی نبوت یعنی وحی اصطلاحی میں۔ وحی لغوی ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ رہے گی، اور نبوت اور وحی نبوت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے۔ بعض بزرگوں کے کلام میں اسی کو وحی تشریعی و غیر تشریعی کے عنوان سے تعبیر کر دیا ہے جس کو مدعی نبوت قادیانی نے شیخ محی الدین ابن عربی رح کی بعض عبارتوں کے حوالہ سے اپنے دعوائے نبوت کے جواز کی دلیل بنایا ہے جو خود ابن عربی رح کی تصریحات سے باطل ہے۔ اس مسئلہ کی مکمل بحث و توضیح میری کتاب ختم نبوت میں تفصیل سے مذکور ہے۔

اُمِ موسیٰ علیہ السلام کا نام روح المعانی میں ہے کہ ان کا مشہور نام یوحانذ ہے، اور اتقان میں ان کا نام لحیانہ بنت یصمد بن لاوی لکھا ہے، اور بعض لوگوں نے ان کا نام بارخا بعض نے باذخت بتلایا ہے۔ بعض تعویذ گنڈے والے ان کے نام کی عجیب خصوصیات بیان کیا کرتے ہیں صاحب روح المعانی نے فرمایا کہ ہمیں اسکی کوئی بنیاد نہیں معلوم ہوئی اور غالب یہ ہے کہ خرافات میں سے ہے۔

فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ، اس جگہ لفظ یم بمعنے دریا سے بظاہر نہر نیل مراد ہے آیت میں ایک حکم تو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کو دیا گیا ہے کہ اس بچے (موسیٰ علیہ السلام) کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈالدیں، دوسرا حکم بصیغۂ امر دریا کے نام ہے کہ وہ اس تابوت کو کنارہ پر ڈالدے فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ، دریا چونکہ بظاہر بے حس و بے شعور ہے اُس کو حکم دینے کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا اسی لئے بعض حضرات نے یہ قرار دیا کہ اگرچہ یہاں صیغۂ امر بمعنی الحکم استعمال ہوا ہے مگر مراد اس سے حکم نہیں بلکہ خبر دینا ہے کہ دریا اس کو کنارہ پر ڈالدیگا۔ مگر محققین علماء کے نزدیک یہ امر اپنے ظاہر پر امر اور حکم ہی ہے اور دریا ہی اُسکا مخاطب ہے کیونکہ اُن کے نزدیک دُنیا کی کوئی مخلوق درخت اور پتھر تک بے عقل و بے شعور نہیں بلکہ سب میں عقل و ادراک موجود ہے اور یہی عقل و ادراک ہے جس کے سبب یہ سب چیزیں حسب تصریح قرآن اللہ کی تسبیح میں مشغول ہیں۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ انسان اور جن اور فرشتہ کے علاوہ کسی مخلوق میں عقل و شعور اتنا مکمل نہیں جس پر احکام حلال و حرام عائد کر کے مکلف بنایا جائے، دانائے رُوم نے خوب فرمایا ہے ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند ٭ با من و تو مُردہ با حق زندہ اند

يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهٗ، یعنی اس تابوت اور اسمیں بند کئے ہوئے بچے کو ساحل دریا سے ایسا شخص اُٹھائے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور موسیٰ کا بھی، مُراد اس سے فرعون ہے۔ فرعون کا اللہ کا دشمن ہونا تو اُس کے کفر کی وجہ سے ظاہر ہے مگر موسیٰ علیہ السلام کا دشمن کہنا اس لئے محلِ غور ہے کہ اسوقت تو فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دشمن نہیں تھا بلکہ اُن کی پرورش پر زرِ کثیر خرچ کر رہا تھا پھر اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دشمن فرمایا تو انجام کار کے اعتبار سے ہے کہ بالآخر فرعون کا دشمن ہوجانا اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا اور یہ کہا جائے تو بھی کچھ بعید نہیں کہ جہاں تک فرعون کی ذات کا تعلق ہے وہ فی نفسہٖ اُسوقت بھی دشمن ہی تھا۔ اُس نے حضرت مُوسیٰ کی تربیت صرف بیوی آسیہ کی خاطر گوارا کی تھی اور اس میں بھی جب اُس کو شبہ ہوا تو اُسی وقت قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا جو حضرت آسیہ کی دانشمندی کے ذریعہ ختم ہوا (روح و مظہری)

وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي، اس جگہ لفظ محبت مصدر بمعنے محبوبیت ہے اور مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمنے اپنی عنایت و رحمت سے آپکے وجود میں ایک محبوبیت کی شان رکھدی تھی کہ جو آپ کو دیکھے آپ سے محبت کرنے لگے۔ حضرت ابن عباس اور عکرمہ سے یہی تفسیر منقول ہے (مظہری)

وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ، لفظ صنعت سے اس جگہ مُراد عمدہ تربیت ہے جیسے عرب میں صَنَعْتُ فَرَسِيْ کا محاورہ اسی معنی میں معروف ہے کہ میں نے اپنے گھوڑے کی اچھی تربیت کی اور عَلٰى عَيْنِيْ سے مُراد علیٰ حفظی یعنی اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمالیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہترین تربیت براہ راست حق تعالیٰ کی نگرانی میں ہو اس لئے مصر کی سب سے بڑی ہستی یعنی فرعون کے ہاتھوں ہی اس کے گھر میں یہ کام اس طرح لیا گیا کہ وہ اس سے بے خبر تھا کہ میں اپنے ہاتھوں اپنے دشمن کو پال رہا ہوں۔ (مظہری)

إِذْ تَمْشِيْٓ أُخْتُكَ، موسیٰ علیہ السلام کی بہن کا اس تابوت کے تعاقب میں جانا اور اُس کے بعد کا قصہ جسکا اجمال اس آیت میں آیا ہے جس کے آخر میں فرمایا ہے وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا یعنی ہمنے آپ کی آزمائش کی بار بار (قالہ ابن عباس رضؓ) یا آپ کو مبتلائے آزمائش کیا بار بار (قالہ الضحاک) اسکی پُوری تفصیل سُنن نسائی کی ایک طویل حدیث میں بروایت ابن عباس رضؓ آئی ہے وہ یہ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مفصل قصہ حدیث الفتون کے نام سے طویل حدیث سُنن نسائی کتاب التفسیر میں بروایت ابن عباسؓ نقل کی ہے اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں بھی اسکو پورا نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ حضرت ابن عباس نے اس روایت کو مرفوع یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان قرار دیا ہے اور ابن کثیر نے بھی حدیث کے مرفوع ہونے کی توثیق کے لئے فرمایا ہے کہ :-

وَصَدَّقَ ذٰلِكَ رَجُلٌ یعنی اس حدیث کا مرفوع ہونا میرے نزدیک درست ہے پھر اس کے لئے ایک دلیل بھی بیان فرمائی۔ لیکن اسکے بعد یہ بھی نقل فرمایا ہے کہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بھی اپنی اپنی تفسیروں میں یہ روایت نقل کی ہے مگر وہ موقوف یعنی ابن عباسؓ کا اپنا کلام ہے، مرفوع حدیث کے جملے اسمیں کہیں کہیں آئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ نے یہ روایت کعب احبارؒ سے لی ہے جیسا کہ بہت سے مواقع میں ایسا ہوا ہے مگر ابن کثیر جیسے ناقدِ حدیث اور نسائی جیسے امام حدیث اس کو مرفوع مانتے ہیں اور جنھوں نے مرفوع تسلیم نہیں کیا وہ بھی اسکے مضمون پر کوئی نکیر نہیں کرتے اور اکثر حصہ اسکا تو خود قرآن کریم کی آیات میں آیا ہوا ہے اسلئے پوری حدیث کا ترجمہ لکھا جاتا ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تفصیلی قصے کے ضمن میں بہت سے علمی اور عملی فوائد بھی ہیں۔ حدیث الفتون بسند امام نسائیؒ قاسم بن ابی ایوب فرماتے ہیں کہ مجھے سعید بن جبیرؒ نے خبر دی کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آئی ہے یعنی وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا میں نے دریافت کیا کہ اسمیں فتون سے کیا مراد ہے؟ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اسکا واقعہ بڑا طویل ہے صبح کو سویرے آجاؤ تو بتلا دینگے جب اگلے دن صبح ہوئی تو میں سویرے ہی ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوگیا تاکہ کل جو وعدہ فرمایا تھا اُس کو پورا کرائوں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ سنو (ایک روز) فرعون اور اس کے ہمنشینوں میں اس بات کا ذکر آیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ فرمایا ہے کہ اُنکی ذرّیت میں انبیاء اور بادشاہ پیدا فرما دیں گے۔ بعض شرکاءِ مجلس نے کہا کہ ہاں بنی اسرائیل تو اسکے منتظر ہیں جس میں اُن کو ذرا شک نہیں کہ اُن کے اندر کوئی نبی و رسول پیدا ہوگا اور پہلے ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ نبی یوسف بن یعقوب علیہ السلام ہیں جب اُن کی وفات ہوگئی تو کہنے لگے کہ ابراہیم علیہ السلام سے جو وعدہ کیا گیا تھا یہ اسکے مصداق نہیں (کوئی اور نبی و رسول پیدا ہوگا جو اس وعدہ کو پورا کریگا)۔ فرعون نے یہ سُنا تو (اُس کو فکر لاحق ہوگئی کہ اگر بنی اسرائیل میں جن کو اُس نے غلام بنا رکھا تھا کوئی نبی و رسول پیدا ہوگیا تو وہ ان کو مجھ سے آزاد کرائے گا) اس لئے حاضرینِ مجلس سے دریافت کیا کہ اس آفت سے بچنے کا کیا راستہ ہے یہ لوگ آپس میں مشورے کرتے رہے اور انجام کار سب کی رائے اس پر متفق ہوگئی کہ (بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو اُس کو ذبح کر دیا جائے اس کے لئے) ایسے سپاہی مقرر کر دیئے گئے جن کے ہاتھوں میں چھُریاں تھیں اور وہ بنی اسرائیل کے ایک ایک گھر میں جاکر دیکھتے تھے جہاں کوئی لڑکا نظر آیا اسکو ذبح کر دیا۔

کچھ عرصہ یہ سلسلہ جاری رہنے کے بعد ان کو یہ ہوش آیا کہ ہماری سب خدمتیں اور محنت مشقت کے کام تو بنی اسرائیل ہی انجام دیتے ہیں اگر یہ سلسلہ قتل کا جاری رہا تو اُن کے بوڑھے تو اپنی

موت مرجائیں گے اور بچے ذبح ہوتے رہے تو آئندہ بنی اسرائیل میں کوئی مرد نہ رہے گا جو ہماری خدمتیں انجام دے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ سارے مشقت کے کام ہمیں خود ہی کرنا پڑیں گے اسلئے اب یہ رائے ہوئی کہ ایک سال میں پیدا ہونے والے لڑکوں کو چھوڑ دیا جائے، دوسرے سال میں پیدا ہونے والوں کو ذبح کر دیا جائے۔ اس طرح بنی اسرائیل میں کچھ جوان بھی رہیں گے جو اپنے بوڑھوں کی جگہ لے سکیں اور ان کی تعداد اتنی زیادہ بھی نہیں ہوگی جس سے فرعونی حکومت کو خطرہ ہوسکے۔ یہ بات سب کو پسند آئی اور یہی قانون نافذ کر دیا گیا (اب حق تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا ظہور اس طرح ہوا کہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ایک حمل اسوقت ہوا جبکہ بچوں کو زندہ چھوڑ دینے کا سال تھا، اسمیں حضرت ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے فرعونی قانون کی رُو سے اُن کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا اگلے سال جو لڑکوں کے قتل کا سال تھا اُسمیں حضرت موسیٰ حمل میں آئے تو اُن کی والدہ پر رنج و غم طاری تھا کہ اب یہ بچہ پیدا ہوگا تو قتل کر دیا جائیگا۔ ابن عباسؓ نے قصہ کو یہاں تک پہنچا کر فرمایا کہ اے ابن جُبیر فُتون یعنی آزمائش کا یہ پہلا موقع ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ابھی دُنیا میں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کہ اُن کے قتل کا منصوبہ تیار تھا۔ اس وقت حق تعالیٰ نے انکی والدہ کو بذریعہ وحی الہام یہ تسلی دیدی کہ لَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ یعنی تم کوئی خوف و غم نہ کرو (ہم اسکی حفاظت کریں گے اور کچھ دن جُدا رہنے کے بعد) ہم اسکو تمہارے پاس واپس کر دیں گے پھر ان کو اپنے رسُولوں میں داخل کرلیں گے۔ جب موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوگئے تو اُن کی والدہ کو حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس کو ایک تابُوت میں رکھ کر دریا (نیل) میں ڈالدو۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اس حکم کی تعمیل کردی۔ جب وہ تابوت کو دریا کے حوالہ کرچکیں تو شیطان نے اُن کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ تونے کیا کام کیا اگر بچہ تیرے پاس رہ کر ذبح بھی کر دیا جاتا تو اپنے ہاتھوں سے کفن دفن کرکے کچھ تو تسلی ہوتی اب تو اسکو دریا کے جانور کھائیں گے (موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اسی رنج و غم میں مبتلا تھیں کہ) دریا کی موجوں نے تابوت کو ایک ایسی چٹان پر ڈالدیا جہاں فرعون کی باندیاں لونڈیاں نہانے دھونے کے لئے جایا کرتی تھیں، انھوں نے یہ تابوت دیکھا تو اُٹھالیا اور کھولنے کا ارادہ کیا تو انمیں سے کسی نے کہا کہ اگر اسمیں کچھ مال ہوا اور ہم نے کھول لیا تو فرعون کی بیوی کو یہ گمان ہوگا کہ ہم نے اسمیں سے کچھ الگ رکھ لیا ہو ہم کچھ بھی کہیں اُس کو یقین نہیں آئے گا اس لئے سب کی رائے یہ ہوگئی کہ اس تابوت کو اسیطرح بند اُٹھا کر فرعون کی بیوی کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

فرعون کی بیوی نے تابوت کھولا تو اسمیں ایک ایسا لڑکا دیکھا جس کو دیکھتے ہی اُس کے دل میں اُس سے اتنی محبت ہوگئی جو اس سے پہلے کسی بچے سے نہیں ہوئی تھی (جو درحقیقت

حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا ظہور تھا (وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ) دوسری طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ بوسوسہ شیطانی اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کو بھول گئیں اور حالت یہ ہوگئی وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا دل ہر خوشی اور ہر خیال سے خالی ہوگیا (صرف موسیٰ علیہ السلام کی فکر غالب آگئی) ادھر جب لڑکوں کے قتل پر مامور پولیس والوں کو فرعون کے گھر میں ایک لڑکا آجانے کی خبر ملی تو وہ چھریاں لیکر فرعون کی بیوی کے پاس پہنچ گئے کہ یہ لڑکا ہمیں دو تاکہ ذبح کر دیں۔

ابن عباسؓ نے یہاں پہنچکر پھر ابن جبیرؒ کو مخاطب کیا کہ اے ابن جبیر فتون یعنی آزمائش کا (دوسرا) واقعہ یہ ہے۔

فرعون کی بیوی نے ان لشکری لوگوں کو جواب دیا کہ ابھی ٹھہرو کہ صرف اس ایک لڑکے سے تو بنی اسرائیل کی قوت نہیں بڑھ جائے گی میں فرعون کے پاس جاتی ہوں اور اس بچے کی جاں بخشی کراتی ہوں، اگر فرعون نے اسکو بخشدیا تو یہ بہتر ہوگا ورنہ تمہارے معاملے میں دخل نہ دوں گی یہ بچہ تمہارے حوالہ ہوگا۔ یہ کہکر وہ فرعون کے پاس گئی اور کہا کہ یہ بچہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے فرعون نے کہا کہ ہاں تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہونا تو معلوم ہے مگر مجھے اسکی کوئی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد ابن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کی قسم کھائی جا سکتی ہے اگر فرعون اسوقت بیوی کی طرح اپنے لئے بھی موسیٰ علیہ السلام کے قرۃ العین آنکھوں کی ٹھنڈک ہونے کا اقرار کرلیتا تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی ہدایت کر دیتا جیساکہ اُس کی بیوی کو ہدایت ایمان عطا فرمائی۔

(بہرحال بیوی کے کہنے سے فرعون نے اس لڑکے کو قتل سے آزاد کر دیا) اب فرعون کی بیوی نے اسکو دودھ پلانے کے لئے اپنے آس پاس کی عورتوں کو بلایا۔ سب نے چاہا کہ موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلانے کی خدمت انجام دیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کسی کی چھاتی نہ لگتی (وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ) اب فرعون کی بیوی کو یہ فکر ہوگئی کہ جب کسی کا دودھ نہیں لیتے تو زندہ یہ کیسے رہیں گے اسلئے اپنی کنیزوں کے سپرد کیا کہ اس کو بازار اور لوگوں کے مجمع میں لیجائیں شاید کسی عورت کا دودھ یہ قبول کریں۔

اس طرف موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے بے چین ہو کر اپنی بیٹی کو کہا کہ ذرا باہر جاکر تلاش کرو اور لوگوں سے دریافت کرو کہ اس تابوت اور بچہ کا کیا انجام ہوا، وہ زندہ ہے یا دریائی جانوروں کی خوراک بن چکا ہے اسوقت تک اُن کو اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ یاد نہیں آیا تھا جو حالتِ حمل میں اُن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت اور چند روزہ مفارقت کے بعد واپسی کا کیا گیا تھا حضرت موسیٰ کی بہن باہر نکلیں تو قدرت حق کا

یہ کرشمہ دیکھا کہ) فرعون کی کنیزیں اس بچے کو لئے ہوئے دودھ پلانے والی عورت کی تلاش میں ہیں، جب انھوں نے یہ ماجرا دیکھا کہ یہ بچہ کسی عورت کا دودھ نہیں لیتا اور یہ کنیزیں پریشان ہیں تو ان سے کہا کہ میں تمھیں ایک ایسے گھرانے کا پتہ دیتی ہوں جہاں مجھے اُمید ہے کہ یہ اُن کا دودھ بھی لینگے اور وہ اس کو خیر خواہی و محبت کے ساتھ پالیں گے۔ یہ سنکر ان کنیزوں نے ان کو اس شبہ میں پکڑ لیا کہ یہ عورت شاید اس بچے کی ماں یا کوئی عزیز خاص ہے جو ذوق کے ساتھ یہ کہہ رہی ہے کہ وہ گھر والے اس کے خیر خواہ اور ہمدرد ہیں (اسوقت یہ بہن بھی پریشان ہوگئی)۔

ابن عباسؓ نے اس جگہ پہنچکر پھر ابن جبیر کو خطاب کیا کہ یہ (تیسرا) واقعہ فتون یعنی آزمائش کا ہے اسوقت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے بات بنائی اور کہا کہ میری مُراد اس گھر والوں کے ہمدرد خیر خواہ ہونے سے یہی تھی کہ فرعونی دربار تک اُن کی رسائی ہوگی اُس سے انکو منافع پہنچنے کی اُمید ہوگی اسلئے وہ اس بچے کی محبت و ہمدردی میں کسر نہ کریں گے۔ یہ سُنکر کنیزوں نے ان کو چھوڑ دیا۔ یہ واپس اپنے گھر پہنچی اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو واقعہ کی خبر دی وہ انکے ساتھ اُس جگہ پہنچیں جہاں یہ کنیزیں جمع تھیں، کنیزوں کے کہنے سے اُنھوں نے بھی بچے کو گود میں لے لیا، موسیٰ علیہ السلام فوراً اُن کی چھاتی سے لگ کر دودھ پینے لگے یہاں تک کہ پیٹ بھر گیا۔ یہ خوشخبری فرعون کی بیوی کو پہنچی کہ اس بچے کے لئے دودھ پلانے والی مل گئی۔ فرعون کی بیوی نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بلوایا۔ اُنھوں نے آکر حالات دیکھے اور یہ محسوس کیا کہ فرعون کی بیوی میری حاجت و ضرورت محسوس کر رہی ہے تو ذرا خودداری سے کام لیا۔ اہلیہ فرعون نے کہا کہ آپ یہاں رہ کر اس بچے کو دودھ پلائیں کیونکہ مجھے اس بچے سے اتنی محبت ہے کہ میں اس کو اپنی نظروں سے غائب نہیں رکھ سکتی۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے کہا کہ میں تو اپنے گھر کو چھوڑ کر یہاں نہیں رہ سکتی کیونکہ میری گود میں خود ایک بچہ ہے جس کو دودھ پلاتی ہوں، میں اسکو کیسے چھوڑوں۔ ہاں اگر آپ اس پر راضی ہوں کہ بچہ میرے سپرد کردیں میں اپنے گھر رکھ کر اسکو دودھ پلاؤں اور یہ وعدہ کرتی ہوں کہ اس بچے کی خبر گیری اور حفاظت میں ذرا کوتاہی نہ کرونگی۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو اسوقت اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ بھی یاد آگیا جسمیں فرمایا کہ چند روز کی جدائی کے بعد ہم اُن کو تمھارے پاس واپس دیدینگے اسلئے وہ اور اپنی بات پر جم گئیں۔ اہلیہ فرعون نے مجبور ہو کر ان کی بات مان لی اور یہ اُسی روز حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لے کر اپنے گھر آگئیں اور اللہ تعالیٰ نے اُن کا نشوونما خاص طریقے پر فرمایا۔

جب موسیٰ علیہ السلام ذرا قوی ہوگئے تو اہلیہ فرعون نے اُن کی والدہ سے کہا کہ یہ بچہ مجھے لاکر دکھلا جاؤ (کہ میں اسکے دیکھنے کیلئے بیچین ہوں) اور اہلیہ فرعون نے اپنے سب درباریوں کو حکم دیا کہ یہ بچہ آج ہمارے گھر میں آرہا ہے تم میں سے کوئی ایسا نہ رہے جو اسکا اکرام نہ کرے اور کوئی ہدیہ اسکو

پیش نہ کرے اور میں خود اس کی نگرانی کروں گی کہ تم لوگ اس معاملہ میں کیا کرتے ہو۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کیساتھ گھر سے نکلے اُسیوقت سے اُن پر تحفوں اور ہدایا کی بارش ہونے لگی یہانتک کہ اہلیہ فرعون کے پاس پہنچے تو اُسنے اپنے پاس سے خاص تحفے اور ہدیئے الگ پیش کئے ۔ اہلیہ فرعون ان کو دیکھ کر بیحد مسرور ہوئی اور یہ سب تحفے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو دیدیئے ۔ اسکے بعد اہلیہ فرعون نے کہا کہ اب میں ان کو فرعون کے پاس لیجاتی ہوں وہ انکو انعامات اور تحفے دیں گے جب ان کو لیکر فرعون کے پاس پہنچی تو فرعون نے ان کو اپنی گود میں لے لیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی داڑھی پکڑ کر زمین کی طرف جھکا دیا۔ اُسوقت دربار کے لوگوں نے فرعون سے کہا کہ آپنے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ابراہیم علیہ السلام سے جو وعدہ کیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک نبی پیدا ہوگا جو آپکے ملک مال کا وارث ہوگا، آپ پر غالب آئیگا اور آپکو پچھاڑ دیگا، یہ وعدہ کس طرح پُورا ہو رہا ہے۔
فرعون متنبہ ہوا اور اُسیوقت لڑکوں کو قتل کرنے والے سپاہیوں کو بُلا لیا تاکہ اسکو ذبح کر دیں
ابن عباسؓ نے یہاں پہنچکر پھر ابن جبیر کو خطاب کیا کہ یہ (چوتھا) واقعہ فتون یعنی آزمائش کا ہے کہ پھر موت سر پر منڈلانے لگی۔

اہلیہ فرعون نے یہ دیکھا تو کہا کہ آپ تو یہ بچہ مجھے دے چکے ہیں پھر اب یہ کیا معاملہ ہو رہا ہے فرعون نے کہا کہ تم یہ نہیں دیکھتیں کہ یہ لڑکا اپنے عمل سے گویا یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ مجھ کو زمین پر پچھاڑ کر مجھ پر غالب آ جائیگا۔ اہلیہ فرعون نے کہا کہ آپ ایک بات کو اپنے اور میرے معاملہ کے فیصلہ کے لئے مان لیں جس سے حق بات ظاہر ہو جاوے گی (کہ بچے نے یہ معاملہ بچپن کی بے خبری میں کیا ہے یا دیدہ دانستہ کسی شوخی سے) آپ دو انگارے آگ کے اور دو موتی منگوا لیجئے اور دونوں کو اسکے سامنے کر دیجئے اگر یہ موتیوں کی طرف ہاتھ بڑھائیں اور آگ کے انگاروں سے بچیں تو آپ سمجھ لیں کہ اسکے افعال عقل و شعور سے دیدہ و دانستہ ہیں اور اگر اس نے موتیوں کے بجائے انگارے ہاتھ میں اُٹھا لئے تو یہ یقین ہو جائے گا کہ یہ کام کسی عقل و شعور سے نہیں کیا گیا کیونکہ کوئی عقل والا انسان آگ کو ہاتھ میں نہیں اُٹھا سکتا (فرعون نے اس آزمائش کو مان لیا) دو انگارے اور دو موتی موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیش کئے تو موسیٰ علیہ السلام نے انگارے اُٹھا لئے (بعض دوسری روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام موتیوں کیطرف ہاتھ بڑھانا چاہتے تھے کہ جبرئیل امین نے اُن کا ہاتھ انگاروں کی طرف پھیر دیا) فرعون نے یہ ماجرا دیکھا تو فوراً اُن کے ہاتھ سے انگارے چھین لئے کہ اُن کا ہاتھ نہ جل جائے (اب تو اہلیہ فرعون کی بات بن گئی) اُسنے کہا کہ آپنے واقعہ کی حقیقت کو دیکھ لیا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے پھر یہ موت موسیٰ علیہ السلام سے ٹلا دی کیونکہ قدرت خداوندی کو ان سے آگے کام لینا تھا۔

(حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی طرح فرعون کے شاہانہ اعزاز و اکرام اور شاہانہ خرچ پر اپنی والدہ کی نگرانی میں پرورش پاتے رہے یہاں تک کہ جوان ہوگئے)۔

اُن کے شاہی اکرام و اعزاز کو دیکھ کر فرعون کے لوگوں کو بنی اسرائیل پر وہ ظلم و جور اور تذلیل و توہین کرنے کی ہمت نہ رہی جو اس سے پہلے آلِ فرعون کیطرف سے ہمیشہ بنی اسرائیل پر ہوتا رہتا تھا۔ ایک روز موسیٰ علیہ السلام شہر کے کسی گوشہ میں چل رہے تھے تو دیکھا کہ دو آدمی آپس میں لڑ رہے ہیں جنمیں سے ایک فرعونی ہے اور دوسرا اسرائیلی۔ اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر امداد کے لئے پکارا۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعونی آدمی کی جسارت پر بہت غصہ آگیا کہ اس نے شاہی دربار میں موسیٰ علیہ السلام کے اعزاز و اکرام کو جانتے ہوئے اسرائیلی کو اُن کے سامنے پکڑ رکھا ہے جبکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اسرائیلیوں کی حفاظت کرتے ہیں اور لوگوں کو تو صرف یہی معلوم تھا کہ ان کا تعلق اسرائیلی لوگوں سے صرف رضاعت اور دودھ پینے کی وجہ سے ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی والدہ یا کسی اور ذریعہ سے یہ معلوم کرا دیا ہو کہ یہ اپنی دودھ پلانے والی عورت ہی کے بطن سے پیدا ہوئے اور اسرائیلی ہیں۔

غرض موسیٰ علیہ السلام نے غصہ میں آکر اس فرعونی کے ایک مُکا رسید کیا جس کو وہ برداشت نہ کرسکا اور وہیں مرگیا مگر اتفاق سے وہاں کوئی اور آدمی موسیٰ علیہ السلام اور ان دونوں لڑنے والوں کے سوا موجود نہیں تھا، فرعونی تو قتل ہوگیا اسرائیلی اپنا آدمی تھا اس سے اسکا اندیشہ نہ تھا کہ یہ مخبری کردے گا۔

جب یہ فرعونی موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے مارا گیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ، یعنی یہ کام شیطان کی طرف سے ہوا ہے وہ کھلا دشمن گمراہ کرنے والا ہے (پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی) رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ، یعنی اے میرے پروردگار میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا (کہ یہ خطا قتلِ فرعونی کی مجھ سے سرزد ہوگئی) مجھے معاف فرما دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا کیونکہ وہ ہی بہت معاف کرنے والا اور بہت رحمت کرنے والا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اس واقعہ کے بعد خوف و ہراس کے عالم میں یہ خبریں دریافت کرتے رہے (کہ اسکے قتل پر آلِ فرعون کا ردعمل کیا ہوا اور دربار فرعون تک یہ معاملہ پہنچا یا نہیں) معلوم ہوا کہ معاملہ فرعون تک اس عنوان سے پہنچا کہ کسی اسرائیلی نے آلِ فرعون کے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے اس لئے اسرائیلیوں سے اسکا انتقام لیا جائے۔ اس معاملے میں ان کے ساتھ کوئی ڈھیل کا معاملہ نہ کیا جائے۔ فرعون نے جواب دیا کہ اس کے قاتل کو متعین کرکے مع شہادت کے پیش کرو۔

کیونکہ بادشاہ اگرچہ تمہارا ہی ہے مگر اُس کے لئے یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ بغیر شہادت و ثبوت کے کسی سے قصاص لے لے۔ تم اسکے قاتل کو تلاش کرو اور ثبوت مہیا کرو میں ضرور تمہارا انتقام بصورت قصاص اُس سے لونگا۔ آلِ فرعون کے لوگ یہ سُن کر گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومنے لگے کہ کہیں اسکے قتل کرنے والے کا سُراغ مل جائے مگر ان کو کوئی سُراغ نہیں مل رہا تھا۔

اچانک یہ واقعہ پیش آیا کہ اگلے روز موسیٰ علیہ السلام گھر سے نکلے تو اُسی اسرائیلی کو دیکھا کہ کسی دوسرے فرعونی شخص سے مقاتلہ کرنے میں لگا ہوا ہے اور پھر اس اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لئے پکارا مگر موسیٰ علیہ السلام کل کے واقعہ پر ہی نادم ہو رہے تھے اور اسوقت اسی اسرائیلی کو پھر لڑتے ہوئے دیکھ کر اس پر ناراض ہوئے (کہ خطا اسی کی معلوم ہوتی ہے یہ جھگڑالو آدمی ہے اور لڑتا ہی رہتا ہے) مگر اسکے باوجود موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ فرعونی شخص کو اس پر حملہ کرنے سے روکیں لیکن اسرائیلی کو بھی بطور تنبیہ کے کہنے لگے تُو نے کل بھی جھگڑا کیا تھا آج پھر لڑ رہا ہے تو ہی ظالم ہے۔ اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ آج بھی اُسی طرح غصّے میں ہیں جیسے کل تھے تو اُس کو موسیٰ علیہ السلام کے ان الفاظ سے یہ شبہ ہو گیا کہ یہ آج مجھے ہی قتل کر دیں گے تو فوراً بول اُٹھا کہ اے موسیٰ کیا تم چاہتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو جیسے کل تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔

یہ باتیں ہونے کے بعد یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے مگر فرعونی شخص نے آلِ فرعون کے اُن لوگوں کو جو کل کے قاتل کی تلاش میں تھے جا کر یہ خبر پہنچا دی کہ خود اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا ہے کہ تم نے کل ایک آدمی قتل کر دیا ہے۔ یہ خبر دربار فرعون تک فوراً پہنچائی گئی۔ فرعون نے اپنے سپاہی موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لئے بھیج دیئے۔ یہ سپاہی جانتے تھے کہ وہ ہم سے بچکر کہاں جائیں گے۔ اطمینان کے ساتھ شہر کی بڑی سڑک سے موسیٰ علیہ السلام کی تلاش میں نکلے۔ اس طرف ایک شخص کو موسیٰ علیہ السلام کے متبعین میں سے جو شہر کے کسی بعید حصہ میں رہتا تھا اس کی خبر لگ گئی کہ فرعونی سپاہی موسیٰ علیہ السلام کی تلاش میں بغرض قتل نکل چکے ہیں اس نے کسی گلی کوچے کے چھوٹے راستہ سے آگے پہنچکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خبر دی۔

یہاں پہنچکر پھر ابنِ عباسؓ نے ابنِ جُبیر کو خطاب کیا کہ اے ابن جُبیر یہ (پانچواں) واقعہ فتون یعنی آزمائش کا ہے کہ موت سر پر آ چکی تھی اللہ نے اُس سے نجات کا سامان کر دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ خبر سُن کر فوراً شہر سے نکل گئے اور مَدْیَنْ کی طرف رُخ پھیر گیا۔ یہ آج تک شاہی ناز و نعمت میں پلے تھے کبھی محنت و مشقت کا نام نہ آیا تھا مصر سے نکل کھڑے ہوئے مگر راستہ بھی کہیں کا نہ جانتے تھے مگر اپنے رب پر بھروسہ تھا کہ عَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یَّھْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ، یعنی اُمید ہے کہ میرا رب مجھے راستہ دکھا دیگا۔ جب شہر مَدْیَنْ کے قریب

پہنچے تو شہر سے باہر ایک کنویں پر لوگوں کا اجتماع دیکھا جو اُس پر اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے۔ اور دیکھا کہ دو عورتیں اپنی بکریوں کو سمیٹے ہوئے الگ کھڑی ہیں، موسیٰ علیہ السلام نے ان عورتوں سے پُوچھا کہ تم الگ کیوں کھڑی ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم ان سب لوگوں سے مزاحمت اور مقابلہ کریں اس لئے ہم اس انتظار میں ہیں کہ جب یہ سب لوگ فارغ ہو جائیں تو جو کچھ بچا ہوا پانی مل جائے گا اُس سے ہم اپنا کام نکالیں گے۔

موسیٰ علیہ السلام نے اُن کی شرافت دیکھ کر خود اُن کے لئے کنویں سے پانی نکالنا شروع کر دیا اللہ تعالیٰ نے قوت و طاقت بخشی تھی بڑی جلدی اُن کی بکریوں کو سیراب کر دیا۔ یہ عورتیں اپنی بکریاں لے کر اپنے گھر گئیں اور موسیٰ علیہ السلام ایک درخت کے سایہ میں چلے گئے اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کی رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ، یعنی اے میرے پروردگار میں محتاج ہوں اس نعمت کا جو آپ میری طرف بھیجیں (مطلب تھا کہ کھانے کا اور ٹھکانہ کا کوئی انتظام ہو جائے) یہ لڑکیاں جب روزانہ کے وقت سے پہلے بکریوں کو سیراب کر کے گھر پہنچیں تو اُن کے والد کو تعجب ہوا اور فرمایا آج تو کوئی نئی بات ہے، لڑکیوں نے موسیٰ علیہ السلام کے پانی کھینچنے اور پلانے کا قصہ والد کو سُنا دیا۔ والد نے انہیں سے ایک کو حکم دیا کہ جس شخص نے یہ احسان کیا ہے اسکو یہاں بُلا لاؤ، وہ بُلا لائی، والد نے موسیٰ علیہ السلام سے اُن کے حالات دریافت کئے اور فرمایا لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ، یعنی اب آپ خوف وہراس اپنے دل سے نکال دیجئے، آپ ظالموں کے ہاتھ سے نجات پا چکے ہیں ہم نہ فرعون کی سلطنت میں ہیں نہ اسکا ہم پر کچھ حکم چل سکتا ہے۔

اب ان دو لڑکیوں میں سے ایک نے اپنے والد سے کہا یٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ، یعنی ابا جان، ان کو آپ ملازم رکھ لیجئے کیونکہ ملازمت کے لئے بہترین آدمی وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی۔ والد کو اپنی لڑکی سے یہ بات سُنکر غیرت سی آئی کہ میری لڑکی کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ قوی بھی ہیں اور امین بھی۔ اسلئے اس سے سوال کیا کہ تمھیں اُن کی قوت کا اندازہ کیسے ہوا اور اُن کی امانتداری کس بات سے معلوم کی۔ لڑکی نے عرض کیا کہ اُن کی قوت کا مشاہدہ تو اُن کے کنویں سے پانی کھینچنے کے وقت ہوا کہ سب چرواہوں سے پہلے انھوں نے اپنا کام کر لیا دوسرا کوئی ان کی برابر نہیں آسکا اور امانت کا حال اس طرح معلوم ہوا کہ جب میں اُن کو بُلانے کے لئے گئی اوّل نظر میں جب انھوں نے دیکھا کہ میں ایک عورت ہوں تو فوراً اپنا سر نیچا کر لیا اور اسوقت تک سر نہیں اُٹھایا جب تک کہ میں نے ان کو آپکا پیغام نہیں پہنچا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم میرے پیچھے پیچھے چلو مگر مجھے اپنے گھر کا راستہ پیچھے سے بتلاتی رہو اور یہ بات صرف وہی مرد کر سکتا ہے جو امانتدار ہو۔ والد کو لڑکی کی اس

دانشمندانہ بات سے مسرّت ہوئی اور اسکی تصدیق فرمائی اور خود بھی ان کے بارے میں قوت و امانت کا یقین ہو گیا۔ اُس وقت لڑکیوں کے والد نے (جو اللہ کے رسول حضرت شعیب علیہ السلام تھے) موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ کو یہ منظور ہے کہ میں ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح آپ سے کردوں جس کی شرط یہ ہوگی کہ آپ آٹھ سال تک ہمارے یہاں مزدوری کریں، اور اگر آپ دس سال پورے کردیں تو اپنے اختیار سے کردیں بہتر ہوگا مگر ہم یہ پابندی آپ پر عائد نہیں کرتے تاکہ آپ پر زیادہ مشقت نہ ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو منظور فرمایا جسکی رُو سے موسیٰ علیہ السلام پر صرف آٹھ سال کی خدمت بطور معاہدہ کے لازم ہوگئی باقی دو سال کا وعدہ اختیاری رہا، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام سے وہ وعدہ بھی پورا کراکر دس سال پورے کرادیئے۔

سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک نصرانی عالم مجھے ملا، اُس نے سوال کیا کہ تم جانتے ہو کہ موسیٰ علیہ السلام نے دونوں میعادوں میں سے کونسی میعاد پوری فرمائی؟ میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں کیونکہ اسوقت تک ابن عباسؓ کی یہ حدیث مجھے معلوم نہ تھی۔ اس کے بعد میں ابن عباسؓ سے ملا اُن سے سوال کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ آٹھ سال کی میعاد پورا کرنا تو موسیٰؑ پر واجب تھا اسمیں کچھ کمی کرنے کا تو احتمال ہی نہیں اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے رسول کا اختیاری وعدہ بھی پورا ہی کرنا منظور تھا اس لئے دس سال کی میعاد پوری کی۔ اس کے بعد میں اس نصرانی عالم سے ملا اور اس کو یہ خبر دی تو اُسنے کہا کہ تم نے جس شخص سے یہ بات دریافت کی ہے کیا وہ تم سے زیادہ علم والے ہیں، میں نے کہا کہ بیشک وہ بہت بڑے عالم اور ہم سب سے افضل ہیں۔

(دس سال کی میعاد خدمت پوری کرنے کے بعد جب) حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی اہلیہ محترمہ کو ساتھ لیکر شعیب علیہ السلام کے وطن مَدیَن سے رخصت ہوئے، راستہ میں سخت سردی اندھیری رات، راستہ نامعلوم، بے کسی اور بے بسی کے عالم میں اچانک کوہ طور پر آگ دیکھنے پھر وہاں جانے اور حیرت انگیز مناظر کے بعد معجزہ عصا وید بیضاء اور اسکے ساتھ منصب نبوت و رسالت عطا ہونے کے بعد (جسکا پورا قصہ قرآن میں اُوپر گزر چکا ہے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ فکر ہوئی کہ میں فرعونی دربار کا ایک مفرور ملزم قرار دیا گیا ہوں مجھ سے قبطی کا قصاص لینے کا حکم وہاں سے ہوچکا ہے اب اُس کے پاس دعوتِ رسالت لیکر جانے کا حکم ہوا ہے، نیز اپنی زبان میں لکنت کا عذر بھی سامنے آیا تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض معروض پیش کی۔ حق تعالیٰ نے اُن کی فرمائش کے مطابق اُنکے بھائی حضرت ہارون کو شریکِ رسالت بناکر اُنکے پاس وحی بھیجدی اور یہ حکم دیا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شہر مصر سے باہر استقبال کریں۔ اسکے مطابق موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے۔ ہارون علیہ السلام سے ملاقات ہوئی دونوں بھائی (حسب الحکم) فرعون کو دعوتِ حق

دینے کے لئے اُس کے دربار میں پہنچے کچھ وقت تک تو اُن کو دربار میں حاضری کا موقع نہیں دیا گیا یہ دونوں دروازے پر ٹھہرے رہے پھر بہت سے پردوں میں گزر کر حاضری کی اجازت ملی اور دونوں نے فرعون سے کہا اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ ، یعنی ہم دونوں تیرے رب کی طرف سے قاصد اور پیغامبر ہیں۔ فرعون نے پوچھا فَمَنْ رَّبُّكُمَا (تو بتلاؤ تمہارا رب کون ہے) موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے وہ بات کہی جس کا قرآن نے خود ذکر کردیا رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ، اس پر فرعون نے پوچھا کہ پھر تم دونوں کیا چاہتے ہو اور ساتھ ہی قبطی مقتول کا واقعہ ذکر کرکے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مجرم ٹھہرایا (اور اپنے گھر میں اُن کی پرورش پانیکا احسان جتلایا) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دونوں باتوں کا وہ جواب دیا جو قرآن میں مذکور ہے (یعنی مقتول کے معاملہ میں تو اپنی خطا اور غلطی کا اعتراف کرکے ناواقفیت کا عذر ظاہر کیا اور گھر میں پرورش پر احسان جتلانیکا جواب یہ دیا کہ تم نے سارے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے اُن پر طرح طرح کے ظلم کر رہے ہو اُسی کے نتیجہ میں بہ نیرنگ تقدیر میں تمہارے گھر میں پہنچا دیا گیا اور جو کچھ اللہ کو منظور تھا وہ ہوگیا اس میں تمہارا کوئی احسان نہیں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو خطاب کرکے پوچھا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ اللہ پر ایمان لے آؤ اور بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کردو۔ فرعون نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ اگر تمہارے پاس رسولِ رب ہونے کی کوئی علامت ہے تو دکھلاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصا زمین پر ڈالدی تو وہ عظیم الشان اژدہا کی شکل میں منھ کھولے ہوئے فرعون کی طرف لپکی۔ فرعون خوفزدہ ہو کر اپنے تخت کے نیچے چھپ گیا اور موسیٰ علیہ السلام سے پناہ مانگی کہ اس کو روک لیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسکو پکڑ لیا۔ پھر اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو وہ چمکنے لگا یہ دوسرا معجزہ فرعون کے سامنے آیا پھر دوبارہ گریبان میں ہاتھ ڈالا تو وہ اپنی اصلی حالت پر آگیا۔

فرعون نے ہیبت زدہ ہو کر اپنے درباریوں سے مشورہ کیا (کہ تم دیکھ رہے ہو یہ کیا ماجرا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیئے) درباریوں نے متفقہ طور پر کہا کہ (کچھ فکر کی بات نہیں) یہ دونوں جادوگر ہیں اپنے جادو کے ذریعہ تم کو تمہارے ملک سے نکالنا چاہتے ہیں اور تمہارے بہترین دین و مذہب کو (جو اُن کی نظر میں فرعون کی پرستش کرنا تھا) یہ مٹانا چاہتے ہیں۔ آپ ان کی کوئی بات نہ مانیں (اور کوئی فکر نہ کریں) کیونکہ آپ کے ملک میں بڑے بڑے جادوگر ہیں، آپ اُن کو بلا لیجئے وہ اپنے جادو سے ان کے جادو پر غالب آجائیں گے۔

فرعون نے اپنی مملکت کے سب شہروں میں حکم دیدیا کہ جتنے آدمی جادوگری میں ماہر ہوں وہ سب دربار میں حاضر کردیئے جاویں، ملک بھر کے جادوگر جمع ہوگئے تو انھوں نے فرعون سے پوچھا کہ جس جادوگر سے آپ ہمارا مقابلہ کرانا چاہتے ہیں وہ کیا عمل کرتا ہے، اُسنے

بتلایا کہ وہ اپنی لاٹھی کو سانپ بنا دیتا ہے، جادوگروں نے بڑی بے فکری سے کہا کہ یہ تو کوئی چیز نہیں، لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپ بنا دینے کے جادو کا تو جو کمال ہمیں حاصل ہے اُس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، مگر یہ طے کر دیجئے کہ اگر ہم اس پر غالب آگئے تو ہمیں کیا ملے گا۔

فرعون نے کہا کہ تم غالب آگئے تو تم میرے خاندان کا جزء اور مقربین خاص میں داخل ہو جاؤ گے اور تمہیں وہ سب کچھ ملے گا جو تم چاہو گے۔

اب جادوگروں نے مقابلہ کا وقت اور جگہ موسیٰ علیہ السلام سے طے کر کے اپنی عید کے دن چاشت کا وقت مقرر کر دیا۔ ابن جُبَیرؒ فرماتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے مجھ سے بیان فرمایا کہ انکا یوم الزینۃ (یعنی عید کا دن) جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اُس کے جادوگروں پر فتح عطا فرمائی وہ عاشوراء یعنی محرم کی دسویں تاریخ تھی۔ جب سب لوگ ایک وسیع میدان میں مقابلہ دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے تو فرعون کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو کہنے لگے لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ، یعنی ہمیں یہاں ضرور رہنا چاہیئے تاکہ یہ ساحر یعنی موسیٰ و ہارون اگر غالب آجائیں تو ہم بھی ان پر ایمان لے آئیں، اُن کی یہ گفتگو ان حضرات کے ساتھ استہزاء و مذاق کے طور پر تھی (اُن کا یقین تھا کہ یہ ہمارے جادوگروں پر غالب نہیں آسکیں گے)۔

میدانِ مقابلہ مکمل آراستہ ہو گیا تو جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کیا کہ پہلے آپ کچھ ڈالیں (یعنی اپنا سحر دکھلائیں) یا ہم پہلے ڈال کر ابتداء کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے کہا کہ تم ہی پہل کرو، اپنا جادو دکھلاؤ۔ ان لوگوں نے اپنی لاٹھیاں اور کچھ رسیاں زمین پر یہ کہتے ہوئے ڈالدیں بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ، یعنی بطفیل فرعون ہم ہی غالب آئیں گے (یہ لاٹھیاں اور رسیاں دیکھنے میں سانپ بن کر چلنے لگیں) یہ دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام پر ایک خوف طاری ہوا (فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى)

یہ خوف طبعی بھی ہو سکتا ہے جو مقتضائے بشریت ہے، انبیاء بھی اس سے مستثنیٰ نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خوف اس بات کا ہو کہ اب اسلام کی دعوت جس کو میں لے کر آیا ہوں اس میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی حکم دیا کہ اپنی عصا ڈالدو۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصا ڈالی تو وہ ایک بڑا اژدہا بن گیا جس کا منہ کھلا ہوا تھا اس اژدہا نے اُن تمام سانپوں کو نگل لیا جو جادوگروں نے لاٹھیوں اور رسیوں کے بنائے تھے۔

فرعونی جادوگر جادو کے فن کے ماہر تھے یہ ماجرا دیکھ کر اُن کو یقین ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی عصا کا یہ اژدہا جادو سے نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اس لئے جادوگروں نے اُسی وقت

اعلان کردیا کہ ہم اللہ پر اور موسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دین پر ایمان لے آئے اور ہم اپنے پچھلے خیالات و عقائد سے توبہ کرتے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اسکے ساتھیوں کی کمر توڑ دی اور انھوں نے جو جال پھیلایا تھا وہ سب باطل ہوگیا (فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ) فرعون اور اسکے ساتھی مغلوب ہوگئے اور ذلت و رسوائی کیساتھ اس میدان سے پسپا ہوئے۔

جس وقت یہ مقابلہ ہو رہا تھا فرعون کی بیوی آسیہ پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اللہ تعالےٰ سے موسیٰ علیہ السلام کی مدد کے لئے دعا مانگ رہی تھی اور آلِ فرعون کے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ یہ فرعون کی وجہ سے پریشان حال ہیں اسکے لئے دعا مانگ رہی ہیں حالانکہ ان کا غم و فکر سارا موسیٰ علیہ السلام کے لئے تھا (اور انھیں کے غالب آنے کی دعا مانگ رہی تھیں) اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوئی معجزہ دکھاتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس پر حجت تمام ہوجاتی تو اُسی وقت وعدہ کرلیتا تھا کہ اب میں بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ بھیجدوں گا مگر جب موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے وہ عذاب کا خطرہ ٹل جاتا تو اپنے وعدہ سے پھر جاتا تھا) اور یہ کہدیتا تھا کہ کیا آپکا رب کوئی اور بھی نشانی دکھا سکتا ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا بالآخر اللہ تعالیٰ نے قوم فرعون پر طوفان اور ٹڈی دَل اور کپڑوں میں جوئیں اور برتنوں اور کھانے میں مینڈکوں اور خون وغیرہ کے عذاب مسلّط کردیئے، جن کو قرآن میں آیات مفصلات کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ اور فرعون کا حال یہ تھا کہ جب اُن میں سے کوئی عذاب آتا اور اُس سے عاجز ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کرتا کہ کسی طرح یہ عذاب ہٹا دیجئے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو آزاد کردیں گے پھر جب عذاب ٹل جاتا تو پھر بدعہدی کرتا۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیدیا کہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر مصر سے نکل جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سب کو لیکر رات کے وقت شہر سے نکل گئے فرعون نے جب صبح کو دیکھا کہ یہ سب لوگ چلے گئے تو اپنی فوج تمام اطراف سے جمع کرکے اُنکے تعاقب میں چھوڑ دی۔ اُدھر اللہ تعالیٰ نے اُس دریا کو جو موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے راستہ میں تھا یہ حکم دیدیا کہ جب موسیٰ علیہ السلام تجھ پر لاٹھی ماریں تو دریا میں بارہ راستے بن جانے چاہئیں۔ جن سے بنی اسرائیل کے بارہ قبائل الگ الگ گزر سکیں۔ اور جب یہ گزر جائیں تو اُن کے تعاقب میں آنے والوں پر یہ دریا کے بارہ حصے پھر مل جائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب دریا کے قریب پہنچے تو یہ یاد نہ رہا کہ لاٹھی مارنے سے دریا میں راستے پیدا ہوں گے اور اُن کی قوم نے اُن سے فریاد کی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ یعنی ہم تو پکڑے لئے گئے دیکھو نکہ پیچھے سے فرعونی فوجوں کو آتا دیکھ رہے تھے اور آگے یہ دریا حائل تھا) اسوقت

موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ یاد آیا کہ دریا پر لاٹھی مارنے سے اسمیں رستے پیدا ہو جائیں گے اور فوراً دریا پر اپنی لاٹھی ماری یہ وہ وقت تھا کہ بنی اسرائیل کے پچھلے حصوں سے فرعونی افواج کے اگلے حصے تقریباً مل چکے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے سے دریا کے الگ الگ ٹکڑے ہو کر وعدہ ربانی کے مطابق بارہ راستے بن گئے اور موسیٰ علیہ السلام اور تمام بنی اسرائیل ان راستوں سے گزر گئے۔ فرعونی افواج جو اُن کے تعاقب میں تھی اُنھوں نے دریا میں راستے دیکھ کر اُن کے تعاقب میں اپنے گھوڑے اور پیادے ڈال دیئے تو دریا کے یہ مختلف ٹکڑے بامر ربانی پھر آپس میں مل گئے۔ جب موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل دوسرے کنارے پر پہنچ گئے تو اُن کے اصحاب نے کہا کہ ہمیں یہ خطرہ ہے کہ فرعون اُنکے ساتھ غرق نہ ہوا ہو اور اُسنے اپنے آپ کو بچالیا ہو تو موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی کہ فرعون کی ہلاکت ہم پر ظاہر کر دے قدرت حق نے فرعون کی مُردہ لاش کو دریا سے باہر پھینکدیا اور سب نے اسکی ہلاکت کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا

اس کے بعد یہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آگے چلے تو راستہ میں ان کا گزر ایک قوم پر ہوا جو اپنے بنائے ہوئے بتوں کی عبادت اور پرستش کر رہے تھے، تو یہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے (یٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۚ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ) یعنی اے موسیٰ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی معبود بنا دیجئے جیسے انھوں نے بہت سے معبود بنا رکھے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم عجیب قوم ہو کہ ایسی جہالت کی باتیں کرتے ہو، یہ لوگ جو بتوں کی عبادت میں مشغول ہیں اُنکی عبادت برباد ہونیوالی ہے (موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا) کہ تم اپنے پروردگار کے اتنے معجزات اور اپنے اوپر انعامات دیکھ چکے ہو پھر بھی تمہارے یہ جاہلانہ خیالات نہیں بدلے۔ یہ کہکر حضرت موسیٰ علیہ السلام مع اپنے اُن ساتھیوں کے یہاں سے آگے بڑھے اور ایک مقام پر جاکر اُن کو ٹھہرا دیا اور فرمایا تم سب یہاں ٹھہرو، میں اپنے رب کے پاس جاتا ہوں تیس دن کے بعد واپس آجاؤنگا اور میرے پیچھے ہارون علیہ السلام میرے نائب و خلیفہ رہیں گے ہر کام میں اُن کی اطاعت کرنا۔

موسیٰ علیہ السلام ان سے رخصت ہو کر کوہِ طور پر تشریف لے گئے اور (اشارۂ ربانی سے) تیس دن رات کا مسلسل روزہ رکھا تاکہ اسکے بعد کلام ربانی سے مستفید ہو سکیں مگر تیس دن رات کے مسلسل روزہ سے جو ایک قسم کی بُو روزہ دار کے منہ میں ہو جاتی ہے یہ فکر ہوئی کہ اس بُو کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے شرف ہمکلامی نامناسب ہے تو پہاڑی گھاس کے ذریعہ مسواک کر کے منہ صاف کر لیا۔ جب بارگاہِ حق میں حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ کیطرف سے ارشاد ہوا کہ تم نے افطار کیوں کر لیا (اور اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کچھ کھایا پیا نہیں بلکہ صرف منہ صاف کر لینے کو بغیر افطار

امتیاز کی بنا پر افطار کرلے سے تعبیر فرمایا) موسیٰ علیہ السلام نے اس حقیقت کو سمجھ کر عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھے یہ خیال ہوا کہ آپ سے ہمکلام ہونے کے لئے منہ کی بُو دُور کرکے صاف کرلوں۔ حکم ہوا کہ موسیٰ کیا تمھیں خبر نہیں کہ روزہ دار کے منہ کی بُو ہمارے نزدیک مُشک کی خوشبو سے بھی زیادہ محبوب ہے، اب آپ لوٹ جائیے اور دس دن مزید روزے رکھئے پھر ہمارے پاس آئیے موسیٰ علیہ السّلام نے حکم کی تعمیل کی۔

ادھر جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل نے دیکھا کہ مقررہ مدت تیس روز گزر گئے اور موسیٰ علیہ السلام واپس نہیں آئے تو اُن کو یہ بات ناگوار ہوئی، ادھر حضرت ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کے رخصت ہونے کے بعد اپنی قوم میں ایک خطبہ دیا کہ قوم فرعون کے لوگوں کی بہت سی چیزیں جو تم نے عاریۃً مانگ رکھی تھی یا اُنھوں نے تمھارے پاس ودیعت (امانت) رکھوا رکھی تھی وہ سب تم اپنے ساتھ لے آئے ہو اگرچہ تمھاری بھی بہت سی چیزیں قوم فرعون کے پاس عاریت اور ودیعت کی تھیں اور آپ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اُن کی یہ چیزیں ہماری چیزوں کے معاوضہ میں ہم نے رکھ لی ہیں مگر میں اس کو حلال نہیں سمجھتا کہ اُن کی عاریت اور ودیعت کا سامان تم اپنے استعمال میں لاؤ اور ہم اس کو واپس بھی نہیں کرسکتے اس لئے ایک گڑھا کھودا کر سب کو حکم دیا کہ یہ چیزیں خواہ زیورات ہوں یا دوسری استعمالی اشیاء سب اس گڑھے میں ڈالدو (ان لوگوں نے اسکی تعمیل کی)، ہارون علیہ السلام نے اس سارے سامان کے اوپر آگ جلوا دی جس سے یہ سب سامان جل گیا اور فرمایا کہ اب یہ نہ ہمارا رہا نہ اُن کا۔

اُن کے ساتھ ایک شخص سامری ایک ایسی قوم کا فرد تھا جو گائے کی پرستش کیا کرتے تھے، یہ بنی اسرائیل میں سے نہ تھا مگر جب حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو یہ بھی اُن کے ساتھ ہولیا، اس کو یہ عجیب اتفاق پیش آیا کہ اس نے (جبرئیل علیہ السلام) کا ایک اثر دیکھا (یعنی جہاں اُن کا قدم پڑتا ہے اُسمیں زندگی اور نمو پیدا ہوجاتا ہے)، اس نے اُس جگہ سے ایک مٹھی مٹی کو اُٹھا لیا، اس کو ہاتھ میں لئے ہوئے آرہا تھا کہ ہارون علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، ہارون علیہ السّلام نے خیال کیا کہ اسکی مٹھی میں کوئی فرعونی زیور وغیرہ ہے اس سے کہا کہ جس طرح سب نے اس گڑھے میں ڈالا ہے تم بھی ڈالدو، اس نے کہا یہ تو اُس رسول (جبرئیل) کے نشانِ قدم کی مٹی ہے جس نے تمھیں دریا سے پار کرایا ہے اور میں اس کو کسی طرح نہ ڈالوں گا بجز اسکے کہ آپ یہ دعاء کریں کہ میں جس مقصد کے لئے ڈالوں وہ مقصد پُورا ہوجائے، ہارون علیہ السلام نے دُعا کا وعدہ کرلیا اُسنے وہ مٹھی مٹی کی اس گڑھے میں ڈالدی اور حسب وعدہ ہارون علیہ السلام نے دُعا کی کہ یا اللہ جو کچھ سامری چاہتا ہے وہ پُورا کردیجئے، جب وہ دُعا کرچکے تو سامری نے

کہا کہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہ سونا، چاندی، لوہا، پیتل جو کچھ اس گڑھے میں ڈالا گیا ہے ایک گائے کا بچھڑا بن جائے۔ ہارون علیہ السلام دُعا کر چکے تھے اور وہ قبول ہو چکی تھی جو کچھ زیورات اور تانبا پیتل لوہا اسمیں ڈالا گیا تھا سب کا ایک بچھڑا بن گیا جسمیں کوئی روح تو نہ تھی مگر گائے کی طرح آواز نکالتا تھا۔ حضرت ابن عباس نے اس روایت کو نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ واللہ وہ کوئی زندہ آواز نہیں تھی بلکہ ہوا اُسکے پچھلے حصّہ سے داخل ہو کر منہ سے نکلتی تھی اُس سے یہ آواز پیدا ہوتی تھی۔

یہ عجیب و غریب قصہ دیکھ کر بنی اسرائیل کئی فرقوں میں تقسیم ہو گئے، ایک فرقہ نے سامری سے پُوچھا کہ یہ کیا ہے اُس نے کہا یہی تمھارا خدا ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام راستہ بھُول کر دوسری طرف چلے گئے۔ ایک فرقہ نے یہ کہا کہ ہم سامری کی اس بات کی اُسوقت تک تکذیب نہیں کر سکتے جب تک موسیٰ علیہ السلام حقیقت حال بتلائیں اگر واقع میں یہی ہمارا خدا ہے تو ہم اسکی مخالفت کر کے گناہگار نہیں ہونگے اور یہ خدا نہیں تو ہم موسیٰ علیہ السلام کے قول کی پیروی کریں گے۔

ایک اور فرقہ نے کہا کہ یہ سب شیطانی دھوکہ ہے یہ ہمارا رب نہیں ہو سکتا نہ ہم اس پر ایمان لا سکتے ہیں نہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ایک اور فرقہ کے دل میں سامری کی بات اُتر گئی اور اُس نے سامری کی تصدیق کر کے اسکو اپنا خدا مان لیا۔

ہارون علیہ السلام نے یہ فسادِ عظیم دیکھا تو فرمایا یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِہٖ وَاِنَّ رَبَّکُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَاَطِیْعُوْٓا اَمْرِیْ، یعنی اے میری قوم تم فتنہ میں پڑ گئے ہو بلاشبہ تمہارا رب اور خدا تو رحمٰن ہے تم میرا اتباع کرو اور میرا حکم مانو۔ اُنھوں نے کہا کہ یہ بتلائیے کہ موسیٰ (علیہ السلام) کو کیا ہوا کہ ہم سے تیس دن کا وعدہ کر کے گئے تھے اور وعدہ خلافی کی یہاں تک کہ اب چالیس دن پورے ہو رہے ہیں۔ اُن کے کچھ بے وقوفوں نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کو بھُول گئے۔ اُس کی تلاش میں پھرتے ہونگے۔

اس طرف جب چالیس روزے پُورے کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ ہمکلامی نصیب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس فتنہ کی خبر دی جسمیں اُن کی قوم مبتلا ہو گئی تھی فَرَجَعَ مُوْسٰٓی اِلٰی قَوْمِہٖ غَضْبَانَ اَسِفًا، موسیٰ علیہ السلام وہاں سے بڑے غصّے میں اور افسوس کی حالتیں واپس آئے اور آگے وہ باتیں فرمائیں جو قرآن میں تم نے پڑھی ہیں۔ وَاَلْقَی الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْہِ یَجُرُّہٗٓ اِلَیْہِ، یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اس غصّے میں اپنے بھائی ہارون کے سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف کھینچے اور الواح تورات جو کہ کوہ طور سے ساتھ لائے تھے ہاتھ میں سے رکھ دیں پھر غصّہ فرد ہونیکے بعد بھائی کا عذر صحیح معلوم کر کے اسکو قبول کیا اور اُن کے لئے اللہ سے استغفار کیا، پھر سامری کے پاس گئے اور اُس سے کہا کہ تو نے یہ حرکت کیوں کی، اُس نے جواب دیا قَبَضْتُ

قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ، یعنی میں نے رسول (جبرئیل) کے نشانِ قدم کی مٹی اُٹھائی تھی اور میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ جس چیز پر ڈالی جائے گی اُسمیں حیات کے آثار پیدا ہو جائیں گے، مگر میں نے تم لوگوں سے اس بات کو چھپائے رکھا فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ، یعنی میں نے اس مٹی کو (زیورات وغیرہ کے ڈھیر پر ڈالدیا) میرے نفس نے میرے لئے یہ کام پسندیدہ شکل میں دکھلایا۔ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا، یعنی موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو فرمایا کہ جا، اب تیری سزا یہ ہے کہ تو زندگی بھر یہ کہتا پھرے کہ مجھے کوئی مس نہ کرے (ورنہ وہ بھی عذاب میں گرفتار ہو جائیگا) اور تیرے لئے ایک میعاد مقرر ہے جس کے خلاف نہیں ہوگا کہ زندگی میں تو یہ عذاب چکھتا رہے، اور دیکھ اپنے اُس معبود کو جس کی تو نے پرستش کی ہے ہم اس کو آگ میں جلائینگے پھر اس کی راکھ کو دریا میں بہا دیں گے، اگر یہ خدا ہوتا تو ہم کو اس عمل پر قدرت نہ ہوتی۔

اس وقت بنی اسرائیل کو یقین آگیا کہ ہم فتنہ میں مبتلا ہو گئے تھے اور سب کو اُس جماعت پر غبطہ اور رشک ہونے لگا، جسکی رائے حضرت ہارون کے مطابق تھی (یعنی یہ ہمارا خدا نہیں ہو سکتا)، بنی اسرائیل کو اپنے اس گناہِ عظیم پر تنبہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنے رب سے دُعا کیجئے کہ ہمارے لئے توبہ کا دروازہ کھولدے جس سے ہمارے گناہ کا کفارہ ہو جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کام کے لئے بنی اسرائیل میں سے ستر ایسے صلحا نیک لوگوں کا انتخاب کیا جو پوری قوم میں نیکی اور صلاح میں ممتاز تھے اور جو اُن کے علم میں گوسالہ پرستی سے بھی دُور رہے تھے اس انتخاب میں بڑی چھان بین سے کام لیا۔ ان ستر منتخب صلحا بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر کوہِ طور کی طرف چلے تاکہ اللہ تعالیٰ سے ان کی توبہ قبول کرنے کے بارے میں عرض کریں۔ موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر پہنچے تو زمین میں زلزلہ آیا جس سے موسیٰ علیہ السلام کو بڑی شرمندگی اس وفد کے سامنے ہوئی اور قوم کے سامنے بھی۔ اس لئے عرض کیا رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا، یعنی اے میرے پروردگار اگر آپ ان کو ہلاک ہی کرنا چاہتے تھے تو اس وفد میں آنے سے پہلے ہلاک کر دیتے اور مجھے بھی ان کے ساتھ ہلاک کر دیتے، کیا آپ ہم سب کو اس لئے ہلاک کرتے ہیں کہ ہم میں کچھ بیوقوفوں نے گناہ کیا ہے۔ اور دراصل وجہ اس زلزلہ کی یہ تھی کہ اس وفد میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تحقیق و تفتیش کے باوجود کچھ لوگ اُنہیں سے شامل ہو گئے تھے جو پہلے گوسالہ پرستی کر چکے تھے اور اُن کے دِلوں میں گوسالہ کی عظمت بیٹھی ہوئی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دُعاء و فریاد کے جواب میں ارشاد ہوا وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ فَسَاَکْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ، یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میری رحمت تو سب کو شامل ہے اور میں عنقریب لکھدونگا اپنی رحمت کا پروانہ، اُن لوگوں کے لئے جو تقوٰی اختیار کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اتباع کرتے ہیں اُس رسُولِ اُمّی کا جسکا ذکر لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے پاس تورات اور انجیل میں۔

یہ سُن کر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا، اے میرے پروردگار، میں نے آپ سے اپنی قوم کی توبہ کے بارے میں عرض کیا تھا، آپ نے جواب میں رحمت کا عطا فرمانا میری قوم کے علاوہ دوسری قوم کے متعلق ارشاد فرمایا تو پھر آپ نے میری پیدائش کو مؤخر کیوں نہ کردیا کہ مجھے بھی اُسی نبی اُمّی کی اُمتِ مرحومہ کے اندر پیدا فرما دیتے، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کی توبہ قبول ہونے کا ایک طریقہ ارشاد ہوا کہ ان کی توبہ قبول ہونے کی صورت یہ ہے کہ انہیں سے ہر شخص اپنے متعلقین میں سے باپ یا بیٹے جس سے ملے اسکو تلوار سے قتل کردے اُسی جگہ میں جہاں یہ گوسالہ پرستی کا گناہ کیا تھا۔

اس وقت موسیٰ علیہ السلام کے وہ ساتھی جن کا حال موسیٰ علیہ السلام کو معلوم نہ تھا اور انکو بے قصور صالح سمجھ کر ساتھ لیا تھا مگر درحقیقت اُن کے دل میں گوسالہ پرستی کا جذبہ ابتک تھا وہ بھی اپنے دل میں نادم ہو کر تائب ہو گئے اور اُنھوں نے اُس شدید حکم پر عمل کیا جو اُن کی توبہ قبول کرنے کے لئے بطور کفارہ نافذ کیا تھا (یعنی اپنے عزیز و اقارب کا قتل) اور جب اُنھوں نے یہ عمل کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے قاتل و مقتول دونوں کی خطا معاف فرمادی اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات کی الواح جن کو غصہ میں ہاتھ سے رکھ دیا تھا اُٹھا کر اپنی قوم کو لے کر ارضِ مقدسہ (شام) کی طرف چلدیئے وہاں ایک ایسے شہر پر پہنچے جس پر جبارین کا قبضہ تھا جن کی شکل و صورت اور قد و قامت بھی ہیبت ناک تھی اُن کے ظلم و جور اور قوت و شوکت کے عجیب و غریب قصّے ان سے کہے گئے (موسیٰ علیہ السلام اس شہر میں داخل ہونا چاہتے تھے مگر بنی اسرائیل پر ان جبارین کے حالات سنکر رُعب چھا گیا اور) کہنے لگے اے موسیٰ اس شہر میں تو بڑے جبار ظالم لوگ ہیں جن کے مقابلے کی ہم میں طاقت نہیں اور ہم تو اس شہر میں اُس وقت تک داخل نہیں ہونگے جب تک یہ جبارین وہاں موجود ہیں، ہاں وہ یہاں سے نکل جائیں تو پھر ہم اُس شہر میں داخل ہو سکتے ہیں۔

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ، اس روایت کے راویوں میں جو یزید بن ہارون ہے اُس سے پُوچھا گیا کہ کیا ابن عباسؓ نے اس آیت کی قراءت اسی طرح کی ہے، یزید بن ہارون نے کہا کہ ہاں ابن عباسؓ کی قراءت یُوں ہی ہے رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ سے مُراد قوم جبّارین کے دو آدمی ہیں جو اس شہر سے آکر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے، اُنھوں نے بنی اسرائیل پر اپنی قوم کا رعب طاری دیکھ کر کہا کہ ہم اپنی قوم کے حالات سے خوب واقف ہیں تم اُن کے ڈیل ڈول اور اُن کی جسامت اور اُن کی بڑی تعداد سے ڈر رہے ہو حقیقت یہ ہے کہ اُن میں دل (کی قوت) بالکل نہیں اور نہ مقابلہ کرنے کی ہمت ہے تم ذرا شہر کے دروازے تک چلے چلو تو دیکھ لینا کہ (وہ ہتھیار ڈالدیں گے) اور تم ہی اُن پر غالب آؤگے۔

اور بعض لوگوں نے رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ کی تفسیر یہ کی ہے کہ یہ دو شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی قوم بنی اسرائیل کے تھے۔ قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ، یعنی بنی اسرائیل نے ان دونوں آدمیوں کی نصیحت سُننے کے بعد بھی موسیٰ علیہ السلام کو کورا جواب اس بیہودگی کے ساتھ دیا کہ اے موسیٰ! ہم تو اس شہر میں اُس وقت تک ہرگز نہ جائیں گے جبتک جبّارین وہاں موجود ہیں اگر آپ اُن کا مقابلہ ہی کرنا چاہتے ہیں تو آپ اور آپکا رب جاکر ان سے لڑ بھڑ لیجئے ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل پر حق تعالیٰ کے بیشمار انعامات کے ساتھ ہر قدم پر اُن کی سرکشی اور بیہودگی کا مشاہدہ کرتے آرہے تھے مگر اس وقت تک صبر و تحمل سے کام لیتے رہے، کبھی اُن کے لئے بد دُعا نہیں کی اس وقت ان کے اس بیہودہ جواب سے وہ بہت دل شکستہ اور غمگین ہوگئے اور اُن کے لئے بد دُعا کی، اُن کے حق میں فاسقین کے الفاظ استعمال فرمائے۔ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دُعا قبول فرمائی اور اُن کو اللہ تعالیٰ نے بھی فاسقین کا نام دیدیا اور اس زمین مقدس سے ان لوگوں کو چالیس سال کے لئے محروم کر دیا اور اس کھلے میدان میں اُن کو ایسا قید کر دیا کہ صبح سے شام تک چلتے رہتے تھے کہیں قرار نہ تھا۔

مگر چونکہ اللہ کے رسُول حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اُن کے ساتھ تھے اُن کی برکت اور طفیل سے اس قوم فاسقین پر اس سزا کے دوران بھی اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتیں برستی رہیں کہ اس میدان تیہ میں یہ جس طرف چلتے تھے بادل ان کے سروں پر سایہ کر دیتا تھا، اُن کے کھانے کیلئے مَنّ و سلویٰ نازل ہوتے تھے، اُن کے کپڑے معجزانہ انداز سے نہ میلے ہوتے تھے نہ پھٹتے تھے۔ اور ان کو ایک مربع پتھر عطا فرما دیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیدیا تھا کہ جب اُن کو پانی کی ضرورت ہو تو اس پتھر پر اپنی لاٹھی مارو تو اسمیں سے بارہ چشمے جاری ہوجاتے تھے، پتھر کی ہر جانب سے

تین چشمے بہنے لگتے تھے اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں یہ چشمے متعین کرکے تقسیم کردیئے گئے تھے تاکہ باہم جھگڑا نہ پیدا ہو اور جب بھی یہ لوگ کسی مقام سے سفر کرتے اور پھر کہیں جاکر منزل کرتے تو اس پتھر کو وہیں موجود پاتے تھے (قرطبی)

حضرت ابن عباسؓ نے اس حدیث کو مرفوع کرکے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد قرار دیا ہے اور میرے نزدیک یہ درست ہے کیونکہ حضرت معاویہؓ نے ابن عباسؓ کو یہ حدیث روایت کرتے ہوئے سُنا تو اس بات کو منکر اور غلط قرار دیا جو اس حدیث میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس قبطی کو قتل کیا تھا اور اسکا سُراغ قوم فرعون کو نہیں مل رہا تھا تو اُس کی مخبری اُس دوسرے فرعونی شخص نے کی جس سے دوسرے روز یہ اسرائیلی لڑ رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس فرعونی کو تو کل کے واقعہ قتل کا علم نہیں تھا وہ اسکی مخبری کیسے کرسکتا تھا اس کی خبر تو صرف اسی لڑنے والے اسرائیلی کو معلوم تھی۔

جب حضرت معاویہؓ نے انکی حدیث کے اس واقعہ کا انکار کیا تو ابن عباسؓ کو غصہ آیا، اور حضرت معاویہؓ کا ہاتھ پکڑ کر سعد بن مالک زہریؓ کے پاس لے گئے اور اُن سے کہا کہ اے ابو اسحاق کیا تمھیں یاد ہے جب ہم سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قتیل موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حدیث بیان فرمائی، اس راز کا افشا کرنے والا اور فرعون کے پاس مخبری کرنے والا اسرائیلی تھا یا فرعونی۔ سعد بن مالک نے فرمایا کہ فرعونی تھا کیونکہ اُسنے اسرائیلی سے یہ سُن لیا تھا کہ کل کا واقعہ قتل موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ہوا تھا اسنے اسکی شہادت فرعون کے پاس دے دی،

امام نسائیؒ نے یہ پوری طویل حدیث اپنی کتاب سُنن کبریٰ کی کتاب التفسیر میں نقل فرمائی ہے۔

اور اس پوری حدیث کو ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں اسی یزید بن ہارون کی سند سے نقل کرکے کہا ہے کہ یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ ابن عباسؓ کا اپنا کلام ہے جس کو انھوں نے کعب بن احبار کی اُن اسرائیلی روایات سے لیا ہے جن کے نقل کرنے اور بیان کرنے کو جائز رکھا گیا ہے۔ ہاں کہیں کہیں اس کلام میں مرفوع حدیث کے جملے بھی شامل ہیں۔ امام ابن کثیر اپنی تفسیر میں اس پوری حدیث اور اُس پر مذکور الصدر تحقیق و تصدیق لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ہمارے شیخ ابوالحجاج مزی بھی ابن جریر اور ابن ابی حاتم کی طرح اس روایت کو موقوف یعنی ابن عباسؓ کا کلام قرار دیتے تھے۔ انتہیٰ (تفسیر ابن کثیر از ص۱۴۸ تا ص۱۵۳ جلد ۳)

مذکور الصدر قصہ موسیٰ علیہ السلام سے حاصل شدہ نتائج و عبر اور فوائد مہمہ

قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کا اسقدر اہتمام فرمایا ہے کہ اکثر سورتوں میں اسکا کچھ نہ کچھ ذکر آہی جاتا ہے

وجہ یہ ہے کہ یہ قصہ ہزاروں عبرتوں اور حکمتوں پر اور خداوند سبحانہٗ وتعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے عجیب مظاہر پر مشتمل ہے جس سے انسان کا ایمان پختہ ہوتا ہے اور اسمیں عملی اور اخلاقی ہدایتیں بھی بیشمار ہیں چونکہ اس جگہ یہ قصہ پوری تفصیل کے ساتھ آگیا ہے تو مناسب معلوم ہوا کہ اسکے ذیل میں آئی ہوئی عبرتوں، نصیحتوں اور ہدایتوں کا کچھ حصہ بھی لکھدیا جائے ۔

فرعون کی احمقانہ تدبیر اور اُس پر قدرتِ حق کا حیرت انگیز ردِّ عمل

فرعون کو جب یہ معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل میں کوئی لڑکا پیدا ہوگا جو فرعون کی سلطنت کے زوال کا سبب بنے گا تو اسرائیلی لڑکوں کی پیدائش بند کرنے کے لئے قتلِ عام کا حکم دیدیا۔ پھر اپنی ملکی اور ذاتی مصلحت سے ایک سال کے لڑکوں کو باقی رکھنے اور دوسرے سال کے لڑکوں کے قتل کرنے کا فیصلہ نافذ کردیا اللہ تعالیٰ کو قدرت تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو اُس سال میں پیدا کردیتے جو سال بچّوں کو باقی چھوڑنے کا تھا مگر قدرت کو منظور یہ ہوا کہ اس احمق کی اس ظالمانہ تدبیر کو پُوری طرح اس پر اُلٹ دیا جائے اور اسکو خوب بیوقوف بنایا جائے ۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو اس سال میں پیدا فرمایا جو لڑکوں کے قتل کا سال تھا اور اپنی حکمتِ بالغہ سے صورت ایسی پیدا کردی کہ موسیٰ علیہ السلام خود اس جبار ظالم کے گھر میں پرورش پائیں، فرعون اور اُس کی بیوی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شوق ورغبت سے اپنے گھر میں پالا، سارے شہر کے اسرائیلی لڑکے موسیٰ کے شبہ میں قتل ہو رہے تھے اور موسیٰ علیہ السلام خود فرعون کے گھر میں آرام وآسائش اور عزت واکرام کے ساتھ اُن کے خرچ پر پرورش پا رہے تھے ؎

در بہ بند و دشمن اندر خانہ بُود　✤　حیلۂ فرعون زیں افسانہ بُود

موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر معجزانہ انعام اور فرعونی تدبیر کا ایک اور انتقام

حضرت موسیٰ علیہ السلام اگر عام بچّوں کی طرح کسی اُنّا کا دودھ قبول کرلیتے تو اُن کی پرورش اپنے دشمن فرعون کے گھر پھر بھی آرام کے ساتھ ہوتی مگر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اُن کی جُدائی سے پریشان رہتیں اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی کسی کافر عورت کا دودھ ملتا ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو کافر عورت کے دودھ سے بھی بچالیا اور اُن کی والدہ کو بھی جُدائی کی پریشانی سے نجات دی اور نجات بھی اس طرح کہ فرعون کے گھر والے ان کے ممنونِ احسان ہوئے ان پر ہدایا اور تحفوں کی بارش ہوئی اور اپنے ہی محبوب بچے کو دودھ پلانے پر فرعونی دربار سے معاوضہ بھی ملا اور عام ملازموں کی طرح فرعون کے گھر میں بھی رہنا نہ پڑا فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۔

صنعت کاروں، تاجروں وغیرہ کیلئے ایک بشارت

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو صنعت کار اپنی صنعت وحرفت میں نیت نیک ثواب کی رکھے اُس کی مثال

موسیٰ علیہ السلام کی والدہ جیسی ہوجاتی ہے کہ اپنے ہی بچے کو دودھ پلاجائیں اور اسکا دوسروں سے معاوضہ لیں (ابن کثیر) مطلب یہ ہے کہ کوئی معمار مسجد، خانقاہ، مدرسہ یا کوئی رفاہِ عام کا ادارہ تعمیر کرتا ہے اگر اُس کی نیت صرف اپنی مزدوری کرنے اور پیسے کمانے کی ہے تو اس کو صرف وہی ملے گا، اور اگر اُس نے نیت یہ بھی کرلی کہ یہ تعمیرات نیک کاموں میں آئیں گی اُن سے اہلِ دین کو نفع پہنچے گا اس لئے دوسری قسم کی تعمیرات پر اُن کو ترجیح دی تو اسکو اُمِّ موسیٰ علیہ السلام کی طرح مزدوری بھی ملے گی اور اپنا دینی فائدہ بھی۔

اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو ایک محبوبیت کی شان عطا ہوتی ہے کہ ہر دیکھنے والا اُن سے محبت کرتا ہے

وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ میں اسطرف اشارہ فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کو ایک خاص شان محبوبیت کی عطا فرما دیتے ہیں جن کو دیکھ کر اپنا پرایا، دوست دشمن سب محبت کرنے لگتے ہیں انبیاء علیہم السلام کا تو بڑا مقام ہے بہت سے اولیاء اللہ میں بھی اس محبوبیت کا مشاہدہ ہوتا رہا ہے

فرعونی کافر شخص کا قتل جو موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ ہوگیا اسکو خطا کس بنا پر قرار دیا گیا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک اسرائیلی مسلمان سے ایک فرعونی کافر کو لڑتا ہوا دیکھ کر فرعونی کو مُکا مارا جس سے وہ مرگیا اُس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود بھی عمل شیطان فرمایا اور اللہ تعالیٰ سے اس خطا کی معافی طلب کی وہ معاف بھی کردی گئی۔

مگر یہاں ایک فقہی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرعونی شخص ایک کافر حربی تھا جس سے موسیٰ علیہ السلام کا کوئی معاہدہ صلح بھی نہ تھا نہ اُس کو اہلِ ذمہ کافروں کی فہرست میں داخل کیا جاسکتا ہے جن کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت مسلمانوں پر واجب ہوتی ہے، یہ تو حربی کافر تھا جس کا حکم اسلامی شریعت میں یہ ہے کہ وہ مباح الدم ہے اسکا قتل کوئی گناہ نہیں، پھر یہاں اس کو عمل شیطان اور خطا کس بنا پر قرار دیا گیا۔

عام کتب تفسیر میں کسی نے اس سوال سے تعرض نہیں کیا۔ احقر جب سیدی حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی کے حکم سے احکام القرآن کی تصنیف میں مشغول تھا اور اسمیں یہ واقعہ زیرِ تحریر آیا تو حضرت نے اس سوال کا جواب یہ دیا تھا کہ اگرچہ اس فرعونی شخص سے براہِ راست کوئی صریح معاہدہ صلح یا ذمہ کا نہیں تھا مگر چونکہ اُسوقت نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حکومت تھی نہ اس فرعونی کی، بلکہ دونوں حکومتِ فرعون کے شہری تھے اور ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن تھے یہ ایک قسم کا عملی معاہدہ تھا، فرعونی کے قتل میں اس عملی معاہدہ کی خلاف ورزی ہوئی اسلئے اسکو خطا قرار دیا گیا اور یہ خطا چونکہ قصداً نہیں بلکہ اتفاقاً ہوگئی اسلئے موسیٰ علیہ السلام کی عصمت نبوت کے منافی نہیں۔

سیدی حضرت حکیم الامتؒ اسی بنا پر مشترک ہندوستان میں جبکہ مسلمان اور ہندو دونوں انگریز کی حکومت میں رہتے تھے کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہ رکھتے تھے کہ وہ کسی ہندو کی جان و مال پر ظلم کرے ۔

ضعیفوں کی امداد اور خدمت خلق دین و دُنیا کے لئے نافع اور مفید کام حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شہر مَدْیَن سے باہر کنوئیں پر دو عورتوں کو دیکھا جو اپنے ضعف کی بنا پر اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلا سکتی تھیں، یہ عورتیں بالکل اجنبی، اور موسیٰ علیہ السلام ایک مسافر تھے مگر ضعیفوں کی امداد و خدمت مقتضائے شرافت اور اللہ کے نزدیک محبوب عمل تھا اسلئے اُن کے واسطے محنت اُٹھائی، اور اُنکی بکریوں کو پانی پلا دیا اسکا اجر و ثواب تو اللہ کے پاس بڑا ہے۔ دُنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے انکے اسی عمل کو مسافرانہ بیکسی اور بے سروسامانی کا ایسا علاج بنا دیا جو اُن کی اگلی زندگی اُن کی شان کے مطابق سنوارنے کا ذریعہ بن گیا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت اور اُن کی دامادی کا شرف حاصل ہوا، جوان ہونے کے بعد جو کام اُن کی والدہ کو کرنا تھا اللہ تعالیٰ نے غربت کے عالم میں اپنے ایک نبی کے ہاتھ سے انجام دلوایا۔

دو پیغمبروں میں اجیر اور آجر کا معاملہ اور اس کی حکمتیں اور فوائد عجیبہ موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے مکان پر پہنچ کر فرعونی سپاہیوں کے خوف سے مطمئن ہوئے تو حضرت شعیب علیہ السلام نے صاجزادی کے مشورہ پر اُن کو اپنے یہاں اجیر رکھنے کا خیال ظاہر فرمایا اسمیں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں اور خلق اللہ کے لئے اہم ہدایتیں ہیں۔

اوّل یہ کہ شعیب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی و رسول تھے ایک مسافر غریب الوطن کی اتنی امداد اُن سے کچھ مستبعد نہ تھی کہ کچھ عرصہ اپنے یہاں بلا کسی معاوضہ خدمت کے مہمان رکھ لیتے مگر غالباً اُنھوں نے پیغمبرانہ فراست سے موسیٰ علیہ السلام کا عالی حوصلہ ہونا معلوم کر کے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ دیر تک مہمانی قبول نہ کریں گے اور کسی دوسری جگہ چلے گئے تو اُن کو تکلیف ہوگی اسلئے بے تکلف معاملہ کی صورت اختیار کرلی جسمیں دوسروں کے لئے بھی یہ ہدایت ہے کہ کسی کے گھر جا کر اپنا بار اُس پر ڈالنا شرافت کے خلاف ہے۔

دوسرے اسمیں یہ حکمت بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت و رسالت سے فائز کرنا چاہتے تھے جس کے لئے اگرچہ کوئی مجاہدہ و عمل نہ شرط ہے اور نہ وہ کسی عمل و مجاہدہ کے ذریعہ حاصل کیجا سکتی ہے وہ تو خالص اللہ تعالیٰ کیطرف سے عطیہ اور انعام ہوتا ہے مگر عادۃ اللہ یہ ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کو بھی مجاہدات اور محنت و مشقت کے دَور سے گزارتے ہیں جو اخلاقِ انسانی کی تکمیل کا ذریعہ اور دوسروں کی اصلاح کا بڑا سبب بنتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی اسوقت تک شاہانہ اعزاز و اکرام میں گزری تھی آگے اُن کو خلقِ خدا کے لئے ہادی و رہبر اور انکا

مصلح بننا تھا، حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھ اس مزدوری و محنت کے معاہدہ میں اُن کی اخلاقی تربیت کا راز بھی پوشیدہ تھا، عارف شیرازی نے اسی کو کہا ہے ؎

شبان وادیٔ ایمن گہے رسد بمراد ✽ کہ چند سال بجاں خدمتِ شعیب کند

تیسرے جو خدمت ان سے لی گئی وہ بکریاں چرانے کی تھی، یہ عجیب بات ہے کہ یہ کام اکثر انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا ہے شاید اسمیں یہ راز بھی ہو کہ بکری ایسا جانور ہے جو گلے سے آگے پیچھے بھاگنے کا عادی ہوتا ہے جس پر چرانے والے کو بار بار غصہ آتا ہے، اس غصہ کے نتیجہ میں اگر وہ اس بھاگنے والی بکری سے قطع نظر کرے تو بکری ہاتھ سے گئی وہ کسی بھیڑیئے کا لقمہ بنے گی اور اپنی مرضی کے تابع چلانے کے لئے اسکو مار پیٹ کرے تو وہ کمزور اتنی ہے کہ ذرا چوٹ مارو تو ٹانگ ٹوٹ جانے اس لئے چرواہے کو بڑے صبر و حلم سے کام لینا پڑتا ہے۔ عام خلق خدا تعالیٰ کا بھی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایسا ہی حال ہوتا ہے جسمیں انبیاء نہ اُن سے صرفِ نظر کر سکتے ہیں اور نہ زیادہ تشدد کر کے اُن کو راستہ پر لا سکتے ہیں صبر و حلم ہی کو شیوہ بنانا پڑتا ہے۔

کسی کو کوئی عہدہ اور ملازمت سپرد کرنے کے لئے بہترین دستور العمل اس قصہ میں شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی نے جو اپنے والد کو یہ مشورہ دیا کہ ان کو ملازم رکھ لیا جائے اس مشورہ کی دلیل یہ بیان فرمائی کہ بہترین اجیر وہ شخص ہو سکتا ہے جو قوی بھی ہو امین بھی۔ قوی سے مراد اس کام کی قوت و صلاحیت والا ہونا ہے جو کام اُسکے سپرد کرنا ہے اور امین سے مراد یہ ہے کہ اُس کی سابقہ زندگی کے حالات اس کی امانت و دیانت پر شاہد ہوں، آجکل مختلف ملازمتوں اور سرکاری وغیر سرکاری عہدوں کے لئے انتخاب کا جو اصول رکھا جاتا ہے اور درخواست گزار میں جن اوصاف کو دیکھا جاتا ہے اگر غور کریں تو سب کے سب ان دو لفظوں میں جمع ہیں بلکہ اُن کے تفصیلی شرائط میں بھی یہ جامعیت عموماً نہیں ہوتی، کیونکہ امانت و دیانت تو کہیں زیرِ غور ہی نہیں آتی صرف علمی قابلیت کی ڈگریاں معیار ہوتی ہیں، اور آجکل جہاں کہیں سرکاری وغیر سرکاری اداروں کے نظام میں ابتری پائی جاتی ہے وہ بیشتر اسی اصولِ دیانت کو نظر انداز کرنیکا نتیجہ ہوتا ہے۔ قابل اور عاقل آدمی جب امانت و دیانت سے کورا ہوتا ہے تو پھر وہ کام چوری اور رشوت خوری کے بھی ایسے ایسے راستے نکال لیتا ہے کہ کسی قانون کی گرفت میں نہ آسکے۔ اسی نے آج دُنیا کے بیشتر سرکاری وغیر سرکاری اداروں کو بیکار بلکہ مضر بنا رکھا ہے۔ اسلامی نظام میں اسی لئے اس کو بڑی اہمیت دی گئی ہے جس کے برکات دُنیا نے صدیوں تک دیکھے ہیں۔

ساحروں اور پیغمبر کے معاملات میں کھلا ہوا فرق فرعون نے جن جادوگروں کو جمع کیا تھا اور پورے ملک و قوم کا خطرہ اُن کے سامنے رکھ کر کام کرنے کو کہا تھا اسکا تقاضا یہ تھا کہ وہ خود اپنا کام سمجھ کر

اس خدمت کو دل وجان سے انجام دیتے مگر وہاں ہوا یہ کہ خدمت شروع کرنے سے پہلے سودے بازی شروع کر دی کہ ہمیں کیا ملے گا۔

اس کے بالمقابل تمام انبیاء علیہم السلام کا عام اعلان یہ ہوتا ہے وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ، یعنی میں تم سے اپنی خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، اور انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ و دعوت کے مؤثر ہونے میں اُن کے اس استغناء کا بڑا دخل ہے۔ جب سے علماء دین اہل فتویٰ اہل خطابت و وعظ کی خدمت کا انتظام اسلامی بیت المال میں نہیں رہا ان کو اپنی تعلیم اور وعظ و امامت پر تنخواہ لینے کی مجبوری پیش آئی وہ اگرچہ متاخرین فقہاء کے نزدیک بدرجۂ مجبوری جائز قرار دی گئی مگر اسمیں شبہ نہیں کہ اس معاوضہ لینے کا اثر تبلیغ و دعوت اور اصلاح خلق پر نہایت بُرا ہوا جس نے اُن کی کوششوں کا فائدہ بہت ہی کم کر دیا۔

فرعونی جادوگروں کے جادو کی حقیقت ان لوگوں نے اپنی لاٹھیوں اور رسیوں کو بظاہر سانپ بنا کر دکھلایا تھا کیا وہ واقعی سانپ بن گئی تھیں اسکے متعلق الفاظ قرآن يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقۃً سانپ نہیں بنی تھی بلکہ یہ ایک قسم کا مسمریزم تھا جس نے خیالات حاضرین پر تصرف کر کے ایک قسم کی نظر بندی کر دی کہ حاضرین کو وہ چلتے پھرتے سانپ دکھائی دینے لگے۔

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی جادو سے کسی شئے کی حقیقت تبدیل ہی نہیں ہو سکتی، اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان جادوگروں کا جادو تبدیل حقیقت کے درجہ کا نہیں تھا۔

قبائلی تقسیم معاشرتی معاملات کی حد تک کوئی مذموم عمل نہیں اسلام نے وطنی، لسانی، نسبی، قبائلی تقسیموں کو قومیت کی بنیاد بنانے پر سخت نکیر کیا ہے اور ان تفرقوں کو مٹانے کی ہر قدم ہر کام میں کوشش کی ہے بلکہ اسلامی سیاست کا سنگ بنیاد ہی اسلام کی دینی قومیت ہے جسمیں عربی، عجمی، حبشی، فارسی، ہندی، سندھی سب ایک قوم کے افراد ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنے کے لئے سب سے پہلا کام مہاجرین وانصار میں یگانگت اور مواخات قائم کرنے سے شروع فرمایا تھا اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں قیامت تک کے لئے یہ دستور العمل دیدیا تھا کہ علاقائی اور نسبی اور لسانی امتیازات سب بُت ہیں جن کو اسلام نے توڑ ڈالا ہے، لیکن معاشرتی معاملات میں ایک حد تک ان امتیازات کی رعایت کو گوارا کیا گیا ہے کیونکہ کھانے پینے رہنے سہنے کے طریقے مختلف قبائل اور مختلف اوطان کے الگ الگ ہوتے ہیں اُس کے خلاف کرنا تکلیف شدید ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جن بنی اسرائیلیوں کو مصر سے ساتھ لیکر نکلے تھے اُن کے

بارہ قبیلے تھے، حق تعالیٰ نے ان قبیلوں کے امتیاز کو معاشرتی معاملہ میں جائز رکھا اور دریا میں بھی جو راستے بطور معجزہ پیدا فرمائے تو بارہ راستے الگ الگ ہر قبیلے کے لئے پیدا فرمائے، اسی طرح وادی تیہ میں جس پتھر سے بطور معجزہ پانی کے چشمے جاری ہوتے تھے وہ بھی بارہ ہوتے تھے۔ تاکہ قبائل میں مزاحمت نہ ہو، ہر ایک قبیلہ اپنا مقررہ پانی حاصل کرے۔ واللہ اعلم

جماعتی انتظام کے لئے خلیفہ اور نائب بنانا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب ایک مہینے کے لئے اپنی قوم سے الگ ہو کر کوہِ طور پر عبادت میں مشغول ہونا چاہا تو ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر سب کو ہدایت کی کہ میرے پیچھے سب ان کی اطاعت کرنا تاکہ آپس میں اختلاف و نزاع نہ پھوٹ پڑے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی جماعت یا خاندان کا بڑا اگر کہیں سفر پر جائے تو سُنتِ انبیاء یہ ہے کہ کسی کو اپنا قائم مقام خلیفہ بنا جائے جو انکے نظم و ضبط کو قائم رکھے۔

مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ سے بچنے کے لئے بڑی سے بڑی بُرائی کو وقتی طور پر برداشت کیا جاسکتا ہے۔

بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری کے وقت جو گوسالہ پرستی کا فتنہ پھوٹا اور اُن کے تین فرقے ہوگئے حضرت ہارون علیہ السلام نے سب کو دعوتِ حق تو دی مگر اُن میں سے کسی فرقہ سے کُلی اجتناب اور بیزاری و علیحدگی کا موسیٰ علیہ السلام کے آنے تک اعلان نہیں کیا۔ اس پر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ناراض ہوئے تو اُنھوں نے یہی عذر پیش کیا کہ میں تشدد کرتا تو بنی اسرائیل کے ٹکڑے ہوجاتے اُن میں تفرقہ پھیل جاتا، اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ، یعنی میں نے اس لئے کسی بھی فرقہ سے علیحدگی اور بیزاری کا شدت سے اظہار نہیں کیا کہ کہیں آپ واپس آکر مجھے یہ الزام نہ دیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا اور میری ہدایت کی پابندی نہیں کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اُن کے عذر کو غلط نہیں قرار دیا بلکہ صحیح تسلیم کر کے اُن کے لئے دُعاء و استغفار کیا اس سے یہ ہدایت نکلتی ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ سے بچنے کے لئے وقتی طور پر اگر کسی بُرائی کے معاملے میں نرمی برتی جائے تو درست ہے واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

قصۂ موسیٰ علیہ السلام کی جو آیات اُوپر لکھی گئی ہیں اُن کے آخر میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کی ہدایت کے لئے بھیجنے کا حکم ایک خاص ہدایت کے ساتھ دیا گیا ہے یعنی فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰى ۔ اسمیں۔

پیغمبرانہ دعوت کا ایک اہم اصول

یہ بیان ہوا ہے کہ فریقِ مخالف کتنا ہی سرکش اور غلط سے غلط عقائد و خیالات کا حامل ہو اصلاح و ہدایت کا فریضہ انجام دینے والوں پر لازم ہے کہ اسکے ساتھ بھی ہمدردانہ خیر خواہانہ انداز سے بات نرم کریں اسی کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ مخاطب کچھ

غور و فکر پر مجبور ہو جائے اور اسکے دل میں خدا کا خوف پیدا ہو جائے۔

فرعون جو خدائی کا دعویدار جبّار اور ظالم ہے، جو اپنی ذات کی حفاظت کے لئے ہزارہا بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کا مجرم ہے اُس کی طرف بھی اللہ تعالیٰ اپنے خاص پیغمبروں کو بھیجتے ہیں تو یہ ہدایت نامہ دے کر بھیجتے ہیں کہ اُس سے بات نرم کریں تاکہ اسکو غور و فکر کا موقع ملے۔ اور یہ اُس پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ فرعون اپنی سرکشی سے اور گمراہی سے باز آنے والا نہیں ہے مگر اپنے پیغمبروں کو اس اُصول کا پابند کرنا تھا جس کے ذریعہ خلق خدا سوچنے سمجھنے پر مجبور ہو کر خدا تعالیٰ کے خوف کی طرف آجائے۔ فرعون کو ہدایت ہو یا نہ ہو مگر اصول وہ ہونا چاہیئے جو ہدایت و اصلاح کا ذریعہ بن سکے۔

آجکل جو بہت سے اہلِ علم اپنے اختلافات میں ایک دوسرے کے خلاف زبان درازی اور الزام تراشی کو اسلام کی خدمت سمجھ بیٹھے ہیں اُنھیں اس پر بہت غور کرنا چاہیئے۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی ﴿۴۵﴾ قَالَ

بولے اے رب ہمارے ہم ڈرتے ہیں کہ جھبک پڑے ہم پر یا جوش میں آجائے فرمایا

لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی ﴿۴۶﴾ فَاْتِیٰهُ فَقُوْلَآ

نہ ڈرو میں ساتھ ہوں تمہارے سُنتا ہوں اور دیکھتا ہوں سو جاؤ اس کے پاس اور کہو

اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّکَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۬ۙ وَلَا

ہم دونوں بھیجے ہوئے ہیں تیرے رب کے سو بھیجدے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو اور مت

تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰکَ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰی مَنِ

ستا ان کو ہم آئے ہیں تیرے پاس نشانی لیکر تیرے رب کی اور سلامتی ہو اسکی جو مان لے

اتَّبَعَ الْهُدٰی ﴿۴۷﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی

راہ کی بات ہم کو حکم ملا ہے کہ عذاب اس پر ہے جو جھٹلائے

مَنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ﴿۴۸﴾ قَالَ فَمَنْ رَّبُّکُمَا یٰمُوْسٰی ﴿۴۹﴾ قَالَ

اور منہ پھیرے بولا پھر کون ہے رب تم دونوں کا اے موسیٰ کہا

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ﴿۵۰﴾

رب ہمارا وہ ہے جس نے دی ہر چیز کو اس کی صورت پھر راہ سمجھائی

خلاصۂ تفسیر

(جب یہ حکم دونوں صاحبوں کو پہنچ چکا تو) دونوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار (ہم تبلیغ کے لئے حاضر ہیں لیکن) ہم کو اندیشہ ہے کہ (کہیں) وہ ہم پر (تبلیغ سے پہلے ہی) زیادتی نہ کر بیٹھے (کہ تبلیغ ہی رہ جاوے) یا یہ کہ (عین تبلیغ کے وقت اپنے کفر میں) زیادہ شرارت نہ کرنے لگے (کہ اپنی بک بک میں تبلیغ نہ سُنے نہ سننے دے جس سے وہ عدم تبلیغ کے برابر ہوجاوے) ارشاد ہوا کہ (اس امر سے مُطلق) اندیشہ نہ کرو (کیونکہ) میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سب سُنتا دیکھتا ہوں (میں تمہاری حفاظت کروں گا اور اُس کو مرعوب کردوں گا جس سے پوری تبلیغ کرسکو گے جیسا دوسری آیت میں ہے نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا) سو تم (بے خوف و خطر) اس کے پاس جاؤ اور (اس سے) کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے فرستادے ہیں (کہ ہم کو نبی بنا کر بھیجا ہے) سو (تو ہماری اطاعت کر اصلاحِ عقیدہ میں بھی کہ توحید کی تصدیق کر اور اصلاحِ اخلاق میں بھی کہ ظلم وغیرہ سے باز آ اور) بنی اسرائیل کو (جن پر تو ناحق ظلم کرتا ہے اپنے پنجۂ ظلم سے رہا کرکے) ہمارے ساتھ جانے دے (کہ جہاں چاہیں اور جس طرح چاہیں رہیں) اور ان کو تکلیفیں مت پہنچا (اور) ہم (جو دعوٰی نبوت کا کرتے ہیں تو خالی خولی نہیں بلکہ ہم) تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے (اپنی نبوت کا) نشان (یعنی معجزہ بھی) لائے ہیں اور (تصدیق اور قبول حق کا ثمرہ اس قاعدہ کلیہ سے معلوم ہوگا کہ) ایسے شخص کے لئے (عذاب الٰہی سے) سلامتی ہے جو (سیدھی) راہ پر چلے (اور تکذیب وردِّ حق کے باب میں) ہمارے پاس یہ حکم پہنچا ہے کہ (اللہ کا) عذاب (قہر کا) اس شخص پر ہوگا جو (حق کو) جھٹلاوے اور (اس سے) روگردانی کرے (غرض یہ سارا مضمون جا کر اس سے کہو چنانچہ دونوں حضرات تشریف لے گئے اور جا کر اس سے سب کہدیا) وہ کہنے لگا کہ پھر (یہ تو بتلاؤ کہ) تم دونوں کا رب کون ہے (جس کے تم اپنے کو فرستادہ بتلاتے ہو) اے موسیٰ (جواب میں) موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کہ ہمارا (دونوں کا بلکہ سب کا) رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب بناوٹ عطا فرمائی پھر (ان میں جو جاندار چیزیں تھیں اُن کو ان کے منافع و مصالح کی طرف) رہنمائی فرمائی (چنانچہ ہر جانور اپنی مناسب غذا اور جوڑہ اور مسکن وغیرہ ڈھونڈ لیتا ہے پس وہی ہمارا بھی رب ہے)۔

معارف و مسائل

حضرت موسیٰ کو خوف کیوں ہوا | إِنَّنَا نَخَافُ ، حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے اس جگہ اللہ تعالیٰ کے سامنے دو طرح کے خوف کا اظہار کیا۔ ایک اَنْ يَفْرُطَ کے لفظ سے جس کے اصلی

معنے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ شاید فرعون ہماری بات سننے سے پہلے ہی ہم پر حملہ کر دے، و دوسرا خوف ان یطغیٰ کے لفظ سے بیان فرمایا جسکا مطلب یہ ہے کہ ممکن ہے وہ اس سے بھی زیادہ سرکشی پر اُتر آئے کہ آپ کی شان میں نامناسب کلمات بکنے لگے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابتدار کلام میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصب نبوت و رسالت عطا فرمایا گیا اور اُنھوں نے حضرت ہارون کو اپنے ساتھ شریک کرنے کی درخواست کی اور یہ درخواست قبول ہوئی تو اُسی وقت حق تعالیٰ نے اُن کو یہ بتلا دیا تھا کہ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا، نیز یہ بھی اطمینان دلا دیا گیا تھا کہ آپ کی درخواست میں جو جو چیزیں طلب کی گئی ہیں وہ سب ہم نے آپ کو دیدیں قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى، ان مطلوب چیزوں میں شرح صدر بھی تھا جسکا حاصل یہی تھا کہ مخالف سے کوئی دل تنگی اور خوف و ہراس پیدا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں کے بعد پھر یہ خوف اور اسکا اظہار کیسا ہے؟ اسکا ایک جواب تو یہ ہے کہ پہلا وعدہ کہ ہم آپ کو غلبہ عطا کریں گے اور وہ لوگ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے یہ ایک مبہم وعدہ ہے کہ مراد غلبہ سے حجت و دلیل کا غلبہ بھی ہو سکتا ہے اور مادی غلبہ بھی۔ نیز یہ خیال بھی ہو سکتا ہے کہ اُن پر غلبہ تو جب ہوگا کہ وہ ان کے دلائل سُنیں معجزات دیکھیں مگر خطرہ یہ ہے کہ وہ کلام سُننے سے پہلے ہی اُن پر حملہ کر بیٹھے اور شرح صدر کے لئے یہ لازم نہیں کہ طبعی خوف بھی جاتا رہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خوف کی چیزوں سے طبعی خوف تو تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے جو وعدوں پر پُورا ایمان و یقین ہونے کے باوجود بھی ہوتا ہے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی ہی لاٹھی کے سانپ بن جانے کے بعد اُسکے پکڑنے سے ڈرنے لگے تو حق تعالیٰ نے فرمایا لَا تَخَفْ ڈرو نہیں اور دوسرے تمام مواقع خوف میں ایسا ہی ہوتا رہا کہ طبعی اور بشری خوف لاحق ہوا پھر اللہ تعالیٰ نے بشارت کے ذریعہ اس کو زائل فرمایا۔ اسی واقعہ کی آیات میں فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ اور فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا اور فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى کی آیات اس مضمون پر شاہد ہیں حضرت خاتم الانبیاء اور سید الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم نے اسی بشری خوف کی وجہ سے مدینہ شریف کی طرف اور کچھ صحابہ کرام نے پہلے حبشہ کی پھر مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ غزوۂ احزاب میں اسی خوف سے بچنے کے لئے خندق کھودی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کیطرف سے وعدہ نصرت و غلبہ بار بار آچکا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ مواعید ربانی سے یقین تو ان سب کو پُورا حاصل تھا مگر طبعی خوف جو مقتضائے بشریت انبیاء میں بھی ہوتا ہے وہ اس کے منافی نہیں۔

اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم دونوں کیساتھ ہوں سب کچھ سنتا اور دیکھتا رہونگا۔ معیت سے مُراد نصرت و امداد ہے جسکی پُوری حقیقت و کیفیت کا ادراک انسان کو نہیں ہو سکتا۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوتِ ایمان کے ساتھ اپنی قوم کو معاشی مصیبت سے بھی چھڑانے کی دعوت دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام جیسے خلق خدا کو ہدایت ایمان دینے کا منصب رکھتے ہیں اسی طرح اپنی اُمت کو دُنیوی اور معاشی مصائب سے آزاد کرنا بھی اُنکے منصب میں شامل ہوتا ہے اسلئے قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوتِ فرعون میں دونوں چیزیں شامل ہیں اوّل اللہ پر ایمان، دوسرے بنی اسرائیل کی آزادی، خصوصاً اس آیت مذکورہ میں تو صرف اسی دوسرے جزر کے ذکر پر اکتفار فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا اور پھر ہر ایک کے وجود کے مناسب اسکو ہدایت فرمائی جس سے وہ اس کام میں لگ گئی

تفصیل اسکی یہ ہے کہ ایک ہدایت جو انبیاء علیہم السلام کا وظیفہ اور فرض منصبی ہے وہ تو خاص ہدایت ہے جس کے مخاطب اہل عقول انسان اور جنات ہی ہوتے ہیں۔ ایک دوسری قسم کی تکوینی ہدایت بھی ہے جو مخلوقات میں ہر چیز کے لئے عام اور شامل ہے۔ آگ، پانی، مٹی اور ہوا اور ان سے مرکب ہونیوالی ہر شئ کو حق تعالیٰ نے ایک خاص قسم کا ادراک شعور دیا ہے جو اگرچہ انسان و جن کی برابر نہیں، اسی لئے احکام حلال و حرام ان چیزوں پر عائد نہیں ہوتے مگر ادراک و شعور سے خالی نہیں، اسی ادراک شعور کے راستہ حق تعالیٰ نے ہر شئے کو اسکی ہدایت کردی کہ تو کس کام کے لئے پیدا کی گئی ہے، تجھے کیا کرنا ہے۔ اسی تکوینی حکم اور ہدایت کے تابع زمین و آسمان اور اُن کی تمام مخلوقات اپنے اپنے کام اور اپنی اپنی ڈیوٹی پر لگے ہوئے ہیں۔ چاند سورج اپنا کام کر رہے ہیں اور دوسرے سیارے و ثوابت اپنے اپنے کام میں اسطرح لگے ہوئے ہیں کہ ایک منٹ یا سیکنڈ کا بھی کبھی فرق نہیں ہوتا۔ ہوا، پانی، آگ اور مٹی اپنی اپنی منشار پیدائش میں لگے ہوئے اُن سے بغیر حکم ربانی سر مُو فرق نہیں کرتے۔ ہاں جب اُن کا حکم ہوتا ہے تو کبھی آگ گلزار بھی بنجاتی ہے جیسے ابراہیم علیہ السلام کے لئے، اور کبھی پانی آگ کا بھی کام کرنے لگتا ہے جیسے قوم نوح کیلئے اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا، بچّہ کو ابتدار پیدائش کے وقت جبکہ اسکو کوئی بات سکھانا کسی کے بس میں نہیں یہ کس نے سکھایا کہ ماں کی چھاتی سے اپنی غذا حاصل کرے اسکے لئے چھاتی کو دبا کر چُوسنے کا ہُنر کس نے بتلایا، بھوک پیاس سردی گرمی کی تکلیف ہو تو رو پڑنا اُس کی ساری ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے مگر یہ رونا کس نے سکھایا یہ وہی ہدایت ربانی ہے جو ہر مخلوق کو اسکی حیثیت اور ضرورت کے مطابق غیب سے بغیر کسی کی تعلیم کے عطا ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کیطرف سے ایک عام ہدایت تکوینی ہر ہر مخلوق کے لئے ہے جسکی ہر مخلوق

تکوینی طور پر پابند ہے اور اسکے خلاف کرنا اسکی قدرت سے خارج ہے، دوسری ہدایت خاص اہل عقول انسان و جن کے لئے ہے یہ ہدایت تکوینی اور جبری نہیں بلکہ اختیاری ہوتی ہے، اسی اختیار کے نتیجہ میں اُس پر ثواب یا عذاب مرتب ہوتا ہے أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ میں پہلی ہی قسم کی ہدایت مذکور ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو سب سے پہلے رب العالمین کا وہ کام بتلایا جو ساری مخلوق پر حاوی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کام ہم نے یا کسی دوسرے انسان نے کیا ہے۔ فرعون اسکا تو کوئی جواب نہ دے سکا اب ادھر اُدھر کی باتوں میں ٹلایا اور ایک سوال موسیٰ علیہ السلام سے کیا کہ جسکا حقیقی جواب عوام سُنیں تو موسیٰ علیہ السلام سے بدگمان ہو جائیں وہ یہ کہ پچھلے دور کی تمام اُمتیں اور اقوام عالم جو بتوں کی پرستش کرتے رہے آپکے نزدیک اُن کا کیا حکم ہے وہ کیسے ہیں اُن کا انجام کیا ہوا؟ مقصد یہ تھا کہ اسکے جواب میں موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کہ یہ سب گمراہ اور جہنمی ہیں تو مجھے یہ کہنے کا موقع ملیگا کہ لو یہ ساری دُنیا ہی کو بیوقوف گمراہ اور جہنمی سمجھتے ہیں اور لوگ یہ سُنکر اُن سے بدگمان ہونگے تو ہمارا مقصد پورا ہو جائیگا مگر پیغمبر خدا موسیٰ علیہ السلام نے اسکا ایسا حکیمانہ جواب دیا جس سے اُسکا یہ منصوبہ غلط ہو گیا۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ ﴿٥١﴾ قَالَ عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي

بولا پھر کیا حقیقت ہے اُن پہلی جماعتوں کی کہا اُن کی خبر میرے رب کے پاس

فِي كِتَابٍ ۖ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى ﴿٥٢﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ

لکھی ہوئی ہے نہ بہکتا ہے میرا رب اور نہ بھولتا ہے وہ ہے جس نے بنا دیا تمہارے

الْأَرْضَ مَهْدًا وَسَلَكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ

واسطے زمین کو بچھونا اور چلائیں تمہارے لئے اسمیں راہیں اور اُتارا آسمان سے

مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّن نَّبَاتٍ شَتَّىٰ ﴿٥٣﴾ كُلُوا

پانی پھر نکالی ہم نے اُس سے طرح طرح کی سبزی کھاؤ

وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ ﴿٥٤﴾ ع

اور چراؤ اپنے چوپایوں کو البتہ اسمیں نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کو

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ﴿٥٥﴾

اسی زمین سے ہم نے تمکو بنایا اور اسی میں پھر پہنچا دیتے ہیں اور اسی سے نکالیں گے تم کو دوسری بار

وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿٥٦﴾ قَالَ اَجِئْتَنَا

اور ہم نے فرعون کو دکھلادیں اپنی سب نشانیاں، پھر اُسنے جھٹلایا اور نہ مانا بولا کیا تو آیا ہے

لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿٥٧﴾ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ

ہم کو نکالنے ہمارے ملک سے اپنے جادو کے زور سے اے موسیٰ سو ہم بھی لائیں گے تیرے مقابلہ میں

مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ

ایک ایسا ہی جادو، سو ٹھہرا لے ہمارے اور اپنے بیچ میں ایک وعدہ نہ ہم خلاف کریں اُس کا

وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿٥٨﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ

اور نہ تو ایک میدان صاف میں کہا وعدہ تمہارا ہے جشن کا دن

وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿٥٩﴾

اور یہ کہ جمع ہوں لوگ دن چڑھے

خلاصۂ تفسیر

فرعون نے (اس پر شبہ کیا اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى اور) کہا کہ اچھا تو پہلے لوگوں کا کیا حال ہوا (جو انبیاء کی تکذیب کرتے تھے اُن پر کون سا عذاب نازل ہوا) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا (کہ میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ عذاب موعود دُنیا ہی میں آنا ضرور ہے بلکہ کبھی دُنیا میں بھی آجاتا ہے اور آخرت میں ضرور ہی ہوگا چنانچہ) ان لوگوں (کی بداعمالیوں) کا علم میرے پروردگار کے پاس دفتر (اعمال) میں (محفوظ) ہے (گو ان کو دفتر کی حاجت نہیں مگر بعض حکمتوں سے ایسا ہی کیا گیا ہے غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے اعمال معلوم ہیں اور) میرا رب (ایسا جاننے والا ہے کہ) نہ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے (پس ان کے اعمال کا صحیح صحیح علم اسکو حاصل ہے مگر عذاب کے لئے وقت مقرر کر رکھا ہے جب وہ وقت آویگا وہ عذاب اُنپر جاری کردیا جاویگا۔ پس دُنیا میں عذاب نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کفر و تکذیب علت عذاب کی نہ ہو یہاں تک موسیٰ علیہ السلام کی تقریر ہو چکی آگے اللہ تعالیٰ نے اپنی شان ربوبیت کی کچھ تفصیل بیان فرماتے ہیں جسکا ذکر اجمالاً موسیٰ علیہ السلام کے اس کلام میں تھا رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى الخ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ الخ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ الخ چنانچہ ارشاد ہے کہ) وہ (رب) ایسا ہے جس نے تم لوگوں کے لئے زمین کو (مثل) فرش (کے) بنایا (کہ اس پر آرام کرتے ہو) اور

اس (زمین) میں تمہارے (چلنے کے) واسطے رستے بنائے اور آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اس (پانی) کے ذریعہ سے اقسام مختلفہ کے نباتات پیدا کئے (اور تم کو اجازت دی کہ) خود (بھی) کھاؤ اور اپنے مواشی کو (بھی) چراؤ ان سب (مذکورہ) چیزوں میں اہل عقل کے (استدلال کے) واسطے (قدرت الٰہیہ کی) نشانیاں ہیں (اور جس طرح نباتات کو زمین سے نکالتے ہیں اسی طرح) ہم نے تم کو اسی زمین سے (ابتدا میں) پیدا کیا، (چنانچہ آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے سو اُن کے واسطے سے سب کا مادہ بعید خاک ہوئی) اور اسی میں ہم تم کو (بعد موت) لے جاویں گے (چنانچہ کوئی مُردہ کسی حالت میں ہو لیکن آخر کو گو مدتوں کے بعد ہی مگر مٹی میں ضرور ملے گا) اور (قیامت کے روز) پھر دوبارہ اسی سے ہم تم کو نکال لیں گے (جیسا پہلی بار اس سے پیدا کر چکے ہیں)

اور ہم نے اس (فرعون) کو اپنی (وہ) سب ہی نشانیاں دکھلائیں (جو کہ موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی تھیں) سو وہ (جب بھی) جھٹلایا ہی کیا اور انکار ہی کرتا رہا (اور) کہنے لگا کہ اے موسیٰ تم ہمارے پاس (یہ دعویٰ لیکر) اسواسطے آئے ہو (گے) کہ ہم کو ہمارے مُلک سے اپنے جادو (کے زور) سے نکال باہر کرو (اور خود عوام کو فریفتہ اور تابع بنا کر رئیس بن جاؤ) سو اب ہم بھی تمہارے مقابلے میں ایسا ہی جادو لاتے ہیں تو ہمارے اور اپنے درمیان میں ایک وعدہ مقرر کر لو جسکے نہ ہم خلاف کریں اور نہ تم خلاف کرو کسی ہموار میدان میں (تاکہ سب دیکھ لیں) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا تمہارے (مقابلہ کے) وعدہ کا وقت وہ دن ہے جس میں (تمہارا) میلا ہوتا ہے، اور (جسمیں) دن چڑھے لوگ جمع ہو جاتے ہیں (اور ظاہر ہے کہ میلے کا موقع اکثر ہموار ہی زمین میں ہوتا ہے اسی سے مکان سوی کی شرط بھی پوری ہو جاوے گی)۔

معارف و مسائل

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى، فرعون نے پچھلی اُمتوں کے انجام کا سوال کیا تھا اگر اسکے جواب میں موسیٰ علیہ السلام اُن کے گمراہ اور جہنمی ہونیکا صاف طور سے اظہار کرتے تو فرعون کو موقع اس طعن کا ملجاتا کہ یہ تو صرف ہمیں ہی نہیں ساری دُنیا کو گمراہ جہنمی سمجھتے ہیں، اور عوام اس سے شبہ میں پڑ جاتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا حکیمانہ جواب دیا کہ بات بھی پوری آگئی اور فرعون کو بہکانے کا موقع نہ ملا۔ فرمایا کہ اُن کا علم میرے رب کے پاس ہے کہ اُنکا کیا انجام ہوگا، میرا رب نہ غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے۔ غلطی کرنے سے مُراد یہ ہے کہ کرنا کچھ چاہیے ہو جائے کچھ اور بھولنے کا مطلب ظاہر ہے۔

اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى، ازواج بمعنے انواع واصناف ہے اور شتّٰی شتیت

کی جمع ہے جس کے معنی ہیں متفرق۔ مُراد یہ ہے کہ نباتات کی اتنی بیشمار قسمیں پیدا فرمائیں کہ اُنکی قسموں کا احاطہ بھی انسان نہیں کرسکتا۔ پھر ہر نبات جڑی بوٹی، پھُول، پھل، درخت کی چھال میں اللہ تعالیٰ نے ایسی ایسی خاصیتیں رکھی ہیں کہ علم طب اور ڈاکٹری کے ماہرین حیران ہیں اور ہزاروں سال سے اسکی تحقیقات کا سلسلہ جاری ہونیکے باوجود یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اسکے متعلق جو کچھ لکھدیا گیا ہے وہ حرف آخر ہے اور یہ ساری نباتات کی مختلف قسمیں انسان اور اسکے پالتو جانوروں اور جنگلی جانوروں کی غذا یا دوا ہوتی ہیں، ان کی لکڑی سے انسان مکانوں کی تعمیر میں کام لیتا ہے۔ اور گھریلو سامانِ استعمال کی ہزاروں قسمیں بناتا ہے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ، اسی لئے اسکے آخر میں فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى، یعنی اسمیں بہت سی نشانیاں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی ہیں عقل والوں کے لئے۔ نہیٰ، نُہْيَةٌ کی جمع ہے نہیۃ عقل کو اس لئے کہا جاتا کہ وہ انسان کو بُرے اور مضر کاموں سے روکتی ہے۔

ہر انسان کے خمیر میں نُطفہ کے ساتھ اُس جگہ کی مٹی بھی شامل ہوتی ہے جہاں وہ دفن ہوگا

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ، منہا کی ضمیر زمین کیطرف راجع ہے اور معنے یہ ہیں کہ ہم نے تم کو زمین کی مٹی سے پیدا کیا مخاطب اسکے سب انسان ہیں حالانکہ عام انسانوں کی پیدائش مٹی سے نہیں بلکہ نطفہ سے ہوئی بجز آدم علیہ السلام کے کہ اُن کی پیدائش براہِ راست مٹی سے ہوئی تو یہ خطاب یا تو اس بناء پر ہوسکتا ہے کہ انسان کی اصل اور سب کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ہیں انکے واسطے سے سب کی تخلیق مٹی کیطرف منسوب کردینا کچھ بعید نہیں بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر نطفہ مٹی ہی کی پیداوار ہوتا ہے اسلئے نطفہ سے تخلیق درحقیقت مٹی ہی سے تخلیق ہوگئی امام قرطبی نے فرمایا کہ الفاظِ قرآن کا ظاہر یہی ہے کہ ہر انسان کی تخلیق مٹی سے ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر انسان کی تخلیق میں حق تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے مٹی شامل فرماتے ہیں اسلئے ہر ایک انسان کی تخلیق کو براہِ راست مٹی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ الفاظ قرآن کا ظاہر یہی ہے کہ ہر انسان کی تخلیق مٹی سے عمل میں آئی ہے اور حضرت ابوہریرہ رضؓ کی ایک حدیث اس پر شاہد ہے جسمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ ہر پیدا ہونیوالے انسان پر رحم مادر میں اُس جگہ کی مٹی کا کچھ جزء ڈالا جاتا ہے جس جگہ اُسکا دفن ہونا اللہ کے علم میں مقدر ہے۔ یہ حدیث ابونعیم نے ابن سیرین کے تذکرہ میں روایت کرکے فرمایا ہے ھٰذا حدیث غریب من حدیث عون لم نکتبہ الا من حدیث عاصم بن نبیل وھو احد الثقات الاعلام من اہل بصرہ، اور اسی مضمون کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی منقول ہے اور عطاء خراسانی نے فرمایا کہ جب رحم میں نطفہ قرار پاتا ہے تو جو فرشتہ اسکی

تخلیق پر مامور ہے وہ جاکر اس جگہ کی مٹی لاتا ہے جس جگہ اسکا دفن ہونا مقرر ہے اور یہ مٹی اُس نطفہ میں شامل کر دیتا ہے اس لئے تخلیق نطفہ اور مٹی دونوں سے ہوتی ہے اور اسی آیت سے استدلال کیا۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ (قرطبی)

تفسیر مظہری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر پیدا ہونیوالے بچے کی ناف میں ایک جزء مٹی کا ڈالا جاتا ہے اور جب مرتا ہے تو اُسی زمین میں دفن ہوتا ہے جہاں کی مٹی اُسکے خمیر میں شامل کی گئی تھی اور فرمایا کہ میں اور ابوبکر و عمر ایک ہی مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں اور اُسی میں دفن ہونگے۔ یہ روایت خطیب نے نقل کر کے فرمایا ہے کہ حدیث غریب ہے اور ابن جوزی نے اسکو موضوعات میں شمار کیا ہے مگر شیخ محدث میرزا محمد حارثی بدخشی رحؒ نے فرمایا کہ اس حدیث کے بہت سے شواہد حضرت ابن عمر، ابن عباس، ابوسعید، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں۔ جن سے اس روایت کو قوت پہنچتی ہے اس لئے یہ حدیث حسن (لغیرہ) سے کم نہیں (مظہری)

مَكَانًا سُوًى، فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے مقابلہ کے لئے یہ خود تجویز کیا کہ ایسے مقام پر ہونا چاہیئے جو آلِ فرعون اور حضرت موسیٰ و بنی اسرائیل کے لئے مسافت کے اعتبار سے برابر ہو تاکہ کسی فریق پر زیادہ دُور جانے کی مشقت نہ پڑے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسکو قبول کر کے دن اور وقت کی تعیین اس طرح فرما دی مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى، یعنی یہ مقابلہ یوم الزینۃ میں ہونا چاہیئے مراد عید یا کسی میلے وغیرہ کے اجتماع کا دن ہے۔ اسمیں اختلاف ہے کہ وہ کونسا دن تھا؟ بعض نے کہا کہ آلِ فرعون کی کوئی عید مقرر تھی جسمیں وہ زینت کے کپڑے پہنکر شہر سے باہر نکلنے کے عادی تھے، بعض نے کہا کہ وہ نیروز کا دن تھا کسی نے کہا کہ یوم السبت یعنی ہفتہ کا دن تھا جس کی یہ لوگ تعظیم کرتے تھے، بعض نے کہا کہ وہ عاشورا یعنی محرم کی دسویں تاریخ تھی۔

فائدہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دن اور وقت کی تعیین میں بڑی حکمت سے کام لیا کہ دن اُن کی عید کا تجویز کیا جسمیں سب چھوٹے بڑے ہر طبقے کے لوگوں کا اجتماع پہلے سے متعین تھا جسکا نتیجہ لازمی یہ تھا کہ یہ اجتماع بہت بڑا پورے شہر کے لوگوں پر مشتمل ہو جائے اور وقت ضحیٰ یعنی چاشت کا رکھا جو آفتاب کے بلند ہونے کے بعد ہوتا ہے جسمیں ایک مصلحت تو یہ ہے کہ سب لوگوں کو اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر اس میدان میں آنا آسان ہو۔ دوسری مصلحت یہ بھی ہے کہ یہ وقت روشنی اور ظہور کے اعتبار سے سارے دن میں بہتر ہے ایسے ہی وقت میں جمعی اور سکون کے ساتھ اہم کام کئے جاتے ہیں اور ایسے وقت کے اجتماع سے جب لوگ

منتشر ہوتے ہیں تو بات دُور دُور تک پھیل جاتی ہے چنانچہ اس روز جب حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعونی ساحروں پر غلبہ عطا فرمایا تو ایک ہی دن میں پورے شہر میں بلکہ دُور دُور تک اسکی شہرت ہوگئی۔

جادو کی حقیقت اور اسکی اقسام اور شرعی احکام یہ مضمون پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ ہاروت ماروت کے قصہ میں معارف القرآن جلد اول ص۲۱۱ سے ص۲۲۳ تک بیان ہوچکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿٦٠﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ

پھر اُلٹا پھرا فرعون پھر جمع کئے اپنے سارے داؤ، پھر آیا کہا اُن کو موسیٰ نے کم بختی تمہاری

لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ

جھوٹ نہ بولو اللہ پر پھر غارت کردے تم کو کسی آفت سے، اور مراد کو نہیں پہنچا

مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾

جس نے جھوٹ باندھا پھر جھگڑے اپنے کام پر آپس میں اور چھپ کر کیا مشورہ

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ

بولے مقرر یہ دونوں جادوگر ہیں چاہتے ہیں کہ نکالدیں تم کو تمہارے ملک سے

بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿٦٣﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ

اپنے جادو کے زور سے اور موقوف کرادیں تمہارے اچھے خاصے چلن کو سو مقرر کرلو اپنی تدبیر

ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿٦٤﴾ قَالُوْا

پھر آؤ قطار باندھ کر اور جیت گیا آج جو غالب رہا بولے

يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿٦٥﴾

اے موسیٰ یا تو تُو ڈال اور یا ہم ہوں پہلے ڈالنے والے

قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ

کہا نہیں تم ڈالو پھر تبھی اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں اسکے خیال میں آئیں انکے

سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿٦٦﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿٦٧﴾

جادو سے کہ دوڑ رہی ہیں پھر پانے لگا اپنے جی میں ڈر موسیٰ،

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿٦٨﴾ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ

ہم نے کہا تو مت ڈر۔ مقرر تو ہی رہے گا غالب اور ڈال جو تیرے داہنے ہاتھ میں ہے

تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ

کہ نگل جائے جو کچھ اُنھوں نے بنایا، اُن کا بنایا ہوا تو فریب ہے جادوگر کا، اور بھلا نہیں ہوتا جادوگر کا

حَيْثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ

جہاں ہو پھر گر پڑے جادوگر سجدہ میں بولے ہم یقین لائے رب پر ہارون

وَمُوْسٰى ﴿۷۰﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ

اور موسٰی کے بولا فرعون تم نے اس کو مان لیا میں نے ابھی حکم نہ دیا تھا وہ ہی

لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ

تمہارا بڑا ہے جس نے سکھلایا تم کو جادو سو اب میں کٹواؤں گا تمہارے ہاتھ

وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ

اور دوسری طرف کے پاؤں اور سولی دوں گا تم کو کھجور کے تنہ پر

وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴿۷۱﴾ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ

اور جان لوگے ہم میں کس کا عذاب سخت ہے اور دیر تک رہنے والا وہ بولے ہم تجھ کو زیادہ نہ سمجھیں گے

عَلٰي مَا جَاۗءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ

اس چیز سے جو پہنچی ہم کو صاف دلیل اور اُس سے جس نے ہم کو پیدا کیا سو تو کر گزر جو تجھ کو

قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۷۲﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا

کرنا ہے تو یہی کرے گا اس دُنیا کی زندگی میں ہم یقین لائے ہیں اپنے رب پر

لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرٌ

تاکہ بخشے ہم کو ہمارے گناہ اور جو تو نے زبردستی کروایا ہم سے یہ جادو اور اللہ بہتر ہے

وَّاَبْقٰى ﴿۷۳﴾ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ

اور سدا باقی رہنے والا بات یہی ہے کہ جو کوئی آیا اپنے رب کے پاس گناہ لے کر سو اس کے واسطے دوزخ ہے

لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۷۴﴾ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ

نہ مرے اس میں نہ جئے اور جو آیا اس کے پاس ایمان لے کر نیکیاں کر کر

الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿۷۵﴾ جَنّٰتُ

سو اُن لوگوں کے لئے ہیں درجے بلند باغ ہیں

عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ وَ ذٰلِکَ

بسنے کے جنتی ہیں اُن کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ رہا کریں گے اُن میں اور یہ

جَزٰٓؤُا مَنۡ تَزَکّٰی ﴿۷۶﴾

بدلہ ہے اسکا جو پاک ہوا

خلاصۂ تفسیر

غرض (یہ سُن کر) فرعون (دربار سے اپنی جگہ) لوٹ گیا پھر اپنا مکر کا (یعنی جادو کا) سامان جمع کرنا شروع کیا پھر (سب کو لیکر اس میدان میں جہاں وعدہ ٹھہرا تھا) آیا (اسوقت) موسٰی علیہ السلام نے ان (جادوگر) لوگوں سے فرمایا کہ ارے کمبختی مارو! اللہ تعالیٰ پر جھوٹ افترا مت کرو (کہ اسکے وجود یا توحید کا انکار کرنے لگو یا اسکے ظاہر کئے ہوئے معجزات کو سحر بتلانے لگو) کبھی خدا تعالیٰ تم کو کسی قسم کی سزا سے بالکل نیست و نابود ہی کر دے اور جو جھوٹ باندھتا ہے وہ (آخر کو) ناکام رہتا ہے پس جادوگر (یہ بات سنکر ان دونوں حضرات کے بارہ میں) باہم اپنی رائے میں اختلاف کرنے لگے اور خفیہ گفتگو کرتے رہے (بالآخر سب متفق ہوکر) کہنے لگے کہ بیشک یہ دونوں جادوگر ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ اپنے جادو (کے زور) سے تم کو تمہاری سرزمین سے نکال باہر کریں اور تمہارے عمدہ (مذہبی) طریقہ کا دفتر ہی اُٹھا دیں تو اب تم ملکر اپنی تدبیر کا انتظام کرو اور صفیں آراستہ کر کے (مقابلہ میں) آؤ اور آج وہی کامیاب ہے جو غالب ہو (پھر) اُنھوں نے (موسٰی علیہ السلام سے) کہا کہ اے موسٰی (کہیے) آپ (اپنا عصا) پہلے ڈالینگے یا ہم پہلے ڈالنے والے بنیں آپ نے (نہایت بے پروائی سے) فرمایا نہیں تم ہی پہلے ڈالو (چنانچہ اُنھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں اور نظربندی کر دی) پس یکایک اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں اُن کی نظربندی سے موسٰی (علیہ السلام) کے خیال میں ایسی معلوم ہونے لگیں جیسے (سانپ کی طرح) چلتی دوڑتی ہوں سو موسٰی (علیہ السلام) کے دل میں تھوڑا سا خوف ہوا (کہ جب دیکھنے میں یہ رسیاں اور لاٹھیاں بھی سانپ معلوم ہوتی ہیں اور میرا عصا بھی بہت سے بہت سانپ بن جاویگا تو دیکھنے والے تو دونوں چیزوں کو ایک ہی سا سمجھیں گے تو حق و باطل میں امتیاز کس طرح کرینگے، اور یہ خوف باقتضائے طبع تھا ورنہ حضرت موسٰی علیہ السلام کو یقین تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے تو اسکے تمام نشیب و فراز کا بھی انتظام کر دیگا اور اپنے مرسل کی کافی مدد کرے گا اور ایسا خوف طبعی جو درجۂ وسوسہ میں تھا شانِ کمال کے منافی نہیں الغرض جب یہ خوف ہوا اسوقت) ہم نے کہا کہ تم ڈرو نہیں تم ہی غالب رہوگے اور (اسکی صورت یہ ہے کہ) یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں جو

(عصا) ہے اس کو ڈالدو، ان لوگوں نے جو کچھ (سانگ) بنایا ہے یہ (عصا) سب کو نگل جاویگا یہ جو کچھ بنایا ہے جادوگروں کا سانگ ہے اور جادوگر کہیں جاوے (معجزے کے مقابلے میں کبھی) کامیاب نہیں ہوتا (موسیٰ علیہ السلام کو تسلی ہوگئی کہ اب امتیاز خوب ہوسکتا ہے چنانچہ انھوں نے عصا ڈالا اور واقعی وہ سب کو نگل گیا) سو جادوگروں (نے جو یہ فعل فوق السحر دیکھا تو سمجھ گئے کہ یہ بیشک معجزہ ہے اور فوراً ہی سب) سجدہ میں گر گئے (اور بآواز بلند) کہا کہ ہم تو ایمان لے آئے ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کے پروردگار پر، فرعون نے (یہ واقعہ دیکھ کر جادوگروں کو دھمکایا اور) کہا کہ بدون اسکے کہ میں تم کو اجازت دوں (یعنی میری خلاف مرضی) تم موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لے آئے واقعی (معلوم ہوتا ہے کہ) وہ (سحر میں) تمہارے بھی بڑے (اور استاذ) ہیں کہ انھوں نے تم کو سحر سکھلایا ہے (اور استاد شاگردوں نے سازش کرکے جنگ زرگری کی ہے تاکہ تمکو ریاست حاصل ہو) سو (اب حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے) میں تم سب کے ہاتھ پاؤں کٹواتا ہوں ایک طرف کا ہاتھ اور ایک طرف کا پاؤں اور تم سب کو کھجوروں کے درختوں پر ٹنگواتا ہوں (تاکہ سب دیکھ کر عبرت حاصل کریں) اور یہ بھی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ ہم دونوں میں (یعنی مجھ میں اور رب موسیٰ میں) کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے ان لوگوں نے صاف جواب دیدیا کہ ہم تجھ کو کبھی ترجیح نہ دیں گے بمقابلہ ان دلائل کے جو ہم کو ملے ہیں اور بمقابلہ اس ذات کے جس نے ہم کو پیدا کیا ہے تجھ کو جو کچھ کرنا ہو (دل کھول کر کر ڈال تو بجز اسکے کہ اس دنیوی زندگانی میں کچھ کرلے اور کر ہی کیا سکتا ہے بس ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لاچکے تاکہ ہمارے (پچھلے) گناہ (کفر وغیرہ) معاف کردیں اور تونے جو جادو (کے مقدمہ) میں ہم پر زور ڈالا اسکو بھی معاف کردیں اور اللہ تعالیٰ (باعتبار ذات و صفات کے بھی تجھ سے) بدرجہا اچھے ہیں اور (باعتبار ثواب و عقاب کے بھی) زیادہ بقا والے ہیں (اور تجھ کو نہ خیریت نصیب ہے نہ بقا تو تیرا کیا انعام جسکا وعدہ ہم سے کیا تھا اور کیا عذاب جس کی اب وعید سناتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے جس ثواب اور عذاب کو بقا ہے اسکا قانون یہ ہے کہ) جو شخص (بغاوت کا) مجرم ہوکر (یعنی کافر ہوکر) اپنے رب کے پاس حاضر ہوگا سو اس کے لئے دوزخ (مقرر) ہے اسمیں نہ مرہی گا اور نہ جئے ہی گا (نہ مرنا تو ظاہر ہے اور نہ جینا یہ کہ جینے کا آرام نہ ہوگا) اور جو شخص اس کے پاس مؤمن ہوکر حاضر ہوگا جس نے نیک کام بھی کئے ہوں سو ایسوں کے لئے بڑے اونچے درجے ہیں یعنی ہمیشہ رہنے کے باغات جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے اور جو شخص (کفر و معصیت سے) پاک ہو اس کا یہی انعام ہے (پس اس قانون کے موافق ہم نے کفر کو چھوڑ کر ایمان اختیار کرلیا۔

معارف و مسائل

فَجَمَعَ كَيْدَهٗ، فرعون نے اپنے کید یعنی مقابلہ موسیٰ علیہ السلام کی تدبیر یں ساحروں اور اُن کے آلات کو جمع کر لیا۔ حضرت ابن عباسؓ سے ان ساحروں کی تعداد بہتر منقول ہے اور دوسرے اقوال کی تعداد میں بہت مختلف ہیں، چار سو سے لیکر نو لاکھ تک انکی تعداد بتلائی گئی ہے اور یہ سب اپنے ایک رئیس شمعون کے ماتحت اسکے حکم کیمطابق کام کرتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ انکا رئیس ایک اندھا آدمی تھا (قرطبی) واللہ اعلم

موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں کو پیغمبرانہ خطاب | جادو کا مقابلہ معجزات سے کرنے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کو ہمدردانہ نصیحت آمیز چند کلمات کہکر اللہ کے عذاب سے ڈرایا وہ الفاظ یہ تھے وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى، یعنی تمہاری ہلاکت سامنے آچکی ہے، اللہ تعالیٰ پر افتراء اور بہتان نہ لگاؤ کہ اسکے ساتھ خدائی میں فرعون یا کوئی اور شریک ہے، اگر تم ایسا کروگے تو وہ تم کو عذاب میں پیس ڈالیگا اور تمہاری جڑ بنیاد اکھاڑ دے گا اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتا ہے وہ انجام کار ناکام اور محروم ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ فرعون کی طاغوتی طاقت و قوت اور حشم و خدم کے سہارے جو لوگ مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں آچکے تھے ان واعظانہ کلمات کا اُن پر کوئی اثر ہونا بہت ہی بعید تھا مگر انبیاء علیہم السلام اور اُن کے متبعین کیساتھ حق کی ایک مخفی طاقت و شوکت ہوتی ہے اُن کے سادے الفاظ بھی سخت سے سخت دلوں پر تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ جملے سُن کر ساحروں کی صفوں میں ایک زلزلہ پڑ گیا اور آپس میں اختلاف ہونے لگا کہ یہ کلمات کوئی جادوگر نہیں کہہ سکتا یہ تو اللہ ہی کی طرف سے معلوم ہوتے ہیں اس لئے بعض نے کہا کہ ان کا مقابلہ کرنا مناسب نہیں، اور بعض اپنی بات پر جمے رہے (فَتَنَازَعُوْا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ) کا یہی مطلب ہے، پھر اس اختلاف کو دُور کرنے کے لئے آپس میں سرگوشی اور آہستہ مشورے ہونے لگے (وَأَسَرُّوا النَّجْوٰى) مگر بالآخر مجموعی رائے مقابلہ کرنے ہی پر جم گئی اور کہنے لگے اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى، یعنی یہ دونوں جادوگر ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے ذریعہ تم کو یعنی فرعون اور آلِ فرعون کو تمہاری زمین مصر سے نکالدیں، مطلب یہ ہے کہ جادو کے ذریعہ تمہارے ملک پر اپنا قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ تمہارا طریقہ جو سب سے افضل و بہتر ہے اسکو مٹا دیں مُثْلٰى، اَمْثَل کا صیغہ مؤنث ہے جس کے معنے افضل و اعلیٰ کے ہیں، مطلب یہ تھا کہ تمہارا مذہب و طریقہ کہ فرعون کو اپنا خدا اور صاحب اختیار و اقتدار مانتے ہو یہی سب سے افضل و بہتر

ع۔ حضرت نافع مدنیؒ وغیرہ کی قراءت میں اِنَّ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ منقول ہے۔ یہ بظاہر عربی زبان کے نحوی قاعدہ کے خلاف ہے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ عرب کے بعض لغات میں یہ صورت بھی جائز ہے۔ (فصلہ القرطبی)

طریقہ ہے یہ لوگ اس کو مٹا کر اپنا دین و مذہب پھیلانا چاہتے ہیں اور لفظ طریقہ کے ایک معنی یہ بھی آتے ہیں کہ قوم کے سرداروں اور نمائندہ لوگوں کو اس قوم کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور علی مرتضیٰ رضؓ سے اس جگہ طریقہ کی یہی تفسیر منقول ہے کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تمہاری قوم کے سرداروں اور باعزت لوگوں کو ختم کردیں، اسلئے تم لوگوں کو چاہیئے کہ مقابلہ کے لئے اپنی پوری تدبیر و توانائی خرچ کرو اور سب جادوگر صف بستہ ہو کر یکبارگی اُن کے مقابلے پر عمل کرو (فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا) صف بستہ ہونے کو مقابل پر رُعب ڈالنے کا ایک خاص اثر ہوتا ہے اس لئے جادوگروں نے اپنی صف بندی کرکے مقابلہ کیا۔

جادوگروں نے اپنی بے فکری اور بے پروائی کا مظاہرہ کرنے کے لئے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی سے کہا کہ پہل آپ کرتے ہیں یا ہم کریں یعنی پہلے آپ اپنا عمل کرتے ہیں یا ہم کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا بَلْ اَلْقُوْا یعنی پہلے تمھیں ڈالو اور اپنے جادو کا کرشمہ دکھلاؤ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب میں بہت سی حکمتیں مضمر تھیں۔ اول تو ادب مجلس کہ جب جادوگروں نے اپنا یہ حوصلہ دکھلایا کہ مخالف کو پہلے حملہ کرنے کی اجازت دی تو اسکا شریفانہ جواب یہی تھا کہ ان کی طرف سے اس سے زیادہ حوصلے کے ساتھ ان کو ابتدا کرنے کی اجازت دی جائے۔ دوسرے یہ کہ جادوگروں کا یہ کہنا اپنے اطمینان اور بے فکری کا مظاہرہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن ہی کو ابتداء کرنے کا موقع دیکر اپنی بے فکری اور اطمینان کا ثبوت دیدیا۔ تیسرے یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے انکے جادو کے سب کرشمے آجاویں اسکے بعد اپنے معجزات کا اظہار کریں تو بیک وقت غلبۂ حق کا ظہور واضح طور پر ہوجائے۔ جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد پر اپنا عمل شروع کردیا اور اپنی لاٹھیاں اور رسیاں جو بڑی تعداد میں تھیں بیک وقت زمین پر ڈالدیں اور وہ سب کی سب بظاہر سانپ بن کر دوڑتی ہوئی نظر آنے لگیں۔

يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعونی جادوگروں کا جادو ایک قسم کی نظر بندی تھی جو مسمریزم کے ذریعہ بھی ہوجاتی ہے کہ دیکھنے والوں کو یہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑتی ہوئی دکھائی دینے لگیں، وہ حقیقۃً سانپ نہ بنی تھیں اور اکثر جادو اسی قسم کے ہوتے ہیں

فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ صورتِ حال دیکھ کر خوف طاری ہوا جس کو اُنھوں نے اپنے نفس میں چھپائے رکھا دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیا یہ خوف اگر موسیٰ علیہ السلام کو اپنی جان کے لئے ہوا تو مقتضائے بشریت سے ایسا ہونا نبوت کے خلاف نہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ خوف اپنی جان کا نہیں تھا بلکہ اسکا تھا کہ اس مجمع کے سامنے ساحروں کا غلبہ محسوس کیا گیا تو جو مقصد دعوتِ نبوت کا تھا وہ پُورا نہ ہوسکے گا اسی لئے اسکے

جواب میں حق تعالیٰ کی طرف سے جو ارشاد ہوا اُسمیں یہ اطمینان دلایا گیا کہ جادوگر غالب آسکیں گے آپ ہی کو فتح اور غلبہ حاصل ہوگا۔ اگلی آیت میں لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى فرما کر اس خطرہ کو دُور کیا گیا ہے۔

وَاَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ ، موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی خطاب ہوا کہ آپکے ہاتھ میں جو چیز ہو اُس کو ڈالدو، مُراد اس سے موسیٰ علیہ السلام کی عصا تھی مگر یہاں عصا کا ذکر نہیں فرمایا۔ اشارہ اس بات کیطرف تھا کہ اُن کے جادو کی کوئی حقیقت نہیں، اسکی پَروا نہ کرو اور جو کچھ بھی تمہارے ہاتھ میں ہے ڈالدو وہ اُنکے سب سانپوں کو نگل جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصا ڈالدی وہ ایک بڑا اژدہا بن کر ان سب جادو کے سانپوں کو نگل گیا۔

فرعونی جادوگروں کا مسلمان ہو کر سجدہ میں پڑ جانا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عصا نے اژدہا بن کر جب اُن کے خیالی سانپوں کو نگل لیا تو چونکہ یہ لوگ جادو کے ماہرین تھے ان کو یقین ہوگیا کہ یہ کام جادو کے ذریعہ نہیں ہو سکتا بلکہ یہ بلاشبہ معجزہ ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ظاہر ہوتا ہے اسلئے سجدہ میں گر گئے اور اعلان کر دیا کہ ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لے آئے۔ بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ ان جادوگروں نے سجدہ سے اُسوقت تک سر نہیں اُٹھایا جبتک کہ اُن کو جنت اور دوزخ کا مشاہدہ قدرت نے نہیں کرا دیا (رواہ عبد ابن حمید و ابن ابی حاتم و ابن المنذر عن عکرمہ - روح)

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ، فرعون کی رُسوائی اللہ تعالیٰ نے اس عظیم الشان مجمع کے سامنے واضح کردی تو بوکھلا کر اوّل تو ساحروں کو یہ کہنے لگا کہ بغیر میری اجازت کے تم کیسے ان پر ایمان لائے۔ گویا لوگوں کو یہ بتلانا تھا کہ میری اجازت کے بغیر ان جادوگروں کا کوئی قول فعل معتبر نہیں مگر ظاہر ہے کہ اس کھُلے ہوئے معجزہ کے بعد کسی کی اجازت کی ضرورت کسی عاقل انسان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس لئے اب جادوگروں پر اس سازش کا الزام لگایا کہ اب معلوم ہوا کہ تم سب موسیٰ کے شاگرد ہو اسی جادوگر نے تمہیں جادو سکھایا ہے اور تم نے سازش کر کے اُس کے سامنے اپنی ہار مان لی ہے۔

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ، اب جادوگروں کو سخت سزا سے ڈرایا کہ تمھارے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں گے جس کی صورت یہ ہوگی کہ داہنا ہاتھ کٹے گا تو بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ یہ صورت یا تو اسلئے تجویز کی کہ فرعونی قانون میں سزا کا یہی طریقہ رائج ہوگا یا اسلئے کہ اس صورت میں انسان ایک عبرت کا نمونہ بنجاتا ہے وَلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ یعنی ہاتھ پاؤں کاٹ کر بھی تمہیں کھجور کے درختوں پر سُولی دیجادیگی کہ تم اُن پر اسی طرح لٹکے رہوگے یہانتک کہ بھوک اور پیاس سے مرجاؤ۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِىْ فَطَرَنَا، جادوگروں نے فرعون کی یہ سخت دھمکی اور سخت سزا دینے کا اعلان سُنکر اپنے ایمان پر بڑی پختگی کا ثبوت دیا۔ کہنے لگے کہ ہم تجھے یا تیرے کسی قول کو اُن بیّنات و معجزات پر ترجیح نہیں دے سکتے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ جادوگر جب سجدہ میں گرے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو جنّت کے ان مقاماتِ عالیہ اور نعمتوں کا مشاہدہ کرا دیا جو اُن کو ملنے والے تھے اسکوان لوگوں نے کہا کہ ان بینات کے ہوتے ہوئے ہم تیری بات نہیں مان سکتے (قرطبی) نیز خالقِ کائنات ربّ سمٰوات کو چھوڑ کر تجھے اپنا رب نہیں مان سکتے۔ فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ، اب جو تیرا جی چاہے ہمارے بارے میں فیصلہ کر، اور جو چاہے سزا تجویز کر۔ اِنَّمَا تَقْضِىْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا، یعنی اگر تونے ہمیں سزا دے بھی دی تو وہ سزا صرف اسی دُنیا کی چند روزہ زندگی ہی تک ہوگی مرنے کے بعد تو تیرا ہم پر قبضہ نہیں رہے گا بخلاف حق تعالیٰ کے کہ ہم اسکے قبضہ میں مرنے سے پہلے بھی ہیں اور مرنے کے بعد بھی، اُس کی سزا کی فکر سب سے مقدم ہے۔

وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ، جادوگروں نے اب فرعون پر یہ الزام لگایا کہ ہمیں جادوگری پر تونے ہی مجبور کر رکھا تھا ورنہ ہم اس لغو کام کے پاس نہ جاتے، اب ہم ایمان لاکر اللہ سے اس جادو کے گناہ کی بھی معافی مانگتے ہیں۔ یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ یہ جادوگر تو خود اپنے اختیار سے مقابلہ کرنے کے لئے آئے تھے اور اس مقابلہ کی سودا بازی بھی فرعون سے کرچکے تھے کہ ہم غالب آئیں گے تو کیا ملے گا، پھر اُنکا فرعون پر یہ الزام لگانا کہ تونے ہمیں جادو کرنے پر مجبور کر رکھا تھا یہ کیسے صحیح ہوگا؟ اسکی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ یہ جادوگر شروع میں تو شاہی انعام و اکرام کے لالچ میں مقابلہ کے لئے تیار تھے بعد میں ان کو کچھ احساس ہوا کہ ہم معجزہ کا مقابلہ نہیں کرسکتے اُسوقت فرعون نے ان کو مجبور کیا۔ دوسری وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ فرعون نے اپنے ملک میں جادوگری کی تعلیم کو جبری بنایا ہوا تھا اسلئے ہر شخص جادو سیکھنے پر مجبور تھا (رح)

اہلیۂ فرعون آسیہ کا انجام خیر تفسیر قرطبی میں ہے کہ حق و باطل کے اس معرکہ کے وقت فرعون کی بیوی برابر خبر رکھتی رہی کہ انجام کیا ہوا۔ جب اُس کو یہ بتلایا گیا کہ موسیٰ و ہارون غالب آگئے تو فوراً اُس نے اعلان کردیا کہ میں بھی ربِ موسیٰ و ہارون پر ایمان لے آئی۔ فرعون کو اپنے گھر کی خبر لگی تو حکم دیا کہ ایک بڑے پتھر کی چٹان اُٹھا کر اسکے اُوپر ڈالدو۔ آسیہ نے جب یہ دیکھا تو آسمان کیطرف نظر اٹھائی اور اللہ سے فریاد کی۔ حق تعالیٰ نے پتھر اسکے اُوپر گرنے سے پہلے اسکی روح قبض کرلی پھر پتھر اُس بے جان جسم پر گرا۔

فرعونی جادوگروں میں عجیب انقلاب اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا ... اِلٰى ... ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى

یہ کلمات اور حقائق جنکا تعلق خالص اسلامی عقائد اور عالم آخرت سے ہے ان جادوگروں کی زبان سے ادا ہو رہے ہیں جو ابھی ابھی مسلمان ہوئے ہیں اور اسلامی عقائد و اعمال کی کوئی تعلیم اُن کو ملی نہیں، یہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صحبت کی برکت اور اُن کے اخلاص کا اثر تھا کہ حق تعالیٰ نے اُن پر دین کے تمام حقائق آن کی آن میں ایسے کھول دیئے کہ اُن کے مقابلے میں نہ اپنی جان کی پروا رہی نہ کسی بڑی سے بڑی سزا اور تکلیف کا خوف رہا، گویا ایمان کیساتھ ساتھ ہی ان کو ولایت کا بھی وہ مقام حاصل ہوگیا جو دوسروں کو عمر بھر کے مجاہدوں ریاضتوں سے بھی حاصل ہونا مشکل ہے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور عبید بن عمیرؓ نے فرمایا کہ قدرتِ حق کا یہ کرشمہ دیکھو کہ یہ لوگ شروع دن میں کفار جادوگر تھے اور آخر دن اولیاء اللہ اور شہداء۔ (ابن کثیر)

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰىٓ ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ

اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کو کہ لے نکل میرے بندوں کو رات سے پھر

لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾

ڈالدے اُن کے لئے سمندر میں رستہ سوکھا نہ خطرہ کر آ پکڑنے کا اور نہ ڈر ڈوبنے سے،

فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿۷۸﴾

پھر پیچھا کیا اُن کا فرعون نے اپنے لشکروں کو لے کر، پھر ڈھانپ لیا اُن کو پانی نے جیسا کہ ڈھانپ لیا

وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿۷۹﴾ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

اور بہکایا فرعون نے اپنی قوم کو اور نہ سمجھایا اے اولادِ اسرائیل

قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ

چھڑا لیا ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے اور وعدہ ٹھہرایا تم سے داہنی طرف پہاڑ کی

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴿۸۰﴾ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ

اور اُتارا تم پر من اور سلویٰ کھاؤ ستھری چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو

وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ

اور نہ کرو اسمیں زیادتی پھر تو اُترے گا تم پر میرا غصہ اور جس پر اُترا میرا

غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿۸۱﴾ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ

غصہ سو وہ پٹکا گیا اور میری بڑی بخشش ہے اس پر جو توبہ کرے اور یقین لائے

وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿٨٢﴾
اور کرے بھلا کام پھر راہ پر رہے

خلاصۂ تفسیر

اور (جب فرعون اس پر بھی ایمان نہ لایا اور ایک عرصہ تک مختلف معاملات و واقعات ہوتے رہے اسوقت) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس وحی بھیجی کہ ہمارے (ان) بندوں کو (یعنی بنی اسرائیل کو مصر سے) راتوں رات (باہر) لے جاؤ (اور دُور چلے جاؤ تاکہ فرعون کے ظلم و شدائد سے ان کو نجات ہو) پھر (راہ میں جو دریا ملے گا تو) ان کے لئے دریا میں (عصا مار کر) خشک راستہ بنا دینا (یعنی عصا مارنا کہ اس سے خشک راستہ بن جاویگا) نہ تو تم کو کسی کے تعاقب کا اندیشہ ہوگا (کیونکہ اہلِ تعاقب کامیاب نہ ہونگے گو تعاقب کریں) اور نہ اور کسی قسم کا (مثلاً غرق وغیرہ کا) خوف ہوگا (بلکہ امن و اطمینان سے پار ہو جاؤ گے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام موافق حکم کے انکو شباشب نکال لے گئے اور صبح مصر میں خبر مشہور ہوئی) پس فرعون اپنے لشکروں کو لیکر ان کے پیچھے چلا (اور بنی اسرائیل موافق وعدہ الٰہیہ کے دریا سے پار ہوگئے اور ہنوز وہ دریائی راستے اسیطرح پنی حالت پر تھے جیسا دوسری آیت میں ہے وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۚ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ، فرعونیوں نے جلدی میں کچھ آگا پیچھا سوچا نہیں، ان رستوں پر ہولئے، جب سب اندر آگئے) تو (اس وقت چاروں طرف سے) دریا (کا پانی سمٹ کر) ان پر جیسا ملنے کو تھا آملا (اور سب غرق ہو کر رہ گئے) اور فرعون نے اپنی قوم کو بُری راہ پر لگایا اور نیک راہ ان کو نہ بتلائی (جسکا اسکو دعویٰ تھا قَالَ مَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ، اور بُری راہ ہونا ظاہر ہے کہ دُنیا کا بھی ضرر ہوا کہ سب ہلاک ہوئے اور آخرت کا بھی، کیونکہ جہنم میں گئے جیسا کہ آیت میں ہے اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ۔ اب پھر بنی اسرائیل کو فرعون کے تعاقب اور غرقِ دریا سے نجات کے بعد اور نعمتیں عنایت ہوئیں مثلاً عطائے توراۃ اور من و سلویٰ، ان نعمتوں کو عطا کر کے ہم نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ) اے بنی اسرائیل (دیکھو ہمنے تم کو کیسی کیسی نعمتیں دیں کہ) تم کو تمہارے (ایسے بڑے) دشمن سے نجات دی اور ہم نے تم سے (یعنی تمہارے پیغمبر سے تمہارے نفع کے واسطے) کوہِ طور کی داہنی جانب آنیکا (اور وہاں آنیکے بعد توراۃ دینے کا) وعدہ کیا اور (وادی تیہ میں) ہم نے تم پر من و سلویٰ نازل فرمایا (اور اجازت دی کہ) ہمنے جو نفیس چیزیں (شرعاً بھی کہ حلال ہیں اور طبعاً بھی کہ لذیذ ہیں) تم کو دی ہیں ان کو کھاؤ اور اس (کھانے) میں حد (شرعی) سے مت گزرو (مثلاً یہ کہ حرام سے حاصل کیا جاوے، کذا فی الدر یا کھا کر معصیت

کی جاوے) کہیں میرا غضب تم پر واقع ہو جائے، اور جس شخص پر میرا غضب واقع ہوتا ہے وہ بالکل گیا گزرا ہوا اور (نیز اُسکے ساتھ یہ بھی ہے کہ) میں ایسے لوگوں کے لئے بڑا بخشنے والا بھی ہوں جو (کفر و معصیت سے) توبہ کرلیں اور ایمان لے آویں اور نیک عمل کریں پھر (اسی راہ) پر قائم (بھی) رہیں (یعنی ایمان و عمل صالح پر مداومت کریں یہ مضمون ہم نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ تذکیر نعمت اور امر بالشکر و نہی عن المعصیت اور وعدہ وعید یہ خود بھی دینی نعمت ہے۔

معارف و مسائل

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى، حق و باطل معجزہ اور جادو کے فیصلہ کن معرکہ نے فرعون اور آلِ فرعون کی کمر توڑ دی اور بنی اسرائیل حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی قیادت میں جمع ہو گئے تو اب اُن کو یہاں سے ہجرت کا حکم ملتا ہے۔ اور چونکہ فرعون کے تعاقب اور آگے دریا کے راستہ میں حائل ہونے کا خطرہ سامنے تھا اس لئے دونوں چیزوں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مطمئن کر دیا گیا کہ دریا پر اپنی لاٹھی ماریں گے تو درمیان سے خشک راستے نکل آئیں گے اور پیچھے سے فرعون کے تعاقب کا خطرہ نہ رہے گا جسکا تفصیلی واقعہ حدیث الفتون کے تحت میں اسی سُورۃ میں گزر چکا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریا پر لاٹھی ماری تو اسمیں بارہ سڑکیں اس طرح بن گئیں کہ پانی کے تودے بحر منجمد کی طرح دونوں طرف پہاڑ کی برابر کھڑے رہے اور درمیان سے راستے خشک نکل آئے جیسا کہ سورۂ شعراء میں ہے فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ، اور درمیان میں جو یہ پانی کی دیواریں ان بارہ سڑکوں کے درمیان تھیں اُن کو قدرت نے ایسا بنا دیا کہ ایک سڑک سے گزرنے والے دوسری سڑکوں سے گزرنے والوں کو دیکھتے بھی جاتے تھے اور باہم باتیں بھی کرتے تھے تاکہ ان کے دلوں میں یہ خوف وہراس بھی نہ رہے کہ ہمارے دوسرے قبیلوں کا کیا حال ہوا (قرطبی)

مصر سے نکلنے کے وقت بنی اسرائیل کے بعض حالات اور اُن کی تعداد اور لشکر فرعون کی تعداد

تفسیر روح المعانی میں یہ روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شروع رات میں بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے دریائے قلزم کی طرف نکلے۔ بنی اسرائیل نے اس سے پہلے شہر کے لوگوں میں یہ شہرت دیدی تھی کہ ہماری عید ہے ہم عید منانے کے لئے باہر جائیں گے اور اس بہانے سے قبطی لوگوں سے کچھ زیورات عاریۃً مانگ لئے کہ عید سے آکر واپس کر دیں گے۔ بنی اسرائیل کی تعداد اسوقت چھ لاکھ تین ہزار اور دوسری روایت میں چھ لاکھ ستر ہزار تھی (یہ اسرائیلی روایات ہیں جنمیں مبالغہ ہو سکتا ہے لیکن اتنی بات قرآن کریم کے اشارات اور روایاتِ حدیث سے ثابت ہے کہ اُن کے بارہ قبیلے تھے اور ہر قبیلے کی بہت بڑی تعداد تھی۔ یہ بھی قدرتِ حق تعالیٰ کا ایک عظیم مشاہدہ تھا کہ

جب یہ حضرات یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر آئے تو بارہ بھائی تھے، اب بارہ بھائیوں کے بارہ قبیلوں کی اتنی عظیم الشان تعداد مصر سے نکلی جو چھ لاکھ سے زائد بتلائی جاتی ہے۔ فرعون کو جب ان کے نکل جانے کی اطلاع ملی تو اپنی فوجیں جمع کیں جنہیں ستر ہزار سیاہ گھوڑے تھے اور لشکر کے مقدمہ میں سات لاکھ سوار تھے۔ جب پیچھے سے اس فوجی سیلاب کو اور آگے دریائے قلزم کو بنی اسرائیل نے دیکھا تو گھبرا اٹھے اور موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ، کہ ہم تو پکڑ لئے گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی کہ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ، کہ میرے ساتھ میرا رب ہے وہ مجھے راستہ دیگا، پھر بحکم ربانی دریا پر لاٹھی ماری اور اُسمیں بارہ سڑکیں خشک نکل آئیں۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے اُن سے گزر گئے۔ جسوقت فرعون اور اُسکا لشکر یہاں پہنچا تو لشکر فرعون یہ حیرت انگیز منظر دیکھ کر سہم گیا کہ ان کے لئے دریا میں کس طرح راستے بن گئے مگر فرعون نے اُن کو کہا کہ یہ سب کرشمہ میری ہیبت کا ہے جس سے دریا کی روانگی رُک کر راستے بن گئے ہیں یہ کہہ کر فوراً آگے بڑھ کر اپنا گھوڑا دریا کے اس راستہ میں ڈالدیا اور سب لشکر کو پیچھے آنیکا حکم دیا۔ جس وقت فرعون مع اپنے تمام لشکر کے ان دریائی راستوں کے اندر سما چکے اُسی وقت حق تعالیٰ نے دریا کو روانی کا حکم دیدیا اور دریا کے سب حصے مل گئے فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ کا یہی حاصل ہے (روح المعانی)

وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ، فرعون سے نجات اور دریا سے پار ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور اُن کے واسطے سے تمام بنی اسرائیل سے یہ وعدہ فرمایا کہ وہ کوہ طور کی داہنی جانب چلے آئیں تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی جائے اور بنی اسرائیل خود بھی ان کے شرفِ ہمکلامی کا مشاہدہ کرلیں۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى، یہ واقعہ اُسوقت کا ہے جب بنی اسرائیل عبور دریا کے بعد آگے بڑھے اور ایک مقدس شہر میں داخل ہونیکا اُن کو حکم ملا۔ اُنھوں نے خلاف ورزی کی، اسکی یہ سزا دی گئی کہ اسی وادی میں جس کو وادئ تیہ کہتے ہیں قید کر دیئے گئے۔ یہاں سے چالیس سال تک باہر نہ نکل سکے۔ اس سزا کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برکت سے اُن پر اس قید کے زمانے میں بھی طرح طرح کے انعامات ہوتے رہے اُنھیں میں سے مَن و سلویٰ کا انعام تھا جو انکی غذا کیلئے دیا جاتا تھا۔

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى

اور کیوں جلدی کی تو نے اپنی قوم سے اے موسیٰ بولا وہ یہ آرہے ہیں میرے

اَثَرِىْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا

پیچھے اور میں جلدی آیا تیری طرف اے میرے رب تاکہ تو راضی ہو، فرمایا ہم نے تو بچلا دیا

قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ﴿۸۵﴾ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى

تیری قوم کو تیرے پیچھے اور بہکایا اُن کو سامری نے پھر اُلٹا پھرا موسیٰ

اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ

اپنی قوم کے پاس غصہ میں بھرا پچھتاتا ہوا کہا اے قوم کیا تم سے وعدہ نہ کیا تھا

رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ۥ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ

تمہارے رب نے اچھا وعدہ کیا طویل ہوگئی تم پر مدت یا چاہا تم نے

اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِىْ ﴿۸۶﴾

کہ اُترے تم پر غضب تمہارے رب کا اس لئے خلاف کیا تم نے میرا وعدہ

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا

بولے ہم نے خلاف نہیں کیا تیرا وعدہ اپنے اختیار سے ولیکن اُٹھوایا ہم سے بھاری بوجھ

مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِىُّ ﴿۸۷﴾

قوم فرعون کے زیور کا سو ہم نے اسکو پھینکدیا، پھر اس طرح ڈالا سامری نے

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ

پھر بنا نکالا انکے واسطے ایک بچھڑا ایک دھڑ جسمیں آواز گائے کی، پھر کہنے لگے یہ معبود ہے تمہارا

وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۬ فَنَسِىَ ﴿۸۸﴾ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ

اور معبود ہے موسیٰ کا سو وہ بھول گیا بھلا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ وہ جواب تک نہیں دیتا انکی کو

قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾

کسی بات کا اور اختیار نہیں رکھتا اُن کے بُرے کا اور نہ بھلے کا

ع ۱۳ / ۱۳

خلاصۂ تفسیر

اور (جب اللہ تعالیٰ کو توراۃ دینا منظور ہوا تو موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر آنیکا حکم فرمایا اور قوم کو بھی یعنی بعضوں کو ساتھ آنیکا حکم ہوا کذا فی فتح المنان عن الباب التاسع عشر من سفر الخروج) موسیٰ علیہ السلام شوق میں سب سے آگے تنہا جا پہنچے اور دوسرے لوگ اپنی جگہ رہ گئے طور کا ارادہ ہی نہیں کیا، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ) اے موسیٰ، آپ کو اپنی قوم سے آگے جلدی آنیکا کیا سبب ہوا، انھوں نے (اپنے گمان کے موافق) عرض کیا کہ وہ لوگ یہی تو ہیں میرے پیچھے پیچھے (آرہے ہیں) اور میں (سب سے پہلے) آپ کے پاس (یعنی اُس جگہ جہاں مکالمت و مخاطبت کا آپنے وعدہ فرمایا جلدی سے اس لئے چلا آیا کہ آپ (زیادہ) خوش ہونگے (کیونکہ امتثالِ امر میں پیشقدمی کرنا زیادہ موجب خوشنودی کا ہے) ارشاد ہوا کہ تمہاری قوم کو تو ہم نے تمہارے (چلے آنے کے) بعد ایک بلا میں مبتلا کر دیا اور ان کو سامری نے گمراہ کر دیا (جسکا بیان آگے آتا ہے فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا الخ اور فتنا میں اس ابتلاء کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب اس لئے کیا کہ خالق ہر فعل کا وہی ہے ورنہ اصل نسبت اس فعل کی سامری کی طرف ہے جس کو اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ میں ظاہر فرمایا ہے) غرض موسیٰ (علیہ السلام بعد انقضائے میعاد کے) غصہ اور رنج میں بھرے ہوئے اپنی قوم کیطرف واپس آئے (اور) فرمانے لگے کہ اے میری قوم کیا تم سے تمہارے رب نے ایک اچھا (اور سچا) وعدہ نہیں کیا تھا (کہ ہم تمکو ایک کتاب احکام کی دیں گے تو اس کتاب کا تو تم کو انتظار واجب تھا) کیا تم پر (میعاد مقرر سے بہت) زیادہ زمانہ گزر گیا تھا (کہ اس کے ملنے سے نااُمیدی ہو گئی اسلئے اپنی طرف سے ایک عبادت ایجاد کر لی) یا (باوجود نااُمیدی نہ ہونے کے) تم کو یہ منظور ہوا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب واقع ہو اس لئے تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا (کہ آپ کی واپسی تک کوئی نیا کام نہ کرینگے اور آپکے نائب ہارون علیہ السلام کی اطاعت کرینگے) اسکے خلاف کیا وہ کہنے لگے کہ ہم نے جو آپسے وعدہ کیا تھا اسکو اپنے اختیار سے خلاف نہیں کیا (یہ معنی نہیں کہ کسی نے اُن سے زبردستی یہ فعل کرا لیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس رائے کو ہم نے ابتداءً جبکہ خالی الذہن تھے اختیار کر لیا تھا، اس کے خلاف سامری کا فعل ہمارے لئے منشاء اشتباہ بن گیا جس سے ہم نے وہ رائے سابق یعنی توحید اختیار نہ کی بلکہ رائے بدل گئی۔ گو اسپر بھی عمل اختیار ہی سے ہوا چنانچہ آئندہ کہا گیا) ولیکن قوم (قبط) کے زیور میں سے ہمپر بوجھ لد رہا تھا سو ہم نے اسکو (سامری کے کہنے سے آگ میں) ڈالدیا پھر اسی طرح سامری نے (بھی اپنے ساتھ کا زیور) ڈالدیا (آگے اللہ تعالیٰ قصہ کی تکمیل اس طرح فرماتے ہیں) پھر اُس (سامری) نے ان لوگوں کے لئے ایک بچھڑا (بناکر) ظاہر

کیا کہ وہ ایک قالب (خالی از کمالات) تھا جس میں ایک (بے معنی) آواز تھی سو (اس کی نسبت وہ احمق لوگ (ایک دوسرے سے) کہنے لگے کہ تمہارا اور موسیٰ کا بھی معبود تو یہ ہے (اس کی عبادت کرو) موسیٰ تو بھول گئے (کہ طور پر خدا کی طلب میں گئے ہیں حق تعالیٰ ان کی احمقانہ جسارت پر فرماتے ہیں کہ) کیا وہ لوگ اتنا بھی نہیں دیکھتے تھے کہ وہ (بواسطہ یا بلا واسطہ) نہ تو ان کی کسی بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ اُن کے کسی ضرر یا نفع پر قدرت رکھتا ہے (ایسا ناکارہ خدا کیا ہوگا اور اللہ حق بواسطہ انبیاء کے خطاب کلام ضروری فرماتا ہے)۔

معارف و مسائل

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل فرعون کے تعاقب اور دریا سے نجات پانے کے بعد آگے بڑھے تو اُن کا گزر ایک بُت پرست قوم پر ہوا اور اُن کی عبادت و پرستش کو دیکھ کر بنی اسرائیل کہنے لگے کہ جس طرح اُنھوں نے موجود اور محسوس چیزوں یعنی بتوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی معبود بنا دیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کے احمقانہ سوال کے جواب میں بتلایا کہ تم بڑے جاہل ہو یہ بُت پرست لوگ تو سب ہلاک ہونے والے ہیں اور ان کا طریقہ باطل ہے إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ اسوقت حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ فرمایا کہ اپنی قوم کو ساتھ کوہ طور پر آجایئے تو ہم آپ کو اپنی کتاب تورات عطا کریں گے جو آپکے اور آپ کی قوم کے لئے دستور العمل ہوگا مگر عطاء تورات سے پہلے آپ تیس روز اور تیس رات کا مسلسل روزہ رکھیں پھر اسکے بعد اس میعاد میں دس کا اور اضافہ کر کے چالیس روز کر دیئے گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام مع اپنی قوم کے کوہِ طور کی طرف روانہ ہوگئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وعدہ ربانی کی وجہ سے شوق بھڑک اُٹھا اور اپنی قوم کو یہ وصیت کر کے آگے چلے گئے کہ تم بھی میرے پیچھے آجاؤ، میں آگے جا کر عبادت روزہ وغیرہ میں مشغول ہوتا ہوں جس کی میعاد مجھے تیس روز بتلائی گئی ہے، میری غیبت میں ہارون علیہ السلام میرے نائب اور قائم مقام ہونگے۔ بنی اسرائیل مع ہارون علیہ السلام کے اپنی رفتار سے پیچھے چلتے رہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جلدی کر کے آگے بڑھ گئے اور خیال یہ تھا کہ قوم کے لوگ بھی پیچھے پیچھے کوہِ طور کے قریب پہنچ گئے مگر وہاں وہ سامری کا فتنہ گوسالہ پرستی کا پیش آگیا۔ بنی اسرائیل کے تین فرقے ہو کر اختلاف میں مبتلا ہوگئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے پیچھے پہنچنے کا معاملہ رُک گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب حاضر ہوئے تو حق تعالیٰ نے یہ خطاب فرمایا وَمَآ أَعْجَلَكَ عَن قَوْمِكَ يٰمُوسٰى، یعنی اے موسیٰ آپ اپنی قوم سے آگے جلدی کر کے کیوں آگئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عجلت کرنے کا سوال اور اس کی حکمت سوال کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی حالت سے بے خبر رہ کر یہ توقع کر رہے تھے کہ وہ بھی کوہِ طور کے قریب پہنچ گئے ہونگے اور قوم فتنہ میں مبتلا ہو چکی ہے اس کی خبر موسیٰ علیہ السلام کو دیدی جائے (از تفسیر ابن کثیر)

اور روح المعانی میں بحوالہ الکشف اس سوال کی وجہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کی تربیت کے متعلق ایک خاص ہدایت دینا اور ان کی اس عجلت پر تنبیہ کرنا تھا کہ آپکے منصب رسالت کا تقاضا یہ تھا کہ قوم کے ساتھ رہتے ان کو اپنی نظر میں رکھتے اور ساتھ لاتے۔ آپ کی عجلت کرنیکا یہ نتیجہ ہوا کہ قوم کو سامری نے گمراہ کر دیا۔ اسمیں خود فعل عجلت کی مذمت کیطرف بھی اشارہ ہے کہ یہ شان انبیاء کی نہ ہونی چاہیئے۔ اور بحوالہ انتصاف نقل کیا ہے کہ اسمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قوم کیساتھ سفر کرنیکا طریقہ بتلایا گیا کہ رئیس القوم کو پیچھے رہنا چاہیئے جیسے لوط علیہ السلام کے واقعہ میں حق تعالیٰ نے اُن کو حکم دیا کہ مومنین کو اپنے ساتھ لیکر شہر سے نکل جائیے، اُن کو آگے رکھ کر خود اُن سب کے پیچھے رہیئے۔ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ

اللہ تعالیٰ کے مذکورہ سوال کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے گمان کے مطابق عرض کیا کہ میری قوم کے لوگ بھی پیچھے پیچھے پہنچا ہی چاہتے ہیں، میں کچھ جلدی کر کے آگے اسلئے آگیا کہ حکم کی تعمیل میں پیشقدمی کرنا حاکم کی زیادہ خوشنودی کا سبب ہوا کرتا ہے۔ اس وقت حق تعالیٰ نے ان کو قوم بنی اسرائیل میں پیش آنے والے فتنہ گوسالہ پرستی کی اطلاع دیدی اور یہ کہ انکو تو سامری نے گمراہ کر دیا ہے اور وہ فتنہ میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

سامری کون تھا بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ آلِ فرعون کا قبطی آدمی تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے پڑوس میں رہتا تھا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا اور جب بنی اسرائیل کو لیکر موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے تو یہ بھی ساتھ ہو لیا۔ بعض نے کہا کہ یہ بنی اسرائیل ہی کے ایک قبیلہ سامرہ کا رئیس تھا اور قبیلہ سامرہ ملک شام میں معروف ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رہ نے فرمایا کہ یہ فارسی شخص کرمان کا رہنے والا تھا۔ حضرت ابن عباس رہ نے فرمایا کہ یہ ایک ایسی قوم کا آدمی تھا جو گائے کی پرستش کرنے والی تھی یہ کسی طرح مصر پہنچ گیا اور بظاہر دین بنی اسرائیل میں داخل ہو گیا مگر اس کے دل میں نفاق تھا (قرطبی) حاشیہ قرطبی میں ہے کہ یہ شخص ہندوستان کا ہندو تھا جو گائے کی عبادت کرتے ہیں۔ انتہیٰ۔ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا پھر اپنے کفر کی طرف لوٹ گیا یا پہلے ہی سے منافقانہ طور پر ایمان کا اظہار کیا وَاللّٰہُ اَعْلَمُ

مشہور یہ ہے کہ سامری کا نام موسیٰ ابن ظفر تھا۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباس رہ سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ سامری پیدا ہوا تو فرعون کی طرف سے تمام اسرائیلی لڑکوں کے قتل کا حکم جاری تھا اس کی والدہ کو خوف ہوا کہ فرعونی سپاہی اس کو قتل کر دیں گے تو بچہ کو اپنے سامنے

قتل ہوتا دیکھنے کی مصیبت سے یہ بہتر سمجھا کہ اس کو جنگل کے ایک غار میں رکھ کر اُوپر سے بند کردیا (کبھی کبھی اسکی خبر گیری کرتی ہوگی) اِدھر اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کو اس کی حفاظت اور غذا دینے پر مامور کردیا وہ اپنی ایک انگلی پر شہد ایک پر مکھن ایک پر دودھ لاتے اور اس بچہ کو چٹا دیتے تھے یہاں تک کہ یہ غار ہی میں پل کر بڑا ہوگیا اور اسکا انجام یہ ہوا کہ کفر میں مبتلا ہوا اور بنی اسرائیل کو مبتلا کیا پھر قہر الٰہی میں گرفتار ہوا۔ اسی مضمون کو کسی شاعر نے دو شعروں میں اسطرح ضبط کیا ہے (از روح المعانی) ؂

اذا المرء لم یخلق سعیدا تحیرت عقول مربیہ وخاب المؤمل
فموسی الذی ربّاہ جبریل کافر وموسی الذی ربّاہ فرعون مرسل

(ترجمہ) جب کوئی شخص اصل پیدائش میں نیک بخت نہ ہو تو اُسکے پرورش کرنے والوں کی عقلیں بھی حیران رہ جاتی ہیں اور اس سے اُمید کرنے والا محروم ہو جاتا ہے۔ دیکھو جس موسیٰ کو جبرئیل امین نے پالا تھا وہ تو کافر ہوگیا اور جس موسیٰ کو فرعون لعین نے پالا تھا وہ خدا کا رسول بن گیا۔

اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رنج و غم کے عالم میں واپس آکر قوم سے خطاب کیا اور پہلے اُن کو اللہ تعالیٰ کا وعدہ یاد دلایا جس کے لئے وہ سب قوم کو لیکر طور کی جانب ایمن کیطرف چلے تھے کہ یہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ اپنی کتاب ہدایت عطا فرمائینگے اور جس کے ذریعہ دین و دُنیا کے تمام مقاصد تمہارے پُورے ہوں گے۔

اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ، یعنی اللہ کے اس وعدہ پر کوئی بڑی مدت بھی تو نہیں گزری جسمیں تمہارے بھول جانے کا احتمال ہو کہ وعدہ کا انتظار زمانہ دراز تک کرنے کے بعد مایوس ہوگئے اس لئے دوسرا طریقہ اختیار کرلیا۔

اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ، یعنی بھول جانے یا انتظار سے تھک جانے کا تو کوئی احتمال نہیں تو اب اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ تم نے خود ہی اپنے قصد و اختیار سے اپنے رب کے غضب کو دعوت دی۔

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا، لفظ مَلْک بفتح میم وبضم میم دونوں کے معنے تقریباً ایک ہیں اور مُراد اس جگہ اس سے اپنا اختیار ہے اور مقصد اسکا یہ ہے کہ ہم نے گوسالہ کی پرستش پر اقدام اپنے اختیار سے نہیں کیا بلکہ سامری کے عمل کو دیکھ کر ہم مجبور ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ دعویٰ غلط اور بے بنیاد ہے۔ سامری یا اس کے عمل نے ان کو مجبور تو نہیں کردیا تھا خود ہی غور و فکر سے کام نہ لیا تو مبتلا ہوگئے آگے سامری کا وہ واقعہ بیان کیا۔

وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ، لفظ اوزار وزر کی جمع ہے جسکے

معنے ثقل اور بوجھ کے ہیں انسان کے گناہ بھی چونکہ قیامت کے روز اُس پر بوجھ بنکر لادے جائینگے اس لئے گناہ کو وزر اور گناہوں کو اوزار کہا جاتا ہے ۔ زینۃ القوم ، لفظ زینت سے مُراد زیور ہے اور قوم سے مراد قوم فرعون (قبط) ہے جن سے بنی اسرائیل نے عید کا بہانہ کر کے کچھ زیورات مستعار لے لئے تھے اور وہ پھر اُن کے ساتھ رہے ۔ اُن کو اوزار یعنی گناہوں کا بوجھ اس لئے کہا کہ عاریت کا نام کر کے ان لوگوں سے لئے تھے جسکا حق یہ تھا کہ اُن کو واپس کئے جاویں چونکہ واپس نہیں کئے گئے تو اس کو گناہ قرار دیا ۔ اور حدیث فتون کے نام سے جو مفصل حدیث اُوپر نقل کی گئی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے ان لوگوں کو اُس کے گناہ ہونے پر متنبہ کیا اور ایک گڑھے میں یہ سب زیورات ڈالدینے کا حکم دیا ۔ بعض روایات میں ہے کہ سامری نے اپنا مطلب نکالنے کے لئے ان کو کہا کہ یہ زیورات دوسروں کا مال ہے تمہارے لئے اس کا رکھنا وبال ہے اسکے کہنے سے گڑھے میں ڈالے گئے ۔

کفار کا مال مسلمان کیلئے کس صورت میں حلال ہے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کفار جو اہلِ ذمہ یعنی مسلمانوں کی حکومت میں اُن کے قانون کی پابندی کر کے بستے ہیں اسی طرح وہ کفار جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ جان و مال وغیرہ کے امن کا ہو جائے ان کا فروں کا مال تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لئے حلال نہیں لیکن جو کافر نہ مسلمانوں کا اہلِ ذمہ ہے نہ اُس سے اُنکا کوئی عہد معاہدہ ہے جن کو فقہاء کی اصطلاح میں کافر حربی کہا جاتا ہے اُن کے اموال تو مسلمانوں کے لئے مباح الاصل اشیاء کی طرح حلال ہیں پھر ہارون علیہ السلام نے ان کو وزر و گناہ کیسے قرار دیا اور اُن کے قبضہ سے نکال کر گڑھے میں ڈالنے کا حکم کیوں دیا ۔ اسکا ایک جواب تو مشہور ہے جو عامۃ مفسرین نے لکھا ہے کہ کفار حربی کا مال لینا اگرچہ مسلمان کے لئے جائز ہے مگر وہ مال بحکم مال غنیمت ہے اور مالِ غنیمت کا قانون شریعت اسلام سے پہلے یہ تھا کہ کافروں کے قبضہ سے نکال لینا تو اسکا جائز تھا مگر مسلمانوں کے لئے اسکا استعمال اور اس سے نفع اُٹھانا حلال نہیں تھا بلکہ مال غنیمت جمع کر کے کسی ٹیلہ وغیرہ پر رکھدیا جاتا تھا اور آسمانی آگ (بجلی وغیرہ) آ کر اسکو کھا جاتی تھی یہی علامت اُن کے جہاد قبول ہونے کی تھی اور جس مالِ غنیمت کو آسمانی آگ نہ کھائے وہ علامت اسکی تھی کہ جہاد مقبول نہیں اسلئے وہ مال بھی منحوس سمجھا جاتا اور کوئی اسکے پاس نہ جاتا ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں جو مخصوص رعایتیں اور سہولتیں دی گئی ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مالِ غنیمت کو مسلمانوں کے لئے حلال کر دیا گیا جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں اس کی تصریح ہے ۔

اس قاعدہ کے اعتبار سے بنی اسرائیل کے قبضہ میں آیا ہوا مال جو قوم فرعون سے لیا

تھا مالِ غنیمت ہی کے حکم میں قرار دیا جائے تب بھی اس کا استعمال ان کے لئے جائز نہیں تھا اسی وجہ سے اس مال کو اوزار کے لفظ سے تعبیر کیا گیا اور حضرت ہارون کے حکم سے اسکو ایک گڑھے میں ڈالدیا گیا۔

فائدہ مہمہ لیکن فقہی نظر سے اس معاملہ کی جو تحقیق امام محمدؒ کی کتاب سیر اور اسکی شرح سرخسی میں بیان کی گئی ہے وہ بہت اہم اور اقرب الی الصواب ہے۔ وہ یہ ہے کہ کافر حربی کا مال بھی ہر حال میں مالِ غنیمت نہیں ہوتا بلکہ اسکی شرط یہ ہے کہ باقاعدہ جہاد و قتال کے ذریعہ بزورِ شمشیر اُن سے حاصل کیا جائے اسی لئے شرح سیر میں مغالبہ بالمحاربہ شرط قرار دیا ہے اور کافر حربی کا جو مال مغالبہ اور محاربہ کی صورت سے حاصل نہ ہو وہ مالِ غنیمت نہیں بلکہ اس کو مالِ فیئ کہتے ہیں مگر اس کے حلال ہونے میں ان کفار کی رضاء و اجازت شرط ہے جیسے کوئی اسلامی حکومت ان پر ٹیکس عائد کردے اور وہ اس پر راضی ہوکر ٹیکس دیدے تو اگرچہ یہ کوئی جہاد و قتال نہیں مگر رضامندی سے دیا ہوا مال مالِ فیئ کے حکم میں ہے اور وہ بھی حلال ہے۔

یہاں قومِ فرعون سے لئے ہوئے زیورات ان دونوں قسموں میں داخل نہیں کیونکہ یہ اُن سے عاریت کہہ کر لئے گئے تھے وہ ان کو مالکانہ طور پر دینے کے لئے رضامند نہ تھے کہ اس کو مالِ فیئ کہا جائے اور کوئی جہاد و قتال تو وہاں ہوا ہی نہیں کہ مالِ غنیمت شمار کیا جائے اسلئے شریعتِ اسلام کی رُو سے بھی یہ مال اُن کے لئے حلال نہ تھا۔

واقعہ ہجرت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ طیبہ جانیکا قصد فرمالیا اور آپکے پاس عرب کے کفار کی بہت سی امانتیں رکھی تھیں کیونکہ سارا عرب آپ کو امانتدار یقین کرتا اور امین کے لفظ سے خطاب کرتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی امانتوں کو واپس کرنے کا اتنا اہتمام فرمایا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سپرد کرکے اپنے پیچھے ان کو چھوڑا اور حکم دیا کہ جس جس کی امانت ہے اُس کو واپس کردی جائے آپ اس سے فارغ ہوکر ہجرت کریں۔ اس مال کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت کے تحت حلال قرار نہیں دیا ورنہ وہ مسلمانوں کا حق ہوتا کافروں کو واپس کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ واللہ اعلم

فَقَذَفْنٰهَا ، یعنی ہم نے ان زیورات کو پھینک دیا۔ حدیث فتون مذکورہ کی رُو سے یہ عمل حضرت ہارون علیہ السلام کے حکم سے کیا گیا اور بعض روایات میں ہے کہ سامری نے انکو بہکا کر زیورات گڑھے میں ڈلوا دیئے اور دونوں باتیں جمع ہوجائیں یہ بھی کوئی مستبعد نہیں۔

فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ، حدیث فتون مذکور میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل کے سب زیورات گڑھے میں ڈلوا دیئے اور اسمیں آگ جلوادی کہ سب زیورات پگھل کر یک جسم ہوجائیں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام

کے آنے کے بعد اسکا معاملہ طے کیا جاویگا کہ کیا کیا جائے۔ جب سب لوگ اپنے اپنے زیورات اسمیں ڈال چکے تو سامری بھی مٹھی بند کئے ہوئے پہنچا اور حضرت ہارون علیہ السلام سے کہا کہ میں بھی ڈالدوں۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے یہ سمجھا کہ اس کے ہاتھ میں بھی کوئی زیور ہوگا، فرمایا کہ ڈالدو۔ اُسوقت سامری نے ہارون علیہ السلام سے کہا کہ میں جب ڈالونگا کہ آپ یہ دُعا کریں کہ جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ پورا ہوجائے۔ ہارون علیہ السلام کو اسکا نفاق وکفر معلوم نہیں تھا دُعا کردی۔ اب جو اُس نے اپنے ہاتھ سے ڈالا تو زیور کے بجائے مٹی تھی جس کو اُس نے جبرئیل امین کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے کہیں یہ حیرت انگیز واقعہ دیکھ کر اُٹھالیا تھا کہ جس جگہ اس کا قدم پڑتا ہے وہیں مٹی میں نشو ونما اور آثارِ حیات پیدا ہوجاتے ہیں جس سے اُس نے سمجھا کہ اس مٹی میں آثارِ حیات رکھے ہوئے ہیں، شیطان نے اس کو اس پر آمادہ کردیا کہ یہ اس کے ذریعہ ایک بچھڑا زندہ کرکے دکھلادے۔ بہرحال اس مٹی کا ذاتی اثر ہو یا حضرت ہارون علیہ السلام کی دُعا کا کہ یہ سونے چاندی کا پگھلا ہوا ذخیرہ اس مٹی کے ڈالنے اور ہارون علیہ السلام کی دُعا کرنے کے ساتھ ایک زندہ بچھڑا بن کر بولنے لگا جن روایات میں ہے کہ سامری ہی نے بنی اسرائیل کو زیورات اس گڑھے میں ڈالنے کا مشورہ دیا تھا اُن میں یہ بھی ہے کہ اُس نے زیورات کو پگھلا کر ایک بچھڑے کی سورت تیار کرلی تھی مگر اسمیں کوئی زندگی نہیں تھی۔ پھر یہ جبرئیل امین کے نشانِ قدم کی مٹی ڈالنے کے بعد اسمیں حیات پیدا ہوگئی (یہ سب روایات تفسیر قرطبی وغیرہ میں مذکور ہیں اور ظاہر ہے کہ اسرائیلی روایات ہیں جن پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا مگر انکو غلط کہنے کی بھی کوئی دلیل موجود نہیں) فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ، یعنی نکال لیا سامری نے ان زیورات سے ایک بچھڑے کا جسم جسمیں گائے کی آواز (خُوار) تھی۔ لفظ جسدا سے بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ محض ایک جسد اور جسم تھا زندگی اسمیں نہیں تھی اور آواز بھی ایک خاص صفت کے سبب اس سے نکلتی تھی، عامۂ مفسرین کا قول وہی ہے جو اوپر لکھا گیا کہ اسمیں آثار زندگی کے تھے۔

فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ، یعنی سامری اور اسکے ساتھی یہ بچھڑا بولنے والا دیکھ کر دوسرے بنی اسرائیل سے کہنے لگے کہ یہی تمھارا اور موسیٰ کا خدا ہے موسیٰ علیہ السلام بھول بھٹک کر کہیں اور چلے گئے۔ یہانتک بنی اسرائیل کے عذرِ لنگ کا بیان تھا جو اُنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عتاب کے وقت پیش کیا اس کے بعد اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ڏ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا میں ان کی حماقت اور گمراہی کو بیان فرمایا ہے کہ اگر یہ فی الواقع ایک بچھڑا زندہ ہی ہوگیا اور گائے کی طرح بولنے بھی لگا تو عقل کے دشمنو یہ تو سمجھو کہ خدائی کا اس سے کیا واسطہ ہے جبکہ نہ وہ تمہاری کسی بات کا جواب دے سکتا ہے نہ تمہیں کوئی

نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے تو اس کو خدا ماننے کی حماقت کا کیا جواز ہے۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ
اور کہا تھا اُن کو ہارون نے پہلے سے اے قوم بات یہی ہے کہ تم بہک گئے اس بچھڑے سے

وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ۝۹۰
اور تمہارا رب تو رحمٰن ہے سو میری راہ چلو اور مانو بات میری

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا
بولے ہم برابر اسی پر لگے بیٹھے رہیں گے جب تک لوٹ کر آئے ہمارے پاس

مُوْسٰى ۝۹۱ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۝۹۲
موسیٰ کہا موسیٰ نے اے ہارون کس چیز نے روکا تجھ کو جب دیکھا تھا تو نے کہ وہ بہک گئے

اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۝۹۳ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ
کہ تو میرے پیچھے نہ آیا کیا تو نے رد کیا میرا حکم وہ بولا اے میری ماں کے جنے نہ پکڑ

بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ
میری داڑھی اور نہ سر، میں ڈرا کہ تو کہے گا پھوٹ ڈال دی تو نے

بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ۝۹۴
بنی اسرائیل میں اور یاد نہ رکھی میری بات

خلاصۂ تفسیر

اور ان لوگوں سے ہارون (علیہ السلام) نے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لوٹنے سے) پہلے بھی کہا تھا کہ اے میری قوم تم اس (گوسالہ) کے سبب گمراہی میں پھنس گئے ہو (یعنی اس کی پرستش کسی طرح درست نہیں ہو سکتی یہ کھلی گمراہی ہے) اور تمہارا رب (حقیقی) رحمان ہے (نہ کہ یہ گوسالہ) سو تم (دین کے بارے میں) میری راہ پر چلو اور (اس باب میں) میرا کہنا مانو (یعنی میرے قول و فعل کی اقتدا کرو) اُنھوں نے جواب دیا کہ ہم تو جب تک موسیٰ (علیہ السلام) واپس (ہو کر) آئیں اُسی (کی عبادت) پر برابر جمے بیٹھے رہیں گے (غرض ہارون علیہ السلام کا کہنا نہیں مانا تھا یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام بھی آگئے اور قوم سے اوّل خطاب کیا جو اُوپر آچکا بعد اس کے ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے اور) کہا اے ہارون جب تم نے (ان کو) دیکھا

تھا کہ یہ (بالکل) گمراہ ہو گئے (اور نصیحت بھی نہیں سنی) تو (اس وقت) تم کو میرے پاس چلے آنے سے کون امر مانع ہوا تھا (یعنی اسوقت میرے پاس چلا آنا چاہئے تھا تاکہ ان لوگوں کو اور زیادہ یقین ہوتا کہ تم اُن کے فعل کو نہایت ناپسند کرتے ہو اور نیز ایسے باغیوں سے قطع تعلقات جس قدر زیادہ ہو بہتر ہے) سو کیا تم نے میرے کہنے کے خلاف کیا (کہ میں نے کہا تھا وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ جیسا پارہ نہم میں ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ مفسدین کے راستہ کا اتباع نہ کریں جس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ مفسدین کے ساتھ تعلقات نہ رکھیں اور سب سے الگ ہو جائیں) ہارون (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے ماں جائے (یعنی میرے بھائی) تم میری داڑھی مت پکڑو اور نہ سر کے بال) پکڑو (اور میرا عذر سن لو میرے تمہارے پاس نہ آنے کی یہ وجہ تھی کہ) مجھ کو یہ اندیشہ ہوگیا کہ (اگر میں آپ کی طرف چلا تو میرے ساتھ وہ لوگ بھی چلیں گے جو گوسالہ پرستی سے الگ رہے تو بنی اسرائیل کی جماعت کے دو ٹکڑے ہو جاویں گے کیونکہ گوسالہ کی پرستش کو برا سمجھنے والے میرے ساتھ ہونگے اور دوسرے لوگ اس کی عبادت پر ہی جمے رہیں گے اور اس حالت میں) تم کہنے لگو کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان تفریق ڈالدی (جو بعض اوقات انکے ساتھ رہنے سے زیادہ مضر ہوتی ہے کہ مفسدین خالی میدان پاکر بے خطر فساد میں ترقی کرتے ہیں) اور تم نے میری بات کا پاس نہ کیا (کہ میں نے کہا تھا اَصْلِحْ ، یعنی اس صورت میں آپ مجھے یہ الزام دیتے کہ میں نے تمہیں اصلاح کرنیکا حکم دیا تھا تم نے بنی اسرائیل میں تفریق ڈالکر فساد کھڑا کر دیا)

معارف و مسائل

بنی اسرائیل میں گوسالہ پرستی کا فتنہ پھوٹ پڑا تو حضرت ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی خلافت اور نیابت کا حق ادا کرکے قوم کو سمجھایا مگر جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اُن میں تین فرقے ہوگئے ایک فرقہ تو حضرت ہارون کے ساتھ رہا اُن کی اطاعت کی اُس نے گوسالہ پرستی کو گمراہی سمجھا اُن کی تعداد بارہ ہزار بتلائی گئی ہے ، کذا فی القرطبی - باقی دو فرقے گوسالہ پرستی میں تو شریک ہو گئے فرق اتنا رہا کہ ان دونوں میں سے ایک فرقے نے یہ اقرار کیا کہ موسیٰ علیہ السلام واپس آکر اس سے منع کریں گے تو ہم گوسالہ پرستی کو چھوڑ دیں گے - دوسرا فرقہ اتنا پختہ تھا کہ اسکا یقین یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی واپس آکر اسی کو معبود بنالیں گے اور ہمیں اس طریقے کو بہر حال چھوڑنا نہیں ہے - جب ان دونوں فرقوں کا یہ جواب حضرت ہارون نے سُنا کہ ہم تو موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک گوسالہ ہی کی عبادت پر جمے رہیں گے تو حضرت ہارون علیہ السلام اپنے ہم عقیدہ بارہ ہزار ساتھیوں کو لیکر اُن سے الگ تو ہو گئے مگر رہنے بسنے وغیرہ کی جگہ وہی تھی اسمیں اُن کے ساتھ اشتراک رہا -

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے واپس آکر اول تو بنی اسرائیل کو وہ خطاب کیا جو پچھلی آیتوں میں بیان ہوا ہے پھر اپنے خلیفہ حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر اُن پر سخت غصہ اور ناراضی کا اظہار کیا اُن کی داڑھی اور سر کے بال پکڑ لئے اور فرمایا کہ جب ان بنی اسرائیل کو آپ نے دیکھ لیا کہ کھلی گمراہی یعنی شرک و کفر میں مبتلا ہو کر گمراہ ہو گئے تو تم نے میرا اتباع کیوں نہ کیا، میرے حکم کی خلاف ورزی کیوں کی۔

مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوٓا أَلَّا تَتَّبِعَنِ ، اس جگہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ تمھیں میرا اتباع کرنے سے کس چیز نے روکا، اس اتباع کا ایک مفہوم تو وہی ہے جو خلاصہ تفسیر میں اختیار کیا گیا کہ اتباع سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے پاس طور پر چلا جانا ہے اور بعض مفسرین نے اتباع کی مراد یہ قرار دی کہ جب یہ لوگ گمراہ ہو گئے تو آپ نے ان کا مقابلہ کیوں نہ کیا کیونکہ میری موجودگی میں ایسا ہوتا تو میں یقیناً اس شرک و کفر پر قائم رہنے والوں سے جہاد اور مقاتلہ کرتا تم نے ایسا کیوں نہ کیا۔

دونوں صورتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ہارون علیہ السلام پر الزام یہ تھا کہ ایسی گمراہی کی صورت میں یا تو اُن سے مقاتلہ اور جہاد کیا جاتا یا پھر اُن سے برارت اور علیحدگی اختیار کر کے میرے پاس آجاتے، اُن کے ساتھ رہتے بستے رہنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک اُن کی خطا اور غلطی تھی۔

حضرت ہارون علیہ السلام نے اس معاملے کے باوجود ادب کی پوری رعایت کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو نرم کرنے کے لئے خطاب يَبْنَؤُمَّ کے الفاظ سے کیا یعنی میری ماں کے بیٹے اس خطاب میں ایک خاص اشارہ سختی کا معاملہ نہ کرنے کی طرف تھا کہ میں آپ کا بھائی ہی تو ہوں کوئی مخالف تو نہیں اسلئے آپ میرا عُذر سُنیں۔ پھر عُذر یہ بیان کیا کہ مجھے خطرہ یہ پیدا ہو گیا کہ اگر میں نے ان لوگوں سے مقابلہ اور مقاتلہ کرنے پر آپکے آنے سے پہلے اقدام کیا یا انکو چھوڑ کر خود بارہ ہزار بنی اسرائیل کے ساتھ آپکے پاس چلا گیا، تو بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا ہو جائیگا اور آپ نے جو چلتے وقت مجھے یہ ہدایت فرمائی کہ اُخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ میں اس اصلاح کا مقتضایہ سمجھا تھا کہ ان میں تفرقہ نہ پیدا ہونے دوں (ممکن ہے کہ آپکے واپس آنے کے بعد یہ سب ہی سمجھ جائیں اور ایمان و توحید پر واپس آجائیں) اور دوسری جگہ قرآن کریم میں ہارون علیہ السلام کے عُذر میں یہ قول بھی ہے کہ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي یعنی قوم بنی اسرائیل نے مجھے ضعیف و کمزور سمجھا کیونکہ میرے ساتھی دوسروں کے مقابلہ میں بہت کم تھے اسلئے قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کر ڈالتے۔

خلاصہ عذر کا یہ ہے کہ میں اُن کی گمراہی کا ساتھی نہیں تھا جتنا سمجھانا اور ہدایت پر رکھنا میرے بس میں تھا وہ میں نے پُورا کیا اُن لوگوں نے میری بات نہ مانی اور میرے قتل کرنے کے درپے ہو گئے ایسی صورت میں اُن سے مقاتلہ کرتا یا اُن کو چھوڑ کر آپکے پاس جانے کا ارادہ کرتا تو صرف یہ بارہ ہزار

بنی اسرائیل میرے ساتھ ہوتے باقی سب مقاتلہ اور مقابلہ پر آجاتے اور باہمی معرکہ گرم ہوجاتا، میں نے اس سے بچنے کے لئے آپ کی واپسی تک کے لئے کچھ مساہلت کی صورت اختیار کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ عذر سُنا تو ہارون علیہ السلام کو چھوڑ دیا اور اصل بانیٔ فساد سامری کی خبر لی۔ قرآن میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کی رائے کو صحیح مان لیا یا محض اُن کی خطاء اجتہادی سمجھ کر چھوڑ دیا۔

دو پیغمبروں میں اختلاف رائے اور دونوں طرف صواب کے پہلو

اس واقعہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رائے از رُوئے اجتہاد یہ تھی کہ اس حالت میں ہارون علیہ السلام اور اُنکے ساتھیوں کو اس مشرک قوم کے ساتھ نہیں رہنا چاہئے تھا ان کو چھوڑ کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آجاتے جس سے اُن کے عمل سے مکمل بیزاری کا اظہار ہوجاتا۔

حضرت ہارون علیہ السلام کی رائے از روئے اجتہاد یہ تھی کہ اگر ایسا کیا گیا تو ہمیشہ کے لئے بنی اسرائیل کے ٹکڑے ہوجائیں گے اور تفرقہ قائم ہوجائے گا اور چونکہ اُن کی اصلاح کا یہ احتمال موجود تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی کے بعد اُن کے اثر سے پھر یہ سب ایمان اور توحید کی طرف لوٹ آویں اس لئے کچھ دنوں کے لئے اُن کے ساتھ مساہلت اور مساکنت کو اُنکی اصلاح کی توقع تک گوارا کیا جائے۔ دونوں کا مقصد اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل، ایمان و توحید پر لوگوں کو قائم کرنا تھا مگر ایک نے مفارقت اور مقاطعہ کو اسکی تدبیر سمجھا، دوسرے نے اصلاحِ حال کی اُمید تک اُن کے ساتھ مساہلت اور نرمی کے معاملہ کو اس مقصد کے لئے نافع سمجھا۔ دونوں جانبین اہلِ عقل و فہم اور فکر و نظر کے لئے محل غور و فکر ہیں۔ کسی کو خطا کہنا آسان نہیں مجتہدین اُمت کے اجتہادی اختلافات عموماً اسی طرح کے ہوتے ہیں انہیں کسی کو گناہگار یا نافرمان نہیں کہا جاسکتا۔

رہا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہارون علیہ السلام کے بال پکڑنے کا معاملہ تو یہ دین کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے شدت و غضب کا اثر تھا کہ تحقیقِ حال سے پہلے اُنھوں نے ہارون علیہ السلام کو ایک واضح غلطی پر سمجھا اور جب ان کا عذر معلوم ہوگیا تو پھر اپنے لئے اور اُن کے لئے دُعاءِ مغفرت فرمائی۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا

کہا موسیٰ نے اب تیری کیا حقیقت ہے اے سامری ۔ بولا میں نے دیکھ لیا جو اوروں نے نہ دیکھا

بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ

پھر بھر لی میں نے ایک مٹھی پاؤں کے نیچے سے اس بھیجے ہوئے کے پھر میں نے وہی ڈالدی اور یہی صلاح

سَوَّلَتْ لِیْ نَفْسِیْ ﴿۹۶﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِی الْحَیٰوةِ

دی مجھ کو میرے جی نے کہا موسیٰ نے دُور ہو تیرے لئے زندگی بھر تو اتنی سزا ہے

اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ

کہ کہا کرے مت چھیڑو اور تیرے واسطے ایک وعدہ ہے وہ ہرگز تجھ سے خلاف نہ ہوگا

وَانْظُرْ اِلٰۤی اِلٰهِكَ الَّذِیْ ظَلْتَ عَلَیْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ

اور دیکھ اپنے معبود کو جس پر تمام دن تو معتکف رہتا تھا ہم اس کو جلا دیں گے

ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾ اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ

پھر بکھیر دیں گے دریا میں اُڑا کر تمہارا معبود تو وہی اللہ ہے جس کے سوا کسی

اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

کی بندگی نہیں سب چیز سما گئی ہے اس کے علم میں

خلاصۂ تفسیر

(پھر سامری کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے) کہا کہ اے سامری تیرا کیا معاملہ ہے (یعنی تو نے یہ حرکت کیوں کی) اس نے کہا کہ مجھ کو ایسی چیز نظر آئی تھی جو اوروں کو نظر نہ آئی تھی (یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام گھوڑے پر چڑھے ہوئے جس روز دریا سے پار اُترے ہیں جو بمصلحت نصرت مؤمنین و اہلاک کفار کے آئے ہوں گے اور تاریخ طبری میں سدی سے بسند نقل کیا ہے کہ حضرت جبرئیل موسیٰ علیہ السلام کے پاس یہ حکم لیکر گھوڑے پر سوار ہو کر آئے تھے کہ آپ طور پر جادیں تو اُس وقت سامری نے دیکھا تھا) پھر میں نے اس فرستادہ (خداوندی کی سواری) کے نقش قدم سے ایک مٹھی (بھر کر خاک) اُٹھالی تھی (اور خود بخود میرے قلب میں یہ بات آئی کہ اس میں زندگی کے اثرات ہونگے جس چیز پر ڈالی جائے گی اُسمیں زندگی پیدا ہو جائے گی) سو میں نے وہ مٹھی (خاک اس بچھڑے کے قالب کے اندر) ڈالدی اور میرے جی کو یہی بات (بھائی اور پسند آئی) آپ نے فرمایا تو بس تیرے لئے اس (دنیوی) زندگی میں یہ سزا (تجویز کی گئی) ہے کہ تو یہ کہتا پھریگا کہ مجھ کو کوئی ہاتھ نہ لگانا اور تیرے لئے (اس سزا کے علاوہ) ایک اور وعدہ (حق تعالیٰ کے عذاب کا) ہے جو تجھ سے ٹلنے والا نہیں (یعنی آخرت میں جُدا عذاب ہوگا) اور تو اپنے اس معبود (باطل) کو دیکھ جس (کی عبادت) پر تو جما ہوا بیٹھا تھا (دیکھ) ہم اسکو جلا دینگے پھر اس (کی راکھ) کو دریا میں بکھیر کر بہا دیں گے (تاکہ نام و نشان اسکا نہ رہے) بس تمہارا

(حقیقی) معبود تو صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ (اپنے) علم سے تمام چیزوں کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔

معارف و مسائل

بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهٖ، (یعنی وہ چیز دیکھی جو دوسروں نے نہیں دیکھی) اس سے مراد جبرئیل امین ہیں اور اُن کے دیکھنے کے واقعہ میں ایک روایت تو یہ ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز سے دریائے قلزم میں خشک راستے بن گئے اور بنی اسرائیل ان راستوں سے گزر گئے اور فرعونی لشکر دریا میں داخل ہو رہا تھا تو جبرئیل امین گھوڑے پر سوار یہاں موجود تھے دوسری روایت یہ ہے کہ دریا سے پار ہونے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر آنے کی دعوت دینے کے لئے جبرئیل امین گھوڑے پر سوار تشریف لائے تھے انکو سامری نے دیکھ لیا دوسرے لوگوں کو معلوم نہ ہو سکا اسکی وجہ حضرت ابن عباس رضؓ کی ایک روایت میں یہ ہے کہ سامری کی پرورش خود جبرئیل امین کے ذریعہ ہوئی تھی جس وقت اسکی ماں نے اسکو غار میں ڈالدیا تھا تو جبرئیل امین روزانہ اسکو غذا دینے کے لئے آتے تھے اس کی وجہ سے وہ اُن سے مانوس تھا اور پہچانتا تھا دوسرے لوگ نہیں پہچان سکے (بیان القرآن)

فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ، رسول سے مراد اس جگہ فرستادہ خداوندی حضرت جبرئیل امین ہیں۔ سامری کے دل میں شیطان نے یہ بات ڈالی کہ جبرئیل امین کے گھوڑے کا قدم جس جگہ پڑتا ہے وہاں کی مٹی میں حیات و زندگی کے خاص اثرات ہوں گے یہ مٹی اُٹھالی جاوے اس نے نشانِ قدم کی مٹی اُٹھالی۔ یہ بات حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے القی فی روعہ انہٗ لا یلقیھا علیٰ شیءٍ فیقول کن کذا الا کان، یعنی سامری کے دل میں خود بخود یہ بات پیدا ہوئی کہ نشانِ قدم کی اس مٹی کو جس چیز پر ڈال کر یہ کہا جائے گا کہ فلاں چیز بن جا تو وہ وہی چیز بن جائیگی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سامری نے گھوڑے کے نشانِ قدم کا یہ اثر مشاہدہ کیا کہ جس جگہ قدم پڑتا وہیں سبزہ فوراً نمودار ہوجاتا تھا جس سے یہ استدلال کیا کہ اس مٹی میں آثارِ حیات ہیں، کذا فی الکمالین۔ اسی تفسیر کو روح المعانی میں صحابہ و تابعین اور جمہور مفسرین سے منقول کہا ہے اور اسمیں آجکل ظاہر پرست لوگوں نے جو شبہات نکالے ہیں ان سب کا جواب دیا ہے جزاہ اللہ خیر الجزاء (بیان القرآن)

پھر جب بنی اسرائیل کے جمع کئے زیورات سے اس نے ایک بچھڑے کی ہیئت بنالی تو اپنے گمان کے مطابق کہ اس مٹی میں آثارِ حیات ہیں جس چیز میں ڈالی جائے گی اسمیں زندگی پیدا ہوجائے گی اس نے یہ مٹی اُس بچھڑے کے اندر ڈالدی بقدرتِ خداوندی اُسمیں حیات کے

آثار پیدا ہوگئے اور بولنے لگا۔ اور حدیث فتون جو پہلے مفصل آچکی ہے اسمیں یہ ہے کہ اسنے حضرت ہارون علیہ السلام سے دعا کرائی کہ میں اپنے ہاتھ میں جو کچھ ہے اسکو ڈالتا ہوں شرط یہ ہے کہ آپ یہ دعا کردیں کہ جو میں چاہتا ہوں وہ ہوجاوے۔ حضرت ہارون اسکے نفاق اور گوسالہ پرستی سے واقف نہ تھے دعا کردی اور اسنے وہ خاک نشانِ قدم کی اسمیں ڈالدی تو حضرت ہارون کی دعا سے اسمیں حیات کے آثار پیدا ہوگئے۔ ایک روایت کے حوالے سے پہلے لکھا جاچکا ہے کہ سامری فارس یا ہندوستان کا باشندہ اس قوم کا فرد تھا جو گائے کی پرستش کرتی ہے، مصر پہنچکر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا بعد میں پھر مرتد ہوگیا یا پہلے ہی ایمان کا اظہار منافقانہ کیا تھا پھر نفاق ظاہر ہوگیا۔ اس اظہارِ ایمان کا فائدہ اسکو یہ پہنچا کہ بنی اسرائیل کے ساتھ دریا سے پار ہوگیا۔

فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کے لئے دنیا کی زندگی میں یہ سزا تجویز کی کہ سب لوگ اس سے مقاطعہ کریں کوئی اس کے پاس نہ جاوے اور اسکو بھی یہ حکم دیا کہ کسی کو ہاتھ نہ لگائے اور زندگی بھر اسی طرح وحشی جانوروں کی طرح سب سے الگ رہے۔ یہ سزا ہوسکتا ہے کہ ایک قانون کی صورت میں ہو جس کی پابندی اسپر اور دوسرے سب بنی اسرائیل پر منجانب موسیٰ علیہ السلام لازم کردی گئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ قانونی حیثیت کی سزا سے آگے خود اسکی ذات میں بقدرتِ خداوندی کوئی ایسی بات پیدا کردی گئی ہو کہ نہ وہ دوسروں کو چھو سکے نہ کوئی دوسرا اسکو چھو سکے جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی بددعا سے اسمیں یہ کیفیت پیدا ہوگئی تھی کہ اگر یہ کسی کو ہاتھ لگا دے یا کوئی اسکو ہاتھ لگا دے تو دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا، کذا فی المعالم۔ اس ڈر کے مارے وہ سب سے الگ بھاگا پھرتا تھا اور جب کسی کو قریب آتا دیکھتا تو دور سے پکارتا تھا لَا مِسَاسَ یعنی کوئی مجھے نہ چھوئے۔

سامری کی سزا میں ایک لطیفہ روح المعانی میں بحوالہ بحر محیط نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو قتل کردینے کا ارادہ کیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی سخاوت اور لوگوں کی خدمت کرنے کی وجہ سے قتل کی سزا سے منع فرمادیا (بیان القرآن)

لَنُحَرِّقَنَّهٗ (یعنی ہم اس کو آگ میں جلائیں گے) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بچھڑا سونے چاندی کے زیورات سے گھڑا ہوا تھا تو اسکے آگ میں جلانے کی کیا صورت ہوگی سونا چاندی پگھلنے والی چیز ہے جلنے والی نہیں۔ جواب یہ ہے کہ اول تو خود اسمیں اختلاف ہے کہ بچھڑے میں آثارِ حیات پیدا ہونے کے بعد بھی وہ چاندی سونے ہی کا رہا یا اسکی حقیقت تبدیل ہوکر گوشت اور خون بن گیا۔ اگر وہ گوشت اور لحم ودم بن گیا تھا تو ظاہر ہے کہ اسکو جلانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ذبح کرکے جلا دیا جاویگا اور اگر دوسرا قول لیا جائے تو اسکے جلانے کا مطلب یہ ہوگا کہ اسکو سوہان سے ریت کر

ذرہ ذرہ کردیا جاویگا کما فی الدر المنثور، یا کسی حیلۂ اکسیر یہ سے جلا دیا جاویگا کما فی روح المعانی، اور یہ بھی کوئی امر مستبعد نہیں کہ احراق اور جلانا بطور خرق عادت و معجزہ ہو واللہ اعلم (بیان القرآن)

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ

یوں سناتے ہیں ہم تجھ کو ان کے احوال جو پہلے گزر چکے اور ہم نے دی تجھ کو

مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿٩٩﴾ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ

اپنے پاس سے پڑھنے کی کتاب جو کوئی منہ پھیرلے اس سے سو وہ اٹھائے گا دن

الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿١٠٠﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَاۗءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

قیامت کے ایک بوجھ سدا رہیں گے اسمیں اور برا ہے ان پر قیامت میں وہ

حِمْلًا ﴿١٠١﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ

بوجھ اٹھانے کا جسدن پھونکیں گے صور میں اور گھیر لائیں گے ہم گناہگاروں کو اسدن

زُرْقًا ﴿١٠٢﴾ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿١٠٣﴾ نَحْنُ

نیلی آنکھیں چپکے چپکے کہتے ہونگے آپس میں تم نہیں رہے مگر دس دن ہم کو

اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ

خوب معلوم ہے جو کچھ کہتے ہیں جب بولے گا ان میں اچھی راہ روش والا تم نہیں رہے

اِلَّا يَوْمًا ﴿١٠٤﴾ وَيَسْـَٔـلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ

مگر ایک دن اور تجھ سے پوچھتے ہیں پہاڑوں کا حال سو تو کہہ انکو بکھیر دیگا میرا رب

نَسْفًا ﴿١٠٥﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿١٠٦﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا

اڑا کر پھر کر چھوڑیگا زمین کو صاف میدان نہ دیکھے تو اس میں موڑ

وَّلَآ اَمْتًا ﴿١٠٧﴾ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَ

اور نہ ٹیلا اسدن پیچھے دوڑیں گے پکارنے والے کے ٹیڑھی نہیں جس کی بات اور

خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿١٠٨﴾

دب جائیں گی آوازیں رحمٰن کے ڈر سے پھر تو نہ سنے گا مگر کھسکھسی آواز

يَوْمَىِٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ

اسدن کام نہ آئیگی سفارش مگر جس کو اجازت دی رحمٰن نے

ع ۵

وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ
اور پسند کی اُس کی بات وہ جانتا ہے جو کچھ ہے اُن کے آگے اور پیچھے

وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ﴿١١٠﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ
اور یہ قابو میں نہیں لا سکتے اسکو دریافت کر کر اور رگڑتے ہیں منھ آگے اس جیتے ہمیشہ رہنے والے کے

وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿١١١﴾ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ
اور خراب ہوا جس نے بوجھ اٹھایا ظلم کا اور جو کوئی کرے کچھ بھلائیاں

وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا ﴿١١٢﴾ وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ
اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو سو اسکو ڈر نہیں بے انصافی کا اور نہ نقصان پہنچنے کا اور اسی طرح اُتارا ہم نے

قُرْآنًا عَرَبِيًّا وَصَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ
قرآن عربی زبان کا اور پھیر پھیر کر سنائی اسمیں ڈرانے کی باتیں تاکہ وہ

يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿١١٣﴾ فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ
پرہیز کریں یا ڈالے ان کے دل میں سوچ سو بلند درجہ اللہ کا اس سچے

الْحَقُّ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَى
بادشاہ کا اور تو جلدی نہ کر قرآن کے لینے میں جب تک پورا نہ ہو چکے

إِلَيْكَ وَحْيُهُ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا ﴿١١٤﴾
اس کا اُترنا اور کہہ اے رب زیادہ کر میری سمجھ

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات سورۂ طٰہٰ میں اصل بیان توحید، رسالت اور آخرت کے اصولی مسائل کا ہے انبیاء علیہم السلام کے واقعات اسی سلسلہ میں بیان ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بڑی تفصیل سے ذکر ہوا ہے اور اس کے ضمن میں رسالتِ محمدیہ کا اثبات بھی ہے اسی اثباتِ رسالتِ محمدیہ کا یہ حصہ ہے جو اگلی آیات میں بیان ہوا ہے کہ ان واقعات و قصص کا اظہار ایک نبی اُمّی کی زبان سے خود دلیل رسالت و نبوت اور وحی الٰہی کی ہے اور ان سب کا سرچشمہ قرآن ہے اور حقیقتِ قرآن کے ذیل میں کچھ تفصیل معاد و آخرت کی بھی آگئی ہے (جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کیا) اسی طرح ہم آپ سے اور واقعات گزشتہ کی خبریں (اور حکایتیں) بھی بیان کرتے رہتے ہیں (تاکہ نبوت کے دلائل میں زیادتی ہوتی چلی جائے) اور ہم نے آپ کو اپنے پاس سے ایک نصیحت نامہ

دیا ہے (یعنی قرآن جس میں وہ خبریں ہیں اور وہ خود بھی استقلالاً بوجہ اپنے اعجاز کے دلیل نبوت ہے، اور وہ نصیحت نامہ لیا ہے کہ) جو لوگ اس (کے مضامین ماننے) سے روگردانی کریں گے سو وہ قیامت کے روز بڑا بھاری بوجھ (عذاب کا) لادے ہونگے (اور) وہ اس (عذاب) میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بوجھ قیامت کے روز ان کے لئے بڑا (بوجھ) ہوگا جس روز صور میں پھونک ماری جاویگی (جس سے مُردے زندہ ہوجاویں گے) اور ہم اس روز مجرم (یعنی کافر) لوگوں کو (میدان قیامت میں) اس حالت سے جمع کریں گے کہ (نہایت بدصورت ہونگے کہ آنکھوں سے اَکرنجے ہونگے (جو آنکھوں کا بدترین رنگ شمار ہوتا ہے اور خوفزدہ اسقدر ہونگے کہ) چپکے چپکے آپس میں باتیں کرتے ہونگے (اور ایک دوسرے سے کہتے ہونگے) کہ تم لوگ (قبروں میں) صرف دس روز رہے ہونگے (مطلب یہ کہ ہم تو یوں سمجھے تھے کہ مر کر پھر زندہ ہونا نہیں یہ گمان تو بالکل غلط نکلا، نہ زندہ ہونا تو درکنار یہ بھی تو نہ ہوا کہ دیر ہی میں زندہ ہوتے بلکہ بہت ہی جلدی زندہ ہوگئے کہ وہ مدت دس روز کے برابر معلوم ہوتی ہے وجہ اس مقدار کے برابر معلوم ہونے کی اس روز کی درازی اور ہول اور پریشانی ہے کہ قبر میں رہنے کی مدت اس کے سامنے اسقدر کم معلوم ہوگی۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں کہ) جس (مدت) کی نسبت وہ بات چیت کریں گے اسکو ہم خوب جانتے ہیں (کہ وہ کتنی ہے جبکہ ان سب میں کا زیادہ صائب الرائے یوں کہتا ہوگا کہ نہیں تم تو ایک ہی روز (قبر میں) رہے ہو (اسکو صائب الرائے اسلئے فرمایا کہ یوم کے طول اور ہول کے اعتبار سے یہی نسبت اقرب ہے پس اس شخص کو حقیقت شدت کا زیادہ ادراک ہوا اسلئے اس شخص کی رائے پہلے شخص کے اعتبار سے بہتر ہے اور یہ مقصود نہیں کہ اس شخص کی بات بالکل صحیح ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ دونوں مقداریں اصلی تحدید کے اعتبار سے صحیح نہیں اور نہ ان قائلین کا یہ مقصود تھا) اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کا حال سُنکر بعضے) لوگ آپ سے پہاڑوں کی نسبت پوچھتے ہیں (کہ قیامت میں ان کا کیا حال ہوگا) سو آپ (جواب میں) فرمادیجئے کہ میرا رب ان کو (ریزہ ریزہ کرکے) بالکل اُڑادیگا پھر زمین کو ایک میدان ہموار کردیگا کہ جس میں تو (اے مخاطب) نہ ناہمواری دیکھے گا اور نہ کوئی بلندی (پہاڑ ٹیلہ وغیرہ کی) دیکھے گا اس روز سب کے سب (خدائی) بلانیوالے (یعنی صور پھونکنے والے فرشتہ) کے کہنے پر ہولیں گے (یعنی وہ اپنی صُور پھونکنے کی آواز سے سب کو قبروں سے بلادیگا تو سب نکل پڑیں گے) اسکے سامنے (کسی کا) کوئی ٹیڑھا پن نہ رہے گا (کہ قبر سے زندہ ہوکر نہ نکلے جیسے دُنیا میں انبیاء علیہم السلام کے سامنے ٹیڑھے رہتے تھے کہ تصدیق نہ کرتے تھے) اور (مارے ہیبت کے) تمام آوازیں اللہ تعالیٰ کے سامنے دب جاویں گی سو (اے مخاطب) تو بجز پاؤں کی آہٹ کے (کہ میدان حشر کی طرف چپکے چپکے چل رہے ہونگے) اور کچھ (آواز) نہ سُنیگا (خواہ

بوجہ اس کے کہ اسوقت بولتے ہی نہ ہونگے گو دوسرے موقع پر آہستہ آہستہ بولیں جیسا اُوپر آیا ہے یتخافتون اور خواہ بوجہ اس کے کہ بہت آہستہ بولتے ہونگے جو ذرا فاصلے سے ہو وہ نہ سُن سکے) اُس روز (کسی کو کسی کی) سفارش نفع نہ دے گی مگر ایسے شخص کو (انبیاء و صلحاء کی سفارش نفع دیگی) کہ جس (کی سفارش کرنے) کیواسطے اللہ تعالیٰ نے (شافعین کو) اجازت دیدی ہو اور اُس شخص کیواسطے (شافع کا) بولنا پسند کرلیا ہو (مُراد اس سے مؤمن ہے کہ شافعین کو اسکی سفارش کے لئے اجازت ہوگی اور اس باب میں شافع کا بولنا پسندیدۂ حق ہوگا اور کفار کیلئے سفارش کی کسی کو اجازت ہی نہ ہوگی پس عدم نفع بوجہ عدم شفاعت کے ہے اسمیں اعتراض کرنیوالے کفار کو ڈرانا ہے کہ تم تو شفاعت سے بھی محروم رہوگے اور) وہ (اللہ تعالیٰ) ان سب کے اگلے پچھلے احوال کو جانتا ہے اور اس (کے معلومات) کو انکا علم احاطہ نہیں کرسکتا (یعنی ایسا تو کوئی امر نہیں جو خلق کو معلوم ہو اور اللہ تعالیٰ کو معلوم نہ ہو اور ایسے بہت اُمور ہیں جو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں اور خلق کو معلوم نہیں پس مخلوقات کے وہ سب احوال بھی اسکو معلوم ہیں جن پر شفاعت کی قابلیت یا عدم قابلیت مرتب ہے سو جو اسکا اہل ہوگا اسکے واسطے سفارش کرنیکی شافعین کو اجازت ہوگی اور جو اہل نہ ہوگا اسکے لئے اجازت نہ ہوگی) اور (اس روز) تمام چہرے اس حی و قیوم کے سامنے جھکے ہونگے (اور سب متکبرین اور منکرین کا تکبر انکا ختم ہو جاویگا) اور (اس وصف میں تو سب مشترک ہونگے پھر آگے انمیں یہ فرق ہوگا کہ) ایسا شخص تو (ہر طرح) ناکام رہیگا جو ظلم (یعنی شرک) لیکر آیا ہوگا اور جس نے نیک کام کئے ہوں گے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا سو اسکو (کامل ثواب ملیگا) نہ کسی زیادتی کا اندیشہ ہوگا اور نہ کمی کا (مثلاً یہ کہ کوئی گناہ اسکے نامۂ اعمال میں زیادہ لکھدیا جاوے یا کوئی نیکی کم لکھدی جاوے اور یہ کنایہ ہے کمال ثواب سے پس اسکے مقابلہ میں کفار سے ثواب کی نفی مقصود ہوگی بوجہ عدم موجب ثواب کے گو ظلم اور حق تلفی کفار کی بھی نہ ہوگی اور کفار کے نیک اعمال کا حساب میں نہ لکھا جانا یہ کوئی ظلم نہیں بلکہ اسلئے ہے کہ اُن کے اعمال شرطِ ایمان سے خالی ہونیکی وجہ سے کالعدم ہوگئے) اور ہم نے (جس طرح یہ مضامین مذکورہ مقام صاف صاف ارشاد کئے ہیں) اسی طرح اسکو (سارے کو) عربی قرآن کرکے نازل کیا ہے (جسکے الفاظ واضح ہیں) اور اسمیں ہم نے طرح طرح سے وعید (قیامت و عذاب کی) بیان کی ہے (جس سے معنی بھی واضح ہوگئے مطلب یہ کہ سارے قرآن کے مضامین ہم نے صاف صاف بتلائے ہیں) تاکہ وہ (سُننے والے) لوگ (اس کے ذریعہ سے بالکل) ڈر جائیں (اور فی الحال ایمان لے آئیں) یا (اگر بالکل نہ ڈریں تو یہی ہو کہ) یہ قرآن ان کیلئے کسی قدر (تو) سمجھ پیدا کردے (یعنی اگر پُورا اثر نہ ہو تو تھوڑا ہی ہو اور اسی طرح چند بار تھوڑا تھوڑا جمع ہو کر کافی مقدار ہو جاوے اور کسی وقت مسلمان ہو جاویں) سو اللہ تعالیٰ جو بادشاہِ حقیقی ہے عالی شان ہے (کہ ایسا نافع کلام نازل

فرمایا) اور (جس طرح عمل کرنا اور نصیحت ماننا جو اوپر مذکور ہوئے قرآن کی تبلیغ کا حق واجب ہے، جسکا ادا کرنا سب مسلمانوں پر جو احکام کے مکلف ہیں فرض ہے اسی طرح بعض آداب قرآن کی تنزیل سے بھی متعلق ہیں جن کے ادا کرنیکا تعلق آپ سے ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ) قرآن (پڑھنے) میں قبل اسکے کہ آپ پر اسکی وحی پوری نازل ہوچکے عجلت نہ کیا کیجئے (کہ اسمیں آپ کو تکلیف ہوتی ہے کہ جبرئیل علیہ السلام سے سُننا اور اس کو پڑھنا ساتھ ساتھ کرنا پڑتا ہے سو ایسا نہ کیجئے اور اسکا اندیشہ نہ کیجئے کہ شاید یاد نہ رہے یاد کرانا ہمارے ذمہ ہے) اور آپ (کبھی یاد ہونے کیلئے ہم سے) یہ دعا کیجئے کہ اے میرے رب میرا علم بڑھادے (اسمیں علم حاصل کے یاد رہنے کی اور غیر حاصل کے حصول کی اور جو حاصل ہونیوالا نہیں اسمیں عدم حصول ہی کو خیر اور مصلحت سمجھنے کی اور سب علوم میں خوش فہمی کی یہ سب دُعائیں داخل ہیں قولاً تعجل کے بعد اسکا آنا نہایت ہی مناسب ہوا حاصل یہ کہ تدابیر حفظ میں سے تدبیر تعجیل کو ترک کیجئے اور تدبیر دُعا کو اختیار کیجئے)۔

معارف و مسائل

قَدْ اٰتَیْنٰکَ مِنْ لَّدُنَّا ذِکْرًا ، ذکر سے مراد اس جگہ جمہور مفسرین کے نزدیک قرآن ہے مَنْ اَعْرَضَ عَنْہُ فَاِنَّہٗ یَحْمِلُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وِزْرًا ، یعنی جو شخص قرآن سے اعراض روگردانی کریگا قیامت کے روز اسکے اوپر گناہوں کا بڑا بوجھ لدا ہوگا۔ قرآن سے اعراض کی مختلف صورتیں ہیں اسکی تلاوت کی طرف کوئی دھیان ہی نہ کرے نہ کبھی قرآن پڑھنے اور سیکھنے کی فکر کرے یا قرآن کو پڑھے مگر غلط سلط پڑھے تصحیح حروف کی فکر نہ کرے یا صحیح بھی پڑھے مگر بے دلی اور بے پروائی سے پڑھے یا کسی دُنیوی مال و عزت کی خواہش سے پڑھے۔ اسی طرح قرآن کے احکام کو سمجھنے کیطرف توجہ نہ دینا بھی قرآن سے اعراض ہے اور سمجھنے کے بعد اُن پر عمل کرنے میں کوتاہی یا اسکے احکام کی خلاف ورزی یہ تو اعراض کا انتہائی درجہ ہے۔ غرض قرآن کے حقوق سے بے پروائی کرنے کا بڑا وبال ہے جو قیامت کے روز بار گراں بن کر اسکی گردن پر لاد دیا جاویگا جیسا کہ روایات حدیث میں ہے کہ انسان کے بُرے اعمال اور گناہ قیامت کے روز ایک بار گراں بنکر اسکے اوپر لادا جائیگا۔

یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ ، حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک گاؤں والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا کہ صُور کیا چیز ہے تو آپ نے فرمایا کہ ایک سینگ ہے جسمیں پھونک ماری جائے گی، مراد یہ ہے کہ سینگ کی طرح کی کوئی چیز ہے جسمیں فرشتہ کی پھونک مارنے کا پوری دُنیا پر یہ اثر ہوگا کہ سب مُردے زندہ ہوکر کھڑے ہوجاوینگے حقیقت اس صُور کی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْکَ وَحْیُہٗ ، صحیح حدیث میں حضرت

ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ ابتداء وحی میں جب جبریل امین کوئی آیت قرآن لیکر آتے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سُناتے تو آپ اُن کے ساتھ ساتھ آیت کو پڑھنے کی بھی کوشش فرماتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یاد سے نکل جائے اسمیں آپ پر دوہری مشقت ہوتی تھی اوّل قرآن کو جبریل سے سُننے اور سمجھنے کی اسکے ساتھ اسکو یاد رکھنے کے لئے اپنی زبان سے ادا کرنے کی حق تعالیٰ نے اس آیت میں نیز سُورۂ قیامہ کی آیت لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ میں آپکے لئے آسانی یہ پیدا فرمادی کہ جو آیات قرآن آپ پر نازل کی جاتی ہیں اُن کا یاد رکھنا آپکی ذمہ داری نہیں وہ ہمارے ذمہ ہے ہم خود آپ کو یاد کرادیں گے اسلئے آپ کو جبریل امین کے ساتھ ساتھ پڑھنے اور زبان کو حرکت دینے کی ضرورت نہیں آپ اُسوقت صرف اطمینان کے ساتھ سُنا کریں البتہ یہ دُعا کرتے رہیں کہ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا، یعنی اے میرے پروردگار میرا علم بڑھا دیجئے اس جامع دُعا میں نازل شدہ قرآن کا یاد رکھنا بھی داخل ہے اور غیر نازل شدہ کی طلب بھی اور اُسکے سمجھنے کی توفیق بھی۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ ع ۱۱ / ۱۵

اور ہم نے تاکید کر دی تھی آدم کو اس سے پہلے پھر بھول گیا اور نہ پائی ہم نے اسمیں کچھ ہمت

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾

اور جب کہا ہم نے فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے، مگر نہ مانا ابلیس نے

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا

پھر کہدیا ہم نے اے آدم یہ دشمن تیرا ہے اور تیرے جوڑے کا سو نکلوا نہ دے

مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾

تم کو بہشت سے، پھر تو پڑ جائے تکلیف میں، تجھ کو یہ ملا ہے کہ نہ بھوکا ہو تو اسمیں اور نہ ننگا

وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ

اور یہ کہ نہ پیاس کھینچے تو اسمیں اور نہ دھوپ پھر جی میں ڈالا اس کے

الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰي شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ

شیطان نے کہا اے آدم میں بتاؤں تجھ کو درخت سدا زندہ رہنے کا اور

مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا

بادشاہی جو پُرانی نہ ہو پھر دونوں نے کھا لیا اسمیں سے پھر کھل گئیں اُن پر اُنکی بُری چیزیں اور لگے

يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۚ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ

گانٹھنے اپنے اوپر پتے بہشت کے اور حکم ٹالا آدم نے اپنے رب کا

فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ قَالَ

پھر راہ سے بہکا پھر نواز دیا اس کو اس کے رب نے پھر متوجہ ہوا اس پر اور راہ پر لایا فرمایا

اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ

اُترو یہاں سے دونوں اکٹھے رہو ایک دوسرے کے دشمن پھر اگر پہنچے تم کو

مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾

میری طرف سے ہدایت پھر جو چلا میری بتلائی راہ پر سو وہ نہ بہکے گا اور نہ وہ تکلیف میں پڑیگا

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ

اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کو ملنی ہے گزران تنگی کی اور لائیں گے ہم اسکو

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْۤ اَعْمٰى وَقَدْ

دن قیامت کے اندھا وہ کہے گا اے رب کیوں اٹھا لایا تو مجھ کو اندھا اور میں تو

كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ

تھا دیکھنے والا فرمایا یونہی پہنچی تھیں تجھ کو ہماری آیتیں پھر تو نے انکو بھلا دیا، اور اسی طرح

الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ

آج تجھ کو بھلا دیں گے اور اسی طرح بدلہ دیں گے ہم اس کو جو حد سے نکلا اور یقین نہ لایا اپنے

بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾

رب کی باتوں پر اور آخرت کا عذاب سخت ہے اور بہت باقی رہنے والا

خلاصۂ تفسیر

اور اس سے (بہت زمانہ) پہلے ہم آدم (علیہ السلام) کو ایک حکم دے چکے تھے (جسکا بیان آگے آتا ہے) سو ان سے غفلت (اور بے احتیاطی) ہو گئی اور ہم نے (اس حکم کے اہتمام میں) ان میں پختگی (اور ثابت قدمی) نہ پائی اور (اس اجمال کی تفصیل اگر مطلوب ہو تو) وہ وقت یاد کرو جبکہ ہم نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ آدم (علیہ السلام) کے سامنے سجدہ (تحیت) کرو

سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے (کہ) اُس نے انکار کیا پھر ہم نے (آدم سے) کہا کہ اے آدم (یاد رکھو) یہ بلاشبہ تمہارا اور تمہاری بی بی کا (اس وجہ سے) دشمن ہے (کہ تمہارے معاملہ میں مردود ہوا) سو کہیں تم دونوں کو جنت سے نہ نکلوا دے (یعنی اسکے کہنے سے کوئی ایسا کام مت کر بیٹھنا کہ جنت سے باہر کئے جاؤ) پھر مصیبت (اکتساب معاش) میں پڑ جاؤ (اور ساتھ میں تمہاری بی بی بھی مگر زیادہ حصہ مصیبت کا تم کو بھگتنا پڑے اور) یہاں جنت میں تو تمہارے لئے یہ (آرام) ہے کہ تم نہ کبھی بھوکے ہوگے (جس سے تکلیف ہو یا اسکی تدبیر میں دیر اور پریشانی ہو) اور نہ ننگے ہوگے (کہ کپڑا نہ ملے یا احتیاج کے اتنی دیر بعد ملے کہ تکلیف ہونے لگے) اور نہ یہاں پیاسے ہوگے (کہ پانی نہ ملے یا دیر ہونے سے تکلیف ہو) اور نہ دھوپ میں تپو گے (کیونکہ جنت میں دھوپ ہی نہیں اور مکان بھی ہر طرح پناہ کے ہیں بخلاف اس حالت کے کہ اگر جنت سے نکل کر دنیا میں گئے تو یہ ساری مصیبتیں پیش آویں گی اسلئے ان امور کو پیش نظر رکھکر خوب ہی ہوشیاری و بیداری سے رہنا) پھر ان کو شیطان نے (جھانسہ دیا یعنی) بہکایا، کہنے لگا کہ اے آدم کیا میں تم کو ہمیشگی (کی خاصیت) کا درخت بتلا دوں (کہ اسکے کھانے سے ہمیشہ شاد و آباد رہو) اور ایسی بادشاہی جسمیں کبھی ضعف نہ آوے سو (اسکے بہکانے سے) دونوں نے اس درخت سے کھالیا (جس سے ممانعت ہوئی تھی اور شیطان نے اسکو شجرۃ الخلد کہہ کر بہکایا تھا) تو (اسکے کھاتے ہی) ان دونوں کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور (اپنا بدن ڈھانکنے کو) دونوں اپنے (بدن کے) اوپر جنت (کے درختوں) کے پتے چپکانے لگے اور آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا سو (جنت میں ہمیشہ رہنے کا مقصد حاصل کرنے کے باب میں) غلطی میں پڑ گئے پھر (جب انھوں نے معذرت کی تو) ان کے رب نے (زیادہ) مقبول بنالیا سو ان پر (مہربانی سے) توجہ فرمائی اور راہ (راست) پر ہمیشہ قائم رکھا (کہ پھر ایسی خطا نہیں ہوئی اور جب درخت کھالیا تو) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دونوں کے دونوں جنت سے اترو (اور دنیا میں) ایسی حالت سے جاؤ کہ (تمہارے فرزندوں میں) ایک کا دشمن ایک ہوگا پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت (کا ذریعہ یعنی رسول یا کتاب) پہنچے تو (تم میں) جو شخص میری اس ہدایت کا اتباع کرے گا تو وہ نہ (دنیا میں) گمراہ ہوگا اور نہ (آخرت میں) شقی ہوگا، اور جو شخص میری اس نصیحت سے اعراض کریگا تو اسکے لئے (قیامت سے پہلے دنیا اور قبر میں) تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت کے روز ہم اسکو اندھا کرکے (قبر سے) اٹھائیں گے وہ (تعجب سے) کہے گا کہ اے میرے رب آپ نے مجھ کو اندھا کرکے کیوں اٹھایا میں تو (دنیا میں) آنکھوں والا تھا (مجھ سے ایسی کیا خطا ہوئی) ارشاد ہوگا کہ (جیسی تجھ کو سزا ہوئی ہے) ایسا ہی (تجھ سے عمل ہوا تھا وہ یہ کہ) تیرے پاس (انبیاء و علماء کے واسطے سے) ہمارے احکام

پہنچے تھے پھر تو نے ان کا کچھ خیال نہ کیا اور ایسا ہی آج تیرا کچھ خیال نہ کیا جاویگا (جیسا تو نے خیال نہ کیا تھا) اور (جس طرح کہ یہ سزا مناسب عمل دی گئی) اسی طرح (ہر) اس شخص کو ہم (مناسب عمل) سزا دیں گے جو حد (اطاعت) سے گزر جاوے اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان نہ لاوے اور واقعی آخرت کا عذاب ہے بڑا سخت اور بڑا دیرپا (کہ اس کی کہیں انتہا ہی نہیں تو اس سے بچنے کا بہت ہی اہتمام کرنا واجب ہے)۔

معارف و مسائل

ربط یہاں سے حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بیان ہوتا ہے یہ قصہ اس سے پہلے سورۂ بقرہ اور اعراف میں پھر کچھ سورۂ حجر اور سورۂ کہف میں گزر چکا ہے اور آخر میں سورۂ صٓ میں آئیگا، ہر مقام پر اسکے مناسب اجزاء قصہ کو مع ہدایات متعلقہ کے بیان کیا گیا ہے۔

اس مقام پر اس قصہ کی مناسبت پچھلی آیات سے حضرات مفسرین نے مختلف پہلوؤں سے بیان فرمائی ہے انہیں سب سے زیادہ روشن اور بے غبار بات یہ ہے کہ سابقہ آیات میں یہ ارشاد آیا ہے كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ مَا قَدْ سَبَقَ، اسمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ آپکی نبوت و رسالت کے اثبات اور آپ کی اُمت کو متنبہ کرنے کے لئے ہم انبیاء سابقین کے حالات و واقعات آپ سے بیان کرتے ہیں جنہیں حضرت موسٰی علیہ السلام کا تفصیلی قصہ اس آیت سے پہلے بیان ہو چکا ہے اور ان تمام قصوں میں سب سے پہلا اور بعض حیثیات میں سب سے اہم حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ ہے۔ یہاں سے اسکو شروع کیا گیا ہے جسمیں اُمتِ محمدیہ کو اس پر تنبیہ کرنا ہے کہ شیطان تمام بنی آدم کا پرانا دشمن ہے اس نے سب سے پہلے تمہارے ماں باپ سے اپنی دشمنی نکالی اور طرح طرح کے حیلوں بہانوں اور ہمدردانہ مشوروں کے جال پھیلا کر اُن کو ایک لغزش میں مبتلا کر دیا جس کے نتیجہ میں جنت سے اُترنے کے احکام جاری ہوئے اور جنت کی پوشاک اُن سے سلب ہو گئی پھر حق تعالیٰ کیطرف رجوع اور لغزش کی معافی ہو کر ان کو رسالت و نبوت کا مقام بلند عطا ہوا۔ اس لئے تمام بنی آدم کو اغواءِ شیطانی سے کبھی بے فکر نہ ہونا چاہئیے احکامِ دین کے معاملے میں شیطانی وساوس اور حیلوں سے بچنے کا بڑا اہتمام کرنا چاہئیے۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا، اسمیں لفظ عَہِدْنَا اَمَرْنَا یا وَصَّيْنَا کے معنے میں ہے (بحر محیط) مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس واقعہ کے متعلق آپ سے بہت پہلے آدم علیہ السلام کو ایک وصیت کی تھی یعنی تاکیدی حکم دیا تھا (جسکا ذکر سورۂ بقرہ وغیرہ میں بھی آ چکا ہے

اور آگے بھی کچھ آ رہا ہے مگر ایک درخت کو معین کر کے بتلا دیا تھا کہ اس درخت کو یعنی اس کے پھل پھول یا کسی جزء کو نہ کھانا اور اس کے قریب بھی نہ جانا، باقی ساری جنت کے باغات اور نعمتیں تمہارے لئے کھلی ہوئی ہیں اُن کو استعمال کرتے رہو اور جیسا کہ آگے آتا ہے یہ بھی بتلا دیا تھا کہ ابلیس تمہارا دشمن ہے کہیں اسکے بہکانے میں نہ آجانا کہ تمہارے لئے مصیبت بنے مگر آدم علیہ السلام بھول گئے اور انہیں ہم نے ارادہ کی پختگی نہ پائی۔ یہاں دو لفظ آئے ہیں ایک نسیان دوسرے عزم، نسیان کے معنی مشہور ہیں بھول جانا، غفلت میں پڑ جانا اور عزم کے لفظی معنے کسی کام کے لئے اپنے ارادے کو مضبوط باندھنے کے ہیں۔ ان دونوں لفظوں سے مراد اس جگہ کیا ہے اس کے سمجھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں اور پیغمبر سب کے سب گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔

پہلے لفظ میں حضرت آدم علیہ السلام پر نسیان اور بھول طاری ہو جانیکا ذکر ہے اور چونکہ بھول اور نسیان غیر اختیاری امر ہے اسلئے اس کو گناہ ہی میں شمار نہیں کیا گیا جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے رفع عن امتی الخطاء والنسیان، یعنی میری اُمت سے خطا اور نسیان کا گناہ معاف کر دیا گیا ہے اور قرآن کریم کا ارشاد عام ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیتے جو اسکے اختیار و قدرت سے باہر ہو۔ لیکن یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عالم میں ایسے اسباب بھی رکھے ہیں کہ ان کو پوری احتیاط کے ساتھ استعمال کیا جائے تو انسان بھول اور خطا سے بچ سکتا ہے انبیاء علیہم السلام چونکہ حق تعالیٰ کے مقربین خاص ہیں اُن سے اتنی بات پر بھی مواخذہ ہو سکتا ہے کہ اُن اسباب اختیاریہ سے کیوں کام نہ لیا جن کے ذریعہ اس بھول سے بچ سکتے تھے۔ بسا اوقات ایک زیر سلطنت کیلئے وہ کام قابل مؤاخذہ سمجھا جاتا ہے جو عام نوکروں کے لئے قابلِ انعام ہوتا ہے۔ اسی کو حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے حسنات الابرار سیئات المقربین، یعنی اُمت کے صالحین اور نیک لوگوں کے بہت سے نیک عمل مقربان بارگاہ الٰہی کے حق میں سیئات اور لغزش قرار دی جاتی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا یہ واقعہ اول تو نبوت و رسالت سے پہلے کا ہے جس میں کسی گناہ کا صدور انبیاء سے بعض علمائے اہلِ سنت کے نزدیک عصمت کے خلاف نہیں۔ دوسرے درحقیقت یہ بھول ہے جو گناہ نہیں مگر حضرت آدم علیہ السلام کے مقام بلند اور تقرب حق سبحانہ و تعالیٰ کے لحاظ سے اس کو بھی اُن کے حق میں ایک لغزش قرار دی گئی جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا اور اُن کو متنبہ کرنے کے لئے اس لغزش کو عصیان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا جیسا کہ آگے آتا ہے۔

دوسرا لفظ عزم ہے اور اسی آیت میں یہ فرمایا کہ آدم علیہ السلام میں عزم نہ پایا گیا اور معلوم

ہو چکا ہے کہ عزم کے معنی کسی کام کے ارادہ پر مضبوطی سے قائم رہنے کے ہیں حضرت آدم علیہ السلام حکم ربانی کی تعمیل کا مکمل فیصلہ اور قصد کیے ہوئے تھے مگر شیطانی وساوس سے اس قصد کی مضبوطی میں فرق آگیا اور بھول نے اس پر قائم نہ رہنے دیا۔ واللہ اعلم

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ، یہ اس عہد کا مختصر بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لیا تھا اسمیں تخلیق آدم کے بعد سب فرشتوں کو اور اُن کے ضمن میں ابلیس کو بھی، کیونکہ اسوقت تک ابلیس جنت میں فرشتوں کیساتھ رہتا سہتا تھا، حکم دیا گیا کہ سب کے سب آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں سب فرشتوں نے سجدہ کر لیا مگر ابلیس نے انکار کر دیا جس کی وجہ دوسری آیات میں اسکا تکبر تھا کہ میں آگ سے بنا ہوں یہ مٹی سے، اور آگ بہ نسبت مٹی کے افضل و اشرف ہے میں اسکو سجدہ کیوں کروں، اس پر ابلیس تو ملعون ہو کر جنت سے نکالا گیا۔ حضرت آدم و حوا کے لئے جنت کے سب باغات اور ساری نعمتوں کے دروازے کھول دیئے گئے اور ہر چیز کے استعمال کی اجازت دی گئی صرف ایک معین درخت کے متعلق یہ ہدایت کی گئی کہ اسکو (یعنی اسکے پھل پھول وغیرہ کو) نہ کھائیں اور اسکے قریب بھی نہ جائیں۔ یہ مضمون بھی سورۂ بقرہ و اعراف کی آیتوں میں آچکا ہے یہاں اسکا ذکر کرنیکے بجائے حق تعالیٰ نے اپنا وہ ارشاد ذکر کیا ہے جو اس عہد کے محفوظ رکھنے اور اس پر قائم رہنے کے سلسلہ میں فرمایا کہ دیکھو شیطان ابلیس جیسا کہ واقعۂ سجدہ کے وقت ظاہر ہو چکا ہے تم دونوں یعنی آدم و حوا کا دشمن ہے ایسا نہ ہو کہ وہ کسی مکر و حیلے سے دھوکہ دے کر تم سے اس عہد کی خلاف ورزی کرا دے جسکا نتیجہ یہ ہو کہ تم جنت سے نکالے جاؤ۔ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى، یعنی یہ شیطان کہیں تمہیں جنت سے نہ نکلوا دے جس کی وجہ سے تم مصیبت اور مشقت میں پڑ جاؤ۔ لفظ تشقی شقاوت سے مشتق ہے۔ یہ لفظ دو معنے کے لئے استعمال ہوتا ہے ایک شقاوت آخرت، دوسرے شقاوتِ دُنیا یعنی جسمانی مشقت و مصیبت۔ اس جگہ یہی دوسرے معنی مُراد ہو سکتے ہیں کیونکہ پہلے معنی میں کسی پیغمبر کے لئے تو کیا کسی نیک مسلمان کے لئے بھی یہ لفظ نہیں بولا جا سکتا اسی لئے فراء نے اس شقاوت کی تفسیر یہ کی ہے کہ ھو ان یاکل من کدّ یدہ یعنی شقاوت سے اس جگہ مُراد یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کی محنت سے خوراک حاصل کرنا پڑے گی (قرطبی) اور اس جگہ قرینۂ مقام بھی دوسرے ہی معنی کے لئے شاہد ہے کیونکہ اس کے بعد کی آیت میں جنت کی نعمتوں میں سے اُن چار نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے جو ہر انسان کی زندگی کے لئے عمودی حیثیت رکھتی ہیں اور ضروریاتِ زندگی میں سب سے اہم ہیں۔ یعنی کھانا، پینا، لباس اور مسکن۔ اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ سب نعمتیں جنت میں تو بلا کسی کسب و اکتساب اور محنت و مشقت کے ملتی ہیں۔ اسمیں اشارہ پایا گیا کہ یہاں سے نکل گئے تو یہ نعمتیں سلب ہو جائیں گی اور شاید اسی اشارہ کے لئے یہاں جنت کی بڑی بڑی نعمتوں کا ذکر

نہیں کیا گیا بلکہ صرف اُن کا ذکر کیا جن پر انسانی زندگی موقوف ہے اور اس سے ڈرایا گیا کہ شیطانی اغوار میں آکر کہیں ایسا نہ ہو کہ جنت سے نکالے جاؤ اور یہ سب نعمتیں سلب ہو جائیں اور پھر زمین پر اُن ضروریاتِ زندگی کو بڑی محنت مشقت اُٹھا کر حاصل کرنا پڑے یہ مفہوم لفظ فَتَشْقٰی کا ہے جو جمہور مفسرین نے لکھا ہے۔ امام قرطبی نے اس جگہ یہ بھی ذکر کیا ہے کہ آدم علیہ السلام جب زمین پر تشریف لائے تو جبرئیلؑ نے جنت سے کچھ دانے گیہوں چاول وغیرہ کے لا کر دیئے کہ انکو زمین میں کاشت کرو پھر جب یہ پودا نکلے اور اُس پر دانے جمیں تو اس کو کاٹو پھر پیس کر روٹی بناؤ اور ان سب کاموں کے طریقے بھی حضرت آدم کو سمجھا دیئے اس کے مطابق آدم علیہ السلام نے روٹی پکائی اور کھانے کے لئے بیٹھے تھے کہ روٹی ہاتھ سے چھوٹ کر پہاڑ کے نیچے لڑھک گئی آدم علیہ السلام اسکے پیچھے چلے اور بڑی محنت کر کے واپس لائے تو جبرئیل امین نے کہا کہ اے آدم آپ کا اور آپکی اولاد کا رزق زمین پر اسی طرح محنت مشقت سے حاصل ہوگا۔ (قرطبی)

بیوی کا نفقہ ضروریہ شوہر کے ذمہ ہے اس مقام پر شروع آیت میں حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے ساتھ حضرت حوّا کو بھی خطاب میں شریک کیا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ جسمیں بتلایا ہے کہ شیطان آپ کا بھی دشمن ہے اور آپ کی بیوی کا بھی اور یہ کہ ایسا نہ ہو کہ تم دونوں کو یہ جنت سے نکلوا دے مگر آخر آیت میں لفظ فَتَشْقٰی کو مفرد استعمال فرمایا بیوی کو اسمیں شریک نہیں کیا ورنہ بمقتضائے مقام فتشقیا کہا جاتا۔ امام قرطبی نے اس سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ ضروریاتِ زندگی بیوی کی مرد کے ذمہ ہیں ان کے حصول میں جو محنت و مشقت ہو اسکا تنہا ذمہ دار مرد ہے اسی لئے فَتَشْقٰی بصیغہ مفرد لا کر اشارہ کر دیا کہ زمین پر آ جانے کے بعد تو ان ضروریاتِ زندگی کی تحصیل میں جو کچھ محنت مشقت اُٹھانا پڑیگی وہ حضرت آدم علیہ السلام پر پڑے گی کیونکہ حوار کا نفقہ اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا ان کے ذمہ ہے۔

نفقۂ واجبہ صرف چار چیزیں ہیں قرطبی نے فرمایا کہ اسی آیت نے ہمیں یہ بھی بتلا دیا کہ عورت کا جو نفقہ مرد کے ذمہ ہے وہ صرف چار چیزیں ہیں۔ کھانا پینا اور لباس اور مسکن۔ اس سے زائد جو کچھ شوہر اپنی بیوی کو دیتا یا اُس پر خرچ کرتا ہے وہ تبرع و احسان ہے واجب لازم نہیں۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیوی کے علاوہ جس کسی کا نفقہ شریعت نے کسی شخص کے ذمہ عائد کیا ہے اسمیں بھی چار چیزیں اس کے ذمہ واجب ہوتی ہیں جیسے ماں باپ کا نفقہ اولاد کے ذمہ جبکہ وہ محتاج اور معذور ہوں وغیر ذلک جسکی تفصیل کتبِ فقہ میں مذکور ہے۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى، جنت میں ضروریاتِ زندگی کی یہ بنیادی چاروں چیزیں بے مانگے بلا مشقت ملتی ہیں۔ اور جنت میں بھوک لگنے سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب تک بھوک

نہ لگے کھانے کا ذائقہ اور لذت ہی نہیں آ سکتی، اسی طرح جب تک پیاس نہ ہو ٹھنڈے پانی کی لذت و راحت نہیں محسوس ہو سکتی وجہ یہ ہے کہ جنت میں بھوک پیاس نہ لگنے کا مطلب یہ ہے کہ بھوک پیاس کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی کہ بھوک کے وقت کھانے کو اور پیاس کے وقت پینے کو نہ ملے یا دیر میں ملے بلکہ ہر وہ چیز جس کو انکا دل چاہے گا فوراً حاضر موجود ہے گی۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ الیٰ قولہ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى، اس آیت میں جو یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم و حوا کو کسی خاص درخت کے کھانے اور اسکے پاس جانے سے بھی روک دیا تھا اور اس پر مزید تنبیہ بھی فرما دی تھی کہ شیطان تم دونوں کا دشمن ہے اسکے مکر و کید سے بچتے رہنا وہ کہیں تمہیں جنت سے نہ نکلوا دے اتنی واضح ہدایتوں کے بعد بھی یہ پیغمبر عالی مقام شیطان کے دھوکہ میں کس طرح آ گئے اور یہ کہ یہ تو کھلی نافرمانی اور گناہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے نبی و رسول ہیں اُن سے یہ گناہ کیسے سرزد ہوا جبکہ جمہور اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہر چھوٹے بڑے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ ان سب سوالات کا جواب سورۂ بقرہ کی تفسیر معارف القرآن جلد اول صفحہ ۱۳۶ پر گزر چکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔ اور اس آیت میں جو حضرت آدم علیہ السلام کی نسبت صاف لفظوں میں عصٰی اور پھر غوٰی فرمایا گیا ہے اس کی وجہ بھی سورۂ بقرہ میں بیان ہو چکی ہے کہ اگرچہ آدم علیہ السلام کا یہ عمل شرعی قانون کی رُو سے گناہ میں داخل نہیں تھا لیکن حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے رسول اور مقربین خاص میں سے ہیں اسلئے اُن کی ادنیٰ لغزش کو بھی بھاری لفظوں سے عصیان کہکر تعبیر کیا گیا اور اس پر عتاب کیا گیا اور لفظ غوٰی دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے ایک معنی زندگی تلخ ہو جانے اور عیش خراب ہو جانے کے ہیں۔ دوسرے معنی گمراہ ہو جانے یا غافل ہو جانے کے۔ ائمہ تفسیر قشیری اور قرطبی وغیرہ نے اس جگہ لفظ غوٰی کے پہلے معنی ہی کو اختیار کیا ہے اور مراد یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جو عیش جنت میں حاصل تھا وہ نہ رہا زندگی تلخ ہو گئی۔

انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ایک اہم ہدایت اُنکا ادب و احترام کی حفاظت قاضی ابوبکر ابن عربی نے احکام القرآن میں آیت مذکورہ میں جو الفاظ عصٰی وغیرہ آدم علیہ السلام کے بارے میں ہیں اس سلسلہ میں اُنھوں نے ایک اہم بات ارشاد فرمائی ہے وہ انہیں کے الفاظ میں یہ ہے۔

لایجوز لاحد منا الیوم ان یخبر بذلک عن اٰدم الّا اذا ذکرناہ فی اثناء قولہ تعالیٰ عنہ او قول نبیہ، فاما ان یبتدیٔ ذٰلک من قبل نفسہ فلیس بجائز لنا فی اٰبائنا الادنین الینا المماثلین لنا فکیف فی ابینا الاقدم الاعظم الاکرم النبی

ہم میں سے کسی کیلئے آج یہ جائز نہیں کہ آدم علیہ السلام کی طرف یہ لفظ عصیان منسوب کرے بجز اسکے کہ قرآن کی اس آیت کے یا کسی حدیث نبوی کے ضمن میں آیا ہو وہ بیان کرے لیکن یہ کہ اپنی طرف سے یہ لفظ منسوب کرنا ہمارے اپنے قریبی آباء و اجداد کے لئے بھی جائز نہیں، پھر ہمارے سب سے

المقام الذی ھو فیہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ وتاب علیہ وغفر لہ (از تفسیر قرطبی ذکرہ فی البحر المحیط ایضاً) | پہلے باپ جو ہر حیثیت میں ہمارے آباء سے مقدم اور اعظم و اکرم ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر معزز ہیں جنکا عذر اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور معافی کا اعلان کر دیا ان کے لئے تو کسی حال میں جائز نہیں۔

اسی لئے قشیری ابو نصر نے فرمایا کہ اس لفظ کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو عاصی اور غاوی کہنا جائز نہیں اور قرآن کریم میں جہاں کہیں کسی نبی یا رسول کے بارے میں ایسے الفاظ آئے ہیں یا تو وہ خلاف اولیٰ امور ہیں یا نبوت سے پہلے کے ہیں۔ اسلئے بعض آیاتِ قرآن و روایاتِ حدیث تو ان کا تذکرہ درست ہے لیکن اپنی طرف سے ان کی شان میں ایسے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں (قرطبی)

اِھۡبِطَا مِنۡھَا جَمِیۡعًا، یعنی اتر جاؤ جنت سے (دونوں) یہ خطاب حضرت آدم و ابلیس دونوں کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور اس صورت میں بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ کا مضمون واضح ہے کہ دنیا میں جاکر بھی شیطان کی دشمنی جاری رہے گی اور اگر یہ کہا جائے کہ شیطان کو تو اس واقعہ سے پہلے ہی جنت سے نکالا جا چکا تھا اب اس کو اس خطاب میں شریک قرار دینا بعید ہے تو دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ خطاب آدم و حوا علیہما السلام دونوں کو ہو۔ اس صورت میں باہمی عداوت سے مراد ان کی اولاد میں باہمی عداوت ہونے کو بیان کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ اولاد میں باہمی عداوت ماں باپ کی زندگی بھی تلخ کر دیتی ہے۔

وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ، یہاں ذکر سے مراد قرآن بھی ہو سکتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک بھی جیسا کہ دوسری آیات میں ذِکۡرًا رَّسُوۡلًا آیا ہے دونوں کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص قرآن سے یا رسولؐ سے اعراض کرے یعنی قرآن کی تلاوت اور اسکے احکام پر عمل سے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے اعراض کرے اسکا انجام یہ ہے کہ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیۡشَۃً ضَنۡکًا وَّنَحۡشُرُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اَعۡمٰی، یعنی اسکی معیشت تنگ ہوگی اور قیامت میں اسکو اندھا کر کے اٹھایا جائیگا۔ پہلا عذاب دنیا ہی میں اسکو مل جائیگا اور دوسرا یعنی اندھا ہونیکا عذاب قیامت میں ہوگا۔

کافر اور بدکار کی زندگی دنیا میں تلخ اور تنگ ہونے کی حقیقت یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ دنیا میں معیشت کی تنگی تو کفار و فجار کے لئے مخصوص نہیں، مومنین صالحین کو بھی پیش آتی ہے بلکہ انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ شدائد و مصائب اس دنیا کی زندگی میں اٹھانے پڑتے ہیں۔ صحیح بخاری اور تمام کتب حدیث میں بروایت سعدؓ وغیرہ یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی بلائیں اور مصیبتیں سب سے زیادہ انبیاء پر سخت ہوتی ہیں ان کے بعد جو جس درجہ کا صالح اور ولی ہے اسی کی مناسبت سے اسکو یہ تکلیفیں پہنچتی ہیں۔ اسکے بالمقابل عموماً کفار و فجار کو خوشحال اور عیش و عشرت میں دیکھا جاتا ہے تو پھر یہ ارشاد قرآنی کہ ان کی معیشت تنگ ہوگی آخرت کے لئے تو ہو سکتا ہے دنیا میں خلاف مشاہدہ معلوم ہوتا ہے۔

اسکا صاف بے غبار جواب تو یہ ہے کہ یہاں دُنیا کے عذاب سے قبر کا عذاب مُراد ہے کہ قبر اُنکی معیشت تنگ کردی جاویگی۔ خود قبر جو اُن کا مسکن ہوگا وہ اُن کو ایسا دبائیگا کہ اُنکی پسلیاں ٹوٹنے لگیں گی جیسا کہ بعض احادیث میں اسکی تصریح ہے اور مسند بزار میں بسند جید حضرت ابوہریرہؓ سے یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اس آیت کے لفظ مَعِيشَةً ضَنكًا کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ اس سے مُراد قبر کا عالم ہے۔ (مظہری)

اور حضرت سعید بن جبیرؓ نے تنگیٔ معیشت کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ اُن سے قناعت کا وصف سلب کرلیا جاویگا اور حرصِ دُنیا بڑھا دی جاویگی (مظہری) جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُسکے پاس کتنا ہی مال و دولت جمع ہوجائے کبھی قلبی سکون اسکو نصیب نہیں ہوگا ہمیشہ مال بڑھانے کی فکر اور اسمیں نقصان کا خطرہ اسکو بے چین رکھے گا۔ اور یہ بات عام اہل تمول میں مشاہد و معروف ہے جسکا حاصل یہ ہوتا ہے کہ اُن لوگوں کے پاس سامانِ راحت تو بہت جمع ہوجاتا ہے مگر جسکا نام راحت ہے وہ نصیب نہیں ہوتی کیونکہ وہ قلب کے سکون و اطمینان کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔

أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ

سو کیا اُن کو سمجھ نہ آئی اس بات سے کہ کتنی غارت کردیں ہم نے اُن سے پہلے جماعتیں یہ لوگ پھرتے ہیں اُنکی جگہوں میں

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ ﴿۱۲۸﴾ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن

اسمیں خوب نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کو اور اگر نہ ہوتی ایک بات کہ نکل چکی تیرے

رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَأَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَ

رب کیطرف سے تو ضرور ہوجاتی تمٹھ بھیڑ اور اگر نہ ہوتا وعدہ مقرر کیا گیا سو تو سہتا رہ جو وہ کہیں اور

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ۖ وَمِنْ آنَاءِ

پڑھتا رہ خوبیاں اپنے رب کی سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اور کچھ گھڑیوں میں

اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَىٰ ﴿۱۳۰﴾ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ

رات کی پڑھا کر اور دن کی حدوں پر شاید تو راضی ہو اور مت پسار اپنی آنکھیں

إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَ

اس چیز پر جو فائدہ اُٹھانے کو دی ہم نے ان طرح طرح کے لوگوں کو رونق دُنیا کی زندگی کی اُن کے جانچنے کو اور

رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴿۱۳۱﴾ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ

تیرے رب کی دی ہوئی روزی بہتر ہے اور بہت باقی رہنے والی اور حکم کر اپنے گھر والوں کو نماز کا اور خود بھی قائم رہ

عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ ﴿۱۳۲﴾ وَ

اس پر ہم نہیں مانگتے تجھ سے روزی ہم روزی دیتے ہیں تجھ کو اور انجام بھلا ہے پرہیزگاری کا اور

قَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ

لوگ کہتے ہیں یہ کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس کوئی نشانی اپنے رب سے، کیا پہنچ نہیں چکی ان کو نشانی اگلی کتابوں میں

الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا

کی۔ اور اگر ہم ہلاک کر دیتے ان کو کسی آفت میں اس سے پہلے تو کہتے اے رب

لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ

کیوں نہ بھیجا ہم تک کسی کو پیغام دے کر کہ ہم چلتے تیری کتاب پر ذلیل اور رسوا ہونے سے

نَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ

پہلے۔ تو کہہ ہر کوئی راہ دیکھتا ہے سو تم بھی راہ دیکھو آئندہ جان لوگے کون ہیں سیدھی

الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾

راہ والے اور کس نے راہ پائی

ع ۷ / ۱۷

خلاصۂ تفسیر

(یہ معترضین جو اعراض پر اصرار کر رہے ہیں تو) کیا ان لوگوں کو (اب تک) اس سے بھی ہدایت نہیں ہوئی کہ ہم ان سے پہلے بہت سے گروہوں کو (اس اعراض ہی کے سبب عذاب سے) ہلاک کر چکے ہیں کہ ان (میں سے بعض) کے رہنے کے مقامات میں یہ لوگ بھی چلتے (پھرتے) ہیں (کیونکہ شام کو جاتے ہوئے اہلِ مکہ کے رستہ میں بعض اُن قوموں کے مکانات آتے تھے) اُس (امر مذکور) میں تو اہل فہم کے (سمجھنے کے) لئے (کافی) دلائل (اعراض کے نتائج بد ہونے کے) موجود ہیں اور (اُن پر فوری عذاب نہ آنے سے جو اُن کو شبہ اپنے مذہب کے مذموم نہ ہونے کا ہوتا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ) اگر آپ کے رب کی طرف سے ایک بات پہلے سے فرمائی ہوئی نہ ہوتی (وہ یہ کہ بعض مصلحتوں کی وجہ سے ان کو مہلت دیجاوے گی) اور (عذاب کے لئے) ایک میعاد معین نہ ہوتی (کہ وہ قیامت کا دن ہے) تو (اُن کے کفر و اعراض کے اقتضاء سے) عذاب لازمی طور پر ہوتا (خلاصہ یہ کہ کفر تو مقتضی عذاب کا ہے لیکن ایک مانع کی وجہ سے توقف ہو رہا ہے پس اُن کا وہ شبہ اور فوری عذاب نہ آنے سے اپنے حق پر ہونے کا استدلال غلط ہے، غرض یہ کہ اہمال ہے اہمال نہیں) سو (جب عذاب کا آنا یقینی ہے تو) آپ اُن کی (کفر آمیز) باتوں پر صبر کیجئے (اور بغض فی اللہ کی وجہ سے جو اُن پر غیظ آتا ہے اور ان پر تاخیر عذاب سے اضطراب ہوتا ہے اس اضطراب کو ترک کیجئے) اور اپنے رب کی حمد (و ثنا) کے ساتھ (اُس کی) تسبیح (و تقدیس) کیجئے (اسمیں نماز بھی آگئی) آفتاب نکلنے سے پہلے (مثلاً نماز فجر) اور اسکے غروب سے پہلے (مثلاً نماز ظہر و عصر) اور اوقاتِ شب میں (بھی) کیا کیجئے (مثلاً نماز مغرب و عشاء)

اور دن کے اوّل و آخر میں (تسبیح کرنے کے واسطے اہتمام کے لئے مکرر کہا جاتا ہے جس سے نماز فجر و مغرب کے ذکر کی بھی اہتماماً تکریر ہوگئی) تاکہ (آپ کو ثواب ملے) آپ (اُس سے) خوش ہوں (مطلب یہ کہ آپ اپنی توجہ معبود حقیقی کیطرف رکھئے لوگوں کی فکر نہ کیجئے) اور ہرگز اُن چیزوں کیطرف آپ آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھئے (جیسا اب تک بھی نہیں دیکھا) جس سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو (مثلاً یہود و نصاریٰ و مشرکین کو) اُن کی آزمائش کے لئے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ (محض) دنیوی زندگی کی رونق ہے (مطلب اَوروں کو سُنانا ہے کہ جب معصوم نبی کے لئے یہ ممانعت ہے جنہیں احتمال بھی نہیں تو غیر معصوم کو تو اسکا اہتمام کیونکر ضروری نہ ہوگا۔ اور آزمائش یہ کہ کون احسان مانتا ہے اور کون سرکشی کرتا ہے) اور آپکے رب کا عطیہ (جو آخرت میں ملیگا) بدرجہا (اس سے) بہتر اور دیرپا ہے (کہ کبھی فنا ہی نہ ہوگا۔ خلاصہ کلام کا یہ ہوا کہ نہ اُن کے اِعراض بکسر الہمزہ کی طرف التفات کیا جاوے نہ انکے اَغراض بفتح الہمزہ یعنی اسباب عیش کیطرف سب کا انجام عذاب ہے) اور اپنے متعلقین کو (یعنی اہل خاندان کو یا مؤمنین کو) بھی نماز کا حکم کرتے رہئے اور خود بھی اسکے پابند رہئے (یعنی زیادہ توجہ کے قابل یہ اُمور ہیں) ہم آپ سے اور (اسی طرح دوسروں سے ایسے) معاش (کموانا) نہیں چاہتے (جو طاعاتِ ضروریہ سے مانع ہوں) معاش تو آپ کو (اور اسی طرح اَوروں کو) ہم دیں گے (یعنی مقصود اصلی اکتساب نہیں بلکہ دین اور طاعت ہیں، اکتساب کی اُتنی حالتیں اجازت یا امر ہے کہ ضروری طاعت میں وہ مخل نہ ہو) اور بہتر انجام تو پرہیزگاری ہی کا ہے۔ واسطے ہم حکم دیتے ہیں لَا تَمُدَّنَّ ؏ اور وَاْمُرْ اَهْلَكَ الخ اور معترضین کے بعض احوال و اقوال جو اُوپر معلوم ہوئے اسی طرح اُن کا ایک اور قول بھی مذکور ہوتا ہے کہ) وہ لوگ (عناداً) یُوں کہتے ہیں کہ یہ رسول ہمارے پاس کوئی نشانی (اپنی نبوّت کی) کیوں نہیں لاتے (آگے جواب ہے کہ) کیا ان کے پاس پہلی کتابوں کے مضمون کا ظہور نہیں پہنچا (مُراد اس سے قرآن ہے کہ اس سے کتب سابقہ کے مضمونِ پیشین گوئی کے صدق کا ظہور ہوگیا مطلب یہ کہ کیا اُنکے پاس قرآن نہیں پہنچا جس کی پہلے سے شہرت تھی کہ وہ نبوت پر کافی دلیل ہے) اور اگر ہم ان کو قبل قرآن آنے کے (سزائے کفر میں) کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے (اور پھر قیامت کے روز اصلی سزا کفر کی دی جاتی کہ وہ لازم ہی تھی) تو یہ لوگ (بطور عذر کے) یُوں کہتے کہ اے ہمارے رب آپ نے ہمارے پاس کوئی رسُول (دُنیا میں) کیوں نہیں بھیجا تھا کہ ہم آپ کے احکام پر چلتے قبل اسکے کہ ہم (یہاں خود) بے قدر ہوں اور (دوسروں کی نگاہ میں) رُسوا ہوں (سو اب اس عذر کی بھی گنجائش نہیں رہی، اگر وہ یُوں کہیں کہ وہ عذاب کب آئیگا تو) آپ کہدیجئے کہ (ہم) سب انتظار کر رہے ہیں سو (چندے) اور انتظار کر لو اب عنقریب تم کو (بھی) معلوم ہو جاویگا کہ راہ راست والے کون ہیں اور وہ کون ہے جو (منزلِ) مقصود تک پہنچا (یعنی وہ فیصلہ عنقریب بعد موت یا بعد الحشر ظاہر ہو جاوے گا)۔

معارف و مسائل

اَفَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ میں ضمیر فاعل ہُدیٰ کیطرف راجع ہے جو اسی لفظ کے ضمن میں مذکور ہے اور ہُدیٰ سے مُراد قرآن یا رسُول ہے تو معنے یہ ہیں کہ کیا قرآن یا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو یعنی اہل مکہ کو یہ ہدایت نہیں دی اور اس سے باخبر نہیں کیا کہ تم سے پہلے کتنی اُمتیں اور جماعتیں اپنی نافرمانی کیوجہ سے عذاب خداوندی میں گرفتار ہو کر ہلاک ہو چکی ہیں جن کے گھروں اور زمینوں میں اب تم چلتے پھرتے ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسمیں ضمیر فاعل اللہ تعالیٰ کیطرف راجع ہو اور معنے یہ ہوں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ہدایت نہیں دی۔ الخ

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ، اہل مکہ جو ایمان سے بھاگنے کے لئے طرح طرح کے حیلے بہانے تلاش کرتے تھے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بُرے بُرے کلمات سے یاد کرتے تھے، کوئی ساحر کوئی شاعر کوئی کاذب کہتا تھا۔ اُن کی ایذاؤں کا علاج قرآن کریم نے اسجگہ دو چیزوں سے بتلایا ہے اوّل یہ کہ آپ انکے کہنے کیطرف التفات نہ کریں بلکہ صبر کریں۔ دوسری چیز اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جانا ہی جو اگلے جملے میں فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔

دشمنوں کی ایذاؤں سے بچنے کا علاج صبر اور اللہ کی یاد میں مشغول ہونا ہے دشمنوں سے تو اس دُنیا میں کسی چھوٹے بڑے، اچھے بُرے انسان کو نجات نہیں ملتی۔ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی دشمن ہوتا ہے اور دشمن کتنا ہی حقیر و ضعیف ہو اپنے مخالف کو کچھ نہ کچھ ایذا پہنچا ہی دیتا ہے بدزبانی گالی گلوچ ہی سہی، سامنے ہمت نہ ہو تو پیچھے ہی سہی، اسلئے دشمن کی ایذاؤں سے بچنے کی فکر ہر شخص کو ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے ان کا بہترین اور کامیاب نسخہ دو چیزوں سے مرکب بیان فرمایا ہے۔ اوّل صبر یعنی اپنے نفس کو قابو میں رکھنا اور انتقام کی فکر میں نہ پڑنا دوسرے اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت میں مشغول ہو جانا۔ تجربہ شاہد ہے کہ صرف یہی نسخہ ہے جس سے ان ایذاؤں سے نجات مل سکتی ہے ورنہ انتقام کی فکر میں پڑنے والا کتنا ہی قوی اور بڑا اور صاحب اقتدار ہو بسا اوقات مخالف سے انتقام لینے پر قادر نہیں ہوتا اور یہ فکر انتقام ایک مستقل عذاب اُس کیلئے بن جاتا ہے اور جب انسان کی توجہ حق تعالیٰ کیطرف ہو جائے اور وہ دھیان یہ کرے کہ اس دُنیا میں کوئی کسی کو کسی طرح کا نقصان یا ایذا بغیر مشیّت خداوندی کے نہیں پہنچا سکتا اور اللہ تعالیٰ کے اعمال و افعال سب حکمت پر مبنی ہوتے ہیں اسلئے جو صورت پیش آئی ہے اسمیں ضرور کوئی حکمت ہوگی تو مخالف کی ایذاؤں سے پیدا ہونیوالا غیظ و غضب خود بخود کافور ہو جاتا ہے اسی لئے آخر آیت میں فرمایا لَعَلَّكَ تَرْضٰی یعنی اس تدبیر سے آپ راضی خوشی بسر کر سکیں گے وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ یعنی آپ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کریں اُسکی حمد و شکر کیساتھ۔ اسمیں اشارہ ہے کہ جس بندے کو اللہ تعالیٰ کا نام لینے یا کچھ عبادت کرنے کی توفیق ہو جائے اسکو چاہئے کہ اپنے اس عمل پر ناز و فخر کرنیکے بجائے اللہ تعالیٰ کی حمد و شکر کو اپنا وظیفہ بنائے یہ ذکر اللہ یا عبادت اُسی کی توفیق کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔

اور یہ لفظ سَبِّحْ بِحَمْدِ عام ذکر و حمد کے معنے میں بھی ہو سکتا ہے اور خاص نماز کے معنے میں بھی عموماً

حضرات مفسرین نے اسی کو لیا ہے اور اس کے بعد جو اوقات معین کر کے بتلائے ہیں وہ بھی نمازوں کے اوقات قرار دیئے ہیں مثلاً قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ سے مراد نماز فجر اور قَبْلَ غُرُوْبِهَا سے مراد نماز ظہر و عصر اور مِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ سے مراد رات کی سب نمازیں مغرب عشاء یہاں تک کہ تہجد بھی اس میں شامل ہے اور پھر لفظ اَطْرَافَ النَّهَارِ سے اس کی مزید تاکید بتلائی گئی ہے۔

دولتِ دُنیا چند روزہ ہے یہ اللہ کے نزدیک مقبولیت کی علامت نہیں بلکہ مؤمن کے لئے خطرہ کی چیز ہے

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ، اس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اور دراصل ہدایت کرنا اُمت کو ہے کہ دُنیا کے مالدار وں سرمایہ داروں کو قسم قسم کی دُنیوی رونق اور طرح طرح کی نعمتیں حاصل ہیں۔ آپ اُن کی طرف نظر بھی نہ اٹھایئے کیونکہ یہ سب عیش فانی اور چند روزہ ہے اللہ تعالیٰ نے جو نعمت آپ کو اور آپ کے واسطے سے مؤمنین کو عطا فرمائی ہے وہ بدرجہا اُن کی اس چند روزہ زونق حیات سے بہتر ہے۔

دُنیا میں کفار و فجار کی عیش و عشرت اور دولت و حشمت ہمیشہ ہی سے ہر شخص کے لئے یہ سوال بنتی رہی ہے کہ جب یہ لوگ اللہ کے نزدیک مبغوض اور ذلیل ہیں تو اُن کے پاس یہ نعمتیں کیسی اور کیوں ہیں، اور اطاعت شعار مؤمنین کی غربت و افلاس کیوں؟ یہاں تک کہ فاروق اعظمؓ جیسے عالی قدر بزرگ کو اس سوال نے متاثر کیا جس وقت وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کے خاص حجرہ میں داخل ہوئے جس میں آپ خلوت گزیں تھے اور یہ دیکھا کہ آپ ایک موٹی موٹی تیلیوں کے بوریئے پر لیٹے ہوئے ہیں اور ان تیلیوں کے نشانات آپ کے بدن مبارک پر کھڑے ہو گئے ہیں تو بے اختیار رو پڑے اور عرض کیا یا رسول اللہ یہ کسریٰ و قیصر اور اُن کے امرا کیسی کیسی نعمتوں اور راحتوں میں ہیں اور آپ ساری مخلوق میں اللہ کے منتخب رسول اور محبوب ہیں اور آپ کی معیشت کا یہ حال ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابن خطاب کیا تم اب تک شک و شبہ میں مبتلا ہو۔ یہ لوگ تو وہ ہیں جن کی لذات و محبوبات اللہ نے اسی دُنیا میں اُن کو دیدی ہیں آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں وہاں عذاب ہی عذاب ہے (اور مؤمنین کا معاملہ برعکس ہے) یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دُنیا کی زینت اور راحت طلبی سے بالکل بے نیاز اور بے تعلق زندگی کو پسند فرماتے تھے باوجودیکہ آپ کو پوری قدرت حاصل تھی کہ اپنے لئے بہتر سے بہتر راحت کا سامان جمع کر لیں۔ اور جب کبھی دُنیا کی دولت آپ کے پاس بغیر کسی محنت مشقت اور سعی و طلب کے آ بھی جاتی تھی تو فوراً اللہ کی راہ میں غربا و فقراء پر اس کو خرچ کر ڈالتے تھے اور اپنے واسطے کل کے لئے بھی کچھ باقی نہ چھوڑتے تھے۔ ابن ابی حاتم نے بروایت ابو سعید خدریؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ان اخوف ما اخاف علیکم ما یفتح اللہ لکم من زھرۃ الدنیا (ابن کثیر)

مجھے تم لوگوں کے بارے میں جس چیز کا سب سے زیادہ خوف اور خطرہ ہے وہ دولت و زینتِ دُنیا ہے جو تم پر کھولدی جاویگی۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُمّت کو پہلے ہی یہ خبر بھی دیدی ہے کہ آئندہ زمانے میں تمھاری فتوحات دُنیا میں ہوں گی اور مال و دولت اور عیش و عشرت کی فراوانی ہو جائے گی ۔ وہ صورتِ حال کچھ زیادہ خوش ہونے کی نہیں بلکہ ڈرنے کی چیز ہے کہ اُسمیں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کے احکام سے غفلت نہ ہو جائے ۔

اپنے اہل و عیال اور متعلقین کو نماز کی پابندی کی تاکید اور اسکی حکمت

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ، یعنی آپ اپنے اہل کو بھی نماز کا حکم کیجئے اور خود بھی اُس پر جمے رہیئے ۔ یہ بظاہر دو حکم الگ الگ ہیں ایک اہل و عیال کو نماز کی تاکید دوسرے خود اس کی پابندی لیکن غور کیا جائے تو خود اپنی نماز کی پوری پابندی کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ آپ کا ماحول آپکے اہل و عیال اور متعلقین نماز کے پابند ہوں کیونکہ ماحول اسکے خلاف ہوا تو طبعی طور پر انسان خود بھی کوتاہی کا شکار ہو جاتا ہے ۔

لفظ اَهْل میں بیوی، اولاد اور متعلقین سبھی داخل ہیں جن سے انسان کا ماحول اور معاشرہ بنتا ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ روزانہ صبح کی نماز کے وقت حضرت علیؓ اور فاطمہؓ کے مکان پر جاکر آواز دیتے تھے الصَّلٰوةَ الصَّلٰوةَ (قرطبی)

اور حضرت عروہ ابن زبیرؓ جب کبھی امراء و سلاطین کی دولت و حشمت پر اُن کی نظر پڑتی تو فوراً اپنے گھر میں لوٹ جاتے اور گھر والوں کو نماز کے لئے دعوت دیتے اور یہ آیت پڑھ کر سناتے تھے ۔ اور حضرت فاروق اعظمؓ جب رات کو تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو اپنے گھر والوں کو بھی بیدار کر دیتے تھے اور یہی آیت پڑھ کر سناتے تھے (قرطبی)

جو آدمی نماز اور اللہ کی عبادت میں لگ جاتا ہے اللہ تعالیٰ اُسکے لئے رزق کا معاملہ آسان بنا دیتے ہیں

لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ، یعنی ہم تم سے یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ تم اپنا اور اپنے اہل و عیال کا رزق اپنے زورِ علم و عمل سے پیدا کرو بلکہ یہ معاملہ ہم نے اپنے ذمہ رکھا ہے کیونکہ رزق کی تحصیل دراصل انسان کے بس میں ہی نہیں وہ زیادہ سے زیادہ یہی تو کر سکتا ہے کہ زمین کو نرم قابلِ کاشت بنائے اور کچھ دانے اسمیں ڈالدے مگر دانہ کے اندر سے درخت نکالنا اور پیدا کرنا اسمیں تو اس کا کوئی ادنیٰ دخل نہیں وہ براہِ راست حق تعالےٰ کا فعل ہے ۔ درخت نکل آنے کے بعد بھی انسان کا سارا عمل اس کی حفاظت کرنا اور جو پھل پھول قدرت نے اُس کے اندر پیدا فرمائے ہیں اُن سے فائدہ اُٹھانا ہے ۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جائے اللہ تعالیٰ یہ بارِ محنت بھی اسکے لئے آسان اور ہلکا کر دیتے ہیں، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہ رضؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یقول اللہ تعالیٰ یا ابن اٰدم تفرغ لعبادتی املأ صدرك غنی واسد فقرك وان لم	اللہ تعالےٰ فرماتا ہے: اے ابن آدم تو میری عبادت کے لئے اپنے آپ کو فارغ کرلے تو میں تیرے سینے کو غنا، واستغنا سے بھردونگا

تفعل ملأت صدرك شغلا ولم اسد فقرك (ابن کثیر)

اور تیری محتاجی کو دور کر دونگا اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تیرا سینہ فکر اور شغل سے بھر دونگا اور محتاجی دور نہ کروں گا (یعنی جتنا مال بڑھتا جائے گا حرص بھی اتنی ہی بڑھتی چلی جائے گی اس لئے ہمیشہ محتاج ہی رہے گا۔)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ:

من جعل همومه هما واحدا هم المعاد كفاه الله هم دنياه ومن تشعبت به الهموم في احوال الدنيا لم يبال الله في اي اوديته هلك رواه ابن ماجه (ابن کثیر)

جو شخص اپنے سارے فکروں کو ایک فکر یعنی آخرت کی فکر بنادے تو اللہ تعالیٰ اسکے دُنیا کے فکروں کی خود کفالت کرلیتا ہے اور جس کے فکر دُنیا کے مختلف کاموں میں لگے رہے تو اللہ تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں کہ وہ اُن فکروں کے کسی جنگل میں ہلاک ہو جائے۔

بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولٰى، یعنی پچھلی آسمانی کتابیں تورات و انجیل اور صحف ابراہیم علیہ السلام وغیرہ سب کے سب رسول آخرالزماں محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی شہادت دیتے آئے ہیں کیا یہ بیّنات ان منکرین کے لئے کافی سے زیادہ ثبوت نہیں ہے۔

فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى، یعنی آج تو اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو زبان دی ہوئی ہے ہر ایک اپنے طریقے اور اپنے عمل کے بہتر اور صحیح ہونیکا دعوٰی کرسکتا ہے لیکن یہ دعوٰی کچھ کام دینے والا نہیں۔ بہتر اور صحیح طریقہ تو وہی ہوسکتا ہے جو اللہ کے نزدیک مقبول و صحیح ہو، اور اسکا پتہ قیامت کے روز سب کو لگ جائیگا کہ کون غلطی اور گمراہی پر تھا کون صحیح اور سیدھے راستہ پر۔

اللهم اهدنا لما اختلف فيه من الحق باذنك ولا حول ولا قوة الا بك ولا ملجأ ولا منجا منك الا اليك

الحمد لله الذي وفقني لتكميل سورة طٰه ضحى يوم الخميس لاربعة عشر خلت من ذي الحجة الحرام سنة ١٣٩٠ھ والله سبحانه وتعالى اسأل لتكميل باقي القرآن والله المستعان وعليه التكلان

سُوْرَةُ الْاَنْبِيَاۗءِ

سُوْرَةُ الْاَنْبِيَاۗءِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّاثْنَتَا عَشْرَةَ اٰيَةً وَّسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ انبیاء مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی ایک سو بارہ آیتیں ہیں اور سات رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝۱ مَا يَاْتِيْهِمْ

نزدیک آگیا لوگوں سے اُن کے حساب کا وقت اور وہ بے خبر ٹلا رہے ہیں کوئی نصیحت نہیں

مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝۲ لَاهِيَةً

پہنچتی اُن کو اُن کے رب سے نئی مگر اس کو سنتے ہیں کھیل میں لگے ہوئے کھیل میں پڑے ہیں

قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ڰ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ڰ هَلْ هٰذَآ اِلَّا

دل اُن کے اور چھپا کر مصلحت کی بے انصافوں نے یہ شخص کون ہے ایک

بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝۳ قٰلَ رَبِّيْ

آدمی ہے تم ہی جیسا پھر کیوں پھنستے ہو اسکے جادو میں آنکھوں دیکھتے اُس نے کہا میرے رب کو

يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۴ بَلْ

خبر ہے بات کی آسمان میں ہو یا زمین میں اور وہ ہے سننے والا جاننے والا اس کو

قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ښ فَلْيَاْتِنَا

چھوڑ کر کہتے ہیں بیہودہ خواب ہیں نہیں جھوٹ باندھ لیا ہے، نہیں، شعر کہتا ہے پھر چاہیے لے آئے

بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝۵ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ

ہمارے پاس کوئی نشانی جیسے پیغام لے کر آئے ہیں پہلے نہیں مانا اُن سے پہلے کسی بستی نے

اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا

جن کو غارت کر دیا ہم نے کیا اب یہ مان لیں گے اور پیغام نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے مگر یہی مردوں کے ہاتھ

نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْــَٔـلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۷

وحی بھیجتے تھے ہم اُن کو سو پوچھ لو یاد رکھنے والوں سے اگر تم نہیں جانتے

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ﴿۸﴾ ثُمَّ
اور نہیں بنائے تھے ہم نے اُن کے ایسے بدن کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور نہ تھے وہ ہمیشہ رہ جانے والے پھر

صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۹﴾
سچا کر دیا ہم نے اُن سے وعدہ سو بچا دیا اُن کو اور جس کو ہم نے چاہا اور غارت کر دیا حد سے نکلنے والوں کو

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰﴾ ع
ہم نے اُتاری ہے تمہاری طرف کتاب کہ اس میں تمہارا ذکر ہے کیا تم سمجھتے نہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اُن (منکر) لوگوں سے اُن کا (وقت) حساب نزدیک آپہنچا (یعنی قیامت وقتاً فوقتاً نزدیک ہوتی جاتی ہے) اور یہ (ابھی) غفلت (ہی) میں (پڑے) ہیں (اور اسکے یقین کرنے اور اس کے لئے تیاری کرنے سے) اعراض کئے ہوئے ہیں (اور اُن کی غفلت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ) اُن کے پاس اُنکے رب کی طرف سے جو نصیحت تازہ (حسب حال انکے) آتی ہے (بجائے اسکے کہ اُن کو تنبہ ہوتا) یہ اسکو ایسے طور سے سُنتے ہیں کہ (اس کے ساتھ) ہنسی کرتے ہیں (اور) اُن کے دل (اصلاً ادھر) متوجہ نہیں ہوتے اور یہ لوگ یعنی ظالم (اور کافر) لوگ (آپس میں) چپکے چپکے سرگوشی کرتے ہیں (اس لئے نہیں کہ انکو اہل اسلام کا خوف تھا کیونکہ مکہ میں کفار ضعیف نہ تھے بلکہ اس لئے کہ اسلام کے خلاف خفیہ سازش کرکے اسکو مٹائیں) کہ یہ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) محض تم جیسے ایک (معمولی) آدمی ہیں (یعنی نبی نہیں اور یہ جو ایک دلکش و دلربا کلام سُناتے ہیں اس پر اعجاز کا شبہ اور اس اعجاز سے نبوت کا خیال نہ کرنا کیونکہ وہ حقیقت میں سحر آمیز کلام ہے) تو کیا (باوجود اس بات کے) پھر بھی تم جادو کی بات سُننے کو (انکے پاس) جاؤگے حالانکہ تم (اس بات کو خوب) جانتے (بوجھتے) ہو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دینے کا حکم ہوا اور اُنھوں) نے (موافق حکم کے جواب میں) فرمایا کہ میرا رب ہر بات کو (خواہ) آسمان میں ہو اور (خواہ) زمین میں (ہو اور خواہ ظاہر ہو یا خفی ہو خوب) جانتا ہے اور وہ خوب سُننے والا اور خوب جاننے والا ہے (سو تمہارے ان اقوالِ کفریہ کو بھی جانتا ہے اور تم کو خوب سزا دیگا اور اُنھوں نے کلام حق کو صرف جادو کہنے پر اکتفا نہیں کیا) بلکہ یوں (بھی) کہا کہ یہ (قرآن) پریشان خیالات ہیں (کہ واقع میں دلکش بھی نہیں) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) اُنھوں نے (یعنی پیغمبر نے) اس کو (قصداً و اختیاراً اپنے دل سے) تراش لیا ہے (اور خواب کے خیالات میں تو انسان قدرے بے اختیار اور معذور اور مبتلائے اشتباہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ افترا کچھ قرآن ہی کے ساتھ خاص نہیں) بلکہ یہ تو ایک شاعر شخص ہیں (ان کی تمام باتیں ایسی ہی تراشیدہ اور خیالی ہوتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ رسُول نہیں ہیں اور

بڑے مدعی رسالت کے ہیں) تو ان کو چاہیے کہ ایسی کوئی (بڑی) نشانی لاویں جیسا پہلے لوگ رسول بنائے گئے (اور بڑے بڑے معجزات ظاہر کئے اس وقت ہم رسول مانیں اور ایمان لائیں اور یہ کہنا بھی ایک بہانہ تھا ورنہ انبیاء سابقین کو بھی نہ مانتے تھے حق تعالیٰ جواب میں فرماتے ہیں کہ) اُن سے پہلے کوئی بستی والے جن کو ہمنے ہلاک کیا ہے (باوجود ان کے فرمائشی معجزات ظاہر ہوجانے کے) ایمان نہیں لائے سو کیا یہ لوگ (ان معجزات کے ظاہر ہونے پر) ایمان لے آویں گے (اور ایسی حالت میں ایمان نہ لانے پر عذاب نازل ہوجاویگا اس لئے ہم وہ معجزات ظاہر نہیں فرماتے اور قرآن معجزہ کافی ہے) اور (رسالت کے متعلق جو ان کا یہ شبہ ہے کہ رسول بشر نہ ہونا چاہیئے اُسکا جواب یہ ہے کہ) ہم نے آپ سے قبل صرف آدمیوں ہی کو پیغمبر بنایا ہے جن کے پاس ہم وحی بھیجا کرتے تھے سو (اے منکرو) اگر تم کو (یہ بات) معلوم نہ ہو تو اہل کتاب سے دریافت کرلو (کیونکہ یہ لوگ اگرچہ کافر ہیں مگر خبر متواتر میں راوی کا مسلمان یا ثقہ ہونا شرط نہیں، پھر تم اُن کو اپنا دوست سمجھتے ہو تو تمہارے نزدیک انکی بات معتبر ہونی چاہیئے) اور (اسی طرح رسالت کے متعلق جو اس شبہ کی دوسری تقریر ہے کہ رسول فرشتہ ہونا چاہیئے اسکا جواب یہ ہے کہ) ہم نے ان رسولوں کے (جو کہ گزر چکے ہیں) ایسے بدن نہیں بنائے تھے جو کھانا نہ کھاتے ہوں (یعنی فرشتہ نہ بنایا تھا) اور (یہ لوگ جو آپ کی وفات کے انتظار میں خوشیاں منا رہے ہیں لقولہ تعالیٰ نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ کذا فی المعالم، یہ وفات بھی منافی نبوت نہیں کیونکہ) وہ گزشتہ حضرات (بھی دُنیا میں) ہمیشہ رہنے والے نہیں ہوئے (پس اگر آپ کی بھی وفات ہوجائے تو نبوت میں کیا اعتراض لازم آیا، غرض یہ کہ جیسے پہلے رسول تھے ویسے ہی آپ بھی ہیں اور یہ لوگ جس طرح آپ کی تکذیب کرتے ہیں اسی طرح ان حضرات کی بھی اُس زمانے کے کفار نے تکذیب کی) پھر ہمنے جو ان سے وعدہ کیا تھا (کہ مکذبین کو عذاب سے ہلاک کریں گے اور تم کو اور مؤمنین کو محفوظ رکھیں گے ہم نے) اُس (وعدہ) کو سچا کیا یعنی ان کو اور جن جن کو (نجات دینا) منظور ہوا (اُس عذاب سے) ہم نے نجات دی اور (اس عذاب سے) حد (اطاعت) سے گزرنے والوں کو ہلاک کیا (سو ان لوگوں کو ڈرنا چاہیئے اے منکرو اس تکذیب کے بعد تم پر دُنیا و آخرت میں عذاب آوے تو تعجب نہیں کیونکہ) ہم تمہارے پاس ایسی کتاب بھیج چکے ہیں کہ اسمیں تمہاری نصیحت (کافی) موجود ہے کیا (باوجود ایسی تبلیغ موعظت کے پھر بھی) تم نہیں سمجھتے (اور نہیں مانتے)۔

معارف و مسائل

سُورۂ انبیاء کی فضیلت | حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ سورۂ کہف اور مریم اور طٰہٰ اور انبیاء یہ چاروں سورتیں نزول کے اعتبار سے ابتدائی سورتیں اور میری یہ قدیم دولت اور کمائی ہیں

جن کی ہمیشہ حفاظت کرتا ہوں (قرطبی)

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ، یعنی وہ وقت قریب آگیا جبکہ لوگوں سے اُن کے اعمال کا حساب لیا جاویگا مُراد اس سے قیامت ہے اور اُسکا قریب آجانا دُنیا کی پچھلی عمر کے لحاظ سے ہے کیونکہ یہ اُمت آخر الاُمم ہے، اور اگر حساب عام مُراد لیا جائے تو حسابِ قبر بھی اسمیں شامل ہے جو ہر انسان کو مرنیکے فوراً بعد دینا ہوتا ہے اور اسی لئے ہر انسان کی موت کو اُسکی شخصی قیامت کہا گیا ہے من مات فقد قامت قیامتہ، یعنی جو شخص مرگیا اسکی قیامت تو ابھی قائم ہوگئی، اس معنے کے اعتبار سے حساب کا وقت قریب ہونا تو بالکل ہی واضح ہے کہ ہر شخص کی موت خواہ کتنی ہی عمر ہو کچھ دُور نہیں خصوصاً جبکہ عمر کی انتہا نامعلوم ہے تو ہر دن ہر گھنٹہ موت کا خطرہ سامنے ہے۔

مقصود اس آیت سے غفلت شعار لوگوں کو متنبہ کرنا ہے جسمیں سب مؤمن و کافر داخل ہیں، کہ دنیا کی خواہشات میں مشغول ہو کر اس حساب کے دن کو نہ بھلائیں کیونکہ اس کو بھلا دینا ہی ساری خرابیوں اور گناہوں کی بنیاد ہے۔

مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ مُحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ

جو لوگ آخرت اور قبر کے عذاب سے غفلت اور اُس کے لئے تیاری سے اعراض کرنے والے ہیں یہ اُن کے حال کا مزید بیان ہے کہ جب ان کے سامنے قرآن کی کوئی نئی آیت آتی اور پڑھی جاتی ہے تو وہ اسکو اس حالت میں سنتے ہیں کہ کھیل اور ہنسی مذاق کرتے ہیں اور ان کے دل اللہ سے اور آخرت سے بالکل غافل ہوتے ہیں اسکی یہ مُراد بھی ہو سکتی ہے کہ قرآن کی آیات سننے کے وقت یہ اپنے کھیل اور شغل میں اسی طرح لگے رہتے ہیں قرآن کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ خود آیاتِ قرآن ہی سے کھیل اور ہنسی مذاق کا معاملہ کرنے لگتے ہیں۔

اَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُونَ، یعنی یہ لوگ آپس میں آہستہ آہستہ سرگوشی کر کے یہ کہتے ہیں کہ یہ جو اپنے کو نبی اور رسُول کہتے ہیں یہ تو ہم جیسے ہی انسان ہیں کوئی فرشتہ تو ہیں نہیں کہ ہم اُن کی بات مان لیں اور پھر اس کلام الٰہی کو جو اُن کے سامنے پڑھا جاتا تھا اور اس کی حلاوت و بلاغت، اور دلوں میں تاثیر کا کوئی کافر بھی انکار نہ کرسکتا تھا اُس سے لوگوں کو ہٹانے کی صورت یہ نکالی کہ اس کو سحر اور جادو قرار دیں اور پھر لوگوں کو اسلام سے روکنے کے لئے یہ کہیں کہ جب تم سمجھ گئے کہ یہ جادو ہے تو پھر ان کے پاس جانا اور یہ کلام سننا دانشمندی کے خلاف ہے شاید گفتگو آپس میں آہستہ اسلئے کرتے تھے کہ مسلمان سُن لیں گے تو اُن کی احمقانہ تلبیس کا پول کھول دیں گے۔

بَلْ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ، اضغاث احلام اِن خوابوں کو کہا جاتا ہے جنمیں کچھ نفسانی یا شیطانی خیالات شامل ہو جاتے ہیں اسی لئے اسکا ترجمہ پریشان خیالات سے کیا گیا ہے یعنی ان منکرین نے اوّل تو

قرآن کو جادو کہا پھر اُس سے آگے بڑھے تو پریشان خواب کہنے لگے پھر اس سے بھی آگے بڑھے تو کہنے لگے یہ تو خدا تعالیٰ پر افتراء اور بہتان ہے کہ یہ اسکا کلام ہے پھر کہنے لگے کہ اصل بات یہ ہے کہ یہ کوئی شاعر آدمی ہے شاعرانہ خیالات اسکے کلام میں ہوتے ہیں۔

فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ، یعنی اگر یہ واقعی نبی و رسول ہیں تو ہمارے مانگے ہوئے خاص معجزات دکھلائیں اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ پچھلی اُمتوں میں اسکا بھی تجربہ اور مشاہدہ ہو چکا ہے کہ جس طرح کا معجزہ اُنھوں نے خود طلب کیا اللہ کے رسول کے ہاتھوں وہی معجزہ سامنے آ گیا مگر وہ پھر بھی ایمان نہ لائے اور منہ مانگے معجزے کو دیکھنے کے بعد بھی جو قوم ایمان سے گریز کرے اسکے لئے اللہ کا قانون یہ ہے کہ دُنیا ہی میں عذاب نازل کر کے ختم کر دیجاتی ہے اور چونکہ اُمّتِ مرحومہ کو حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عزم میں دُنیا کے عذاب عام سے محفوظ کر دیا ہے اس لئے اُن کو اُن کے مانگے ہوئے معجزات دکھلانا مصلحت نہیں آگے أَفَهُمْ يُؤْمِنُونَ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ کیا منہ مانگے معجزہ کو دیکھ کر یہ ایمان لے آئینگے مُراد یہ ہے کہ ان سے اسکی کوئی توقع نہیں کیجا سکتی اسلئے مطلوبہ معجزہ نہیں دکھایا جاتا۔

فَسْـَٔلُوٓا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ، اہل الذکر سے مُراد اس جگہ علماء تورات و انجیل ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے مطلب یہ ہے کہ اگر تمھیں پچھلے انبیاء کا حال معلوم نہیں کہ وہ انسان تھے یا فرشتے تو علماء تورات و انجیل سے معلوم کر لو کیونکہ وہ سب جانتے ہیں کہ سب انبیاء سابقین انسان ہی کی نوع سے تھے اسلئے اگر یہاں اہل الذکر سے مطلق اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ ہی مُراد ہوں تو بعید نہیں کیونکہ اس معاملے کے بھی شاہد ہیں۔ خلاصہ تفسیر میں اسی احتمال کو اختیار کر کے تشریح کی گئی ہے۔ **مسئلہ:۔** تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جاہل آدمی جسکو احکامِ شریعت معلوم نہ ہوں اُسپر عالم کی تقلید واجب ہے کہ عالم سے دریافت کر کے اسکے مطابق عمل کرے۔

قرآن کریم عربوں کے لئے عزت و فخر ہے | كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ، کتاب سے مراد قرآن ہے اور ذکر اس جگہ بمعنے شرف و فضیلت اور شہرت کے ہے۔ مُراد یہ ہے کہ یہ قرآن جو تمہاری زبان عربی میں نازل ہوا تمہارے لئے ایک بڑی عزت اور دائمی شہرت کی چیز ہے تمھیں اس کی قدر کرنا چاہیئے جیساکہ دُنیا نے دیکھ لیا کہ اہل عرب کو حق تعالیٰ نے قرآن کی برکت سے ساری دُنیا پر غالب اور فاتح بنا دیا اور پورے عالم میں اُن کی عزت و شہرت کا ڈنکا بجا۔ اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ یہ عربوں کی مقامی یا قبائلی یا لسانی خصوصیت کی بناء پر نہیں بلکہ صرف قرآن کی بدولت ہوا، اگر قرآن نہ ہوتا تو شاید آج کوئی عرب قوم کا نام لینے والا بھی نہ ہوتا۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا
اور کتنی پیس ڈالیں ہم نے بستیاں جو تھیں گناہگار اور اٹھا کھڑے کئے ان کے پیچھے اور

آخَرِينَ ﴿۱۱﴾ فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ ﴿۱۲﴾ لَا
لوگ پھر جب آہٹ پائی انہوں نے ہماری آفت کی تب لگے وہاں سے ایڑ کرنے ایڑ

تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسَاكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ ﴿۱۳﴾
مت کرو اور لوٹ جاؤ جہاں تم نے عیش کیا تھا اور اپنے گھروں میں شاید کوئی تم کو پوچھے

قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۱۴﴾ فَمَا زَالَتْ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّىٰ
کہنے لگے ہائے خرابی ہماری ہم تھے بیشک گنہگار پھر برابر یہی رہی ان کی فریاد یہاں تک کہ

جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ ﴿۱۵﴾
ڈھیر کر دیئے گئے کاٹ کر بجھے پڑے ہوئے

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے بہت سی بستیاں جن کے رہنے والے ظالم (یعنی کافر) تھے تباہ کر ڈالیں اور ان کے بعد دوسری قوم پیدا کر دی تو جب ان ظالموں نے ہمارا عذاب آتا دیکھا تو اس بستی سے بھاگنا شروع کیا (تاکہ عذاب سے بچ جاویں۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ) بھاگو مت اور اپنے سامانِ عیش اور اپنے مکانات کی طرف واپس چلو شاید تم سے کوئی پوچھے پاچھے (کہ تم پر کیا گزری مقصود اس سے بطور تعریض کے ان کی احمقانہ جسارت پر تنبیہ ہے کہ جس سامان اور مکان پر تم کو ناز تھا اب نہ وہ سامان رہا نہ مکان نہ کسی دوست ہمدرد کا نام و نشان رہا) وہ لوگ (نزولِ عذاب کے وقت) کہنے لگے کہ ہائے ہماری کم بختی بیشک ہم لوگ ظالم تھے ان کا یہی شور و غل رہا یہاں تک کہ ہم نے ان کو ایسا (نیست و نابود) کر دیا جس طرح کھیتی کٹ گئی ہو یا آگ بجھ گئی ہو۔

معارف و مسائل

ان آیات میں جن بستیوں کے تباہ کرنے کا ذکر ہے بعض مفسرین نے ان کو یمن کی بستیاں حضور اور قلابہ قرار دیا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک رسول بھیجا تھا جس کے نام میں روایات مختلف ہیں بعض میں موسیٰ بن میشا اور بعض میں شعیب ذکر کیا گیا ہے اور اگر شعیب نام ہے تو وہ مدین والے شعیب علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور ہیں ان لوگوں نے اللہ کے رسول کو قتل کر ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک کافر بادشاہ بخت نصر کے ہاتھوں تباہ کرایا۔ بخت نصر کو ان پر مسلط کر دیا جیسا کہ بنی اسرائیل

نے جب فلسطین میں بے راہی اختیار کی تو ان پر بھی بخت نصر کو مسلط کر کے سزا دی گئی تھی مگر صاف بات یہ ہے کہ قرآن نے کسی خاص بستی کو معین نہیں کیا اس لئے عام ہی رکھا جائے اس میں یمن کی بستیاں بھی داخل ہوں گی واللہ اعلم۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ لَوْ اَرَدْنَآ

اور ہم نے نہیں بنایا آسمان اور زمین کو اور جو کچھ اُن کے بیچ میں ہے کھیلتے ہوئے اگر ہم چاہتے

اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۷﴾

کہ بنالیں کچھ کھلونا تو بنا لیتے ہم اپنے پاس سے اگر ہم کو کرنا ہوتا

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ وَ

یوں نہیں پر ہم پھینک مارتے ہیں سچ کو جھوٹ پر پھر وہ اسکا سر پھوڑ ڈالتا ہے پھر وہ جاتا رہتا ہے اور

لَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ

تمہارے لئے خرابی ہے اُن باتوں سے جو تم بتلاتے ہو اور اسی کا ہے جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں

وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور جو اسکے نزدیک رہتے ہیں سرکشی نہیں کرتے اس کی عبادت سے اور نہیں کرتے کاہلی

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً

یاد کرتے ہیں رات اور دن نہیں تھکتے کیا ٹھہرائے ہیں انہوں نے اور معبود

مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ

زمین میں کے کہ وہ جلا اٹھائیں گے ان کو اگر ہوتے ان دونوں میں اور معبود سوائے اللہ کے

لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾ لَا

تو دونوں خراب ہو جاتے، سو پاک ہے اللہ عرش کا مالک ان باتوں سے جو یہ بتلاتے ہیں اس سے

يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ

پوچھا نہ جائے جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جائے کیا ٹھہرائے ہیں انہوں نے اس سے ورے

اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ

اور معبود تو کہہ لاؤ اپنی سند یہی بات ہے میرے ساتھ والوں کی اور یہی بات مجھ

قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾

سے پہلوں کی، کوئی نہیں پر وہ بہت لوگ نہیں سمجھتے سچی بات سو ٹلا رہے ہیں

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ

اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول مگر اسکو یہی حکم بھیجا کہ بات یوں ہے کہ کسی

إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعْبُدُونِ ﴿٢٥﴾ وَقَالُوا ٱتَّخَذَ ٱلرَّحْمَٰنُ وَلَدًا ۗ سُبْحَٰنَهُۥ

کی بندگی نہیں سوائے میرے سو میری بندگی کرو اور کہتے ہیں رحمٰن نے کر لیا کسی کو بیٹا وہ ہرگز اس لائق نہیں

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ ﴿٢٦﴾ لَا يَسْبِقُونَهُۥ بِٱلْقَوْلِ وَهُم بِأَمْرِهِۦ

لیکن وہ بندے ہیں جن کو عزت دی ہے اس سے بڑھ کر نہیں بول سکتے۔ اور وہ اسی کے حکم پر کام

يَعْمَلُونَ ﴿٢٧﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا

کرتے ہیں اس کو معلوم ہے جو ان کے آگے ہے اور پیچھے اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر

لِمَنِ ٱرْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِۦ مُشْفِقُونَ ﴿٢٨﴾ وَمَن يَقُلْ مِنْهُمْ

اسکی جس سے اللہ راضی ہو اور وہ اسکی ہیبت سے ڈرتے ہیں اور جو کوئی ان میں کہے کہ میری

إِنِّىٓ إِلَٰهٌ مِّن دُونِهِۦ فَذَٰلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٢٩﴾ ع ۲

بندگی ہے اس سے ورے سو اسکو ہم بدلہ دیں گے جہنم یوں ہی ہم بدلہ دیتے ہیں بے انصافوں کو

خلاصۂ تفسیر

اور (ہمارے یکتا ہونے پر ہماری مصنوعات دلالت کر رہی ہیں کیونکہ) ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ انکے درمیان میں ہے اس کو اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم فعل عبث کرنے والے ہوں (بلکہ انمیں بہت سی حکمتیں ہیں جنمیں بڑی حکمت توحید حق پر دلالت ہے اور) اگر ہم کو (آسمان اور زمین کے بنانے سے کوئی حکمت مقصود نہ ہوتی بلکہ ان کو محض) مشغلہ ہی بنانا منظور ہوتا (جس میں کوئی معتدبہ فائدہ مقصود نہیں ہوتا محض دل بہلانا منظور ہوتا ہے) تو ہم خاص اپنے پاس کی چیز کو مشغلہ بناتے (مثلاً اپنی صفات کمال کے مشاہدہ کو) اگر ہم کو یہ کرنا ہوتا (کیونکہ مشغلہ کو مشاغل کی شان سے مناسبت چاہئے تو کہاں ذات خالق کائنات اور کہاں یہ مصنوعات حادثہ البتہ صفات کو بوجہ قدیم اور لازم ذات ہونے کے باہم مناسبت ہے سو جب بدلائل عقلیہ و اجماع اہل ملل اسکا بھی مشغلہ قرار دیا جانا محال ہے تو مصنوعات حادثہ میں تو کسی کو اسکا وہم بھی نہ ہونا چاہئے پس ثابت ہوا کہ ہم نے عبث یعنی فضول پیدا نہیں کیا) بلکہ اثبات حق اور ابطال باطل کیلئے پیدا کیا ہے اور) ہم (اس) حق بات کو (جس کے ثبوت پر مصنوعات دلالت کرتی ہیں) باطل بات پر (اس طرح غالب کر دیتے ہیں جیسے یوں سمجھو کہ ہم اس کو اس پر) پھینک مارتے ہیں سو وہ (حق) اس (باطل) کا بھیجا نکال دیتا ہے (یعنی اس کو مغلوب کر دیتا ہے) سو وہ (باطل مغلوب ہو کر) دفعتہً جاتا رہتا ہے (یعنی دلائل توحید جو ان مصنوعات سے حاصل ہوتے ہیں شرک کی بالکلیہ نفی کر دیتے ہیں جس کی جانب مخالف کا احتمال ہی نہیں رہتا) اور (تم جو باوجود ان دلائل قاہرہ کے شرک کرتے ہو تو) تمہارے لئے اس بات سے بڑی خرابی ہو جو تم (خلاف حق کے) گھڑتے ہو اور (حق تعالیٰ کی وہ شان ہے کہ)

جتنے کچھ آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اسی کے (مملوک) ہیں اور (ان میں سے) جو اللہ کے نزدیک (بڑے مقبول و مقرب) ہیں (اُن کی بندگی کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ اُس کی عبادت سے عار نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں (بلکہ) شب و روز (اللہ کی) تسبیح (و تقدیس) کرتے ہیں (کسی وقت) موقوف نہیں کرتے (جب انکی یہ حالت ہے تو عام مخلوق تو کس شمار میں ہے پس لائق عبادت کے وہی ہے اور جب کوئی دوسرا ایسا نہیں تو پھر اسکا شریک سمجھنا کتنی بے عقلی ہے) کیا (باوجود ان دلائل توحید کے) ان لوگوں نے خدا کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں (بالخصوص) زمین کی چیزوں میں سے (جو کہ اور بھی ادنیٰ تر اور نازل تر ہیں جیسے پتھر یا معدنیات کے بُت) جو کسی کو زندہ کرتے ہیں (یعنی جو جان بھی نہ ڈال سکتا ہو ایسا عاجز کب معبود ہونے کے قابل ہوگا اور) زمین (میں یا) آسمان میں اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود (واجب الوجود) ہوتا تو دونوں (کبھی کے) درہم برہم ہو جاتے (کیونکہ عادۃً دونوں کے ارادوں اور افعال میں تزاحم ہوتا، ایک دوسرے سے ٹکراتے اور اس کے لئے فساد لازم ہے لیکن فساد واقع نہیں ہے اس لئے متعدد معبود بھی نہیں ہوسکتے) سو (ان تقریرات سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ جو کہ مالک ہے عرش کا ان اُمور سے پاک ہے جو کچھ یہ لوگ بیان کر رہے ہیں (کہ نعوذ باللہ اسکے اور شرکا بھی ہیں حالانکہ اس کی ایسی عظمت ہے کہ) وہ جو کچھ کرتا ہے اُس سے کوئی باز پرس نہیں کرسکتا اور اوروں سے باز پُرس کی جاسکتی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ باز پرس کرسکتا ہے پس کوئی عظمت میں اسکا شریک نہیں ہوا پھر معبودیت میں کوئی کیسے شریک ہوسکتا ہے، یہاں تک تو بطور ابطال اور نقض و استلزام محال کے کلام تھا آگے بطور سوال اور منع کے کلام ہے کہ) کیا خدا کو چھوڑ کر انھوں نے اور معبود بنا رکھے ہیں (ان سے) کہئے کہ تم اپنی دلیل (اس دعویٰ پر) پیش کرو (یہاں تک تو سوال اور دلیل عقلی سے شرک کا ابطال تھا آگے دلیل نقلی سے استدلال ہے کہ) یہ میرے ساتھ والوں کی کتاب (یعنی قرآن) اور مجھ سے پہلے لوگوں کی کتابیں (یعنی توراۃ و انجیل و زبور) موجود ہیں (جن کا صدق اور منزل من اللہ ہونا دلیل عقلی سے ثابت ہے اور اوروں میں گو تحریف ہوئی ہے مگر قرآن میں تحریف کا احتمال نہیں پس جو مضمون ان کتب کا قرآن کے مطابق ہوگا وہ یقیناً صحیح ہے اور ان سب دلائل مذکورہ کا مقتضا یہ تھا کہ یہ لوگ توحید کے قائل ہوجاتے لیکن پھر بھی قائل نہیں) بلکہ ان میں زیادہ وہی ہیں جو امر حق کا یقین نہیں کرتے سو (اسوجہ سے) وہ (اسکے قبول کرنے سے) اعراض کر رہے ہیں، اور (یہ توحید کوئی جدید بات نہیں جس سے توحش ہو بلکہ شرع قدیم ہے چنانچہ) ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جسکے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے لائق) نہیں پس میری (ہی) عبادت کیا کرو اور یہ (مشرک) لوگ (جو ہیں ان میں بعضے) یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ نے (فرشتوں کو) اولاد بنا رکھی ہے (توبہ توبہ) وہ (اللہ تعالیٰ اس سے) پاک ہے (اور وہ فرشتے اسکی اولاد نہیں ہیں) بلکہ (وہ اسکے) بندے ہیں (ہاں) معزز (بندے ہیں اسی سے بے عقلوں کو اشتباہ ہوگیا اور انکی عبدیت

اور محکومیت اور ادب کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ اس سے آگے بڑھ کر بات نہیں کر سکتے (بلکہ منتظر حکم رہتے ہیں) اور وہ اُسی کے حکم کے موافق عمل کرتے ہیں (اس کے خلاف نہیں کر سکتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ اُن کے اگلے پچھلے احوال کو (خوب) جانتا ہے (پس جو حکم ہوگا اور جب حکم ہوگا موافق حکمت کے ہوگا اس لئے نہ عملی مخالفت کرتے ہیں نہ قولی مسابقت کرتے ہیں) اور (ان کے ادب کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ بجز اس (شخص) کے جس کے لئے (شفاعت کرنے کی) خدا تعالیٰ کی مرضی ہو اور کسی کی سفارش نہیں کر سکتے اور وہ سب اللہ تعالیٰ کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں اور (یہ تو بیان تھا ان کی مغلوبیت اور محکومیت کا۔ آگے بیان ہے اللہ تعالیٰ کی غالبیت اور حاکمیت کا، گو حاصل دونوں کا متقارب ہے یعنی) ان میں سے جو شخص (بالفرض) یوں کہے کہ (نعوذ باللہ) میں علاوہ خدا کے معبود ہوں سو ہم اس کو سزائے جہنم دیں گے (اور) ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں (یعنی خدا کا ان پر پورا بس ہے جیسے اور مخلوقات پر، پھر وہ خدا کی اولاد جس کے لئے خدا ہونا ضروری ہے کیسے ہو سکتے ہیں)۔

معارف و مسائل

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاۗءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ، یعنی ہم نے آسمان اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی چیزوں کو لعب اور کھیل کے لئے نہیں بنایا۔ پچھلی آیتوں میں بعض بستیوں کو تباہ و ہلاک کرنے کا ذکر آیا تھا اس آیت میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جس طرح زمین و آسمان اور اُن کی تمام مخلوقات کی تخلیق بڑی بڑی اہم حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے جن بستیوں کو تباہ کیا گیا اُن کا تباہ کرنا بھی عین حکمت تھا۔ اس مضمون کو اس آیت میں تعبیر اس طرح کیا گیا کہ یہ توحید یا رسالت کے منکر کیا ہماری قدرت کاملہ اور علم و بصیرت کی ان نمایاں نشانیوں کو جو زمین و آسمان کی تخلیق میں اور تمام مخلوقات کی صنعت گری میں مشاہدہ کی جا رہی ہیں دیکھتے سمجھتے نہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے یہ سب چیزیں فضول ہی محض کھیل کے لئے پیدا کی ہیں۔

لٰعِبِيْنَ، لعب سے مشتق ہے، لعب ایسے کام کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی صحیح مقصد متعلق نہ ہو (راغب) اور لہو اُس کام کو کہتے ہیں جس سے کوئی صحیح یا غلط مقصد ہی نہ ہو خالی وقت گزاری کا مشغلہ بنایا جائے منکرین اسلام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر اعتراض اور توحید کا انکار کرتے ہیں، قدرتِ حق کی ان عظیم الشان نشانیوں کے باوجود نہیں مانتے تو اُن کا یہ عمل گویا اسکا دعویٰ ہے کہ یہ سب چیزیں فضول ہی کھیل کے لئے بنائی گئی ہیں، اُن کے جواب میں یہ ارشاد ہوا کہ یہ کھیل اور فضول نہیں ذرا بھی غور و فکر سے کام لو تو کائنات کے ایک ایک ذرہ میں اور قدرت کی ایک ایک صنعت میں ہزاروں حکمتیں ہیں اور سب کی سب معرفت حق سبحانہٗ اور اس کی توحید کے خاموش سبق ہیں ؎ ہر گیاہے کہ از زمیں روید، وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّا تَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ، یعنی اگر ہم کوئی مشغلہ بطور کھیل کے بنانا ہی چاہتے اور ہمیں یہ کام کرنا ہی ہوتا تو ہمیں اسکی کیا ضرورت تھی کہ زمین و آسمان وغیرہ پیدا کریں یہ کام اپنے پاس کی چیزوں سے بھی ہو سکتا تھا۔

عربی زبان میں حرف لَوْ فرضی چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے جسکا کوئی وجود نہ ہو اس جگہ بھی اسی حرف سے یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ جو حق ان تمام علویات اور سفلیات آسمانی اور زمینی مخلوقات اور مصنوعات عجیبہ کو لہو ولعب سمجھتے ہیں کیا وہ اتنی بھی عقل نہیں رکھتے کہ اتنے بڑے بڑے کام لہو ولعب کیلئے نہیں ہوا کرتے یہ کام جس کو کرنا ہو وہ یوں نہیں کیا کرتا، اسمیں اشارہ اسطرف ہے کہ لہو ولعب کا کوئی کام بھی حق تعالیٰ کی عظمت شان تو بہت بلند و بالا ہے کسی اچھے معقول آدمی سے بھی متصور نہیں۔

لہو کے اصلی اور معروف معنی بیکاری کے مشغلہ کے ہیں اسی کیمطابق مذکورہ تفسیر کی گئی ہے۔ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ لفظ لہو کبھی بیوی کے لئے اور اولاد کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور یہاں یہ مراد لیجائے تو مطلب آیت کا یہود و نصاریٰ پر رد کرنا ہوگا جو حضرت مسیح یا عزیر علیہما السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں کہ اگر ہمیں اولاد ہی بنانی ہوتی تو انسان مخلوق کو کیوں بناتے اپنے پاس کی مخلوق میں سے بنا لیتے۔ واللہ علم

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ، قذف کے لغوی معنی پھینکنا اور پھینک مارنے کے ہیں دمغ کے معنے دماغ پر ضرب لگانے کے ہیں اور زاہق کے معنے جانے والا اور بے نام و نشان ہو جانیوالا۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ زمین و آسمان کی عجیب و غریب کائنات ہم نے کھیل کے لئے نہیں بلکہ بڑی حکمتوں پر مبنی کر کے بنائی ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُن کے ذریعہ حق و باطل کا امتیاز ہوتا ہے، مصنوعات قدرت کا مشاہدہ انسان کو حق کیطرف ایسی رہبری کرتا ہے کہ باطل اسکے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ اسی مضمون کی تعبیر اسطرح کی گئی ہے کہ حق کو باطل کے اوپر پھینک مارا جاتا ہے جس سے باطل کا دماغ (بھیجا) نکل جاتا ہے اور وہ بے نام و نشان ہو کر رہ جاتا ہے۔

وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ، یعنی ہمارے جو بندے ہمارے پاس ہیں مراد اس سے فرشتے ہیں وہ ہر وقت ہماری عبادت میں بغیر کسی وقفہ کے ہمیشہ مشغول رہتے ہیں اگر تم ہماری عبادت نہ کرو تو ہماری خدائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ انسان چونکہ دوسروں کو بھی اپنے حال پر قیاس کرنیکا عادی اور خوگر ہوتا ہے اسکو دائمی عبادت سے دو چیزیں مانع ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کسی کی عبادت کرنے کو اپنے درجہ اور مقام کے خلاف سمجھے اسلئے عبادت کے پاس ہی نہ جائے دوسرے یہ کہ عبادت تو کرنا چاہتا ہے مگر دائمی مسلسل اس لئے نہیں کر سکتا کہ بمقتضائے بشریت وہ تھوڑا کام کر کے تھک جاتا ہے اس کو آرام کرنے اور سونے کی ضرورت پیش آتی ہے اسلئے آخر آیت میں فرشتوں سے ان دونوں موانع کی نفی کر دی گئی کہ وہ نہ تو ہماری عبادت سے استکبار کرتے ہیں

کہ اسکو اپنی شان کے خلاف جانیں اور نہ عبادت کرنے سے کسی وقت تھکتے ہیں اسی مضمون کی تکمیل بعد کی آیت میں اسطرح فرمائی یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ، یعنی فرشتے رات دن تسبیح کرتے رہتے ہیں کسی وقت سُست بھی نہیں ہوتے۔

عبد اللہ بن حارث کہتے ہیں کہ میں نے کعب احبار سے پُوچھا کہ کیا فرشتوں کو تسبیح کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں، اگر ہے تو پھر دوسرے کاموں کیساتھ ہر وقت کی تسبیح کیسے جاری رہتی ہے۔ کعب نے فرمایا اے میرے بھتیجے کیا تمہارا کوئی کام اور شغلہ تمہیں سانس لینے سے روکتا ہے اور کام کرنے میں مخل و مانع ہوتا ہے حقیقت یہی ہے کہ تسبیح فرشتوں کے لئے ایسی ہے جیسے ہمارا سانس یا آنکھ جھپکنا کہ یہ دونوں چیزیں ہر وقت ہر حال میں جاری رہتی ہیں اور کسی کام میں مانع اور مخل نہیں ہوتیں (قرطبی و بحر محیط)

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ، اسمیں مشرکین کی جہالت کو کئی طرح ظاہر فرمایا ہے۔ اول یہ کہ یہ کیسے احمق ہیں کہ خدا بھی بنایا تو زمین کی مخلوق کو بنایا یہ تو علوی اور آسمانی مخلوقات سے بہرحال کمتر و ابتر ہیں دوسرے یہ کہ جن کو خدا بنایا کیا ان کو اُنھوں نے یہ کام کرتے دیکھا ہے کہ وہ کسی کو زندہ کرتے اور اسمیں جان ڈالتے ہیں۔ معبود کے لئے تو یہ بات ضروری ہے کہ موت و حیات خلائق اسکے قبضہ میں ہو۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ، یہ توحید کی دلیل عادی ہے جو عام عادات کے اعتبار پر مبنی ہے اور دلیل عقلی کیطرف بھی اشارہ ہے جس کی مختلف تقریریں علم کلام کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ اور دلیل عادی اس بنا پر ہے کہ اگر زمین و آسمان کے دو خدا اور دونوں مالک و مختار ہوں تو ظاہر ہے کہ دونوں کے احکام پورے پورے زمین و آسمان میں نافذ ہونے چاہئیں اور عادۃً یہ ممکن نہیں کہ جو حکم ایک دے وہی دوسرا بھی دے یا جس چیز کو ایک پسند کرے دوسرا بھی اُسی کو پسند کرے اسلئے کبھی کبھی اختلاف رائے اور اختلاف احکام ہونا ناگزیر ہے اور جب دو خداؤں کے احکام زمین و آسمان میں مختلف ہوئے تو نتیجہ ان دونوں کے فساد کے سوا کیا ہے۔ ایک خدا چاہتا ہے کہ اسوقت دن ہو۔ دوسرا چاہتا ہے رات ہو۔ ایک چاہتا ہے بارش ہو دوسرا چاہتا ہے نہ ہو تو دونوں کے متضاد احکام کس طرح جاری ہونگے اور اگر ایک مغلوب ہوگیا تو مالک مختار اور خدا نہ رہا۔ اس پر یہ شبہ کہ دونوں آپس میں مشورہ کر کے احکام جاری کیا کریں اس میں کیا بُعد ہے اسکے جوابات علم کلام کی کتابوں میں بڑی تفصیل سے آئے ہیں۔ اتنی بات یہاں بھی سمجھ لیجائے کہ اگر دونوں مشورہ کے پابند ہوئے ایک بغیر دوسرے کے مشورے کے کوئی کام نہ کرسکے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ انمیں سے ایک بھی مالک مختار نہیں، دونوں ناقص ہیں اور ناقص خدا نہیں ہوسکتا اور شاید اگلی آیت لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ میں بھی اسطرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ جو شخص کسی قانون

کا پابند ہو جس کے افعال و اعمال پر کسی کو مواخذہ کرنیکا حق ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ خدا وہی ہے جو کسی کا پابند نہ ہو، جس سے کسی کو سوال کرنیکا حق نہ ہو۔ اگر دو خدا ہوں اور دونوں مشورہ کے پابند ہوں تو ہر ایک کو دوسرے سے سوال کرنے اور ترک مشورہ پر مواخذہ کرنیکا حق لازمی ہے جو خود منصب خدائی کے منافی ہے۔

هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِي، اسکا ایک مفہوم تو وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں بیان ہوا ہے کہ ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ سے مُراد قرآن اور ذِكْرُ مَنْ قَبْلِي سے مُراد تورات و انجیل اور زبور وغیرہ کتب سابقہ ہیں اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ میرا اور میرے ساتھ والوں کا قرآن اور پچھلی اُمتوں کی کتابیں تورات و انجیل وغیرہ موجود ہیں کیا اُن میں سے کسی کتاب میں اللہ کے سوا کسی کی عبادت کی تلقین موجود ہے۔ تورات و انجیل وغیرہ میں تحریف ہو جانے کے باوجود یہ تو اب تک بھی کہیں صاف نہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کر کے دوسرا معبود بنالو۔ بحر محیط میں اسکا یہ مفہوم بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ قرآن ذکر ہے میرے ساتھ والوں کیلئے بھی اور ذکر ہے مجھ سے پہلوں کیلئے بھی مطلب یہ ہے کہ اپنے ساتھ والوں کیلئے تو دعوت اور تشریع احکام کے لحاظ سے ذکر ہے اور سابقین کیلئے ذکر بایں معنے ہے کہ اسکے ذریعہ سابقین کے احوال و معاملات اور قصص زندہ ہیں۔

لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ، یعنی فرشتے حق تعالیٰ کی اولاد تو کیا ہوتے وہ تو ایسے خائف اور مؤدب رہتے ہیں کہ نہ قول میں اللہ تعالیٰ سے سبقت کرتے ہیں نہ عمل میں اسکے خلاف کبھی کچھ کرتے ہیں، قول میں سبقت نہ کرنیکا مطلب یہ ہے کہ جب تک حق تعالیٰ ہی کیطرف سے کوئی ارشاد نہ ہو خود کوئی کلام کرنے میں مسابقت کی ہمت نہیں کرتے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑوں کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ جب مجلس میں کوئی بات آئے تو جو اس مجلس کا بڑا ہے اسکے کلام کا انتظار کیا جائے پہلے ہی کسی اور کا بول پڑنا خلافِ ادب ہے۔

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا

اور کیا نہیں دیکھا ان منکروں نے کہ آسمان اور زمین منہ بند تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٠﴾ وَجَعَلْنَا فِي

اور بنائی ہم نے پانی سے ہر ایک چیز جس میں جان ہے پھر کیا یقین نہیں کرتے اور رکھ دیئے ہم نے

الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا

زمین میں بھاری بوجھ کبھی اُن کو لے کر جُھک پڑے اور رکھیں اُس میں کشادہ راہیں

لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿٣١﴾ وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا ۖ وَهُمْ

تاکہ وہ راہ پائیں اور بنایا ہم نے آسمان کو چھت محفوظ اور وہ

عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ ﴿٣٢﴾ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَ

آسمان کی نشانیوں کو دھیان میں نہیں لاتے اور وہی ہے جس نے بنائے رات اور دن اور

اَلشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾

سورج اور چاند سب اپنے اپنے گھر میں پھرتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

کیا ان کافروں کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ آسمان اور زمین (پہلے) بند تھے (یعنی آسمان سے بارش ہوتی تھی نہ زمین سے کچھ پیداوار، اسی کو بند ہونا فرمایا جیسا کہ اب بھی اگر کسی جگہ یا کسی زمانے میں آسمان سے بارش اور زمین سے پیداوار نہ ہو تو اُس جگہ یا اُس زمانے کے اعتبار سے انکو بند کہا جا سکتا ہے) پھر ہم نے دونوں کو (اپنی قدرت سے) کھول دیا کہ آسمان سے بارش اور زمین سے نباتات کا اگنا شروع ہو گیا) اور (بارش سے صرف نباتات ہی کو نمو نہیں ہوتا بلکہ) ہم نے (بارش کے) پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا ہے (یعنی ہر زندہ جاندار کے وجود اور بقاء میں پانی کا دخل ضرور ہے خواہ بلا واسطہ ہو یا کسی واسطہ سے جیسا کہ دوسری آیت میں ہے وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ) کیا (ان باتوں کو سنکر) پھر بھی ایمان نہیں لاتے اور ہم نے (اپنی قدرت سے) زمین میں پہاڑ اس لئے بنائے کہ زمین ان لوگوں کو لے کر ہلنے نہ لگے اور ہم نے اس (زمین) میں کشادہ رستے بنائے تاکہ لوگ (ان کے ذریعہ) منزل (مقصود) کو پہنچ جاویں اور ہم نے (اپنی قدرت سے) آسمان کو (بمقابلہ زمین کے اس کے اوپر مثل) ایک چھت (کے) بنایا جو (ہر طرح سے) محفوظ ہے۔ (یعنی گرنے سے بھی ٹوٹنے پھوٹنے سے بھی اور اس سے بھی کہ شیطان وہاں تک پہنچ کر آسمان کی باتیں سُن سکیں مگر یہ آسمان کا محفوظ و مضبوط ہونا بھی دائمی نہیں ایک زمانہ معین تک ہے) اور یہ لوگ اس (آسمان) کے (اندر کی موجودہ) نشانیوں سے اعراض کئے ہوئے ہیں (یعنی ان میں غور و فکر اور تدبر نہیں کرتے) اور وہ ایسا (قادر) ہے کہ اس نے رات اور دن اور سورج اور چاند بنائے (وہ نشانیاں آسمان کی یہی ہیں اور شمس و قمر میں سے) ہر ایک ایک ایک دائرے میں (اس طرح چل رہے ہیں کہ گویا تیر رہے ہیں۔

معارف و مسائل

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا، اس جگہ لفظ رؤیت بمعنے علم عام ہے خواہ وہ آنکھوں سے دیکھکر حاصل ہو یا استدلال عقلی سے۔ کیونکہ آگے جو مضمون آرہا ہے اُسکا تعلق کچھ مشاہدہ اور دیکھنے سے ہے کچھ علم استدلالی سے۔

اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا، لفظ رتق کے معنے بند ہونے اور فتق کے معنے کھولدینے کے ہیں۔ ان دو لفظوں کا مجموعہ رتق و فتق کسی کام کے انتظام اور اس کے

پورے اختیار کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ الفاظ آیت کا ترجمہ یہ ہوا کہ آسمان اور زمین بند تھے ہم نے ان کو کھولدیا۔ اسمیں بند ہونے اور کھولدینے سے مراد کیا ہے اس کی مراد میں حضرات مفسرین نے مختلف اقوال نقل کئے ہیں مگر اُن سب میں جو معنے صحابہ کرام اور جمہور مفسرین نے اختیار فرمائے وہ وہی ہیں جو خلاصہ تفسیر میں لئے گئے ہیں کہ بند ہونے سے مراد آسمان کی بارش اور زمین کی پیداوار کا بند ہونا ہے اور کھولنے سے مراد ان دونوں کو کھولدینا ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں ابن ابی حاتم کی سند سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص اُن کے پاس آیا اور اُن سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی اُنھوں نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس شیخ کے پاس جاؤ اُن سے دریافت کرو اور وہ جو جواب دیں مجھے بھی اس کی اطلاع کر دو یہ شخص حضرت ابن عباسؓ کے پاس گیا اور دریافت کیا کہ اس آیت میں رتقا اور فتقنا سے کیا مراد ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ پہلے آسمان بند تھے بارش نہ برساتے تھے اور زمین بند تھی کہ اسمیں نباتات نہیں اُگتی تھی جب اللہ تعالیٰ نے زمین پر انسان کو آباد کیا تو آسمان کی بارش کھولدی اور زمین کا نشو و نما۔ یہ شخص آیت کی تفسیر معلوم کر کے حضرت ابن عمرؓ کے پاس واپس گیا اور جو کچھ ابن عباسؓ سے سنا تھا وہ بیان کیا تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ اب مجھے ثابت ہو گیا کہ واقعی ابن عباسؓ کو قرآن کا علم عطا کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے میں تفسیر قرآن کے بارے میں ابن عباسؓ کے بیانات کو ایک جرأت سمجھا کرتا تھا جو مجھے پسند نہ تھی اب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انکو علوم قرآن کا خاص ذوق عطا فرمایا ہے اُنھوں نے رتق و فتق کی تفسیر صحیح فرمائی ہے۔

روح المعانی میں ابن عباسؓ کی اس روایت کو ابن المنذر اور ابونعیم اور ایک جماعت محدثین کے حوالہ سے نقل کیا ہے جن میں حاکم صاحب مستدرک بھی ہیں، حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

ابن عطیہ عوفی اس روایت کو نقل کر کے کہتے ہیں کہ یہ تفسیر حسن اور جامع اور سیاق و سباق قرآن کے مناسب ہے اسمیں منکرین کے خلاف عبرت اور حجت بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتوں اور قدرت کاملہ کا اظہار بھی جو معرفت و توحید کی بنیاد ہے اور بعد کی آیت میں جو وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ فرمایا ہے اس سے اسی معنے کے اعتبار سے مناسبت ہے۔ بحر محیط میں بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ قرطبی نے اسی کو عکرمہ کا قول بھی قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ایک دوسری آیت سے بھی اس معنے کی تائید ہوتی ہے یعنی وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ، طبری نے بھی اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ، مراد یہ ہے کہ ہر جاندار کی تخلیق میں پانی کا دخل ضرور ہے اور جاندار و ذی روح اہل تحقیق کے نزدیک صرف انسان اور حیوانات ہی نہیں بلکہ

نباتات بلکہ جمادات میں رُوح اور حیات محققین کے نزدیک ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ پانی کو ان سب چیزوں کی تخلیق و ایجاد اور ارتقاء میں بڑا دخل ہے۔

ابن کثیر نے امام احمدؒ کی سند سے بروایت ابوہریرہ رضؓ نقل کیا ہے کہ ابوہریرہ رضؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ میں جب آپؐ کی زیارت کرتا ہوں تو میرا دل باغ باغ اور آنکھیں ٹھنڈی ہوجاتی ہیں آپ مجھے ہر شی (کی تخلیق) کے بارے میں بتلا دیجئے، آپؐ نے فرمایا کہ ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے اس کے بعد ابوہریرہ رضؓ نے سوال کیا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتلا دیجئے جس پر عمل کرنے سے میں جنّت میں پہنچ جاؤں، آپؐ نے فرمایا:

افش السلام واطعم الطعام وصل الارحام وقم باللیل والناس نیام ثم ادخل الجنۃ بسلام تفرد بہ احمد وھذا اسناد علی شرط الشیخین الخ

سلام کرنے کو عام کرو (خواہ مخاطب اجنبی ہو) اور کھانا کھلا کرو (اسکو بھی حدیث میں عام رکھا ہے کھانا کھلانا ہر شخص کو خواہ کافر فاسق ہی ہو ثواب سے خالی نہیں) اور صلہ رحمی کیا کرو اور رات کو تہجد کی نماز پڑھا کرو جب سب لوگ سوتے ہوں تو جنّت میں سلامتی کیساتھ داخل ہوجاؤ گے

وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ، لفظ مَيَد عربی زبان میں اضطرابی حرکت کو کہا جاتا ہے اور مُراد آیت کی یہ ہے کہ زمین پر پہاڑوں کا بوجھ حق تعالےٰ نے اسکا توازن برقرار رکھنے کے لئے ڈالدیا ہے تاکہ وہ اضطرابی حرکت نہ کرسکے جس سے اُس کے اُوپر بسنے والوں کو نقصان پہنچے۔ اس کی فلسفیانہ تحقیق کہ پہاڑوں کے بوجھ کو زمین کے قرار میں کیا دخل ہے اسکی یہاں ضرورت نہیں۔ تفسیر کبیر وغیرہ میں اسکا مفصّل بیان اہلِ علم دیکھ سکتے ہیں اور بقدر ضرورت سورۂ نمل کی تفسیر میں حضرت حکیم الامۃ رحؒ نے تفسیر بیان القرآن میں بھی لکھدیا ہے۔

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ لفظ فلك دراصل ہر دائرے اور گول چیز کو کہا جاتا ہے اسی وجہ سے چرخے میں جو گول چمڑا لگا ہوتا ہے اسکو فلکۃ المغزل کہتے ہیں (رُوح) اور اسی وجہ سے آسمان کو بھی فلک کہدیا جاتا ہے۔ یہاں مُراد شمس و قمر کی وہ مداریں ہیں جن پر وہ حرکت کرتے ہیں۔ الفاظ قرآن میں اسکی کوئی تصریح نہیں ہے یہ مداریں آسمان کے اندر ہیں یا باہر فضاء میں۔ حالیہ خلائی تحقیقات نے واضح کردیا ہے کہ یہ مداریں خلاء اور فضاء میں آسمان سے بہت نیچے ہیں۔

اس آیت کے ظاہر سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ آفتاب بھی ایک مدار پر حرکت کرتا ہے جدید خلا سفر پہلے اسکے منکر تھے اب وہ بھی اسکے قائل ہوگئے ہیں۔ مزید تفصیلات کی یہ جگہ نہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالےٰ اعلم

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِن مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ ﴿٣٤﴾

اور نہیں دیا ہم نے تجھ سے پہلے کسی آدمی کو ہمیشہ کے لئے زندہ رہنا، پھر کیا اگر تو مر گیا تو وہ رہ جائیں گے

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۖ

ہر جی کو چکھنی ہے موت اور ہم تم کو جانچتے ہیں بُرائی سے اور بھلائی سے آزمانے کو

وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ﴿٣٥﴾ وَإِذَا رَآكَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِن يَتَّخِذُونَكَ

اور ہماری طرف پھر کر آجاؤ گے اور جہاں تجھ کو دیکھا منکروں نے تو کوئی کام نہیں اُن کو تجھ سے

إِلَّا هُزُوًا أَهَٰذَا الَّذِي يَذْكُرُ آلِهَتَكُمْ وَهُم بِذِكْرِ الرَّحْمَٰنِ

مگر ٹھٹھا کرنا کیا یہی شخص ہے جو نام لیتا ہے تمہارے معبودوں کا اور وہ رحمٰن کے نام سے

هُمْ كَافِرُونَ ﴿٣٦﴾ خُلِقَ الْإِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۚ سَأُرِيكُمْ آيَاتِي فَلَا

منکر ہیں بنا ہے آدمی جلدی کا اب دکھلاتا ہوں تم کو اپنی نشانیاں سو

تَسْتَعْجِلُونِ ﴿٣٧﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣٨﴾

مجھ سے جلدی مت کرو اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَن وُجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا

اگر جان لیں یہ منکر اُس وقت کو کہ نہ روک سکیں گے اپنے منہ سے آگ اور نہ

عَن ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٣٩﴾ بَلْ تَأْتِيهِم بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ

اپنی پیٹھ سے اور نہ اُن کو مدد پہنچے گی کچھ نہیں وہ آئے گی اُن پر ناگہاں پھر اُنکے ہوش

فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٤٠﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ

کھودے گی پھر نہ پھیر سکیں گے اُس کو اور نہ اُن کو فرصت ملے گی اور ٹھٹھے ہو چکے ہیں

بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ

رسولوں سے تجھ سے پہلے پھر اُلٹ پڑی ٹھٹھا کرنے والوں پر اُن میں سے وہ چیز جس کا

يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٤١﴾ قُلْ مَن يَكْلَؤُكُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ

ٹھٹھا کرتے تھے تو کہہ کون نگہبانی کرتا ہے تمہاری رات میں اور دن میں

الرَّحْمَٰنِ ۗ بَلْ هُمْ عَن ذِكْرِ رَبِّهِم مُّعْرِضُونَ ﴿٤٢﴾ أَمْ لَهُمْ آلِهَةٌ

رحمٰن سے کوئی نہیں وہ اپنے رب کے ذکر سے منہ پھیرتے ہیں یا اُنکے واسطے کوئی معبود ہیں

تَمْنَعُهُم مِّن دُونِنَا ۚ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَ أَنفُسِهِمْ وَلَا هُم

کہ اُن کو بچاتے ہیں ہمارے سوا وہ اپنی بھی مدد نہیں کر سکتے اور نہ اُن کی ہماری

مِّنَّا يُصْحَبُونَ ﴿٤٣﴾ بَلْ مَتَّعْنَا هَٰؤُلَاءِ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ طَالَ

طرف سے رفاقت ہو کوئی نہیں پر ہم نے عیش دیا اُن کو اور اُن کے باپ دادوں کو یہاں تک کہ بڑھ گئی

عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۗ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ

اُن پر زندگی پھر کیا نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں زمین کو گھٹاتے اُس کے

اَطْرَافِهَا ۭ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ڮ وَلَا

کناروں سے اب کیا وہ جیتنے والے ہیں تو کہہ میں جو تم کو ڈراتا ہوں سو حکم کے موافق اور سنتے

يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاۗءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَىِٕنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ

نہیں بہرے پکارنے کو جب کوئی اُن کو ڈر کی بات سنائے اور کہیں پہنچ جائے اُن تک ایک بھاپ

مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ

تیرے رب کے عذاب کی تو ضرور کہنے لگیں ہائے کم بختی ہماری بیشک ہم تھے گنہگار اور رکھیں گے ہم ترازوئیں

الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْــــًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ

انصاف کی قیامت کے دن پھر ظلم نہ ہوگا کسی جی پر ایک ذرہ اور اگر ہوگا برابر رائی کے

حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾

دانہ کی تو ہم لے آئیں گے اُس کو اور ہم کافی ہیں حساب کرنے کو

خلاصۂ تفسیر

اور (یہ لوگ جو آپ کی وفات کی خوشیاں منا رہے ہیں بقولہ تعالیٰ نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ، یہ وفات بھی منافی نبوت کی نہیں کیونکہ) ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی بشر کے لئے (خواہ وہ نبی ہو یا غیر نبی دنیا میں) ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا (کقولہ تعالیٰ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ، پس جیسے آپ سے پہلے انبیاء کو موت آئی اس سے ان کی نبوت میں کسی کو شبہ نہیں ہوا اسی طرح آپ کی وفات سے آپ کی نبوت میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ نبوت اور موت دونوں ایک شخص میں جمع ہو سکتی ہیں) پھر (یہ کہ) اگر آپ کا انتقال ہو جاوے تو کیا یہ لوگ (دنیا میں) ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے (آخر یہ بھی مریں گے پھر خوشی کا کیا مقام ہے؟ مطلب یہ کہ آپ کی وفات سے ان کی خوشی اگر ابطال نبوت کے لئے ہے، تب تو وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ الخ اس کا جواب ہے اور اگر ذاتی بغض و عداوت سے ہے تو اَفَاۡىِٕنْ مِّتَّ الخ اسکا جواب ہے غرض ہر حال میں یہ انتظار جہل اور لغو ہے اور موت تو ایسی چیز ہے کہ تم میں) ہر جاندار موت کا مزا چکھے گا اور (یہ جو ہم نے چند روزہ تم کو زندگی دے رکھی ہے تو اس سے مقصود محض یہ ہے کہ) ہم تم کو بری بھلی حالتوں سے اچھی طرح آزماتے ہیں (بری حالت سے مراد جو کہ خلاف مزاج ہو جیسے مرض و فقر اور اچھی حالت سے مراد جو کہ موافق مزاج ہو جیسے صحت اور غنا زندگی میں یہی حالتیں مختلف طور پر پیش آتی ہیں۔ کوئی ان میں ایمان اور طاعت بجالاتا ہے اور کوئی کفر و

معصیت کرتا ہے مطلب یہ کہ زندگی اس لئے دے رکھی ہے کہ دیکھیں کیسے کیسے عمل کرتے ہو) اور (اس زندگی کے ختم پر) پھر تم سب ہمارے پاس چلے آؤ گے (اور ہر ایک کو اُس کے مناسب سزا و جزا دیں گے پس امر مہم تو موت اور ما بعد الموت ہی ہوا اور زندگی محض عارضی پھر یہ لوگ اس پر اتراتے ہیں اور پیغمبر کی وفات پر خوشیاں مناتے ہیں یہ نہ ہوا کہ اس مستعار زندگی میں دولتِ ایمان وطاعت کما لیتے جو اُن کے کام آتی اور اُلٹا نامۂ اعمال سیاہ اور آخرت کی منزل بھاری کر رہے ہیں ڈرتے نہیں) اور (ان منکرین کی یہ حالت ہے کہ) یہ کافر لوگ جب آپ کو دیکھتے ہیں تو بس آپ سے ہنسی مذاق کرنے لگتے ہیں (اور آپس میں کہتے ہیں) کہ کیا یہی (صاحب) ہیں جو تمہارے معبودوں کا (برائی سے) ذکر کیا کرتے ہیں (سو آپ پر تو بتوں کے انکار کا بھی اعتراض ہے) اور خود یہ لوگ (حضرت) رحمان (جل شانہٗ) کے ذکر پر انکار (اور کفر) کیا کرتے ہیں (تو اعتراض کی بات تو درحقیقت یہ ہے اس لئے ان کو اپنی اس حالت پر استہزاء کرنا چاہئے تھا اور اُن کی یہ حالت ہے کہ جب سزائے کفر کا مضمون سنتے ہیں جیسے اوپر ہی ذکر ہوا ہے اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ تو بوجہ تکذیب کے اسکا تقاضا کرتے ہیں کہ یہ سزا جلد آجائے اور یہ تقاضا اور عجلت کچھ انسانی طبیعت کا خاصہ اکثر یہ بھی ہے پس اسکا طبعی ہونا ایسا ہے جیسے گویا) انسان جلدی ہی (کے خمیر) کا بنا ہوا (ہے یعنی عجلت اور جلدی مثل اُسکے اجزاء ترکیبیہ کے ہے اسی واسطے یہ لوگ عذاب جلدی جلدی مانگتے ہیں اور اسمیں دیر ہونے کو دلیل عدم وقوع کی سمجھتے ہیں لیکن اے کافرو یہ تمہاری غلطی ہے کیونکہ اسکا وقت معین ہے سو ذرا صبر کرو) ہم عنقریب (اسکے وقت آنے پر) تم کو اپنی نشانیاں (قہر کی یعنی سزائیں) دکھائے دیتے ہیں، پس تم مجھ سے جلدی مت مچاؤ (کیونکہ عذاب وقت سے پہلے آتا نہیں اور وقت پر ٹلتا نہیں) اور یہ لوگ (جب یہ مضمون سنتے ہیں کہ وقت موعود پر عذاب آویگا تو رسول اور مؤمنین سے یوں) کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کس وقت آویگا اگر تم (وقوع عذاب کی خبر میں) سچے ہو (تو توقف کاہے کا جلدی سے کیوں نہیں واقع کر دیا جاتا۔ اصل یہ ہے کہ ان کو اس مصیبت کی خبر نہیں جو ایسی بے فکری کی باتیں کرتے ہیں) کاش ان کافروں کو اس وقت کی خبر ہوتی جبکہ (اُن کو سب طرف سے دوزخ کی آگ گھیرے گی اور) یہ لوگ (اس) آگ کو نہ اپنے سامنے سے روک سکیں گے اور نہ اپنے پیچھے سے اور نہ اُن کی کوئی حمایت کریگا (یعنی اگر اس مصیبت کا علم ہوتا تو ایسی باتیں نہ بناتے اور یہ جو دنیا ہی میں عذاب نار کی فرمائش کر رہے ہیں سو یہ ضرور نہیں کہ اُن کی فرمائش کے موافق عذاب نار آجاوے) بلکہ وہ آگ (تو) ان کو ایکدم سے آلیگی سو اُن کو بدحواس کر دیگی پھر نہ اُس کے ہٹانے کی اُن کو قدرت ہوگی اور نہ اُن کو مہلت دی جائے گی اور (اگر وہ یوں کہیں کہ اگر یہ عذاب آخرت میں موعود ہونے کی وجہ سے دنیا میں نہیں ہوتا تو اچھا دنیا میں اسکا کوئی نمونہ تو دکھلا دو تو گو بقاعدہ

مناظرہ نمونہ دکھلانا ضرور نہیں لیکن تبرعاً نمونہ کا پتہ بھی دیا جاتا ہے وہ یہ کہ) آپ سے پہلے جو پیغمبر گزرے ہیں اُن کے ساتھ بھی (کفار کی طرف سے) تمسخر کیا گیا سو جن لوگوں نے اُن سے تمسخر کیا تھا اُن پر وہ عذاب واقع ہو گیا جس کے ساتھ وہ استہزار کرتے تھے (کہ عذاب کہاں ہے پس اس سے معلوم ہوا کہ کفر موجب عذاب ہے پس اگر دُنیا میں وقوع نہ ہو تو آخرت میں ہوگا اور یہ بھی اُن سے) کہدیجئے (کہ دُنیا میں جو تم عذاب سے محفوظ ہو سو یہ حفاظت بھی حضرت رحمان ہی کر رہا ہے اس میں بھی اُسی کا احسان اور دلالت علی التوحید ہے اور اگر تم اُس کو تسلیم نہیں کرتے تو پھر بتلاؤ) کہ وہ کون ہے جو رات اور دن میں رحمان (کے عذاب) سے تمہاری حفاظت کرتا ہو (اور اس مضمون کا مسلم مقتضا یہ تھا کہ توحید کے قائل ہو جاتے مگر وہ اب بھی قائل نہ ہوئے) بلکہ وہ لوگ (اب بھی بدستور) اپنے رب (حقیقی) کے ذکر (توحید کے قبول کرنے) سے روگرداں (رہی) ہیں (ہاں ہم مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ کے مصداق کی توضیح کے لئے تصریحاً دریافت کرتے ہیں کہ) کیا انکے پاس ہمارے سوا اور ایسے معبود ہیں کہ (عذاب کو رہے) اُن کی حفاظت کر لیتے ہوں (وہ بیچارے ان کی تو کیا حفاظت کرتے اُن کی بیچارگی و درماندگی کی تو یہ حالت ہے کہ) وہ خود اپنی حفاظت کی قدرت نہیں رکھتے (مثلاً اُن کو کوئی توڑنے پھوڑنے لگے تو مدافعت بھی نہیں کر سکتے کقولہ تعالیٰ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ الخ پس نہ وہ اُن کے معبود ان کی حفاظت کر سکتے ہیں) اور نہ ہمارے مقابلہ میں کوئی اُن کا ساتھ دے سکتا ہے (اور یہ لوگ باوجود ان دلائل ساطعہ کے جو حق کو قبول نہیں کرتے تو یہ وجہ نہیں کہ دعویٰ یا دلیل میں کچھ خلل ہے) بلکہ (اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ) ہم نے ان کو اور اُن کے باپ دادوں کو (دُنیا کا) خوب سامان دیا یہاں تک کہ اُن پر (اسی حالت میں) ایک عرصہ دراز گزر گیا (کہ پشتہا پشت سے عیش آرام کرتے آ رہے ہیں پس کھا کھا کے غُرّانے لگے اور آنکھیں پتھرا گئیں مطلب یہ کہ ان ہی میں خلل غفلت کا ہے لیکن باوجود منبہات تشریعیہ تکوینیہ کے اتنی غفلت بھی نہ ہونا چاہیئے چنانچہ ایک امر منبّہ کا ذکر کیا جاتا ہے وہ یہ کہ) کیا اُن کو یہ نظر نہیں آتا کہ ہم (ان کی) زمین کو (بذریعہ فتوحات اسلامیہ کے) ہر چہار طرف سے برابر گھٹاتے چلے جاتے ہیں سو کیا یہ لوگ (یہ توقع رکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین پر) غالب آویں گے (کیونکہ قرائن عادیہ اور دلائل تنزیلیہ متفق ہیں اُن کے مغلوب اور اہل حق کے غالب ہوتے جانے پر تا وقتیکہ مسلمان اطاعت خداوندی سے منہ نہ موڑیں اور حمایت اسلام نہ چھوڑیں پس اس امر میں تأمل کرنا بھی تنبیہ کے لئے کافی ہے اگر اس پر بھی عناد و جہالت سے وقوع عذاب ہی کی فرمائش کریں تو) آپ کہدیجئے کہ میں تو صرف وحی کے ذریعہ سے تم کو ڈراتا ہوں (عذاب کا آنا میرے بس سے باہر ہے) اور (گو یہ طریقہ دعوت الی الحق کا اور یہ انذار کافی ہے مگر) یہ بہرے جس وقت (حق کی طرف بلائے جانے کے واسطے عذاب سے) ڈرائے جاتے ہیں سُنتے ہی نہیں (اور طریق وضوح حق

میں تامل ہی نہیں کرتے بلکہ وہی مرغی کی ایک ٹانگ عذاب ہی مانگے جاتے ہیں) اور (کیفیت عالی ہمتی کی یہ ہے کہ) اگر ان کو آپ کے رب کے عذاب کا ایک جھونکا بھی ذرا لگ جاوے تو (ساری بہادری ختم ہو جاوے اور) یوں کہنے لگیں کہ ہائے ہماری کمبختی (کیسی ہمارے سامنے آئی) واقعی ہم خطاوار تھے (بس اس ہمت پر عذاب کی فرمائش ہے واقعی ان کی اس شرارت کا تو یہی مقتضا تھا کہ دنیا ہی میں فیصلہ کر دیتے مگر ہم بہت سی حکمتوں سے دنیا میں سزائے موعود دینا نہیں چاہتے بلکہ آخرت کیلئے اٹھا رکھا ہے اور (وہاں) قیامت کے روز ہم میزان عدل قائم کریں گے (اور سب کے اعمال کا وزن کرینگے) سو کسی پر اصلاً ظلم نہ ہوگا اور (ظلم نہ ہونیکا یہ ثمرہ ہوگا کہ) اور اگر (کسی کا کوئی) عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہو تو ہم اس کو (وہاں) حاضر کر دیں گے (اور اسکا بھی وزن کریں گے) اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں (ہمارے اس وزن اور حساب کے بعد پھر کسی حساب کتاب کی ضرورت نہ رہے گی بلکہ اسی پر سب فیصلہ ہو جاویگا پس وہاں لوگوں کی شرارتوں کی بھی سزائے مناسب کافی جاری کر دی جاوے گی)۔

معارف و مسائل

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن قَبْلِكَ الْخُلْدَ، سابقہ آیات میں کفار و مشرکین کے باطل دعووں اور مشرکانہ عقیدوں کی جنہیں حضرت مسیح یا عزیر وغیرہ کو خدائی کا شریک یا فرشتوں اور مسیح کو خدا تعالیٰ کی اولاد کہا گیا ان گمراہ کن عقائد کی تردید و ابطال واضح دلائل کے ساتھ آیا ہے جسکا مخالفین کے پاس کوئی جواب نہ تھا ایسے مواقع میں جب مخالف حجت و دلیل سے مغلوب ہو جائے تو جھنجلاہٹ پیدا ہوتی ہے اسی کا نتیجہ تھا کہ مشرکین مکہ اسکی تمنا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جلد وفات ہو جاوے جیسا کہ بعض آیات میں ہے نَّتَرَبَّصُ بِهِ رَيْبَ الْمَنُونِ، اس آیت میں حق تعالیٰ نے ان کی اس بیہودہ تمنا کے دو جواب دیئے ہیں، وہ یہ کہ اگر ہمارے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی جلد ہی وفات ہوگئی تو تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟ اگر تمہارا مقصد یہ ہے کہ ان کی موت ہو جائے گی تو ہم لوگوں کو بتلائیں گے کہ یہ نبی و رسول نہیں تھے ورنہ موت نہ آتی تو اسکا یہ جواب دیا کہ جن انبیاء کی نبوت کو تم بھی مانتے ہو کیا ان کو موت نہیں آئی، جب ان کی موت سے ان کی نبوت و رسالت میں کوئی فرق نہیں آیا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات سے آپ کی نبوت کے خلاف کوئی پروپیگنڈا کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر تمھارا مقصد آپ کی جلد وفات سے اپنا غصہ ٹھنڈا کرنا ہے تو یاد رکھو کہ یہ موت کا مرحلہ تمھیں بھی درپیش ہے آخر تمھیں بھی مرنا ہے پھر کسی کی موت سے خوش ہونے کے کیا معنے ؎

اگر بمرد عدو جائے شادمانی نیست ٭ کہ زندگانیٔ ما نیز جاودانی نیست

موت کیا چیز ہے | پھر ارشاد فرمایا كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ، یعنی ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے

یہاں مُراد ہر نفس سے نفوس ارضیہ یعنی زمینی جاندار ہیں۔ اُن سب کو موت آنا لازمی ہے نفوس ملائکہ اسمیں داخل نہیں، اسمیں اختلاف ہے کہ قیامت کے روز فرشتوں کو بھی موت آئے گی یا نہیں؟ بعض حضرات نے فرمایا کہ ایک لحظہ کے لئے تو سب پر موت طاری ہو جاویگی خواہ انسان اور نفوس ارضیہ ہوں یا فرشتے اور نفوس سماویہ۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ فرشتے اور جنت کے حور و غلمان موت سے مستغنٰی ہیں۔ واللہ اعلم (روح المعانی) اور موت کی حقیقت جمہور علماء کے نزدیک روح کا جسدِ عنصری سے نکل جانا ہے اور روح خود ایک جسم نورانی لطیف ذی حیات متحرک کا نام ہے جو انسان کے پورے بدن میں ایسا سمایا ہوا رہتا ہے جیسے عرق گلاب اسکے پھول میں۔ ابن قیم نے روح کی حقیقت بیان کر کے اس کو سو دلائل سے ثابت کیا ہے (رُوح المعانی)

لفظ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ سے اشارہ اسطرف پایا جاتا ہے کہ ہر نفس موت کی خاص تکلیف محسوس کریگا کیونکہ مزہ چکھنے کا محاورہ ایسے ہی مواقع میں استعمال ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ رُوح کا جیسا اتصال بدن کے ساتھ ہے اُس کے نکلنے کے وقت تکلیف اور الم کا احساس امر طبعی ہے رہا بعض اہل اللہ کا یہ معاملہ کہ اُن کو موت سے لذت و راحت حاصل ہوتی ہے کہ دُنیا کی تنگیوں سے نجات ہوئی اور محبوبِ اکبر سے مُلاقات کا وقت آگیا، تو یہ ایک دوسری طرح کی لذت ہے جو مفارقت بدن کی طبعی تکلیف کے منافی نہیں کیونکہ جب کوئی بڑی راحت اور بڑا فائدہ سامنے ہوتا ہے تو اُس کے لئے چھوٹی تکلیف برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے اس معنی کے لحاظ سے بعض اہل اللہ نے دُنیا کے غم و رنج اور مصیبتوں کو بھی محبوب قرار دیا ہے کہ "از محبت تلخہا شیریں شوند" ؎

غم چہ استادہ تو بر درِ ما ✻ اندر آ یارِ ما برادرِ ما

اور مولانا رومی نے فرمایا ؎

رنج راحت شد چو طالب شد بزرگ ✻ گرد گلہ توتیائے چشم گرگ

دُنیا کی ہر تکلیف و راحت آزمائش ہے | وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ، یعنی ہم شر اور خیر دونوں کے ذریعہ انسان کی آزمائش کرتے ہیں۔ شر سے مُراد ہر خلافِ طبع چیز ہے جیسے بیماری، رنج و غم، فقر و فاقہ اور خیر سے اسکے بالمقابل ہر مرغوب طبع چیز ہے جیسے صحت و عافیت، خوشی و راحت، غناء و اسباب عیش وغیرہ۔ یہ دونوں طرح کی چیزیں اس دُنیا میں انسان کی آزمائش کے لئے آتی ہیں کہ شر یعنی خلاف طبع اُمور پر صبر کر کے اسکا حق ادا کرنا اور خیر یعنی مرغوب خاطر چیزوں پر شکر کر کے اسکا حق ادا کرنا ہی آزمائش یہ ہے کہ کون اس پر ثابت قدم رہتا ہے کون نہیں رہتا۔ اور بزرگوں نے فرمایا کہ حقوق شکر پر ثابت قدم رہنا بنسبت حقوق صبر کے مشکل ہے۔ انسان کو تکلیف پر صبر کرنا اتنا بھاری نہیں ہوتا جتنا عیش و عشرت اور آرام و راحت میں اسکے حق شکر ادا کرنے پر ثابت قدمی مشکل ہوتی ہے اسی بنا پر حضرت

فاروق اعظمؓ نے فرمایا :

بُلینا بالضراء فصبرنا وبُلینا بالسراء فلم نصبر (روح المعانی)

یعنی ہم تکلیفوں میں مبتلا کئے گئے اس پر تو ہم نے صبر کرلیا لیکن جب راحت عیش میں مبتلا کئے گئے تو اس پر صبر نہ کرسکے یعنی اس کے حقوق ادا کرنے پر ثابت قدم نہ رہ سکے۔

جلد بازی مذموم ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ، عَجَل بمعنے عجلت اور جلدی کے ہے جس کی حقیقت کسی چیز کو اُسکے وقت سے پہلے طلب کرنا ہے اور یہ وصف فی نفسہ مذموم ہے قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی اس کو انسانی کمزوری کے طور پر ذکر فرمایا ہے وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا یعنی انسان بڑا جلد باز ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر اپنی قوم سے آگے بڑھ کر حق تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو وہاں بھی اس عجلت پر عتاب ہوا۔ اور انبیاء وصلحاء کے بارے میں جو مسارعت اور مسابقت فی الخیرات کو بطور مدح کے ذکر کیا گیا ہے وہ جلد بازی اور عجلت کے مفہوم میں داخل نہیں۔ کیونکہ وہ وقت سے پہلے کسی چیز کی طلب نہیں بلکہ وقت پر تکثیر خیرات و حسنات کی کوشش ہے وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

اور خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی طبیعت میں جس طرح کچھ دوسری کمزوریاں رکھدی گئی ہیں انہیں سے ایک کمزوری عجلت کی بھی ہے اور جو چیز طبیعت اور جبلّت میں داخل ہوتی ہے عرب اس کو اسی عنوان سے تعبیر کرتے ہیں کہ یہ شخص اس چیز سے پیدا کیا گیا جیسے کسی کے مزاج میں غصہ غالب ہوگا تو کہا جائے گا کہ یہ غصہ کا بنا ہوا آدمی ہے۔

سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ، اسمیں آیات سے مراد وہ معجزات اور حالات ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صدق و حقانیت پر شہادت دیتے ہیں (قرطبی) جیسے غزوۂ بدر وغیرہ میں نشانیاں کھلے طور پر ظاہر ہوئیں، اور انجام کار اُن مسلمانوں کا غلبہ سب کی آنکھوں نے دیکھ لیا جن کو سب سے زیادہ ضعیف و ذلیل سمجھا جاتا تھا۔

قیامت میں وزن اعمال اور اُس کی میزان وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ، لفظ موازین میزان کی جمع ہے جو ترازو کے معنے میں آتا ہے اس جگہ میزان کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے بعض حضرات مفسرین نے یہ قرار دیا ہے کہ وزن اعمال کے لئے بہت سی میزانیں استعمال کی جائیں گی خواہ ہر شخص کے لئے الگ الگ میزان ہو یا خاص خاص اعمال کے لئے الگ الگ میزانیں ہوں مگر جمہور علماء اس پر متفق ہیں کہ میزان ایک ہی ہوگی اس کو بصیغۂ جمع اس لئے تعبیر کردیا ہے کہ وہ بہت سی موازین کا کام دیگی کیونکہ ساری مخلوقات آدم علیہ السلام سے قیامت تک جنکی تعداد اللہ ہی جانتا ہے اُن سب کے اعمال کو یہی ترازو تولے گی۔ اور قسط کے معنی عدل و انصاف کے ہیں مطلب یہ ہے کہ یہ میزان عدل و انصاف کے ساتھ وزن کرے گی ذرا کمی بیشی نہ ہوگی۔ مستدرک حاکم میں بروایت حضرت سلمانؓ روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز جو میزان وزن اعمال کے لئے رکھی جائیگی اتنی بڑی اور وسیع ہوگی کہ اس

آسمان و زمین کو تولنا چاہیں تو وہ بھی اس میں سما جائیں۔ (مظہری)

حافظ ابو القاسم لالکائی نے اپنی سنن میں حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میزان پر ایک فرشتہ مقرر ہوگا اور ہر انسان کو اس میزان کے سامنے لایا جائیگا۔ اگر اس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگیا تو فرشتہ منادی کریگا جس کو تمام اہل محشر سنیں گے کہ فلاں شخص کامیاب ہوگیا اب کبھی اسکو محرومی نہیں ہوگی، اور اگر نیکیوں کا پلہ ہلکا رہا تو یہ فرشتہ منادی کریگا کہ فلاں شخص شقی اور محروم ہوگیا اب کبھی کامیاب بامراد نہیں ہوگا۔ اور حافظ مذکور نے حضرت حذیفہؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ فرشتہ جو میزان پر مقرر ہوگا حضرت جبریل امین ہیں۔ (قرطبی)

حاکم اور بیہقی اور آجری نے حضرت صدیقہ عائشہؓ سے روایت کیا ہے انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا قیامت کے روز بھی آپ اپنے اہل و اولاد کو یاد رکھیں گے تو فرمایا کہ قیامت میں تین مقام تو ایسے ہونگے کہ ان میں کوئی کسی کو یاد نہ کریگا۔ ایک وہ وقت جب میزان عدل کے سامنے وزن اعمال کے لئے حاضر ہوں گے جب تک یہ نتیجہ معلوم نہ ہوجائے کہ اسکا پلہ نیکیوں کا بھاری ہوا یا ہلکا رہا کسی کو کسی کی یاد نہ آویگی اور دوسرا مقام وہ ہے جب نامہ اعمال اڑائے جاویں گے جبتک یہ متعین نہ ہوجائے کہ نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں آیا (جو نجات کی علامت) یا بائیں ہاتھ یا پشت کیطرف آیا (جو عذاب کی علامت ہے) اور تیسرا مقام پل صراط سے گزرنے کا وقت ہے جبتک پار نہ ہوجاویں کوئی کسی کو یاد نہ کریگا (مظہری)

وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا، یعنی یوم حساب اور میزان اعمال کے وقت انسان کے سارے چھوٹے بڑے اچھے برے اعمال حاضر کئے جاوینگے تاکہ حساب اور وزن میں شامل ہوں۔

وزن اعمال کی صورت | یہ بھی ہوسکتی ہے کہ فرشتوں کے لکھے ہوئے اعمالنامے تولے جائیں جیسا کہ حدیث بطاقہ سے اسطرف اشارہ نکلتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عین اعمال کو وہاں جواہر مستقلہ کی شکل دیدی جائے اور ان کا وزن کیا جائے عام طور سے روایات اسی پر شاہد ہیں اور جمہور علماء نے اسی صورت کو اختیار کیا ہے۔ قرآن مجید میں وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وغیرہ آیات اور بہت سی روایات حدیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے

اعمال کا محاسبہ | ترمذی نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر بیٹھا اور بیان کیا یا رسول اللہ میرے دو غلام ہیں جو مجھے جھوٹا کہتے ہیں اور معاملات میں خیانت کرتے ہیں اور میرے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں میں ان کو زبان سے بھی برا بھلا کہتا ہوں اور ہاتھ سے مارتا بھی ہوں، تو میرا اور ان غلاموں کا انصاف کس طرح ہوگا؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کی نافرمانی اور خیانت اور سرکشی کو تولا جائے گا، پھر تمہارے سب وشتم اور مار پیٹ کو تولا جائیگا۔ اگر تمہاری سزا اور ان کا جرم برابر ہوئے تو معاملہ برابر ہوجائے گا۔ اور اگر تمہاری سزا ان کے جرم سے کم رہی تو وہ تمہارا احسان شمار ہوگا اور اگر ان کے جرم سے بڑھ گئی تو جتنی تم نے زیادتی کی ہے اسکا

تم سے انتقام اور قصاص لیا جاویگا۔ یہ شخص یہاں سے اٹھ کر الگ بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ، اس نے عرض کیا کہ اب تو میرے لئے اسکے سوا کوئی راہ نہیں کہ میں ان کو آزاد کر کے اس حساب کے غم سے بے فکر ہو جاؤں۔ (قرطبی)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾

اور ہم نے دی تھی موسیٰ اور ہارون کو فیصلے چکانے والی کتاب اور روشنی اور نصیحت ڈرنے والوں کو

الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے بن دیکھے اور وہ قیامت کا خطرہ رکھتے ہیں

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۭ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور یہ ایک نصیحت ہے برکت کی جو ہم نے اُتاری سو کیا تم اس کو نہیں مانتے

ع ۴

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (آپ کے قبل) موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو ایک فیصلہ کی اور روشنی کی اور متقیوں کے لئے نصیحت کی چیز (یعنی توریت) عطا فرمائی تھی جو (متقی) اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں اور (خدا ہی سے ڈرنے کے سبب) وہ لوگ قیامت سے (بھی) ڈرتے ہیں (کیونکہ قیامت میں اسکا خوف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور سزا نہ ہونے لگے) اور (جیسے اُن کو وہ کتاب ہم نے دی تھی اسی طرح) یہ (قرآن بھی) ایک کثیر الفائدہ نصیحت (کی کتاب) ہے جسکو ہم نے نازل کیا، سو کیا (بعد اسکے کہ تنزیل کتب کا عادۃ اللہ ہونا معلوم ہوگیا اور خود اسکا منزل من اللہ ہونا دلیل سے ثابت ہے) پھر بھی تم اسکے (منزل من اللہ ہونیکے) منکر ہو۔

معارف و مسائل

اَلْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ، یہ تینوں صفتیں تورات کی ہیں کہ فرقان یعنی حق و باطل میں امتیاز کرنے والی ہے اور قلوب کے لئے ضیاء و نور ہے اور لوگوں کے لئے ذکر و تذکیر اور ذریعۂ ہدایت ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ فرقان سے مراد اللہ تعالیٰ کی مدد ہے جو ہر موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کیساتھ رہی کہ فرعون کے گھر میں پرورش ہوئی اور پھر اُس سے مقابلے کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرعون کو ذلیل کیا پھر لشکر فرعون کے تعاقب کے وقت دریا میں راستے پیدا ہو کر اس سے نجات ملی اور لشکر فرعون غرق کیا گیا اسی طرح بعد کے ہر موقع پر اس مدد خداوندی کا مشاہدہ ہوتا رہا۔ اور ضیاء و ذکر دونوں تورات کی صفتیں ہیں قرطبی نے اسی کو ترجیح دی ہے کیونکہ الفرقان کے بعد واؤ کے ذریعہ فاصلہ کرنے سے اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ فرقان تورات کے علاوہ کوئی چیز ہے واللہ اعلم

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ اِذْ قَالَ

اور آگے دی تھی ہم نے ابراہیم کو اسکی نیک راہ اور ہم رکھتے ہیں اس کی خبر جب کہا اُس نے

لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾

اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو یہ کیسی مورتیں ہیں جن پر تم مجاور بنے بیٹھے ہو

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ

بولے ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو انہی کی پوجا کرتے بولا مقرر رہے تم

وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ

اور تمہارے باپ دادے صریح گمراہی میں بولے تو ہمارے پاس لایا ہے سچی بات یا تو

مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ

کھلاڑیاں کرتا ہے بولا نہیں رب تمہارا وہی ہے رب آسمان اور زمین کا جس نے

فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ

اُن کو بنایا اور میں اسی بات کا قائل ہوں اور قسم اللہ کی میں علاج کرونگا

اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا

تمہارے بتوں کا جب تم جا چکو گے پیٹھ پھیر کر پھر کر ڈالا اُن کو ٹکڑے ٹکڑے مگر

كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا

ایک بڑا اُن کا کہ شاید اس کی طرف رجوع کریں کہنے لگے کس نے کیا یہ کام ہمارے

بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ

معبودوں کے ساتھ وہ تو کوئی بے انصاف ہے وہ بولے ہم نے سنا ہے ایک جوان بتوں کو کچھ کہا کرتا ہے

لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓي اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

اسکو کہتے ہیں ابراہیم وہ بولے اسکو لے آؤ لوگوں کے سامنے شاید وہ دیکھیں

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ

بولے کیا تو نے کیا ہے یہ ہمارے معبودوں کے ساتھ اے ابراہیم بولا نہیں پر یہ کیا ہے اسکے

كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓي

اس بڑے نے سو ان سے پوچھ لو اگر وہ بولتے ہیں پھر سوچے اپنے

اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰي

جی میں پھر بولے لوگو تم ہی بے انصاف ہو پھر اوندھے ہو گئے

رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ

سر جھکا کر تو تو جانتا ہے جیسا یہ بولتے ہیں بولا کیا پھر تم پوجتے ہو

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَ

اللہ سے ورے ایسے کو جو تمہارا کچھ بھلا کرے نہ بُرا بیزار ہوں میں تم سے اور

لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ

جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے کیا تم کو سمجھ نہیں بولے اس کو جلاؤ

وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ

اور مدد کرو اپنے معبودوں کی اگر کچھ کرتے ہو ہم نے کہا اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور

سَلٰمًا عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿۷۰﴾

آرام ابراہیم پر اور چاہنے لگے اُسکا بُرا پھر اُنہی کو ڈالا ہم نے نقصان میں

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَوَهَبْنَا

اور بچا نکالا ہم نے اُسکو اور لوط کو اُس زمین کیطرف جسمیں برکت رکھی ہم نے جہان کے واسطے اور بخشا ہم نے

لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ

اس کو اسحٰق اور یعقوب دیا انعام میں اور سب کو نیک بخت کیا اور اُنکو کیا ہم نے

اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ

پیشوا راہ بتلاتے تھے ہمارے حکم سے اور کہلا بھیجا ہم نے اُن کو کرنا نیکیوں کا اور قائم رکھنی

الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾

نماز اور دینی زکوٰۃ اور وہ تھے ہماری بندگی میں لگے ہوئے

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے اس (زمانۂ موسوی) سے پہلے ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کی (شان کے مناسب) خوش فہمی عطا فرمائی تھی اور ہم اُن (کے کمالات علمیہ عملیہ) کو خوب جانتے تھے (یعنی وہ بڑے کامل تھے اُن کا وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ انھوں نے اپنے باپ سے اور اپنی برادری سے (اُن کو بت پرستی میں مشغول دیکھ کر) فرمایا کہ کیا (واہیات) مورتیں ہیں جن (کی عبادت) پر تم جمے بیٹھے ہو (یعنی یہ ہرگز قابل عبادت نہیں) وہ لوگ (جواب میں) کہنے لگے کہ ہم نے اپنے بڑوں کو ان کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا ہے، (اور وہ لوگ عاقل تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مورتیں لائق عبادت کے ہیں) ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ بیشک تم اور تمہارے باپ دادے (ان کو لائق عبادت سمجھنے میں) صریح غلطی میں (مبتلا) ہو۔ (یعنی خود ان ہی کے پاس ان کی معبودیت کی کوئی دلیل اور سند نہیں ہے وہ تو اس لئے ضلال میں ہیں اور تم ایسوں کی تقلید کرتے ہو جو بے دلیل بے ثبوت اوہام کے پیچھے چلنے والے ہیں اسلئے تم ضلال میں ہو

چونکہ اُن لوگوں نے ایسی بات سُنی نہ تھی نہایت متعجب ہوکر) وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا تم (اپنے نزدیک) سچی بات (سمجھ کر) ہمارے سامنے پیش کر رہے ہو یا (یوں ہی) دل لگی کر رہے ہو، ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ نہیں (دل لگی نہیں بلکہ سچی بات ہے اور صرف میرے ہی نزدیک نہیں بلکہ واقع میں بھی سچی بات یہی ہے کہ یہ عبادت کے قابل نہیں) بلکہ تمھارا رب (حقیقی جو لائق عبادت ہے) وہ ہے جو تمام آسمانوں کا اور زمین کا رب ہے جس نے (علاوہ تربیت کے) اُن سب (آسمانوں اور زمین اور اُن میں جو مخلوق ہے جس میں یہ اصنام بھی داخل ہیں سب) کو پیدا کیا اور میں اس (دعویٰ) پر دلیل بھی رکھتا ہوں (تمھاری طرح کورانہ تقلید سے کام نہیں کرتا) اور خدا کی قسم میں تمھارے ان بتوں کی گت بناؤں گا جب تم (ان کے پاس سے) چلے جاؤ گے (تاکہ ان کا عاجز اور درماندہ ہونا زیادہ مشاہدے میں آجاوے، اُن لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ اکیلے ہمارے مخالف کارروائی کیا کرسکتے ہیں کچھ التفات نہ کیا ہوگا اور چلے گئے) تو (اُن کے چلے جانے کے بعد) انھوں نے اُن بتوں کو (تبر وغیرہ سے توڑ پھوڑ کر) ٹکڑے ٹکڑے کر دیا بجز اُن کے ایک بڑے بُت کے (جو جثے میں یا اُن لوگوں کی نظر میں معظم ہونے میں بڑا تھا کہ اس کو چھوڑ دیا جس سے ایک قسم کا استہزاء مقصود تھا کہ ایک کے سالم اور دوسروں کے قطع و بُرید سے ایہام ہوتا ہے کہ کہیں اُسی نے تو سب کو نہیں توڑا، پس ابتداء تو ایہام ہے پھر جب وہ لوگ قطع و بُرید کرنے والے کی تحقیق کریں گے اور اُس بڑے بُت پر احتمال بھی نہ کریں گے تو ان کی طرف سے اُس کے عجز کا بھی اعتراف ہو جاویگا اور حجت اور لازم تر ہو جاوے گی۔ پس انتہاءً یہ الزام و افحام ہے یعنی لاجواب کرنا ہے اور مقصود مشترک اثباتِ عجز ہے، بعض کا انکار سے اور ایک کا اُن کے اقرار سے، غرض ایک کو اس مصلحت سے چھوڑ کر سب کو توڑ دیا) کہ شاید وہ لوگ ابراہیم کی طرف (دریافت کرنے کے طور پر) رجوع کریں (اور پھر وہ تقریر جواب سے مکرر پوری طرح احقاقِ حق کرسکیں غرض وہ لوگ جو بُت خانہ میں آئے تو بتوں کی بُری گت بنی دیکھی آپس میں) کہنے لگے کہ یہ (بے ادبی کا کام) ہمارے بتوں کے ساتھ کس نے کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس نے بڑا ہی غضب کیا (یہ بات ایسے لوگوں نے پوچھی جن کو اس قول کی اطلاع نہ تھی تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ الخ یا تو اس وجہ سے کہ وہ اس وقت موجود نہ ہوں گے کیونکہ اس مناظرہ کے وقت تمام قوم کا مجتمع ہونا ضروری نہیں اور یا موجود ہوں مگر سُنا نہ ہو اور بعضوں نے سُن لیا ہو، کذا فی الدر المنثور عن ابن مسعود نحوہ آمنہ) بعضوں نے کہا (جن کو اس قول کا علم تھا) کہ ہم نے ایک نوجوان آدمی کو جس کو ابراہیم کرکے پکارا جاتا ہے اُن بتوں کا (بُرائی کیساتھ) تذکرہ کرتے سُنا ہے (پھر) وہ (سب) لوگ (یا جنھوں نے اوّل استفسار کیا تھا) بولے کہ (جب یہ بات ہے) تو اچھا اس کو سب آدمیوں کے سامنے حاضر کرو تاکہ (شاید وہ اقرار کرلے اور) وہ لوگ (اسکے اقرار کے) گواہ ہو جائیں (پھر اتمام حجت کے بعد سزا دی جائے جس پر کوئی ملامت نہ کرسکے، غرض سب کے روبرو وہ آئے اور اُن سے) اُن لوگوں نے کہا کہ کیا ہمارے بتوں کیساتھ تم نے یہ حرکت کی ہے اے ابراہیم، اُنھوں نے (جواب میں) فرمایا کہ

(تم یہ احتمال کیوں نہیں فرض کرتے کہ یہ حرکت میں نے) نہیں کی، بلکہ اُن کے اُس بڑے (گرو) نے کی (اور
جب اس کبیر میں فاعل ہونے کا احتمال ہوسکتا ہے تو ان صغار میں ناطق ہونے کا احتمال بھی ہوگا) سو ان
(ہی) سے پوچھ لو (نا) اگر یہ بولتے ہوں (اور اگر بڑے بُت کا فاعل اس عمل کا ہونا اور دوسرے بُتوں
میں بولنے کی طاقت ہونا باطل ہے تو عجز ان کا تمہارے نزدیک مسلّم ہوگیا پھر اعتقاد الوہیت کی کیا وجہ)
اس پر وہ لوگ اپنے جی میں سوچے پھر (آپس میں) کہنے لگے کہ حقیقت میں تم ہی لوگ ناحق پر ہو اور ابراہیم
حق پر ہے کہ جو ایسا عاجز ہو وہ کیا معبود ہوگا) پھر (شرمندگی کے مارے) اپنے سروں کو جھکا لیا
(ابراہیم علیہ السلام سے نہایت مغلوبانہ لہجہ میں بولے کہ) اے ابراہیم تم کو تو معلوم ہی ہے کہ یہ بُت
(کچھ) بولتے نہیں (ہم اُن سے کیا پوچھیں اور اس سے فاعلیتِ کبیر کی نفی بدرجۂ اولیٰ ہوگئی اسوقت)
ابراہیم (علیہ السلام) نے (خوب خبر لی اور) فرمایا کہ (افسوس جب یہ ایسے ہیں) تو کیا خدا کو چھوڑ کر
تم ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو تم کو نہ کچھ نفع پہنچا سکے اور نہ (بالمباشرۃ) کچھ نقصان پہنچا سکے تف ہے
تم پر (کہ باوجود وضوحِ حق کے باطل پر مصر ہو) اور اُن پر (بھی) جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو کیا تم (اتنا
بھی) نہیں سمجھتے (اس تمام تقریر سے خصوص اس سے کہ توڑنے پھوڑنے سے انکار نہیں فرمایا باوجودیکہ احتمال
انتقام مقتضی انکار کو تھا ان کو ثابت ہوگیا کہ یہ کام اُن ہی کا ہے اور تقریر کا کچھ جواب بن نہ آیا تو
بمقتضائے اس قول کے کہ ؎

چو حجت نماند جفا جوئے را ٭ بہ پرخاش درہم کشد روئے را

یعنی جب جاہل جواب نہ رکھتا ہو اور قدرت رکھتا ہو تو برسر پیکار آجاتا ہے، آپس میں) وہ لوگ
کہنے لگے کہ ان (ابراہیم) کو آگ میں جلا دو اور اپنے معبودوں کا (اُن سے) بدلا لو اگر تم کو کچھ کرنا ہے
(تو یہ کام کرو ورنہ بالکل ہی بات ڈوب جاوے گی۔ غرض سب نے متفق ہو کر اسکا سامان کیا اور ان
کو آتشِ سوزاں میں ڈالدیا اُسوقت) ہم نے (آگ کو) حکم دیا کہ اے آگ تو ٹھنڈی اور بے گزند ہو جا،
ابراہیم کے حق میں (یعنی نہ ایسی گرم رہ جس سے جلنے کی نوبت آوے اور نہ بہت ٹھنڈی برف ہو جا کہ
اسکی ٹھنڈک سے تکلیف پہنچے بلکہ مثل ہوائے معتدل کے بن جا چنانچہ ایسا ہی ہوگیا) اور اُن لوگوں نے
اُن کے ساتھ بُرائی کرنا چاہا تھا (کہ ہلاک ہو جائیں گے) سو ہم نے اُن ہی لوگوں کو ناکام کردیا (کہ اُن کا
مقصود حاصل نہ ہوا بلکہ اور بالعکس حقانیت ابراہیم علیہ السلام کا زیادہ ثبوت ہوگیا) اور ہم نے
ابراہیم کو اور (اُن کے برادر زادہ کذا فی الدر المنثور عن ابن عباسؓ) لوط علیہ السلام کو (کہ انھوں نے برخلاف
قوم کے ابراہیم علیہ السلام کی تصدیق کی تھی قال تعالیٰ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ اور اسوجہ سے لوگ اُن کے بھی
مخالف اور درپے تھے) ایسے ملک (یعنی شام) کی طرف بھیجکر (کافروں کے شر و ایذا سے) بچالیا جسمیں
ہم نے دُنیا جہان والوں کے واسطے (خیر و) برکت رکھی ہے (دُنیوی بھی کہ ہر قسم کے عمدہ پھل پھول بکثرت

پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی اس سے منتفع ہوسکتے ہیں اور دینی بھی کہ بکثرت انبیاء علیہم السلام وہاں ہوئے جن کے شرائع کی برکت دُور دُور عالم میں پھیلی یعنی اُنھوں نے ملک شام کیطرف باذن الٰہی ہجرت فرمائی) اور (ہجرت کے بعد) ہم نے اُن کو اسحٰق (بیٹا) اور یعقوب پوتا عطا کیا اور ہم نے ان سب (باپ بیٹے پوتے) کو (اعلیٰ درجہ کا) نیک کیا (اعلیٰ درجہ کی نیکی کا مصداق عصمت ہے جو بشریت میں خواص نبوت سے ہے پس مُراد یہ ہے کہ اُن سب کو نبی بنایا) اور ہم نے اُن (سب) کو مقتدا بنایا (جوکہ لوازم نبوت سے ہے) کہ ہمارے حکم سے (خلق کو) ہدایت کیا کرتے تھے (جوکہ مناصب نبوت سے ہے) اور ہم نے اُن کے پاس نیک کاموں کے کرنے کا اور (خصوصاً) نماز کی پابندی کا اور زکوٰۃ ادا کرنیکا حکم بھیجا (یعنی یہ حکم بھیجا کہ ان کاموں کو کیا کرو) اور وہ (حضرات) ہماری (خوب) عبادت کیا کرتے تھے (یعنی ان کو جو حکم ہوا تھا اس کو اچھی طرح بجالاتے تھے پس صالحین میں کمال نبوت کی طرف اور اَوْحَیْنَآ اِلَیْھِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ میں کمال علم کی طرف اور کَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ میں کمال عمل کیطرف اور اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ میں دوسروں کی ہدایت و تربیت کی طرف اشارہ کافیہ ہے۔

معارف و مسائل

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ، الفاظ آیت سے ظاہر یہی ہے کہ یہ بات ابراہیم علیہ السلام نے اپنی برادری کے سامنے کہی تھی مگر اسپر شبہ یہ ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے اِنِّیْ سَقِیْمٌ (میں بیمار ہوں) کا عذر کر کے اُن کے ساتھ عید کے اجتماع میں جانے سے گریز کیا تھا اور جب بُتوں کو توڑنے کا واقعہ پیش آیا تو برادری اس تلاش میں پڑی کہ یہ کس نے کیا۔ اگر ابراہیم علیہ السلام کا یہ کلام پہلے ہی برادری کو معلوم تھا تو یہ سب باتیں کیسے ہوئیں اسکا جواب اوپر خلاصہ تفسیر میں یہ دیا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام اس خیال کے اکیلے آدمی تھے پوری برادری کے مقابلے میں اُن کی کوئی حیثیت نہ سمجھ کر ممکن ہے کہ ان کے کلام کی طرف التفات نہ کیا ہو اور بھول بھی گئے ہوں (بیان القرآن) اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تلاش و تحقیق کرنے والے دوسرے لوگ ہوں جن کو ابراہیم علیہ السلام کی اس گفتگو کا علم نہیں تھا اور مفسرین میں سے مجاہد اور قتادہ کا قول یہ ہے کہ یہ کلام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے برادری کے سامنے نہیں کہا بلکہ اپنے دل میں کہا یا برادری کے جانے کے بعد ایک دو ضعیف آدمی جو رہ گئے تھے اُن سے کہا پھر جب بُت شکنی کا واقعہ پیش آیا اور برادری کو ایسا کرنے والے کی تلاش ہوئی تو ان لوگوں نے مخبری کردی (قرطبی)

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا، جذاذ جذ بکسر الجیم کی جمع ہے جس کے معنی ٹکڑے کے ہیں مُراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے توڑ کر ان سب بُتوں کے ٹکڑے کر دیئے۔

اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ، یعنی صرف بڑے بُت کو بغیر توڑے ہوئے چھوڑ دیا، اسکا بڑا ہونا یا تو جسی

اعتبار سے ہو کہ اپنے جسم اور جثے کے اعتبار سے یہ دوسرے بتوں سے بڑا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جسم اور جثے میں سب کے برابر ہونیکے باوجود یہ بت ان بت پرستوں کے عقیدہ میں سب سے بڑا مانا جاتا ہو۔

لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ، اسمیں الیہ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ ضمیر ابراہیم علیہ السلام کی طرف راجع ہو جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں ایسا ہی بیان کیا گیا اور اسکے مناسب آیت کی یہ تشریح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد اس عمل سے خود ہی یہ تھا کہ یہ لوگ میری طرف رجوع کریں مجھ سے پوچھیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا تو میں اُن کو اُن کی بیوقوفی پر مطلع کردوں اور اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عمل اس اُمید پر کیا کہ شاید اپنے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے دیکھ کر اُن میں عقل آجائے کہ یہ پرستش کے قابل نہیں پھر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کیطرف رجوع ہو جاویں۔ اور کلبی نے فرمایا کہ اِلَيْهِ کی ضمیر کبیر کی طرف راجع ہے اور معنی یہ ہیں کہ جب یہ لوگ واپس آکر سارے بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے اور بڑے بت کو صحیح سالم اور اسکے مونڈھے پر کلہاڑا رکھا ہوا دیکھیں گے تو شاید اُس بڑے بت کی طرف رجوع ہوں اور اُس سے پوچھیں کہ ایسا کیوں ہوا وہ کوئی جواب نہ دیگا تو اسکا بھی عاجز ہونا اُن پر واضح ہو جاویگا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول جھوٹ نہیں بلکہ ایک کنایہ تھا اس کی تفصیل و تحقیق

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ یعنی جب ابراہیم علیہ السلام کو اُن کی برادری نے گرفتار کر کے بلایا اور ان سے اقرار لینے کے لئے سوال کیا کہ کیا آپ نے ہمارے بتوں کیساتھ یہ معاملہ کیا ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ بلکہ ان کے بڑے نے یہ کام کیا ہے تم خود ان سے دریافت کر لو اگر یہ بول سکتے ہوں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود کیا تھا پھر اس سے انکار اور اُن کے بڑے کی طرف منسوب کرنا بظاہر خلاف واقعہ ہے جس کو جھوٹ کہا جاتا ہے حضرت خلیل اللہ کی شان اس سے بالا و برتر ہے۔ اس کے جواب کے لئے حضرات مفسرین نے بہت سے احتمالات بیان فرمائے ہیں اُنہیں سے ایک وہ بھی ہے جسکو خلاصہ تفسیر بیان القرآن میں اختیار کیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول بطور فرض کے تھا یعنی تم یہ کیوں نہیں فرض کر لیتے کہ یہ کام بڑے بت نے کیا ہوگا اور بطور فرض کے کوئی خلاف واقعہ بات کہنا جھوٹ میں داخل نہیں جیسے خود قرآن میں ہے اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ یعنی اگر اللہ رحمٰن کے کوئی لڑکا ہوتا تو میں سب سے پہلے اُس کی عبادت کرنے والوں میں داخل ہوتا۔ لیکن بے غبار اور بے تاویل وہ توجیہ ہے جسکو بحر محیط۔ قرطبی۔ روح المعانی وغیرہ میں اختیار کیا ہے کہ اسناد مجازی ہے جو کام ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے کیا تھا اسکو بڑے بت کیطرف بطور اسناد مجازی کے منسوب کر دیا کیونکہ اس کام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آمادہ کرنیوالا یہی بت تھا اور اسکی تخصیص شاید اسوجہ سے ہو کہ اُن کی برادری اس بت کی تعظیم سب سے زیادہ کرتی تھی اسکی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی چور کی سزا میں اُس کا ہاتھ کاٹ دے اور پھر کہے کہ یہ میں نے نہیں کاٹا بلکہ تیرے عمل اور تیری کجروی نے ہاتھ کاٹا ہے

کیونکہ ہاتھ کاٹنے کا سبب اسکا عمل ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عملی طور پر بھی بتوں کے توڑنے کو بڑے بُت کی طرف منسوب کیا تھا جیسا کہ روایات میں ہے کہ جس تبر یا کلہاڑے سے اُن کے بُت توڑے تھے یہ کلہاڑا بڑے بُت کے مونڈھے پر یا اُس کے ہاتھ میں رکھدیا تھا کہ دیکھنے والے کو یہ خیال پیدا ہو کہ اُس نے ہی یہ کام کیا ہے اور قولاً بھی اسکی طرف منسوب فرمایا تو یہ ایک اسناد مجازی ہے جیسے عربی کا مشہور مقولہ انبت الربیع البقلۃ اس کی معروف مثال ہے (یعنی موسم ربیع کی بارش نے کھیتی اگائی ہے) کہ اگرچہ اُگانے والا در حقیقت حق تعالیٰ ہے مگر اسکے ایک ظاہری سبب کیطرف منسوب کر دیا گیا ہے اور اسکو کوئی جھوٹ نہیں کہہ سکتا اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بڑے بُت کی طرف اس فعل کو عملاً اور قولاً منسوب کر دینا جھوٹ ہرگز نہیں، البتہ بہت سی مصالح دینیہ کے لئے یہ توریہ اختیار فرمایا اونمیں ایک مصلحت تو یہی تھی کہ دیکھنے والوں کو اسطرف توجہ ہو جائے کہ شاید اس بڑے بُت کو اس پر غصہ آگیا ہو کہ میرے ساتھ عبادت میں ان چھوٹے بتوں کو کیوں شریک کیا جاتا ہے۔ اگر یہ خیال اُن کے دلوں میں پیدا ہو تو توحید حق کا راستہ کھل جاتا ہے کہ جب ایک بڑا بُت اپنے ساتھ چھوٹے بتوں کی شرکت گوارا نہیں کرتا تو رب العالمین اُن پتھروں کی شرکت اپنے ساتھ کیسے گوارا کرے۔

دوسرے یہ کہ ان کو یہ خیال اسوقت پیدا ہونا قرین عقل ہے کہ جن کو ہم خدا اور مختارِ کل کہتے ہیں اگر یہ ایسے ہی ہوتے تو کوئی اُن کے توڑنے پر کیسے قادر ہوتا۔ تیسرے یہ کہ اگر اس فعل کو وہ بڑے بُت کی طرف منسوب کر دیں تو جو بُت یہ کام کر سکے کہ دوسرے بتوں کو توڑ دے اسمیں گویائی کی طاقت بھی ہونی چاہیے اس لئے فرمایا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ، خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول مذکور کو بلا تاویل کے اپنے ظاہر پر رکھ کر یہ کہا جائے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس فعل کو بڑے بُت کی طرف منسوب فرمایا اور یہ اسناد مجازی کے طور پر فرمایا تو اس میں کوئی جھوٹ اور خلاف واقعہ کا شبہ نہیں رہتا صرف ایک قسم کا توریہ ہے۔

حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف تین جھوٹ منسوب کرنے کی حقیقت

ایک سوال اب یہ رہ جاتا ہے کہ صحیح احادیث میں خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ سلم نے فرمایا ہے ان ابراھیم علیہ السلام لم یکذب غیر ثلاث (رواہ البخاری ومسلم) یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی جھوٹ نہیں بولا بجز تین جگہوں کے پھر ان تینوں کی تفصیل اسی حدیث میں اس طرح بیان فرمائی کہ ان میں سے دو جھوٹ تو خالص اللہ کے لئے بولے گئے ایک یہی جو اس آیت میں بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ فرمایا ہے، دوسرا عید کے روز برادری سے یہ عذر کرنا کہ اِنِّىْ سَقِيْمٌ میں بیمار ہوں اور تیسرا (اپنی زوجہ کی حفاظت کے لئے بولا گیا) وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ کیساتھ سفر میں

تھے کہ ایک ایسی بستی پر گزر ہوا جہاں کا رئیس ظالم بدکار تھا جب کسی شخص کے ساتھ اسکی بیوی کو دیکھتا تو بیوی کو پکڑ لیتا اور اُس سے بدکاری کرتا۔ مگر یہ معاملہ اُس صورت میں نہ کرتا تھا جبکہ کوئی بیٹی اپنے باپ کے ساتھ یا بہن اپنے بھائی کیساتھ ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس بستی میں مع اہلیہ کے پہنچنے کی خبر اس ظالم بدکار کے سامنے کر دی گئی تو اُس نے حضرت سارہ کو گرفتار کر کے بلوالیا۔ پکڑنے والوں نے ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ عورت رشتہ میں تم سے کیا تعلق رکھتی ہے ابراہیم علیہ السلام نے ظالم کے خوف سے بچنے کے لئے یہ فرمادیا کہ یہ میری بہن ہے (یہی وہ چیز ہے جس کو حدیث میں تیسرے جھوٹ سے تعبیر کیا گیا ہے) مگر اسکے باوجود وہ پکڑ کر لے گئے اور ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ کو بھی بتلا دیا کہ میں نے تم کو اپنی بہن کہا ہے تم بھی اسکے خلاف نہ کہنا اور وجہ یہ ہے کہ اسلامی رشتہ سے تم میری بہن ہو کیونکہ اسوقت اس زمین میں ہم دو ہی مسلمان ہیں اور اسلامی اخوت کا تعلق رکھتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو مقابلے پر قدرت نہ تھی۔ اللہ کے سامنے الحاح وزاری کے لئے نماز پڑھنا شروع کر دیا حضرت سارہ جب اس کے پاس پہنچیں یہ ظالم بُری نیت سے ان کی طرف بڑھا تو قدرت نے اس کو اپاہج و معذور کر دیا اس پر اس نے حضرت سارہ سے درخواست کی کہ تم دُعا کر دو کہ میری یہ معذوری دُور ہو جاوے میں تمھیں کچھ نہ کہونگا۔ ان کی دُعا سے اللہ تعالیٰ نے پھر اسکو صحیح سالم کر دیا مگر اُسنے عہد شکنی کی اور پھر بُری نیت سے اُن پر ہاتھ ڈالنا چاہا پھر اللہ نے اُس کی ساتھ وہی معاملہ کیا اسی طرح تین مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا تو اسنے حضرت سارہ کو واپس کر دیا (یہ خلاصہ مضمون حدیث کا ہے) بہر حال اس حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کیطرف تین جھوٹ کی نسبت صراحۃً کی گئی ہے جو شانِ نبوت وعصمت کیخلاف ہے مگر اسکا جواب خود اسی حدیث کے اندر موجود ہے وہ یہ کہ درحقیقت انمیں سے ایک بھی حقیقی معنی جھوٹ نہ تھا یہ توریہ تھا جو ظلم سے بچنے کے لئے جائز و حلال ہوتا ہے وہ جھوٹ کے حکم میں نہیں ہوتا اسکی دلیل خود حدیث مذکور میں یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ سے کہا تھا کہ میں نے تمھیں اپنی بہن بتلایا ہے تم سے پوچھا جائے تو تم بھی مجھے بھائی بتلانا اور بہن کہنے کی وجہ بھی اُن کو بتلا دی کہ ہم دونوں اسلامی برادری کے اعتبار سے بہن بھائی ہیں اسی کا نام توریہ ہے کہ الفاظ ایسے بولے جائیں جن کے دو مفہوم ہوسکیں، سُننے والا اُس سے ایک مفہوم سمجھے اور بولنے والے کی نیت دوسرے مفہوم کی ہو اور ظلم سے بچنے کے لئے یہ تدبیر توریہ کی باتفاق فقہاء جائز ہے یہ شیعوں کے تقیہ سے بالکل مختلف چیز ہے۔ تقیہ میں صریح جھوٹ بولا جاتا ہے اور اُسپر عمل بھی کیا جاتا ہے توریہ میں صریح جھوٹ نہیں ہوتا بلکہ جس معنے سے متکلم بول رہا ہے وہ بالکل صحیح اور سچ ہوتے ہیں جیسے اسلامی برادری کے لحاظ سے بھائی بہن ہونا۔ یہ وجہ تو خود حدیث مذکور کے الفاظ میں صراحۃً مذکور ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ درحقیقت کذب نہ تھا بلکہ ایک توریہ تھا۔ ٹھیک اسی طرح کی توجیہ پہلے دونوں کلاموں میں ہوسکتی ہے بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ

کی توجیہ ابھی اوپر لکھی گئی ہے کہ اسمیں بطور اسناد مجازی اس فعل کو بڑے بُت کیطرف منسوب کیا ہے اسی طرح اِنِّىْ سَقِيْمٌ کا لفظ ہے کیونکہ سقیم کا لفظ جس طرح ظاہری طور پر بیمار کے معنے میں آتا ہے اسیطرح رنجیدہ غمگین اور مضمحل ہونے کے معنے میں بھی بولا جاتا ہے ابراہیم علیہ السلام نے اسی دوسرے معنے کے لحاظ سے اِنِّىْ سَقِيْمٌ فرمایا تھا مخاطبوں نے اس کو بیماری کے معنے میں سمجھا اور اسی حدیث میں جو یہ الفاظ آئے ہیں کہ ان تین کذبات میں دو اللہ کی ذات کے لئے تھے یہ خود قرینہ تو یہ اسکا ہے کہ یہ کوئی گناہ کا کام نہ تھا ورنہ گناہ کا کام اللہ کے لئے کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوسکتا اور گناہ کا کام نہ ہونا جبھی ہوسکتا ہے جبکہ وہ حقیقۃً کذب نہو بلکہ ایسا کلام ہو جسکے دو معنی ہوسکتے ہوں، ایک کذب اور دوسرا صحیح ہو۔

حدیث کذبات ابراہیم علیہ السلام کو غلط قرار دینا جہالت ہے

مرزا قادیانی اور کچھ دوسرے مستشرقین سے مغلوب مسلمانوں نے اس حدیث کو باوجود صحیح السند ہونے کے اسلئے غلط اور باطل کہدیا کہ اس سے حضرت خلیل اللہ کیطرف جھوٹ کی نسبت ہوتی ہے اور سند کے سارے راویوں کو جھوٹا کہدینا اس سے بہتر ہے کہ خلیل اللہ کو جھوٹا قرار دیا جائے کیونکہ وہ قرآن کے خلاف ہے اور پھر اس سے ایک کلیہ قاعدہ یہ نکال لیا کہ جو حدیث قرآن کیخلاف ہو خواہ وہ کتنی ہی قوی اور صحیح اور معتبر اسانید سے ثابت ہو وہ غلط قرار دیجائے یہ بات اپنی جگہ تو بالکل صحیح اور ساری اُمت کے نزدیک بطور فرض محال کے مسلّم ہے مگر علماء اُمت نے تمام ذخیرہ احادیث میں اپنی عمریں صرف کرکے ایک ایک حدیث کو چھان لیا ہے جس حدیث کا ثبوت قوی اور صحیح اسانید سے ہوگیا اُن میں ایک بھی ایسی نہیں ہوسکتی کہ جسکو قرآن کیخلاف کہا جاسکے بلکہ وہ اپنی کم فہمی یا کج فہمی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جس حدیث کو رَد اور باطل کرنا چاہا اسکو قرآن سے ٹکرا دیا اور یہ کہہ کر فارغ ہوگئے کہ یہ حدیث خلاف قرآن ہونے کے سبب غیر معتبر ہے جیسا کہ اسی حدیث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ الفاظ کذبات سے توریہ مُراد ہونا خود حدیث کے اندر موجود ہے رہا یہ معاملہ کہ پھر حدیث میں توریہ کو کذبات کے لفظ سے کیوں تعبیر کیا گیا تو اُس کی وجہ وہی ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی بھول اور لغزش کو عصیٰ اور غویٰ کے الفاظ سے تعبیر کرنے کی ابھی سورۂ طٰہٰ میں موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں گزر چکی ہے کہ مقربانِ بارگاہ حق تعالیٰ کے لئے ادنیٰ کمزوری اور محض رُخصت اور جائز پر عمل کرلینا اور عزیمت کو چھوڑ دینا بھی قابلِ مواخذہ سمجھا جاتا ہے اور ایسی چیزوں پر قرآن میں حق تعالیٰ کا عتاب انبیاء کے بارے میں بکثرت منقول ہے حدیث شفاعت جو مشہور و معروف ہے کہ محشر میں ساری مخلوق جمع ہوکر حساب جلد ہونیکے متعلق انبیاء سے شفاعت کے طالب ہونگے۔ آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم الانبیاء سے پہلے تک تمام انبیاء کے پاس پہنچیں گے ہر پیغمبر اپنے کسی قصور اور کوتاہی کا ذکر کرکے شفاعت کی ہمت نہ کریگا، آخر میں سب خاتم الانبیاء علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونگے اور آپ اس شفاعتِ کبریٰ کے لئے

کھڑے ہونگے۔ اس حدیث میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ ان کلمات کو جو بطور توریہ کے کہے گئے تھے حقیقۃً کذب نہ تھے مگر پیغمبرانہ عزیمت کیخلاف تھے اپنا قصور اور کوتاہی قرار دیکر عذر کر دیں گے۔ اسی کوتاہی کیطرف اشارہ کرنے کے لئے حدیث میں ان کو بلفظ کذبات تعبیر کر دیا گیا جسکا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حق تھا اور آپ کی حدیث روایت کرنے اور بیان کرنے کی حد تک ہمیں بھی حق ہے مگر اپنی طرف سے کوئی حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں یوں کہے کہ انھوں نے جھوٹ بولا یہ جائز نہیں جیساکہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ کے ساتھ سُورہ طٰہٰ کی تفسیر میں قرطبی اور بحر محیط کے حوالہ سے بیان ہو چکا ہے کہ قرآن یا حدیث میں جو اسطرح کے الفاظ کسی پیغمبر کے بارے میں آئے ہیں اُن کا ذکر بطور تلاوتِ قرآن یا تعلیم قرآن یا روایتِ حدیث کے تو کیا جا سکتا ہے خود اپنی طرف سے اُن الفاظ کا کسی پیغمبر کیطرف منسوب کرنا بے ادبی ہے جو کسی کے لئے جائز نہیں۔

حدیثِ مذکور میں ایک اہم ہدایت اور اخلاصِ عمل کی باریکی کا بیان

حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جن کذباتِ ثلٰثہ کا ذکر آیا ہے حدیث میں ان میں سے پہلے دو کے بارے میں تو یہ آیا کہ اللہ کے لئے تھے، مگر تیسری بات جو حضرت سارہ کے بارے میں کہی گئی اُس کو اللہ کے لئے نہیں فرمایا حالانکہ بیوی کی آبرو کی حفاظت بھی عین دین ہے اس پر تفسیر قرطبی میں قاضی ابوبکر بن عربی سے ایک بڑا نکتہ نقل کیا ہے جس کے متعلق ابن عربی نے فرمایا کہ یہ صلحاء و اولیاء کی کمر توڑ دینے والی بات ہے وہ یہ کہ تیسری بات بھی اگرچہ کام دین ہی کا تھا مگر اسمیں کچھ اپنا حظِ نفس بیوی کی عصمت اور حرم کی حفاظت کا بھی تھا، اتنی سی غرض دُنیوی شامل ہو جانے کی بنا پر اس کو فِی اللّٰہِ اور لِلّٰہِ کی فہرست سے الگ کر دیا گیا کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ۔ یہ معاملہ بیوی کی عصمت کی حفاظت کا اگر ہماری یا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو بلاشبہ اسکو بھی للہ فی اللہ ہی میں شمار کیا جاتا مگر انبیاء علیہم السلام کی عظمتِ شان کا مقام سب سے بلند ہے اُن کے لئے اتنا سا حظِ نفس شامل ہونا بھی اخلاص کامل کے منافی سمجھا گیا۔ واللہ اعلم وفقنا اللہ للاخلاص فی کل عمل۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نارِ نمرود کے گلزار بن جانے کی حقیقت

جو لوگ معجزات اور خوارق عادات کے منکر ہیں اُنھوں نے تو اس میں عجیب و غریب تحریفات کی ہیں۔ بات یہ ہے کہ فلسفہ کا یہ ضابطہ کہ جو چیز کسی چیز کے لئے لازم ذات ہو وہ اُس سے کسی وقت جُدا نہیں ہو سکتی خود ایک باطل اور بے دلیل ضابطہ ہے حقیقت یہ ہے کہ اس دُنیا میں اور تمام مخلوقات میں کوئی چیز کسی کے لازم ذات نہیں بلکہ صرف عادۃ اللہ یہ جاری ہے کہ آگ کے لئے حرارت اور جلانا لازم ہے، پانی کے لئے ٹھنڈا کرنا اور بجھانا لازم ہے۔ مگر یہ لازم صرف عادی ہے عقلی نہیں کیونکہ فلاسفہ بھی اسکے عقلی ہونے کی کوئی معقول دلیل نہیں پیش کر سکے اور جب یہ لازم عادی ہوا تو جب اللہ تعالیٰ کسی خاص حکمت سے

کسی عادت کو بدلنا چاہتے ہیں بدل دیتے ہیں اُسکے بدلنے میں کوئی عقلی محال لازم نہیں آتا جب اللہ تعالیٰ چاہے تو آگ بجھانے اور ٹھنڈا کرنے کا کام کرنے لگتی ہے اور پانی جلانیکا حالانکہ آگ اپنی حقیقت میں آگ ہی ہوتی ہے اور پانی بھی پانی ہی ہوتا ہے مگر کسی خاص فرد یا جماعت کے حق میں بحکم خداوندی وہ اپنی خاصیت چھوڑ دیتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی نبوت کے ثبوت میں جو معجزات حق تعالیٰ ظاہر فرماتے ہیں اُن سب کا حاصل یہی ہوتا ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو حکم دیدیا کہ ٹھنڈی ہو جا وہ ٹھنڈی ہوگئی اور اگر برداً کے ساتھ وَسَلٰماً کا لفظ نہ ہوتا تو آگ برف کی طرح ٹھنڈی ہو کر سبب ایذا بن جاتی۔ اور قوم نوحؑ جیانی میں ڈوبی تھی اُن کے بارے میں قرآن نے فرمایا اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا، یعنی یہ لوگ پانی میں غرق ہو کر آگ میں داخل ہوگئے۔ حَرِّقُوْهُ، یعنی پوری برادری اور نمرود نے یہ فیصلہ کرلیا کہ ان کو آگ میں جلا دیا جائے۔ تاریخی روایات میں ہے کہ ایک مہینہ تک سارے شہر کے لوگ اس کام کے لئے لکڑی وغیرہ سوختہ کا سامان جمع کرتے رہے پھر اسمیں آگ لگا کر سات دن تک اسکو دھونکتے اور بھڑکاتے رہے یہاں تک کہ اُسکے شعلے فضائی آسمان میں اتنے اونچے ہوگئے کہ اگر کوئی پرندہ اُسپر گزرے تو جل جائے۔ اسوقت ارادہ کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو اسمیں ڈالا جائے تو فکر ہوئی کہ ڈالیں کیسے اُسکے پاس تک جانا کسی کے بس میں نہیں تھا شیطان نے ان کو منجنیق (گوپیا) میں رکھ کر پھینکنے کی ترکیب بتلائی۔ جسوقت اللہ کے خلیل منجنیق کے ذریعہ اس آگ کے سمندر میں پھینکے جا رہے تھے تو سب فرشتے بلکہ زمین و آسمان اور اُن کی مخلوقات سب چیخ اُٹھے کہ یا رب آپکے خلیل پر کیا گزر رہی ہے حق تعالیٰ نے ان سب کو ابراہیمؑ کی مدد کرنے کی اجازت دیدی۔ فرشتوں نے مدد کرنے کے لئے حضرت ابراہیمؑ سے دریافت کیا تو ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کافی ہے وہ میرا حال دیکھ رہا ہے۔ جبرئیل امین نے عرض کیا کہ آپ کو میری کسی مدد کی ضرورت ہے تو میں خدمت انجام دوں، جوابدیا کہ حاجت تو ہے مگر آپ کیطرف نہیں بلکہ اپنے رب کیطرف۔ (مظہری)

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ، اُوپر گزر چکا ہے کہ آگ کے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بردو سلام ہونے کی یہ صورت بھی ممکن ہے کہ آگ آگ ہی نہ رہی ہو بلکہ ہوا میں تبدیل ہوگئی ہو مگر ظاہر یہ ہے کہ آگ اپنی حقیقت میں آگ ہی رہی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آس پاس کے علاوہ دوسری چیزوں کو جلاتی رہی بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جن رسیوں میں باندھکر آگ میں ڈالا گیا تھا اُن رسیوں کو بھی آگ ہی نے جلا کر ختم کیا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بدن مبارک تک کوئی آنچ نہیں آئی (کما فی بعض الروایات)

تاریخی روایات میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس آگ میں سات روز رہے اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے عمر میں کبھی ایسی راحت نہیں ملی جتنی ان سات دنوں میں حاصل تھی (مظہری)

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ، یعنی حضرت ابراہیم اور انکے ساتھ لوط علیہما السلام کو ہم نے اس زمین سے جس پر نمرود کا غلبہ تھا (یعنی عراق کی زمین) نجات دیکر ایک ایسی زمین میں پہنچا دیا جسمیں ہم نے تمام جہان والوں کے لئے برکت رکھی ہے مراد اس سے ملک شام کی زمین ہے کہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی حیثیت سے بڑی برکتوں کا مجموعہ ہے باطنی برکت تو یہ ہے کہ یہ زمین مخزن انبیاء ہے بیشتر انبیاء علیہم السلام اسی زمین میں پیدا ہوئے اور ظاہری برکات آب و ہوا کا اعتدال، نہروں اور چشموں کی فراوانی پھل پھول اور ہر طرح کی نباتات کا غیر معمولی نشو و نما وغیرہ ہے جس کے فوائد صرف اس زمین کے رہنے والوں کو نہیں بلکہ عام دنیا کے لوگوں تک پہنچتے ہیں۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً، یعنی ہم نے عطا کر دیا اس کو بیٹا اسحٰق (اُن کی دعا و درخواست کے مطابق) اور اُس پر زیادہ دیدیا پوتا یعقوب علیہ السلام یعنی دعا تو صرف بیٹے کے لئے تھی اللہ نے اپنے فضل سے بیٹا بھی دیا پھر اس سے پوتا بھی اپنی طرف سے زائد عطا فرما دیا اسی لئے اسکو نافلہ کہا گیا ہے

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ	
اور لوط کو دیا ہم نے حکم اور سمجھ اور بچا نکالا اس کو اس بستی سے جو کرتے تھے	
تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿۷۴﴾ وَاَدْخَلْنٰهُ	
گندے کام وہ تھے لوگ بڑے نافرمان اور اس کو لے لیا ہم	
فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾	۵ ع ۵
نے اپنی رحمت میں، وہ ہے نیک بختوں میں	

خلاصۂ تفسیر

اور لوط (علیہ السلام) کو ہم نے حکمت اور علم (مناسب شان انبیاء) عطا فرمایا اور ہم نے ان کو اس بستی سے نجات دی جس کے رہنے والے گندے گندے کام کیا کرتے تھے (جن میں سب سے بدتر لواطت تھی اور بھی بہت سے بیہودہ اور بُرے افعال کے یہ لوگ عادی تھے۔ شراب خوری، گانا بجانا، داڑھی کٹانا، مونچھیں بڑھانا، کبوتر بازی، ڈھیلے پھینکنا، سیٹی بجانا، ریشمی لباس پہننا، اخرجہ اسحٰق بن بشر والخطیب وابن عساکر عن الحسن موقوفاً کذا فی الدر) بلاشبہ وہ لوگ بڑے بدذات بدکار تھے اور ہم نے لوط کو اپنی رحمت میں (یعنی جن بندوں پر رحمت ہوتی ہے ان میں) داخل کیا (کیونکہ) بلاشبہ وہ بڑے (درجہ کے) نیکوں میں سے تھے (بڑے درجہ کے نیک سے مراد معصوم ہے جو نبی کی خصوصیت ہے)۔

معارف و مسائل

حضرت لوط علیہ السلام کو جس بستی سے نجات دینے کا ذکر ان آیات میں آیا ہے اُس بستی کا نام سدوم تھا اسکے تابع سات بستیاں اور تھیں جن کو جبرئیل نے اُلٹ کر تہ و بالا کر ڈالا تھا صرف ایک بستی باقی چھوڑ دی تھی جس میں لوط علیہ السلام مع اپنے متعلقین مومنین کے رہ سکیں (قالہ ابن عباس۔ قرطبی)

تَعۡمَلُ الۡخَبٰٓئِثَ ، خبائث خبیثہ کی جمع ہے۔ بہت سی خبیث اور گندی عادتوں کو خبائث کہا جاتا ہے۔ یہاں ان کی سب سے بڑی خبیث اور گندی عادت جس سے جنگلی جانور بھی پرہیز کرتے ہیں لواطت تھی، یعنی مرد کا مرد کے ساتھ شہوت پوری کرنا۔ یہاں اسی ایک عادت کو اسکے بڑے جرم ہونے کے سبب خبائث کہدیا گیا ہو تو یہ بھی بعید نہیں جیسا کہ بعض مفسرین نے فرمایا ہے اور اس کے علاوہ دوسری خبیث عادتیں اُن میں ہونا بھی روایات میں مذکور ہے جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں بحوالہ روح المعانی گزر چکا ہے اس لحاظ سے مجموعہ کو خبائث کہنا تو ظاہر ہی ہے واللہ اعلم

وَنُوۡحًا اِذۡ نَادٰی مِنۡ قَبۡلُ فَاسۡتَجَبۡنَا لَہٗ فَنَجَّیۡنٰہُ وَ اَہۡلَہٗ مِنَ

اور نوح کو جب اس نے پکارا اس سے پہلے پھر قبول کر لی ہم نے اسکی دعا سو بچا دیا اسکو اور اسکے گھر والوں کو

الۡکَرۡبِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۷۶﴾ وَ نَصَرۡنٰہُ مِنَ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ؕ

بڑی گھبراہٹ سے اور مدد کی اُس کی ان لوگوں پر جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتیں

اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَوۡمَ سَوۡءٍ فَاَغۡرَقۡنٰہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۷۷﴾

وہ تھے بُرے لوگ پھر ڈبا دیا ہم نے ان سب کو

خلاصۂ تفسیر

اور نوح (علیہ السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے جبکہ اُس (زمانۂ ابراہیمی) سے پہلے اُنھوں نے (اللہ تعالیٰ سے) دعا کی (کہ ان کافروں سے میرا بدلہ لے لیجئے) سو ہم نے اُن کی دعا قبول کی اور اُن کو اور اُن کے متبعین کو بڑے بھاری غم سے نجات دی (یہ غم کفار کی تکذیب اور اُسکے ساتھ طرح طرح کی ایذائیں پہنچانے سے پیش آتا تھا) اور (نجات اس طرح دی کہ) ہم نے ایسے لوگوں سے ان کا بدلہ لیا جنھوں نے ہمارے حکموں کو (جو کہ حضرت نوح علیہ السلام لائے تھے) جھوٹا بتلایا تھا بلاشبہ وہ لوگ بہت بُرے تھے اسلئے ہم نے اُن سب کو غرق کر دیا۔

معارف و مسائل

وَنُوۡحًا اِذۡ نَادٰی مِنۡ قَبۡلُ ، من قبل سے مراد ابراہیم و لوط علیہما السلام سے پہلے ہونا ہے

جن کا ذکر اوپر کی آیات میں آیا ہے اور نوح علیہ السلام کی جس ندا کا ذکر اس جگہ مجملاً آیا ہے اسکا بیان سورۂ نوح میں یہ ہے کہ نوح علیہ السلام نے قوم کے لئے بددعا کی رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ، یعنی اے پروردگار ردئے زمین پر کافروں میں کسی بسنے والے کو نہ چھوڑ اور ایک جگہ یہ ہے کہ جب نوح علیہ السلام کی قوم نے کسی طرح اُن کا کہنا نہ مانا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا، اِنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ، یعنی میں مغلوب اور عاجز ہو چکا ہوں آپ ہی ان لوگوں سے انتقام لے لیجئے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ، کرب عظیم سے مراد یا تو طوفان میں غرق ہونا ہے جس میں پوری قوم مبتلا ہوئی، یا اس قوم کی ایذائیں مراد ہیں جو وہ طوفان سے پہلے حضرت نوح اور ان کے خاندان کو پہنچاتے تھے۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ

اور داؤد اور سلیمان کو جب لگے فیصل کرنے کھیتی کا جھگڑا جب روند گئیں اس کو رات میں ایک قوم کی بکریاں

وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ

اور سامنے تھا ہمارے ان کا فیصلہ پھر سمجھا دیا ہم نے وہ فیصلہ سلیمان کو اور دونوں کو دیا تھا ہم نے حکم اور

عِلْمًا ۫ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾

سمجھ اور تابع کئے ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑ، تسبیح پڑھا کرتے اور اڑتے جانور اور یہ سب کچھ ہم نے کیا

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ

اور اسکو سکھلایا ہم نے بنانا ایک تمہارا لباس کہ بچاؤ ہو تم کو تمہاری لڑائی میں سو کچھ تم شکر

شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ

کرتے ہو اور سلیمان کے تابع کی ہوا زور سے چلنے والی کہ چلتی اسکے حکم سے اس زمین کی طرف

الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ

جہاں برکت دی ہے ہم نے اور ہم کو سب چیز کی خبر ہے اور تابع کئے کتنے شیطان جو

يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾

غوطہ لگاتے اسکے واسطے اور بہت سے کام بناتے اسکے سوائے اور ہم نے ان کو تھام رکھا تھا

خلاصۂ تفسیر

اور داؤد اور سلیمان (علیہما السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے جبکہ دونوں (حضرات) کسی کھیت کے بارہ میں (جس میں غلہ تھا یا انگور کے درخت تھے کذا فی الدر المنثور) فیصلہ کرنے لگے جبکہ اس کھیت میں کچھ لوگوں

کی بکریاں رات کے وقت جا پڑیں (اور اُسکو چر گئیں) اور ہم اس فیصلہ کو جو (مقدمہ والے) لوگوں کے متعلق ہوا تھا دیکھ رہے تھے سو ہم نے اس فیصلہ (کی آسان صورت) کی سمجھ سلیمان کو دیدی۔ اور (یوں) ہم نے دونوں (ہی) کو حکمت اور علم عطا فرمایا تھا (یعنی داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی خلاف شرع نہ تھا صورت مقدمہ کی یہ تھی کہ جسقدر کھیت کا نقصان ہوا تھا اس کی لاگت بکریوں کی قیمت کے برابر تھی۔ داؤد علیہ السلام نے ضمان میں کھیت والے کو وہ بکریاں دلوادیں اور اصل قانون شرعی کا بھی مقتضا تھا جس میں مدعی یا مدعا علیہ کی رضا کی شرط نہیں مگر چونکہ اسمیں بکری والوں کا بالکل ہی نقصان ہوتا تھا اس لئے سلیمان علیہ السلام نے بطور مصالحت کے جو کہ موقوف تھی جانبین کی رضامندی پر یہ صورت جسمیں دونوں کی سہولت اور رعایت تھی تجویز فرمائی کہ چند روز کے لئے بکریاں تو کھیت والے کو دی جاویں کہ انکے دودھ وغیرہ سے اپنا گزر کرے اور بکری والوں کو وہ کھیت سپرد کیا جاوے کہ اس کی خدمت آبپاشی وغیرہ سے کریں جب کھیت پہلی حالت پر آجاوے کھیت اور بکریاں اپنے اپنے مالکوں کو دیدی جاویں۔ کذا فی الدر المنثور عن مرۃ وابن مسعود ومسروق وابن عباس و مجاہد وقتادہ والزہری۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ دونوں فیصلوں میں کوئی تعارض نہیں کہ ایک کی صحت دوسرے کی عدم صحت کو مقتضی ہو اسلئے كُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا بڑھا دیا گیا) اور (یہاں تک تو کرامت عامہ کا ذکر تھا جو دونوں حضرات میں مشترک تھی آگے دونوں حضرات کی خاص خاص کرامتوں کا بیان ہے) ہم نے داؤد (علیہ السلام) کے ساتھ تابع کر دیا تھا پہاڑوں کو کہ (ان کی تسبیح کے ساتھ) وہ (بھی) تسبیح کیا کرتے تھے اور (اسی طرح) پرندوں کو بھی (جیسا سورہ سبا میں ہے يَا جِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ وَالطَّيْرَ) اور (کوئی اس بات پر تعجب نہ کرے کیونکہ ان کاموں کے) کرنے والے ہم تھے (اور ہماری قدرت کا عظیم ہونا ظاہر ہے پھر ان معجزات میں تعجب ہی کیا ہے) اور ہم نے ان کو زرہ (بنانے) کی صنعت تم لوگوں کے (نفع کے) واسطے سکھلائی (یعنی) تاکہ وہ (زرہ) تم کو (لڑائی میں) ایک دوسرے کی زد سے بچائے (اور اس نفع عظیم کا مقتضا یہ ہے کہ تم شکر کرو) سو تم (اس نعمت کا) شکر کرو گے بھی (یا نہیں) اور ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کا تیز ہوا کو تابع بنا دیا تھا کہ وہ ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف کو چلتی جس میں ہم نے برکت کر رکھی ہے (مراد ملک شام ہے جو ان کا مسکن تھا کذا فی الدر عن السدی ویدل علیہ عمارۃ بیت المقدس یعنی جب ملک شام سے کہیں چلے جاتے اور پھر آتے تو یہ آنا اور اسی طرح جانا بھی ہوا کے ذریعہ سے ہوتا تھا جیسا درمنثور میں بروایت وتصحیح حاکم حضرت ابن عباس رض سے اسکی کیفیت مروی ہے کہ سلیمان علیہ السلام مع اعیان ملک کے کرسیوں پر بیٹھ جاتے پھر ہوا کو بلا کر حکم دیتے وہ سب کو اُٹھا کر تھوڑی دیر میں ایک ایک ماہ کی مسافت قطع کرتی) اور ہم ہر چیز کو جانتے ہیں (ہمارے علم میں سلیمان کو یہ چیزیں دینے میں حکمت تھی اس لئے عطا فرمائی) اور بعضے بعضے شیطان (یعنی

جن) ایسے تھے کہ سلیمان (علیہ السلام) کے لئے (دریاؤں میں) غوطے لگاتے تھے (تاکہ موتی نکال کر اُنکے پاس لادیں) اور وہ اور کام بھی اس کے علاوہ (سلیمان کے لئے) کیا کرتے تھے اور (گو وہ جن بڑے سرکش اور شریر تھے مگر) ان کے سنبھالنے والے ہم تھے (اس لئے وہ چون نہیں کر سکتے تھے)

معارف و مسائل

نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ، لفظ نفش کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے یہ ہیں کہ رات کے وقت کوئی جانور کسی کے کھیت پر جا پڑے اور نقصان پہنچائے۔

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ، فھمنٰھا کی ضمیر بظاہر مقدمہ اور اس کے فیصلہ کی طرف راجع ہے اور معنی یہ ہیں کہ جو فیصلہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ تھا اللہ تعالیٰ نے وہ حضرت سلیمانؑ کو سمجھا دیا۔ اس مقدمہ اور فیصلہ کی صورت اوپر خلاصہ تفسیر میں آچکی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی از روئے قانونِ شرعی غلط نہیں تھا مگر جو فیصلہ اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو سمجھایا اسمیں فریقین کی رعایت اور مصلحت تھی اسلئے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ پسندیدہ قرار دیا گیا۔ امام بغوی نے حضرت ابن عباسؓ اور قتادہ اور زہری سے اس واقعہ کی روایت اسطرح کی ہے کہ دو شخص حضرت داؤد علیہ السلام کیخدمت میں حاضر ہوئے انمیں ایک شخص بکریوں والا دوسرا کھیتی والا تھا کھیتی والے نے بکریوں والے پر یہ دعویٰ کیا کہ اسکی بکریاں رات کو چھوٹ کر میرے کھیت میں گھس گئیں اور کھیت کو بالکل صاف کر دیا کچھ نہیں چھوڑا (غالباً مدعا علیہ نے اسکا اقرار کر لیا ہوگا اور بکریوں کی پوری قیمت اسکے ضائع شدہ کھیت کی قیمت کے برابر ہوگی اسلئے) حضرت داؤدؑ نے یہ فیصلہ سنادیا کہ بکریوں والا اپنی ساری بکریاں کھیت والے کو دیدے۔ (کیونکہ جو چیزیں قیمت ہی کے ذریعہ لی اور دیجاتی ہیں جنکو عرف فقہاء میں ذوات القیم کہا جاتا ہے وہ اگر کسی نے ضائع کر دی تو اسکا ضمان قیمت ہی کے حساب سے دیا جاتا ہے بکریوں کی قیمت چونکہ ضائع شدہ کھیتی کی قیمت کے مساوی تھی اسلئے یہ ضابطہ کا فیصلہ فرمایا گیا) یہ دونوں مدعی اور مدعا علیہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عدالت سے واپس ہوئے تو (دروازے پر اُن کے صاحبزادے) حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اُنھوں نے دریافت کیا کہ تمھارے مقدمہ کا کیا فیصلہ ہوا؟ ان لوگوں نے بیان کر دیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر اس مقدمہ کا فیصلہ میں کرتا تو اسکے علاوہ کچھ اور ہوتا جو فریقین کے لئے مفید اور نافع ہوتا۔ پھر خود والد ماجد حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر یہی بات عرض کی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے تاکید کے ساتھ دریافت کیا کہ وہ کیا فیصلہ ہے جو دونوں کے لئے اس فیصلہ سے بہتر ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ بکریاں تو سب کھیت والے کو دیدیں کہ وہ اُن کے دودھ اور اُون وغیرہ سے فائدہ اُٹھاتا رہے اور کھیت کی زمین بکریوں والے کے سپرد کر دیں کہ وہ اسمیں کاشت کر کے کھیت اُگائے۔ جب

یہ کھیت اُس حالت پر آجائے جس پر بکریوں نے کھایا تھا تو کھیت کھیت والے کو دلوا دیں اور بکریاں بکری والے کو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس فیصلے کو پسند فرما کر کہا کہ بس اب فیصلہ یہی رہنا چاہیئے اور فریقین کو بُلا کر دوسرا فیصلہ نافذ کر دیا (مظہری و قرطبی وغیرہ)

کیا فیصلہ دینے کے بعد کسی قاضی کا فیصلہ توڑا اور بدلا جا سکتا ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جب ایک فیصلہ دے چکے تھے تو سلیمان علیہ السلام کو اُس کے توڑنے کا کیا حق تھا؟ اور اگر خود حضرت داؤد ہی نے اُن کا فیصلہ سُن کر اپنے سابق فیصلے کو توڑا اور دوسرا جاری کیا تو کیا قاضی کو اسکا اختیار ہے کہ ایک فیصلہ دیدینے کے بعد اس کو توڑ دے اور فیصلہ بدلدے۔

قرطبی نے اس جگہ اس طرح کے مسائل پر بڑی تفصیل سے بحث فرمائی ہے خلاصہ اُسکا یہ ہے کہ اگر کسی قاضی نے نصوصِ شرعیہ اور جمہور اُمت کے خلاف کوئی غلط فیصلہ محض اٹکل سے دیدیا ہے تو وہ فیصلہ باتفاقِ اُمت مردود و باطل ہے دوسرے قاضی کو اسکے خلاف فیصلہ دینا نہ صرف جائز بلکہ واجب اور اس قاضی کا معزول کرنا واجب ہے لیکن اگر ایک قاضی کا فیصلہ شرعی اجتہاد پر مبنی اور اصولِ اجتہاد کے ماتحت تھا تو کسی دوسرے قاضی کو اس فیصلہ کا توڑنا جائز نہیں کیونکہ اگر ایسا کیا جائیگا تو فسادِ عظیم ہوگا اور اسلامی قانون ایک کھیل بن جائے گا اور روز حلال و حرام بدلا کرینگے، البتہ اگر خود اسی فیصلہ دینے والے قاضی کو بعد اسکے کہ اصولِ اجتہاد کے تحت وہ ایک فیصلہ نافذ کر چکا ہے اب از روئے اجتہاد یہ نظر آئے کہ پہلے فیصلے اور پہلے اجتہاد میں غلطی ہوگئی ہے تو اسکا بدلنا جائز بلکہ بہتر ہے۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے جو ایک مفصّل خط حضرت ابو موسیٰ اشعری کے نام قضاء اور فصل مقدمات کے اصول پر مشتمل لکھا تھا اُسمیں اس کی تصریح ہے کہ فیصلہ دینے کے بعد اجتہاد بدل جائے تو پہلے فیصلہ کو بدل دینا چاہیئے۔ یہ خط دارقطنی نے سند کیساتھ نقل کیا ہے۔ (قرطبی ملخصًا) اور شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط باب القضاء میں بھی یہ خط مفصّل دیا ہے۔

اور امام تفسیر مجاہد کا قول یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام دونوں کے فیصلے اپنی اپنی جگہ ہیں اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام نے جو فیصلہ فرمایا تھا وہ ضابطہ کا فیصلہ تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو فرمایا وہ درحقیقت مقدمہ کا فیصلہ نہیں، بلکہ فریقین میں صلح کرانے کا ایک طریقہ تھا اور قرآن میں وَالصُّلْحُ خَيْرٌ کا ارشاد وارد ہے اس لئے یہ دوسری صورت اللہ کے نزدیک پسندیدہ ٹھہری (مظہری)

حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے قاضیوں کو یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ جب آپکے پاس دو فریق کا مقدمہ آئے تو پہلے ان دونوں میں رضامندی کے ساتھ کسی بات پر صلح کرانے کی کوشش کریں اگر یہ ناممکن ہوجائے تو اپنا شرعی فیصلہ جاری کریں اور حکمت اس کی یہ ارشاد فرمائی کہ حاکمانہ عدالتی

۱۴

فیصلے سے وہ شخص جس کے خلاف ہوا ہو دب تو جاتا ہے مگران دونوں میں بغض و عداوت کا بیج قائم ہوجاتا ہے جو دو مسلمانوں میں نہیں ہونا چاہئے بخلاف مصالحت کی صورت کے کہ اس سے دلوں کی منافرت بھی دُور ہوجاتی ہے (از معین الحکام)

مجاہد کے اس قول پر یہ معاملہ قاضی کے فیصلہ کو توڑنے اور بدلنے کا نہیں رہا بلکہ فریقین کو جو حکم سُنایا تھا وہ ابھی گئے بھی نہ تھے کہ انہیں ایک صورت مصالحت کی نکل آئی اور وہ دونوں اسپر راضی ہوگئے۔

دو مجتہد اگر اپنے اپنے اجتہاد سے دو متضاد فیصلے کریں تو کیا اُن میں سے ہر ایک صواب اور درست ہے یا کسی ایک کو غلط کہا جائے۔ اس موقع پر قرطبی نے بڑی تفصیل سے اور دوسرے مفسرین نے مفصّل یا مختصر یہ بحث بھی کی ہے کہ ہر مجتہد ہمیشہ مصیب ہی ہوتا ہے اور دو متضاد اجتہاد ہوں تو دونوں کو حق سمجھا جائے گا یا اُن میں سے ایک فیصلہ کو خطاء اور غلط قرار دیا جائے گا اسمیں قدیم زمانے سے علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ آیت مذکورہ سے دونوں جماعتوں نے استدلال کیا ہے جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ دونوں اجتہاد حق ہیں اگرچہ متضاد ہوں اُن کا استدلال آیت کے آخری جملے سے ہے جسمیں فرمایا وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۔ اس میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ دونوں کو حکمت اور علم عطا کرنے کا ارشاد ہے حضرت داؤد علیہ السلام پر کوئی عتاب نہیں ہے نہ ان کو یہ کہا گیا کہ اُن سے غلطی ہوگئی اس سے معلوم ہوا کہ داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی حق تھا اور سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ بھی، البتہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کو فریقین کے لئے اصلح ہونے کی بنا پر ترجیح دیدی گئی ۔ اور جو حضرات یہ فرماتے ہیں کہ اختلاف اجتہادی کے مواقع میں حق ایک طرف ہوتا ہے دوسرا غلط ہوتا ہے اُنکا استدلال اسی آیت کے پہلے جملے سے ہو یعنی فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ۔ کہ اسمیں تخصیص کر کے حضرت سلیمان کے بارے میں فرمایا ہے کہ ہم نے انکو حق فیصلہ سمجھا دیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ داؤد علیہ السلام کا فیصلہ حق نہ تھا گو وہ بوجہ اپنے اجتہاد کے اسمیں معذور ہوں اور اُن اسپر کوئی مواخذہ نہ ہو۔ یہ بحث اصولِ فقہ کی کتابوں میں بڑی تفصیل سے آئی ہے وہاں دیکھی جاسکتی ہے یہاں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے اجتہاد کیا اور کوئی حکم دینی اصول اجتہاد کے ماتحت بیان کیا۔ اگر اسکا اجتہاد صحیح ہوا تو اُس کو دو اجر ملیں گے ایک اجتہاد کرنے کی محنت کا دوسرا صحیح ثواب حکم تک پہنچنے کا اور اگر یہ اجتہاد صحیح نہ ہوا اُس سے خطا ہوگئی تو پھر اسکو ایک اجر اجتہاد کی محنت کا ملے گا دوسرا اجر جو اصل حکم صحیح تک پہنچنے کا تھا وہ نہ ملے گا (یہ حدیث اکثر مستند کتب حدیث میں منقول ہے) اس حدیث سے اس اختلاف علماء کی حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ درحقیقت یہ اختلاف ایک نزاعِ لفظی جیسا ہے کیونکہ حق دونوں طرف ہونیکا حاصل یہ ہے کہ اجتہاد میں خطا کرنے والے مجتہد اور اسکے متبعین کے لئے بھی اجتہاد حق و صحیح ہے اسپر عمل کرنے سے اُن کی نجات ہوجائیگی خواہ یہ اجتہاد اپنی ذات میں خطا ہی ہو مگر اسپر

عمل کرنے والوں کو کوئی گناہ نہیں اور جن حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ حق ان دونوں میں ایک ہی ہے دوسرا غلط اور خطا ہے اسکا حاصل بھی اس سے زیادہ نہیں کہ اصل مُراد حق تعالیٰ اور مطلوب خداوندی تک نہ پہنچنے کی وجہ سے اس مجتہد کے ثواب میں کمی آجائے گی اور یہ کمی اسوجہ سے ہے کہ اسکا اجتہاد حق بات تک نہ پہنچا لیکن یہ مطلب انکا بھی نہیں ہے کہ مجتہد خاطی پر کوئی ملامت ہوگی یا اسکے متبعین کو گناہگار کہا جائے گا۔ تفسیر قرطبی میں اس مقام پر ان تمام مباحث کو پوری تفصیل سے لکھا ہے اہل علم وہاں دیکھ سکتے ہیں۔

یہ مسئلہ فقہیہ کہ اگر کسی کے جانور دوسرے آدمی کی جان یا مال کو نقصان پہنچا دیں تو فیصلہ کیا ہونا چاہئے

حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ جانور کے مالک پر ضمان آئے گا اگر یہ واقعہ رات میں ہوا ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ داؤد علیہ السلام کی شریعت کا جو فیصلہ ہو وہی شریعت محمدیہ میں رہے اسی لئے اس مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر رات کے وقت کسی کے جانور کسی دوسرے کے کھیت میں داخل ہو کر نقصان پہنچا دیں تو جانور کے مالک پر ضمان آئیگا اور اگر دن میں ایسا ہو تو ضمان نہیں آئے گا ان کا استدلال حضرت داؤدؑ کے فیصلہ سے بھی ہو سکتا ہے مگر شریعت محمدیہ کے اصول کے تحت انھوں نے ایک حدیث سے استدلال فرمایا ہے جو مؤطا امام مالک میں مرسلاً منقول ہے کہ حضرت براء بن عازب رضؓ کی ناقہ ایک شخص کے باغ میں داخل ہوگئی اور اسکو نقصان پہنچا دیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ باغوں اور کھیتوں کی حفاظت راتمیں انکے مالکوں کے ذمہ ہے اور ان کی حفاظت کے باوجود اگر رات کو کسی کے جانور نقصان پہنچا دیں تو جانور کے مالک پر ضمان ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ اور فقہاء کوفہ کا مسلک یہ ہے کہ جسوقت جانوروں کے ساتھ ان کا چرانے والا یا حفاظت کرنے والا کوئی آدمی موجود ہو اُس نے غفلت کی اور جانوروں نے کسی کے باغ یا کھیت کو نقصان پہنچا دیا اس صورتمیں تو جانور کے مالک پر ضمان آتا ہے خواہ یہ معاملہ رات میں ہو یا دن میں اور اگر مالک یا محافظ جانوروں کیساتھ نہوں جانور خود ہی نکل گئے اور کسی کے کھیت کو نقصان پہنچا دیا تو جانور کے مالک پر ضمان نہیں معاملہ دن اور رات کا اسمیں بھی برابر ہے امام اعظم رحؒ کی دلیل وہ حدیث ہے جو بخاری و مسلم اور تمام محدثین نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جرح العجماء جبار یعنی جانور جو کسی کو نقصان پہنچا دے وہ قابلِ مواخذہ نہیں یعنی جانور کے مالک پر اسکا ضمان نہیں ہے (بشرطیکہ جانور کا مالک یا محافظ اسکے ساتھ نہ ہو جیسا کہ دوسرے دلائل سے ثابت ہے) اس حدیث میں دن رات کی تفریق کے بغیر عام قانون شرعی یہ قرار دیا گیا ہے کہ اگر جانور کے مالک نے خود اپنے قصد و ارادے سے کسی کے کھیت میں نہیں چھوڑا، جانور بھاگ کر چلا گیا تو اسکے نقصان کا ضمان جانور کے مالک پر نہیں ہوگا۔ اور حضرت براء بن عازب کے واقعہ کی روایت کی سند میں فقہاء حنفیہ نے کلام کیا ہے اور فرمایا کہ اس کو

صحیحین کی حدیث مذکور کے مقابلے میں حجت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۚ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ، حضرت داؤد علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ظاہری کمالات میں سے ایک کمال حُسنِ صَوت کا بھی عطا فرمایا تھا، جب وہ زبور پڑھتے تھے تو پرندے ہوا میں ٹھہرنے لگتے تھے اور اُن کے ساتھ تسبیح کرنے لگتے تھے اسی طرح پہاڑ اور ہر شجر و مدر سے تسبیح کی آواز نکلنے لگتی تھی خوش آوازی کا کمال تو ظاہری کمالات میں سے تھا اور پرندوں و پہاڑوں کا تسبیح میں شریک ہو جانا تسخیر خداوندی بطور معجزہ کے تھا اور معجزہ کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ پرندوں اور پہاڑوں میں حیات و شعور ہو بلکہ بطور معجزہ ہر غیر ذی شعور میں بھی شعور پیدا ہو سکتا ہے۔ اسکے علاوہ تحقیق یہی ہے کہ پہاڑوں اور پتھروں میں بھی حیات و شعور بقدر اُن کی حیثیت کے موجود ہے صحابہ کرام میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بہت خوش آواز تھے ایک روز وہ قرآن پڑھ رہے تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا گزر اُن کی طرف ہوا تو آپ اُن کی تلاوت سُننے کے لئے ٹھہر گئے اور سُنتے رہے پھر فرمایا کہ اُن کو اللہ تعالیٰ نے خوش آوازی حضرت داؤد علیہ السلام کی عطا فرمائی ہے۔ جب ابو موسیٰ رضؓ کو معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی تلاوت سُن رہے تھے تو عرض کیا کہ اگر مجھے آپ کا سُننا معلوم ہو جاتا تو میں اور زیادہ سنوار کر پڑھنے کی کوشش کرتا (ابن کثیر)

فائدہ اس سے معلوم ہوا کہ تلاوتِ قرآن میں حُسنِ صَوت اور اچھا لہجہ جس سے دلکشی پیدا ہو ایک درجہ میں مطلوب و محبوب ہے بشرطیکہ آجکل کے قرار کی طرح اسمیں غلو نہ ہو کہ صرف آواز ہی سنوارنے اور لوگوں کو لُبھانے کی فکر رہ جائے تلاوت کا اصل مقصد ہی غائب ہو جائے وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

زرہ بنانے کی صنعت حضرت داؤد علیہ السلام کو منجانب اللہ عطا کی گئی۔ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ ، لفظ لبوس لغت کے اعتبار سے اسلحہ میں سے ہر چیز کو کہا جاتا ہے جو انسان اوڑھ کر یا گلے میں ڈال کر استعمال کرے مراد اس جگہ آہنی زرہ ہے جو جنگ میں حفاظت کے لئے پہنی جاتی ہے دوسری آیت میں ہے وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ یعنی ہم نے اُن کے لئے لوہے کو نرم کر دیا تھا خواہ اسطرح کہ لوہا اُن کے ہاتھ میں آکر خود بخود نرم ہو جاتا ہو کہ اُس کو جس طرح موڑیں مُڑ جائے اور باریک یا موٹا کرنا چاہیں تو ہو جائے جیسے موم ہوتا ہے یا اس طرح کہ اُن کو آگ میں پگھلا کر نرم کرنے کی تدبیر بتلا دی جو سب لوہے کے کارخانوں میں آج استعمال کی جاتی ہے۔

ایسی صنعت جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے مطلوب اور فعلِ انبیاء ہے اس آیت میں زرہ سازی کی صنعت داؤد علیہ السلام کو سکھانے کے ذکر کے ساتھ اُس کی حکمت بھی یہ بتلائی ہے کہ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ، یعنی تاکہ یہ زرہ تمھیں جنگ کے وقت تیز تلوار کے خطرہ سے محفوظ رکھ سکے یہ ایک ایسی ضرورت ہے کہ جس سے اہلِ دین اور اہلِ دُنیا سب کو کام پڑتا ہے اسلئے اس صنعت کے

سکھانے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک انعام قرار دیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس صنعت کے ذریعہ لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوں اسکا سیکھنا سکھانا داخلِ ثواب ہے بشرطیکہ نیت خدمتِ خلق کی ہو، صرف کمائی ہی مقصد نہ ہو۔ حضرات انبیاء علیہم السلام سے مختلف قسم کی صنعتوں کا عمل کرنا منقول ہے حضرت آدم علیہ السلام سے کھیتی بونے کاٹنے کا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو صنعتکار اپنی صنعت میں نیت نیک یعنی خدمتِ خلق کی رکھے اُس کی مثال اُمِ موسیٰ کی سی ہو جاتی ہے کہ اُنھوں نے اپنے ہی بچہ کو دودھ پلایا اور معاوضہ فرعون کیطرف سے مفت میں ملا۔ اسی طرح خدمتِ خلق کی نیت سے صنعتکاری کرنے والے کو اپنا مقصد ثواب خدمتِ خلق تو حاصل ہوگا ہی صنعت کا نفع دنیوی مزید براں اسکو ملیگا یہ حدیث حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں سورۂ طٰہٰ میں گزر چکی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے ہوا کی تسخیر اور اُس کے متعلقہ مسائل حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کا یہ واقعہ پیش آیا کہ لشکری گھوڑوں کے معائنہ میں مشغول ہو کر عصر کی نماز فوت ہو گئی تو اپنی اس غفلت پر افسوس ہوا اور یہ گھوڑے جو اس غفلت کا سبب بنے تھے انکو بیکار کر کے چھوڑ دیا چونکہ اُن کا یہ عمل اللہ کی رضا جوئی کیلئے ہوا تھا اسلئے اللہ تعالیٰ نے انکو گھوڑوں سے بہتر اور تیز رفتار سواری ہوا کی عطا فرمادی اس واقعہ کی تفصیل اور اس سے متعلقہ آیات کی تفسیر سورۂ صٓ میں آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً ، یہ جملہ سابقہ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ پر عطف ہے یعنی جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو اُن کی آواز کے ساتھ تسبیح کیا کرتے تھے اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا تھا جس پر سوار ہو کر وہ جہاں چاہتے بہت جلد آسانی سے پہنچ جاتے تھے اس جگہ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ تسخیر داؤد علیہ السلام میں تو لفظ مع استعمال فرمایا کہ اُن کے ساتھ پہاڑوں پرندوں کو مسخر کر دیا تھا اور یہاں حرف لام کے ساتھ فرمایا کہ ہوا کو سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کر دیا تھا اسمیں لطیف اشارہ اس بات کیطرف ہے کہ دونوں تسخیروں میں فرق تھا، داؤد علیہ السلام جب تلاوت کرتے تو پہاڑ اور پرندے خود بخود تسبیح کرنے لگتے تھے اُن کے حکم کے منتظر نہ رہتے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو اُن کے حکم کے تابع بنا دیا گیا کہ جب چاہیں جسوقت چاہیں جسطرف جانا چاہیں ہوا کو حکم دیدیا اُسنے پہنچا دیا پھر جہاں اُترنا چاہیں وہاں اُتار دیا پھر جب واپس چلنے کا حکم ہوا واپس پہنچا دیا۔ (روح عن البیضاوی)

تفسیر ابن کثیر میں تختِ سلیمان علیہ السلام جو ہوا پر چلتا تھا اُس کی کیفیت یہ بیان کی ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے لکڑی کا ایک بہت بڑا وسیع تخت بنوایا تھا جس پر خود مع اعیانِ سلطنت اور مع لشکر اور آلاتِ حرب کے سب سوار ہو جاتے پھر ہوا کو حکم دیتے وہ اس عظیم الشان وسیع وعریض تخت کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر جہاں کا حکم ہوتا وہاں جا کر اُتار دیتی تھی۔ یہ ہوائی تخت صبح

سے دو پہر تک ایک مہینہ کی مسافت طے کرتا تھا اور دو پہر سے شام تک ایک مہینہ کی یعنی ایک دن میں دو مہینوں کی مسافت ہوا کے ذریعہ طے ہو جاتی تھی۔ ابن ابی حاتم نے حضرت سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ اس تخت سلیمانی پر چھ لاکھ کرسیاں رکھی جاتی تھیں جسمیں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اہل ایمان انسان سوار ہوتے تھے اور ان کے پیچھے اہل ایمان جن بیٹھتے تھے پھر پرندوں کو حکم ہوتا کہ وہ اس پورے تخت پر سایہ کرلیں تاکہ آفتاب کی تپش سے تکلیف نہ ہو پھر ہوا کو حکم دیا جاتا تھا وہ اس عظیم الشان مجمع کو اٹھا کر جہاں کا حکم ہوتا پہنچا دیتی تھی۔ اور بعض روایات میں ہے کہ اس ہوائی سفر کے وقت پورے راستہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام سر جھکائے ہوئے اللہ کے ذکر و شکر میں مشغول رہتے تھے دائیں بائیں کچھ نہ دیکھتے تھے اور اپنے عمل سے تواضع کا اظہار فرماتے تھے (ابن کثیر)

عَاصِفَةً ، ریح عاصفہ کے لفظی معنے سخت اور تیز ہوا کے ہیں۔ قرآن کریم کی دوسری آیت میں اس ہوا کی صفت رُخَاءً بیان کی گئی ہے جس کے معنے نرم ہوا کے ہیں جس سے نہ غبار اُڑے نہ فضا میں تلاطم پیدا ہو۔ بظاہر یہ دو متضاد صفتیں ہیں لیکن دونوں صفتوں کا جمع ہونا اس طرح ممکن ہے کہ یہ ہوا اپنی ذات میں بڑی سخت اور تیز ہو جسکی وجہ سے چند گھنٹوں میں ایک مہینہ کی مسافت طے کر سکے لیکن قدرت حق تعالیٰ نے اُس کو ایسا بنا دیا ہو کہ اُس سے فضا میں تلاطم نہ پیدا ہو چنانچہ اس کا یہ حال بیان کیا گیا ہے کہ جس فضا میں یہ تخت روانہ ہوتا تھا وہاں کسی پرندے کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچتا تھا۔

سلیمان علیہ السلام کیلئے تسخیر جنات و شیاطین

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ، یعنی ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کر دیا شیاطین جن میں سے ایسے لوگوں کو جو دریاؤں میں غوطہ لگا کر سلیمان علیہ السلام کے لئے جواہرات نکال کر لاتے تھے اور اسکے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے جن میں سے بعض کا ذکر دوسری آیات میں آیا ہے۔ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ یعنی بناتے ہیں حضرت سلیمان کے لئے محرابیں اور شاندار مکانات اور مورتیں اور پتھر کے بڑے بڑے پیالے جو حوض کی طرح کام دیں اُن سے سلیمانؑ بڑی مشقت کے کام بھی لیتے تھے اور عجیب و غریب صنعتوں کے بھی، اور ہم ہی اُن کے محافظ تھے۔

شَيٰطِيْنَ ، وہ آگ کے بنے ہوئے اجسام لطیفہ ہیں جو عقل و شعور رکھتے ہیں اور انسان کی طرح احکام شرع کے مکلف ہیں۔ اس نوع کے لئے اصل لفظ جن یا جنات استعمال ہوتا ہے ان میں جو ایمان قبول کریں کافر رہیں ان کو شیاطین کہا جاتا ہے ظاہر یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر تو سبھی جنات تھے خواہ مومن ہوں یا کافر، مگر مومنین تو تسخیر کے بغیر بھی سلیمان علیہ السلام کے احکام کی تعمیل ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت سے کرتے تھے اُن کے لئے تسخیر کے ذکر کی ضرورت نہیں۔

اسلئے تسخیر میں صرف شیاطین یعنی کفار جنات کا ذکر فرمایا کہ وہ باوجود اپنے کفر و سرکشی کے زیردستی حضرت سلیمان کے تابع فرمان رہتے تھے اور شاید اسی لئے آیت کے آخر میں یہ جملہ بڑھایا گیا کہ ہم ہی اُن کے محافظ تھے ورنہ کفار جنات سے تو ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ وہ کوئی نقصان پہنچا دیں مگر حفاظتِ خداوندی کا پہرہ اُن پر لگا ہوا تھا اسلئے کوئی گزند نہ پہنچا سکتے تھے۔

ایک لطیفہ حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے تو حق تعالیٰ نے سب سے زیادہ سخت اور کثیف اجسام کو مسخر فرمایا جن میں پہاڑ اور لوہا جیسی سخت چیزیں شامل ہیں، اسکے بالمقابل سلیمان علیہ السلام کیلئے ایسے اجسام لطیفہ کو مسخر فرمایا جو دیکھنے میں بھی نہ آسکیں جیسے ہوا اور جنات اسمیں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ہر قسم کی مخلوقات پر حاوی ہونا واضح کیا گیا ہے (تفسیر کبیر للرازی)

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۸۳﴾

اور ایوب کو جس وقت پکارا اس نے اپنے رب کو کہ مجھ پر پڑی ہے تکلیف اور تو ہے سب رحم والوں سے رحم والا

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ

پھر ہم نے سُن لی اُس کی فریاد سو دُور کر دی جو اُس پر تھی تکلیف اور عطا کئے اسکو اسکے گھر والے اور اتنے ہی اور انکے ساتھ

رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾

رحمت اپنی طرف سے اور نصیحت بندگی کرنے والوں کو

خلاصۂ تفسیر

اور ایوب (علیہ السلام) کے قصے کا تذکرہ کیجئے جب کہ انھوں نے (مرض شدید میں مبتلا ہونیکے بعد) اپنے رب کو پکارا کہ مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں (تو اپنی مہربانی سے میری یہ تکلیف دُور کر دیجئے) تو ہم نے اُن کی دُعا قبول کی اور اُن کو جو تکلیف تھی اُس کو دُور کر دیا اور (بغیر اُن کی درخواست کے) ہم نے اُن کا کنبہ (یعنی اولاد جو اُن سے غائب ہو گئے تھے (قالہ الحسن کذا فی الدر المنثور) یا مر گئے تھے (کما قال غیرہ) عطا فرمایا (اس طرح سے کہ وہ اُن کے پاس آگئے یا بایں معنی کہ اتنے ہی اور پیدا ہو گئے، قالہ عکرمہ کما فی فتح المنان) اور انکے ساتھ (گنتی میں) اُن کے برابر اور بھی (دیئے اپنی جتنی اولاد پہلے تھی اُس کے برابر اور بھی دیدیئے خواہ خود اپنی صلب سے یا اولاد کی اولاد ہونے کی حیثیت سے کذا فی فتح المنان من کتاب ایوب) اپنی رحمتِ خاصّہ کے سبب سے اور عبادت کرنے والوں کے لئے ایک یادگار رہنے کے سبب سے۔

معارف و مسائل

قصہ ایوب علیہ السلام حضرت ایوب علیہ السلام کے قصہ میں اسرائیلی روایات بڑی طویل ہیں انہیں سے جن کو حضرات محدثین نے تاریخی درجہ میں قابل اعتماد سمجھا ہے وہ نقل کیجاتی ہیں۔ قرآن کریم سے تو صرف اتنی بات ثابت ہے کہ اُن کو کوئی شدید مرض پیش آیا جس پر وہ صبر کرتے رہے بالآخر اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اُس سے نجات ملی اور یہ کہ اس بیماری کے زمانے میں اُن کی اولاد اور احباب سب غائب ہو گئے خواہ موت کی وجہ سے یا کسی دوسری وجہ سے، پھر حق تعالیٰ نے اُن کو صحت و عافیت دی اور جتنی اولاد تھی وہ سب اُن کو دیدی بلکہ اتنی ہی اور بھی زیادہ دیدی، باقی حصّے کے اجزاء بعض تو مستند احادیث میں موجود ہیں اور زیادہ تر تاریخی روایات ہیں حافظ ابن کثیرؒ نے اس قصّے کی تفصیل یہ لکھی ہے کہ:

ایوب علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ابتدا میں مال و دولت اور جائداد اور شاندار مکانات اور سواریاں اور اولاد اور حشم و خدم بہت کچھ عطا فرمایا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیغمبرانہ آزمائش میں مبتلا کیا یہ سب چیزیں اُنکے ہاتھ سے نکل گئیں اور بدن میں بھی ایسی سخت بیماری لگ گئی جیسے جذام ہوتا ہے کہ بدن کا کوئی حصّہ بجز زبان اور قلب کے اس بیماری سے نہ بچا وہ اس حالت میں زبان و قلب کو اللہ کی یاد میں مشغول رکھتے اور شکر ادا کرتے رہتے تھے۔ اس شدید بیماری کی وجہ سے سب عزیزوں، دوستوں اور پڑوسیوں نے اُن کو الگ کر کے آبادی سے باہر ایک کوڑا کچرہ ڈالنے کی جگہ پر ڈالدیا[عـہ]۔ کوئی اُن کے پاس نہ جاتا تھا صرف اُن کی بیوی اُن کی خبرگیری کرتی تھی جو حضرت یوسف علیہ السلام کی بیٹی یا پوتی تھی جس کا نام لیا بنت میشا ابن یوسف علیہ السلام بتلایا جاتا ہے (ابن کثیر) مال و جائداد تو سب ختم ہو چکا تھا ان کی زوجہ محترمہ محنت مزدوری کر کے اپنے اور اُن کے لئے رزق اور ضروریات فراہم کرتی اور انکی خدمت کرتی تھیں۔ ایوب علیہ السلام کا یہ ابتلاء و امتحان کوئی حیرت و تعجب کی چیز نہیں، نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الصالحون ثم الامثل فالامثل، یعنی سب سے زیادہ سخت بلائیں اور آزمائشیں انبیاء علیہم السلام کو پیش آتی ہیں اُن کے بعد دوسرے صالحین کو درجہ بدرجہ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ہر انسان کا ابتلاء اور آزمائش اس کی دینی صلابت اور مضبوطی کے اندازے پر ہوتا ہے جو دین میں جتنا زیادہ مضبوط ہوتا ہے اُتنی اس کی آزمائش و ابتلاء زیادہ ہوتی ہے (تاکہ اسی مقدار سے اسکے درجات اللہ کے نزدیک بلند ہوں) حضرت ایوب علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے زمرۂ انبیاء علیہم السلام میں دینی صلابت اور صبر کا ایک امتیازی مقام عطا فرمایا تھا (جیسے داؤد علیہ السلام کو شکر کا ایسا ہی امتیاز دیا گیا تھا) مصائب و شدائد پر صبر میں حضرت ایوب علیہ السلام ضرب المثل ہیں۔ یزید بن میسرہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کو مال و اولاد وغیرہ

عـہ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کے بارے میں اس روایت کی اصل وضاحت معارف القرآن جلد نمبر ۷ صفحہ نمبر ۵۲۲ پر سورہ ص کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔ محمد تقی عثمانی ۱۸/۳/۱۴۲۶ھ۔

سب دُنیا کی نعمتوں سے خالی کر کے آزمائش فرمائی تو اُنھوں نے فارغ ہو کر اللہ کی یاد اور عبادت میں اور زیادہ محنت شروع کر دی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے مال جائداد اور دولتِ دُنیا اور اولاد عطا فرمائی جس کی محبت میرے دل کے ایک ایک جزء پر چھا گئی پھر اس پر بھی شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے ان سب چیزوں سے فارغ اور خالی کر دیا اور اب میرے اور آپکے درمیان حائل ہونے والی کوئی چیز باقی نہ رہی۔

حافظ ابن کثیر یہ مذکورہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ وہب بن منبہ سے اس قصہ میں بڑی طویل روایات منقول ہیں جن میں غرابت پائی جاتی ہے اور طویل ہیں اسلئے ہم نے ان کو چھوڑ دیا ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی دُعا صبر کے خلاف نہیں

حضرت ایوب علیہ السلام اس شدید بلا میں کہ سب مال و جائداد اور دَولتِ دُنیا سے الگ ہو کر ایسی جسمانی بیماری میں مبتلا ہوئے کہ لوگ پاس آتے ہوئے گھبرائیں، بستی سے باہر ایک کوڑے کچرے کی جگہ پر سات سال چند ماہ پڑے رہے کبھی جزع و فزع یا شکایت کا کوئی کلمہ زبان پر نہیں آیا۔ نیک بی بی لیا زوجہ محترمہ نے عرض بھی کیا کہ آپ کی تکلیف بہت بڑھ گئی ہے اللہ سے دُعا کیجئے کہ یہ تکلیف دُور ہو جائے تو فرمایا کہ میں نے ستر سال صحیح تندرست اللہ کی بے شمار نعمت و دولت میں گزارے ہیں کیا اسکے مقابلے میں سات سال بھی مصیبت کے گزرنے مشکل ہیں۔ پیغمبرانہ عزم و ضبط اور صبر و ثبات کا یہ عالم تھا کہ دُعا کرنے کی بھی ہمت نہ کرتے تھے کہ کہیں صبر کیخلاف نہ ہو جائے (حالانکہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنا اور اپنی احتیاج و تکلیف پیش کرنا بے صبری میں داخل نہیں) بالآخر کوئی ایسا سبب پیش آیا جس نے ان کو دُعا کرنے پر مجبور کر دیا اور جیسا کہ اُوپر لکھا گیا ہے یہ دعاء دُعاء ہی تھی کوئی بے صبری نہیں تھی حق تعالیٰ نے اُن کے کمالِ صبر پر اپنے کلام میں مہر ثبت فرما دی ہے فرمایا اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا اس سبب کے بیان میں روایات بہت مختلف اور طویل ہیں اس لئے ان کو چھوڑا جاتا ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ (جب ایوب علیہ السلام کی دُعا قبول ہوئی اور اُن کو حکم ہوا کہ زمین پر ایڑ لگایئے یہاں سے صاف پانی کا چشمہ پھوٹے گا اُس سے غسل کیجئے اور اسکا پانی پیجئے تو یہ سارا روگ چلا جائیگا حضرت ایوبؑ نے اسکے مطابق کیا تمام بدن جو زخموں سے چور تھا اور بجز ہڈیوں کے کچھ نہ رہا تھا اس چشمہ کے پانی سے غسل کرتے ہی سارا بدن کھال اور بال یکایک اپنی اصلی حالت پر آ گئے تو) اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے جنت کا ایک لباس بھیجدیا وہ زیب تن فرمایا اور اس کوڑے کچرے سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ زوجہ محترمہ حسب عادت انکی خبر گیری کے لئے آئی تو اُن کو اپنی جگہ پر نہ پا کر رونے لگی۔ ایوب علیہ السلام جو ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے تھے اُن کو نہیں پہچانا کہ حالت بدل چکی تھی، اُنھیں سے پوچھا کہ اے خدا کے بندے کیا تمھیں معلوم ہے کہ

وہ بیمار مبتلا جو یہاں پڑا رہتا تھا کہاں چلا گیا، کیا کتوں یا بھیڑیوں نے اُسے کھالیا؟ اور کچھ دیر تک اس معاملے میں اُن سے گفتگو کرتی رہی۔ یہ سب سُن کر ایوب علیہ السلام نے اُن کو بتلایا کہ میں ہی ایوب ہوں مگر زوجہ محترمہ نے اب تک بھی نہیں پہچانا۔ کہنے لگی اللہ کے بندے کیا آپ میرے ساتھ تمسخر کرتے ہیں تو ایوب علیہ السلام نے پھر فرمایا کہ غور کرو میں ہی ایوب ہوں اللہ تعالیٰ نے میری دُعا قبول فرمالی اور میرا بدن از سر نو درست فرمادیا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے انکا مالُ دولت بھی اُن کو واپس دیدیا اور اولاد بھی، اور اولاد کی تعداد کے برابر مزید اولاد بھی دیدی (ابن کثیر)

ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے سات لڑکے سات لڑکیاں تھیں اس ابتلاء کے زمانے میں یہ سب مر گئے تھے، جب اللہ نے ان کو عافیت دی تو ان کو بھی دوبارہ زندہ کردیا اور انکی اہلیہ سے نئی اولاد بھی اتنی ہی اور پیدا ہوگئی جس کو قرآن میں وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ فرمایا ہے۔ ثعلبی نے کہا کہ یہ قول ظاہر آیت قرآن کے ساتھ اقرب ہے۔ (قرطبی)

بعض حضرات نے فرمایا کہ نئی اولاد خود اپنے سے اُتنی ہی مل گئی جتنی پہلے تھی اور اُن کے مثل اولاد سے مراد اولاد کی اولاد ہے واللہ اعلم

وَإِسْمَاعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ ۖ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ ﴿٨٥﴾ وَ

اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو یہ سب ہیں صبر والے اور

أَدْخَلْنَاهُمْ فِي رَحْمَتِنَا ۖ إِنَّهُم مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿٨٦﴾

لے لیا ہم نے اُن کو اپنی رحمت میں وہ ہیں نیک بختوں میں

خلاصۂ تفسیر

اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذوالکفل (کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے یہ سب (احکام الٰہیہ تشریعیہ اور تکوینیہ پر) ثابت قدم رہنے والے لوگوں میں سے تھے اور ہم نے ان (سب) کو اپنی رحمت (خاصہ) میں داخل کرلیا تھا بیشک یہ (سب) کمال صلاحیت والوں میں تھے۔

معارف و مسائل

حضرت ذوالکفل نبی تھے یا ولی اور اُن کا قصۂ عجیبہ

آیاتِ مذکورہ میں تین حضرات کا ذکر ہے جنہیں حضرت اسمٰعیل اور حضرت ادریس علیہما السلام کا نبی و رسول ہونا قرآن کریم کی بہت سی آیات سے ثابت اور اُن کا تذکرہ بھی قرآن میں جا بجا آیا ہے۔ تیسرے بزرگ ذوالکفل ہیں۔ ابن کثیرؒ نے

فرمایا کہ ان کا نام ان دونوں پیغمبروں کیساتھ شامل کر کے ذکر کرنے سے ظاہر یہی ہے کہ یہ بھی کوئی اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے مگر بعض دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمرۂ انبیاء میں نہیں تھے بلکہ ایک مرد صالح اولیاء اللہ میں سے تھے۔ امام تفسیر ابن جریرؒ نے اپنی سند کیساتھ مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ حضرت یَسَعؑ (جن کا نبی و پیغمبر ہونا قرآن میں مذکور ہے) جب بوڑھے اور ضعیف ہوگئے تو ارادہ کیا کہ کسی کو اپنا خلیفہ بنادیں جو اُن کی زندگی میں وہ سب کام اُن کی طرف سے کرے جو نبی کے فرائض میں داخل ہیں۔

اس مقصد کے لئے حضرت یَسَعؑ علیہ السلام نے اپنے سب صحابہ کو جمع کیا کہ میں اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں جس کے لئے تین شرطیں ہیں جو شخص ان شرائط کا جامع ہو اس کو خلیفہ بناؤں گا۔ وہ تین شرطیں یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھتا ہو اور ہمیشہ راتکو عبادت میں بیدار رہتا ہو اور کبھی غصہ نہ کرتا ہو۔ مجمع میں سے ایک ایسا غیر معروف شخص کھڑا ہوا جس کو لوگ حقیر ذلیل سمجھتے تھے اور کہا کہ میں اس کام کے لئے حاضر ہوں۔ حضرت یَسَعؑ نے دریافت کیا کہ کیا تم ہمیشہ روزہ رکھتے ہو اور ہمیشہ شب بیداری کرتے ہو اور کبھی غصہ نہیں کرتے۔ اس شخص نے عرض کیا بیشک میں ان تین چیزوں کا عامل ہوں۔ حضرت الیسعؑ (کو شاید کچھ اسکے قول پر اعتماد نہ ہوا اسلئے) اُس روز اسکو رَد کر دیا پھر کسی دوسرے روز اسیطرح مجمع سے خطاب فرمایا اور سب حاضرین ساکت رہے اور یہی شخص پھر کھڑا ہو گیا اُس وقت حضرت یَسَعؑ نے ان کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیا۔ شیطان نے یہ دیکھا کہ ذوالکفلؑ اسمیں کامیاب ہوگئے تو اپنے اعوان شیاطین سے کہا کہ جاؤ کسی طرح اس شخص پر اثر ڈالو کہ یہ کوئی ایسا کام کر بیٹھے جس سے یہ منصب اسکا سلب ہوجائے۔ اعوانِ شیطان نے عذر کر دیا۔ کہ وہ ہمارے قابو میں آنیوالا نہیں شیطان ابلیس نے کہا کہ اچھا تم اس کو مجھ پر چھوڑ دو میں اُس سے نمٹ لوں گا) حضرت ذوالکفلؑ اپنے اقرار کے مطابق دن بھر روزہ رکھتے اور رات بھر جاگتے تھے صرف دوپہر کو قیلولہ کرتے تھے (قیلولہ دوپہر کے سونے کو کہتے ہیں) شیطان عین دوپہر کو ان کے قیلولہ کے وقت آیا اور دروازہ پر دستک دی یہ بیدار ہوگئے اور پُوچھا کون ہے کہنے لگا کہ میں بوڑھا مظلوم ہوں، اُنھوں نے دروازہ کھولدیا۔ اُس نے اندر پہنچکر ایک افسانہ کہنا شروع کر دیا کہ میری برادری کا مجھ سے جھگڑا ہے اُنھوں نے مجھ پر یہ ظلم کیا وہ ظلم کیا، ایک طویل داستان شروع کر دی یہانتک کہ دوپہر کے سونے کا وقت ختم ہو گیا۔ حضرت ذوالکفل نے فرمایا کہ جب میں باہر آؤں تو میرے پاس آجاؤ میں تمھارا حق دلواؤں گا۔

حضرت ذوالکفلؑ باہر تشریف لائے اور اپنی مجلس عدالت میں اُسکا انتظار کرتے رہے مگر اسکو نہیں پایا۔ اگلے روز پھر جب وہ عدالت میں فیصلہ مقدمات کے لئے بیٹھے تو اس بوڑھے کا انتظار کرتے رہے اور یہ نہ آیا۔ جب دوپہر کو پھر قیلولہ کے لئے گھر میں گئے تو یہ شخص آیا اور دروازہ کوٹنا شروع کیا۔ انھوں نے پھر پوچھا کون ہے؟ جواب دیا کہ ایک مظلوم بوڑھا ہے، اُنھوں نے پھر دروازہ کھولدیا اور فرمایا کہ کیا

میں نے کل تم سے نہیں کہا تھا کہ جب میں اپنی مجلس میں بیٹھوں تو تم آجاؤ (تم نہ کل آئے نہ آج صبح سے آئے) اُسنے کہا کہ حضرت میرے مخالف بڑے خبیث لوگ ہیں جب انھوں نے دیکھا کہ آپ اپنی مجلس میں بیٹھے ہیں اور میں حاضر ہونگا تو آپ اُن کو میرا حق دینے پر مجبور کریں گے تو انھوں نے اُسوقت اقرار کرلیا کہ ہم تیرا حق دیتے ہیں، پھر جب آپ مجلس سے اُٹھ گئے تو انکار کردیا۔ انھوں نے پھر اسکو یہی فرمایا کہ اب جاؤ جب میں مجلس میں بیٹھوں تو میرے پاس آجاؤ۔ اسی گفت وشنید میں آج کے دو پہر کا سونا بھی رہ گیا اور وہ باہر مجلس میں تشریف لے گئے اور اس بوڑھے کا انتظار کرتے رہے (اگلے روز بھی دوپہر تک انتظار کیا وہ نہیں آیا پھر جب تیسرے روز دوپہر کا وقت ہوا اور نیند کو تیسرا دن ہوگیا تھا نیند کا غلبہ تھا) تو گھر میں آکر گھر والوں کو اسپر مقرر کیا کہ کوئی شخص دروازے پر دستک نہ دے سکے۔ یہ بوڑھا پھر تیسرے روز پہنچا اور دروازے پر دستک دینا چاہا لوگوں نے منع کیا تو ایک روشندان کے راستے سے اندر داخل ہوگیا اور اندر پہنچکر دروازہ بجانا شروع کردیا یہ پھر نیند سے بیدار ہوگئے اور دیکھا کہ یہ شخص گھر کے اندر ہے اور دیکھا کہ دروازہ بدستور بند ہے اس سے پوچھا، تو کہاں سے اندر پہنچا، اسوقت حضرت ذوالکفل نے پہچان لیا کہ شیطان ہے اور فرمایا کہ کیا تو خدا کا دشمن ابلیس ہے؟ اس نے اقرار کیا کہ ہاں، اور کہنے لگا کہ تو نے مجھے میری ہر تدبیر میں تھکا دیا کبھی میرے جال میں نہیں آیا، اب میں نے یہ کوشش کی کہ تجھے کسی طرح غصہ دلادوں تاکہ تو اپنے اس اقرار میں جھوٹا ہوجائے جو تیسع نبی کے ساتھ کیا ہے، اس لئے میں نے یہ سب حرکتیں کیں۔ یہ واقعہ تھا جس کی وجہ سے اُن کو ذوالکفل کا خطاب دیا گیا، کیونکہ ذوالکفل کے معنی ہیں ایسا شخص جو اپنے عہد اور ذمہ داری کو پورا کرے، حضرت ذوالکفل اپنے اس عہد پر پورے اُترے۔ (ابن کثیر)

مسند احمد میں ایک روایت اور بھی ہے مگر اسمیں ذوالکفل کے بجائے الکفل کا نام آیا ہے۔ اسی لئے ابن کثیر نے اُس روایت کو نقل کرکے کہا کہ یہ کوئی دوسرا شخص کفل نامی ہے وہ ذوالکفل جنکا ذکر اس آیت میں آیا ہے وہ نہیں۔ روایت یہ ہے :-

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سُنی ہے اور ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ سات مرتبہ سے زائد سُنی ہے وہ یہ کہ آپؐ نے فرمایا کہ کِفل بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا جو کسی گناہ سے پرہیز نہ کرتا تھا، اُسکے پاس ایک عورت آئی اُسنے اسکو ساٹھ دینار (گنیاں) دیں اور فعل حرام پر اسکو راضی کرلیا۔ جب وہ مباشرت کے لئے بیٹھ گیا تو یہ عورت کانپنے اور رونے لگی اُس نے کہا کہ رونے کی کیا بات ہے کیا میں نے تم پر کوئی جبر اور زبردستی کی ہے۔ اس نے کہا نہیں جبر تو نہیں کیا، لیکن یہ ایسا گناہ ہے جو میں نے کبھی عمر بھر نہیں کیا اور اسوقت مجھے اپنی ضرورت نے مجبور کردیا اس لئے اسپر آمادہ ہوگئی یہ سنکر وہ شخص

اسی حالت میں عورت سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ جاؤ یہ دینار بھی تمھارے ہیں اور اب سے کفل بھی کوئی گناہ نہیں کریگا، اتفاق یہ ہوا کہ اسی رات میں کفل کا انتقال ہو گیا اور صبح اسکے دروازے پر غیب سے یہ تحریر لکھی ہوئی دیکھی گئی غفر اللہ للکفل یعنی اللہ نے کفل کو بخش دیا ہے۔

ابن کثیر نے یہ روایت مسند احمد کی نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس کو صحاح ستہ میں سے کسی نے روایت نہیں کیا اور اسناد اسکی غریب ہے اور بہرحال اگر روایت ثابت بھی ہے تو اسمیں ذکر کفل کا ہے ذوالکفل کا نہیں، یہ کوئی دوسرا شخص معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ذوالکفل حضرت یسع نبی کے خلیفہ اور ولی صالح تھے اُن کے خاص محبوب اعمال کی بنا پر ہو سکتا ہے کہ اُن کا ذکر اس آیت میں بزمرہ انبیار کر دیا گیا اور اسمیں بھی کوئی بعد نہیں معلوم ہوتا کہ شروع میں یہ حضرت یسع کے خلیفہ ہی ہوں پھر حق تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت عطا فرما دیا ہو واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي

اور مچھلی والے کو جب چلا گیا غصہ ہو کر پھر سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے اس کو پھر پکارا ان

الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

اندھیروں میں کہ کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے تو بے عیب ہے میں تھا گنہگاروں سے

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُـنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾

پھر سن لی ہم نے اسکی فریاد اور بچا دیا اسکو اس گھٹنے سے اور یونہی ہم بچا دیتے ہیں ایمان والوں کو

خلاصۂ تفسیر

اور مچھلی والے (پیغمبر یعنی یونس علیہ السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجئے جب وہ (اپنی قوم سے جبکہ وہ ایمان نہ لائی) خفا ہو کر چل دیئے (اور انکی قوم پر سے عذاب ٹلنے کے بعد بھی خود واپس نہ آئے اور اس سفر کے لئے ہمارے حکم کا انتظار نہیں کیا) اور اُنھوں نے (اپنے اجتہاد سے) یہ سمجھا کہ ہم (اس چلے جانے میں) اُن پر کوئی دار وگیر نہ کریں گے (یعنی چونکہ اس فرار کو انھوں نے اپنے اجتہاد سے جائز سمجھا اس لئے وحی کا انتظار نہ کیا لیکن چونکہ اُمید وحی تک وحی کا انتظار انبیار کے لئے مناسب ہے اور یہ مناسب کام اُن سے ترک ہو گیا لہٰذا ان کو یہ ابتلا پیش آیا کہ راستہ میں اُن کو کوئی دریا ملا اور وہاں کشتی میں سوار ہوئے، کشتی چلتے چلتے رُک گئی یونس علیہ السلام سمجھ گئے کہ میرا یہ بلا اجازت فرار ناپسند ہوا اس کی وجہ سے یہ کشتی رُکی، کشتی والوں سے فرمایا کہ مجھ کو دریا میں ڈالدو، وہ راضی نہ ہوئے

غرض قُرعہ پر اتفاق ہوا تب بھی ان ہی کا نام نکلا، آخر اُن کو دریا میں ڈالدیا اور خدا کے حکم سے انکو ایک مچھلی نے نگل لیا، اخرجہ ابن ابی حاتم عن ابن عباس کذا فی الدر المنثور) پس اُنھوں نے اندھیروں میں پکارا (ایک اندھیرا مچھلی کے پیٹ کا، دوسرا دریا کے پانی کا دونوں گہرے اندھیرے جو بہت سے اندھیروں کے قائم مقام، یا تیسرا اندھیرا رات کا، قالہ ابن مسعودؓ کما فی الدر المنثور، غرض ان تاریکیوں میں دُعا کی) کہ آپکے سوا کوئی معبود نہیں (یہ توحید ہے) آپ سب نقائص سے) پاک ہیں (یہ تنزیہ ہے) میں بیشک قصوروار ہوں (یہ استغفار ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ میرا قصور معاف کرکے اس شدت سے نجات دیجئے) سو ہم نے اُن کی دُعا قبول کی اور اُن کو اس گھٹن سے نجات دی (جسکا قصہ سورۂ صافات میں فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَاۗءِ الخ میں مذکور ہے) اور ہم اسی طرح (اور) ایمان والوں کو (بھی کرب اور غم سے) نجات دیا کرتے ہیں (جبکہ چندے غم میں رکھنا مصلحت نہ ہو)۔

معارف و مسائل

ذَا النُّوْنِ، حضرت یونس بن متی علیہ السلام کا قصہ قرآن کریم نے سُورۂ یونس سورۂ انبیاء پھر سورۂ صافات اور سورۂ نون میں ذکر فرمایا کہیں ان کا اصل نام ذکر فرمایا ہے کہیں ذوالنون یا صاحب الحوت کے القاب سے ذکر کیا گیا ہے۔ نون اور حوت دونوں کے معنے مچھلی کے ہیں ذوالنون اور صاحب الحوت کا ترجمہ ہے مچھلی والا، حضرت یونس علیہ السلام کو بتقدیر الٰہی چند روز بطن ماہی میں رہنے کا واقعہ غریبہ پیش آیا تھا اس کی مناسبت سے ان کو ذوالنون بھی کہا جاتا ہے اور صاحب الحوت کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا۔

قصہ یُونس علیہ السلام | تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ یُونس علیہ السلام کو علاقہ موصل کی ایک بستی نینوٰی کے لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یُونس علیہ السلام نے ان کو ایمان و عمل صالح کی دعوت دی، اُنھوں نے تمرّد اور سرکشی سے کام لیا۔ یونس علیہ السلام ان سے ناراض ہو کر بستی سے نکل گئے اور اُن کو کہدیا کہ تین دن کے اندر تمھارے اوپر عذاب آجائیگا۔ یُونس علیہ السلام بستی چھوڑ کر نکل گئے تو ان کو فکر ہوئی کہ اب عذاب آہی جائیگا (اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب کے بعض آثار کا اُن کو مشاہدہ بھی ہوگیا) تو اُنھوں نے اپنے شرک و کفر سے توبہ کی اور بستی کے سب مرد عورت اور بچے جنگل کیطرف نکل گئے اور اپنے مویشی جانوروں اور اُن کے بچوں کو بھی ساتھ لے گئے اور بچوں کو اُن کی ماؤں سے الگ کر دیا اور سب نے گریہ وزاری کرنا شروع کی اور الحاح وزاری کے ساتھ اللہ سے پناہ مانگی، جانوروں کے بچوں نے جن کو اُن کی ماؤں سے الگ کر دیا گیا تھا الگ شور و غل کیا۔ حق تعالےٰ نے اُن کی سچّی توبہ اور الحاح وزاری کو قبول کرلیا

اور عذاب اُن سے ہٹا دیا۔ ادھر حضرت یونس علیہ السلام اس انتظار میں رہے کہ قوم پر عذاب آرہا ہے وہ ہلاک ہوگئی ہوگی جب اُن کو یہ پتہ چلا کہ عذاب نہیں آیا اور قوم صحیح سالم اپنی جگہ ہے تو (ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اب میں جھوٹا سمجھا جاؤں گا، اور بعض روایات میں ہے کہ اُن کی قوم میں یہ رسم جاری تھی کہ کسی کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے تو اس کو قتل کر دیا جاتا تھا (مظہری) اسلئے حضرت یونس علیہ السلام کو اپنی جان کا بھی خطرہ لاحق ہوگیا تو) یونس علیہ السلام نے اپنی قوم میں واپس جانے کے بجائے کسی دوسری جگہ کو ہجرت کرنیکے کے قصد سے سفر اختیار کیا راستہ میں دریا تھا اسکو پار کرنے کے لئے ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ اتفاق سے کشتی ایسے گرداب میں پھنسی کہ غرق ہونے کا خطرہ لاحق ہوگیا ملاحوں نے یہ طے کیا کہ کشتی میں سوار لوگوں میں سے ایک کو دریا میں ڈالدیا جائے تو باقی لوگ غرقابی سے محفوظ رہ سکیں گے۔ اس کام کے لئے کشتی والوں کے نام پر قرعہ اندازی کی گئی اتفاق سے قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام پر نکل آیا (کشتی والے شاید آپکی بزرگی سے واقف تھے) ان کو دریا میں ڈالنے سے انکار کیا اور دوبارہ قرعہ ڈالا پھر بھی اسمیں نام یونس علیہ السلام کا نکلا، ان کو پھر بھی تامل ہوا تو تیسری مرتبہ قرعہ ڈالا پھر بھی اُنھیں کا نام نکل آیا۔ اسی قرعہ اندازی کا ذکر قرآن کریم میں دوسری جگہ ان الفاظ سے آیا ہے فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ یعنی قرعہ اندازی کی گئی تو یونس علیہ السلام ہی اس قرعہ میں متعین ہوئے۔ اس وقت یونس علیہ السلام کھڑے ہوگئے اور اپنے غیر ضروری کپڑے اُتار کر اپنے آپ کو دریا میں ڈالدیا اُدھر حق تعالیٰ نے بحر اخضر سے ایک مچھلی کو حکم دیا وہ دریاؤں کو چیرتی پھاڑتی فوراً یہاں پہنچ گئی (کما قالہ ابن مسعودؓ) اور یونس علیہ السلام کو اپنے اندر لے لیا۔ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو یہ ہدایت فرمادی تھی کہ نہ ان کے گوشت کو کوئی نقصان پہنچے نہ ہڈی کو یہ تیری غذا نہیں بلکہ تیرا پیٹ چند روز کے لئے ان کا قید خانہ ہے (یہاں تک یہ سب واقعہ روایت ابن کثیر میں ہے۔ بجز اُن کلمات کے جو قوسین میں لئے گئے ہیں وہ دوسری کتابوں سے لئے ہوئے ہیں) قرآن کریم کے اشارات اور بعض تصریحات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کا بغیر اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کے اپنی قوم کو چھوڑ کر نکل جانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند ہوا اسی پر عتاب نازل ہوا اور دریا میں پھر مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی نوبت آئی۔

حضرت یونس علیہ السلام نے جو قوم کو تین دن کے اندر عذاب آجانے سے ڈرایا تھا ظاہر یہ ہے کہ یہ اپنی رائے سے نہیں بلکہ وحی الٰہی سے ہوا تھا اور اسوقت قوم کو چھوڑ کر ان سے الگ ہو جانا بھی جو قدیم عادت انبیاء علیہم السلام کی ہے ظاہر یہ ہے کہ یہ بھی بحکم خداوندی ہوا ہوگا یہاں تک کوئی بات لغزش کی موجب عتاب نہیں تھی مگر جب قوم کی سچی توبہ اور الحاح وزاری کو اللہ تعالیٰ نے قبول

فرماکر ان سے عذاب ہٹا دیا اُس وقت حضرت یونس علیہ السلام کا اپنی قوم میں واپس نہ آنا اور بقصدِ ہجرت سفر اختیار کرنا یہ اپنے اس اجتہاد کی بنا پر ہوا کہ اس حالت میں اگر میں واپس اپنی قوم میں گیا تو جھوٹا سمجھا جاؤں گا اور میری دعوت بے اثر بے فائدہ ہو جاوے گی بلکہ اپنی جان کا بھی خطرہ ہے اور اگر میں اُنکو چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں تو یہ بات اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابلِ مواخذہ و گرفت نہیں ہوگی اپنے اجتہاد کی بنا پر ہجرت کا قصد کر لینا اور اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کا انتظار نہ کرنا اگرچہ کوئی گناہ نہیں تھا مگر اللہ تعالیٰ کو یونس علیہ السلام کا یہ طرزِ عمل پسند نہ آیا کہ وحی کا انتظار کئے بغیر ایک فیصلہ کر لیا یہ گرچہ کوئی گناہ نہیں تھا مگر خلافِ اولیٰ ضرور ہوا۔ انبیاء علیہم السلام اور مقربانِ بارگاہِ الٰہی کی شان بہت بلند ہوتی ہے اُن کو مزاج شناس ہونا چاہیئے، اُن سے اس معاملے میں اُدنیٰ کوتاہی ہوتی ہے تو اس پر بھی عتاب اور گرفت ہوتی ہے یہی معاملہ تھا جس پر عتاب ہوا۔

تفسیر قرطبی میں قشیری سے بھی نقل کیا کہ ظاہر یہ ہے کہ یہ صورتِ غضب یونس علیہ السلام کی اُس وقت پیش آئی جبکہ قوم سے عذاب ہٹ گیا ان کو یہ پسند نہ تھا، اور مچھلی کے پیٹ میں چند روز رہنا بھی کوئی تعذیب نہیں بلکہ تادیب کے طور پر تھا جیسے اپنے نابالغ بچوں پر زجر و تنبیہ تعذیب نہیں ہوتی تادیب ہوتی ہے تاکہ آئندہ وہ احتیاط برتیں (قرطبی) واقعہ سمجھ لینے کے بعد آیاتِ مذکورہ کے الفاظ کی تفسیر دیکھئے۔

ذَهَبَ مُغَاضِبًا، یعنی چلے گئے غصہ میں آکر، ظاہر ہے کہ مُراد اس سے اپنی قوم پر غصہ ہے حضرت ابن عباس رضؓ سے یہی منقول ہے اور جن حضرات نے مغاضبا کا مفعول ربّ کو قرار دیا ہے اُن کی مُراد بھی مغاضبا لربہ ہے یعنی اپنے رب کے لئے غصہ میں بھر کر چل دیئے اور کفار فجار سے اللہ کے لئے غصہ کرنا عین علامتِ ایمان ہے (کذا فی القرطبی والبحر المحیط)

فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ، لفظ نَقْدِرَ میں باعتبار لغت ایک احتمال تو یہ ہے کہ مصدر قدرت سے مشتق ہو تو معنے یہ ہونگے کہ اُنھوں نے یہ گمان کر لیا کہ ہم اُن پر قدرت اور قابو نہ پا سکیں گے ظاہر ہے کہ یہ بات کسی پیغمبر سے تو کیا کسی مسلمان سے بھی اسکا گمان نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسا سمجھنا کفر صریح ہے اس لئے یہاں یہ معنے قطعاً نہیں ہو سکتے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ مصدر قدر سے مشتق ہو جس کے معنے تنگی کرنے کے ہیں جیسے قرآن کریم میں ہے اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ یعنی اللہ تعالیٰ وسعت کر دیتا ہے رزق میں جس کے لئے چاہے اور تنگ کر دیتا ہے جس پر چاہے۔

ائمہ تفسیر میں سے عطاء، سعید بن جبیر، حسن بصری، اور بہت سے علماء نے یہی معنے اس آیت میں لئے ہیں اور مراد آیت کی یہ قرار دی کہ حضرت یونس علیہ السلام کو اپنے قیاس و اجتہاد سے یہ گمان تھا کہ ان حالات میں اپنی قوم کو چھوڑ کر کہیں چلے جانے کے بارے میں مجھ پر کوئی تنگی نہیں کی جائیگی۔

اور تیسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ لفظ قَدَر بمعنے تقدیر سے مشتق ہے جس کے معنے قضاء اور فیصلہ دینے کے ہیں تو معنے آیت کے یہ ہونگے کہ حضرت یونس علیہ السلام کو یہ گمان ہو گیا کہ اس معاملہ میں مجھ پر کوئی گرفت اور مواخذہ نہیں ہوگا۔ ائمہ تفسیر میں سے قتادہ اور مجاہد اور فراء نے اسی معنے کو اختیار کیا ہے۔ بہرحال پہلے معنے کا تو اس جگہ کوئی احتمال نہیں دوسرے یا تیسرے معنے ہو سکتے ہیں۔

دُعاء یونس علیہ السلام ہر شخص کے لئے ہر زمانے میں ہر مقصد کے لئے مقبول ہے

وَكَذٰلِكَ نُـْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ، یعنی جس طرح ہم نے یونس علیہ السلام کو غم اور مصیبت سے نجات دی اسیطرح ہم سب مؤمنین کیساتھ بھی یہی معاملہ کرتے ہیں جبکہ وہ صدق و اخلاص کیساتھ ہماری طرف متوجہ ہوں اور ہم سے پناہ مانگیں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ذوالنون کی وہ دُعا جو اُنھوں نے بطنِ ماہی کے اندر کی تھی یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ، جو مسلمان اپنے کسی مقصد کے لئے ان کلمات کیساتھ دُعا کریگا اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمادینگے (رواہ احمد والترمذی والحاکم وصححہ من حدیث سعد بن ابی وقاص - از مظہری)

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور زکریا کو جب پکارا اس نے اپنے رب کو، اے رب نہ چھوڑ تو مجھ کو اکیلا اور تو ہے سب سے بہتر وارث

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡوَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا

پھر ہم نے سُن لی اسکی دُعا اور بخشا اس کو یحییٰ اور اچھا کر دیا اس کی عورت کو وہ لوگ دوڑتے

يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۰﴾

تھے بھلائیوں پر اور پکارتے تھے ہم کو توقع سے اور ڈر سے اور تھے ہمارے آگے عاجز

خلاصۂ تفسیر

اور زکریا (علیہ السلام کے قصہ) کا تذکرہ کیجیے جب کہ اُنھوں نے اپنے رب کو پکارا کہ اے میرے رب مجھ کو لاوارث نہ رکھیو (یعنی مجھ کو فرزند دیجئے جو میرا وارث ہو) اور (یوں تو) سب وارثوں سے بہتر (یعنی حقیقی وارث) آپ ہی ہیں (اسلئے فرزند بھی وارث حقیقی نہ ہوگا بلکہ ایک وقت وہ بھی فنا ہو جاویگا لیکن اس ظاہری وارث سے بعض دینی فوائد اور منافع حاصل ہو جائیں گے اسلئے اسکی طلب ہے) سو ہم نے انکی دُعا قبول کرلی اور ہم نے انکو یحییٰ (فرزند) عطا فرمایا اور انکی خاطر سے اُن کی بی بی کو بھی (جو بانجھ تھیں) اولاد کے قابل کر دیا یہ سب (انبیاء جنکا اس سورت میں ذکر ہوا ہے) نیک کاموں میں دوڑتے تھے اور اُمید و بیم کیساتھ ہماری عبادت کیا کرتے تھے اور ہمارے سامنے دَب کر رہتے تھے۔

معارف و مسائل

حضرت زکریا علیہ السلام کی خواہش تھی کہ ایک فرزند وارث عطا ہو اُس کی دعا مانگی مگر ساتھ ہی یہ بھی عرض کردیا کہ اَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ کہ بیٹا ملے یا نہ ملے ہر حال میں آپ تو بہتر وارث ہیں یہ پیغمبرانہ رعایتِ ادب ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی اصل توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہونا چاہیے غیر اللہ کیطرف اُن کی توجہ ہو بھی تو اصل مرکز سے نہ ہٹنے پاوے۔

يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا، وہ رغبت و خوف یعنی راحت اور تکلیف کی ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اور اسکے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ اپنی عبادت و دُعا کے وقت اُمید و بیم دونوں کے درمیان رہتے ہیں اللہ تعالیٰ سے قبول اور ثواب کی اُمید بھی رہتی ہے اور اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے خوف بھی (قرطبی)

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَ

اور وہ عورت جس نے قابو میں رکھی اپنی شہوت پھر پھونک دی ہم نے اُس عورت میں اپنی روح اور کیا اسکو اور

ابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾

اسکے بیٹے کو نشانی جہان والوں کے واسطے

خلاصۂ تفسیر

اور اُن بی بی (مریم کے قصہ) کا بھی تذکرہ کیجیے جنھوں نے اپنے ناموس کو (مردوں سے) بچایا (نکاح سے بھی اور ناجائز سے بھی) پھر ہم نے اُن میں (بواسطہ جبرئیل علیہ السلام) اپنی روح پھونک دی (جس سے اُن کو بے شوہر کے حمل رہ گیا) اور ہمنے ان کو اور اُن کے فرزند (عیسٰی علیہ السلام) کو دُنیا جہان والوں کے لئے (اپنی قدرتِ کاملہ کی) نشانی بنادیا (کہ اُن کو دیکھ سُنکر سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے وہ بغیر باپ کے بھی اولاد پیدا کرسکتا ہے اور بغیر ماں اور باپ کے بھی جیسا کہ آدم علیہ السلام)۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ وَ

یہ لوگ ہیں تمہارے دین کے سب ایک دین پر اور میں ہوں رب تمہارا سو میری بندگی کرو اور

تَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۭ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ

ٹکڑے ٹکڑے بانٹ لیا لوگوں نے آپس میں اپنا کام سب ہمارے پاس پھر آئیں گے سو جو کوئی کرے کچھ

ع ۶ / ۸

الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾

نیک کام اور وہ رکھتا ہو ایمان سو اکارت نہ کریں گے اسکی سعی کو اور ہم اس کو لکھ لیتے ہیں

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حَتّٰٓى اِذَا

اور مقرر ہو چکا ہر بستی پر جس کو غارت کر دیا ہم نے کہ وہ پھر کر نہیں آئیں گے یہاں تک کہ جب

فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾

کھول دیئے جائیں یاجوج اور ماجوج اور وہ ہر اونچان سے پھیلتے چلے آئیں

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ

اور نزدیک آ لگے سچا وعدہ پھر اس دم اوپر لگی رہ جائیں منکروں کی آنکھیں

كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۹۷﴾

ہائے کم بختی ہماری ہم بے خبر رہے اس سے، نہیں، پر ہم تھے گنہگار

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا

تم اور جو کچھ تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے ایندھن ہے دوزخ کا تم کو اس پر

وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَاۗءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا

پہنچنا ہے اگر ہوتے یہ بت معبود تو نہ پہنچتے اس پر اور سارے اس میں

خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ اِنَّ

سدا پڑے رہیں گے ان کو وہاں چلانا ہے اور وہ اسمیں کچھ نہ سنیں گے جن کے

الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰۗىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

لئے پہلے سے ٹھہر چکی ہماری طرف سے نیکی وہ اس سے دور رہیں گے

لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

نہیں سنیں گے اس کی آہٹ اور وہ اپنے جی کے مزوں میں سدا رہیں گے

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ۭ هٰذَا يَوْمُكُمُ

نہ غم ہوگا ان کو اس بڑی گھبراہٹ میں اور لینے آئیں گے ان کو فرشتے آج دن تمہارا ہے

الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاۗءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ

جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا جس دن ہم لپیٹ لیویں آسمان کو جیسے لپیٹتے ہیں طومار میں

لِلْكُتُبِ ۭ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا

کاغذ جیسا سرے سے بنایا تھا ہم نے پہلی بار، پھر اسکو دہرائیں گے، وعدہ ضرور ہو چکا ہے ہم پر ہم کو

فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ

پورا کرنا ہے اور ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں نصیحت کے پیچھے کہ آخر زمین پر مالک ہونگے

يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾
میرے نیک بندے

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات | یہاں تک انبیار علیہم السلام کے قصص اور واقعات اور اُن کے ضمن میں بہت سے اُصولی اور فروعی مسائل کا بیان تھا۔ اُصول مثلاً توحید و رسالت اور عقیدۂ آخرت، سب انبیار علیہم السلام میں اُصول مشترک ہیں جو اُن کی دعوت کی بنیاد ہے جیسا کہ واقعاتِ مذکورہ میں ان حضرات کی سب کوششوں کا محور توحیدِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کا مضمون تھا۔ اگلی آیات میں بطورِ نتیجۂ قصص توحید کا اثبات اور شرک کی مذمت کا بیان ہے۔

اے لوگو (اُوپر جو انبیار علیہم السلام کا طریقہ و عقیدہ توحید کا معلوم ہو چکا ہے) یہ تمھارا طریقہ ہے (جس پر تم کو رہنا واجب ہے) کہ وہ ایک ہی طریقہ ہے (جسمیں کسی نبی اور کسی شریعت کو اختلاف نہیں ہوا) اور (حاصل اس طریقہ کا یہ ہے کہ) میں تمھارا رب ہوں تو تم میری عبادت کیا کرو اور (لوگوں کو چاہئے تھا کہ جب یہ ثابت ہو چکا کہ تمام انبیار اور تمام آسمانی کتابیں اور شریعتیں اسی طریقہ کی داعی ہیں تو وہ بھی اسی طریقہ پر رہتے مگر ایسا نہ کیا بلکہ) ان لوگوں نے اپنے دین میں اختلاف پیدا کر لیا (مگر اس کی سزا دیکھیں گے کیونکہ) سب ہمارے پاس آنے والے ہیں (اور آنے کے بعد ہر ایک کو اسکے عمل کا بدلہ ملیگا) تو جو شخص نیک کام کرتا ہوگا اور وہ ایمان والا بھی ہوگا تو اس کی محنت اکارت جانے والی نہیں اور ہم اسکو لکھ لیتے ہیں (جسمیں بھول اور خطا کا امکان نہیں رہتا اُس لکھے ہوئے کے مطابق اس کو ثواب ملیگا) اور (ہم نے جو یہ کہا ہے کہ سب کے سب ہمارے پاس آنیوالے ہیں اسمیں منکرین یہ شبہ کرتے ہیں کہ دُنیا کی اتنی عمر گزر چکی ہے اب تک تو ایسا ہوا نہیں کہ مُردے زندہ ہوئے ہوں اُن کا حساب ہوا ہو، اُن کا یہ شبہ اسلئے غلط ہے کہ اللہ کی طرف لوٹنے کے لئے ایک دن قیامت کا مقرر ہے اُس سے پہلے کوئی نہیں لوٹتا، یہی وجہ ہے کہ) ہم جن بستیوں کو (عذاب یا موت سے) فنا کر چکے ہیں اُن کے لئے یہ بات (با متناع شرعی) ناممکن ہے کہ وہ (دُنیا میں حساب کتاب کے لئے) پھر لوٹ کر آدیں (مگر یہ نہ لوٹنا دائمی نہیں بلکہ وقت موعود یعنی قیامت تک ہے) یہاں تک کہ جب (وہ وقت مَوعود آپہنچیگا جس کا ابتدائی سامان یہ ہوگا کہ) یاجوج ماجوج (جنکا اب سدِ ذوالقرنین کے ذریعہ راستہ رُکا ہوا ہے وہ) کھولدیئے جاویں گے اور وہ (انتہائی کثرت کے سبب) ہر بلندی (ٹیلہ اور پہاڑ) سے نکلتے (معلوم) ہونگے اور (اللہ کیطرف لوٹنے کا سچا وعدہ) نزدیک آپہنچا

ہوگا تو بس پھر یکایک یہ حالت ہو جائے گی کہ منکروں کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ جاویں گی (اور وہ یوں کہتے نظر آویں گے) ہائے ہماری کم بختی ہم اس سے غفلت میں تھے (پھر کچھ سوچ کر کہیں گے کہ اسکو غفلت تو جب کہا جا سکتا کہ کسی نے ہمیں آگاہ نہ کیا ہوتا) بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) ہم ہی قصور وار تھے (حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کے منکر تھے وہ بھی اسوقت اسکے قائل ہو جاویں گے آگے مشرکین کے لئے وعید ہے) بلاشبہ تم اور جسکو تم خدا کے سوا پوج رہے ہو سب جہنم میں جھونکے جاؤ گے (اور) تم سب اسمیں داخل ہوگے (اسمیں وہ انبیاء اور فرشتے داخل نہیں ہو سکتے جن کو دنیا میں بعض مشرکین نے خدا اور معبود بنالیا تھا کیونکہ اُن میں ایک مانع شرعی موجود ہے کہ وہ اسکے مستحق نہیں اور نہ ان کا اسمیں کوئی قصور ہے آگے آیت میں اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ سے بھی اس شبہ کو دفع کیا گیا ہے اور یہ بات سمجھنے کی ہے کہ) اگر (یہ تمہارے معبود) واقعی معبود ہوتے، تو اس (جہنم) میں کیوں جاتے اور (جانا بھی ایسا کہ چند روزہ نہیں بلکہ سب (عابدین اور معبودین) اسمیں ہمیشہ کو رہیں گے (اور) اُن کا اسمیں شور و غل ہوگا اور وہاں (اپنے شور و غل میں) کسی کی کوئی بات سُنیں گے بھی نہیں (یہ تو دوزخیوں کا حال ہوا اور) جن کے لئے ہماری طرف سے بھلائی مقدر ہو چکی ہے (اور اسکا ظہور اُن کے اعمال و افعال میں ہوا) وہ لوگ اس (دوزخ) سے (اسقدر) دُور رکھے جاویں گے کہ اسکی آہٹ بھی نہ سُنیں گے (کیونکہ یہ لوگ جنت میں ہونگے اور جنت دوزخ میں بڑا بُعد ہے) اور وہ لوگ اپنی جی چاہی چیزوں میں ہمیشہ رہیں گے (اور) ان کو بڑی گھبراہٹ (یعنی قیامت میں زندہ ہونے اور محشر کے ہولناک مناظر دیکھنے کی حالت) غم میں نہ ڈالے گی اور (قبر سے نکلتے ہی) فرشتے ان کا استقبال کریں گے (اور کہیں گے) یہ ہے تمہارا وہ دن جسکا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا (یہ اکرام کا معاملہ اور بشارت اُن کے لئے زیادہ خوشی و مسرت کا سبب ہو جائیگا اور اگر کسی روایت سے یہ ثابت ہو جائے کہ قیامت کے ہول اور خوف سے کوئی مستثنیٰ نہیں سب کو پیش آئیگا تو چونکہ نیک بندوں کے لئے اسکا زمانہ بہت قلیل ہوگا اسلئے وہ کالعدم ہے اور) وہ دن (بھی) یاد کرنے کے قابل ہے جس روز ہم (نفخۂ اولیٰ کے بعد) آسمانوں کو اسطرح لپیٹ دینگے جس طرح لکھے ہوئے مضامین کا کاغذ لپیٹ دیا جاتا ہے (پھر لپیٹنے کے بعد خواہ معدوم محض کر دیا جائے یا نفخۂ ثانیہ تک اسی حالت پر رہے دونوں باتیں ممکن ہیں اور) ہم نے جس طرح اوّل بار پیدا کرنیکے وقت (ہر چیز کی) ابتداء کی تھی اسی طرح (آسانی سے) اس کو دوبارہ پیدا کر دینگے یہ ہمارے ذمہ وعدہ ہے ہم ضرور (اسکو پورا) کریں گے اور (اوپر جو نیک بندوں سے ثواب نعمت کا وعدہ ہوا ہے وہ بہت قدیم اور مؤکد وعدہ ہے چنانچہ ہم (سب آسمانی) کتابوں میں لوح محفوظ (میں لکھنے) کے بعد لکھ چکے ہیں کہ اس زمین (جنت) کے مالک میرے نیک بندے ہونگے (قدامت اس

وعدہ کی تو اس سے ظاہر ہے کہ لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے اور تاکید اس بات سے کہ کوئی آسمانی کتاب اس سے خالی نہیں)

معارف و مسائل

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ، اس جگہ لفظ حرام بمعنے ممتنع شرعی کے آیا ہے جسکا ترجمہ خلاصہ تفسیر میں ناممکن سے کیا گیا ہے اور لَا يَرْجِعُوْنَ میں اکثر حضرات مفسرین کے نزدیک حرف لَا زائدہ ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ جو بستی اور اسکے آدمی ہمنے ہلاک کردیئے ہیں انکے لئے محال ہے کہ وہ پھر لوٹ کر دُنیا میں آجائیں اور بعض حضرات مفسرین نے لفظ حرام کو اس جگہ بمعنی واجب قرار دیکر لَا کو اپنے معروف معنی نفی کے لئے رکھا ہے اور مفہوم آیت کا یہ لکھا ہے کہ واجب ہے اس بستی پر جسکو ہم نے عذاب سے ہلاک کردیا ہے کہ وہ دُنیا میں نہیں لوٹیں گے (قرطبی) آیت کا مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہوجاتا ہے۔ اگر کوئی دُنیا میں آکر عمل صالح کرنا چاہے تو اسکا موقع نہیں ملیگا، اب تو صرف روز قیامت کی زندگی ہوگی

حَتّٰىٓ اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ، لفظ حَتّٰى سابق مضمون پر تفریع و ترتیب کیطرف اشارہ کرتا ہے۔ آیت سابقہ میں یہ کہا گیا تھا کہ جو لوگ کفر پر مرچکے ہیں اُن کا دوبارہ دُنیا میں زندہ ہوکر لوٹنا ناممکن ہے اس عدم امکان کی انتہا یہ بتلائی گئی کہ دوبارہ زندہ ہوکر لوٹنا ناممکن اُسوقت تک ہے جبتک کہ یہ واقعہ یاجوج ماجوج کا پیش نہ آجائے جو قیامت کی قریبی علامت ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ رضؓ سے روایت ہے کہ ہم چند صحابہ ایک روز آپس میں کچھ مذاکرہ کررہے تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، دریافت فرمایا کہ کیا مذاکرہ تمھارے درمیان جاری ہے ہم نے عرض کیا کہ قیامت کا ذکر کررہے ہیں آپنے فرمایا کہ قیامت اسوقت تک قائم نہ ہوگی جب تک دس علامتیں اُس سے پہلے ظاہر نہ ہوجائیں۔ ان دس علامتوں میں خروج یاجوج ماجوج کا بھی ذکر فرمایا۔

آیت میں یاجوج ماجوج کے لئے لفظ فُتِحَتْ یعنی کھولنا استعمال فرمایا گیا ہے جس کے ظاہری معنے یہی ہیں کہ اسوقت سے پہلے وہ کسی بندش اور رکاوٹ میں رہیں گے قرب قیامت کے وقت جب اللہ تعالےٰ کو اُن کا نکلنا منظور ہوگا تو یہ بندش راستے سے ہٹادی جاویگی۔ اور ظاہر قرآن کریم سے یہ ہے کہ یہ رکاوٹ سدِّ ذوالقرنین ہے جو قربِ قیامت میں ختم ہوجاوے گی خواہ اس سے پہلے بھی وہ ٹوٹ چکی ہو مگر اُن کے لئے بالکل راستہ ہموار اُسی وقت ہوگا۔ سورہ کہف میں یاجوج ماجوج اور سدِّ ذوالقرنین کے محل وقوع اور دوسرے متعلقہ مسائل پر تفصیلی بحث ہوچکی ہے وہاں دیکھ لیا جاوے۔

مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ، لفظ حَدَبٍ ہر اونچی جگہ کو کہا جاتا ہے وہ بڑے پہاڑ ہوں یا چھوٹے چھوٹے ٹیلے۔ سورہ کہف میں جہاں یاجوج ماجوج کے محل وقوع پر گفتگو کی گئی ہے اس سے معلوم ہوچکا ہے کہ ان کی جگہ دُنیا کے شمالی پہاڑوں کے پیچھے ہے اس لئے خروج کے وقت اسی طرف

سے پہاڑوں ٹیلوں سے اُمنڈتے ہوئے نظر آئیں گے۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ، یعنی تم اور تمہارے معبود بجز اللہ کے سب کے سب جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ اس آیت میں تمام معبودات باطلہ جن کی ناجائز پرستش کفار کے مختلف گروہوں نے دنیا میں کی سب کا جہنم میں داخل ہونا بیان فرمایا گیا ہے اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ناجائز عبادت تو حضرت مسیحؑ اور عزیزؑ اور فرشتوں کی بھی کی گئی ہے تو سب کے جہنم میں جانیکا کیا مطلب ہوگا؟ اسکا جواب حضرت ابن عباسؓ نے دیا ہے اُن کی روایت تفسیر قرطبی میں اسطرح ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قرآن کی ایک آیت ایسی ہے جسمیں لوگ شبہات کرتے ہیں مگر عجیب اتفاق ہے کہ اسکے متعلق لوگ مجھ سے سوال نہیں کرتے، معلوم نہیں کہ شبہات کا جواب ان لوگوں کو معلوم ہوگیا ہے اسلئے سوال نہیں کرتے یا انھیں شبہ اور جواب کیطرف التفات ہی نہیں ہوا۔ لوگوں نے عرض کیا وہ کیا ہے؟ آپؓ نے فرمایا کہ وہ آیت اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ الآیۃ ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو کفار قریش کو سخت ناگوار ہوا اور کہنے لگے کہ اسمیں تو ہمارے معبودوں کی سخت توہین کی گئی ہے یہ لوگ (عالم اہل کتاب) ابن الزبعری کے پاس گئے اور اس کی شکایت کی اُس نے کہا کہ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو ان کو اسکا جواب دیتا۔ ان لوگوں نے پوچھا کہ آپ کیا جواب دیتے، اسنے کہا کہ میں اُن سے کہتا کہ نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کی اور یہود حضرت عزیز علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں اُن کے بارے میں آپؐ کیا کہیں گے (کیا معاذ اللہ وہ بھی جہنم میں جائیں گے) کفار قریش یہ سنکر بڑے خوش ہوئے کہ واقعی یہ بات تو ایسی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اسکا کوئی جواب نہیں دے سکتے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جو آگے آتی ہے اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ، یعنی جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے بھلائی اور اچھا نتیجہ مقدر ہو چکا ہے وہ اس جہنم سے بہت دُور رہیں گے۔

اور اسی ابن الزبعری کے متعلق قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ، یعنی جب ابن زبعری نے حضرت ابن مریم کی مثال پیش کی تو آپکی قوم کے لوگ قریش خوشی سے شور مچانے لگے۔

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ فزع اکبر سے مراد صور کا نفخہ ثانیہ ہے جس سے سب مردے زندہ ہو کر حساب کیلئے کھڑے ہونگے بعض حضرات نے نفخہ اولیٰ کو فزع اکبر قرار دیا ہے۔ ابن عربی کا قول یہ ہے کہ نفخات تین ہونگے پہلا نفخہ نفخہ فزع ہوگا جس سے ساری دُنیا کے لوگ گھبرا اٹھیں گے اسی کو یہاں فزع اکبر کہا گیا ہے۔ دوسرا نفخہ نفخہ صعق ہوگا جس سے سب مر جائیں گے اور فنا ہو جائیں گے، تیسرا نفخہ نفخہ بعث ہوگا جس سے سب مُردے زندہ ہو جائیں گے اس کی شہادت میں مسند ابو یعلی اور بیہقی، عبد بن حمید، ابو الشیخ، ابن جریر طبری

وغیرہ سے حضرت ابوہریرہ رضی کی ایک حدیث نقل کی گئی ہے (مظہری) واللہ اعلم۔

یَوۡمَ نَطۡوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلۡکُتُبِ لفظ سجل کے معنے حضرت ابن عباسؓ سے صحیفہ کے منقول ہیں علی بن طلحہ۔ عوفی۔ مجاہد۔ قتادہ وغیرہ نے بھی یہی معنے بیان کئے ہیں۔ ابن جریر ابن کثیر وغیرہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور کتب اس جگہ بمعنے المکتوب ہے معنی یہ ہیں کہ آسمان کو اسطرح لپیٹ دیا جائیگا جس طرح کوئی صحیفہ اپنے اندر لکھی ہوئی تحریر کیساتھ لپیٹ دیا جاتا ہے (کذا قال ابن کثیر ذکرہ فی الروح) سجل کے متعلق دوسری روایات کہ وہ کسی شخص یا فرشتہ کا نام ہے محدثین کے نزدیک ثابت نہیں (فصلہ ابن کثیر) آیت کے مفہوم کے متعلق صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز سب زمینوں اور آسمانوں کو لپیٹ کر اپنے ہاتھ میں رکھیں گے ابن ابی حاتم نے اپنی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں کو انکے اندر کی تمام مخلوقات کیساتھ اور ساتوں زمینوں کو انکی تمام مخلوقات کے ساتھ لپیٹ کر ایک جگہ کر دینگے اور وہ سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ایک رائی کے دانے کی مثل ہونگے (ابن کثیر)

وَلَقَدۡ کَتَبۡنَا فِی الزَّبُوۡرِ مِنۡۢ بَعۡدِ الذِّکۡرِ اَنَّ الۡاَرۡضَ یَرِثُہَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوۡنَ

لفظ زبور، زُبُرٌ کی جمع ہے جس کے معنی کتاب کے ہیں اور زبور اس خاص کتاب کا نام بھی ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اس جگہ زبور سے کیا مراد ہے اس میں اقوال مختلف ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک روایت میں یہ ہے کہ ذکر سے مراد آیت میں تورات ہے اور زبور سے مراد وہ سب کتابیں ہیں جو تورات کے بعد نازل ہوئیں۔ انجیل۔ زبور داؤد۔ اور قرآن (اخرجہ ابن جریر) یہی تفسیر ضحاک سے بھی منقول ہے۔ اور ابن زید نے فرمایا کہ ذکر سے مراد لوح محفوظ ہے اور زبور سے مراد تمام کتابیں جو انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئی ہیں۔ زجاج نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ (روح المعانی)

الۡاَرۡضَ، اس جگہ ارض سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک ارض جنت ہے۔ ابن جریر نے ابن عباسؓ سے یہ تفسیر نقل کی ہے اور یہی تفسیر مجاہد۔ ابن جبیر۔ عکرمہ۔ سدی اور ابو العالیہ سے بھی منقول ہے۔ امام رازیؒ نے فرمایا کہ قرآن کی دوسری آیت اسی کی مؤید ہے جس میں فرمایا ہے وَاَوۡرَثَنَا الۡاَرۡضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الۡجَنَّۃِ حَیۡثُ نَشَآءُ، اور آیت میں جو یہ فرمایا کہ اس ارض کے وارث صالحین ہونگے یہ بھی اسی کا قرینہ ہے کہ ارض سے ارض جنت مراد ہو۔ دنیا کی زمین کے وارث تو مومن کافر سبھی ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ یہاں صالحین کا وارث ارض ہونا ذکر قیامت کے بعد آیا ہے اور قیامت کے بعد جنت کی زمین کے سوا کوئی دوسری زمین نہیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس ارض سے مراد عام ارض ہے دنیا کی زمین بھی اور جنت کی زمین

بھی جنت کی زمین کے تو تنہا وارث صالحین ہونا ظاہر ہے۔ دُنیا کی پوری زمین کے وارث ہونا بھی ایک وقت میں مؤمنین صالحین کے لئے موعود ہے جس کی خبر قرآن کریم کی متعدد آیات میں دی گئی ہے۔ ایک آیت میں ہے، اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، ایک دوسری آیت میں ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ الآیۃ، تیسری ایک آیت میں اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ، مؤمنین صالحین کا دُنیا کے معظم معمورہ پر قابض اور وارث ہونا ایک مرتبہ دنیا پہلے مشاہدہ کر چکی ہے اور زمانہ دراز تک یہ صورت قائم رہی اور پھر مہدی علیہ السلام کے زمانے میں ہونے والی ہے (روح المعانی و ابن کثیر)

اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿١٠٦﴾ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً

اس میں مطلب کو پہنچتے ہیں لوگ بندگی والے　　اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو مہربانی کر کر

لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٧﴾ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ

جہان کے لوگوں پر　　تو کہہ مجھ کو تو حکم یہی آیا ہے کہ معبود تمہارا ایک معبود ہے　　پھر کیا ہو

اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٠٨﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَاۤءٍ ۭ وَاِنْ

تم حکمبرداری کرنے والے　　پھر اگر وہ منہ موڑیں تو تُو کہدے میں نے خبر کر دی تم کو دونوں طرف برابر، اور

اَدْرِيْۤ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿١٠٩﴾ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ

میں نہیں جانتا نزدیک ہے یا دُور ہے جو تم سے وعدہ ہوا　　وہ رب جانتا ہے جو بات

مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿١١٠﴾ وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ

پکار کر کرو　　اور جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو　　اور میں نہیں جانتا شاید تاخیر میں تمکو جانچنا ہے

لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿١١١﴾ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ وَرَبُّنَا

اور فائدہ دینا ہے ایک وقت تک　　رسول نے کہا اے رب فیصلہ کر انصاف کا　　اور رب ہمارا

الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰي مَا تَصِفُوْنَ ﴿١١٢﴾

رحمٰن ہے اسی سے مدد مانگتے ہیں ان باتوں پر جو تم بتلاتے ہو

خلاصۂ تفسیر

بلاشبہ اس (قرآن یا اسکے جز یعنی سورتِ مذکورہ) میں کافی مضمون ہے ان لوگوں کے لئے جو عبادت کرنے والے ہیں (اور جو عبادت اور اطاعت سے سرکشی کرنے والے ہیں یہ ہدایت تو ان کے لئے بھی ہے مگر انہیں ہدایت کی طلب نہیں، اس لئے اسکے فائدے سے محروم ہیں) اور ہم نے آپ کو کسی اور بات

کے واسطے (رسول بناکر) نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگوں پر (اپنی) مہربانی کرنے کے لئے (وہ مہربانی یہی ہے کہ لوگ رسول سے ان مضامین کو قبول کریں اور ہدایت کے ثمرات حاصل کریں اور جو قبول نہ کرے وہ اُسکا قصور ہے اُس سے اس مضمون کی صحت میں کوئی فرق نہیں پڑتا) آپ ان لوگوں سے (بطور خلاصہ کلام کے مکرر) فرما دیجئے کہ میرے پاس تو (موحدین اور مشرکین کے باہمی اختلاف کے بارے میں) صرف یہ وحی آئی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے تو (اس کی حقانیت ثابت ہوجانے کے بعد) اب بھی تم مانتے ہو (یا نہیں یعنی اب تو مان لو) پھر بھی اگر یہ لوگ (اسکے قبول کرنے سے) سرتابی کریں تو آپ (بطور اتمام حجت کے) فرما دیجئے کہ میں تم کو نہایت واضح اطلاع کر چکا ہوں (جسمیں ذرہ برابر خفاء و پوشیدگی نہیں رہی توحید اور حقانیت اسلام کی اطلاع بھی اور اسکے انکار پر جو سزا ملیگی وہ بھی صاف صاف بیان ہو چکی ہے اب نہ مجھ پر تبلیغ حق کی کوئی ذمہ داری باقی رہی نہ تمہارا کوئی عذر باقی رہا) اور اگر (اسکے حق ہونے میں تم کو اس وجہ سے شبہ ہو کہ جو سزا بتلائی گئی ہے وہ مل کیوں نہیں جاتی تو سمجھ لو کہ سزا کا ملنا تو یقینی ہے مگر) میں یہ نہیں جانتا کہ جس (سزا) کا تم سے وعدہ ہوا ہے آیا وہ قریب (واقع ہونیوالی ہے) یا دُور دراز (زمانے میں واقع ہونے والی) ہے (البتہ اُسکا واقع ہونا ضروری ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ کو (تمہاری) پکار کر کہی ہوئی بات کی بھی خبر ہے اور جو تم دل میں رکھتے ہو اُس کی بھی خبر ہے اور (تاخیر عذاب سے اسکے واقع نہونے کے دھوکے میں نہ رہنا یہ تاخیر کسی مصلحت و حکمت سے ہو رہی ہے) میں نہیں جانتا (کہ وہ مصلحت کیا ہے ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ) شاید (یہ تاخیر عذاب) تمہارے لئے امتحان ہو (کہ شاید متنبہ ہوکر ایمان لے آویں) اور ایک وقت (محدود یعنی موت کے وقت) فائدہ پہنچانا ہو (کہ خوب غفلت بڑھے اور عذاب بڑھتا چلا جائے۔ پہلا معاملہ یعنی امتحان رحمت ہے اور دوسرا معاملہ یعنی عمر دراز اور اُس کی سہولتیں دینا یہ عقوبت و سزا ہے، اور جب ان سب مضامین سے ہدایت نہ ہوئی تو) پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے (باذنِ الٰہی) کہا کہ اے میرے رب (ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان) فیصلہ کر دیجئے (جو کہ ہمیشہ) حق کے موافق (ہوا کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ عملی فیصلہ فرما دیجئے کہ مسلمانوں سے جو فتح و نصرت کے وعدے ہیں وہ واقع کر دیجئے تاکہ اُن پر اور زیادہ حجت تمام ہو جائے) اور (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار سے یہ بھی فرمایا کہ) ہمارا رب بڑا مہربان ہے جس سے اُن باتوں کے مقابلے میں مدد چاہی جائے جو تم بنایا کرتے ہو (کہ مسلمان جلد نیست و نابود ہو جاویں گے یعنی ہم اُسی مہربان رب سے تمہارے مقابلہ میں مدد چاہتے ہیں)۔

معارف و مسائل

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ، عالمین عالم کی جمع ہے جسمیں ساری مخلوقات

انسان، جن، حیوانات، نباتات، جمادات سبھی داخل ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سب چیزوں کے لئے رحمت ہونا اس طرح ہے کہ تمام کائنات کی حقیقی رُوح اللہ کا ذکر اور اُس کی عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت زمین سے یہ رُوح نکل جائے گی اور زمین پر کوئی اللہ اللہ کہنے والا نہ رہے گا تو ان سب چیزوں کی موت یعنی قیامت آجائیگی اور جب ذکر اللہ وعبادت کا ان سب چیزوں کی رُوح ہونا معلوم ہوگیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ان سب چیزوں کے لئے رحمت ہونا خود بخود ظاہر ہوگیا، کیونکہ اس دُنیا میں قیامت تک ذکر اللہ اور عبادت آپ ہی کے دَم قدم اور تعلیمات سے قائم ہے اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے انا رحمۃ مھداۃ میں اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی رحمت ہوں۔ (اخرجہ ابن عساکر عن ابی ھریرۃ) اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انا رحمۃ مھداۃ برفع قوم وخفض آخرین، یعنی میں اللہ کی بھیجی ہوئی رحمت ہوں تاکہ (اللہ کے حکم ماننے والی) ایک قوم کو سر بلند کردوں اور دوسری قوم (جو اللہ کا حکم ماننے والی نہیں اُنکو) پست کردوں (ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ کفر وشرک کو مٹانے کیلئے کفار کو پست کرنا اور اُن کے مقابلے میں جہاد کرنا بھی عین رحمت ہے جس کے ذریعہ سرکشوں کو ہوش آکر ایمان اور عمل صالح کا پابند ہوجانے کی اُمید کی جاسکتی ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تمّ تفسیر سُورَۃِ الْاَنْبِیَآءِ وللّٰہ الحمد لیلۃ السابع والعشرین من ذی الحجۃ الحرام سنۃ ۱۳۹۰ من الھجرۃ النبویۃ قبل العشاء ولہ الحمد اوّلاً وآخراً وظاھراً وباطناً وھو المرجوّ لاتمام الباقی وما ذٰلک علیہ بعزیز

رَبَّنا تقبّل منّا انّک انت السّمیع العلیم

سُوْرَةُ الحَجّ

سُوْرَةُ الحَجِّ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانٌ وَّسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّعَشْرُ رُكُوْعَاتٍ

سُورۂ حج مدینہ میں نازل ہوئی اور اسکی اٹھتر آیتیں ہیں اور دس رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝۱

لوگو ڈرو اپنے رب سے بیشک بھونچال قیامت کا ایک بڑی چیز ہے

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ

جس دن اسکو دیکھو گے بھول جائے گی ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پلائے کو اور ڈال دے گی

كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ

ہر پیٹ والی اپنا پیٹ اور تو دیکھے لوگوں پر نشہ اور اُن پر

بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝۲

نشہ نہیں پر آفت اللہ کی سخت ہے

خلاصۂ تفسیر

اے لوگو اپنے رب سے ڈرو (اور ایمان واطاعت اختیار کرو کیونکہ) یقیناً قیامت کا زلزلہ بڑی بھاری چیز ہوگی (جسکا آنا ضروری ہے اُس روز کے شدائد سے بچنے کی اب فکر کرو جسکا طریقہ تقویٰ ہے آگے اس زلزلہ کی شدت کا بیان ہے) جس روز تم لوگ اس (زلزلہ) کو دیکھو گے اُس روز (یہ حال ہوگا کہ) تمام دودھ پلانے والیاں (ہیبت و دہشت کی وجہ سے) اپنے دودھ پیتے (بچّہ) کو بھول جاویں گی اور تمام حمل والیاں اپنا حمل (دن پورے ہونے سے پہلے) ڈالدیں گی اور تجھکو (اے مخاطب) لوگ نشہ کی سی حالت میں دکھائی دیں گے حالانکہ وہ نشہ میں نہ ہوں گے (کیونکہ وہاں کسی نشہ کی چیز استعمال کرنے کا کوئی امکان واحتمال ہی نہیں) لیکن اللہ کا عذاب

ہی سخت چیز ہے (جس کے خوف کی وجہ سے اُن کی حالت نشہ والے کی سی ہو جاوے گی)۔

معارف و مسائل

خصوصیاتِ سورت | اس سورت کے مکی یا مدنی ہونے میں مفسرین کا اختلاف ہے حضرت ابن عباسؓ ہی سے دونوں روایتیں منقول ہیں۔ جمہور مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ سورت آیاتِ مکیہ اور مدنیہ سے مخلوط سورت ہے۔ قرطبی نے اسی کو اصح قرار دیا ہے۔ نیز فرمایا کہ اس سورت کے عجائب میں سے یہ بات ہے کہ اس کی آیات کا نزول بعض کا رات میں، بعض کا دن میں، بعض کا سفر میں بعض کا حضر میں، بعض کا مکہ میں، بعض کا مدینہ میں، بعض کا جنگ و جہاد کے وقت اور بعض کا صلح و امن کی حالت میں ہوا ہے اور اس میں بعض آیتیں ناسخ ہیں اور بعض منسوخ، بعض محکم ہیں بعض متشابہ کیونکہ تمام اصنافِ تنزیل پر مشتمل ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ، یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بحالتِ سفر نازل ہوئی تو آپ نے بلند آواز سے اس کی تلاوت شروع فرمائی۔ رفقاءِ سفر صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سُنکر جمع ہوگئے۔ آپؐ نے صحابہ کرام کو خطاب کر کے فرمایا کہ زلزلۂ قیامت جسکا ذکر اس آیت میں ہے آپ جانتے ہیں کہ کس دن میں ہوگا صحابہ کرام نے عرض کیا اللہ اور رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ وہ دن ہوگا جس میں اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام سے خطاب کر کے فرماویں گے کہ جہنم میں جانے والوں کو اُٹھائیے۔ آدم علیہ السلام دریافت کریں گے کہ وہ جہنم میں جانے والے کون لوگ ہیں تو حکم ہوگا کہ ہر ایک ہزار میں نو سو ننانوے، اور فرمایا کہ یہی وہ وقت ہوگا کہ ہول اور خوف سے بچے بوڑھے ہو جاویں گے اور حمل والی عورتوں کا حمل ساقط ہو جاویگا۔ صحابہ کرام یہ سُنکر سہم گئے اور پوچھنے لگے پھر یا رسول اللہ ہم میں سے وہ کون ہوگا جو نجات پائے تو فرمایا کہ تم بے فکر رہو جہنم میں جانے والا یاجوج ماجوج میں سے ایک ہزار اور تم میں سے ایک ہوگا۔ یہ مضمون صحیح مسلم وغیرہ کی روایات میں ابو سعید خدری رضؓ سے مروی ہے اور بعض روایات میں ہے کہ اُس روز تم ایسی دو مخلوقوں کے ساتھ ہوگے کہ وہ جب کسی جماعت کے ساتھ ہوں تو وہی تعداد میں غالب اور اکثر رہیں گے۔ ایک یاجوج ماجوج اور دوسرے ابلیس اور اسکی ذریت اور اولادِ آدم میں سے جو لوگ پہلے مر چکے ہیں (اسلئے نو سو ننانوے میں بڑی تعداد اُنھیں کی ہوگی) تفسیر قرطبی وغیرہ میں یہ سب روایات نقل کی ہیں۔

زلزلۂ قیامت کب ہوگا | قیامت قائم ہونے اور لوگوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد یا اس سے پہلے، بعض نے فرمایا کہ یہ قیامت سے پہلے اسی دُنیا میں ہوگا اور قیامت کی آخری علامت میں

شمار ہوگا جس کا ذکر قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں آیا ہے۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا۔ وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً۔ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا وغیرہ۔ اور بعض حضرات نے حدیث مذکور جس میں آدم علیہ السلام کو خطاب کرنے کا ذکر ہے اس سے استدلال کرتے ہوئے یہ قرار دیا ہے کہ زلزلہ حشر و نشر اور دوبارہ زندہ ہونے کے بعد ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں کوئی منافات نہیں۔ قیامت سے پہلے زلزلہ ہونا بھی آیاتِ قرآن اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور حشر و نشر کے بعد ہونا اس حدیثِ مذکور سے ثابت ہے وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

اس زلزلہ قیامت کی جو کیفیت آگے آیت میں ذکر کی گئی ہے کہ تمام حمل والی عورتوں کے حمل ساقط ہو جاویں گے اور دودھ پلانے والی عورتیں اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جاویں گی۔ اگر یہ زلزلہ اسی دنیا میں قبل القیامۃ ہے تو ایسا واقعہ پیش آنے میں کوئی اشکال نہیں اور اگر حشر و نشر قیامت کے بعد ہے تو اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ جو عورت اس دنیا میں حالتِ حمل میں مری ہے قیامت کے روز اسی حالت میں اسکا حشر ہوگا۔ اور جو دودھ پلانے زمانے میں مرگئی ہے وہ اسی طرح بچے کے ساتھ اٹھائی جائے گی (کما ذکرہ القرطبی) وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ
اور بعضے لوگ وہ ہیں جو جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں بے خبری سے اور پیروی کرتا ہے

شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ﴿۳﴾ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ
ہر شیطان سرکش کی جس کے حق میں لکھ دیا گیا ہے کہ جو کوئی اسکا رفیق ہو سو وہ اسکو بہکائے

وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۴﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ
اور لے جائے عذاب میں دوزخ کے اے لوگو اگر تم کو

رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ
دھوکا ہے جی اٹھنے میں تو ہم نے تم کو بنایا مٹی سے پھر قطرہ سے پھر

مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ
جمے ہوئے خون سے پھر گوشت کی بوٹی نقشہ بنی ہوئی سے اور بدون نقشہ بنی ہوئی سے اس واسطے کہ تم کو کھول کر سنادیں

وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ
اور ٹھہرا رکھتے ہیں ہم پیٹ میں جو کچھ چاہیں ایک وقت معین تک پھر تم کو نکالتے ہیں

طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ
لڑکا پھر جب تک کہ پہنچو اپنی جوانی کے زور کو اور کوئی تم میں سے قبضہ کرلیا جاتا ہے اور کوئی تم میں سے

مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ وَ

پھر چلایا جاتا ہے نکمی عمر تک تاکہ سمجھنے کے پیچھے کچھ نہ سمجھنے لگے اور

تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَ

تو دیکھتا ہے زمین خراب پڑی ہوئی پھر جہاں ہم نے اُتارا اُس پر پانی تازی ہو گئی اور

رَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ⑤ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ

اُبھری اور اُگائیں ہر قسم قسم رونق کی چیزیں یہ سب کچھ اس واسطے کہ اللہ وہی ہے

الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُـحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑥ وَّ

تحقیق اور وہ جلاتا ہے مُردوں کو اور وہ ہر چیز کر سکتا ہے اور

اَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ⑦

یہ کہ قیامت آنی ہے اسمیں دھوکا نہیں اور یہ کہ اللہ اُٹھائے گا قبروں میں پڑے ہوؤں کو

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا

اور بعضا شخص وہ ہے جو جھگڑتا ہے اللہ کی بات میں بغیر جانے اور بغیر دلیل اور بدون

كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ⑧ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا

روشن کتاب کے اپنی کروٹ موڑ کر تاکہ بہکائے اللہ کی راہ سے، اُس کے لئے دُنیا میں

خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ⑨ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ

رسوائی ہے اور چکھائیں گے ہم اُس کو قیامت کے دن جلنے کی مار یہ اس کی وجہ سے جو آگے

يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ⑩ ع

بھیج چکے تیرے دو ہاتھ اور اس وجہ سے کہ اللہ نہیں ظلم کرتا بندوں پر

ع ۸

خلاصۂ تفسیر

اور بعضے آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارہ میں (یعنی اسکی ذات یا صفات یا افعال کے متعلق) بے جانے بوجھے جھگڑا کرتے ہیں اور ہر شیطان سرکش کے پیچھے ہو لیتے ہیں (یعنی گمراہی کی ایسی قابلیت ہے کہ جو شیطان جس طرح بہکا دے اُسکے بہکانے میں آجاتا ہے پس اس شخص میں انتہائی درجہ کی ضلالت ہوئی کہ اس پر ہر شیطان کی دسترس ہو جاتی ہے) جس کی نسبت (خدا کے یہاں سے) یہ بات لکھی جا چکی ہے (اور طے ہو چکی ہے) کہ جو شخص اس سے تعلق رکھیگا (یعنی اسکا اتباع کریگا) تو اسکا کام ہی یہ ہے کہ وہ اسکو (راہ حق سے) بے راہ کر دیگا اور اسکو عذاب دوزخ کا راستہ دکھلا دیگا (آگے ان مجادلین کو خطاب ہے کہ) اے لوگو اگر تم (قیامت کے روز) دوبارہ زندہ ہونے (کے امکان) سے شک میں ہو تو (ذرا مضمون

آئندہ میں غور کرلو تاکہ شک رفع ہو جاوے اور وہ یہ کہ) ہم نے (اول بار) تم کو مٹی سے بنایا (کیونکہ غذا جس سے نطفہ بنتا ہے اوّل عناصر سے پیدا ہوتی ہے جسمیں ایک جزو مٹی بھی ہے) پھر نطفہ سے (جو کہ غذا سے پیدا ہوتا ہے) پھر خون کے لوتھڑے سے (کہ نطفہ میں غلظت اور سُرخی آنے سے حاصل ہوتا ہے) پھر بوٹی سے (کہ علقہ میں سختی آجانے سے حاصل ہوتا ہے) کہ (بعضی) پوری ہوتی ہے (کہ اسمیں پورے اعضا بنجاتے ہیں) اور (بعضی) ادھوری بھی (ہوتی ہے کہ بعض اعضا ناقص رہ جاتے ہیں یہ اسطرح کی ساخت اور ترتیب اور تفاوت سے اسلئے بنایا) تاکہ ہم تمہارے سامنے (اپنی قدرت) ظاہر کردیں (اور اسی سے ظاہر ہے کہ وہ دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے) اور (تتمہ اس مضمون کا یہ ہے جس سے اور زیادہ قدرت ظاہر ہوتی ہے کہ) ہم (ماں کے) رحم میں جس (نطفہ) کو چاہتے ہیں ایک مدت معین (یعنی وضع حمل کے وقت) تک ٹھہرائے رکھتے ہیں (اور جس کو ٹھہرانا نہیں چاہتے ہیں وہاں اسقاط ہو جاتا ہے) پھر (اس مدتِ معینہ کے بعد) ہم تم کو بچہ بناکر (ماں کے پیٹ سے) باہر لاتے ہیں پھر (اسکے بعد تین قسمیں ہو جاتی ہیں ایک قسم یہ کہ تم میں سے بعض کو جوانی تک مہلت دیتے ہیں) تاکہ تم اپنی بھری جوانی (کی عمر) تک پہنچ جاؤ اور بعضے تم میں وہ بھی ہیں جو (جوانی سے پہلے ہی) مرجاتے ہیں (یہ دوسری قسم ہوئی) اور بعضے تم میں وہ ہیں جو نکمی عمر (یعنی زیادہ بڑھاپے) تک پہنچا دیئے جاتے ہیں جسکا اثر یہ ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بےخبر ہو جاتے ہیں (جیسا اکثر بوڑھوں کو دیکھا کہ ابھی ایک بات بتلائی اور ابھی پھر پوچھ رہے ہیں۔ یہ تیسری قسم ہوئی یہ سب احوال بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت عظیمہ کی نشانیاں ہیں ایک استدلال تو یہ تھا) اور (آگے دوسرا استدلال ہے کہ) اے مخاطب تو زمین کو دیکھتا ہے کہ خشک (پڑی) ہے پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ اُبھرتی ہے اور پھولتی ہے اور ہر قسم (یعنی قسم قسم) کی خوشنما نباتات اُگاتی ہے (سو یہ بھی دلیل ہے قدرت کاملہ کی آگے استدلال کو اور واضح کرنے کے لئے تصرفات مذکورہ کی علت اور حکمت کا بیان فرماتے ہیں یعنی) یہ (جو کچھ اوپر دونوں استدلالوں کے ضمن میں اشیاء مذکورہ کا ایجاد و اظہار مذکور ہوا یہ سب) اس سبب سے ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہستی میں کامل ہے (یہ تو اسکا کمال ذاتی ہے) اور وہ ہی بے جانوں میں جان ڈالتا ہے (یہ اسکا کمال فعلی ہے) اور وہی ہر چیز پر قادر ہے (یہ اسکا کمالِ وصفی ہے اور یہ تینوں اُمور ملکر اُمور مذکورہ کی علت ہیں کیونکہ اگر کمالاتِ ثلاثہ میں سے ایک بھی غیر متحقق ہوتا تو ایجاد نہ پایا جاتا چنانچہ ظاہر ہے) اور (نیز اس سبب سے ہوا کہ) قیامت آنیوالی ہے اس میں ذرا شبہ نہیں اور اللہ تعالیٰ (قیامت میں) قبر والوں کو دوبارہ پیدا کریگا (یہ اُمور مذکورہ کی حکمت ہیں یعنی ہم نے وہ تصرفاتِ مذکورہ اس لئے ظاہر کئے کہ اس میں منجملہ اور حکمتوں کے ایک حکمت اور غایت یہ بھی کہ ہم کو قیامت کا لانا اور مُردوں کو زندہ کرنا منظور تھا تو ان تصرفات سے اُن کا امکان لوگوں پر ظاہر ہو جاویگا پس ایجاد اشیاء مذکورہ کی تین علتیں اور دو حکمتیں مذکور ہوئیں

اور سبب بالمعنی الاعم سب کو عام ہوا اسلئے بِاَنَّ اللّٰہَ کی باء سببیہ سب پر داخل ہو گئی) اور (یہاں تک تو مجادلین کی گمراہی اور اس کے رد میں استدلال مذکور تھا آگے ان کا اضلال یعنی دوسروں کو گمراہ کرنا۔ اور دونوں ضلال و اضلال کا وبال عظیم مذکور ہوتا ہے) بعضے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارہ میں (یعنی اسکی ذات یا صفات یا افعال کے مقدمہ میں) بدون واقفیت (یعنی علم ضروری) اور بدون دلیل (یعنی علم استدلالی عقلی) اور بدون کسی روشن کتاب (یعنی علم استدلالی نقلی) کے (اور دوسرے محقق کے اتباع و تقلید سے) تکبر کرتے ہوئے جھگڑا کرتے ہیں تاکہ (دوسرے لوگوں کو بھی) اللہ کی راہ سے (یعنی دین حق سے) بے راہ کر دیں ایسے شخص کے لئے دنیا میں رسوائی ہے (خواہ کسی قسم کی رسوائی ہو چنانچہ بعضے گرفتار قتل و قید وغیرہ سے ذلیل ہوتے ہیں بعضے مناظرہ اہل حق میں مغلوب ہو کر عقلاء کی نظر میں بے عزت ہوتے ہیں) اور قیامت کے دن ہم اس کو جلتی آگ کا عذاب چکھا دیں گے (اور اس سے کہا جاویگا) کہ یہ تیرے ہاتھ کے کئے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے اور یہ بات ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ (اپنے) بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں (پس تجھ کو بلاجرم سزا نہیں دی گئی)۔

معارف و مسائل

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ، یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی جو بڑا جھگڑالو تھا، فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں اور قرآن کو پچھلے لوگوں کے افسانے کہا کرتا تھا اور قیامت اور دوبارہ زندہ ہونیکا منکر تھا (کذا رواہ ابن ابی حاتم عن ابی مالک۔ مظہری)

نزول آیت کا اگرچہ ایک خاص شخص کے بارے میں ہوا مگر حکم اس کا سب کے لئے عام ہے جن میں اس طرح کی بری خصلتیں پائی جائیں۔

بطن مادر میں تخلیق انسانی کے درجات اور مختلف احوال فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ، اس آیت میں بطن مادر کے اندر انسان کی تخلیق کے مختلف درجات کا بیان ہے۔ اس کی تفصیل صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے جو حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اور وہ سچ بولنے والے اور سچے سمجھے جانیوالے ہیں کہ انسان کا مادہ چالیس روز تک رحم میں جمع رہتا ہے پھر چالیس دن کے بعد علقہ یعنی منجمد خون بن جاتا ہے پھر چالیس ہی دن میں وہ مضغہ یعنی گوشت بن جاتا ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کیطرف سے ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو اس میں روح پھونک دیتا ہے اور اس کے متعلق چار باتیں اسی وقت فرشتہ کو لکھوا دی جاتی ہیں۔ اول یہ کہ اس کی عمر کتنی ہے دوسرے رزق کتنا ہے، تیسرے عمل کیا کیا کریگا، چوتھے یہ کہ انجام کار یہ شقی اور بدبخت ہو گا یا سعید خوش نصیب (قرطبی)

دوسری ایک روایت میں جس کو ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی سے روایت کیا ہے اسمیں یہ بھی ہے کہ نطفہ جب کئی دوروں سے گزرنے کے بعد مضغہ گوشت بنجاتا ہے تو اسوقت وہ فرشتہ جو ہر انسان کی تخلیق پر مامور ہے وہ اللہ تعالیٰ سے دریافت کرتا ہے یَارَبِّ مُخَلَّقَۃٌ اَوْ غَیْرُ مُخَلَّقَۃٍ (یعنی اس مضغہ سے انسان کا پیدا کرنا آپکے نزدیک مقدر ہے یا نہیں) اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب ملتا ہے کہ یہ غیر مخلقہ ہے تو رحم اسکو ساقط کر دیتا ہے تخلیق کے دوسرے مراتب تک نہیں پہنچتا اور اگر حکم ہوتا کہ یہ مخلقہ ہے تو پھر فرشتہ سوال کرتا ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی، اور شقی ہے یا سعید اور اس کی عمر کیا ہے اور اس کا عمل کیسا ہے اور کہاں مریگا، یہ سب چیزیں اُسی وقت فرشتہ کو بتلادی جاتی ہیں (ابن کثیر) مخلقہ و غیر مخلقہ کی یہ تفسیر حضرت ابن عباس رضؓ سے بھی منقول ہے (قرطبی)

مُخَلَّقَۃٍ وَّغَیْرِ مُخَلَّقَۃٍ، حدیث مذکور سے ان دونوں کی تفسیر یہ معلوم ہوئی کہ جس نطفہ انسانی کا پیدا ہونا مقدر ہوتا ہے وہ مخلقہ ہے اور جسکا ضائع اور ساقط ہوجانا مقدر ہے وہ غیر مخلقہ ہے اور بعض حضرات مفسرین مخلقہ اور غیر مخلقہ کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ جس بچے کی تخلیق مکمل اور تمام اعضاء صحیح سالم اور متناسب ہوں وہ مخلقہ اور جس کے بعض اعضا ناقص ہوں یا قد اور رنگ وغیرہ غیر متناسب ہو وہ غیر مخلقہ ہے خلاصۂ تفسیر مذکور میں اسی تفسیر کو لیا گیا ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا، یعنی پھر بطنِ مادر سے تم کو نکالتے ہیں طفل ضعیف کی صورت میں اُس کا بدن بھی کمزور ہوتا ہے سماعت و بصارت بھی۔ حواس و عقل بھی، حرکت و گرفت کی قوت بھی غرضیکہ سب قوتیں انتہائی ضعیف و کمزور ہوتی ہیں پھر تدریجاً اُن میں ترقی دی جاتی ہے یہاںتک کہ پوری قوت تک پہنچ جاتے ہیں ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ کے یہی معنے ہیں۔ لفظ اَشُد، شِدّۃ کی جمع ہے جیسے اَنْعُمْ نعمۃ کی جمع آتی ہے معنے یہ ہوئے کہ تدریجی ترقی کا سلسلہ اسوقت تک چلتا رہتا ہے جبتک کہ تمہاری ہر قوت مکمل نہ ہوجائے جو جوانی کے وقت میں ہوتی ہے۔

اَرْذَلِ الْعُمُرِ، یعنی وہ عمر جس میں انسان کے عقل و شعور اور حواس میں خلل آنے لگے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی عمر سے پناہ مانگی ہے۔ نسائی میں بروایت سعد رضؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حسب ذیل الفاظ پر مشتمل یہ دُعا بکثرت مانگتے تھے اور راوی حدیث حضرت سعدؓ یہ دُعا اپنی سب اولاد کو یاد کرادیتے تھے وہ دُعا یہ ہے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ اُرَدَّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَۃِ الدُّنْیَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ (قرطبی)

انسان کی ابتدائی تخلیق کے بعد عمر کے مختلف مدارج اور انکے احوال

مسند احمد اور مسند ابویعلی میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بچہ جب تک بالغ نہیں ہوتا اسکے نیک عمل اسکے والد یا والدین کے حساب میں لکھے جاتے ہیں اور جو کوئی بُرا عمل کرے تو وہ نہ اسکے حساب

میں لکھا جاتا ہے نہ والدین کے، پھر جب وہ بالغ ہو جاتا ہے تو قلم حساب اسکے لئے جاری ہو جاتا ہے اور دو فرشتے جو اسکے ساتھ رہنے والے ہیں ان کو حکم دیدیا جاتا ہے کہ اسکی حفاظت کریں اور قوت بہم پہنچائیں جب حالتِ اسلام میں چالیس سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو (تین قسم کی بیماریوں سے) محفوظ کر دیتے ہیں یعنی جنون اور جذام اور برص سے ۔ جب پچاس سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکا حساب ہلکا کر دیتے ہیں ۔ جب ساٹھ سال کو پہنچتا ہے تو اللہ اسکو اپنی طرف رجوع کی توفیق دیدیتے ہیں ۔ جب ستر سال کو پہنچتا ہے تو سب آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جب اسی سال کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکے حسنات کو لکھتے ہیں اور سیئات کو معاف فرما دیتے ہیں پھر جب نوے سال کی عمر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسکے سب اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیتے ہیں اور اس کو اپنے اہلِ بیت کے معاملے میں شفاعت کرنے کا حق دیتے ہیں اور اسکی شفاعت قبول فرماتے ہیں اور اسکا لقب امین اللہ اور اسیر اللہ فی الارض (یعنی زمین میں اللہ کا قیدی) ہو جاتا ہے (کیونکہ اس عمر میں پہنچکر عموماً انسان کی قوت ختم ہو جاتی ہے کسی چیز میں لذت نہیں رہتی، قیدی کی طرح عمر گزارتا ہے اور جب ارذل عمر کو پہنچ جائے تو اسکے تمام وہ نیک عمل نامۂ اعمال میں برابر لکھے جاتے ہیں جو اپنی صحت و قوت کے زمانے میں کیا کرتا تھا اور اگر اس سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو وہ لکھا نہیں جاتا ۔

یہ روایت حافظ ابن کثیر نے مسند ابو یعلی سے نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے ھذا حدیث غریب جدا وفیہ نکارۃ شدیدۃ (یعنی یہ حدیث غریب ہے اور اسمیں سخت نکارت ہے) پھر فرمایا ومع ھذا فقد رواہ الامام احمد بن حنبل فی مسندہ موقوفا و مرفوعا (یعنی اس غرابت و نکارت کے باوجود امام احمد نے اپنی مسند میں اسکو موقوفاً اور مرفوعاً دونوں طرح روایت کیا ہے پھر ابن کثیر نے مسند احمد سے یہ دونوں قسم کی روایتیں نقل کی ہیں جنکا مضمون تقریباً وہی ہے جو بحوالہ مسند ابو یعلی اوپر نقل ہوا ہے واللہ اعلم۔

ثَانِیَ عِطْفِهٖ ، عطف کے معنے جانب اور کروٹ کے ہیں یعنی کروٹ موڑنے والا۔ اس سے مراد اسکا اعراض کرنا ہے ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِ اطْمَاَنَّ

اور بعضا شخص وہ ہے کہ بندگی کرتا ہے اللہ کی کنارے پر پھر اگر پہنچی اس کو بھلائی تو قائم ہو گیا اس عبادت

بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ

پر اور اگر پہنچ گئی اس کو جانچ پھر گیا الٹا اپنے منہ پر گنوائی دنیا اور آخرت

ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ

یہی ہے ٹوٹا صریح پکارتا ہے اللہ کے سوائے ایسی چیز کو کہ نہ اسکا نقصان کرے

وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ

اور نہ اسکا فائدہ کرے　یہی ہے دُور جا پڑنا گمراہ ہو کر　پکارے جاتا ہے اسکو جس کا ضرر

اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾

پہلے پہنچے نفع سے　بیشک برا دوست ہے اور برا رفیق

خلاصۂ تفسیر

اور بعض آدمی اللہ کی عبادت (ایسے طور پر) کرتا ہے (جیسے کوئی کسی چیز کے) کنارہ پر (کھڑا ہو اور موقع پاکر چلدینے پر تیار ہو) پھر اگر اس کو کوئی (دُنیوی) نفع پہنچ گیا تو اس کی وجہ سے (ظاہری) قرار پالیا اور اگر اس پر کچھ آزمائش ہوگئی تو منہ اُٹھاکر (کفر کیطرف) چلدیا (جس سے) دُنیا و آخرت دونوں کو کھو بیٹھا یہی ہے کھلا نقصان (دُنیا کا نقصان تو دُنیاوی آزمائش جو کسی مصیبت سے ہوتی وہ ظاہر ہی ہے اور آخرت کا نقصان یہ ہوا کہ اسلام اور) خدا کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت کرنے لگا جو (اسقدر عاجز اور بے بس ہے کہ) نہ اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے نہ نفع پہنچا سکتی ہے (یعنی اسکی عبادت نہ کرو تو کوئی نقصان پہنچانے کی اور کرو تو نفع پہنچانے کی کوئی قدرت نہیں۔ ظاہر ہے کہ قادرِ مطلق کو چھوڑ کر ایسی بے بس چیز کو اختیار کرنا خسارہ ہی خسارہ ہے) یہ انتہا درجہ کی گمراہی ہے (صرف یہی نہیں کہ اس کی عبادت سے کوئی نفع نہ پہنچے بلکہ اُلٹا ضرر اور نقصان ہے کیونکہ) وہ ایسے کی عبادت کر رہا ہے کہ اسکا ضرر اسکے نفع سے زیادہ قریب ہے۔ ایسا کارساز بھی برا اور ایسا رفیق بھی برا، جو کسی طرح کسی حال کسی کے کام نہ آسکے کہ اسکو مولیٰ اور آقا بناؤ یا دوست اور ساتھی بناؤ کسی حال اُس سے کچھ نفع نہیں)۔

معارف و مسائل

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ، بخاری اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں مقیم ہوگئے تو بعض ایسے لوگ بھی آکر مسلمان ہو جاتے تھے (جن کے دل میں ایمان کی پختگی نہیں تھی) اگر اسلام لانیکے بعد اسکی اولاد اور مال میں ترقی ہوگئی تو کہتا تھا کہ یہ دین اچھا ہے اور اگر اسکے خلاف ہوا تو کہتا تھا کہ یہ برا دین ہے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے کہ یہ لوگ ایمان کے ایک کنارہ پر کھڑے ہیں۔ اگر ان کو ایمان کے بعد دنیوی راحت اور مال و سامان مل گیا تو اسلام پر جم گئے اور اگر وہ بطور آزمائش کسی تکلیف و پریشانی میں مبتلا ہوگئے تو دین سے پھر گئے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
اللہ داخل کرے گا اُن کو جو ایمان لائے اور کیں بھلائیاں باغوں میں بہتی ہیں

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ
نیچے اُن کے نہریں اللہ کرتا ہے جو چاہے جس کو یہ خیال ہو کہ

لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَاۗءِ
ہرگز نہ مدد کریگا اُس کی اللہ دُنیا میں اور آخرت میں تو تان لے ایک رسّی آسمان کو

ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾ وَكَذٰلِكَ
پھر کاٹ ڈالے اب دیکھے کچھ جاتا رہا اس کی اس تدبیر سے اس کا غصّہ اور یوں اُتارا

اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾
ہم نے یہ قرآن کھُلی باتیں اور یہ ہے کہ اللہ سمجھا دیتا ہے جس کو چاہے

خلاصۂ تفسیر

بلا شبہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے (جنّت کے) ایسے باغوں میں داخل فرمائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہونگی (اور اللہ جس شخص یا قوم کو کوئی ثواب یا عذاب دینا چاہے اس کو کوئی روکنے والا نہیں کیونکہ) اللہ تعالیٰ (قادر مطلق ہے) جو ارادہ کرتا ہے کر گزرتا ہے (اور جن لوگوں کے دینِ حق میں مجادلہ کرنیکا ذکر آیا ہے اگلی آیت میں اُن کی ناکامی اور محرومی کا بیان ہے فرمایا) جو شخص (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخالفت اور مخاصمت کرکے) اس بات کا خیال رکھتا ہو کہ (میں غالب آجاؤنگا اور آپکے دین کی ترقی کو روک ڈونگا اور یہ کہ) اللہ تعالیٰ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپکے دین کی) دُنیا و آخرت میں مدد نہ کریگا تو اسکو چاہیئے کہ ایک رسّی آسمان تک تان لے (اور آسمان سے باندھ دے) پھر (اس رسّی کے ذریعہ اگر آسمان پر پہنچ سکے تو پہنچ جائے تاکہ) اس وحی کو موقوف کرادے (اور ظاہر ہے کہ ایسا کوئی نہیں کرسکتا) تو پھر غور کرنا چاہیئے آیا اس کی (یہ) تدبیر (جس سے بالکل عاجز ہے) اس کے غیظ و غضب کی چیز کو (یعنی وحی کو) موقوف کرسکتی ہے اور ہم نے اس (قرآن) کو اسی طرح اُتارا ہے (کہ اسمیں ہمارے ارادے اور قدرت کے سوا کسی کا دخل نہیں) جس میں کھلی کھلی دلیلیں (تعیینِ حق کی) ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

معارف و مسائل

مَنْ كَانَ يَظُنُّ، حاصل یہ ہے کہ اسلام کا راستہ روکنے والے معاند جو یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

اپنے رسول اور اُسکے دین کی مدد نہ کرے اُن کو سمجھنا چاہیئے کہ یہ تو جبھی ہوسکتا ہے جبکہ معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منصبِ نبوت سلب ہوجائے اور آپ پر وحی آنا منقطع ہوجائے کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو نبوت و رسالت سپرد فرماتا ہے اور اسکو وحیِ الٰہی سے نوازتا ہے اُسکی مدد تو دنیا و آخرت میں کرنے کا اُس کیطرف سے پختہ عہد ہے اور عقلاً بھی اسکے خلاف نہ ہونا چاہیئے تو جو شخص آپ کی اور آپ کے دین کی ترقی کو روکنا چاہتا ہے اُسکو اگر اسکے قبضہ میں ہو تو ایسی تدبیر کرنا چاہیئے کہ یہ منصبِ نبوت سلب ہوجائے اور وحیِ الٰہی منقطع ہوجائے۔ اس مضمون کو ایک فرضِ محال کے عنوان سے اس طرح تعبیر کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے وحی کو منقطع کرنیکا کام کرنا چاہتا ہے تو کسی طرح آسمان پر پہنچے وہاں جاکر اس سلسلۂ وحی کو ختم کردے۔ اور ظاہر ہے کہ نہ کسی کا اسطرح آسمان پر جانا ممکن نہ اللہ تعالےٰ سے قطعِ وحی کو کہنا ممکن تو پھر جب تدبیر کوئی کارگر نہیں تو اسلام و ایمان کے خلاف غیظ و غضب کا کیا نتیجہ؟ یہ تفسیر بعینہٖ دُرِّ منثور میں ابن زید سے روایت کی ہے اور میرے نزدیک یہ سب سے بہتر اور صاف تفسیر ہے (بیان القرآن مع تسہیل)۔

قرطبی نے اسی تفسیر کو ابوجعفر نحاس سے نقل کرکے فرمایا کہ یہ سب سے احسن تفسیر ہے اور حضرت ابن عباس رض سے بھی اس تفسیر کو نقل کیا ہے۔ اور بعض حضرات نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ سماء سے مراد اپنے مکان کی چھت ہے اور مُراد آیت کی یہ ہے کہ اگر کسی معاند جاہل کی خواہش یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اسکے دین کی مدد نہ کرے اور وہ اسلام کے خلاف غیظ و غضب لئے ہوئے ہے تو سمجھ لے کہ اسکی یہ مُراد تو کبھی پوری نہ ہوگی اس احمقانہ غیظ و غضب کا تو علاج یہی ہے کہ چھت میں رسّی ڈال کر پھانسی لیلے اور مرجائے۔ (مظہری وغیرہ)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَىٰ وَ

جو لوگ مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں اور صابئین اور نصاریٰ اور

الْمَجُوسَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ

مجوس اور جو شرک کرتے ہیں مقرر اللہ فیصلہ کریگا ان میں قیامت

الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿١٧﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ

کے دن اللہ کے سامنے ہے ہر چیز تونے نہیں دیکھا کہ اللہ کو

يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ

سجدہ کرتا ہے جو کوئی آسمان میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے اور سورج اور چاند

وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ

اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت آدمی

وَ كَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۗ وَ مَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ

اور بہت ہیں کہ اُن پر ٹھہر چکا عذاب اور جس کو اللہ ذلیل کرے اُسے کوئی نہیں عزت دینے والا

اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ؕ (۱۸)

اللہ کرتا ہے جو چاہے

خلاصۂ تفسیر

اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان اور یہود اور صابئین اور نصاریٰ اور مجوس اور مشرکین، اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان میں قیامت کے روز (عملی) فیصلہ کردیگا (کہ مسلمانوں کو جنت میں اور سب اقسام کافروں کو جہنم میں داخل کریگا) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے۔

اے مخاطب کیا تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے (اپنی اپنی حالت کے مناسب) سب عاجزی کرتے ہیں جو کہ آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور (تمام مخلوقات کے مطیع و فرمانبردار ہونے کے باوجود انسان جو خاص درجہ کی عقل بھی رکھتا ہے وہ سب کے سب مطیع و فرمانبردار نہیں بلکہ) بہت سے (تو) آدمی بھی (اطاعت اور عاجزی کرتے ہیں) اور بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب کا استحقاق ثابت ہوگیا ہے اور (صحیح یہ ہے کہ) جس کو خدا ذلیل کرے (کہ اُسکو ہدایت کی توفیق نہ ہو) اُس کا کوئی عزت دینے والا نہیں (اور) اللہ تعالیٰ (کو اختیار ہے اپنی حکمت سے) جو چاہے کرے۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں تمام اقوام عالم مؤمنین اور کفار پھر کفار کے مختلف العقائد گروہوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کا فیصلہ فرمادینگے اور وہ ہر ایک کے ظاہر و باطن سے باخبر ہیں۔ فیصلہ کیا ہوگا اسکا ذکر بار بار قرآن میں آچکا ہے کہ مؤمنین صالحین کے لئے ابدی اور لازوال راحت ہے اور کفار کے لئے دائمی عذاب۔ دوسری آیت میں تمام مخلوقات خواہ زندہ ذی روح ہوں یا جمادات و نباتات سب کا حق تعالیٰ کے لئے مطیع اور فرمانبردار ہونا بعنوان سجدہ بیان فرماکر بنی نوع انسان کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک مطیع و فرمانبردار سجدہ میں سب کے ساتھ شریک اور دوسرا سرکش باغی سجدہ سے منحرف۔ اور تابع فرمان ہونے کو سجدہ کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے جسکا ترجمہ خلاصہ تفسیر میں عاجزی کرنے سے کیا ہے تاکہ مخلوقات کی ہر نوع اور ہر قسم کے سجدہ کو شامل ہو جائے کیونکہ انمیں سے ہر ایک کا سجدہ اُسکے مناسب حال ہوتا ہے انسان کا سجدہ زمین پر پیشانی رکھنے کا نام ہے دوسری مخلوقات

کا سجدہ اپنی اپنی خدمت جس کے لئے اُن کو پیدا کیا گیا ہے اسکو انجام دینے کا اور خدمت کا حق ادا کرنیکا نام ہے

تمام مخلوقات کے مطیع و فرمانبردار ہونے کی حقیقت تمام کائنات و مخلوقات کا اپنے خالق کے زیر حکم اور تابع مشیت ہونا ایک تو تکوینی اور تقدیری طور پر غیر اختیاری ہے جس سے کوئی بھی مخلوق مومن یا کافر زندہ یا مُردہ، جمادات یا نباتات مستثنیٰ نہیں اس حیثیت میں سب کے سب یکساں طور پر حق تعالے کے زیر حکم و مشیت ہیں۔ جہان کا کوئی ذرہ یا پہاڑ اس کے اِذن و مشیت کے بغیر کوئی ادنیٰ حرکت نہیں کر سکتا دوسری اطاعت و فرمانبرداری اختیاری ہے کہ کوئی مخلوق اپنے قصد و اختیار سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرے اسمیں مومن و کافر کا فرق ہوتا ہے کہ مومن اطاعت شعار فرمانبردار ہوتا ہے کافر اس سے منحرف اور منکر ہوتا ہے۔ اس آیت میں چونکہ مومن و کافر کا فرق بیان فرمایا ہے یہ قرینہ اسکا ہے کہ اسمیں سجدہ اور فرمانبرداری سے مُراد صرف تکوینی و تقدیری اطاعت نہیں بلکہ اختیاری اور ارادی اطاعت ہے۔ اسمیں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اختیاری اور ارادی اطاعت تو صرف ذوی العقول انسان اور جن وغیرہ میں ہو سکتی ہے۔ حیوانات، نباتات، جمادات میں عقل و شعور ہی نہیں تو پھر قصد و ارادہ کہاں اور اطاعت اختیاری کیسی؟ کیونکہ قرآن کریم کی بے شمار نصوص اور تصریحات سے یہ بات ثابت ہے کہ عقل و شعور اور قصد و ارادہ سے کوئی بھی مخلوق خالی نہیں، کمی بیشی کا فرق ہے۔ انسان اور جن کو اللہ تعالےٰ نے عقل و شعور کا ایک کامل درجہ عطا فرمایا ہے اور اسی لئے ان کو احکام امر و نہی کا مکلف بنایا گیا ہے ان کے سوا باقی مخلوقات میں سے ہر نوع اور ہر صنف کو اس صنف کی ضروریات کے موافق عقل و شعور دیا گیا، انسان کے بعد سب سے زیادہ یہ عقل و شعور حیوانات میں ہے اسکے دوسرے نمبر میں نباتات ہیں، تیسرے میں جمادات ہیں۔ حیوانات کا عقل و شعور تو عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے نباتات کا عقل و شعور بھی ذرا سا غور و تحقیق کرنے والا پہچان لیتا ہے لیکن جمادات کا عقل و شعور اتنا کم اور مخفی ہے کہ عام انسان اس کو نہیں پہچان سکتے۔ مگر اُن کے خالق و مالک نے خبر دی ہے کہ وہ بھی عقل و شعور اور قصد و ارادے کے مالک ہیں۔ قرآن کریم نے آسمان و زمین کے بارے میں فرمایا ہے قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ، یعنی جب اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حکم دیا کہ تم کو ہمارے تابع فرمان رہنا ہے اپنی خوشی سے فرمانبرداری اختیار کرو ورنہ جبراً اور حکماً تابع رہنا ہی ہے تو آسمان و زمین نے عرض کیا کہ ہم اپنے ارادے اور خوشی سے اطاعت و فرمانبرداری قبول کرتے ہیں اور دوسری جگہ پہاڑ کے پتھروں کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ، یعنی بعض پتھر ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی خشیت و خوف کے مارے اوپر سے نیچے لڑھک جاتے ہیں۔ اسی طرح احادیث کثیرہ میں پہاڑوں کی باہم گفتگو اور دوسری مخلوقات میں عقل و شعور کی شہادتیں بکثرت ملتی ہیں۔ اس لئے اس آیت میں جس اطاعت و فرمانبرداری کو سجدہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے،

اِس سے اطاعتِ اختیاری وارادی مُراد ہے اور معنے آیت کے یہ ہیں کہ نوعِ انسان کے علاوہ (جن کے ضمن میں جنّات بھی داخل ہیں) باقی تمام مخلوقات اپنے قصد و اختیار سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز یعنی تابع فرمان ہیں صرف انسان اور جن ایسے ہیں جنہیں دو حصّے ہوگئے ایک مؤمن و مطیع سجدہ گزار دوسرے کافر و نافرمان سجدہ سے منحرف جن کو اللہ نے ذلیل کر دیا ہے کہ انکو سجدہ کی توفیق نہیں بخشی واللّٰہُ اَعْلَمُ

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ

یہ دو مدعی ہیں جھگڑے ہیں اپنے رب پر سو جو منکر ہوئے اُن کے واسطے بیونتے ہیں

ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿١٩﴾ يُصْهَرُ

کپڑے آگ کے ڈالتے ہیں اُن کے سر پر جلتا پانی گل کر نکل جاتا ہے

بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴿٢٠﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿٢١﴾

اس سے جو کچھ اُن کے پیٹ میں ہے اور کھال بھی اور اُن کے واسطے ہتھوڑے ہیں لوہے کے

كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَذُوْقُوْا

جب چاہیں کہ نکل پڑیں دوزخ سے گھٹنے کے مارے پھر ڈال دیئے جائیں اسکے اندر اور چکھتے رہو

عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٢٢﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

جلنے کا عذاب بیشک اللہ داخل کریگا اُن کو جو یقین لائے اور کیں

الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ

بھلائیاں باغوں میں بہتی ہیں اُن کے نیچے نہریں گہنا پہنائیں گے اُن کو وہاں کنگن

مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ؕ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿٢٣﴾ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ

سونے کے اور موتی اور اُن کی پوشاک ہے وہاں ریشم کی اور راہ پائی اُنھوں نے

مِنَ الْقَوْلِ ۚۖ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿٢٤﴾

ستھری بات کی اور پائی اس تعریفوں والے کی راہ

ع ۱۲ / ۹

خلاصۂ تفسیر

(جن کا ذکر اوپر آیت اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا میں ہوا ہے) یہ دو فریق ہیں (ایک مومن دوسرا کافر۔ پھر کافر گروہ کی کئی قسمیں ہیں۔ یہود، نصاریٰ، صابئین، مجوس اور بُت پرست) جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں (اعتقاداً اور کبھی کبھی مباحثۃً بھی) باہم اختلاف کیا (اس اختلاف کا فیصلہ قیامت میں اس طرح ہوگا کہ) جو لوگ کافر تھے اُن کے (پہننے کے لئے) آگ کے کپڑے قطع کئے

جاویں گے (یعنی آگ اُن کے پورے بدن پر اسطرح محیط ہوگی جیسے لباس) اور اُن کے سر کے اُوپر سے تیز گرم پانی چھوڑا جاویگا جس سے اُن کے پیٹ کی چیزیں (یعنی آنتیں) اور کھالیں سب گل جاویں گی، (یعنی یہ کھولتا ہوا تیز پانی پیٹ کے اندر چلا جاویگا جس سے آنتیں اور پیٹ کے اندر کے سب اجزاء و اعضاء گل جاویں گے کچھ اوپر بہے گا جس سے کھال گل جاوے گی) اور ان کے (مارنے کے لئے) لوہے کے گرز ہونگے (اور اس مصیبت سے کبھی نجات نہ ہوگی) وہ لوگ جب (دوزخ میں) گھٹے گھٹے (گھبراجاتنگے اور) اس سے باہر نکلنا چاہیں گے تو پھر اسی میں دھکیل دیئے جاویں گے اور کہا جاویگا کہ جلنے کا عذاب (ہمیشہ کے لئے) چکھتے رہو (کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا اور) اللہ تعالٰے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے (بہشت کے) ایسے باغوں میں داخل کریگا جس کے نیچے نہریں جاری ہونگی اُن کو وہاں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جاویں گے اور پوشاک اُن کی وہاں ریشم ہوگی اور (یہ سب انعام و اکرام ان کے لئے اس سبب سے ہے کہ دُنیا میں اُن کو) کلمہ طیب (کے اعتقاد) کی ہدایت ہوگئی تھی اور اُن کو اس (خدا) کے رستہ کی ہدایت ہوگئی تھی جو لائق حمد ہے (وہ راستہ اسلام ہے)۔

معارف و مسائل

هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ اخۡتَصَمُوۡا، یہ دو فریق جن کا ذکر اس آیت میں ہے عام مؤمنین اور اُن کے مقابلہ میں تمام گروہ کفار ہیں خواہ قرنِ اول کے ہوں یا قرون مابعد کے۔ البتہ نزول اس آیت کا اُن دو فریق کے بارے میں ہوا ہے جو میدان بدر کے مبارزہ میں ایک دوسرے کے مقابل نبرد آزما ہوئے تھے مسلمانوں میں سے حضرت علی و حمزہ و عبیدہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور کفار میں سے عتبہ بن ربیعہ اور اسکا بیٹا ولید اور اسکا بھائی شیبہ تھے جنمیں سے کفار تو تینوں مارے گئے اور مسلمانوں میں سے حضرت علیؓ و حمزہؓ صحیح سالم واپس آئے اور عبیدہؓ شدید زخمی ہوکر آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں پہنچکر دم توڑ دیا۔ آیت کا نزول ان مبارزین بدر کے بارے میں ہونا بخاری و مسلم کی احادیث سے ثابت ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ حکم ان کیساتھ مخصوص نہیں پوری اُمت کیلئے عام ہے، کسی بھی زمانے میں ہو۔

اہلِ جنّت کو کنگن پہنائے جانے کی حکمت

یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ کنگن ہاتھوں میں پہننا عورتوں کا کام اور انھیں کا زیور ہے۔ مَردوں کے لئے معیوب سمجھا جاتا ہے جواب یہ ہے کہ دُنیا کے بادشاہوں کی امتیازی شان رہی ہے کہ سر پر تاج اور ہاتھوں میں کنگن استعمال کرتے تھے جیساکہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سراقہ بن مالکؓ کو جبکہ وہ مسلمان نہیں تھے اور سفرِ ہجرت میں آپؐ کو گرفتار کرنے کے لئے تعاقب میں نکلے تھے، جب اُن کا گھوڑا باذنِ خداوندی زمین میں دھنس گیا اور اُنہنے توبہ کی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے گھوڑا نکل گیا اسوقت سراقہ بن مالکؓ سے وعدہ فرمایا تھا کہ کسریٰ شاہ فارس

کے کنگن مالِ غنیمت میں مسلمانوں کے پاس آئیں گے وہ تمھیں دیئے جائیں گے اور جب فاروقِ اعظمؓ کے زمانے میں فارس کا ملک فتح ہوا اور ایران کے یہ کنگن دوسرے اموالِ غنیمت کیساتھ آئے تو سراقہ بن مالکؓ نے مطالبہ کیا اور اُن کو دیدیئے گئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جیسے سر پر تاج پہننا عام مردوں کا رواج نہیں، شاہی اعزاز ہے اسی طرح ہاتھوں میں کنگن بھی شاہی اعزاز سمجھے جاتے ہیں اسلئے اہلِ جنت کو کنگن پہنائے جائیں گے۔ کنگن کے متعلق اس آیت میں اور سورہ فاطر میں تو یہ ہے کہ وہ سونے کے ہوں گے اور سورۂ دھر میں یہ کنگن چاندی کے بتلائے گئے ہیں اس لئے حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اہلِ جنت کے ہاتھوں میں تین طرح کے کنگن پہنائے جائیں گے ایک سونے کا، دوسرا چاندی کا تیسرا موتیوں کا جیسا کہ اس آیت میں موتیوں کا بھی ذکر موجود ہے۔ (قرطبی)

ریشم کے کپڑے مردوں کے لئے حرام ہیں آیت مذکورہ میں ہے کہ اہلِ جنت کا لباس ریشم کا ہوگا مُراد یہ ہے کہ اُن کے تمام ملبوسات اور فرش اور پردے وغیرہ ریشم کے ہونگے جو دنیا میں سب سے زیادہ بہتر لباس سمجھا جاتا ہے اور جنت کا ریشم ظاہر ہے کہ دُنیا کے ریشم سے صرف نام کی شرکت رکھتا ہے ورنہ اُس کی عمدگی اور بہتری کو اس سے کوئی مناسبت نہیں۔

امام نسائی اور بزار اور بیہقی نے بسند جید حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ جنت کا ریشمی لباس جنت کے پھلوں میں سے نکلے گا اور حضرت جابرؓ کی ایک روایت میں ہے کہ جنت میں ایک درخت ایسا ہوگا جس سے ریشم پیدا ہوگا اہلِ جنت کا لباس اُسی سے تیار ہوگا (مظہری)

حدیث میں امام نسائی نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من لبس الحرير في الدنيا لم يلبسه في الآخرة ومن شرب الخمر في الدنيا لم يشربها في الآخرة ومن شرب في آنية الذهب والفضة لم يشرب فيها في الآخرة ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لباس اهل الجنة وشراب اهل الجنة وآنية اهل الجنة

(از قرطبی بحوالہ نسائی)

جو شخص ریشمی کپڑا دُنیا میں پہنے گا وہ آخرت میں نہ پہنے گا اور جو دُنیا میں شراب پیئے گا وہ آخرت کی شراب سے محروم رہے گا اور جو دُنیا میں سونے چاندی کے برتنوں میں (کھائے) پیئے گا وہ آخرت میں سونے چاندی کے برتنوں میں کھائیگا۔ پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تینوں چیزیں اہلِ جنت کے لئے مخصوص ہیں۔

مراد یہ ہے کہ جس شخص نے دُنیا میں یہ کام کیے اور توبہ نہیں کی وہ جنت کی ان تین چیزوں سے محروم رہے گا اگرچہ جنت میں داخل بھی ہو جائے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے دُنیا میں شراب پی، پھر اُس سے توبہ نہیں کی

وہ آخرت میں جنت کی شراب سے محروم رہے گا (رواہ الائمہ۔ قرطبی) نیز ایک دوسری حدیث میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من لبس الحریر فی الدنیا لم یلبسہ فی الآخرۃ وان دخل الجنۃ لبسہ اھل الجنۃ ولم یلبسہ ہو رواہ ابو داؤد الطیالسی فی مسندہ وقال القرطبی اسنادہ صحیح۔

جس شخص نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں نہ پہنے گا اگرچہ جنت میں داخل بھی ہو جائے دوسرے اہل جنت ریشم پہنیں گے یہ نہیں پہن سکے گا۔

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ جب ایک شخص جنت میں داخل کرلیا گیا پھر اگر وہ کسی چیز سے محروم کیا گیا تو اسکو حسرت و افسوس رہے گا اور جنت اس کی جگہ نہیں۔ وہاں کسی شخص کو کسی کا غم و افسوس نہ ہونا چاہیئے اور اگر یہ حسرت و افسوس نہ ہو تو پھر اس محرومی کا کوئی فائدہ نہیں رہتا۔ اسکا جواب قرطبی نے اچھا دیا ہے کہ اہل جنت کے جس طرح مقامات اور درجات مختلف اور متفاوت اعلیٰ و ادنیٰ ہوں گے۔ اُن کے تفاوت کا احساس بھی سب کو ہوگا مگر اس کے ساتھ ہی حق تعالیٰ شانہٗ اہل جنت کے قلوب ایسے بنا دیگا کہ اُن میں حسرت و افسوس کسی چیز کا نہ رہے گا واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

وَهُدُوٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس سے مراد کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ ہے۔ بعض نے فرمایا قرآن مراد ہے (قرطبی) صحیح یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اسمیں داخل ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

جو لوگ منکر ہوئے اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور مسجد حرام سے

الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ۭ وَمَنْ يُّرِدْ

جو ہم نے بنائی سب لوگوں کے واسطے برابر ہے اسمیں رہنے والا اور باہر سے آنے والا اور جو اس میں

فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۵﴾

چاہے ٹیڑھی راہ شرارت سے اُسے ہم چکھائیں گے ایک عذاب دردناک

ع ۳ / ۱۰

خلاصۂ تفسیر

بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور (مسلمانوں کو) اللہ کے راستہ سے اور مسجد حرام سے روکتے ہیں (تاکہ مسلمان عمرہ ادا نہ کرسکیں حالانکہ حرم کی حیثیت یہ ہے کہ اسمیں کسی کی خصوصیت نہیں بلکہ) اس کو ہم نے تمام آدمیوں کے واسطے مقرر کیا ہے کہ اسمیں سب برابر ہیں اس (حرم کے داخل حدود) میں رہنے والا بھی (یعنی جو لوگ وہاں مقیم ہیں) اور باہر سے آنیوالا (مسافر) بھی

اور جو کوئی اس میں (یعنی حرم شریف میں) ظلم کے ساتھ کوئی بے دینی کا کام کرنے کا ارادہ کریگا تو ہم اُس شخص کو عذاب دردناک چکھا دیں گے ۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں مؤمنین اور کفار کے دو فریق کی باہمی مخاصمت کا ذکر تھا اسی مخاصمت کی ایک خاص صورت اس آیت میں بیان کی گئی ہے کہ ان میں بعض ایسے کفار بھی ہیں جو خود گمراہی پر جمے ہوئے ہیں دوسروں کو بھی اللہ کے راستہ پر چلنے سے روکتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اُن کے صحابہ کو جبکہ وہ عمرہ کا احرام باندھ کر حرم شریف میں داخل ہونا چاہتے تھے مسجد حرام میں داخل ہونے سے روک دیا حالانکہ مسجد حرام اور حرم شریف کا وہ حصہ جس سے لوگوں کی عبادت عمرہ و حج کا تعلق ہے ان کی ملک میں داخل نہیں تھا جس کی بنا پر اُن کو مزاحمت اور مداخلت کا کوئی حق پہنچتا، بلکہ وہ سب لوگوں کے لئے یکساں ہے جہاں باشندگان حرم اور باہر کے مسافر اور شہری اور پردیسی سب برابر ہیں۔ آگے اُن کی سزا کا ذکر ہے کہ جو شخص مسجد حرام (یعنی پورے حرم شریف) میں کوئی بے دینی کا کام کرے گا جیسے لوگوں کو حرم میں داخل ہونے سے روکنا یا دوسرا کوئی خلاف دین کام کرنا، اسکو عذاب دردناک چکھایا جائے گا خصوصاً جبکہ اس بے دینی کے کام کے ساتھ ظلم یعنی شرک بھی ملا ہوا ہو جیسا کہ مشرکین مکہ کا حال تھا جنھوں نے مسلمانوں کو حرم میں داخل ہونے سے روکا کہ ان کا یہ عمل بھی خلاف دین ناروا تھا پھر اس کے ساتھ وہ کفر و شرک میں بھی مبتلا تھے۔ اور اگرچہ ہر خلاف دین کام خصوصاً شرک کفر ہر جگہ ہر زمانے میں حرام اور انتہائی جرم و گناہ موجب عذاب ہے مگر جو ایسے کام حرم محترم کے اندر کرے اُس کا جرم دوگنا ہو جاتا ہے اسلئے یہاں حرم کی تخصیص کر کے بیان کیا گیا ہے۔

یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، سبیل اللہ سے مراد اسلام ہے معنے آیت کے یہ ہیں کہ یہ لوگ خود تو اسلام سے دُور ہیں ہی دوسروں کو بھی اسلام سے روکتے ہیں۔

وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، یہ اُن کا دوسرا گناہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ مسجد حرام اصل میں اُس مسجد کا نام ہے جو بیت اللہ کے گرد بنائی ہوئی ہے اور یہ حرم مکہ کا ایک اہم جزء ہے لیکن بعض مرتبہ مسجد حرام بول کر پُورا حرم مکہ بھی مُراد لیا جاتا ہے جیسے خود اسی واقعہ یعنی مسلمانوں کو عمرہ کے لئے حرم میں داخل ہونے سے روکنے کی جو صورت پیش آئی وہ یہی تھی کہ کفار مکہ نے آپ کو صرف مسجد میں جانے سے نہیں بلکہ حدود حرم مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور قرآن کریم نے اس واقعہ میں مسجد حرام کا لفظ بمعنے مطلق حرم استعمال

فرمایا ہے وَصَدٌّ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔

تفسیر درمنثور میں اس جگہ مسجد حرام کی تفسیر میں پورا حرم مراد ہونا حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے

حرم مکہ میں سب مسلمانوں کے مساوی حق کا مطلب

اتنی بات پر تمام امّت اور ائمہ فقہاء کا اتفاق ہے کہ مسجد حرام اور حرم شریف مکہ کے وہ تمام حصّے جن سے افعالِ حج کا تعلق ہے جیسے صفا مروہ کے درمیان کا میدان جس میں سعی ہوتی ہے اور منیٰ کا پورا میدان اسی طرح عرفات کا پورا میدان اور مزدلفہ کا پورا میدان، یہ سب زمینیں سب دُنیا کے مسلمانوں کے لئے وقفِ عام ہیں کسی شخص کی ذاتی ملکیت ان پر نہ کبھی ہوئی ہے نہ ہوسکتی ہے۔ ان کے علاوہ مکہ مکرمہ کے عام مکانات اور باقی حرم کی زمینیں ان کے متعلق بھی بعض ائمہ فقہاء کا یہی قول ہے کہ وہ بھی وقفِ عام ہیں۔ اُن کا فروخت کرنا یا کرایہ دینا حرام ہے ہر مسلمان ہر جگہ ٹھہر سکتا ہے مگر دوسرے فقہاء کا مختار مسلک یہ ہے کہ مکہ کے مکانات مِلکِ خاص ہوسکتے ہیں انکی خرید و فروخت اور انکو کرایہ پر دینا جائز ہے حضرت فاروق اعظمؓ سے ثابت ہے کہ اُنھوں نے صفوان بن اُمیہ کا مکان مکہ مکرمہ میں خرید کر اس کو مجرموں کے لئے قیدخانہ بنایا تھا امام اعظم ابوحنیفہؒ سے اسمیں دو روایتیں منقول ہیں ایک پہلے قول کے مطابق دوسری دوسرے قول کے مطابق اور فتویٰ دوسرے قول پر ہے۔ کذا فی روح المعانی۔ یہ بحث کتب فقہ میں مفصّل مذکور ہے مگر اس آیت میں حرم کے جن حصّوں سے روکنے کا ذکر ہے وہ حصّے بہرحال سب کے نزدیک وقفِ عام ہیں ان سے روکنا حرام ہے آیت مذکورہ سے اسی کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ، الحاد کے معنے لغت میں سیدھے راستے سے ہٹ جانیکے ہیں۔ اس جگہ الحاد سے مراد مجاہد و قتادہ کے نزدیک کفر و شرک ہے مگر دوسرے مفسّرین نے اسکو اپنے عام معنے میں قرار دیا ہے جس میں ہر گناہ اور اللہ و رسول کی نافرمانی داخل ہے یہاں تک کہ اپنے خادم کو گالی دینا بُرا کہنا بھی۔ اور اسی معنے کے لحاظ سے حضرت عطاء نے فرمایا کہ حرم میں الحاد سے مراد اسمیں بغیر احرام کے داخل ہوجانا یا ممنوعات حرم میں سے کسی ممنوع چیز کا ارتکاب کرنا ہے جیسے حرم کا شکار مارنا یا اُسکا درخت کاٹنا وغیرہ۔ اور جو چیزیں شریعت میں ممنوع ناجائز ہیں وہ سبھی جگہ گناہ اور موجب عذاب ہیں حرم کی تخصیص اس بناء پر کی گئی کہ جس طرح حرم مکہ میں نیکی کا ثواب بہت بڑھ جاتا ہے اسی طرح گناہ کا عذاب بھی بہت بڑھ جاتا ہے (قالہ مجاہد)۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اسکی ایک تفسیر یہ بھی منقول ہے کہ حرم کے علاوہ دوسری جگہوں میں محض گناہ کا ارادہ کرنے سے گناہ نہیں لکھا جاتا جب تک عمل نہ کرے اور حرم میں صرف ارادہ پختہ کرلینے پر بھی گناہ لکھا جاتا ہے۔ قرطبی نے یہی تفسیر ابن عمرؓ سے بھی نقل کی ہے اور اسی تفسیر کو صحیح کہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حج کے لئے جاتے تو دو خیمے لگاتے تھے ایک حرم کے اندر دوسرا باہر۔ حرم میں اگر اپنے اہل و عیال یا خدّام

و متعلقین میں کسی کو کسی بات پر سرزنش اور عتاب کرنا ہوتا تو حرم سے باہر والے خیمے میں جا کر یہ کام کرتے تھے۔ لوگوں نے مصلحت دریافت کی تو فرمایا ہم سے یہ بیان کیا جاتا تھا کہ انسان جو عتاب ناراضی کے وقت کلا واللہ یا بلی واللہ کے الفاظ بولتا ہے یہ بھی الحاد فی الحرم میں داخل ہے (مظہری)

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَ

اور جب ٹھیک کر دی ہم نے ابراہیم کو جگہ اس گھر کی کہ شریک نہ کرنا میرے ساتھ کسی کو اور

طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿۲۶﴾ وَ

پاک رکھ میرا گھر طواف کرنے والوں کے واسطے اور کھڑے رہنے والوں کے اور رکوع و سجدہ والوں کے اور

أَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ

پکار دے لوگوں میں حج کے واسطے کہ آئیں تیری طرف پیروں چلکر اور سوار ہو کر دبلے دبلے اونٹوں پر چلے آئیں

مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ﴿۲۷﴾ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا

راہوں دور سے تاکہ پہنچیں اپنے فائدہ کی جگہوں پر اور پڑھیں

اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ

اللہ کا نام کئی دن جو معلوم ہیں ذبح پر جو پایوں مواشی کے جو اللہ نے دیئے ہیں

الْأَنْعَامِ ۖ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ﴿۲۸﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوا

ان کو سو کھاؤ اس میں سے اور کھلاؤ برے حال کے محتاج کو پھر چاہیے کہ ختم

تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿۲۹﴾

کر دیں اپنا میل کچیل اور پوری کر دیں اپنی منتیں اور طواف کریں اس قدیم گھر کا

خلاصۂ تفسیر

اور (اس قصہ کا تذکرہ کیجئے) جب کہ ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو خانہ کعبہ کی جگہ بتلا دی (کیونکہ اس وقت خانہ کعبہ بنا ہوا نہ تھا اور حکم دیا) کہ (اس مکان کو عبادت کے لئے تیار کرو اور اس عبادت میں) میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا (یہ دراصل ان کے بعد کے لوگوں کو سنانا تھا اور بنا بیت اللہ کے ساتھ شرک کی ممانعت کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ بیت اللہ کی طرف نماز اور اس کا طواف کرنے سے کسی جاہل کو یہ شبہ نہ ہو جائے کہ یہی معبود ہے) اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے اور (نماز میں) قیام اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے واسطے (ظاہری اور باطنی نجاسات یعنی کفر و شرک سے) پاک رکھنا (یہ بھی دراصل دوسروں ہی کو سنانا تھا ابراہیم علیہ السلام سے تو اس کے

خلاف کا احتمال ہی نہ تھا) اور (ابراہیم علیہ السلام سے یہ بھی کہا گیا کہ) لوگوں میں حج (کے فرض ہونے) کا اعلان کردو (اس اعلان سے) لوگ تمہارے پاس (یعنی تمہاری اس مقدس عمارت کے پاس) چلے آئیں گے پیادہ بھی اور (طولِ سفر کی وجہ سے دُبلی ہوجانے والی) اُونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی (اور وہ لوگ اس لئے آویں گے) تاکہ اپنے (اپنے دینی اور دُنیوی) فوائد کیلئے حاضر ہوجاویں (دینی فوائد تو معلوم و مشہور ہیں دُنیوی فوائد بھی اگر مقصود نہ ہوں مثلاً خرید و فروخت اور قربانی کا گوشت وغیرہ تو یہ بھی کوئی مذموم نہیں) اور (اس لئے آویں گے) تاکہ ایامِ مقررہ میں (جو قربانی کے ایام دسویں سے بارھویں ذی الحجہ تک ہیں) اُن مخصوص چوپاؤں پر (یعنی قربانی کے جانوروں پر ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیں جو خدا تعالیٰ نے اُن کو عطا کئے ہیں (ابراہیم علیہ السلام کے خطاب کا مضمون ہوچکا آگے اُمتِ محمدیہ مخاطب ہے) ان (قربانی کے) جانوروں میں سے تم بھی کھایا کرو (کہ یہ جائز ہے اور مستحب یہ ہے کہ) مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلایا کرو پھر (قربانی کے بعد) لوگوں کو چاہیے کہ اپنا میل کچیل دُور کریں (یعنی احرام کھول ڈالیں سر منڈالیں) اور اپنے واجبات کو خواہ نذر سے قربانی وغیرہ واجب کرلی ہو یا بلا نذر جو افعالِ حج کے واجب ہیں اُن سب کو پورا کریں اور (انہی ایام معلومات میں) اس مامون و محفوظ گھر (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں (یہ طواف زیارت کہلاتا ہے)۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیت میں مسجد حرام اور حرم سے روکنے والوں پر عذابِ شدید کی وعید آئی ہے آگے اس کی مناسبت سے بیت اللہ کے خاص فضائل اور عظمت کا بیان ہے جس سے اُن کے فعل کی قباحت اور زیادہ واضح ہوجائے۔

بناءِ بیت اللہ کی ابتدا | وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ، بوء کا لفظ لغت میں کسی کو ٹھکانا اور رہنے کا مکان دینے کے معنے میں آتا ہے۔ معنے آیت کے یہ ہیں کہ یہ بات قابلِ ذکر اور یاد رکھنے کی ہے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اُس جگہ کا ٹھکانا دیا جہاں بیت اللہ ہے۔ اسمیں اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے اس زمین پر آباد نہ تھے جیسا کہ روایات سے ثابت ہے کہ اُن کو مُلک شام سے ہجرت کرا کر یہاں لایا گیا تھا۔ اور مکان البیت میں اسطرف اشارہ ہے کہ بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے موجود تھا جیسا کہ معتبر روایات میں ہے کہ اسکی پہلی بناء حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر لانے سے پہلے یا اسکے ساتھ ہوئی تھی اور آدم علیہ السلام اور اُن کے بعد کے انبیاء بیت اللہ کا طواف کرتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے وقت بیت اللہ کی تعمیر اُٹھالی گئی تھی بنیادیں اور اسکی معین جگہ موجود تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہیں لاکر ٹھہرایا گیا اور انکو حکم

دیا گیا اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا، یعنی میری عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شرک کرنے کا کوئی احتمال نہیں۔ اُن کی بت شکنی اور شرک کرنے والوں کا مقابلہ اور اسمیں سخت ترین آزمائش کے واقعات پہلے ہو چکے تھے اس لئے مُراد اس سے عام لوگوں کو سُنانا ہے کہ شرک سے پرہیز کریں۔ دوسرا حکم یہ دیا گیا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ (یعنی میرے گھر کو پاک کیجئے) اسوقت اگرچہ گھر موجود نہیں تھا مگر بیت اللہ دراصل در و دیوار اور تعمیر کا نام نہیں، وہ اُس بقعۂ مقدسہ کا نام ہے جس میں بیت اللہ پہلے بنایا گیا تھا اور اب دوبارہ بنانے کا حکم دیا جا رہا ہے وہ بقعہ اور مکان بہر حال موجود تھا اُس کو پاک کرنیکا حکم اسلئے دیا گیا کہ اس زمانے میں بھی قوم جرہم اور عمالقہ نے یہاں کچھ بُت رکھے ہوئے تھے جن کی پوجا پاٹ ہوتی تھی (ذکرہ القرطبی) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حکم آئندہ آنے والوں کو سُنانا ہو اور پاک کرنے سے مُراد جیسے کفر و شرک سے پاک رکھنا ہے ایسے ہی ظاہری نجاسات اور گندگیوں سے پاک رکھنا بھی مُراد ہے اور ابراہیم علیہ السلام کو اسکا خطاب کرنے سے دوسرے لوگوں کو اہتمام کی فکر دلانا مقصود ہے کہ جب خلیل اللہ کو اسکا حکم ہوا جو خود ہی اس پر عامل تھے تو ہمیں اسکا اہتمام کتنا کرنا چاہیئے۔

تیسرا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ دیا گیا کہ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ، یعنی لوگوں میں اعلان کر دیجئے کہ اس بیت اللہ کا حج تم پر فرض کر دیا گیا ہے۔ بغوی۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رض سے نقل کیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو فرضیت حج کے اعلان کا حکم ہوا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ (یہاں تو جنگلی میدان ہے کوئی سُننے والا نہیں) جہاں آبادی ہے وہاں میری آواز کیسے پہنچے گی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپکی ذمہ داری صرف اعلان کرنے کی ہے اسکے ساری دُنیا میں پہنچانے اور پھیلانے کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا جس کو اللہ تعالیٰ نے بہت اُونچا کر دیا اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے جبل ابی قبیس پر چڑھ کر یہ اعلان کیا، کانوں میں انگلیاں رکھ کر داہنے اور بائیں اور شرقاً و غرباً ہر طرف یہ ندا دی کہ اے لوگو تمہارے رب نے اپنا بیت بنایا ہے اور تم پر اس بیت کا حج فرض کیا ہے تو تم سب اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرو۔

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ آواز اللہ تعالیٰ نے ساری دُنیا میں پہنچا دی اور صرف اُسوقت کے زندہ انسانوں تک ہی نہیں بلکہ جو انسان آئندہ تا قیامت پیدا ہونیوالے تھے بطور معجزہ اُن سب تک یہ آواز پہنچا دی گئی اور جس جس کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے حج کرنا لکھ دیا ہے اُنمیں سے ہر ایک نے اس آواز کے جواب میں لبیک اللّٰھم لبیک کہا یعنی حاضر ہونیکا اقرار کیا۔ حضرت ابن عباس رض نے فرمایا کہ حج کے تلبیہ کی اصل بنیاد یہی ندائے ابراہیمی کا جواب ہے۔ (قرطبی و مظہری)

آگے آیت میں اُس تاثیر کا ذکر ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے اعلان کو تمام انسانوں تک منجانب اللہ پہنچانے سے قیامت تک کے لئے قائم ہوگئی وہ یہ ہے یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ، یعنی اطراف عالم سے لوگ بیت اللہ کیطرف چلے آوینگے کوئی پیادہ کوئی سوار، اور سواری سے آنے والے بھی دُور دراز ملکوں سے آئیں گے جس سے انکی سواریاں بھی لاغر ہو جائیں گی چنانچہ اُسوقت سے آج تک کہ ہزار ہا سال گزر چکے ہیں بیت اللہ کیطرف حج کے لئے آنیوالوں کی یہی کیفیت ہے۔ بعد میں آنے والے سب انبیاء اور اُن کی اُمتیں بھی اس کی پابند رہیں اور عیسٰی علیہ السلام کے بعد جو طویل دَور جاہلیت کا گزرا ہے اسمیں بھی عرب کے باشندے اگرچہ بُت پرستی کی بلا میں مبتلا ہوگئے تھے مگر حج کے ارکان کے اُسی طرح پابند تھے جس طرح ابراہیم علیہ السلام سے منقول و ماثور چلا آتا تھا۔

لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ، یعنی اُن کی یہ حاضری دور دراز سفر طے کرکے اپنے ہی منافع کیلئے ہے قرآن میں منافع کو بصیغہ نکرہ لاکر اسکے عموم کیطرف اشارہ کر دیا ہے جسمیں دینی منافع تو بیشمار ہیں ہی دُنیوی منافع بھی بہت مشاہدہ میں آتے ہیں کم از کم اتنی بات خود قابلِ تعجب حیرت ہے کہ حج کے سفر پر عموماً بڑی رقم خرچ ہوتی ہے جو بعض لوگ ساری عمر محنت کرکے تھوڑی تھوڑی بچاکر جمع کرتے ہیں اور یہاں بیک وقت خرچ کر ڈالتے ہیں لیکن ساری دُنیا کی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ ایسا نہیں بتایا جاسکتا کہ کوئی شخص حج یا عمرہ میں خرچ کرنے کی وجہ سے فقیر و محتاج ہوگیا ہو۔ اسکے سوا دوسرے کاموں مثلاً بیاہ شادی کی رسموں میں مکان تعمیر کرنے میں خرچ کرکے ہزاروں آدمی محتاج و فقیر ہونیوالے ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سفر حج و عمرہ میں یہ خصوصیت بھی رکھی ہے کہ اس سے کوئی شخص دُنیوی فقر و فاقہ میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ بعض روایات میں ہے کہ حج و عمرہ میں خرچ کرنا افلاس و محتاجی کو دُور کر دیتا ہے غور کیا جائے تو اسکا بھی مشاہدہ عموماً پایا جائیگا اور حج کے دینی منافع تو بہت ہیں اُنمیں سے ایک یہی کچھ کم نہیں جو حضرت ابوہریرہ رضی کی حدیث میں ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے اللہ کے لئے حج کیا اور اسمیں بے حیائی کی باتوں سے اور گناہ کے کاموں سے بچتا رہا تو وہ حج سے ایسی حالت میں واپس آئیگا کہ گویا یہ اپنی ماں کے پیٹ سے آج برآمد ہوا ہے یعنی جیسے ابتداء ولادت میں بچہ بے گناہ معصوم ہوتا ہے یہ بھی ایسا ہی ہو جائیگا۔ رواہ البخاری و مسلم (مظہری) بیت اللہ کے پاس جمع ہونیوالے حجاج کے آنے کا ایک فائدہ تو اوپر یہ مذکور ہوا کہ وہ اپنے دینی اور دُنیوی منافع اور فوائد کا مشاہدہ کرلیں۔ دوسرا فائدہ یہ بتلایا گیا کہ وَیَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ، یعنی تاکہ وہ اللہ کا نام ذکر کریں ایام معلومات میں اُن چوپایہ جانوروں پر جو اللہ نے اُن کو عطا فرمائے ہیں۔ اسمیں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قربانی کے گوشت اور اُس سے حاصل ہونیوالے فوائد پر نظر نہ ہونی چاہیئے بلکہ اصل چیز اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے جو ان دنوں میں قربان

کرنے کے وقت جانوروں پر کیا جاتا ہے جو روحِ عبادت ہے۔ قربانی کا گوشت اُن کے لئے حلال کر دیا گیا یہ مزید انعام ہے۔ اور ایام معلومات سے مُراد وہی دن ہیں جنمیں قربانی جائز ہے یعنی ذی الحجہ کی دسویں، گیارھویں بارھویں تاریخیں۔ اور مَا رَزَقَهُم مِّنۢ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ کے الفاظ عام ہیں اسمیں ہر طرح کی قربانی داخل ہے خواہ واجب ہو یا مستحب فَكُلُوا مِنْهَا، یہاں لفظ کلوا اگرچہ بصیغہ امر آیا ہے مگر مُراد اس سے وجوب نہیں بلکہ اباحت اور جواز ہے جیسا قرآن کی آیت وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا میں شکار کا حکم بمعنے اجازت ہے۔

مسئلہ: مکہ معظمہ اور زمانۂ حج میں مختلف قسم کے جانور ذبح کیے جاتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو کسی جرم کی سزا کے طور پر جانور کی قُربانی واجب ہو جاتی ہے جیسے کسی نے حرم شریف کے اندر شکار مار دیا تو اُس پر اسکی جزا میں کسی جانور کی قربانی واجب ہوتی ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں ہے کہ کون سے جانور کے بدلے میں کس طرح کا جانور قربان کرنا ہے۔ اسی طرح جو کام احرام کی حالت میں ممنوع ہیں اگر کسی نے وہ کام کرلیا تو اسپر بھی جانور ذبح کرنا لازم اور واجب ہو جاتا ہے جسکو فقہاء کی اصطلاح میں دم جنایت کہا جاتا ہے اسمیں بھی کچھ تفصیل ہے بعض ممنوعات کے کرلینے سے گائے یا اونٹ ہی کی قربانی دینا ضروری ہوتا ہے اور بعض کیلئے بکرے دُنبے کی کافی ہوتی ہے بعض میں دَم واجب نہیں ہوتا صرف صدقہ دینا کافی ہوتا ہے یہاں تفصیلات کی یہ جگہ نہیں، احقر نے اپنے رسالہ احکام الحج میں بقدر ضرورت لکھدیا ہے۔ یہ قسم دَم کی جو کسی جنایت اور جُرم کی سزا کے طور پر لازم ہوا ہے اسکا گوشت کھانا خود اس شخص کیلئے جائز نہیں بلکہ یہ صرف فقراء و مساکین کا حق ہے کسی دوسرے مالدار آدمی کو بھی اسکا کھانا جائز نہیں، اسپر تمام فقہاء اُمت کا اتفاق ہے۔ باقی قسمیں قربانی کی خواہ واجب ہوں یا نفلی، واجب میں حنفیہ مالکیہ شافعیہ کے نزدیک دَم تمتع اور دَم قران بھی داخل ہے ان سب کا گوشت قربانی کرنے والا اسکے احباب اعزا اگرچہ اغنیاء ہوں وہ بھی کھا سکتے ہیں اس آیت میں اسی کا بیان ہے اور پوری تفصیل اسکے مسائل کی کتب فقہ میں دیکھی جائے۔ عام قربانی کا گوشت ہو یا خاص حج کی قربانیاں ان سب کا حکم یہی ہے کہ قربانی کرنیوالا خود اور ہر مسلمان غنی ہو یا فقیر اسمیں سے کھا سکتا ہے لیکن مستحب یہ ہے کہ کم از کم ایک تہائی حصہ غرباء، فقراء کو دیدیا جائے۔ اسی امر مستحب کا بیان آیت کے اگلے جملے میں اسطرح فرمایا ہے وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ، بائس کے معنے بہت تنگدست مصیبت زدہ اور فقیر کے معنے حاجتمند کے ہیں مطلب یہ ہے کہ قربانی کے گوشت میں سے ان کو بھی کھلانا اور دینا مستحب اور مطلوب ہے۔

ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ تفث کے لغوی معنے میل کچیل کے ہیں جو انسان کے بدن پر جمع ہو جاتا ہے حالتِ احرام میں چونکہ بالوں کا مونڈنا، کاٹنا، نوچنا اسی طرح ناخن تراشنا، خوشبو لگانا یہ سب چیزیں حرام ہوتی ہیں تو انکے نیچے میل کچیل جمع ہونا طبعی امر ہے اس آیت میں یہ فرمایا کہ جب حج میں قربانی سے

فارغ ہو جاؤ تو اس مَیل کچیل کو دُور کر دو مطلب یہ ہے کہ اب احرام کھول ڈالو اور سر منڈاؤ ناخن تراشو۔ زیر ناف کے بال صاف کرلو۔ آیت مذکورہ میں پہلے قربانی کرنیکا ذکر آیا اسکے بعد احرام کھولنے کا اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ اسی ترتیب سے کام کرنا چاہئے قربانی سے پہلے حلق کرنا یا ناخن کاٹنا وغیرہ ممنوع ہے اور جو ایسا کریگا اُس پر دَم جنایت واجب ہوگا۔

افعالِ حج میں ترتیب کا درجہ | جو ترتیب افعال حج کی قرآن و حدیث میں آئی اور فقہاء نے اسکو منضبط کیا اسی ترتیب سے افعال حج ادا کرنا باتفاقِ اُمت کم از کم سنت ضرور ہے واجب ہونیمیں اختلاف ہے امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالکؒ کے نزدیک واجب ہے جس کے خلاف کرنے سے ایک دَم جنایت لازم ہوتا ہے امام شافعی رحؒ کے نزدیک سُنت ہے اسلئے اسکے خلاف کرنیسے ثواب میں کمی آتی ہے مگر دَم لازم نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضؓ کی حدیث میں ہے من قدّم شیئاً من نسکہ اواخرہ فلیھرق دماً رواہ ابن ابی شیبۃ موقوفا وھو فی حکم المرفوع (مظہری) یعنی جس شخص نے افعال حج میں سے کسی کو مقدم یا مؤخر کر دیا اُس پر لازم ہے کہ ایک دَم دے۔ یہ روایت طحاوی نے بھی مختلف طرق سے نقل کی ہے اور حضرت سعید بن جبیرؓ، قتادہؒ، نخعیؒ، حسن بصریؒ کا بھی یہی مذہب ہے کہ خلاف ترتیب کرنے والے پر دَم لازم کرتے ہیں۔ تفسیر مظہری میں اس جگہ اس مسئلہ کی پوری تفصیل و تحقیق مذکور ہے۔ نیز دوسرے مسائل حج بھی مفصل لکھے ہیں۔

وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ، نذور، نذر کی جمع ہے جس کو اُردو میں مَنّت کہا جاتا ہے اُس کی حقیقت یہ ہے کہ جو کام شرعاً کسی شخص پر لازم و واجب نہیں تھا اگر وہ زبان سے یہ نذر کرلے اور منّت مان لے کہ میں یہ کام کرونگا یا اللہ کے لئے مجھ پر لازم ہے کہ فلاں کام کروں تو یہ نذر ہو جاتی ہے۔ جسکا حکم یہ ہے کہ اسکا پُورا کرنا واجب ہو جاتا ہے اگرچہ اصل سے واجب نہیں تھا مگر اسکے واجب ہو جانے کے لئے یہ شرط تو باتفاق اُمت ہے کہ وہ کام شرعاً گناہ اور ناجائز نہ ہو۔ اگر کسی شخص نے گناہ کے کام کی نذر مان لی تو اُس پر وہ گناہ کرنا اس سے لازم نہیں ہو جاتا ہے بلکہ اسکے خلاف کرنا واجب ہے البتہ اُسپر کفارۂ قسم لازم ہو جائے گا۔ اور ابوحنیفہؒ وغیرہ ائمہ فقہاء کے نزدیک یہ بھی شرط ہے کہ وہ کام ایسا ہو جس کی جنس میں کوئی عبادت مقصودہ شرعیہ پائی جاتی ہو جیسے نماز، روزہ، صدقہ، قربانی وغیرہ کہ ان کی جنس میں کچھ شرعی واجبات اور عبادات مقصودہ ہیں۔ تو اگر کوئی شخص نفلی نماز روزے صدقہ وغیرہ کی نذر مان لے تو وہ نفل اسکے ذمہ واجب ہو جاتی ہے اُسکا پُورا کرنا اسکے ذمّہ لازم و واجب ہے۔ آیت مذکورہ سے یہی حکم ثابت ہوتا ہے کیونکہ اسمیں نذر کے ایفاء یعنی پُورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

مسئلہ | یہ یاد رہے کہ صرف دل میں کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرنے سے نذر نہیں ہوتی جبتک زبان

سے الفاظ نذر ادا نہ کرے۔ تفسیر مظہری میں اس جگہ نذر اور منت کے احکام و مسائل بڑی تفصیل سے جمع کر دیئے ہیں جو اپنی جگہ بہت اہم ہیں مگر یہاں اُن کی گنجائش نہیں۔

ایک سوال اور جواب اس آیت سے پہلے بھی اعمال حج قربانی اور احرام کھولنے وغیرہ کا ذکر ہوا ہے اور آگے بھی طواف زیارت کا بیان ہے درمیان میں ایفاء نذر کا ذکر کس مناسبت سے ہوا جبکہ ایفائے نذر ایک مستقل حکم ہے حج میں ہو یا حج کے بغیر اور حرم شریف میں ہو یا باہر کسی ملک میں۔

جواب یہ ہے کہ اگرچہ ایفاء نذر ایک مستقل حکم شرعی ہے ایام حج اور افعال حج یا حرم کیساتھ مخصوص نہیں لیکن اسکا ذکر یہاں افعال حج کے ضمن میں شاید اسوجہ سے ہے کہ انسان جب حج کے لئے نکلتا ہے تو دل کا داعیہ ہوتا ہے کہ اس سفر میں زیادہ سے زیادہ نیک کام اور عبادات ادا کرے اسمیں بہت سی چیزوں کی نذر بھی کرلیتا ہے خصوصاً جانوروں کی قربانی کی نذر کرنے کا تو عام رواج ہے حضرت ابن عباسؓ نے یہاں نذر سے مراد قربانی ہی کی نذر قرار دی ہے۔ اور ایک مناسبت نذر کی احکام حج سے یہ بھی ہے کہ جسطرح نذر اور قسم سے انسان پر بہت سی چیزیں جو اصل شرع کی رُو سے واجب نہیں تھیں واجب ہو جاتی ہیں۔ اور بہت سی چیزیں جو اصل احکام کی رو سے حرام ناجائز نہیں تھیں وہ اس شخص پر ناجائز و حرام ہو جاتی ہیں۔ احرام کے تمام احکام تقریباً ایسے ہی ہیں کہ سلے ہوئے کپڑے، خوشبو کا استعمال بال مونڈنا، ناخن تراشنا وغیرہ فی نفسہ کوئی ناجائز کام نہ تھے مگر اسنے احرام باندھ کر یہ سب کام اپنے اوپر حرام کرلئے۔ اسی طرح حج کے دوسرے اعمال و افعال جو فرض تو عمر میں ایک ہی مرتبہ ہوتے ہیں مگر بعد میں حج وعمرہ کے لئے احرام باندھ کر یہ سب کام اسکے لئے فرض ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے حضرت عکرمہؓ نے اس جگہ نذور کی تفسیر میں یہی فرمایا کہ اس سے مواجب حج مراد ہیں جو حج کی وجہ سے اسپر لازم ہو گئے تھے۔

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ، یہاں طواف سے مراد طوافِ زیارت ہے جو دسویں تاریخ ذی الحجہ کو رمی جمرہ اور قربانی کے بعد کیا جاتا ہے یہ طواف حج کا دوسرا رکن اور فرض ہے پہلا رکن وقوف عرفات ہے جو اس سے پہلے ادا ہو جاتا ہے۔ طواف زیارت پر احرام کے سب احکام مکمل ہو کر پورا احرام کھل جاتا ہے (روی ذلک عن ابن عباس ومجاہد والضحاک وجماعۃ بل قال الطبری ولم یسلم لہ لا خلاف بین المتاولین فی انہ طواف الافاضہ ویکون ذلک یوم النحر از روح المعانی)

بیتِ عتیق، بیت اللہ کا نام بیت عتیق اسلئے ہے کہ عتیق کے معنے آزاد کے ہیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے اپنے گھر کا نام بیت عتیق اسلئے رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسکو کفار و جبابرہ کے غلبہ اور قبضہ سے آزاد کر دیا ہے (رواہ الترمذی وحسنہ والحاکم وصححہ وابن جریر والطبرانی وغیرہم از روح المعانی) کسی کافر کی مجال نہیں کہ اسپر قبضہ یا غلبہ کرسکے۔ اصحابِ فیل کا واقعہ اسپر شاہد ہے واللہ اعلم۔ تفسیر مظہری میں اس موقع پر طواف کے مفصل احکام و مسائل جمع کر دیئے ہیں جو بہت اہم قابلِ دید ہیں۔ واللہ اعلم

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ وَاُحِلَّتْ

یہ سُن چکے اور جو کوئی بڑائی رکھے اللہ کی حرمتوں کی سو وہ بہتر ہے اسکے لئے اپنے رب کے پاس اور حلال ہیں

لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ

تم کو چوپائے مگر جو تم کو سُناتے ہیں سو بچتے رہو بتوں کی گندگی سے

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝۳۰ حُنَفَاۗءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ

اور بچتے رہو جھوٹی بات سے ایک اللہ کی طرف کے ہو کر نہ کہ اسکے ساتھ شریک بنا کر اور جسنے

يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاۗءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ

شریک بنایا اللہ کا سو جیسے گر پڑا آسمان سے پھر اُچکتے ہیں اسکو اُڑنے والے مردار خوار یا جا ڈالا

بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝۳۱ ذٰلِكَ ۤ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ

اس کو ہوا نے کسی دور مکان میں یہ سُن چکے اور جو کوئی ادب رکھے اللہ کے نام لگی چیزوں کا

فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝۳۲ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى

سو وہ دل کی پرہیزگاری کی بات ہے تمہارے واسطے چوپایوں میں فائدے ہیں ایک مقرر وعدہ تک

ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝۳۳ ع

پھر اُن کو پہنچنا اس قدیم گھر تک

خلاصۂ تفسیر

یہ بات تو ہو چکی (جو حج کے مخصوص احکام تھے) اور (اب دوسرے عام احکام جن میں حج اور علاوہ حج کے دوسرے مسائل بھی ہیں سنو کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کے محترم احکام کی وقعت کریگا سو یہ اسکے حق میں اسکے رب کے نزدیک بہتر ہے (احکام کی وقعت کرنے میں یہ بھی داخل ہے کہ اُن کا علم بھی حاصل کرے اور یہ بھی کہ اُن پر عمل کا اہتمام کرے۔ اور احکام خداوندی کی وقعت کا اسکے لئے بہتر ہونا اس لئے ہے کہ وہ عذاب سے نجات اور دائمی راحت کا سامان ہے) اور ان مخصوص چوپاؤں کو باستثنائے اُن (بعض بعض) کے جو تم کو پڑھ کر سنا دیئے گئے ہیں (یعنی سورۂ انعام وغیرہ کی آیت قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا میں حرام جانوروں کی تفصیل بتلا دی گئی ہے انکے سوا دوسرے چوپائے) تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے (اس جگہ چوپایہ جانوروں کے حلال ہونیکا ذکر اس لئے کیا گیا کہ حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت سے کسی کو احرام کی حالت میں عام چوپائے جانوروں کی ممانعت کا شبہ نہ ہو جائے اور جب دین و دُنیا کی بھلائی احکام خداوندی کی تعظیم میں منحصر ہے) تو تم لوگ گندگی سے یعنی بتوں سے کنارہ کش رہو (کیونکہ بتوں کو خدا کے ساتھ شریک کرنا تو حکم الٰہی سے کھلی بغاوت ہے اس جگہ شرک سے بچنے

کی ہدایت خاص طور پر اس لئے کی گئی کہ مشرکین مکہ اپنے حج میں جو تلبیہ پڑھتے تھے اُسمیں الا شریکا ھو لک ملا دیتے تھے یعنی اللہ کا کوئی شریک بجز اُن بُتوں کے نہیں ہے جو خود اُسی اللہ کے ہیں) اور جھوٹی بات سے بچتے رہو (خواہ وہ عقائد کا جھوٹ ہو جیسے مشرکین کا اعتقاد شرک یا دوسری قسم کا جھوٹ) اس طور سے کہ اللہ کی طرف جھکے رہو اسکے ساتھ (کسی کو شریک مت ٹھہراؤ اور جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو (اُس کی حالت ایسی ہوگی جیسے) گویا وہ آسمان سے گر پڑا پھر پرندوں نے اُس کی بوٹیاں نوچ لیں یا اسکو ہوا نے کسی دُور دراز جگہ لیجا کر پٹک دیا۔ یہ بات بھی (جو بطور قاعدہ کلیہ کے تھی) ہو چکی اور (اب ایک ضروری بات قربانی کے جانوروں کے متعلق اور سُن لو کہ) جو شخص دینِ خداوندی کے ان (مذکورہ) یادگاروں کا پُورا لحاظ رکھے گا تو اُسکا یہ لحاظ رکھنا دل کے ساتھ خدا سے ڈرنے سے حاصل ہوتا ہے (یادگاروں کا لحاظ رکھنے سے مُراد احکامِ الٰہیہ کی پابندی ہے جو قُربانی کے متعلق ہیں خواہ ذبح سے قبل کے احکام ہوں یا ذبح کے وقت ہوں جیسا اُس پر اللہ کا نام لینا یا بعد ذبح کے ہوں جیسے اُسکا کھانا یا نہ کھانا کہ جس کا کھانا جس کے لئے حلال ہے وہ کھائے جس کا کھانا جس کے لئے حلال نہیں وہ نہ کھائے۔ ان احکام میں کچھ تو پہلے بھی ذکر کئے جا چکے اور کچھ یہ ہیں کہ) تم کو ان سے ایک معین وقت تک فوائد حاصل کرنا جائز ہے (یعنی جب تک وہ قواعد شرعیہ کے مطابق ہدی نہ بنائے جاویں تو اُن سے دودھ یا سواری باربرداری وغیرہ کا فائدہ اُٹھانا جائز ہے مگر جب اُن کو بیت اللہ اور حج یا عمرہ کے لئے ہدی بنا دیا تو پھر اُن سے کوئی نفع اُٹھانا جائز نہیں) پھر (یعنی ہدی بننے کے بعد) اسکے ذبح حلال ہونے کا موقع بیت عتیق کے قریب ہے (مراد پُورا حرم ہے یعنی حرم سے باہر ذبح نہ کریں)۔

معارف و مسائل

حُرُمٰتِ اللّٰہِ سے مُراد اللہ کی محترم اور معزز بنائی ہوئی چیزیں یعنی احکامِ شرعیہ ہیں۔ اُن کی تعظیم یعنی اُن کا علم حاصل کرنا اور اُس پر عمل کرنا سرمایۂ سعادتِ دُنیا و آخرت ہے۔

اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ، انعام سے مراد اُونٹ۔ گائے بکرا۔ مینڈھا۔ دُنبہ وغیرہ ہیں کہ یہ جانور حالتِ احرام میں بھی حلال ہیں اور اِلَّا مَا يُتْلٰى میں جن جانوروں کو مستثنیٰ کرنے کا ذکر ہے اُن کا بیان دوسری آیات میں آیا ہے وہ مُردار جانور اور موقوذہ اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو یا جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو یہ سب ہمیشہ کے لئے حرام ہیں حالت احرام کی ہو یا غیر احرام کی۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ ، رجس کے معنے ناپاکی اور گندگی کے ہیں اور اوثان وثن کی جمع ہے بُت کے معنے میں۔ بُتوں کو نجاست اس لئے قرار دیا کہ وہ انسان کے باطن کو شرک

کی نجاست سے بھر دیتے ہیں۔

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ، قول زور سے مُراد جھوٹ ہے، حق کے خلاف جو کچھ ہے وہ باطل اور جھوٹ میں داخل ہے خواہ عقائدہ فاسدہ شرک و کفر ہوں یا معاملات میں اور شہادت میں جھوٹ بولنا ہو۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب کبیرہ گناہوں میں سے بڑے کبیرہ یہ گناہ ہیں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی گواہی دینا اور عام باتوں میں جھوٹ بولنا۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے آخری لفظ وَقَوْلَ الزُّوْرِ کو بار بار فرمایا (رواہ البخاری)

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ، شعائر شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنے علامت کے ہیں جو چیزیں کسی خاص مذہب یا جماعت کی علامات خاص سمجھی جاتی ہوں وہ اُس کے شعائر کہلاتے ہیں شعائرِ اسلام اُن خاص احکام کا نام ہے جو عرف میں مسلمان ہونے کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ حج کے اکثر احکام ایسے ہی ہیں۔

مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ، یعنی شعائر اللہ کی تعظیم دل کے تقویٰ کی علامت ہے ان کی تعظیم وہی کرتا ہے جس کے دل میں تقویٰ اور خوفِ خدا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ کا تعلق اصل میں انسان کے دل سے ہے جب اُسمیں خوفِ خدا ہوتا ہے تو اسکا اثر سب اعمال افعال میں دیکھا جاتا ہے۔

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى، یعنی چوپائے جانوروں سے دودھ، سواری، بار برداری ہر قسم کے منافع حاصل کرنا تمھارے لئے اسوقت تک تو حلال ہے جب تک ان کو حرم مکہ میں ذبح کرنے کے لئے نامزد کرکے ہدیٰ نہ بنالیا ہو۔ ہدیٰ اُسی جانور کو کہتے ہیں جو حج یا عمرہ کرنے والا اپنے ساتھ کوئی جانور لیجائے کہ اس کو حرم شریف میں ذبح کیا جائے گا۔ جب اُس کو ہدی حرم کے لئے نامزد اور مقرر کردیا تو پھر اُس سے کسی قسم کا نفع اُٹھانا بغیر کسی خاص مجبوری کے جائز نہیں جیسے اونٹ کو ہدی بناکر ساتھ لیا اور خود پیدل چل رہا ہے سواری کے لئے کوئی دوسرا جانور موجود نہیں اور پیدل چلنا اُسکے لئے مشکل ہو جائے تو مجبوری اور ضرورت کی بنا پر اسوقت سوار ہونے کی اجازت ہے۔

ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ، یہاں بیت عتیق سے مراد پورا حرم شریف ہے جو درحقیقت بیت اللہ ہی کا حریم خاص ہے جیسے سابقہ آیت میں مسجد حرام کے لفظ سے پورا حرم مُراد لیا گیا، یہاں بیتِ عتیق کے لفظ سے بھی پورا حرم مُراد ہے اور محلھا میں محِل کے معنے موضع حلول اجل کے ہیں مُراد اس سے موضع ذبح ہے یعنی ہدی کے جانوروں کے ذبح کرنے کا مقام بیت عتیق کے پاس ہے اور مراد پورا حرم ہے کہ وہ بیت عتیق ہی کے حکم میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہدی کا ذبح کرنا حرم کے اندر ضروری ہے حرم سے باہر جائز نہیں۔ اور پھر حرم عام ہے خواہ منحر منیٰ ہو یا مکہ مکرمہ کی کوئی اور جگہ ہو (روح المعانی)

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ

اور ہر اُمت کے واسطے ہم نے مقرر کردی ہے قربانی کہ یاد کریں اللہ کے نام ذبح پر چوپایوں کے،

مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ؕ وَ

جو اُن کو اللہ نے دیئے سو اللہ تمہارا ایک اللہ ہے سو اسی کے حکم میں رہو اور

بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ

بشارت سُنا دے عاجزی کرنے والوں کو وہ کہ جب نام لیجئے اللہ کا ڈر جائیں اُن کے دل

وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

اور سہنے والے اُس کو جو اُن پر پڑے اور قائم رکھنے والے نماز کے اور ہمارا دیا ہوا کچھ خرچ

يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ

کرتے رہتے ہیں اور کعبہ کے چڑھانے کے اونٹ ٹھہرائے ہیں تمہارے واسطے نشانی اللہ کے نام

لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا

کی تمہارے واسطے اسمیں بھلائی ہے سو پڑھو اُن پر نام اللہ کا قطار باندھ کر پھر جب

وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ

گر پڑے اُن کی کروٹ تو کھاؤ اسمیں سے اور کھلاؤ صبر سے بیٹھے کو اور بیقراری کرتے کو اسی طرح

سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا

تمہارے بس میں کر دیا ہم نے ان جانوروں کو تاکہ تم احسان مانو اللہ کو نہیں پہنچتا اُن کا گوشت

وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا

اور ان کا لہو لیکن اس کو پہنچتا ہے تمہارے دل کا ادب اسی طرح اُن کو بس میں کر دیا

لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

تمہارے کہ اللہ کی بڑائی پڑھو اس بات پر کہ تم کو راہ سجھائی اور بشارت سُنا دے نیکی والوں کو

خلاصۂ تفسیر

اور (اُوپر جو قربانی کا حرم میں ذبح کرنے کا حکم ہے اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ مقصود اصلی تعظیم حرم کی ہے بلکہ اصل مقصود اللہ ہی کی تعظیم اور اسکے ساتھ تقرب ہے اور مذبوح اور مذبح اسکا ایک آلہ اور ذریعہ ہے اور تخصیص بعض حکمتوں کی وجہ سے ہے اور اگر یہ تخصیصات مقصود اصلی ہوتیں تو کسی شریعت میں نہ بدلتیں مگر ان کا بدلتا رہنا ظاہر ہے البتہ تقرب الی اللہ جو اصل مقصود تھا وہ سب شرائع میں محفوظ رہا چنانچہ) ہم نے (جتنے اہلِ شرائع گزرے ہیں ان میں سے) ہر اُمت کے لئے قربانی کرنا اس غرض سے مقرر کیا تھا کہ وہ ان مخصوص چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انکو عطا

فرمایا تھا (پس اصلی مقصود یہ نام لینا تھا) سو (اس سے یہ بات نکل آئی کہ) تمہارا معبود (حقیقی) ایک ہی خدا ہے (جسکا ذکر کرکے سبب کو تقرب کا حکم ہوتا رہا) تو تم ہمہ تن اسی کے ہو کر رہو (یعنی موحد خالص رہو، کسی مکان وغیرہ کو معظم بالذات سمجھنے سے ذرہ برابر شرک کا شائبہ اپنے عمل میں نہ ہونے دو) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو لوگ ہماری اس تعلیم پر عمل کریں) آپ (ایسے احکام الٰہیہ کے سامنے) گردن جھکا دینے والوں کو (جنت وغیرہ کی) خوشخبری سُنا دیجئے جو (اس توحید خالص کی برکت سے) ایسے ہیں کہ جب (ان کے سامنے) اللہ (کے احکام وصفات اور وعدہ وعید) کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن کے دل ڈر جاتے ہیں اور جو ان مصیبتوں پر کہ اُن پر پڑتی ہیں صبر کرتے ہیں اور جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے (بقدر حکم اور توفیق کے) خرچ کرتے ہیں (یعنی توحید خالص ایسی بابرکت چیز ہے کہ اسکی بدولت کمالاتِ نفسانیہ وبدنیۂ مالیہ پیدا ہوجاتے ہیں) اور (اسی طرح اوپر جو تعظیم شعائر اللہ الخ میں بعض انتفاعات کا ممنوع ہونا معلوم ہوا ہے اس سے بھی ان قربانیوں کے معظم بالذات ہونے کا شبہہ نہ کیا جاوے کیونکہ اس سے بھی اصل وہی اللہ تعالیٰ کی اور اسکے دین کی تعظیم ہے اور یہ تخصیصات اسکا ایک طریق ہے پس) قربانی کے اونٹ اور گائے کو (اور اسی طرح بکری بھیڑ کو بھی) ہم نے اللہ (کے دین) کی یادگار بنایا ہے (کہ اسکے متعلق احکام کے علم اور عمل سے اللہ کی عظمت اور دین کی وقعت ظاہر ہوتی ہے کہ اسکے نامزد چیز سے منتفع ہونے میں مالک مجازی کی رائے قابلِ اعتبار نہ رہے جس سے اس کی پوری عبدیت اور مالک حقیقی کی معبودیت ظاہر ہوتی ہے اور اس حکمت دینی کے علاوہ) ان جانوروں میں تمہارے (اور بھی) فائدے ہیں (مثلاً دنیوی فائدہ کھانا اور کھلانا اور اخروی فائدہ ثواب ہے) سو (جب اس میں یہ حکمتیں ہیں تو) تم ان پر کھڑے کرکے (ذبح کرنیکے وقت) اللہ کا نام لیا کرو (یہ صرف اُونٹوں کے اعتبار سے فرمایا کہ ان کا کھڑے کرکے ذبح کرنا بوجہ آسانی ذبح وخروج روح کے بہتر ہے پس اس سے تو اُخروی فائدہ یعنی ثواب حاصل ہوا اور نیز اللہ کی عظمت ظاہر ہوئی کہ اسکے نام پر ایک جان قربان ہوئی جس سے اُسکا خالق اور اسکا مخلوق ہونا ظاہر کردیا گیا) پس جب وہ (کسی) کروٹ کے بل گر پڑیں (اور ٹھنڈے ہوجاویں) تو تم خود بھی کھاؤ اور بے سوال اور سوالی (محتاج) کو (جو کہ باعتبار فقیر کی دو قسمیں ہیں) بھی کھانے کو دو۔ (کہ یہ دُنیوی فائدہ بھی ہے اور) ہم نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے زیرِ حکم کردیا (کہ تم باوجود تمہارے ضعف اور اُن کی قوت کے اس طرح اسکے ذبح پر قادر ہوگئے) تاکہ تم (اس تسخیر پر اللہ تعالیٰ کا) شکر کرو (یہ حکمت مطلق ذبح میں ہے۔ قطع نظر اس کی قربانی ہونے کے اور آگے ذبح کی تخصیصات کے مقصود بالذات نہ ہونے کو ایک عقلی قاعدے سے بیان فرماتے ہیں کہ دیکھو ظاہر بات ہے کہ) اللہ تعالیٰ کے پاس نہ اُن کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ اُن کا خون،

ولیکن اسکے پاس تمہارا تقویٰ (کہ نیت تقرب واخلاص اسکے شعبوں میں سے ہے البتہ) پہنچتا ہے۔ (پس وہی تعظیم الٰہی کی مقصودیت ثابت ہوگئی اور جیسے اوپر کَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا الخ میں تسخیر کی ایک عام حکمت یعنی قربانی ہونے کی خصوصیت سے قطع نظر کرنے کے اعتبار سے بیان ہوئی تھی آگے تسخیر کی ایک خاص حکمت یعنی بلحاظ قربانی ہونے کے ارشاد فرماتے ہیں کہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو تمہارا زیر حکم کردیا کہ تم (اللہ کی راہ میں ان کو قربانی کرکے) اس بات پر اللہ کی بڑائی (بیان) کرو کہ اس نے تم کو (اس طرح قربانی کرنے کی) توفیق دی (ورنہ اگر توفیق الٰہی رہبر نہ ہوتی تو یا تو ذبح ہی میں شبہات نکال کر اس عبادت سے محروم رہتے اور یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے لگتے) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اخلاص والوں کو خوشخبری سنا دیجئے (اس سے پہلے خوشخبری اخلاص کے شعبوں پر تھی یہ خاص اخلاص پر ہے)

معارف ومسائل

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لفظ مَنْسَك اور نُسُك، عربی زبان کے اعتبار سے کئی معنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ ایک معنی جانور کی قربانی کے دوسرے معنے تمام افعالِ حج کے اور تیسرے معنی مطلقاً عبادت کے ہیں قرآن کریم میں مختلف مواقع پر یہ لفظ ان تین معنے میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں تینوں معنے مراد ہوسکتے ہیں اسی لئے ائمہ تفسیر میں سے مجاہد وغیرہ نے اس جگہ مَنْسَک کو قربانی کے معنے میں لیا ہے۔ اس پر معنے آیت کے یہ ہونگے کہ قربانی کا حکم جو اس امت کے لوگوں کو دیا گیا ہے کوئی نیا حکم نہیں۔ پچھلی سب اُمتوں کے بھی ذمہ قربانی کی عبادت لگائی گئی تھی۔ اور قتادہؓ نے دوسرے معنے میں لیا ہے جس پر مراد آیت کی یہ ہوگی کہ افعالِ حج جیسے اس اُمت پر عائد کئے گئے ہیں پچھلی اُمتوں پر بھی حج فرض کیا گیا تھا۔ ابن عرفہ نے تیسرے معنے لئے ہیں اس اعتبار سے مراد آیت کی یہ ہوگی کہ ہم نے اللہ کی عبادت گزاری سب پچھلی اُمتوں پر بھی فرض کی تھی طریقہ عبادت میں کچھ کچھ فرق سب اُمتوں میں رہا ہے مگر اصل عبادت سب میں مشترک رہی ہے

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ لفظ خَبْت عربی زبان میں پست زمین کے معنی میں آتا ہے اسی لئے مُخْبِت اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو اپنے آپ کو حقیر سمجھے۔ اسی لئے حضرت قتادہ ومجاہد نے مخبتین کا ترجمہ متواضعین سے کیا ہے۔ عمرو بن اوس فرماتے ہیں کہ مخبتین وہ لوگ ہیں جو لوگوں پر ظلم نہیں کرتے اور اگر کوئی ان پر ظلم کرے تو اُس سے بدلہ نہیں لیتے۔ سفیان نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی قضاء وتقدیر پر راحت وکلفت فراخی اور تنگی ہر حال میں راضی رہتے ہیں۔

وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ، وجل کے اصلی معنے اس خوف وہیبت کے ہیں جو کسی کی عظمت کی بناء

پر دل میں پیدا ہو۔ اللہ کے نیک بندوں اور صلحار کا یہی حال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور نام سن کر انکے دلوں پر اس کی عظمت اور بڑائی کے سبب ایک خاص ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ، پہلے گزر چکا ہے کہ شعائر ان خاص احکام و عبادات کا نام ہے جو دینِ اسلام کی علامات سمجھی جاتی ہیں۔ قربانی بھی انھیں میں سے ہے ایسے احکام کی پابندی زیادہ اہم ہے۔

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ، صواف بمعنے مصفوفہ ہے یعنی صف بستہ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کی تفسیر یہ بیان فرمائی ہے کہ جانور تین پاؤں پر کھڑا ہو ایک ہاتھ بندھا ہوا ہو۔ یہ صورت قربانی کی اونٹ کے ساتھ مخصوص ہے اسکی قربانی کھڑے ہونیکی حالت میں سُنت اور بہتر ہے، باقی جانوروں کو لٹا کر ذبح کرنا سُنت ہے۔

فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا، یہاں وَجَبَتْ بمعنے سقطت آیا ہے جیسے وجبت الشمس بمعنے سقطت کا محاورہ مشہور ہے مُراد اس سے جانور کی جان نکل جانا ہے۔

الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ، پچھلی آیت میں جن لوگوں کو قربانی کا گوشت دینا چاہیئے انکو بائس فقیر کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے جس کے معنے ہیں مصیبت زدہ محتاج - اس آیت میں اس کی جگہ قانع اور معتر کے دو لفظوں میں اُس کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے۔ قانع سے مراد وہ محتاج فقیر ہے جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا اپنی غربت و فقر کے باوجود اپنی جگہ بیٹھ کر جو مل جائے اس پر قناعت کرتا ہے اور معتر، جو ایسے مواقع پر جائے جہاں سے کچھ ملنے کی اُمید ہو خواہ زبان سے سوال کرے یا نہ کرے (مظہری)

عبادات کی خاص صورتیں اصل مقصود نہیں بلکہ دل کا اخلاص و اطاعت مقصود ہے

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ قربانی جو ایک عظیم عبادت ہے اللہ کے پاس اس کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا نہ وہ مقصود قربانی ہے بلکہ مقصود اصلی اس پر اللہ کا نام لینا اور حکم ربی کی بجا آوری دلی اخلاص کے ساتھ ہے۔ یہی حکم دوسری تمام عبادات کا ہے کہ نماز کی نشست و برخاست، روزہ میں بھوکا پیاسا رہنا اصل مقصود نہیں بلکہ مقصود اصلی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل دلی اخلاص و محبت کیساتھ ہے اگر یہ عبادات اس اخلاص و محبت سے خالی ہیں تو صرف صورت اور ڈھانچہ ہے روح غائب ہے مگر عبادات کی شرعی صورت اور ڈھانچہ بھی اس لئے ضروری ہے کہ حکم ربانی کی تعمیل کیلئے اُس کی طرف سے یہ صورتیں متعین فرمادی گئی ہیں۔ واللہ اعلم۔

إِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِينَ اٰمَنُوا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ

اللہ دشمنوں کو ہٹا دے گا ایمان والوں سے اللہ کو خوش نہیں آتا کوئی

خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۸﴾

دغا باز ناشکر

خلاصۂ تفسیر

بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ان مشرکین کے غلبہ اور ایذا رسانی کی قدرت کو) ایمان والوں سے (عنقریب) ہٹا دیگا (کہ پھر حج وغیرہ سے روک ہی نہ سکیں گے) بیشک اللہ تعالیٰ کسی دغاباز کفر کرنیوالے کو نہیں چاہتا (بلکہ ایسے لوگوں سے ناراض ہے اسلئے انجام کار ان لوگوں کو مغلوب اور مؤمنین مخلصین کو غالب کرے گا)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں اسکا ذکر تھا کہ مشرکین نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپکے صحابہ کو جو عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ کے قریب مقام حدیبیہ پر پہنچ چکے تھے حرم شریف اور مسجد حرام میں جانے اور عمرہ ادا کرنے سے روکدیا تھا اس آیت میں مسلمانوں کو اس وعدہ کیساتھ تسلی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب ان مشرکین کی اس قوت کو توڑ دیگا جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں یہ واقعہ سنہ ۶ ہجری میں پیش آیا تھا اسکے بعد سے مسلسل کفار مشرکین کی طاقت کمزور اور ہمت پست ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ سنہ ۸ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوگیا۔ اگلی آیات میں اس کی تفصیل آرہی ہے۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقٰتَلُونَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ

حکم ہوا اُن لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں اسواسطے کہ اُن پر ظلم ہوا اور اللہ اُن کی مدد کرنے پر

لَقَدِيْرُۨ ﴿۳۹﴾ الَّذِينَ اُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ

قادر ہے وہ لوگ جن کو نکالا اُن کے گھروں سے اور دعویٰ کچھ نہیں سوائے اسکے کہ وہ

يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ

کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو دوسرے سے

لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ

تو ڈھائے جاتے تکیے اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ

اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۰﴾

کا بہت اور اللہ مقرر مدد کریگا اسکی جو مدد کریگا اسکی بیشک اللہ زبردست ہے زور والا

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ

وہ لوگ کہ اگر ہم اُن کو قدرت دیں مُلک میں تو وہ قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ اور

اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝۴۱

حکم کریں بھلے کام کا اور منع کریں بُرائی سے اور اللہ کے اختیار میں ہے آخر ہر کام کا

خلاصۂ تفسیر

(گو اب تک بمصالح کفار سے لڑنے کی ممانعت تھی لیکن اب) لڑنے کی ان لوگوں کو اجازت دیدی گئی جن سے (کافروں کی طرف سے) لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ اُن پر (بہت) ظلم کیا گیا ہے (یہ علت ہے مشروعیت جہاد کی) اور (اس حالتِ اذن میں مسلمانوں کی قلت اور کفار کی کثرت پر نظر نہ کرنا چاہئے کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے غالب کر دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے (آگے ان کی مظلومیت کا بیان ہے کہ) جو (بیچارے) اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ یُوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے (یعنی عقیدہ توحید پر کفار کا یہ تمام ترغیظ و غضب تھا کہ ان کو اسقدر پریشان کیا کہ وطن چھوڑنا پڑا آگے جہاد کی حکمت ہے) اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ (ہمیشہ سے) لوگوں کا ایک دوسرے (کے ہاتھ) سے زور نہ گھٹواتا رہتا (یعنی اہلِ حق کو اہلِ باطل پر وقتاً فوقتاً غالب نہ کرتا رہتا) تو (اپنے اپنے زمانوں میں) نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم (اور منعدم) ہو گئے ہوتے (آگے اخلاص فی الجہاد پر غلبہ کی بشارت ہے) اور بیشک اللہ تعالیٰ اُسکی مدد کریگا جو کہ اللہ (کے دین) کی مدد کریگا (یعنی اسکے لڑنے میں خالص نیت اعلاء کلمۃ اللہ کی ہو) بیشک اللہ تعالیٰ قوت والا (اور) غلبہ والا ہے (وہ جس کو چاہے قوت و غلبہ دے سکتا ہے آگے ان کی فضیلت ہے) یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دُنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ خود بھی نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور (دوسروں کو بھی) نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور بُرے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے (پس مسلمانوں کی موجودہ حالت دیکھ کر یہ کوئی کیونکر کہہ سکتا ہے کہ انجام بھی ان کا یہی رہے گا بلکہ ممکن ہے کہ اسکا عکس ہو جاوے چنانچہ ہوا)۔

معارف و مسائل

کفار کیساتھ جہاد کا پہلا حکم : مکہ مکرمہ میں مسلمانوں پر کفار کے مظالم کا یہ حال تھا کہ کوئی دن خالی نہ جاتا تھا کہ کوئی

مسلمان ان کے دستِ ستم سے زخمی اور چوٹ کھایا ہوا نہ آتا ہو۔ قیام مکہ کے آخری دور میں مسلمانوں کی تعداد بھی خاصی ہوچکی تھی وہ کفار کے ظلم و جور کی شکایت اور اُن کے مقابلے میں قتل و قتال کی اجازت مانگتے تھے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جواب میں فرماتے کہ صبر کرو مجھے ابھی تک قتال کی اجازت نہیں دی گئی یہ سلسلہ دس سال تک اسی طرح جاری رہا (قرطبی عن ابن عربی)

جس وقت رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم وطن مکہ چھوڑنے اور ہجرت کرنے پر مجبور کردیئے گئے اور صدیقِ اکبرؓ آپ کے رفیق تھے تو مکہ مکرمہ سے نکلتے وقت آپ کی زبان سے نکلا اخرجوا نبیّھم لیھلکن یعنی ان لوگوں نے اپنے نبی کو نکالا ہے اب اُن کی ہلاکت کا وقت آگیا ہے اس پر مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد یہ آیتِ مذکورہ نازل ہوئی (جس میں مُسلمانوں کو کفار سے قتال کی اجازت دیدی گئی) رواہ النسائی والترمذی عن ابن عباس۔ قرطبی

اور حضرت ابن عباسؓ سے ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم وغیرہ نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسکو حسن فرمایا ہے روایت یہ ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ پہلی آیت ہے جو قتالِ کفار کے معاملہ میں نازل ہوئی جبکہ اس سے پہلے ستر سے زیادہ آیتوں میں قتال کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

جہاد و قتال کی ایک حکمت وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ، اس میں جہاد و قتال کی حکمت کا اور اسکا بیان ہے کہ یہ کوئی نیا حکم نہیں۔ پچھلے انبیاء اور اُن کی اُمتوں کو بھی قتال کفار کے احکام دیئے گئے ہیں اور اگر ایسا نہ کیا جاتا تو کسی مذہب اور دین کی خیر نہ تھی سارے ہی دین و مذہب اور ان کی عبادت گاہیں ڈھادی جاتیں۔

لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ جتنے دین ومذہب دُنیا میں ایسے ہوئے ہیں کہ کسی زمانے میں اُن کی اصل بنیاد اللہ کیطرف سے اور وحی کے ذریعہ سے قائم ہوئی تھی پھر وہ منسوخ ہوگئے اور اُن میں تحریف ہوکر کفر و شرک میں تبدیل ہوگئے مگر اپنے اپنے وقت میں وہی حق تھے اُن سب کی عبادت گاہوں کا اس آیت میں ذکر فرمایا ہے کیونکہ اپنے اپنے وقت میں اُن کی عبادت گاہوں کا احترام اور حفاظت فرض تھی اُن مذاہب کے عبادت خانوں کا ذکر نہیں فرمایا جن کی بنیاد کسی وقت بھی نبوت اور وحی الٰہی پر نہیں تھی جیسے آتش پرست مجوس یا بُت پرست ہندو کیونکہ انکے عبادت خانے کسی وقت بھی قابل احترام نہ تھے۔

آیت میں صوامع، صومعہ کی جمع ہے جو نصاریٰ کے تارک الدنیا راہبوں کی مخصوص عبادتگاہ کو کہا جاتا ہے اور بِیَع، بیعۃ کی جمع ہے جو نصاریٰ کے عام کنیسوں کا نام ہے اور صَلَوٰت صلوٰۃ کی جمع ہے جو یہود کے عبادتخانہ کا نام ہے اور مَسٰجِد مسلمانوں کی عبادتگاہوں کا نام ہے۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ اگر کفار سے قتال و جہاد کے احکام نہ آتے تو کسی زمانے میں کسی مذہب و ملت کے لئے امن کی جگہ نہ ہوتی۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں صلوات اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں صوامع اور بیع اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسجدیں ڈھادی جاتیں (قرطبی)

خلفائے راشدین کے حق میں قرآن کی پیشین گوئی اور اس کا ظہور اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ، اس آیت میں الذین صفت ہے اُن لوگوں کی جن کا ذکر اس سے پہلے آیت میں ان الفاظ سے آیا ہے اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ، یعنی وہ لوگ جن کو اُن کے گھروں سے ظلماً بغیر کسی حق کے نکال دیا گیا۔ ان لوگوں کے بارے میں اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ان کو زمین میں حکومت و اقتدار دیدیا جائے تو یہ لوگ اپنے اقتدار کو ان کاموں میں صرف کرینگے کہ نمازیں قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کاموں کی طرف لوگوں کو دعوت دیں بُرے کاموں سے روکیں۔ اور یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہ آیات ہجرت مدینہ کے فوراً بعد اُس وقت نازل ہوئی ہیں جبکہ مسلمانوں کو کسی بھی زمین میں حکومت و اقتدار حاصل نہیں تھا مگر حق تعالیٰ نے اُن کے بارے میں پہلے ہی یہ خبر دیدی کہ جب اُن کو اقتدار حکومت ملے گا تو یہ دین کی مذکورہ اہم خدمات انجام دیں گے اسی لئے حضرت عثمان غنی رضہ نے فرمایا ثناء قبل بلاء، یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد عمل کے وجود میں آنے سے پہلے اُس کے عمل کرنے والوں کی مدح و ثنا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی اس خبر کا جس کا وقوع یقینی تھا اس دُنیا میں وقوع اس طرح ہوا کہ چاروں خلفائے راشدین اور مہاجرین اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا کے مصداق صحیح تھے پھر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں کو سب سے پہلے زمین کی مکنت و قدرت یعنی حکومت و سلطنت عطا فرمائی اور قرآن کی پیشین گوئی کے مطابق اُن کے اعمال و کردار اور کارناموں نے دُنیا کو دکھلا دیا کہ اُنھوں نے اپنے اقتدار کو اسی کام میں استعمال کیا کہ نمازیں قائم کیں زکوٰۃ کا نظام مضبوط کیا اچھے کاموں کو رواج دیا بُرے کاموں کا راستہ بند کیا۔

اسی لئے علماء نے فرمایا کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ خلفاء راشدین سب کے سب اسی بشارت کے مصداق ہیں اور جو نظام خلافت اُن کے زمانے میں قائم ہوا وہ حق و صحیح اور عین اللہ تعالیٰ کے ارادے اور رضا اور پیشگی خبر کے مطابق ہے (روح المعانی)

یہ تو اس آیت کے شانِ نزول کا واقعاتی پہلو ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ الفاظ قرآن جب عام ہوں تو وہ کسی خاص واقعہ میں منحصر نہیں ہوتے اُن کا حکم عام ہوتا ہے۔ اسی لئے ائمہ تفسیر میں سے ضحاکؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اُن لوگوں کے لئے ہدایت بھی ہے جن کو اللہ تعالیٰ ملک و سلطنت عطا فرما دیں کہ وہ اپنے اقتدار میں یہ کام انجام دیں جو خلفاء راشدین نے اپنے وقت میں انجام دیئے تھے۔ (قرطبی مع توضیح)

وَإِن يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَثَمُودُ ﴿٤٢﴾ وَ

اور اگر تجھ کو جھٹلائیں تو ان سے پہلے جھٹلا چکی ہے نوح کی قوم اور عاد اور ثمود اور

قَوْمُ إِبْرَاهِيمَ وَقَوْمُ لُوطٍ ﴿٤٣﴾ وَأَصْحَابُ مَدْيَنَ وَكُذِّبَ مُوسَىٰ فَأَمْلَيْتُ

ابراہیم کی قوم اور لوط کی قوم اور مدین کے لوگ اور موسیٰ کو جھٹلایا پھر میں نے

لِلْكَافِرِينَ ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٤٤﴾ فَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ

ڈھیل دی منکروں کو پھر پکڑ لیا ان کو تو کیسا ہوا میرا انکار سو کتنی بستیاں ہم نے غارت

أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ

کر ڈالیں اور وہ گنہگار تھیں اب وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر اور کتنے کنوئیں نکمے پڑے

وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ ﴿٤٥﴾ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ

اور کتنے محل گچکاری کے کیا سیر نہیں کی ملک کی جو ان کے دل ہوتے جن سے سمجھتے

بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن

یا کان ہوتے جن سے سنتے سو کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں پر اندھے

تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ﴿٤٦﴾ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَن

ہو جاتے ہیں دل جو سینوں میں ہیں اور تجھ سے جلدی مانگتے ہیں عذاب اور اللہ

يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا

ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ اور ایک دن تیرے رب کے یہاں ہزار برس کے برابر ہوتا ہے جو تم

تَعُدُّونَ ﴿٤٧﴾ وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ

گنتے ہو اور کتنی بستیاں ہیں کہ میں نے ان کو ڈھیل دی اور وہ گنہگار تھیں پھر

أَخَذْتُهَا وَإِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿٤٨﴾ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ

میں نے انکو پکڑا اور میری طرف پھر کر آنا ہے تو کہہ اے لوگو میں تو ڈر سنا دینے والا ہوں

نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٤٩﴾ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ

تم کو کھول کر سو جو لوگ یقین لائے اور کیں بھلائیاں انکے گناہ بخشدیتے ہیں اور انکو روزی کر

كَرِيمٌ ﴿٥٠﴾ وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿٥١﴾

عزت کی! اور جو دوڑے ہماری آیتوں کے ہرانے کو وہی ہیں دوزخ کے رہنے والے

ع ۱۰ / ۱۳

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (مجادلہ کرنے والے لوگ) اگر آپ کی تکذیب کرتے ہوں (تو آپ مغموم نہ ہوں کیونکہ

۱۸

ان لوگوں سے پہلے قوم نوح اور عاد و ثمود اور قوم ابراہیم اور قوم لوط اور اہل مدین بھی (اپنے اپنے انبیاء علیہم السلام کی) تکذیب کر چکے ہیں اور موسیٰ (علیہ السلام) کو بھی کاذب قرار دیا گیا (مگر تکذیب کے بعد) میں نے ان کافروں کو (چند روز) مہلت دی جیسے آج کے منکروں کو مہلت دے رکھی ہے پھر میں نے ان کو (عذاب میں) پکڑ لیا تو (دیکھو) میرا عذاب کیسا ہوا۔ غرض کتنی بستیاں ہیں جنکو ہم نے (عذاب سے) ہلاک کیا جن کی یہ حالت تھی کہ وہ نافرمانی کرتی تھیں تو (اب ان کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں (یعنی ویران ہیں کیونکہ عادۃً اول چھت گرا کرتی ہے پھر دیواریں آپڑتی ہیں) اور (اس طرح ان بستیوں میں) بہت سے بیکار کنویں (جو پہلے آباد تھے) بہت سے پختہ قلعے چونے کے محل (جو اب شکستہ ہوگئے یہ سب ان بستیوں کے ساتھ تباہ ہوئے۔ پس اسی طرح وقت موعود پر اس زمانے کے لوگ بھی عذاب میں پکڑے جاویں گے) تو کیا یہ (سُن کر) لوگ مُلک میں چلے پھرے نہیں جس سے اُن کے دل ایسے ہو جاویں کہ ان سے سمجھنے لگیں یا اُن کے کان ایسے ہو جاویں کہ اُن سے سُننے لگیں بات یہ ہے کہ (نہ سمجھنے والوں کی کچھ) آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں (ان موجودہ منکرین کے بھی دل اندھے ہوگئے ورنہ پچھلی اُمتوں کے حالات سے سبق سیکھ لیتے) اور یہ لوگ (نبوت میں شبہ ڈالنے کے لئے) آپ سے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں (اور عذاب کے جلدی نہ آنے سے یہ دلیل پکڑتے ہیں کہ عذاب آنیوالا ہی نہیں) حالانکہ اللہ تعالیٰ کبھی اپنا وعدہ خلاف نہ کریگا (یعنی وعدہ کے وقت ضرور عذاب واقع ہوگا) اور آپ کے رب کے پاس کا ایک دن (جس میں عذاب واقع ہوگا یعنی قیامت کا دن اپنے امتداد یا اشتداد میں) ایکہزار سال کی برابر ہے تم لوگوں کی شمار کے مطابق (تو یہ بڑے بیوقوف ہیں کہ ایسی مصیبت کا تقاضا کرتے ہیں) اور (جواب مذکور کا خلاصہ پھر سُن لو کہ) بہت سی بستیاں ہیں جن کو میں نے مہلت دی تھی اور وہ نافرمانی کرتی تھیں پھر میں نے اُن کو (عذاب میں) پکڑ لیا اور سب کو میری ہی طرف لوٹنا ہوگا (اُس وقت پُوری سزا ملے گی) اور آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ اے لوگو میں تو تمہارے لئے ایک صاف ڈرانے والا ہوں (عذاب واقع کرنے نہ کرنے میں میرا دخل نہیں نہ میں نے اسکا دعویٰ کیا ہے) تو جو لوگ (اس ڈر کو سنکر) ایمان لے آئے اور اچھے کام کرنے لگے ان کے لئے مغفرت اور عزت کی روزی (یعنی جنت) ہے اور جو لوگ ہماری آیتوں کے متعلق (انکے انکار اور ابطال کی) کوشش کرتے رہتے ہیں (نبی کو اور اہلِ ایمان کو ہرانے (یعنی عاجز کرنے) کیلئے ایسے لوگ دوزخ میں (رہنے والے) ہیں۔

معارف و مسائل

زمین کی سیر و سیاحت اگر عبرت و بصیرت حاصل کرنے کے لئے ہو تو مطلوب دینی ہے

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ، اس آیت میں

زمین کی سیر و سیاحت جبکہ بچشم عبرت ہو اسکی طرف ترغیب ہے اور فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ سے اسطرف اشارہ ہے کہ زمانہ ماضی اور گزشتہ اقوام عالم کے حالات و کیفیات کا مشاہدہ انسان کو عقل و بصیرت عطا کرنے والا ہے بشرطیکہ ان حالات کو محض تاریخی سوانح کی حیثیت سے نہیں بلکہ عبرت کی نظر سے دیکھے تو ہر واقعہ ایک بصیرت کا سبق دیگا۔ ابن ابی حاتم نے کتاب التفکر میں حضرت مالک بن دینارؒ سے نقل کیا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوہے کے جُوتے بناؤ اور لوہے کی عصا ہاتھ میں لو اور اللہ کی زمین میں اتنے پھرو کہ یہ آہنی جُوتے گھس جائیں اور آہنی عصا ٹوٹ جائے (روح المعانی) اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس سیر و سیاحت کا مقصد وہی عبرت و بصیرت حاصل کرنا ہے۔

آخرت کا دن ایک ہزار سال ہونیکا مطلب آیتِ مذکورہ میں جو یہ فرمایا ہے اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ، یعنی آپ کے رب کے پاس ایک دن دُنیا کے ایک ہزار سال کی برابر ہوگا۔

اسمیں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اس دن سے مُراد قیامت کا دن لیا جائے اور اُسکا ایک ہزار سال کی برابر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس دن کے ہولناک واقعات اور ہیبتناک حالات کی وجہ سے یہ دن اتنا دراز محسوس ہوگا جیسے ایک ہزار سال خلاصہ تفسیر مذکور میں اسی کو اشتداد کے لفظ سے تعبیر کیا ہے بہت سے حضرات مفسرین نے اسکے یہی معنے قرار دیئے ہیں۔

دوسرے یہ کہ واقع میں عالم آخرت کا ایک دن ہمیشہ کے لئے دُنیا کے ایک ہزار سال ہی کی برابر ہو بعض روایاتِ حدیث سے اسی معنے کی شہادت ملتی ہے۔ مسند احمد، ترمذی میں حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک روز فقراء مہاجرین کو خطاب کرکے فرمایا کہ تم کو میں قیامت کے روز مکمل نور کی بشارت دیتا ہوں اور یہ کہ تم اغنیاء اور مالداروں سے آدھا دن پہلے جنت میں جاؤ گے اور اللہ کے یہاں ایک دن ایک ہزار سال کا ہوگا اسلئے فقراء اغنیاء سے پانچسو سال پہلے جنت میں داخل ہونگے (رواہ الترمذی وحسنہ۔ مظہری)

خلاصۂ تفسیر میں اسی دوسرے معنے کو بلفظ امتداد تعبیر کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

ایک شبہ کا جواب سورۂ معارج میں جو آخرت کے دن کو پچاس ہزار سال کی برابر قرار دیا ہے كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ اسمیں بھی دونوں تفسیریں اشتداد اور امتداد کی ہو سکتی ہیں اور ہر شخص کی شدت و مصیبت چونکہ دوسروں سے مختلف اور کم و بیش ہوگی اسلئے وہ دن کسی کو ایک ہزار سال کا محسوس ہوگا کسی کو پچاس ہزار سال کا، اور اگر دوسرے معنے لئے جاویں کہ حقیقۃً آخرت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا تو ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہوتا ہے کہ ایک میں ایک ہزار سال اور دوسری میں پچاس ہزار سال کا ذکر ہے تو اسکی تطبیق سیدی حکیم الامت قدس سرہٗ نے بیان القرآن میں بیان فرمائی ہے جو اہلِ علم کے لئے علمی اور اصطلاحی الفاظ ہی میں نقل کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تفاوت

ایک ہزار سال سے پچاس ہزار سال تک اختلاف آفاق کے اعتبار سے ہو جس طرح دُنیا میں معدل النہار کی حرکت کہیں دولابی ہے کہیں حمائلی کہیں رحوی اور اسی وجہ سے خطِ استوا پر ایک رات دن جو بیس

گھنٹے کا ہوتا ہے اور عرض تسعین (قطب شمالی) پر ایک سال کا اور ان دونوں کے درمیان مختلف مقادیر پر مختلف ہوتا چلا جاتا ہے اسی طرح ممکن ہے کہ اول شمس کی حرکت جو معدل کیساتھ ہے بطور خرق عادت و اعجاز اسقدر سست ہو جائے کہ ایک افق پر ایک ہزار سال کا دن ہو اور جو افق اُس سے پچاس حصے ہٹا ہوا ہو اُسپر پچاس ہزار برس کا ہو اور درمیان میں اسی نسبت سے متفاوت ہو، واللہ اعلم (بیان القرآن)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى

اور جو رسول بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے یا نبی سو جب لگا خیال باندھنے

الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ

شیطان نے ملا دیا اُسکے خیال میں پھر اللہ مٹا دیتا ہے شیطان کا ملایا ہوا پھر پکی کر دیتا ہے اپنی

اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۲﴾ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً

باتیں اور اللہ سب خبر رکھتا ہے حکمتوں والا اسواسطے کہ جو کچھ شیطان نے ملایا اُس سے جانچے

لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ

اُن کو کہ جن کے دل میں روگ ہیں اور جن کے دل سخت ہیں اور گنہگار تو ہیں

شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ

مخالفت میں دُور جا پڑے اور اسواسطے کہ معلوم کرلیں وہ لوگ جن کو سمجھ ملی ہے کہ یہ تحقیق ہے تیرے

رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ

رب کی طرف سے پھر اس پر یقین لائیں اور نرم ہو جائیں اُسکے آگے دل اُن کے اور اللہ سمجھانے والا ہے یقین

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

لانے والوں کو راہ سیدھی اور منکروں کو ہمیشہ رہے گا اسمیں

فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ

دھوکا جب تک آ پہنچے اُن پر قیامت بے خبری میں یا آ پہنچے اُن پر آفت ایسے دن کی

يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

جسمیں راہ نہیں خلاصی کی راج اسدن اللہ کا ہے ان میں فیصلہ کریگا سو جو یقین لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا

اور کیں بھلائیاں نعمت کے باغوں میں ہیں اور جو منکر ہوئے اور جھٹلائیں ہماری

بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵۷﴾ ع

باتیں سو اُن کے لئے ہے ذلت کا عذاب

ع ۹ / ۱۳

نصف

خلاصۂ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ لوگ جو شیطان کے اغواء سے آپ سے مجادلہ کرتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ) ہم نے آپ کے قبل کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کو یہ قصہ پیش نہ آیا ہو کہ جب اس نے (اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے) کچھ پڑھا (تب ہی) شیطان نے اسکے پڑھنے میں (کفار کے قلوب میں) شبہہ (اور اعتراض) ڈالا (اور کفار انہی شبہات اور اعتراضات کو پیش کر کے انبیاء سے مجادلہ کیا کرتے جیسا دوسری آیات میں ارشاد ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو (جوابات قاطعہ و دلائل واضحہ سے) نیست و نابود کر دیتا ہے (جیسا کہ ظاہر ہے کہ جواب صحیح کے بعد اعتراض دفع ہو جاتا ہے) پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیات (کے مضامین) کو زیادہ مضبوط کر دیتا ہے (گو وہ فی نفسہا بھی مستحکم تھیں لیکن اعتراضات کے جواب سے اس استحکام کا زیادہ ظہور ہو گیا) اور اللہ تعالیٰ (ان اعتراضات کے متعلق) خوب علم والا ہے (اور ان کے جواب کے تعلیم میں) خوب حکمت والا ہے (اور یہ سارا قصہ اس لئے بیان کیا ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو ایسے لوگوں کے لئے آزمائش (کا ذریعہ) بنا دے جن کے دل میں (شک کا) مرض ہے اور جن کے دل (بالکل ہی) سخت ہیں (کہ وہ شک سے بڑھ کر باطل کا یقین کئے ہوئے ہیں، سو ان کی آزمائش ہوتی ہے کہ دیکھیں بعد جواب کے اب بھی شبہات کا اتباع کرتے ہیں یا جواب کو سمجھ کر حق کو قبول کرتے ہیں) اور واقعی (یہ) ظالم لوگ (یعنی اہل شک بھی اور اہل یقین بالباطل بھی) بڑی مخالفت میں ہیں (کہ حق کو باوجود واضح ہونے کے محض عناد کے سبب قبول نہیں کرتے شیطان کو وسوسہ ڈالنے کا تصرف تو اس لئے دیا گیا تھا کہ آزمائش ہو) اور (ان شبہات کا اجوبہ صحیحہ منوّرِ ہدایت سے ابطال اس لئے ہوتا ہے) تاکہ جن لوگوں کو فہم (صحیح) عطا ہوا ہے وہ (ان اجوبۂ منوّرِ ہدایت سے) اس امر کا زیادہ یقین کر لیں کہ یہ (جو نبی نے پڑھا ہے وہ) آپ کے رب کی طرف سے حق ہے سو ایمان پر زیادہ قائم ہو جاویں پھر (زیادہ یقین کی برکت سے) اُس (پر عمل کرنے) کی طرف اُن کے دل اور بھی جھک جاویں اور واقعی ان ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ ہی راہِ راست دکھلاتا ہے (پھر کیونکر ان کو ہدایت نہ ہو، یہ تو ایمان والوں کی کیفیت ہوئی) اور (رہ گئے) کافر لوگ (سو وہ) ہمیشہ اُس (پڑھے ہوئے حکم) کیطرف سے شک ہی میں رہیں گے (جو اُن کے دل میں شیطان نے ڈالا تھا) یہاں تک کہ اُن پر دفعۃً قیامت آجاوے (جس کی ہول ہی کافی ہے گو عذاب

نہ بھی ہوتا) یا (اس سے بڑھ کر یہ کہ) ان پر کسی بے برکت دن کا (کہ قیامت کا دن ہے) عذاب آپہنچے (اور دونوں کا جمع ہونا جو کہ واقع میں ہوگا اور بھی اشد مصیبت ہے مطلب یہ ہے کہ یہ بدون مشاہدۂ عذاب کفر سے باز نہ آویں گے مگر اسوقت نافع نہ ہوگا) بادشاہی اس روز اللہ ہی کی ہوگی وہ ان سب (مذکورین) کے درمیان (عملی) فیصلہ فرمادے گا۔ سو جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور اچھے کام کئے ہوں گے وہ چین کے باغوں میں ہوں گے اور جنھوں نے کفر کیا ہوگا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہوگا تو ان کے لئے ذلت کا عذاب ہوگا۔

معارف و مسائل

مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ، ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اور نبی دو الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں ایک نہیں، ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ اسمیں اقوال مختلف ہیں مشہور اور واضح یہ ہے کہ نبی تو اُس شخص کو کہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصب نبوت قوم کی اصلاح کے لئے عطا ہوا ہو اور اُس کے پاس اللہ کی طرف سے وحی آتی ہو خواہ اُس کو کوئی مستقل کتاب اور شریعت دی جائے یا کسی پہلے نبی ہی کی کتاب اور شریعت کی تبلیغ کے لئے مامور ہو۔ پہلے کی مثال حضرت موسیٰ و عیسیٰ اور خاتم الانبیاء علیہم السلام کی ہے اور دوسرے کی مثال حضرت ہارون علیہ السلام کی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تورات اور اُنہی کی شریعت کی تبلیغ و تعلیم کے لئے مامور تھے۔ اور رسول وہ ہے جس کو مستقل شریعت اور کتاب ملی ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ہر رسول کا نبی ہونا ضروری ہے مگر ہر نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں، یہ تقسیم انسانوں کیلئے ہے۔ فرشتہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لیکر آتا ہے اسکو رسول کہنا اسکے منافی نہیں، اسکی تفصیل سورۂ مریم میں آچکی ہے۔

اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ لفظ تمنیٰ اس جگہ بمعنے قرأ ہے اور اُمنیہ کے معنی قراءت کے ہیں۔ عربی لُغت کے اعتبار سے یہ معنے بھی معروف ہیں۔ اس آیت کی جو تفسیر اوپر خلاصۂ تفسیر میں لکھی ہے وہ بہت صاف بے غبار ہے۔ ابو حیان نے بحر محیط میں اور بہت سے دوسرے حضرات مفسرین نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ کتب حدیث میں اس جگہ ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے جو غرانیق کے نام سے معروف ہے یہ واقعہ جمہور محدثین کے نزدیک ثابت نہیں ہے بعض حضرات نے اسکو موضوع ملحدین و زنادقہ کی ایجاد قرار دیا ہے اور جن حضرات نے اس کو معتبر بھی قرار دیا ہے تو اسکے ظاہری الفاظ سے جو شبہات قرآن و سُنت کے قطعی اور یقینی احکام پر عائد ہوتے ہیں انکے مختلف جوابات دیئے ہیں لیکن اتنی بات بالکل واضح ہے کہ اس آیتِ قرآن کی تفسیر اُس واقعہ پر موقوف نہیں بلکہ اسکا سیدھا سادہ مطلب وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے بلا وجہ اسکو اس آیت کی تفسیر کا جز بنا کر شکوک و شبہات کا دروازہ کھولنا اور پھر جوابدہی کی فکر کرنا کوئی مفید کام نہیں اسلئے اسکو ترک کیا جاتا ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ

اور جو لوگ گھر چھوڑ آئے اللہ کی راہ میں پھر مارے گئے یا مرگئے البتہ اُن کو دے گا اللہ

رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝۵۸ لَيُدْخِلَنَّهُمْ

روزی خاصی اور اللہ ہے سب سے بہتر روزی دینے والا البتہ پہنچائے گا اُن کو

مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝۵۹

ایک جگہ جس کو پسند کریں گے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے تحمل والا

خلاصۂ تفسیر

اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں (یعنی دین کی حفاظت کے لئے) اپنا وطن چھوڑا (جن کا ذکر پچھلی آیت میں بھی اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ کے الفاظ سے آچکا ہے) پھر وہ لوگ (کفار کے مقابلہ میں) قتل کئے گئے یا (ویسے ہی طبعی موت سے) مرگئے (وہ ناکام و محروم نہیں، گو اُن کو دُنیاوی فوائد نہ ملے مگر آخرت میں) اللہ تعالیٰ اُن کو ضرور ایک عمدہ رزق دیگا (یعنی جنت کی بیشمار نعمتیں) اور یقیناً اللہ تعالیٰ سب دینے والوں سے اچھا (دینے والا) ہے (اور اس اچھے رزق کیساتھ) اللہ تعالیٰ اُن کو (مسکن بھی اچھا دیگا یعنی) ایسی جگہ لیجا کر داخل کریگا جس کو وہ (بہت ہی) پسند کریں گے (رہی یہ بات کہ بعض مہاجرین اس طرح دُنیاوی فتح و نصرت اور اُس کے فوائد سے محروم کیوں ہوتے اور اُنکے مقابلے کے کفار اُن کے قتل کرنے پر قادر کیوں ہوگئے وہ قہر الٰہی سے کیوں نہ ہلاک کر دیئے گئے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ہر کام کی حکمت و مصلحت کو خوب جاننے والا ہے (اُن کی اس ظاہری ناکامی میں بھی بہت سی مصلحتیں اور حکمتیں ہیں اور) بہت حلم والا ہے (اسلئے دشمنوں کو فوراً سزا نہیں دیتا)۔

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ

یہ سُن چکے اور جس نے بدلہ لیا جیسا کہ اُس کو دُکھ دیا تھا پھر اس پر کوئی زیادتی

لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۶۰

کرے تو البتہ اسکی مدد کرے گا اللہ، بیشک اللہ درگزر کرنے والا بخشنے والا ہے

خلاصۂ تفسیر

یہ (مضمون تو) ہو چکا اور (آگے یہ سنو کہ) جو شخص (دشمن کو) اسی قدر تکلیف پہنچائے جس قدر (دشمن کی طرف سے) اس کو تکلیف پہنچائی گئی تھی پھر (اس برابر سرابر ہو جانے کے بعد اگر اس

دشمن کی طرف سے) اس شخص پر زیادتی کی جاوے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کی ضرور امداد کریگا بیشک اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا بہت مغفرت کرنے والا ہے۔

معارف و مسائل

چند آیات پہلے یہ مضمون مذکور ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ مظلوم کی مدد کرتا ہے وَإِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ مگر مظلوم کی دو قسم ہیں ایک تو وہ جس نے دشمن سے ظلم کا کوئی انتقام اور بدلہ لیا ہی نہیں بلکہ معاف کر دیا یا چھوڑ دیا۔ دوسرا وہ شخص جس نے اپنے دشمن سے برابر سرابر بدلہ اور انتقام لے لیا جسکا مقتضیٰ یہ تھا کہ اب دونوں برابر ہوگئے آگے یہ سلسلہ ختم ہو مگر دشمن نے اس کے انتقام لینے کی بنا پر مشتعل ہو کر دوبارہ حملہ کر دیا اور مزید ظلم کیا تو یہ شخص پھر مظلوم ہی رہ گیا۔ اس آیت میں اس دوسری قسم کے مظلوم کی امداد کا بھی وعدہ ہے مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسند یہ ہے کہ آدمی پہلے ہی ظلم پر صبر کرے اور معاف کر دے انتقام نہ لے جیسا کہ بہت سی آیات میں اسکا ذکر ہے مثلاً فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ اور وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى اور وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ان سب آیات میں ترغیب اس کی دی گئی ہے کہ ظلم کا بدلہ نہ لے بلکہ معاف کر دے اور صبر کرے۔ قرآن کریم کی ان ہدایات سے اسی طرز کا افضل و اولیٰ ہونا ثابت ہوا۔ شخص مذکور جس نے اپنے دشمن سے برابر کا بدلہ لے لیا اُس نے اس افضل و اولیٰ اور قرآنی ہدایات مذکورہ پر عمل ترک کر دیا تو اس سے شبہ ہو سکتا تھا کہ اب یہ شاید اللہ کی نصرت سے محروم ہو جائے اس لئے آخر آیت میں ارشاد فرما دیا إِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ، یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کی اس کوتاہی پر کہ افضل و اولیٰ پر عمل نہیں کیا اس سے کوئی مواخذہ نہیں فرمائیگا بلکہ اب بھی اگر مخالف نے اس پر دوبارہ ظلم کر دیا تو اسکی امداد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی۔ (روح المعانی)

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ يُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ

یہ اس واسطے کہ اللہ لے لیتا ہے رات کو دن میں اور دن کو رات میں

وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ﴿٦١﴾ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ

اور اللہ سنتا دیکھتا ہے یہ اسواسطے کہ اللہ وہی ہے صحیح اور جس کو

مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ﴿٦٢﴾

پکارتے ہیں اس کے سوائے وہی ہے غلط اور اللہ وہی ہے سب سے اوپر بڑا

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَتُصْبِحُ الْأَرْضُ مُخْضَرَّةً

تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اتارا آسمان سے پانی پھر زمین ہو جاتی ہے سرسبز

إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ ﴿٦٣﴾ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَ

بیشک اللہ جانتا ہے چھپی تدبیریں خبردار ہے، اُسی کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں اور

إِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٦٤﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا

اللہ وہی ہے بے پروا تعریفوں والا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ نے بس میں کر دیا تمہارے جو

فِي الْأَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۗ وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ

کچھ ہے زمین میں اور کشتی کو جو چلتی ہے دریا میں اُسکے حکم سے اور تھام رکھتا ہے آسمان کو

أَن تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿٦٥﴾

اس سے کہ گر پڑے زمین پر مگر اسکے حکم سے بیشک اللہ لوگوں پر نرمی کرنے والا مہربان ہے

وَهُوَ الَّذِي أَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ۗ إِنَّ الْإِنسَانَ لَكَفُورٌ ﴿٦٦﴾

اور اسی نے تم کو جلایا پھر مارتا ہے پھر زندہ کرے گا بیشک انسان ناشکر ہے

خلاصۂ تفسیر

یہ (مومنین کا غالب کر دینا) کہ اللہ تعالیٰ (کی قدرت بڑی کامل ہے وہ) رات (کے اجزاء) کو دن میں اور دن (کے اجزاء) کو رات میں داخل کر دیتا ہے (یہ کائناتی انقلاب ایک قوم کو دوسری پر غالب کرنیوالے انقلاب سے زیادہ عجیب ہے) اور اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ (ان سب کے اقوال و احوال کو) خوب سننے والا اور خوب دیکھنے والا ہے (وہ کفار کے ظلم اور مومنین کی مظلومیت کو سنتا دیکھتا ہے اس لئے وہ سب حالات سے باخبر بھی ہے اور قوت و قدرت بھی اُس کی سب سے بڑی ہے یہ مجموعہ سبب ہوگیا کمزوروں کو غالب کرنے کا) اور (نیز) یہ (نصرت) اس سبب سے (یقینی) ہے کہ (اسمیں کسی طاقت کی مجال نہیں جو اسمیں اللہ تعالیٰ کی مزاحمت کرے کیونکہ) اللہ ہی ہستی میں کامل ہے اور جن چیزوں کی اللہ کے سوا یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں وہ بالکل ہی لچر ہیں۔ (کہ وہ خود اپنے وجود میں محتاج بھی ہیں کمزور بھی وہ کیا اللہ کی مزاحمت کر سکتے ہیں) اور اللہ ہی عالیشان سب سے بڑا ہے (اس میں غور کرنے سے توحید کا حق ہونا اور شرک کا باطل ہونا ہر شخص سمجھ سکتا ہے اس کے علاوہ) کیا تجھ کو خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا جس سے زمین سرسبز ہوگئی (پھر) بیشک اللہ تعالیٰ بہت مہربان سب باتوں کی خبر رکھنے والا ہے (اسلئے بندوں کی ضرورتوں پر مطلع ہو کر اُن کے مناسب مہربانی فرماتا ہے) سب اُسی کا جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ ہی ایسا ہے جو کسی کا محتاج نہیں ہر طرح کی تعریف کے لائق ہے (اور اے مخاطب) کیا تجھ کو خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے کام میں لگا رکھا

زمین کی چیزوں کو اور کشتی کو (بھی) کہ وہ دریا میں اُسکے حکم سے چلتی ہے اور وہی آسمانوں کو زمین پر گرنے سے تھامے ہوئے ہے ہاں مگر یہ کہ اُسی کا حکم ہو جاوے (تو یہ سب کچھ ہو سکتا ہے اور بندوں کے گناہ اور بُرے اعمال اگرچہ ایسا حکم ہو جانے کے مقتضی ہیں مگر پھر بھی جو ایسا حکم نہیں دیتا تو وجہ یہ ہے کہ) بالیقین اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑی شفقت اور رحمت فرمانے والا ہے اور وہی ہے جس نے تم کو زندگی دی پھر (وقت موعود پر) تم کو موت دیگا پھر (قیامت میں) تم کو زندہ کرے گا (ان انعامات و احسانات کا تقاضا تھا کہ لوگ توحید اور اللہ کے شکر کو اختیار کرتے مگر) واقعی انسان ہے بڑا ناشکر (کہ اب بھی کفر و شرک سے باز نہیں آتا۔ مُراد سب انسان نہیں بلکہ وہی جو اس ناشکری میں مبتلا ہوں)۔

معارف و مسائل

سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ، یعنی زمین کی سب چیزوں کو انسان کا مسخر بنا دیا۔ مسخر بنانے کے ظاہری اور عام معنے یہ سمجھے جاتے ہیں کہ وہ اس کے حکم کے تابع چلے۔ اس معنے کے لحاظ سے یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ زمین کے پہاڑ اور دریا اور درندے پرندے اور ہزاروں چیزیں انسان کے حکم کے تابع تو نہیں چلتے مگر کسی چیز کو کسی شخص کی خدمت میں لگا دینا جو ہر وقت یہ خدمت انجام دیتی رہے یہی درحقیقت اس کے لئے تسخیر ہی ہے اگرچہ وہ اس کے حکم سے نہیں بلکہ مالکِ حقیقی کے حکم سے یہ خدمت انجام دے رہی ہے۔ اسی لئے یہاں ترجمہ تسخیر کا کام میں لگا دینے سے کیا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی قدرت میں یہ بھی تھا کہ ان سب چیزوں کو انسان کا تابع حکم بھی بنا دیتے مگر اسکا نتیجہ خود انسان کے حق میں مضر پڑتا، کیونکہ انسانوں کی طبائع، خواہشات اور ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں ایک انسان دریا کو اپنا رُخ دوسری طرف موڑنے کا حکم دیتا اور دوسرا اسکے خلاف تو انجام بجز فساد کے کیا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لئے ان سب چیزوں کو تابع حکم تو اپنا ہی رکھا مگر تسخیر کا جو اصل فائدہ تھا وہ انسان کو پہنچا دیا۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ

ہر اُمت کے لئے ہم نے مقرر کر دی ایک راہ بندگی کی کہ وہ اسی طرح کرتے ہیں بندگی، سو چاہئے تجھ سے جھگڑا نہ کریں اس کام میں اور

اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۶۷﴾ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ

تو بلائے جا اپنے رب کی طرف، بیشک تو ہے سیدھی راہ پر سوجھ والا اور اگر تجھ سے جھگڑنے لگیں تو تو کہہ

اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

اللہ بہتر جانتا ہے جو تم کرتے ہو اللہ فیصلہ کرے گا تم میں قیامت کے دن

فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٦٩﴾ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ

جس چیز میں تمہاری راہ جُدا جُدا تھی کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ ہے آسمان

وَالْأَرْضِ إِنَّ ذَٰلِكَ فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿٧٠﴾

اور زمین میں یہ سب لکھا ہوا ہے کتاب میں یہ اللہ پر آسان ہے

خلاصہ تفسیر

(جتنی اُمتیں اہل شرائع گزری ہیں اُن میں) ہم نے ہر اُمت کے واسطے ذبح کرنے کا طریق مقرر کیا ہے کہ وہ اسی طریقہ پر ذبح کیا کرتے تھے تو (اعتراض کرنے والے) لوگوں کو چاہیئے کہ اس امر (ذبح) میں آپ سے جھگڑا نہ کریں (اُن کو تو آپ سے بحث اور جھگڑا کرنیکا حق نہیں مگر آپ کو حق ہے اس لئے آپ (ان کو) اپنے رب (یعنی اسکے دین) کی طرف بُلاتے رہیئے آپ یقیناً صحیح راستہ پر ہیں۔ (صحیح راستہ پر چلنے والے کو حق ہوتا ہے کہ غلط راستے پر چلنے والے کو اپنی طرف بُلائے غلط راستہ والے کو یہ حق نہیں ہوتا) اور اگر (اسپر بھی) یہ لوگ آپ سے جھگڑا کرتے رہیں تو آپ یہ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے (وہی تم کو سمجھے گا آگے اسی کی توضیح یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے دن (عملی) فیصلہ فرما دیگا جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے تھے (آگے اسی کی تائید ہے کہ) اے مخاطب کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب چیزوں کو جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے (اور علم الٰہی میں محفوظ ہونے کے ساتھ یہ بھی) یقینی بات ہے کہ یہ (یعنی ان کے سب اقوال و اعمال) نامۂ اعمال میں (بھی محفوظ) ہیں (بس) یقیناً (ثابت ہوگیا کہ) یہ (فیصلہ کرنا) اللہ تعالیٰ کے نزدیک آسان ہے۔

معارف و مسائل

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا، یہی مضمون تقریباً انہیں الفاظ کے ساتھ اسی سورت کی آیت ۳۴ میں گزر چکا ہے مگر دونوں جگہ لفظ مَنسَک کے معنے اور مُراد میں فرق ہے۔ وہاں نسک اور منسک قربانی کے معنے میں بضمن احکام حج آیا تھا اور اسلئے وہاں واؤ کیساتھ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ فرمایا گیا۔ یہاں نسک کے دوسرے معنے (یعنی احکام ذبائح یا علم احکام شرعیہ) اور دوسرا مفہوم مُراد ہے اور یہ ایک مستقل حکم ہے اسلئے اسکو عطف کرکے نہیں بیان کیا گیا۔ اس آیت کی تفسیر میں ایک قول تو وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں لیا گیا ہے کہ بعض کفار مسلمانوں سے اُن کی ذبائح کے متعلق فضول بحث و جدال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ تمہارے مذہب کا یہ حکم عجیب ہے کہ جس جانور کو تم خود اپنے ہاتھ سے قتل کرو وہ تو حلال اور جس کو اللہ تعالیٰ براہِ راست مار دے یعنی عام مُردار جانور وہ حرام۔ ان کے اس جدال کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی (کما رواہ الحاکم

وصححہ والبیہقی فی الشعب عن علی بن حسن وابن عباسؓ انہا نزلت بسبب قول الخزاعیین ۔ (روح المعانی) تو یہاں منسک کے معنی طریقۂ ذبح کے ہونگے اور حاصل جواب کا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک اُمت اور شریعت کے لئے ذبیحہ کے احکام الگ الگ رکھے ہیں۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شریعت ایک مستقل شریعت ہے اسکے احکام کا معارضہ کسی پہلی شریعت کے احکام سے کرنا بھی جائز نہیں چہ جائیکہ تم اُس کا معارضہ خالص اپنی رائے اور خیال باطل سے کرتے ہو یعنی مُردار جانور کا حلال نہ ہونا تو اس اُمت و شریعت کیساتھ مخصوص نہیں سب پچھلی شریعتوں میں بھی حرام رہا ہے تو تمہارا یہ قول تو بالکل ہی بے بنیاد ہے اس بے بنیاد خیال کی بنا پر صاحبِ شریعت نبی سے مجادلہ اور معارضہ کرنا حماقت ہی حماقت ہے (ہکذا بین فی روح المعانی معنی الآیۃ)۔ اور جمہور مفسرین نے اس جگہ لفظ منسک عام احکامِ شریعت کے معنے میں لیا ہے کیونکہ اصل لُغت میں مَنسک کے معنی ایک معیّن جگہ کے ہیں جو کسی خاص عمل خیر یا شر کے لئے مقرر ہو اور اسی لئے احکامِ حج کو مناسک الحج کہا جاتا ہے کہ انہیں خاص خاص مقامات خاص احکام و اعمال کے لئے مقرر ہیں (ابن کثیر) اور قاموس میں لفظ نسک کے معنی عبادت کے لکھے ہیں قرآن میں اَرِنَا مَنَاسِكَنَا اسی معنے کے لئے آیا ہے مناسک سے مُراد عبادت کے احکام شرعیہ ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے یہ دوسری تفسیر بھی روایت کی گئی ہے۔ ابن جریر، ابن کثیر، قرطبی، رُوح المعانی وغیرہ میں اسی معنی عام کی تفسیر کو اختیار کیا گیا ہے اور آیت کا سیاق و سباق بھی اسی کا قرینہ ہے کہ منسک سے مراد شریعت اور اسکے احکام عام ہیں اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مشرکین اور مخالفین اسلام جو شریعت محمدیہ کے احکام میں جدال اور جھگڑے کرتے ہیں اور بنیاد یہ ہوتی ہے کہ اُنکے آبائی مذہب میں وہ احکام نہ تھے تو وہ سُن لیں کہ پچھلی کسی شریعت و کتاب سے نئی شریعت و کتاب کا معارضہ مجادلہ کرنا باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر اُمت کو اسکے وقت میں ایک خاص شریعت اور کتاب دی ہے جسکا اتباع اُس اُمت پر اُسوقت تک درست تھا جب تک کوئی دوسری اُمت اور دوسری شریعت اللہ تعالیٰ کیطرف سے نہ آگئی۔ اور جب دوسری شریعت آگئی تو اتباع اس جدید شریعت کا کرنا ہے اگر اُسکا کوئی حکم پہلی شریعتوں کے مخالف ہے تو پہلے حکم کو منسوخ اور اسکو ناسخ سمجھا جائیگا اس لئے اس صاحبِ شریعت سے کسی کو مجادلہ اور منازعت کی اجازت نہیں ہوسکتی۔ آیت کے آخری الفاظ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ کا یہی حاصل ہے کہ موجودہ زمانہ میں جبکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ایک مستقل شریعت لیکر آگئے تو کسی کو اسکا حق نہیں کہ اُن کی شریعت کے احکام میں جدال اور نزاع پیدا کرے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ پہلی تفسیر اور اس دوسری تفسیر میں درحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا ہو کہ آیت کا نزول کسی خاص نزاع دربارہ ذبائح کے سبب سے ہوا ہو مگر آیت کے عام الفاظ تمام احکامِ شرعیہ پر مشتمل ہیں اور اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے خصوص مورد کا نہیں ہوتا۔ تو حاصل دونوں تفسیروں کا یہی ہوجائے گا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہر اُمت کو الگ الگ شریعت دی ہے جن میں احکامِ جزئیہ مختلف بھی

ہوتے ہیں تو کسی پچھلی شریعت پر عمل کرنے والے کو نئی شریعت سے معارضہ اور نزاع کا کوئی حق نہیں بلکہ اُسپر اس نئی شریعت کا اتباع واجب ہے اسی لئے آخر آیت میں فرمایا گیا، اُدْعُ اِلٰی رَبِّکَ اِنَّکَ لَعَلٰی ھُدًی مُّسْتَقِیْمٍ، یعنی آپ ان لوگوں کی چہ میگوئیوں اور نزاع وجدال سے متاثر نہ ہوں بلکہ برابر اپنے منصبی فریضہ دعوت الی الحق میں مشغول رہیں کیونکہ آپ حق اور صراط مستقیم پر ہیں آپکے مخالف ہی راستہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔

ایک شبہ کا جواب اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ شریعتِ محمدیہ کے نزول کے بعد کسی پہلی شریعت پر ایمان رکھنے والے مثلاً یہودی نصرانی وغیرہ کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ خود قرآن نے ہمارے لئے اس آیت میں یہ کہہ کر گنجائش دی ہے کہ ہر شریعت اللہ ہی کیطرف سے ہے اسلئے اگر زمانۂ اسلام میں بھی ہم شریعتِ موسویہ یا عیسویہ پر عمل کرتے رہیں تو مسلمانوں کو ہم سے اختلاف نہ کرنا چاہیے کیونکہ آیت میں ہر اُمت کو شریعتِ خاصہ دیئے کا ذکر کرنے کے بعد پوری دُنیا کے لوگوں کو یہ حکم بھی دیدیا گیا ہے کہ شریعتِ محمدیہ کے قائم ہوجانے کے بعد وہ اس شریعت کی مخالفت نہ کریں یہ نہیں فرمایا کہ مسلمان اُن کی سابقہ شریعت کے کسی حکم کے خلاف نہ بولیں اور اس آیت کے بعد کی آیات سے یہ مضمون اور زیادہ واضح ہوجاتا ہے جنمیں شریعت اسلام کے خلاف مجادلہ کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھاری ان حرکتوں کو خوب جانتا ہے وہی اسکی سزا دے گا۔ فَاِنْ جٰدَلُوْکَ فَقُلِ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ
اور پوجتے ہیں اللہ کے سوائے اُس چیز کو جس چیز کی سند نہیں اُتاری اُسنے اور جس کی خبر نہیں

بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۷۱﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا
اُن کو اور بے انصافوں کا کوئی نہیں مددگار اور جب سُنائے اُن کو ہماری آیتیں

بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ۭ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ
صاف تو پہچانے تو منکروں کے منھ کی بُری شکل نزدیک ہوتے ہیں کہ حملہ کر پڑیں

بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۭ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ
اُن پر جو پڑھتے ہیں انکے پاس ہماری آیتیں تو کہہ میں تم کو بتلاؤں ایک چیز اس سے بدتر وہ

اَلنَّارُ ۭ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۲﴾ يٰٓاَيُّهَا
آگ ہے اسکا وعدہ کردیا ہے اللہ نے منکروں کو اور وہ بہت بری ہے پھر جانے کی جگہ اے

النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ
لوگو ایک مثل کہی ہے سو اس پر کان رکھو جن کو تم پوجتے ہو

ع ۹ / ۱۶

دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ

اللہ کے سوائے ہرگز نہ بنا سکیں گے ایک مکھی اگرچہ سارے جمع ہو جائیں اور اگر کچھ چھین لے اُن سے

شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾ مَا قَدَرُوا

مکھی چھڑا نہ سکیں وہ اُس سے بودا ہے چاہنے والا اور جن کو چاہتا ہے اللہ کی قدر

اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۷۴﴾

نہیں سمجھے جیسی اسکی قدر ہے بیشک اللہ زور آور ہے زبردست

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (مشرک) لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن (کے جواز عبادت) پر اللہ تعالیٰ نے کوئی حجت (اپنی کتاب میں) نہیں بھیجی اور نہ ان کے پاس اس کی کوئی (عقلی) دلیل ہے اور (قیامت میں) جب (ان کو شرک پر سزا ہونے لگے گی تو) ان ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا (نہ قولاً کہ انکے فعل کے استحسان پر کوئی حجت پیش کر سکے نہ عملاً کہ اُن کو عذاب سے بچا لے) اور (ان لوگوں کو اسی گمراہی اور اہل حق سے عناد رکھنے میں یہاں تک غلو ہے کہ) جب ان لوگوں کے سامنے ہماری آیتیں (متعلق توحید وغیرہ کے) جو کہ (اپنے مضامین میں) خوب واضح ہیں (اہل حق کی زبان سے) پڑھ کر سُنائی جاتی ہیں تو تم کافروں کے چہروں میں (بوجہ ناگواری باطنی کے) بُرے آثار دیکھتے ہو (جیسے چہرے پر بل پڑ جانا۔ ناک چڑھ جانا۔ تیور بدل جانا اور ان آثار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) قریب ہے کہ اُن لوگوں پر (اب) حملہ کر بیٹھیں (گے) جو ہماری آیتیں ان کے سامنے پڑھ رہے ہیں یعنی حملہ کا شبہہ ہمیشہ ہوتا ہے اور گاہ گاہ اس حملہ کا تحقق بھی ہوا ہے پس یکادون استمرار کے اعتبار سے فرمایا) آپ (ان مشرکین سے) کہیئے کہ (تم کو جو یہ آیات قرآنیہ سُنکر ناگواری ہوئی تو) کیا میں تم کو اس (قرآن) سے (بھی) زیادہ ناگوار چیز بتلا دوں وہ دوزخ ہے (کہ) اسکا اللہ تعالیٰ نے کافروں سے وعدہ کیا ہے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے (یعنی قرآن سے ناگواری کا نتیجہ ناگوار دوزخ ہے اس ناگواری کا تو غیظ سے غضب سے انتقام سے کچھ تدارک بھی کر لیتے ہو مگر اُس ناگواری کا کیا علاج کرو گے جو دوزخ سے ہوگی۔ آگے ایک بدیہی دلیل سے شرک کا ابطال ہے کہ) اے لوگو ایک عجیب بات بیان کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سُنو (وہ یہ ہے کہ) اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ جن کی تم لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ ایک (ادنیٰ) مکھی کو تو پیدا کر ہی نہیں سکتے گو سب کے سب بھی (کیوں نہ) جمع ہو جاویں اور (پیدا کرنا تو بڑی بات ہے وہ تو ایسے عاجز ہیں کہ) اگر ان سے مکھی کچھ (انکے چڑھاوے میں سے) چھین لے جائے تو اس کو (تو) اس سے چھڑا (ہی) نہیں سکتے ایسا عابد بھی لچر اور ایسا

معبود بھی ہیچ (افسوس ہے) ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی تعظیم کرنا چاہیئے تھی (کہ اسکے سوا کسی کی عبادت نہ کرتے) وہ نہ کی (کہ شرک کرنے لگے حالانکہ) اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا سب پر غالب ہے۔ (تو عبادت اسکا خالص حق تھا نہ کہ غیر قوی اور غیر عزیز کا جس کی عدم قوت باوضح وجوہ معلوم ہو چکی)۔

معارف و مسائل

شرک و بت پرستی کی احمقانہ حرکت کی ایک مثال سے توضیح

ضُرِبَ مَثَلٌ، ضرب مثل کا لفظ عام طور پر جو کسی خاص قصہ کی تمثیل کے لئے استعمال ہوتا ہے یہاں ضرب مثل سے یہ صورت مراد نہیں بلکہ شرک و بت پرستی کی حماقت کو ایک واضح مثال سے بیان کرنا ہے کہ یہ بت جن کو تم لوگ اپنا کارساز سمجھتے ہو یہ تو ایسے بےکس بےبس ہیں کہ سب ملا کر ایک مکھی جیسی حقیر چیز بھی پیدا نہیں کر سکتے اور پیدا کرنا تو بڑا کام ہے تم روز ان کے سامنے مٹھائی اور پھل وغیرہ کھانے کی چیزیں رکھتے ہو اور مکھیاں اُس کو کھا جاتی ہیں، ان سے اتنا تو ہوتا نہیں کہ مکھیوں سے اپنی چیز ہی کو بچالیں یہ تمھیں کسی آفت سے کیا بچائیں گے اسی لئے آخر آیت میں ان کی جہالت اور بیوقوفی کو ان الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ یعنی جسکا معبود ہی ایسا بےبس ہو اسکا عابد اُس سے بھی زیادہ کمزور ہوگا مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ یعنی کیسے بے وقوف احسان فراموش ہیں ان لوگوں نے اللہ کی کچھ قدر نہ پہچانی کہ ایسے عظیم الشان قدرت والے کے ساتھ ایسے بےبس بےشعور پتھروں کو برابر کر دیا۔ واللہ اعلم

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ

اللہ چھانٹ لیتا ہے فرشتوں میں پیغام پہنچانے والے اور آدمیوں میں اللہ سنتا

بَصِيْرٌ ۝۷۵ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ

دیکھتا ہے جانتا ہے جو کچھ اُن کے آگے ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے اور اللہ تک پہنچ ہے

الْاُمُوْرُ ۝۷۶ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ

ہر کام کی اے ایمان والو رکوع کرو اور سجدہ کرو اور بندگی کرو اپنے رب کی

وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۷۷ۚ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ

اور بھلائی کرو تاکہ تمہارا بھلا ہو اور محنت کرو اللہ کے واسطے جیسی کہ چاہیئے

جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ

اسکے واسطے محنت، اُس نے تم کو پسند کیا اور نہیں رکھی تم پر دین میں کچھ مشکل

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ

دین تمہارے باپ ابراہیم کا اُسی نے نام رکھا تمہارا مسلمان پہلے سے اور اس

هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى
قرآن میں تاکہ رسول ہو بتانے والا تم پر اور تم ہو بتانے والے لوگوں

النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ
پر سو قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور مضبوط پکڑو اللہ کو وہ تمہارا مالک ہے

فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾
سو خوب مالک ہے اور خوب مددگار

ع ۱۰ / ۱۷

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ (کو اختیار ہے رسالت کے لئے جس کو چاہتا ہے) منتخب کرلیتا ہے فرشتوں میں سے (جن فرشتوں کو چاہے) احکام (الٰہیہ نبیوں کے پاس) پہنچانے والے (مقرر فرمادیتا ہے) اور (اسی طرح) آدمیوں میں سے بھی جس کو چاہے عامۂ ناس کے لئے احکام پہنچانے والے مقرر کردیتا ہے یعنی رسالت کا مدار اصطفاء خداوندی پر ہے اسمیں کچھ ملکیت یعنی فرشتہ ہونے کی خصوصیت نہیں بلکہ جس طرح ملکیت کے ساتھ رسالت جمع ہوسکتی ہے جس کو مشرکین بھی مانتے ہیں چنانچہ فرشتوں کے رسول ہونے کی وہ خود تجویز کرتے تھے اسی طرح بشریت کیساتھ بھی وہ جمع ہوسکتی ہے رہا یہ کہ اصطفا کسی ایک خاص کیساتھ کیوں واقع ہوا تو ظاہری سبب تو اسکا خصوصیاتِ احوال ان رُسُل کے ہیں اور یہ) یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے (یعنی) وہ اُن (سب فرشتوں اور آدمیوں) کی آئندہ اور گزشتہ حالتوں کو (خوب) جانتا ہے (تو حالتِ موجودہ کو بدرجۂ اولیٰ جانے گا غرض سب احوال مسموعہ و مبصرہ اس کو معلوم ہیں ان میں بعض کا حال مقتضی اس اصطفا کا ہوگیا) اور (حقیقی سبب اسکا یہ ہے کہ) تمام کاموں کا مدار اللہ ہی پر ہے (یعنی وہ مالک مستقل بالذات و فاعل مختار ہے اسکا ارادہ مرجع بالذات ہے۔ اس ارادہ کے لئے کسی مرجع کی ضرورت نہیں، پس سببِ حقیقی ارادہ خداوندی ہے اور اسکا سبب پوچھنا لغو ہے وھو معنی قولہ تعالیٰ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ، یعنی اللہ تعالیٰ سے اسکے کسی فعل کا سبب دریافت کرنیکا کسی کو حق نہیں۔

(آگے ختم سورت پر اول فروع و شرائع کا بیان ہے اور ملتِ ابراہیم پر استقامت کا حکم دیا گیا ہے اور اسکی ترغیب کے لئے بعض مضامین ارشاد فرماتے ہیں) اے ایمان والو (تم اُصول کے قبول کرنے کے بعد فروع کی بھی پابندی رکھو خصوصاً نماز کی، پس تم) رکوع کیا کرو اور سجدہ کیا کرو اور (عموماً دوسرے فروع بھی بجالاکر) اپنے رب کی عبادت کیا کرو اور نیک کام کیا کرو۔ امید (یعنی وعدہ) ہے کہ تم فلاح پاؤ گے اور اللہ کے کام میں خوب کوشش کیا کرو جیسا کوشش کرنیکا حق ہے، اسنے تم کو (دوسری اُمتوں سے) ممتاز فرمایا (جیسا کہ آیت جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا وغیرہ میں مذکور ہے) اور تم پر دین

میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی (اور اے ایمان والو، جب اسلام کا تم کو امر کیا گیا ہے کہ احکام کی پوری بجاآوری ہو اور یہی ملتِ ابراہیمی ہے) تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر قائم رہو اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا پہلے بھی اور اس (قرآن) میں بھی، تاکہ تمہارے لئے رسول اللہ گواہ ہوں اور (اس شہادتِ رسول کے قبل) تم (ایک بڑے مقدمہ میں جس میں ایک فریق حضرات انبیاء ہونگے اور فریقِ ثانی ان کی مخالف قومیں ہونگی ان مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو (اور رسول کی شہادت سے تمہاری شہادت کی تصدیق ہو اور حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں فیصلہ ہو) سو (ہمارے احکام کی پوری بجاآوری کرو پس) تم لوگ (خصوصیت کیساتھ) نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور (بقیہ احکام میں بھی) اللہ ہی کو مضبوط پکڑے رہو (یعنی عزم و ہمت کیساتھ دین کے احکام بجالاؤ، غیر اللہ کی رضا و عدم رضا اور اپنے نفس کی مصلحت و مضرت کی طرف التفات مت کرو) وہ تمہارا کارساز ہے سو کیسا اچھا کارساز ہے اور کیسا اچھا مددگار ہے۔

معارف و مسائل

سُورۂ حج کا سجدۂ تلاوت | يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ، سُورۂ حج میں ایک آیت تو پہلے گزر چکی ہے جس پر سجدۂ تلاوت کرنا باتفاق واجب ہے۔ اس آیت پر جو یہاں مذکور ہے سجدۂ تلاوت کے وجوب میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، سفیان ثوری رحمہم اللہ کے نزدیک اس آیت پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں کیونکہ اسمیں سجدہ کا ذکر رکوع وغیرہ کیساتھ آیا ہے جس سے نماز کا سجدہ مراد ہونا ظاہر ہے جیسے وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ میں سب کا اتفاق ہے کہ سجدۂ نماز مراد ہے اس کی تلاوت کرنے سے سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا اسی طرح آیتِ مذکورہ پر بھی سجدۂ تلاوت واجب نہیں۔ امام شافعیؒ امام احمدؒ وغیرہ کے نزدیک اس آیت پر بھی سجدۂ تلاوت واجب ہے اُن کی دلیل ایک حدیث ہے جسمیں یہ ارشاد ہے کہ سُورۂ حج کو دوسری سورتوں پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ اسمیں دو سجدۂ تلاوت ہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ رہ کے نزدیک اس روایت کے ثبوت میں کلام ہے تفصیل اس کی کتبِ فقہ و حدیث میں دیکھی جاسکتی ہے۔

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ، لفظ جہاد اور مجاہدہ کسی مقصد کی تحصیل میں اپنی پوری طاقت خرچ کرنے اور اسکے لئے مشقت برداشت کرنے کے معنے میں آتا ہے۔ کفار کیساتھ قتال میں بھی مسلمان اپنے قول فعل اور ہر طرح کی امکانی طاقت خرچ کرتے ہیں اسلئے اسکو بھی جہاد کہا جاتا ہے اور حقِ جہاد سے مراد اسمیں پورا اخلاص اللہ کیلئے ہونا ہے جسمیں کسی دنیوی نام و نمود یا مالِ غنیمت کی طمع کا شائبہ نہ ہو۔

حضرت ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ حقِ جہاد یہ ہے کہ جہاد میں اپنی پوری طاقت خرچ کرے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت پر کان نہ لگائے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ جہاد کے معنی

عام عبادات اور احکام الٰہیہ کی تعمیل میں اپنی پوری طاقت پورے اخلاص کیساتھ خرچ کرنے کے لئے ہیں۔ ضحاک اور مقاتل نے فرمایا کہ مراد آیت کی یہ ہے کہ اعملوا للّٰہ حق عملہ واعبدوہ حق عبادتہ یعنی عمل کرو اللہ کے لئے جیسا کہ اسکا حق ہے اور عبادت کرو اللہ کی جیسا کہ اُسکا حق ہے۔ اور حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ نے فرمایا کہ یہاں جہاد سے مراد اپنے نفس اور اسکی بیجا خواہشات کے مقابلہ میں جہاد کرنا ہے اور یہی حق جہاد ہے۔ امام بغوی وغیرہ نے اس قول کی تائید میں ایک حدیث بھی حضرت جابر بن عبداللہ سے نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ صحابۂ کرام کی ایک جماعت جو جہاد کفار کے لئے گئی ہوئی تھی واپس آئی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قدمتم خیر مقدم من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر قال مجاھدۃ العبد لھواہ رواہ البیہقی وقال ھذا اسناد فیہ ضعف، یعنی تم لوگ خوب واپس آئے چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کیطرف یعنی اپنے نفس کی خواہشات بیجا کے مقابلہ کا جہاد اب بھی جاری ہے۔ اس روایت کو بیہقی نے روایت کیا ہے مگر کہا ہے کہ اسکے اسناد میں ضعف ہے۔

فائدہ: تفسیر مظہری میں اس دوسری تفسیر کو اختیار کر کے اس آیت سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ صحابۂ کرام جب مقابلۂ کفار میں جہاد کر رہے تھے خواہشاتِ نفسانی کے مقابلہ کا جہاد تو اسوقت بھی جاری تھا مگر حدیث میں اسکو واپسی کے بعد ذکر کیا ہے اسمیں اشارہ یہ ہے کہ اہوار نفس کے مقابلہ کا جہاد اگرچہ میدان کارزار میں بھی جاری تھا مگر عادۃً یہ جہاد شیخ کامل کی صحبت پر موقوف ہے اسلئے وہ جہاد سے واپسی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے وقت ہی شروع ہوا۔

اُمتِ محمدیہ اللہ تعالیٰ کی منتخب اُمت ہے

هُوَ اجْتَبٰىكُمْ، حضرت واثلہ ابن اسقع رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے تمام بنی اسماعیل میں کنانہ کا انتخاب فرمایا، پھر کنانہ میں سے قریش کا پھر قریش میں سے بنی ہاشم کا پھر بنی ہاشم میں سے میرا انتخاب فرمایا۔ (رواہ مسلم۔ مظہری)

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ، یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ دین میں تنگی نہ ہونے کا مطلب بعض حضرات نے یہ بیان فرمایا کہ اس دین میں ایسا کوئی گناہ نہیں ہے جو توبہ سے معاف نہ ہوسکے اور عذابِ آخرت سے خلاصی کی کوئی صورت نہ نکلے۔ بخلاف پچھلی اُمتوں کے کہ اُن میں بعض گناہ ایسے بھی تھے جو توبہ کرنے سے بھی معاف نہ ہوتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تنگی سے مُراد وہ سخت و شدید احکام ہیں جو بنی اسرائیل پر عائد کئے گئے تھے جن کو قرآن میں اِصر اور اغلال سے تعبیر کیا گیا ہے اس اُمت پر ایسا کوئی حکم فرض نہیں کیا گیا۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ تنگی سے مُراد وہ تنگی ہے جس کو انسان برداشت نہ کرسکے اس دین کے احکام میں کوئی حکم ایسا نہیں جو فی نفسہ ناقابلِ برداشت ہو۔ باقی رہی تھوڑی بہت محنت و مشقت

تو وہ دُنیا کے ہر کام میں ہوتی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے پھر ملازمت، تجارت و صنعت میں کیسی کیسی محنتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں مگر اس کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کام بڑے سخت و شدید ہیں۔ ماحول کے غلط اور مخالف ہونے یا ملک و شہر میں اُسکا رواج نہ ہونے کے سبب جو کسی عمل میں دشواری پیش آئے وہ عمل کی تنگی اور تشدد نہیں کہلائے گی۔ کرنے والے کو اس لئے بھاری معلوم ہوتی ہے کہ ماحول میں کوئی اُسکا ساتھ دینے والا نہیں۔ جس ملک میں روٹی کھانے پکانے کی عادت نہ ہو وہاں روٹی حاصل کرنا کسقدر دشوار ہو جاتا ہے وہ سب جانتے ہیں مگر اسکے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ روٹی پکانا بڑا سخت کام ہے۔

اور حضرت قاضی ثناء اللہ رہ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ دین میں تنگی نہ ہونے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو ساری اُمتوں میں سے اپنے لئے منتخب فرما لیا ہے اسکی برکت سے اس اُمت کے لوگوں کو دین کی راہ میں بڑی سے بڑی مشقت اُٹھانا بھی آسان بلکہ لذیذ ہو جاتا ہے۔ محنت سے راحت ملنے لگتی ہے خصوصاً جب دل میں حلاوتِ ایمان پیدا ہو جائے تو سارے بھاری کام بھی ہلکے پھلکے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ حدیث صحیح میں حضرت انس رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ یعنی نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک کر دی گئی ہے۔ (رواہ احمد والنسائی والحاکم وصححہ)

مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ، یعنی یہ ملت ہے تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی۔ یہ خطاب دراصل مؤمنین قریش کو ہے جو ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں ہیں پھر سب لوگ قریش کے تابع ہو کر اس فضیلت میں شامل ہو جاتے ہیں جیسے حدیث میں ہے الناس تبع لقریش فی ھذا الشان مسلمھم تبع لمسلمھم وکافرھم تبع لکافرھم رواہ البخاری ومسلم (مظہری) یعنی سب لوگ اس دین میں قریش کے تابع ہیں، مسلمان مسلمان قریش کے تابع اور کافر لوگ کافر قریش کے تابع ہیں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ کا خطاب سب اُمت کے مسلمانوں کو ہے اور ابراہیم علیہ السلام کا ان سب کے لئے باپ ہونا اس اعتبار سے ہے کہ حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُمت کے روحانی باپ ہیں جیسا کہ ازواج مطہرات امہات المومنین ہیں اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہونا ظاہر و معروف ہے۔

هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَٰذَا، یعنی حضرت ابراہیمؑ ہی نے اُمتِ محمدیہ اور تمام اہلِ ایمان کا نام قرآن سے پہلے مُسلِم تجویز کیا ہے اور خود قرآن میں بھی جیسا کہ ابراہیمؑ کی دُعا قرآن کریم میں یہ منقول ہے رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ۔ اور قرآن میں جو اہلِ ایمان کا نام مُسلِم رکھا گیا ہے اس کے رکھنے والے اگرچہ براہِ راست ابراہیم علیہ السلام نہیں

مگر قرآن سے پہلے اُن کا یہ نام تجویز کر دینا قرآن میں اسی نام سے موسوم کرنے کا سبب بنا اس لئے اس کی نسبت بھی ابراہیم علیہ السلام کی طرف کر دی گئی۔

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ، یعنی آپ محشر میں گواہی دیں گے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے احکام اس اُمّت کو پہنچا دیئے تھے۔ اور اُمّتِ محمدیہ اسکا اقرار کرے گی مگر دوسرے انبیاء جب یہ کہیں گے تو اُن کی اُمتیں مُکر جائیں گی اُسوقت اُمّتِ محمدیہ شہادت دے گی کہ بیشک سب انبیاء نے اپنی اپنی قوم کو اللہ کے احکام پہنچا دیئے تھے دوسری اُمتوں کیطرف سے ان کی شہادت پر یہ جرح ہوگی کہ ہمارے زمانے میں تو اُمّتِ محمدیہ کا وجود بھی نہ تھا یہ ہمارے معاملے میں کیسے گواہ بن سکتے ہیں۔ اُن کی طرف سے جرح کا یہ جواب ہوگا کہ بیشک ہم موجود نہ تھے مگر ہم نے یہ بات اپنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہے جن کے صدق میں کوئی شک شبہ نہیں اس لئے ہم یہ گواہی دے سکتے ہیں۔ تو اُن کی شہادت قبول کی جائے گی یہ مضمون اس حدیث کا ہے جس کو بخاری وغیرہ نے حضرت ابو سعید خدری رضؓ سے روایت کیا ہے۔

فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ، مُراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں پر ایسے احساناتِ عظیمہ فرمائے ہیں جن کا ذکر اُوپر آیا ہے تو تمھارا فرض ہے کہ احکامِ الٰہیہ کی پابندی میں پُوری کوشش کرو اُن میں سے اس جگہ نماز اور زکوٰۃ کے ذکر پر اکتفا اس لئے کیا گیا کہ بدن کے متعلقہ اعمال واحکام میں نماز سب سے اہم ہے اور مال سے متعلقہ احکام میں زکوٰۃ سب سے زیادہ اہم گویا مُراد تمام ہی احکامِ شرعیہ کی پابندی کرنا ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ، یعنی اپنے سب کاموں میں صرف اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرو، اُسی سے مدد مانگو اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ مراد اس اعتصام سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگا کرو کہ تم کو تمام مکروہاتِ دُنیا و آخرت سے محفوظ رکھے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ کے معنے یہ ہیں کہ قرآن و سُنت کے ساتھ تمسک کرو انکو ہر حال میں لازم پکڑو جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:۔

تركت فيكم امرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما كتاب الله وسنة رسوله رواه مالك في الموطا مرسلاً۔ (مظہری)	یعنی تمھارے لئے دو چیزیں ایسی چھوڑی ہیں کہ تم جب تک ان دونوں کو پکڑے رہو گے گمراہ نہ ہو گے ایک اللہ کی کتاب دوسرے اُس کے رسُول کی سُنت۔

تم تفسير سورة الحج بعون الله سبحانه وبحمده نعتصم هو مولانا ونعم النصير

الحمدللہ سُورۂ حج کی تفسیر کا اکثر حصہ اشہرِ حج کے آخری مہینہ ذی الحجہ میں پُورا ہوا، پُوری سُورت کی تفسیر سات روز میں مکمل ہوئی پانچ روز ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ کے اور دو روز محرم ۱۳۹۱ھ کے للہ الحمد اولہ وآخرہ وبہ نستعین تکمیل ما بقی فانہ علی اللہ عزیز

سُورَۃُ الْمُؤْمِنُوْنَ

سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنُوْنَ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ مِائَۃٌ وَّثَمَانَ عَشَرَۃَ اٰیَۃً وَّسِتُّ رُکُوْعَاتٍ

سورۂ مؤمنون مکہ میں اُتری اور اُس کی ایک سو اٹھارہ آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ① الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خٰشِعُوْنَ ②

کام نکال لے گئے ایمان والے جو اپنی نماز میں جھکنے والے ہیں

وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ③ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ ④

اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں کرتے اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں

وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ ⑤ اِلَّا عَلٰۤی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا

اور جو اپنی شہوت کی جگہ کو تھامتے ہیں مگر اپنی عورتوں پر یا اپنے

مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ⑥ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ

ہاتھ کے مال باندیوں پر سو اُن پر نہیں کچھ الزام پھر جو کوئی ڈھونڈے اس کے

ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْعٰدُوْنَ ⑦ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ

سوا سو وہی ہیں حد سے بڑھنے والے اور جو اپنی امانتوں سے

وَعَھْدِھِمْ رٰعُوْنَ ⑧ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَوٰتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ ⑨

اور اپنے اقرار سے خبردار ہیں اور جو اپنی نمازوں کی خبر رکھتے ہیں

وقف لازم

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْوٰرِثُوْنَ ⑩ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ⑪

وہی ہیں میراث لینے والے جو میراث پائیں گے باغ ٹھنڈی چھاؤں کے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

فضائل و خصوصیات سورۂ مؤمنون | مسند احمد میں حضرت فاروق اعظم عمر بن خطابؓ کی روایت ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو پاس والوں کے کان میں ایسی آواز ہوتی تھی جیسے شہد کی مکھیوں کی آواز ہوتی ہے۔ ایک روز آپکے قریب ایسی ہی آواز سُنی گئی تو ہم ٹھہر گئے کہ تازہ آئی ہوئی وحی سُن لیں۔ جب وحی کی خاص کیفیت سے فراغت ہوئی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم قبلہ رُخ ہو کر بیٹھ گئے اور یہ دُعا کرنے لگے اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَاَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا وَاَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَاٰثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا وَارْضَ عَنَّا وَاَرْضِنَا (یعنی یا اللہ ہمیں زیادہ دے کم نہ کر اور ہماری عزت بڑھا ذلیل نہ کر اور ہمیں بخشش فرما، محروم نہ کر اور ہمیں دوسروں پر ترجیح دے ہم پر دوسروں کو ترجیح نہ دے اور ہم سے راضی ہو اور ہمیں بھی اپنی رضا سے راضی کر دے)۔ اسکے بعد فرمایا کہ مجھ پر اس وقت دس آیتیں ایسی نازل ہوئی ہیں کہ جو شخص اُن پر پُورا پورا عمل کرے تو وہ (سیدھا) جنت میں جائیگا۔ پھر یہ دس آیتیں جو اوپر لکھی گئی ہیں پڑھ کر سنائی۔ (ابن کثیر)

اور نسائی نے کتاب التفسیر میں یزید بن بابنوس سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خلق کیسا اور کیا تھا، انھوں نے فرمایا آپ کا خُلق یعنی طبعی عادت وہ تھی جو قرآن میں ہے اس کے بعد یہ دس آیتیں تلاوت کر کے فرمایا کہ بس یہی خُلق و عادت تھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی۔ (ابن کثیر)

خلاصۂ تفسیر

بالتحقیق اُن مسلمانوں نے (آخرت میں) فلاح پائی جو (تصحیح عقائد کے ساتھ صفات ذیل کیساتھ بھی موصوف ہیں یعنی وہ) اپنی نماز میں (خواہ فرض ہو یا غیر فرض) خشوع کرنے والے ہیں اور جو لغو (یعنی فضول) باتوں سے (خواہ قولی ہوں یا فعلی) برکنار رہنے والے ہیں اور جو (اعمال و اخلاق میں) اپنا تزکیہ کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی شرمگاہوں کی (حرام شہوت رانی سے) حفاظت رکھنے والے ہیں لیکن اپنی بیبیوں سے یا اپنی (شرعی) لونڈیوں سے (حفاظت نہیں کرتے) کیونکہ اُن پر (اس میں) کوئی الزام نہیں۔ ہاں جو اسکے علاوہ (اور جگہ شہوت رانی کا) طلبگار ہو ایسے لوگ حد (شرعی) سے نکلنے والے ہیں اور جو اپنی (سپردگی میں لی ہوئی) امانتوں اور اپنے عہد کا (جو کسی عقد کے ضمن میں کیا ہو یا ویسے ہی ابتداء کیا ہو) خیال رکھنے والے ہیں اور جو اپنی (فرض) نمازوں کی پابندی کرتے ہیں ایسے ہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس (بریں) کے وارث ہوں گے (اور) وہ اسمیں ہمیشہ رہیں گے۔

معارف و مسائل

فلاح کیا چیز ہے اور کہاں اور کیسے ملتی ہے | قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ، لفظ فلاح قرآن و سنت میں بکثرت استعمال ہوا ہے اذان و اقامت میں پانچ وقت ہر مسلمان کو فلاح کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ فلاح کے معنے یہ ہیں کہ ہر مراد حاصل ہو اور ہر تکلیف دُور ہو (قاموس) یہ لفظ جتنا مختصر ہے اتنا ہی جامع ایسا ہے کہ کوئی انسان اس سے زیادہ کسی چیز کی خواہش کر ہی نہیں سکتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مکمل فلاح کہ ایک مراد بھی ایسی نہ رہے جو پوری نہ ہو اور ایک بھی تکلیف ایسی نہ رہے جو دُور نہ ہو، یہ دُنیا میں کسی بڑے سے بڑے انسان کے بس میں نہیں چاہے دُنیا کا سب سے بڑا بادشاہ ہفت اقلیم ہو یا سب سے بڑا رسُول اور پیغمبر ہو۔ اس دُنیا میں کسی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ کوئی چیز خلاف طبع پیش نہ آئے اور جو خواہش جس وقت دل میں پیدا ہو بلا تاخیر پوری ہو جائے۔ اگر اور بھی کچھ نہیں تو ہر نعمت کے لئے زوال اور فنا کا کھٹکا اور ہر تکلیف کے واقع ہو جانے کا خطرہ، اس سے کون خالی ہو سکتا ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ فلاح کامل تو ایسی چیز ہے جو اس مُلک دُنیا میں دستیاب ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ دُنیا تو دار التکلیف والمحنت بھی ہے اور اس کی کسی چیز کو بقاء و قرار بھی نہیں۔ یہ متاعِ گرانمایہ ایک دوسرے عالم میں ملتی ہے جسکا نام جنّت ہے۔ وہ ہی ایسا ملک ہے جسمیں انسان کی ہر مراد ہر وقت بلا انتظار حاصل ہوگی وَلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ (یعنی ان کو ملے گی ہر وہ چیز جو وہ چاہیں گے) اور وہاں کسی ادنیٰ رنج و تکلیف کا گزر نہ ہوگا اور ہر شخص یہ کہتا ہوا وہاں داخل ہوگا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ یعنی شکر ہے اللہ کا جسنے ہم سے غم دُور کر دیا بلاشبہ ہمارا رب معاف کرنے والا قدردان ہے جس نے ہمیں اپنے فضل سے ایک مقام میں پہنچا دیا جس کی ہر چیز قائم و دائم ہے۔ اس آیت میں یہ بھی اشارہ موجود ہے کہ دار دنیا میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جس کو کبھی کوئی رنج و غم نہ پہنچا ہو، اسلئے جنّت میں قدم رکھتے ہوئے ہر شخص یہ کہے گا کہ اب ہمارا غم دُور ہوا۔ قرآن کریم نے سورۂ اعلیٰ میں جہاں فلاح حاصل کرنے کا یہ نسخہ بتلایا کہ اپنے آپ کو گناہوں سے پاک کرے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى اِسکے ساتھ ہی یہ بھی اشارہ فرمایا کہ کامل فلاح کی جگہ اصل میں آخرت ہے صرف دُنیا سے دل لگانا طالب فلاح کا کام نہیں فرمایا بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ، یعنی تم لوگ دُنیا ہی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے کہ اُسی میں ہر مُراد حاصل اور ہر تکلیف دُور ہوگی ہے اور وہ باقی رہنے والی بھی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کامل و مکمل فلاح تو صرف جنّت ہی میں مل سکتی ہے دُنیا اُسکی جگہ ہی نہیں۔ البتہ اکثری حالات کے اعتبار سے فلاح یعنی بامراد ہونا اور تکلیفوں سے نجات پانا یہ دُنیا میں بھی

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عطا فرماتے ہیں۔ آیاتِ مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے فلاح پانیکا وعدہ ان مؤمنین سے کیا ہے جنہیں وہ سات صفات موجود ہوں جن کا ذکران آیات کے اندر آیا ہے۔ یہ فلاح عام اور شامل ہے جسمیں آخرت کی کامل مکمل فلاح بھی داخل ہے اور دُنیا میں جسقدر فلاح حاصل ہونا ممکن ہے وہ بھی۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ صفات مذکور کے حامل مؤمنین کو آخرت کی کامل فلاح ملنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن دُنیا میں فلاح تو بظاہر کفار فجار کا حصہ بنی ہوئی ہے اور ہر زمانے کے انبیاء اور اُن کے بعد صلحاء اُمت عموماً تکلیفوں میں مبتلا رہے ہیں بگر جواب اسکا ظاہر ہے کہ دُنیا میں مکمل فلاح کا تو وعدہ نہیں کہ کوئی تکلیف پیش ہی نہ آوے بلکہ کچھ نہ کچھ تکلیف تو یہاں پر صالح و متقی کو بھی اور ہر کافر فاجر کو بھی پیش آنا ناگزیر ہے اور یہی حال حصولِ مُراد کا ہے کہ کچھ نہ کچھ یہ مقصد بھی ہر انسان کو خواہ وہ صالح و متقی ہو خواہ کافر و بدکار ہو حاصل ہوتا ہی ہے۔ پھر ان دونوں میں فلاح پانے والا کس کو کہا جائے تو اسکا اعتبار عواقب اور انجام پر ہے۔

دُنیا کا تجربہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ جو اہلِ صلاح ان سات اوصاف کے حامل اور اُن سے متصف اور اُن پر قائم ہیں گو دُنیا میں وقتی تکلیف اُن کو بھی پیش آجائے مگر انجام کار اُن کی تکلیف جلد دُور ہوتی ہے اور مُراد حاصل ہوجاتی ہے ساری دُنیا اُن کی عزت کرنے پر مجبور ہوتی ہے اور دُنیا میں نیک نام اُنھیں کا باقی رہتا ہے۔ جتنا دُنیا کے حالات کا غور و انصاف سے مطالعہ کیا جائیگا ہر دَور ہر زمانے ہر خطہ میں اسکی شہادتیں ملتی چلی جائیں گی۔

مومن کامل کے وہ سات اوصاف جن پر آیاتِ مذکورہ میں فلاحِ دُنیا و آخرت کا وعدہ ہے سب سے پہلا وصف تو مومن ہونا ہے مگر وہ ایک بنیادی چیز اور اصل الاصول ہے اُس کو الگ کرکے سات اوصاف جو یہاں بیان کئے گئے ہیں یہ ہیں۔

اوّل نماز میں خشوع، خشوع کے لُغوی معنے سکون کے ہیں اصطلاحِ شرع میں خشوع یہ ہے کہ قلب میں بھی سکون ہو۔ یعنی غیر اللہ کے خیال کو قلب میں بالقصد حاضر نہ کرے اور اعضاء بدن میں بھی سکون ہو کہ عبث اور فضول حرکتیں نہ کرے (بیان القرآن) خصوصاً وہ حرکتیں جن سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نماز میں منع فرمایا ہے اور فقہاء نے اُن کو مکروہاتِ نماز کے عنوان سے جمع کردیا ہے۔ تفسیر مظہری میں خشوع کی یہی تعریف حضرت عمرو بن دینارؓ سے نقل کی ہے اور دوسرے بزرگوں سے جو خشوع کی تعریف میں مختلف چیزیں نقل کی گئی ہیں وہ دراصل اسی سکونِ قلب و جوارح کی تفصیلات ہیں۔ مثلاً حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ نظر اور آواز کو پست رکھنے کا نام خشوع ہے۔ حضرت علی رضؓ نے فرمایا کہ دائیں بائیں التفات یعنی گوشۂ چشم سے دیکھنے سے بچنا خشوع ہے۔ حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ بدن کے کسی حصہ سے کھیل نہ کرنا خشوع ہے۔ حدیث میں حضرت

ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نماز کے وقت اپنے بندے کیطرف برابر متوجہ رہتا ہے جب تک وہ دوسری طرف التفات نہ کرے، جب دوسری طرف التفات کرتا ہے یعنی گوشۂ چشم سے دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس سے رُخ پھیر لیتے ہیں۔ (رواہ احمد والنسائی و ابو داؤد وغیرہم۔ مظہری) اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت انسؓ کو حکم دیا کہ اپنی نگاہ اُس جگہ رکھو جس جگہ سجدہ کرتے ہو اور یہ کہ نماز میں دائیں بائیں التفات نہ کرو (رواہ البیہقی فی السنن الکبریٰ مظہری)

اور حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز میں اپنی داڑھی سے کھیل رہا ہے تو فرمایا لوخشع قلب ھٰذا لخشعت جوارحہ (رواہ الحاکم الترمذی بسند ضعیف) یعنی اگر اس شخص کے دل میں خشوع ہوتا تو اسکے اعضاء میں بھی سکون ہوتا۔ (مظہری)

نماز میں خشوع کی ضرورت کا درجہ امام غزالیؒ و قرطبیؒ اور بعض دوسرے حضرات نے فرمایا کہ نماز میں خشوع فرض ہے اگر پوری نماز خشوع کے بغیر گزر جائے تو نماز ادا ہی نہ ہوگی۔ دوسرے حضرات نے فرمایا کہ اسمیں شبہ نہیں کہ خشوع رُوحِ نماز ہے اسکے بغیر نماز بے جان ہے مگر اس کو رُکنِ نماز کی حیثیت سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ خشوع نہ ہوا تو نماز ہی نہ ہوئی اور اُسکا اعادہ فرض قرار دیا جائے۔

حضرت سیدی حکیم الامۃ رحمہ نے بیان القرآن میں فرمایا کہ خشوع صحتِ نماز کیلئے موقوف علیہ تو نہیں اور اس درجہ میں وہ فرض نہیں مگر قبولِ نماز کا موقوف علیہ اور اس مرتبہ میں فرض ہے حدیث میں طبرانی نے معجم کبیر میں بسندِ حسن حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلے جو چیز اس اُمت سے اُٹھ جائیگی یعنی سلب ہوجائیگی وہ خشوع ہے یہانتک کہ قوم میں کوئی خاشع نظر نہ آئیگا۔ کذا فی مجمع الزوائد (بیان)

مومن کامل کا دوسرا وصف، لغو سے پرہیز کرنا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ لغو کے معنے فضول کلام یا کام جسمیں کوئی دینی فائدہ نہ ہو۔ لغو کا اعلیٰ درجہ معصیت اور گناہ ہے جس میں فائدہ دینی نہ ہونے کے ساتھ دینی ضرر و نقصان ہے اس سے پرہیز واجب ہے اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ نہ مفید ہو نہ مضر، اسکا ترک کم از کم اولیٰ اور موجبِ مدح ہے حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من حسن اسلام المرأ ترکہ مالا یعنیہ۔ یعنی انسان کا اسلام جب اچھا ہوسکتا ہے جبکہ وہ بے فائدہ چیزوں کو چھوڑ دے۔ اسی لئے آیت میں اسکو مومن کامل کی خاص صفت قرار دیا ہے۔

تیسرا وصف زکوٰۃ ہے لفظ زکوٰۃ کے معنے لغت میں پاک کرنے کے ہیں اصطلاح میں شرح مال کا ایک خاص حصہ کچھ شرائط کے ساتھ صدقہ کرنے کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے اور قرآن کریم میں عام طور پر یہ لفظ اسی اصطلاحی معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں یہ معنے بھی مراد ہوسکتے ہیں۔

اور اسپر جو شبہ کیا جاتا ہے کہ یہ آیت مکی ہے مکہ میں زکوٰۃ فرض نہ ہوئی تھی ہجرتِ مدینہ کے بعد فرض ہوئی، اسکا جواب ابن کثیر وغیرہ مفسرین کیطرف سے یہ ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت مکہ ہی میں ہو چکی تھی سورۂ مزمل جو بالاتفاق مکی ہے اسمیں بھی اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کیساتھ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کا ذکر موجود ہے مگر سرکاری طور پر اُسکے وصول کرنے کا عام انتظام اور نصابات وغیرہ کی تفصیلات مدینہ طیبہ جانے کے بعد جاری ہوئیں۔

جن لوگوں نے زکوٰۃ کو مدنی احکام میں شمار کیا ہے انکا یہی منشا ہے۔ اور جن حضرات نے فرضیتِ زکوٰۃ کو مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد کا حکم قرار دیا ہے اُنھوں نے اس جگہ زکوٰۃ کا مضمون عام لغوی معنی میں اپنے نفس کو پاک کرنا قرار دیا ہے خلاصہ تفسیر میں بھی یہی لیا گیا ہے اس معنے کا قرینہ اس آیت میں یہ بھی ہے کہ عام طور پر قرآن کریم میں جہاں زکوٰۃ فرض کا ذکر آیا ہے تو اُس کو اِیْتَاءُ الزَّکٰوۃِ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ اور اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کے عنوان سے بیان کیا گیا، یہاں عنوان بدل کر لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ فرمانا اسکا قرینہ ہے کہ یہاں زکوٰۃ کے وہ اصطلاحی معنے مراد نہیں اسکے علاوہ فاعلون کا بے تکلف تعلق فعل سے ہوتا ہے اور زکوٰۃ اصطلاحی فعل نہیں بلکہ ایک حصہ مال ہے اس حصہ مال کیلئے فاعلون کہنا بغیر تاویل کے نہیں ہو سکتا۔ اگر آیت میں زکوٰۃ کے معنی اصطلاحی زکوٰۃ کے لئے جاویں تو اسکا فرض ہونا اور مؤمن کے لئے لازم ہونا کھلا ہوا معاملہ ہے اور اگر مُراد زکوٰۃ سے تزکیہ نفس ہے یعنی اپنے نفس کو رذائل سے پاک کرنا تو وہ بھی فرض ہی ہے کیونکہ شرک۔ ریا۔ تکبر۔ حسد۔ بغض حرص۔ بخل جن سے نفس کو پاک کرنا تزکیہ کہلاتا ہے یہ سب چیزیں حرام اور گناہِ کبیرہ ہیں۔ نفس کو ان سے پاک کرنا فرض ہے۔

چوتھا وصف شرمگاہوں کی حفاظت حرام سے وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ، یعنی وہ لوگ جو اپنی بیویوں اور شرعی لونڈیوں کے علاوہ سب سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ان دونوں کے ساتھ شرعی ضابطہ کے مطابق شہوتِ نفس پوری کرنے کے علاوہ اور کسی سے کسی ناجائز طریقہ پر شہوت رانی میں مبتلا نہیں ہوتے۔ اس آیت کے ختم پر ارشاد فرمایا فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ، یعنی شرعی قاعدے کیمطابق اپنی بیوی یا لونڈی سے شہوتِ نفس کو تسکین دینے والوں پر کوئی ملامت نہیں۔ اسمیں اشارہ ہے کہ اس ضرورت کو ضرورت کے درجہ میں رکھنا ہے مقصدِ زندگی بنانا نہیں۔ اسکا درجہ اتنا ہی ہے کہ جو ایسا کرے وہ قابلِ ملامت نہیں واللہ اعلم۔

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ، یعنی منکوحہ بیوی یا شرعی قاعدہ سے حاصل شدہ لونڈی کیساتھ شرعی قاعدے کے مطابق قضاءِ شہوت کے علاوہ اور کوئی بھی صورت شہوت پورا کرنے کی حلال نہیں، اسمیں زنا بھی داخل ہے اور جو عورت شرعاً اُس پر حرام ہے اُس سے نکاح

بھی بحکم زنا ہے اور اپنی بیوی یا لونڈی سے حیض و نفاس کی حالت میں یا غیر فطری طور پر جماع کرنا بھی اسمیں داخل ہے یعنی کسی مرد یا لڑکے سے یا کسی جانور سے شہوت پوری کرنا بھی ۔ اور جمہور کے نزدیک استمنا بالید یعنی اپنے ہاتھ سے منی خارج کرلینا بھی اسمیں داخل ہے ۔ (از تفسیر بیان القرآن ۔ قرطبی ۔ بحر محیط وغیرہ)

پانچواں وصف امانت کا حق ادا کرنا وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ لفظ امانت کے لغوی معنے ہر اُس چیز کو شامل ہیں جس کی ذمہ داری کسی شخص نے اُٹھائی ہو اور اُسپر اعتماد و بھروسہ کیا گیا ہو۔ اس کی قسمیں چونکہ بیشمار ہیں اسی لئے باوجود مصدر ہونے کے اسکو بصیغہ جمع لایا گیا ہے تاکہ امانت کی سب قسموں کو شامل ہو جائے خواہ وہ حقوق اللہ سے متعلق ہوں یا حقوق العباد سے ۔ حقوق اللہ سے متعلق امانات تمام شرعی فرائض و واجبات کا ادا کرنا اور تمام محرمات و مکروہات سے پرہیز کرنا ہے اور حقوق العباد سے متعلق امانات میں مالی امانت کا داخل ہونا تو معروف و مشہور ہے کہ کسی شخص نے کسی کے پاس اپنا کوئی مال امانت کے طور پر رکھ دیا یہ اُسکی امانت ہے اس کی حفاظت اُسکے واپس کرنے تک اس کی ذمہ داری ہے ۔ اسکے علاوہ کسی نے کوئی راز کی بات کسی سے کہی وہ بھی اسکی امانت ہے بغیر اذن شرعی کے کسی کا راز ظاہر کرنا امانت میں خیانت ہے مزدور، ملازم کو جو کام سپرد کیا گیا اُسکے لئے جتنا وقت خرچ کرنا باہم طے ہوگیا اُسمیں اس کام کو پورا کرنے کا حق ادا کرنا اور مزدوری ملازمت کے لئے جتنا وقت مقرر ہے اُسکو اُسی کام میں لگانا بھی امانت ہے کام کی چوری یا وقت کی چوری خیانت ہے اس سے معلوم ہوا کہ امانت کی حفاظت اور اسکا حق ادا کرنا بڑا جامع لفظ ہے سب مذکورہ تفصیلات اُسمیں داخل ہیں ۔

چھٹا وصف عہد پورا کرنا ہے ۔ عہد ایک تو وہ معاہدہ ہے جو دو طرف سے کسی معاملے کے سلسلے میں لازم قرار دیا جائے اُسکا پورا کرنا فرض اور اسکے خلاف کرنا غدر اور دھوکا ہے جو حرام ہے ۔ دوسرا وہ جس کو وعدہ کہتے ہیں یعنی یکطرفہ صورت سے کوئی شخص کسی شخص سے کسی چیز کے دینے کا یا کسی کام کے کرنے کا وعدہ کرلے ۔ اسکا پورا کرنا بھی شرعاً لازم و واجب ہو جاتا ہے ۔ حدیث میں ہے العدۃ دین یعنی وعدہ ایک قسم کا قرض ہے ۔ جیسے قرض کی ادائیگی واجب ہے ایسے ہی وعدہ کا پورا کرنا واجب ہے بلا عذر شرعی اسکے خلاف کرنا گناہ ہے ۔ فرق دونوں قسموں میں یہ ہے کہ پہلی قسم کے پورا کرنے پر دوسرا آدمی اُس کو بذریعہ عدالت بھی مجبور کرسکتا ہے یکطرفہ وعدہ کو پورا کرنے کے لئے بذریعہ عدالت مجبور نہیں کیا جاسکتا ۔ دیانۃً اُسکا پورا کرنا بھی واجب اور بلا عذر شرعی خلاف کرنا گناہ ہے ۔

ساتواں وصف نماز پر محافظت ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ، نماز کی محافظت سے مراد اُس کی پابندی کرنا اور ہر ایک نماز کو اسکے وقت مستحب میں ادا کرنا ہے ۔

(کذا فسّرہ ابن مسعودؓ۔ روح) یہاں صلوات کا لفظ جمع اسلئے لایا گیا ہے کہ مراد اس سے پانچ وقت کی نمازیں ہیں جن کو اپنے اپنے وقت مستحب میں پابندی سے ادا کرنا مقصود ہے اور شروع میں جہاں مقصود بالذکر خشوع تھا وہاں لفظ مفرد لایا گیا کہ مطلقاً جنس نماز خواہ فرض ہو یا واجب، سنت ہو یا نفل سب کی روح خشوع ہے۔ غور کیا جائے تو ان سات اوصاف مذکورہ میں تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد اور اُن سے متعلقہ احکام آجاتے ہیں جو شخص ان اوصاف کے ساتھ متصف ہو جائے اور اُس پر جما رہے وہ مؤمن کامل، فلاحِ دُنیا و آخرت کا مستحق ہے۔

یہ بات قابلِ نظر ہے کہ ان سات اوصاف کو شروع بھی نماز سے کیا گیا اور ختم بھی نماز پر کیا گیا اس میں اشارہ ہے کہ اگر نماز کو نماز کی طرح پابندی اور آدابِ نماز کیساتھ ادا کیا جائے تو باقی اوصاف اسمیں خود بخود پیدا ہوتے چلے جائیں گے واللہ اعلم

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ اوصافِ مذکورہ کے حامل لوگوں کو اس آیت میں جنت الفردوس کا وارث فرمایا ہے لفظ وارث میں اشارہ اسطرف ہے کہ جسطرح مورث کا مال اسکے وارث کو پہنچنا قطعی اور لازمی ہے اسی طرح ان اوصاف والوں کا جنت میں داخلہ یقینی ہے اور قَدْ اَفْلَحَ کے بعد اوصاف مفلحین پورے ذکر کرنے کے بعد اس جملے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ فلاحِ کامل اور اصلی فلاح کی جگہ جنت ہی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً
اور ہم نے بنایا آدمی کو چُنی ہوئی مٹی سے پھر ہم نے رکھا اسکو پانی کی بُوند کر کے

فِیْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً
ایک جمے ہوئے ٹھکانہ میں پھر بنایا اُس بُوند سے لہو جما ہوا پھر بنایا اس لہو جمے ہوئے سے گوشت

فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۖ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ
کی بوٹی پھر بنائیں اس بوٹی سے ہڈیاں پھر پہنایا ان ہڈیوں پر گوشت پھر اُٹھا کھڑا کیا اسکو ایک نئی صورت میں

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿۱۵﴾
سو بڑی برکت اللہ کی جو سب سے بہتر بنانے والا ہے پھر تم اسکے بعد مرو گے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ
پھر تم قیامت کے دن کھڑے کیے جاؤ گے اور ہم نے بنائے تمہارے اوپر سات رستے

وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ
اور ہم نہیں ہیں خلق سے بے خبر اور اُتارا ہم نے آسمان سے پانی ماپ کر پھر اس کو

فَاَسْكَنّٰهُ فِی الْاَرْضِ ۖۗ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَاَنْشَاْنَا

ٹھہرا دیا زمین میں اور ہم اس کو لے جائیں تو لیجا سکتے ہیں پھر اُگا دیئے

لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا

تمہارے واسطے اس سے باغ کھجور اور انگور کے، تمہارے واسطے انہیں میوے ہیں بہت اور انہی میں سے

تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ

کھاتے ہو اور وہ درخت جو نکلتا ہے سینا پہاڑ سے لے اُگتا ہے تیل

وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ

اور روٹی ڈبونا کھانے والوں کے واسطے اور تمہارے لئے چوپایوں میں دھیان کرنے کی بات ہے پلاتے ہیں ہم تم کو

مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾

اُن کے پیٹ کی چیز سے اور تمہارے لئے اُن میں بہت فائدے ہیں اور بعضوں کو کھاتے ہو

وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور اُن پر اور کشتیوں پر لدے پھرتے ہو

ع ۱

خلاصۂ تفسیر

(اول بیان ہے ایجادِ انسان کا) اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ (یعنی غذا) سے بنایا (یعنی اول مٹی ہوتی ہے پھر اس سے بذریعہ نباتات کے غذا حاصل ہوتی ہے) پھر ہم نے اس کو نطفہ سے بنایا جو کہ (ایک مدت معینہ تک) ایک محفوظ مقام (یعنی رحم) میں رہا (اور وہ غذا سے حاصل ہوا تھا) پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنایا پھر ہم نے اس خون کے لوتھڑے کو (گوشت کی) بوٹی بنا دیا پھر ہم نے اس بوٹی (کے بعض اجزاء) کو ہڈیاں بنا دیا پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا (جس سے وہ ہڈیاں ڈھک گئیں) پھر (ان سب انقلابات کے بعد) ہم نے (اس میں روح ڈال کر) اُس کو ایک دوسری ہی (طرح کی) مخلوق بنا دیا (جو حالات سابقہ سے نہایت ہی متمائز و متباین ہے کیونکہ اس سے پہلے سب انقلابات ایک جماد بے جان میں ہو رہے تھے اور اب یہ ایک ذی حیات زندہ انسان بن گیا) سو کیسی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھکر ہے (کیونکہ دوسرے صناع تو اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں جوڑ توڑ کر کے ہی بنا سکتے ہیں زندگی پیدا کرنا یہ خاص اللہ ہی کا کام ہے اور نطفہ پر مذکورہ انقلابات کی تفصیل اسی ترتیب کیساتھ قانون وغیرہ کتب طبیہ میں بھی مذکور ہے آگے انسان کے آخری انجام فنا کا بیان ہے) پھر تم بعد اس (تمام قصۂ عجیبہ) کے ضرور ہی مرنے والے ہو (آگے بیان ہے اعادہ کا یعنی) پھر تم قیامت

کے روز دوبارہ زندہ کئے جاؤگے (اور جس طرح ہم نے تم کو ابتداءً وجود عطا فرمایا اسی طرح تمہاری بقا کا سامان بھی کیا کہ) ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان (جن میں ملائکہ کے آمد و رفت کیلئے راہیں ہیں) بنائے (کہ اس سے تمہاری بھی بعض مصلحتیں متعلق ہیں) اور ہم مخلوق (کی مصلحتوں) سے بے خبر نہ تھے۔ (بلکہ ہر مخلوق کو مصالح و حکم کی رعایت کرکے بنایا) اور ہم نے (انسان کی بقاء اور نشو و نما کے لئے) آسمان سے (مناسب) مقدار کے ساتھ پانی برسایا پھر ہم نے اسکو (مدت تک) زمین میں ٹھہرایا (چنانچہ کچھ پانی تو زمین کے اوپر رہتا ہے اور کچھ اندر اُتر جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً نکلتا رہتا ہے) اور ہم (جس طرح اُس کے برسانے پر قادر ہیں اسی طرح) اُس (پانی) کے معدوم کر دینے پر (بھی) قادر ہیں (خواہ ہوا کی طرف مستحیل کرکے خواہ اتنی دُور زمین کی گہرائی میں اُتار کر کہ آلات کے ذریعہ سے نہ نکال سکو مگر ہم نے باقی رکھا) پھر ہم نے اس (پانی) کے ذریعہ سے باغ پیدا کئے کھجوروں کے اور انگوروں کے تمہارے واسطے اُن (کھجوروں انگوروں) میں بکثرت میوے بھی ہیں (جبکہ ان کو تازہ تازہ کھایا جاوے تو میوہ سمجھا جاتا ہے) اور ان میں سے (جو بچاکر خشک کرکے رکھ لیا جاتا ہے اسکو بطور غذا کے) کھاتے بھی ہو اور (اُسی پانی سے) ایک (زیتون کا) درخت بھی (ہم نے پیدا کیا) جو کہ طور سینا میں (بکثرت) پیدا ہوتا ہے جو اُگتا ہے تیل لئے ہوئے اور کھانے والوں کے لئے سالن لئے ہوئے (یعنی اُس کے پھل سے دونوں فوائد حاصل ہوتے ہیں خواہ روشن کرنے کے اور مالش کرنے کے کام میں لاؤ خواہ اُسمیں روٹی ڈبوکر کھاؤ۔ یہ سامان مذکور پانی اور نباتات سے تھا) اور (آگے حیوانات کے ذریعہ انسان کے منافع اور آسانیوں کا بیان ہے کہ) تمہارے لئے مواشی میں (بھی) غور کرنے کا موقع ہے کہ ہم تم کو اُن کے جوف میں کی چیز (یعنی دودھ) پینے کو دیتے ہیں اور تمہارے لئے اُنمیں اور بھی بہت سے فائدے ہیں (کہ ان کے بال اور اُون کام آتی ہے) اور (نیز) اُنمیں سے بعض کو کھاتے بھی ہو اور اُن (میں جو بار برداری کے قابل ہیں اُن) پر اور کشتی پر لدے لدے پھرتے (بھی) ہو۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں انسان کی فلاحِ دُنیا و آخرت کا طریقہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اُسکے احکام کی تعمیل میں اپنے ظاہر و باطن کو پاک رکھنے اور تمام انسانوں کے حقوق ادا کرنے سے بیان کیا گیا تھا۔ آیاتِ مذکورہ میں اللہ جل شانہٗ کی قدرتِ کاملہ اور بنی نوع انسان کی تخلیق میں اُسکے مظاہر خاص کا ذکر ہے جس سے واضح ہو جائے کہ انسان جسکو عقل و شعور ہو وہ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار کر ہی نہیں سکتا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ، سُلالہ بمعنے خلاصہ اور طین ، گیلی مٹی ،

جس کے معنے یہ ہیں کہ زمین کی مٹی کے خاص اجزاء نکال کر اُس سے انسان کو پیدا کیا گیا۔ انسان کی تخلیق کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے اور اُن کی تخلیق اس مٹی کے خلاصہ سے ہوئی اس لئے ابتدائی تخلیق کو مٹی کیطرف منسوب کیا گیا اسکے بعد ایک انسان کا نطفہ دوسرے انسان کی تخلیق کا سبب بنا۔ اگلی آیت میں اسی کا بیان ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً سے فرمایا ہے مطلب یہ ہے کہ ابتدائی تخلیق مٹی سے ہوئی پھر آگے سلسلۂ تخلیق اسی مٹی کے جزء لطیف یعنی نطفہ سے جاری کر دی گئی۔ جمہور مفسرین نے آیتِ مذکورہ کی تفسیر یہی لکھی ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ سے مراد بھی نطفہ انسانی ہو کیونکہ وہ غذاء سے پیدا ہوتا ہے اور غذاء انسانی مٹی سے بنتی ہے۔ واللہ اعلم

تخلیق انسانی کے سات مدارج آیاتِ مذکورہ میں انسان کی تخلیق کی سات دَور ذکر کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے سلالۃ من طین، دوسرے درجہ میں نطفہ، تیسرے میں علقہ، چوتھے میں مضغہ پانچویں میں عظام یعنی ہڈیاں، چھٹے دَور میں ہڈیوں پر گوشت چڑھانا۔ ساتواں دور تکمیلِ تخلیق کا ہے یعنی رُوح پھونکنا۔

ایک لطیفہ عجیبہ از حضرت ابن عباسؓ تفسیر قرطبی میں اس جگہ حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے اسی آیت سے استدلال کر کے ایک عجیب لطیفہ شبِ قدر کی تعیین میں نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضؓ نے ایک مرتبہ اکابرِ صحابہ کے مجمع سے سوال کیا کہ شبِ قدر رمضان کی کونسی تاریخ میں ہے، سب نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ اللّٰہُ اعلم کوئی تعیین بیان نہیں کی۔ حضرت ابنِ عباس رضؓ ان سب میں چھوٹے تھے اُن سے خطاب فرمایا کہ آپ کیا کہتے ہیں تو ابنِ عباس رضؓ نے فرمایا کہ امیرالمؤمنین اللہ تعالیٰ نے آسمان سات پیدا کئے، زمینیں سات پیدا کیں، انسان کی تخلیق سات درجات میں فرمائی۔ انسان کی غذاء سات چیزیں بنائیں اسلئے میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ شبِ قدر ستائیسویں شب ہوگی۔ فاروق اعظم رضؓ نے یہ عجیب استدلال سُن کر اکابرِ صحابہ سے فرمایا کہ آپ سے وہ بات نہ ہو سکی جو اس لڑکے نے کی جس کے سر کے بال بھی ابھی مکمل نہیں ہوئے۔ یہ حدیث طویل ابن ابی شیبہ کے مُسند میں ہے۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے تخلیق انسانی کے سات درجات سے مراد وہی لیا ہے جو اس آیت میں ہے اور انسان کی غذاء کی سات چیزیں سورۂ عبس کی آیت میں ہیں فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا، اس آیت میں آٹھ چیزیں مذکور ہیں جنمیں پہلی سات انسان کی غذاء اور آخری یعنی اَبّ یہ جانوروں کی غذا ہے۔ (قرطبی)

پھر تخلیق انسانی پر جو سات دَور گزرتے ہیں قرآن کریم کی بلاغت دیکھئے کہ ان سب کو ایک ہی انداز سے بیان نہیں فرمایا بلکہ کہیں ایک دَور سے دوسرے دَور تک انقلاب کو لفظ ثُمَّ

سے تعبیر کیا ہے جو تراخی یعنی کچھ دیر سے ہونے پر دلالت کرتا ہے کہیں اس انقلاب کا ذکر حرف فا سے کیا ہے جو بلا تاخیر ہونے پر دلالت کرتا ہے اسمیں اشارہ اس ترتیب کی طرف ہے جو ایک انقلاب سے دوسرے انقلاب کے درمیان فطرۃً ہوتی ہے کہ بعض انقلابات انسانی عقل کے لحاظ سے بہت مشکل اور بہت دیر طلب ہوتے ہیں۔ بعض اتنے دیر طلب نہیں ہوتے چنانچہ قرآنِ کریم نے ابتدائی تین دَور کو لفظ ثُمَّ کیساتھ بیان کیا ہے اوّل سلالہ طین پھر اس کو نطفہ کی صورتمیں تبدیل کرنا۔ اسکو لفظ ثُمَّ سے فرمایا ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً کیونکہ مٹی سے غذا کا پیدا ہونا پھر غذا کا جزوِ بدن ہونا پھر اُسمیں سے جزء خاص کا نطفہ کی صورت میں تبدیل ہونا انسانی قیاس کی رو سے بڑا وقت چاہتا ہے۔ اسی طرح اسکے بعد تیسرا درجہ نطفہ کا گوشت کے ٹکڑے کی شکل میں تبدیل ہونا یہ بھی ایک طویل وقت چاہتا ہے اس کو بھی ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً سے تعبیر فرمایا۔ اسکے بعد کے تین دور علقہ سے مضغہ مضغہ سے ہڈیاں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھانا ان سب کا تھوڑی مدت میں ہو جانا مستبعد نہیں معلوم ہوتا تو ان تینوں کو حرف فا سے بیان فرمایا ہے۔ پھر آخری دَور جو نفخِ روح اور زندگی پیدا کرنیکا ہے اسکو بھی لفظ ثُمَّ سے تعبیر فرمایا کیونکہ ایک غیر ذی روح جماد میں رُوح اور حیات پیدا کرنا گیا عقل میں بڑی مدت چاہتا ہے اسلئے یہاں پھر لفظ ثُمَّ لایا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک دَور سے دوسرے دَور کیطرف انقلاب جن صورتوں میں انسانی عقل و قیاس کے مطابق دیر طلب اور مدت کا کام تھا وہاں لفظ ثُمَّ سے اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا اور جہاں عام انسانی قیاس کی رُو سے زیادہ مدت درکار نہیں تھی وہاں حرف فا سے تعبیر کرکے اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ اسلئے اس پر اُس حدیث سے شبہ نہیں ہو سکتا جس میں یہ بیان فرمایا ہے کہ ہر دَور سے دوسرے دَور تک منقلب ہونمیں چالیس چالیس دن صرف ہوتے ہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا کام ہے جو انسانی قیاس کے تابع نہیں۔

تخلیق انسانی کا آخری مقام یعنی اس میں روح و حیات پیدا کرنا اس کا بیان قرآن کریم نے ایک خاص اور ممتاز انداز سے اسطرح فرمایا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ، یعنی پھر ہم نے اسکو ایک خاص قسم کی اور پیدائش عطا کی۔ اس امتیازِ بیان کی وجہ یہ ہے کہ پہلے چھ دَورِ تخلیق کے عالمِ عناصر اور مادیات سے اور اُن میں انقلاب و تبدیل سے متعلق تھے اور یہ آخری ساتواں دَور دوسرے عالم یعنی عالمِ ارواح سے رُوح کو اسکے جسم میں منتقل کرنیکا دَور تھا اسلئے اسکو خلقاً آخر سے تعبیر کیا گیا۔

رُوحِ حقیقی اور روحِ حیوانی یہاں خلقاً آخر کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، شعبیؒ، عکرمہؒ، ضحاکؒ ابوالعالیہؒ وغیرہ نے نفخ روح سے فرمائی ہے۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ غالباً مراد اس روح سے رُوحِ حیوانی ہے کہ وہ بھی مادّی اور ایک جسم لطیف ہے جو جسم حیوانی کے ہر ہر جزء میں سمایا ہوا ہوتا ہے

جس کو اطبار اور فلاسفہ روح کہتے ہیں۔ اُس کی تخلیق بھی تمام اعضار انسانی کی تخلیق کے بعد ہوتی ہے
اسلئے اسکو لفظ ثُمَّ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور روح حقیقی جسکا تعلق عالم ارواح سے ہے وہ وہیں سے لاکر
اس رُوح حیوانی کے ساتھ اسکا کوئی رابطہ حق تعالیٰ اپنی قدرت سے پیدا فرما دیتے ہیں جسکی حقیقت
کا پہچاننا انسان کے بس کا نہیں اس روح حقیقی کی تخلیق تو تمام انسانوں کی تخلیق سے بہت پہلے ہو
انھیں ارواح کو حق تعالیٰ نے ازل میں جمع کر کے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ فرمایا اور سب نے بَلیٰ کے لفظ سے اللہ تعالیٰ
کی ربوبیت کا اقرار کیا۔ ہاں اسکا تعلق جسم انسانی کے ساتھ تخلیق اعضار انسانی کے بعد ہوتا ہے۔
اس جگہ نفخ روح سے اگر یہ مُراد لیجائے کہ روحِ حیوانی کیساتھ روح حقیقی کا تعلق اسوقت قائم فرمایا گیا تو یہ
بھی ممکن ہے۔ اور درحقیقت حیاتِ انسان اسی رُوحِ حقیقی سے متعلق ہے جب اس کا تعلق روحِ
حیوانی کے ساتھ ہو جاتا ہے تو انسان زندہ کہلاتا ہے جب منقطع ہو جاتا ہے تو انسان مُردہ کہلاتا ہے
وہ روح حیوانی بھی اپنا عمل چھوڑ دیتی ہے۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ، خلق و تخلیق کے اصلی معنے کسی چیز کو از سرِ نو بغیر کسی مادہ
سابقہ کے پیدا کرنا ہے جو حق تعالیٰ جل شانہٗ کی مخصوص صفت ہے اس معنے کے اعتبار سے خالق صرف
اللہ تعالیٰ ہی ہے کوئی دوسرا شخص فرشتہ ہو یا انسان کسی ادنیٰ چیز کا خالق نہیں ہو سکتا لیکن کبھی کبھی
یہ لفظ خلق و تخلیق صنعت کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اور صنعت کی حقیقت اس سے زائد
نہیں کہ اللہ جل شانہٗ نے جو مواد اور عناصر اس جہان میں اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا فرما دیئے ہیں انکو
جوڑ توڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ مرکب کر کے ایک نئی چیز بنا دی جائے یہ کام ہر انسان کر سکتا ہے
اور اسی معنے کے لحاظ سے کسی انسان کو بھی کسی خاص چیز کا خالق کہدیا جاتا ہے۔ خود قرآن کریم نے
فرمایا تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا اِنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ
كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ ، ان تمام مواقع میں لفظ خلق مجازی طور پر صنعت کے معنے میں بولا گیا ہے۔

اسی طرح یہاں لفظ خٰلِقِيْنَ بصیغہ جمع اسی لئے لایا گیا ہے کہ عام انسان جو اپنی صنعت گری
کے اعتبار سے اپنے کو کسی چیز کا خالق سمجھتے ہیں اگر ان کو مجازاً خالق کہا بھی جائے تو اللہ تعالیٰ
ان سب خالقوں یعنی صنعت گروں میں سب سے بہتر صنعت کرنے والے ہیں۔ واللہ اعلم

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ، پچھلی تین آیتوں میں انسان کے مَبْدأ یعنی ابتدار آفرینش کا
ذکر تھا۔ اب دو آیتوں میں اُسکے معاد یعنی انجام کار کا ذکر ہے۔ آیت مذکورہ میں فرمایا کہ پھر تم سب
اس دُنیا میں آنے اور رہنے کے بعد موت سے دوچار ہونے والے ہو جس سے کوئی مستثنیٰ نہیں
ہو سکتا۔ پھر فرمایا کہ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ، یعنی مرنے کے بعد پھر قیامت کے روز تم سب
زندہ کر کے اُٹھائے جاؤ گے تاکہ تمہارے اعمال کا حساب لیکر اصلی ٹھکانے جنت یا دوزخ تک

پہنچا دیا جائے۔ یہ انسان کا انجام ہوا، آگے آغاز و انجام یعنی مبدأ و معاد کے درمیانی حالات اور اُن میں انسان پر حق تعالیٰ کے احسانات و انعامات کی تھوڑی سی تفصیل ہے جس کو اگلی آیت میں آسمان کی تخلیق کے ذکر سے شروع فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ، طرائق، طریقہ کی جمع ہے اس کو بمعنی طبقہ بھی لیا جا سکتا ہے جس کے معنے یہ ہوں گے کہ تہ برتہ سات آسمان تمہارے اُوپر بنائے گئے اور طریقہ کے معنے مشہور راستہ کے ہیں۔ یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ سب آسمان فرشتوں کی گزرگاہیں ہیں جو احکام لیکر زمین پر آتے جاتے ہیں۔

وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ آیت نے بتلایا کہ ہم نے انسان کو صرف پیدا کر کے نہیں چھوڑ دیا اور اُس سے غافل نہیں ہو سکتے بلکہ اُس کے نشو و نما، اور رہائش و آسائش کے سامان بھی مہیا کئے۔ جس کی ابتدا آسمانوں کی تخلیق سے ہوئی پھر آسمان سے بارش برسا کر انسان کے لئے غذا اور اسکی آسائش کا سامان پھلوں پھولوں سے پیدا کیا جس کا ذکر بعد کی آیت میں اسطرح فرمایا۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ

انسانوں کو آب رسانی کا قدرتی عجیب و غریب نظام اس آیت میں آسمان سے پانی برسانے کے ذکر کے ساتھ ایک قید بقدر کی بڑھا کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ انسان ایسا ضعیف الخلقت ہے کہ جو چیزیں اس کے لئے مدار زندگی ہیں اگر وہ مقدار مقدر سے زائد ہو جاویں تو وہی اس کیلئے وبالِ جان اور عذاب بن جاتی ہیں پانی جیسی چیز جس کے بغیر کوئی انسان و حیوان زندہ نہیں رہ سکتا اگر ضرورت سے زیادہ برس جائے تو طوفان آجاتا ہے اور انسان اور اسکے سامان کے لئے وبال و عذاب بنجاتا ہے۔ اس لئے آسمان سے پانی برسانا بھی ایک خاص پیمانے سے ہوتا ہے جو انسان کی ضرورت پوری کر دے اور طوفان کی صورت اختیار نہ کرے بجز اُن خاص مقامات کے جن پر اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہی کسی وجہ سے طوفان مسلط کرنیکا سبب ہو جائے۔ اس کے بعد بڑا غور طلب مسئلہ یہ تھا کہ پانی اگر روزانہ کی ضرورت کا روزانہ برسا کرے تو بھی انسان مصیبت میں آجائے روز کی بارش اُس کے کاروبار اور مزاج کے خلاف ہے۔ اور اگر سال بھر یا چھ مہینے یا تین مہینے کی ضرورت کا پانی ایک دفعہ برسایا جائے اور لوگوں کو حکم ہو کہ اپنا اپنا کوٹہ پانی کا چھ مہینے کے لئے جمع کر کے رکھو اور استعمال کرتے رہو تو ہر انسان کیا اکثر انسان بھی اتنے پانی کے جمع رکھنے کا انتظام کیسے کریں اور کسی طرح بڑے حوضوں اور گڑھوں میں بھر لینے کا انتظام بھی کریں تو چند روز کے بعد یہ پانی سڑ جائیگا جسکا پینا بلکہ استعمال کرنا بھی دشوار ہو جائے گا اسلئے قدرتِ حق جلّ شانہٗ نے اسکا انتظام یہ بنایا کہ پانی جس وقت برستا ہے اسوقت وقتی طور پر جتنے درخت اور زمینیں سیرابی کے قابل ہیں وہ سیراب ہو جاتے ہیں

پھر زمین کے مختلف تالابوں، حوضوں اور قدرتی گڑھوں میں یہ پانی جمع رہتا ہے جس کو انسان اور جانور ضرورت کے وقت استعمال کرتے ہیں مگر ظاہر ہے یہ پانی چند روز میں ختم ہو جاتا ہے۔ دائمی طور پر روزانہ انسان کو تازہ پانی کس طرح پہنچے جو ہر خطے کے باشندوں کو مل سکے؟ اسکا نظام قدرت نے یہ بنایا کہ پانی کا بہت بڑا حصہ برف کی صورت میں ایک بحر منجمد بنا کر پہاڑوں کے سروں پر ایسی پاک صاف فضا میں رکھدیا جہاں نہ گرد و غبار کی رسائی نہ کسی آدمی اور جانور کی اور جس میں نہ سڑنے کا امکان ہے نہ اُسکے ناپاک یا خراب ہونے کی کوئی صورت ہے پھر یہ برف کا پانی آہستہ آہستہ رِس رِس کر پہاڑوں کی رگوں کے ذریعہ زمین کے اندر پھیلتا ہے اور یہ قدرتی پائپ لائن پوری زمین کے گوشہ گوشہ میں پہنچ جاتی ہے جہاں سے کچھ تو چشمے خود پھوٹ نکلتے ہیں اور ندی نالے اور نہروں کی شکل میں زمین پر بہنے لگتے ہیں، تازہ بتازہ جاری پانی کروڑوں انسانوں اور جانوروں کو سیراب کرتا ہے اور کچھ یہی پہاڑی برف سے بہنے والا پانی زمین کی تہ میں اُتر کر نیچے نیچے بہتا رہتا ہے اور اُس کو کنواں کھود کر ہر جگہ نکالا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں اس پورے نظام کو ایک لفظ فَاَسْکَنّٰہُ فِی الْاَرْضِ سے بیان فرما دیا ہے آخر میں اسطرف بھی اشارہ کر دیا کہ زمین کی تہ سے جو پانی کنوؤں کے ذریعہ نکالا جاتا ہے یہ بھی قدرت کیطرف سے آسانی ہے کہ بہت زیادہ گہرائی میں نہیں بلکہ تھوڑی گہرائی میں یہ پانی رکھا گیا ہے۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا بلکہ پانی کی طبعی خاصیت کا تقاضا یہی تھا کہ یہ پانی زمین کی گہرائی میں اُترتا چلا جاتا، جہاں تک انسان کی رسائی ممکن نہیں۔ اسی مضمون کو آیت کے آخری جملہ میں ارشاد فرمایا وَاِنَّا عَلٰی ذَھَابٍۭ بِہٖ لَقٰدِرُوْنَ۔

آگے پانی کے ذریعہ پیدا ہونے والی خاص خاص چیزوں کو عرب کے مزاج و مذاق کے مطابق ذکر فرمایا کہ کھجور اور انگور کے باغات اُس سے پیدا ہوئے اور دوسرے پھلوں کو ایک عام لفظ میں جمع کر کے ذکر فرمایا لَکُمْ فِیْھَا فَوَاکِہُ کَثِیْرَۃٌ، یعنی ان باغات میں تمھارے لئے کھجور انگور کے علاوہ ہزاروں قسم کے پھل پیدا کئے جن کو تم محض تفریحی اور شوقیہ طور پر بھی کھاتے ہو اور اُن میں سے بعض پھلوں کا ذخیرہ کر کے تمھاری مستقل غذا بھی اُن سے تیار ہوتی ہے وَمِنْھَا تَاْکُلُوْنَ کا یہی مطلب ہے۔ آگے خصوصیت سے زیتون اور اُسکے تیل کے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا کیونکہ اسکے منافع بیشمار ہیں۔ اور چونکہ زیتون کے درخت کوہ طور پر زیادہ پیدا ہوتے ہیں اسلئے اسکی طرف نسبت کر دی گئی وَشَجَرَۃً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَیْنَآءَ، سیناء اور سینین اُس مقام کا نام ہے جس میں کوہ طور واقع ہے۔ زیتون کا تیل تیل کی ضروریات مثلاً بدن کی مالش اور چراغ میں جلانے کے بھی کام آتا ہے اور کھانے میں سالن کا بھی کام دیتا ہے اسی کو فرمایا تَنْۢبُتُ بِالدُّھْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰکِلِیْنَ، زیتون کے درخت کے لئے کوہ طور کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ درخت سب

سے پہلے کوہ طور ہی پر پیدا ہوا ہے اور بعض نے کہا کہ طوفانِ نوح کے بعد سب سے پہلا درخت جو زمین پر اُگا ہے وہ زیتون تھا۔ (مظہری)

اس کے بعد اُن نعمتوں کا ذکر فرمایا جو اللہ تعالیٰ نے جانوروں چوپایوں کے ذریعہ انسان کو عطا فرمائی تاکہ انسان اُن سے عبرت حاصل کرے اور حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور رحمتِ کاملہ پر استدلال کر کے توحید و عبادت میں مشغول ہو۔ اسی لئے فرمایا وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً، یعنی تمہارے لئے چوپایہ جانوروں میں ایک عبرت و نصیحت ہے آگے اسکی کچھ تفصیل اسطرح بتلائی نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا، کہ ان جانوروں کے پیٹ میں ہم نے تمھارے لئے پاکیزہ دودھ تیار کیا جو انسان کی بہترین غذا ہے اور پھر فرمایا کہ صرف دودھ ہی نہیں، ان جانوروں میں تمھارے لئے بہت سے (بیشمار) منافع اور فوائد ہیں وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ، غور کرو تو جانوروں کے جسم کا ایک ایک جزء، رواں رواں انسان کے کام آتا ہے اور اُس سے انسان کی معیشت کے لئے بیشمار قسم کے سامان تیار ہوتے ہیں۔ جانوروں کے بال، ہڈی، آنتیں، پٹھے اور سبھی اجزاء سے انسان اپنی معیشت کے کتنے سامان بناتا اور تیار کرتا ہے اُسکا شمار بھی مشکل ہے ان بیشمار منافع کے علاوہ ایک بڑا نفع یہ بھی ہے کہ ان میں سے جو جانور حلال ہیں اُن کا گوشت بھی انسان کی بہترین غذا ہے وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ۔ آخر میں ان جانوروں کا ایک اور عظیم فائدہ ذکر کیا گیا کہ تم اُن پر سوار بھی ہوتے ہو اور بار برداری کا بھی ان سے کام لیتے ہو۔ اس آخری فائدہ میں چونکہ جانوروں کے ساتھ دریا میں چلنے والی کشتیاں بھی شریک ہیں کہ سواری اور بار برداری کا بڑا کام ان سے نکلتا ہے اس لئے کشتیوں کو بھی اس کے ساتھ ذکر فرما دیا۔ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ، فلک یعنی کشتیوں ہی کے حکم میں وہ تمام سواریاں بھی ہیں جو پہیوں کے ذریعہ چلنے والی ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ

اور ہم نے بھیجا نوح کو اُس کی قوم کے پاس تو اُس نے کہا اے قوم بندگی کرو اللہ کی تمہارا کوئی

مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ

حاکم نہیں اس کے سوائے کیا تم ڈرتے نہیں تب بولے سردار جو کافر تھے اُس کی

قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ

قوم میں یہ کیا ہے آدمی ہے جیسے تم چاہتا ہے کہ بڑائی کرے تم پر اور اگر اللہ

اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۗىِٕكَةً ښ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَاۗىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾

چاہتا تو اُتارتا فرشتے ہم نے یہ نہیں سنا اپنے اگلے باپ دادوں میں

إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ بِهِ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوا بِهِ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿۲۵﴾ قَالَ

اور کچھ نہیں یہ ایک مرد ہے کہ اس کو سودا ہے سو راہ دیکھو اسکی ایک وقت تک بولا

رَبِّ انْصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ﴿۲۶﴾ فَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ أَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ

اے رب تو مدد کر میری کہ انھوں نے مجھ کو جھٹلایا پھر ہم نے حکم بھیجا اس کو کہ بنا کشتی ہماری

بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَإِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ فَاسْلُكْ فِيهَا مِنْ

آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم سے پھر جب پہنچے ہمارا حکم اور اُبلے تنور تو تو ڈال لے کشتی میں ہر چیز

كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ

کا جوڑا دو دو اور اپنے گھر کے لوگ مگر جس کی قسمت میں پہلے سے ٹھہر چکی ہے بات

وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُمْ مُغْرَقُونَ ﴿۲۷﴾ فَإِذَا اسْتَوَيْتَ

اور مجھ سے بات نہ کر ان ظالموں کے واسطے بیشک ان کو ڈوبنا ہے پھر جب چڑھ چکے

أَنْتَ وَمَنْ مَعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي نَجَّانَا

تو اور جو تیرے ساتھ ہے کشتی پر تو کہہ شکر اللہ کا جس نے چھڑایا ہم کو

مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۲۸﴾ وَقُلْ رَبِّ أَنْزِلْنِي مُنْزَلًا مُبَارَكًا وَأَنْتَ

گنہگار لوگوں سے اور کہہ اے رب اُتار مجھ کو برکت کا اُتارنا اور تو ہے

خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ﴿۲۹﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ وَإِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِينَ ﴿۳۰﴾

بہتر اُتارنے والا اس میں نشانیاں ہیں اور ہم ہیں جانچنے والے

خلاصۂ تفسیر

(اس سے پہلی آیتوں میں انسان کی تخلیق اور اس کی بقاء و آسائش کے لئے مختلف قسم کے سامان پیدا کرنے کا ذکر تھا آگے اُس کی روحانی تربیت اور دینی فلاح کا جو انتظام فرمایا اسکا ذکر ہے) اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اُن کی قوم کی طرف پیغمبر کر کے بھیجا سو اُنھوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا کہ اے میری قوم اللہ ہی کی عبادت کیا کرو اُسکے سوا کوئی تمہارے لئے معبود بنانے کے لائق نہیں (اور جب یہ ایک بات ثابت ہے تو) پھر کیا تم (دوسروں کے معبود بنانے سے) ڈرتے نہیں ہو پس (نوح علیہ السلام کی یہ بات سُن کر) اُن کی قوم میں جو کافر رئیس تھے (عوام سے) کہنے لگے کہ یہ شخص بجز اسکے کہ تمہاری طرح کا ایک (معمولی) آدمی ہے اور کچھ (رسول وغیرہ) نہیں ہے (اس دعوے سے) اُن کا (اصل) مطلب یہ ہے کہ تم سے برتر ہو کر رہے (یعنی اسکا مقصد محض اپنی جاہ و عزت ہے) اور اگر اللہ کو (رسول بھیجنا) منظور ہوتا تو (اس کام کے لئے) فرشتوں کو بھیجتا

(پس دعویٰ ان کا غلط ہے اسی طرح ان کی دعوت کرنا توحید کیطرف یہ دوسری غلطی ہے کیونکہ) ہم نے یہ بات (کہ اور کسی کو معبود مت قرار دو) اپنے پہلے بڑوں میں (کبھی) نہیں سُنی بس یہ ایک آدمی ہے جس کو جنون ہوگیا ہے (اس واسطے ساری دُنیا کے خلاف باتیں کرتا ہے کہ میں رسُول ہوں اور معبود ایک ہے) سو ایک وقت خاص (یعنی اسکے مرنے کے وقت) تک اس (کی حالت) کا اور انتظار کر لو (آخر ایک وقت پر پہنچکر ختم ہو جاویگا اور سب پاپ کٹ جاویگا) نوح علیہ السلام نے (اُن کے ایمان لانے سے مایوس ہوکر جناب باری تعالیٰ میں) عرض کیا کہ اے میرے رب (اُن سے) میرا بدلہ لے بوجہ اسکے کہ انھوں نے مجھ کو جھٹلایا ہے پس ہم نے (اُن کی دُعا قبول کی اور) اُن کے پاس حکم بھیجا کہ تم کشتی تیار کرلو ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے (کہ اب طوفان آوے گا اور تم اور مؤمنین اسکے ذریعہ سے محفوظ رہوگے) پھر جس وقت ہمارا حکم (عذاب کا قریب) آپہنچے اور (علامت اسکی یہ ہے کہ) زمین سے پانی اُبلنا شروع ہو جاوے تو (اُسوقت) ہر قسم (کے جانوروں) میں سے (جو کہ انسان کے کارآمد ہیں اور پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے، جیسا بھیڑ بکری، گائے بیل اونٹ گھوڑا گدھا وغیرہ) ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ یعنی دو دو عدد اس (کشتی) میں داخل کرلو اور اپنے گھر والوں کو بھی (سوار کرلو) باستثنا اسکے جس پر اُن میں سے (غرق ہونیکا) حکم نافذ ہوچکا ہے (یعنی آپکے اہل وعیال میں جو کافر ہو اسکو مت سوار کرو) اور (یہ سُن لو کہ عذاب آنے کے وقت) مجھ سے کافروں (کی نجات) کے بارے میں کچھ گفتگو مت کرنا (کیونکہ) وہ سب غرق کئے جاویں گے پھر جس وقت تم اور تمھارے ساتھی (مُسلمان) کشتی میں بیٹھ چکو تو یوں کہنا کہ شکر ہے خدا کا جس نے ہم کو کافر لوگوں سے (یعنی اُن کے افعال سے اور اُن کے وبال سے) نجات دی اور (جب بعد فرو ہونے طوفان کے کشتی سے زمین پر آنے لگو تو) یوں کہنا کہ اے میرے رب مجھ کو (زمین پر) برکت کا اُتارنا اُتاریو (یعنی اطمینان ظاہری وباطنی کے ساتھ رکھیو) اور آپ سب (اپنے پاس بطور مہمانی کے) اُتارنے والوں سے اچھے ہیں (یعنی اور لوگ جو مہمان کو اُتار لیتے ہیں وہ اپنے مہمان کی مقصد براری اور مصائب سے نجات پر قدرت نہیں رکھتے آپ کو ان سب چیزوں پر قدرت ہے) اس (واقعہ مذکورہ میں (اہل عقل کے لئے ہماری قدرت کی) بہت سی نشانیاں ہیں اور ہم (یہ نشانیاں معلوم کراکر اپنے بندوں کو) آزماتے ہیں (کہ دیکھیں کہ کون ان سے نفع اُٹھاتا ہے کون نہیں اُٹھاتا، اور نشانیاں یہ ہیں۔ رسُول بھیجنا، ایمان داروں کو بچالینا، کافروں کو ہلاک کردینا دفعۃً طوفان پیدا کردینا، کشتی کو محفوظ رکھنا وغیرہ وغیرہ)۔

معارف و مسائل

وَفَارَ التَّنُّوْرُ، تنور، اُس خاص جگہ کو بھی کہا جاتا ہے جو روٹی پکانے کیلئے بنائی جاتی ہے اور یہی معنے معروف و مشہور ہیں۔ دوسرے معنے میں تنور پوری زمین کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ خلاصۂ تفسیر میں اسی معنے کے اعتبار سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اور بعض حضرات نے اس سے ایک خاص تنور روٹی پکانے والا مُراد لیا ہے جو کوفہ کی مسجد میں اور بعض کے نزدیک ملک شام میں کسی جگہ تھا۔ اس تنور سے پانی اُبلنے لگنا حضرت نوح علیہ السلام کے لئے طوفان کی علامت قرار دی گئی تھی (مظہری) حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کے طوفان اور کشتی کا واقعہ پچھلی سورتوں میں تفصیل سے گزر چکا ہے)۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا

پھر پیدا کی ہم نے اُن سے پیچھے ایک جماعت اور پھر بھیجا ہم نے ان میں ایک رسول

مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ ع وَ

اُن میں کا کہ بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا حاکم اس کے سوائے پھر کیا تم ڈرتے نہیں اور

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَ

بولے سردار اُس کی قوم کے جو کافر تھے اور جھٹلاتے تھے آخرت کی ملاقات کو اور

اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا

آرام دیا تھا اُن کو ہم نے دُنیا کی زندگی میں اور کچھ نہیں یہ ایک آدمی ہے جیسے تم کھاتا ہے جس قسم سے

تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾ ۙ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا

تم کھاتے ہو اور پیتا ہے جس قسم سے تم پیتے ہو اور کہیں تم چلنے لگے کہنے پر ایک آدمی کے

مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ

اپنے برابر کے تو تم بیشک خراب ہوئے کیا تم کو وعدہ دیتا ہے کہ جب تم مرجاؤ اور ہو جاؤ

تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ ۙ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾

مٹی اور ہڈیاں تو تم کو نکلنا ہے، کہاں ہو سکتا ہے کہاں ہو سکتا ہے جو تم سے وعدہ ہوتا ہے

اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾

اور کچھ نہیں یہی جینا ہے ہمارا دُنیا کا مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو پھر اُٹھنا نہیں

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ۨافْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۸﴾

اور کچھ نہیں یہ ایک مرد ہے باندھ لایا ہے اللہ پر جھوٹ اور اُس کو ہم نہیں ماننے والے

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ﴿٣٩﴾ قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَّيُصْبِحُنَّ
بولا اے رب میری مدد کر کہ انھوں نے مجھ کو جھٹلایا فرمایا اب تھوڑے دنوں میں صبح کو رہ جائیں گے

نٰدِمِينَ ﴿٤٠﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ج
پچھتاتے پھر پکڑا ان کو چنگھاڑ نے تحقیق پھر کر دیا ہم نے ان کو کوڑا

فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِينَ ﴿٤١﴾
سو دور ہو جائیں گنہگار لوگ

خلاصۂ تفسیر

پھر (قوم نوح کے بعد) ہم نے دوسرا گروہ پیدا کیا (مراد عاد ہے یا ثمود) پھر ہم نے انہیں ایک پیغمبر کو بھیجا جو ان ہی میں کے تھے (مراد ہود علیہ السلام یا صالح علیہ السلام ہیں، ان پیغمبر نے کہا کہ) تم لوگ اللہ ہی کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود (حقیقی) نہیں، کیا تم (شرک سے) ڈرتے نہیں ہو اور (ان پیغمبر کی بات سنکر) ان کی قوم میں سے جو رئیس تھے جنہوں نے (خدا و رسول کے ساتھ) کفر کیا تھا اور آخرت کے آنے کو جھٹلایا تھا اور ہم نے ان کو دنیوی زندگانی میں عیش بھی دیا تھا کہنے لگے کہ بس یہ تو تمہاری طرح ایک (معمولی) آدمی ہیں (چنانچہ) یہ وہی کھاتے ہیں جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتے ہیں جو تم پیتے ہو اور (جب یہ تمہارے ہی جیسے بشر ہیں تو) اگر تم اپنے جیسے ایک (معمولی) آدمی کے کہنے پر چلنے لگو تو بیشک تم (عقل کے) گھاٹے میں ہو (یعنی بڑی بے وقوفی ہے) کیا یہ شخص تم سے یہ کہتا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور (مرکر) مٹی اور ہڈیاں ہوجاؤ گے (چنانچہ جب اجزاء لحمیہ خاک ہوجاتے ہیں تو ہڈیاں بے گوشت رہ جاتی ہیں پھر بعد چندے وہ بھی خاک ہوجاتی ہیں تو یہ شخص کہتا ہے کہ جب اس حالت پر پہنچ جاؤ گے) تو پھر دوبارہ زندہ کرکے زمین سے نکالے جاؤ گے (تو بھلا ایسا شخص کہیں قابل اطاعت و اتباع ہوسکتا ہے اور) بہت ہی بعید اور بہت ہی بعید ہے جو بات تم سے کہی جاتی ہے بس زندگی تو یہی ہماری دنیوی زندگی ہے کہ ہم میں کوئی مرتا ہے اور کوئی پیدا ہوتا ہے اور ہم دوبارہ زندہ کئے جاویں گے بس یہ ایک ایسا شخص ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے (کہ اس نے مجھ کو رسول بناکر بھیجا ہے اور کوئی دوسرا معبود نہیں اور قیامت آوے گی) اور ہم تو ہرگز اس کو سچا نہ سمجھیں گے۔ پیغمبر نے دعا کی کہ اے میرے رب میرا بدلہ لے اس وجہ سے کہ انھوں نے مجھ کو جھٹلایا، ارشاد ہوا کہ یہ لوگ عنقریب پشیمان ہونگے چنانچہ ان کو ایک سخت آواز نے (یا سخت عذاب نے) موافق وعدہ برحق کے (کہ لَيُصْبِحُنَّ نٰدِمِينَ) آپکڑا (جس سے وہ سب ہلاک ہوگئے) پھر (ہلاک کرنے کے بعد) ہم نے ان کو خس و خاشاک (کی طرح پامال) کر دیا سو خدا کی مار کافر لوگوں پر۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ بسلسلہ ہدایت ذکر کیا گیا تھا، آگے دوسرے پیغمبروں اور اُن کی اُمتوں کا کچھ حال اجمالاً بغیر نام متعین کئے ذکر کیا گیا ہے۔ آثار و علامات سے حضرات مفسرین نے فرمایا کہ مراد اُن اُمتوں سے عاد یا ثمود یا دونوں ہیں۔ عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا اور ثمود کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام تھے۔ اس قصہ میں ان قوموں کا ہلاک ہونا ایک صَیحہ یعنی غیبی سخت آواز کے ذریعہ بیان فرمایا ہے اور صَیحہ کے ذریعہ ہلاک ہونا دوسری آیات میں قوم ثمود کا بیان ہوا ہے اس سے بعض حضرات نے فرمایا کہ ان آیات میں قَرْنًا اٰخَرِیْنَ سے مراد ثمود ہیں مگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صَیحہ کا لفظ اس جگہ مطلق عذاب کے معنے میں لیا گیا ہو تو پھر یہ قوم عاد کے ساتھ بھی لگ سکتا ہے۔ واللہ اعلم

اِنْ ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ (اس دُنیا کی زندگی کے سوا اور کوئی زندگی نہیں۔ پس مرنا جینا اسی دُنیا کا ہے اور پھر دوبارہ زندہ ہونا نہیں) یہی قول عام کفار کا ہے جو قیامت کے منکر ہیں۔ یہ انکار جو زبان سے کرتے ہیں وہ تو کھلے کافر ہیں ہی، لیکن افسوس اور بہت فکر کی چیز یہ ہے کہ اب بہت سے مسلمانوں میں بھی عملی طور پر یہ انکار اُن کے ہر قول و فعل سے مترشح ہوتا ہے کہ آخرت اور قیامت کے حساب کیطرف کبھی دھیان بھی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اس مصیبت سے نجات عطا فرما دیں۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِیْنَ ﴿۴۲﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ
پھر پیدا کیں ہم نے ان سے پیچھے جماعتیں اور نہ آگے جائے کوئی قوم

اَجَلَهَا وَمَا یَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا
اپنے وعدہ سے اور نہ پیچھے رہے پھر بھیجتے رہے ہم اپنے رسول لگاتار جہاں پہنچا

جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ
کسی اُمت کے پاس اُن کا رسول اسکو جھٹلا دیا، پھر چلاتے گئے ہم ایک کے پیچھے دوسرے اور کر ڈالا اُن کو

اَحَادِیْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی
کہانیاں سو دُور ہو جائیں جو لوگ نہیں مانتے پھر بھیجا ہم نے موسیٰ

وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ
اور اُسکے بھائی ہارون کو اپنی نشانیاں دے کر اور کھلی سند فرعون اور اسکے سرداروں کے پاس

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ

پھر لگے بڑائی کرنے اور وہ لوگ زور پر چڑھ رہے تھے سو بولے کیا ہم مانیں گے اپنی برابر کے دو

مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ

آدمیوں کو اور اُن کی قوم ہماری تابعدار ہیں پھر جھٹلایا ان دونوں کو پس ہو گئے

الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾

غارت ہونے والوں میں اور ہم نے دی موسیٰ کو کتاب تاکہ وہ راہ پائیں

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ

اور بنایا ہم نے مریم کے بیٹے اور اسکی ماں کو ایک نشانی اور ان کو ٹھکانا دیا ایک ٹیلہ پر

ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾

جہاں ٹھہرنے کا موقع تھا اور پانی نتھرا

ع ۳ / ۱۴

خلاصۂ تفسیر

پھر ان (عاد یا ثمود) کے (ہلاک ہونے کے) بعد ہم نے اور اُمتوں کو پیدا کیا (جو کہ تکذیب رسُول کے سبب وہ بھی ہلاک ہوئے اور اُن کے ہلاک ہونے کی جو مدت علم الٰہی میں مقرر تھی) کوئی اُمت (ان اُمتوں میں سے) اپنی (اس) مدتِ معینہ سے (ہلاک ہونے میں) نہ پیش دستی کر سکتی تھی اور نہ (اس مدت سے) وہ لوگ پیچھے ہٹ سکتے تھے (بلکہ عین وقت پر ہلاک کئے گئے غرض وہ اُمتیں اوّل پیدا کی گئیں) پھر (اُن کے پاس) ہم نے اپنے پیغمبروں کو یکے بعد دیگرے (ہدایت کے لئے) بھیجا (جس طرح وہ اُمتیں یکے بعد دیگرے پیدا ہوئیں مگر اُن کی حالت یہ ہوئی کہ) جب کبھی کسی اُمت کے پاس اس اُمت کا (خاص) رسُول (خدا کے احکام لیکر) آیا انھوں نے اسکو جھٹلایا سو ہم نے (بھی ہلاک کرنے میں) ایک کے بعد ایک کا تار باندھ دیا اور ہم نے اُن کی کہانیاں بنا دیں (یعنی وہ ایسے نیست و نابود ہوگئے کہ بجز کہانیوں کے ان کا کچھ نام و نشان نہ رہا) سو خدا کی مار ان لوگوں پر جو (انبیاء کے سمجھانے پر بھی) ایمان نہ لاتے تھے۔ پھر ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) اور اُن کے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنے احکام اور کھلی دلیل (یعنی معجزہ صریحہ کہ دلیل نبوت ہے) دیکر فرعون اور اُسکے درباریوں کے پاس (بھی پیغمبر بنا کر) بھیجا (اور بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہونا بھی معلوم ہے) سو اُن لوگوں نے (اُن کی تصدیق و اطاعت سے) تکبر کیا اور وہ لوگ تھے ہی متکبر (یعنی پہلے ہی سے ان کا دماغ سڑا ہوا تھا) چنانچہ وہ (باہم) کہنے لگے کہ کیا ہم ایسے دو شخصوں پر جو ہماری طرح کے آدمی ہیں (انہیں کوئی بات امتیاز کی نہیں) ایمان لے آویں (اور اُن کے

فرمانبردار بن جاویں) حالانکہ ان کی قوم کے لوگ (تو خود) ہمارے زیرِ حکم ہیں (یعنی ہم کو تو خود انکی قوم پر ریاست حاصل ہے پھر ان دونوں کے اقتدار اور ریاست کو ہم کیسے تسلیم کرسکتے ہیں، اُن لوگوں نے ریاستِ دینیہ کو ریاستِ دُنیویہ پر قیاس کیا کہ ہم کو ایک قسم کی ریاست یعنی دُنیوی حاصل ہے تو دوسری قسم کے بھی ہم ہی مستحق ہیں اور جب ان کو دُنیوی ریاست نہیں ملی تو دینی کیسے مل سکتی ہے اور فساد اس قیاس کا ظاہر ہے) غرض وہ لوگ ان دونوں کی تکذیب ہی کرتے رہے پس (اس تکذیب کی وجہ سے) ہلاک کئے گئے اور (اُن کے ہلاک ہونے کے بعد) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (یعنی توراۃ) عطا فرمائی تاکہ (اُس کے ذریعہ سے) وہ لوگ (یعنی موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل) ہدایت پائیں اور ہم نے (اپنی قدرت و توحید پر دلالت کے لئے اور نیز بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے) مریم کے بیٹے (عیسیٰ علیہ السلام) کو اور اُن کی ماں (حضرت مریم علیہا السلام) کو بڑی نشانی (اپنی قدرت کی اور اُن کے صدق کی) بنایا (کہ بے باپ تولد ہونا دونوں کے متعلق آیتِ عظیمہ ہے) اور (چونکہ اُن کو نبی بنانا منظور تھا اور ایک ظالم بادشاہ بچپن ہی میں اُن کے درپے قتل ہوگیا تھا اسلئے) ہم نے (اس سے بچاکر) ان دونوں کو ایک ایسی بلند زمین پر لیجاکر پناہ دی جو (بوجہ غلات اور میوہ جات پیدا ہونیکے) ٹھہرنے کے قابل اور (بوجہ نہر جاری ہونے کے) شاداب جگہ تھی (یہاں تک کہ امن و امان سے جوان ہوئے اور نبوت عطا ہوئی تو توحید و دعویٰ رسالت میں اُن کی تصدیق ضروری تھی مگر بعض نے نہ کی)۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلرُّسُلُ كُلُوا۟ مِنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَٱعْمَلُوا۟ صَٰلِحًا ۖ إِنِّى بِمَا تَعْمَلُونَ

اے رسولو کھاؤ ستھری چیزیں اور کام کرو بھلا جو تم کرتے ہو میں جانتا

عَلِيمٌ ﴿٥١﴾ وَإِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ فَٱتَّقُونِ ﴿٥٢﴾

ہوں اور یہ لوگ ہیں تمہارے دین کے سب ایک دین پر اور میں ہوں تمہارا رب سو مجھ سے ڈرتے رہو

فَتَقَطَّعُوٓا۟ أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۖ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿٥٣﴾

پھر پھوٹ ڈال کر کر لیا اپنا کام آپس میں ٹکڑے ٹکڑے، ہر فرقہ جو اُن کے پاس ہے اس پر ریجھ رہے ہیں

فَذَرْهُمْ فِى غَمْرَتِهِمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٥٤﴾ أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُم بِهِۦ

سو چھوڑ دے اُن کو اُن کی بیہوشی میں ڈوبے ایک وقت تک کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ جو ہم اُن کو دیئے جاتے

مِن مَّالٍ وَبَنِينَ ﴿٥٥﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِى ٱلْخَيْرَٰتِ ۚ بَل لَّا يَشْعُرُونَ ﴿٥٦﴾

ہیں مال اور اولاد سو دوڑ دوڑ کر پہنچا رہے ہیں ہم اُن کو بھلائیاں یہ بات نہیں وہ سمجھتے نہیں

خلاصۂ تفسیر

ہم نے جس طرح تم کو اپنی نعمتوں کے استعمال کی اجازت دی اور عبادت کا حکم دیا اسی طرح سب پیغمبروں کو اور اُن کے واسطے سے اُن کی اُمتوں کو بھی حکم دیا کہ) اے پیغمبرو! تم (اور تمھاری اُمتیں) نفیس چیزیں کھاؤ (کہ خدا کی نعمت ہیں) اور (کھا کر شکر ادا کرو کہ) نیک کام کرو (یعنی عبادت اور) میں تم سب کے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتا ہوں (تو عبادت اور نیک کاموں پر اُن کی جزا اور ثمرات عطا کروں گا) اور (ہمنے اُن سے یہ بھی کہا کہ جو طریقہ تمھیں ابھی بتایا گیا ہے) یہ ہے تمھارا طریقہ (جس پر تم کو چلنا اور رہنا واجب ہے) کہ وہ ایک ہی طریقہ ہے (سب انبیاء اور اُن کی اُمتوں کا کسی شریعت میں یہ طریقہ نہیں بدلا) اور (حاصل اُس طریقہ کا یہ ہے کہ) میں تمھارا رب ہوں تم مجھ سے ڈرتے رہو (یعنی میرے احکام کی مخالفت نہ کرو کیونکہ رب ہونے کی حیثیت سے تمھارا خالق و مالک بھی ہوں اور مُنعم ہونے کی حیثیت سے تم کو بیشمار نعمتیں بھی دیتا ہوں، ان سب چیزوں کا تقاضا اطاعت و فرمانبرداری ہی ہے) سو (اسکا نتیجہ تو یہ ہونا تھا کہ سب ایک ہی طریقۂ مذکورہ پر رہتے مگر ایسا نہ کیا بلکہ) اُن لوگوں نے اپنے دین اپنا طریق الگ الگ کر کے اختلاف پیدا کر لیا ہر گروہ کے پاس جو دین (یعنی اپنا بنایا ہوا طریقہ) ہے وہ اسی پر مگن اور خوش ہے (اُس کے باطل ہونے کے باوجود اُسی کو حق سمجھتا ہے) تو آپ اُن کو اُنکی جہالت میں ایک خاص وقت تک رہنے دیجئے (یعنی اُن کی جہالت پر آپ غم نہ کیجئے جب مقرر وقت اُنکی موت کا آجاویگا تو سب حقیقت کھل جاوے گی اور اب جو فوری طور پر ان پر عذاب نہیں آتا تو) کیا (اس سے) یہ لوگ یوں گمان کر رہے ہیں کہ ہم ان کو جو کچھ مال و اولاد دیتے ہیں تو ہم ان کو جلدی جلدی فائدے پہنچا رہے ہیں (یہ بات ہرگز نہیں) بلکہ یہ لوگ (اس ڈھیل دینے کی وجہ) نہیں جانتے (یعنی یہ ڈھیل تو اُن کو بطور استدراج کے دی جا رہی ہے جو انجام کار اُن کے لئے اور زیادہ عذاب کا سبب بنے گی کیونکہ ہماری مہلت اور ڈھیل دینے سے یہ اور مغرور ہو کر سرکشی اور گناہوں میں زیادتی کریں گے اور عذاب زیادہ ہوگا)۔

معارف ومسائل

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا، لفظ طیبات کے لغوی معنی ہیں پاکیزہ نفیس چیزیں۔ اور چونکہ شریعت اسلام میں جو چیزیں حرام کر دی گئی ہیں نہ وہ پاکیزہ ہیں نہ اہلِ عقل کے لئے نفیس و مرغوب۔ اس لئے طیبات سے مُراد صرف حلال چیزیں ہیں جو ظاہری اور باطنی ہر اعتبار سے پاکیزہ و نفیس ہیں۔ اس آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو اپنے

اپنے وقت میں دو ہدایات دی گئی ہیں ایک یہ کہ کھانا حلال اور پاکیزہ کھاؤ، دوسرے یہ کہ عمل نیک صالح کرو۔ اور جب انبیار علیہم السلام کو یہ خطاب کیا گیا ہے جن کو اللہ نے معصوم بنایا ہے تو ان کی اُمّت کے لوگوں کے لئے یہ حکم زیادہ قابلِ اہتمام ہے اور اصل مقصود بھی اُمتوں ہی کو اس حکم پر چلانا ہے۔

علمار نے فرمایا کہ ان دونوں حکموں کو ایک ساتھ لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ حلال غذا کا عمل صالح میں بڑا دخل ہے جب غذا حلال ہوتی ہے تو نیک اعمال کی توفیق خود بخود ہونے لگتی ہے اور غذا حرام ہو تو نیک کام کا ارادہ کرنے کے باوجود بھی اسمیں مشکلات حائل ہو جاتی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ بعض لوگ لمبے لمبے سفر کرتے ہیں اور غبار آلود رہتے ہیں پھر اللہ کے سامنے دُعا کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور یا رب یا رب پکارتے ہیں مگر اُن کا کھانا بھی حرام ہوتا ہے پینا بھی، لباس بھی حرام سے تیار ہوتا ہے اور حرام ہی کی اُن کو غذا ملتی ہے ایسے لوگوں کی دُعا کہاں قبول ہو سکتی ہے۔ (قرطبی)

اس سے معلوم ہوا کہ عبادت اور دُعا کے قبول ہونے میں حلال کھانے کو بڑا دخل ہے جب غذا حلال نہ ہو تو عبادت اور دُعا کی مقبولیت کا بھی استحقاق نہیں رہتا۔

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً، لفظ اُمّت، ایک جماعت اور کسی خاص پیغمبر کی قوم کے معنی میں معروف و مشہور ہے اور کبھی یہ لفظ طریقہ اور دین کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے قرآن کی ایک آیت وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ، اسمیں اُمت سے مُراد ایک دین اور طریقہ ہے۔ یہی معنے اس جگہ بھی مُراد ہیں فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا، زُبُر، زبور کی جمع ہے جو کتاب کے معنے میں آتا ہے اس معنے کے اعتبار سے مراد آیت کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو سب انبیار اور اُن کی اُمتوں کو اُصول اور عقائد کے مسائل میں ایک ہی دین اور طریقہ پر چلنے کی ہدایت فرمائی تھی مگر اُمتوں نے اسکو نہ مانا اور آپسمیں ٹکڑے ٹکڑے مختلف ہو گئے ہر ایک نے اپنا اپنا طریقہ الگ اور اپنی کتاب الگ بنالی۔ اور زُبُر کبھی زُبرہ کی جمع بھی آتی ہے جس کے معنے قطعہ اور فرقہ کے ہیں۔ یہی معنے اس جگہ زیادہ واضح ہیں اور مُراد آیت کی یہ ہے کہ یہ لوگ عقائد اور اُصول میں بھی مختلف فرقے بن گئے لیکن فروعی اختلاف ائمہ مجتہدین کا اسمیں داخل نہیں کیونکہ ان اختلافات سے دین و ملت الگ نہیں ہو جاتا اور ایسا اختلاف رکھنے والے الگ الگ فرقے نہیں کہلاتے۔ اور اس اجتہادی اور فروعی اختلاف کو فرقہ واریت کا رنگ دینا خالص جہالت ہے جو کسی مجتہد کے نزدیک جائز نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾

البتہ جو لوگ اپنے رب کے خوف سے اندیشہ رکھتے ہیں اور جو لوگ اپنے رب کی باتوں پر یقین کرتے ہیں اور جو لوگ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں مانتے

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ

اور جو لوگ کہ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور اُن کے دل ڈر رہے ہیں اسلئے کہ اُن کو اپنے رب کیطرف

رٰجِعُوْنَ ﴿٦٠﴾ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿٦١﴾

لوٹ کر جانا ہے وہ لوگ دوڑ دوڑ کر لیتے ہیں بھلائیاں اور وہ ان پر پہنچے سب سے آگے

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ

اور ہم کسی پر بوجھ نہیں ڈالتے مگر اس کی گنجائش کے موافق اور ہمارے پاس لکھا ہوا ہے جو بولتا ہے

بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾

سچ اور ان پر ظلم نہ ہوگا

خلاصۂ تفسیر

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ اپنے رب کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں اور جو لوگ اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جو لوگ اپنے رب کے ساتھ شرک نہیں کرتے اور جو لوگ (اللہ کی راہ میں) دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور (باوجود اللہ کی راہ میں دینے اور خرچ کرنے کے) ان کے دل اس سے خوفزدہ رہتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جانے والے ہیں (دیکھئے وہاں جا کر ان صدقات کا کیا ثمرہ ظاہر ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دینا حکم کے موافق نہ ہو مثلاً مال حلال نہ ہو یا نیت اللہ کے لئے خالص نہ ہو اور نیت میں اخلاص کامل نہ ہونا یا مال کا حرام ہونا ہمیں معلوم نہ ہو تو اُلٹا اس پر مواخذہ ہونے لگے تو جن لوگوں میں یہ صفات ہوں) یہ لوگ اپنے فائدے جلدی جلدی حاصل کر رہے ہیں اور وہ اُن کی طرف دوڑ رہے ہیں اور (یہ اعمال مذکورہ کچھ سخت بھی نہیں جنکا کرنا مشکل ہو کیونکہ) ہم کسی کو اُس کی وسعت سے زیادہ کام کرنے کو نہیں کہتے (اس لئے یہ سب کام آسان ہیں اور اس کے ساتھ اُن کا اچھا انجام اور ثمرہ یقینی ہے کیونکہ) ہمارے پاس ایک دفتر (نامۂ اعمال کا محفوظ) ہے جو ٹھیک ٹھیک (سب کا حال) بتلا دے گا اور لوگوں پر ذرا ظلم نہ ہوگا۔

معارف و مسائل

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ، لفظ يُؤْتُوْنَ، ایتاء سے مشتق ہے جس کے معنے دینے اور خرچ کرنے کے ہیں اس لئے اس کی تفسیر صدقات کے ساتھ کی گئی ہے اور حضرت صدیقہ عائشہ رض سے ایک قرارت اس کی یاتون ما اتو بھی منقول ہے یعنی عمل کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں

اس میں صدقات نماز روزہ اور تمام نیک کام شامل ہوجاتے ہیں اور مشہور قرأت پر اگرچہ ذکر یہاں صدقات ہی کا ہوگا مگر مراد بہرحال عام اعمال صالحہ ہیں جیسا کہ ایک حدیث سے ثابت ہے۔ حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں کہ میں نے اس آیت کا مطلب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہ کام کرکے ڈرنے والے لوگ وہ ہیں جو شراب پیتے یا چوری کرتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے صدیق کی بیٹی یہ بات نہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے اور نمازیں پڑھتے ہیں اور صدقات دیتے ہیں اس کے باوجود اس سے ڈرتے رہتے ہیں کہ شاید ہمارے یہ عمل اللہ کے نزدیک (ہماری کسی کوتاہی کے سبب) قبول نہ ہوں ایسے ہی لوگ نیک کاموں میں مسارعت اور مسابقت کیا کرتے ہیں (رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ۔ مظہری) اور حضرت حسن بصری رہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو نیک عمل کرکے اتنے ڈرتے تھے کہ تم بُرے عمل کرکے بھی اتنا نہیں ڈرتے (قرطبی)

أُولَٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ، مسارعت فی الخیرات سے مُراد یہ ہے کہ جیسے عام لوگ دُنیا کے منافع کے پیچھے دَوڑتے اور دوسروں سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتے ہیں یہ حضرات دین کے فوائد میں ایسا ہی عمل کرتے ہیں! اسی لئے وہ دین کے کاموں میں دوسروں سے آگے رہتے ہیں

بَلْ قُلُوبُهُمْ فِي غَمْرَةٍ مِّنْ هَٰذَا وَلَهُمْ أَعْمَالٌ مِّن دُونِ ذَٰلِكَ هُمْ

کوئی نہیں اُن کے دل بیہوش ہیں اس طرف سے اور اُن کو اور کام لگ رہے ہیں اسکے سوائے کہ وہ اُن کو

لَهَا عَامِلُونَ ﴿٦٣﴾ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذْنَا مُتْرَفِيهِم بِالْعَذَابِ إِذَا هُمْ

کر رہے ہیں یہاں تک کہ جب پکڑیں گے ہم اُن کے آسودہ لوگوں کو آفت میں تبھی وہ لگیں گے

يَجْأَرُونَ ﴿٦٤﴾ لَا تَجْأَرُوا الْيَوْمَ ۖ إِنَّكُم مِّنَّا لَا تُنصَرُونَ ﴿٦٥﴾ قَدْ

چلّانے مت چلّاؤ آج کے دن تم ہم سے چھوٹ نہ سکو گے تم کو

كَانَتْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ تَنكِصُونَ ﴿٦٦﴾

سُنائی جاتی تھیں میری آیتیں تو تم ایڑیوں پر اُلٹے بھاگتے تھے

مُسْتَكْبِرِينَ بِهِ سَامِرًا تَهْجُرُونَ ﴿٦٧﴾ أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ

اس سے تکبّر کرکے ایک قصّہ گو کو چھوڑ کر چلے گئے سو کیا انھوں نے دھیان نہیں کیا اس کلام میں یا

جَاءَهُم مَّا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ ﴿٦٨﴾ أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ

آئی ہے اُن کے پاس ایسی چیز جو نہ آئی تھی اُنکے پہلے باپ دادوں کے پاس یا پہچانا نہیں اُنھوں اپنے پیغام لانیوالے کو

فَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ ﴿٦٩﴾ أَمْ يَقُولُونَ بِهِ جِنَّةٌ ۚ بَلْ جَاءَهُم بِالْحَقِّ

سو وہ اسکو اُوپرا سمجھتے ہیں یا کہتے ہیں اس کو سودا ہے، کوئی نہیں وہ تو لایا ہے اُنکے پاس سچی بات

وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاۗءَهُمْ لَفَسَدَتِ

اور اُنہیں بہتوں کو سچی بات بُری لگتی ہے اور اگر سچا رب چلے اُن کی خوشی پر تو خراب ہو جائیں

السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ

آسمان اور زمین اور جو کوئی اُن میں ہے کوئی نہیں ہم نے پہنچائی ہے اُن کو اُن کی نصیحت

عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٧١﴾ اَمْ تَسْـَٔــلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ

سو وہ اپنی نصیحت کو دھیان نہیں کرتے یا تو اُن سے مانگتا ہے کچھ محصول سو محصول تیرے رب کا بہتر ہے

وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿٧٢﴾ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٧٣﴾

اور وہ ہے بہتر روزی دینے والا اور تو تو بُلاتا ہے اُن کو سیدھی راہ پر

وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿٧٤﴾

اور جو لوگ نہیں مانتے آخرت کو راہ سے ٹیڑھے ہو گئے ہیں

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّـلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ

اور اگر ہم اُن پر رحم کریں اور کھول دیں جو تکلیف پہنچی اُن کو تو بھی برابر لگے رہیں گے اپنی شرارت میں

يَعْمَهُوْنَ ﴿٧٥﴾ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ

بہکے ہوئے اور ہم نے پکڑا تھا اُن کو آفت میں پھر عاجزی کی اپنے رب کے آگے

وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿٧٦﴾ حَتّٰٓى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ

اور نہ گڑگڑائے یہاں تک کہ جب کھول دیں ہم اُن پر دروازہ ایک سخت

شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿٧٧﴾

آفت کا تب اُس میں اُن کی آس ٹوٹے گی

خلاصۂ تفسیر

(یہ تو اوپر مؤمنین کی حالت سُنی مگر کفار ایسے نہیں ہیں) بلکہ (برعکس) ان کفار کے قلوب اس دین کیطرف سے (جسکا ذکر بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ میں ہے) جہالت (اور شک) میں ڈوبے ہوئے ہیں (جنکا حال اُوپر بھی معلوم ہو چکا فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ) اور اس (جہالت و انکار) کے علاوہ ان لوگوں کے اور بھی (بُرے بُرے خبیث) عمل ہیں جن کو یہ (مسلسل) کرتے رہتے ہیں (یہ لوگ شرک اور اعمال سیئہ کے برابر خوگر رہیں گے) یہانتک کہ جب ہم اُن کے خوشحال لوگوں کو (جن کے پاس مال و دولت اور نوکر چاکر سب کچھ ہے) عذاب (بعد الموت) میں دھر پکڑیں گے (اور غریب غربا، تو کس گنتی میں ہیں اور وہ تو عذاب سے کیا بچاؤ کر سکتے ہیں، غرض یہ کہ جب ان سب پر عذاب نازل ہوگا) تو فوراً چلا اُٹھیں گے (اور سارا انکار و استکبار

جس کے اب عادی ہیں کافور ہو جاویگا اسوقت اُن سے کہا جاوے گا کہ) اب مت چلاؤ (کہ کوئی فائدہ
نہیں کیونکہ) ہماری طرف سے تمہاری مُطلق مدد نہ ہوگی (کیونکہ یہ دار الجزاء ہے دار العمل نہیں ہے جس میں
چلانا اور عاجزی کرنا مفید ہو جو دار العمل تھا اس میں تو تمہارا یہ حال تھا کہ) میری آیتیں تم کو پڑھ پڑھ کر
(رسُول کی زبان سے) سُنائی جایا کرتی تھیں تو تم اُلٹے پاؤں بھاگتے تھے تکبر کرتے ہوئے قرآن کا مشغلہ
بناتے ہوئے (اس قرآن کی شان) میں بیہودہ بکتے ہوئے (کہ کوئی اس کو سحر کہتا تھا کوئی شعر کہتا تھا
اور مشغلہ کا یہی مطلب ہے پس تم نے دار العمل میں جیسا کیا آج دار الجزاء میں ویسا بھگتو) اور یہ لوگ
جو قرآن کی اور صاحب قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں تو اسکا کیا سبب ہے) کیا ان لوگوں نے اس کلام (الٰہی)
میں غور نہیں کیا (جس سے اسکا اعجاز ظاہر ہو جاتا اور یہ ایمان لے آتے) یا (تکذیب کی یہ وجہ ہے کہ) ان
کے پاس کوئی ایسی چیز آئی ہے جو ان کے پہلے بڑوں کے پاس نہیں آئی تھی (مُراد اس سے احکام الٰہیہ کا
آنا ہے جو کوئی نئی بات نہیں، ہمیشہ سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اُن کی اُمتوں کو بھی احکام دیئے
جاتے رہے ہیں کقولہ تعالیٰ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ، پس تکذیب کی یہ وجہ بھی باطل ٹھہری اور یہ دو وجہ
تو قرآن کے متعلق ہیں۔ آگے صاحبِ قرآن کے متعلق فرماتے ہیں یعنی) یا (وجہ تکذیب کی یہ ہے کہ) یہ
لوگ اپنے رسُول (کی صفتِ دیانت وصدق و امانت) سے واقف نہ تھے اسوجہ سے اُن کے منکر ہیں،
(یعنی یہ وجہ بھی باطل ہے کیونکہ آپ کے صدق و دیانت پر سب کا اتفاق تھا) یا (یہ وجہ ہے کہ)
یہ لوگ (نعوذ باللہ) آپ کی نسبت جنون کے قائل ہیں (سو آپ کا اعلیٰ درجہ کا صاحب عقل اور
صاحب الرائے ہونا بھی ظاہر ہے۔ سو واقع میں ان میں سے کوئی وجہ بھی معقول نہیں) بلکہ (اصلی وجہ
یہ ہے کہ) یہ رسُول ان کے پاس حق بات لیکر آئے ہیں اور ان میں اکثر لوگ حق بات سے نفرت رکھتے ہیں۔
(پس یہ تمام تر وجہ ہے تکذیب کی اور عدم اتباع حق کی اور یہ لوگ اس دینِ حق کا اتباع تو کیا کرتے یہ تو
اور اُلٹا یہ چاہتے ہیں کہ وہ دینِ حق ہی ان کے خیالات کے تابع کر دیا جاوے اور جو مضامین قرآن میں
ان کے خلاف ہیں اُن کو خارج یا ترمیم کر دیا جاوے کقولہ تعالیٰ فی سورۂ یُونس قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ
لِقَاۗءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ) اور (بفرضِ محال) اگر (ایسا امر واقع ہو جاتا) اور دینِ حق
اُن کے خیالات کے تابع (اور موافق) ہو جاتا تو (تمام عالم میں کفر و شرک پھیل جاتا اور اسکا اثر یہ ہوتا
کہ حق تعالیٰ کا غضب تمام عالم پر متوجہ ہو جاتا اور اسکا مقتضا یہ تھا کہ) تمام آسمان اور زمین اور جو ان میں
(آباد) ہیں سب تباہ ہو جاتے (جیسا قیامت میں تمام انسانوں میں گمراہی عام ہو جانے کے سبب
اللہ تعالیٰ کا غضب بھی سب پر عام ہوگا اور غضب الٰہی عام ہونے سے سب کی ہلاکت بھی عام ہوگی اور
اوّل تو کسی امر کا حق ہونا مقتضی ہے اُس کے وجوبِ قبول کو گو نافع بھی نہ ہو اور اُسکا قبول نہ کرنا
خود عیب ہے مگر ان لوگوں میں صرف یہی ایک عیب نہیں کہ حق سے کراہت ہو) بلکہ (اس سے بڑھکر

دوسرا عیب اور بھی ہے کہ حق کا اتباع جو انھیں کے نفع کا سامان ہے اُس سے دُور بھاگتے ہیں بس) ہم نے اُن کے پاس اُن کی نصیحت (اور نفع) کی بات بھیجی سو یہ لوگ اپنی نصیحت سے بھی روگردانی کرتے ہیں یا (علاوہ وجوہ مذکورہ کے ان کی تکذیب کی یہ وجہ ہے کہ ان کو یہ شبہ ہوا ہو کہ) آپ ان سے کچھ آمدنی چاہتے ہیں تو (یہ بھی غلط ہے کیونکہ جب آپ جانتے ہیں کہ) آمدنی تو آپکے رب کی سب سے بہتر ہے اور وہ سب دینے والوں سے اچھا ہے (تو آپ لوگوں سے کیوں مانگتے ہیں) اور (خلاصہ ان کی حالت کا یہ ہے کہ) آپ تو ان کو سیدھے رستہ کی طرف (جس کو اُوپر حق کہا ہے) بُلا رہے ہیں اور ان لوگوں کی جو کہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے یہ حالت ہے کہ اس (سیدھے) رستہ سے ہٹے جاتے ہیں (مطلب یہ کہ حق ہونا اور مستقیم ہونا اور نافع ہونا یہ سب مقتضیات ایمان کے جمع ہیں اور جو وجوہات مانع ہوسکتی تھیں وہ کوئی موجود نہیں، پھر ایمان نہ لانا اشد درجہ کی جہالت اور ضلالت ہے) اور (ان کی قساوت و عناد کی یہ حالت ہے کہ جس طرح یہ لوگ آیاتِ شرعیہ سے متأثر نہیں ہوتے اسی طرح آیاتِ قہریہ مصائب و بلیات سے بھی متأثر نہیں ہوتے گو مصیبت کے وقت طبعی طور پر ہم کو پکارتے بھی ہیں لیکن وہ دفع الوقتی ہوتی ہے چنانچہ) اگر ہم ان پر مہربانی فرمادیں اور ان پر جو تکلیف ہے اُس کو ہم دُور بھی کردیں تو وہ لوگ (پھر) اپنی گمراہی میں بھٹکتے ہوئے اصرار کرتے رہیں (اور وہ قول و قرار جو مصیبت میں کئے تھے سب ختم ہوجاویں کقولہ تعالیٰ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا الخ وقولہ تعالیٰ اِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ الخ) اور (شاہد اسکا یہ ہے کہ بعض اوقات) ہم نے ان کو گرفتارِ عذاب بھی کیا ہے سو ان لوگوں نے نہ اپنے رب کے سامنے (پُورے طور پر) فروتنی کی اور نہ عاجزی اختیار کی (پس جب عین مصیبت میں اور مصیبت بھی ایسی سخت جس کو عذاب کہا جاسکے جیسے قحط جو مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بد دُعا سے ہوا تھا انھوں نے عاجزی اختیار نہیں کی تو بعد زوال مصیبت کے تو بدرجہ اَولیٰ اُن سے اسکی توقع نہیں مگر ان کی یہ ساری بے پروائی دنیا کی ان مصائب تک ہے جن کے عادی ہوچکے ہیں) یہانتک کہ ہم جب ان پر سخت عذاب کا دروازہ کھولدیں گے (جو کہ فوق العادۃ ہو خواہ دُنیا ہی میں کہ کوئی غیبی قہر آپڑے یا بعد الموت کہ ضروری واقع ہوگا) تو اسوقت بالکل حیرت زدہ رہ جاوینگے (کہ یہ کیا ہوگیا اور سب نشہ ہرن ہوجاویگا)

معارف و مسائل

غَمْرَۃٍ، ایسے گہرے پانی کو کہتے ہیں جسمیں آدمی ڈوب جائے اور جو اسمیں داخل ہونے والے کو اپنے اندر چھپالے اسی لئے لفظ غمرہ پردہ اور ہر ڈھانپ لینے والی چیز کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ یہاں اُن کی مشرکانہ جہالت کو غمرہ کہا گیا ہے جس میں اُن کے دل ڈوبے ہوئے اور چھپے ہوئے ہیں کہ کسی

طرف سے اُن کو روشنی کی کرن نہیں پہنچی ۔

وَلَهُمْ أَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ ، یعنی اُن کی گمراہی کے لئے تو ایک شرک وکفر ہی کا پردۂ غفلت کافی تھا مگر وہ اسی پر بس نہیں کرتے اس کے ساتھ دوسرے اعمالِ خبیثہ بھی مسلسل کرتے ہی رہتے ہیں ۔

مُتْرَفِيْهِمْ ، مُتْرَفٌ ، تَرَفٌ سے مشتق ہے جس کے معنے تنعُّم اور خوشحالی کے ہیں ۔ اس جگہ اس قوم کو عذاب میں پکڑنے کا ذکر ہے جس میں امیر غریب خوشحال بدحال سبھی داخل ہونگے مگر مترفین اور خوشحالوں کا ذکر خاص طور پر اسلئے کیا کہ ایسے ہی لوگ دُنیا کے مصائب سے اپنے بچاؤ کا کچھ سامان کر لیا کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کا عذاب جب آتا ہے تو سب سے پہلے یہی لوگ بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں ۔ اس آیت میں جس عذاب کے اندر اُنکے پکڑے جانے کا ذکر ہے حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مُراد وہ عذاب ہے جو غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تلوار سے ان کے سرداروں پر پڑا تھا ۔ اور بعض حضرات نے اس عذاب سے مُراد قحط کا عذاب لیا ہے جو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بددُعا سے مکّہ والوں پر مسلط کر دیا گیا تھا یہاں تک کہ وہ مُردار جانور اور کُتّے اور ہڈیاں کھانے پر مجبور ہوگئے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے لئے بددُعا بہت کم کی ہے لیکن اس موقع میں مسلمانوں پر اُن کے مظالم کی شدت سے مجبور ہو کر یہ بددُعا کی تھی ۔ اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلٰى مُضَرَ وَاجْعَلْهَا عَلَيْهِمْ سِنِيْنَ كَسِنِيْ يُوْسُفَ (رواہ البخاری ومسلم) ۔ (قرطبی ومظہری)

مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ، اس میں لفظ بِہٖ کی ضمیر اکثر مفسرین نے حرم کیطرف راجع قرار دی جو اگرچہ اوپر کہیں مذکور نہیں مگر حرم سے قریش مکّہ کا گہرا تعلق اور اس پر اُن کا ناز اتنا معروف ومشہور تھا کہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ۔ اور معنے اس کے یہ ہیں کہ قریشِ مکّہ کا اللہ کی آیتیں سُن کر پچھلے پاؤں بھاگنے اور نہ ماننے کا سبب حرم مکّہ کی نسبت اور اُس کی خدمت پر ان کا تکبّر اور ناز تھا ۔ اور سٰمِرًا ، سَمر سے مشتق ہے جس کے اصل معنے چاندنی رات کے ہیں ۔ عرب کی عادت تھی کہ چاندنی رات میں بیٹھ کر قصّے کہانیاں کہا کرتے تھے اس لئے لفظ سمر قصّہ کہانی کے معنے میں استعمال ہونے لگا اور سامر قصّہ گو کو کہا جاتا ہے یہ لفظ اگرچہ مفرد ہے مگر معنی میں جمع کے لئے بھی بولا جاتا ہے ! اس جگہ سامر بمعنے سامرین جمع کے لئے استعمال ہوا ہے ۔ مشرکین کا ایک حال جو آیاتِ الٰہیہ سے انکار کا سبب بنا ہوا تھا حرم مکّہ کی نسبت وخدمت پر ان کا ناز تھا ۔ دوسرا حال یہ بیان فرمایا کہ یہ لوگ بے اصل اور بے بنیاد قصّے کہانیوں میں مشغول رہنے کے عادی ہیں ان کو اللہ کی آیات سے دلچسپی نہیں ۔

تَهْجُرُوْنَ ، یہ لفظ ہُجر بضم الہاء سے مشتق ہے جس کے معنے فضول بکواس اور گالی گلوچ کے ہیں یہ تیسرا حال ان مشرکین کا بیان کیا گیا کہ یہ لوگ فضول بکواس اور گالی گلوچ کے عادی ہیں ۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں بعض ایسے ہی گستاخانہ کلمات کہتے رہتے ہیں ۔

عشاء کے بعد قصہ گوئی کی ممانعت اور خاص ہدایات

رات کو افسانہ گوئی کا مشغلہ عرب و عجم میں قدیم سے چلا آتا ہے اور اس میں بہت سے مفاسد اور وقت کی اضاعت تھی۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کو مٹانے کے لئے عشاء سے پہلے سونے کو اور عشاء کے بعد فضول قصہ گوئی کو منع فرمایا۔ حکمت یہ تھی کہ عشاء کی نماز پر انسان کے اعمال یومیہ ختم ہو رہے ہیں جو دن بھر کے گناہوں کا بھی کفارہ ہو سکتا ہے۔ یہی اُس کا آخری عمل اس دن کا ہو تو بہتر ہے اگر بعد عشاء فضول قصہ گوئی میں لگ گیا تو اوّلاً یہ خود فعل عبث اور مکروہ ہے اس کے علاوہ اسکے ضمن میں غیبت جھوٹ اور دوسرے طرح طرح کے گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہے اور ایک بُرا انجام اسکا یہ ہے کہ رات کو دیر تک جاگے گا تو صبح کو سویرے نہیں اُٹھ سکے گا اسی لئے حضرت فاروق اعظمؓ جب کسی کو عشاء کے بعد فضول قصوں میں مشغول دیکھتے تو تنبیہ فرماتے تھے اور بعض کو سزا بھی دیتے تھے اور فرماتے کہ جلد سو جاؤ شاید آخر رات میں تہجد کی توفیق ہو جائے۔ (قرطبی)

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ سے اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ تک ایسی پانچ چیزوں کا ذکر ہے جو مشرکین کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے کسی درجہ میں مانع ہو سکتی تھیں اور اُن میں سے ہر ایک وجہ کے منفی ہونے کا بیان اسکے ساتھ کر دیا ہے۔ حاصل اسکا یہ ہے کہ جو وجوہ ان لوگوں کے لئے ایمان سے مانع ہو سکتی تھیں اُن میں سے کوئی بھی وجہ موجود نہیں اور ایمان لانے کے لئے جو اسباب و وجوہ داعی ہیں وہ سب موجود ہیں اس لئے اب اُنکا اِنکار خالص عناد اور ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں جسکا ذکر اسکے بعد کی آیت میں اس طرح فرمایا ہے بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ۔ یعنی اِنکارِ رسالت کی کوئی عقلی یا طبعی وجہ تو موجود نہیں پھر اِنکار کا سبب اسکے سوا کچھ نہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حق بات لیکر آئے ہیں اور یہ لوگ حق بات ہی کو بُرا سمجھتے ہیں سُننا نہیں چاہتے جسکا سبب ہوا و ہوس کا غلبہ اور جاہلوں کو جو ریاست و اقتدار حاصل ہے اسکی محبت اور جاہلوں کی تقلید ہے۔ یہ پانچ وجوہ جن کا ذکر ایمان اور اقرار بالنبوت سے مانع ہونے کی حیثیت میں کیا گیا ہے اُن میں ایک یہ بھی بیان فرمائی ہے۔

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ، یعنی اُن کے اِنکار کی ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ جو شخص دعوتِ حق اور دعوائے نبوت لیکر آیا ہے یہ کہیں باہر سے آیا ہوتا تاکہ یہ لوگ اسکے نام و نسب اور عادات و خصال اور کردار سے واقف نہ ہوتے تو یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم اس مدعی کے حالات سے واقف نہیں اس کو کیسے نبی و رسول مان کر اپنا مقتدا بنا لیں۔ مگر یہاں تو یہ بات کھُلی ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قریش ہی کے اعلیٰ نسب میں اسی شہر مکہ میں پیدا ہوئے اور بچپن سے لیکر جوانی اور ما بعد کا سارا زمانہ اُنھیں لوگوں کے سامنے گزرا۔ آپ کا کوئی عمل کوئی عادت ان سے چھپی ہوئی نہیں تھی اور دعوائے نبوت سے پہلے تک سارے کفار مکہ آپ کو صادق و امین کہا کرتے تھے آپکے کردار

عمل پر کسی نے بھی کبھی کوئی شبہ ظاہر نہیں کیا تھا تو اب ان کا یہ عذر بھی نہیں چل سکتا کہ وہ انکو پہچانتے نہیں۔

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ، اس سے پہلی آیت میں مشرکین کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ یہ لوگ جو عذاب میں مبتلا ہونے کے وقت اللہ سے یا رسول سے فریاد کرتے ہیں اگر ہم ان کی فریاد پر رحم کھا کر عذاب ہٹا دیں تو اُن کی جبلی شرارت و سرکشی کا عالم یہ ہے کہ عذاب سے نجات پانے کے بعد پھر اپنی سرکشی اور نافرمانی میں مشغول ہو جائیں گے اس آیت میں اُن کے ایک اسی طرح کے واقعہ کا بیان ہے کہ ان کو ایک عذاب میں پکڑا گیا مگر عذاب سے بدعا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نجات پانے کے بعد بھی یہ اللہ کے سامنے نہیں جھکے اور برابر اپنے کفر و شرک پر جمے رہے۔

اہلِ مکہ پر قحط کا عذاب اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے اس کا دفع ہونا

پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مکہ پر قحط کا عذاب مسلط ہونے کی دُعا کی تھی اس کی وجہ سے یہ سخت قحط میں مبتلا ہوئے اور مُردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہو گئے۔ یہ دیکھ کر ابو سفیانؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں اور صلہ رحمی کی کیا آپ نے یہ نہیں کہا کہ میں اہلِ عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، آپ نے فرمایا بیشک کہا ہے اور واقعہ بھی یُوں ہی ہے۔ ابو سفیانؓ نے کہا کہ آپ نے اپنی قوم کے بڑوں کو تو بدر کے معرکہ میں تلوار سے قتل کر دیا اور جو اب رہ گئے ہیں اُن کو بھوک سے قتل کر رہے ہیں اللہ سے دُعا کیجئے کہ یہ عذاب ہم سے ہٹ جائے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی یہ عذاب اسی وقت ختم ہو گیا اسی پر یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ۔

اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ عذاب میں مبتلا ہونے پھر اس سے نجات پانے کے بعد بھی یہ لوگ اپنے رب کے سامنے نہیں جھکے چنانچہ واقعہ یہی تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے قحط رفع بھی ہو گیا مگر مشرکینِ مکہ اپنے شرک و کفر پر اسی طرح جمے رہے۔ (مظہری وغیرہ)

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا

اور اسی نے بنا دیئے تمہارے کان اور آنکھیں اور دل تم بہت تھوڑا

مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ

حق مانتے ہو اور اسی نے تم کو پھیلا رکھا ہے زمین میں اور اسی کی طرف

تُحْشَرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ

جمع ہو کر جاؤ گے اور وہی ہے جِلاتا اور مارتا اور اسی کا کام ہے بدلنا رات

وَالنَّهَارِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٨٠﴾ بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالَ الْأَوَّلُونَ ﴿٨١﴾

اور دن کا سو کیا تم کو سمجھ نہیں کوئی بات نہیں یہ تو وہی کہہ رہے ہیں جیسا کہا کرتے تھے پہلے لوگ

قَالُوا أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿٨٢﴾ لَقَدْ

کہتے ہیں کیا جب ہم مرگئے اور ہوگئے مٹی اور ہڈیاں کیا ہم کو زندہ ہو کر اٹھنا ہے وعدہ دیا

وُعِدْنَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا هَٰذَا مِنْ قَبْلُ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ

جاتا ہے ہم کو اور ہمارے باپ دادوں کو یہی پہلے سے اور کچھ بھی نہیں یہ نقلیں ہیں

الْأَوَّلِينَ ﴿٨٣﴾ قُلْ لِمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٨٤﴾

پہلوں کی تو کہہ کس کی ہے زمین اور جو کوئی اس میں ہے بتاؤ اگر تم جانتے ہو

سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۚ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٨٥﴾ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ

اب کہیں گے سب کچھ اللہ کا ہے، تو کہہ پھر تم سوچتے نہیں تو کہہ کون ہے مالک ساتوں

السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿٨٦﴾ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۚ قُلْ أَفَلَا

آسمانوں کا اور مالک اس بڑے تخت کا اب بتائیں گے اللہ کو تو کہہ پھر تم

تَتَّقُونَ ﴿٨٧﴾ قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا

ڈرتے نہیں تو کہہ کس کے ہاتھ میں ہے حکومت ہر چیز کی اور وہ بچا لیتا ہے اور اس

يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٨٨﴾ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۚ قُلْ

سے کوئی بچا نہیں سکتا بتاؤ اگر تم جانتے ہو اب بتائیں گے اللہ کو تو کہہ

فَأَنَّىٰ تُسْحَرُونَ ﴿٨٩﴾ بَلْ أَتَيْنَاهُمْ بِالْحَقِّ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿٩٠﴾

پھر کہاں سے تم پر جادو آپڑتا ہے کوئی نہیں ہم نے ان کو پہنچایا سچ اور وہ البتہ جھوٹے ہیں

مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ ۚ إِذًا لَذَهَبَ كُلُّ

اللہ نے کوئی بیٹا نہیں کیا اور نہ اس کے ساتھ کسی کا حکم چلے یوں ہوتا تو لے جاتا ہر حکم والا

إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا

اپنی بنائی چیز کو اور چڑھائی کرتا ایک پر ایک اللہ نرالا ہے ان کی بتلائی

يَصِفُونَ ﴿٩١﴾ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٩٢﴾ ع ۵ ۱۵ ۵

باتوں سے جاننے والا چھپے اور کھلے کا وہ بہت اوپر ہے اس سے جس کو یہ شریک بتلاتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور وہ (اللہ) ایسا (قادر اور منعم) ہے جس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے

(کہ آرام بھی برتو اور دین کا بھی ادراک کرو لیکن) تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو (کیونکہ اصلی شکر یہ تھا کہ اس منعم کے پسندیدہ دین کو قبول کرتے اور دوبارہ قیامت میں زندہ کرنے کا انکار نہ کرتے) اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں پھیلا رکھا ہے اور تم سب (قیامت میں) اسی کے پاس لائے جاؤ گے (اُسوقت اس کفرانِ نعمت کی حقیقت معلوم ہوگی) اور وہ ایسا ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے اور اُسی کے اختیار میں ہے رات اور دن کا گھٹنا بڑھنا سو کیا تم (اتنی بات) نہیں سمجھتے (کہ یہ دلائل قدرت توحید اور قیامت میں دوسری زندگی دونوں پر دال ہیں مگر) پھر بھی مانتے نہیں، بلکہ یہ بھی ویسی ہی بات کہتے ہیں جو اگلے (کافر) لوگ کہتے چلے آئے ہیں (یعنی) یوں کہتے ہیں کہ کیا ہم جب مرجاویں گے اور ہم مٹی اور ہڈیاں رہ جاویں گے تو کیا ہم دوبارہ زندہ کئے جاویں گے اسکا تو ہم سے اور (ہم سے) پہلے ہمارے بڑوں سے وعدہ ہوتا چلا آیا ہے یہ کچھ بھی نہیں محض بے سند باتیں ہیں جو اگلوں سے منقول ہوتی چلی آتی ہیں (چونکہ اس قول سے انکارِ قدرت لازم آتا ہے اور اس سے مثل انکار بعث کے انکار توحید کا بھی ہوتا ہے اس لئے اس قول کے جواب میں اثبات قدرت کے ساتھ اثبات توحید کا بھی ارشاد ہے یعنی) آپ (جواب میں) یہ کہدیجئے کہ (اچھا یہ بتلاؤ کہ) یہ زمین اور جو اس پر رہتے ہیں کس کی ملک ہیں، اگر تم کو کچھ خبر ہے ۔ وہ ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ کے ہیں (تو) ان سے کہئے کہ پھر کیوں نہیں غور کرتے (کہ قدرت علی البعث اور توحید دونوں کے حکم کا ثبوت ہو جاوے اور) آپ یہ بھی کہئے کہ (اچھا یہ بتاؤ کہ) ان سات آسمانوں کا مالک اور عالیشان عرش کا مالک کون ہے (اسکا بھی) وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ یہ بھی (سب) اللہ کا ہے آپ (اسوقت) کہئے کہ پھر تم (اس سے) کیوں نہیں ڈرتے (کہ اس کی قدرت اور آیات بعث کا انکار کرتے ہو اور) آپ (ان سے) یہ بھی کہئے کہ (اچھا) وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں تمام چیزوں کا اختیار ہے اور وہ (جس کو چاہتا ہے) پناہ دیتا ہے اور اسکے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا اگر تم کو کچھ خبر ہے (تب بھی جواب میں) وہ ضرور یہی کہیں گے کہ یہ سب صفتیں بھی اللہ ہی کی ہیں آپ (اسوقت) کہئے کہ پھر تم کو کیسا خبط ہو رہا ہے (کہ ان سب مقدمات کو مانتے ہو اور نتیجہ کو کہ توحید اور قیامت کا اعتقاد ہے نہیں مانتے یہ تو استدلال تھا مقصود پر ان کے جواب میں آگے انکے مقدمہ کی دلیل یعنی اِنْ ھٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ الخ کا ابطال ہے یعنی یہ جو ان کو بتلایا جارہا ہے کہ قیامت آوے گی اور مُردے زندہ ہونگے یہ اساطیر الاولین نہیں ہے) بلکہ ہم نے ان کو سچی بات پہنچائی ہے اور یقیناً یہ (خود ہی) جھوٹے ہیں (یہاں تک مکالمہ ختم ہو چکا اور توحید و بعث دونوں ثابت ہوگئے مگر ان دونوں مسئلوں میں چونکہ توحید کا مسئلہ زیادہ مہتم بالشان اور حقیقت میں مسئلہ قیامت و آخرت کا بھی مبنیٰ اور محل کلام بھی زیادہ تھا اس لئے تتمۂ تقریر

میں اس کو مستقلاً ارشاد فرماتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ نے کسی کو اولاد قرار نہیں دیا (جیسا مشرکین ملائکہ کی نسبت کہتے تھے) اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو (تقسیم کرکے) جدا کرلیتا اور (پھر دنیا کے بادشاہوں کی عادت کے مطابق دوسرے کی مخلوقات چھیننے کے لئے) ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا (پھر مخلوق کی تباہی کی تو کیا انتہا ہے لیکن نظام عالم بدستور قائم ہے اس سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ ان (مکروہ) باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ (اس کی نسبت) بیان کرتے ہیں، جاننے والا ہے سب پوشیدہ اور آشکارا کا، غرض ان لوگوں کے شرک سے وہ بالاتر (اور منزہ) ہے۔

معارف و مسائل

وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ، یعنی اللہ تعالیٰ جس کو چاہے عذاب اور مصیبت رنج و تکلیف سے پناہ دیدے اور یہ کسی کی مجال نہیں کہ اسکے مقابلہ پر کسی کو پناہ دیکر اس کے عذاب و تکلیف سے بچالے۔ یہ بات دنیا کے اعتبار سے بھی صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو کوئی نفع پہنچانا چاہے اسکو کوئی روک نہیں سکتا اور جس کو کوئی تکلیف و عذاب دینا چاہے اس سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ اور آخرت کے اعتبار سے بھی یہ مضمون صحیح ہے کہ جس کو وہ عذاب میں مبتلا کریگا اس کو کوئی بچا نہ سکے گا اور جسکو جنت اور راحت دیگا اس کو کوئی روک نہ سکے گا (قرطبی)

قُلْ رَّبِّ إِمَّا تُرِيَنِّي مَا يُوعَدُونَ ﴿٩٣﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِي

تو کہہ اے رب اگر تو دکھانے لگے مجھ کو جو ان سے وعدہ ہوا ہے تو اے رب مجھ کو نہ کرو

فِي الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٩٤﴾ وَإِنَّا عَلَىٰ أَن نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ

ان گنہگار لوگوں میں اور ہم کو قدرت ہے کہ تجھ کو دکھلا دیں جو ان سے وعدہ

لَقَادِرُونَ ﴿٩٥﴾ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ أَعْلَمُ

کر دیا ہے بری بات کے جواب میں وہ کہہ جو بہتر ہے ہم خوب جانتے ہیں

بِمَا يَصِفُونَ ﴿٩٦﴾ وَقُل رَّبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ ﴿٩٧﴾ وَ

جو یہ بتلاتے ہیں اور کہہ اے رب میں تیری پناہ چاہتا ہوں شیطان کی چھیڑ سے اور

أَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَن يَحْضُرُونِ ﴿٩٨﴾ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ

پناہ تیری چاہتا ہوں اے رب اس سے کہ میرے پاس آئیں یہاں تک کہ جب پہنچے ان میں کسی کو

الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ﴿٩٩﴾ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ

موت کہے گا اے رب مجھ کو پھر بھیج دو شاید کچھ میں بھلا کام کرلوں اس میں جو پیچھے چھوڑ آیا

كَلَّا ۚ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۖ وَمِنْ وَرَائِهِم بَرْزَخٌ
ہرگز نہیں یہ ایک بات ہے کہ وہی کہتا ہے اور ان کے پیچھے پردہ ہے اُس دن

إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿١٠٠﴾
تک کہ اُٹھائے جائیں

خلاصۂ تفسیر

آپ (حق تعالیٰ سے) دُعا کیجئے کہ اے میرے رب جس عذاب کا ان کافروں سے وعدہ کیا جا رہا ہے (جیسا اوپر اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ سے بھی معلوم ہوا) اگر آپ مجھ کو دکھا دیں (مثلاً یہ کہ وہ عذاب میری زندگی میں اس طور سے آوے کہ میں بھی دیکھوں کیونکہ اس عذاب موعود کا کوئی وقت خاص نہیں بتلایا گیا ہے چنانچہ آیتِ مذکورہ بھی مبہم ہے جسمیں یہ احتمال مذکور بھی ہے غرض اگر ایسا ہوا) تو اے میرے رب مجھ کو ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجئے اور ہم اس بات پر کہ جو اُن سے وعدہ کر رہے ہیں آپکو بھی دکھلا دیں قادر ہیں (باقی جب تک اُن پر عذاب نہ آوے) آپ (ان کیساتھ یہ معاملہ رکھئے کہ) ان کی بدی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کر دیا کیجئے جو بہت ہی اچھا (اور نرم) ہو (اور اپنی ذات کے لئے بدلہ نہ لیجئے بلکہ ہمارے حوالہ کر دیا کیجئے) ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ (آپ کی نسبت) کہا کرتے ہیں اور (اگر آپکو بمقتضائے بشریت غیظ آجایا کرے تو) آپ یوں دُعا کیا کیجئے کہ اے میرے رب میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے وسوسوں سے (جو مفضی ہو جاویں کسی ایسے امر کیطرف جو خلاف مصلحت ہو گو خلافِ شریعت نہ ہو) اور اے میرے رب میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ شیطان میرے پاس بھی آویں (اور وسوسہ ڈالنا تو درکنار پس اس سے وہ غیظ جاتا رہے گا - یہ کفار اپنے کفر و انکارِ معاد سے باز نہیں آتے) یہاں تک کہ جب اُنمیں سے کسی (کے سر) پر موت آ (کھڑی ہو) تی ہے (اور آخرت کا معائنہ ہونے لگتا ہے) اُسوقت (آنکھیں کھلتی ہیں اور اپنے جہل و کفر پر نادم ہو کر) کہتا ہے کہ اے میرے رب (مجھے موت کو ٹال دیجئے اور) مجھ کو (دُنیا میں) پھر واپس بھیجدیجئے تاکہ جس (دُنیا) کو میں چھوڑ آیا ہوں اُسمیں (پھر جاکر) نیک کام کروں (یعنی تصدیق و طاعت حق تعالیٰ اس درخواست کو رد فرماتے ہیں کہ) ہرگز (ایسا) نہیں (ہوگا) یہ (اسکی) ایک بات ہی بات ہے جسکو یہ کہے جا رہا ہے (اور پوری ہونے والی نہیں) اور (وجہ اس کی یہ ہے کہ) ان لوگوں کے آگے ایک (چیز) آڑ (کی آنے والی) ہے (کہ جسکا آنا ضروری ہے، اور وہی دُنیا میں واپس آنے سے مانع ہے مراد اس سے موت ہے کہ اسکا وقوع بھی وقت مقدر پر ضروری ہے وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا اور موت کے بعد دُنیا میں لوٹ کر آنا بھی) قیامت کے دن تک (قانونِ الٰہی کے خلاف ہے)

معارف و مسائل

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ۝ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝

مطلب اِن دونوں آیتوں کا یہ ہے کہ قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں مشرکین و کفار پر عذاب کی وعید مذکور ہے جو عام ہے قیامت میں تو اسکا وقوع قطعی اور یقینی ہے دُنیا میں ہونیکا بھی احتمال ہے پھر یہ عذاب اگر دُنیا میں ان پر واقع ہو تو اسمیں یہ احتمال بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے بعد آئے اور یہ بھی احتمال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ ہی کے سامنے اُن پر اللہ کا کوئی عذاب آجائے۔ اور دُنیا میں جب کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو بعض اوقات اُس عذاب کا اثر صرف ظالموں ہی پر نہیں رہتا بلکہ نیک لوگ بھی اُس سے دُنیاوی تکلیف میں متأثر ہوتے ہیں گو آخرت میں انکو کوئی عذاب نہ ہو بلکہ اس دُنیا کی تکلیف پر جو اُن کو پہنچتی ہے اجر بھی ملے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے [وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً]، یعنی ایسے عذاب سے ڈرو جو اگر آگیا تو صرف ظالموں ہی تک نہیں رہے گا دوسرے لوگ بھی اُسکے لپیٹ میں آئیں گے۔

ان آیات میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ دُعا تلقین فرمائی گئی ہے کہ یا اللہ اگر ان لوگوں پر آپ کا عذاب میرے سامنے اور میرے دیکھتے ہوئے ہی آنا ہے تو مجھے ان ظالموں کیساتھ نہ رکھئے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا معصوم اور عذابِ الٰہی سے محفوظ ہونا اگرچہ آپ کے لئے یقینی تھا مگر پھر بھی اس دُعا کی تلقین اس لئے فرمائی گئی کہ آپ ہر حال میں اپنے رب کو یاد رکھیں اُس سے فریاد کرتے رہیں تاکہ آپ کا اجر بڑھے۔ (قرطبی)

وَاِنَّا عَلٰٓي اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ، یعنی ہم کو اس پر پوری قدرت ہے کہ ہم آپ کے سامنے ہی آپ کو ان پر عذاب آتا ہوا دکھلادیں۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ اگرچہ اس اُمت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے عذابِ عام نہ آنیکا وعدہ اللہ تعالیٰ کیطرف سے ہو چکا ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ، یعنی ہم ان لوگوں کو اس حالتمیں ہلاک کرنیوالے نہیں کہ آپ ان کے اندر موجود ہوں لیکن خاص خاص لوگوں پر خاص حالات میں عذابِ دُنیا ہی میں آجانا اسکے منافی نہیں۔ اس آیت میں جیسا کہ فرمایا ہے کہ ہم اس پر قادر ہیں کہ آپ کو بھی ان کا عذاب دکھلادیں وہ اہلِ مکہ پر قحط اور بھوک کا عذاب پھر غزوہ بدر میں مسلمانوں کی تلوار کا عذاب آپکے سامنے ہی ان پر پڑ چکا تھا (قرطبی)

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ، یعنی آپ بُرائی کو بھلائی کے ذریعہ ظلم کو انصاف کے ذریعہ اور بے رحمی کو رحم کے ذریعہ دفع فرمادیں۔ یہ مکارم اخلاق کی تعلیم ہے جو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے جو مسلمانوں کے باہم معاملات کے لئے ہمیشہ جاری ہے البتہ

کفار و مشرکین سے اُن کے مظالم کے مقابلے میں عفو و درگزر ہی کرتے رہنا، اُن پر ہاتھ نہ اُٹھانا، یہ حکم آیاتِ جہاد سے منسوخ ہوگیا مگر عین حالتِ جہاد میں بھی اس حُسنِ خلق کے بہت سے مظاہر باقی رکھے گئے کہ عورت کو قتل نہ کیا جائے، بچے کو قتل نہ کیا جائے جو مذہبی لوگ مسلمانوں کے مقابلے پر جنگ میں شریک نہیں اُن کو قتل نہ کیا جائے اور جس کو بھی قتل کریں تو اُس کا مُثلہ نہ بناویں کہ ناک کان وغیرہ کاٹ لیں، وغیر ذٰلک من احکام مکارم الاخلاق۔ اسی لئے بعد کی آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شیطان اور اسکے وساوس سے پناہ مانگنے کی دُعا تلقین کی گئی کہ عین میدانِ قتال میں بھی آپ کی طرف سے عدل و انصاف اور مکارمِ اخلاق کے خلاف کوئی چیز شیطان کے غصہ دلانے سے صادر نہ ہونے پائے وہ دُعا یہ ہے:۔

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ

لفظ ھمز کے معنے دھکا دینے اور دبانے کے آتے ہیں۔ اور پیچھے کی طرف سے آواز دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ دُعا اپنے مفہوم عام کے اعتبار سے ایک جامع دُعا شیطان کے شر اور مکر سے بچنے کے لئے ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اس دُعا کی تلقین فرمائی ہے تاکہ ایسے غصہ اور غیظ و غضب کی حالت میں جبکہ انسان کو اپنے نفس پر قابو نہیں رہتا اور اسمیں ھمزِ شیطان کا دخل ہوتا ہے اُس سے محفوظ رہیں۔ اس کے علاوہ شیاطین اور جنات کے دوسرے آثار اور حملوں سے بچنے کے لئے بھی یہ دُعا مجرب ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو شب میں نیند نہ آتی تھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو یہ کلماتِ دُعا تلقین فرمائے کہ یہ پڑھ کر لیٹا کریں۔ اُنھوں نے پڑھا تو یہ شکایت جاتی رہی وہ دُعا یہ ہے اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ وَعِقَابِهٖ وَمِنْ شَرِّ عِبَادِهٖ وَمِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ وَاَنْ يَّحْضُرُوْنِ۔

اَنْ يَّحْضُرُوْنِ، صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان تمھارے ہر کام میں ہر حال میں تمھارے پاس آتا ہے اور ہر کام میں گناہوں اور غلط کاموں کا وسوسہ دل میں ڈالتا رہتا ہے (قرطبی) اسی سے پناہ مانگنے کے لئے یہ دُعا تلقین فرمائی گئی ہے۔

رَبِّ ارْجِعُوْنِ، یعنی موت کے وقت کافر پر جب آخرت کا عذاب سامنے آنے لگتا ہے تو وہ تمنا کرتا ہے کہ کاش میں پھر دُنیا میں لوٹ جاؤں اور نیک عمل کر کے اس عذاب سے نجات حاصل کرلوں۔ ابن جریر نے بروایت ابن جریج نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موت کے وقت مومن جب رحمت کے فرشتے اور رحمت کے سامان سامنے دیکھنے لگتا ہے تو

فرشتے اُس سے پوچھتے ہیں کہ کیا تم چاہتے ہو کہ پھر تمہیں دُنیا میں واپس کر دیا جائے تو وہ کہتا ہے کہ ہیں اُس غموں اور تکلیفوں کے عالم میں جاکر کیا کرونگا مجھے تو اب اللہ کے پاس لیجاؤ اور کافر سے پوچھتے ہیں تو وہ کہتا ہے رَبِّ ارْجِعُوْنِ یعنی مجھے دُنیا میں لوٹا دو۔

كَلَّا ۚ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۖ وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ، برزخ کے لفظی معنے حاجز اور فاصل کے ہیں۔ دو حالتوں یا دو چیزوں کے درمیان جو چیز فاصل ہو اسکو برزخ کہتے ہیں اسی لئے موت کے بعد قیامت اور حشر تک کے زمانے کو برزخ کہا جاتا ہے کہ یہ دُنیاوی حیات اور آخرت کی حیات کے درمیان حدِ فاصل ہے اور معنے آیت کے یہ ہیں کہ جب مرنے والا کافر، فرشتوں سے دوبارہ دُنیا میں بھیجنے کو کہتا ہے تو یہ کلمہ تو اُس کو کہنا ہی تھا کیونکہ اب عذاب سامنے آچکا ہے مگر اس کلمہ کا اب کوئی فائدہ اسلئے نہیں کہ وہ اب برزخ میں پہنچ چکا ہے جس کا قانون یہ ہے کہ برزخ سے لوٹ کر کوئی دُنیا میں نہیں آتا اور قیامت اور بعث و نشر سے پہلے دوسری زندگی نہیں ملتی۔ واللہ اعلم

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ ﴿١٠١﴾

پھر جب پھونکی جاوے صور میں تو نہ قرابتیں ہیں ان میں اس دن اور نہ ایک دوسرے کو پوچھے

فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٢﴾ وَمَنْ خَفَّتْ

سو جس کی بھاری ہوئی تول تو وہی لوگ کام لے نکلے اور جس کی ہلکی نکلی

مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ﴿١٠٣﴾

تول تو وہی لوگ ہیں جو ہار بیٹھے اپنی جان دوزخ ہی میں رہا کریں گے

تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ ﴿١٠٤﴾ أَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي

جھلس دے گی اُن کے منہ کو آگ اور وہ اسمیں بدشکل ہو رہے ہونگے کیا تم کو سنائی نہ دیتیں ہماری

تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿١٠٥﴾ قَالُوا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا

آیتیں پھر تم اُن کو جھٹلاتے تھے بولے اے رب زور کیا ہم پر

شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ ﴿١٠٦﴾ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا

ہماری کم بختی نے اور رہے ہم لوگ بہکے ہوئے اے ہمارے رب نکال لے ہم کو اسمیں سے اگر ہم پھر کریں

فَإِنَّا ظَالِمُونَ ﴿١٠٧﴾ قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ﴿١٠٨﴾ إِنَّهُ

تو ہم گنہگار فرمایا پڑے رہو پھٹکارے ہوئے اسمیں اور مجھ سے نہ بولو ایک

كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

فرقہ تھا میرے بندوں میں جو کہتے تھے اے رب ہمارے ہم یقین لائے سو معاف کر ہم کو اور رحم کر ہم پر

وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ

اور تو سب رحم والوں سے بہتر ہے۔ پھر تم نے ان کو ٹھٹھوں میں پکڑ لیا یہاں تک کہ بھول گئے ان کے پیچھے

ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا

میری یاد اور تم اُن سے ہنستے رہے۔ میں نے آج دیا اُن کو بدلہ اُن کے صبر کرنے کا

اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ

کہ وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے۔ فرمایا تم کتنی دیر رہے زمین میں برسوں کی

سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾

گنتی سے۔ بولے ہم رہے ایک دن یا کچھ دن سے کم تو پوچھ لے گنتی والوں سے

قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

فرمایا تم اُس میں بہت نہیں تھوڑا ہی رہے ہو اگر تم جانتے ہوتے

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾

سو کیا تم خیال رکھتے ہو کہ ہم نے تم کو بنایا کھیلنے کو اور تم ہمارے پاس پھر کر نہ آؤ گے

خلاصۂ تفسیر

پھر جب (قیامت کا روز ہوگا اور) صُور پھونکا جاویگا تو (ایسی ہول وہیبت میں گرفتار ہونگے کہ) اُن میں (جو) باہمی رشتے ناتے (تھے) اُس روز (وہ بھی گویا) نہ رہیں گے (یعنی کوئی کسی کی ہمدردی نہ کریگا جیسے اجنبی اجنبی ہوتے ہیں) اور نہ کوئی کسی کو پُوچھے گا (کہ بھائی تم کس حالت میں ہو، غرض نہ رشتہ ناتا کام آویگا نہ دوستی اور تعارف، پس وہاں کام کی چیز ایک ایمان ہوگا جس کی عام شناخت کے لئے کہ سب پر ظاہر ہو جاوے ایک ترازو کھڑی کی جاویگی اور اس سے اعمالُ عقائد کا وزن ہوگا) سو جس شخص کا پلہ (ایمان کا) بھاری ہوگا (یعنی وہ مومن ہوگا) تو ایسے لوگ کامیاب (یعنی نجات پانیوالے) ہونگے (اور مذکور ہول وہیبت کے حالات کہ نہ کسی کا رشتہ کام آوے نہ دوستی اور نہ کوئی کسی کو پُوچھے کہ کس حال میں ہو یہ ان مؤمنین کو پیش نہ آئیں گے لقولہ تعالیٰ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ۔ الآیۃ) اور جس شخص کا پلہ (ایمان کا) ہلکا ہوگا (یعنی وہ کافر ہوگا) سو یہ وہ لوگ ہونگے جنھوں نے اپنا نقصان کر لیا اور جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے ان کے چہروں کو (اس جہنم کی) آگ جُھلستی ہوگی اور اُس (جہنم) میں اُن کے منہ بگڑے ہونگے (اور ان سے حق تعالیٰ بواسطہ یا بلا واسطہ ارشاد فرمادیں گے کہ) کیوں کیا میری آیتیں (دُنیا میں) تم کو پڑھ کر سُنائی نہیں جایا کرتی تھیں، اور تم اُن کو جُھٹلایا کرتے تھے (یہ اُسکی سزا مل رہی ہے) وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب (واقعی)

ہماری بدبختی نے ہم کو (ہمارے ہاتھوں) گھیر لیا تھا اور (بیشک) ہم گمراہ لوگ تھے (یعنی ہم جرم کا اقرار اور اس پر ندامت و معذرت کا اظہار کر کے درخواست کرتے ہیں کہ) اے ہمارے رب ہم کو اس (جہنم) سے (اب) نکال دیجئے (اور دوبارہ دُنیا میں بھیج دیجئے لقولہ تعالیٰ فی الم السجدۃ فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا) پھر اگر ہم دوبارہ (ایسا) کریں تو ہم بیشک پُورے قصور وار ہیں (اسوقت ہمکو خوب سزا دیجئے اور اب چھوڑ دیجئے) ارشاد ہوگا کہ اسی (جہنم) میں راندے ہوئے پڑے رہو اور مجھ سے بات مت کرو (یعنی ہم نہیں منظور کرتے، کیا تم کو یاد نہیں رہا کہ) میرے بندوں میں ایک گروہ (ایمانداروں کا) تھا جو (بیچارے ہم سے) عرض کیا کرتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے سو ہم کو بخش دیجئے اور ہم پر رحمت فرمایئے اور آپ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے ہیں سو تم نے (محض اس بات پر جو ہر طرح قابل قدر تھی) ان کا مذاق مقرر کیا تھا (اور) یہاں تک (اسکا مشغلہ کیا) کہ ان کے مشغلہ نے تم کو ہماری یاد بھی بھلادی اور تم اُن سے ہنسی کیا کرتے تھے (سو ان کا تو کچھ نہ بگڑا چند روز کی کلفت تھی کہ صبر کرنا پڑا جسکا یہ نتیجہ ملا کہ) میں نے اُن کو آج اُن کے صبر کا یہ بدلہ دیا، کہ وہی کامیاب ہوئے (اور تم اس ناکامی میں گرفتار ہوئے مطلب جواب کا یہ ہوا کہ تمھارا قصور اس قابل نہیں کہ سزا کے وقت اقرار کرنے سے معاف کر دیا جاوے کیونکہ تم نے ایسا معاملہ کیا جس سے ہمارے حقوق کا بھی اتلاف ہوا اور حقوق العباد کا بھی۔ اور عباد بھی کیسے ہمارے مقبول اور محبوب جو ہم سے خصوصیتِ خاصہ رکھتے تھے کیونکہ ان کو سخریہ بنانے میں اُن کی ایذا کہ اضاعۃ حق العبد ہے اور تکذیب حق جو منشا سخریہ کا ہے کہ اضاعۃ حق اللہ ہے دونوں لازم آئے پس اس کی سزا کے لئے دوام اور تمام ہی مناسب ہے اور مؤمنین کو اُن کے سامنے جنت کی نعمتوں سے کامیاب کرنا یہ بھی ایک سزا ہے کفار کیلئے کیونکہ اعداء کی کامیابی سے روحانی ایذا ہوتی ہے یہ تو جواب ہوگیا اُن کی درخواستوں کا آگے تنبیہ ہے اُن کے بطلانِ اعتقاد و مشرب پر تاکہ ذلت پر ذلت و حسرت پر حسرت ہونے سے عقوبت میں شدت ہو اسلئے) ارشاد ہوگا کہ (اچھا یہ تبلاؤ) تم برسوں کے شمار سے کس قدر مدت زمین میں رہے ہوگے (چونکہ وہاں کے ہول و ہیبت سے اُن کے ہوش و حواس گم ہو چکے ہونگے اور اُس دن کا طول بھی پیش نظر ہوگا) وہ جواب دیں گے کہ (برس کیسے، بہت رہے ہونگے تو) ایک دن یا ایک دن سے بھی کم ہم رہے ہونگے (اور سچ یہ ہے کہ ہم کو یاد نہیں) سو گننے والوں سے (یعنی فرشتوں سے کہ اعمال و اعمار سب کا حساب کرتے تھے) پُوچھ لیجئے، ارشاد ہوگا کہ (یوم اور بعض یوم تو غلط ہے مگر اتنا تو تمھارے اقرار سے جو کہ صحیح بھی ہے ثابت ہوگیا کہ) تم (دُنیا میں) تھوڑی ہی مدت رہے (لیکن) کیا خوب ہوتا کہ تم (یہ بات اُسوقت) سمجھتے ہوتے (کہ دُنیا کی بقا ناقابلِ اعتبار ہے اور اسکے سوا اور کوئی دار القرار ہے مگر وہاں تو بقار کو دُنیا ہی میں منحصر سمجھا اور

اس عالم کا انکار کرتے ہے وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ، اور اب جو غلطی ظاہر ہوئی اور صحیح سمجھے تو بیکار، اور غلطیٔ اعتقاد پر تنبیہ کے بعد آگے پھر اس اعتقاد پر زجر ہے، جو بطور خلاصہ مضمون فرد قرار دادِ جرم کے ہے کہ) ہاں تو کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تم کو یوں ہی مہمل (خالی از حکمت) پیدا کر دیا ہے اور یہ (خیال کیا تھا) کہ تم ہمارے پاس نہیں لائے جاؤ گے (مطلب یہ کہ جب ہم نے آیات میں جن کا صدق دلائل صحیحہ سے ثابت ہے قیامت اور اس میں اعمال کے بدلے کی خبر دی تھی تو معلوم ہو گیا تھا کہ مکلفین کی تخلیق کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اسکا منکر ہونا کتنا بڑا امرِ منکَر تھا)۔

معارف و مسائل

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ ، قیامت کے روز صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا نفخۂ اولیٰ یعنی پہلے صور کا یہ اثر ہوگا کہ سارا عالم زمین و آسمان اور جو اسکے درمیان ہے فنا ہو جائیگا اور نفخۂ ثانیہ سے پھر سارے مردے زندہ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے قرآن کریم کی آیت ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اس آیت میں صور کا نفخۂ اولیٰ مراد ہے یا نفخۂ ثانیہ، اس میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے بروایت ابن جبیرؓ منقول ہے کہ اس آیت میں مراد نفخۂ اولیٰ ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ نے فرمایا اور بروایت عطاؒ بھی بات حضرت ابن عباس رضؓ سے بھی منقول ہے کہ مراد اس جگہ نفخۂ ثانیہ ہے۔ تفسیر مظہری میں اسکو صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول یہ ہے کہ قیامت کے روز ایک ایک بندے مرد و عورت کو محشر کے میدان میں لایا جائے گا اور تمام اولین و آخرین کے اس بھرے مجمع کے سامنے کھڑا کیا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ کا ایک منادی یہ ندا کریگا کہ یہ شخص فلاں بن فلاں ہے اگر کسی کا کوئی حق اسکے ذمہ ہے تو سامنے آجائے اس سے اپنا حق وصول کرلے۔ یہ وہ وقت ہوگا کہ بیٹا اسپر خوش ہوگا کہ میرا حق باپ کے ذمہ نکل آیا، اور باپ کا کوئی حق بیٹے پر رہا تو باپ خوش ہوگا کہ اس سے وصول کر دنگا اسی طرح میاں بیوی اور بھائی بہن جس کا جسپر کوئی حق ہوگا یہ منادی سُنکر اُس سے وصول کرنے پر آمادہ اور خوش ہوگا، یہی وہ وقت ہے جس کے متعلق اس آیتِ مذکورہ میں آیا ہے فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ ، یعنی اُس وقت باہمی نسبی رشتے اور قرابتیں کام نہ آئیں گی کوئی کسی پر رحم نہ کریگا، ہر شخص کو اپنی اپنی فکر لگی ہوگی یہی مضمون اس آیت کا ہے يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ، یعنی وہ دن جس میں ہر انسان اپنے بھائی سے، ماں اور باپ سے، بیوی اور اولاد سے دُور بھاگے گا۔

محشر میں مؤمنین اور کفار کے حالات میں فرق

مگر یہ حال کافروں کا ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ اوپر اسکا ذکر موجود ہے مؤمنین کا یہ حال نہیں ہوگا کیونکہ مؤمنین کا حال خود قرآن نے یہ ذکر کیا ہے اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ، یعنی مؤمنین صالحین کی اولاد کو بھی اللہ تعالیٰ (بشرط ایمان) اپنے آباء صالحین کیساتھ لگا دیں گے اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز جس وقت محشر میں سب پیاسے ہونگے تو مسلمان بچے جو نابالغی کی حالت میں مرگئے تھے وہ جنت کا پانی لئے ہوئے نکلیں گے لوگ اُن سے پانی مانگیں گے تو وہ کہیں گے کہ ہم تو اپنے ماں باپ کو تلاش کر رہے ہیں یہ پانی اُن کے لئے ہے۔ (رواہ ابن ابی الدنیا عن عبداللہ بن عمرؓ و عن ابی ذرؓ۔ مظہری)

اسی طرح ایک صحیح حدیث میں جس کو ابن عساکر نے بسند صحیح حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز ہر نسبی تعلق یا زوجیت کے تعلق سے جو رشتے پیدا ہونگے وہ سب منقطع ہو جائیں گے (کوئی کسی کے کام نہ آئیگا) بجز میرے نسب اور میری زوجیت کے رشتہ کے علماء نے فرمایا کہ اس نسبِ نبوی میں ساری اُمّت کے مسلمان بھی داخل ہیں کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُمّت کے باپ اور آپ کی ازواج مطہرات اُمّت کی مائیں ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ رشتہ اور دوستی کا کوئی تعلق کسی کے کام نہ آنا یہ حال محشر میں کافروں کا ہوگا مؤمنین ایک دوسرے کی شفاعت اور مدد کریں گے اور اُن کے تعلقات ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔

وَلَا يَتَسَاءَلُونَ، یعنی آپس میں کوئی کسی کی بات نہ پوچھے گا اور دوسری ایک آیت میں جو یہ مذکور ہے وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ، یعنی محشر میں لوگ باہم ایک دوسرے سے سوالات کریں گے اور حالات پوچھیں گے۔ اس کے بارہ میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ محشر میں مختلف موقف ہوں گے ہر موقف کا حال مختلف ہوگا۔ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ کوئی کسی کو نہ پوچھیگا پھر کسی موقف میں جب وہ ہیبت اور ہول کا غلبہ کم ہو جائیگا تو باہم ایک دوسرے کا حال بھی دریافت کریں گے (مظہری)۔ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ یعنی میزانِ عمل میں جس شخص کا نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا وہ ہی فلاح پانے والے ہیں اور جسکا پلہ نیکیوں کا ہلکا رہے گا تو یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دُنیا میں خود اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا اور اب وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہنے والے ہیں۔ اس آیت میں مقابلہ صرف مؤمنین کاملین اور کفار کا ہے اور اُنھیں کے وزن اعمال کا اور اُن میں سے ہر ایک کے انجام کا ذکر کیا گیا کہ مؤمنین کاملین کا پلہ بھاری ہوگا انکو فلاح حاصل ہوگی، کفار کا پلہ ہلکا رہے گا اُن کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہنا پڑیگا۔

اور قرآن کریم کی دوسری تصریحات سے ثابت ہے کہ اس جگہ مؤمنین کاملین کا پلہ بھاری ہونیکا

مطلب یہ ہے کہ دوسرے پلّے یعنی سیئات و معاصی کے پلّے میں کوئی وزن ہی نہ ہوگا وہ خالی نظر آئے گا۔ اور کفار کا پلّہ ہلکا ہونیکا مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے پلّہ میں کوئی وزن ہی نہ ہوگا بالکل خالی جیسا ہلکا رہے گا جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ، یعنی ہم کفار اور اُنکے اعمال کا قیامت کے دن کوئی وزن ہی قائم نہ کریں گے۔ یہ حال تو مؤمنین کاملین کا ہوا اور جن سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوئے یا توبہ وغیرہ سے معاف کر دیئے گئے وزنِ اعمال کے وقت سیئات کے پلّہ میں اُن کے نام پر کچھ نہ ہوگا۔ دوسری طرف کفار ہیں جن کے نیک اعمال بھی شرطِ ایمان موجود نہ ہونے کے سبب میزانِ عدل میں بے وزن ہوں گے۔ باقی رہا معاملہ گنہگار مسلمانوں کا جن کے نیکیوں کے پلّہ میں بھی اعمال ہونگے اور سیئات کے پلّہ میں بھی اعمال ہونگے ان کا ذکر اس آیت میں صراحۃً نہیں کیا گیا بلکہ عموماً قرآن کریم میں گنہگار مسلمانوں کی سزا و جزاء سے سکوت ہی اختیار کیا گیا ہے اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں جتنے مؤمنین صحابہ کرامؓ تھے وہ سب کے سب عدول تھے یعنی عموماً تو وہ کبیرہ گناہوں سے پاک ہی رہے اور اگر کسی سے کوئی گناہ ہو بھی گیا تو اُسنے توبہ کرلی توبہ سے معاف ہوگیا۔ (مظہری)

قرآن مجید کی ایک آیت خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا میں ایسے لوگوں کا ذکر ہے جنکے نیک بد اعمال ملے جلے ہیں۔ اُن کے متعلق حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قیامت کے روز ان لوگوں کے اعمال کا حساب اس طرح ہوگا کہ جس شخص کی نیکیاں اُسکے گناہوں سے بڑھ جائیں خواہ ایک ہی نیکی کی مقدار سے بڑھے وہ جنت میں جائیگا اور جس شخص کے سیئات اور گناہ نیکیوں سے بڑھ جائیں خواہ ایک ہی گناہ کی مقدار سے بڑھے وہ دوزخ میں جائیگا مگر اس مؤمن گنہگار کا دوزخ میں داخلہ تطہیر اور پاک کرنے کے لئے ہوگا جیسے لوہے، سونے وغیرہ کو آگ میں ڈال کر میل اور زنگ سے صاف کیا جاتا ہے اس کا جہنم میں جانا بھی ایسا ہی ہوگا۔ جس وقت جہنم کی آگ سے اسکے گناہوں کا زنگ دُور ہو جاویگا تو جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جاویگا اور جنت میں بھیجدیا جائے گا اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قیامت کی میزانِ عمل ایسا صحیح وزن کرنے والی ہوگی کہ ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی کمی بیشی ہوگی تو پلّہ جھک جائیگا یا اُٹھ جائیگا۔ اور جس شخص کی حسنات اور سیئات میزانِ عمل میں بالکل برابر سرابر رہیں گے تو وہ اصحابِ اعراف میں داخل ہوگا اور ایک زمانہ تک دوزخ اور جنت کے درمیان حکم ثانی کا منتظر رہے گا اور بالآخر اسکو بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا (رواہ ابن ابی حاتم۔ مظہری)

ابن عباسؓ کے اس قول میں کفار کا ذکر نہیں صرف مؤمنین گنہگاروں کا ذکر ہے۔

وزنِ اعمال کی کیفیت بعض روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود انسان مؤمن و کافر کو

میزانِ عدل میں رکھ کر تولا جائے گا۔ کافر کا کوئی وزن نہ ہوگا خواہ وہ کتنا ہی فربہ اور موٹا ہو۔ (بخاری و مسلم من حدیث ابی ہریرۃ رضہ) اور بعض روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انکے نامۂ اعمال تولے جائیں گے۔ ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم نے یہ مضمون حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کے اعمال جو دنیا میں بے وزن بے جسم اعراض ہوتے ہیں محشر میں ان کو مجسم کر کے میزانِ عمل میں رکھا جائیگا وہ تولے جائیں گے۔ طبرانی وغیرہ نے یہ روایت ابن عباسؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ ان سب روایات حدیث کے الفاظ اور متن تفسیر مظہری میں مکمل موجود ہیں وہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسی آخری قول کی تائید میں ایک حدیث عبدالرزاق نے فضل العلم میں ابراہیم نخعی رح سے نقل کی ہے کہ قیامت کے روز ایک شخص کے اعمال وزن کے لئے لائے جائیں گے اور ترازو کے پلہ میں رکھے جائیں گے تو یہ پلہ ہلکا رہیگا۔ پھر ایک چیز ایسی لائی جائے گی جو بادل کی طرح ہوگی اس کو بھی اسکے حسنات کے پلہ میں رکھدیا جائے گا تو یہ پلہ بھاری ہوجائیگا اسوقت اس شخص سے کہا جائیگا کہ تم جانتے ہو یہ کیا چیز ہے (جسنے تمھاری نیکیوں کا پلہ بھاری کردیا) وہ کہے گا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تو بتلایا جائے گا کہ یہ تیرا علم ہے جو تو لوگوں کو سکھایا کرتا تھا۔ اور ذہبی نے فضل علم میں حضرت عمران بن حصین رضہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز شہیدوں کا خون اور علماء کی روشنائی (جس سے انھوں نے علمِ دین کی کتابیں لکھی تھیں) باہم تولے جائیں گے تو علماء کی روشنائی کا وزن شہیدوں کے خون سے زیادہ نکلے گا۔ (مظہری)

وزنِ اعمال کی کیفیت کے متعلق تینوں قسم کی روایات نقل کرنے کے بعد تفسیر مظہری میں فرمایا کہ اسمیں کوئی بُعد نہیں کہ خود انسان اور اسکے اعمال کو جسمانی شکل میں تولا جائے یا اسکے نامۂ اعمال کو اسکے ساتھ رکھ کر تولا جائے اس لئے ان تینوں روایتوں میں کوئی تعارض اور اختلاف نہیں۔

وَهُمْ فِيهَا كٰلِحُوْنَ، کالح لغت میں اُس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے دونوں ہونٹ اسکے دانتوں کو نہ چھپائیں ایک اوپر رہے دوسرا نیچے دانت نکلے ہوئے نظر آئیں جو نہایت بدصورت ہے جہنم میں جہنمی کا اوپر کا ہونٹ اُوپر چڑھ جائیگا اور نیچے کا ہونٹ نیچے لٹک جائیگا دانت کھلے نکلے نظر آویں گے

وَلَا تُكَلِّمُوْنِ، حضرت حسن بصری رح نے فرمایا کہ اہل جہنم کا یہ آخری کلام ہوگا جس کے جواب میں حکم ہوجائیگا کہ ہم سے کلام نہ کرو پھر وہ کسی سے کچھ کلام نہ کرسکیں گے جانوروں کی طرح ایک دوسرے کیطرف بھونکیں گے۔ اور بیہقی وغیرہ نے محمد بن کعبؓ سے نقل کیا ہے کہ قرآن میں اہل جہنم کی پانچ درخواستیں نقل کی گئی ہیں اُن میں سے چار کا جواب دیا گیا اور پانچویں کے جواب میں حکم ہوگیا لَا تُكَلِّمُوْنِ بس یہ اُنکا آخری کلام ہوگا اس کے بعد کچھ نہ بول سکیں گے۔ (مظہری)

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾

سو بہت اوپر ہے اللہ وہ بادشاہ سچا کوئی حاکم نہیں اس کے سوائے مالک اس عزت کے تخت کا

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ

اور جو کوئی پکارے اللہ کے ساتھ دوسرا حاکم جس کی سند نہیں اس کے پاس سو اس کا حساب ہے

عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ

اس کے رب کے نزدیک، بیشک بھلا نہ ہوگا منکروں کا اور تو کہہ اے رب معاف کر اور رحم کر

وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ ع

اور تو ہے بہتر سب رحم والوں سے

خلاصۂ تفسیر

(اور یہ سب مضامین جب معلوم ہو چکے) سو (اس سے یہ کامل طور پر ثابت ہوگیا کہ) اللہ تعالیٰ بہت ہی عالیشان ہے جو کہ بادشاہ (ہے اور بادشاہ بھی) حقیقی ہے اس کے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں (اور وہ) عرشِ عظیم کا مالک ہے اور جو شخص (اس امر پر دلائل قائم ہونے کے بعد) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کی بھی عبادت کرے کہ جس (کے معبود ہونے) پر اس کے پاس کوئی بھی دلیل نہیں سو اسکا حساب اس کے رب کے یہاں ہوگا (جسکا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ) یقیناً کافروں کو فلاح نہ ہوگی (بلکہ ابدالآباد معذب رہیں گے) اور (جب حق تعالیٰ کی یہ شان ہے تو) آپ (اور دوسرے لوگ بدرجۂ اولیٰ) یوں کہا کریں کہ اے میرے رب (میری خطائیں) معاف کر اور (ہر حالت میں مجھ پر) رحم کر (معاش میں بھی، توفیق طاعات میں بھی، نجاتِ آخرت میں بھی، عطائے جنت میں بھی) اور تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

معارف و مسائل

یہ سورۂ مومنون کی آخری آیتیں اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ سے آخر سورت تک خاص فضیلت رکھتی ہیں۔ بغوی اور ثعلبی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ اُن کا گزر ایک ایسے بیمار پر ہوا جو سخت امراض میں مبتلا تھا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کے کان میں سورۂ مومنون کی یہ آیتیں اَفَحَسِبْتُمْ سے آخر تک پڑھ دی وہ اُسی وقت اچھا ہوگیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ نے اس کے کان میں کیا پڑھا؟ عبداللہ بن مسعودؓ نے عرض کیا کہ یہ آیتیں پڑھی ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے

قبضہ میں میری جان ہے اگر کوئی آدمی جو یقین رکھنے والا ہو یہ آیتیں پہاڑ پر پڑھ دے تو پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہے (قرطبی و مظہری)

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ یہاں اغفر اور ارحم دونوں کا مفعول ذکر نہیں کیا گیا کہ کیا معاف کریں اور کس چیز پر رحم کریں اس سے اشارہ عموم کی طرف ہے کہ دُعاءِ مغفرت شامل ہے ہر مضرّ اور تکلیف دہ چیز کے ازالہ کو اور دُعاءِ رحمت شامل ہے ہر مُراد اور محبوب چیز کے حاصل ہونے کو۔ کیونکہ دفع مضرت اور جلب منفعت جو انسانی زندگی اور اُسکے مقاصد کا خلاصہ ہیں دونوں اسمیں شامل ہوگئے (مظہری) اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دُعاءِ مغفرت و رحمت کی تلقین باوجودیکہ آپ معصوم اور مرحوم ہی ہیں دراصل اُمت کو سکھانے کیلئے ہے کہ تمہیں اس دُعا کا کتنا اہتمام کرنا چاہیئے (قرطبی)

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ، سورہ مؤمنون کی ابتدا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ سے ہوئی تھی اور انتہا لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ پر کی گئی، جس سے معلوم ہوا کہ فلاح یعنی مکمل کامیابی مومنین ہی کا حصہ ہے کفار اس سے محروم ہیں ؂

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ فِىْ ثَمَانِيَةِ اَيَّامٍ مِّنْ اَوَّلِ الْمُحَرَّمِ سَنَةَ ۱۳۹۱ وَذٰلِكَ فِىْ يَوْمِ عَاشُوْرَاءَ يَوْمِ الْاِثْنَيْنِ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلُهٗ وَاٰخِرُهٗ وَاِيَّاهُ اَسْاَلُ التَّوْفِيْقَ لِاِتْمَامِ الْبَاقِىْ كَمَا يُحِبُّ وَيَرْضَاهُ وَاَنْ يَّتَقَبَّلَ مِنِّىْ وَيَجْعَلَهٗ ذُخْرًا لِّاٰخِرَتِىْ وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ

سُوْرَۃُ النُّوْرِ

سُوْرَۃُ النُّوْرِ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ اَرْبَعٌ وَّسِتُّوْنَ اٰیَۃً وَّتِسْعُ رُکُوْعَاتٍ

سورۂ نور مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی چونسٹھ آیتیں اور نو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سُوْرَۃٌ اَنْزَلْنٰھَا وَفَرَضْنٰھَا وَاَنْزَلْنَا فِیْھَآ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّکُمْ

یہ ایک سورت ہے کہ ہم نے اُتاری اور ذمہ پر لازم کی اور اُتاریں اس میں باتیں صاف تاکہ تم

تَذَکَّرُوْنَ ① اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ

یاد رکھو بدکاری کرنے والی عورت اور مرد سو مارو ہر ایک کو دونوں میں سے سو سو

جَلْدَۃٍ وَّلَا تَاْخُذْکُمْ بِھِمَا رَاْفَۃٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ

دُرّے اور نہ آوے تم کو ان پر ترس اللہ کے حکم چلانے میں اگر تم یقین رکھتے ہو

بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْیَشْھَدْ عَذَابَھُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ②

اللہ پر اور پچھلے دن پر اور دیکھیں اُن کا مارنا کچھ لوگ مسلمان

سورۂ نور کی بعض خصوصیات اس سورت میں زیادہ تر احکام عفت کی حفاظت اور ستر و حجاب کے متعلق ہیں اور اُسی کی تکمیل کے لئے حدِ زنا کا بیان آیا۔ پچھلی سورت یعنی مؤمنون میں مسلمانوں کی فلاح دنیا و آخرت کو جن اوصاف پر موقوف رکھا گیا ہے اُن میں ایک اہم وصف شرمگاہوں کی حفاظت تھی جو خلاصہ ہے ابواب عفت کا۔ اس سورت میں عفت کے اہتمام کے لئے متعلقہ احکام ذکر کئے گئے ہیں، اسی لئے عورتوں کو اس سورت کی تعلیم کی خصوصی ہدایات آئی ہیں۔

حضرت فاروقِ اعظمؓ نے اہلِ کوفہ کے نام اپنے ایک فرمان میں تحریر فرمایا علموا نساءکم سُوْرَۃَ النُّوْرِ، یعنی اپنی عورتوں کو سورۂ نور کی تعلیم دو۔

خود اس سورت کی تمہید جن الفاظ سے کی گئی ہے کہ سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا، یہ بھی اس سورت کے خاص اہتمام کی طرف اشارہ ہے۔

خلاصۂ تفسیر

یہ ایک سورت ہے جس (کے الفاظ) کو (بھی) ہم (ہی) نے نازل کیا ہے اور اس (کے معانی یعنی احکام) کو (بھی) ہم (ہی) نے مقرر کیا ہے (خواہ وہ فرض و واجب ہوں یا مندوب و مستحب) اور ہم نے (ان احکام پر دلالت کرنے کے لئے) اس (سورت) میں صاف صاف آیتیں نازل کی ہیں تاکہ تم سمجھو (اور عمل کرو) زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد (دونوں کا حکم یہ ہے کہ) ان میں سے ہر ایک کے سو سو درے مارو اور تم لوگوں کو ان دونوں پر اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں ذرا رحم نہ آنا چاہیئے (کہ رحم کھا کر چھوڑ دو یا سزا میں کمی کر دو) اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور دونوں کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہیئے (تاکہ ان کی رُسوائی ہو اور دیکھنے سننے والوں کو عبرت ہو)۔

معارف و مسائل

اس سورت کی پہلی آیت تو بطور تمہید کے ہے جس سے اسکے احکام کا خاص اہتمام بیان کرنا مقصود ہے اور احکام میں سب سے پہلے زنا کی سزا کا ذکر جو مقصود سورت عفت اور اُس کے لئے نگاہوں تک کی حفاظت بغیر اجازت کسی کے گھر میں جانے اور نظر کرنے کی ممانعت کے احکام آگے آنیوالے ہیں زنا کا ارتکاب ان تمام احتیاطوں کو توڑ کر عفت کے خلاف انتہائی حد پر پہنچنا اور احکام الٰہیہ کی کھلی بغاوت ہے۔ اسی لئے اسلام میں انسانی جرائم پر جو سزائیں (حدود) قرآن میں متعین کر دی گئی ہیں زنا کی سزا بھی ان تمام جرائم کی سزا سے اشد اور زیادہ ہے زنا خود ایک بہت بڑا جرم ہونے کے علاوہ اپنے ساتھ سیکڑوں جرائم لیکر آتا ہے اور اُسکے نتائج پوری انسانیت کی تباہی ہے۔ دُنیا میں جتنے قتل و غارتگری کے واقعات پیش آتے ہیں تحقیق کی جائے تو ان میں بیشتر کا سبب کوئی عورت اور اُس سے حرام تعلق ہوتا ہے اس لئے شروع سورت میں اس انتہائی جرم و بے حیائی کا قلع قمع کرنے کے لئے اس کی حدِ شرعی بتلائی گئی ہے۔

زنا ایک جُرم عظیم اور بہت سے جرائم کا مجموعہ ہے اسلئے اسلام میں اُس کی سزا بھی سب سے بڑی رکھی گئی ہے

قرآن کریم اور احادیث متواترہ نے چار جرائم کی سزا اور اُسکا طریقہ خود متعین کر دیا ہے کسی قاضی یا امیر کی رائے پر نہیں چھوڑا انھیں متعینہ سزاؤں کو اصطلاح شرع میں حدود کہا جاتا ہے اُنکے علاوہ باقی جرائم کی سزا کو اس طرح متعین نہیں کیا گیا بلکہ امیر یا قاضی مجرم کی حالت اور جرم کی حیثیت اور

ماحول وغیرہ کے مجموعہ پر نظر کر کے جس قدر سزا دینے کو انسداد جرم کے لئے کافی سمجھے وہ سزا دے سکتا ہے ایسی سزاؤں کو شریعت کی اصطلاح میں تعزیرات کہا جاتا ہے۔ حدودِ شرعیہ پانچ ہیں۔ چوری۔ ڈاکہ۔ کسی پاکدامن عورت پر تہمت رکھنا۔ شراب پینا اور زنا کرنا۔[1] انہیں سے ہر جرم اپنی جگہ بڑا سخت اور دُنیا کے امن و امان کو برباد کرنے والا اور بہت سی خرابیوں کا مجموعہ ہے لیکن ان سب میں بھی زنا کے عواقب اور نتائج بد جیسے دُنیا کے نظام انسانیت کو تباہ و برباد کرنے والے ہیں وہ شاید کسی دوسرے جرم میں نہیں۔

(۱) کسی شخص کی بیٹی، بہن، بیوی پر ہاتھ ڈالنا اس کی ہلاکت کا مرادف ہے۔ شریف انسان کو سارا مال و جائداد اور اپنا سب کچھ قربان کر دینا اتنا مشکل نہیں جتنا اپنے حرم کی عفت پر ہاتھ ڈالنا۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں روزمرہ یہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ جن لوگوں کے حرم پر ہاتھ ڈالا گیا ہے وہ اپنی جان کی پروا کئے بغیر زانی کے قتل و فنا کے درپے ہوتے ہیں اور یہ جوش انتقام نسلوں میں چلتا ہے اور خاندانوں کو تباہ کر دیتا ہے۔

(۲) جس قوم میں زنا عام ہو جائے وہاں کسی کا نسب محفوظ نہیں رہتا۔ ماں بہن بیٹی وغیرہ جن سے نکاح حرام ہے جب یہ رشتے بھی غائب ہو گئے تو اپنی بیٹی اور بہن بھی نکاح میں آسکتی ہے جو زنا سے بھی زیادہ اشد جرم ہے۔

(۳) غور کیا جائے تو دُنیا میں جہاں کہیں بدامنی اور فتنہ و فساد ہوتا ہے اسکا بیشتر سبب عورت اور اُس سے کم مال ہوتا ہے۔ جو قانون عورت اور دولت کی حفاظت صحیح انداز میں کر سکے ان کو انکے مقررہ حدود سے باہر نہ نکلنے دے وہ ہی قانون امنِ عالم کا ضامن ہو سکتا ہے۔ یہ جگہ زنا کے تمام مفاسد اور خرابیاں جمع کرنے اور تفصیل سے بیان کرنے کی نہیں۔ انسانی معاشرہ کے لئے اسکی تباہ کاری معلوم ہونے کے لئے اتنا بھی کافی ہے اسی لئے اسلام نے زنا کی سزا کو دوسرے سارے جرائم کی سزاؤں سے اشد قرار دیا ہے۔ وہ سزا آیتِ مذکورہ میں اسطرح بیان کی گئی ہے اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۔ اسمیں عورت زانیہ کا ذکر پہلے اور مرد زانی کا بعد میں لایا گیا ہے سزا دونوں کی ایک ہی ہے عام قیاس بیان احکام کا یہ ہے کہ اکثر تو صرف مَردوں کو مخاطب کر کے حکم دیدیا جاتا ہے عورتیں بھی اسمیں ضمناً شامل ہوتی ہیں اُن کا علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ سارے قرآن میں يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا کے صیغہ مذکر سے جو احکام بیان کئے گئے ہیں عورتیں بھی اُس میں بغیر ذکر شامل قرار دی گئی ہیں۔ شاید حکمت اس کی یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو مستور رہنے کا حکم دیا ہے اُن کے ذکر کو بھی ذکر رجال کے ضمن میں مستور کر کے بیان کیا گیا ہے اور چونکہ اس طرز سے یہ احتمال تھا کہ کسی کو یہ شبہ ہو جائے کہ یہ سب احکام مَردوں ہی کے لئے ہیں عورتیں ان سے سبکدوش ہیں اسلئے خاص خاص آیات میں مستقلاً عورتوں کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے اَقِمْنَ

[1] ارتداد کی سزا کو ملا کر اکثر فقہاء نے حدود کی تعداد چھ بیان کی ہے۔ محمد تقی عثمانی ۳/۷/۱۴۲۶ھ

الصَّلٰوۃَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوۃَ اور جہاں مرد و عورت دونوں ہی کا ذکر کرنا ہوتا ہے تو ترتیب طبعی یہ ہوتی ہے کہ مرد کا ذکر مقدم عورت کا بعد میں ہوتا ہے۔ چوری کی سزا میں اسی ضابطہ عرفیہ کے مطابق اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا فرمایا ہے جس میں مرد چور کو مقدم اور عورت کو مؤخر ذکر کیا ہے مگر سزائے زنا میں اوّل تو عورت کے ذکر کے ضمنی آجانے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ صراحۃً ذکر مناسب سمجھا گیا دوسرے عورت کا ذکر مرد پر مقدم کر کے بیان کیا گیا۔ اسمیں بہت سی حکمتیں ہیں اوّل تو عورت ضعیف الخلقۃ اور طبعی طور پر قابلِ رحم سمجھی جاتی ہے اگر اسکا صراحۃً ذکر نہ ہوتا تو کسی کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید عورت اس سزا سے مستثنیٰ ہے۔ اور عورت کا ذکر مقدم اس لئے کیا گیا کہ فعل زنا ایک ایسی بے حیائی ہے جسکا صدور عورت کیطرف سے ہونا انتہائی بیباکی اور بے پروائی سے ہو سکتا ہے کیونکہ قدرت نے اس کے مزاج میں فطری طور پر ایک حیا، اور اپنی عفت کی حفاظت کا جذبہ قویہ ودیعت فرمایا ہے اور اُسکی حفاظت کے لئے بڑے سامان جمع فرمائے ہیں اُس کی طرف سے اس فعل کا صدور بہ نسبت مرد کے زیادہ اشد ہے بخلاف چور کے کہ مرد کو اللہ تعالیٰ نے کسب اور کمائی کی قوت دی ہے۔ اپنی ضروریات اپنے عمل سے حاصل کرنے کے مواقع اسکے لئے فراہم کئے ہیں یہ کہ اُن کو چھوڑ کر چوری کرنے پر اُتر آئے یہ مرد کے لئے بڑا عار اور عیب ہے۔ عورت کے چونکہ یہ حالات نہیں ہیں اگر اُس سے چوری کا صدور ہو جائے تو مرد کی نسبت سے اہون اور کم درجہ ہے۔

فَاجْلِدُوْا لفظ جَلْد کوڑا مارنے کے معنے میں آتا ہے وہ جِلْد سے مشتق ہے کیونکہ کوڑا عموماً چمڑے سے بنایا جاتا ہے۔ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ لفظ جَلْد سے تعبیر کرنے میں اسطرف اشارہ ہے کہ یہ کوڑوں یا دُرّوں کی ضرب اس حد تک رہنی چاہیئے کہ اسکا اثر انسان کی کھال تک رہے گوشت تک نہ پہنچے۔ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کوڑے لگانے کی سزا میں اسی توسط و اعتدال کی تلقین عملاً فرمائی ہے کہ کوڑا نہ بہت سخت ہو جس سے گوشت تک اُدھڑ جائے اور نہ بہت نرم ہو کہ اُس سے کوئی خاص تکلیف ہی نہ پہنچے اس جگہ اکثر حضرات مفسرین نے یہ روایاتِ حدیث سند اور الفاظ کیساتھ لکھی ہیں

سو کوڑوں کی مذکورہ سزا صرف غیر شادی شدہ مرد و عورت کیلئے مخصوص ہے شادی شدہ لوگوں کی سزا سنگساری ہے

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ زنا کی سزا کے احکام بتدریج آئے ہیں اور خفّت سے شدت کی طرف بڑھتے گئے ہیں جیسے شراب کی حُرمت میں بھی اسی طرح کی تدریج خود قرآن میں مذکور ہے جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے زنا کی سزا کا سب سے پہلا حکم تو وہ تھا جو سُورۂ نساء کی آیات نمبر ۱۵، ۱۶ میں مذکور ہے وہ یہ ہے:

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِکُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ

اور جو کوئی بدکاری کرے تمھاری عورتوں میں سے تو گواہ لاؤ اُن پر چار مرد اپنوں میں سے پھر اگر وہ گواہی دیدیں تو بند رکھو ان عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ اُٹھالے ان کو

أَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيلًا ○ وَالَّذٰنِ يَأْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَآذُوهُمَا فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا إِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ○ (سورۂ نساء)

موت یا مقرر کرے اللہ تعالیٰ اُن کے لئے کوئی راہ۔ اور جو مرد کریں تم میں سے وہی بدکاری تو اُن کو ایذا دو پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کریں تو ان کا خیال چھوڑ دو۔ بیشک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

اِن دونوں آیتوں کی مکمل تفسیر اور ضروری بیان سورۂ نساء میں آچکا ہے۔ یہاں اس لئے اسکا اعادہ کیا گیا ہے کہ زنا کی سزا کا ابتدائی دَور سامنے آجائے۔ اِن آیتوں میں ایک تو ثبوتِ زنا کا خاص طریقہ چار مَردوں کی شہادت کے ساتھ ہونا بیان فرمایا ہے۔ دوسرے زنا کی سزا عورت کے لئے گھر میں قید رکھنا اور دونوں کے لئے ایذا پہنچانا مذکور ہے اور ساتھ اسمیں یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ سزائے زنا کا یہ حکم آخری نہیں آئندہ اور کچھ حکم آنیوالا ہے أَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيلًا کا یہی مفہوم ہے۔

مذکورہ سزا میں عورتوں کو گھر میں قید رکھنا اُسوقت کافی قرار دیا گیا اور دونوں کو ایذا دینے کی سزا کافی قرار دی گئی مگر اس ایذا اور تکلیف کی کوئی خاص صورت خاص مقدار اور حد بیان نہیں فرمائی بلکہ الفاظِ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا کی ابتدائی سزا صرف تعزیری تھی جس کی مقدار شریعت سے متعین نہیں ہوئی بلکہ قاضی یا امیر کی صوابدید پر موقوف تھی اسی لئے ایذا دینے کا مبہم لفظ اختیار فرمایا گیا مگر ساتھ ہی أَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيلًا فرماکر اس طرف اشارہ کر دیا کہ یہ ہوسکتا ہے کہ آئندہ ان مجرموں کے لئے سزا کا کوئی اور طریقہ جاری کیا جائے۔ جب سُورۂ نور کی آیتِ مذکورہ نازل ہوئی تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ سُورۂ نساء میں جو وعدہ کیا گیا تھا أَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيلًا یعنی یہ کہ یا اللہ تعالیٰ انکے لئے کوئی اور سبیل بتا دے تو سُورۂ نورؔ کی اس آیت نے وہ سبیل بتلا دی یعنی سو کوڑے مارنے کی سزا عورت مرد دونوں کیلئے متعین فرمادی۔ اسکے ساتھ ہی حضرت ابن عباسؓ نے سو کوڑے مارنے کی سزا کو غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لئے مخصوص قرار دے کر فرمایا۔

یعنی الرجم للثیب والجلد للبکر (صحیح بخاری کتاب التفسیر صفحہ ۶۵۷)

یعنی وہ سبیل اور سزائے زنا کی تعیین یہ ہے کہ شادی شدہ مرد و عورت سے یہ گناہ سرزد ہو تو اُن کو سنگسار کر کے ختم کیا جائے اور غیر شادی شدہ کے سو کوڑے مارنا سزا ہے۔

ظاہر ہے کہ سُورۂ نور کی مذکورہ آیت میں تو بغیر کسی تفصیل کے سزائے زنا سو کوڑے ہونا مذکور ہے۔ اس حکم کا غیر شادی شدہ مرد و عورت کے ساتھ مخصوص ہونا اور شادی شدہ کے لئے رجم یعنی سنگساری کی سزا ہونا اُن کو کسی دوسری دلیل حدیث سے معلوم ہوا ہوگا اور وہ حدیث صحیح مسلم، مسند احمد سنن نسائی، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت عبادہ ابن صامتؓ کی روایت سے اس طرح آئی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

خذوا عنی خذوا عنی قد جعل اللہ لھن سبیلاً البکر بالبکر جلد مائۃ وتغریب عام والثیب بالثیب جلد مائۃ والرجم۔ (ابن کثیر)

مجھ سے علم حاصل کرو مجھ سے علم حاصل کرو کہ اللہ تعالیٰ نے زانی مرد و عورت کے لئے وہ سبیل جسکا وعدہ سورۂ نساء کی آیت میں ہوا تھا اب سورۂ نور میں فرمادی ہے وہ یہ ہے کہ غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لئے سو کوڑے اور سال بھر جلا وطنی اور شادی شدہ مرد و عورت کے لئے سو کوڑے اور سنگساری۔

غیر شادی شدہ مرد و عورت کی سزا سو کوڑے جو آیتِ نور میں مذکور ہے اس حدیث میں اُس کے ساتھ ایک مزید سزا کا ذکر ہے کہ مرد کو سال بھر کے لئے جلا وطن بھی کر دیا جائے اسمیں فقہاء کا اختلاف ہے کہ یہ سال بھر کی جلا وطنی کی سزا مردِ زانی کو سو کوڑوں کی طرح لازمی ہے یا قاضی کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ ضرورت سمجھے تو سال بھر کے لئے جلا وطن بھی کر دے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رح کے نزدیک یہی آخری صُورت صحیح ہے یعنی حاکم کی رائے پر موقوف ہے۔ دوسری بات اس حدیث میں یہ ہے کہ شادی شدہ مرد و عورت کے لئے سنگساری سے پہلے سو کوڑوں کی سزا بھی ہے مگر دوسری روایاتِ حدیث۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اکثر خلفاء راشدین رض کے تعامل سے ثابت یہ ہے کہ یہ دونوں سزائیں جمع نہیں ہوں گی۔ شادی شُدہ پر صرف سزائے سنگساری جاری کی جائے گی۔ اس حدیث میں خاص طور پر یہ بات قابلِ نظر ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا کی تفسیر فرمائی ہے۔ اور تفسیر میں جو بات سُورۂ نور کی آیت میں مذکور ہے یعنی سو کوڑے لگانا۔ اس پر کچھ مزید چیزوں کا اضافہ بھی ہے اوّل سو کوڑے کی سزا کا غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لئے مخصوص ہونا، دوسرے سال بھر کی جلا وطنی کا اضافہ تیسرے شادی شدہ مرد و عورت کے لئے رجم و سنگساری کا حکم۔ ظاہر ہے کہ اسمیں سُورۂ نور کی آیت پر جن چیزوں کی زیادتی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی وہ بھی وحی الٰہی اور حکم ربانی ہی سے تھی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی، اور پیغمبر اور اُن سے براہ راست سُننے والوں کے حق میں وہ وحی جو بصورت قرآن تلاوت کی جاتی ہے اور وہ وحی جس کی تلاوت نہیں ہوتی دونوں برابر ہیں۔ خود رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کے مجمع عام کے سامنے اس پر عمل فرمایا۔ ماعز اور غامدیہ پر سزائے رجم و سنگساری جاری فرمائی۔ جو تمام کتب حدیث میں اسانید صحیحہ کیساتھ مذکور ہے اور حضرتِ ابوہریرہ رض اور زید بن خالد جہنی رض کی روایت صحیحین میں ہے کہ ایک غیر شادی شدہ مرد نے جو ایک شادی شدہ عورت کا ملازم تھا اس کیساتھ زنا کیا۔ زانی لڑکے کا باپ اس کو لیکر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ واقعہ اقرار سے ثابت ہو گیا تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لاقضین بینکما بکتاب اللہ، یعنی میں تم دونوں کے معاملہ کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کرونگا۔ پھر یہ حکم صادر فرمایا کہ زانی لڑکا جو غیر شادی شدہ تھا اسکو

سو کوڑے لگائے جاویں اور عورت شادی شدہ تھی اُس کو رجم و سنگسار کرنے کے لئے حضرت اُنیس رضؓ کو حکم فرمایا انھوں نے خود عورت سے بیان لیا اُس نے اعتراف کر لیا تو اس پر بحکم نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم رجم و سنگساری کی سزا جاری ہوئی (ابن کثیر)

اس حدیث میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک کو سو کوڑے لگانے کی دوسرے کو سنگسار کرنے کی سزا دی اور دونوں سزاؤں کو قضاء بکتاب اللہ فرمایا، حالانکہ آیت سورۂ نور میں صرف کوڑوں کی سزا کا ذکر ہے، سنگساری کی سزا مذکور نہیں۔ وجہ وہی ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جو اس آیت کی مکمل تفسیر و تشریح اور تفصیلی حکم بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا تھا وہ سارا کتاب اللہ ہی کے حکم میں ہے گو اسمیں سے بعض حصہ کتاب اللہ میں مذکور اور متلو نہیں۔ صحیح بخاری و مسلم وغیرہ کتب حدیث میں حضرت فاروق اعظم رضؓ کا خطبہ بروایت ابن عباسؓ مذکور ہے صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں۔

قال عمر بن خطابؓ وھو جالس علی منبر رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم ان اللّٰہ بعث محمدا صلے اللّٰہ علیہ وسلم بالحق وانزل علیہ الکتاب فکان مما انزل اللّٰہ علیہ اٰیۃ الرجم قرأناھا ووعیناھا وعقلناھا فرجم رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم ورجمنا بعدہ فاخشی ان طال بالناس زمان ان یقول قائل ما نجد الرجم فی کتاب اللّٰہ تعالٰی فیضلوا بترک فریضۃ انزلھا اللّٰہ وان الرجم فی کتاب اللّٰہ حق علی من زنا اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینۃ او کان الحبل والاعتراف (مسلم ص ۶۵ ج ۲)

حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا جبکہ وہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر تشریف رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو حق کیساتھ بھیجا اور آپ پر کتاب نازل فرمائی تو جو کچھ کتاب اللہ میں آپ پر نازل ہوا اسمیں آیت رجم بھی ہے جس کو ہم نے پڑھا، یاد کیا اور سمجھا، پھر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی رجم کیا اور ہم نے آپکے بعد رجم کیا، اب مجھے یہ خطرہ ہے کہ زمانہ گزرنے پر کوئی یُوں نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کا حکم کتاب اللہ میں نہیں پاتے تو وہ ایک دینی فریضہ چھوڑ دینے سے گمراہ ہو جاویں جو اللہ نے نازل کیا ہے اور سمجھ لو کہ رجم کا حکم کتاب اللہ میں حق ہے اُس شخص پر جو مردوں اور عورتوں میں سے محصن ہو یعنی شادی شدہ جبکہ اسکے زنا پر شرعی شہادت قائم ہو جائے یا حمل اور اعتراف پایا جائے۔

یہ روایت صحیح بخاری میں بھی زیادہ تفصیل کیساتھ مذکور ہے (بخاری ص ۱۰۰۹ جلد ۲) اور نسائی میں اس روایت کے بعض الفاظ یہ ہیں۔

انا لا نجد من الرجم بدا فانہ حد من حدود اللّٰہ الا وان رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم قد رجم ورجمنا بعدہ ولولا ان یقولوا ان عمر زاد فی کتاب اللّٰہ ما لیس فیہ لکتبت

زنا کی سزا میں ہم شرعی حیثیت سے رجم کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ وہ اللہ کی حدود میں سے ایک حد ہے خوب سمجھ لو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود رجم کیا اور ہم نے آپ کے بعد بھی رجم کیا۔ اور اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ کہنے والے کہیں گے

فی ناحیۃ المصحف وشھد عمر بن الخطاب وعبد الرحمٰن بن عوف وفلان و فلان ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم رجم و رجمنا بعدہ الحدیث (ابن کثیر)

کہ عمر نے کتاب اللہ میں اپنی طرف سے کچھ بڑھا دیا ہے تو میں قرآن کے کسی گوشہ میں بھی اسکو لکھ دیتا۔ اور عمر بن خطاب گواہ ہے عبد الرحمٰن بن عوف گواہ ہیں اور فلاں فلاں صحابہ گواہ ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور آپکے بعد ہم نے رجم کیا۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس خطبہ سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حکم رجم کی کوئی مستقل آیت ہے جو سُورۂ نور کی آیتِ مذکورہ کے علاوہ ہے مگر حضرت فاروق اعظمؓ نے اُس آیت کے الفاظ نہیں بتلائے کہ کیا تھے۔ اور نہ یہ فرمایا کہ اگر وہ اس آیتِ نور کے علاوہ کوئی مستقل آیت ہے تو قرآن میں کیوں نہیں اور کیوں اس کی تلاوت نہیں کیجاتی۔ صرف اتنا فرمایا کہ اگر مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ لوگ مجھ پر کتاب اللہ میں زیادتی کا الزام لگائیں گے تو میں اس آیت کو قرآن کے حاشیہ پر لکھدیتا۔ کما رواہ النسائی

اس روایت میں یہ بات قابل غور ہے کہ اگر وہ واقعی قرآن کی کوئی آیت ہے اور دوسری آیات کی طرح اُس کی تلاوت واجب ہے تو فاروق اعظمؓ نے لوگوں کی بدگوئی کے خوف سے اُس کو کیسے چھوڑ دیا جبکہ اُن کی شدت فی امر اللہ معروف و مشہور ہے اور یہ بھی قابل غور ہے کہ خود حضرت فاروقؓ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اس آیت کو قرآن میں داخل کر دیتا بلکہ ارشاد یہ فرمایا کہ میں اسکو قرآن کے حاشیہ پر لکھدیتا۔

یہ سب اُمور اس کے قرائن ہیں کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے سُورۂ نور کی آیتِ مذکورہ کی جو تفسیر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنی جسمیں آپ نے سو کوڑے لگانے کے حکم کو غیر شادی شدہ مرد و عورت کے ساتھ مخصوص فرمایا اور شادی شدہ کے لئے رجم کا حکم دیا۔ اس مجموعی تفسیر کو اور پھر اُس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تعامل کو کتاب اللہ اور آیتِ کتاب اللہ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا اس معنی میں کہ آپکی یہ تفسیر و تفصیل بحکم کتاب اللہ ہے وہ کوئی مستقل آیت نہیں ورنہ حضرت فاروق اعظمؓ کو کوئی طاقت اس سے نہ روک سکتی کہ قرآن کی جو آیت رہ گئی ہے اس کو اسکی جگہ لکھدیں۔ حاشیہ پر لکھنے کا جو ارادہ ظاہر فرمایا وہ بھی اسی کی دلیل ہے کہ درحقیقت وہ کوئی مستقل آیت نہیں بلکہ آیت سورۂ نور ہی کی تشریح میں کچھ تفصیلات ہیں۔ اور بعض روایات میں جو اس جگہ ایک مستقل آیت کے الفاظ مذکور ہیں وہ اسناد و ثبوت کے اعتبار سے اس درجہ میں نہیں کہ اُس کی بنا پر قرآن میں اسکا اضافہ کیا جاسکے۔ حضرات فقہاء نے جو اسکو منسوخ التلاوۃ غیر منسوخ الحکم کی مثال میں پیش کیا ہے وہ مثال ہی کی حیثیت میں ہے اُس سے درحقیقت اسکا آیت قرآن ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سورۂ نور کی آیت مذکورہ میں جو زانیہ اور زانی کی سزا سو کوڑے لگانا مذکور ہے یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مکمل تشریح و تصریح کی بنا پر غیر شادی شدہ لوگوں کے لئے مخصوص ہے

اور شادی شدہ کی سزا رجم ہے یہ تفصیل اگرچہ الفاظ آیت میں مذکور نہیں مگر جس ذات اقدس پر یہ آیت نازل ہوئی خود اُن کی طرف سے ناقابلِ التباس وضاحت کیساتھ یہ تفصیل مذکور ہے اور صرف زبانی تعلیم و ارشاد ہی نہیں بلکہ متعدد بار اس تفصیل پر عمل بھی صحابہ کرام کے مجمع کے سامنے ثابت ہے اور یہ ثبوت ہم تک تواتر کے ذریعہ پہنچا ہوا ہے اس لئے شادی شدہ مرد و عورت پر سزائے رجم کا حکم درحقیقت کتاب اللہ ہی کا حکم اور اُسی ... کی طرح قطعی اور یقینی ہے اس کو یُوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ سزائے رجم کتاب اللہ کا حکم ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سزائے رجم سنتِ متواترہ سے قطعی الثبوت ہے جیسا کہ حضرت علی رضہ سے یہی الفاظ منقول ہیں کہ رجم کا حکم سُنّت سے ثابت ہے اور حاصل دونوں کا ایک ہی ہے

ایک ضروری تنبیہ | اس مقام پر جہاں جہاں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے الفاظ احقر نے لکھے ہیں ان الفاظ کو ایک آسان تعبیر کی حیثیت سے لکھا گیا ہے۔ اصلی الفاظ محصن اور غیر محصن، یا ثیّب اور بکر کے حدیث میں آئے ہیں۔ اور محصن کی شرعی تعریف اصل میں یہ ہے کہ جس شخص نے نکاح صحیح کیساتھ اپنی زوجہ سے مباشرت کرلی ہو اور وہ عاقل بھی ہو۔ مراد احکام میں سب جگہ یہی مفہوم ہے تعبیر کی سہولت کے لئے شادی شدہ کا لفظ لکھا جاتا ہے۔

سزائے زنا میں تدریج کے تین درجے | مذکورہ بالا روایاتِ حدیث اور آیاتِ قرآن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً زنا کی سزا ہلکی رکھی گئی کہ قاضی یا امیر اپنی صوابدید پر اس جُرم کے مرتکب مرد و عورت کو ایذا پہنچائے، اور عورت کو گھر میں مقید رکھا جائے، جیسا کہ سُورۂ نساء میں اسکا حکم آیا ہے۔ دوسرا دَور وہ ہے جسکا حکم سُورۂ نور کی اس آیت میں آیا ہے کہ دونوں کو سو سو کوڑے لگائے جاویں تیسرا درجہ وہ ہے جو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے آیتِ مذکورہ نازل ہونے کے بعد ارشاد فرمایا کہ سو کوڑوں کی سزا پر اُن لوگوں کے لئے اکتفا کیا جائے جو شادی شدہ نہ ہوں اور شادی شدہ مرد و عورت اس کے مرتکب ہوں تو اُن کی سزا رجم و سنگساری ہے۔

اسلامی قانون میں جس جرم کی سزا سخت ہے اسکے ثبوت کے لئے شرائط بھی سخت رکھی گئی ہیں | جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ زنا کی سزا اسلام میں سب جرائم کی سزاؤں سے زیادہ سخت ہے۔ اس کے ساتھ اسلامی قانون میں اُس کے ثبوت کے لئے شرائط بھی بہت سخت رکھی گئی ہیں جن میں ذرا بھی کمی رہے یا شبہ پیدا ہو جائے تو زنا کی انتہائی سزا جس کو حد کہا جاتا ہے وہ معاف ہو جاتی ہے صرف تعزیری سزا بقدرِ جُرم باقی رہ جاتی ہے۔ تمام معاملات میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت ثبوت کے لئے کافی ہو جاتی ہے مگر حدِ زنا جاری کرنے کے لئے چار مرد گواہوں کی عینی شہادت جس میں کوئی التباس نہ ہو شرط ضروری ہے جیسا کہ سُورۂ نساء کی آیت میں گزر چکا ہے۔ دوسری احتیاط اور شدت اس شہادت میں یہ ہے کہ اگر شہادت زنا کی کوئی شرط مفقود ہونے کی بنا پر شہادت رَد کی گئی تو

پھر شہادت دینے والوں کی خیر نہیں۔ اُن پر قذف یعنی زنا کی جھوٹی تہمت کا جُرم قائم ہو کر حدِ قذف اَسّی کوڑے لگائے جانے کی صورت میں جاری کیجاتی ہے۔ اس لئے ذرا سا شبہ ہونے کی صورتمیں کوئی شخص اس کی شہادت پر اقدام نہیں کرسکتا۔ البتہ جس صورت میں صریح زنا کا ثبوت نہ ہو مگر شہادت سے دو مرد و عورت کا غیر مشروع حالت میں دیکھنا ثابت ہو جائے تو قاضی اُن کے جرم کی حیثیت کے مطابق تعزیری سزا کوڑے لگانے وغیرہ کی جاری کرسکتا ہے۔ سزائے زنا اور اس کی شرائط وغیرہ کے مفصل احکام کتب فقہ میں مذکور ہیں وہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔

کسی مرد یا جانور کے ساتھ فعل قبیح کا حکم یہ مسئلہ کہ کوئی مرد کسی مرد کے ساتھ یا جانور کے ساتھ یہ فعل کرے تو وہ زنا میں داخل ہے یا نہیں اور اُس کی سزا بھی سزائے زنا ہے یا کچھ اور، اس کی تفصیل سُورۂ نِسار کی تفسیر میں گزر چکی ہے کہ اگرچہ لُغت اور اصطلاح میں یہ فعل زِنا نہیں کہلاتا اور اسی لئے اس پر حدِ زنا کا اطلاق نہیں ہوتا مگر اس کی سزا بھی اپنی سختی میں زنا کی سزا سے کم نہیں۔ صحابۂ کرام نے ایسے شخص کو زندہ جلادینے کی سزا دی ہے۔

لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ، سزائے زنا چونکہ بہت سخت ہے اور اس کا احتمال ہے کہ سزا جاری کرنیوالوں کو ان پر رحم آجائے سزا کو چھوڑ بیٹھیں یا کم کردیں اس لئے اس کے ساتھ یہ حکم بھی دیا گیا کہ دین کے اس اہم فریضہ کی ادائیگی میں مجرموں پر رحم اور ترس کھانا جائز نہیں۔ رافت و رحمت اور عفو و کرم ہر جگہ محمود ہے مگر مجرموں پر رحم کھانے کا نتیجہ ساری خلقِ خدا کے ساتھ بے رحمی ہے اس لئے ممنوع و ناجائز ہے۔

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ، یعنی سزائے زنا جاری کرنے کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہیئے۔ اسلام میں سب سزاؤں اور خصوصاً حدود کو منظرِ عام پر جاری کردینے کا طریقہ رائج ہے تاکہ دیکھنے والوں کو عبرت ہو مگر ایک جماعت کو اسمیں حاضر و موجود رہنے کا حکم یہ بھی سزائے زنا کی خصوصیت ہے۔

اسلام میں ابتداءً جرائم کی پردہ پوشی کا حکم ہے لیکن جب معاملہ شہادت سے ثابت ہوجائے تو پھر مجرموں کی پوری رُسوائی بھی عین حکمت قرار دی گئی ہے فواحش اور بے حیائی کی روک تھام کے لئے شریعتِ اسلام نے دُور دُور تک پہرے بٹھائے ہیں عورتوں پر پردہ لازم کردیا گیا۔ مردوں کو نظر نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا۔ زیور کی آواز یا عورت کے گانے کی آواز کو ممنوع قرار دیا گیا کہ وہ بے حیائی کے لئے محرک ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جس شخص سے ان معاملات میں کوتاہی دیکھی جائے اسکو خلوت میں تو سمجھانے کا حکم ہے مگر اس کو رُسوا کرنے کی اجازت نہیں۔ لیکن جو شخص ان تمام شرعی احتیاطوں کو توڑ کر اس درجہ میں پہنچ گیا کہ اسکا جُرم شرعی شہادت سے ثابت ہوگیا تو اب اسکی پردہ پوشی دوسرے لوگوں کی جرأت بڑھانے

کا موجب ہوسکتی ہے اسلئے ابتک جتنا اہتمام پردہ پوشی کا شریعت نے کیا تھا اب اتنا ہی اہتمام اسکی تفضیح اور رسوائی کا کیا جاتا ہے اسی لئے زنا کی سزا کو صرف منظر عام پر جاری کرنے پر کفایت نہیں فرمائی بلکہ مسلمانوں کی ایک جماعت کو اسمیں حاضر اور شریک رہنے کا حکم دیا گیا۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً ز وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُهَآ اِلَّا

بدکار مرد نہیں نکاح کرتا مگر عورت بدکار سے یا شرک والی سے اور بدکار عورت سے نکاح نہیں کرتا مگر

زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ ج وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۳﴾

بدکار مرد یا مشرک اور یہ حرام ہوا ہے ایمان والوں پر

خلاصۂ تفسیر

(زنا ایسی گندی چیز ہے کہ اس سے انسان کی طبیعت کا مزاج ہی بگڑ جاتا ہے اُس کی رغبت بُری ہی چیزوں کی طرف ہو جاتی ہے ایسے آدمی کیطرف رغبت بھی کسی ایسے ہی خبیث النفس کی ہوسکتی ہے جسکا اخلاقی مزاج بگڑ چکا ہو چنانچہ زانی (اپنے زانی اور راغب الی الزنا ہونیکی حیثیت سے) نکاح بھی کسی کے ساتھ نہیں کرتا بجز زانیہ یا مشرکہ عورت کے اور (اسی طرح) زانیہ کے ساتھ بھی (اُس کے زانیہ اور راغب الی الزنا ہونے کی حیثیت سے) اور کوئی نکاح نہیں کرتا بجز زانی یا مُشرک کے اور یہ (ایسا نکاح جو زانیہ کے زانیہ ہونے کی حیثیت کیساتھ ہو جسکا نتیجہ آئندہ بھی اسکا مبتلائے زنا رہنا ہے یا کسی مشرک عورت کیساتھ ہو) مسلمانوں پر حرام (اور موجب گناہ) کیا گیا ہے (گو صحت و عدم صحت میں دونوں میں فرق ہو کہ زانیہ بحیثیت زانیہ سے کوئی نکاح کر ہی لے تو گناہ ہونے کے باوجود نکاح منعقد اور صحیح ہو جاویگا اور مشرکہ سے نکاح کیا تو ناجائز و گناہ ہونے کے علاوہ وہ نکاح ہی نہیں ہوگا بلکہ باطل ہوگا)۔

معارف و مسائل

زنا کے متعلق دوسرا حکم پہلا حکم سزائے زنا کا تھا جو اس سے پہلی آیت میں بیان ہو چکا، یہ دوسرا حکم زانی اور زانیہ کے ساتھ نکاح کرنے سے متعلق ہے اسکے ساتھ مشرک مرد یا مشرک عورت سے نکاح کا بھی حکم ذکر کیا گیا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں ائمہ تفسیر کے اقوال بہت مختلف ہیں ان سب میں سہل اور اسلم تفسیر وہی معلوم ہوتی ہے جسکو خلاصۂ تفسیر میں بین القوسین کی وضاحتوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ خلاصہ اسکا یہ ہے کہ آیت کا شروع حصہ کوئی حکم شرعی نہیں بلکہ ایک عام مشاہدہ اور تجربہ کا بیان ہے

جسمیں زنا کا فعلِ خبیث ہونا اور اسکے اثرات کی دُور رس مضرتوں کا ذکر ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ زنا ایک اخلاقی زہر ہے اسکے زہریلے اثرات سے انسان کا اخلاقی مزاج ہی بگڑ جاتا ہے اُسے بھلے بُرے کی تمیز نہیں رہتی بلکہ بُرائی اور خباثت ہی مرغوب ہو جاتی ہے حلال حرام کی بحث نہیں رہتی۔ اور جو عورت اُس کو پسند آتی ہے اسکا اصلی مقصود اس سے زنا کرنا اور اسکو زناکاری پر راضی کرنا ہوتا ہے اگر زنا کے ارادے میں ناکام ہو جاوے تو مجبوری سے نکاح پر راضی ہوتا ہے مگر نکاح کو دل سے پسند نہیں کرتا کیونکہ نکاح کے جو مقاصد ہیں کہ آدمی عفیف ہو کر رہے اور اولاد صالح پیدا کرے اور اسکے لئے بیوی کے حقوق نفقہ وغیرہ کا ہمیشہ کے لئے پابند ہو جاوے یہ ایسے شخص کو وبال معلوم ہوتے ہیں اور چونکہ ایسے شخص کو درصل نکاح سے کوئی غرض ہی نہیں اسلئے اسکی رغبت صرف مسلمان عورتوں ہی کی طرف نہیں بلکہ مشرک عورتوں کیطرف بھی ہوتی ہے اور مشرک عورت اگر اپنے مذہب کی وجہ سے یا کسی برادری کی رسم کی وجہ سے نکاح کی شرط لگالے تو مجبوراً وہ اُس سے نکاح پر بھی تیار ہو جاتا ہے اس کی اسکو کچھ بحث ہی نہیں کہ یہ نکاح حلال اور صحیح ہوگا یا شرعاً باطل ٹھہرے گا۔ اس لئے اس پر یہ بات صادق آگئی کہ اس کی جس عورت کیطرف اصلی رغبت ہوگی اگر وہ مسلمان ہے تو زانیہ کیطرف رغبت ہوگی خواہ پہلے سے زنا کی عادی ہو یا اسی کے ساتھ زنا کرکے زانیہ کہلائے یا پھر کسی مشرک عورت کیطرف رغبت ہوگی جس کے ساتھ نکاح بھی زنا ہی کے حکم میں ہے یہ معنی ہوئے آیت کے پہلے جملہ کے یعنی اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً۔

اسی طرح جو عورت زنا کی خوگر ہو اور اس سے توبہ نہیں کرتی تو سچے مؤمن مسلمان جنکا مقصود اصلی نکاح اور نکاح کے شرعی فوائد و مقاصد ہیں وہ ایسی عورت سے متوقع نہیں اسلئے ان کو ایسی عورت کی طرف اصلی رغبت نہیں ہو سکتی خصوصاً جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ یہ عورت نکاح کے بعد بھی اپنی بُری عادتِ زنا نہ چھوڑے گی۔ ہاں ایسی عورت کی طرف رغبت یا تو زانی کو ہوگی جسکا اصلی مقصد اپنی خواہش پوری کرنا ہے نکاح مقصود نہیں۔ اسمیں اگر وہ زانیہ کسی اپنی دُنیوی مصلحت سے اس کے ساتھ ملنے کے لئے نکاح کی شرط لگا دے تو بادلِ ناخواستہ نکاح کو بھی گوارا کر لیتا ہے یا پھر ایسی عورت کے نکاح پر وہ شخص راضی ہوتا ہے جو مشرک ہو۔ اور چونکہ مشرک سے نکاح بھی شرعاً زنا ہی ہے اس لئے اسمیں دو چیزیں جمع ہو گئیں کہ مشرک بھی ہے اور زانی بھی۔ یہ معنے ہیں آیت کے دوسرے جملے کے یعنی وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ۔

مذکورہ تفسیر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس آیت میں زانی اور زانیہ سے مُراد وہ ہیں جو زنا سے توبہ نہ کریں اور اپنی اس بُری عادت پر قائم رہیں۔ اور اگر ان میں سے کوئی مرد خانہ داری یا اولاد کی مصلحت سے کسی پاکدامن شریف عورت سے نکاح کرلے یا ایسی عورت کسی نیک مرد سے نکاح کرلے تو اس آیت سے اس نکاح کی نفی لازم نہیں آتی۔ یہ نکاح شرعاً درست ہو جائے گا۔

جمہور فقہاءِ اُمت امام اعظم ابو حنیفہ، مالک، شافعی وغیرہ رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے اور صحابہ کرام سے ایسے نکاح کرانے کے واقعات ثابت ہیں تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی فتویٰ نقل کیا ہے۔

اب رہا آیت کا آخری جملہ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ، اسمیں بعض حضرات مفسرین نے تو ذٰلِكَ کا اشارہ زنا کی طرف قرار دیا ہے تو معنے جملے کے یہ ہوگئے کہ جب زنا ایسا خبیث فعل ہے تو زنا مؤمنین پر حرام کر دیا گیا۔ اس تفسیر پر معنے میں تو کوئی اشکال نہیں رہتا لیکن ذٰلِكَ سے زنا مراد لینا سیاقِ آیت سے کسی قدر بعید ضرور ہے اسلئے دوسرے مفسرین نے ذٰلِكَ کا اشارہ نکاح زانی وزانیہ اور مشرک ومشرکہ کیطرف قرار دیا ہے اس صورت میں مشرکہ سے مسلمان مرد کا نکاح اور مشرک سے مسلمان عورت کا نکاح حرام ہونا تو دوسری نصوصِ قرآن سے بھی ثابت ہے اور تمام اُمت کے نزدیک اجماعی مسئلہ ہے اور زانی مرد سے پاکدامن عورت کا نکاح یا زانیہ عورت سے عفیف مرد کا نکاح حرام ہونا جو اس جملے سے مستفاد ہوگا وہ اُس صورت کیساتھ مخصوص ہے کہ عفیف مرد زانیہ عورت سے نکاح کر کے اُس کو زنا سے نہ روکے بلکہ نکاح کے بعد بھی اس کی زنا کاری پر راضی رہے کیونکہ اس صورت میں یہ دیوثیت ہوگی جو شرعاً حرام ہے اسی طرح کوئی شریف پاکدامن عورت زنا کے خوگر شخص سے نکاح کرے اور نکاح کے بعد بھی اسکی زنا کاری پر راضی رہے یہ بھی حرام ہے یعنی ان لوگوں کا یہ فعل حرام اور گناہِ کبیرہ ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن کا باہمی نکاح صحیح نہ ہو، باطل ہو جائے۔ لفظ حرام شریعت کی اصطلاح میں دو معنے کے لئے استعمال ہوتا ہے ایک یہ کہ وہ گناہ ہے اسکا کرنے والا آخرت میں مستحق سزا ہے اور دُنیا میں بھی یہ عمل بالکل باطل کالعدم ہے اسپر کوئی شرعی ثمرہ احکام دُنیا کا بھی مرتب نہیں ہوگا جیسے کسی مشرک عورت سے یا جو عورتیں ہمیشہ کے لئے حرام ہیں اُنمیں سے کسی سے نکاح کر لیا تو یہ گناہِ عظیم بھی ہے اور ایسا نکاح شرعاً کالعدم ہے زنا میں اور اسمیں کوئی فرق نہیں۔ دوسرے یہ کہ فعل حرام تو ہے یعنی گناہ موجب سزا ہے مگر دُنیا میں اس فعل کے کچھ ثمرات رہتے ہیں معاملہ صحیح ہو جاتا ہے جیسے کسی عورت کو دھوکہ دیکر یا اغوا کر کے لے آیا پھر شرعی قاعدے کیمطابق دو گواہوں کے سامنے اسکی مرضی سے نکاح کر لیا تو یہ فعل تو ناجائز و حرام تھا مگر نکاح صحیح ہوگیا اولاد ثابت النسب ہوگی اسی طرح زانیہ اور زانی کا نکاح جبکہ اُن کا مقصود اصلی زنا ہی ہو، نکاح محض کسی دُنیوی مصلحت سے کرتے ہوں اور زنا سے توبہ نہیں کرتے ایسا نکاح حرام ہے مگر دُنیوی احکام میں باطل کالعدم نہیں۔ نکاح کے ثمرات شرعیہ نفقہ، مہر، ثبوتِ نسب، میراث سب جاری ہوں گے۔ اس طرح لفظ حرّم اس آیت میں مشرکہ کے حق میں پہلے معنے کے اعتبار سے اور زانیہ اور زانی کے حق میں دوسرے معنے کے اعتبار سے صحیح اور درست ہوگیا۔ اس تفسیر پر آیت کو منسوخ کہنے کی ضرورت نہ رہی جیسا کہ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ

اور جو لوگ عیب لگاتے ہیں حفاظت والیوں کو پھر نہ لائے چار مرد شاہد تو مارو اُن کو

ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ﴿۴﴾

اسّی دُرّے اور نہ مانو اُن کی کوئی گواہی کبھی اور وہی لوگ ہیں نافرمان

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵﴾

مگر جنھوں نے توبہ کرلی اسکے پیچھے اور سنور گئے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ (زنا کی) تہمت لگائیں پاکدامن عورتوں کو (جن کا زانیہ ہونا کسی دلیل یا قرینہ شرعیہ سے ثابت نہیں) اور پھر چار گواہ (اپنے دعوے پر) نہ لا سکیں تو ایسے لوگوں کو اسّی دُرّے لگاؤ اور اُن کی کوئی گواہی کبھی قبول مت کرو (یہ بھی تہمت لگانے کی سزا ہی کا جز ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے مردود الشہادت ہوگئے یہ تو دنیا کی سزا کا ذکر تھا) اور یہ لوگ (آخرت میں بھی سزا کے مستحق ہیں کیونکہ) فاسق ہیں لیکن جو لوگ اس کے بعد (خدا کے سامنے) توبہ کرلیں (کیونکہ تہمت لگانے میں انھوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور حق اللہ کو ضائع کیا) اور (جس پر تہمت لگائی تھی اُس سے معاف کرا کر بھی) اپنی (حالت کی) اصلاح کرلیں (کیونکہ اسکا حق ضائع کیا تھا) تو اللہ تعالیٰ ضرور مغفرت کرنیوالا رحمت کرنیوالا ہے (یعنی سچی توبہ کرنے سے عذاب آخرت معاف ہوجائے گا اگرچہ شہادت کا مقبول نہ ہونا جو دُنیوی سزا تھی وہ باقی رہے گی کیونکہ وہ حدِ شرعی کا جز ہے اور ثبوت جُرم کے بعد توبہ کرنے سے حد شرعی ساقط نہیں ہوتی)۔

معارف و مسائل

زنا کے متعلق تیسرا حکم جھوٹی تہمت کا مجرم ہونا اور اُسکی حدِ شرعی جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ زنا چونکہ سارے جرائم سے زیادہ معاشرے میں بگاڑ اور فساد کا ذریعہ ہے اسلئے اسکی سزا شریعتِ اسلام نے دوسرے سب جرائم سے زیادہ سخت رکھی ہے اس لئے عدل و انصاف کا تقاضا تھا کہ اس معاملہ کے ثبوت کو بڑی اہمیت دی جائے بغیر شرعی ثبوت کے کوئی کسی مرد یا عورت پر زنا کا الزام یا تہمت لگانے کی جرأت نہ کرے اس لئے شریعتِ اسلام نے بغیر ثبوت شرعی کے جسکا نصاب چار مرد گواہ عادل ہونا ہے اگر کوئی کسی پر تہمت صریح زنا کی لگائے تو اس تہمت لگانے کو بھی شدید جُرم قرار دیا اور اس جُرم پر بھی حدِ شرعی اسّی کوڑے مقرر کی جسکا لازمی اثر یہ ہوگا کہ کسی شخص پر زنا کا الزام کوئی

شخص اُسی وقت لگانے کی جرأت کرے گا جبکہ اس نے اس فعلِ خبیث کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا بھی ہو اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کو یہ یقین ہو کہ میرے ساتھ اور تین مردوں نے دیکھا ہے اور وہ گواہی دیں گے۔ کیونکہ اگر دوسرے گواہ ہیں ہی نہیں یا چار سے کم ہیں یا اُن کے گواہی دینے میں شبہ ہو تو اکیلا یہ شخص گواہی دیکر تہمتِ زنا کی سزا کا مستحق بننا کسی حال گوارا نہ کریگا۔

ایک شبہ اور جواب رہا یہ معاملہ کہ جب زنا کی شہادت کے لئے ایسی کڑی شرطیں لگا دی گئیں تو مجرموں کو کھلی چھٹی مل گئی نہ کسی کو شہادت کی جرأت ہوگی نہ کبھی ثبوت شرعی بہم پہنچے گا نہ ایسے مجرم کبھی سزایاب ہو سکیں گے مگر یہ خیال اس لئے غلط ہے کہ زنا کی حدِ شرعی یعنی سو کوڑے یا رجم و سنگساری کی سزا دینے کیلئے تو یہ شرطیں ہیں لیکن دو غیر محرم مرد و عورت کو یکجا قابلِ اعتراض حالت میں یا بیحیائی کی باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر اس کی شہادت دینے پر کوئی پابندی نہیں اور ایسے تمام اُمور جو زنا کے مقدمات ہوتے ہیں یہ بھی شرعاً قابلِ سزائے جرم ہیں لیکن حدِ شرعی کی سزا نہیں بلکہ تعزیری سزا قاضی یا حاکم کی صوابدید کیمطابق کوڑے لگانے کی دی جاتی ہے اسلئے جس شخص نے دو مرد و عورت کو زنا میں مبتلا دیکھا مگر دوسرے گواہ نہیں ہیں تو صریح زنا کے الفاظ سے تو شہادت نہ دے مگر بے حجابانہ اختلاط کی گواہی دے سکتا ہے اور حاکم قاضی اس پر تعزیری سزا بعد ثبوت جرم جاری کر سکتا ہے۔

محصنٰت کون ہیں یہ لفظ احصان سے مشتق ہے اصطلاحِ شرع میں احصان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جسکا حدِ زنا میں اعتبار کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ جس پر زنا کا ثبوت ہو جاوے وہ عاقل بالغ آزاد مسلمان ہو اور کسی عورت کیساتھ نکاحِ صحیح کر چکا ہو اور اُس سے مباشرت بھی ہو چکی ہو تو اس پر سزائے رجم و سنگساری جاری ہوگی۔ دوسری قسم وہ ہے جسکا اعتبار حدِ قذف یعنی تہمتِ زنا میں کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جس شخص پر زنا کا الزام لگایا گیا ہے وہ عاقل بالغ آزاد مسلمان ہو اور عفیف ہو یعنی پہلے کبھی اس پر زنا کا ثبوت نہ ہوا ہو۔ اس آیت میں یہی معنے محصنٰت کے ہیں (جصاص)

مسئلہ ۔ آیتِ قرآن میں عام معروف عادت کیمطابق یا اُس واقعہ کی وجہ سے جو شانِ نزول اس آیت کا ہے تہمتِ زنا اور اُس کی سزا کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ تہمت لگانے والے مرد ہوں اور جس پر تہمت لگائی گئی وہ پاکدامن عورت ہو مگر حکم شرعی اشتراکِ علت کے سبب سے عام ہے کوئی عورت دوسری عورت پر یا کسی مرد پر یا مرد کسی دوسرے مرد پر تہمتِ زنا لگائے اور ثبوتِ شرعی موجود نہ ہو تو یہ سب بھی اسی سزائے شرعی کے مستحق ہونگے (جصاص و ہدایہ)

مسئلہ ۔ یہ حدِ شرعی جو تہمتِ زنا پر ذکر کی گئی ہے صرف اسی تہمت کیلئے مخصوص ہے کسی دوسرے جرم کی تہمت کسی شخص پر لگائی جائے تو یہ حدِ شرعی اُس پر جاری نہیں ہوگی۔ ہاں تعزیری سزا حاکم کی صوابدید کے مطابق ہر جرم کی تہمت پر دی جا سکتی ہے۔ الفاظِ قرآن میں اگرچہ صراحتاً اس حکم

کا تہمت زنا کے ساتھ مخصوص ہونا ذکر نہیں مگر چار گواہوں کی شہادت کا ذکر اس خصوصیت کی دلیل ہے کیونکہ چار گواہ کی شرط صرف ثبوت زنا ہی کے لئے مخصوص ہے۔ (جصاص ہدایہ)

مسئلہ۔ حد قذف میں چونکہ حق العبد یعنی جس پر تہمت لگائی گئی ہے اس کا حق بھی شامل ہے اسلئے یہ حد جبھی جاری کی جائے گی جبکہ مقذوف یعنی جس پر تہمت لگائی گئی وہ حد جاری کرنے کا مطالبہ بھی کرے ورنہ حد ساقط ہو جائے گی (ہدایہ) بخلاف حدِ زنا کے کہ وہ خالص حق اللہ ہے اس لئے کوئی مطالبہ کرے یا نہ کرے حدِ زنا جرم ثابت ہونے پر جاری کی جائے گی۔

وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا، یعنی جس شخص پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانے کا جرم ثابت ہو جائے اور مقذوف کے مطالبہ سے اُس پر حد قذف جاری ہو جائے تو اُس کی ایک سزا تو فوری ہو گی کہ اسّی کوڑے لگائے گئے۔ دوسری سزا ہمیشہ کے لئے جاری رہے گی وہ یہ ہے کہ اس کی شہادت کسی معاملے میں قبول نہ کی جائیگی جبتک یہ شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے ندامت کیساتھ توبہ نہ کرے اور مقذوف شخص سے معافی حاصل کر کے توبہ کی تکمیل نہ کرے اُسوقت تک تو باجماعِ اُمت اسکی شہادت کسی بھی معاملہ میں مقبول نہ ہوگی۔ اور اگر توبہ کرلے تب بھی حنفیہ کے نزدیک اسکی شہادت قبول نہیں ہوتی ہاں گناہ معاف ہوجاتا ہے جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں گزرا اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ، یعنی وہ لوگ جن پر تہمت زنا کی حد شرعی جاری کی گئی ہے اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنی حالت درست کرلیں کہ آئندہ اسطرح کے اقدام کا اس سے خطرہ نہ رہے اور جس پر تہمت لگائی تھی اُس سے بھی معاف کرالیں تو اللہ تعالیٰ مغفرت کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔

یہ استثناء اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا کا امام اعظم ابو حنیفہ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک آیت سابقہ کے صرف آخری جملے کیطرف راجع ہے۔ یعنی وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ، تو مطلب اس استثناء کا یہ ہے کہ جس پر حد قذف جاری ہوئی ہے وہ فاسق ہے لیکن اگر وہ صدق دل سے توبہ کرے اور اپنی حالت کی اصلاح بھی مقذوف سے معافی لے کر کرے تو پھر وہ فاسق نہیں رہے گا اور آخرت کی سزا اُس سے معاف ہو جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دُنیا میں جو اس پر دو سزاؤں کا ذکر اس آیت کے شروع میں ہے یعنی اسّی کوڑے لگانا اور مردود الشہادت کر دینا یہ سزائیں توبہ کے باوجود اپنی جگہ رہیں گی کیونکہ ان میں ایک بڑی سزا کوڑے لگانے کی وہ تو جاری ہو ہی چکی ہے دوسری سزا بھی چونکہ اُسی حدِ شرعی کا جزء ہے اور یہ سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ توبہ سے حدِ شرعی معاف نہیں ہوتی اگرچہ آخرت کا عذاب گناہ معاف ہو کر ٹل جاتا ہے۔ تو جب مردود الشہادت ہونا بھی حدِ شرعی کا جزء ہے تو وہ توبہ سے معاف نہ ہوگا۔ امام شافعیؒ اور بعض دوسرے ائمہ نے استثناء مذکور کو آیت سابقہ کے سب جملوں کی طرف راجع کیا ہے جسکا مطلب یہ ہوگا کہ توبہ کر لینے سے جیسا کہ وہ فاسق

نہیں رہا اسلئے مردود الشہادت بھی نہیں رہے گا۔ جصاص اور مظہری میں دونوں طرف کے دلائل اور جوابات کی تفصیل مذکور ہے اہل علم وہاں دیکھ سکتے ہیں۔ واللہ اعلم

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ

اور جو لوگ عیب لگائیں اپنی جوروؤں کو اور شاہد نہ ہوں اُن کے پاس سوائے اُن کی جان کے

فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ⑥ وَ

تو ایسے شخص کی گواہی کی یہ صورت ہے کہ چار بار گواہی دے اللہ کی قسم کھاکر، کہ مقرر وہ شخص سچا ہے اور

الْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ⑦ وَيَدْرَؤُا

پانچویں بار یہ کہ اللہ کی پھٹکار ہو اُس شخص پر اگر ہو وہ جھوٹا اور عورت سے

عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ⑧

ٹل جائے گی مار یوں کہ وہ گواہی دے چار گواہی اللہ کی قسم کھاکر کہ مقرر وہ شخص جھوٹا ہے۔

وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ⑨

اور پانچویں یہ کہ اللہ کا غضب آئے اس عورت پر اگر وہ شخص سچا ہے

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ⑩ ع

اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تمہارے اوپر اور اسکی رحمت اور یہ کہ اللہ معاف کرنے والا ہے حکمتیں جاننے والا تو کیا کچھ نہ ہوتا

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ اپنی بیبیوں کو (زنا کی) تہمت لگائیں اور اُن کے پاس بجز اپنے (ہی دعوے کے) اور کوئی گواہ نہ ہوں (جو عدد میں چار ہونے ضروری ہیں) تو اُن کی شہادت (جو کہ دافع حبس یا حد قذف ہو) یہی ہے کہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھاکر یہ کہدے کہ بیشک میں سچا ہوں اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ مجھ پر خدا کی لعنت ہو اگر میں جھوٹا ہوں اور (اس کے بعد) اُس عورت سے سزا (یعنی حبس یا حد زنا) اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ قسم کھاکر کہے کہ بیشک یہ مرد جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر خدا کا غضب ہو اگر یہ مرد سچا ہو (اس طریق سے دونوں میاں بیوی سزائے دُنیوی سے بچ سکتے ہیں البتہ وہ عورت اس مرد پر حرام ہو جاوے گی) اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اُسکا کرم ہے (کہ ایسے ایسے احکام مقرر کئے جس میں انسان کے فطری جذبات کی پوری رعایت ہے) اور یہ کہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا حکمت والا ہے تو تم بڑی مضرتوں میں پڑ جاتے جنکا بیان آگے آتا ہے)

معارف و مسائل

زنا کے متعلقات میں چوتھا حکم لعان کا ہے

لعان اور ملاعنت کے معنے ایک دوسرے پر لعنت اور غضب الٰہی کی بددعا کرنے کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں میاں اور بیوی دونوں کو چند خاص قسمیں دینے کو لعان کہا جاتا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ جب کوئی شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے یا اپنے بچے کو کہے کہ یہ میرے نطفہ سے نہیں ہے اور یہ عورت جس پر الزام لگایا گیا ہے اُس کو جھوٹا بتلادے اور اُس کا مطالبہ کرے کہ مجھ پر جھوٹی تہمت لگائی ہے اس لئے شوہر پر تہمت زنا کی سزا اسّی کوڑے جاری کیجادے تو اسوقت شوہر سے مطالبہ کیا جاویگا کہ الزام زنا پر چار گواہ پیش کرے۔ اگر اس نے گواہ پیش کر دیئے تو عورت پر حدِ زنا لگائی جاوے گی۔ اور اگر وہ چار گواہ نہ لاسکا تو ان دونوں میں لعان کرایا جاویگا۔ یعنی اوّل مرد سے کہا جاویگا کہ وہ چار مرتبہ اُن الفاظ سے جو قرآن میں مذکور ہیں یہ شہادت دے کہ میں اس الزام میں سچّا اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔

اگر شوہر ان الفاظ کے کہنے سے رُکے تو اُس کو قید کر دیا جائے گا کہ یا تو اپنے جھوٹے ہونے کا اقرار کر دیا مذکورہ الفاظ کے ساتھ پانچ مرتبہ یہ قسمیں کھاؤ اور جب تک وہ ان دونوں میں سے کوئی کام نہ کرے اُس کو قید رکھا جائے گا۔ اگر اُس نے اپنے جھوٹے ہونیکا اقرار کرلیا تو اس پر حدِ قذف یعنی تہمتِ زنا کی شرعی سزا جاری ہوگی اور اگر الفاظِ مذکورہ کیساتھ پانچ مرتبہ قسمیں کھالیں تو پھر اسکے بعد عورت سے اُن الفاظ میں پانچ قسمیں لی جاویں گی جو قرآن میں عورت کے لئے مذکور ہیں اگر وہ قسم کھانے سے انکار کرے تو اُس کو اُسوقت تک قید رکھا جاوے گا جب تک کہ وہ یا تو شوہر کی تصدیق کرے اور اپنے جُرم زنا کا اقرار کرے تو اس پر حدِ زنا جاری کردی جاوے اور یا پھر الفاظ مذکورہ کیساتھ پانچ قسمیں کھاوے۔ اگر وہ الفاظ مذکورہ سے قسمیں کھانے پر راضی ہوجاوے اور قسمیں کھالے تو اب لعان پُورا ہوگیا جس کے نتیجہ میں دُنیاکی سزا سے دونوں بچ گئے آخرت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہی ہے کہ اُن میں سے کون جھوٹا ہے جھوٹے کو آخرت میں سزا ملے گی، لیکن دنیا میں بھی جب دو میاں بیوی میں لعان کا معاملہ ہوگیا تو یہ ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتے ہیں شوہر کو چاہئے کہ اسکو طلاق دے کر آزاد کردے۔ اگر وہ طلاق نہ دے تو حاکم ان دونوں میں تفریق کرسکتا ہے جو بحکم طلاق ہوگی۔ بہرحال اب ان دونوں کا آپس میں دوبارہ نکاح بھی کبھی نہیں ہوسکتا معاملہ لعان کی یہ تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے۔

لعان کا قانون شریعتِ اسلام میں شوہر کے جذبات و نفسیات کی رعایت کی بنا پر نافذ ہوا ہے کیونکہ کسی شخص پر الزام زنا لگانے کا قانون جو پہلی آیات میں گزر چکا ہے اُس کی رُو سے یہ ضروری ہے

کہ الزام زنا لگانے والا چار گواہ عینی پیش کرے اور جو یہ نہ کرسکے تو اُلٹی اسی پر تہمت زنا کی حد جاری کی جاوے گی۔ عام آدمی کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ جب چار گواہ میسر نہ ہوں تو وہ الزام زنا لگانے سے خاموش رہے تاکہ تہمتِ زنا کی سزا سے محفوظ رہ سکے لیکن شوہر کے لئے یہ معاملہ بہت سنگین ہے جب اُس نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا اور گواہ موجود نہیں اگر وہ بولے تو تہمت زنا کی سزا پائے اور نہ بولے تو ساری عمر خون کے گھونٹ پیتا رہے اور اس کی زندگی وبال ہو جائے اس لئے شوہر کے معاملہ کو عام قانون سے الگ کر کے اسکا مستقل قانون بنا دیا گیا اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ لعان صرف میاں بیوی کے معاملہ میں ہو سکتا ہے دوسروں کا حکم وہی ہے جو پہلی آیات میں گزر چکا ہے۔ کتبِ حدیث میں اس جگہ دو واقعے ذکر کئے گئے ہیں انمیں سے آیاتِ لعان کا شانِ نزول کونسا واقعہ ہے اسمیں ائمہ تفسیر کے اقوال مختلف ہیں۔ قرطبی نے آیات کا نزول مکرر مان کر دونوں کو شانِ نزول قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر شارح بخاری اور نووی شارح مسلم نے دونوں میں تطبیق دے کر ایک ہی نزول میں دونوں کو شانِ نزول آیات لعان کا قرار دیا ہے ان کی توجیہ زیادہ صاف ہے جو آگے آجائے گی۔ ایک واقعہ ہلال بن اُمیہ اور اُن کی بیوی کا ہے جو صحیح بخاری میں بروایت ابن عباس رض مذکور ہے اور اس واقعہ کا ابتدائی حصہ حضرت ابن عباسؓ ہی کی روایت سے مسند احمد میں اسطرح آیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب قرآن کریم میں حدِ قذف کے احکام کی آیات نازل ہوئیں یعنی وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً جس میں کسی عورت پر زنا کا الزام لگانیوالے مرد پر لازم کیا گیا ہے کہ یا تو اس الزام پر چار گواہ پیش کرے جنمیں ایک یہ خود ہوگا اور جو ایسا نہ کرسکے تو اسکو جھوٹا قرار دیکر اس پر اسّی کوڑوں کی حد اور ہمیشہ کے لئے مردود الشہادت ہونے کی سزا جاری کی جائے گی۔ یہ آیات سُنکر انصار مدینہ کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رض نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، یا رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا یہ آیات اسی طرح نازل ہوئی ہیں۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم (کو سعد بن عبادہؓ کی زبان سے ایسی بات سُن کر بڑا تعجب ہوا) آپؐ نے حضرات انصار کو خطاب کر کے فرمایا کہ آپ سُن رہے ہیں کہ آپ کے سردار کیا بات کہہ رہے ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسُول اللہ، آپ اُن کو ملامت نہ فرمادیں۔ ان کے اس کلام کی وجہ ان کی شدتِ غیرت ہے۔ پھر سعد بن عبادہؓ نے خود عرض کیا یا رسُول اللہ! میرے باپ اور ماں آپ پر قربان ہیں پوری طرح جانتا ہوں یہ آیات حق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں لیکن مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ اگر میں بے حیا بیوی کو اس حال میں دیکھوں کہ غیر مرد اُس پر چڑھا ہوا ہو تو کیا میرے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ میں اسکو وہاں ڈانٹوں اور وہاں سے ہٹا دوں بلکہ میرے لئے یہ ضروری ہوگا کہ میں چار آدمیوں کو لاکر یہ حالت دکھلاؤں اور اس پر گواہ بناؤں اور جب تک میں

گواہوں کو جمع کروں وہ اپنا کام کر کے بھاگ جائے (حضرت سعدؓ کے الفاظ اس جگہ مختلف منقول ہیں خلاصہ سب کا ایک ہی ہے۔ قرطبی)

آیات حدِ قذف نازل ہونے اور سعد بن عبادہؓ کے اس کلام پر تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ ہلال بن اُمیہؓ کو یہ واقعہ پیش آیا کہ وہ عشاء کے وقت اپنی زمین سے واپس ہوئے تو اپنی بیوی کیساتھ ایک مرد کو بچشم خود دیکھا اور انکی باتیں اپنے کانوں سے سُنیں مگر کوئی اقدام نہیں کیا یہاں تک کہ صبح ہوگئی تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ واقعہ عرض کیا۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ واقعہ سُن کر دل بُرا ہوا اور بڑا بھاری محسوس کیا۔ ادھر حضرات انصار جمع ہوگئے اور آپس میں مذکرہ کرنے لگے کہ جو بات ہمارے سردار سعدؓ بن عبادہ نے کہی تھی ہم اُسی میں مُبتلا ہوگئے اب قانون شرعی کیمطابق رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہلال بن اُمیہ کو اسی کوڑے حدِ قذف کے لگائیں گے اور لوگوں میں انکو ہمیشہ کے لئے مردود الشہادت قرار دیدیں گے مگر ہلال بن اُمیہؓ نے کہا کہ خدا کی قسم مجھے پوری اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس مصیبت سے نکالیں گے۔ اور صحیح بخاری کی روایت میں یہ بھی ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہلال کا معاملہ سنکر قرآنی حکم کیمطابق ہلالؓ سے فرما بھی دیا کہ یا تو اپنے اس دعوے پر بینہ (چار گواہ) لاؤ ورنہ تمھاری پیٹھ پر حدِ قذف جاری ہوگی۔ ہلال ابن اُمیہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے عرض کیا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق کیساتھ بھیجا ہے میں اپنے کلام میں سچا ہوں اور ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا حکم نازل فرمادیں گے جو میری پیٹھ کو حدِ قذف کی سزا سے بری کردیگا۔ یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ جبرئیل امین یہ آیات جن میں لعان کا قانون ہے لیکر نازل ہوئے وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ اَزْوَاجَھُمْ الآیۃ

ابو یعلی نے یہی روایت حضرت انسؓ سے بھی نقل کی ہے اُس میں یہ بھی ہے کہ جب آیات لعان نازل ہوئی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہلال ابن اُمیہؓ کو بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری مشکل کا حل نازل فرمادیا۔ ہلالؓ نے عرض کیا کہ میں اللہ تعالیٰ سے اسی کی اُمید لگائے ہوئے تھا۔ اب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہلال بن اُمیہؓ کی بیوی کو بھی بُلوالیا اور جب دونوں میاں بیوی جمع ہوگئے تو بیوی سے معاملہ کے متعلق پُوچھا گیا۔ اُس نے کہا کہ میرا شوہر ہلال بن اُمیہؓ مجھ پر جھوٹ الزام لگاتا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم میں سے کوئی ایک جھوٹا ہے۔ کیا تم میں کوئی ہے جو (اللہ کے عذاب سے ڈر کر) توبہ کرے اور سچی بات ظاہر کردے۔ اس پر ہلال بن اُمیہؓ نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں نے بالکل سچ بات کہی ہے اور جو کچھ کہا ہے حق کہا ہے تب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ نازل شدہ آیاتِ قرآن کیمطابق دونوں میاں بیوی میں لعان کرایا جائے۔ پہلے حضرت ہلالؓ سے کہا گیا کہ تم چار مرتبہ ان الفاظ سے شہادت دو جو قرآن میں مذکور ہیں۔ یعنی میں اللہ کو حاضر ناظر سمجھ کر کہتا ہوں کہ میں اپنے الزام میں سچا ہوں۔ ہلالؓ نے اسکے مطابق چار مرتبہ اسکی شہادت دی۔ جب پانچویں شہادت

کا نمبر آیا جس کے الفاظ قرآنی یہ ہیں کہ اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کے طور پر ہلال بن اُمیہؓ سے فرمایا کہ دیکھو ہلال خدا سے ڈرو کیونکہ دُنیا کی سزا آخرت کے عذاب سے ہلکی ہے اور اللہ کا عذاب لوگوں کی دی ہوئی سزا سے کہیں زیادہ سخت ہے اور یہ پانچویں شہادت آخری شہادت ہے اسی پر فیصلہ ہونا ہے مگر ہلال بن اُمیہؓ نے عرض کیا کہ میں بقسم کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس شہادت پر آخرت کا عذاب نہیں دیں گے (کیونکہ بالکل سچی شہادت ہے) جیسا کہ اللہ کے رسُول مجھے دُنیا میں حدِ قذف کی سزا نہیں دیں گے اور پھر یہ پانچویں شہادت کے الفاظ ادا کر دیئے۔ اس کے بعد آپ نے ہلال کی بیوی سے اسی طرح کی چار شہادات یا چار قسمیں لیں اس نے بھی ہر دفعہ میں قرآنی الفاظ کے مطابق یہ شہادت دی کہ میرا شوہر جھوٹا ہے۔ جب پانچویں شہادت کا نمبر آیا تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذرا ٹھہرو، پھر اس عورت سے فرمایا کہ خدا سے ڈرو کہ یہ پانچویں شہادت آخری بات ہے اور خدا کا عذاب لوگوں کے عذاب یعنی زنا کی حدِ شرعی سے کہیں زیادہ سخت ہے یہ سُنکر وہ قسم کھانے سے جھجکنے لگی، کچھ دیر اسی کیفیت میں رہی مگر پھر آخر میں کہا کہ واللہ میں اپنی قوم کو رُسوا نہیں کرونگی اور پانچویں شہادت بھی ان لفظوں کیساتھ ادا کر دی کہ اگر میرا شوہر سچا ہے تو مجھ پر خدا کا غضب ہو۔ یہ لعان کی کارروائی مکمل ہو گئی تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں میاں بیوی میں تفریق کر دی یعنی ان کا نکاح توڑ دیا اور یہ فیصلہ فرمایا کہ اس حمل سے جو بچہ پیدا ہو وہ اس عورت کا بچہ کہلائے گا باپ کیطرف منسوب نہیں کیا جائے گا مگر بچے کو مطعون بھی نہ کیا جائے گا۔ انتہیٰ (تفسیر مظہری بحوالہ مسند احمد عن ابن عباسؓ)

دُوسرا واقعہ بھی صحیحین بخاری و مسلم میں مذکور ہے اور واقعہ کی تفصیل امام بغوی نے بروایت ابن عباسؓ اس طرح نقل فرمائی ہے کہ زنا کی تہمت لگانے والے پر حدِ قذف جاری کرنے کے احکام جن آیات میں نازل ہوئے یعنی وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الآیۃ تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہو کر یہ آیات لوگوں کو سنائیں۔ مجمع میں عاصم بن عدی انصاریؓ بھی موجود تھے یہ کھڑے ہو گئے اور عرض کیا یا رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میری جان آپ پر قربان ہو اگر ہم میں سے کوئی شخص اپنی عورت کو کسی مرد کیساتھ مبتلا دیکھے تو اگر وہ اپنے دیکھے ہوئے واقعہ کو بیان کرے تو اُس کو کوڑے لگائے جاویں گے اور ہمیشہ کے لئے مردود الشہادت کر دیا جاویگا اور مسلمان اسکو فاسق کہا کریں گے ایسی حالت میں ہم گواہ کہاں سے لائیں گے اور اگر گواہوں کی تلاش میں نکلیں گے تو گواہ آنے تک وہ اپنا کام کر کے بھاگ چکا ہوگا۔ یہ وہی سوال تھا جو پہلے واقعہ میں حضرت سعد بن عبادہؓ نے کیا تھا اس دوسرے واقعہ میں عاصم بن عدیؓ نے کیا ہے۔

یہ سوال ایک جمعہ کے دن کیا گیا تھا اسکے بعد یہ قصہ پیش آیا کہ عاصم بن عدیؓ کا ایک چچا زاد

بھائی عویمر تھا جسکا نکاح بھی عاصم بن عدیؓ کی چچا زاد بہن خولہؓ سے ہوا تھا۔ عویمرؓ نے ایک روز دیکھا کہ اُن کی بیوی خولہ شریک بن سحماء کیساتھ مبتلا ہے اور یہ شریک بن سحماء بھی عاصم کا چچا زاد بھائی تھا۔ عویمرؓ نے یہ واقعہ آکر عاصم بن عدیؓ سے بیان کیا، عاصمؓ نے اِنّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھا اور اگلے روز جمعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پھر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پچھلے جمعہ میں میں نے آپ سے جو سوال کیا تھا افسوس ہے کہ میں خود اسمیں مبتلا ہو گیا کیونکہ میرے ہی اہلِ بیت میں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا۔ بغویؒ نے ان دونوں کو حاضر کرنے اور پھر آپس میں لعان کرانیکا واقعہ بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے (مظہری) اور صحیحین میں اسکا خلاصہ حضرت سہلؓ بن سعد ساعدی کی روایت سے یہ مذکور ہے کہ عویمر عجلانی رضؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کیساتھ کسی غیر مرد کو دیکھے تو کیا وہ اس کو قتل کر دے جس کے نتیجہ میں لوگ اس کو قتل کریں گے یا پھر وہ کیا کرے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے اور تمھاری بیوی کے معاملے میں حکم نازل فرما دیا ہے۔ جاؤ بیوی کو لیکر آؤ۔ حضرت سہل بن سعدؓ راوی حدیث فرماتے ہیں کہ ان دونوں کو بلاکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے اندر لعان کرایا (جس کی صورت واقعہ سابقہ میں بیان ہو چکی ہے) جب دونوں طرف سے پانچوں شہادات پوری ہو کر لعان ختم ہوا تو عویمر عجلانیؓ نے کہا یا رسول اللہؐ، اگر میں اب اسکو بیوی بنا کر رکھوں تو گویا میں نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے اسلئے میں اسے تین طلاق دیتا ہوں (مظہری بحوالہ صحیحین)

ان دونوں واقعوں میں سے ہر ایک میں یہ مذکور ہے کہ آیاتِ لعان اسکے بارے میں نازل ہوئی ہیں حافظ ابن حجر اور شیخ الاسلام نوویؒ نے دونوں میں تطبیق کی یہ صورت بیان کی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلا واقعہ ہلال بن اُمیّہ کا تھا اور آیاتِ لعان کا نزول اُسی واقعہ کے بارے میں ہوا اسکے بعد عویمرؓ کو ایسا ہی واقعہ پیش آ گیا اور اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا انکو ہلال بن اُمیّہ کا معاملہ سابقہ معلوم نہ ہوگا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بتلایا کہ تمھارے معاملہ کا فیصلہ یہ ہے اور قرینہ اسکا یہ ہے کہ ہلال بن اُمیّہ رضؓ کے واقعہ میں تو الفاظ حدیث کے یہ ہیں فنزل جبرئیل، اور عویمر رضؓ کے واقعہ میں الفاظ یہ ہیں قد انزل اللّٰہ فیك جسکا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے واقعہ جیسے ایک واقعہ میں اسکا حکم نازل فرما دیا ہے واللہ اعلم (مظہری)

مسئلہ: جب دو میاں بیوی کے درمیان حاکم کے سامنے لعان ہو جاوے تو یہ عورت اس مرد پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی ہے جیسے حرمت رضاعت ابدی ہوتی ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے المتلاعنان لا یجتمعان ابدًا، حرمت تو لعان ہونے ہی سے ثابت ہو جاتی ہے لیکن عورت کو دوسرے شخص سے بعد عدت نکاح کرنا امام اعظمؒ کے نزدیک جب جائز

ہوگا جبکہ مرد طلاق دیدے یا زبان سے کہدے کہ میں نے اس کو چھوڑ دیا اور اگر مرد ایسا نہ کرے تو حاکم قاضی ان دونوں میں تفریق کا حکم کر دیگا وہ بھی بحکم طلاق ہو جائے گا پھر عدت طلاق تین حیض پورے ہونے کے بعد عورت آزاد ہوگی اور دوسرے کسی شخص سے نکاح کر سکے گی (مظہری وغیرہ)

مسئلہ: جب لعان ہو چکا اس کے بعد اس حمل سے جو بچہ پیدا ہو وہ اسکے شوہر کیطرف منسوب نہیں ہوگا بلکہ اُس کی نسبت اُس کی ماں کیطرف کی جاویگی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہلال بن اُمیہ اور عویمر عجلانی دونوں کے معاملات میں یہی فیصلہ فرمایا۔

مسئلہ: لعان کے بعد اگرچہ اُن میں جو جھوٹا ہے اُسکا عذاب آخرت پہلے سے زیادہ بڑھ گیا مگر دُنیا کی سزا اس سے ساقط ہو گئی۔ اسی طرح دُنیا میں اُس کو زانیہ اور بچے کو ولد الزنا کہنا بھی کسی کے لئے جائز نہیں ہوگا۔ ہلال ابن اُمیہؓ کے معاملہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ میں حکم بھی فرمایا۔ وقضیٰ بان لا ترمی ولا ولدھا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۭ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۭ

جو لوگ لائے ہیں یہ طوفان تمہیں میں ایک جماعت ہیں تم اسکو نہ سمجھو برا اپنے حق میں

بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ

بلکہ یہ بہتر ہے تمہارے حق میں ہر آدمی کے لئے اُن میں سے وہ ہے جتنا اُسنے گناہ کمایا اور جس نے

تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱﴾ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ

اُٹھایا ہے اسکا بڑا بوجھ اسکے واسطے بڑا عذاب ہے کیوں نہ جب تم نے اسکو سُنا تھا خیال کیا

الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۲﴾

ہوتا ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں نے اپنے لوگوں پر بھلا خیال اور کہا ہوتا یہ صریح طوفان ہے

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰۗىِٕكَ

کیوں نہ لائے وہ اس بات پر چار شاہد پھر جب نہ لائے شاہد تو وہ لوگ

عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ

اللہ کے یہاں وہی ہیں جھوٹے اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت

فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِذْ

دُنیا اور آخرت میں تو تم پر پڑتی اس چرچا کرنے میں کوئی آفت بڑی جب

تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ

لینے لگے تم اسکو اپنی زبانوں پر اور بولنے لگے اپنے منہ سے جس چیز کی تم کو خبر نہیں اور

تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ

تم سمجھتے ہو اسکو ہلکی بات اور یہ اللہ کے یہاں بہت بڑی ہے اور کیوں نہ جب تم نے اسکو سنا تھا

قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۶﴾

کہا ہوتا ہم کو نہیں لائق کہ منہ پر لائیں یہ بات اللہ تو پاک ہے یہ تو بڑا بہتان ہے

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَيُبَيِّنُ

اللہ تم کو سمجھاتا ہے کہ پھر نہ کرو ایسا کام کبھی اگر تم ایمان رکھتے ہو اور کھولتا ہے

اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ

اللہ تمہارے واسطے پتے کی باتیں، اور اللہ سب جانتا ہے حکمت والا ہے جو لوگ چاہتے ہیں کہ

اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي

چرچا ہو بدکاری کا ایمان والوں میں اُن کے لئے عذاب ہے دردناک دُنیا

الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ

اور آخرت میں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے اور اگر نہ ہوتا اللہ

اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

کا فضل تم پر اور اس کی رحمت اور یہ کہ اللہ نرمی کرنے والا ہے مہربان تو کیا کچھ نہ ہوتا، اے ایمان

اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ

والو نہ چلو قدموں پر شیطان کے اور جو کوئی چلے گا قدموں پر شیطان کے

فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ

سو وہ تو یہی بتلائے گا بے حیائی اور بُری بات اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور

رَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ

اس کی رحمت تو نہ سنورتا تم میں ایک شخص بھی کبھی ولیکن اللہ سنوارتا ہے جس کو چاہے

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ

اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے اور قسم نہ کھائیں بڑے درجہ والے تم میں سے اور کشائش والے اس

يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۽

پر کہ دیں قرابتیوں کو اور محتاجوں کو اور وطن چھوڑنے والوں کو اللہ کی راہ میں

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ

اور چاہئے کہ معاف کریں اور درگزر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے اور اللہ بخشنے والا ہے

رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا

مہربان جو لوگ عیب لگاتے ہیں حفاظت والیوں بے خبر ایمان والیوں کو ان کو پھٹکار ہے

ع ۹ / ۱۰

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٢٣﴾ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ
دُنیا میں اور آخرت میں اور اُن کے لئے ہے بڑا عذاب جس دن کہ ظاہر کر دیں گی
أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٢٤﴾ يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ
اُن کی زبانیں اور ہاتھ اور پاؤں جو کچھ وہ کرتے تھے اُس دن پوری دے گا
اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ﴿٢٥﴾ الْخَبِيثَاتُ
اُن کو اللہ اُن کی سزا جو چاہیئے، اور جان لیں گے کہ اللہ وہی ہے سچا کھولنے والا گندیاں ہیں
لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ ۖ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ
گندوں کے واسطے اور گندے واسطے گندیوں کے اور ستھریاں ہیں ستھروں کے واسطے اور ستھرے واسطے
لِلطَّيِّبَاتِ ۚ أُولَٰئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ ۖ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٢٦﴾
ستھریوں کے وہ لوگ بے تعلق ہیں ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں اُنکے واسطے بخشش ہے اور روزی ہے عزت کی

ع ۳ / ۹

ربطِ آیات جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سُورۂ نور کا بیشتر حصہ اُن احکام سے متعلق ہے جو عفت و عصمت کی حفاظت کے لئے جاری کئے گئے ہیں۔ اُسکے بالمقابل عفت و عصمت پر دست اندازی اور اسکی خلاف ورزی کی دُنیوی سزائیں اور اُن پر آخرت کا وبالِ عظیم ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے حدِ زنا پھر حدِ قذف اور پھر لعان کا بیان آ چکا ہے۔ حدِ قذف کے ضمن میں کسی پاکدامن عورت پر جب تک چار گواہوں کی شہادت نہ ہو زنا کا الزام لگانا گناہِ عظیم قرار دیا ہے اور ایسا کرنے والے کیلئے حدِ شرعی اسّی کوڑے لگانے کی جاری فرمائی ہے۔ یہ مسئلہ عام مسلمان پاکدامن عورتوں سے متعلق تھا۔ اور چونکہ ۵ ہجری میں بعض منافقین نے ام المؤمنین حضرتِ صدیقہ عائشہ رضؓ پر ایسی تہمت گھڑی تھی، اور تقلیداً بعض مسلمان بھی اُسکا تذکرہ کرنے لگے تھے یہ معاملہ عام مسلمان پاکدامن عورتوں کے معاملہ سے کہیں زیادہ اشد تھا۔ اس لئے قرآن کریم نے حضرت صدیقہ عائشہ رضؓ کی برارت اور پاکی کے بیان میں اس جگہ دس آیتیں مذکور الصدر نازل فرمائیں جنہیں حضرت صدیقہ کی برارت و نزاہت کا اعلان اور اُن کے معاملہ میں جن لوگوں نے افترا و بہتان میں کسی طرح کا حصہ لیا تھا ان سب کو تنبیہ اور دُنیا و آخرت میں اُن کے وبال کا بیان ہے۔ یہ بہتان بندی کا واقعہ قرآن و حدیث میں واقعہ اِفک کے نام سے مشہور ہے۔ اِفک کہتے ہیں بدترین قسم کے جھوٹ و افترا و بہتان کو۔ ان آیات کی تفسیر سمجھنے میں قصہ اِفک کے معلوم ہونے کو بڑا دخل ہے اسلئے مناسب ہے کہ پہلے مختصر طور پر یہ قصہ بیان کر دیا جاوے۔

قصۂ اِفک و بہتان صحیحین اور دوسری کتبِ حدیث میں یہ واقعہ غیر معمولی طویل تفصیل کیساتھ ذکر کیا گیا ہے اسکا مختصر بیان یہ ہے کہ جب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ سلم غزوہ بنی المصطلق میں جسکو غزوہ مریسیع بھی کہا جاتا ہے ۵ ہجری میں تشریف لے گئے تو ازواجِ مطہرات امہات المؤمنین میں سے حضرت صدیقہ عائشہ رضؓ

ساتھ تھیں، حضرت عائشہؓ کا اونٹ جس پر اُن کا ہودج (پردہ دار شغدف) ہوتا تھا اور چونکہ اُس وقت احکام پردہ کے نازل ہو چکے تھے تو معمول یہ تھا کہ صدیقہ عائشہؓ اپنے ہودج میں سوار ہو جائیں پھر لوگ اُس ہودج کو اُٹھا کر اونٹ پر رکھدیتے تھے۔ غزوہ سے فراغت اور مدینہ طیبہ کی طرف واپسی میں ایک روز یہ قصہ پیش آیا کہ ایک منزل میں قافلہ ٹھہرا آخر شب میں کوچ سے کچھ پہلے اعلان کیا گیا کہ قافلہ روانہ ہونے والا ہے تاکہ لوگ اپنی اپنی ضرورتوں سے فارغ ہو کر تیار ہو جاویں۔ حضرت صدیقہ عائشہؓ کو قضاء حاجت کی ضرورت تھی اُس سے فراغت کے لئے جنگل کیطرف چلی گئیں وہاں اتفاق سے اُن کا ہار ٹوٹ کر گر گیا اس کی تلاش میں اُن کو دیر لگ گئی۔ جب واپس اپنی جگہ پہنچیں تو دیکھا کہ قافلہ روانہ ہو چکا ہے اُن کے اونٹ کا قصہ یہ ہوا کہ جب کُوچ ہونے لگا تو عادت کے مطابق حضرت صدیقہ عائشہؓ کا ہودج یہ سمجھ کر اونٹ پر سوار کر دیا گیا کہ حضرت صدیقہؓ اسمیں موجود ہیں اُٹھاتے وقت بھی کچھ شبہ اسلئے نہ ہوا کہ اُسوقت حضرت صدیقہؓ کی عمر کم اور بدن میں نحیف تھیں کسی کو یہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ ہودج خالی ہے چنانچہ اونٹ کو ہانک دیا گیا۔ حضرت صدیقہؓ نے اپنی جگہ واپس آ کر قافلہ کو نہ پایا تو بڑی دانشمندی اور وقار و استقلال سے کام لیا کہ قافلہ کے پیچھے دوڑنے یا ادھر اُدھر تلاش کرنے کے بجائے اپنی جگہ چادر اوڑھ کر بیٹھ گئیں اور خیال کیا کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور رفقاء کو یہ معلوم ہوگا کہ میں ہودج میں نہیں ہوں تو مجھے تلاش کرنے کے لئے یہاں پہنچیں گے، اگر میں ادھر اُدھر کہیں اور گئی تو اُن کو تلاش میں مشکل ہوگی اسلئے اپنی جگہ پر چادر میں لپٹ کر بیٹھ رہیں۔ آخر رات کا وقت تھا نیند کا غلبہ ہوا وہیں لیٹ کر آنکھ لگ گئی۔

دوسری طرف قدرت نے یہ سامان کیا کہ حضرت صفوان بن معطل صحابیؓ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی خدمت کے لئے مقرر کیا ہوا تھا کہ وہ قافلہ کے پیچھے رہیں اور قافلہ روانہ ہونے کے بعد گری پڑی کوئی چیز رہ گئی ہو تو اُسکو اُٹھا کر محفوظ کرلیں۔ وہ صبح کے وقت اس جگہ پہنچے، ابھی روشنی پوری نہ تھی اتنا دیکھا کہ کوئی آدمی پڑا سو رہا ہے۔ قریب آئے تو حضرت صدیقہ عائشہؓ کو پہچان لیا کیونکہ اُنھوں نے پردہ کے احکام نازل ہونے سے پہلے اُن کو دیکھا تھا۔ پہچاننے کے بعد انتہائی افسوس کے ساتھ اُن کی زبان سے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ نکلا، یہ کلمہ صدیقہؓ کے کان میں پڑا تو آنکھ کھل گئی اور چہرہ ڈھانپ لیا۔ حضرت صفوانؓ نے اپنا اونٹ قریب لاکر بٹھا دیا۔ حضرت صدیقہؓ اُس پر سوار ہو گئیں اور خود اونٹ کی نکیل پکڑ کر پیادہ پا چلنے لگے یہانتک کہ قافلہ میں مل گئے۔

عبداللہ بن اُبَیّ بڑا خبیث منافق رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دشمن تھا اسکو ایک بات ہاتھ لگ گئی اور کم بخت نے واہی تباہی بکنا شروع کیا اور بعض بھولے بھالے مسلمان بھی سُنی سُنائی اُسکا تذکرہ کرنے لگے۔ جیسے حضرت حسانؓ، حضرت مسطحؓ مردوں میں سے اور حضرت حمنہؓ عورتوں میں سے

تفسیر دُرِّ منثور میں بحوالہ ابنِ مردویہ حضرت ابنِ عباسؓ کا یہی قول نقل کیا ہے کہ اعانہ ای عبداللہ ابن ابی حسان و مسطح و حمنہ۔

جب اس منافق کے بہتان کا چرچا ہوا تو خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس سے سخت صدمہ پہنچا۔ صدیقہ عائشہؓ کو تو انتہائی صدمہ پہنچنا ظاہر ہی ہے عام مسلمانوں کو بھی اس سے سخت رنج افسوس ہوا۔ ایک مہینہ تک یہی قصہ چلتا رہا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے حضرت صدیقہؓ کی برارت اور بہتان باندھنے یا اسمیں شریک ہونے والوں کی مذمت میں مذکورہ بالا آیات نازل فرمادیں جن کی تفسیر آگے آتی ہے۔ قرآنی ضابطہ کے مطابق جسکا ذکر ابھی حدِ قذف کے تحت میں آچکا ہے تہمت لگانے والوں سے شہادت کا مطالبہ کیا گیا وہ تو ایک بالکل ہی بے بنیاد خبر تھی گواہ کہاں سے آتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تہمت لگانے والوں پر شرعی ضابطہ کے مطابق حدِ قذف جاری کی، ہر ایک کو اسی اسی کوڑے لگائے۔ بزار اور ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ اسوقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تین مسلمانوں پر حدِ قذف جاری فرمائی، مسطح، حمنہ، حسانؓ۔ اور طبرانی نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر عبداللہ بن اُبی منافق جس نے اصل تہمت گھڑی تھی اس پر دوہری حد جاری فرمائی پھر مومنین نے توبہ کرلی اور منافقین اپنے حال پر قائم رہے (بیان القرآن)

خلاصۂ تفسیر

(اے مسلمانو! تم جو صدیقہ عائشہؓ کے متعلق جھوٹی تہمت کی شہرت سے رنجیدہ ہوا ہمیں خود صدیقہؓ بھی داخل ہیں تو تم زیادہ غم نہ کرو کیونکہ) جن لوگوں نے یہ طوفان (حضرت صدیقہ عائشہؓ کی نسبت) برپا کیا ہے وہ تمہارے میں کا ایک (چھوٹا سا) گروہ ہے (کیونکہ تہمت لگانے والے کل چار تھے، ایک بالذات اور جھوٹی تہمت گھڑنے والا یعنی عبداللہ ابن اُبی منافق، اور تین بالواسطہ جو اسکی خبر سے متاثر ہوگئے یعنی حسان، مسطح و حمنہ جو مومن مخلص تھے ان سب کو قرآن نے (منکم) میں داخل کیا یعنی مسلمانوں میں، حالانکہ عبداللہ ابن اُبی منافق تھا اسکی وجہ انکا ظاہری دعوائے اسلام تھا۔ مطلب آیت کا تسلی دینا ہے کہ زیادہ غم نہ کرو، اول تو خبر جھوٹی، پھر ناقل بھی کل چار ہی آدمی، اور زیادہ آدمی تو اسکے مخالف ہی ہیں پس عُرفاً بھی یہ موجب زیادہ غم کا نہ ہونا چاہیئے، آگے ایک اور طریقہ پر تسلی ہے کہ) تم اس (بہتان بندی) کو اپنے حق میں بُرا نہ سمجھو (گو ظاہر میں غم کی بات ہے مگر واقع میں اس سے تمہارا ضرر نہیں) بلکہ یہ (باعتبار انجام کے) تمہارے حق میں بہتر ہی بہتر ہے (کیونکہ اس غم سے تم کو صبر کا ثواب ملا، تمہارے درجے

بڑھے۔ خصوصاً متہم حضرات کی براءۃ کے لئے نصِ قطعی آئی اور آئندہ بھی مسلمانوں کے حق میں خیر ہے کہ ایسے مصیبت زدہ اس واقعہ سے تسلی حاصل کیا کریں گے پس تمہارا تو کوئی ضرر نہ ہوا البتہ ان چرچا کرنے والوں کا ضرر ہوا کہ) ان میں سے ہر شخص کو جتنا کسی نے کچھ کیا تھا گناہ ہوا (مثلاً زبان سے کہنے والوں کو زیادہ گناہ اور سُن کر خاموش رہ جانے والوں کو یا دل سے بدگمانی کرنے والوں کو اس کے موافق گناہ ہوا) اور ان میں جس نے اس (بہتان) میں سب سے بڑا حصہ لیا (کہ اسکو اختراع کیا مُراد اس سے عبداللہ بن اُبَی منافق ہے) اس کو (سب سے بڑھ کر) سخت سزا ہوگی (مراد اس سے جہنم ہے جس کا استحقاق پہلے سے بوجہ کفر و نفاق و عداوتِ رسولؐ کے بھی تھا اب اور زیادہ سزا کا مستحق ہوگیا، یہ تو غم زدوں کے ضرر کی نفی اور بہتان باندھنے والوں کے ضرر کا اثبات تھا آگے ان میں جو مؤمنین تھے اُن کو ناصحانہ ملامت ہے کہ) جب تم لوگوں نے یہ بات سُنی تھی تو مسلمان مردوں (جن میں حسان و مسطح بھی آگئے) اور مسلمان عورتوں نے (جن میں حمنہ بھی آگئیں) اپنے آپس والوں کیساتھ (یعنی حضرت صدیقہؓ اور ان صحابی کے ساتھ دل سے) گمان نیک کیوں نہ کیا اور (زبان سے) یہ کیوں نہ کہا کہ یہ صریح جھوٹ ہے جیسا کہ دُرِّ منثور میں ابو ایوبؓ اور اُن کی زوجہ کا یہی قول مروی ہے اس میں بہتان باندھنے والوں کے ساتھ وہ بھی شامل ہیں جو سُنکر خاموش رہے یا شک میں پڑ گئے ان سب پر بھی ملامت ہے جن میں عام مؤمنین و مؤمنات بھی داخل ہوگئے۔ آگے اس تہمت کو رَد کرنے اور نیک گمان رکھنے کے وجوب کی وجہ ارشاد ہے کہ) یہ (بہتان لگانے والے) لوگ اس (اپنے قول) پر چار گواہ کیوں نہ لائے (جو کہ اثباتِ زنا کے لئے شرط ہے) سو جس حالت میں یہ لوگ گواہ (موافق قاعدہ کے) نہیں لائے تو بس اللہ کے نزدیک (جو قانون ہے اس کے اعتبار سے) یہ جھوٹے ہیں (آگے بہتان لگانے والوں میں جو مؤمن تھے اُن پر بھی رحمت کا ذکر ہے) اور اگر (اے حسان و مسطح و حمنہؓ) تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم نہ ہوتا دُنیا میں (بھی کہ توبہ کی مہلت دی) اور آخرت میں (بھی کہ توبہ کی توفیق دی اور اس کو قبول بھی کرلیا اگر یہ نہ ہوتا) تو جس شغل میں تم پڑے تھے اس میں تم پر سخت عذاب واقع ہوتا (جیسا عبداللہ بن اُبَی کو بوجہ عدم توبہ کے ہوگا گو اسوقت مہلت دُنیا میں اسکو بھی دیدی گئی مگر مجموعہ دارین میں رحمت نہیں ہے اور اس سے معلوم ہوگیا کہ صحابہؓ مقبول التوبہ اور پاک ہوکر آخرت میں مرحوم ہیں اور علیکم میں خطاب مؤمنین کو ہونے کا قرینہ اولاً اوپر کی آیت میں یہ ارشاد ہے ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ ثانیاً فِی الْاٰخِرَۃِ فرمانا کہ منافق تو آخرت میں جہنم کے درکِ اسفل یعنی نچلے طبقہ کا مستحق ہے وہ یقیناً مرحوم فی الآخرۃ نہیں ہوسکتا۔ ثالثاً آگے یَعِظُكُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ میں طبرانی نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا یرید مسطحا و حمنۃ وحسانا۔ کذا فی الدر المنثور یعنی لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ کے مخاطب صرف تین مومن ہیں۔ یعنی

مِسْطَحؓ، حمنہؓ، حسانؓ۔ آگے اسکا بیان ہے کہ مؤمنین پر اگر اللہ کا خاص فضل نہ ہوتا کہ انکو توبہ کی توفیق دی اور توبہ بھی کرلی تو جو کام اُنھوں نے کیا تھا وہ اپنی ذات میں عذابِ عظیم کا موجب تھا فرمایا) جبکہ تم اس (جھوٹ بات) کو اپنی زبانوں سے نقل در نقل کر رہے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کی تم کو (کسی دلیل سے) مطلق خبر نہیں (اور ایسی خبر کے ناقل کا کاذب ہونا فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ میں بیان ہوچکا ہے) اور تم اسکو ہلکی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات (یعنی موجبِ گناہِ عظیم) تھی (اول تو کسی پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت خود بڑی معصیت ہے پھر وہ بھی کون، ازواج مطہرات میں سے کہ اُن پر تہمت لگانا جناب رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذار کا سبب بنا۔ پس اسمیں بہت سے اسبابِ معصیت کے جمع تھے) اور تم نے جب اس (بات) کو (اول) سُنا تھا تو یُوں کیوں نہ کہا کہ ہم کو زیبا نہیں کہ ایسی بات مُنہ سے بھی نکالیں۔ معاذ اللہ یہ تو بڑا بہتان ہے (جیسا کہ بعض صحابہ نے اسی طرح کہا تھا جیساکہ سعد بن معاذ و زید بن حارثہ و ابی ایوب سے اسی طرح کا قول منقول ہے اور زائد کی نفی نہیں ہے ممکن ہے اور بہتوں نے کہا ہو۔ مطلب یہ کہ قاذفین اور ساکتین سب کو یہی کہنا چاہئے تھا۔ یہاں تک تو ماضی پر ملامت تھی اب مستقبل کے لئے نصیحت ہے جو کہ اصل مقصود ہے ملامت کا پس ارشاد ہے کہ) اللہ تعالیٰ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ پھر ایسی حرکت مت کرنا اگر تم ایمان والے ہو اور اللہ تعالیٰ تم سے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے (جسمیں نصیحت اور حدِ قذف اور قبولِ توبہ جو اوپر مذکور ہوچکے ہیں سب داخل ہیں) اور اللہ تعالیٰ بڑا جاننے والا حکمت والا ہے (تمہارے دل کی ندامت کا حال بھی اس کو معلوم ہے اس لئے توبہ قبول کرلی اور سیاست کی حکمت بھی خوب جانتا ہے اس لئے تمہیں سیاسۃً دُنیا میں سزا دی گئی ہذا فسرہ ابن عباسؓ رواہ فی الدر۔ یہاں تک نزولِ برارۃ سے قبل تہمت کا تذکرہ کرنے والوں کا ذکر تھا۔ آگے ان کا ذکر ہے جو قرآن میں نزولِ برارۃ کے بعد بھی باز نہ آویں اور ظاہر ہے ایسا شخص بے ایمان ہی ہوگا پس ارشاد ہے) جو لوگ (بعد نزول ان آیات کے بھی) چاہتے ہیں (یعنی اسکی کوشش عملی کرتے ہیں) کہ بے حیائی کی بات کا مسلمانوں میں چرچا ہو۔ (یعنی یہ خبر شائع ہو کہ ان مسلمانوں میں بے حیائی کی بات ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ جو لوگ ان حضرات مقدسین کیطرف زنا کی نسبت کرتے ہیں) اُن کے لئے دُنیا و آخرت میں سزائے دردناک (مقرر) ہے اور (اس امر پر سزا کا تعجب مت کرو کیونکہ) اللہ تعالیٰ جانتا ہے (کہ کون معصیت کس درجہ کی ہے) اور تم (اسکی حقیقت پوری) نہیں جانتے (رواہ فی الدر عن ابن عباسؓ۔ آگے ان لوگوں کو خطاب ہے جنھوں نے توبہ کرلی اور اس پر آخرت کے عذابِ عظیم سے محفوظ ہوگئے) اور (اے تائبین) اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے (جس نے تم کو توفیق توبہ کی دی) اور

یہ کہ اللہ بڑا شفیق بڑا رحیم ہے (جس نے تمھاری توبہ قبول کرلی) تو تم بھی (اس وعید سے) نہ بچتے (آگے
مسلمانوں کو اپنی رحمت سے بلا تخصیص اس معصیت مذکورہ کے تمام معاصی سے احتراز رکھنے کا امر اور
تزکیہ بالتوبہ کی تصریح ہے جو اہتمام کے واسطے بعنوانات مختلفہ مکرر ہے ارشاد فرماتے ہیں کہ) اے ایمان
والو تم شیطان کے قدم بقدم مت چلو (یعنی اس کے اغواء و اضلال پر عمل مت کرو) اور جو شخص شیطان
کے قدم بقدم چلتا ہے تو وہ (ہمیشہ ہر شخص کو) بے حیائی اور نامعقول ہی کام کرنے کو کہے گا (جیسا اس
واقعۂ افک میں تم نے دیکھ لیا) اور (شیطان کے قدم بقدم چل چلنے کے اور گناہ سمیٹ لینے کے بعد
اس کے وبال و ضرر سے جو کہ ثابت ہو ہی چکا تھا نجات دیدینا یہ بھی ہمارا ہی فضل تھا ورنہ) اگر تم پر
اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی کبھی بھی (توبہ کرکے) پاک صاف نہ ہوتا (یا تو توبہ کی
توفیق ہی نہ ہوتی جیسا منافقین کو نہ ہوئی اور یا توبہ قبول نہ کی جاتی، کیونکہ ہم پر کوئی چیز واجب تو ہے
نہیں) ولیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے (توبہ کی توفیق دے کر) پاک صاف کر دیتا ہے (اور بعد
توبہ کے اپنے فضل سے وعدہ قبولیت کا بھی فرمالیا ہے) اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے
(پس تمھاری توبہ سن لی اور تمھاری ندامت جان لی اس لئے فضل فرما دیا۔ آگے اسکا بیان ہے کہ بعد
نزول آیات براءۃ کے بعض صحابہ نے (جنمیں ابوبکر صدیق رض بھی ہیں، رواہ البخاری اور دوسرے صحابہ
بھی ہیں۔ کذا فی الدر المنثور عن ابن عباسؓ) شدت غیظ میں قسم کھالی کہ جس جس نے یہ چرچا کیا اگر
جن میں حاجتمند بھی تھے اُن کو اب سے کسی قسم کی مالی امداد نہ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی عفو تقصیر
اور امداد جاری کر دینے کے لئے ارشاد فرماتے ہیں) اور جو لوگ تم میں (دینی) بزرگی اور (دنیوی) وسعت والے ہیں وہ اہل قرابت
کو اور مساکین کو اور اللہ کی راہ میں ہجرت والوں کو دینے سے قسم نہ کھا بیٹھیں (یعنی اس قسم کے
مقتضیٰ پر قائم نہ رہیں بلکہ توڑ ڈالیں یہ مطلب ہے ورنہ قسم تو ہو ہی چکی تھی، یعنی ان صفات کا مقتضیٰ
ہے امداد کرنا خصوصاً جس میں کوئی سبب امداد کرنے کا ہو جیسے حضرت مسطح رض کہ وہ حضرت ابوبکر رض
کے نزدیک کے رشتہ دار بھی ہیں اور مسکین اور مہاجر بھی ہیں، آگے ترغیب کے لئے فرماتے ہیں کہ) اور چاہئے کہ
یہ معاف کر دیں اور درگزر کریں کیا تم یہ بات نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف کر دے (سو تم بھی اپنے قصور واروں کو
معاف کر دو) بیشک اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے (سو تم کو بھی تخلق باخلاق الٰہیہ چاہئے آگے منافقین
کی وعید کی تفصیل ہے جسکا اوپر اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ الخ میں اجمالاً ذکر تھا یعنی) جو لوگ (بعد نزول
آیات کے بدکاری کی) تہمت لگاتے ہیں ان عورتوں کو جو پاکدامن ہیں (اور) ایسی باتوں (کے کرنے
اور اسکے ارادے) سے (بھی محض) بے خبر ہیں (اور) ایمان والیاں ہیں (اور جن کی براءۃ نص قرآن
سے ثابت ہو چکی ہے اور جمع لانا اسلئے ہے کہ سب ازواج مطہرات کو شامل ہو جائے کہ الطیبات
سے سب کی طہارت ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ جو ایسی مطہرات کو متہم کریں کافر اور

منافق ہی ہوسکتے ہیں) ان پر دُنیا اور آخرت میں لعنت کی جاتی ہے (یعنی خدا تعالیٰ کی رحمت خاصہ سے دارین میں بوجہ کفر کے دُور ہونگے) اور ان کو (آخرت میں) بڑا عذاب ہوگا جس روز ان کیخلاف ان کی زبانیں گواہی دیں گی اور اُن کے ہاتھ اور ان کے پاؤں بھی (گواہی دیں گے) ان کاموں کی جو کہ یہ لوگ کیا کرتے تھے (مثلاً زبان کہے گی کہ اس نے میرے ذریعہ سے فلاں فلاں کفر کی بات بکی۔ اور ہاتھ پاؤں کہیں گے کہ اس نے ترویج کفریات کے لئے یوں تگاپو کی) اس روز اللہ تعالیٰ اُن کو انکا واجبی بدلہ پُورا پُورا دیگا اور (اس روز ٹھیک ٹھیک) ان کو معلوم ہوگا کہ اللہ ہی ٹھیک فیصلہ کرنے والا (اور) بات (کی حقیقت) کو کھول دینے والا ہے (یعنی اب تو بوجہ کفر کے اس بات کا اعتقاد انکو کما حقہٗ نہیں مگر قیامت کے روز معلوم ہوجاویگا اور یہ معلوم کرکے بالکل نجات سے مایوس ہوجائیں گے، کیونکہ ان کے مناسب فیصلہ عذاب ابدی ہے یہ آیتیں غیر تائبین کے بارے میں ہیں جو نزول آیات برأت کے بعد بھی اعتقاد تہمت سے باز نہیں آئے۔ تائبین کو فَضْلُ اللّٰهِ وَرَحْمَتُهٗ میں مرحوم دارین فرمایا اور غیر تائبین کو لُعِنُوْا میں ملعون دارین فرمایا۔ تائبین کو لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ میں عذاب سے محفوظ بتلایا تھا اور غیر تائبین کو لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ میں۔ نیز اس سے قبل وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ الخ میں مبتلائے عذاب بتلایا۔ تائبین کے لئے اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ میں بشارت عفو و غفران یعنی ستر معصیت کی فرمائی تھی اور غیر تائبین کے لئے تَشْهَدُ اور يُوَفِّيْهِمُ میں وعید عدم عفو اور فضیحت کی فرمائی۔ تائبین کو مَا زَكٰى مِنْكُمْ الخ میں طاہر بتلایا تھا غیر تائبین کو اگلی آیت میں خبیث فرمایا جس میں مضمون برأت پر استدلال کرکے قصہ کو ختم فرمایا ہے یعنی یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ) گندی عورتیں گندے مَردوں کے لائق ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لائق ہوتے ہیں اور ستھری عورتیں ستھرے مَردوں کے لائق ہوتی ہیں اور ستھرے مرد ستھری عورتوں کے لائق ہوتے ہیں (ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ ضروریات سے ہے کہ جناب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ہر چیز آپ کے لائق اور مناسب ہی دی گئی ہے اور وہ سُتھری ہی چیزیں ہیں تو ضرور اس مقدمہ ضروریہ کے اعتبار سے آپ کی بی بی بھی ستھری ہیں اور اُن کے سُتھرے ہونے سے اس تہمت خاص سے حضرت صفوانؓ کا منزہ ہونا بھی لازم آیا اسی لئے آگے فرماتے ہیں کہ) یہ اس بات سے پاک ہیں جو یہ (منافق) بکتے پھرتے ہیں ان (حضرات) کے لئے (آخرت میں) مغفرت اور عزت کی روزی (یعنی جنّت) ہے۔

معارف و مسائل

حضرت صدیقہ عائشہ رضؓ کے خصوصی فضائل کمالات اور قصہ اِفک کا کچھ بقیہ

رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں نے آپکے خلاف اپنی ساری ہی تدبیریں صرف کرڈالیں اور آپؐ کو ایذا پہنچانے کی

جو جو صورتیں کسی کے ذہن میں آسکتی تھیں وہ سبھی جمع کی گئیں۔ کفار کیطرف سے جو ایذائیں آپکو پہنچی ہیں اُن میں شاید یہ آخری سخت اور روحانی ایذا تھی کہ ازواج مطہرات میں سب سے زیادہ عالم فاضل اور مقدس ترین اُم المومنین صدیقہ عائشہؓ پر اور اُن کے ساتھ حضرت صفوان بن معطلؓ جیسے مقدس صحابی پر عبداللہ ابن اُبَی منافق نے تہمت گھڑی۔ منافقین نے اس کو رنگ دیئے اور پھیلایا۔ اسمیں سب سے زیادہ رنج وہ یہ بات ہوئی کہ چند سیدھے سادے مسلمان بھی اُن کی سازش سے متأثر ہوکر تہمت کے تذکرے کرنے لگے۔ اس بے اصل و بے دلیل ہوائی تہمت کی چند روز میں خود ہی حقیقت کھل جاتی مگر اُم المومنینؓ کو اور خود رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جو اس تہمت سے رُوحانی ایذا پہنچی تھی حق تعالیٰ نے اُسکے ازالہ اور صدیقہ رضؓ کی برارت کے لئے وحی الٰہی کے کسی اشارہ پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ قرآن کے تقریباً دو رکوع ان کی برارت میں نازل فرمائے۔ اور جن لوگوں نے یہ تہمت گھڑی یا جن لوگوں نے اسکے تذکرے میں حصہ لیا ان سب پر عذابِ دنیا و آخرت کی ایسی وعیدیں بیان فرمائیں کہ شاید اور کسی موقع پر ایسی وعیدیں نہیں آئیں۔

درحقیقت اس واقعہ افک نے حضرت صدیقہ عائشہؓ کی عفت وتقدس کے ساتھ اُن کی اعلیٰ عقل وفہم کے کمالات کو بھی روشن کردیا۔ اسی لئے اس واقعہ میں جو آیات اُوپر مذکور ہوئیں اُنہیں سے پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس حادثہ کو اپنے لئے شر نہ سمجھو بلکہ یہ تمھارے لئے خیر ہے اس سے بڑی خیر کیا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے دسؔ آیات میں اُن کی پاکی اور نزاہت کی شہادت دی جو قیامت تک تلاوت کی جائے گی۔ خود صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے اپنی جگہ یہ تو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر میری صفائی اور برارت ظاہر فرما دیں گے مگر میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ میرے معاملہ میں قرآن کی آیات نازل ہوجاویں گی جو ہمیشہ پڑھی جاویں گی۔ اس جگہ واقعہ کی کچھ مزید تفصیل جان لینا بھی آیات کے سمجھنے میں معین ہوگا اسلئے اسکو مختصراً لکھا جاتا ہے۔

اس سفر سے واپس آنے کے بعد حضرت صدیقہؓ اپنے گھریلو کاموں میں مشغول ہوگئیں ان کو کچھ خبر نہیں تھی کہ منافقین نے اُن کے بارے میں کیا خبریں اُڑائی ہیں۔ صحیح بخاری کی روایت میں خود حضرت صدیقہؓ کا بیان یہ ہے کہ سفر سے واپسی کے بعد کچھ میری طبیعت خراب ہوگئی اور سب سے بڑی وجہ طبیعت خراب ہونے کی یہ ہوگئی کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وہ لطف و کرم اپنے ساتھ نہ دیکھتی تھی جو ہمیشہ سے معمول تھا بلکہ اس عرصہ میں آپؐ کا معاملہ یہ رہا کہ گھر میں تشریف لاتے اور سلام کرتے پھر پُوچھ لیتے کیا حال ہے اور واپس تشریف لیجاتے تھے۔ مجھے چونکہ اسکی کچھ خبر نہ تھی کہ میرے بارے میں کیا خبر مشہور کیجارہی ہے اس لئے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

سے اس طرزِ عمل کا راز مجھ پر نہ کھلتا تھا۔ میں اسی غم میں گھلنے لگی۔ ایک روز اپنی کمزوری کی وجہ سے
مِسطحؓ صحابی کی والدہ اُمِّ مِسطحؓ کو ساتھ لیکر میں نے قضاءِ حاجت کے لئے باہر جانیکا ارادہ کیا کیونکہ
اُسوقت گھروں میں بیت الخلاء بنانے کا رواج نہ تھا۔ جب میں قضاءِ حاجت سے فارغ ہوکر
گھر کیطرف آنے لگی تو اُمِّ مسطحؓ کا پاؤں اُن کی بڑی چادر میں اُلجھا اور یہ گر پڑیں۔ اسوقت انکی زبان
سے یہ کلمہ نکلا تَعِسَ مِسطَحٌ یہ ایسا کلمہ ہے جو عرب میں بددعا کے لئے استعمال ہوتا ہے اسمیں ماں کی
زبان سے اپنے بیٹے مسطح کے لئے بددُعا کا کلمہ سُن کر صدیقہ عائشہؓ کو تعجب ہوا۔ ان سے فرمایا کہ یہ بہت
بُری بات ہے تم ایک نیک آدمی کو بُرا کہتی ہو جو غزوۂ بدر کا شریک تھا یعنی ان کا بیٹا مسطحؓ، اِس پر
اُمِّ مسطحؓ نے تعجب سے کہا کہ بیٹی کیا تم کو خبر نہیں کہ مسطحؓ میرا بیٹا کیا کہتا پھرتا ہے۔ میں نے پوچھا وہ
کیا کہتا ہے تب اُن کی والدہ نے مجھے یہ سارا واقعہ اہلِ افک کی چلائی ہوئی تہمت کا اور مسطحؓ کا اسمیں
شریک ہونا بیان کیا۔ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ یہ سُنکر میرا مرض دوگنا ہوگیا۔ جب میں گھر میں واپس
آئی اور حسبِ معمول رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے سلام کیا اور مزاج پُرسی فرمائی تو صدیقہؓ
نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ اپنے والدین کے گھر چلی جاؤں۔ آپؐ نے اجازت
دیدی۔ منشاء یہ تھا کہ والدین سے اس معاملہ کی تحقیق کریں۔ میں نے جاکر والدہ سے پُوچھا، اُنھوں نے
تسلی دی کہ تم جیسی عورتوں کے دشمن ہوا کرتے ہیں اور ایسی چیزیں مشہور کیا کرتے ہیں تم اسکے غم میں نہ
پڑو خود بخود معاملہ صاف ہوجاویگا۔ میں نے کہا، سُبحان اللہ! لوگوں میں اسکا چرچا ہوچکا میں
اس پر کیسے صبر کروں۔ میں ساری رات روتی رہی، نہ میرا آنسو تھما نہ آنکھ لگی۔ دوسری طرف
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو اس خبر کے پھیلنے سے سخت غمگین تھے اور اس عرصہ میں اس معاملے کے
متعلق کوئی وحی بھی آپ پر نہ آئی تھی اسلئے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور اُسامہ بن زیدؓ جو دونوں گھر
کے ہی آدمی تھے ان سے مشورہ لیا کہ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ حضرت اُسامہ بن زیدؓ نے
تو کُھل کر عرض کیا کہ جہانتک ہمارا علم ہے ہمیں عائشہؓ کے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں۔ انکی کوئی
بات ایسی نہیں جس سے بدگمانی کی راہ پیدا ہو۔ آپ ان افواہوں کی کچھ پرواہ نہ کریں۔ حضرت
علی کرم اللہ وجہہٗ نے (آپؐ کو غم و اضطراب سے بچانے کے لئے) یہ مشورہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ
پر کچھ تنگی نہیں فرمائی اگر افواہوں کی بناء پر عائشہؓ کیطرف سے کچھ تکدر طبعی ہوگیا ہے تو عورتیں
اور بہت ہیں۔ اور آپ کا یہ تکدر اسطرح بھی رفع ہوسکتا ہے کہ بریرہؓ جو صدیقہ عائشہؓ کی
کنیز ہیں اُن سے انکے حالات کی تحقیق فرمالیجئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بریرہؓ سے
پُوچھ گچھ فرمائی بریرہؓ نے عرض کیا کہ اور تو کوئی بات عیب کی مجھے ان میں نظر نہیں آئی بجز
اسکے کہ نوعمر لڑکی ہیں بعض اوقات آٹا گوندھ کر رکھدیتی ہیں خود سوجاتی ہیں بکری آکر آٹا

کھا جاتی ہے (اسکے بعد حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خطبہ پڑھنا اور برسرِ منبر تہمت گھڑنے والوں اور افواہ پھیلانے والوں کی شکایت کا ذکر فرمانا اور طویل قصہ مذکور ہے۔ آگے کا مختصر قصہ یہ ہے کہ) صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے یہ سارا دن پھر دوسری رات بھی مسلسل روتے ہوئے گزری میرے والدین بھی میرے پاس آگئے تھے وہ ڈر رہے تھے کہ رونے سے میرا کلیجہ پھٹ جائیگا۔ میرے والدین میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھ گئے اور جب سے یہ قصہ چلا تھا اس سے پہلے آپ میرے پاس آکر نہ بیٹھے تھے پھر آپ نے ایک مختصر خطبہ شہادت پڑھا اور فرمایا اے عائشہ مجھے تمھارے بارمیں یہ باتیں پہنچی ہیں۔ اگر تم بری ہو تو ضرور اللہ تعالے تمھیں بری کر دینگے (یعنی برارت کا اظہار بذریعہ وحی فرما دینگے) اور اگر تم سے کوئی لغزش ہوگئی ہے تو اللہ سے توبہ استغفار کرو کیونکہ بندہ جب اپنے گناہ کا اعتراف کرکے توبہ کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکی توبہ قبول فرمالیتے ہیں۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا کلام پورا فرمالیا تو میرے آنسو بالکل خشک ہوگئے، میری آنکھوں میں ایک قطرہ نہ رہا۔ میں نے اپنے والد ابوبکر صدیقؓ سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بات کا جواب دیجئے۔ ابوبکرؓ نے عذر کیا کہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ پھر میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ آپ جواب دیجئے انھوں نے بھی عذر کردیا کہ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اب مجبور ہوکر مجھے ہی بولنا پڑا، میں ایک کم عمر لڑکی تھی اب تک قرآن بھی زیادہ نہیں پڑھ سکی تھی۔ اسوقت اس رنج وغم اور انتہائی صدمہ کی حالت میں جبکہ اچھے اچھے عقلاء کو بھی کوئی معقول کلام کرنا آسان نہیں ہوتا حضرت صدیقہؓ نے جو کچھ فرمایا وہ ایک عجیب و غریب عاقلانہ فاضلانہ کلام ہے اسکے الفاظ بعینہٖ لکھے جاتے ہیں۔

واللہ لقد عرفت لقد سمعتم ھذا الحدیث حتی استقر فی انفسکم وصدقتم بہ ولئن قلت لکم انی بریئۃ واللہ یعلم انی بریئۃ لا تصدقونی ولئن اعترفت لکم بامر واللہ یعلم انی منہ بریئۃ لتصدقونی واللہ لا اجد لی ولکم مثلا الا کما قال ابو یوسف فصبر جمیل واللہ المستعان علیٰ ما تصفون

بخدا مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ آپ نے اس بات کو سُنا اور سُنتے رہے یہاں تک کہ آپ کے دل میں بیٹھ گئی اور آپ نے اُسکی (عملاً) تصدیق کردی۔ اب اگر میں یہ کہتی ہوں کہ میں اس سے بری ہوں جیسا کہ اللہ جانتا ہے کہ واقع میں بری ہوں تو آپ میری تصدیق نہ کرینگے اور اگر میں ایسے کام کا اعتراف کرلوں جس سے میرا بری ہونا اللہ تعالے جانتا ہے تو آپ میری بات مان لیں گے۔ واللہ اب میں اپنے اور آپکے معاملہ کی کوئی مثال بجز اسکے نہیں پاتی جو یوسف علیہ السلام کے والد یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کی غلط بات سُنکر فرمائی تھی کہ میں صبر جمیل اختیار کرتا ہوں اور اللہ سے اُس معاملہ میں مدد طلب کرتا ہوں جو تم بیان کررہے ہو۔

صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں کہ اتنی بات کرکے میں الگ اپنے بستر پر جاکر لیٹ گئی اور فرمایا کہ مجھے یقین تھا کہ جیسا کہ میں فی الواقع بری ہوں اللہ تعالیٰ میری برارت کا اظہار بذریعہ وحی ضرور فرمادیں گے لیکن یہ وہم وخیال بھی نہ تھا کہ میرے معاملے میں قرآن کی آیات نازل ہونگی جو ہمیشہ تلاوت کی جاوینگی کیونکہ میں اپنا مقام اس سے بہت کم محسوس کرتی تھی۔ ہاں یہ خیال تھا کہ غالباً آپ کو خواب میں میری برارت ظاہر کردیجاوے گی۔ صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی اس مجلس سے ابھی نہیں اٹھے تھے اور گھروالوں میں بھی کوئی نہیں اٹھا تھا کہ آپؐ پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو نزول وحی کے وقت ہوا کرتی تھی جس سے سخت سردی کے زمانے میں آپ کی پیشانی مبارک سے پسینہ پھوٹنے لگتا تھا جب یہ کیفیت رفع ہوئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہنستے ہوئے اٹھے اور سب سے پہلا کلمہ جو فرمایا وہ یہ تھا ابشری یا عائشۃ اما اللّٰہ فقد ابرأک یعنی اے عائشہ رضؓ خوشخبری سنو اللہ تعالےٰ نے تو تمھیں بری کردیا۔ میری والدہ نے کہا کہ کھڑی ہوجاؤ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو، میں نے کہا کہ نہ میں اس معاملہ میں اللہ کے سوا کسی کا احسان مانتی ہوں نہ کھڑی ہوں گی میں اپنے رب کی شکرگزار ہوں کہ اسی نے مجھے بری فرمایا۔

حضرت صدیقہ رضؓ کی چند خصوصیات

امام بغویؒ نے انھیں آیات کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ حضرت صدیقہ عائشہ رضؓ کی چند خصوصیات ایسی ہیں جو ان کے علاوہ کسی دوسری عورت کو نصیب نہیں ہوئیں اور صدیقہ عائشہ رضؓ بھی (بطور تحدیث بالنعمۃ) ان چیزوں کو فخر کے ساتھ بیان فرمایا کرتی تھیں ایک یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے سے پہلے جبرئیل امینؑ ایک ریشمی کپڑے میں میری تصویر لیکر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا کہ یہ تمھاری زوجہ ہے (رواہ الترمذی عن عائشہؓ) اور بعض روایات میں ہے کہ جبرئیل امینؑ اپنی ہتھیلی میں یہ صورت لیکر تشریف لائے تھے۔

دوسری یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوا کسی کنواری لڑکی سے نکاح نہیں کیا۔ **تیسری** یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات انکی گود میں ہوئی۔ **چوتھی** یہ کہ بیتِ عائشہ رضؓ ہی میں آپ مدفون ہوئے۔ **پانچویں** یہ کہ آپ پر اسوقت بھی وحی نازل ہوتی تھی جبکہ آپ حضرت صدیقہ رضؓ کے ساتھ ایک لحاف میں ہوتے تھے دوسری کسی بی بی کو یہ خصوصیت حاصل نہ تھی۔ **چھٹی** یہ کہ آسمان سے اُن کی برارت نازل ہوئی۔ **ساتویں** یہ کہ وہ خلیفۂ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہیں اور صدیقہ ہیں اور اُن میں سے ہیں جن سے دُنیا ہی میں مغفرت کا اور رزقِ کریم کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا ہے۔ (مظہری)

حضرت صدیقہ رضؓ کی فقیہانہ اور عالمانہ تحقیقات اور فاضلانہ تقریر کو دیکھکر حضرت موسیٰ بن طلحہؓ نے فرمایا کہ میں نے صدیقہ عائشہؓ سے زیادہ فصیح و بلیغ نہیں دیکھا۔ (رواہ الترمذی)

تفسیر قرطبی میں نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام پر تہمت لگائی گئی تو اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹے بچے کو گویائی دیکر اُس کی شہادت سے اُن کی برات ظاہر فرمائی اور حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت لگائی گئی تو اللہ تعالیٰ نے اُنکے فرزند عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت سے اُن کو بری کیا اور حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت لگائی گئی تو اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم کی دسؔ آیات نازل کرکے اُن کی برات کا اعلان کیا، جس نے اُن کے فضل و عزت کو اور بڑھا دیا۔

آیاتِ مذکورہ کی اجمالی تفسیر خلاصۂ تفسیر کے عنوان میں آچکی ہے اب آیات کے خاص خاص جملوں سے متعلق کچھ مباحث ہیں وہ دیکھئے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ، اِفْك کے اصلی لغوی معنے پلٹ دینے اور بدل دینے کے ہیں۔ بدترین قسم کا جھوٹ جو حق کو باطل سے اور باطل کو حق سے بدلدے پاکباز متقی کو فاسق، فاسق کو متقی پرہیزگار بنا دے ایسا جھوٹ کو بھی افک کہتے ہیں۔ عُصْبَة کے معنے جماعت کے ہیں جو دسؔ سے چالیسؔ تک ہو، اس سے کم و بیش کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے مِنْكُمْ سے مُراد مؤمنین ہیں۔ اس تہمت کا اصل گھڑنے والا اگرچہ مسلمان نہیں بلکہ منافق عبداللہ ابن اُبَی تھا جو مؤمنین میں داخل نہیں مگر منافقین جو دعویٰ اسلام کا کرتے تھے اُن پر بھی ظاہری احکام مؤمنین کے جاری ہوتے تھے اسلئے مِنْكُمْ کے لفظ میں اسکو بھی شامل کر لیا گیا۔ مسلمانوں میں سے دوؔ مرد اور ایک عورت اسمیں مبتلا ہوئے جن پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے آیات نازل ہونے کے بعد حدِ قذف جاری فرمائی۔ کما مرّ سابقاً۔ مگر مؤمنین سب تائب ہو گئے اور اللہ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی اُنہیں سے حضرت حسانؓ اور مسطحؓ دونوں شرکائے بدر میں سے ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مغفرت کا اعلان فرما دیا ہے۔ اسی لئے حضرت صدیقہ عائشہؓ کے سامنے کوئی حضرت حسانؓ کی بُرائی کرتا تو وہ پسند نہ کرتی تھیں اگرچہ یہ بھی اُن دو مَردوں میں شامل تھے جن پر حدِ قذف لگائی گئی تھی اور صدیقہؓ فرماتی تھیں کہ حسانؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیطرف سے کفار کا شاعرانہ مقابلہ خوب کیا ہے اسلئے ان کو بُرا نہیں کہنا چاہئیے۔ اور وہ جب صدیقہ عائشہؓ کے پاس حاضر ہوتے تو اُن کو تعظیم تکریم کے ساتھ بٹھاتی تھیں۔ (مظہری وغیرہ)

لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ، یہ خطاب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صدیقہ عائشہؓ اور صفوانؓ اور تمام مؤمنین کو ہے جن کو اس افواہ کی اشاعت سے صدمہ پہنچا۔ اور معنے یہ ہیں کہ اس واقعہ کو آپ بُرا نہ سمجھیں کیونکہ اللہ تعالےٰ نے قرآن میں برات نازل فرما کر ان کا اعزاز اور بڑھا دیا۔ اور جن لوگوں نے یہ حرکات کی تھیں اُن کی وعید شدید نازل فرما دی جو قیامت تک محرابوں میں پڑھی جائے گی۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ، یعنی جن لوگوں نے اس بہتان میں جتنا حصہ لیا اُسی مقدار سے اسکا گناہ لکھا گیا ہے اور اُسی تناسب سے اُس کو عذاب ہوگا۔ جس نے یہ خبر گھڑی اور چلتی کی جسکا ذکر آگے آتا ہے وہ سب سے زیادہ عذاب کا مستحق ہے، جس نے خبر سُنکر تائید کی وہ اُس سے کم، جس نے سُنکر سکوت کیا وہ اُس سے کم۔

وَالَّذِي تَوَلَّى كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ، لفظ کِبْر بکسر الکاف کے معنے بڑے کے ہیں مُراد یہ ہے جس نے اس تہمت میں بڑا کام کیا یعنی اسکو گھڑا اور چلتا کیا اسکے لئے عذاب عظیم ہے مُراد اس سے عبداللہ بن اُبی منافق ہے (رواہ البغوی وغیرہ)

لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ ، یعنی ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے اس تہمت کی خبر سُنی تھی تو مُسلمان مرد اور مُسلمان عورتیں اپنے بارے میں یعنی اپنے مسلمان بھائی بہن کے بارے میں نیک گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ کھُلا جھوٹ ہے۔ اس آیت میں کئی چیزیں قابلِ غور ہیں اوّل یہ کہ بِأَنفُسِهِمْ کے لفظ سے قرآن کریم نے یہ اشارہ کیا کہ جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو بدنام و رُسوا کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی کو رُسوا کرتا ہے کیونکہ اسلام کے رشتہ نے سب کو ایک بنا دیا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے تمام مواقع میں یہ اشارہ استعمال فرمایا ہے جیسا ایک جگہ فرمایا لَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ یعنی عیب نہ لگاؤ اپنے آپ کو۔ مُراد اس سے یہ ہے کہ کسی بھائی مسلمان مرد یا عورت کو۔ دوسری جگہ فرمایا لَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ، اپنے آپ کو قتل نہ کرو مُراد وہی ہے کہ کسی بھائی مسلمان کو قتل نہ کرو۔ تیسری جگہ فرمایا وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَارِكُمْ، یعنی نہ نکالو اپنے آپ کو اپنے گھروں سے۔ یہاں بھی کسی مسلمان بھائی کو اُسکے گھر سے نکالنا مُراد ہے۔ چوتھی جگہ فرمایا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ، یعنی اپنے آپکو سلام کرو۔ مُراد وہی بھائی مُسلمان کو سلام کرنا ہے۔ یہ سب آیاتِ قرآن یہ ضمنی ہدایت دیتی ہیں کہ ایک مسلمان جو دوسرے کسی بھی مسلمان پر عیب لگاتا یا اسکو ایذا و نقصان پہنچاتا ہے حقیقت کے اعتبار سے خود اپنے کو عیب دار کرتا ہے اور خود نقصان و تکلیف اُٹھاتا ہے کیونکہ اس کا انجام پُوری قوم کی رُسوائی اور بدنامی ہوتی ہے بقول سعدی ؎

چو از قومے یکے بے دانشی کرد ❖ نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

قرآن کی اسی تعلیم کا اثر تھا کہ جب مسلمان اُبھرے تو پوری قوم کے ساتھ اُبھرے، اُن کا ہر فرد اُبھرا۔ اور اسی کے چھوڑنے کا نتیجہ آج آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ سب گرے اور ہر فرد گرا۔

دوسری بات اس آیت میں یہ قابلِ نظر ہے کہ مقام کا تقاضا یہ تھا کہ لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَنتُمْ بِأَنفُسِكُمْ خَيْرًا بصیغہ خطاب کہا جاتا جیسا کہ شروع میں سَمِعْتُمُوهُ بصیغہ خطاب آیا ہے مگر

قرآن کریم نے اس مختصر جملے کو چھوڑ کر اس جگہ طرز بدلا کہ صیغہ خطاب یعنی ظَنَنْتُمْ کے بجائے ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ فرمایا۔ اسمیں ہلکا سا اشارہ اس بات کیطرف ہے کہ یہ فعل جن لوگوں سے سرزد ہوا وہ اس فعل کی حد تک مؤمنون کہلانے کے مستحق نہیں کیونکہ ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے حسنِ ظن قائم رکھتا۔

تیسری بات یہ قابلِ نظر ہے کہ اس آیت کے آخری جملے وَقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تقاضا ایمان کا یہ تھا کہ مسلمان اس خبر کو سنتے ہی کہدیتے کہ یہ کھلا جھوٹ ہے اس سے ثابت ہوا کہ کسی مسلمان کے بارے میں جب تک کسی گناہ یا عیب کا علم کسی دلیلِ شرعی سے نہ ہو جائے اسوقت تک اُس کے ساتھ نیک گمان رکھنا اور بلا کسی دلیل کے عیب و گناہ کی بات اُس کی طرف منسوب کرنے کو جھوٹ قرار دینا عین تقاضائے ایمان ہے۔

مسئلہ ۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان مرد و عورت کے ساتھ اچھا گمان رکھنا واجب ہے جب تک کسی دلیلِ شرعی سے اسکے خلاف ثابت نہ ہو جائے۔ اور جو شخص بلا دلیلِ شرعی کے اُس پر الزام لگاتا ہے اُس کی بات کو رد کرنا اور جھوٹا قرار دینا بھی واجب ہے کیونکہ وہ محض ایک غیبت اور مسلمان کو بلا وجہ رُسوا کرنا ہے۔ (مظہری)

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ، اس آیت کے پہلے جملہ میں تو اسکی تلقین ہے کہ ایسی خبر مشہور کرنیوالوں کے بارہ میں مسلمانوں کو چاہیئے تھا کہ اُن کی بات کو چلتا کرنے کے بجائے اُن سے مطالبہ دلیل کا کرتے اور چونکہ تہمت زنا کے معاملے میں دلیلِ شرعی چار گواہوں کے بغیر قائم نہیں ہوتی اسلئے اُن سے مطالبہ یہ کرنا چاہیئے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اُس پر چار گواہ پیش کرو یا زبان بند کرو۔ دوسرے جملے میں فرمایا کہ جب وہ چار گواہ نہیں لاسکے تو اللہ کے نزدیک یہی لوگ جھوٹے ہیں۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ایسا ہونا کچھ بعید نہیں کہ ایک شخص نے اپنی آنکھ سے ایک واقعہ دیکھا مگر اُسکو اس پر دوسرے گواہ نہیں ملے تو اگر یہ شخص اپنے چشم دید واقعہ کو بیان کرتا ہے تو اس کو جھوٹا کیسے کہا جاسکتا ہے خصوصاً اللہ کے نزدیک جھوٹا کہنا تو کسی طرح سمجھ ہی میں نہیں آتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو سب واقعات کے حقائق معلوم ہیں اور یہ واقعہ وجود میں آنا بھی معلوم ہے تو وہ عند اللہ جھوٹ بولنے والا کیسے قرار پایا۔ اس کے دو جواب ہیں اول یہ کہ یہاں عند اللہ سے مُراد حکم اللہ اور قانونِ الٰہی ہے یعنی یہ شخص قانونِ الٰہی اور حکمِ خداوندی کی رو سے جھوٹا قرار دیا جائیگا اور اسپر حدِ قذف جاری کی جائے گی کیونکہ حکمِ ربانی یہ تھا کہ جب چار گواہ نہ ہوں تو واقعہ دیکھنے کے باوجود اس کو بیان نہ کرو اور جو بغیر چار گواہوں کے بیان کرے گا وہ

قانوناً اور حکماً جھوٹا قرار پاکر سزا پائے گا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ مسلمان کی شان یہ ہے کہ کوئی کام فضول نہ کرے جبکا کوئی فائدہ نتیجہ نہ ہو خصوصاً ایسا کام جسمیں دوسرے مسلمان پر کوئی الزام عائد ہوتا ہو تو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے خلاف کسی عیب و گناہ کی شہادت صرف اس نیت سے دے سکتا ہے کہ جرم و گناہ کا انسداد مقصود ہو کسی کو رُسوا کرنا یا ایذا دینا مقصود نہ ہو تو جس شخص نے چار گواہوں کے بغیر اس قسم کی شہادت زبان سے نکالی گویا اُسکا دعویٰ یہ ہے کہ میں یہ کلام اصلاحِ خلق اور معاشرہ کو بُرائی سے بچانے اور انسدادِ جرائم کی نیت سے کر رہا ہوں مگر جب شریعت کا قانون اسکو معلوم ہے کہ بغیر چار گواہوں کے ایسی شہادت دینے سے نہ اُس شخص پر کوئی حد و سزا جاری ہوگی اور نہ ثبوت بہم پہنچے گا بلکہ اُلٹی جھوٹ بولنے کی سزا کا میں مستحق ہوجاؤنگا تو اسوقت وہ عند اللہ اپنی اس نیت کے دعویٰ میں جھوٹا ہے کہ میں اصلاحِ خلق اور انسدادِ جرائم کی نیت سے یہ شہادت دے رہا ہوں کیونکہ شرعی ضابطہ کے مطابق شہادت نہ ہونے کی صورت میں یہ نیت ہو ہی نہیں سکتی۔ (مظہری)

ایک اہم اور ضروری تنبیہ: مذکورہ دونوں آیتوں میں ہر مسلمان کو دوسرے مسلمانوں سے حُسنِ ظن رکھنے کی ہدایت اور اسکے خلاف بے دلیل باتوں کی تردید کو واجب قرار دیا ہے اس پر کسی کو یہ شبہ نہ ہونا چاہیئے کہ پھر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی سے اس خبر کے غلط ہونے پر یقین کیوں نہ فرمایا اور اس خبر کی تردید کیوں نہ کردی اور ایک مہینہ تک تردّد کی حالت میں کیوں رہے یہاں تک کہ حضرت صدیقہ عائشہؓ سے فرمایا کہ اگر تم سے کوئی لغزش ہوگئی ہو تو توبہ کر لینا چاہیئے (کما رواہ البخاری)

وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر حُسنِ ظن رکھنے کا جو حکم ہے وہ اس تردد کے منافی نہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا۔ کیونکہ آپنے اس خبر کی نہ تصدیق فرمائی اور نہ اسکے مقتضا پر کوئی عمل فرمایا نہ اسکا چرچا کرنا پسند فرمایا بلکہ صحابۂ کرام کے مجمع میں یہی فرمایا کہ ما علمت علی اھلی الاخیرا۔ رواہ البخاری۔ یعنی میں اپنی اہلیہ کے بارہ میں بھلائی اور نیکی کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ یہ سب اعمال آیاتِ مذکورہ کے مقتضیٰ پر عمل اور حُسنِ ظن رکھنے کے شواہد ہیں۔ البتہ قطعی اور یقینی علم جس سے طبعی تردد بھی رفع ہو جاوے وہ اُسوقت ہوا جب آیات برات نازل ہوگئیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ دل میں کوئی شک تردّد پیدا ہو جانا اور احتیاطی تدابیر استعمال کرنا جیسا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حُسنِ ظن بالمؤمنین کے منافی نہیں تھا جبکہ اُسکے مقتضیٰ پر کوئی عمل نہ کیا گیا ہو۔ جن مسلمانوں پر اس معاملے میں حد قذف کی سزا جاری کی گئی اور ان دو آیتوں میں ان پر عتاب کیا گیا اُنھوں نے اس خبر کے مقتضیٰ پر عمل کیا تھا کہ اُسکا چرچا کیا اور پھیلایا وہ نزولِ آیات سے پہلے بھی ناجائز و موجب سزا تھا۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ لَمَسَّکُمْ فِیْ مَآ اَفَضْتُمْ فِیْہِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔ یہ آیت اُن مومنین کے بارے میں نازل ہوئی جو غلطی سے اس تہمت میں کسی قسم کی شرکت کر بیٹھے تھے پھر توبہ کرلی اور بعض پر سزا بھی جاری ہوئی۔ ان سب کو اس آیت نے یہ بھی بتلا دیا کہ جو جُرم تم سے سرزد ہوا وہ بہت بڑا جُرم تھا اُس پر دُنیا میں بھی عذاب آسکتا تھا جیسے پچھلی قوموں کے مجرموں پر آیا ہے اور آخرت میں بھی اُس پر عذاب شدید ہوتا مگر اللہ تعالیٰ کا معاملہ تم مومنین کیساتھ فضل و رحمت کا ہے، دُنیا میں بھی، آخرت میں بھی۔ اسلئے یہ عذاب تم سے ٹل گیا۔ دُنیا میں اللہ کے فضل و رحمت کے مظاہر یہ ہوئے کہ اوّل اسلام و ایمان کی توفیق بخشی پھر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف عطا فرمایا جو کہ نزولِ عذاب سے مانع ہے اور پھر جو گناہ ہو گیا تھا اُس سے سچّی توبہ کی توفیق بخشی پھر اُس توبہ کو قبول فرمالیا۔ اور آخرت میں اللہ کے فضل و رحمت کا اثر یہ ہے کہ تم سے عفو و درگزر اور مغفرت کا وعدہ فرمالیا۔

اِذْ تَلَقَّوْنَہٗ بِاَلْسِنَتِکُمْ، تَلَقِّیْ کا مفہوم یہ ہے کہ ایک دوسرے سے بات پُوچھے اور نقل کرے، یہاں بات کو سُنکر بے دلیل اور بلا تحقیق آگے چلتی کر دینا مُراد ہے۔

وَتَحْسَبُوْنَہٗ ھَیِّنًا وَّھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ عَظِیْمٌ، یعنی تم تو اس کو معمولی بات خیال کرتے تھے کہ ہم نے جیسا سُنا ویسا دوسرے سے نقل کر دیا مگر وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ تھا کہ بے دلیل اور بے تحقیق ایسی بات کو چلتا کر دیا جس سے دوسرے مسلمان کو سخت ایذا ہو، اُس کی رُسوائی ہو اور اُسکے لئے زندگی دُوبھر ہو جائے۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ قُلْتُمْ مَّا یَکُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَکَلَّمَ بِھٰذَا سُبْحٰنَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ، یعنی ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ افواہ سُنی تھی تو یوں کہدیتے کہ ہمارے لئے ایسی بات زبان سے نکالنا جائز نہیں۔ پاک ہے اللہ یہ تو بڑا بہتان ہے۔ اس آیت میں مکرر وہی ہدایت ہے جو اس سے پہلی ایک آیت میں آچکی ہے اسمیں یہ مزید وضاحت ہے کہ مسلمانوں کو ایسی خبر سُننے کے وقت کیا عمل کرنا چاہیئے وہ یہ کہ صاف کہدیں کہ ایسی بات بلا کسی دلیل کے زبان سے نکالنا بھی ہمارے لئے جائز نہیں یہ تو بہتان عظیم ہے۔

ایک شبہ اور جواب اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جیسے کسی واقعہ کا صدق بغیر دلیل کے معلوم نہیں ہوتا اس لئے اُسکا زبان سے نکالنا اور چرچا کرنا ناجائز قرار پایا اسی طرح کسی کلام کا کاذب ہونا بھی تو بغیر دلیل کے ثابت نہیں ہوتا کہ اسکو بہتانِ عظیم کہدیا جائے۔ جواب یہ ہے کہ ہر مسلمان کو گناہوں سے پاک صاف سمجھنا اصل شرعی ہے جو دلیل سے ثابت ہے اسکے خلاف جو بات بغیر دلیل کے کہی جائے اُسکو جھوٹا سمجھنے کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا کافی ہے کہ ایک مومن مسلمان

پر بغیر کسی دلیل شرعی کے الزام لگایا گیا ہے لہٰذا یہ بہتان ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ، اس آیت میں پھر اُن لوگوں کی مذمت اور اُن پر دُنیا و آخرت کے عذاب کی وعید ہے جنھوں نے اس تہمت میں کسی طرح کا حصہ لیا۔ اس آیت میں یہ بات زیادہ ہے کہ جو لوگ ایسی خبریں مشہور کرتے ہیں گویا وہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بدکاری اور فواحش پھیل جائیں۔

انسدادِ فواحش کا قرآنی نظام اور ایک اہم تدبیر جس کے نظر انداز کرنے کا نتیجہ آج کل فواحش کی کثرت ہے۔

قرآن حکیم نے فواحش کے انسداد کا یہ خاص نظام بنایا ہے کہ اوّل تو اس قسم کی خبر کہیں مشہور نہ ہونے پاوے اور شہرت ہو تو ثبوتِ شرعی کے ساتھ ہو تاکہ اُس شہرت کیساتھ ہی مجمع عام میں حدِ زنا اُس پر جاری کرکے اُس شہرت ہی کو سببِ انسداد بنا دیا جائے۔ اور جہاں ثبوتِ شرعی نہ ہو وہاں اس طرح کی بے حیائی کی خبروں کو چلتا کر دینا اور شہرت دینا جبکہ اسکے ساتھ کوئی سزا نہیں طبعی طور پر لوگوں کے دلوں سے بے حیائی اور فواحش کی نفرت کم کر دینے اور جرائم پر اقدام کرنے اور شائع کرنے کا موجب ہوتی ہے جسکا مشاہدہ آجکل کے اخبارات میں روزانہ ہوتا ہے کہ اس طرح کی خبریں ہر روز ہر اخبار میں نشر ہوتی رہتی ہیں۔ نوجوان مرد اور عورتیں اُن کو دیکھتے رہتے ہیں روزانہ ایسی خبروں کے سامنے آنے اور اُس پر کسی خاص سزا کے مرتب نہ ہونے کا لازمی اور طبعی اثر یہ ہوتا ہے کہ دیکھتے دیکھتے وہ فعلِ خبیث نظروں میں ہلکا نظر آنے لگتا ہے اور پھر نفس میں ہیجان پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے ایسی خبروں کی تشہیر کی اجازت صرف اُس صورت میں دی ہے جبکہ وہ ثبوتِ شرعی کے ساتھ ہو اُسکے نتیجہ میں خبر کے ساتھ ہی اس بے حیائی کی ہولناک پاداش بھی دیکھنے سننے والوں کے سامنے آجائے۔ اور جہاں ثبوت اور سزا نہ ہو تو ایسی خبروں کی اشاعت کو قرآن نے مسلمانوں میں فواحش پھیلانے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ کاش مسلمان اس پر غور کریں۔ اس آیت میں ایسی خبریں بلا ثبوت مشہور کرنے والوں پر دُنیا و آخرت دونوں میں عذابِ الیم ہونیکا ذکر ہے۔ آخرت کا عذاب تو ظاہر ہے کہ قیامت کے بعد ہوگا جسکا یہاں مشاہدہ نہیں ہوسکتا مگر دُنیا کا عذاب تو مشاہدہ میں آنا چاہیئے سو جن لوگوں پر حدِ قذف (تہمت کی سزا) جاری کر دی گئی اُن پر تو دُنیا کا عذاب آہی گیا۔ اور اگر کوئی شخص شرائطِ اجراءِ حد موجود نہ ہونے کی وجہ سے حدِ قذف سے بچ نکلا تو وہ دُنیا میں بھی فی الجملہ مستحق عذاب تو ٹھہرا آیت کے مصداق کیلئے یہ بھی کافی ہے۔

وَلَا یَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْٓا اُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰكِیْنَ وَالْمُهٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

صحابۂ کرام کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم | وَلَا يَأْتَلِ، ائتلاء کے معنے قسم کھانے کے ہیں۔ حضرت صدیقہؓ پر تہمت کے واقعہ میں مسلمانوں میں سے مسطحؓ اور حسانؓ مبتلا ہوگئے تھے جن پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نزولِ آیات برارت کے بعد حدِّ قذف جاری فرمائی۔ مسطحؓ اور حسانؓ دونوں ہی جلیل القدر صحابی غزوۂ بدر کے شرکاء میں سے ہیں مگر ایک لغزش ہوگئی جس سے توبہ صادقہ نصیب ہوئی اور حق تعالیٰ نے جس طرح حضرت صدیقہؓ کی برارت نازل فرمادی اسی طرح ان مؤمنین کی توبہ قبول کرنے اور معاف کرنے کا بھی اعلان فرمادیا۔

مسطحؓ حضرت صدیقِ اکبرؓ کے عزیز بھی تھے اور مفلس بھی۔ حضرت صدیق اکبرؓ ان کی مالی مدد فرمایا کرتے تھے۔ جب واقعہ اِفک میں اُن کی گونہ شرکت ثابت ہوئی تو صدیقہؓ کے والد کی شفقتِ پدری اور بیٹی کو ایسا سخت صدمہ پہنچانے کی وجہ سے طبعی طور پر مسطحؓ سے رنج پیدا ہوگیا اور قسم کھا بیٹھے کہ آئندہ ان کی کوئی مالی مدد نہیں کریں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی خاص فقیر کی مالی مدد کرنا کسی خاص مسلمان پر علی التعیین واجب نہیں، اور جس کی مالی مدد کوئی کرتا ہے اگر وہ اُس کو روک لے تو گناہ کی کوئی وجہ نہیں مگر صحابۂ کرام کی جماعت کو حق تعالیٰ دُنیا کے لئے ایک مثالی معاشرہ بنانے والے تھے اس لئے ایک طرف جن لوگوں سے لغزش ہوئی ان کو سچی توبہ اور آئندہ اصلاحِ حال کی نعمت سے نوازا۔ دوسری طرف جن بزرگوں نے طبعی رنج و ملال کے سبب ایسے غریب فقیر کی مدد ترک کرنے کی قسم کھالی اُن کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم اس آیت میں دی گئی کہ اُن کو یہ قسم توڑ دینا اور اس کا کفارہ ادا کر دینا چاہیئے۔ آنکی مالی امداد سے دستکش ہو جانا اُن کے مقامِ بلند کے مناسب نہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کو معاف کر دیا اُن کو بھی عفو و درگزر سے کام لینا چاہیئے۔

چونکہ حضرت مسطحؓ کی مالی امداد کرنا کوئی شرعی واجب حضرت صدیقؓ کے ذمہ نہیں تھا اسی لئے قرآنِ کریم نے عنوان یہ اختیار فرمایا کہ اہلِ علم و فضل جن کو اللہ نے دینی کمالات عطا فرمائے ہیں اور جن کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی وسعت و گنجائش بھی ہے انکو ایسی قسم نہیں کھانی چاہیئے۔ آیت میں دو لفظ اولوالفضل اور والسعۃ اسی معنے کے لئے آئے ہیں۔

اس آیت کے آخری جملے میں جو ارشاد ہوا کہ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ، یعنی کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف فرمادے تو صدیق اکبرؓ نے فوراً کہا۔ واللہ انی احب ان یغفر اللہ لی (رواہ الشیخان) یعنی بخدا میں ضرور چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرمادے اور فوراً حضرت مسطحؓ کی مالی امداد جاری فرمادی اور یہ بھی فرمایا اب کبھی یہ امداد بند نہ ہوگی (بخاری و مسلم)

یہ وہ مکارمِ اخلاق ہیں جن سے صحابہ کرام کی تربیت کی گئی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لیس الواصل بالمکافی ولکن الواصل الذی اذا قطعت رحمہ وصلھا۔ (از مظہری)	یعنی صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو رشتہ داروں کے صرف احسان کا بدلہ کر دے بلکہ اصل صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ رشتہ داروں کے قطع تعلق کرنے کے باوجود یہ تعلق قائم رکھے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ، اس آیت میں بظاہر مکرر وہ مضمون بیان ہوا ہے جو اس سے پہلے آیاتِ قذف میں آچکا ہے وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ، لیکن درحقیقت ان دونوں میں ایک بڑا فرق ہے۔ کیونکہ آیات حدِ قذف کے آخر میں توبہ کرنے والوں کا استثنار اور اُنکے لئے مغفرت کا وعدہ ہے۔ اس آیت میں ایسا نہیں بلکہ دُنیا و آخرت کی لعنت اور عذابِ عظیم بلا استثنار مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا تعلق اُن لوگوں سے ہے جنھوں نے حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت لگائی اور پھر اُس سے توبہ نہیں کی، یہاں تک کہ قرآن میں اُن کی برارت نازل ہونیکے بعد بھی وہ اپنے اس افترار پر قائم اور تہمت کا چرچا کرنے میں مشغول رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کسی مسلمان سے ممکن نہیں۔ اور جو مسلمان بھی نصوصِ قرآن کا ایسا خلاف کرے وہ مسلمان نہیں رہ سکتا اس لئے یہ مضمون اُن منافقین کے بارے میں آیا ہے جنھوں نے آیات برارت صدیقہ نازل ہونے کے بعد بھی اس مشغلۂ تہمت کو نہیں چھوڑا اُن کے کافر منافق ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں تائبین کیلئے اللہ تعالیٰ نے فضلُ اللہ ورحمتہٗ فرماکر مرحوم دارین قرار دیا اور جنھوں نے توبہ نہیں کی اُن کو اس آیت میں ملعون دُنیا و آخرت فرمایا۔ تائبین کو عذاب سے نجات کی بشارت دی اور غیر تائبین کے لئے عذابِ عظیم کی وعید فرمائی۔ تائبین کو اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ فرماکر مغفرت کی بشارت دی اور غیر تائبین کو اگلی آیت یَوْمَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ میں معافی نہ ہونے کی وعید فرمائی (کذا ذکرہ سیدی فی بیان القرآن)

ایک اہم تنبیہ حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت کے قضیہ میں جو بعض مسلمان بھی شریک ہوگئے تھے یہ قضیہ اسوقت کا تھا جب تک آیات برارت قرآن میں نازل نہیں ہوئی تھیں۔ آیاتِ برارت نازل ہونے کے بعد جو شخص حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت لگائے وہ بلاشبہ کافر منکرِ قرآن ہے جیسا کہ شیعوں کے بعض فرقے اور بعض افراد اسمیں مبتلا پائے جاتے ہیں اُن کے کافر ہونے میں کوئی شک شبہ کرنے کی بھی گنجائش نہیں وہ باجماعِ اُمت کافر ہیں۔

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، یعنی اُس روز جبکہ اُن کے خلاف خود اُن کی زبانیں اور ہاتھ اور پاؤں بولیں گے اور اُن کے جرائم کی شہادت دینگے جیساکہ روایاتِ حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز جو گنہگار اپنے گناہ کا اعتراف کرلیگا تو اللہ تعالیٰ اسکو معاف فرمادیں گے اور محشر کے مجمع عام کی نظروں سے اُسکے گناہ کو چھپادیں گے اور جو وہاں بھی انکار کریگا کہ میں نے تو یہ کام نہیں کیا، نگراں فرشتوں نے غلط میرے نامۂ اعمال میں لکھ دیا ہے تو اسوقت اُن کے منہ بند کردیئے جاویں گے اور ہاتھ پاؤں سے گواہی لی جاوے گی وہ بولیں گے اور شہادت دیں گے اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ میں اسی کا بیان ہے۔ اس آیت میں یہ فرمایا کہ اُن کے مونہوں پر مہر لگادی جاویگی مگر آیتِ مذکورہ میں یہ ہے کہ خود اُن کی زبانیں شہادت دیں گی۔ ان دونوں میں کوئی تعارض اسلئے نہیں کہ وہ اپنی زبان کو اپنے اختیار سے استعمال نہ کرسکیں گے کہ اُسوقت جو چاہیں جھوٹی یا سچی بات کہدیں جیسے دنیا میں اسکا اختیار ہے بلکہ اُن کی زبان اُن کے ارادہ اور قصد کے خلاف حق بات کا اعتراف کرے گی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک وقت میں منہ اور زبان بالکل بند کردی جاویں پھر خود زبان کو بھی حکم ہو کہ سچی بات بولے۔ واللہ اعلم

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ، یعنی گندی عورتیں گندے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لائق ہوتے ہیں اور پاک صاف عورتیں پاک صاف مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور پاک صاف مرد پاک صاف عورتوں کے لائق ہوتے ہیں۔

اس آخری آیت میں اوّل تو عام ضابطہ یہ بتلادیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے طبائع میں طبعی طور پر جوڑ رکھا ہے۔ گندی اور بدکار عورتیں بدکار مردوں کی طرف اور گندے بدکار مرد گندی بدکار عورتوں کیطرف رغبت کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح پاک صاف عورتوں کی رغبت پاک صاف مردوں کی طرف ہوتی ہے اور پاک صاف مردوں کی رغبت پاک صاف عورتوں کیطرف ہوا کرتی ہے۔ اور ہر ایک اپنی اپنی رغبت کیمطابق اپنا جوڑ تلاش کرتا ہے اور قدرۃً اُسکو وہی ملجاتا ہے۔

اس عام عادتِ کلیہ اور ضابطہ سے واضح ہوگیا کہ انبیاء علیہم السلام جو دُنیا میں پاکی اور صفائی ظاہری و باطنی میں مثالی شخصیت ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ اُن کو ازواج بھی اُنکے مناسب عطا فرماتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو تمام انبیاء کے سردار ہیں اُن کو ازواج مطہرات بھی اللہ تعالیٰ نے پاکی اور صفائی ظاہری اور اخلاقی برتری میں آپ ہی

کی مناسب شان عطا فرمائی ہے۔ اور صدیقہ عائشہؓ اُن سب میں ممتاز ہیں۔ اُن کے بارے میں شک وشبہ وہی کر سکتا ہے جس کو خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ ہو۔ اور حضرت نوحؑ حضرت لوط علیہما السلام کی بیبیوں کے بارے میں جو قرآن کریم میں اُن کا کافر ہونا مذکور ہے تو اُنکے متعلق بھی یہ ثابت ہے کہ کافر ہونے کے باوجود فسق وفجور میں مبتلا نہیں تھیں، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ما بغت امرأۃ نبی قط، یعنی کسی نبی کی عورت نے کبھی زنا نہیں کیا (ذکرہ فی الدر المنثور) اس سے معلوم ہوا کہ کسی نبی کی بیوی کافر ہو جائے اسکا تو امکان ہے مگر بدکار فاحشہ ہو جائے یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ بدکاری طبعی طور پر موجبِ نفرتِ عوام ہے کفر طبعی نفرت کا موجب نہیں (بیان القرآن)

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا

اے ایمان والو مت جایا کرو کسی گھر میں اپنے گھر کے سوائے جب تک بول چال نہ کرلو،

وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٢٧﴾

اور سلام کرلو اُن گھر والوں پر یہ بہتر ہے تمہارے حق میں تاکہ تم یاد رکھو،

فَإِنْ لَمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَ

پھر اگر نہ پاؤ اسمیں کسی کو تو اس میں نہ جاؤ جب تک کہ اجازت نہ ملے تم کو اور

إِنْ قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَى لَكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ

اگر تم کو جواب ملے کہ پھر جاؤ تو پھر جاؤ اسمیں خوب ستھرائی ہے تمہارے لئے اور اللہ جو تم کرتے ہو اُس کو

عَلِيمٌ ﴿٢٨﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ

جانتا ہے نہیں گناہ تم پر اسمیں کہ جاؤ اُن گھروں میں جہاں کوئی نہیں بستا،

فِيهَا مَتَاعٌ لَكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ﴿٢٩﴾

اس میں کچھ چیز ہو تمہاری اور اللہ کو معلوم ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو

خلاصۂ تفسیر

حکم پنجم استیذان اور آدابِ ملاقات باہمی کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت حاصل کرنا

سُورۂ نُور کے شروع ہی سے فواحش اور بیحیائی کی روک تھام کے لئے اُن سے متعلقہ جرائم کی سزاؤں کا ذکر اور بے دلیل کسی پر تہمت لگانے کی مذمت کا بیان تھا آگے اُنہی فواحش کے انسداد اور عفت وعصمت کے تحفظ کے لئے ایسے احکام دیئے گئے ہیں جن سے ایسے حالات ہی پیدا نہ ہوں جہاں سے بیحیائی کو راستہ ملے اِنہی احکام میں سے استیذان کے مسائل واحکام ہیں کہ کسی شخص کے مکان میں بغیر اُس کی اجازت

کے داخل ہونا یا اندر جھانکنا ممنوع کردیا گیا جسمیں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ غیر محرم عورتوں پر نظر نہ پڑے۔

آیات مذکورہ میں مختلف قسم کے مکانات کے مختلف احکام بیان کئے گئے ہیں۔

مکانات کی چار قسمیں ہیں۔ ایک خاص اپنے رہنے کا مکان جسمیں کسی دوسرے کے آنے کا احتمال نہیں۔ دوسرے وہ مکان جسمیں کوئی اور بھی رہتا ہو خواہ وہ اپنے محارم ہی کیوں نہوں یا کسی اور کے اسمیں آجانے کا احتمال ہو۔ تیسری قسم وہ مکان جسمیں کسی کا بالفعل رہنا یا نہ رہنا دونوں کا احتمال ہو۔ چوتھی قسم وہ مکان جو کسی خاص شخص کی رہائش کے لئے مخصوص نہ ہو جیسے مسجد، مدرسہ، خانقاہ وغیرہ عام لوگوں کے انتفاع اور آمد و رفت کی جگہیں۔ انمیں قسم اوّل کا حکم تو ظاہر تھا کہ اسمیں جانے کے لئے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں اسلئے اُسکا ذکر ان آیات میں صراحۃً نہیں کیا گیا باقی تین قسموں کے مکانات کے احکام اگلی آیتوں میں بیان فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو تم اپنے (خاص رہنے کے) گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں (جنمیں دوسرے لوگ رہتے ہوں خواہ وہ اُن کی ملک ہوں یا کسی سے عاریۃً رہنے کو لے لئے ہوں یا کرایہ پر لئے ہوں) داخل مت ہو جب تک اجازت حاصل نہ کرلو (اور اجازت لینے سے پہلے اُن کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو (یعنی اوّل باہر سے سلام کر کے پھر اُن سے پوچھو کہ کیا ہمیں اندر آنے کی اجازت ہے اور بغیر اجازت لئے ویسے ہی مت گھس جاؤ۔ اور اگرچہ بعض لوگ اجازت لینے کو اپنی شان کے خلاف سمجھیں لیکن واقع میں) یہی تمھارے لئے بہتر ہے (کہ اجازت لیکر جاؤ اور یہ بات تم کو اس لئے بتائی) تاکہ تم خیال رکھو (اور اس پر عمل کرو کہ اس میں بڑی حکمتیں ہیں۔ یہ حکم ہوا مکانات کی قسم دوم کا) پھر اگر ان گھروں میں تم کو کوئی آدمی معلوم نہ ہو (خواہ واقع میں وہاں کوئی ہو یا نہ ہو) تو (بھی) ان گھروں میں نہ جاؤ جب تک تم کو اجازت نہ دی جائے (کیونکہ اوّل تو یہ احتمال ہے کہ اُس میں کوئی آدمی موجود ہو اگرچہ تمھیں معلوم نہیں۔ اور واقع میں کوئی موجود نہ ہو تو دوسرے کے خالی مکان میں بھی بلا اجازت گھس جانا، دوسرے کی ملک میں اُس کی اجازت کے بغیر تصرّف کرنا ہے جو ناجائز ہے۔ یہ حکم ہوا قسم سوم کا) اور اگر (اجازت طلب کرنے کے وقت) تم سے یہ کہہ دیا جاوے کہ (اس وقت) لوٹ جاؤ تو تم لوٹ آیا کرو یہی بات تمہارے لئے بہتر ہے (اس بات سے کہ وہیں جم جاؤ کہ کبھی تو باہر نکلیں گے کیونکہ اسمیں اپنی ذلت اور دوسرے پر بلا وجہ دباؤ ڈال کر تکلیف پہنچانا ہے اور کسی مسلمان کو ایذا دینا حرام ہے) اور اللہ تعالیٰ کو تمھارے سب اعمال کی خبر ہے (اگر خلاف حکم کروگے سزا پاؤ گے اور یہی حکم اُس صورت کا ہے کہ گھر والوں نے اگرچہ لوٹ جانے کو کہا نہیں مگر کوئی بولا بھی نہیں۔ ایسی حالت میں تین مرتبہ استیذان اس احتیاط

پر کر لیا جاوے کہ شاید سُنا نہ ہو۔ تین مرتبہ تک جب کوئی جواب نہ آوے تو لوٹ آنا چاہیئے جیسا کہ حدیث میں اسکی تصریح موجود ہے) اور تم کو ایسے مکانات میں (بغیر خاص اجازت کے) چلے جانے میں گناہ نہ ہوگا جن میں (گھر کے طور پر) کوئی نہ رہتا ہو (اور) اُن میں تمھاری برت ہو (یعنی ان مکانات کے برتنے اور استعمال کرنے کا تمھیں حق ہو، یہ حکم ہے قسم چہارم کا جو رفاہِ عام کے مکانات ہیں اور جن سے عام لوگوں کے منافع متعلق ہیں۔ تو وہاں جانے کی عادۃً عام اجازت ہوتی ہے) اور تم جو کچھ علانیہ کرتے ہو یا پوشیدہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے۔ (اس لئے ہر حال میں تقویٰ اور خوفِ خدا لازم ہے)۔

معارف و مسائل

قرآنی آداب معاشرت کا ایک اہم باب کسی کی ملاقات کو جاؤ تو پہلے اجازت لو بغیر اجازت کسی کے گھر میں داخل نہ ہو

افسوس ہے کہ شریعت اسلام نے جس قدر اس معاملے کا اہتمام فرمایا کہ قرآن حکیم میں اس کے مفصّل احکام نازل ہوئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اُس کی بڑی تاکید فرمائی، اُتنا ہی آجکل مسلمان اس سے غافل ہوگئے۔ لکھے پڑھے نیک لوگ بھی نہ اس کو کوئی گناہ سمجھتے ہیں نہ اس پر عمل کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ دُنیا کی دوسری مہذب قوموں نے اس کو اختیار کر کے اپنے معاشرہ کو درست کر لیا مگر مسلمان ہی اسمیں سب سے پیچھے نظر آتے ہیں۔ اسلامی احکام میں سب سے پہلے سُستی اسی حکم میں شروع ہوئی بہرحال استیذان قرآن کریم کا وہ واجب التعمیل حکم ہے کہ اسمیں ذراسی سستی اور تبدیلی کو بھی حضرت ابن عباسؓ انکار آیتِ قرآن کے شدید الفاظ سے تعبیر فرما رہے ہیں اور اب تو لوگوں نے واقعی ان احکام کو ایسا نظرانداز کر دیا ہے کہ گویا اُن کے نزدیک یہ قرآن کے احکام ہی نہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

استیذان کی حکمتیں اور مصالح مہمہ

حق تعالیٰ جلّ شانہٗ نے ہر انسان کو جو اسکے رہنے کی جگہ عطا فرمائی خواہ مالکانہ ہو یا کرایہ وغیرہ پر بہرحال اُسکا گھر اُسکا مسکن ہے اور مسکن کی اصل غرض سکون و راحت ہے قرآن عزیز نے جہاں اپنی اس نعمت گرانمایہ کا ذکر فرمایا ہے اسمیں بھی اسی طرف اشارہ ہے فرمایا جَعَلَ لَكُم مِّن بُيُوتِكُمْ سَكَنًا، یعنی اللہ نے تمھارے گھروں سے تمھارے لئے سکون و راحت کا سامان دیا۔ اور یہ سکون و راحت جبھی باقی رہ سکتا ہے کہ انسان دوسرے کسی شخص کی مداخلت کے بغیر اپنے گھر میں اپنی ضرورت کیمطابق آزادی سے کام اور آرام کر سکے۔ اسکی آزادی میں خلل ڈالنا گھر کی اصل مصلحت کو فوت کرنا ہے جو بڑی ایذا و تکلیف ہے۔ اسلام نے کسی کو بھی ناحق تکلیف پہنچانا حرام قرار دیا ہے۔ استیذان کے احکام

میں ایک بڑی مصلحت لوگوں کی آزادی میں خلل ڈالنے اور اُن کی ایذا رسانی سے بچنا ہے جو ہر شریف انسان کا عقلی فریضہ بھی ہے۔ دوسری مصلحت خود اس شخص کی ہے جو کسی کی ملاقات کے لئے اُسکے پاس گیا ہے کہ جب وہ اجازت لیکر شائستہ انسان کی طرح ملیگا تو مخاطب بھی اسکی بات قدر و منزلت سے سُنے گا اور اگر اسکی کوئی حاجت ہے تو اُسکے پُورا کرنیکا داعیہ اُسکے دل میں پیدا ہوگا۔ بخلاف اسکے کہ وحشیانہ طرز سے کسی شخص پر بغیر اسکی اجازت کے مسلط ہوگیا تو مخاطب اسکو ایک بلائے ناگہانی سمجھ کر دفع الوقتی سے کام لیگا خیرخواہی کا داعیہ اگر ہوا بھی تو مضمحل ہوجائیگا اور اسکو ایذاء مسلم کا گناہ الگ ہوگا۔

تیسری مصلحت فواحش اور بے حیائی کا انسداد ہے کہ بلا اجازت کسی کے مکان میں داخل ہو جانے سے یہ بھی احتمال ہے کہ غیر محرم عورتوں پر نظر پڑے اور شیطان دل میں کوئی مرض پیدا کردے اور اسی مصلحت سے احکام استیذان کو قرآن کریم میں حدِ زنا۔ حدِ قذف وغیرہ احکام کے متصل لایا گیا ہے۔

چوتھی مصلحت یہ ہے کہ انسان بعض اوقات اپنے گھر کی تنہائی میں کوئی ایسا کام کر رہا ہوتا ہے جس پر دوسروں کو اطلاع کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اگر کوئی شخص بغیر اجازت کے گھر میں آجائے تو وہ جس چیز کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا اُس پر مطلع ہوجائیگا کسی کے پوشیدہ راز کو زبردستی معلوم کرنیکی فکر بھی گناہ اور دوسروں کے لئے موجب ایذا ہے۔ استیذان کے کچھ مسائل تو خود آیاتِ مذکورہ میں آگئے ہیں پہلے اُن کی تفصیل و تشریح دیکھئے باقی متفرق مسائل بعد میں لکھے جاویں گے۔

مسئلہ: ان آیات میں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب کیا گیا جو مَردوں کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر عورتیں بھی اس حکم میں داخل ہیں جیسا کہ عام احکام قرآنیہ اسی طرح مَردوں کو مخاطب کر کے آتے ہیں عورتیں بھی اُسمیں شامل ہوتی ہیں بجز مخصوص مسائل کے جنکی خصوصیت مَردوں کیساتھ بیان کردی جاتی ہے۔ چنانچہ نساءِ صحابہ کا بھی یہی معمول تھا کہ کسی کے گھر جاویں تو پہلے اُن سے استیذان کریں۔ حضرت اُمِّ ایاسؓ فرماتی ہیں کہ ہم چار عورتیں اکثر حضرت صدیقہ عائشہؓ کے پاس جایا کرتی تھیں اور گھر میں جانے سے پہلے اُن سے استیذان کرتی تھیں جب وہ اجازت دیتی تو اندر جاتی تھیں (ابن کثیر بحوالہ ابن ابی حاتم)

مسئلہ: اسی آیت کے عموم سے معلوم ہوا کہ کسی دوسرے شخص کے گھر میں جانے سے پہلے استیذان کا حکم عام ہے مرد عورت محرم غیر محرم سب کو شامل ہے۔ عورت کسی عورت کے پاس جائے یا مرد مرد کے پاس، سب کو استیذان کرنا واجب ہے اسی طرح ایک شخص اگر اپنی ماں اور بہن یا دوسری محرم عورتوں کے پاس جائے تو بھی استیذان کرنا چاہیئے۔ امام مالکؒ نے مؤطا میں مرسلاً عطاء بن یسارؒ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پُوچھا کہ کیا میں اپنی والدہ کے پاس جانے وقت بھی استیذان کروں آپنے فرمایا ہاں استیذان کرو۔ اُس شخص نے کہا یا رسول اللہ! میں تو اپنی والدہ ہی کے ساتھ گھر میں رہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا پھر بھی اجازت لئے بغیر گھر میں

نہ جاؤ۔ اُسنے پھر عرض کیا یا رسول اللہ میں تو ہر وقت اُن کی خدمت میں رہتا ہوں آپؐ نے فرمایا پھر بھی اجازت لئے بغیر گھر میں نہ جاؤ کیا تمھیں یہ بات پسند ہے کہ اپنی والدہ کو ننگی دیکھو اسنے کہا کہ نہیں۔ فرمایا اسی لئے استیذان کرنا چاہئیے کیونکہ یہ احتمال ہے کہ وہ گھر میں کسی ضرورت سے ستر کھولے ہوئے ہوں۔ (مظہری)

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آیتِ قرآن میں جو غَيْرَ بُيُوتِكُمْ آیا ہوا ہے بیوتکم سے مراد وہ بیوت اور گھر ہیں جن میں انسان تنہا خود ہی رہتا ہو۔ والدین، بہن بھائی وغیرہ اُس میں نہ ہوں۔

مسئلہ: جس گھر میں صرف اپنی بیوی رہتی ہو اسمیں داخل ہونے کے لئے اگرچہ استیذان واجب نہیں مگر مستحب اور طریقِ سنت یہ ہے کہ وہاں بھی اچانک بغیر کسی اطلاع کے اندر نہ جائے بلکہ داخل ہونے سے پہلے اپنے پاؤں کی آہٹ سے یا کھنکار سے کسی طرح پہلے باخبر کردے پھر داخل ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ محترمہ فرماتی ہیں کہ عبداللہ جب کبھی باہر سے گھر میں آتے تھے تو دروازہ میں کھنکار کر پہلے اپنے آنے سے باخبر کردیتے تھے تاکہ وہ ہمیں کسی ایسی حالت میں نہ دیکھیں جو انکو پسند نہ ہو (ابن کثیر بحوالہ ابن جریر وقال اسنادہ صحیح) اور اس صورت میں استیذان کا واجب نہ ہونا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن جریج نے حضرت عطاءؒ سے دریافت کیا کہ کیا ایک شخص کو اپنی بیوی کے پاس جانیکے وقت بھی استیذان ضروری ہے اُنھوں نے فرمایا کہ نہیں۔ ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ اس سے مراد یہی ہے کہ واجب نہیں لیکن مستحب اور اَولیٰ وہاں بھی ہے۔

استیذان کا مسنون طریقہ آیت میں جو طریقہ بتلایا گیا ہے وہ یہ ہے حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا یعنی کسی کے گھر میں اسوقت تک داخل نہ ہو جبتک دو کام نہ کرلو، اوّل استیناس، اسکے لفظی معنی طلب اُنس کے ہیں۔ مراد اس سے جمہور مفسرین کے نزدیک استیذان یعنی اجازت حاصل کرنا ہی ہے استیذان کو بلفظ استیناس ذکر کرنے میں اشارہ اسطرف ہے کہ داخل ہونے سے پہلے اجازت حاصل کرنے میں مخاطب مانوس ہوتا ہے اسکو وحشت نہیں ہوتی۔ دوسرا کام یہ ہے کہ گھر والوں کو سلام کرو۔ اسکا مفہوم بعض حضرات مفسرین نے تو یہ لیا کہ پہلے اجازت حاصل کرو اور جب گھر میں جاؤ تو سلام کرو۔ قرطبی نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ اس مفہوم کے اعتبار سے آیت میں کوئی تقدیم تاخیر نہیں پہلے استیذان کیا جائے جب اجازت مل جائے اور گھر میں جائیں تو سلام کریں۔ اور اسی کو حضرت ابوایوب انصاریؓ کی حدیث کا مقتضیٰ قرار دیا ہے۔ اور ماوردی نے اسمیں تفصیل کی ہے کہ اگر اجازت لینے سے پہلے گھر کے کسی آدمی پر نظر پڑجائے تو پہلے سلام کرے پھر اجازت طلب کرے ورنہ پہلے اجازت لے اور جب گھر میں جائے تو سلام کرے مگر عام روایاتِ حدیث سے جو طریقہ مسنون معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ پہلے باہر سے سلام کرے السلام علیکم اسکے بعد اپنا نام لیکر کہے کہ فلاں شخص ملنا چاہتا ہے۔

امام بخاری نے الادب المفرد میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ جو شخص سلام سے پہلے استیذان کرے اسکو اجازت نہ دو (کیونکہ اُسنے مسنون طریقہ کو چھوڑ دیا) (روح المعانی) اور ابوداؤد کی حدیث میں ہے کہ بنی عامر کے ایک شخص نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اسطرح استیذان کیا کہ باہر سے کہا أَأَلِج کیا میں گھس جاؤں۔ آپ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ یہ شخص استیذان کا طریقہ نہیں جانتا باہر جا کر اسکو طریقہ سکھلاؤ کہ یوں کہے السلام علیکم أأدخل یعنی کیا میں داخل ہو سکتا ہوں۔ ابھی یہ خادم باہر نہیں گیا تھا کہ اُسنے خود حضور کے کلمات سُن لیئے اور اسطرح کہا السلام علیکم أأدخل۔ تو آپ نے اندر آنے کی اجازت دیدی (ابن کثیر) اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا تأذنوا لمن لم يبدأ بالسلام یعنی جو شخص پہلے سلام نہ کرے اسکو اندر آنے کی اجازت نہ دو (مظہری) اس واقعہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دو اصلاحیں فرمائیں۔ ایک یہ کہ پہلے سلام کرنا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ اُس نے أدخل کے بجائے أَلِج کا لفظ استعمال کیا تھا یہ نامناسب تھا کیونکہ الج دلوج سے مشتق ہے جسکے معنے کسی تنگ جگہ میں گھسنے کے ہیں یہ تہذیبِ الفاظ کے خلاف تھا۔ بہرحال ان روایات سے یہ معلوم ہوا کہ آیتِ قرآن میں جو سلام کرنے کا ارشاد ہے یہ سلام استیذان ہے جو اجازت حاصل کرنے کے لئے باہر سے کیا جاتا ہے تاکہ اندر جو شخص ہے وہ متوجہ ہو جائے اور جو الفاظ اجازت طلب کرنے کے لئے کہے گا وہ سُن لے۔ گھر میں داخل ہونے کے وقت حسبِ معمول دوبارہ سلام کرے۔

مسئلہ: پہلے سلام اور پھر داخل ہونے کی اجازت لینے کا جو بیان اوپر احادیث سے ثابت ہوا اسمیں بہتر یہ ہے کہ اجازت لینے والا خود اپنا نام لیکر اجازت طلب کرے جیسا کہ حضرت فاروق اعظم کا عمل تھا کہ اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر آکر یہ الفاظ کہے۔ السلام علی رسول الله السلام علیکم أيدخل عمر یعنی سلام کے بعد کہا کہ کیا عمر داخل ہو سکتا ہے (رواہ قاسم بن اصبغ وابن عبد البر فی التمہید عن ابن عباس عن عمرؓ۔ ابن کثیر) اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ کے پاس گئے تو استیذان کے لئے یہ الفاظ فرمائے۔ السلام علیکم هذا ابو موسیٰ السلام علیکم هذا الاشعری (قرطبی) اسمیں بھی پہلے اپنا نام ابوموسیٰ بتلایا پھر مزید وضاحت کے لئے اشعری کا ذکر کیا۔ اور یہ اسلئے کہ جب تک آدمی اجازت لینے والے کو پہچانے نہیں تو جواب دینے میں تشویش ہوگی۔ اس تشویش سے بھی مخاطب کو بچانا چاہیئے۔

مسئلہ: اور اس معاملہ میں سب سے بُرا وہ طریقہ ہے جو بعض لوگ کرتے ہیں کہ باہر سے اندر داخل ہونے کی اجازت مانگی اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ اندر سے مخاطب نے پوچھا کون صاحب ہیں

تو جواب میں یہ کہدیا کہ میں ہوں، کیونکہ یہ مخاطب کی بات کا جواب نہیں، جس نے اول آواز سے نہیں پہچانا وہ میں کے لفظ سے کیا پہچانے گا۔

خطیب بغدادی نے اپنے جامع میں علی بن عاصم واسطی سے نقل کیا ہے کہ وہ بصرہ گئے تو حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ کی ملاقات کو حاضر ہوئے۔ دروازہ پر دستک دی۔ حضرت مغیرہؓ نے اندر سے پوچھا کون ہے تو جواب دیا انا (یعنی میں ہوں) تو حضرت مغیرہ نے فرمایا کہ میرے دوستوں میں تو کوئی بھی ایسا نہیں جسکا نام انا ہو پھر باہر تشریف لائے اور ان کو حدیث سنائی کہ ایک روز حضرت جابر بن عبداللہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازت لینے کے لئے دروازہ پر دستک دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اندر سے پوچھا کون صاحب ہیں؟ تو جابرؓ نے یہی لفظ کہدیا انا یعنی میں ہوں۔ آپ نے بطور زجر و تنبیہ کے فرمایا انا انا یعنی انا انا کہنے سے کیا حاصل ہے اس سے کوئی پہچانا نہیں جاتا۔

مسئلہ: اس سے بھی زیادہ بُرا یہ طریقہ ہے جو آجکل بہت سے لکھے پڑھے لوگ بھی استعمال کرتے ہیں کہ دروازہ پر دستک دی جب اندر سے پوچھا گیا کہ کون صاحب ہیں تو خاموش کھڑے ہیں کوئی جواب ہی نہیں دیتے۔ یہ مخاطب کو تشویش میں ڈالنے اور ایذا پہنچانے کا بدترین طریقہ ہے جس سے استیذان کی مصلحت ہی فوت ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: روایاتِ مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ استیذان کا یہ طریقہ بھی جائز ہے کہ دروازہ پر دستک دیدی جائے بشرطیکہ ساتھ ہی اپنا نام بھی ظاہر کر کے بتلا دیا جائے کہ فلاں شخص ملنا چاہتا ہے۔

مسئلہ: لیکن اگر دستک ہو تو اتنی زور سے نہ دے کہ جس سے سننے والا گھبرا اٹھے بلکہ متوسط انداز سے دے جس سے اندر تک آواز تو چلی جائے لیکن کوئی سختی ظاہر نہ ہو۔ جو لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر دستک دیتے تھے تو ان کی عادت یہ تھی کہ ناخنوں سے دروازہ پر دستک دیتے تاکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہ ہو (رواہ الخطیب فی جامعہ۔ قرطبی) جو شخص استیذان کے مقصد کو سمجھ لے کہ اصل اس سے استیناس ہے یعنی مخاطب کو مانوس کر کے اجازت حاصل کرنا وہ خود بخود ان سب چیزوں کی رعایت کو ضروری سمجھے گا جن چیزوں سے مخاطب کو تکلیف ہو اس سے بچیگا۔ اپنا نام ظاہر کرے اور دستک دے تو متوسط انداز سے دے یہ سب چیزیں اس میں شامل ہیں۔

تنبیہ ضروری آجکل اکثر لوگوں کو تو استیذان کی طرف کوئی توجہ ہی باقی نہیں رہی جو صریح ترک واجب کا گناہ ہے اور جو لوگ استیذان کرنا چاہیں اور مسنون طریقہ کے مطابق باہر سے پہلے سلام کریں پھر اپنا نام بتلا کر اجازت لیں۔ ان کے لئے اس زمانے میں بعض دشواریاں یوں بھی پیش آتی ہیں کہ عموماً مخاطب جس سے اجازت لیتا ہے وہ دروازہ سے دور ہے۔ وہاں

تک سلام کی آواز اور اجازت لینے کے الفاظ پہنچنا مشکل ہیں اسلئے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اصل واجب یہ بات ہے کہ بغیر اجازت کے گھر میں داخل نہ ہو۔ اجازت لینے کے طریقے ہر زمانے اور ہر ملک میں مختلف ہوسکتے ہیں۔ اُن میں سے ایک طریقہ دروازہ پر دستک دینے کا تو خود روایاتِ حدیث سے ثابت ہے اسی طرح جو لوگ اپنے دروازوں پر گھنٹی لگالیتے ہیں اُس گھنٹی کا بجادینا بھی واجب استیذان کی ادائیگی کے لئے کافی ہے بشرطیکہ گھنٹی کے بعد اپنا نام بھی ایسی آواز سے ظاہر کردے جس کو مخاطب سُن لے۔ اسکے علاوہ اور کوئی طریقہ جو کسی جگہ رائج ہو اسکا استعمال کرلینا بھی جائز ہے آجکل جو شناختی کارڈ کا رواج یورپ سے چلا ہے یہ رسم اگرچہ اہلِ یورپ نے جاری کی مگر مقصد استیذان اسمیں بہت اچھی طرح پورا ہوجاتا ہے کہ اجازت دینے والے کو اجازت چاہنے والے کا پورا نام و پتہ اپنی جگہ بیٹھے ہوئے بغیر کسی تکلیف کے معلوم ہوجاتا ہے اس لئے اسکو اختیار کرلینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مسئلہ: اگر کسی شخص نے کسی شخص سے استیذان کیا اور اُسنے جواب میں کہدیا کہ اسوقت ملاقات نہیں ہوسکتی لوٹ جائیے تو اس سے بُرا نہ ماننا چاہیئے کیونکہ ہر شخص کے حالات اور اُسکے مقتضیات مختلف ہوتے ہیں بعض وقت وہ مجبور ہوتا ہے باہر نہیں آسکتا نہ آپکو اندر بُلا سکتا ہے تو ایسی حالت میں اسکے عذر کو قبول کرنا چاہیئے۔ آیت مذکورہ میں یہی ہدایت ہے وَإِن قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَىٰ لَكُمْ یعنی جب آپ سے کہا جائے کہ اسوقت لوٹ جائیں تو آپ کو خوشدلی سے لوٹ آنا چاہیئے اس سے بُرا ماننا یا وہیں جم کر بیٹھ جانا دونوں چیزیں درست نہیں بعض حضرات سلف سے منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں عمر بھر اس تمنا میں رہا کہ کسی کے پاس جاکر استیذان کروں اور وہ مجھے یہ جواب دے کہ لوٹ جاؤ تو میں اس حکم قرآنی کی تعمیل کا ثواب حاصل کروں مگر عجیب اتفاق ہے کہ مجھے کبھی یہ نعمت نصیب نہ ہوئی۔

مسئلہ: شریعتِ اسلام نے حُسنِ معاشرت کے آداب سکھانے اور سب کو ایذا و تکلیف سے بچانے کا دو طرفہ معتدل نظام قائم فرمایا ہے اس آیت میں جس طرح آنیوالے کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اگر استیذان کرنے پر آپ کو اجازت نہ ملے اور کہا جائے کہ اسوقت لوٹ جاؤ تو کہنے والے کو معذور سمجھو اور خوشدلی کیساتھ واپس لوٹ جاؤ بُرا نہ مانو اسی طرح ایک حدیث میں اسکا دوسرا رُخ اس طرح آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان لزورك عليك حقاً یعنی جو شخص آپ سے ملاقات کے لئے آئے اُسکا بھی آپ پر حق ہے یعنی اسکا یہ حق ہے کہ اسکو اپنے پاس بلاؤ یا باہر آکر اُس سے ملو اسکا اکرام کرو بات سنو بلا کسی شدید مجبوری اور عذر کے ملاقات سے انکار نہ کرو۔

مسئلہ: اگر کسی کے دروازے پر جاکر استیذان کیا اور اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو سُنت

یہ ہے کہ دوبارہ پھر استیذان کرے اور پھر بھی جواب نہ آوے تو تیسری مرتبہ کرے ۔ اگر تیسری مرتبہ بھی جواب نہ آوے تو اسکا حکم وہی ہے جو ارجعوا کا ہے ۔ یعنی لوٹ جانا چاہیے کیونکہ تین مرتبہ کہنے سے تقریباً یہ تو متعین ہو جاتا ہے کہ آواز سن لی مگر یا تو وہ شخص ایسی حالت میں ہے کہ جواب نہیں دے سکتا مثلاً نماز پڑھ رہا ہے یا بیت الخلاء میں ہے یا غسل کر رہا ہے اور یا پھر اسکو اسوقت ملنا منظور نہیں دونوں حالتوں میں وہیں جمے رہنا اور مسلسل دستک وغیرہ دیتے رہنا بھی موجب ایذا ہے جس سے بچنا واجب ہے اور استیذان کا اصل مقصد ہی ایذاء سے بچنا ہے ۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اذا استأذن احدکم ثلاثاً فلم یؤذن لہ فلیرجع ۔ یعنی جب کوئی آدمی تین مرتبہ استیذان کرے اور کوئی جواب نہ آوے تو اسکو لوٹ جانا چاہیے (ابن کثیر بحوالہ صحیح بخاری) اور مسند احمد میں حضرت انس رضی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ کے مکان پر تشریف لے گئے اور سنت کیمطابق باہر سے استیذان کیلئے سلام کیا السلام علیکم حضرت سعد بن عبادہ نے سلام کا جواب تو دیا مگر آہستہ کہ حضور نہ سنیں، آپ نے دوبارہ اور پھر سہ بارہ سلام کیا ۔ حضرت سعد رضی سنتے اور آہستہ جواب دیتے رہے تین مرتبہ ایسا کرنے کے بعد آپ لوٹ گئے جب سعد رضی نے دیکھا کہ اب آواز نہیں آرہی تو گھر سے نکل کر پیچھے دوڑے اور یہ عذر پیش کیا کہ یا رسول اللہ میں نے ہر مرتبہ آپ کی آواز سنی اور جواب بھی دیا مگر آہستہ دیا تاکہ زبان مبارک سے زیادہ سے زیادہ سلام کے الفاظ میرے بارے میں نکلیں وہ میرے لئے موجب برکت ہوگا (آپ نے ان کو طریقہ سنت بتلا دیا کہ تین مرتبہ جواب نہ آنے پر لوٹ جانا چاہیے) اس کے بعد حضرت سعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر ساتھ لے گئے انھوں نے کچھ مہمانی کی آپ نے اسکو قبول فرمایا ۔

حضرت سعد رضی کا یہ عمل غلبہ عشق و محبت کا اثر تھا کہ اسوقت ذہن اسطرف نہ گیا کہ سرور دو عالم دروازے پر تشریف فرما ہیں مجھے فوراً جا کر انکے قدم چوم لینے چاہئیں بلکہ ذہن اسطرف متوجہ ہوگیا کہ آپ کی زبان مبارک سے السلام علیکم جتنی مرتبہ زیادہ نکلے گا میرے لئے زیادہ مفید ہوگا ۔ بہرحال اس سے یہ مسئلہ ثابت ہوگیا کہ تین مرتبہ استیذان کے بعد جواب نہ آوے تو سنت یہ ہے کہ لوٹ جائے وہیں جم کر بیٹھ جانا خلاف سنت اور مخاطب کے لئے موجب ایذا ہے کہ اسکو دباؤ ڈالکر نکلنے پر مجبور کرنا ہے ۔

مسئلہ : یہ حکم اسوقت ہے جبکہ سلام یا دستک وغیرہ کے ذریعہ اجازت حاصل کرنے کی کوشش تین مرتبہ کرلی ہو کہ اب وہاں جم کر بیٹھ جانا موجب ایذا ہے لیکن اگر کوئی کسی عالم یا بزرگ کے دروازہ پر بغیر استیذان کئے ہوئے اور بغیر ان کو اطلاع دیئے ہوئے انتظار میں بیٹھے رہے کہ جب اپنی فرصت

کے مطابق باہر تشریف لا دینگے تو ملاقات ہو جائیگی یہ سمیں داخل نہیں بلکہ عین ادب ہے خود قرآن کریم نے لوگوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب گھر میں ہوں تو اُن کو آواز دیکر بُلانا ادب کیخلاف ہے بلکہ لوگوں کو چاہیئے کہ انتظار کریں جسوقت آپ اپنی ضرورت کیمطابق باہر تشریف لادیں اُسوقت ملاقات کریں۔ آیت یہ ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ۔ اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں میں بعض اوقات کسی انصاری صحابی کے دروازہ پر پورے دوپہر انتظار کرتا رہتا ہوں کہ جب وہ باہر تشریف لادیں تو اُن سے کسی حدیث کی تحقیق کروں اور اگر میں اُن سے ملنے کے لیئے اجازت مانگتا تو وہ ضرور مجھے اجازت دیدیتے مگر میں اسکو خلافِ ادب سمجھتا تھا اسلئے انتظار کی مشقت گوارا کرتا تھا۔ (صحیح بخاری)

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ لفظ متاع کے لغوی معنی کسی چیز کے برتنے، استعمال کرنے اور اُس سے فائدہ اُٹھانے کے ہیں اور جس چیز سے فائدہ اُٹھایا جائے اسکو بھی متاع کہا جاتا ہے اس آیت میں متاع کے لُغوی معنی ہی مُراد ہیں جسکا ترجمہ بَرت سے کیا گیا ہے یعنی برتنے کا استحقاق۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ سے روایت ہے کہ جب استیذان کی آیاتِ مذکورہ نازل ہوئیں جنمیں بغیر اجازت کے کسی مکان میں داخل ہونیکی ممانعت ہے تو صدیقِ اکبرؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ، اس ممانعت کے بعد قریش کے تجارت پیشہ لوگ کیا کرینگے کیونکہ مکہ اور مدینہ سے ملکِ شام تک اُنکے تجارتی سفر ہوتے ہیں اور اس راستہ میں جابجا اُنکے مسافر خانے بنے ہوتے ہیں جنمیں دورانِ سفر وہ لوگ قیام کرتے ہیں۔ انمیں کوئی مستقل رہنے والا نہیں ہوتا تو وہاں استیذان کی کیا صورت ہوگی اجازت کس سے حاصل کیجائیگی۔ اسپر آیتِ مذکورہ نازل ہوئی (رواہ ابن ابی حاتم۔ مظہری) اس شانِ نزول کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ آیت میں بیوت غیر مسکونہ سے مُراد وہ مکانات اور مقامات ہیں جو کسی خاص فرد یا قوم کے لئے خصوصی طور پر رہائش گاہ نہیں بلکہ افرادِ قوم کو عام اجازت وہاں جانے ٹھہرنے اور استعمال کرنے کی ہے جیسے وہ مسافر خانے جو شہروں اور جنگلوں میں اسی غرض کے لئے بنائے گئے ہوں اور باشتراکِ علت عام مسجدیں، خانقاہیں، دینی مدارس، ہسپتال، ڈاکخانہ، ریلوے اسٹیشن، ہوائی جہازوں کے مستقر اور قومی تفریحات کیلئے جو مکانات بنائے گئے ہوں غرض رفاہِ عام کے سب ادارے اسی حکم میں ہیں کہ وہاں ہر شخص بلا اجازت جا سکتا ہے۔

مسئلہ: رفاہِ عام کے اداروں میں جس مقام پر اسکے مالکان یا متولیان کیطرف سے داخلہ کے لئے کچھ شرائط اور پابندیاں ہوں اسکی پابندی شرعاً واجب ہے مثلاً ریلوے اسٹیشن پر اگر بغیر پلیٹ فارم کے جانے کی اجازت نہیں ہر تو پلیٹ فارم ٹکٹ حاصل کرنا ضروری ہے اسکی خلاف ورزی ناجائز ہے ایر ڈروم (ہوائی اڈے) کے جس حصہ میں جانیکی محکمہ کیطرف سے اجازت نہ ہو وہاں بغیر اجازت

کے جانا شرعاً جائز نہیں۔

مسئلہ: اسی طرح مساجد، مدارس، خانقاہوں، ہسپتالوں وغیرہ میں جو کمرے وہاں کے منتظمین یا دوسرے لوگوں کی رہائش کے لئے مخصوص ہوں جیسے مساجد، مدارس اور خانقاہوں کے خاص حجرے یا ریلوے، ایرڈروم اور ہسپتالوں کے دفاتر اور مخصوص کمرے جو مریضوں یا دوسرے لوگوں کی رہائش گاہ ہیں وہ بیوت غیر مسکونہ کے حکم میں نہیں، بلکہ مسکونہ کے حکم میں ہیں انہیں بغیر اجازت جانا شرعاً ممنوع اور گناہ ہے۔

استیذان سے متعلق چند دوسرے مسائل

جبکہ یہ معلوم ہو چکا کہ استیذان کے احکامِ شرعیہ کا اصل مقصد لوگوں کی ایذا رسانی سے بچنا اور حُسنِ معاشرت کے آداب سکھانا ہے تو اشتراکِ علت سے مسائل ذیل کا حکم بھی معلوم ہوگیا۔

ٹیلیفون سے متعلق بعض مسائل مسئلہ: کسی شخص کو ایسے وقت ٹیلیفون پر مخاطب کرنا جو عادۃً اُس کے سونے یا دوسری ضروریات میں یا نماز میں مشغول ہونیکا وقت ہو بلا ضرورتِ شدیدہ جائز نہیں کیونکہ اسمیں بھی وہی ایذا رسانی ہے جو کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونے اور اُس کی آزادی میں خلل ڈالنے سے ہوتی ہے۔

مسئلہ: جس شخص سے ٹیلیفون پر بات چیت اکثر کرنا ہو تو مناسب یہ ہے کہ اُس سے دریافت کرلیا جائے کہ آپ کو ٹیلیفون پر بات کرنے میں کس وقت سہولت ہوتی ہے پھر اُس کی پابندی کرے۔ مسئلہ: ٹیلیفون پر اگر کوئی طویل بات کرنا ہو تو پہلے مخاطب سے دریافت کرلیا جائے کہ آپ کو ذرا سی فرصت ہو تو میں اپنی بات عرض کردوں کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی آنے پر آدمی طبعاً مجبور ہوتا ہے کہ فوراً معلوم کرے کہ کون کیا کہنا چاہتا ہے اور اس ضرورت سے وہ کسی بھی حال میں اور اپنے ضروری کام میں ہو تو اسکو چھوڑ کر ٹیلیفون اُٹھاتا ہے۔ کوئی بے رحم آدمی اُسوقت لمبی بات کرنے لگے تو سخت تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

مسئلہ: بعض لوگ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی رہتی ہے اور کوئی پروا نہیں کرتے نہ پوچھتے ہیں کہ کون ہے کیا کہنا چاہتا ہے یہ اسلامی اخلاق کے خلاف اور بات کرنے والے کی حق تلفی ہے جیسے حدیث میں آیا ہے ان لزورك علیك حقا یعنی جو شخص آپ کی ملاقات کو آئے اُس کا تم پر حق ہے کہ اس سے بات کرو اور بلا ضرورت ملاقات سے انکار نہ کرو اسی طرح جو آدمی ٹیلیفون پر آپ سے بات کرنا چاہتا ہے اسکا حق ہے کہ آپ اسکو جواب دیں۔

مسئلہ: کسی کے مکان پر ملاقات کے لئے جاؤ اور اجازت حاصل کرنے کے لئے کھڑے

ہو تو گھر کے اندر نہ جھانکو کیونکہ استیذان کی مصلحت تو یہی ہے کہ دوسرا آدمی جو چیز آپ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا آپکو اسکی اطلاع ہونی چاہیئے اگر پہلے ہی گھر میں جھانک کر دیکھ لیا تو یہ مصلحت فوت ہو جاویگی حدیث میں اسکی سخت ممانعت آئی ہے (رواہ البخاری ومسلم عن سہل بن سعد الساعدی) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریف یہ تھی کہ کسی کے پاس جاتے اور اجازت حاصل کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تو دروازے کے بالمقابل کھڑے ہونے کے بجائے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کر استیذان فرماتے تھے دروازہ کے بالمقابل کھڑے ہونیسے اسلئے اجتناب فرماتے کہ اوّل تو اُس زمانے میں دروازوں پر پردے بہت کم تھے اور پردہ بھی ہو تو ہوا سے کھل جانیکا احتمال بہرحال ہے (مظہری)

مسئلہ: جن مکانوں میں داخل ہونا آیاتِ مذکورہ میں بغیر اجازت کے ممنوع قرار دیا ہے یہ عام حالات میں ہے اگر اتفاقاً کوئی حادثہ آگ لگنے یا مکان منہدم ہونیکا پیش آجائے تو اجازت لئے بغیر اسمیں جاسکتے ہیں اور امداد کے لئے جانا چاہیئے۔ (مظہری)

مسئلہ: جس شخص کو کسی نے بُلا کر بھیجا ہے اگر وہ اسکے قاصد کیساتھ ہی آگیا تو اب اسکو اجازت لینے کی ضرورت نہیں قاصد کا آنا ہی اجازت ہے۔ ہاں اگر اسوقت نہ آیا کچھ دیر کے بعد پہنچا تو اجازت لینا ضروری ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اذا دعی احدکم فجاء مع الرسول فان ذلک لہ اذن، یعنی جو آدمی بلایا جائے اور وہ قاصد کیساتھ ہی آجائے تو یہی اُسکے لئے اندر آنیکی اجازت ہے۔ (رواہ ابوداؤد۔ مظہری)

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ

کہہ دے ایمان والوں کو نیچی رکھیں ذری اپنی آنکھیں اور تھامتے رہیں اپنے ستر کو اس میں

اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ

خوب ستھرائی ہے اُن کے لئے، بیشک اللہ کو خبر ہے جو کچھ کرتے ہیں اور کہہ دے ایمان والیوں کو

يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ

نیچی رکھیں ذرا اپنی آنکھیں اور تھامتی رہیں اپنے ستر کو اور نہ دکھلائیں اپنا سنگار

زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰي جُيُوْبِهِنَّ ۠

مگر جو کھلی چیز ہے اسمیں سے اور ڈال لیں اپنی اوڑھنی اپنے گریبان پر

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ

اور نہ کھولیں اپنا سنگار مگر اپنے خاوند کے آگے یا اپنے باپ کے یا اپنے خاوند کے باپ کے

اَوْ اَبْنَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ

یا اپنے بیٹے کے یا اپنے خاوند کے بیٹے کے یا اپنے بھائی کے یا اپنے بھتیجوں کے

أَوْ بَنِيٓ أَخَوٰتِهِنَّ أَوْ نِسَآئِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَٰنُهُنَّ أَوِ التّٰبِعِينَ

یا اپنے بھانجوں کے یا اپنی عورتوں کے یا اپنے ہاتھ کے مال کے یا کارو بار کرنیوالوں کے

غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلٰى

جو مرد کہ کچھ غرض نہیں رکھتے یا لڑکوں کے جنھوں نے ابھی نہیں پہچانا عورتوں

عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ

کے بھید کو اور نہ ماریں زمین پر اپنے پاؤں کو کر جانا جائے جو چھپاتی ہیں اپنے

زِينَتِهِنَّ ۚ وَتُوبُوٓا إِلَى اللّٰهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۳۱﴾

سنگار اور توبہ کرو اللہ کے آگے سب ملکر اے ایمان والو تاکہ تم بھلائی پاؤ

خلاصۂ تفسیر

حکم ششم عورتوں کے پردہ کے احکام آپ مسلمان مردوں سے کہد یجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں (یعنی جس عضو کیطرف مطلقاً دیکھنا ناجائز ہے اس کو بالکل نہ دیکھیں اور جس کو فی نفسہٖ دیکھنا جائز ہے مگر شہوت سے جائز نہیں اسکو شہوت سے نہ دیکھیں) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں (یعنی ناجائز محل میں شہوت رانی نہ کریں جس میں زنا اور لواطت سب داخل ہے) یہ اُن کے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے (اور اسکے خلاف میں آلودگی ہے زنا یا مقدمۂ زنا میں) بیشک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں (پس خلاف کرنے والے سزا یابی کے مستحق ہونگے) اور (اسی طرح) مسلمان عورتوں سے کہدیجئے کہ (وہ بھی) اپنی نگاہیں نیچی رکھیں (یعنی جس عضو کیطرف مطلقاً دیکھنا ناجائز ہے اسکو بالکل نہ دیکھیں اور جسکو فی نفسہٖ دیکھنا جائز ہے مگر شہوت سے جائز نہیں اس کو شہوت سے نہ دیکھیں) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں (یعنی ناجائز محل میں شہوت رانی نہ کریں جس میں زنا و سحاق سب داخل ہے) اور اپنی زینت (کے مواقع) کو ظاہر نہ کریں (زینت سے مُراد زیور جیسے کنگن، چوڑی، خلخال، بازوبند طوق، جھومر، پٹی، بالیاں وغیرہ اور ان کے مواقع سے مُراد ہاتھ، پنڈلی، بازو، گردن، سر، سینہ کان، یعنی ان سب مواقع کو سب سے چھپائے رکھیں بلحاظ ان دو استثناؤں کے جو آگے آتے ہیں اور جب ان مواقع کو اجانب سے پوشیدہ رکھنا واجب ہے جن کا ظاہر کرنا محارم کے روبرو جائز ہے جیسا آگے آتا ہے تو اور مواقع و اعضاء جو بدن کے رہ گئے جیسے پشت و شکم وغیرہ جنکا کھولنا محارم کے روبرو بھی جائز نہیں ان کا پوشیدہ رکھنا بدلالۃ النص واجب ہوگیا۔ حاصل یہ ہوا کہ سر سے پاؤں تک تمام بدن اپنا پوشیدہ رکھیں۔ دو استثناء جن کا ذکر اوپر آیا ہے اُن میں سے پہلا استثناء مواقع ضرورت کے لحاظ سے ہے کہ روزمرہ کے کام کاج میں جن اعضاء کے کھولنے کی ضرورت

ہوتی ہے ان کو مستثنیٰ قرار دیا گیا اُس کی تفصیل یہ ہے) مگر جو اس (موقع زینت) میں سے (غالباً) کھلا (ہی) رہتا ہے (جس کے چھپانے میں ہر وقت حرج ہے مراد اس موقع زینت سے چہرہ اور ہاتھ کی ہتھیلیاں اور اصح قول کے مطابق دونوں قدم بھی کیونکہ چہرہ تو قدرتی طور پر مجمع زینت ہے اور بعض زینتیں قصداً بھی اس میں کی جاتی ہیں مثل سرمہ وغیرہ اور ہتھیلیاں اور انگلیاں انگوٹھی چھلے مہندی کا موقع ہے اور قدمین بھی چھلوں اور مہندی کا موقع ہے پس ان مواقع کو اس ضرورت سے مستثنیٰ فرمایا ہے کہ ان کو کھولے بغیر کام کاج نہیں ہو سکتا اور ماظہر کی تفسیر وجہ اور کفین کیساتھ حدیث میں آئی ہے اور قدمین کو فقہاء نے اس پر قیاس کر کے اس حکم میں شامل قرار دیا ہے) اور (خصوصاً سر اور سینہ ڈھکنے کا بہت اہتمام کریں اور) اپنے دوپٹے (جو سر ڈھانکنے کے لئے ہیں) اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں (گو سینہ قمیص سے ڈھک جاتا ہے لیکن اکثر قمیص میں سامنے سے گریبان کھلا رہتا ہے اور سینہ کی ہیئت قمیص کے باوجود ظاہر ہوتی ہے اسلئے اہتمام کی ضرورت ہوئی آگے دوسرا استثناء بیان کیا جاتا ہے جن میں محرم مردوں وغیرہ کو پردہ کے حکم مذکور سے مستثنیٰ کیا گیا ہے) اور اپنی زینت (کے مواقع مذکورہ) کو (کسی پر) ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر یا (اپنے محارم پر یعنی) اپنے باپ پر یا اپنے شوہر کے باپ پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر یا اپنے (حقیقی و علاتی و اخیافی) بھائیوں پر (نہ کہ چچازاد ماموں زاد وغیرہ بھائیوں پر) یا اپنے (مذکورہ) بھائیوں کے بیٹوں پر یا اپنی (حقیقی و علاتی و اخیافی) بہنوں کے بیٹوں پر (نہ کہ چچازاد خالہ زاد بہنوں کی اولاد پر) یا اپنی (یعنی دین کی شریک) عورتوں پر (مطلب یہ کہ مسلمان عورتوں پر کیونکہ کافر عورتوں کا حکم مثل اجنبی مرد کے ہے رواہ فی الدرعن طاؤس و مجاہد و عطاء و سعید بن المسیب وابراہیم) یا اپنی لونڈیوں پر (مطلقاً گو وہ کافر ہی ہوں کیونکہ مرد غلام کا حکم ابو حنیفہؒ کے نزدیک مثل اجنبی مرد کے ہے اُس سے بھی پردہ واجب ہے رواہ فی الدرعن طاؤس و مجاہد و عطاء و سعید بن المسیب ابراہیم) یا اُن مردوں پر جو (محض کھانے پینے کے واسطے) طفیلی (کے طور پر رہتے) ہوں اور ان کو (بوجہ حواس درست نہ ہونے کے عورتوں کیطرف) ذرا توجہ نہ ہو (تابعین کی تخصیص اس لئے ہے کہ اسوقت ایسے ہی لوگ موجود تھے کذا فی الدرعن ابن عباس اور اسی حکم میں ہے ہر مسلوب العقل پس مدار حکم کا سلب حواس پر ہے نہ کہ تابع اور طفیلی ہونے پر مگر اس وقت وہ تابع ایسے ہی تھے اس لئے تابع کا ذکر کر دیا گیا لقول ابن عباس رضؓ فی الدر مغفل فی عقلہ احمق لا یکترث للنساء اور جو سمجھ رکھتا ہو تو وہ بہر حال اجنبی مرد ہے گو بوڑھا یا خصی یا مجبوب ہی کیوں نہ ہو اُس سے پردہ واجب ہے) یا ایسے لڑکوں پر جو عورتوں کے پردہ کی باتوں سے ابھی واقف نہیں ہوئے (مراد وہ بچے ہیں جو ابھی بلوغ کے قریب نہیں پہنچے اور انہیں شہوت

کی کچھ خبر نہیں پس ان سب کے سامنے وجہ وکفین وقدمین کے علاوہ زینت کے مواقع مذکورہ کا
ظاہر کرنا بھی جائز ہے یعنی سر اور سینہ اور شوہر کے روبرو کسی جگہ کا بھی اخفار واجب نہیں گو
خاص بدن کو دیکھنا خلاف اولیٰ ہے۔ قالت سیدتنا ام المومنین عائشۃ رض ما غصلہ لم
ارمنہ ولم یرمنی ذلک الموضع اوردہ فی المشکوٰۃ وروی بقی بن مخلد وابن عدی عن
ابن عباس مرفوعا اذا جامع احدکم زوجتہ اوجاریتہ فلا ینظر الی فرجھا فان ذلک یورث
العمی قال ابن صلاح جید الاسناد کذا فی الجامع الصغیر اور (پردے کا یہاں تک اہتمام
رکھیں کہ چلنے میں) اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہو جاوے (یعنی زیور کی آواز
غیر محرموں کے کان تک پہنچے) اور مسلمانو (تم سے جو ان احکام میں کوتاہی ہو گئی ہو تو) تم سب
اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ (ورنہ معصیت مانع فلاح کامل ہو جاتی ہے)۔

معارف و مسائل

انسداد فواحش اور حفاظت عصمت کا ایک اہم باب۔ پردۂ نسواں

عورتوں کے لئے حجاب اور پردہ کے احکام کی پہلی آیات وہ ہیں جو سورۂ احزاب میں ام المومنین حضرت زینب بنت
جحش رض کے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے عقد نکاح میں آنے کے وقت نازل ہوئیں جس کی تاریخ
بعض حضرات نے ۳ھ ہجری اور بعض نے ۵ھ ہجری بتلائی ہے تفسیر ابن کثیر اور نیل الاوطار
میں ۵ھ ہجری کو ترجیح دی ہے اور روح المعانی میں حضرت انس رض سے روایت نقل کی ہے کہ
ذی قعدہ ۵ھ ہجری میں یہ عقد ہوا ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پہلی آیت حجاب اسی
موقع پر نازل ہوئی۔ اور سورۂ نور کی یہ آیات قصہ افک کیساتھ نازل ہوئی ہیں جو
غزوہ بنی المصطلق یا مریسیع سے واپسی میں پیش آیا یہ غزوہ ۶ھ ہجری میں ہوا ہے اس
سے معلوم ہوا کہ سورۂ نور کی آیات پردہ وحجاب نزول کے اعتبار سے بعد میں آئی ہیں سورۂ احزاب
کی چار آیتیں متعلقہ حجاب نزول کے اعتبار سے مقدم ہیں اور شرعی پردہ کے احکام اُسی وقت
سے شروع ہوئے جبکہ سورۂ احزاب کی آیات نازل ہوئیں، اسلئے حجاب اور پردہ کی پوری بحث
توانشاء اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب میں آوے گی۔ یہاں صرف ان آیات کی تفسیر لکھی جاتی ہے جو
سورۂ نور میں آئی ہیں۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ، یغضوا، غض سے مشتق ہے جس کے معنی کم کرنے اور پست
کرنے کے ہیں (راغب) نگاہ پست اور نیچی رکھنے سے مراد نگاہ کو اُن چیزوں سے پھیر لینا ہے

جن کی طرف دیکھنا شرعاً ممنوع و ناجائز ہے۔ ابن کثیر۔ ابن حبان نے یہی تفسیر فرمائی ہے اس میں غیر محرم عورت کیطرف بری نیت سے دیکھنا تحریماً اور بغیر کسی نیت کے دیکھنا کراہۃً داخل ہے اور کسی عورت یا مرد کے ستر شرعی پر نظر ڈالنا بھی اسمیں داخل ہے (مواضع ضرورت جیسے علاج معالجہ وغیرہ اس سے مستثنیٰ ہیں) کسی کا راز معلوم کرنے کے لئے اُس کے گھر میں جھانکنا اور تمام وہ کام جن میں نگاہ کے استعمال کرنے کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے اسمیں داخل ہیں۔

وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ، شرمگاہوں کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ نفس کی خواہش پورا کرنے کی جتنی ناجائز صورتیں ہیں اُن سب سے اپنی شرمگاہوں کو محفوظ رکھیں۔ اسمیں زنا، لواطت اور دو عورتوں کا باہمی سحاق جس سے شہوت پوری ہو جائے، ہاتھ سے شہوت پوری کرنا یہ سب ناجائز و حرام چیزیں داخل ہیں۔ مراد اس آیت کی ناجائز و حرام شہوت رانی اور اُس کے تمام مقدمات کو ممنوع کرنا ہے جن میں سے ابتدا اور انتہا کو تصریحاً بیان فرما دیا باقی درمیانی مقدمات سب اسمیں داخل ہو گئے۔ فتنۂ شہوت کا سب سے پہلا سبب اور مقدمہ نگاہ ڈالنا اور دیکھنا ہے اور آخری نتیجہ زنا ہے ان دونوں کو صراحۃً ذکر کر کے حرام کر دیا گیا اُن کے درمیانی حرام مقدمات مثلاً باتیں سُننا۔ ہاتھ لگانا وغیرہ یہ سب ضمناً آگئے۔

ابن کثیر نے حضرت عبیدہؒ سے نقل کیا ہے کہ کل ما عصی اللہ بہ فھو کبیرۃ وقد ذکر الطرفین یعنی جس چیز سے بھی اللہ کے حکم کی مخالفت ہوتی ہو سب کبیرہ ہی ہیں لیکن آیت میں اُن کے دو طرف ابتدا و انتہا کو ذکر کر دیا گیا۔ ابتدا نظر اُٹھا کر دیکھنا اور انتہا زنا ہے۔ طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

النظر سھم من سھام ابلیس مسموم من ترکھا مخافتی ابدلتہ ایمانا یجد حلاوتہ فی قلبہ (از ابن کثیر)	نظر ایک زہریلا تیر شیطان کے تیروں میں سے ہے جو شخص باوجود دل کے تقاضے کے اپنی نظر پھیر لے تو میں اسکے بدلے اسکو ایسا پختہ ایمان دونگا جسکی لذت وہ اپنے قلب میں محسوس کرے گا۔

اور صحیح مسلم میں حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ سے روایت ہے کہ اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا اگر بلا ارادہ اچانک کسی غیر محرم عورت پر نظر پڑ جائے تو کیا کرنا چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اپنی نظر اُسطرف سے پھیر لو (ابن کثیر) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ پہلی نظر تو معاف ہے دوسری گناہ ہے، اسکا مطلب بھی یہی ہے کہ پہلی نظر جو بلا ارادہ اچانک پڑ جائے وہ غیر اختیاری ہونے کے سبب معاف ہے ورنہ بالقصد پہلی نظر بھی معاف نہیں۔

بے ریش لڑکوں کیطرف قصداً نظر کرنا بھی اسی حکم میں ہے

ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ بہت سے اسلافِ اُمت کسی امرد (بے ریش لڑکے کیطرف دیکھتے رہنے سے بڑی سختی کے ساتھ منع فرماتے تھے اور بہت سے علماء نے اس کو حرام قرار دیا ہے (غالباً یہ اُس صورت میں ہے جبکہ بُری نیت اور نفس کی خواہش کے ساتھ نظر کیجائے واللہ اعلم۔ش)

غیر محرم کی طرف نظر کرنا حرام ہے اس کی تفصیل

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ الآیۃ، اس طویل آیت کے ابتدائی حصہ میں تو وہی حکم ہے جو اس سے پہلی آیت میں مردوں کو دیا گیا ہے کہ اپنی نظریں پست رکھیں یعنی نگاہ پھیر لیں۔ مردوں کے حکم میں عورتیں بھی داخل تھیں مگر اُن کا ذکر علیحدہ تاکید کے لئے کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کو اپنے محارم کے سوا کسی مرد کو دیکھنا حرام ہے بہت سے علماء کا قول یہ ہے کہ غیر محرم مرد کو دیکھنا عورت کے لئے مطلقاً حرام ہے خواہ شہوت اور بُری نیت سے دیکھے یا بغیر کسی نیت و شہوت کے، دونوں صورتیں حرام ہیں اور اسپر حضرت اُم سلمہؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں مذکور ہے کہ ایک روز اُم سلمہ اور میمونہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں اچانک عبداللہ ابن اُم مکتوم نابینا صحابی آگئے اور یہ واقعہ احکام حجاب نازل ہونے کے بعد پیش آیا تھا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم دونوں کو حکم دیا کہ ان سے پردہ کرو۔ اُم سلمہؓ نے عرض کیا کہ یا رسُول اللہ، وہ تو نابینا ہیں نہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں نہ ہمیں پہچانتے ہیں۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم تو نابینا نہیں ہو، تم تو اُن کو دیکھ رہی ہو (رواہ ابو داؤد والترمذی وقال الترمذی حدیث حسن صحیح) اور دوسرے بعض فقہاء نے کہا کہ بغیر شہوت کے غیر مرد کو دیکھنے میں عورت کے لئے مضائقہ نہیں۔ ان کا استدلال صدیقہ عائشہؓ کی اُس حدیث سے ہے جسمیں مذکور ہے کہ مسجد نبوی کے احاطہ میں کچھ حبشی نوجوان عید کے روز اپنا سپاہیانہ کھیل دکھا رہے تھے۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسکو دیکھنے لگے اور صدیقہ عائشہؓ نے آپکی آڑ میں کھڑے ہو کر اُن کا کھیل دیکھا اور اُسوقت تک دیکھتی رہیں جب تک کہ خود ہی اُس سے اکتا گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نہیں روکا۔ اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ نظرِ شہوت تو حرام ہے اور بلا شہوت نظر کرنا بھی خلافِ اولیٰ ہے اور ایک عورت کو دوسری عورت کے مواضع ستر کو دیکھنا بغیر خاص ضرورتوں کے یہ بھی اسی آیت کے الفاظ سے حرام ہے کیونکہ جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے کہ موضع ستر یعنی مردوں کا ناف سے گھٹنوں تک اور عورتوں کا کل بدن بجز چہرہ اور ہتھیلیوں کے، یہ مواضع ستر ہیں اُن کا چھپانا سب[1] سے فرض ہے نہ کوئی مرد دوسرے مرد کا ستر دیکھ سکتا ہے نہ کوئی عورت دوسری عورت کا ستر دیکھ سکتی ہے اور مرد کسی عورت کا یا عورت کسی مرد کا ستر دیکھے یہ بدرجۂ اولیٰ حرام ہے اور آیت مذکورہ کے حکم غضِ بصر کے

---

[1] یعنی تمام نامحرموں سے۔ محرم کا حکم آگے آرہا ہے۔ (محمد تقی عثمانی ۱۴۱۹ھ)

۲۶

خلاف ہے کیونکہ آیت کا مطلب جو اوپر بیان ہو چکا ہے اس میں ہر ایسی چیز پر نظر کرنا اور نیت رکھنا اور شہانا مُراد ہے جس کی طرف دیکھنے کو شرع میں ممنوع کیا گیا ہے اسمیں عورت کے لئے عورت کا ستر دیکھنا بھی داخل ہے۔

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ الآية، زینت لغوی معنے کے اعتبار سے اُس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے انسان اپنے آپ کو مزین اور خوش منظر بنائے۔ وہ عمدہ کپڑے بھی ہو سکتے ہیں، زیور بھی۔ یہ چیزیں جبکہ کسی عورت کے بدن پر نہ ہوں علیحدہ ہوں تو باتفاقِ اُمت اُن کا دیکھنا مَردوں کے لئے حلال ہے جیسے بازار میں بکنے والے زنانہ کپڑے اور زیور کہ اُن کے دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، اس لئے جمہور مفسرین نے اس آیت میں زینت سے مراد محلِ زینت یعنی وہ اعضاء جن میں زینت کی چیزیں زیور وغیرہ پہنی جاتی ہیں وہ مُراد لئے ہیں اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ عورتوں پر واجب ہے کہ وہ اپنی زینت یعنی مواقعِ زینت کو ظاہر نہ کریں (کذا فی الروح) اس آیت میں جو عورت کے لئے اظہارِ زینت کو حرام قرار دیا ہے آگے اس حکم سے دو استثناء بیان فرمائے گئے ایک منظور کے اعتبار سے ہے یعنی جس کی طرف دیکھا جائے دوسرا ناظر یعنی دیکھنے والوں کے اعتبار سے۔

احکامِ پردہ سے استثناء پہلا استثناء مَا ظَهَرَ مِنْهَا کا ہے یعنی عورت کے لئے اپنی زینت کی کسی چیز کو مَردوں کے سامنے ظاہر کرنا جائز نہیں بجز اُن چیزوں کے جو خود بخود ظاہر ہو ہی جاتی ہیں یعنی کام کاج اور نقل و حرکت کے وقت جو چیزیں عادۃً کھل ہی جاتی ہیں اور عادۃً اُنکا چھپانا مشکل ہے وہ مستثنیٰ ہیں اُن کے اظہار میں کوئی گناہ نہیں (ابن کثیر) مراد اس سے کیا ہے اسمیں حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس کی تفسیریں مختلف ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ مَا ظَهَرَ مِنْهَا میں جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ اوپر کے کپڑے ہیں جیسے برقع یا لمبی چادر جو برقع کے قائم مقام ہوتی ہے یہ کپڑے زینت کے کپڑوں کو چھپانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں تو مُراد آیت کی یہ ہو گئی کہ زینت کی کسی چیز کو ظاہر کرنا جائز نہیں بجز اُن اوپر کے کپڑوں کے جنکا چھپانا بضرورت باہر نکلنے کے وقت ممکن نہیں جیسے برقع وغیرہ۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مُراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں کیونکہ جب عورت کسی ضرورت سے باہر نکلنے پر مجبور ہو تو نقل و حرکت اور لین دین کے وقت چہرے اور ہتھیلیوں کو چھپانا مشکل ہے۔ اس لئے حضرت عبداللہ بن مسعود کی تفسیر کے مطابق تو غیر محرم مردوں کے سامنے عورت کو چہرہ اور ہاتھ کھولنا بھی جائز نہیں صرف اوپر کے کپڑے برقع وغیرہ کا اظہار بضرورت مستثنیٰ ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق چہرہ اور ہاتھوں کی ہتھیلیاں بھی غیر محرموں کے سامنے کھولنا جائز ہے اس لئے فقہاء اُمت

میں بھی اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ چہرہ اور ہتھیلیاں پردے سے مستثنیٰ اور اُن کا غیر محرموں کے سامنے کھولنا جائز ہے یا نہیں، مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر چہرہ اور ہتھیلیوں پر نظر ڈالنے سے فتنہ کا اندیشہ ہو تو اُن کا دیکھنا بھی جائز نہیں اور عورت کو اُن کا کھولنا بھی جائز نہیں اسیطرح اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ ستر عورت جو نماز میں اجماعاً اور خارج نماز علی الاصح فرض ہے اُس سے چہرہ اور ہتھیلیاں مستثنیٰ ہیں اگر انکو کھول کر نماز پڑھی تو نماز باتفاق صحیح و درست ہو جائے گی۔

قاضی بیضاوی اور خازن نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ مقتضا آیت کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے لئے اصل حکم یہ ہے کہ وہ اپنی زینت کی کسی چیز کو بھی ظاہر نہ ہونے دے بجز اُسکے جو نقل و حرکت اور کام کاج کرنے میں عادۃً کھل ہی جاتی ہیں انمیں برقع اور چادر بھی داخل ہیں اور چہرہ اور ہتھیلیاں بھی کہ جب عورت کسی مجبوری اور ضرورت سے باہر نکلتی ہے تو برقع چادر وغیرہ کا ظاہر ہونا تو متعین ہی ہے لین دین کی ضرورت میں بعض اوقات چہرہ اور ہاتھ کی ہتھیلیاں بھی کھل جاتی ہیں تو وہ بھی معاف ہیں گناہ نہیں۔ لیکن اس آیت سے یہ کہیں ثابت نہیں کہ مردوں کو چہرہ اور ہتھیلیاں دیکھنا بھی بلا ضرورت جائز ہے بلکہ مردوں کا تو وہی حکم ہے کہ نگاہ پست رکھیں اگر عورت کہیں چہرہ اور ہاتھ کھولنے پر مجبور ہو جائے تو مردوں کو لازم ہے کہ بلا عذر شرعی اور بلا ضرورت کے اسکی طرف نہ دیکھیں۔ اس توجیہ میں دونوں روایتیں اور تفسیریں جمع ہو جاتی ہیں۔ امام مالکؒ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے کہ غیر محرم عورت کے چہرہ اور ہتھیلیوں پر نظر کرنا بھی بغیر ضرورت صحیحہ کے جائز نہیں۔ اور زواجر میں ابن حجر مکی شافعی رح نے امام شافعی رح کا بھی یہی مذہب نقل کیا ہے کہ اگرچہ عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں ستر عورت کے فرض میں داخل نہیں ان کو کھول کر بھی نماز ہو جاتی ہے مگر غیر محرم مردوں کو ان کا دیکھنا بلا ضرورتِ شرعیہ جائز نہیں۔ اور یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ جن فقہاء نے چہرہ اور ہتھیلیوں کو دیکھنا جائز قرار دیا ہے وہ بھی اسپر متفق ہیں کہ اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو چہرہ وغیرہ دیکھنا بھی ناجائز ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حسن اور زینت کا اصل مرکز انسان کا چہرہ ہے اور زمانہ فتنہ و فساد اور غلبۂ ہوٰی اور غفلت کا ہے اس لئے بجز مخصوص ضرورتوں کے مثلاً علاج معالجہ یا کوئی خطرہ شدیدہ وغیرہ عورت کو غیر محارم کے سامنے قصداً چہرہ کھولنا بھی ممنوع ہے اور مردوں کو اُس کیطرف قصداً نظر کرنا بھی بغیر ضرورت شرعیہ کے جائز نہیں۔

آیت مذکورہ میں زینتِ ظاہرہ کے استثنار کے بعد ارشاد ہے وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ یعنی آنچل مار لیا کریں اپنے دوپٹوں کا اپنے سینوں پر۔ خُمُرٌ، خمار کی جمع ہے اُس کپڑے کو کہتے ہیں جو عورت سر پر استعمال کرے اور اُس سے گلا اور سینہ بھی چھپ جائے۔ جیوب جیب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں گریبان۔ چونکہ زمانہ قدیم سے گریبان سینہ ہی پر ہونے کا معمول ہے

اس لئے جیوب کے چھپانے سے مراد سینہ کا چھپانا ہے شروع آیت میں اظہارِ زینت کی ممانعت تھی اس جملہ میں اخفاءِ زینت کی تاکید اور اس کی ایک صورت کا بیان ہے جسکی اصل وجہ ایک رسمِ جاہلیت کا مٹانا ہے زمانۂ جاہلیت میں عورتیں دوپٹہ سر پر ڈال کر اسکے دونوں کنارے پُشت پر چھوڑ دیتی تھیں جس سے گریبان اور گلا اور سینہ اور کان کھلے رہتے تھے اس لئے مسلمان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ایسا نہ کریں بلکہ دوپٹے کے دونوں پلّے ایک دوسرے پر اُلٹ لیں تاکہ یہ سب اعضاء چھُپ جائیں (رواہ ابن ابی حاتم عن ابی جبیرؒ - روح) آگے دوسرا استثناء اُن مردوں کا بیان کیا گیا ہے جن سے شرعاً پردہ نہیں جس کے دو سبب ہیں اوّل تو جن مردوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے اُن سے کسی فتنہ کا خطرہ نہیں وہ محارم ہیں جن کی طبائع کو حق تعالیٰ نے خلقۃً ایسا بنایا ہے کہ وہ ان عورتوں کی عصمت کے محافظ ہوتے ہیں اُن سے خود کوئی فتنہ کا احتمال نہیں - دوسرے ہر وقت ایک جگہ رہنے سہنے کی ضرورت بھی سہولت پیدا کرنے کی مقتضی ہے - یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ شوہر کے سوا دوسرے محارم کو جو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ احکام حجاب پردہ سے استثناء ہے - ستر عورت سے استثناء نہیں عورت کا جو بدن ستر میں داخل ہے جسکا کھولنا نماز میں جائز نہیں اُس کا دیکھنا محارم کے لئے بھی جائز نہیں ہے[1]

اس آیت میں آٹھ قسم کے محرم مَردوں کا اور چار دوسری اقسام کا پردہ سے استثناء کیا گیا ہے اور سورۂ احزاب کی آیت جو نزول میں اس سے مقدم ہے اسمیں صرف سات اقسام کا ذکر ہے پانچ کا اضافہ سُورۂ نور کی آیت میں کیا گیا ہے جو اس کے بعد نازل ہوئی ہے -

تنبیہ یاد رہے کہ اس جگہ لفظ محرم عام معنی میں استعمال ہوا ہے جو شوہر پر بھی مشتمل ہے فقہاء کی اصطلاح میں محرم کی جو خاص تفسیر ہے کہ جس سے کبھی نکاح جائز نہ ہو وہ یہاں مراد نہیں - تفصیل ان بارہ مستثنیات کی جو سورۂ نور کی مذکورۂ آیت میں ہے یہ ہے - سب سے پہلے شوہر ہے جس سے بیوی کے کسی عضو کا پردہ نہیں اگرچہ اعضاء مخصوصہ کو بلا ضرورت دیکھنا خلافِ اولیٰ ہے حضرت صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا ما رأی منی ولا رأیت منہ یعنی نہ آپ نے میرے خاص عضو کو دیکھا نہ میں نے آپ کے -

دوسرے اپنے باپ ہیں، جس میں دادا، پردادا سب داخل ہیں - تیسرے شوہر کا باپ ہے اسمیں بھی دادا، پردادا سب داخل ہیں - چوتھے اپنے لڑکے جو اپنی اولاد میں ہیں - پانچویں شوہر کے لڑکے جو کسی دوسری بیوی سے ہوں - چھٹے اپنے بھائی، اسمیں حقیقی بھی داخل ہیں اور باپ شریک یعنی علاتی اور ماں شریک یعنی اخیافی بھی - لیکن ماموں، خالہ یا چچا، تایا اور پھوپی کے لڑکے جن کو عام عرف میں بھائی کہا جاتا ہے وہ اسمیں داخل نہیں وہ غیر محرم ہیں - ساتویں بھائیوں کے لڑکے یہاں بھی صرف حقیقی یا علاتی یا اخیافی بھائی کے لڑکے مُراد ہیں دوسرے عرفی بھائیوں کے لڑکے شامل نہیں - آٹھویں بہنوں کے لڑکے - اسمیں بھی بہنوں سے حقیقی اور علاتی اخیافی بہنیں

---

[1] یہاں مسئلے میں تھوڑی سی تفصیل ہے جو بیان ہونے سے رہ گئی ہے - وہ تفصیل یہ ہے کہ عورت کے ستر کا وہ حصّہ جو ناف اور گھٹنوں کے درمیان ہے نیز پیٹ اور کمر محرم کے لئے بھی دیکھنا جائز نہیں - البتہ اس کے علاوہ بدن کے دوسرے حصّے، مثلاً سر، کلائیاں، پنڈلی وغیرہ محرم کے سامنے کھولی جا سکتی ہے، البتہ زمانہ چونکہ فتنے کا ہے - اس لئے بلا ضرورت کھولنے کی عادت ڈالنا مناسب نہیں - شاید اسی وجہ سے حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کے ستر ہی کو محرم کا ستر قرار دیا ہے، واللہ اعلم محمد تقی عثمانی ۱۴۱۹ھ

مراد ہیں۔ ماموں زاد چچا زاد بہنیں داخل نہیں یہ آٹھ قسمیں تو محارم کی ہیں۔

نویں قسم اَوْ نِسَآئِهِنَّ یعنی اپنی عورتیں جس سے مُراد مُسلمان عورتیں ہیں کہ اُن کے سامنے بھی وہ تمام اعضاء کھولنا جائز ہے جو اپنے باپ بیٹوں کے سامنے کھولے جاسکتے ہیں اور یہ اوپر لکھا جاچکا ہے کہ یہ استثناء احکام حجاب و پردہ سے ہے، احکام ستر سے نہیں۔ اس لئے جو اعضاء ایک عورت اپنے محرم مردوں کے سامنے نہیں کھول سکتی اُن کا کھولنا کسی مسلمان عورت کے سامنے بھی جائز نہیں۔ علاج معالجہ وغیرہ کی ضرورتیں مستثنیٰ ہیں۔

نِسَآئِهِنَّ، مسلمان عورتوں کی قید سے یہ معلوم ہوا کہ کافر مشرک عورتوں سے بھی پردہ واجب ہے وہ غیر محرم مَردوں کے حکم میں ہیں۔ ابن کثیر نے حضرت مجاہدؒ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان عورت کے لئے جائز نہیں کہ کسی کافر عورت کے سامنے اپنے اعضاء کھولے لیکن احادیث صحیحہ میں ایسی روایات موجود ہیں جن میں کافر عورتوں کا ازواج مطہرات کے پاس جانا ثابت ہے اسلئے اس مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے بعض نے کافر عورتوں کو مثل غیر محرم مردوں کے قرار دیا ہے بعض نے اس معاملہ میں مسلمان اور کافر دونوں قسم کی عورتوں کا ایک ہی حکم رکھا ہے کہ اُن سے پردہ نہیں۔ امام رازیؒ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ لفظ نِسَآئِهِنَّ میں تو سبھی عورتیں مسلم اور کافر داخل ہیں اور سلف صالحین سے جو کافر عورتوں سے پردہ کرنے کی روایات منقول ہیں وہ استحباب پر مبنی ہیں۔ روح المعانی میں مفتی بغداد علامہ آلوسیؒ نے اسی قول کو اختیار فرما کر کہا ہے۔

هٰذا القول اوفق بالناس الیوم فانہ لا یکاد یمکن احتجاب المسلمات عن الذمیات (روح المعانی)	یہی قول آجکل لوگوں کے مناسب حال ہے کیونکہ اس زمانے میں مسلمان عورتوں کا کافر عورتوں سے پردہ تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔

دسویں قسم اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ہے یعنی وہ جو ان عورتوں کے مملوک ہوں۔ ان الفاظ کے عموم میں تو غلام اور لونڈیاں دونوں داخل ہیں لیکن اکثر ائمہ فقہاء کے نزدیک اس سے مراد صرف لونڈیاں ہیں، غلام مرد اس میں داخل نہیں۔ اُن سے عام محارم کی طرح پردہ واجب ہے۔ حضرت سعید بن مسیّبؒ نے اپنے آخری قول میں فرمایا لا یغرنکم اٰیۃ النور فانہا فی الاناث دون الذکور یعنی تم لوگ کہیں سورۂ نور کی اس آیت سے مغالطہ میں نہ پڑجاؤ کہ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ کے الفاظ عام ہیں۔ مرد غلاموں کو بھی شامل ہیں لیکن واقعہ ایسا نہیں یہ آیت صرف عورتوں یعنی کنیزوں کے حق میں ہے مرد غلام اسمیں داخل نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حسن بصریؒ ابن سیرینؒ نے فرمایا کہ غلام مرد کے لئے اپنی آقا عورت کے بال دیکھنا جائز نہیں (روح المعانی) باقی رہا یہ سوال کہ جب لفظ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ سے صرف عورتیں لونڈیاں ہی مُراد ہیں تو وہ اس سے

پہلے لفظ نسائہن میں داخل ہیں ان کو علیحدہ بیان کرنے کی ضرورت کیا تھی اسکا جواب جصاصؒ نے یہ دیا ہے کہ لفظ نسائہن اپنے ظاہر کے اعتبار سے صرف مسلمان عورتوں کے لئے ہے۔ اور مملوکہ باندیوں میں اگر کافر بھی ہوں تو ان کو مستثنیٰ کرنے کے لئے یہ لفظ علیحدہ لایا گیا ہے۔

گیارھویں قسم اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ مغفل اور بدحواس قسم کے لوگ ہیں جن کو عورتوں کی طرف کوئی رغبت و دلچسپی ہی نہ ہو (ابن کثیر) اور یہی مضمون ابن جریر نے ابوعبداللہؒ، ابن جبیرؒ، ابن عطیہؒ وغیرہ سے نقل کیا ہے اسلئے اس سے مراد وہ مرد ہیں جو عورتوں کیطرف نہ کوئی رغبت و شہوت رکھتے ہوں، نہ اُن کے اوصافِ حُسن اور حالات سے کوئی دلچسپی رکھتے ہوں کہ دوسرے لوگوں سے بیان کر دیں بخلاف مخنث قسم کے لوگوں کے جو عورتوں کے اوصافِ خاص سے تعلق رکھتے ہوں اُن سے بھی پردہ واجب ہے جیسا کہ صدیقہ عائشہؓ کی حدیث میں ہے کہ ایک مخنث ازواجِ مطہرات کے پاس آیا کرتا تھا اور اُمہات المؤمنین اسکو غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ جو اس آیت میں مذکور ہے داخل سمجھ کر اُس کے سامنے آجاتی تھیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب اُس کو دیکھا اور اُس کی باتیں سُنیں تو گھروں میں داخل ہونے سے اسکو روک دیا (روح المعانی)

اسی لئے ابن حجر مکیؒ نے شرح منہاج میں فرمایا ہے کہ مرد اگرچہ عنین (نامرد) یا مجبوب (مقطوع العضو) یا بہت بوڑھا ہو وہ اس غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ کے لفظ میں داخل نہیں ان سب سے پردہ واجب ہے۔ اس میں غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ کے لفظ کیساتھ جو التّٰبِعِيْنَ کا لفظ مذکور ہے۔ اُس سے مراد یہ ہے کہ ایسے مغفل بدحواس لوگ جو طفیلی بن کر کھانے پینے کے لئے گھروں میں چلے جائیں وہ مستثنیٰ ہیں۔ اسکا ذکر صرف اسلئے کیا گیا کہ اسوقت ایسے مغفل قسم کے کچھ مرد ایسے ہی تھے جو طفیلی بن کر کھانے پینے کے لئے گھروں میں جاتے تھے اصل مدارِ حکم کا ان کے مغفل بدحواس ہونے پر ہے تابع اور طفیلی ہونے پر نہیں۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

بارھویں قسم اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ ہے۔ اس سے مراد وہ نابالغ بچے ہیں جو ابھی بلوغ کے قریب بھی نہیں پہنچے اور عورتوں کے مخصوص حالات و صفات اور حرکات و سکنات سے بالکل بے خبر ہوں۔ اور جو لڑکا ان اُمور سے دلچسپی لیتا ہو وہ مراہق یعنی قریب البلوغ ہے اُس سے پردہ واجب ہے (ابن کثیر) امام جصاص رحؒ نے فرمایا کہ یہاں طفل سے مراد وہ بچے ہیں جو مخصوص معاملات کے لحاظ سے عورتوں اور مردوں میں کوئی امتیاز نہ کرتے ہوں (ذکرہ عن المجاہد) پردہ سے مستثنیات کا بیان ختم ہوا۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ، یعنی عورتوں پر لازم ہے

کہ اپنے پاؤں اتنی زور سے نہ رکھیں جس سے زیور کی آواز نکلے اور انکی مخفی زینت مردوں پر ظاہر ہو۔

زیور کی آواز غیر محرموں کو سُنانا جائز نہیں شروع آیت میں عورتوں کو اپنی زینت غیر مردوں پر ظاہر کرنے سے منع فرمایا تھا، آخر میں اسکی مزید تاکید ہے کہ مواضع زینت سر اور سینہ وغیرہ کا چھپانا تو واجب تھا ہی۔ اپنی مخفی زینت کا اظہار خواہ کسی ذریعہ سے ہو وہ بھی جائز نہیں۔ زیور کے اندر خود کوئی چیز ایسی ڈالی جائے جس سے وہ بجنے لگے یا ایک زیور دوسرے زیور سے ٹکرا کر بجے یا پاؤں زمین پر اس طرح مارے جس سے زیور کی آواز نکلے اور غیر محرم مرد سُنیں یہ سب چیزیں اس آیت کی رُو سے ناجائز ہیں۔ اور اسی وجہ سے بہت سے فقہاء نے فرمایا کہ جب زیور کی آواز غیر محرموں کو سُنانا اس آیت سے ناجائز ثابت ہوا تو خود عورت کی آواز کا سُنانا اس سے بھی زیادہ سخت اور بدرجۂ اولی ناجائز ہوگا۔ اس لئے عورت کی آواز کو بھی ان حضرات نے ستر میں داخل قرار دیا ہے اور اسی بناء پر نوازل میں فرمایا کہ عورتوں کو جہاں تک ممکن ہو قرآن کی تعلیم بھی عورتوں ہی سے لینا چاہیئے۔ مردوں سے تعلیم لینا بدرجۂ مجبوری جائز ہے۔

صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ نماز میں اگر کوئی سامنے سے گزرنے لگے تو مرد کو چاہیئے بلند آواز سے سُبحان اللہ کہہ کر گزرنے والے کو متنبہ کردے مگر عورت آواز نہ نکالے بلکہ اپنی ایک ہتھیلی کی پُشت پر دوسرا ہاتھ مار کر اس کو متنبہ کرے۔

عورت کی آواز کا مسئلہ کیا عورت کی آواز فی نفسہ ستر میں داخل ہے اور غیر محرم کو آواز سُنانا جائز ہے؟ اس معاملے میں حضرات ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رح کی کتب میں عورت کی آواز کو ستر میں داخل نہیں کیا گیا۔ حنفیہ کے نزدیک بھی مختلف اقوال ہیں۔ ابن ہمام نے نوازل کی روایت کی بناء پر ستر میں داخل قرار دیا ہے۔ اسی لئے حنفیہ کے نزدیک عورت کی اذان مکروہ ہے لیکن حدیث سے ثابت ہے کہ ازواج مطہرات نزولِ حجاب کے بعد بھی پسِ پردہ غیر محارم سے بات کرتی تھیں اس مجموعہ سے راجح اور صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس موقع اور جس محل میں عورت کی آواز سے فتنہ پیدا ہونیکا خطرہ ہو وہاں ممنوع ہے جہاں یہ نہ ہو جائز ہے (جصاص) اور احتیاط اسی میں ہے کہ بلا ضرورت عورتیں پسِ پردہ بھی غیر محرموں سے گفتگو نہ کریں واللہ اعلم

خوشبو لگا کر باہر نکلنا اسی حکم میں یہ بھی داخل ہے کہ عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو خوشبو لگا کر نہ نکلے کیونکہ وہ بھی اس کی مخفی زینت ہے غیر محرم تک یہ خوشبو پہنچے تو ناجائز ہے ترمذی میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رض کی حدیث ہے جس میں خوشبو لگا کر باہر جانے والی عورت کو بُرا کہا گیا ہے۔

مزیّن برقع پہن کر نکلنا بھی ناجائز ہے امام جصاصؒ نے فرمایا کہ جب زیور کی آواز تک کو

قرآن نے اظہارِ زینت میں داخل قرار دے کر ممنوع کیا ہے تو مزین رنگوں کے کامدار برقعے پہن کر نکلنا بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کا چہرہ اگرچہ ستر میں داخل نہیں مگر وہ زینت کا سب سے بڑا مرکز ہے اسلئے اسکا بھی غیر محرموں سے چھپانا واجب ہے الا بضرورت (جصاص)

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ، یعنی توبہ کرو اللہ سے تم سب کے سب اے مؤمن بندو۔ اس آیت میں اوّل مردوں کو نظریں پست رکھنے کا حکم پھر عورتوں کو ایسا ہی حکم پھر عورتوں کو غیر محرموں سے پردہ کرنے کا حکم الگ الگ دینے کے بعد اس جملے میں سب مرد و عورت کو شامل کر کے ہدایت کی گئی ہے کہ شہوتِ نفسانی کا معاملہ دقیق ہے دوسروں کو اسپر اطلاع ہونا مشکل ہے مگر اللہ تعالیٰ پر ہر ہر چھپا ہوا اور کھلا ہوا یکساں ظاہر ہے اسلئے اگر کسی سے احکامِ مذکورہ میں کسی وقت کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو اسپر لازم ہے کہ اس سے توبہ کرے گزشتہ پر ندامت کے ساتھ اللہ سے مغفرت مانگے اور آئندہ اُسکے پاس نہ جانے کا عزم مصمم کرے۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ
اور نکاح کر دو رانڈوں کا اپنے اندر اور جو نیک ہوں تمہارے غلام اور لونڈیاں

اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ
اگر وہ ہوں گے مفلس اللہ اُن کو غنی کر دے گا اپنے فضل سے اور اللہ کشائش والا ہے

عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى
سب کچھ جانتا ہے، اور اپنے آپ کو تھامتے رہیں جن کو نہیں ملتا سامان نکاح کا جب تک کہ

يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ
مقدور دے اُن کو اللہ اپنے فضل سے

خلاصۂ تفسیر

(احرار میں سے) جو بے نکاح ہوں (خواہ مرد ہوں یا عورتیں اور بے نکاح ہونا بھی عام ہے خواہ ابھی تک نکاح ہوا ہی نہ ہو یا ہونے کے بعد بیوی کی موت یا طلاق کے سبب بے نکاح رہ گئے) تم اُن کا نکاح کر دیا کرو اور (اسی طرح) تمھارے غلام اور لونڈیوں میں جو اس (نکاح) کے لائق ہوں (یعنی حقوقِ نکاح ادا کر سکتے ہوں) ان کا بھی (نکاح کر دیا کرو محض اپنی مصلحت سے اُن کی خواہشِ نکاح کی مصلحت کو نوت نہ کیا کرو۔ اور احرار کے نکاح پیغام

دینے والے کے فقر و افلاس پر نظر کر کے انکار نہ کر دیا کرو جبکہ اسمیں کسب معاش کی صلاحیت موجود ہو کیونکہ) اگر وہ لوگ مفلس ہوں گے تو اللہ تعالیٰ (اگر چاہے گا) اُن کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا (خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو مالدار نہ ہونے کیوجہ سے نکاح سے انکار کرو اور نہ یہ خیال کرو کہ نکاح ہوگیا تو خرچ بڑھ جائے گا جو موجودہ حالت میں غنی و مالدار ہے وہ بھی نکاح کرنے سے محتاج و مفلس ہو جائے گا کیونکہ رزق کا مدار اصل میں اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے وہ کسی مالدار کو بغیر نکاح کے بھی فقیر و محتاج کر سکتا ہے، اور کسی غریب نکاح والے کو نکاح کے باوجود فقر و افلاس سے نکال سکتا ہے) اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے (جس کو چاہے مالدار کر دے اور سب کا حال) خوب جاننے والا ہے (جس کو غنی کرنا مقتضائے حکمت و مصلحت ہوگا اسکو غنی کر دیا جاوے گا اور جس کے محتاج و فقیر رہنے ہی میں اسکی مصلحت ہے اُس کو فقیر رکھا جائے گا) اور (اگر کسی کو اپنے فقر و افلاس کیوجہ سے نکاح کا سامان میسر نہ ہو تو) ایسے لوگوں کو کہ جنکو نکاح کا مقدور نہیں اُن کو چاہیئے کہ (اپنے نفس کو) قابو میں رکھیں یہانتک کہ اللہ تعالیٰ (اگر چاہے تو) انکو اپنے فضل سے غنی کر دے (اسوقت نکاح کر لیں)۔

معارف و مسائل

بعض احکام نکاح پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سورۂ نور میں زیادہ تر وہ احکام ہیں جن کا تعلق عفت و عصمت کی حفاظت اور فواحش و بے حیائی کی روک تھام سے ہے۔ اس سلسلہ میں زنا اور اُسکے متعلقات کی شدید سزاؤں کا ذکر کیا گیا پھر استیذان کا، پھر عورتوں کے پردے کا۔ شریعت اسلام چونکہ ایک معتدل شریعت ہے اس کے احکام سب ہی اعتدال پر اور انسان کے فطری جذبات و خواہشات کی رعایت کیساتھ تعدی اور حد سے نکلنے کی ممانعت کے اصول پر دائر ہیں اسلئے جب ایک طرف انسان کو ناجائز شہوت رانی سے سختی کیساتھ روکا گیا تو ضروری تھا کہ فطری جذبات و خواہشات کی رعایت سے اسکا کوئی جائز اور صحیح طریقہ بھی بتلایا جائے۔ اسکے علاوہ بقائے نسل کا عقلی اور شرعی تقاضا بھی یہی ہے کہ کچھ حدود کے اندر رہ کر مرد و عورت کے اختلاط کی کوئی صورت تجویز کی جائے۔ اسی کا نام قرآن و سنت کی اصطلاح میں نکاح ہے۔ آیت مذکورہ میں اسکے متعلق حرہ عورتوں کے اولیاء اور کنیزوں غلاموں کے آقاؤں کو حکم دیا ہے کہ وہ اُن کا نکاح کر دیا کریں۔ وَاَنۡكِحُوا الۡاَيَامٰى مِنۡكُمۡ الاٰیۃ

اَیَامٰی، اَیِّم کی جمع ہے جو ہر اُس مرد و عورت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جسکا نکاح موجود نہ ہو۔ خواہ اوّل ہی سے نکاح نہ کیا ہو یا زوجین میں سے کسی ایک کی موت سے یا طلاق

سے نکاح ختم ہو چکا ہو۔ ایسے مردوں و عورتوں کے نکاح کے لئے اُن کے اولیاء کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اُن کے نکاح کا انتظام کریں۔

آیتِ مذکورہ کے طرزِ خطاب سے اتنی بات تو باتفاق ائمہ فقہاء ثابت ہے کہ نکاح کا مسنون اور بہتر طریقہ یہی ہے کہ خود اپنا نکاح کرنے کے لئے کوئی مرد یا عورت بلا واسطہ اقدام کے بجائے اپنے اولیاء کے واسطے سے یہ کام انجام دے۔ اسمیں دین و دُنیا کے بہت سے مصالح اور فوائد ہیں۔ خصوصاً لڑکیوں کے معاملہ میں کہ لڑکیاں اپنے نکاح کا معاملہ خود طے کریں، یہ ایک قسم کی بے حیائی بھی ہے اور اسمیں فواحش کے راستے کھل جانیکا خطرہ بھی۔ اسی لئے بعض روایاتِ حدیث میں عورتوں کو خود اپنا نکاح بلا واسطہ ولی کرنے سے روکا بھی گیا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک یہ حکم ایک خاص سنّت اور شرعی ہدایت کی حیثیت میں ہے اگر کوئی بالغ لڑکی اپنا نکاح بغیر اجازت ولی کے اپنے کفو میں کرے تو نکاح صحیح ہو جائے گا اگرچہ خلاف سُنّت کرنے کیوجہ سے وہ موجبِ ملامت ہوگی جبکہ اُسنے کسی مجبوری سے اس پر اقدام نہ کیا ہو۔

امام شافعیؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک اسکا نکاح ہی باطل کالعدم ہوگا جب تک ولی کے واسطہ سے نہ ہو۔ یہ جگہ اختلافی مسائل کی مکمل تحقیق اور دونوں فقہاء کے دلائل بیان کرنے کی نہیں لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ مذکورہ آیت سے زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ نکاح میں اولیاء کا واسطہ ہونا چاہئے باقی یہ صورت کہ کوئی بلا واسطہ اولیاء نکاح کرے تو اُس کا کیا حکم ہوگا یہ آیتِ قرآن اُس سے ساکت ہے۔ خصوصاً اسوجہ سے بھی کہ لفظ ایامیٰ میں بالغان مرد و عورت دونوں داخل ہیں اور بالغ لڑکوں کا نکاح بلا واسطہ ولی سب کے نزدیک صحیح ہو جاتا ہے اسکو کوئی باطل نہیں کہتا۔ اسی طرح ظاہر یہ ہے کہ لڑکی بالغ اگر اپنا نکاح خود کرے تو وہ بھی صحیح اور منعقد ہو جائے۔ ہاں خلافِ سنت کام کرنے پر ملامت دونوں کو کی جائے گی۔

نکاح واجب ہے یا سنت یا مختلف حالات میں حکم مختلف ہے اس پر ائمہ مجتہدین تقریباً سبھی متفق ہیں کہ جس شخص کو نکاح نہ کرنے کی صورت میں غالب گمان یہ ہو کہ وہ حدودِ شرعیت پر قائم نہیں رہ سکے گا گناہ میں مبتلا ہو جائے گا اور نکاح کرنے پر اُس کو قدرت بھی ہو کہ اُسکے وسائل موجود ہوں تو ایسے شخص پر نکاح کرنا فرض یا واجب ہے جب تک نکاح نہ کریگا گنہگار رہے گا۔ ہاں اگر نکاح کے وسائل موجود نہیں کہ کوئی مناسب عورت میسر نہیں یا اسکے لئے مہر معجل وغیرہ کی حد تک ضروری خرچ اُسکے پاس نہیں تو اسکا حکم اگلی آیت میں آیا ہے کہ اسکو چاہئے کہ وسائل کی فراہمی کی کوشش کرتا رہے اور جب تک وہ میسر نہ ہوں اپنے نفس کو قابو میں رکھنے اور صبر

کرنے کی کوشش کرے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے لئے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ مسلسل روزے رکھے۔ اس سے غلبۂ شہوت کو سکون ہو جاتا ہے۔

مسند احمد میں روایت ہے کہ حضرت عکاف رضؓ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا تمہاری زوجہ ہے انھوں نے عرض کیا نہیں۔ پھر پوچھا کوئی شرعی لونڈی ہے کہا کہ نہیں پھر آپ نے دریافت کیا کہ تم صاحبِ وسعت ہو یا نہیں۔ انھوں نے عرض کیا کہ صاحبِ وسعت ہوں۔ مراد یہ تھی کہ کیا تم نکاح کے لئے ضروری نفقات کا انتظام کر سکتے ہو جس کے جواب میں انھوں نے اقرار کیا۔ اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تو تم شیطان کے بھائی ہو اور فرمایا کہ ہماری سنت نکاح کرنا ہے۔ تم میں بدترین آدمی وہ ہیں جو بے نکاح ہوں اور تمھارے مُردوں میں سب سے رذیل وہ ہیں جو بے نکاح مرگئے (مظہری)

اس روایت کو بھی جمہور فقہاء نے اُسی حالت پر محمول فرمایا ہے جبکہ نکاح نہ کرنے کی صورت میں گناہ کا خطرہ غالب ہو۔ عکافؓ کا حال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوگا کہ وہ صبر نہیں کرسکتے۔ اسی طرح مسند احمد میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نکاح کرنے کا حکم دیا اور تبتّل یعنی بے نکاح رہنے سے سختی کیساتھ منع فرمایا (مظہری) اسی طرح کی اور بھی روایاتِ حدیث ہیں۔ ان سب کا محل جمہور فقہاء کے نزدیک وہی صورت ہے کہ نکاح نہ کرنے میں ابتلاءِ معصیت کا خطرہ غالب ہو۔ اسی طرح اس پر بھی تقریباً سبھی فقہاء کا اتفاق ہے کہ جس شخص کو ظنِ غالب یہ معلوم ہو کہ وہ نکاح کرنے کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہو جائے گا مثلاً بیوی کے حقوقِ زوجیت ادا کرنے پر قدرت نہیں اُس پر ظلم کا مرتکب ہوگا یا اسکے لئے نکاح کرنے کی صورت میں کوئی دوسرا گناہ یقینی طور پر لازم آجائیگا ایسے شخص کو نکاح کرنا حرام یا مکروہ ہے۔

اب اُس شخص کا حکم باقی رہا جو حالت اعتدال میں ہے کہ نہ تو ترکِ نکاح سے گناہ کا خطرہ قوی ہے اور نہ نکاح کی صورت میں کسی گناہ کا اندیشہ غالب ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں کہ اسکو نکاح کرنا افضل ہے یا ترکِ نکاح کر کے نفلی عبادات میں مشغول ہونا افضل ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک نفلی عبادات میں لگنے سے افضل نکاح کرنا ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک اشتغالِ عبادت افضل ہے۔ وجہ اس اختلاف کی اصل میں یہ ہے کہ نکاح اپنی ذات کے اعتبار سے تو ایک مباح ہے جیسے کھانا، پینا، سونا وغیرہ ضروریاتِ زندگی سب مباح ہیں اسمیں عبادت کا پہلو اس نیت سے آجاتا ہے کہ اسکے ذریعہ آدمی اپنے آپ کو گناہ سے بچا سکے گا اور اولاد صالح پیدا ہوگی تو اسکا بھی ثواب ملے گا۔ اور ایسی نیک نیت سے جو مباح کام بھی انسان کرتا ہے وہ اُس کے لئے بالواسطہ عبادت بنجاتی ہے کھانا پینا اور سونا بھی اسی

نیت سے عبادت ہوجاتا ہے اور اشتغال بالعبادت اپنی ذات میں عبادت ہے اسلئے امام شافعیؒ عبادت کے لئے خلوت گزینی کو نکاح سے افضل قرار دیتے ہیں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک نکاح میں عبادت کا پہلو بہ نسبت دوسرے مباحات کے غالب ہے احادیث صحیحہ میں اُس کو سُنّت المرسلین اور اپنی سنّت قرار دے کر تاکیدات بکثرت آئی ہیں۔ اُن روایاتِ حدیث کے مجموعہ سے اتنا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ نکاح عام مباحات کی طرح مُباح نہیں بلکہ سُنّتِ انبیاء ہے جس کی تاکیدات بھی حدیث میں آئی ہیں صرف نیت کی وجہ سے عبادت کی حیثیت اسمیں نہیں بلکہ سُنّتِ انبیاء ہونے کی حیثیت سے بھی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اس طرح تو کھانا پینا سونا بھی سُنّتِ انبیاء ہے کہ سب نے ایسا کیا ہے مگر جواب واضح ہے کہ ان چیزوں پر سب انبیاء کا عمل ہونے کے باوجود یہ کسی نے نہیں کہا نہ کسی حدیث میں آیا کہ کھانا پینا اور سونا سُنّتِ انبیاء ہے بلکہ اس کو عام انسانی عادت کے تابع انبیاء کا عمل قرار دیا ہے بخلاف نکاح کے کہ اسکو صراحۃً سُنّت المرسلین اور اپنی سُنّت فرمایا ہے۔

تفسیر مظہری میں اس موقع پر ایک معتدل بات یہ کہی ہے کہ جو شخص حالتِ اعتدال میں ہو کہ نہ غلبۂ شہوت سے مجبور و مغلوب ہو اور نہ نکاح کرنے سے کسی گناہ میں پڑنے کا اندیشہ رکھتا ہو۔ یہ شخص اگر یہ محسوس کرے کہ نکاح کرنے کے باوجود نکاح اور اہل و عیال کی مشغولیت میرے لئے کثرتِ ذکر اللہ اور توجہ الی اللہ سے مانع نہیں ہوگی تو اسکے لئے نکاح افضل ہے اور انبیاء علیہم السلام اور صلحاء اُمت کا عام حال یہی تھا۔ اور اگر اسکا اندازہ یہ ہے کہ نکاح اور اہل و عیال کے مشاغل اسکو دینی ترقی، کثرتِ ذکر وغیرہ سے روک دیں گے تو بحالتِ اعتدال اُسکے لئے عبادت کے لئے خلوت گزینی اور ترکِ نکاح افضل ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات اس کی تطبیق پر شاہد ہیں اُن میں ایک یہ ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، اسمیں یہی ہدایت ہے کہ انسان کے مال و اولاد اُس کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کر دینے کا سبب نہ بننے چاہئیں۔ واللہ سبحانہٗ تعالیٰ اعلم۔

وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ، یعنی اپنے غلاموں اور کنیزوں میں جو صالح ہوں اُن کے نکاح کرا دیا کرو۔ یہ خطاب اُن کے آقاؤں اور مالکوں کو ہے اس جگہ صالحین کا لفظ اپنے لُغوی معنے میں آیا ہے یعنی انمیں جو شخص نکاح کی صلاحیت و استطاعت رکھتا ہو اسکا نکاح کرا دینے کا حکم انکے آقاؤں کو دیا گیا ہے مُراد اس صلاحیت سے وہی ہے کہ بیوی کے حقوقِ زوجیت اور نفقہ و مہر معجل ادا کرنے کے قابل ہوں۔ اور اگر صالحین کو معروف یعنی نیک لوگوں کے معنے میں لیا جائے تو پھر انکی تخصیص بالذکر اسوجہ سے ہوگی کہ نکاح کا اصل مقصد حرام سے بچنے کا وہ صالحین ہی میں ہو سکتا ہے بہرحال اپنے غلاموں اور کنیزوں میں جو صلاحیت نکاح کی رکھنے والے ہوں اُنکے نکاح

کا حکم اُن کے آقاؤں کو دیا گیا ہے اور مُراد اس سے یہ ہے کہ اگر وہ اپنی نکاح کی ضرورت ظاہر کریں اور خواہش کریں کہ اُن کا نکاح کر دیا جائے تو آقاؤں پر بعض فقہار کے نزدیک واجب ہوگا کہ انکے نکاح کر دیں اور جمہور فقہار کے نزدیک اُن پر لازم ہے کہ انکے نکاح میں رکاوٹ نہ ڈالیں بلکہ اجازت دیدیں کیونکہ مملوک غلاموں اور کنیزوں کا نکاح بغیر مالکوں کی اجازت کے نہیں ہوسکتا۔ تو یہ حکم ایسا ہی ہوگا جیسا کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں ہے فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ یعنی عورتوں کے اولیار پر لازم ہے کہ اپنی زیر ولایت عورتوں کو نکاح سے نہ روکیں اور جیسا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تمھارے پاس کوئی ایسا شخص منگنی لیکر آوے اور اخلاق آپکو پسند ہوں تو ضرور نکاح کر دو اگر ایسا نہیں کروگے تو زمین میں فتنہ اور وسیع پیمانے کا فساد پیدا ہو جائے گا۔ (رواہ الترمذی)

خلاصہ یہ ہے کہ یہ حکم آقاؤں کو اس لئے دیا گیا کہ وہ اجازت نکاح دینے میں کوتاہی نہ کریں۔ خود نکاح کرانا انکے ذمہ واجب ہو یہ ضروری نہیں۔ واللہ اعلم

اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ اس میں اُن غریب فقیر مسلمانوں کیلئے بشارت ہے جو اپنے دین کی حفاظت کے لئے نکاح کرنا چاہتے ہیں مگر وسائلِ مالیہ انکے پاس نہیں کہ جب وہ اپنے دین کی حفاظت اور سُنّتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے کی نیت صالحہ سے نکاح کریں گے تو اللہ تعالیٰ اُن کو مالی غنا بھی عطا فرما دیں گے اور اسمیں اُن لوگوں کو بھی ہدایت ہے جن کے پاس ایسے غریب لوگ منگنی لے کر جائیں کہ وہ محض انکے فی الحال غریب فقیر ہونیکی وجہ سے رشتہ سے انکار نہ کر دیں۔ مال آنے جانے والی چیز ہے اصل چیز صلاحیت عمل ہے اگر وہ انمیں موجود ہے تو اُن کے نکاح سے انکار نہ کریں۔

حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے سب مسلمانوں کو نکاح کرنیکی ترغیب دی ہے اسمیں آزاد اور غلام سب کو داخل فرمایا ہے اور نکاح کرنے پر اُن سے غنا کا وعدہ فرمایا ہے۔ (ابن کثیر) اور ابن ابی حاتم نے حضرت صدیق اکبرؓ سے نقل کیا ہے کہ اُنھوں نے مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا کہ تم نکاح کرنے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرو تو اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ غنار عطا فرمانے کا کیا ہے وہ پورا فرما دیں گے پھر یہ آیت پڑھی۔ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ تم غنی ہونا چاہتے ہو تو نکاح کرلو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ (رواہ ابن جریر و ذکر البغوی عن عمرؓ نحوہ۔ ابن کثیر)

تنبیہ: تفسیر مظہری میں ہے کہ مگر یہ یاد رہے کہ نکاح کرنیوالے کو غنی اور مال عطا فرمانیکا وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی حال میں ہے جبکہ نکاح کرنے والے کی نیت اپنی عفت کی حفاظت اور سُنّت پر عمل ہو اور پھر اللہ تعالیٰ پر توکل و اعتماد ہو اسکی دلیل اگلی آیت کے یہ الفاظ ہیں۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ، یعنی جو لوگ مال واسباب کے لحاظ سے نکاح پر قدرت نہیں رکھتے اور نکاح کرنے میں یہ خطرہ ہے کہ بیوی کے حقوق ادا نہ کرنے کی وجہ سے گنہگار ہو جائیں گے اُن کو چاہیئے کہ عفت اور صبر کیساتھ اسکا انتظار کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُن کو غنی کردے۔ اور اس صبر کے لئے ایک تدبیر بھی حدیث میں یہ بتلادی گئی ہے کہ کثرت سے روزے رکھا کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُن کو اتنے مالی وسائل عطا فرمائیں گے جن سے نکاح پر قدرت ہو جائے۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ

اور جو لوگ چاہیں لکھت آزادی کی مال دے کر ان میں سے کہ جو تمہارے ہاتھ کے مال ہیں تو ان کو لکھ کر دیدو

عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۭ وَلَا

اگر سمجھو ان میں کچھ نیکی اور دو ان کو اللہ کے مال سے جو اس نے تم کو دیا ہے اور نہ

تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَي الْبِغَاۗءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ

زبردستی کرو اپنی چھوکریوں پر بدکاری کے واسطے اگر وہ چاہیں قید سے رہنا کہ تم کمانا چاہو اسباب دُنیا کی

الدُّنْيَا ۭ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۳۳)

زندگانی کا اور جو کوئی اُن پر زبردستی کریگا تو اللہ اُن کی بے بسی کے پیچھے بخشنے والا مہربان ہے

خلاصۂ تفسیر

اور تمہارے مملوکوں میں سے (غلام ہوں یا لونڈیاں) جو مکاتب ہونے کے خواہاں ہوں تو (بہتر ہے کہ) اُن کو مکاتب بنادیا کرو اگر اُن میں بہتری (کے آثار) پاؤ اور اللہ کے (دیئے ہوئے) اس مال میں سے اُن کو بھی دو جو اللہ نے تم کو دے رکھا ہے (تاکہ جلدی آزاد ہو سکیں) اور اپنی (مملوکہ) لونڈیوں کو زنا کرنے پر مجبور نہ کرو (بالخصوص) جب وہ پاکدامن رہنا چاہیں (اور تمہاری یہ ذلیل حرکت) محض اسلئے کہ دنیوی زندگی کا کچھ فائدہ (یعنی مال) تم کو حاصل ہو جائے اور جو شخص اُن کو مجبور کریگا (اور وہ بچنا چاہیں گی) تو اللہ تعالیٰ اُن کے مجبور کئے جانے کے بعد (اُن کے لئے) بخشنے والا مہربان ہے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں مملوک غلاموں اور لونڈیوں کو اگر نکاح کرنے کی ضرورت ہو تو آقاؤں کو ہدایت کی گئی تھی کہ اُن کو نکاح کی اجازت دیدینا چاہیئے اپنی مصلحت کے لئے اُن کے طبعی مصالح کو مؤخر

نہ کریں یہ اُن کے لئے افضل اور بہتر ہے۔ خلاصہ اس ہدایت کا اپنے مملوک غلاموں لونڈیوں کیساتھ حسنِ معاملہ اور اُن کو تکلیف سے بچانا ہے اُسکی مناسبت سے آیتِ مذکورہ میں ایک دوسری ہدایت انکے آقاؤں کیلئے یہ دی گئی ہے کہ اگر یہ مملوک غلام یا لونڈی آقاؤں سے معاملہ مکاتبت کا کرنا چاہیں تو ان کی اس خواہش کو پورا کر دینا بھی آقاؤں کے لئے افضل اور مستحب، موجب ثواب ہے۔ صاحبِ ہدایہ اور عامۂ فقہاء نے اس حکم کو حکم استحباب ہی قرار دیا ہے یعنی آقا کے ذمہ واجب تو نہیں کہ اپنے مملوک کو مکاتب بنا دے لیکن مستحب اور افضل ہے اور معاملہ مکاتبت کی صورت یہ ہے کہ کوئی مملوک اپنے آقا سے کہے کہ آپ مجھ پر کچھ رقم مقرر کر دیں کہ وہ رقم میں اپنی محنت و کسب سے حاصل کر کے آپکو ادا کر دوں تو میں آزاد ہو جاؤں اور آقا اسکو قبول کرے، یا معاملہ برعکس ہو کہ آقا چاہے کہ اُس کا غلام کچھ معینہ رقم اسکو دیدے تو آزاد ہو جائے اور غلام اسکو قبول کرے۔ اگر آقا اور مملوک کے درمیان ایجاب و قبول کے ذریعہ یہ معاملہ مکاتبت کا طے ہو جاتا ہے تو وہ شرعاً لازم ہو جاتا ہے آقا کو اسکے فسخ کرنے کا اختیار نہیں رہتا جس وقت بھی غلام معینہ رقم کما کر اسکو دیدیگا خود بخود آزاد ہو جائے گا۔

یہ رقم جو بدلِ کتابت کہلاتی ہیں شریعت نے اس کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی خواہ غلام کی قیمت کی برابر ہو یا اُس سے کم یا زیادہ جس پر فریقین میں بات طے ہو جائے وہ بدل کتابت ٹھہرے گا۔ اپنے مملوک غلام یا لونڈی کو مکاتب بنا دینے کی ہدایت اور اسکو مستحب اور افضل قرار دینا شریعتِ اسلام کے اُن ہی احکام میں سے ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلام کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جو لوگ شرعی حیثیت سے غلام ہیں اُن کی آزادی کے زیادہ سے زیادہ راستے کھولے جائیں۔ تمام کفارات میں اُن کے آزاد کرنے کے احکام دیئے گئے ہیں۔ ویسے بھی غلام آزاد کرنے میں بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہے مکاتبت کا معاملہ بھی اسی کا ایک راستہ ہے اس لئے اُس کی ترغیب دی گئی۔ البتہ اُس کے ساتھ شرط یہ لگائی گئی کہ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا یعنی مکاتب بنانا جب درست ہوگا جبکہ تم اُن میں بہتری کے آثار دیکھو۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور اکثر حضرات ائمہ نے اس بہتری سے مراد قوتِ کسب بتلائی ہے یعنی جس شخص میں یہ دیکھو کہ اگر اس کو مکاتب بنا دیا تو کما کر معینہ رقم جمع کر لیگا اُس کو مکاتب بناؤ ورنہ جو اس قابل نہ ہو اُس کو مکاتب بنا دینے سے غلام کی محنت بھی ضائع ہوگی آقا کا نقصان بھی ہوگا۔ اور صاحبِ ہدایہ نے فرمایا کہ خیر اور بہتری سے مراد اس جگہ یہ ہے کہ اُسکے آزاد ہونے سے مسلمانوں کو کسی نقصان کے پہنچنے کا خطرہ نہ ہو مثلاً یہ کہ وہ کافر ہو اور اپنے کافر بھائیوں کی مدد کرتا ہو۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ لفظ خیر اس جگہ دونوں چیزوں پر حاوی ہے کہ غلام میں قوتِ کسب بھی ہو اور اُس کی آزادی سے مسلمانوں کو کوئی خطرہ بھی نہ ہو۔ (مظہری)

وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ، یعنی بخشش کرو ان پر اُس مال میں سے جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔ یہ خطاب مسلمانوں کو عموماً اور آقاؤں کو خصوصاً کیا گیا ہے کہ جب اس غلام کی آزادی ایک معینہ رقم جمع کر کے آقا کو دینے پر موقوف ہے تو مسلمانوں کو چاہئے کہ اسمیں اُس کی مدد کریں، زکوٰۃ کا مال بھی اُن کو دے سکتے ہیں، اور آقاؤں کو اسکی ترغیب ہے کہ خود بھی اُنکی مالی امداد کریں یا بدلِ کتابت میں سے کچھ کم کر دیں۔ صحابہ کرام کا معمول اسی لئے یہ رہا ہے کہ بدلِ کتابت میں جو رقم اُس پر لگائی جاتی تھی اُمیں سے تہائی چوتھائی یا اس سے کم حسبِ استطاعت کم کر دیا کرتے تھے۔ (مظہری)

فنِ معاشیات کا ایک اہم مسئلہ اور اُس میں قرآنی فیصلہ

آجکل دُنیا میں مادہ پرستی کا دَور دَورہ ہے۔ ساری دُنیا معاد و آخرت کو بھلا کر صرف معاش کے جال میں پھنس گئی ہے اُن کی علمی تحقیقات اور غور و فکر کا دائرہ صرف معاشیات ہی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اسمیں بحث و تحقیق کے زور نے ایک ایک معمولی مسئلہ کو ایک مستقل فن بنا دیا ہے۔ ان فنون میں سب سے بڑا فن معاشیات کا ہے۔

اس معاملہ میں آجکل عقلاءِ دُنیا کے دو نظریئے زیادہ معروف و مشہور ہیں اور دونوں ہی باہم متصادم ہیں اُن کے تصادم نے اقوامِ دُنیا میں تصادم اور جنگ و جدال کے ایسے دروازے کھول دیئے ہیں کہ ساری دُنیا امن و اطمینان سے محروم ہو گئی۔

ایک نظام سرمایہ دارانہ نظام ہے جس کو اصطلاح میں کیپٹل ازم کہا جاتا ہے۔ دوسرا نظام اشتراکیت کا ہے جس کو کیمونزم یا سوشل ازم کہا جاتا ہے۔ اتنی بات تو مشاہدہ کی ہے جسکا دونوں نظاموں میں سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس دُنیا میں انسان اپنی محنت اور کوشش سے جو کچھ کماتا اور پیدا کرتا ہے اُس سب کی اصل بنیاد قدرتی وسائلِ پیداوار زمین، پانی اور معادن میں پیدا ہونے والی قدرتی اشیاء پر ہے۔ انسان اپنے غور و فکر اور محنت و مشقت کے ذریعہ انھیں وسائلِ پیداوار میں جوڑ توڑ اور تحلیل و ترکیب کے ذریعہ اپنی ضرورت کی لاکھوں اشیاء پیدا کرتا اور بناتا ہے۔ عقل کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ دونوں نظام پہلے یہ سوچتے کہ یہ قدرتی وسائل خود تو پیدا نہیں ہو گئے ان کا کوئی پیدا کرنیوالا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اُن کا اصل مالک بھی وہی ہو گا جو اُن کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہم ان وسائل پر قبضہ کرنے اور اُن کے مالک بننے یا استعمال کرنے میں آزاد نہیں بلکہ اصل مالک و خالق نے اگر کچھ ہدایات دی ہیں تو اُن کے تابع چلنا ہمارا فرض ہے۔ مگر مادہ پرستی کے جنون نے ان سبھی کو اصل خالق و مالک کے تصور ہی سے غافل کر دیا۔ اُن کے نزدیک اب بحث صرف یہ رہ گئی کہ وسائلِ پیداوار پر قبضہ کر کے اُن سے ضروریاتِ زندگی پیدا کرنے والا اُن سب چیزوں کا خود بخود آزاد مالک و مختار ہو جاتا ہے، یا یہ سب چیزیں وقفِ عام اور مشترک ہیں ہر ایک کو اُن سے نفع اُٹھانے کا یکساں حق حاصل ہے؟

پہلا نظریہ سرمایہ دارانہ نظام کا ہے جو انسان کو ان چیزوں پر آزاد ملکیت کا حق دیتا ہے۔

کہ جس طرح چاہے اسکو حاصل کرے اور جہاں چاہے اسکو خرچ کرے اسمیں اُس پر کوئی روک ٹوک برداشت نہیں۔ یہی نظریہ قدیم زمانے کے مشرکین و کفار کا تھا جنھوں نے حضرت شعیب علیہ السلام پر یہ اعتراض کیا تھا کہ یہ مال ہمارے ہیں ہم ان کے مالک ہیں آپ کو کیا حق ہے کہ ہم پر پابندی لگائیں کہ فلاں کام میں خرچ کرنا جائز اور فلاں میں حرام ہے۔ آیتِ قرآن اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا کا یہی مطلب ہے۔ اور دوسرا نظریہ اشتراکیت کا ہے جو کسی کو کسی چیز پر ملکیت کا حق نہیں دیتا بلکہ ہر چیز کو تمام انسانوں میں مشترک اور سب کو اُس سے فائدہ اُٹھانے کا یکساں حقدار قرار دیتا ہے اور اصل نظریۂ اشتراکیت کی بنیاد یہی ہے۔ مگر پھر جب دیکھا کہ یہ ناقابلِ عمل تصور ہے اس پر کوئی نظام نہیں چلایا جاسکتا تو پھر کچھ اشیاء کو ملکیت کے لئے مستثنیٰ بھی کر دیا ہے۔

قرآن کریم نے ان دونوں بیہودہ نظریوں پر رد کر کے اُصول یہ بنایا کہ کائنات کی ہر چیز دراصل اللہ تعالیٰ کی مِلک ہے جو اُن کا خالق ہے۔ پھر اُس نے اپنے فضل و کرم سے انسان کو ایک خاص قانون کے تحت ملکیت عطا فرمائی ہے جن چیزوں کا اس قانون کی رُو سے وہ مالک بنا دیا گیا ہے اسمیں دوسروں کے تصرف کو بغیر اسکی اجازت کے حرام قرار دیا مگر مالک بننے کے بعد بھی اسکو آزاد ملکیت نہیں دی کہ جس طرح چاہے کمائے اور جس طرح چاہے خرچ کرے بلکہ دونوں طرف ایک عادلانہ اور حکیمانہ قانون رکھا ہے کہ فلاں طریقہ کمانے کا حلال ہے فلاں حرام اور فلاں جگہ خرچ کرنا حلال ہے اور فلاں حرام۔ اور یہ کہ جو چیز اس کی ملکیت میں دی ہے اُس میں کچھ اور لوگوں کے حقوق بھی لگا دیئے ہیں جن کو ادا کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔

آیتِ مذکورہ اگرچہ ایک اور مضمون کے لئے آئی ہے مگر اسکے ضمن میں اسی اہم معاشی مسئلہ کے چند اُصول بھی آ گئے ہیں الفاظ آیت پر نظر کیجئے وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰىكُمْ یعنی دو ان حاجتمند لوگوں کو اللہ کے اُس مال میں سے جو اللہ نے تمھیں دیدیا ہے اسمیں تین باتیں ثابت ہوئیں۔ اوّل یہ کہ اصل مالک مال اور ہر چیز کا اللہ تعالیٰ ہے۔ دوسرے یہ کہ اُسی نے اپنے فضل سے اسکے ایک حصہ کا تمھیں مالک بنا دیا ہے تیسرے یہ کہ جس چیز کا تم کو مالک بنایا ہے اُس پر کچھ پابندیاں بھی اُسنے لگائی ہیں۔ بعض چیزوں میں خرچ کرنے کو ممنوع قرار دیا اور بعض چیزوں میں خرچ کرنے کو لازم و واجب اور بعض میں مستحب اور افضل قرار دیا ہے وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

دوسرا حکم اس آیت میں ایک جاہلیت کی رسم مٹانے اور زنا و فواحش کے انسداد کے لئے یہ دیا گیا۔ کہ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاۗءِ، یعنی اپنی لونڈیوں کو اس پر مجبور نہ کرو کہ وہ زناکاری کے ذریعہ مال کما کر تمھیں دیا کریں۔ جاہلیت میں بہت سے لوگ لونڈیوں کو اسی کام کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اسلام نے جب زنا پر سخت سزائیں جاری کیں، آزاد اور غلام

سب کو اسکا پابند کیا تو ضروری تھا کہ جاہلیت کی اس رسم کو مٹانے کے لئے خاص احکام دیے۔

اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا، یعنی جبکہ وہ لونڈیاں زنا سے بچنے اور پاکدامن رہنے کا ارادہ کریں تو تمہارا اُن کو مجبور کرنا بڑی بے حیائی اور بے غیرتی کی بات ہے۔ یہ الفاظ اگرچہ بصورت شرط آئے ہیں مگر بااجماعِ اُمت در حقیقت مراد ان سے شرط نہیں کہ لونڈیاں زنا سے بچنا چاہیں تو اُن کو زنا پر مجبور نہ کیا جائے ورنہ مجبور کرنا جائز ہے بلکہ بتلانا یہ ہے کہ عام عرف و عادت کے اعتبار سے لونڈیوں میں حیا اور پاکدامنی زمانۂ جاہلیت میں نابود تھی۔ اسلام کے احکام کے بعد اُنھوں نے توبہ کی۔ اُنکے آقاؤں نے مجبور کرنا چاہا تو اسپر یہ احکام آئے کہ جب وہ زنا سے بچنا چاہتی ہیں تو تم مجبور نہ کرو۔ اسمیں انکے آقاؤں کو زجر و تنبیہ اور تشنیع کرنا ہے کہ بڑی بے غیرتی اور بے حیائی کی بات ہے کہ لونڈیاں تو پاک رہنے کا ارادہ کریں اور تم اُنھیں زنا پر مجبور کرو۔

فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ لونڈیوں کو زنا پر مجبور کرنا حرام ہے۔ اگر کسی نے ایسا کیا اور وہ آقا کے جبر و اکراہ سے مغلوب ہو کر زنا میں مبتلا ہو گئی تو اللہ تعالیٰ اُس کے گناہ کو معاف فرمادیں گے اور اسکا سارا گناہ مجبور کرنیوالے پر ہوگا (مظہری) واللہ اعلم

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ
اور ہم نے اُتاریں تمہاری طرف آیتیں کھلی ہوئی اور کچھ حال اُن کا جو ہو چکے تم سے

قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۴﴾ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ
پہلے اور نصیحت ڈرنے والوں کو اللہ روشنی ہے آسمانوں کی اور زمین کی مثال اسکی

نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا
روشنی کی جیسے ایک طاق اسمیں ہو ایک چراغ وہ چراغ دھرا ہو ایک شیشہ میں وہ شیشہ ہے جیسے

كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا
ایک تارہ چمکتا ہوا تیل جلتا ہے اسمیں ایک برکت کے درخت کا وہ زیتون ہے نہ مشرق کیطرف ہے اور نہ

غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ
مغرب کیطرف، قریب ہے اسکا تیل کہ روشن ہو جائے، اگرچہ نہ لگی ہو اسمیں آگ روشنی پر روشنی

يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ
اللہ راہ دکھلا دیتا ہے اپنی روشنی کی جسکو چاہے، اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں کے واسطے اور اللہ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۳۵﴾ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا
سب چیز کو جانتا ہے ان گھروں میں کہ اللہ نے حکم دیا اُن کو بلند کرنے کا اور وہاں اُسکا نام

اِسۡمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيۡهَا بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ

پڑھنے کا یاد کرتے ہیں اس کی وہاں صبح اور شام وہ مرد کہ نہیں غافل ہوتے سودا کرنے میں

وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيۡتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوۡنَ يَوۡمًا

اور نہ بیچنے میں اللہ کی یاد سے اور نماز قائم رکھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے ڈرتے رہتے ہیں اس دن سے

تَتَقَلَّبُ فِيۡهِ الۡقُلُوۡبُ وَالۡاَبۡصَارُ ﴿۳۷﴾ لِيَجۡزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحۡسَنَ مَا عَمِلُوۡا

جس میں اُلٹ جائیں گے دل اور آنکھیں تاکہ بدلہ دے اُن کو اللہ اُنکے بہتر سے بہتر کاموں کا

وَيَزِيۡدَهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾

اور زیادتی دے اُن کو اپنے فضل سے اور اللہ روزی دیتا ہے جس کو چاہے بے شمار

وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُهُمۡ كَسَرَابٍۢ بِقِيۡعَةٍ يَّحۡسَبُهُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤى اِذَا

اور جو لوگ منکر ہیں اُن کے کام جیسے ریت جنگل میں پیاسا جانے اسکو پانی یہاں تک کہ جب

جَآءَهٗ لَمۡ يَجِدۡهُ شَيۡـئًا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ فَوَفّٰٮهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيۡعُ

پہنچا اُس پر اس کو کچھ نہ پایا، اور اللہ کو پایا اپنے پاس پھر اُسکو پورا پہنچا دیا اسکا لکھا، اور اللہ جلد لینے

الۡحِسَابِ ۙ﴿۳۹﴾ اَوۡ كَظُلُمٰتٍ فِىۡ بَحۡرٍ لُّـجِّىٍّ يَّغۡشٰٮهُ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ مَوۡجٌ

والا ہے حساب یا جیسے اندھیرے گہرے دریا میں چڑھی آتی ہے اُس پر ایک لہر اس پر ایک اور لہر

مِّنۡ فَوۡقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ اِذَاۤ اَخۡرَجَ يَدَهٗ لَمۡ

اس کے اوپر بادل اندھیرے ہیں ایک پر ایک جب نکالے اپنا ہاتھ لگتا نہیں

يَكَدۡ يَرٰٮهَا ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَجۡعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوۡرًا فَمَا لَهٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ﴿۴۰﴾ ع

کہ اسکو وہ سوجھے اور جس کو اللہ نے نہ دی روشنی اُس کے واسطے کہیں نہیں روشنی

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (تم لوگوں کی ہدایت کے واسطے اس سورت میں یا قرآن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے) تمہارے پاس کھلے کھلے احکام (علمیہ و عملیہ) بھیجے ہیں اور جو لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں ان کی (یا اُن جیسے لوگوں کی) بعض حکایات اور (خدا سے) ڈرنیوالوں کے لئے نصیحت کی باتیں (بھیجی ہیں) اللہ تعالیٰ نور (ہدایت) دینے والا ہے آسمانوں (میں رہنے والوں) کا اور زمین (میں رہنے والوں) کا (یعنی اہلِ آسمان و زمین میں جن کو ہدایت ہوئی ہے ان سب کو اللہ ہی نے ہدایت دی ہے اور مُراد آسمان و زمین سے کُل عالم ہے پس جو مخلوقات آسمان و زمین سے باہر ہے وہ بھی داخل ہوگئی جیسے حاملانِ عرش) اُس کے نور (ہدایت) کی حالتِ عجیبہ ایسی ہے جیسے (فرض کرو) ایک طاق ہے

(اور) اُس میں ایک چراغ (رکھا) ہے اور) وہ چراغ (خود طاق میں نہیں رکھا بلکہ) ایک قندیل میں ہے (اور قندیل طاق میں رکھا ہے اور) وہ قندیل ایسا (صاف شفاف) ہے جیسا کہ ایک چمکدار ستارہ ہو (اور) وہ چراغ ایک نہایت مفید درخت (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے جو زیتون (کا درخت) ہے جو (کسی آڑ کے) نہ پُورب رُخ ہے اور نہ (کسی آڑ کے) پچھم رُخ ہے۔ (یعنی نہ اس کی جانب شرقی میں کسی درخت یا پہاڑ کی آڑ ہے کہ شروع دن میں اُس پر دھوپ نہ پڑے اور نہ اس کی جانب غربی میں کوئی آڑ پہاڑ ہے کہ آخر دن میں اُس پر دھوپ نہ پڑے بلکہ کھلے میدان میں ہے جہاں تمام دن دھوپ رہتی ہے ایسے درخت کا روغن بہت لطیف اور صاف اور روشن ہوتا ہے اور) اسکا تیل (اسقدر صاف اور سلگنے والا ہے کہ) اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اُٹھے گا (اور جب آگ بھی لگ گئی تب تو) نُورٌ علیٰ نُور ہے (یعنی ایک تو اسمیں خود قابلیت نُور کی اعلیٰ درجہ کی تھی پھر اُوپر سے فاعل یعنی آگ کیساتھ اجتماع ہوگیا اور پھر اجتماع بھی ان کیفیات کیساتھ کہ چراغ قندیل میں رکھا ہو جس سے بالمشاہدہ چمک بڑھ جاتی ہے اور پھر وہ ایسے طاق میں رکھا ہو جو ایک طرف سے بند ہو ایسے موقع پر شعاعیں ایک جگہ سمٹ کر بہت تیز روشنی ہوتی ہے اور پھر تیل بھی زیتون کا جو صاف روشنی اور دھواں کم ہونے میں مشہور ہے تو اسقدر تیز روشنی ہوگی جیسے بہت سی روشنیاں جمع ہوگئی ہوں اسی کو نُورٌ علیٰ نُورٍ فرمایا۔ یہاں مثال ختم ہوگئی۔ پس اسی طرح مؤمن کے قلب میں اللہ تعالیٰ جب نورِ ہدایت ڈالتا ہے تو روز بروز اسی کا انشراح قبولِ حق کے لئے بڑھتا چلا جاتا ہے اور ہر وقت احکام پر عمل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ گو بالفعل بعض احکام کا علم بھی نہ ہوا ہو کیونکہ علم تدریجاً حاصل ہوتا ہے جیسے وہ روغنِ زیتون آگ لگنے سے پہلے ہی روشنی کے لئے مستعد تھا، مومن بھی علم احکام سے پہلے ہی اُن پر عمل کے لئے مستعد ہوتا ہے اور جب اُس کو علم حاصل ہوتا ہے تو نورِ عمل یعنی عمل کے پختہ ارادہ کیساتھ نورِ علم بھی مل جاتا ہے جس سے وہ فوراً ہی قبول کر لیتا ہے پس عمل و علم جمع ہو کر نُورٌ علیٰ نُور صادق آجاتا ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ علمِ احکام کے بعد اسکو کچھ تامل و تردد ہو کہ اگر موافق نفس کے پایا تو قبول کر لیا ورنہ رد کر دیا۔ اسی انشراح اور نور کو دوسری آیت میں اِس طرح بیان فرمایا ہے اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ، یعنی جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا تو وہ اپنے رب کیطرف سے ایک نُور پر ہوتا ہے اور ایک جگہ فرمایا ہے فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ۔ غرض نورِ ہدایت الٰہیہ کی یہ مثال ہے اور) اللہ تعالیٰ اپنے (اس) نور (ہدایت) تک جس کو چاہتا ہے راہ دیتا ہے (اور پہنچا دیتا ہے) اور (ہدایت کی جو یہ مثال دی گئی اسی طرح قرآن میں بہت سی مثالیں بیان کی گئی ہیں تو اس

سے بھی لوگوں کی ہدایت ہی مقصود ہے اس لئے) اللہ تعالیٰ لوگوں (کی ہدایت) کے لئے (یہ) مثالیں بیان فرماتا ہے (تاکہ مضامین عقلیہ محسوس چیزوں کی طرح قریب الی الفہم ہو جاویں) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے (اسلئے جو مثال افادہ مقصود کیلئے کافی ہو اور جسمیں اغراض مثال کے پورے مرعی ہوں اُسی کو اختیار کرتا ہے مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ مثالیں بیان کرتا ہے اور وہ مثال نہایت مناسب ہوتی ہے تاکہ خوب ہدایت ہو۔ آگے اہل ہدایت کا حال بیان فرماتے ہیں کہ) وہ ایسے گھروں میں (جاکر عبادت کرتے) ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اُن کا ادب کیا جاوے اور اُن میں اللہ کا نام لیا جاوے (مُراد اُن گھروں سے سجدیں ہیں اور انکا ادب یہ کہ اُن میں جنُب و حائض داخل نہ ہوں اور اُنمیں کوئی نجس چیز داخل نہ کیجاوے، وہاں غُل نہ مچایا جاوے۔ دُنیا کے کام اور باتیں کرنے کے لئے وہاں نہ بیٹھیں۔ بدبو کی چیز کھاکر اُنمیں نہ جاویں وغیر ذٰلک، غرض) اُن (مسجدوں) میں ایسے لوگ صبح و شام اللہ کی پاکی (نمازوں میں) بیان کرتے ہیں جن کو اللہ کی یاد (یعنی بجا آوری احکام) سے (جو وقت کے متعلق جو حکم ہو) اور (بالخصوص) نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے (کہ یہ احکام فرعیہ میں سب سے اہم ہیں) نہ خرید غفلت میں ڈالنے پاتی ہے اور نہ فروخت (اور باوجود اطاعت و عبادت کے اُن کی خشیت کا یہ حال ہے کہ) وہ ایسے دن (کی دارو گیر) سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں بہت سے دل اور آنکھیں اُلٹ جاویں گی (جیسا دوسری آیت میں ہے يُؤْتُونَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ، یعنی یہ لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اسکے باوجود اُن کے دل قیامت کی باز پُرس سے ڈرتے رہتے ہیں اور مقصود اس سے اہل نور ہدایت کے اوصاف و اعمال کا بیان فرمانا ہے اور آگے ان کے انجام کا ذکر ہے کہ) انجام (ان لوگوں کا) یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کے اعمال کا بہت ہی اچھا بدلہ دیگا (یعنی جنت) اور (علاوہ جزا کے) ان کو اپنے فضل سے اور بھی زیادہ دیگا (جزا وہ جسکا وعدہ مفصل مذکور ہے اور زیادہ وہ جسکا مفصل وعدہ نہیں گو مجمل عنوانوں سے ہوا ہو) اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بیشمار (یعنی بہت کثرت سے) دے دیتا ہے (پس ان لوگوں کو جنت میں اسیطرح بیشمار دیگا۔ یہانتک تو ہدایت اور اہل ہدایت کا بیان تھا آگے ضلالت اور اہل ضلالت کا ذکر ہے یعنی) اور جو لوگ کافر (اور اہل ضلال اور نورِ ہدایت سے دُور) ہیں اُن کے اعمال (بوجہ کافروں کی دو قسمیں ہونے کے دو مثالوں کے مشابہ ہیں کیونکہ ایک قسم تو وہ کفار ہیں جو آخرت اور قیامت کے قائل ہیں اور اپنے بعض اعمال پر یعنی جو اُن کے گمان کے مطابق کار ثواب اور حسنات ہیں توقع جزائے آخرت کی رکھتے ہیں۔ اور دوسری قسم وہ کفار ہیں جو آخرت اور قیامت کے منکر ہیں قسم اوّل کفار کے اعمال تو) ایسے ہیں جیسے ایک چٹیل میدان میں چمکتا ہوا ریت کہ پیاسا (آدمی) اسکو (دُور سے)

پانی خیال کرتا ہے (اور اُس کی طرف دوڑتا ہے) یہاں تک کہ جب اسکے پاس آیا تو اُسکو (جو سمجھ رکھا تھا) کچھ بھی نہ پایا اور (غایت پیاس، پھر نہایت یاس سے جو جسمانی اور روحانی صدمہ پہنچا اور اُس سے تڑپ تڑپ کر مرگیا تو یوں کہنا چاہیئے کہ بجائے پانی کے) قضاء الٰہی یعنی موت کو پایا سو اللہ تعالیٰ نے اُس (کی عمر) کا حساب اس کو برابر سرابر چکا دیا (اور بیباق کر دیا یعنی عمر کا خاتمہ کر دیا) اور اللہ تعالیٰ (جس چیز کی میعاد آجاتی ہے اسکا) دم بھر میں حساب (فیصل) کر دیتا ہے (اُس کو کچھ بکھیڑا نہیں کرنا پڑتا کہ دیر لگے اور میعاد سے کچھ بھی توقف ہو جاوے بس یہ مضمون ایسا ہے جیسا دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ و قولہ لَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا۔ حاصل اس مثال کا یہ ہوا کہ جیسے پیاسا ریت کو ظاہری چمک سے پانی سمجھا اسی طرح یہ کافر اپنے اعمال کو ظاہری صورت سے مقبول اور شمر نافع آخرت سمجھا اور جیسا وہ پانی نہیں اسی طرح یہ اعمال شرط قبول یعنی ایمان نہ ہونے کے سبب مقبول اور نافع نہیں ہیں اور جب وہاں جاکر اُس پیاسے کو حقیقت معلوم ہوئی اسی طرح اُس کو آخرت میں پہنچکر حقیقت معلوم ہوگی اور جس طرح یہ پیاسا اپنی توقع کے غلط ہونے سے حسرت و افسوس میں خائب ہو کر مرگیا اسی طرح یہ کافر بھی اپنی توقع کے غلط ہونے پر اسوقت حسرت میں اور ہلاکت ابدی یعنی عقاب جہنم میں مبتلا ہوگا۔ ایک قسم کی مثال تو یہ ہوئی۔ آگے دوسری قسم کے کافروں کے اعمال کی مثال ہے یعنی) یا وہ (اعمال باعتبار خصوصیت منکرین قیامت کے) ایسے ہیں جیسے بڑے گہرے سمندر کے اندر ونی اندھیرے (جنکا ایک سبب دریا کی گہرائی ہے اور پھر یہ) کہ اُس (سمندر کے اصلی سطح) کو ایک بڑی موج نے ڈھانک لیا ہو (پھر وہ موج بھی اکیلی نہیں بلکہ) اُس (موج) کے اوپر دوسری موج (ہو پھر) اُس کے اوپر بادل (ہو جس سے ستارہ وغیرہ کی روشنی بھی نہ پہنچتی ہو غرض) اوپر تلے بہت سے اندھیرے (ہی اندھیرے) ہیں کہ اگر (ایسی حالت میں کوئی آدمی دریا کی تہ میں) اپنا ہاتھ نکالے (اور اس کو دیکھنا چاہے) تو (دیکھنا تو درکنار) دیکھنے کا احتمال بھی نہیں (اس مثال کا حاصل یہ ہے کہ ایسے کافر جو آخرت اور قیامت کے اور اسمیں جزاء و سزا ہی کے منکر ہیں اُن کے پاس وہمی نور بھی نہیں جیسے قسم اول کے کافروں کے پاس ایک وہمی اور خیالی نور تھا۔ کیونکہ اُنھوں نے بعض نیک اعمال کو اپنی آخرت کا سامان سمجھا تھا مگر وہ شرط ایمان نہ ہونے کے سبب حقیقی نور نہ تھا ایک وہمی نور تھا۔ یہ لوگ جو منکر آخرت ہیں انھوں نے اپنے اعتقاد و خیال کے مطابق بھی کوئی کام آخرت کے لئے کیا ہی نہیں جس کے نور کا ان کو وہم و خیال ہو۔ غرض انکے پاس ظلمت ہی ظلمت ہے نور کا وہم و خیال بھی نہیں ہو سکتا جیسا کہ تہ دریا کی مثال میں ہے۔ اور نظر نہ آنے میں ہاتھ کی تخصیص شاید اسلئے کہ انسانی اعضاء و جوارح میں ہاتھ نزدیک تر ہے پھر اس کو جتنا نزدیک کرنا چاہو نزدیک آجاتا ہے اور جب ہاتھ ہی نظر نہ آیا تو دوسرے اعضاء

کا معاملہ ظاہر ہی) اور (آگے ان کفار کے اندھیرے میں ہونے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ) جس کو اللہ ہی نور (ہدایت) نہ دے اُس کو (کہیں سے بھی) نور نہیں (میسر آسکتا)

معارف و مسائل

آیتِ مذکورہ کو اہلِ علم آیتِ نور لکھتے ہیں کیونکہ اسمیں نورِ ایمان اور ظلمتِ کفر کو بڑی تفصیلی مثال سے بتایا گیا ہے۔

نور کی تعریف امام غزالیؒ نے یہ فرمائی الظاھر بنفسہ والمظھر لغیرہٖ، یعنی خود اپنی ذات سے ظاہر اور روشن ہو اور دوسری چیزوں کو ظاہر و روشن کرنے والا ہو۔ اور تفسیر مظہری میں ہے کہ نور دراصل اُس کیفیت کا نام ہے جس کو انسان کی قوتِ باصرہ پہلے ادراک کرتی ہے اور پھر اُسکے ذریعہ اُن تمام چیزوں کا ادراک کرتی ہے جو آنکھ سے دیکھی جاتی ہیں جیسے آفتاب اور چاند کی شعاعیں اُن کے مقابل اجسامِ کثیفہ پر پڑکر اول اُس چیز کو روشن کردیتی ہیں پھر اُس سے شعاعیں منعکس ہو کر دوسری چیزوں کو روشن کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ لفظ نور کا اپنے لغوی اور عرفی معنے کے اعتبار سے حق تعالیٰ جل شانہٗ کی ذات پر اطلاق نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ جسم اور جسمانیات سب سے بری اور وراء الوریٰ ہے۔ اسلئے آیتِ مذکورہ میں جو حق تعالیٰ کے لئے لفظ نور کا اطلاق ہوا ہے اسکے معنے باتفاق ائمہ تفسیر مُنوِّر یعنی روشن کرنے والے کے ہیں یا پھر صیغۂ مبالغہ کی طرح صاحبِ نور کو نور سے تعبیر کردیا گیا جیسے صاحبِ کرم کو کرم اور صاحبِ عدل کو عدل کہدیا جاتا ہے۔ اور معنے آیت کے وہ ہیں جو خلاصۂ تفسیر میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نور بخشنے والے ہیں آسمان و زمین کو اور اسمیں بسنے والی سب مخلوق کو۔ اور مراد اس نور سے نورِ ہدایت ہے۔ ابن کثیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے اسکی تفسیر میں نقل کیا ہے اللہ ھادی اھل السمٰوٰت والارض

نورِ مؤمن مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ الآیۃ، اللہ تعالیٰ کا نورِ ہدایت جو مؤمن کے قلب میں آتا ہے۔ یہ اُس کی ایک عجیب مثال ہے جیسا کہ ابن جریر نے حضرت اُبی بن کعبؓ سے اس کی تفسیر میں نقل کیا ہے ھو المؤمن الذی جعل اللہ الایمان والقراٰن فی صدرہٖ فضرب اللہ مثلہ فقال اللہ نور السمٰوٰت والارض فبدأ بنور نفسہ ثم ذکر نور المؤمن فقال مثل نور من اٰمن بہٖ فکان اُبی بن کعب یقرأھا مثل نور من اٰمن بہٖ (ابن کثیر)

یعنی یہ مثال اُس مؤمن کی ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور قرآن کا نورِ ہدایت ڈالدیا ہے اس آیت میں پہلے تو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نور کا ذکر فرمایا اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ پھر قلبِ مؤمن کے نور کا ذکر فرمایا مَثَلُ نُوْرِهٖ۔ اور اس آیت کی قراءت بھی حضرت اُبی ابن کعبؓ

کی مثل نورہٖ کے بجائے مثل نور من اٰمن بہٖ کی ہے اور سعید بن جبیرؒ نے یہی قرات اور آیت کا یہی مفہوم حضرت ابن عباسؓ سے بھی روایت کیا ہے۔ ابن کثیرؒ نے یہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مَثَلُ نُوْرِهٖ کی ضمیر کے متعلق ائمہ تفسیر کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ کا نورِ ہدایت جو مؤمن کے قلب میں فطرۃً رکھا گیا ہے اُس کی مثال یہ ہے کَمِشْكٰوةٍ الخ یہ قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر ہی مؤمن کیطرف راجع ہو جس پر سیاقِ کلام دلالت کر رہا ہے۔ اس لئے حاصل اس مثال کا یہ ہے کہ مؤمن کا سینہ ایک طاق کی مثال ہے اسمیں اسکا دل ایک قندیل کی مثال ہے اسمیں نہایت شفاف روغنِ زیتون فطری نورِ ہدایت کی مثال ہے جو مؤمن کی فطرت میں ودیعت رکھا گیا ہے۔ جسکا خاصہ خود بخود بھی قبولِ حق کا ہے پھر جس طرح روغنِ زیتون آگ کے شعلہ سے روشن ہو کر دوسروں کو روشن کرنے لگتا ہے اسی طرح فطری نورِ ہدایت جو قلبِ مؤمن میں رکھا گیا ہے جب وحیِ الٰہی اور علمِ الٰہی کے ساتھ اسکا اتصال ہو جاتا ہے تو روشن ہو کر عالم کو روشن کرنے لگتا ہے ۱ھ اور حضرات صحابہ و تابعین نے جو اس مثال کو قلبِ مؤمن کیساتھ مخصوص فرمایا وہ بھی غالباً اسلئے ہے کہ فائدہ اس نور کا صرف مؤمن ہی اُٹھاتا ہے۔ ورنہ وہ فطری نورِ ہدایت جو ابتدائے تخلیق کے وقت انسان کے قلب میں رکھا جاتا ہے وہ مؤمن کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ ہر انسان کی فطرت اور جبلت میں وہ نورِ ہدایت رکھا جاتا ہے اسی کا یہ اثر دُنیا کی ہر قوم ہر خطہ ہر مذہب و مشرب کے لوگوں میں مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے وجود کو اور اُس کی عظیم قدرت کو فطرۃً مانتا ہے اس کی طرف رجوع کرتا ہے اس کے تصور اور تعبیر میں خواہ کیسی ہی غلطیاں کرتا ہو مگر اللہ تعالیٰ کے نفسِ وجود کا ہر انسان فطرۃً قائل ہوتا ہے بجز چند مادہ پرست افراد کے جن کی فطرت مسخ ہو گئی ہے کہ وہ خدا ہی کے وجود کے منکر ہیں۔

ایک صحیح حدیث سے اس عموم کی تائید ہوتی ہے جسمیں یہ ارشاد ہے کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، یعنی ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اسکے ماں باپ اسکو فطرت کے تقاضوں سے ہٹا کر غلط راستوں پر ڈالدیتے ہیں۔ اس فطرت سے مراد ہدایت ایمان ہے۔ یہ ہدایتِ ایمان اور اسکا نور ہر انسان کی پیدائش کے وقت اُسمیں رکھا جاتا ہے اور اسی نورِ ہدایت کی وجہ سے اُسمیں قبولِ حق کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جب انبیاء اور اُنکے نائبوں کے ذریعہ وحیِ الٰہی کا علم اُن کو پہنچتا ہے تو وہ اسکو بسہولت قبول کر لیتے ہیں بجز اُن ممسوخ الفطرت لوگوں کے جنھوں نے اُس فطری نور کو اپنی حرکتوں سے مٹا ہی ڈالا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں تو عطاء نور کو عام بیان فرمایا ہے جو تمام آسمان والوں اور زمین والوں کو شامل ہے مؤمن کافر کی بھی کوئی تخصیص نہیں۔ اور آخر آیت میں یہ فرمایا یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے نور کیطرف جس کو چاہتا ہے ہدایت کر دیتا ہے یہاں مشیت الٰہی کی قید اُس نورِ فطرت کے لئے نہیں جو ہر انسان میں رکھا ہے بلکہ نورِ قرآن کے لئے ہے جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا بجز اُس خوش نصیب کے جس کو اللہ تعالیٰ کیطرف سے توفیق نصیب ہو۔ ورنہ انسان کی کوشش بھی بلا توفیقِ الٰہی بیکار بلکہ بعض اوقات مضر بھی پڑ جاتی ہے ؎

اذا لم یکن عون من اللّٰہ للفتیٰ ٭ فاوّل ما یجنی علیہ اجتہادہٗ

یعنی اگر اللہ کی طرف سے بندہ کی مدد نہ ہو تو اُس کی کوشش ہی اُس کو اُلٹا نقصان پہنچا دیتی ہے۔

نورِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور امام بغوی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کعب احبار سے پوچھا کہ اس آیت کی تفسیر میں آپ کیا کہتے ہیں مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ الآیۃ کعب احبار جو تورات و انجیل کے بڑے عالم مسلمان تھے اُنھوں نے فرمایا کہ یہ مثال رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کی بیان کی گئی ہے۔ مشکوٰۃ آپکا سینہ اور زجاجہ (قندیل) آپ کا قلب مبارک، اور مصباح (چراغ) نبوت ہے۔ اور اس نورِ نبوت کا خاصہ یہ ہے کہ نبوت کے اظہار و اعلان سے پہلے ہی اسمیں لوگوں کے لئے روشنی کا سامان ہے پھر وحیِ الٰہی اور اسکے اعلان کا اس کے ساتھ اتصال ہو جاتا ہے تو یہ ایسا نور ہوتا ہے کہ سارے عالم کو روشن کرنے لگتا ہے۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اظہارِ نبوت و بعثت بلکہ آپ کی پیدائش سے بھی پہلے جو بہت سے عجیب و غریب واقعات عالم میں ایسے پیش آئے جو آپ کی نبوت کی بشارت دینے والے تھے جنکو اصطلاح محدثین میں ارہاصات کہا جاتا ہے۔ کیونکہ معجزات کا لفظ تو اس قسم کے اُن واقعات کے لئے مخصوص ہے جو دعوائے نبوت کی تصدیق کے لئے اللہ تعالیٰ کیطرف سے کسی پیغمبر کے ہاتھ پر جاری کئے جاتے ہیں۔ اور دعوائے نبوت سے پہلے جو اس قسم کے واقعات دُنیا میں ظاہر ہوں ان کو ارہاصات کا نام دیا جاتا ہے اس طرح کے بہت سے واقعات عجیبہ صحیح روایات سے ثابت ہیں جن کو شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ نے خصائص کبریٰ میں اور ابو نعیم نے دلائل النبوۃ میں اور دوسرے علماء نے بھی اپنی مستقل کتابوں میں جمع کر دیا ہے۔ اسکا ایک کافی حصہ اس جگہ تفسیر مظہری میں بھی نقل کر دیا ہے۔

روغنِ زیتون کی برکات شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ، اس سے زیتون اور اسکے درخت کا مبارک اور نافع و مفید ہونا ثابت ہوتا ہے۔ علماء نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسمیں بیشمار منافع اور فوائد رکھے ہیں۔ اس کو چراغوں میں روشنی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس کی روشنی ہر تیل کی روشنی سے زیادہ صاف شفاف ہوتی ہے اس کو روٹی کے ساتھ سالن کی جگہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے پھل کو بطور تفکہ کے کھایا بھی جاتا ہے اور یہ ایسا تیل ہے جس کے نکالنے کیلئے کسی مشین یا چرخی وغیرہ کی ضرورت نہیں خود بخود اسکے پھل سے نکل آتا ہے۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ روغنِ زیتون کو کھاؤ بھی اور بدن پر مالش بھی کرو کیونکہ یہ شجرہ مبارکہ ہے (رواہ البغوی والترمذی عن عمرؓ مرفوعاً۔ مظہری)

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ الآیۃ، سابقہ آیت میں حق تعالیٰ نے قلبِ مومن میں اپنا نورِ ہدایت ڈالدینے کی ایک خاص مثال بیان فرمائی تھی اور آخر میں یہ فرمایا تھا کہ اس نور سے فائدہ وہ ہی لوگ اُٹھاتے ہیں جنکو اللہ چاہتا اور توفیق دیتا ہے۔ اس آیت میں ایسے مومنین کا مستقر اور محل بیان فرمایا گیا کہ ایسے مومنین کا اصل مقام و مستقر جہاں وہ اکثر اوقات خصوصاً پانچ نمازوں کے اوقات میں دیکھے جاتے ہیں وہ بیوت یعنی مکانات ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اُن کو بلند و بالا رکھا جائے اور اُن میں اللہ کا نام ذکر کیا جائے اور ان بیوت و مکانات کی شان یہ ہے کہ اُن میں اللہ کے نام کی تسبیح و تقدیس صبح شام یعنی تمام اوقات میں ایسے لوگ کرتے رہتے ہیں جن کی خاص صفات کا بیان آگے آتا ہے۔

اس تقریر کی بناء اسپر ہے کہ نحوی ترکیب میں فِيْ بُيُوْتٍ کا تعلق آیت کے جملہ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ کے ساتھ ہو (کما یستفاد من ابن کثیر وغیرہ من المفسرین) بعض حضرات نے اسکا تعلق لفظ يُسَبِّحُ محذوف کے ساتھ کیا ہے جس پر آگے آنیوالا لفظ يُسَبِّحُ دلالت کرتا ہے مگر پہلا احتمال نسقِ کلام کے اعتبار سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ مثالِ سابق میں اللہ تعالیٰ کے جس نورِ ہدایت کا ذکر ہوا ہے اُس کے ملنے کی جگہ وہ بیوت و مکانات ہیں جہاں صبح شام اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک ان بیوت سے مُراد مساجد ہیں۔

مساجد اللہ کے گھر ہیں انکی تعظیم واجب ہے قرطبی نے اسی کو ترجیح دی اور استدلال میں حضرت انسؓ کی یہ حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من احب اللّٰہ عزّ وجلّ فلیحبّنی ومن احبّنی فلیحب اصحابی ومن احب اصحابی فلیحب القراٰن ومن احب القراٰن فلیحب المساجد فانھا افنیۃ اللّٰہ اذن اللّٰہ فی رفعھا وبارک فیھا میمونۃ میمون اھلھا محفوظۃ محفوظ اھلھا ھم فی صلاتھم واللّٰہ عزّ وجلّ فی حوائجھم	جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنا چاہتا ہے اسکو چاہیئے کہ مجھ سے محبت کرے۔ اور جو مجھ سے محبت رکھنا چاہے اُسکو چاہیئے کہ میرے صحابہ سے محبت کرے۔ اور جو صحابہ سے محبت رکھنا چاہے اُسکو چاہیئے کہ قرآن سے محبت کرے۔ اور جو قرآن سے محبت رکھنا چاہے اُسکو چاہیئے کہ مسجدوں سے محبت کرے کیونکہ وہ اللہ کے گھر ہیں، اللہ نے اُن کی تعظیم کا حکم دیا ہے اور اُن میں برکت رکھی ہے وہ بھی بابرکت ہیں اور اُن کے رہنے والے بھی بابرکت۔ وہ بھی اللہ کی حفاظت میں ہیں

هم فی المساجد واللّٰہ من ورائہم (قرطبی)	اور اُن کے رہنے والے بھی حفاظت میں - وہ لوگ اپنی نمازوں میں مشغول ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کے کام بناتے اور حاجتیں پوری کرتے ہیں وہ مسجدوں میں ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُنکے پیچھے اُن کی چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں (قرطبی)

رفع مساجد کے معنے | اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ ، اَذِنَ ، اذن سے مشتق ہے جس کے معنی اجازت دینے کے ہیں اور ترفع ، رفع سے مشتق ہے جس کے معنے بلند کرنے اور تعظیم کرنے کے ہیں معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے مسجدوں کو بلند کرنے کی - اجازت دینے سے مراد اُس کا حکم کرنا ہے اور بلند کرنے سے مراد اُن کی تعظیم کرنا - حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بلند کرنے کے حکم میں اللہ تعالیٰ نے مسجدوں میں لغو کام کرنے اور لغو کلام کرنیسے منع فرمایا ہے (ابن کثیر)

عکرمہؓ مجاہدؒ امام تفسیر نے فرمایا کہ رفع سے مراد مسجد کا بنانا ہے جیسے بنار کعبہ کے متعلق قرآن میں آیا ہے وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ کہ اسمیں رفع قواعد سے مراد بنار قواعد ہے اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ رفع مساجد سے مراد مساجد کی تعظیم و احترام اور اُن کو نجاستوں اور گندی چیزوں سے پاک کرنا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ مسجد میں جب کوئی نجاست لائی جائے تو مسجد اُس سے اس طرح سمٹتی ہے جیسے انسان کی کھال آگ سے - حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے مسجد میں سے ناپاکی اور گندگی اور ایذا کی چیز کو نکال دیا اللہ تعالیٰ اُسکے لئے جنت میں گھر بنادیں گے - رواہ ابن ماجہ - اور حضرت صدیقہ عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اپنے گھروں میں (بھی) مسجدیں (یعنی نماز پڑھنے کی مخصوص جگہیں) بنائیں اور اُن کو پاک صاف رکھنے کا اہتمام کریں - (قرطبی)

اور اصل بات یہ ہے کہ لفظ ترفع میں مسجدوں کا بنانا بھی داخل ہے اور اُن کی تعظیم و تکریم اور پاک صاف رکھنا بھی - پاک صاف رکھنے میں یہ بھی داخل ہے کہ ہر نجاست اور گندگی سے پاک رکھیں - اور یہ بھی داخل ہے کہ اُن کو ہر بدبو کی چیز سے پاک رکھیں - اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لہسن یا پیاز کھا کر بغیر منہ صاف کئے ہوئے مسجد میں آنیسے منع فرمایا ہے جو عام کتب حدیث میں معروف ہے - سگرٹ ، حقہ ، پان کا تمبا کو کھا کر مسجد میں جانا بھی اسی حکم میں ہے - مسجد میں مٹی کا تیل جلانا جسمیں بدبو ہوتی ہے وہ بھی اسی حکم میں ہے -

صحیح مسلم میں حضرت فاروق اعظم رضؓ سے روایت ہے فرمایا کہ میں نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جس شخص کے منہ سے لہسن یا پیاز کی بدبو محسوس فرماتے تھے اسکو مسجد سے نکال کر بقیع میں بھیجدیتے تھے اور فرماتے تھے کہ جسکو لہسن پیاز کھانا ہی ہو تو اُسکو خوب اچھی طرح پکا کر کھائے کہ اُن کی بدبو ماری جائے حضرات فقہاء نے اس حدیث سے استدلال کر کے فرمایا کہ جس شخص کو کوئی ایسی بیماری ہو کہ اُسکے پاس کھڑے

ہونے والوں کو اس سے تکلیف پہنچے اُس کو بھی مسجد سے ہٹایا جا سکتا ہے اُس کو خود چاہیئے کہ جب تک ایسی بیماری میں ہے نماز گھر میں پڑھے۔

رفع مساجد کا مفہوم جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک یہی ہے کہ مسجدیں بنائی جائیں اور اُن کو ہر بُری چیز سے پاک صاف رکھا جائے۔ بعض حضرات نے اسمیں مسجدوں کی ظاہری شان و شوکت اور تعمیری بلندی کو بھی داخل قرار دیا ہے اور استدلال کیا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے مسجد نبوی کی تعمیر سال کی لکڑی سے شاندار بنائی تھی اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مسجد نبوی میں نقش و نگار اور تعمیری خوبصورتی کا کافی اہتمام فرمایا تھا اور یہ زمانہ اجلۂ صحابہ کا تھا کسی نے اُنکے اس فعل پر انکار نہیں کیا اور بعد کے بادشاہوں نے تو مسجدوں کی تعمیرات میں بڑے اموال خرچ کئے ہیں۔ ولید بن عبدالملک نے اپنے زمانۂ خلافت میں دمشق کی جامع مسجد کی تعمیر و تزیین پر پورے ملک شام کی سالانہ آمدنی سے تین گُنا زیادہ مال خرچ کیا تھا اُن کی بنائی ہوئی یہ مسجد آج تک قائم ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر نام و نمود اور شہرت کیلئے نہ ہو اللہ کے نام اور اللہ کے گھر کی تعظیم کی نیت سے کوئی شخص مسجد کی تعمیر شاندار بلند و مستحکم خوبصورت بنائے تو کوئی ممانعت نہیں بلکہ اُمید ثواب کی ہے۔

بعض فضائل مساجد ابو داؤد نے حضرت ابو امامہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے گھر سے وضو کر کے فرض نماز کے لئے مسجد کیطرف نکلا اسکا ثواب اُس شخص جیسا ہے جو احرام باندھ کر گھر سے حج کے لئے نکلا ہو اور جو شخص نماز اشراق کے لئے اپنے گھر سے وضو کر کے مسجد کیطرف چلا تو اسکا ثواب عمرہ کرنے والے جیسا ہے۔ اور ایک نماز کے بعد دوسری بشرطیکہ ان دونوں کے درمیان کوئی کام یا کلام نہ کرے، علیین میں لکھی جاتی ہے۔ اور حضرت بریدہ رضؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ اندھیرے میں مساجد کو جاتے ہیں اُن کو قیامت کے روز مکمل نور کی بشارت سُنا دیجئے (رواہ مسلم)

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرد کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا، گھر میں یا دُکان میں نماز پڑھنے کی نسبت بیس سے زائد درجہ افضل ہے اور یہ اسلئے کہ جب کوئی شخص وضو کرے اور اچھی طرح (سنت کے مطابق) وضو کرے پھر مسجد کو صرف نماز کی نیت سے چلے اور کوئی غرض نہ ہو تو ہر قدم پر اسکا مرتبہ ایک درجہ بلند ہو جاتا ہے اور ایک گناہ معاف ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ مسجد میں پہنچ جائے۔ پھر جب تک جماعت کے انتظار میں بیٹھا رہے گا اسکو نماز ہی کا ثواب ملتا رہے گا اور فرشتے اسکے لئے یہ دُعا کرتے رہیں گے کہ یا اللہ، اسپر رحمت نازل فرما اور اسکی مغفرت فرما، جب تک کہ وہ کسی کو ایذا نہ پہنچائے اور اسکا وضو نہ ٹوٹے۔ اور حضرت حکم بن عُمیرؓ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دُنیا میں مہمانوں کی طرح رہو اور مسجدوں کو اپنا

گھر بناؤ اور اپنے ذہن کو رقت کی عادت ڈالو (یعنی رقیق القلب نرم دل بنو) اور (اللہ کی نعمتوں میں) کثرت سے تفکر و غور کیا کرو اور بکثرت (اللہ کے خوف سے) رویا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ خواہشاتِ دنیا تمھیں اس حال سے مختلف کر دیں کہ تم گھروں کی فضول تعمیرات میں لگ جاؤ جنہیں رہنا بھی نہ ہو اور ضرورت سے زیادہ مال جمع کرنے کی فکر میں لگ جاؤ اور مستقبل کے لئے ایسی فضول تمناؤں میں مبتلا ہو جاؤ جو پا نہ سکو۔ اور حضرت ابوالدرداءؓ نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی کہ تمھارا گھر مسجد ہونا چاہیئے کیونکہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ مساجد متقی لوگوں کے گھر ہیں جس شخص نے مساجد کو (کثرتِ ذکر کے ذریعہ) اپنا گھر بنالیا، اللہ تعالیٰ اُسکے لئے راحت و سکون اور پُل صراط پر آسانی سے گزرنے کا ضامن ہوگیا۔ اور ابوصادق ازدی نے شعیب بن الحجاب کو خط لکھا کہ مسجدوں کو لازم پکڑو کیونکہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ مساجد ہی انبیاء کی مجالس تھیں۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر زمانے میں ایسے لوگ ہونگے جو مسجدوں میں آکر جگہ جگہ حلقے بنا کر بیٹھ جاویں گے اور وہاں دُنیا ہی کی اور اُسکی محبت کی باتیں کرینگے تم ایسے لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ایسے مسجد میں آنے والوں کی ضرورت نہیں۔

اور حضرت سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ جو شخص مسجد میں بیٹھا گویا وہ اپنے رب کی مجلس میں بیٹھا ہے اس لئے اُسکے ذمہ ہے کہ زبان سے سوائے کلمۂ خیر کے اور کوئی کلمہ نہ نکالے۔ (قرطبی)

مساجد کے پندرہ آداب علماء نے آداب مساجد میں پندرہ چیزوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اوّل یہ کہ مسجد میں پہنچنے پر اگر کچھ لوگوں کو بیٹھا دیکھے تو اُن کو سلام کرے اور کوئی نہ ہو تو السّلام علینا و علیٰ عباد اللہ الصالحین کہے (لیکن یہ اُس صورت میں ہے جبکہ مسجد کے حاضرین نفلی نماز یا تلاوت و تسبیح وغیرہ میں مشغول نہ ہوں ورنہ اسکو سلام کرنا درست نہیں۔ ش) دوسرے یہ کہ مسجد میں داخل ہو کر بیٹھنے سے پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد کی پڑھے (یہ بھی جب ہے کہ اسوقت نماز پڑھنا مکروہ نہ ہو، مثلاً عین آفتاب کے طلوع یا غروب یا استواء نصف النہار کا وقت نہ ہو۔ ۱۲ ش) تیسرے یہ کہ مسجد میں خرید و فروخت نہ کرے۔ چوتھے یہ کہ وہاں تیر تلوار نہ نکالے۔ پانچویں یہ کہ مسجد میں اپنی گم شدہ چیز تلاش کرنے کا اعلان نہ کرے۔ چھٹے یہ کہ مسجد میں آواز بلند نہ کرے۔ ساتویں یہ کہ وہاں دُنیا کی باتیں نہ کرے۔ آٹھویں یہ کہ مسجد میں بیٹھنے کی جگہ میں کسی سے جھگڑا نہ کرے۔ نویں یہ کہ جہاں صف میں پوری جگہ نہ ہو وہاں گھس کر لوگوں پر تنگی پیدا نہ کرے۔ دسویں یہ کہ کسی نماز پڑھنے والے کے آگے سے نہ گزرے۔ گیارھویں یہ کہ مسجد میں تھوکنے ناک صاف کرنے سے پرہیز کرے۔ بارھویں اپنی انگلیاں نہ چٹخائے۔ تیرھویں یہ کہ اپنے بدن کے کسی حصہ سے کھیل نہ کرے۔ چودھویں نجاسات سے پاک صاف رہے اور کسی چھوٹے بچے یا مجنون کو ساتھ نہ لے جائے۔ پندرھویں یہ کہ وہاں کثرت سے ذکر اللہ میں مشغول رہے۔

قرطبی نے یہ پندرہ آداب لکھنے کے بعد فرمایا ہے کہ جس نے یہ کام کرلئے اُس نے مسجد کا حق ادا کر دیا اور مسجد اُسکے لئے حرز وامان کی جگہ بن گئی۔

احقر نے مساجد کے آداب و احکام ایک مستقل رسالہ بنام آدابُ المساجدؔ میں جمع کر دیئے ہیں جن کو ضرورت ہو اُسکا مطالعہ فرمائیں۔

جو مکانات، ذکر اللہ، تعلیم قرآن تعلیم دین کے لئے مخصوص ہوں وہ بھی مساجد کے حکم میں ہیں۔ تفسیر بحر محیط میں ابوحیان نے فرمایا کہ فِیْ بُیُوْتٍ کا لفظ قرآن میں عام ہے جس طرح مساجد اسمیں داخل ہیں اسی طرح وہ مکانات جو خاص تعلیم قرآن تعلیم دین یا وعظ و نصیحت یا ذکر و شغل کے لئے بنائے گئے ہوں جیسے مدارس اور خانقاہیں، وہ بھی اس حکم میں داخل ہیں اُن کا بھی ادب احترام لازم ہے۔

اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ میں لفظ اذن کی خاص حکمت علماء تفسیر کا اتفاق ہے کہ اس جگہ اذن بمعنے اَمر و حکم ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر لفظ اذن کے اس جگہ لانے میں کیا مصلحت ہے روح المعانی میں ایک لطیف مصلحت یہ بیان کی ہے کہ اسمیں مؤمنین صالحین کو اس ادب کی تعلیم و ترغیب دینا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی حاصل کرنے کے ہر کام کے لئے ایسے مستعد اور تیار ہونے چاہئیں کہ حکم کی ضرورت نہ پڑے صرف اسکے منتظر ہوں کہ کب ہمیں اس کام کی اجازت ملے تو ہم یہ سعادت حاصل کریں۔

یُذْکَرَ فِیْہَا اسْمُہٗ، یہاں اللہ کا نام ذکر کرنے میں ہر قسم کا ذکر شامل ہے۔ تسبیح و تحمید وغیرہ بھی نفلی نماز بھی تلاوتِ قرآن وعظ و نصیحت تعلیم علم دین، اور علوم دینیہ کے سب مشاغل اسمیں داخل ہیں۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ، اسمیں اُن مؤمنین کی خاص صفات بیان کی گئی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نورِ ہدایت کے خاص مورد اور مسجدوں کو آباد رکھنے والے ہیں اسمیں لفظ رِجَالٌ کی تعبیر میں اسطرف اشارہ ہے کہ مساجد کی حاضری دراصل مَردوں کے لئے ہے عورتوں کی نماز اُن کے گھروں میں افضل ہے۔

مسند احمد اور بیہقی میں حضرت اُمّ سلمہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ سلم نے فرمایا ہے خیر مساجد النساء قعر بیوتھن، یعنی عورتوں کی بہترین مساجد اُنکے گھروں کے تنگ و تاریک گوشے ہیں۔ اس آیت میں مؤمنین صالحین کی یہ صفت بیان کی ہے کہ ان کو تجارت اور بیع کا مشغلہ اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔ لفظ تجارت میں چونکہ بیع بھی داخل ہے اسلئے بعض مفسرین نے مقابلہ کیوجہ سے اس جگہ تجارت سے مراد خریداری اور بیع سے مراد فروخت کرنا لیا ہے اور بعض نے تجارت کو اپنے مفہوم عام میں رکھا ہے یعنی لین دین خرید و فروخت کے معاملات، پھر بیع کو الگ کر کے بیان کرنے کی حکمت یہ بتلائی ہے کہ معاملات تجارت تو ایک وسیع مفہوم ہے جس کے فوائد و منافع کبھی مدتوں میں وصول ہوتے ہیں اور کسی چیز کو فروخت کر دینے اور قیمت مع نفع کے نقد وصول کرلینے کا فائدہ فوری اور

نقد ہے اسکو خصوصیت سے اس لئے ذکر فرمایا کہ اللہ کے ذکر اور نماز کے مقابلہ میں وہ کسی بڑے سے بڑے دُنیوی فائدہ کا بھی خیال نہیں کرتے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ یہ آیت بازار والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اُنکے صاحبزادے حضرت سالمؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت عبداللہ بن عمرؓ بازار سے گزرے تو نماز کا وقت ہوگیا تھا لوگوں کو دیکھا کہ دُکانیں بند کر کے مسجد کیطرف جارہے ہیں تو فرمایا کہ انہی لوگوں کے بارے میں قرآن کا یہ ارشاد ہے رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللّٰهِ۔

اور عہدِ رسالت میں دو صحابی تھے ایک تجارت کرتے تھے دوسرے صنعت و حرفت یعنی لوہار کا کام کرتے اور تلواریں بنا کر بیچتے تھے۔ پہلے صحابی کی تجارت کا حال یہ تھا کہ اگر سودا تولنے کے وقت اذان کی آواز کان میں پڑجاتی تو وہیں ترازو کو پٹک کر نماز کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے۔ دوسرے بزرگ کا یہ عالم تھا کہ اگر گرم لوہے پر ہتھوڑے کی ضرب لگا رہے ہیں اور کان میں آواز اذان کی آگئی تو اگر ہتھوڑا مونڈھے پر اُٹھائے ہوئے ہیں تو وہیں مونڈھے کے پیچھے ہتھوڑا ڈال کر نماز کو چلدیتے تھے اُٹھائے ہوئے ہتھوڑے کی ضرب سے کام لینا بھی گوارا نہ تھا۔ اُن کی مدح میں یہ آیت نازل ہوئی (قرطبی)

صحابہ کرام اکثر تجارت پیشہ تھے | اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام زیادہ تر تجارت پیشہ یا صنعت پیشہ تھے جو کام کہ بازاروں سے متعلق ہیں کیونکہ تجارت و بیع کا مانع ازیادِ خدا ہونا انہی لوگوں کا وصف ہوسکتا ہے جن کا مشغلہ تجارت و بیع کا ہو ورنہ یہ کہنا فضول ہوگا (رواہ الطبرانی عن ابن عباسؓ۔ روح)

يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ، یہ مؤمنین جنکا ذکر اُوپر آیت میں آیا ہی اُنکا آخری وصف ہے جسمیں بتلایا ہے کہ یہ حضرات ہر وقت ذکر اللہ اور طاعات و عبادات میں مشغول ہونے کے باوجود بے فکر اور بے ڈر بھی نہیں ہوجاتے بلکہ قیامت کے حساب کا خوف اُن پر مسلط رہتا ہے۔ اور یہ اُس نورِ ہدایت کا کمال ہے جو اللہ تعالیٰ کیطرف سے اُن کو عطا ہوا ہے جسکا ذکر اوپر آیت میں يَهْدِي اللّٰهُ لِنُورِهِ مَن يَشَاءُ میں فرمایا۔ آخر میں ایسے حضرات کی جزاء کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اُنکے عمل کی بہترین جزاء عطا فرمادیں گے اور پھر فرمایا وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ، یعنی صرف جزاءِ عمل دینے پر اکتفا نہیں ہوگا بلکہ اپنی طرف سے مزید انعامات بھی اُن کو ملیں گے وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ، یعنی اللہ تعالیٰ نہ کسی قانون کا پابند ہے نہ اُسکے خزانے میں کبھی کمی آتی ہے وہ جس کو چاہے بے حساب رزق دیدیتا ہے۔ یہاں تک مؤمنین صالحین جن کے سینے نورِ ہدایت کے مشکوٰۃ ہوتے ہیں اور جو نورِ ہدایت کو خاص طور سے قبول کرتے ہیں اُن کا ذکر تھا۔ آگے اُن کفار کا ذکر ہے جن کی فطرت میں تو اللہ تعالیٰ نے نورِ ہدایت کا مادہ رکھا تھا مگر جب اس مادہ کو روشن کرنے والی وحیِ الٰہی اُن کو پہنچی تو اُس سے روگردانی اور انکار کر کے نور سے محروم ہوگئے اور اندھیرے ہی اندھیرے میں رہ گئے اور ان میں چونکہ

کافر و منکر دو قسم کے تھے اس لئے ان کی دو مثالیں بیان کی گئیں جن کی تفصیل خلاصہ تفسیر میں آچکی ہے۔ دونوں مثالیں بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ، یہ جملہ کفار کے بارے میں ایسا ہی ہے جیسا مومنین کے بارے میں یہ ارشاد ہوا تھا يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ کفار کے لئے اس جملہ میں نورِ ہدایت سے محرومی کا ذکر ہے کہ انہوں نے احکامِ الٰہیہ سے انحراف کرکے اپنا فطری نور بھی فنا کر لیا اب جبکہ اللہ کے نورِ ہدایت سے محروم ہوگئے تو نور کہاں سے آئے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی شخص محض اسبابِ علم و بصیرت جمع ہونے سے عالم مبصر نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے آدمی جو دنیا کے کاموں میں بالکل ناواقف بے خبر سمجھے جاتے ہیں آخرت کے معاملہ میں وہ بڑے مبصر عقلمند ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح اسکے برعکس بہت سے آدمی جو دنیا کے کاموں میں بڑے ماہر اور مبصر محقق مانے جاتے ہیں مگر آخرت کے معاملہ میں بڑے بے وقوف جاہل ثابت ہوتے ہیں۔ (مظہری)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ

کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ کی یاد کرتے ہیں جو کوئی ہیں آسمان و زمین میں اور اڑتے جانور پر کھولے ہوئے

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلِلّٰهِ

ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی بندگی اور یاد، اور اللہ کو معلوم ہے جو کچھ کرتے ہیں اور اللہ کی

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ

حکومت ہے آسمان اور زمین میں اور اللہ ہی تک پھر جانا ہے تو نے نہ دیکھا کہ اللہ ہانک

يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ

لاتا ہے بادل کو پھر ان کو ملا دیتا ہے پھر ان کو رکھتا ہے تہ بر تہ پھر تو دیکھے مینہ نکلتا ہے اس

مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ

کے بیچ سے اور اتارتا ہے آسمان سے اسمیں جو پہاڑ ہیں اولوں کے پھر وہ ڈالتا ہے جس

مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ۭ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾

پر چاہے اور بچا دیتا ہے جس سے چاہے ابھی اس کی بجلی کی کوندے لے جائے آنکھوں کو

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۴۴﴾

اللہ بدلتا ہے رات اور دن کو اسمیں دھیان کرنے کی جگہ ہے آنکھ والوں کو

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَ

اور اللہ نے بنایا ہر پھرنے والے کو ایک پانی سے پھر کوئی ہے کہ چلتا ہے اپنے پیٹ پر اور

مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ

کوئی ہے کہ چلتا ہے دو پاؤں پر اور کوئی ہے کہ چلتا ہے چار پر بناتا ہے

اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴۵

اللہ جو چاہتا ہے بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تجھ کو (دلائل اور مشاہدہ سے) معلوم نہیں ہوا کہ اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں (خواہ قالاً جو بعض مخلوقات میں مشاہد بھی ہے خواہ حالاً جو کل مخلوقات میں بدلالت عقل معلوم ہے) اور (بالخصوص) پرند (بھی) جو پر پھیلائے ہوئے (اڑتے پھرتے) ہیں (کہ ان کی دلالت علیٰ وجود الصانع اور زیادہ عجیب ہے کہ باوجود ان کے ثقل اجسام کے پھر فضاء میں رُکے ہوئے ہیں اور) سب (پرندوں) کو اپنی اپنی دعا (اور التجاء اللہ سے) اور اپنی تسبیح (وتقدیس کا طریقہ الہام سے) معلوم ہے اور (باوجود ان دلائل کے پھر بھی بعضے توحید کو نہیں مانتے تو) اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے سب افعال کا پورا علم ہے (اس انکار واعراض پر ان کو سزا دیگا) اور اللہ ہی کی حکومت ہے آسمانوں اور زمین میں (اب بھی) اور (انتہا میں) اللہ ہی کی طرف (سب کو) لوٹ کر جانا ہے (اسوقت بھی حاکمانہ تصرف اُسی کا ہوگا چنانچہ حکومت کا ایک اثر بیان کیا جاتا ہے وہ یہ کہ اے مخاطب) کیا تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ (ایک) بادل کو (دوسرے بادل کی طرف) چلتا کرتا ہے (اور) پھر اُس بادل (کے مجموعہ) کو باہم ملا دیتا ہے پھر اسکو تہ بہ تہ کرتا ہے پھر تو بارش کو دیکھتا ہے کہ اُس (بادل) کے بیچ میں سے نکل (نکل کر) آتی ہے اور اس بادل یعنی اسکے بڑے بڑے حصّوں میں سے اولے برساتا ہے پھر اُن کو جس (کی جان) پر یا مال پر چاہتا ہے گراتا ہے (کہ اسکا نقصان ہو جاتا ہے) اور جس سے چاہتا ہے اُس کو ہٹا دیتا ہے (اور اُس کے جان و مال کو بچا لیتا ہے اور) اُس بادل (میں سے بجلی بھی پیدا ہوتی ہے اور ایسی چمکدار کہ اس بادل) کی بجلی کی چمک کی یہ حالت ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُس نے اب بینائی کو اُچک لیا (یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے تصرفات میں سے ہے اور) اللہ تعالےٰ رات اور دن کو بدلتا رہتا ہے (یہ بھی منجملہ تصرفات الٰہیہ کے ہے) اس (سب مجموعہ) میں اہلِ دانش کے لئے استدلال (کا موقع) ہے (جس سے مضمون توحید اور مضمون لہٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ پر استدلال کرتے ہیں) اور اللہ (ہی کا یہ تصرف بھی ہے کہ اُس) نے ہر چلنے والے جاندار کو (بری ہو یا بحری) پانی سے پیدا کیا ہے پھر اُن (جانوروں) میں بعضے تو وہ (جانور) ہیں جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں (جیسے سانپ مچھلی) اور بعضے اُن میں وہ ہیں جو دو

۲۸

پیروں پر چلتے ہیں (جیسے انسان اور پرندے جبکہ ہوا میں نہ ہوں) اور بعضے اُن میں وہ ہیں جو چار (پیروں) پر چلتے ہیں (جیسے مواشی، اسی طرح بعضے زیادہ پر بھی اصل یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے بناتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پورا قادر ہے (اُس کو کچھ بھی مشکل نہیں)۔

معارف و مسائل

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ، شروع آیت میں یہ فرمایا ہے کہ زمین و آسمان اور انکے درمیان کی ہر مخلوق اور ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کرنے میں مشغول ہے۔ اس تسبیح کا مفہوم حضرت سفیان رح نے یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا کی ہر چیز آسمان، زمین، آفتاب، ماہتاب اور کل سیارے اور ستارے اور زمین کے عناصر آگ، پانی، مٹی، ہوا سب کو خاص خاص کاموں کے لئے پیدا فرمایا ہے اور جس کو جس کام کے لئے پیدا فرمایا ہے وہ برابر اُسی پر لگا ہوا ہے اُس سے سرِ مو خلاف نہیں کرتا۔ اسی اطاعت و انقیاد کو ان چیزوں کی تسبیح فرمایا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اُن کی تسبیح حالی ہے مقالی نہیں۔ اُن کی زبانِ حال بول رہی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کو پاک برتر سمجھ کر اُسکی اطاعت میں لگے ہوئے ہیں۔

زمخشری اور دوسرے مفسرین نے فرمایا کہ اسمیں بھی کوئی بُعد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک چیز کے اندر اتنا فہم و شعور رکھا ہو جس سے وہ اپنے خالق و مالک کو پہچانے اور اسمیں بھی کوئی بُعد نہیں کہ انکو کسی خاص قسم کی گویائی عطا فرمائی ہو اور خاص قسم کی تسبیح و عبادت اُن کو سکھا دی ہو جسمیں وہ مشغول رہتے ہوں آخری جملے كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ میں اسی مضمون کیطرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور نماز میں ساری مخلوق لگی ہوئی ہے مگر ہر ایک کی نماز اور تسبیح کا طریقہ اور صورت مختلف ہے۔ فرشتوں کا اور طریقہ، انسان کا دوسرا، اور نباتات کسی اور طرح سے عبادت نماز و تسبیح ادا کرتے ہیں جمادات کسی اور طریق سے۔ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت سے بھی اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اسکو ہدایت دی۔ وہ ہدایت یہی ہے کہ وہ ہر وقت حق تعالیٰ کی اطاعت میں لگی ہوئی اپنی مفوضہ ڈیوٹی کو پورا کر رہی ہے اس کے علاوہ اسکی اپنی ضروریاتِ زندگی کے متعلق بھی اسکو ایسی ہدایت دیدی ہے کہ بڑے بڑے عقلاء کی عقل حیران ہو جاتی ہے۔ اپنے رہنے بسنے کے لئے کیسے کیسے گھونسلے اور بل وغیرہ بناتے ہیں اور اپنی غذا وغیرہ حاصل کرنے کے لئے کیسی کیسی تدبیریں کرتے ہیں۔

مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا، یہاں سماء سے مُراد بادل ہے اور جبال سے مُراد بڑے بڑے بادل ہیں اور بَرَدٌ اولے کو کہا جاتا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۴۶

ہم نے اُتاریں آیتیں کھول کھول کر بتلانے والی، اور اللہ چلائے جس کو چاہے سیدھی راہ پر

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ

اور لوگ کہتے ہیں ہم نے مانا اللہ کو اور رسول کو اور حکم میں آگئے پھر پھر جاتا ہے ایک فرقہ اُنمیں سے

مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۷ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ

اس کے پیچھے اور وہ لوگ نہیں ماننے والے اور جب اُن کو بلائیے اللہ اور

وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۴۸ وَاِنْ يَّكُنْ

رسول کی طرف کہ انمیں فیصلہ کرائے تبھی ایک فرقہ کے لوگ اُنمیں منہ موڑتے ہیں اور اگر اُن کو

لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۝۴۹ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ

کچھ پہنچتا ہو تو چلے آئیں اُس کی طرف قبول کر کر کیا اُن کے دلوں میں روگ ہے یا

ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ۭ بَلْ اُولٰۗىِٕكَ

دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، یا ڈرتے ہیں کہ بے انصافی کرے گا اُن پر اللہ اور اُس کا رسول کچھ نہیں وہی لوگ

هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۵۰ۧ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ

بے انصاف ہیں ایمان والوں کی بات یہی تھی کہ جب بلائیے اُن کو اللہ اور

رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵۱

رسول کی طرف فیصلہ کرنے کو ان میں تو کہیں ہم نے سُن لیا اور حکم مان لیا اور وہ لوگ کہ انہی کا بھلا ہے

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝۵۲

اور جو کوئی حکم پر چلے اللہ کے اور اسکے رسول کے اور ڈرتا ہے اللہ سے اور بچکر چلے اُس سے سو وہی لوگ ہیں مراد کو پہنچنے والے

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۭ قُلْ لَّا

اور قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی اپنی تاکید کی قسمیں کہ اگر تو حکم کرے تو سب کچھ چھوڑ کر نکل جائیں، تو کہہ قسمیں

تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۵۳ قُلْ

نہ کھاؤ حکمبرداری چاہئے جو دستور ہے، البتہ اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو تو کہہ

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ

حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا پھر اگر تم منہ پھیرو گے تو اسکا ذمہ ہے جو بوجھ اس پر رکھا

وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ

اور تمہارا ذمہ ہے جو بوجھ تم پر رکھا اور اگر اُس کا کہا مانو تو راہ پاؤ، اور پیغام لانے والے کا ذمہ نہیں

إِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾
مگر پہنچا دینا کھول کر

خلاصۂ تفسیر

ہم نے (حق کے) سمجھانے والے دلائل (ہدایت عام کے لئے) نازل فرمائے ہیں اور (ان عام میں سے) جس کو اللہ چاہتا ہے راہ راست کیطرف (خاص) ہدایت فرماتا ہے (کہ وہ اُلوہیت کے حقوق علمیہ یعنی عقائد صحیحہ اور حقوقِ عملیہ یعنی طاعت کو بجالاتا ہے ورنہ بہت سے محروم ہی رہتے ہیں) اور یہ منافق لوگ (زبان سے) دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور رسول پر ایمان لے آئے اور (خدا و رسول کا) حکم (دل سے) مانا پھر اسکے بعد (جب عمل کرکے اپنا دعویٰ ثابت کرنیکا وقت آیا تو) انہیں کا ایک گروہ (جو بہت زیادہ شریر ہے خدا و رسول کے حکم سے) سرتابی کرتا ہے (اسوقت سے وہ صورت مراد ہے کہ جب انکے ذمہ کسی کا حق چاہتا ہو اور صاحبِ حق اس منافق سے درخواست کرے کہ چلو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدمہ لے چلیں اس موقع پر یہ سرتابی کرتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ آپکے اجلاس میں جب حق ثابت ہوجاویگا تو اسی کے موافق آپ فیصلہ کریں گے جیسا عنقریب آیت وَاِذَا دُعُوْٓا میں اس موقع کا یہی بیان آتا ہے اور تخصیص ایک فریق کی باوجودیکہ تمام منافقین ایسے ہی تھے اسلئے ہے کہ غریب غربا کو باوجود کراہت قلبی کے صاف انکار کرنے کی جرأت و ہمت نہیں ہوا کرتی یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جنکو کچھ وجاہت اور قوت حاصل ہو) اور یہ لوگ بالکل ایمان نہیں رکھتے (یعنی دل میں تو کسی منافق کے بھی ایمان نہیں مگر ان کا تو وہ ظاہری طمع شدہ ایمان بھی نہ رہا جیسا اس آیت میں ہے وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ اور اس آیت میں ہے قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اور بیان اس حکم عدولی کا یہ ہے کہ) یہ لوگ جب اللہ اور اسکے رسول کیطرف اس غرض سے بُلائے جاتے ہیں کہ رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) انکے (اور ان کے خصوم کے) درمیان میں فیصلہ کردیں تو ان میں کا ایک گروہ (وہاں حاضر ہونے سے) پہلوتہی کرتا ہے (اور ٹالتا ہے اور یہ بلانا اگرچہ رسول ہی کیطرف ہے مگر چونکہ آپ کا فیصلہ حکمِ خداوندی کی بناء پر ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کیطرف بھی نسبت کردی گئی غرض جب ان کے ذمہ کسی کا حق چاہتا ہے تب تو انکی یہ حالت ہوتی ہے) اور اگر (اتفاق سے) ان کا حق (کسی دوسرے کے ذمہ ہو) تو سرِ تسلیم خم کئے ہوئے (بے تکلف آپکے بُلانے پر) آپ کے پاس چلے آتے ہیں (کیونکہ اطمینان ہوتا ہے کہ وہاں حق کا فیصلہ ہوگا اسمیں ہمارا فائدہ ہے۔ آگے ان لوگوں کے اعراض اور حاضر نہونے کی وجہ اسباب چند احتمالات کے طور پر بیان کرکے اور سب احتمالات کی نفی اور ایک احتمال کا اثبات ہے) آیا (اس اعراض کا سبب یہ ہے کہ) انکے دلوں میں (کفر

یقینی کا) مرض ہے (یعنی ان کو اسکا یقین ہے کہ آپ اللہ کے رسول نہیں) یا یہ (نبوت کی طرف سے) شک میں پڑے ہیں (کہ رسول نہونے کا یقین تو نہیں مگر رسول ہونیکا بھی یقین نہیں) یا انکو یہ اندیشہ ہے کہ اللہ اور اسکا رسول ان پر ظلم کرنے لگیں (اور ان کے ذمہ جو حق ہے اس سے زائد دلا دیں، سو واقعہ یہ ہے کہ ان اسباب میں سے کوئی بھی سبب) نہیں (ہے) بلکہ (اصلی سبب یہ ہے کہ) یہ لوگ (ان مقدمات میں) برسر ظلم (ہوتے) ہیں (اسلئے حضور نبوی میں مقدمہ لانا پسند نہیں کرتے کہ ہم ہار جاوینگے اور باقی اسباب سابقہ سب منفی ہیں) مسلمانوں (کی شان اور ان) کا قول تو جب انکو (کسی مقدمہ میں) اللہ اور اسکے رسول کیطرف بلایا جاتا ہے یہ ہے کہ وہ (خوشی خوشی) کہدیتے ہیں کہ ہمنے (تمھارا کلام) سُن لیا اور (اس کو) مان لیا (اور پھر فوراً چلے جاتے ہیں یہ ہے علامت اس کی ایسوں کا آمنا اور اطعنا کہنا دُنیا میں بھی صادق ہے) اور ایسے (ہی) لوگ (آخرت میں بھی) فلاح پائیں گے اور (ہمارے یہاں کا تو قاعدہ کلیہ ہے کہ) جو شخص اللہ اور اسکے رسول کا کہنا مانے اور اللہ سے ڈرے اور اسکی مخالفت سے بچے بس ایسے لوگ بامراد ہوں گے اور (نیز ان منافقین کی یہ حالت ہے کہ) وہ لوگ بڑا زور لگا کر قسمیں کھایا کرتے ہیں کہ واللہ (ہم ایسے فرمانبردار ہیں کہ) اگر آپ انکو (یعنی ہمکو) حکم دیں (کہ گھر بار سب چھوڑ دو) تو وہ (یعنی ہم) ابھی (سب چھوڑ چھاڑ) نکل کھڑے ہوں آپ (ان سے) کہدیجئے کہ بس قسمیں نہ کھاؤ (تمھاری) فرمانبرداری کی حقیقت معلوم ہے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے (اور اس نے مجھ کو بتلا دیا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ اور) آپ (ان سے) کہئے کہ (باتیں بنانے سے کام نہیں چلتا کام کرو یعنی) اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو (آگے اللہ تعالیٰ اہتمام شانِ مضمون کے واسطے خود ان لوگوں کو خطاب فرماتا ہے کہ رسول کے اس کہنے کے اور تبلیغ کے بعد) پھر اگر تم لوگ (اطاعت سے) روگردانی کروگے تو سمجھ رکھو کہ (رسول کا کوئی ضرر نہیں کیونکہ) رسول کے ذمہ وہی تبلیغ (کا کام) ہے جسکا ان پر بار رکھا گیا ہے (جس کو وہ کر چکے اور سبکدوش ہوگئے) اور تمھارے ذمہ وہ (اطاعت کا کام) ہے جسکا تم پر بار رکھا گیا ہے (جس کو تم نہیں بجالائے پس تمھارا ہی ضرر ہوگا) اور اگر (روگردانی نہ کی بلکہ) تمنے ان کی اطاعت کرلی (جو عین اطاعت اللہ ہی کی ہے) تو راہ پر جالگو گے اور (بہر حال) رسول کے ذمہ صرف صاف طور پر پہنچا دینا ہے (آگے تم سے بازپرس ہوگی کہ قبول کیا یا نہیں)۔

معارف و مسائل

یہ آیات ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہیں۔ طبری وغیرہ نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ منافقین

میں سے ایک شخص بشر نامی تھا اسکے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین کے متعلق جھگڑا اور خصومت تھی۔ یہودی نے اسکو کہا کہ چلو تمہارے ہی رسول سے ہم فیصلہ کرالیں مگر بشر منافق ناحق پر تھا یہ جانتا تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدمہ گیا تو آپ حق کے موافق فیصلہ کریں گے اور میں ہار جاؤنگا۔ اسنے اس سے انکار کیا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بجائے کعب بن اشرف یہودی کے پاس مقدمہ لیجانے کو کہا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ اور آیت اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ الآیۃ میں جو ان کے دلوں میں کفر یقینی کا مرض یا نبوت میں شک ہونے کی نفی کی گئی ہے اس کی مراد یہ ہے کہ یہ کفر یقینی یا شک ان کے دربار نبوی میں مقدمہ لانے سے گریز کرنیکا سبب نہیں اگرچہ کفر و شک کا ہونا منافقین میں ثابت اور واضح ہے مگر مقدمہ نہ لانا اصل میں اس سبب سے ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ حق کا فیصلہ ہوگا تو ہم ہار جائیں گے۔

فوز و فلاح کے لئے چار شرطیں | وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ

اس آیت میں چار چیزیں بیان کرکے فرمایا ہے کہ جو ان چار چیزوں کے پابند ہیں وہی بامراد اور دین و دُنیا میں کامیاب ہیں۔

ایک واقعہ عجیبہ | تفسیر قرطبی میں اس جگہ ایک واقعہ حضرت فاروق اعظم رضی کا نقل کیا جس سے ان چاروں چیزوں کے مفہوم کا فرق اور وضاحت ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی ایک روز مسجد نبوی میں کھڑے تھے اچانک ایک رومی دیہقانی آدمی بالکل آپکے برابر آکر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، حضرت فاروق اعظم رضی نے پوچھا کیا بات ہے؟ تو کہا میں اللہ کے لئے مسلمان ہوگیا ہوں۔ حضرت فاروق اعظم رضی نے پوچھا کیا اسکا کوئی سبب ہے اس نے کہا ہاں۔ بات یہ ہے کہ میں نے تورات، انجیل، زبور اور انبیاء سابقین کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ مگر حال میں ایک مسلمان قیدی قرآن کی ایک آیت پڑھ رہا تھا وہ سُنی تو معلوم ہوا کہ اس چھوٹی سی آیت نے تمام کتب قدیمہ کو اپنے اندر سمو لیا ہے تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ فاروق اعظم رضی نے پوچھا کہ وہ کونسی آیت ہے تو اس رومی دیہقان نے یہی آیت مذکورہ تلاوت کی اور اسکے ساتھ اسکی تفسیر بھی عجیب و غریب اس طرح بیان کی کہ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ فرائضِ الٰہیہ کے متعلق ہے۔ وَرَسُوْلَهٗ سنتِ نبوی کے متعلق ہے وَيَخْشَ اللّٰهَ گزشتہ عمر کے متعلق ہے وَيَتَّقْهِ آئندہ باقی عمر کے متعلق ہے۔ جب انسان ان چار چیزوں کا عامل ہو جائے تو اسکو فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ کی بشارت ہے اور فائز وہ شخص ہے جو جہنم سے نجات پائے اور جنت میں اس کو ٹھکانا ملے۔ فاروق اعظم رضی نے یہ سنکر فرمایا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم (کے کلام میں اسکی تصدیق موجود ہے آپ) نے فرمایا ہے اُوْتِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ یعنی اللہ تعالے نے مجھے ایسے جامع کلمات عطا فرمائے ہیں جن کے الفاظ مختصر اور معانی نہایت وسیع ہیں۔ (قرطبی)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي

وعدہ کرلیا اللہ نے اُن لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے ہیں اور کیے ہیں اُنھوں نے نیک کام، البتہ پیچھے حاکم کردیگا اُنکو

الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ

ملک میں جیسا حاکم کیا تھا اُن سے اگلوں کو اور جمادیگا اُن کے لئے دین اُن کا

الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ

جو پسند کردیا اُن کے واسطے اور دیگا اُن کو اُن کے ڈر کے بدلے میں امن، میری بندگی کرینگے

لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾

شریک نہ کرینگے میرا کسی کو اور جو کوئی ناشکری کریگا اسکے پیچھے سو وہی لوگ ہیں نافرمان

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور حکم پر چلو رسُول کے تاکہ تم پر رحم ہو

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ

نہ خیال کر کہ یہ جو کافر ہیں تھکادینگے بھاگ کر ملک میں اور اُن کا ٹھکانا آگ ہے

وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾ ع

اور وہ بُری جگہ ہے پھر جانے کی

ع ۱۲

خلاصۂ تفسیر

(اے مجموعہ اُمت) تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں (یعنی اللہ کے بھیجے ہوئے نورِ ہدایت کا کامل اتباع کریں) اُن سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ اُن کو (اس اتباع کی برکت سے) زمین میں حکومت عطا فرمادیگا جیسا ان سے پہلے (اہلِ ہدایت) لوگوں کو حکومت دی تھی (مثلاً بنی اسرائیل کو فرعون اور اُس کی قوم قبطیوں پر غالب کیا پھر ملک شام میں عمالقہ جیسی بہادر قوم پر اُن کو غلبہ عطا فرمایا اور مصر و شام کی حکومت کا ان کو وارث بنایا) اور (مقصود اس حکومت دینے سے یہ ہوگا کہ) جس دین کو (اللہ تعالیٰ نے) اُن کے لئے پسند کیا ہے (یعنی اسلام جیسا کہ دوسری آیت میں ہے رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا) اُس کو اُن کے (نفع آخرت کے) لئے قوت دیگا اور (اُن کو جو دشمنوں سے طبعی خوف ہے) اُن کے اس خوف کے بعد اُس کو امن سے بدل دیگا بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں (اور) میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں (نہ جلی نہ خفی جس کو ریا کہتے ہیں یعنی یہ وعدہ اللہ تعالیٰ کا مشروط ہے دین پر پوری طرح ثابت قدم رہنے کیساتھ۔ اور یہ وعدہ تو دُنیا میں ہے اور آخرت میں ایمان اور عمل صالح پر جو جزائے عظیم اور دائمی راحت کا وعدہ ہے وہ اسکے علاوہ ہے) اور جو شخص بعد (ظہور) اس (وعدہ)

کے ناشکری کریگا (یعنی دین کے خلاف راستہ اختیار کریگا) تو (ایسے شخص کے لئے یہ وعدہ نہیں کیونکہ) یہ لوگ نافرمان ہیں (اور وعدہ تھا فرمانبرداروں کے لئے اسلئے اُن سے دُنیا میں بھی وعدہ حکومت دینے کا نہیں ہے اور آخرت کا عذاب اسکے علاوہ ہے) اور (اے مسلمانوں جب ایمان اور عمل صالح کے دُنیوی اور دینی فوائد سُن لئے تو تم کو چاہیئے کہ خوب) نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو اور (باقی احکام میں بھی) رسُول (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کیا کرو تاکہ تم پر (کامل) رحم کیا جائے (آگے کفر و معصیت کا انجام ذکر کیا گیا ہے کہ اے مخاطب) کافروں کی نسبت یہ خیال مت کرنا کہ زمین (کے کسی حصّہ) میں (بھاگ جاویں گے اور ہم کو) ہرا دینگے (اور ہمارے قہر سے بچ جاویں گے نہیں بلکہ وہ خود ہاریں گے اور مقہور و مغلوب ہوں گے۔ یہ تو نتیجہ دُنیا میں ہے) اور (آخرت میں) اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

معارف و مسائل

شانِ نزول قرطبی نے ابوالعالیہ سے نقل کیا ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نزولِ وحی اور اعلانِ نبوت کے بعد دس سال مکہ مکرمہ میں رہے تو ہر وقت کفار و مشرکین کے خوف میں رہے پھر ہجرت مدینہ کا حکم ہوا تو یہاں بھی مشرکین کے حملوں سے ہر وقت کے خطرہ میں رہے کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسُول اللہ کبھی ہم پر ایسا وقت بھی آئیگا کہ ہم ہتھیار کھول کر امن و اطمینان کے ساتھ رہ سکیں۔ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہت جلد ایسا وقت آنے والا ہے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں (قرطبی و بحر) حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ نے فرمایا کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے جو اُسنے اُمتِ محمدیہ سے اُنکے وجود میں آنے سے پہلے ہی تورات و انجیل میں فرمایا تھا۔ (بحر محیط)

اللہ تعالیٰ نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے تین چیزوں کا وعدہ فرمایا کہ آپکی اُمت کو زمین کے خلفاء اور حکمراں بنایا جائیگا اور اللہ کے پسندیدہ دینِ اسلام کو غالب کیا جائیگا اور مسلمانوں کو اتنی قوت و شوکت دی جائے گی کہ اُن کو دشمنوں کا کوئی خوف نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ اس طرح پُورا فرمایا کہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں مکہ، خیبر، بحرین اور پورا جزیرۃ العرب اور پورا ملک یمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ فتح ہوا اور ہجر کے مجوسیوں سے اور ملک شام کے بعض اطراف سے آپ نے جزیہ وصول فرمایا۔ اور شاہِ روم ہرقل نے اور شاہ مصر و اسکندریہ مقوقس اور شاہانِ عمان اور بادشاہ حبشہ نجاشی وغیرہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایا بھیجے اور آپ کی تعظیم و تکریم کی۔ پھر آپ کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبر ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو وفات کے بعد جو کچھ فتنے پیدا ہو گئے تھے اُن کو ختم کیا اور بلاد فارس اور بلاد شام

و مصر کیطرف اسلامی لشکر بھیجے اور بُصری اور دمشق آپ ہی کے زمانے میں فتح ہوئے اور دوسرے ملکوں کے بھی بعض حصے فتح ہوئے۔

حضرت صدیقِ اکبرؓ کی وفات کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل میں اپنے بعد عمرؓ بن خطاب کو خلیفہ بنانے کا الہام فرمایا۔ عمر بن خطابؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے نظامِ خلافت ایسا سنبھالا کہ آسمان نے انبیاء علیہم السلام کے بعد ایسا نظام کہیں نہ دیکھا تھا۔ اُن کے زمانے میں ملک شام پُورا فتح ہوگیا اسی طرح پورا ملک مصر اور ملک فارس کا اکثر حصہ۔ اُنھیں کے زمانے میں قیصر و کسریٰ کی قیصری اور کسری کا خاتمہ ہوا۔ اسکے بعد خلافت عثمانی کا وقت آیا تو اسلامی فتوحات کا دائرہ مشارق و مغارب تک وسیع ہوگیا۔ بلاد مغرب، اندلس اور قبرص تک اور مشرق اقصٰی میں بلاد چین تک اور عراق، خراسان، اھواز سب آپکے زمانے میں فتح ہوئے۔ اور صحیح حدیث میں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مجھے پوری زمین کے مشارق و مغارب سمیٹ کر دکھائے گئے ہیں اور میری اُمت کی حکومت اُن تمام علاقوں تک پہنچے گی جو مجھے دکھائے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ خلافتِ عثمانیہ کے دَور ہی میں پُورا فرما دیا (یہ سب مضمون تفسیر ابن کثیر سے لیا گیا ہے)۔

اور ایک حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ خلافت میرے بعد تیس سال رہے گی اس کی مُراد خلافتِ راشدہ ہے جو بالکل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر قائم رہی اور حضرت علیؓ مرتضٰی تک چلی کیونکہ یہ تیس سال کی مدت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانے تک پوری ہوئی۔

ابن کثیرؒ نے اس جگہ صحیح مسلم کی یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ حضرت جابر بن سمرہ رضؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میری اُمت کا کام چلتا رہیگا جبتک بارہ خلیفہ رہیں گے۔ ابن کثیر نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ حدیث بارہ خلیفہ عادل اس اُمت میں ہونے کی خبر دے رہی ہے جسکا وقوع ضروری ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ سب کے سب مُسلسل اور متصل ہی ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ کچھ وقفوں کے بعد ہوں۔ انیں سے چار تو یکے بعد دیگرے ہو چکے جو خلفاء راشدین تھے پھر کچھ وقفہ کے بعد حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز ہوئے اُن کے بعد بھی مختلف زمانوں میں ایسے خلیفہ ہوتے رہے اور تا قیامت رہیں گے آخری خلیفہ حضرت مہدی ہونگے۔ روافض نے جن بارہ خلفاء کو متعین کیا ہے اس کی کوئی دلیل حدیث میں نہیں بلکہ انمیں سے بعض تو وہ ہیں جنکا خلافت سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ان سب کے درجات برابر ہوں اور سب کے زمانے میں امن و سکون دُنیا کا یکساں ہو۔ بلکہ اس وعدہ کا مدار ایمان و عمل صالح پر استقامت اور مکمل اتباع پر ہے اسکے درجات کے اختلاف سے حکومت کی نوعیت و قوت میں بھی فرق و اختلاف لازمی ہے۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں

جب اور جہاں کوئی مسلمان عادل اور صالح بادشاہ ہوا ہے اس کو اپنے عمل و صلاح کے پیمانے پر اس وعدہ الٰہیہ کا حصہ ملا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا ہے اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ یعنی اللہ کی جماعت ہی غالب رہے گی۔

آیتِ مذکورہ سے خلفاء راشدین کی خلافت اور مقبولیت عند اللہ کا ثبوت یہ آیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی دلیل بھی ہے کیونکہ جو پیش گوئی اس آیت میں فرمائی گئی تھی وہ بالکل اُسی طرح پوری ہوئی۔ اسی طرح یہ آیت حضرات خلفاء راشدین کی خلافت کے حق و صحیح اور مقبول عند اللہ ہونے کی بھی دلیل ہے کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ اپنے رسول اور اسکی اُمت سے فرمایا تھا اُس کا پُورا پُورا ظہور انھیں حضرات کے زمانے میں ہوا۔ اگر ان حضرات کی خلافت کو حق و صحیح نہ مانا جائے جیسے روافض کا خیال ہے تو پھر قرآن کا یہ وعدہ ہی کہیں پورا نہیں ہوا۔ اور روافض کا یہ کہنا کہ یہ وعدہ حضرت مہدی کے زمانے میں پورا ہوگا ایک مضحکہ خیز چیز ہے اسکا حاصل تو یہ ہوا کہ چودہ سو برس تو پوری اُمت ذلت و خواری میں رہے گی اور قربِ قیامت میں جو چند روز کے لئے اُن کو حکومت ملے گی وہی حکومت اس وعدہ سے مراد ہے معاذ اللہ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وعدہ اللہ تعالیٰ نے جن شرائط ایمان و عمل صالح کی بنیاد پر کیا تھا وہ شرائط بھی انھیں حضرات میں سب سے زیادہ کامل و مکمل تھیں اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی پُورا پُورا انھیں کے عہد میں پورا ہوا اُنکے بعد نہ ایمان و عمل کا وہ درجہ قائم رہا نہ خلافت و حکومت کا وہ وقار کبھی قائم ہوا۔

وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ، لفظ کفر کے لغوی معنے ناشکری کے اور اصطلاحی معنے ایمان کی ضد ہیں۔ یہاں لفظی معنے بھی مُراد ہو سکتے ہیں اور اصطلاحی بھی۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ جبوقت اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ساتھ اپنا یہ وعدہ پُورا کر دے، مسلمانوں کو حکومت قوت اور امن و اطمینان اور دین کو استحکام حاصل ہو جائے اسکے بعد بھی اگر کوئی شخص کفر کرے یعنی اسلام سے پھر جائے یا ناشکری کرے کہ اس اسلامی حکومت کی اطاعت سے گریز کرے تو ایسے لوگ حد سے نکل جانے والے ہیں۔ پہلی صورت میں ایمان ہی سے نکل گئے اور دوسری صورتمیں اطاعت سے نکل گئے۔ کفر اور ناشکری ہر وقت ہر حال میں گناہ عظیم ہے مگر اسلام اور مسلمانوں کی قوت و شوکت اور حکومت قائم ہونیکے بعد یہ چیزیں دوہرے جُرم ہو جاتی ہیں اسلئے بَعْدَ ذٰلِكَ سے مؤکد فرمایا گیا۔ امام بغوی نے فرمایا کہ علماء تفسیر نے کہا ہے کہ قرآن کے اس جملے کے سب سے پہلے مصداق وہ لوگ ہوئے جنھوں نے خلیفہ وقت حضرت عثمان غنی رض کو قتل کیا اور جب وہ اس جُرم عظیم کے مُرتکب ہوئے تو اللہ تعالیٰ کے مذکورہ انعامات میں بھی کمی آگئی آپس کے قتل و قتال سے خوف و ہراس میں مبتلا ہوگئے اور بھائی بھائی ہونے کے بعد ایک دوسرے

آپس میں بھائی بھائی تھے ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن سلام کا یہ خطبہ نقل کیا ہے جو انھوں نے حضرت عثمان رضؓ کے خلاف ہنگامہ کیوقت دیا تھا، خطبہ کے الفاظ یہ ہیں

"اللہ کے فرشتے تمھارے شہر کے گرد احاطہ کئے ہوئے حفاظت میں اُسوقت سے مشغول تھے جب سے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف فرما ہوئے اور آج تک یہ سلسلہ جاری تھا، خدا کی قسم اگر تم نے عثمان کو قتل کر دیا تو یہ فرشتے واپس چلے جاویں گے اور پھر کبھی نہ لوٹیں گے۔ خدا کی قسم تم میں سے جو شخص ان کو قتل کریگا وہ اللہ کے سامنے دست بریدہ حاضر ہوگا اُس کے ہاتھ نہ ہوں گے۔ اور سمجھ لو کہ اللہ کی تلوار ابتک میان میں تھی، خدا کی قسم اگر وہ تلوار میان سے نکل آئی تو پھر کبھی میان میں نہ جاویگی، کیونکہ جب کوئی نبی قتل کیا جاتا ہے تو اُس کے بدلے میں ستر ہزار آدمی مارے جاتے ہیں اور جب کسی خلیفہ کو قتل کیا جاتا ہے تو پینتیس ہزار آدمی مارے جاتے ہیں" (مظہری)

چنانچہ قتل عثمان غنی رضؓ سے جو باہمی خونریزی کا سلسلہ شروع ہوا تھا اُمت میں چلتا ہی رہا ہے۔ اور جیسے اللہ تعالیٰ کی نعمت استخلاف اور استحکام دین کی مخالفت اور ناشکری قاتلانِ عثمان نے کی تھی اُن کے بعد روافض اور خوارج کی جماعتوں نے خلفاء راشدین کی مخالفت میں گروہ بنالئے۔ اسی سلسلے میں حضرت حسین بن علیؓ کی شہادت کا عظیم حادثہ پیش آیا نسأل اللہ الھدایۃ وشکر نعمتہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ

اے ایمان والو اجازت لے کر آئیں تم سے جو تمھارے ہاتھ کے مال ہیں اور جو کہ نہیں

يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ

پہنچے تم میں عقل کی حد کو تین بار فجر کی نماز سے پہلے اور جب

تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۟ؕ ثَلٰثُ

اُتار رکھتے ہو اپنے کپڑے دوپہر میں اور عشاء کی نماز سے پیچھے یہ تین وقت

عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ

بدن کھلنے کے ہیں تمھارے، کچھ تنگی نہیں تم پر اور نہ اُن پر ان وقتوں کے پیچھے، پھرا ہی کرتے ہو

عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ

ایک دوسرے کے پاس یوں کھولتا ہے اللہ تمھارے آگے باتیں اور اللہ

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۸﴾ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا

سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے، اور جب پہنچیں لڑکے تم میں کے عقل کی حد کو تو اُن کو ویسی ہی

كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ۭ
اجازت لینی چاہئے جیسے لیتے رہے ہیں اُن سے اگلے، یوں کھول کر سُناتا ہے اللہ تم کو اپنی باتیں
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاۗءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ
اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور جو بیٹھ رہی ہیں گھروں میں تمہاری عورتیں جنکو توقع نہیں رہی
نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۢ
نکاح کی اُن پر گناہ نہیں کہ اُتار رکھیں اپنے کپڑے یہ نہیں کہ دکھاتی پھریں
بِزِيْنَةٍ ۭ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۶۰﴾
اپنا سنگار اور اس سے بھی بچیں تو بہتر ہے اُنکے لئے اور اللہ سب باتیں سُنتا جانتا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (تمہارے پاس آنے کے لئے) تمہارے مملوکوں کو اور جو تم میں حدِ بلوغ کو نہیں پہنچے اُن کو تین وقتوں میں اجازت لینا چاہئے (ایک تو) نماز صبح سے پہلے اور (دوسرے) جب دو پہر کو (سونے لیٹنے کیلئے) اپنے (زائد) کپڑے اُتار دیا کرتے ہو اور (تیسرے) نماز عشاء کے بعد یہ تین وقت تمہارے پردے کے ہیں (یعنی یہ اوقات چونکہ عام عادت کے مطابق تخلیہ اور آرام کے ہیں، جسمیں آدمی بے تکلفی سے رہنا چاہتا ہے اور تنہائی میں کسی وقت اعضائے مستورہ بھی کھل جاتے ہیں، یا کسی ضرورت سے کھولے جاتے ہیں اسلئے اپنے مملوک غلاموں لونڈیوں کو اور اپنے نابالغ بچوں کو سمجھادو کہ بے اطلاع اور بغیر اجازت لئے ہوئے ان اوقات میں تمہارے پاس نہ آیا کریں اور) ان اوقات کے علاوہ نہ (تو بلا اجازت آنے دینے اور منع نہ کرنے میں) تم پر کوئی الزام ہے اور نہ (بلا اجازت چلے آنے میں) اُن پر کچھ الزام ہے (کیونکہ) وہ بکثرت تمہارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں کوئی کسی کے پاس اور کوئی کسی کے پاس (پس ہر وقت اجازت لینے میں تکلیف ہے اور چونکہ یہ وقت پردے کے نہیں ہیں اسلئے ان میں اپنے اعضاء مستورہ کو چھپائے رکھنا کچھ مشکل نہیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے (اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے اور جس وقت تم میں کے (یعنی احرار میں کے) وہ لڑکے (جن کا اوپر حکم آیا ہے) حدِ بلوغ کو پہنچیں (یعنی بالغ یا قریب بلوغ ہو جاویں) تو ان کو بھی اسی طرح اجازت لینا چاہئے جیسا ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے) لوگ اجازت لیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے اور (ایک بات یہ جاننا چاہئے کہ پردہ کے احکام میں شدت فتنہ کے خوف پر مبنی ہے جہاں فتنہ کا عادۃً احتمال نہ ہو مثلاً جو) بڑی بوڑھی عورتیں جنکو (کسی کے) نکاح (میں آنے) کی اُمید نہ رہی ہو (یعنی وہ محل رغبت

نہیں رہیں یہ تفسیر ہے بڑی بوڑھی ہونے کی) اُن کو اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے (زائد) کپڑے (جس سے چہرہ وغیرہ چھپا رہتا ہے غیر محرم کے روبرو بھی) اُتار رکھیں بشرطیکہ زینت (کے مواقع) کا اظہار نہ کریں (جن کا ظاہر کرنا غیر محرم کے سامنے بالکل ناجائز ہے پس مُراد اس سے چہرہ، ہتھیلیاں اور بقول بعض دونوں قدم بھی، بخلاف جوان عورت کے کہ بوجہ احتمال فتنہ اسکے چہرہ وغیرہ کا بھی پردہ ضروری ہے) اور (اگرچہ بڑی بوڑھی عورتوں کے لئے غیر محرموں کے سامنے چہرہ کھولنے کی اجازت ہے لیکن) اس سے بھی احتیاط رکھیں تو انکے لئے اور زیادہ بہتر ہے (کیونکہ اوّل تو "ہر گندہ پیرے را گندہ خورے" مثل مشہور ہے دوسرے بالکل ہی بے پردگی کا سدِّ باب مقصود ہے) اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سُنتا سب کچھ جانتا ہے۔

معارف و مسائل

شروع سورت میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ سورۂ نور کے بیشتر احکام بے حیائی اور فواحش کے انسداد کے لئے آئے ہیں اور اُنھیں کی مناسبت سے کچھ احکام آداب معاشرت اور ملاقات باہمی کے بھی بیان ہوئے ہیں۔ پھر عورتوں کے پردے کے احکام بیان کئے گئے۔

اقارب و محارم کے لئے خاص اوقات میں استیذان کا حُکم آداب معاشرت اور ملاقات باہمی کے آداب اس سے پہلے اسی سورت کی آیت ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹ میں احکام استیذان کے عنوان سے بیان ہوئے ہیں کہ کسی سے ملاقات کو جاؤ تو بغیر اجازت لئے اُسکے گھر میں داخل نہ ہو۔ گھر زنانہ ہو یا مردانہ آنے والا مرد ہو یا عورت سب کے لئے کسی کے گھر میں جانے سے پہلے اجازت کو واجب قرار دیا گیا ہے مگر یہ احکام استیذان اجانب کے لئے تھے جو باہر سے ملاقات کے لئے آئے ہوں۔

آیاتِ مذکورہ میں ایک دوسرے استیذان کے احکام کا بیان ہے جنکا تعلق اُن اقارب اور محارم سے ہے جو عموماً ایک گھر میں رہتے اور ہر وقت آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور اُن سے عورتوں کا پردہ بھی نہیں ایسے لوگوں کے لئے بھی اگرچہ گھر میں داخل ہونے کے وقت اسکا حکم ہے کہ اطلاع کر کے یا کم از کم قدموں کی آہٹ کو ذرا تیز کر کے یا کھانس کھنکار کر گھر میں داخل ہوں اور یہ استیذان ایسے اقارب کے لئے واجب نہیں مستحب ہے جس کو ترک کرنا مکروہ تنزیہی ہے تفسیر مظہری میں ہے من اراد الدخول فی بیت نفسه وفیه محرماته یکره له الدخول فیه من غیر استیذان تنزیها لاحتمال رؤیة واحدة منهن عریانة وهو احتمال ضعیف ومقتضاه التنزه (مظہری) یہ حکم تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے کا تھا لیکن گھر میں داخل ہو کر پھر یہ سب ایک جگہ ایک دوسرے کے سامنے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں اُن کے لئے تین خاص اوقات میں جو انسان کے خلوت

میں رہنے کے اوقات ہیں ایک اور استیذان کا حکم ان آیات میں دیا گیا ہے وہ تین اوقات صبح کی نماز سے پہلے اور دوپہر کو آرام کرنے کے وقت اور عشاء کی نماز کے بعد کے اوقات ہیں ان میں محارم اور اقارب کو یہاں تک کہ سمجھدار نابالغ بچوں اور مملوکہ لونڈیوں کو بھی اس استیذان کا پابند کیا گیا ہے کہ ان تین اوقات خلوت میں انمیں سے بھی کوئی کسی کی خلوتگاہ میں بغیر اجازت کے نہ جائے کیونکہ ایسے اوقات میں ہر انسان آزاد بے تکلف رہنا چاہتا ہے زائد کپڑے بھی اُتار دیتا ہے اور کبھی اپنی بیوی کے ساتھ بے تکلف اختلاط میں مشغول ہوتا ہے ان اوقات میں کوئی ہوشیار بچہ یا گھر کی کوئی عورت یا اپنی اولاد میں سے کوئی بغیر اجازت کے اندر آجائے تو بسا اوقات وہ ایسی حالت میں پائیگا جس کے ظاہر ہونے سے انسان شرماتا ہے اسکو سخت تکلیف پہنچے گی اور کم از کم اسکی بے تکلفی اور آرام میں خلل پڑنا تو ظاہر ہی ہے اس لئے آیاتِ مذکورہ میں اُن کے لئے خصوصی استیذان کے احکام آئے ہیں کہ ان تین وقتوں میں کوئی کسی کے پاس بغیر اجازت کے نہ جائے۔ ان احکام کے بعد پھر یہ بھی فرمایا کہ

لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ، یعنی ان وقتوں کے علاوہ کوئی مضائقہ نہیں کہ ایک دوسرے کے پاس بلا اجازت جایا کریں کیونکہ وہ اوقات عموماً ہر شخص کے کام کاج میں مشغول ہونے اور اعضائے مستورہ کو چھپائے رہنے کے ہیں جنہیں عادۃً آدمی بیوی کیساتھ اختلاط بھی نہیں کرتا۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں بالغ مرد و عورت کو استیذان کا حکم دینا تو ظاہر ہے مگر نابالغ بچے جو شرعاً کسی حکم کے مکلف نہیں انکو بھی اس حکم کا پابند کرنا بظاہر اُصول کیخلاف ہے۔ جواب یہ ہے کہ اسکے مخاطب دراصل بالغ مرد و عورت ہیں کہ وہ چھوٹے بچوں کو بھی سمجھا دیں کہ ایسے وقت میں بغیر پوچھے اندر نہ آیا کرو۔ جیسے حدیث میں ہے کہ بچوں کو جب وہ سات سال کے ہوجائیں تو نماز سکھاؤ اور پڑھنے کا حکم دو اور دس سال کی عمر کے بعد اُن کو سختی سے نماز کا پابند کرو نہ مانیں تو مارکر نماز پڑھاؤ۔ اسی طرح اس استیذان کا اصل حکم بالغ مرد و عورت کو ہے۔ اور مذکورہ جملے میں جو یہ الفاظ ہیں کہ ان وقتوں کے علاوہ دوسرے اوقات میں نہ تم پر جُناح ہے کہ اُن کو بلا اجازت آنے دو اور نہ ان پر کوئی جُناح ہے کہ وہ بلا اجازت آجائیں اسمیں اگرچہ لفظ جُناح آیا ہے جو عموماً گناہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مگر کبھی مطلقاً حرج اور مضائقہ کے معنے میں بھی آتا ہے یہاں لَا جُنَاحَ کے معنی یہی ہیں کہ کوئی مضائقہ اور تنگی نہیں ہے اس سے بچوں کے مکلف اور گنہگار ہونے کا شبہ ختم ہوگیا۔ (بیان القرآن)

مسئلہ: آیتِ مذکورہ میں جو اَلَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کا لفظ آیا ہے جس کے معنے مملوک

غلام اور لونڈی دونوں پر حاوی ہیں۔ انمیں مملوک غلام جو بالغ ہو وہ تو شرعاً اجنبی غیر محرم کے حکم میں ہے۔ اس کی آقا اور مالک عورت کو بھی اس سے پردہ کرنا واجب ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اس لئے یہاں اس لفظ سے مُراد لونڈیاں یا مملوک غلام جو بالغ نہ ہو وہ ہے جو ہر وقت گھر میں آنے جانے کے عادی ہیں۔

مسئلہ: اسمیں علماء و فقہاء کا اختلاف ہے کہ یہ خاص استیذان اقارب کے لئے واجب ہے یا استحبابی حکم ہے اور یہ کہ یہ حکم اب بھی جاری ہے یا منسوخ ہوگیا۔ جمہور فقہاء کے نزدیک یہ آیت محکم غیر منسوخ ہے اور حکم وجوب کے لئے ہے مَردوں کے واسطے بھی عورتوں کے واسطے بھی (قرطبی) لیکن یہ ظاہر ہے کہ اسکے وجوب کی علت اور وجہ وہ ہے جو اوپر بیان ہوچکی ہے کہ ان تین اوقات میں عام آدمی خلوت چاہتا ہے اور اسمیں بسا اوقات اپنی بیوی کیساتھ بھی مشغول ہوتا ہے بعض اوقات اعضائی مستورہ بھی کھلے ہوتے ہیں۔ اگر کچھ لوگ اسکی احتیاط کرلیں کہ ان اوقات میں بھی اعضائی مستورہ کو چھپانے کی عادت ڈالیں اور بیوی سے اختلاط بھی بجز اُس صورت کے نہ کریں کہ کسی کے آنیکا احتمال نہ رہے جیسے عموماً یہی عادت بن گئی ہے تو اس صورتمیں ان پر یہ بھی واجب نہیں رہتا کہ اپنے اقارب اور بچوں کو استیذان کا پابند کریں، اور نہ اقارب پر واجب رہتا ہے۔ البتہ اسکا مستحسن اور مستحب ہونا ہر حال میں ہے۔ مگر عام طور پر عمل اس پر زمانۂ دراز سے متروک سا ہوگیا ہے۔ اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے ایک روایت میں تو اس پر بڑی شدّت کے الفاظ استعمال فرمائے اور ایک روایت میں عمل نہ کرنے والے لوگوں کا کچھ عذر بیان کردیا۔

پہلی روایت ابن کثیر نے بسند ابن ابی حاتم یہ نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ تین آیتیں ایسی ہیں جن پر لوگوں نے عمل کو چھوڑ ہی دیا ہے۔ ایک یہی آیت استیذان یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْکُمُ الَّذِیْنَ مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ جسمیں اقارب اور نابالغ بچوں کو بھی استیذان کی تعلیم ہے دوسری آیت وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَۃَ اُولُوا الْقُرْبٰی ہے جسمیں تقسیم میراث کے وقت وارثوں کو اسکی ہدایت کی گئی ہے کہ اگر مال وراثت تقسیم کرنے کے وقت کچھ ایسے رشتہ دار بھی موجود ہوجاویں جنکا ضابطۂ میراث سے کوئی حصہ نہیں ہے تو اُن کو بھی کچھ دیدیا کرو کہ اُن کی دلشکنی نہ ہو۔ تیسری آیت اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ہے جسمیں بتلایا ہے کہ سب سے زیادہ معزز و مکرم وہ آدمی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ اور آجکل لوگ معزز مکرم اسکو سمجھتے ہیں جس کے پاس پیسہ بہت ہو جسکا مکان کوٹھی بنگلہ شاندار ہو۔ بعض روایات کے الفاظ اسمیں یہ بھی ہیں کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تین آیتوں کے معاملہ میں لوگوں پر شیطان غالب آگیا ہے اور پھر فرمایا کہ میں نے تو اپنی لونڈی کو بھی اسکا پابند کر رکھا ہے کہ ان تین وقتوں میں بغیر اجازت میرے پاس نہ آیا کرے۔

دوسری روایت ابن ابی حاتم ہی کے حوالہ سے حضرت عکرمہ سے یہ منقول ہے کہ دو شخصوں نے حضرت ابن عباسؓ سے اس استیذانِ اقارب کے متعلق سوال کیا کہ اس پر لوگ عمل نہیں کرتے تو ابن عباسؓ نے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ سِتِّیْرٌ یُّحِبُّ السِّتْرَ، یعنی اللہ بہت ستر رکھنے والا ہے اور ستر کی حفاظت کو پسند فرماتا ہے، بات یہ ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت معاشرت بہت سادہ تھی نہ لوگوں کے دروازوں پر پردے تھے نہ گھر کے اندر پردہ دار مسہریاں تھیں اُس وقت کبھی ایسا ہوتا تھا کہ آدمی کا نوکر یا بیٹا بیٹی اچانک آجاتے اور یہ آدمی اپنی بیوی کے ساتھ مشغول ہوتا، اس لئے اللہ جل شانہٗ نے ان آیات میں تین وقتوں میں استیذان کی پابندی لگا دی تھی۔ اور اب چونکہ دروازوں پر پردے اور گھر میں پردہ دار مسہریاں ہونے لگیں اس لئے لوگوں نے یوں سمجھ لیا کہ بس یہ پردہ کافی ہے اب استیذان کی ضرورت نہیں (ابن کثیر نے یہ روایت نقل کر کے فرمایا ہے ھذا اسناد صحیح الی ابن عباس)۔ بہرحال حضرت ابن عباسؓ کی اس دوسری روایت سے اتنی بات نکلتی ہے کہ جب اسطرح کے واقعات کا اندیشہ نہ ہو کہ آدمی بیوی کیساتھ مشغول یا اعضائے مستورہ کھولے ہوئے ہو اور کسی کے آنیکا احتمال ہو ایسے حالات میں کچھ مساہلت ہے۔ لیکن

قرآن نے پاکیزہ معاشرت کی تعلیم دی ہے

کہ کوئی کسی کی آزادی میں خلل انداز نہ ہو سب آرام و راحت سے رہیں جو لوگ اس طرح کے استیذان کا گھر والوں کو پابند نہیں بناتے وہ خود تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں، اپنی ضرورت و خواہش کا کام کرنے میں تنگی برتتے ہیں۔

عورتوں کے احکام پردہ کی تاکید اور اُسمیں سے ایک اور استثناء

اس سے پہلے عورتوں کے حجاب اور پردہ کے احکام دو آیتوں میں مفصل آچکے ہیں اور اُن میں دو استثناء بھی ذکر کئے گئے۔ ایک استثناء ناظر یعنی دیکھنے والے کے اعتبار سے، دوسرا استثناء منظور یعنی جس کو دیکھا جائے اُسکے اعتبار سے۔ ناظر کے اعتبار سے تو محارم کو اور اپنی مملوکہ کنیزوں نابالغ بچوں کو مستثنیٰ کیا گیا تھا اور منظور یعنی جس چیز کو نظروں سے چھپانا مقصود ہے اُسکے اعتبار سے زینت ظاھرہ کو مستثنیٰ کیا گیا جسمیں اُوپر کے کپڑے برقع یا بڑی چادر باتفاق مُراد ہیں اور بعض کے نزدیک عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں بھی اس استثناء میں داخل ہیں۔

یہاں اگلی آیت میں ایک تیسرا استثناء عورت کے شخصی حال کے اعتبار سے یہ کیا گیا کہ جو عورت بڑی بوڑھی ایسی ہوجاوے کہ نہ اُس کیطرف کسی کو رغبت ہو اور نہ وہ نکاح کے قابل ہو تو اُسکے لئے پردہ کے احکام میں یہ سہولت دیدی گئی ہے کہ اجانب بھی اسکے حق میں مثل محارم کے ہوجاتے ہیں جن اعضاء کا چھپانا اپنے محرموں سے ضروری نہیں ہے اس بوڑھی عورت کے لئے غیر مردوں غیر محرموں سے بھی اُن کا چھپانا ضروری نہیں۔ اسلئے فرمایا وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاۗءِ الّٰتِیْ، الآیۃ جسکی

مختصر تفسیر اوپر گزر چکی ہے مگر ایسی بڑی بوڑھی عورت کے لئے بھی ایک قید تو یہ ہے کہ جو اعضاء محرم کے سامنے کھولے جائیں یہ عورت غیر محرم کے سامنے بھی کھول سکتی ہے بشرطیکہ بن سنور کر زینت کر کے نہ بیٹھے۔ دوسری بات آخر میں یہ فرمائی وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ، یعنی اگر وہ غیر محرموں کے سامنے آنے سے بالکل ہی بچیں تو یہ اُن کے لئے بہتر ہے۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى
نہیں ہے اندھے پر کچھ تکلیف اور نہ لنگڑے پر تکلیف اور نہ بیمار
الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ
پر تکلیف اور نہیں تکلیف تم لوگوں پر کہ کھاؤ اپنے گھروں سے یا
بُيُوْتِ اٰبَاۗىِٕكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ
اپنے باپ کے گھر سے یا اپنی ماں کے گھر سے یا اپنے بھائی کے گھر سے یا اپنی
اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ
بہن کے گھر سے یا اپنے چچا کے گھر سے یا اپنی پھوپھی کے گھر سے یا اپنے ماموں کے گھر سے
اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ
یا اپنی خالہ کے گھر سے یا جس گھر کی کنجیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوست کے گھر سے، نہیں گناہ تم پر
جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ۭ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓي
کہ کھاؤ آپس میں مل کر یا جدا ہو کر پھر جب کبھی جانے لگو گھروں میں تو سلام کہو اپنے
اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
لوگوں پر نیک دعا ہے اللہ کے یہاں سے برکت والی ستھری یوں کھولتا ہے
اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ۶۱ ع
اللہ تمہارے آگے اپنی باتیں تاکہ تم سمجھ لو

خلاصۂ تفسیر

(اگر تم کسی اندھے لنگڑے بیمار غریب کو اپنے کسی عزیز یا ملاقاتی کے گھر لیجا کر کچھ کھلا پلا دو، یا خود کھا پی لو تو جب یہ یقینی طور پر معلوم ہو کہ وہ عزیز ملاقاتی ہمارے کھانے اور کھلانے پر راضی ہوگا اسکو کوئی تکلیف نہ ہوگی تو ان صورتوں میں) نہ تو اندھے آدمی کے لئے کوئی مضائقہ ہے اور نہ لنگڑے آدمی کے لئے اور نہ بیمار آدمی کے لئے کچھ مضائقہ ہے اور نہ خود تمھارے لئے اس بات میں (کچھ مضائقہ ہے

کہ تم (خواہ خود یا تم مع اُن معذورین کے سب) اپنے گھروں سے (جن میں بی بی۔ اولاد کے گھر بھی آگئے) کھانا کھالو یا (اُن گھروں میں جنکا ذکر آگے آتا ہے کھالو، یعنی نہ تم کو خود کھانے میں گناہ ہے اور نہ اُن معذورین کو کھلانے میں۔ اسی طرح تمھارے کھلا دینے سے اُن معذورین کو بھی کھا لینے میں کوئی گناہ نہیں اور وہ گھر یہ ہیں۔ مثلاً) اپنے باپ کے گھر سے (کھالو کھلا دو) یا اپنی ماؤں کے گھر سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا اُن گھروں سے جنکی کنجیاں تمھارے اختیار میں ہیں یا اپنے دوستوں کے گھروں سے (پھر اسمیں بھی) کہ سب مل کر کھاؤ یا الگ الگ۔ پھر (یہ بھی معلوم کر رکھو کہ) جب تم گھروں میں جانے لگو تو اپنے لوگوں کو (یعنی وہاں جو مسلمان ہوں اُنکو) سلام کر لیا کرو (جو کہ) دُعا کے طور پر ہے اور) جو خدا کی طرف سے مقرر ہے اور (بوجہ اسپر ثواب ملنے کے) برکت والی (اور بوجہ مخاطب کا دل خوش کرنے کے) عمدہ چیز ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے (اپنے) احکام بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو (اور عمل کرو)۔

معارف و مسائل

گھروں میں داخل ہونے کے بعد کے بعض احکام اور آدابِ معاشرت پچھلی آیتوں میں کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے استیذان کرنے کا حکم آیا ہے۔ اس آیت میں وہ احکام و آداب مذکور ہیں جو اجازت ملنے پر گھر میں جانے کے بعد مستحب یا واجب ہیں۔ اس آیت کا مفہوم اور اسمیں مذکورہ احکام کو سمجھنے کے لئے پہلے اُن حالات کو معلوم کر لینا مناسب ہے جن میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

قرآن کریم اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عام تعلیمات میں حقوق العباد کی حفاظت و رعایت کے لئے جتنی تاکیدات آئی ہیں اُن سے کوئی مسلمان بے خبر نہیں۔ کسی دوسرے کے مال میں بغیر اُسکی اجازت کے کوئی تصرف کرنے پر سخت وعیدیں آئی ہیں۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لئے ایسے خوش نصیب لوگوں کو چن لیا تھا کہ وہ اللہ و رسولؐ کے فرمان پر ہر وقت گوش برآواز رہتے اور ہر حکم کی تعمیل میں اپنی پوری توانائی صرف کرتے تھے۔ قرآنی تعلیمات پر عمل اور اُسکے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت کیمیا اثر سے اللہ تعالےٰ نے ایک ایسی جماعت تیار کر دی تھی کہ فرشتے بھی اُن پر فخر کرتے ہیں۔ دوسروں کے مال میں اُن کی مرضی و اجازت کے بغیر ادنیٰ قسم کا تصرف گوارا نہ ہونا کسی کو ادنیٰ سی تکلیف پہنچانے سے پرہیز کرنا اور اسمیں تقویٰ کے اعلیٰ معیار پر قائم ہونا سبھی صحابہ کا وصف تھا۔ اسی سلسلے کے چند واقعات عہدِ رسالت میں پیش آئے جن کی وجہ سے آیتِ مذکورہ کے احکام نازل ہوئے۔ حضرات مفسرین نے یہ سب واقعات

لکھے ہیں کسی نے اُنمیں سے کسی کو شانِ نزول قرار دیا کسی نے کسی دوسرے واقعہ کو مگر صحیح بات یہ ہے کہ ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں، یہ مجموعہ واقعات ہی اس آیت کا شانِ نزول ہے۔ واقعات یہ ہیں۔

(۱) امام بغویؒ نے حضرت سعید بن جبیر اور ضحاک ائمہ تفسیر سے نقل کیا ہے کہ دُنیا کی عرف عام اور اکثر لوگوں کی طبائع کا حال یہ ہے کہ لنگڑے لولے اندھے اور بیمار آدمی کیساتھ بیٹھ کر کھانے سے گھن کرتے ہیں اور ناپسند کرتے ہیں حضرات صحابہ میں سے جو ایسے معذور تھے اُن کو یہ خیال ہوا کہ ہم کسی کیساتھ کھانے میں شریک ہونگے تو شاید اسکو تکلیف ہو اسلئے یہ لوگ تندرست آدمیوں کیساتھ کھانے میں شرکت سے گریز کرنے لگے نیز نابینا آدمی کو یہ بھی فکر ہوئی کہ جب چند آدمی کھانے میں شریک ہوں تو تقاضائے عدل و مروّت یہ ہے کہ کوئی شریک دوسرے سے زیادہ نہ کھائے سب کو برابر حصہ ملے اور میں نابینا ہونے کی وجہ سے اسکا اندازہ نہیں کرسکتا ممکن ہے کہ میں دوسروں سے زیادہ کھالوں اسمیں دوسروں کی حق تلفی ہوگی۔ لنگڑے آدمی نے خیال کیا کہ عام تندرست لوگوں کی طرح بیٹھ نہیں سکتا دو آدمی کی جگہ لیتا ہوں، کھانے پر دوسروں کیساتھ بیٹھونگا تو ممکن ہے اُنکو تنگی اور تکلیف پیش آئے، انکی اس غایت احتیاط میں ظاہر ہے کہ خود انکو تنگی اور تکلیف پیش آتی تھی اسلئے یہ آیت نازل ہوئی جس میں اُن کو دوسروں کیساتھ ملکر کھانے کی اجازت اور ایسی دقیق احتیاط کو چھوڑنے کی تلقین فرمائی جس سے تنگی میں پڑ جائیں۔ اور بغوی نے بروایت ابن جریر حضرت ابن عباسؓ سے ایک دوسرا واقعہ نقل کیا ہے جو واقعہ مذکورہ کا دوسرا رُخ ہے وہ یہ کہ قرآن کریم کی جب یہ آیت نازل ہوئی لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ، یعنی نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر۔ تو لوگوں کو اندھے، لنگڑے بیمار لوگوں کے ساتھ ملکر کھانے میں یہ تردد پیش آنے لگا کہ بیمار تو عادۃً کم کھاتا ہے، نابینا کو کھانے کی چیزوں میں یہ امتیاز نہیں ہوتا کہ کونسی چیز عمدہ ہے لنگڑے کو اپنی نشست ہموار نہ ہونے کے سبب کھانے میں تکلف ہوتا ہے تو ممکن ہے کہ یہ لوگ کم کھائیں ہمارے پاس زیادہ آجائے تو ان کی حق تلفی ہوئی کیونکہ مشترک کھانے میں سب کا حصہ مساوی ہونا چاہئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جسمیں اس تعمق اور تکلف میں پڑنے سے اُن کو آزاد کر دیا گیا کہ سب ملکر کھاؤ معمولی کمی بیشی کی فکر نہ کرو۔ اور سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ مسلمان جب کسی جہاد و غزوہ کے لئے جاتے تو اپنے گھروں کی کنجیاں ان معذوروں کے سپرد کردیتے تھے اور یہ کہدیتے تھے کہ گھر میں جو کچھ ہے وہ تم لوگ کھا پی سکتے ہو۔ مگر یہ لوگ اس احتیاط کی بنا پر اُن کے گھروں میں سے کچھ نہ کھاتے کہ شاید اُن کی منشا کیخلاف خرچ ہو جائے۔ اسپر یہ آیت نازل ہوئی۔ مسند بزار میں بسند صحیح حضرت عائشہؓ سے بھی یہی مضمون نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ میں تشریف لیجاتے تو عام صحابہؓ کی دلی خواہش یہ ہوتی تھی کہ سب آپکی رفاقت میں شریک جہاد ہوں اور اپنے مکانوں کی کنجیاں اُن غریب معذورین کے سپرد کردیتے تھے اور اُن کو اجازت دیتے تھے کہ ہمارے پیچھے آپ ہمارے گھر میں جو کچھ ہے

کھا پی سکتے ہو مگر یہ لوگ غایت تقویٰ سے اس اندیشہ پر کہ شاید اُن کی یہ اجازت بطیب خاطر نہ ہو اس سے پرہیز کرتے تھے۔ بغوی نے حضرت ابن عباس رضؓ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آیت مذکورہ میں جو لفظ صدیقکم آیا ہے یعنی اپنے دوست کے گھر سے بھی کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں ۔ یہ حارث بن عمروؓ کے واقعہ میں نازل ہوا کہ وہ کسی جہاد میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے گئے اور اپنے دوست مالک بن زیدؓ کو اپنے گھر اور گھر والوں کی نگرانی سپرد کر دی، جب حارثؓ واپس آئے تو دیکھا کہ مالک بن زیدؓ بہت ضعیف کمزور ہو رہے ہیں وجہ دریافت کرنے پر انھوں نے کہا کہ میں نے آپکے گھر سے کچھ کھانا آپکے پیچھے مناسب نہیں سمجھا (یہ سب روایات تفسیر مظہری میں ہیں) اور صاف بات یہی ہے کہ اس قسم کے تمام واقعات اس آیت کے نزول کا سبب ہوئے ہیں۔

مسئلہ: جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جن گھروں میں سے بغیر اجازت خاص کے کھانے پینے کی اجازت اس آیت میں دی گئی ہے اسکی بناء اس پر ہے کہ عرب کی عام عادت کیمطابق ایسے قریبی رشتہ داروں میں کوئی تکلف بالکل نہ تھا ایک دوسرے کے گھر سے کچھ کھاتے پیتے تو گھر والے کو کسی قسم کی تکلیف یا ناگواری نہ ہوتی تھی بلکہ وہ اس سے خوش ہوتا تھا۔ اسی طرح اس سے بھی کہ وہ اپنے ساتھ کسی معذور بیمار مسکین کو بھی کھلادے۔ ان سب چیزوں کی گو صراحۃً اجازت نہ دی ہو مگر عادۃً اجازت تھی اس علتِ جواز سے ثابت ہوا کہ جس زمانے یا جس مقام میں ایسا رواج نہ ہو اور مالک کی اجازت مشکوک ہو وہاں بغیر صریح اجازت مالک کے کھانا پینا حرام ہے۔ جیسا کہ آجکل عام طور پر نہ یہ عادت رہی نہ کوئی اسکو گوارہ کرتا ہے کہ کوئی عزیز قریب اُسکے گھر میں جو چاہے کھائے پیئے یا دوسروں کو کھلائے پلائے اسلئے آجکل عام طور پر اس اجازت پر عمل کرنا جائز نہیں بجز اسکے کہ کسی دوست عزیز کے متعلق کسی کو یقینی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اسکے کھانے پینے یا دوسروں کو کھلانے پلانے سے کوئی تکلیف یا ناگواری محسوس نہ کریگا بلکہ خوش ہوگا تو خاص اسکے گھر سے کھانے پینے میں اس آیت کے مقتضیٰ پر عمل جائز ہے۔

مسئلہ: مذکورہ بیان سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا بلکہ حکم اوّل سے آج تک جاری ہے البتہ شرط اسکی مالک کی اجازت کا یقین ہے جب یہ نہ ہو تو وہ مقتضائے آیت میں داخل ہی نہیں۔ (مظہری)

مسئلہ: اسی طرح اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ حکم صرف ان مخصوص رشتہ داروں ہی میں منحصر نہیں بلکہ دوسرے شخص کے بارے میں اگر یہ یقین ہو کہ اُسکی طرف سے ہمارے کھانے پینے اور کھلانے پلانے کی اجازت ہے وہ اس سے خوش ہوگا اسکو کوئی تکلیف نہ پہنچے گی تو اسکا بھی یہی حکم ہے (مظہری)

احکام مذکورہ کا تعلق اُن کاموں سے ہے جو کسی کے گھر میں باجازت داخل ہونے کے بعد جائز یا مستحب ہیں ان کاموں میں بڑا مسئلہ کھانے پینے کا تھا اُس کو پہلے ذکر فرما دیا۔

دوسرا مسئلہ گھر میں داخل ہونے کے آداب کا یہ ہے کہ جب گھر میں باجازت داخل ہو تو گھر میں جو مسلمان ہوں اُن کو سلام کرو۔ آیت عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ سے یہی مراد ہے کیونکہ مسلمان سب ایک جماعت متحدہ ہیں۔ احادیث کثیرہ صحیحہ میں مسلمان کے باہم ایک دوسرے کو سلام کرنے کی بڑی تاکید اور فضیلت آئی ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ

ایمان والے وہ ہیں جو یقین لائے ہیں اللہ پر اور اسکے رسول پر اور جب ہوتے ہیں اسکے ساتھ کسی

جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ

جمع ہونے کے کام میں تو چلے نہیں جاتے جبتک اس سے اجازت نہ لے لیں، جو لوگ تجھ سے اجازت لیتے ہیں وہی ہیں

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَن

جو مانتے ہیں اللہ کو اور اس کے رسول کو پھر جب اجازت مانگیں تجھ سے اپنے کسی کام کے لئے تو اجازت

لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٦٢﴾ لَّا

دے جس کو ان میں سے تو چاہے اور معافی مانگ اُن کے واسطے اللہ سے، اللہ بخشنے والا مہربان ہے مت

تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُم بَعْضًا ۚ قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ

کر لو بلانا رسول کا اپنے اندر برابر اُسکے جو بلاتا ہے تم میں ایک دوسرے کو اللہ جانتا ہے

الَّذِينَ يَتَسَلَّلُونَ مِنكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ

اُن لوگوں کو تم میں سے جو سٹک جاتے ہیں آنکھ بچا کر سو ڈرتے رہیں وہ لوگ جو خلاف کرتے ہیں

عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦٣﴾ أَلَا

اُسکے حکم کا اس سے کہ آپڑے اُن پر کچھ خرابی یا پہنچے اُن کو عذاب دردناک سنتے ہو

إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ قَدْ يَعْلَمُ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ

اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں اُس کو معلوم ہے جس حال پر تم ہو

وَيَوْمَ يُرْجَعُونَ إِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ

اور جس دن پھیرے جائیں گے اُس کی طرف تو بتائے گا اُن کو جو کچھ اُنھوں نے کیا، اور اللہ ہر ایک

شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٦٤﴾

چیز کو جانتا ہے

ع ۹ ۱۵

خلاصۂ تفسیر

بس مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ پر اور اُسکے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور جب رسول کے پاس

کسی ایسے کام پر جمع ہوتے ہیں جس کے لئے مجمع کیا گیا ہے (اور اتفاقاً وہاں سے کہیں جانے کی ضرورت پڑتی ہے) تو جب تک آپ سے اجازت نہ لیں (اور آپ اس پر اجازت نہ دیدیں مجلس سے اُٹھ کر) نہیں جاتے (اے پیغمبر) جو لوگ آپ سے (ایسے مواقع پر) اجازت لیتے ہیں بس وہی اللہ پر اور اسکے رسول پر ایمان رکھتے ہیں (آگے ایسے لوگوں کو اجازت دینے کا بیان ہے) تو جب یہ (اہل ایمان) لوگ (ایسے مواقع پر) اپنے کسی کام کے لئے آپ سے (جانے کی) اجازت طلب کریں تو ان میں آپ جس کے لئے (مناسب سمجھیں اور اجازت دینا) چاہیں اجازت دیدیا کریں (اور جس کو مناسب نہ سمجھیں اجازت نہ دیں کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ اجازت طلب کرنے والے اُس کام کو ضروری سمجھتے ہوں جس کے لئے اجازت طلب کر رہے ہیں اور وہ واقع میں ضروری نہ ہو یا ضروری بھی ہو مگر اسکے جانے سے اُس سے بڑا کوئی ضرر پیدا ہونیکا خطرہ ہو اسلئے اجازت و عدم اجازت کا فیصلہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا) اور (اجازت دیکر بھی) آپ اُن کے لئے اللہ تعالٰے سے مغفرت کی دُعا کیا کیجئے (کیونکہ اُن کا یہ رخصت چاہنا اگرچہ قوی عذر ہی کیوجہ سے ہو مگر اسمیں دُنیا کو دین پر مقدم رکھنے کی صورت تو لازم آتی ہے جسمیں ایک کوتاہی کا شائبہ ہے اسکے لئے آپ کی دُعاء مغفرت درکار ہے۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ اجازت چاہنے والے نے جس عذر و ضرورت کو قوی سمجھ کر اجازت لی ہے اُسمیں اُس سے خطاء اجتہادی ہوگئی ہو کہ غیر ضروری کو ضروری سمجھ لیا اور یہ خطاء اجتہادی ایسی ہو کہ ذرا غور و تأمل سے رفع ہوسکتی ہو تو ایسی صورتمیں غور و فکر کی کمی بھی ایک کوتاہی ہے اس سے استغفار کی ضرورت ہوئی) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (چونکہ اُن کی نیت اچھی تھی اسلئے ایسے دقائق پر مواخذہ نہیں فرماتا) تم لوگ رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کے بُلانے کو (جب وہ کسی اسلامی ضرورت کے لئے تمکو جمع کریں) ایسا (معمولی بُلانا) مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو بُلالیتا ہے (کہ چاہے آیا یا نہ آیا پھر آکر بھی جب تک چاہا بیٹھا جب چاہا اُٹھ کر بے اجازت چلدیا۔ رسول کا بُلانا ایسا نہیں بلکہ اُنکے اس حکم کی تعمیل واجب ہے اور بے اجازت واپس جانا حرام اور اگر کوئی بلا اجازت چلا گیا تو یہ تو ممکن ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اُسکا جانا مخفی رہ جاوے لیکن یہ یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو (خوب جانتا ہے جو (دوسرے کی) آڑ میں ہوکر تم میں سے (مجلس نبوی سے) کھسک جاتے ہیں تو جو لوگ اللہ کے حکم کی (جو بواسطہ رسول صلے اللہ علیہ وسلم پہنچا ہی) مخالفت کرتے ہیں اُن کو اس سے ڈرنا چاہیئے کہ ان پر (دُنیا میں) کوئی آفت آن پڑے یا اُن پر (آخرت میں) کوئی دردناک عذاب نازل ہو جاوے (اور یہ بھی ممکن ہو کہ دُنیا و آخرت دونوں میں عذاب ہو اور یہ بھی) یاد رکھو کہ جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے اللہ تعالٰے اُس حالت کو بھی جانتا ہے جس پر تم (اب) ہو اور اُس دن کو بھی جس میں سب اُسکے پاس (دوبارہ زندہ کرکے)

لائے جاویں گے تو وہ اُن کو سب جتلا دیگا جو کچھ اُنھوں نے کیا تھا (اور تمھاری موجودہ حالت اور روزِ قیامت ہی کی کچھ تخصیص نہیں) اللہ تعالیٰ (تو) سب کچھ جانتا ہے۔

معارف و مسائل

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے خصوصاً اور عام معاشرت کے بعض آداب و احکام آیاتِ مذکورہ میں دو حکم دیئے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کو کسی دینی جہاد وغیرہ کے لئے جمع کریں تو مقتضائے ایمان یہ ہے کہ سب جمع ہو جاویں اور پھر آپ کی مجلس سے بغیر آپ کی اجازت کے نہ جائیں۔ کوئی ضرورت پیش آئے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے اجازت حاصل کرلیں اور اسمیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہے کہ کوئی خاص حرج اور ضرورت نہ ہو تو اجازت دیدیا کریں! اسی ضمن میں اُن منافقین کی مذمت ہے جو اس تقاضائے ایمان کے خلاف بدنامی سے بچنے کے لئے حاضر تو ہو جاتے ہیں مگر پھر کسی کی آڑ لیکر چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔

یہ آیت غزوۂ احزاب کے موقع پر نازل ہوئی ہے جبکہ مشرکین عرب اور دوسری جماعتوں کے متحدہ محاذ نے یکبارگی مدینہ پر حملہ کیا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بمشورہ صحابہ اُن کے حملے سے بچاؤ کیلئے خندق کھودی تھی اسی لئے اس جہاد کو غزوۂ خندق بھی کہا جاتا ہے یہ غزوہ شوال ۵ھ ہجری میں ہوا ہی (قرطبی) بیہقی اور ابنِ اسحاق کی روایت میں ہے کہ اسوقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود اور تمام صحابہ خندق کھودنے میں مصروفِ کار تھے مگر منافقین اول تو آنے میں سستی کرتے اور پھر آکر بھی معمولی سا کام دکھانے کو کر لیتے اور پھر چپکے سے غائب ہو جاتے تھے اسکے خلاف مؤمنین سب کے سب محنت کیساتھ لگے رہتے اور کوئی مجبوری اور ضرورت پیش آتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لیکر جاتے تھے اسپر یہ آیت نازل ہوئی (مظہری)

ایک سوال و جواب اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے بغیر آپکی اجازت کے چلا جانا حرام ہے حالانکہ صحابۂ کرام کے بیشمار واقعات ہیں جنہیں وہ آپکی مجلس میں ہوتے اور پھر جب چاہتے چلے جاتے تھے اجازت لینا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ جواب یہ ہے کہ یہ عام مجلسوں کا حکم نہیں بلکہ اسوقت کا ہے جبکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انکو کسی ضرورت سے جمع کیا ہو جیسا کہ واقعہ خندق میں ہوا تھا۔ اس تخصیص کیطرف خود آیت کے لفظ عَلٰٓی اَمْرٍ جَامِعٍ میں اشارہ موجود ہے۔

امرِ جامع سے کیا مُراد ہے اسمیں اقوال مختلف ہیں مگر واضح بات یہ ہے کہ امرِ جامع سے مراد وہ کام ہے جس کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کو جمع کرنا ضروری سمجھیں اور کسی خاص کام کے لئے جمع فرمادیں جیسے غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے کا کام تھا (قرطبی۔ مظہری)

یہ حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے ساتھ مخصوص ہے یا عام باتفاق فقہاء چونکہ یہ حکم ایک دینی اور اسلامی ضرورت کے لئے جاری کیا گیا ہے اور ایسی ضرورتیں ہر زمانے میں ہوسکتی ہیں اسلئے آنحضرت

صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مسلمانوں کے ہر امام و امیر جس کے قبضہ میں زمام حکومت ہو اُسکا اور اسکی ایسی مجلس کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ سب کو جمع ہونیکا حکم دیں تو اسکی تعمیل واجب اور واپس جانا بغیر اجازت ناجائز ہے (قرطبی۔ مظہری۔ بیان القرآن) اور یہ ظاہر ہے کہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے لئے یہ حکم زیادہ مؤکد اور اسکی مخالفت کھلی شقاوت ہے جیسے منافقین سے صادر ہوئی۔ اور اسلامی آدابِ معاشرت کے لحاظ سے یہ حکم باہمی اجتماعات اور عام مجلسوں کے لئے بھی کم از کم مستحب اور مستحسن ضرور ہے کہ جب مسلمان کسی مجلس میں کسی اجتماعی معاملہ میں غور کرنے یا عمل کرنے کے لئے جمع ہوئے ہوں تو جب جانا ہو میر مجلس سے اجازت لیکر جائیں۔

دوسرا حکم آخری آیت میں یہ دیا گیا ہے لَا تَجْعَلُوا دُعَاۗءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ الآیۃ اسکی ایک تفسیر تو وہ ہے جو اوپر خلاصہ تفسیر میں بیان کی گئی ہے کہ دُعَاۗءَ الرَّسُوْلِ سے مُراد رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا لوگوں کو بُلانا ہے (جو نحوی قاعدہ سے اضافت الی الفاعل ہے) اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کو بلائیں تو اسکو عام لوگوں کے بُلانے کیطرح نہ سمجھو کہ اسمیں آنے نہ آنیکا اختیار رہتا ہے بلکہ اسوقت آنا فرض ہو جاتا ہے اور بغیر اجازت جانا حرام ہو جاتا ہے۔ آیت کے سیاق و سباق سے یہ تفسیر زیادہ مناسبت رکھتی ہے اسی لئے مظہری اور بیان القرآن میں اسکو اختیار کیا ہے۔ اور اس کی ایک دوسری تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی سے ابن کثیر اور قرطبی وغیرہ نے یہ نقل کی ہے کہ دُعَاۗءَ الرَّسُوْلِ سے مُراد لوگوں کا رسُول صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی کام کے لئے پکارنا اور بلانا ہے (جو نحوی ترکیب میں اضافت الی المفعول ہوگی)۔

اس تفسیر کی بناء پر معنی آیت کے یہ ہونگے کہ جب تم رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی ضرورت سے بُلاؤ یا مخاطب کرو تو عام لوگوں کی طرح آپکا نام لیکر یا محمد نہ کہو کہ بے ادبی ہے بلکہ تعظیمی القاب کے ساتھ یا رسُوْلَ اللہِ۔ یا نبی اللہ وغیرہ کہا کرو۔ اسکا حاصل رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر کا مسلمانوں پر واجب ہونا اور ہر ایسی چیز سے بچنا ہے جو ادب کے خلاف ہو یا جس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچے۔ یہ حکم ایسا ہوگا جیسے سورۂ حجرات میں اسی طرح کے کئی حکم دیئے گئے ہیں مثلاً لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ یعنی جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بات کرو تو ادب کی رعایت رکھو، ضرورت سے زیادہ اونچی آواز سے باتیں نہ کرو جیسے لوگ آپس میں کیا کرتے ہیں اور مثلاً یہ کہ جب آپ گھر میں تشریف رکھتے ہوں تو باہر سے آواز دیکر نہ بلاؤ بلکہ آپکے باہر تشریف لانیکا انتظار کرو اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَاۗءِ الْحُـجُرٰتِ میں اسی کا بیان ہے۔

تنبیہ | اس دوسری تفسیر میں ایک عام ادب بزرگوں اور بڑوں کا بھی معلوم ہوا کہ اپنے بزرگوں بڑوں کو ان کا نام لے کر پکارنا اور بُلانا بے ادبی ہے تعظیمی لقب سے مخاطب کرنا چاہیئے۔

سُورَةُ الفُرْقَانِ

سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سَبْعٌ وَّسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ فرقان مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ستتر آیتیں اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ﴿۱﴾

بڑی برکت ہے اسکی جس نے اُتاری فیصلہ کی کتاب اپنے بندہ پر تاکہ رہے جہان والوں کے لئے ڈرانے والا

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ

وہ کہ جس کی ہے سلطنت آسمان اور زمین میں اور نہیں پکڑا اُس نے بیٹا اور نہیں

يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ﴿۲﴾

کوئی اس کا ساجھی سلطنت میں اور بنائی ہر چیز پھر ٹھیک کیا اُس کو ماپ کر

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ

اور لوگوں نے پکڑ رکھے ہیں اس سے ورے کتنے حاکم جو نہیں بناتے کچھ چیز اور وہ خود بنائے گئے ہیں

وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا

اور نہیں مالک اپنے حق میں بُرے کے اور نہ بھلے کے اور نہیں مالک مرنے کے

وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ﴿۳﴾

اور نہ جینے کے اور نہ جی اُٹھنے کے

خلاصۂ تفسیر

بڑی عالی شان ذات ہے جس نے یہ فیصلہ کی کتاب (یعنی قرآن) اپنے خاص بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرمائی تاکہ وہ تمام دُنیا جہان والوں کے لئے (ایمان نہ لانے کی صورت میں عذاب الٰہی سے) ڈرانے والا ہو، ایسی ذات جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی حکومت حاصل ہے اور اس نے کسی کو (اپنی) اولاد

قرار نہیں دیا اور نہ کوئی اُسکا شریک ہے حکومت میں اور اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر سب کا الگ الگ انداز رکھا (کہ کسی چیز کے آثار و خواص کچھ ہیں کسی کے کچھ ہیں) اور ان مشرکین نے خدا کو چھوڑ کر ادر ایسے معبود قرار دے لئے ہیں جو (کسی طرح معبود ہونے کے قابل نہیں کیونکہ وہ) کسی چیز کے خالق نہیں اور بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور خود اپنے لئے نہ کسی نقصان (کے رفع کرنے) کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ کسی نفع (کے حاصل کرنے) کا اور نہ کسی کے مرنے کا اختیار رکھتے ہیں (کہ کسی جاندار کی جان نکال سکیں) اور نہ کسی کے جینے کا (اختیار رکھتے ہیں کہ کسی بے جان میں جان ڈال دیں) اور نہ کسی کو (قیامت میں) دوبارہ زندہ کرنیکا (اختیار رکھتے ہیں۔ اور جو شخص ان چیزوں پر قدرت نہیں رکھتا وہ معبود نہیں ہوسکتا)

معارف و مسائل

خصوصیات سُورت یہ پُوری سورت جمہور مفسرین کے نزدیک مکّی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ و قتادہ نے تین آیتوں کے متعلق بیان فرمایا کہ یہ مکّی نہیں، مدنی ہیں۔ باقی سورت مکّی ہے اور بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ سُورت مدنی ہے اور اسمیں کچھ آیات مکّی ہیں (قرطبی) اور خلاصہ اس سورت کے مضامین کا قرآن کریم کی عظمت اور رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی حقانیت کا بیان اور دشمنوں کیطرف سے اسپر جو اعتراضات تھے اُن کا جواب ہے۔

تَبٰرَكَ، برکت سے مشتق ہے۔ برکت کے معنے خیر کی کثرت کے ہیں۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہر خیر و برکت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ فرقان، قرآن کریم کا لقب ہے لغوی معنے اسکے تمیز اور فرق کرنے کے ہیں۔ قرآن چونکہ اپنے واضح ارشادات کے ذریعہ حق و باطل میں تمیز اور فرق بتلاتا ہے اور معجزہ کے ذریعہ اہل حق و اہل باطل میں امتیاز کردیتا ہے اسلئے اس کو فرقان کہا جاتا ہے۔

لِلْعٰلَمِيْنَ، اس سے ثابت ہوا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت سارے عالم کیلئے ہے بخلاف پچھلے انبیاء کے کہ اُن کی نبوت و رسالت کسی مخصوص جماعت یا مخصوص مقام کے لئے ہوتی تھی۔ صحیح مسلم کی حدیث میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو اپنے چھ خصوصی فضائل کا ذکر فرمایا ہے اُنمیں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کی بعثت سارے جہان کے لئے عام ہے۔

فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا، تخلیق کے بعد تقدیر کا ذکر فرمایا گیا۔ تخلیق کے معنی تو اتنے ہیں کہ بغیر کسی سابق مادہ وغیرہ کے ایک چیز کو عدم سے وجود میں لایا جائے وہ کیسی بھی ہو۔

مخلوقات میں سے ہر ایک چیز میں خاص خاص حکمتیں اور تقدیر کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو بھی پیدا فرمایا اسکے اجزاء کی ساخت اور شکل و صورت اور آثار و خواص بڑی حکمت کیساتھ اُس کام کے مناسب پیدا کئے جس کام کے لئے اس چیز کو پیدا کیا گیا ہے۔ آسمان کی ساخت اُسکے اجزاء ترکیبی اُسکی

ہیئت اُس کام کے مناسب ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسمان بنایا ہے۔ سیاروں اور ستاروں کی تخلیق میں وہ چیزیں رکھی گئیں جو اُن کے منشاء وجود کے مناسب ہیں۔ زمین اور اسکے پیٹ میں پیدا ہونیوالی ہر چیز جس پر نظر ڈالو ہر ایک کی ساخت، شکل و صورت، نرمی سختی اُس کام کے مناسب بنائی گئی ہے جس کام کے لئے قدرت نے اسکو پیدا کیا ہے۔ زمین کو نہ اتنا رقیق مادہ پانی کی طرح بنایا کہ جو کچھ اُس پر رکھا جائے وہ اسکے اندر ڈوب جائے، نہ اتنا سخت پتھر اور لوہے کی طرح بنایا کہ اسکو کھود نہ سکیں کیونکہ اُس سے یہی ضرورتیں متعلق تھیں کہ اسکو کھود کر پانی بھی نکالا جاسکے۔ اِس میں بنیادیں کھود کر بڑی اونچی عمارتیں اِس پر کھڑی کی جاسکیں۔ پانی کو سیال بنایا جس میں ہزاروں حکمتیں ہیں۔ ہوا بھی سیال ہی ہے مگر پانی سے مختلف، پانی ہر جگہ خود بخود نہیں پہنچتا اُسمیں انسان کو کچھ محنت بھی کرنا پڑتی ہے ہوا کو قدرت نے اپنا جبری انعام بنایا کہ وہ بغیر کسی محنت و عمل کے ہر جگہ پہنچ جاتی ہے بلکہ کوئی شخص ہوا سے بچنا چاہے تو اُس کو اسکے لئے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ یہ جگہ مخلوقاتِ الٰہیہ کی حکمتوں کی تفصیل بیان کرنے کی نہیں۔ ایک ایک مخلوق کو دیکھو انمیں سے ہر ایک قدرت و حکمت کا شاہکار ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی ایک مستقل کتاب اس موضوع پر لکھی ہے بنام الحکمۃ فی مخلوقات اللہ تعالیٰ۔

آن آیات میں شروع ہی سے قرآن کی عظمت اور جس ذاتِ گرامی پر وہ نازل ہوا ہے اُس کو عبدکا کا خطاب دیکر اُس کی عزت و عظمت کا عجیب غریب بیان ہے۔ کیونکہ کسی مخلوق کے لئے اس سے بڑا کوئی شرف نہیں ہو سکتا کہ خالق اُسکو یہ کہدے کہ یہ میرا ہے ؎

بندہ حسن بصد زباں گفت کہ بندۂ توام ❊ تو بزبانِ خود بگو بندہ نواز کیستی

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ

اور کہنے لگے جو منکر ہیں اور کچھ نہیں ہے یہ مگر طوفان باندھ لایا ہے اور ساتھ دیا ہے

عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ④ وَقَالُوْٓا

اسکا اس میں اور لوگوں نے سو آگئے بے انصافی اور جھوٹ پر اور کہنے لگے

اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ⑤

یہ نقلیں ہیں پہلوں کی جن کو اُس نے لکھ رکھا ہے سو وہی لکھوائی جاتی ہیں اسکے پاس صبح اور شام

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ

تو کہہ اسکو اتارا ہے اُسنے جو جانتا ہے چھپے ہوئے بھید آسمانوں میں اور زمین میں بیشک وہ

غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ⑥ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ

بخشنے والا مہربان ہے اور کہنے لگے یہ کیسا رسول ہے کھاتا ہے کھانا

منزل ۴

وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ۙ

اور پھرتا ہے بازاروں میں کیوں نہ اُترا اس کی طرف کوئی فرشتہ کہ رہتا اس کے ساتھ ڈرانے کو

اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ

یا آپڑتا اس کے پاس خزانہ یا ہو جاتا اسکے لئے ایک باغ کہ کھایا کرتا اس میں سے، اور کہنے لگے بے انصاف

اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ

تم پیروی کرتے ہو اس ایک مرد جادو مارے کی دیکھ کیسی بٹھلاتے ہیں تجھ پر

الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝

مثلیں سو بہک گئے اب پا نہیں سکتے راستہ

ع ۱ / ۹ / ۱۶

خلاصۂ تفسیر

اور کافر لوگ (قرآن کے بارے میں) یوں کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) تو کچھ بھی نہیں نرا جھوٹ (ہی جھوٹ) ہے جس کو اس شخص (یعنی پیغمبر) نے گھڑ لیا ہے اور دوسرے لوگوں نے اس (گھڑت) میں اس کی مدد کی ہے (مُراد وہ اہل کتاب ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے یا آپ کی خدمت میں ویسے ہی حاضر ہوا کرتے تھے) سو (ایسی بات کہنے سے) یہ لوگ بڑے ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوئے (اس کا ظلم اور جھوٹ ہونا آگے بیان میں آئے گا) اور یہ (کافر) لوگ (اپنے اسی اعتراض کی تائید میں) یوں کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) بے سند باتیں ہیں جو اگلے لوگوں سے منقول ہوتی چلی آئی ہیں جن کو اس شخص (پیغمبر) نے (عمدہ عبارت میں سوچ سوچ کر اپنے صحابہ کے ہاتھ سے) لکھوا لیا ہے (تاکہ محفوظ رہے) پھر وہی (مضامین) اس کو صبح شام پڑھ کر سنائے جاتے ہیں (تاکہ یاد رہیں، پھر وہی یاد کئے ہوئے مضامین مجمع میں بیان کر کے خدا کی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں) آپ (اسکے جواب میں) کہہ دیجئے کہ اس (قرآن) کو تو اس ذات (پاک) نے اُتارا ہے جس کو سب چھپی باتوں کی خواہ وہ آسمانوں میں ہوں یا زمین میں ہوں خبر ہے (خلاصہ جواب کا یہ ہے کہ اس کلام کا اعجاز اس کی کھلی دلیل ہے کہ کفار کا یہ اعتراض غلط اور جھوٹ اور ظلم ہے کیونکہ اگر قرآن اساطیر الاولین، یعنی پرانے لوگوں کی کہانیاں ہوتا یا کسی دوسرے کی مدد سے تصنیف کیا گیا ہوتا تو ساری دنیا اس کی مثال لانے سے عاجز کیوں ہوتی) واقعی اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے (اس لئے ایسے ایسے جھوٹ اور ظلم پر فوری سزا نہیں دیتا)۔

اور یہ کافر لوگ (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت) یوں کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہوا کہ وہ (ہماری طرح) کھانا (بھی) کھاتا ہے اور (انتظام معاش کے لئے ہماری ہی طرح) بازاروں میں چلتا پھرتا ہے (مطلب یہ ہے کہ رسول نہ پیغمبر انسان کے بجائے فرشتہ ہونا چاہیئے جو کھانے

پینے وغیرہ کی ضروریات سے مستغنی ہو اور کم از کم اتنا تو ضرور ہی ہونا چاہیئے کہ رسُول اگر خود فرشتہ نہیں ہے تو اسکا مصاحب مشیر کوئی فرشتہ ہونا چاہیئے اسلئے کہا کہ) اس (رسُول) کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا کہ وہ اسکے ساتھ رہ کر (لوگوں کو عذابِ الٰہی سے) ڈراتا (اور اگر یہ بھی نہ ہوتا تو کم از کم رسُول کو اپنے کھانے پینے کی ضروریات سے تو بے فکری ہوتی اس طرح) کہ اسکے پاس (غیب سے) کوئی خزانہ آ پڑتا یا اسکے پاس کوئی باغ ہوتا جس سے یہ کھایا پیا کرتا۔ اور (مسلمانوں سے) یہ ظالم یوں (بھی) کہتے ہیں کہ (جب انکے پاس نہ کوئی فرشتہ ہے نہ خزانہ نہ باغ، اور پھر بھی یہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عقل میں فتور ہے اسلئے) تم لوگ ایک مسلوب العقل آدمی کی راہ پر چل رہے ہو۔ (اے محمد صلے اللہ علیہ سلم) دیکھئے تو یہ لوگ آپ کے لئے کیسی عجیب عجیب باتیں بیان کر رہے ہیں سو (ان خرافات سے) وہ (بالکل) گمراہ ہوگئے پھر وہ راہ نہیں پاسکتے۔

معارف و مسائل

کفار و مشرکین جو آنحضرت صلے اللہ علیہ سلم کی نبوت اور قرآن پر اعتراضات کیا کرتے تھے یہاں سے اُن کے اعتراضات اور پھر جوابات کا سلسلہ شروع ہو کر کچھ دُور تک چلا ہے۔

پہلا اعتراض یہ تھا کہ قرآن کوئی اللہ کیطرف سے نازل کیا ہوا کلام نہیں بلکہ آپ نے اس کو خود ہی جھوٹ گھڑ لیا ہے یا پچھلے لوگوں کے قصّے یہود و نصاریٰ وغیرہ سے سُن کر اپنے صحابہؓ سے لکھوا لیتے ہیں اور چونکہ خود اُمّی ہیں، نہ لکھنا جانتے ہیں نہ پڑھنا اسلئے ان لکھے ہوئے قصوں کو صبح شام سُنتے رہتے ہیں تاکہ وہ یاد ہو جاویں پھر لوگوں کے سامنے جاکر یہ کہدیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس اعتراض کا جواب قرآن کریم نے یہ دیا قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہ کلام خود اسکا شاہد ہے کہ اس کی نازل کرنیوالی وہ ذات پاک حق تعالیٰ کی ہے جو آسمانوں اور زمین کے سب خفیہ رازوں سے واقف و باخبر ہے۔ اسی لئے قرآن کو ایک کلام معجز بنایا اور ساری دُنیا کو چیلنج کیا کہ اگر اسکو تم خدا کا کلام نہیں مانتے کسی انسان کا کلام سمجھتے ہو تو تم بھی انسان ہو اس جیسا کلام زیادہ نہیں تو ایک سورۃ بلکہ ایک آیت ہی بنا کر دکھلا دو اور یہ چیلنج جسکا جواب دینا عرب کے فصیح و بلیغ لوگوں کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں مگر اُنھوں نے اس سے اِفرار اختیار کی۔ کسی کو اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ قرآن کی ایک آیت کے مقابلہ میں اُس جیسی دوسری آیت لکھ لائے۔ حالانکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ سلم کی مخالفت میں اپنا مال و متاع بلکہ اپنی اولاد اور اپنی جان تک خرچ کرنے کو تیار ہوگئے۔ یہ مختصر سی بات نہ کرسکے کہ قرآن کی مثل ایک سورت لکھ لاتے

یہ دلیل واضح اس امر کی ہے کہ یہ کلام کسی انسان کا نہیں، ورنہ دوسرے انسان بھی ایسا کلام لکھ سکتے، صرف اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہی کا ہے۔ علاوہ فصاحت و بلاغت کے اسکے تمام معانی و مضامین بھی ایسے علوم پر مشتمل ہیں جو اس ذات کی طرف سے ہو سکتے ہیں جو ہر ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے (اس مضمون کی پوری تفصیل سورۂ بقرہ میں اعجاز قرآن پر مکمل بحث کی صورت میں بیان ہو چکی ہے اس کو معارف القرآن جلد اول میں دیکھ سکتے ہیں)۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اگر یہ رسول ہوتے تو عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے نہیں بلکہ فرشتوں کی طرح کھانے پینے کی ضروریات سے مستغنی اور الگ ہوتے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہوتا تو کم از کم انکے پاس اللہ کیطرف سے اتنا خزانہ یا باغات ہوتے کہ ان کو اپنے معاش کی فکر نہ کرنا پڑتی، بازاروں میں چلنا پھرنا نہ پڑتا۔ اس کے علاوہ ان کا اللہ کیطرف سے رسول ہونا ہم کیسے مان لیں کہ اول تو یہ فرشتہ نہیں، دوسرے کوئی فرشتہ بھی انکے ساتھ نہیں رہتا جو انکے ساتھ ان کے کلام کی تصدیق کیا کرتا، اسلئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر کسی نے جادو کر دیا ہے جس سے ان کا دماغ چل گیا اور یہ ایسی بے سرو پا باتیں کہتے ہیں۔ اسکا اجمالی جواب تو اس آیت میں دیدیا گیا، اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا، یعنی دیکھو تو یہ لوگ آپ کی شان میں کیسی کیسی عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں جسکا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سب گمراہ ہو گئے اور اب ان کو راہ ملنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ تفصیلی جواب اگلی آیات میں آیا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

بڑی برکت ہے اُس کی جو چاہے تو کر دے تیرے واسطے اس سے بہتر باغ کہ نیچے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ۝ بَلْ كَذَّبُوْا

بہتی ہیں اُن کے نہریں اور کر دے تیرے واسطے محل کچھ نہیں وہ جھٹلاتے ہیں

بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ۝ اِذَا رَاَتْهُمْ

قیامت کو اور ہم نے تیار کی ہے اسکے واسطے کہ جھٹلاتا ہے قیامت کو آگ، جب وہ دیکھے گی انکو

مِّنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ۝ وَاِذَآ اُلْقُوْا

دُور کی جگہ سے سُنیں گے اس کا جھنجھلانا اور چلانا اور جب ڈالے جائیں گے

مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ۝ لَا تَدْعُوا

اسکے اندر ایک جگہ تنگ میں ایک زنجیر میں کئی کئی بندھے ہوئے پکاریں گے اُس جگہ موت کو مت پکارو

الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ۝ قُلْ اَذٰلِكَ

آج ایک مرنے کو اور پکارو بہت سے مرنے کو تو کہہ بھلا یہ چیز

خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّ

بہتر ہے یا باغ ہمیشہ رہنے کا جسکا وعدہ ہو چکا پرہیزگاروں سے وہ ہوگا ان کا بدلہ اور پھر جانے

مَصِيْرًا ۝۱۵ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ وَعْدًا

کی جگہ اُن کے واسطے وہاں ہے جو وہ چاہیں رہا کریں ہمیشہ ہو چکا تیرے رب کے ذمہ وعدہ

مَّسْــــُٔوْلًا ۝۱۶ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ

مانگا ملتا اور جس دن جمع کر بلائے گا اُن کو اور جن کو وہ پوجتے ہیں اللہ کے سوائے پھر ان سے کہے گا

ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَاۗءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۝۱۷ قَالُوْا

کیا تم نے بہکایا میرے ان بندوں کو یا وہ آپ بہکے راہ سے بولیں گے

سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ

تو پاک ہے ہم سے بن نہ آتا تھا کہ پکڑیں کسی کو تیرے بغیر

اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَاۗءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا

رفیق لیکن تو اُن کو فائدہ پہنچاتا رہا اور ان کے باپ دادوں کو یہاں تک کہ بھلا بیٹھے تیری یاد اور

قَوْمًۢا بُوْرًا ۝۱۸ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ

یہ تھے لوگ تباہ ہونے والے، سو وہ تو جھٹلا چکے تم کو تمہاری بات میں اب نہ تم لوٹا سکتے ہو

صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ۝۱۹

اور نہ مدد کر سکتے ہو اور جو کوئی تم میں گنہگار ہے اُس کو ہم چکھائیں گے بڑا عذاب

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ

اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے رسول سب کھاتے تھے کھانا

الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ

اور پھرتے تھے بازاروں میں اور ہم نے رکھا ہے تم میں ایک دوسرے کے

فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ۝۲۰

جانچنے کو، دیکھیں ثابت بھی رہتے ہو اور تیرا رب سب کچھ دیکھتا ہے

ع ۲ / ۱۱ / ۱۴

خلاصۂ تفسیر

وہ ذات بڑی عالی شان ہے کہ اگر وہ چاہے تو آپ کو (کفار کی) اس (فرمائش) سے (بھی) اچھی چیز دیدے یعنی بہت سے (غیبی) باغات جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں (بہتر اس لئے کہا کہ وہ تو مطلق باغ کی فرمائش کرتے تھے گویا ایک ہی ہو اور متعدد باغ کا ایک سے بہتر ہونا ظاہر ہے) اور

(بلکہ ان باغوں کیساتھ اور بھی مناسب چیزیں دیدے جن کی اُنھوں نے فرمائش بھی نہیں کی یعنی) آپ کو بہت سے محل دیدے (جو ان باغوں میں بنے ہوں یا باہر ہی ہوں جس سے اُن کی فرمائش اور بھی زیادہ نعمتوں کیساتھ پوری ہوجاوے۔ مطلب یہ کہ جو جنّت میں ملے گا اگر اللہ چاہے تو آپ کو دُنیا ہی میں دیدے لیکن بعض حکمتوں سے نہیں چاہا اور فی نفسہٖ ضروری تھا نہیں پس شبہ محض بیہودہ ہے ان کفار کے ان شبہاتِ مذکورہ کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان کو حق کی طلب اور فکر ہوئی ہے اور اس دَوران میں قبل تحقیق ایسے شبہات واقع ہوگئے ہوں بلکہ وجہ اعتراضات کی محض شرارت اور طلب حق سے بیفکری ہے اور اس بیفکری اور شرارت کا سبب یہ ہے کہ) یہ لوگ قیامت کو جھوٹ سمجھ رہے ہیں (اس لئے فکر انجام نہیں ہے اور جو جی میں آتا ہے کر لیتے ہیں بک دیتے ہیں) اور (انجام اسکا یہ ہوگا کہ) ہم نے ایسے شخص (کی سزا) کے لئے جو کہ قیامت کو جھوٹا سمجھے دوزخ تیار کر رکھی ہے (کیونکہ قیامت کی تکذیب سے اللہ و رسُول کی تکذیب لازم آتی ہے جو اصل سبب ہے دوزخ میں جانیکا اور اس دوزخ کی یہ کیفیت ہوگی کہ) وہ (دوزخ) ان کو دُور سے دیکھے گی تو (دیکھتے ہی غضبناک ہو کر اسقدر جوش مارے گی کہ) وہ لوگ (دُور ہی سے) اسکا جوش و خروش سُنیں گے اور (پھر) جب وہ اس (دوزخ کی کسی تنگ جگہ میں ہاتھ پاؤں جکڑ کر ڈالدیئے جاویں گے تو وہاں موت ہی موت پکاریں گے (جیسا مصیبت میں عادت ہے کہ موت کو بُلاتے اور اسکی تمنا کرتے ہیں اسوقت ان سے کہا جاویگا کہ) ایک موت کو نہ پکارو بلکہ بہت سی موتوں کو پکارو (کیونکہ موت کے پُکارنے کی علت مصیبت ہے اور تمھاری مصیبت غیر متناہی ہے اور ہر مصیبت کا مقتضا موت کا پُکارنا ہے تو پکارنا بھی کثیر ہوا اور اسی کی کثرت کو موت کی کثرت کہا گیا) آپ (ان کو یہ مصیبت سُناکر) کہیئے کہ (یہ بتلاؤ کہ) کیا یہ (مصیبت کی) حالت اچھی ہے (جو کہ مقتضیٰ ہے تمھارے کفر و انکار کا) یا وہ ہمیشہ کے رہنے کی جنّت (اچھی ہے) جسکا خدا سے ڈرنے والوں سے (یعنی اہل ایمان سے) وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ ان کے لئے (ان کی اطاعت کا) صلہ ہے اور ان کا (آخری) ٹھکانا (اور) ان کو وہاں وہ سب چیزیں ملیں گی جو کچھ وہ چاہیں گے (اور) وہ (اسمیں) ہمیشہ رہیں گے (اے پیغمبر) یہ ایک وعدہ ہے جو (بطور فضل و عنایت کے) آپ کے رب کے ذمہ ہے اور قابلِ درخواست ہے (اور ظاہر ہے کہ جنت الخلد ہی بہتر ہے سو اسمیں ترہیب کے بعد ترغیب ایمان کی ہوگئی) اور (وہ دن ان کو یاد دلائیے کہ) جس روز اللہ تعالیٰ ان (کافر) لوگوں کو اور جن کو وہ لوگ خدا کے سوا پُوجتے تھے (جنھوں نے اپنے اختیار سے کسی کو گمراہ نہیں کیا خواہ صرف بُت مراد ہوں یا ملائکہ وغیرہم بھی) ان (سب) کو جمع کریگا پھر (ان معبودین سے ان عابدین کی رُسوائی کے لئے) فرماویگا کیا تم نے میرے ان بندوں کو (راہِ حق سے) گمراہ کیا تھا یا یہ (خود ہی) راہ (حق) سے گمراہ ہوگئے تھے (مطلب یہ کہ

انھوں نے تمھاری عبادت جو واقع میں گمراہی ہے تمھارے امر و رضا سے کی تھی جیسا ان لوگوں کا
زعم تھا کہ یہ معبودین ہماری اس عبادت سے خوش ہوتے ہیں اور خوش ہو کر اللہ تعالیٰ سے شفاعت
کریں گے یا اپنی رائے فاسد سے اختراع کرلی تھی) وہ (معبودین) عرض کریں گے کہ معاذ اللہ
ہماری کیا مجال تھی کہ ہم آپ کے سوا اور کارسازوں کو (اپنے اعتقاد میں) تجویز کریں (عام اس سے کہ
وہ کارساز ہم ہوں یا ہمارے سوا اور کوئی ہو۔ مطلب یہ کہ جب خدائی کو آپ میں منحصر سمجھتے ہیں تو ہم شرک
کرنے کا ان کو امر یا اس پر رضامندی کیوں ظاہر کرتے) ولیکن (یہ خود ہی گمراہ ہوئے اور گمراہ بھی ایسے
نامعقول طور پر ہوئے کہ اسباب شکر کو انھوں نے اسباب کفر بنایا چنانچہ) آپ نے (تو) ان کو اور
ان کے بڑوں کو (خوب) آسودگی دی (جس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ نعمت دینے والے کو پہچانتے اور اس کا
شکر و اطاعت کرتے مگر یہ لوگ) یہاں تک (شہوات و تلذذات میں منہمک ہوئے) کہ (آپ کی)
یاد (ہی) کو بھلا بیٹھے اور یہ لوگ خود ہی برباد ہوئے (مطلب جواب کا ظاہر ہے کہ دونوں شقوں میں سے
اس شق کو اختیار کیا کہ یہ خود ہی گمراہ ہوئے ہم نے نہیں کیا۔ اور اُن کی گمراہی کو اللہ کی بڑی نعمتیں ان
پر مبذول ہونیکا ذکر کر کے اور زیادہ واضح کردیا۔ اسوقت اللہ تعالیٰ ان عابدین کو لاجواب کرنے کے
لئے جو اصل مقصود تھا سوال مذکور سے یہ فرماویگا) لو تمھارے ان معبودوں نے تو تم کو تمھاری (سب)
باتوں میں جھوٹا (ہی) ٹھہرادیا (اور انھوں نے بھی تمھارا ساتھ نہ دیا اور جرم پورے طور پر قائم ہوگیا)
سو (اب) تم نہ تو خود (عذاب کو اپنے اوپر سے) ٹال سکتے ہو اور نہ (کسی دوسرے کیطرف سے) مدد
دیئے جاسکتے ہو (حتیٰ کہ جن پر پورا بھروسہ تھا وہ بھی صاف جواب دے رہے ہیں اور تمھاری
صریح مخالفت کر رہے ہیں) اور جو (جو) تم میں ظالم (یعنی مشرک) ہوگا ہم اس کو بڑا عذاب چکھائیں گے
(اور گو اسوقت مخاطبین سب مشرک ہی ہونگے مگر اس طرح فرمانے کی یہ وجہ ہے کہ ظلم کا مقتضیٰ
عذاب ہونا بیان فرمانا مقصود ہے) اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب کھانا بھی کھاتے
تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے (مطلب یہ کہ نبوت و اکلِ طعام وغیرہ میں تنافی
نہیں چنانچہ جن کی نبوت دلائل سے ثابت ہے گو معترضین اعتراف نہ کریں، ان سب سے اسکا
صدور ہوا ہے پس آپ پر بھی یہ اعتراض غلط ہے) اور (اے پیغمبر اور اے تابعین پیغمبران کفار
کے ایسے بیہودہ اقوال سے غمگین مت ہو کیونکہ) ہم نے تم (مجموعہ مکلفین) میں ایک کو دوسرے
کے لئے آزمائش بنایا ہے (پس اسی عادت مستمرہ کے موافق انبیاء کو ایسی حالت پر بنایا کہ اُمت
کی آزمائش ہو کہ کون انکے حالاتِ بشریہ پر نظر کر کے تکذیب کرتا ہے اور کون اُن کے کمالاتِ نبوت پر
نظر کر کے تصدیق کرتا ہے سو جب یہ بات معلوم ہوگئی تو) کیا تم (اب بھی) صبر کروگے (یعنی صبر
کرنا چاہیئے) اور (یہ بات یقینی ہے کہ) آپ کا رب خوب دیکھ رہا ہے (تو وقت موعود پر ان کو

سزا دے گا، پھر آپ کیوں ہم و غم میں واقع ہوں)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں کفار و مشرکین کی طرف سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر جو شبہات پیش کئے گئے تھے اور وہاں اُن کا اجمالی جواب دیا گیا تھا ان آیات میں اس کی کچھ تفصیل مذکور ہے۔ جسکا حاصل یہ ہے کہ تم نے اپنی جہالت اور حقیقت شناسی سے دُوری کی وجہ سے ایک بات یہ کہی ہے کہ اگر یہ اللہ کے رسُول ہوتے تو اُن کے پاس بہت دولت کے خزانے ہوتے بہت بڑی جائیداد اور باغات ہوتے تاکہ یہ کسبِ معاش سے مستغنی رہتے اسکا جواب یہ دیا گیا کہ ایسا کر دینا ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں کہ اپنے رسُول کو دولت کے خزانے دیدیں، بلکہ بڑی سے بڑی حکومت و سلطنت کا مالک بنا دیں۔ جیساکہ اس سے پہلے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو ایسی دولت اور پُوری دُنیا پر بے مثال حکومت عطا فرما کر اپنی اس قدرتِ کاملہ کا اظہار بھی کیا جاچکا ہے۔ مگر عامۂ خلق کی مصلحت اور بیشمار حکمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ گروہِ انبیاء کو مادّی اور دنیوی مال و دولت سے الگ ہی رکھا جائے۔ خصوصاً سید الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے حق تعالیٰ کو یہی پسند ہوا کہ وہ عام غریب مسلمانوں کی صفوف میں اور انہی جیسے حالات میں رہیں اور خود رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے اسی حالت کو پسند فرمایا۔ جیساکہ مُسند احمد اور ترمذی میں حضرت ابو اُمامہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھ سے فرمایا کہ میں آپ کے لئے پورے بطحاءِ مکہ اور اسکے پہاڑوں کو سونا بنا دیتا ہوں، تو میں نے عرض کیا نہیں، اے میرے پروردگار مجھے تو یہ پسند ہے کہ مجھے ایک روز پیٹ بھرائی کھانا ملے (جس پر اللہ کا شکر ادا کروں) اور ایک روز بھوکا رہوں (اس پر صبر کروں) اور حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں چاہتا تو سونے کے پہاڑ میرے ساتھ پھرا کرتے (مظہری)

خلاصہ اسکا یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا عام طور پر فقر و فاقہ میں رہنا اللہ تعالیٰ کی ہزاروں حکمتوں اور عام انسانوں کی مصالح کی بناء پر ہے اور اسمیں بھی وہ اس حالت پر مجبور نہیں ہوتے اگر وہ چاہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کو بڑا مالدار صاحبِ جائیداد بنا سکتے ہیں مگر اُن کی ذات کو حق تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ وہ مال و دولت سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رکھتے، فقر و فاقہ ہی کو پسند کرتے ہیں۔

دوسری بات کفار نے یہ کہی تھی کہ یہ پیغمبر ہوتے تو عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے نہیں، اور کسبِ معاش کے لئے بازاروں میں نہ پھرتے اس اعتراض کی بنیاد بہت سے کفار کا یہ خیال ہے کہ اللہ کا رسُول انسان نہیں ہوسکتا، فرشتہ ہی رسُول ہوسکتا ہے۔ جسکا جواب قرآن کریم میں جابجا آیا ہے

اور یہاں اسکا یہ جواب دیا گیا کہ جن انبیاء کو تم بھی نبی و رسول مانتے ہو وہ بھی تو انسان ہی تھے انسانوں کی طرح کھاتے پیتے بازاروں میں پھرتے تھے جس سے تمہیں یہ نتیجہ نکال لینا چاہیئے تھا کہ کھانا پینا اور بازار میں پھرنا منصبِ نبوت و رسالت کے خلاف نہیں۔ آیاتِ مذکورہ میں وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ الآیۃ میں اسی مضمون کا بیان ہے۔

مخلوق میں معاشی مساوات کا نہ ہونا بڑی حکمت پر مبنی ہے وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً، اسمیں اشارہ اس طرف ہے کہ حق تعالیٰ کو قدرت تو سب کچھ تھی وہ سارے انسانوں کو یکساں مالدار بنا دیتے، سب کو تندرست رکھتے، کوئی بیمار نہ ہوتا۔ سب کو عزت و جاہ کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز کر دیتے کوئی ادنیٰ یا کم رتبہ نہ رہ جاتا مگر نظامِ عالم میں اسکی وجہ سے بڑے رخنے پیدا ہوتے اسلئے حق تعالیٰ نے کسی کو مالدار بنایا کسی کو غریب مفلس۔ کسی کو قوی، کسی کو ضعیف۔ کسی کو تندرست، کسی کو بیمار کسی کو صاحبِ عزت وجاہ، کسی کو گمنام۔ اس اختلافِ انواع و اصناف اور اختلافِ احوال میں ہر طبقے کا امتحان اور آزمائش ہے۔ غنی کے شکر کا غریب کے صبر کا امتحان ہے اسی طرح بیمار و تندرست کا حال ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ جب تمہاری نظر کسی ایسے شخص پر پڑے جو مال و دولت میں تم سے زیادہ ہے یا صحت و قوت اور عزت و جاہ میں تم سے بڑا ہے تو تم فوراً ایسے لوگوں پر نظر کرو جو ان چیزوں میں تم سے کم حیثیت رکھتے ہیں (تاکہ تم حسد کے گناہ سے بھی بچ جاؤ اور اپنی موجودہ حالت میں اللہ تعالےٰ کا شکر کرنے کی توفیق ہو۔ (رواہ البخاری ومسلم) مظہری

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ

اور بولے وہ لوگ جو اُمید نہیں رکھتے کہ ہم سے ملیں گے کیوں نہ اُترے ہم پر فرشتے یا ہم

نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾ يَوْمَ

دیکھ لیتے اپنے رب کو، بہت بڑائی رکھتے ہیں اپنے جی میں اور سر چڑھ رہے ہیں بڑی شرارت میں جس دن

يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾

دیکھیں گے فرشتوں کو کچھ خوشخبری نہیں اس دن گنہگاروں کو اور کہیں گے کہیں روک دی جائے کوئی آڑ

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ ہمارے سامنے پیش ہونے سے اندیشہ نہیں کرتے (کیونکہ وہ قیامت اور اس کی پیشی اور حساب کے منکر ہیں) وہ (انکار رسالت کے لئے) یوں کہتے ہیں کہ ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں

آتے (کہ اگر فرشتے آکر ہم سے کہیں کہ یہ رسُول ہیں) یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں (اور وہ خود ہم سے کہدے کہ یہ رسُول ہیں جب ہم تصدیق کریں۔ اسکے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ) یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں (کہ اپنے آپ کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ فرشتے آکر ان سے خطاب کریں یا خود حق تعالیٰ سے ہمکلام ہوں) اور (بالخصوص اللہ تعالیٰ کے دُنیا میں دیکھنے اور اُس سے ہمکلام ہونے کی فرمایش میں تو) یہ لوگ حد (انسانیت) سے بہت دُور نکل گئے ہیں (کیونکہ ملائکہ اور انسان کی تو بعض چیزوں میں شرکت بھی ہے کہ دونوں اللہ کی مخلوق ہیں مگر اللہ تعالیٰ اور انسان میں تو کوئی مشارکت اور مشابہت نہیں۔ اور یہ لوگ خدا کو دیکھنے کے لائق تو کیا ہوتے مگر فرشتے ان کو ایک روز دکھلائی دیں گے مگر جس طرح یہ چاہتے ہیں اس طرح نہیں بلکہ اُن کے عذاب و مصیبت اور پریشانی لیکر) چنانچہ جس روز یہ لوگ فرشتوں کو دیکھیں گے (اور وہ دن قیامت کا ہے) اُس روز مجرموں (یعنی کافروں) کے لئے کوئی خوشی کی بات (نصیب) نہ ہوگی اور (فرشتوں کو جب سامان عذاب کیساتھ آتا دیکھیں گے تو گھبراکر) کہیں گے پناہ ہے پناہ ہے۔

معارف و مسائل

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا، لفظ رجا کے عام معنے کسی محبوب و مرغوب چیز کی اُمید کے آتے ہیں اور کبھی یہ لفظ بمعنے خوف بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ابن الانباری نے کتاب الاضداد میں لکھا ہے اس جگہ بھی یہی معنے خوف کے زیادہ واضح ہیں یعنی وہ لوگ جو ہمارے سامنے پیشی سے نہیں ڈرتے۔ اسمیں اشارہ اس بات کیطرف ہے کہ دور از کار اور جاہلانہ سوالات اور فرمائشوں کی جرأت اُسی شخص کو ہوسکتی ہے جو آخرت کا بالکل منکر ہو۔ آخرت کے قائل پر آخرت کی فکر ایسی غالب ہوتی ہے کہ اُس کو ایسے سوال و جواب کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ آج کل جو تعلیم جدید کے اثر سے اسلام اور اسکے احکام کے بارے میں بہت سے لوگ شبہات اور بحث و مباحثہ میں مشغول نظر آتے ہیں یہ بھی علامت اسکی ہوتی ہے کہ معاذ اللہ دل میں آخرت کا سچا یقین نہیں ہے۔ اور یہ ہوتا تو اس قسم کے فضول سوالات دل میں پیدا ہی نہ ہوتے۔

حِجْرًا مَّحْجُوْرًا، حجر کے لفظی معنے محفوظ جگہ کے ہیں اور محجوراً اُس کی تاکید ہے۔ یہ لفظ محاورہ عرب میں اُسوقت بولا جاتا تھا جب کوئی مصیبت سامنے ہو، اُس سے بچنے کے لئے لوگوں سے کہتے تھے کہ پناہ ہے پناہ، یعنی ہمیں اس مصیبت سے پناہ دو تو قیامت کے روز بھی جب کفار فرشتوں کو سامان عذاب لاتا ہوا دیکھیں گے دُنیا کی عادت کے مطابق یہ لفظ کہیں گے۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے اس لفظ کے یہ معنے منقول ہیں حَرَامًا مُّحَرَّمًا، اور مراد یہ ہے کہ قیامت کے روز جب یہ لوگ فرشتوں کو

عذاب کے ساتھ دیکھیں گے اور اُن سے معاف کرنے اور جنت میں جانے کی درخواست کریں گے یا تمنا ظاہر کرینگے تو فرشتے اُنکے جواب میں کہیں گے حِجْرًا مَّحْجُوْرًا یعنی جنت کافروں پر حرام اور ممنوع ہے (مظہری)

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ اَصْحٰبُ
اور ہم پہنچے اُن کے کاموں پر جو انھوں نے کئے تھے پھر ہم نے کر ڈالا اُسکو خاک اُڑتی ہوئی بہشت کے

الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ
لوگوں کا اس دن خوب ہے ٹھکانا، اور خوب ہے جگہ دوپہر کے آرام کی اور جس دن پھٹ جائے

السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ
آسمان بادل سے اور اُتارے جائیں فرشتے تار لگاکر بادشاہی اس دن

نِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۭ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾ وَيَوْمَ
سچی ہے رحمٰن کی اور ہے وہ دن منکروں پر مشکل اور جس دن

يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ
کاٹ کاٹ کھائیگا گنہگار اپنے ہاتھوں کو کہے گا اے کاش کہ میں نے پکڑا ہوتا رسول کے ساتھ

سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ
رستہ اے خرابی میری کاش کہ نہ پکڑا ہوتا میں نے فلانے کو دوست اُسنے تو بہکا دیا

عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾
مجھ کو نصیحت سے مجھ تک پہنچ چکنے کے پیچھے، اور ہے شیطان آدمی کو وقت پر دغا دینے والا

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ
اور کہا رسول نے اے میرے رب میری قوم نے ٹھہرایا ہے اس قرآن کو

مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ
جھک جھک اور اسی طرح رکھے ہیں ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن گنہگاروں میں سے

وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿۳۱﴾
اور کافی ہے تیرا رب راہ دکھلانے کو اور مدد کرنے کو

خلاصۂ تفسیر

اور ہم (اس روز) ان کے (یعنی کفار کے) ان (نیک) کاموں کی طرف جو کہ وہ (دنیا میں) کر چکے تھے متوجہ ہوں گے سو ان کو (علانیہ طور پر) ایسا (بیکار) کر دیں گے جیسے پریشان غبار

(کہ کسی کام نہیں آتا، اسی طرح ان کفار کے اعمال پر کچھ ثواب نہ ہوگا البتہ) اہل جنت اس روز قیامگاہ میں بھی اچھے رہیں گے اور آرامگاہ میں بھی خوب اچھے ہونگے (مراد مستقر اور مقیل سے جنت ہے یعنی جنت اُن کے لئے جائے قیام اور جائے آرام ہوگی اور اچھا ہونا اسکا ظاہر ہے) اور جس روز آسمان ایک بدلی پر سے پھٹ جائے گا اور (اُس بدلی کے ساتھ آسمان سے) فرشتے (زمین پر) بکثرت اُتارے جائیں گے (اور اسی وقت حق تعالیٰ حساب وکتاب کے لئے تجلی فرماویں گے اور) اس روز حقیقی حکومت (حضرت) رحمان (ہی) کی ہوگی (یعنی حساب و کتاب جزا و سزا میں کسی کو دخل نہ ہوگا جیسا دُنیا میں ظاہری تصرف تھوڑا بہت دوسروں کے لئے بھی حاصل ہے) اور وہ (دن) کافروں پر بڑا سخت دن ہوگا (کیونکہ انکے حساب کا انجام جہنم ہی ہے) اور جس روز ظالم (یعنی کافر آدمی غایت حسرت سے) اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کھاوے گا (اور) کہے گا کیا اچھا ہوتا میں رسول کے ساتھ (دین کی) راہ پر لگ لیتا ہائے میری شامت (کہ ایسا نہ کیا اور) کیا اچھا ہوتا کہ میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا اُس (کم بخت) نے مجھ کو نصیحت آئے پیچھے اس سے بہکا دیا (اور ہٹا دیا) اور شیطان تو انسان کو (عین وقت پر) امداد کرنے سے جواب دیدیتا ہے (چنانچہ اُس کافر کی اس حسرت کے وقت اُس نے کوئی ہمدردی نہ کی، گو کرنے سے بھی کچھ نہ ہوتا صرف دُنیا ہی میں بہکانے کو تھا) اور (اس دن) رسول (صلے اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ سے کافروں کی شکایت کے طور پر) کہیں گے کہ اے میرے پروردگار میری اس قوم نے اس قرآن کو (جو کہ واجب العمل تھا) بالکل نظر انداز کر رکھا تھا (اور التفات ہی نہ کرتے تھے عمل تو درکنار مطلب یہ کہ خود کفار بھی اپنی ضلالت کا اقرار کریں گے اور رسول بھی شہادت دیں گے۔ کقولہ تعالیٰ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا اور ثبوتِ جرم کی یہی دو صورتیں معتاد ہیں، اقرار اور شہادت اور دونوں کے اجتماع سے یہ ثبوت اور بھی موکد ہو جاویگا اور سزایاب ہونگے) اور ہم اسی طرح مجرم لوگوں میں سے ہر نبی کے دشمن بناتے رہتے ہیں (یعنی یہ لوگ جو انکار قرآن کر کے آپ کی مخالفت کر رہے ہیں کوئی نئی بات نہیں جسکا غم کیا جاوے) اور (جس کو ہدایت دینا منظور ہو اُس کی) ہدایت کرنے کو اور (جو ہدایت سے محروم ہے اُسکے مقابلہ میں آپ کی) مدد کرنے کو آپ کا رب کافی ہے۔

معارف و مسائل

خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا، مُسْتَقَر، مستقل جائے قیام کو کہا جاتا ہے اور مَقِيْل قیلولہ سے مشتق ہے دوپہر کو آرام کرنے کی جگہ کو مقیل کہتے ہیں اس جگہ مقیل کا ذکر خصوصیت سے شاید اسلئے بھی ہوا ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے روز حق تعالیٰ نصف النہار کے

وقت ساری مخلوقات کے حساب کتاب سے فارغ ہوجاویں گے اور دو پہر کے سونے کے وقت اہل جنت جنت میں پہنچ جائیں گے اور اہل جہنم جہنم میں۔ (قرطبی)

تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ، ای عن الغمام۔ قرطبی۔ معنے یہ ہیں کہ آسمان شق ہو کر اُس میں سے ایک رقیق بادل اُترے گا جس میں فرشتے ہوں گے۔ یہ اَبر بشکل سائبان آسمان سے آویگا اور اسمیں حق تعالیٰ کی تجلی ہوگی اور اُسکے گرداگرد ملائکہ ہوں گے۔ یہ حساب شروع ہونے کا وقت ہوگا اور اُسوقت آسمان کا پھٹنا صرف کھلنے کے طور پر ہوگا یہ وہ پھٹنا نہیں ہوگا جو پہلی مرتبہ نفخۂ صعق کے وقت آسمان زمین کو فنا کرنے کے لئے ہوگا کیونکہ یہ نزولِ غمام جسکا ذکر آیت میں ہے نفخۂ ثانیہ کے بعد ہے جبکہ سب زمین و آسمان دوبارہ درست ہو چکے ہوں گے۔ (بیان القرآن)

يَقُولُ يٰلَيْتَنِي لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا، یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے مگر حکم عام ہے واقعہ یہ تھا کہ عقبہ ابن ابی معیط مکہ کے مشرک سرداروں میں سے تھا اس کی عادت تھی کہ جب کسی سفر سے واپس آتا تو شہر کے معززوں کی دعوت کرتا تھا اور اکثر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی ملا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ حسب عادت اُس نے معززین شہر کی دعوت کی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی بلایا۔ جب اُسنے آپؐ کے سامنے کھانا رکھا تو آپؐ نے فرمایا کہ میں تمہارا کھانا اُس وقت تک نہیں کھا سکتا جب تک تم اس کی گواہی نہ دو کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اُسکا کوئی شریک عبادت میں نہیں ہے اور یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسُول ہوں۔ عقبہ نے یہ کلمہ پڑھ لیا اور رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے شرط کے مطابق کھانا تناول فرمایا۔

عقبہ کا ایک گہرا دوست اُبَی بن خلف تھا جب اُس کو خبر لگی کہ عقبہ مُسلمان ہوگیا تو یہ بہت برہم ہوا۔ عقبہ نے عذر کیا کہ قریش کے معزز مہمان محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) میرے گھر پر آئے ہوئے تھے اگر وہ بغیر کھانا کھائے میرے گھر سے چلے جاتے تو میرے لئے بڑی رُسوائی تھی اس لئے میں نے انکی خاطر سے یہ کلمہ کہہ لیا۔ اُبَی بن خلف نے کہا کہ میں تیری ایسی باتوں کو قبول نہیں کرونگا جب تک تو جا کر اُن کے منہ پر نہ تھوکے۔ یہ کمبخت بدنصیب دوست کے کہنے سے اس گستاخی پر آمادہ ہوگیا اور کر گزرا اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں بھی ان دونوں کو ذلیل کیا کہ غزوۂ بدر میں دونوں مارے گئے (بغوی) اور آخرت میں اُنکے عذاب کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے کہ جب آخرت کا عذاب سامنے دیکھے گا تو اُسوقت ندامت و افسوس سے اپنے ہاتھ کاٹنے لگے گا اور کہیگا کاش میں فلاں یعنی اُبَی بن خلف کو دوست نہ بناتا۔ (مظہری و قرطبی)

غلط کار اور بے دین دوستوں کی دوستی قیامت کے روز حسرت و ندامت کا باعث ہوگی تفسیر مظہری میں ہے کہ یہ آیات اگرچہ خاص عقبہ کے واقعہ میں نازل ہوئی تھیں لیکن جیسا کہ الفاظ آیت کے عام ہیں حکم بھی عام ہے اور شاید اس جگہ اُس دوست کے نام کے بجائے قرآن میں فلاناً کا لفظ اسی عموم کی طرف اشارہ کرنے کے

لئے اختیار کیا گیا ہے۔ ان آیات نے یہ بتلایا ہے کہ جو دو دوست کسی معصیت اور گناہ پر جمع ہوں اور خلافِ شرع امور میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے ہوں ان سب کا یہی حکم ہے کہ قیامت کے روز اس گہرے دوست کی دوستی پر روئیں گے۔ مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد وغیرہ نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لا تصاحب الا مؤمنا ولا یاکل مالک الا تقی (مظہری) کسی غیر مسلم کو اپنا ساتھی نہ بناؤ، اور تمہارا مال (بطور دوستی کے) صرف متقی آدمی کھائے یعنی غیر متقی سے دوستی نہ کرو، اور ابوہریرہ رضہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المرء علی دین خلیلہ فلینظر من یخالل (رواہ البخاری)	ہر انسان (عادۃً) اپنے دوست کے دین اور طریقہ پر چلا کرتا ہے اسلئے دوست بنانے سے پہلے خوب غور کر لیا کرو کہ کس کو دوست بنا رہے ہو۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ہمارے مجلسی دوستوں میں کون لوگ بہتر ہیں تو آپؐ نے فرمایا۔

من ذکرکم باللّٰہ رؤیتہ وزاد فی علمکم منطقہ وذکرکم بالاٰخرۃ عملہ رواہ البزار (قرطبی)	وہ شخص جس کو دیکھ کر خدا یاد آئے اور جس کی گفتگو سے تمہارا علم بڑھے اور جس کے عمل کو دیکھ کر آخرت کی یاد تازہ ہو۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا، یعنی کہیں گے رسول (محمد صلے اللہ علیہ وسلم) اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو مہجور و متروک کر دیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شکایت بارگاہِ حق تعالیٰ میں قیامت کے روز ہوگی یا اسی دنیا میں آپؐ نے یہ شکایت فرمائی؟ ائمۂ تفسیر اس میں مختلف ہیں، احتمال دونوں ہیں۔ اگلی آیت بظاہر قرینہ اسکا ہے کہ یہ شکایت آپؐ نے دنیا ہی میں پیش فرمائی تھی جس کے جواب میں آپؐ کو تسلی دینے کیلئے اگلی آیت میں فرمایا وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ، یعنی اگر آپکے دشمن قرآن کو نہیں مانتے تو آپؐ کو اس پر صبر کرنا چاہیئے کیونکہ سنت اللہ ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ ہر نبی کے کچھ مجرم لوگ دشمن ہوا کرتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام اس پر صبر کرتے رہے ہیں۔

قرآن کو عملاً ترک کر دینا بھی گناہِ عظیم ہے۔ اس سے ظاہر یہ ہے کہ قرآن کو مہجور و متروک کر دینے سے مراد قرآن کا انکار ہے جو کفار ہی کا کام ہے۔ مگر بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ جو مسلمان قرآن پر ایمان تو رکھتے ہیں مگر نہ اسکی تلاوت کی پابندی کرتے ہیں نہ اس پر عمل کرتے ہیں وہ بھی اس حکم میں داخل ہیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

من تعلم القراٰن وعلق مصحفہ لم یتعاھدہ ولم ینظر فیہ جاء یوم القیٰمۃ متعلقا بہ یقول یارب العالمین ان عبدک ھذا اتخذنی مھجورا فاقض بینی و بینہ۔ ذکرہ الثعلبی (قرطبی)	جس شخص نے قرآن پڑھا مگر پھر اسکو بند کر کے گھر میں معلق کر دیا نہ اسکی تلاوت کی پابندی کی نہ اسکے احکام میں غور کیا، قیامت کے روز قرآن اسکے گلے میں پڑا ہوا آئیگا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کریگا کہ آپکے اس بندہ نے مجھے چھوڑ دیا تھا اب آپ میرے اور اسکے معاملہ کا فیصلہ فرما دیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ

اور کہنے لگے وہ لوگ جو منکر ہیں کیوں نہ اُترا اس پر قرآن سارا ایک جگہ ہوکر

كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾

اسی طرح اُتارا تاکہ ثابت رکھیں ہم اس سے تیرا دل اور پڑھ سنایا ہم نے اسکو ٹھہر ٹھہر کر

خلاصۂ تفسیر

اور کافر لوگ یوں کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نازل نہیں کیا گیا (مقصود اس اعتراض سے یہ ہے کہ اگر خدا کا کلام ہوتا تو بتدریج نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس بتدریج نازل کرنے سے تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم خود ہی سوچ سوچ کر تھوڑا تھوڑا بنا لیتے ہیں آگے اس اعتراض کا جواب ہے کہ) اس طرح (تدریجاً) اس لئے (ہم نے نازل کیا) ہے تاکہ ہم اسکے ذریعہ آپکے دل کو قوی رکھیں اور (اسی لئے) ہم نے اس کو بہت ٹھہر ٹھہر کر اُتارا ہے (چنانچہ تیئیس ۲۳ سال کے عرصہ میں آہستہ آہستہ پورا ہوا)۔

معارف و مسائل

یہ وہی سلسلہ کفار و مشرکین کے اعتراضات و جوابات کا ہے جو شروع سورت سے چلا آرہا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں قرآن کو بتدریج نازل کرنے کی ایک حکمت یہاں یہ بیان فرمائی ہے کہ اسکے ذریعہ آپکے دل کو قوی رکھنا مقصود ہے۔ نزول تدریجی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقویتِ قلب کی چند وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ یاد رکھنا آسان ہوگیا، ایک ضخیم کتاب بیک وقت نازل ہوجاتی تو یہ آسانی نہ رہتی اور آسانی کے ساتھ یاد ہوتے رہنے سے دل میں کوئی پریشانی نہیں رہتی۔ دوسرے جب کفار آپ پر کوئی اعتراض یا آپکے ساتھ کوئی ناگوار معاملہ کرتے تو اُسی وقت آپ کی تسلّی کے لئے قرآن میں آیت نازل ہوجاتی، اور اگر پورا قرآن ایک دفعہ آگیا ہوتا اور اس خاص واقعہ پر تسلّی کا ذکر بھی نازل ہوگیا ہوتا تو بہرحال اس کو قرآن میں تلاش کرنے کی ضرورت پڑتی اور ذہن کا اُسطرف متوجہ ہوجانا بھی عادۃً ضروری نہیں تھا تیسرے پیغام خداوندی آنا تازہ شہادت ہے معیتِ خداوندی کی جو مدار اعظم ہے قوتِ قلب کا۔ اور اس جگہ جو حکمت تقویتِ قلب کی بتلائی گئی ہے نزولِ تدریجی کی حکمت اسمیں منحصر نہیں دوسری حکمتیں بھی ہیں جنمیں سے بعض سورۂ بنی اسرائیل کی آیت وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ میں پہلے آچکی ہے۔ (بیان القرآن)

وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۳﴾ اَلَّذِيْنَ

اور نہیں لاتے تیرے پاس کوئی مثل کہ ہم نہیں پہنچا دیتے تجھ کو ٹھیک بات اور اس سے بہتر کھول کر جو لوگ کہ

يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾ وَ

گھیر کر وہیں جائیں گے اوندھے پڑے ہوئے اپنے منہ پر دوزخ کی طرف انہی کا برا درجہ ہے اور بہت بہکے ہوئے ہیں راہ سے اور

لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ﴿۳۵﴾ فَقُلْنَا

ہم نے دی موسیٰ کو کتاب اور کر دیا ہم نے اسکے ساتھ اسکا بھائی ہارون کام بٹانے والا پھر کہا ہم نے

اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿۳۶﴾

تم دونوں جاؤ اُن لوگوں کے پاس جنھوں نے جھٹلایا ہماری باتوں کو پھر دے مارا ہم نے ان کو اکھاڑ کر

خلاصۂ تفسیر

اور یہ لوگ کیسا ہی عجیب سوال آپکے سامنے پیش کریں مگر ہم (اس کا) ٹھیک جواب اور وضاحت میں بڑھا ہوا آپ کو عنایت کر دیتے ہیں (تاکہ آپ مخالفین کو جواب دے سکیں۔ یہ بظاہر بیان اُس تقویتِ قلب کا ہے جسکا ذکر اس سے پہلی آیت میں ہوا ہے کہ تدریج نازل کرنے میں ایک حکمت آپ کی دلجمعی اور تقویتِ قلب ہے کہ جب کفار کیطرف سے کوئی اعتراض آئے تو اُسی وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب نازل کر دیا جائے) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے چہروں کے بل جہنم کی طرف لیجائے جاویں گے (یعنی گھسیٹ کر) یہ لوگ جگہ میں بھی بدتر ہیں اور طریقہ میں بھی بہت گمراہ ہیں۔ (یہاں تک انکار رسالت پر وعید اور قرآن پر اعتراضات کے جواب تھے، آگے اسکی تائید میں زمانہ ماضی کے بعض واقعات نقل کئے گئے ہیں جن میں منکرینِ رسالت کا انجام اور عبرت انگیز حالات مذکور ہیں اور اسمیں بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی اور تقویتِ قلب کا سامان ہے کہ پچھلے انبیاء کی اللہ تعالیٰ نے جس طرح مدد فرمائی اور دشمنوں پر غالب فرمایا وہ آپکے لئے بھی ہونے والا ہے اس میں پہلا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا گیا کہ) اور بتحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب (یعنی تورات) دی تھی اور (اس کتاب ملنے سے پہلے) ہم نے ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو (اُن کا) معین (و مددگار) بنایا تھا پھر ہم نے (دونوں کو حکم دیا کہ دونوں آدمی اُن لوگوں کے پاس (ہدایت کرنے کے لئے) جاؤ جنھوں نے ہماری (توحید کی) دلیلوں کو جھٹلایا ہے (مُراد اس سے فرعون اور اسکی قوم ہے چنانچہ یہ دونوں حضرات وہاں پہنچے اور سمجھایا مگر انھوں نے نہ مانا) سو ہم نے اُن کو (اپنے قہر سے) بالکل ہی غارت کر دیا (یعنی دریا میں غرق کئے گئے)۔

معارف و مسائل

اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا، اس میں قوم فرعون کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ اُنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے۔ حالانکہ اسوقت تک تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل بھی نہیں ہوئی تھی اس لئے اس تکذیب سے آیاتِ تورات کی تکذیب تو مُراد نہیں ہو سکتی، بلکہ مراد آیات سے یا تو توحید کے دلائل عقلیہ

جو ہر انسان کو اپنی عقل کے مطابق سمجھ میں آسکتے ہیں اُن میں غور نہ کرنے کو تکذیبِ آیات فرمایا اور یا یہ کہ انبیاء سابقین کی روایات جو کچھ نہ کچھ ہر قوم میں نقل ہوتی آئی ہیں اُن کا انکار مُراد ہے جیسے قرآن کریم میں فرمایا وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ، اس میں انبیاء سابقین کی تعلیم کا ان لوگوں تک منقول چلا آنا بتلایا گیا ہے۔ (بیان القرآن)

وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ۚ

اور نوح کی قوم کو جب اُنھوں نے جھٹلایا پیغام لانے والوں کو ہم نے انکو ڈبا دیا اور کیا اُن کو لوگوں کے حق میں نشانی

وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۚ﴿۳۷﴾ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَاَصْحٰبَ

اور تیار کر رکھا ہے ہم نے گنہگاروں کے واسطے عذاب دردناک اور عاد کو اور ثمود کو اور کنوئیں

الرَّسِّ وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۫ وَ

والوں کو اور اسکے بیچ میں بہت سی جماعتوں کو اور سب کو کہہ سنائیں ہم نے مثالیں اور

كُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ

سب کو کھو دیا ہم نے غارت کر کر اور یہ لوگ ہو آئے ہیں اُس بستی کے پاس جن پر برسا بُرا

السَّوْءِ ۭ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾ وَاِذَا

برساؤ کیا دیکھتے نہ تھے اس کو، نہیں پر اُمید نہیں رکھتے جی اُٹھنے کی اور جہاں

رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾

تجھ کو دیکھیں کچھ کام نہیں اُن کو تجھ سے مگر ٹھٹھے کرنے کیا یہی ہے جس کو بھیجا اللہ نے پیغام دے کر

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۭ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ

یہ تو ہم کو بچلا ہی دیتا ہمارے معبودوں سے اگر ہم نہ جمے رہتے اُن پر اور آگے جان لیں گے

حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ

جس وقت دیکھیں گے عذاب کو کہ کون بہت بچلا ہوا ہے راہ سے بھلا دیکھ تو اس شخص کو جس نے پوجنا اختیار کیا

هَوٰىهُ ۭ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ

اپنی خواہش کا، کہیں تو لے سکتا ہے اسکا ذمہ یا تو خیال رکھتا ہے کہ بہت سے ان میں سنتے

اَوْ يَعْقِلُوْنَ ۭ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۴﴾ ع

یا سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں وہ برابر ہیں چوپایوں کے بلکہ وہ زیادہ بہکے ہوئے ہیں راہ سے

ع ۲ ۱۰

خلاصۂ تفسیر

اور قوم نوح کو بھی (ان کے زمانہ میں) ہم ہلاک کر چکے ہیں (جن کی ہلاکت اور سبب ہلاکت کا بیان

یہ ہے کہ) جب اُنھوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو (طوفان سے) غرق کر دیا اور ہم نے ان (کے واقعہ) کو لوگوں (کی عبرت) کے لئے نشان بنا دیا (یہ تو دُنیا میں سزا ہوئی) اور (آخرت میں) ہم نے (اُن) ظالموں کے لئے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔ اور ہم نے عاد اور ثمود اور اصحاب الرس اور اُن کے بیچ بیچ میں بہت سی اُمتوں کو ہلاک کیا اور ہم نے (اُمم مذکورہ میں سے) ہر ایک (کی ہدایت) کے واسطے عجیب عجیب (یعنی مؤثر اور بلیغ) مضامین بیان کئے اور (جب نہ مانا تو) ہم نے سب کو بالکل ہی برباد کر دیا۔ اور یہ (کفار ملک شام کے سفر میں) اس بستی پر ہو کر گزرتے ہیں جس پر بُری طرح پتھر برسائے گئے تھے (مراد قریہ قوم لوط کا ہے) سو کیا یہ لوگ اسکو دیکھتے نہیں رہتے (پھر بھی عبرت نہیں پکڑتے کہ کفر و تکذیب کو چھوڑ دیں جس کی بدولت قوم لوط کو سزا ہوئی سو بات یہ ہے کہ عبرت نہ پکڑنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اُس قریہ کو دیکھتے نہ ہوں) بلکہ (اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ) یہ لوگ مرکر جی اُٹھنے کا احتمال ہی نہیں رکھتے (یعنی آخرت کے منکر ہیں اس لئے کفر کو موجب سزا ہی قرار نہیں دیتے اور اسلئے اُن کی ہلاکت کو کفر کا وبال نہیں سمجھتے بلکہ اُمور اتفاقیہ میں سے سمجھتے ہیں یہ وجہ عبرت نہ پکڑنے کی ہے) اور جب یہ لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو بس آپ سے تمسخر کرنے لگتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ کیا یہی (بزرگ) ہیں جنکو خدا تعالیٰ نے رسُول بنا کر بھیجا ہے (یعنی ایسا غریب آدمی رسُول نہ ہونا چاہیئے۔ اگر رسالت کوئی چیز ہے تو کوئی رئیس مالدار ہونا چاہیئے تھا پس یہ رسُول نہیں البتہ) اس شخص (کی جادو بیانی اس غضب کی ہے کہ اس) نے تو ہم کو ہمارے معبودوں سے ہٹا ہی دیا ہوتا اگر ہم اُن پر (مضبوطی سے) قائم نہ رہتے (یعنی ہم تو ہدایت پر ہیں اور یہ ہم کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا تھا اللہ تعالیٰ اُن کی تردید کے لئے فرماتے ہیں کہ یہ ظالم اب تو اپنے آپ کو ہدایت یافتہ اور ہمارے پیغمبر کو گمراہ بتلا رہے ہیں) اور (مرنے کے بعد) جلدی ہی ان کو معلوم ہو جاویگا جب عذاب کا معائنہ کریں گے کہ کون شخص گمراہ تھا (آیا وہ خود یا نعوذ باللہ پیغمبر، اسمیں اُن کے بیہودہ اعتراض کے جواب کی طرف بھی اشارہ ہے کہ نبوّت اور مالداری میں کوئی جوڑ نہیں مالدار نہ ہونیکے سبب نبوت سے انکار جہالت و گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔ مگر دُنیا میں جو چاہیں خیال پکالیں مگر قیامت میں سب حقیقت کھُل جاوے گی) اے پیغمبر آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہشِ نفسانی کو بنا رکھا ہے سو کیا آپ اُس کی نگرانی کر سکتے ہیں یا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں اکثر سُنتے یا سمجھتے ہیں (مطلب یہ کہ آپ ان کی ہدایت نہ ہونے سے مغموم نہ ہوجئے کیونکہ آپ ان پر مسلط نہیں کہ خواہی نخواہی ان کو راہ پر لا دیں اور نہ ہدایت کی ان سے توقع کیجئے کیونکہ نہ یہ حق بات کو سُنتے ہیں نہ عقل ہے کہ غور کریں) یہ تو محض چوپایوں کی طرح ہیں (کہ وہ بات کو نہ سُنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں) بلکہ یہ اُن سے بھی زیادہ بے راہ ہیں (کیونکہ وہ احکامِ دین کے مکلف نہیں تو ان کا نہ سمجھنا مذموم نہیں، اور یہ مکلف ہیں پھر بھی نہیں سمجھتے پھر یہ کہ وہ اگر معتقد ان ضروریاتِ دین کے نہیں ہیں تو منکر بھی تو نہیں اور یہ تو منکر ہیں اور اذ قربت میں ان کی گمراہی کا منشاء بھی بیان کر دیا کہ کسی شبہ و دلیل سے ان کو اشتباہ نہیں ہوا بلکہ اتباعِ ہوٰی اسکا سبب ہے

معارف و مسائل

قوم نوح علیہ السلام کے متعلق یہ ارشاد کہ انھوں نے رسولوں کو جھٹلایا حالانکہ پہلے رسول نہ ان کے زمانے میں تھے نہ انھوں نے جھٹلایا، تو منشا اسکا یہ ہے کہ انھوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلایا اور چونکہ اصولِ دین سب انبیاء کے مشترک ہیں اسلئے ایک کو جھٹلانا سبھی کے جھٹلانے کے حکم میں ہے۔

اَصْحٰبَ الرَّسِّ، رس، لغت میں کچے کنوئیں کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم اور کسی صحیح حدیث میں ان لوگوں کے تفصیلی حالات مذکور نہیں۔ اسرائیلی روایات مختلف ہیں۔ راجح یہ ہے کہ قوم ثمود کے کچھ باقیماندہ لوگ تھے جو کسی کنوئیں پر آباد تھے (کذا فی القاموس والدر عن ابن عباسؓ) ان کے عذاب کی کیفیت بھی قرآن میں منصوص اور کسی صحیح حدیث میں بھی مذکور نہیں۔ (بیان القرآن)

خلاف شرع خواہشات کی پیروی ایک قسم کی بُت پرستی ہے۔ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ، اس آیت میں اُس شخص کو جو اسلام شریعت کیخلاف اپنی خواہشات کا پیرو ہو یہ کہا گیا ہے کہ اس نے اپنی خواہشات کو معبود بنا لیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خلافِ شرع خواہشاتِ نفسانی بھی ایک بُت ہے جس کی پرستش کیجاتی ہے پھر استدلال میں یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (قرطبی)

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا
تو نے نہیں دیکھا اپنے رب کیطرف کیسے دراز کیا سایہ کو اور اگر چاہتا تو اس کو ٹھہرا رکھتا پھر ہم نے مقرر کیا

الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾ وَهُوَ الَّذِيْ
سورج کو اسکا راہ بتلانے والا پھر کھینچ لیا ہم نے اسکو اپنی طرف سہج سہج سمیٹ کر اور وہی ہے جس نے

جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾ وَ
بنا دیا تمہارے واسطے رات کو اوڑھنا اور نیند کو آرام اور دن کو بنا دیا اُٹھ نکلنے کے لئے اور

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ
وہی ہے جس نے چلائیں ہوائیں خوشخبری لانے والیاں اسکی رحمت سے آگے اور اُتارا ہم نے

السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ
آسمان سے پانی پاکی حاصل کرنے کا کہ زندہ کر دیں اُس سے مرے ہوئے دیس کو اور پلائیں اسکو اپنے پیدا کئے ہوئے

اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ
بہت سے چوپایوں اور آدمیوں کو اور طرح طرح سے تقسیم کیا ہم نے اسکو انکے بیچ میں تا دھیان رکھیں

فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ
پھر بھی نہیں رہتے بہت لوگ بدون ناشکری کئے اور اگر ہم چاہتے تو اُٹھاتے ہر بستی میں

نَذِيرًا ﴿٥١﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيرًا ﴿٥٢﴾ وَهُوَ الَّذِي

کوئی ڈرانے والا، سو تو کہنا مت مان منکروں کا اور مقابلہ کر اُن کا اسکے ساتھ بڑے زور سے اور وہی ہے جس نے

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا

ملے ہوئے چلائے دو دریا یہ میٹھا ہے پیاس بجھانے والا اور یہ کھاری ہے کڑوا اور رکھا ان دونوں کے بیچ پردہ

وَّحِجْرًا مَّحْجُورًا ﴿٥٣﴾ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۭ

اور آڑ روکی ہوئی۔ اور وہی ہے جس نے بنایا پانی سے آدمی پھر ٹھہرایا اسکے لئے جد اور سسرال

وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ﴿٥٤﴾ وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ

اور تیرا رب سب کچھ کر سکتا ہے اور پوجتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر وہ چیز جو نہ بھلا کرے اُن کا نہ برا

وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيرًا ﴿٥٥﴾ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا ﴿٥٦﴾ قُلْ

اور ہے کافر اپنے رب کی طرف سے پیٹھ پھیر رہا اور تجھ کو ہم نے بھیجا یہی خوشی اور ڈر سنانے کے لئے تو کہہ

مَا اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَاءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيلًا ﴿٥٧﴾ وَ

میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کچھ مزدوری مگر جو کوئی چاہے کہ پکڑ لے اپنے رب کی طرف راہ اور

تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۭ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوبِ عِبَادِهٖ

بھروسہ کر اُوپر اس زندہ کے جو نہیں مرتا اور یاد کر اسکی خوبیاں اور وہ کافی ہے اپنے بندوں کے گناہوں سے

خَبِيرًا ﴿٥٨﴾ اِۨلَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ

مع

خبردار جس نے بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ انکے بیچ میں ہے چھ دن میں پھر

اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيرًا ﴿٥٩﴾ وَاِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْجُدُوا

قائم ہوا عرش پر وہ بڑی رحمت والا سو پوچھ اس سے جو اسکی خبر رکھتا ہو اور جب کہئے ان سے سجدہ کرو

لِلرَّحْمٰنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۤ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُورًا ﴿٦٠﴾

السجدۃ ع

رحمن کو کہیں رحمن کیا ہے کیا سجدہ کرنے لگیں ہم جس کو تو فرمائے اور بڑھ جاتا ہے ان کا بدکنا

تَبٰرَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَّجَعَلَ فِيهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيرًا ﴿٦١﴾

بڑی برکت ہے اسکی جسنے بنائے آسمان میں برج اور رکھا اس میں چراغ اور چاند اُجالا کرنے والا

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُورًا ﴿٦٢﴾

اور وہی ہے جسنے بنائے رات اور دن بدلتے سدلتے اُس شخص کے واسطے کہ چاہے دھیان رکھنا یا چاہے شکر کرنا

خلاصۂ تفسیر

اے مخاطب کیا تو نے اپنے پروردگار (کی اس قدرت) پر نظر نہیں کی کہ اُس نے (جب آفتاب اُفق

سے طلوع کرتا ہے اسوقت کھڑی ہوئی چیزوں کے) سایہ کو کیونکر (دُور تک) پھیلایا ہے (کیونکہ طلوع
کے وقت ہر چیز کا سایہ لمبا ہوتا ہے) اور اگر وہ چاہتا تو اس کو ایک حالت پر ٹھہرا یا ہوا رکھتا (یعنی آفتاب
کے بلند ہونے سے بھی نہ گھٹتا اس طرح پر کہ اتنی دُور تک آفتاب کی شعاعوں کو نہ آنے دیتا کیونکہ آفتاب
کی شعاعوں کا زمین کے حصوں پر پہنچنا بارادہ حق ہے نہ کہ بالاضطرار مگر ہم نے اپنی حکمت سے اسکو ایک
حالت پر نہیں رکھا بلکہ اس کو پھیلا ہوا بنا کر) پھر ہمنے آفتاب کو (یعنی اُسکے اُفق کے قریب ہونے اور پھر
اُفق سے بلند ہونے کو) اس (سایہ کی درازی و کوتاہی) پر (ایک ظاہری) علامت مقرر کیا (مطلب یہ
کہ اگرچہ روشنی اور سایہ اور انکے گھٹنے بڑھنے کی اصل علت حق تعالیٰ کا ارادہ اور مشیت ہے، آفتاب یا کوئی
دوسری چیز مؤثر حقیقی نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں پیدا ہونے والی چیزوں کے لئے کچھ ظاہری اسباب
بنا دیئے ہیں اور اسباب کیساتھ اُن کے مسببات کا ایسا رابطہ قائم کردیا کہ سبب کے تغیر سے مسبب میں
تغیر ہوتا ہے) پھر (اس تعلق ظاہری کی وجہ سے) ہمنے اس (سایہ) کو اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹ
لیا (یعنی جُوں جُوں آفتاب اونچا ہوا وہ سایہ زائل اور معدوم ہوتا گیا اور چونکہ اسکا غائب ہونا محض
قدرتِ الٰہیہ سے بلا شرکتِ غیرے ہے اور عام لوگوں کی رؤیت سے غائب ہونے کے باوجود علم الٰہی سے
غائب نہیں ہے اسلئے یہ فرمایا گیا کہ اپنی طرف سمیٹ لیا) اور وہ ایسا ہے جس نے تمھارے لئے رات
کو پردہ کی چیز اور نیند کو راحت کی چیز بنایا اور دن کو (اس اعتبار سے کہ سونا مشابہ موت کے ہے
اور دن کا وقت جاگنے کا ہے گویا) زندہ ہونیکا وقت بنایا اور وہ ایسا ہے کہ اپنی بارانِ رحمت
سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ (بارش کی اُمید دلاکر دل کو) خوش کر دیتی ہیں اور ہم آسمان
سے پانی برساتے ہیں جو پاک صاف کرنے کی چیز ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے مُردہ زمین میں جان
ڈالدیں اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سے چارپایوں اور بہت سے آدمیوں کو سیراب کریں اور
ہم اُس (پانی) کو (بقدرِ مصلحت) ان لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیتے ہیں تاکہ لوگ غور کریں (کہ یہ
تصرفات کسی بڑے قادر کے ہیں کہ وہی مستحقِ عبادت ہے) سو (چاہیئے تھا کہ غور کرکے اسکا حق ادا
کرتے لیکن) اکثر لوگ بغیر ناشکری کئے نہ رہے (جس میں سب سے بڑھ کر کفر و شرک ہے لیکن
آپ ان کی اور بالخصوص اکثر کی ناشکری سُنکر یا دیکھ کر سعی فی التبلیغ سے ہمت نہ ہاریئے کہ میں
تنہا ان سب سے کیسے عہدہ برآ ہونگا بلکہ آپ تنہا ہی اپنا کام کئے جایئے کیونکہ آپ کو تنہا ہی نبی
بنانے سے خود ہمارا مقصود یہ ہے کہ آپ کا اجر اور قرب بڑھے) اور اگر ہم چاہتے تو (آپ کے علاوہ
اسی زمانہ میں) ہر بستی میں ایک ایک پیغمبر بھیجدیتے (اور تنہا آپ پر تمام کام نہ ڈالتے لیکن چونکہ
آپ کا اجر بڑھانا مقصود ہے اسلئے ہم نے ایسا نہیں کیا تو اس طور پر اتنا کام آپکے سپرد کرنا خدا تعالیٰ
کی نعمت ہے) سو (اس نعمت کے شکریہ میں) آپ کافروں کی خوشی کا کام نہ کیجئے (یعنی کافر تو

اس سے خوش ہونگے کہ تبلیغ نہ ہو یا کمی ہو جائے اور ان کی آزادی سے تعرض نہ کیا جاوے) اور قرآن (میں جو دلائل حق کے مذکور ہیں جیسا اسی مقام پر دلائل توحید کے ارشاد ہوئے ہیں اُن) سے اُن کا زور شور سے مقابلہ کیجئے (یعنی عام اور مکمل دعوت و تبلیغ کیجئے، یعنی سب سے کہئے اور بار بار کہئے اور ہمت قوی رکھئے جیسا اب تک آپ کرتے رہے ہیں اس پر قائم رہئے۔ آگے پھر بیان ہے دلائل توحید کا) اور وہ ایسا ہے جس نے دو دریاؤں کو (صورۃً) ملایا جن میں ایک (کا پانی) تو شیریں تسکین بخش ہے اور ایک (کا پانی) شور تلخ ہے اور (باوجود اختلاط صوری کے حقیقۃً) اُن کے درمیان میں (اپنی قدرت سے) ایک حجاب اور (اختلاط حقیقی سے) ایک مانع قوی رکھدیا (جو خود خفی غیر محسوس ہے مگر اُس کا اثر یعنی امتیاز دونوں پانی کے مزہ میں محسوس اور مشاہد ہے۔ مراد ان دو دریاؤں سے وہ مواقع ہیں جہاں شیریں ندیاں اور نہریں بہتے بہتے سمندر میں آگرگری ہیں وہاں باوجود اسکے کہ اوپر سے دونوں کا سطح ایک معلوم ہوتا ہے لیکن قدرتِ الٰہیہ سے ان میں ایک ایسی حدِ فاصل ہے کہ ملتقی کے ایک جانب سے پانی لیا جاوے تو شیریں اور دوسری جانب سے جو کہ جانبِ اوّل سے بالکل قریب ہے پانی لیا جائے تو تلخ۔ دُنیا میں جہاں جس جگہ شیریں پانی کی نہریں چشمے سمندر کے پانی میں گرتے ہیں وہاں اسکا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ میلوں دُور تک میٹھا اور کھاری پانی الگ الگ چلتے ہیں، دائیں طرف میٹھا بائیں طرف تلخ کھاری یا اوپر نیچے شیریں اور تلخ پانی الگ الگ پائے جاتے ہیں (حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ بیان القرآن میں دو معتبر بنگالی علماء کی شہادت نقل کی ہے کہ ارکان سے چاٹگام تک دریا کی شان یہ ہے کہ اس کی دو جانبین بالکل الگ الگ نوعیت کے دو دریا نظر آتے ہیں ایک کا پانی سفید ہے اور ایک کا سیاہ، سیاہ میں سمندر کی طرح طوفانی تلاطم اور تموّج ہوتا ہے اور سفید بالکل ساکن رہتا ہے کشتی سفید میں چلتی ہے اور دونوں کے بیچ میں ایک دھاری سی برابر چلی گئی ہے جو دونوں کا ملتقی ہے لوگ کہتے ہیں کہ سفید پانی میٹھا ہے اور سیاہ کڑوا۔ اھ۔ اور مجھ سے باریسال کے بعض طلباء نے بیان کیا کہ ضلع باریسال میں دو ندیاں ہیں جو ایک ہی دریا سے نکلی ہیں، ایک کا پانی کھاری بالکل کڑوا اور ایک کا نہایت شیریں اور لذیذ ہے۔ یہاں گجرات میں راقم الحروف جس جگہ آجکل مقیم ہے (ڈابھیل سملک ضلع سورت) سمندر وہاں سے تقریباً دس باره میل کے فاصلے پر ہے۔ ادھر کی ندیوں میں برابر مد و جزر (جوار بھاٹا) ہوتا رہتا ہے بکثرت ثقات نے بیان کیا کہ مد کے وقت جب سمندر کا پانی ندی میں آجاتا ہے تو میٹھے پانی کی سطح پر کھاری پانی بہت زور سے چڑھ جاتا ہے لیکن اسوقت بھی دونوں پانی مختلط نہیں ہوتے۔ اوپر کھاری رہتا ہے نیچے میٹھا۔ جزر کے وقت اوپر سے کھاری اُتر جاتا ہے اور میٹھا جوں کا توں میٹھا باقی رہ جاتا ہے واللہ اعلم، ان شواہد کو دیکھتے ہوئے آیت کا مطلب بالکل واضح ہے یعنی خدا کی قدرت دیکھو کہ کھاری اور میٹھے دونوں دریاؤں کے پانی کہیں نہ کہیں مِلجانے کے باوجود بھی کس طرح ایک دوسرے

سے ممتاز رہتے ہیں) اور وہ ایسا ہے جس نے پانی سے (یعنی نطفہ سے) آدمی کو پیدا کیا پھر اُس کو خاندان والا اور سُسرال والا بنایا (چنانچہ باپ دادا وغیرہ شرعی خاندان اور ماں، نانی وغیرہ عرفی خاندان ہیں جن سے پیدائش کے ساتھ ہی تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں پھر شادی کے بعد سُسرالی رشتے پیدا ہو جاتے ہیں یہ دلیل قدرت بھی ہے کہ نطفہ کیا چیز تھا پھر اس کو کیسا بنا دیا کہ وہ اتنی جلد خون والا ہو گیا اور نعمت بھی ہے کہ ان تعلقات پر تمدن اور امداد باہمی کی تعمیر قائم ہے) اور (اے مخاطب) تیرا پروردگار بڑی قدرت والا ہے اور (باوجود اسکے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں ایسا کامل ہے جیسا بیان ہوا اور یہ کمالات مقتضی ہیں کہ اسی کی عبادت کی جاوے مگر) یہ (مشرک) لوگ (ایسے) خدا کو چھوڑ کر اُن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں (جو عبادت کرنے پر) نہ اُن کو کچھ نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ (درصورت عبادت نہ کرنے کے) اُن کو کچھ ضرر پہنچا سکتی ہیں اور کافر تو اپنے رب کا مخالف ہے (کہ اُس کو چھوڑ کر دوسرے کی عبادت کرتا ہے اور کفار کی مخالفت معلوم کر کے آپ نہ تو اُن کے ایمان نہ لانے سے غمگین ہوں کیونکہ) ہم نے آپ کو صرف اسلئے بھیجا ہے کہ (ایمان والوں کو جنت کی) خوشخبری سنائیں اور (کافروں کو دوزخ سے) ڈرائیں۔ (ان کے ایمان نہ لانے سے آپ کا کیا نقصان ہے، پھر آپ کیوں غم کریں اور نہ آپ اُس مخالفت کو معلوم کر کے فکر میں پڑیں کہ جب یہ حق تعالیٰ کے مخالف ہیں تو میں جو حق تعالیٰ کیطرف دعوت کرتا ہوں اس دعوت کو یہ لوگ خیر خواہی کب سمجھیں گے بلکہ میری خود غرضی پر محمول کر کے التفات بھی نہ کریں گے تو اُن کے گمان کی کیونکر اصلاح کیجاوے تاکہ مانع مرتفع ہو سو اگر آپ کو اُن کا یہ خیال قرینہ سے یا زبانی گفتگو سے معلوم ہو تو) آپ (جواب میں اتنا) کہہ دیجئے (اور بےفکر ہو جائیے) کہ میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی معاوضہ (مالی یا جاہی) نہیں مانگتا ہاں جو شخص یُوں چاہے کہ اپنے رب تک (پہنچنے کا) رستہ اختیار کرلے (تو البتہ میں یہ ضرور چاہتا ہوں چاہے اس کو معاوضہ کہو یا نہ کہو) اور (نہ اُس مخالفت کفار کو دریافت کر کے اُن کی ضرر رسانی سے اندیشہ کیجئے بلکہ تبلیغ میں) اُس حی لایموت پر توکل رکھئے اور (اطمینان کے ساتھ) اُس کی تسبیح و تحمید میں لگے رہیئے اور (نہ مخالفت سن کر تعجیل عقوبت کی اس خیال سے تمنا کیجئے کہ ان کا ضرر دوسروں کو نہ پہنچ جاوے کیونکہ) وہ (خدا) اپنے بندوں کے گناہوں سے کافی (طور پر) خبردار ہے (وہ جب مناسب سمجھے گا سزا دیدیگا۔ پس ان جملوں میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے حزن و فکر اور خوف کو زائل فرمایا ہے آگے پھر توحید کا بیان ہے) وہ ایسا ہے جس نے آسمان و زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان میں ہے سب چھ روز (کی مقدار) میں پیدا کیا پھر عرش پر (جو مشابہ ہے تخت سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اُس کی شان کے لائق ہے جسکا بیان سورۂ اعراف کے رکوع ہفتم کے شروع آیت میں گزر چکا) وہ بڑا مہربان ہے سو اس کی شان کسی جاننے والے سے پُوچھنا چاہیئے (کہ وہ کیسا ہے کافر مشرک کیا

۳۱

جانیں اور اس معرفت صحیحہ کے نہ ہونے سے شرک کرتے ہیں کما قال اللہ تعالیٰ وما قدروا اللہ حق قدرہ) اور جب ان (کافروں) سے کہا جاتا ہے کہ رحمن کو سجدہ کرو تو (بوجہ جہل و عناد کے) کہتے ہیں کہ رحمن کیا چیز ہے (جس کے سامنے ہم کو سجدہ کرنے کو کہتے ہو) کیا ہم اس کو سجدہ کرنے لگیں گے جس کو تم سجدہ کرنے کے لئے ہم کو کہو گے اور اس سے ان کو اور زیادہ نفرت ہوتی ہے (لفظ رحمن ان میں کم مشہور تھا مگر یہ نہیں کہ جانتے نہ ہوں مگر اسلامی تعلیم سے جو مخالفت بڑھی ہوئی تھی تو محاورات اور بول چال میں بھی مخالفت کو نباہتے تھے۔ قرآن میں جو یہ لفظ بکثرت آیا وہ اس کی بھی مخالفت کر بیٹھے) وہ ذات بہت عالیشان ہے جس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے اور ان ستاروں میں سے دو بڑے نورانی اور فائدہ بخش ستارے بنائے یعنی) اس (آسمان) میں ایک چراغ (یعنی آفتاب) اور نورانی چاند بنایا (شاید آفتاب کو سراج بوجہ تیزی کے کہا) اور وہ ایسا ہے جس نے رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والے بنائے (اور یہ سب کچھ جو دلائل توحید اور اللہ کی نعمتوں کا ذکر ہوا ہے) اس شخص کے (سمجھنے کے) لئے (ہیں) جو سمجھنا چاہے یا شکر کرنا چاہے (کہ اس میں سمجھنے والے کی نظر میں استدلالات ہیں اور شکر گزاری کرنے والے کی نظر میں انعامات ہیں) ورنہ ؎

اگر صد باب حکمت پیش ناداں ❖ بخوانی آیدش بازیچہ در گوش

معارف و مسائل

مخلوقات الٰہیہ میں اسباب و مسببات کا رشتہ اور ان سب کا قدرت حق کا تابع ہونا مذکور الصدر آیات میں حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور بندوں پر اسکے انعامات و احسانات کا ذکر ہے جس سے حق تعالیٰ کی توحید اور استحقاق عبادت میں اسکے ساتھ کسی کا شریک نہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ، دھوپ اور چھاؤں دونوں ایسی نعمتیں ہیں کہ ان کے بغیر انسانی زندگی اور اسکے کاروبار نہیں چل سکتے۔ ہر وقت ہر جگہ دھوپ ہی دھوپ ہو جائے تو انسان اور ہر جاندار کے لئے کیسی مصیبت ہو جائے یہ تو ظاہر ہے اور سایہ کا بھی یہی حال ہے کہ اگر ہر جگہ ہر وقت سایہ ہی رہے کبھی دھوپ نہ آوے تو انسان کی صحت و تندرستی نہیں رہ سکتی، اور بھی ہزاروں کاموں میں خلل آئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں نعمتیں اپنی قدرت کاملہ سے پیدا فرمائیں اور انسانوں کے لئے ان کو موجب راحت و سکون بنایا۔ لیکن حق تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے اس دنیا میں پیدا ہونے والی تمام اشیاء کو خاص خاص اسباب کے ساتھ مربوط کر دیا ہے کہ جب وہ اسباب موجود ہوتے ہیں تو یہ چیزیں موجود ہو جاتی ہیں جب نہیں ہوتے تو یہ چیزیں بھی نہیں رہتیں۔ اسباب قوی یا زیادہ ہوتے ہیں تو ان کے مسببات کا وجود قوی اور زیادہ ہو جاتا ہے، وہ کمزور یا کم ہوتے ہیں تو

مُسببات بھی کمزور یا کم ہوجاتے ہیں۔ غلّہ اور گھاس اُگانے کا سبب زمین اور پانی اور ہوا کو بنا رکھا ہے روشنی کا سبب آفتاب ماہتاب کو بنا رکھا ہے۔ بارش کا سبب بادل اور ہواؤں کو بنا رکھا ہے۔ اور ان اسباب اور اُن پر مرتب ہونے والے اثرات میں ایسا مستحکم اور مضبوط ربط قایم فرما دیا ہے کہ ہزاروں سال سے بغیر کسی ادنیٰ فرق کے چل رہے ہیں۔ آفتاب اور اس کی حرکت اور اس سے پیدا ہونے والے دن رات اور دھوپ چھاؤں پر نظر ڈالو تو ایسا مستحکم نظام ہے کہ صدیوں بلکہ ہزاروں سال میں ایک منٹ بلکہ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا۔ نہ کبھی آفتاب و ماہتاب وغیرہ کی مشینری میں کوئی کمزوری آتی ہے، نہ کبھی ان کو اصلاح و مرمت کی ضرورت ہوتی ہے جب سے دُنیا وجود میں آئی ایک انداز ایک رفتار سے چل رہے ہیں حساب لگا کر ہزار سال بعد تک کی چیزوں کا وقت بتلایا جاسکتا ہے۔

سبب اور مُسبّب کا یہ مستحکم نظام جو حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا عجیب غریب شاہکار اور اُس کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کی بُرہان قطعی ہے اسکے استحکام ہی نے لوگوں کو غفلت میں ڈالدیا کہ ان کی نظروں میں صرف یہ اسبابِ ظاہرہ ہی رہ گئے اور انہی اسباب کو تمام چیزوں اور تاثیرات کا خالق و مالک سمجھنے لگے۔ مسبب الاسباب کی اصلی قوت جو ان اسباب کی پیدا کرنے والی ہے وہ اسباب کے پردوں میں مستور ہوگئی۔ اسلئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں انسان کو بار بار اس پر تنبیہ کرتی ہیں کہ ذرا نظر کو بلند اور تیز کرو، اسباب کے پردوں کے پیچھے دیکھو کون اس نظام کو چلا رہا ہے تاکہ حقیقت تک راہ پاؤ۔ اسی سلسلے کے یہ ارشادات ہیں جو آیات مذکورہ میں آئے۔ آیت اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ میں غافل انسان کو اس پر تنبیہ کیا گیا ہے کہ تم روزانہ دیکھتے ہو کہ صبح کو ہر چیز کا سایہ جانبِ غرب دراز ہوتا ہے، پھر وہ گھٹنا شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ نصف النہار کے وقت معدوم یا کالعدم ہوجاتا ہے پھر زوال کے بعد یہی سایہ اسی تدریجی رفتار کے ساتھ مشرق کی جانب میں پھیلنا شروع ہوتا ہے۔ ہر انسان اس دھوپ اور چھاؤں کے فوائد ہر روز حاصل کرتا ہے اور اُس کی آنکھیں دیکھتی ہیں کہ یہ سب کچھ آفتاب کے طلوع ہونے پھر بلند ہونے پھر غروب کی طرف مائل ہونے کے لازمی نتایج و ثمرات ہیں، لیکن آفتاب کے کرہ کی تخلیق پھر اسکے ایک خاص نظام کے تحت باقی رکھنے کا کام کس نے کیا، یہ آنکھوں سے نظر نہیں آتا اس کیلئے دل کی آنکھیں اور بصیرت درکار ہے۔

آیتِ مذکورہ میں یہی بصیرت انسان کو دینا مقصود ہے کہ یہ سایوں کا بڑھنا گھٹنا اگرچہ تمہاری نظروں میں آفتاب سے متعلق ہے مگر اس پر بھی تو غور کرو کہ آفتاب کو اس شان کیساتھ کس نے پیدا کیا اور اسکی حرکت کو ایک خاص نظام کے اندر کس نے باقی رکھا، جس کی قدرتِ کاملہ نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ ہی درحقیقت اس دھوپ چھاؤں کی نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے اگر وہ

چاہتا تو اس دھوپ چھاؤں کو ایک حالت پر قائم کر دیتا جہاں دھوپ ہے وہاں ہمیشہ دھوپ رہتی، جہاں چھاؤں ہے ہمیشہ چھاؤں رہتی مگر اس کی حکمت نے انسانی ضروریات و فوائد پر نظر کر کے ایسا نہیں کیا۔ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا کا یہی مطلب ہے۔

انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنے کے لئے سایہ کے واپس لوٹنے اور گھٹنے کو آیتِ مذکورہ میں اس عنوان سے تعبیر فرمایا ہے کہ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا، یعنی پھر سایہ کو ہم نے اپنی طرف سمیٹ لیا، یہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جسم اور جسمانیت اور جہت اور سمت سے بالاتر ہے، اسکی طرف سایہ کا سمٹنا، اسکا مفہوم یہی ہے کہ اُس کی قدرتِ کاملہ سے یہ سب کام ہوا۔

رات میں نیند اور دن میں کام کی تخصیص بھی بڑی حکمت پر مبنی ہیں

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا، اس آیت میں رات کو لباس کے لفظ سے تعبیر فرمایا کہ جس طرح لباس انسان کے پورے بدن کا ساتر ہے اسی طرح رات ایک قدرتی پردہ کی چادر ہے جو پوری کائنات پر ڈالدی جاتی ہے۔ سُبَاتًا، سبت سے مشتق ہے جس کے اصل معنی قطع کرنے کے ہیں۔ سُبَات وہ چیز ہے جس سے کسی دوسری چیز کو قطع کیا جائے۔

نیند کو اللہ تعالیٰ نے ایسی چیز بنایا ہے کہ دن بھر کی محنتوں کا تکان اور کمزوری اس سے قطع ہو جاتی ہے۔ افکار و خیالات منقطع ہو کر دماغ کو آرام ملتا ہے اسلئے سُبَات کا ترجمہ راحت کا کیا جاتا ہے معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ ہم نے رات کو ایک چھپانے والی چیز بنایا پھر اسمیں انسان اور سارے جانداروں پر نیند مسلط کر دی جو اُن کے آرام و راحت کا سامان ہے۔

یہاں کئی چیزیں قابلِ غور ہیں۔ اوّل یہ کہ نیند کا راحت ہونا بلکہ راحت کی جان ہونا تو ہر شخص جانتا ہے مگر انسانی فطرت یہ ہے کہ روشنی میں نیند آنا مشکل ہوتا ہے اور آ بھی جائے تو جلد آنکھ کھل جاتی ہے۔ حق تعالیٰ نے نیند کے مناسب رات کو تاریک بھی بنایا اور ٹھنڈا بھی۔ اسیطرح رات خود ایک نعمت ہے اور نیند دوسری نعمت، اور تیسری نعمت یہ ہے کہ سارے جہان کے انسانوں جانوروں کی نیند ایک ہی وقت رات میں جبری کر دی۔ ورنہ اگر ہر انسان کی نیند کے اوقات دوسرے انسان سے مختلف ہوتے تو جس وقت کچھ لوگ سونا چاہتے دوسرے لوگ کاموں میں مصروف اور شور و شغب کا سبب بنے رہتے۔ اسی طرح جب دوسروں کے سونے کی باری آتی تو اسوقت کام کرنے والے چلنے پھرنے والے ان کی نیند میں خلل انداز ہوتے۔ اس کے علاوہ ہر انسان کی ہزاروں حاجتیں دوسرے انسانوں سے وابستہ ہوتی ہیں باہمی تعاون و تناصر اور کاموں میں بھی شدید حرج ہوتا کہ جس شخص سے آپ کو کام ہے اُسکے سونے کا وقت ہے اور جب اُسکے جاگنے کا وقت آئیگا تو آپکا سونے کا وقت ہوگا۔

اگر ان مقاصد کی تکمیل کے لئے کسی بین الاقوامی معاہدہ سے کام لیا جاتا کہ سب لوگ اپنے سونے کا

وقت ایک ہی مقرر کرلیں، اوّل تو ایسا معاہدہ اربوں کروڑوں انسانوں میں ہونا آسان نہ تھا پھر اسپر کاربند رکھنے کے لئے ہزاروں محکمے کھولنے پڑتے اس کے باوجود عام قانونی اور معاہداتی طریقوں سے طے ہونیوالی چیزوں میں جو خلل ہر جگہ رشوت، رعایت وغیرہ کے سبب پایا جاتا ہے وہ پھر بھی باقی رہتا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے اپنی قدرت کاملہ سے نیند کا ایک وقت جبری طور پر مقرر کردیا ہے کہ ہر انسان اور ہر جانور کو اُسی وقت نیند آتی ہے کبھی کسی ضرورت سے جاگنا بھی چاہے تو اُس کے لئے مشکل سے انتظام کرپاتا ہے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

اسی طرح وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا، میں دن کو نشور یعنی زندگی فرمایا کیونکہ اسکا مقابل یعنی نیند ایک قسم کی موت ہے اور اس زندگی کے وقت کو بھی سارے انسانوں میں جبری طور پر ایک کردیا ہے ورنہ کچھ کارخانے اور دُکانیں دن کو بند رہتیں، رات کو کھلتیں، اور جب وہ کھلتیں تو دوسری بند ہوجاتیں۔ اس لحاظ سے دونوں میں کاروباری مشکلات پیش آتیں۔

جس طرح رات کو نیند کے لئے مخصوص فرماکر ایک بڑا انعام حق تعالیٰ نے فرمایا اسی طرح دوسری ضروریاتِ زندگی جو باہم اشتراک چاہتی ہیں اُن کے لئے بھی تقریبی طور پر ایسے ہی متحد اور مشترک وقت مقرر کردیئے۔ مثلاً بھوک اور کھانے کی ضرورت صبح شام ایک امر مشترک ہے سب کو ان اوقات میں اسکی فکر ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں سب ضروریات کی فراہمی ہر ایک کے لئے آسان ہوجاتی ہیں کھانے کے ہوٹل اور دُکانیں ان وقتوں میں تیار کھانے سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہر گھر میں یہ اوقات کھانے کی مصروفیت کے لئے متعین ہیں۔ یہ تعیین کی بڑی نعمت ہے جو حق تعالیٰ ہی کی حکمت بالغہ نے فطری طور پر انسان کی طبیعت میں رکھدی ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً طَهُوْرًا، طہور کا لفظ عربی زبان میں مبالغہ کا صیغہ ہے۔ طہور اُس کو کہا جاتا ہے جو خود بھی پاک ہو اور دوسری چیزوں کو بھی اُس سے پاک کیا جاسکے۔ حق تعالیٰ نے پانی کو یہ خاص صفت عطا فرمائی ہے کہ جیسے وہ خود پاک ہے اُس سے دوسری ہر قسم کی نجاست حقیقی و معنوی کو بھی دُور کیا جاسکتا ہے۔ اور جس پانی کو آدمی استعمال کرتے ہیں وہ عموماً وہی ہے جو آسمان سے نازل ہوتا ہے کبھی بارش کی صورت میں کبھی برف اور اولے کی صورت میں پھر وہ ہی پانی پہاڑوں کی رگوں کے ذریعہ قدرتی پائپ لائن کی صورت میں ساری زمین پر پھیلتا ہے جو کہیں خود بخود چشموں کی صورت میں نکل کر زمین پر بہنے لگتا ہے۔ کہیں زمین کھود کر کنویں کی صورت میں نکالا جاتا ہے یہ سب پانی اپنی ذات سے پاک اور دوسری چیزوں کو پاک کرنیوالا ہے اس پر قرآن و سنت کی نصوص بھی ناطق ہیں اور اُمت کا اجماع بھی۔

یہ پانی جب تک کثیر مقدار میں ہو، جیسے تالاب، حوض، نہر کا پانی اس میں کوئی نجاست بھی گر جائے

تو ناپاک نہیں ہوتا اس پر بھی سب کا اتفاق ہے بشرطیکہ پانی میں نجاست کا اثر ظاہر نہ ہو اور اسکا رنگ ذائقہ بُو متغیر نہ ہو، لیکن تھوڑا پانی ہو جسمیں نجاست گر جائے تو اسکا کیا حکم ہے؟ اس مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے اسی طرح پانی کی کثیر و قلیل کی مقدار معین کرنے میں اقوال مختلف ہیں تفسیر مظہری اور قرطبی میں اس جگہ پانی سے متعلق تمام مسائل تفصیل کیساتھ لکھے ہیں اور یہ مسائل عام کتب فقہ میں بھی مذکور ہیں اس لئے یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

وَنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا، اناسی، انسی کی جمع ہے اور بعض نے فرمایا کہ انسان کی جمع ہے۔ آیت میں یہ بتلایا ہے کہ آسمان سے نازل کردہ پانی سے اللہ تعالیٰ زمین کو بھی سیراب کرتا ہے اور جانوروں کو بھی اور بہت سے انسانوں کو بھی۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جس طرح جانور سب کے سب اس پانی سے سیراب ہوتے ہیں اسی طرح انسان بھی سبھی اس پانی سے فائدہ اٹھاتے اور سیراب ہوتے ہیں پھر اس میں یہ تخصیص کہ بہت سے انسانوں کو سیراب کیا اس کی تو یہ لازم آتا ہے کہ بہت سے انسان اس سیرابی سے محروم اور الگ ہیں۔ جواب یہ ہے کہ یہاں بہت سے انسانوں سے وہ جنگل کے رہنے والے لوگ مراد ہیں جنکا عموماً گزارہ بارش کے پانی پر ہوتا ہے۔ شہری آبادی والے تو نہروں کے کناروں پر کنوؤں کے قریب آباد ہوتے ہیں بارش کے منتظر نہیں رہتے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ، مطلب آیت کا یہ ہے کہ بارش کو ہم بدلتے اور پھیرتے رہتے ہیں کبھی ایک شہر میں کبھی دوسرے میں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ جو لوگوں میں شہرت ہوتی ہے کہ اس سال بارش زیادہ ہے اس سال کم ہے یہ حقیقت کے اعتبار سے صحیح نہیں بلکہ بارش کا پانی تو ہر سال اللہ تعالیٰ کیطرف سے یکساں نازل ہوتا ہے البتہ بحکم الٰہی یہ ہوتا رہتا ہے کہ اس کی مقدار کسی شہر بستی میں زیادہ کر دی کسی میں کم کر دی۔ بعض اوقات کمی کر کے کسی بستی کے لوگوں کو سزا دینا اور متنبہ کرنا ہوتا ہے اور بعض اوقات زیادتی بھی عذاب بن جاتی ہے۔ تو یہی پانی جو خالص رحمت ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور نافرمانی کرتے ہیں اُن کے لئے اسی کو عذاب اور سزا بنا دیا جاتا ہے۔

جہاد بالقرآن یعنی قرآن کی دعوت کو پھیلانا جہاد کبیر ہے

وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا، یہ آیت مکی ہے جبکہ احکام کفار سے قتال و جنگ کے نازل نہیں ہوئے تھے اسی لئے یہاں جہاد کو بِهٖ کے ساتھ مقید کیا گیا۔ بِهٖ کی ضمیر قرآن کیطرف راجع ہے معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کے ذریعہ مخالفین اسلام سے جہاد کرو بڑا جہاد۔ قرآن کے ذریعہ اس جہاد کا حاصل اسکے احکام کی تبلیغ اور خلق خدا کو اس کی طرف توجہ دینے کی ہر کوشش ہے خواہ زبان سے ہو یا قلم سے یا دوسرے طریقوں سے اس سب کو یہاں جہاد کبیر فرمایا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا، لفظ مَرَجَ آزاد چھوڑ دینے کے معنے میں آتا ہے اسی وجہ سے مَرَج چراگاہ

کو کہتے ہیں جہاں جانور آزادی سے چلیں پھریں اور چریں۔ عَذْبٌ میٹھے پانی کو کہا جاتا ہے۔ فُرَاتٌ خوش ذائقہ اور خوشگوار مِلْحٌ نمکین اُجَاجٌ تیز و تلخ۔

حق تعالیٰ نے اپنے فضل اور حکمتِ بالغہ سے دنیا میں دو طرح کے دریا پیدا فرمائے ہیں۔ ایک سب سے بڑا بحرِ محیط جس کو سمندر کہتے ہیں اور زمین کے سب اطراف اسی میں گھرے ہوئے ہیں ایک چوتھائی کے قریب حصہ ہے جو اس سے کھلا ہوا ہے اسی میں ساری دُنیا آباد ہے۔ یہ سب سے بڑا دریا بتقاضائے حکمت سخت نمکین تلخ اور بدمزہ ہے۔ زمین کے آباد حصے پر آسمان سے اُتارے ہوئے پانی کے چشمے، ندیاں نہریں اور بڑے بڑے دریا ہیں یہ سب میٹھے خوشگوار اور خوش ذائقہ ہیں۔ انسان کو اپنے پینے اور پیاس بجھانے اور روز مرہ کے استعمال میں ایسے ہی شیریں پانی کی ضرورت ہے جو حق تعالیٰ نے زمین کے آباد حصہ میں مختلف صورتوں میں مہیا فرما دیا ہے۔ لیکن بحرِ محیط سمندر اگر میٹھا ہوتا تو میٹھے پانی کا خاصہ ہے کہ بہت جلد سڑ جاتا ہے۔ خصوصاً سمندر جس میں خشکی کی آبادی سے زیادہ دریائی انسانوں جانوروں کی آبادی بھی ہے جو اسی میں مرتے ہیں وہیں سڑتے اور مٹی ہو جاتے ہیں اور پوری زمین کے پانی اور اس میں بہنے والی ساری گندگیاں بھی بالآخر سمندر میں جاکر پڑتی ہیں۔ اگر یہ پانی میٹھا ہوتا تو دو چار دن میں ہی سڑ جاتا اور یہ سڑتا تو اس کی بدبو سے زمین والوں کو زمین پر رہنا مصیبت ہو جاتا۔ اسلئے حکمتِ خداوندی نے اس کو اتنا سخت نمکین اور کڑوا اور تیز بنا دیا کہ دُنیا بھر کی گندگیاں اسی میں جاکر بھسم ہو جاتی ہیں اور خود اسی میں رہنے والی مخلوق بھی جو اسی میں مرتی ہے وہ بھی سڑنے نہیں پاتی۔

آیتِ مذکورہ میں ایک تو اس انعام و احسان کا ذکر ہے کہ انسان کی ضرورت کا لحاظ فرما کر دو قسم کے دریا پیدا فرمائے۔ دوسرے اس قدرتِ کاملہ کا کہ جس جگہ میٹھے پانی کا دریا یا نہر سمندر میں جاکر گرتے ہیں اور میٹھا اور کڑوا دونوں پانی یکجا ہو جاتے ہیں وہاں یہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ دونوں پانی میلوں دُور تک اسطرح ساتھ لگے ہوئے چلتے ہیں کہ ایک طرف میٹھا، دوسری طرف کڑوا اور ایک دوسرے سے نہیں ملتے، حالانکہ ان دونوں کے درمیان کوئی آڑ حائل نہیں ہوتی۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا، نسب اس رشتہ اور قرابت کو کہا جاتا ہے جو باپ یا ماں کیطرف سے ہو، اور صِہر وہ رشتہ و تعلق ہے جو بیوی کیطرف سے ہو جس کو عرف میں سُسرال بولتے ہیں۔ یہ سب تعلقات اور قرابتیں اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں جو انسان کی خوشگوار زندگی کے لئے لازمی ہیں، اکیلا آدمی کوئی کام بھی نہیں کر سکتا۔

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا، یعنی تمھیں ایمان کی دعوت اور اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانے اور دُنیا و آخرت میں تمھارے لئے فلاح کی کوشش کرنے میں میرا کوئی دُنیوی فائدہ نہیں۔ میں اپنی اس محنت کا تم سے کوئی اجر و معاوضہ

نہیں مانگتا، میرا فائدہ اسکے سوا نہیں کہ جسکا جی چاہے اللہ کا راستہ اختیار کرلے - اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص راہ پر آجاوے تو فائدہ اُسی کا ہے اس کو اپنا فائدہ قرار دینا پیغمبرانہ شفقت کیطرف اشارہ ہے کہ میں تمہارے فائدہ ہی کو اپنا فائدہ سمجھتا ہوں۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی بوڑھا ضعیف باپ اولاد کو کہے کہ تم کھاؤ پیو اور خوش رہو، یہی میرا کھانا پینا اور خوش رہنا ہے - اور یہ بھی احتمال ہے کہ اسکو اپنا فائدہ اس لحاظ سے فرمایا ہو کہ اسکا ثواب آپ کو ملے گا جیسا کہ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ جو شخص کسی کو نیک کاموں کی ہدایت کرتا ہے اور وہ اسکے کہنے کے مطابق نیک عمل کرے تو اسکے عمل کا ثواب خود کرنے والے کو بھی پورا پورا ملے گا اور اتنا ہی ثواب ہدایت کرنے والے شخص کو بھی ملے گا (مظہری)

فَسۡـَٔلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا، یعنی آسمانوں زمینوں کو پیدا کرنا پھر اپنی شان کے مطابق اُن پر جلوہ افروز ہونا سب اللہ رحمٰن کا کام ہے اس کی تصدیق و تحقیق مطلوب ہو تو کسی باخبر سے پوچھئے۔ باخبر سے مراد حق تعالیٰ یا جبرئیل امین ہیں اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مُراد کتب سابقہ کے علماء ہوں جن کو اپنے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اس معاملہ کی اطلاع ملی ہے - (مظہری)

قَالُوۡا وَمَا الرَّحۡمٰنُ لفظ رحمٰن عربی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی سب عرب جانتے تھے مگر یہ لفظ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے نہ بولتے تھے اسی لئے یہاں یہ سوال کیا کہ رحمٰن کون اور کیا ہے -

تَبٰرَكَ الَّذِيۡ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوۡجًا وَّجَعَلَ فِيۡهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيۡرًا ۝ وَهُوَ الَّذِيۡ جَعَلَ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ خِلۡفَةً لِّمَنۡ اَرَادَ اَنۡ يَّذَّكَّرَ اَوۡ اَرَادَ شُكُوۡرًا ۝

مقصود ان آیات سے انسان کو یہ تبلانا ہے کہ ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے اور شمس و قمر اور انکے ذریعہ رات دن کا انقلاب اور انکی تاریکی اور روشنی اور زمین و آسمان کی تمام کائنات اسلئے پیدا کئے ہیں کہ غور و فکر کرنیوالے کو اسمیں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور توحید کے دلائل فراہم ہوں - اور شکر گزار کے لئے شکر کے مواقع ملیں تو جس شخص کا وقت دُنیا میں ان دونوں چیزوں سے خالی گذر گیا اسکا وقت ضائع ہو گیا اور اسکا راس المال بھی فنا ہو گیا اللّٰھم اجعلنا من الذاکرین الشاکرین -

ابن عربی فرماتے ہیں کہ میں نے شہید اکبر سے سُنا ہے کہ بڑے غبن اور خسارہ میں ہے وہ آدمی جسکی عمر ساٹھ سال ہوئی۔ اسمیں سے آدھا وقت تیس سال رات کو سونے میں گزر گئے اور چھٹا حصہ یعنی دس سال دن کو آرام کرنے میں گزر گیا تو ساٹھ میں سے صرف بیس سال کام میں لگے - قرآن حکیم نے اس جگہ بڑے بڑے ستاروں اور سیاروں اور فلکیات کا ذکر کرنے کے بعد یہ بھی تبلا دیا کہ قرآن ان چیزوں کا ذکر بار بار اسلئے کرتا ہے کہ تم ان کی تخلیق اور ان کی حرکات اُن سے پیدا ہونے والے آثار میں غور کر کے اُن کے پیدا کرنے والے اور چلانے والے کو پہچانو اور شکر گزاری کیساتھ اُسے یاد کرتے رہو - باقی رہا یہ مسئلہ کہ اجرام سماویہ اور فلکیات کی حقیقت اور ہیئت کیا ہے یہ آسمانوں کے جرم کے اندر سمائے ہوئے ہیں یا اُن سے باہر کی فضائی آسمانی میں ہیں - انسان کے معاش یا معاد کا کوئی مسئلہ اس سے وابستہ نہیں اور ان کی حقیقت کا معلوم کرنا انسان کے

لئے آسان بھی نہیں۔ جن لوگوں نے اپنی عمریں اس کام میں صرف کی ہیں انکے اقرار سے ثابت ہے کہ وہ بھی کوئی قطعی اور آخری فیصلہ نہیں کر سکے اور جو فیصلے کئے وہ بھی خود دوسرے حکمار کی مخالف تحقیقات نے مخدوش مجروح کر دیئے ہیں، اس لئے تفسیر قرآن میں اس سے زیادہ کسی بحث میں پڑنا بھی کوئی قرآن کی ضروری خدمت نہیں۔ لیکن اس زمانے کے ماہرین سائنس نے مصنوعی سیارات اُڑانے اور چاند تک پہنچ جانے اور وہاں کی مٹی پتھر، غاروں، پہاڑوں کے فوٹو فراہم کرنے میں بلاشبہ حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے مگر افسوس ہے کہ قرآن حکیم ان چیزوں سے انسان کو جس حقیقت شناسی کا سبق دینا چاہتا ہے یہ لوگ اپنی تحقیق کا وشوں کے غرور میں مست ہو کر اُس سے اور زیادہ دُور ہو گئے اور عام لوگوں کے ذہنوں کو بھی بُری طرح اُلجھا دیا، کوئی ان چیزوں کو قرآن کے خلاف سمجھ کر مشاہدات کا ہی انکار کر دیتا ہے کوئی قرآن کریم میں تاویلات کرنے لگتا ہے اسلئے ضروری معلوم ہوا کہ بقدر ضرورت تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کو واضح کر دیا جائے۔ سُورۂ حجر کی آیت وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا کے تحت اسکا وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ سُوْرَۃ فرقان میں اسکی تفصیل لکھی جاویگی وہ حسب ذیل ہے وَاللّٰهُ الموفق

جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا کے الفاظ سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بُروج یعنی سیارے آسمانوں کے اندر ہیں کیونکہ حرف فی ظرفیت کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ اسی طرح سُوْرَۃ نوح میں ہے اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا اسمیں فِيهِنَّ کی ضمیر سبع سمٰوات کی طرف راجع ہے جس سے ظاہراً یہی مفہوم ہوتا ہے کہ چاند آسمانوں کے اندر ہے۔

ستارے اور سیارے آسمانوں کے اندر ہیں یا باہر قدیم و جدید علم ہیئت کے نظریات اور قرآن کریم کے ارشادات

لیکن یہاں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ اوّل تو یہ کہ قرآن کریم میں لفظ سماء جس طرح اس عظیم الشان اور وہم و گمان سے زائد وسعت رکھنے والی مخلوق کے لئے استعمال ہوتا ہے جسمیں قرآن کی تصریحات کے مطابق دروازے ہیں اور دروازوں پر فرشتوں کے پہرے ہیں جو خاص خاص اوقات میں کھولے جاتے ہیں اور جن کی تعداد قرآن کریم نے سات بتلائی ہے اسی طرح یہ لفظ سماء ہر بلند چیز جو آسمان کی طرف ہو اُس پر بھی بولا جاتا ہے۔ آسمان زمین کے درمیان کی فضار اور اُس سے آگے جس کو آجکل کی اصطلاح میں خلا بولتے ہیں یہ سب دوسرے معنی کے اعتبار سے لفظ سماء کے مفہوم میں داخل ہیں۔ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُوْرًا، اور اسی طرح کی دوسری آیتیں جنمیں آسمان سے پانی برسانے کا ذکر ہے ان کو اکثر مفسرین نے اسی دوسرے معنی پر محمول فرمایا ہے کیونکہ عام مشاہدات سے بھی یہ ثابت ہے کہ بارش ان بادلوں سے برستی ہے جو آسمان کی بلندی سے کوئی نسبت نہیں رکھتے اور خود قرآن کریم نے بھی دوسری آیات میں بادلوں سے پانی برسانے کی تصریح فرمائی ہے ارشاد ہے ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ اسمیں مزن، مزنۃ کی جمع ہے جس کے معنی سفید بادل کے آتے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ کیا بارش کو سفید بادلوں

سے تم نے اُتارا ہے یا ہم نے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا، اس میں معصرات کے معنی پانی سے بھرے ہوئے بادل ہیں اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہم نے ہی پانی بھرے بادلوں سے کثرت سے پانی برسایا۔ قرآن مجید کی ان واضح تصریحات اور عام مشاہدات کی بنا پر جن آیاتِ قرآن میں بارش کا آسمان سے برسانا مذکور ہے اُن میں بھی اکثر مفسرین نے لفظ سماء کے یہی دوسرے معنی لئے ہیں یعنی فضاء آسمانی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب قرآن کریم اور لُغت کی تصریحات کیمطابق لفظ سماء فضائے آسمانی کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور خود جرم آسمان کیلئے بھی۔ تو ایسی صورتیں جن آیات میں کواکب اور سیارات کیلئے فِی السَّمَآءِ کا لفظ استعمال ہوا ہے اُنکے مفہوم میں دونوں احتمال موجود ہیں کہ یہ کواکب اور ستارے جرم آسمان کے اندر ہوں یا فضائے آسمانی میں آسمانوں کے نیچے ہوں۔ اور دو احتمالوں کے ہوتے ہوئے کوئی قطعی فیصلہ قرآن کیطرف منسوب نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن نے ستاروں اور سیاروں کو آسمان کے اندر قرار دیا ہے یا اُن سے باہر فضائے آسمانی میں۔ بلکہ الفاظِ قرآن کے اعتبار سے دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ کائنات کی تحقیقات اور تجربے اور مشاہدے سے جو صورت بھی ثابت ہو جائے قرآن کی کوئی تصریح اسکے منافی نہیں ہے۔

حقائقِ کونیہ اور قرآن یہاں ایک بات اُصولی طور پر سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کوئی فلسفہ یا ہیئت کی کتاب نہیں جسکا موضوع بحث حقائقِ کائنات یا آسمانوں اور ستاروں کی ہیئت و حرکات وغیرہ کا بیان ہو مگر اسکے ساتھ ہی وہ آسمان و زمین اور اُنکے درمیان کی کائنات کا ذکر بار بار کرتا ہے اُنمیں غور و فکر کیطرف دعوت بھی دیتا ہے۔ قرآن کریم کی ان تمام آیات میں غور کرنے سے واضح طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن عزیز ان حقائقِ کونیہ کے متعلق انسان کو صرف وہ چیزیں بتلانا چاہتا ہے جن کا تعلق اسکے عقیدے اور نظریے کی درستی سے ہو یا اسکے دینی اور دنیوی منافع اُن سے متعلق ہوں۔ مثلاً قرآن کریم نے آسمان زمین اور ستاروں، سیاروں کا اور اُن کی حرکات اور حرکات سے پیدا ہونے والے آثار کا ذکر بار بار ایک تو اس مقصد سے کیا ہے کہ انسان ان کی عجیب و غریب صنعت اور مافوق العادت آثار کو دیکھ کر یہ یقین کرے کہ یہ چیزیں خود بخود پیدا نہیں ہوگئیں ان کو پیدا کرنے والا کوئی سب سے بڑا حکیم سب سے بڑا علیم اور سب سے بڑا صاحبِ قدرت و قوت ہے۔ اور اس یقین کے لئے ہرگز اس کی ضرورت نہیں کہ آسمانوں کی اور فضائی مخلوقات اور ستاروں سیاروں کے مادے کی حقیقت اور اُن کی اصلی ہیئت و صورت اور اُن کے پورے نظام کی پوری کیفیت اس کو معلوم ہو بلکہ اسکے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے جسکو ہر شخص مشاہدہ سے دیکھتا اور سمجھتا ہے کہ شمس و قمر اور دوسرے ستاروں کے کبھی سامنے آنے اور کبھی غائب ہو جانے سے نیز چاند کے گھٹنے بڑھنے سے اور رات دن کے انقلاب سے پھر مختلف موسموں اور مختلف خطوں میں دن رات کے گھٹنے بڑھنے کے عجیب و غریب نظام سے جسمیں ہزاروں سال سے کبھی ایک منٹ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا، ان سب اُمور سے

ایک ادنیٰ عقل و بصیرت رکھنے والا انسان یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ حکیمانہ نظام یوں ہی خود بخود نہیں چل رہا کوئی اسکو بنانے چلانے والا اور باقی رکھنے والا ہے اور اتنا سمجھنے کے لئے انسان کو نہ کسی فلسفی تحقیق اور آلات رصدیہ وغیرہ کی حاجت پڑتی ہے نہ قرآن نے اسکی طرف دعوت دی۔ قرآن کی دعوت صرف اُسی حد تک ان چیزوں میں غور و فکر کی ہے جو عام مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے آلات رصدیہ بنانے یا مہیا کرنے اور اجرام سماویہ کی ہیئتیں دریافت کرنیکا مطلقاً کوئی اہتمام نہیں فرمایا۔ اگر ان آیات کونیہ میں تدبر اور غور و فکر کا یہ مطلب ہوتا کہ انکے حقائق اور ہیئات اور اُن کی حرکات کا فلسفہ معلوم کیا جائے تو یہ ناممکن تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسکا اہتمام نہ فرماتے، خصوصاً جبکہ ان فنون کا رواج اور تعلیم و تعلّم کا سلسلہ دنیا میں اُس وقت موجود بھی تھا۔ مصر، شام، ہند، چین وغیرہ میں ان فنون کے جاننے والے اور ان پر کام کرنے والے موجود تھے حضرت مسیح علیہ السلام سے پانسو سال پہلے فیثا غورس کا اور اُسکے کچھ بعد بطلیموس کا نظریہ دنیا میں شائع اور رائج ہو چکا تھا اور اُس زمانے کے حالات کے مناسب آلاتِ رصدیہ وغیرہ ایجاد بھی ہو چکے تھے مگر جس ذاتِ قدسی پر یہ آیات نازل ہوئیں اور جن صحابہ کرام نے بلا واسطہ آپ سے ان کو پڑھا اُنھوں نے کبھی اسطرف التفات تک نہیں فرمایا۔ اس سے قطعی طور پر معلوم ہوا کہ ان آیاتِ کونیہ میں تدبر اور غور و فکر کا وہ منشار ہرگز نہ تھا جو آجکل کے بعض تجدد پسند علماء نے یورپ اور اُس کی تحقیقات سے متاثر ہو کر اختیار کیا ہے کہ خلائی سفر، چاند اور مریخ و زہرہ پر کمندیں پھینکنے کی مساعی قرآن کریم کے تقاضے کو پورا کرنا ہے۔

بس صحیح بات یہ ہے کہ قرآن کریم نہ ان فلسفی اور سائنسی تحقیقات قدیمہ یا جدیدہ کیطرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے نہ اُن سے بحث کرتا ہے اور نہ اُن کی مخالفت کرتا ہے۔ قرآن کریم کا حکیمانہ اصول اسلوب کائنات و مخلوقات سے متعلقہ تمام فنون کے بارے میں یہی ہے کہ وہ ہر فن کی چیزوں سے صرف اُسی قدر لیتا اور بیان کرتا ہے جسقدر انسان کی دینی یا دنیوی ضرورت سے متعلق ہے اور جس کو انسان آسانی سے حاصل بھی کر سکتا ہے اور جس کے حصول پر تخمیناً اس کو اطمینان بھی ہو سکتا ہے فلسفیانہ دور از کار بحثوں سے اور ایسی تحقیقات سے جو عام انسانوں کے قابو سے باہر ہیں اور جن کو کچھ حاصل کر لینے کے بعد بھی قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہی صحیح ہیں بلکہ حیرانی اور شکوک بڑھتے ہیں، ایسی بحثوں میں انسان کو نہیں اُلجھاتا۔ کیونکہ قرآن کی نظر میں انسان کی منزلِ مقصود ان تمام زمینی اور آسمانی کائنات و مخلوقات سے آگے اپنے خالق کی مرضیات پر چل کر جنت کی دائمی نعمتوں اور راحتوں کو حاصل کرنا ہے۔ حقائق کائنات کی بحث نہ اس کے لئے ضروری ہے اور نہ اس پر پورا عبور انسان کے بس میں ہے۔ ہر زمانے کے فلاسفروں اور ماہرین فلکیات کے نظریات میں شدید اختلافات اور روزمرہ کے نئے

اکتشافات اس کی واضح دلیل ہیں کہ کسی نظریہ اور تحقیق کو یقینی اور آخری نہیں کہا جا سکتا۔ انسانی ضرورت سے متعلقہ تمام فنون، فلکیات، کائنات فضا، ابر و باراں، خلا، طبقات الارض، پھر زمین پر پیدا ہونے والی مخلوقات، جمادات، نباتات، حیوانات سے اور عام انسان اور انسانی علوم و فنون، تجارت، زراعت صنعت وغیرہ ان سب میں قرآن حکیم صرف اُن کی رُوح اور مشاہداتی حصہ کو اسقدر لیتا ہے جس سے انسان کی دینی یا دُنیوی ضرورت متعلق ہے، دوراز کار تحقیقات کی دلدل میں انسان کو نہیں پھنساتا البتہ کہیں کہیں کسی خاص مسئلے کی طرف اشارہ یا صراحت بھی پائی جاتی ہے۔

تفسیر قرآن میں فلسفی نظریات کی موافقت یا مخالفت کا صحیح معیار علماء اہل حق قدیم و جدید اس پر متفق ہیں کہ ان مسائل کے متعلق جو بات قرآن کریم سے یقینی طور پر ثابت ہے، اگر کوئی قدیم یا جدید نظریہ اُس سے مختلف ہو تو اس کی وجہ سے قرآنی آیات میں کھینچ تان اور تاویل جائز نہیں، اس نظریہ ہی کو مغالطہ قرار دیا جائے گا، البتہ جن مسائل میں قرآن کریم کی کوئی تصریح موجود نہیں الفاظ قرآنی میں دونوں معنے کی گنجائش ہے وہاں اگر مشاہدات اور تجربے سے کسی ایک نظریہ کو قوت حاصل ہو جائے تو آیتِ قرآن کو بھی اسی معنی پر محمول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جیسے اسی آیت جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا میں ہے کہ قرآن کریم نے اس بارہ میں کوئی واضح فیصلہ نہیں دیا کہ ستارے آسمان کے اندر ہیں یا باہر فضائے آسمانی میں ہیں، آجکل جبکہ خلائی تجربات نے یہ ثابت کر دیا کہ ان سیارات تک پہنچا جا سکتا ہے تو اس سے فیثاغورسی نظریہ کی تائید ہو گئی کہ ستارے آسمانوں میں پیوست نہیں کیونکہ قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کی تصریحات کی رُو سے آسمان ایک ایسا حصار ہے جس میں دروازے ہیں اور دروازوں پر فرشتوں کا پہرہ ہے اُن میں ہر شخص داخل نہیں ہو سکتا۔ اس مشاہدے اور تجربے کی بناء پر آیت مذکورہ کا یہ مفہوم قرار دیا جائیگا کہ کواکب کو فضائے آسمانی میں پیدا کیا گیا ہے اور یہ کوئی تاویل نہیں بلکہ دو مفہوم میں سے ایک کی تعیین ہے۔

لیکن اگر کوئی سرے سے آسمانوں کے وجود کا انکار کرے جیسے بعض ہیئتِ جدید والے کہتے ہیں یا کوئی یہ دعویٰ کرے کہ راکٹوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ آسمانوں کے اندر داخلہ ہو سکتا ہے تو از روئے قرآن اُس دعوے کو غلط قرار دیا جائے گا کیونکہ قرآن کریم نے متعدد آیات میں یہ بات واضح طور پر بتلائی ہے کہ آسمانوں میں دروازے ہیں اور وہ دروازے خاص خاص حالات میں کھولے جاتے ہیں ان دروازوں پر فرشتوں کا پہرہ مسلط ہے۔ آسمانوں میں داخلہ ہر شخص کا جب چاہے نہیں ہو سکتا، اس دعوے کی وجہ سے اُن آیات میں کوئی تاویل نہیں کیجائیگی اور اس دعوے کو غلط قرار دیا جائے گا۔

اسی طرح جبکہ قرآن کریم کی آیت كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ سے ستاروں کا حرکت کرنا ثابت ہے تو اس معاملہ میں بطلیموسی نظریہ کو غلط قرار دیا جائیگا جس کی رُو سے ستارے آسمان کے جرم میں پیوست ہیں وہ خود حرکت نہیں کرتے بلکہ آسمان کی حرکت کے تابع اُن کی حرکت ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قدیم مفسرین میں سے بعض لوگ جو فلکیات کے متعلق بطلیموسی نظریے کے معتقد تھے اُنھوں نے اُن آیاتِ قرآنی میں تاویلات سے کام لیا جن سے بطلیموسی نظریہ کیخلاف کوئی چیز سمجھی جاتی تھی اسی طرح آج کے بعض مصنفین جن آیات کو جدید ہیئت کے نظریات سے مختلف سمجھتے ہیں انھیں تاویلات کر کے اُسکے مطابق بنانے کی فکر کرتے ہیں یہ دونوں صورتیں درست نہیں سلف صالحین کے طریقے کیخلاف اور قابلِ تردید ہے۔ البتہ واقعہ یہی ہے کہ اسوقت تک ہیئتِ جدیدہ نے جو نئی تحقیقات پیش کی ہیں اُن میں آسمانوں کے انکار کے سوا کوئی بھی قرآن و سُنت کیخلاف نہیں، بعض لوگ اپنے قصورِ علم سے اُن کو قرآن یا سنت کیخلاف سمجھ کر تاویلات کے درپے ہو جاتے ہیں۔

زمانۂ حال کے سب سے بڑے مفسرِ قرآن سید محمود آلوسی بغدادی جن کی تفسیر روح المعانی علماءِ سلف کی تفاسیر کا بہترین خلاصہ اور عرب و عجم مشرق و مغرب میں مقبول و مستند تفسیر ہے۔ موصوف جسطرح قرآن و سُنت کے متبحر عالم ہیں اسی طرح فلسفہ و ہیئت قدیم و جدید کے بھی بڑے عالم ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تفسیر میں تحقیقاتِ فلسفیہ کے متعلق یہی اُصول قرار دیا ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے اور اُن کے پوتے علامہ سید محمود شکری آلوسی نے ان مسائل پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے مادل علیہ القرآن مما یعضد الھیئۃ الجدیدۃ القویمۃ البرھان جسمیں ہیئت جدیدہ کے نظریات کی تائید قرآن کریم کی روشنی میں کی گئی ہے مگر دوسرے تجدد پسند علماء کی طرح قرآنی آیات میں کسی قسم کی تاویل کو روا نہیں رکھا۔ اُن کے چند جملے اس جگہ نقل کر دینا کافی ہیں جو ہیئتِ جدیدہ کی تائید میں لکھے ہیں وہ فرماتے ہیں:

رأیت کثیرا من قواعدھا لا یعارض النصوص الواردۃ فی الکتاب والسنۃ علی انھا لو خالفت شیئا من ذلک لم یلتفت الیھا ولم نؤول النصوص لاجلھا والتاویل فیھا لیس من مذاھب السلف الحریۃ بالقبول بل لا بد ان نقول ان المخالف لھا مشتمل علی خلل فیہ فان العقل الصریح لا یخالف النقل الصحیح بل کل منھما یصدق الآخر ویؤیدہ (ما دل علیہ القرآن)

میں نے ہیئتِ جدیدہ کے بہت سے قواعد کو دیکھا ہے وہ قرآن و سنت کی نصوص کیخلاف نہیں۔ اور اسکے باوجود اگر وہ قرآن و سُنت کی کسی نص کیخلاف ہو تو ہم اسکی طرف رُخ نہ کرینگے اور قرآن و سنت کی نصوص میں اس کیوجہ سے تاویل نہ کریں گے کیونکہ ایسی تاویل سلف صالحین کے مذہب مقبول میں نہیں ہے بلکہ ہم اُسوقت یہ کہیں گے کہ جو نظریہ قرآن و سنت کیخلاف ہے اس ہی میں کوئی خلل ہے کیونکہ عقلِ سلیم اور نقلِ صحیح میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ فلکیات اور ستاروں، سیاروں کی حرکات اور ہیئات کے متعلق بحث و تحقیق کوئی نیا فن نہیں، ہزاروں سال پہلے سے ان مسائل پر تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ مصر، شام، ہند

چین وغیرہ میں ان فنون کا چرچا قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے پانسو سال پہلے اس فن کا بڑا معلم فیثاغورس گذرا ہے جو اطالیہ کے مدرسہ کروتونا میں باقاعدہ اس کی تعلیم دیتا تھا، اس کے بعد میلاد مسیح علیہ السلام سے تقریباً ایکسو چالیس سال پہلے اس فن کا دوسرا محقق بطلیموس رومی آیا اور اسی زمانے میں ایک دوسرے فلاسفر ہیپرخوس کی شہرت ہوئی جسنے زاویئے ناپنے کے آلات ایجاد کئے۔

فیثاغورس اور بطلیموس کے نظریات ہیئت افلاک کے متعلق بالکل ایک دوسرے سے متضاد تھے۔ بطلیموس کو اپنے زمانے کی حکومت اور عوام کا تعاون حاصل ہوا۔ اسکا نظریہ اتنا پھیلا کہ فیثاغورس کا نظریہ گوشۂ گمنامی میں جا پڑا۔ اور جب یونانی فلسفہ کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تو یہی بطلیموسی نظریہ ان کتابوں میں منتقل ہوا اور اہل علم میں عام طور سے یہی نظریہ جانا پہچانا گیا۔ بہت سے مفسرین نے آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر میں بھی یہی نظریہ سامنے رکھکر کلام کیا۔ گیارہویں صدی ہجری اور پندرہویں صدی عیسوی جبیں اقوام یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا اور یورپین محققین نے ان مسائل پر کام کرنا شروع کیا جن میں سب سے پہلے کوپرنک پھر جرمنی میں کیپلر اور اطالیہ میں گلیلیو وغیرہ کے نام آتے ہیں انھوں نے ازسرنو ان مباحث کا جائزہ لیا، یہ سب اس پر متفق ہو گئے کہ ہیئت افلاک کے متعلق بطلیموسی نظریہ غلط اور فیثاغورس کا نظریہ صحیح ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی اور تیرہویں صدی ہجری میں اسحٰق نیوٹن کی شہرت ہوئی۔ اس کی تحقیقات و ایجادات نے اس کو مزید تقویت پہنچائی۔ اس نے یہ تحقیق کی کہ وزنی چیزیں اگر ہوا میں چھوڑی جائیں تو انکے زمین پر آگرنے کا سبب وہ نہیں جو بطلیموسی نظریہ میں بتلایا گیا ہے کہ زمین کے وسط میں مرکزِ عالم ہے اور تمام وزنی چیزیں مرکز کی طرف فطرۃً رجوع کرتی ہیں بلکہ اُسنے بتلایا کہ جتنے ستارے اور سیارات ہیں سب میں ایک جذب وکشش کا مادہ ہے زمین بھی اسی طرح کا ایک سیارہ ہے اسمیں بھی کشش ہے جس حد تک زمین کی کشش کا اثر رہتا ہے وہاں سے ہر وزنی چیز زمین پر آ جاتی لیکن اگر کوئی چیز اسکی کشش کے دائرہ سے باہر نکل جائے تو وہ پھر نیچے نہیں آئے گی۔

حال میں روسی اور امریکی ماہرین نے قدیم اسلامی فلاسفر ابوریحان بیرونی کی تحقیقات کی امداد سے راکٹ وغیرہ ایجاد کرکے اسکا عملی تجربہ اور مشاہدہ کر لیا کہ راکٹ جب اپنی شدید قوت اور تیز رفتاری کے سبب زمین کی کشش کو توڑ کر اسکے دائرہ سے باہر نکل گیا تو پھر یہ نیچے نہیں آتا بلکہ ایک مصنوعی سیارے کی صورت اختیار کر لیتا اور اپنے مدار پر چکر لگاتا ہے۔ پھر ان مصنوعی سیاروں کا تجربہ کرتے کرتے اسکے ماہرین نے سیارات تک پہنچنے کی تدبیریں شروع کیں اور بالآخر چاند پر پہنچ گئے جس کی تصدیق اس زمانے کے تمام ماہرین فن موافق و مخالف نے کی اور ابتک چاند پر بار بار جانے، وہاں کے پتھر، خاک وغیرہ لانے اور اسکے فوٹو مہیا کرنیکا سلسلہ جاری ہے۔ دوسرے سیارات تک

پہنچنے کی بھی کوششیں ہو رہی ہیں اور خلا نوردی خلا پیمائی کی مشقیں جاری ہیں۔

ان میں سے امریکن خلا نورد جان گلین جو کامیابی کے ساتھ خلا کا سفر کر کے واپس آیا اور اسکی کامیابی پر اسکے موافق و مخالف سبھی نے اعتماد کیا، اسکا ایک بیان امریکہ کے مشہور ماہنامہ ریڈرز ڈائجسٹ میں اور اسکا اردو ترجمہ امریکہ کے اردو ماہنامہ سیر بین میں مفصل شائع ہوا ہے، یہاں اسکے اہم اقتباسات ماہنامہ سیر بین سے نقل کئے جاتے ہیں جن سے ہمارے زیر بحث مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے جان گلین نے اپنے طویل مقالہ میں خلا کے عجائب کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہی وہ ایک واحد شئی ہے جو خلا میں خدا کے وجود پر دلالت کرتی ہے، اور یہ کہ کوئی طاقت ہے جو ان سب کو مرکز و محور سے وابستہ رکھتی ہے"

آگے لکھا ہے کہ:

"اس کے باوجود خلا میں پہلے ہی سے جو عمل جاری ہے اسکو دیکھتے ہوئے ہماری کوششیں انتہائی حقیر ہیں۔ سائنسی اصطلاحات و پیمانوں میں خلائی پیمائش ناممکن ہے"

آگے ہوائی جہاز کی مشینی قوت کا تذکرہ کر کے لکھا ہے کہ:

"لیکن ایک یقینی اور غیر محسوس قوت کے بغیر اسکا استعمال بھی محدود اور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اسلئے کہ جہاز کو اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے تعیین رُخ کی حاجت ہوتی ہے اور یہ کام قطب نما سے لیا جاتا ہے۔ وہ قوت جو قطب نما کو متحرک رکھتی ہے ہمارے تمام حواس خمسہ کے لئے ایک کھلا چیلنج ہے اسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں نہ سُن سکتے ہیں نہ چھو سکتے ہیں نہ چکھ سکتے ہیں نہ سونگھ سکتے ہیں حالانکہ نتائج کا ظہور اسپر واضح دلالت کر رہا ہوتا ہے کہ یہاں کوئی پوشیدہ قوت ضرور موجود ہے"

آگے سب سیر و سفر کے نتیجہ کے طور پر لکھتا ہے:

"عیسائیت کے اُصول و نظریات کی حقیقت بھی ٹھیک یہی کچھ ہے۔ اگر ہم ان کو اپنا رہنما بنائیں تو باوجودیکہ ہمارے حواس ان کے ادراک سے عاجز ہوتے ہیں لیکن اس رہنما قوت کے نتائج و تاثرات اپنے اور اپنے دوسرے بھائیوں کی زندگیوں میں کھلی آنکھوں دیکھیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جانتے ہیں اور اس بنا پر کہتے ہیں کہ اس کائنات میں ایک رہنما قوت موجود ہے"

یہ ہیں خلا کے مسافروں اور سیارات پر کمند پھینکنے والوں کی کمائی کے حاصلات جو آپنے امریکی خلا نورد کے بیان میں پڑھ لیں کہ اس تمام تگ و دو کے نتیجہ میں رازِ کائنات اور اس کی حقیقت تک رسائی تو کیا ہوتی بے عدد بے حساب سیارات و نجوم کی گردشوں کا ادراک ہو کر اور حیرانی بڑھ گئی۔

سائنسی آلات سے انکی پیمائش کے ناممکن ہونے اور اپنی سب کوششوں کی اس کے مقابلہ میں حقارت کا اقرار و اعتراف کرنا پڑا۔ بس حاصل اتنی بات ہوئی کہ یہ سب نظام کائنات اور نجوم و سیارات خود بخود نہیں، بلکہ کسی عظیم اور غیر محسوس طاقت کے زیر فرمان چل رہے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جسکو انبیاء علیہم السلام نے پہلے قدم پر عام انسانوں کو بتلا دیا تھا اور قرآن کریم کی بیشمار آیات میں اسی چیز کا یقین لانے کے لئے آسمان و زمین، نجوم و سیارات وغیرہ کے حالات پر غور و فکر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ جس طرح زمین میں بیٹھ کر آسمانی فضاؤں اور نجوم و سیارات کی تحقیقات و ہیئات پر فلسفیانہ بحثیں کرنے والے ان چیزوں کی حقیقت تک نہ پہنچ سکے اور بالآخر اپنے عجز و بے بسی کا اعتراف کیا۔ اسی طرح یہ زمین سے لاکھوں میل اُوپر کا سفر کرنیوالے اور چاند کے پتھر اور مٹی اور وہاں کے فوٹو لانے والے بھی حقیقت شناسی کے میدان میں کچھ اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔

ان تحقیقات نے انسان اور انسانیت کو کیا بخشا جہانتک انسانی جد و جہد اور فکری ارتقاء اور اسکی محیرالعقول کاری اور حیرت انگیز انکشافات کا معاملہ ہے وہ اپنی جگہ درست اور عام نظروں کے اعتبار سے قابل تحسین بھی ہے۔ لیکن اگر اس پر غور کیا جائے کہ بے مصرف شعبدہ گری اور تماشبینی جس سے انسان اور انسانیت کا کوئی معتدبہ فائدہ نہ ہو وہ حکماء و عقلاء کا کام نہیں۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس پچاس سال کی جد و جہد اور اربوں کھربوں روپیہ جو بہت سے انسانوں کے مصائب دُور کرنے کے لئے کافی ہوتا اُس کو آگ کی نذر کر دینے اور چاند تک پہنچ کر وہاں کی خاک اور پتھر سمیٹ لانے سے انسان اور انسانیت کو کیا فائدہ پہنچا۔ انسان کی بڑی بھاری تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو بھوک سے مرتے ہیں اُن کو لباس اور سر چھپانے کی جگہ میسر نہیں، کیا اس جد و جہد نے انکے افلاس و مصیبت کا کوئی حل نکالا، یا انکے امراض و آفات سے صحت و عافیت کا کوئی انتظام کیا یا انکے لئے قلبی سکون و راحت کا کوئی سامان فراہم کیا؟ تو یقین ہے کہ کسی کے پاس اسکا جواب بجز نفی کے نہیں ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن و سُنت انسان کو ایسے لایعنی مشغلے میں مبتلا کرنے سے گریز کرتے ہیں اور کائناتِ عالم میں غور و فکر اور تدبیر کی دعوت صرف دو حیثیتوں سے دیتے ہیں۔ پہلی حیثیت جو اصل مقصود ہے یہ ہے کہ ان آثار عجیبہ کو دیکھ کر مؤثر حقیقی اور اُس غیر محسوس قوت کا یقین کرلیں جو اس سارے نظام کو چلا رہی ہے، اُسی کا نام خدا ہے۔ دوسرے ان زمینی اور آسمانی مخلوقات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے فائدے کے لئے ہر ضرورت کی چیز ودیعت فرما دی ہے انسان کا کام یہ ہے کہ اپنی عقل و شعور اور جد و جہد سے کام لیکر اُن چیزوں کو زمین کے خزائن سے نکالنے اور استعمال کرنے کے طریقے سیکھ لے۔ پہلی حیثیت اصل مقصود ہے اور دوسری حیثیت ثانوی

رفع ضرورت کے لئے ہے اس لئے ضرورت سے زائد اسمیں انہماک پسندیدہ نہیں اور کائنات عالم میں غور و فکر اور تدبر کی دونوں حیثیتیں انسان کے لئے آسان بھی ہیں نتیجہ خیز بھی۔ اور ان دونوں حیثیتوں کے نتائج میں قدیم و جدید فلاسفہ کا کوئی اختلاف بھی نہیں۔ ان کے سب اختلافات افلاک اور سیارات کی ہیئت و حقیقت سے متعلق ہیں جن کو قرآن نے بے ضرورت اور ناقابل حصول قرار دیکر نظر انداز کر دیا ہے۔ علامہ بخیت مفتی مصر نے اپنی کتاب توفیق الرحمٰن میں علم ہیئت کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک حصہ وصفی ہے جو اجرام سماویہ کی حرکات اور حسابات سے متعلق ہے۔ دوسرا عملی جو ان حسابات کو معلوم کرنے کے لئے آلات قدیمہ و جدیدہ سے متعلق ہے۔ تیسرا طبعی، جو افلاک سیارات کی ہیئت و حقیقت سے متعلق ہے اور لکھا ہے کہ پہلی دونوں قسموں میں ماہرین قدیم و جدید میں اختلاف کالعدم ہے۔ آلات ادراک میں بہت بڑا اختلاف ہونے کے باوجود نتائج پر اکثر امور میں سب کا اتفاق ہے ان کا شدید اختلاف صرف تیسری قسم میں ہے۔

غور کیجئے تو انسانی ضرورت کے متعلق بھی پہلی دو قسمیں ہیں تیسری قسم دوراز کار بھی ہے اور مشکل بھی۔ اسی لئے قرآن و سنت اور عام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات نے انسان کو اس تیسری بحث میں نہیں الجھایا، اور بزرگان سلف نے یہ نصیحت فرمائی ؂

زباں تازہ کردن باقرار تو ✲ نینگیختن علت از کار تو

مہندس بسے جوید از راز شاں ✲ نداند کہ چوں کردی آغاز شاں

صوفیائے کرام جو نظر کشفی سے ان چیزوں کو دیکھتے ہیں ان کا فیصلہ بھی انجام کار وہی ہے جو شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے فرمایا ؂

چہ شبہا نشستم دریں سیر گم ✲ کہ حیرت گرفت آستینم کہ قُم

حافظ شیرازی نے اپنی لَے میں فرمایا ؂

سخن از مطرب و می گوی راز دہر کمتر جو ✲ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

اس تمام تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ کائنات افلاک و فضا اور کائنات ارضی میں غور و فکر اس حیثیت سے کہ ان سے پیدا کرنے والے کے وجود اور توحید اور اس کی بے مثال علم و قدرت پر استدلال کیا جا سکے عین مقصود قرآنی ہے اور قرآن جا بجا اسکی دعوت دے رہا ہے اور اس حیثیت سے کہ ان چیزوں سے انسان کے معاشی مسائل کا تعلق ہے وہ بھی ضرورت کی حد تک منشاء قرآنی ہے اور قرآن اسکی طرف بھی دعوت دیتا ہے مگر اس فرق کیساتھ کہ معاش اور معاشی ضروریات کو اصل مقصد قرار دیکر اسمیں انہماک نہ کرے بلکہ اس موجودہ زندگی کو اصلی زندگی کیطرف ایک سفر کا درجہ قرار دے کر اسکے مطابق اسمیں مشغول ہو۔ اور تیسری حیثیت چونکہ انسانی ضرورت سے زائد بھی ہے اور اسکا حصول بھی

مشکل ہے اُس میں عمر عزیز صرف کرنے سے گریز کیطرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ موجودہ سائنس کی جدید ترقیات و تحقیقات کو عین منشار قرآنی سمجھنا بھی غلط ہے جیسا کہ بعض تجدد پسند علماء نے لکھا ہے اور قرآن کو اُن کا مخالف کہنا بھی غلط ہے جیسا کہ بعض قدامت پسند علماء نے کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نہ ان چیزوں کے بیان کے لئے آیا ہے نہ یہ اسکا موضوع بحث ہے نہ انسان کے لئے اُن کا حاصل کرنا آسان ہے نہ انسانی ضروریات سے اسکا کوئی تعلق ہے۔ قرآن ان معاملات میں کہتا ہے تجربات و مشاہدات سے کوئی چیز ثابت ہو جائے تو اس کو قرآن کے منافی کہنا بھی صحیح نہیں۔ چاند کے اوپر پہنچنا، رہنا بسنا اور وہاں کی معدنیات وغیرہ سے نفع اُٹھانا وغیرہ سب اسمیں داخل ہیں ان میں سے کوئی چیز مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہو جائے تو اسکے انکار کی کوئی وجہ نہیں اور جب تک ثابت نہ ہو خواہ مخواہ اسکے تصورات باندھنا اور اسمیں عمر عزیز کے اوقات صرف کرنا بھی کوئی دانشمندی نہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

عِبَادُ الرَّحْمٰن[1]

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ

اور بندے رحمٰن کے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں اور جب بات کرنے لگیں

الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ﴿۶۴﴾

اُن سے بے سمجھ لوگ تو کہیں صاحب سلامت اور وہ لوگ جو رات کاٹتے ہیں اپنے رب کے آگے سجدے میں اور کھڑے

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا

اور وہ لوگ کہ کہتے ہیں اے رب ہٹا ہم سے دوزخ کا عذاب بیشک اسکا عذاب

كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾ وَالَّذِیْنَ اِذَآ

چمٹنے والا ہے وہ بُری جگہ ہے ٹھہرنے کی اور بُری جگہ رہنے کی اور وہ لوگ کہ جب

اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾ وَ

خرچ کرنے لگیں نہ بے جا اُڑائیں اور نہ تنگی کریں اور ہے اس کے بیچ ایک سیدھی گذران اور

الَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ

وہ لوگ کہ نہیں پکارتے اللہ کے ساتھ دوسرے حاکم کو اور نہیں خون کرتے جان کا جو منع کر دی

اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ یُّضٰعَفْ

اللہ نے مگر جہاں چاہئے اور بدکاری نہیں کرتے اور جو کوئی کرے یہ کام وہ جا پڑا گناہ میں دُونا ہوگا

[1] یہاں یہ عنوان اس لئے قائم کر دیا گیا ہے کہ اس کو مستقل رسالہ کی صورت میں اس نام سے شائع کیا جا سکتا ہے اور جب ایسا کیا جائے تو اسکے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ دی جاوے ۱۲ محمد شفیع

لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿٦٩﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ
اس کو عذاب قیامت کے دن اور پڑا رہے گا اسیں خوار ہوکر مگر جس نے توبہ کی اور
اٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ
یقین لایا اور کیا کچھ کام نیک سو اُن کو بدل دیگا اللہ بُرائیوں کی جگہ بھلائیاں
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٧٠﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ
اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان اور جو کوئی توبہ کرے اور کرے کام نیک سو وہ
يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿٧١﴾ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا
پھر آتا ہے اللہ کی طرف پھر آنے کی جگہ اور جو لوگ شامل نہیں ہوتے جھوٹے کام میں اور جب گزرتے ہیں
بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿٧٢﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا
کھیل کی باتوں پر نکل جائیں بزرگانہ اور وہ لوگ کہ جب اُن کو سمجھائیے ان کے رب کی باتیں نہ پڑیں
عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿٧٣﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا
اُن پر بہرے اندھے ہوکر اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے رب دے ہمکو ہماری عورتوں کی طرف سے
وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿٧٤﴾ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ
اور اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک اور کر ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا ان کو بدلہ ملے گا
الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ﴿٧٥﴾ خٰلِدِيْنَ
کوٹھوں کے جھروکے اسلئے کہ وہ ثابت قدم رہے اور لینے آئیں گے ان کو وہاں دُعا اور سلام کہتے ہوئے سدا رہا کریں
فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿٧٦﴾ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ
اُن میں خوب جگہ ہے ٹھہرنے کی اور خوب جگہ رہنے کی تو کہہ پرواہ نہیں رکھتا میرا رب تمہاری
لَوْلَا دُعَاۗؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿٧٧﴾
اگر تم اس کو نہ پکارا کرو سو تم تو جھٹلا چکے اب آگے کو ہوتی ہے مٹھ بھیڑ

رکوع ۶

خلاصۂ تفسیر

اور (حضرت) رحمٰن کے (خاص) بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں (مطلب یہ کہ ان کے مزاج میں تواضع ہے تمام اُمور میں، اور اسی کا اثر چلنے میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور خاص چال کی ہیئت بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ فارغ داری کے ساتھ نرم رفتاری موجب مدح نہیں اور یہ تواضع تو ان کا طرز خاص اپنے اعمال میں ہے) اور (دوسروں کے ساتھ ان کا طرز یہ ہے کہ) جب ان سے جہالت والے لوگ (جہالت کی) بات (چیت) کرتے ہیں تو وہ رفع شر کی بات کہتے ہیں

(مطلب یہ کہ اپنے نفس کے لئے انتقام قولی یا فعلی نہیں لیتے اور جو خشونت تادیب و اصلاحِ سیاستِ شرعیہ یا اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے ہو اس کی نفی مقصود نہیں) اور جو (اللہ کے ساتھ اپنا یہ طرز رکھتے ہیں کہ) راتوں کو اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام (یعنی نماز) میں لگے رہتے ہیں اور جو (باوجود ادائے حقوق اللہ و حقوق العباد کے اللہ تعالیٰ سے اسقدر ڈرتے ہیں کہ) دُعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے جہنم کے عذاب کو دُور رکھیے کیونکہ اسکا عذاب پوری تباہی ہے، بیشک وہ جہنم بُرا ٹھکانا اور بُرا مقام ہے (یہ تو ان کی حالت طاعاتِ بدنیہ میں ہے) اور (طاعاتِ مالیہ میں ان کا یہ طریقہ ہے کہ) وہ جب خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں (کہ معصیت میں صرف کرنے لگیں) اور نہ تنگی کرتے ہیں (کہ طاعتِ ضروریہ میں بھی خرچ کی کوتاہی کریں، اور اسراف میں وہ خرچ بھی آ گیا کہ بلاضرورت استطاعت سے زیادہ مباحات میں یا طاعاتِ غیر ضروریہ میں خرچ کریں جسکا انجام اخیر میں بے صبری اور حرص و بدنیتی ہو کیونکہ یہ اُمور معصیت ہیں اور جو چیز معصیت کا سبب بنے وہ بھی معصیت ہے اس لئے وہ بھی معصیت ہی میں خرچ کرنا انجام کار ہو گیا۔ اسی طرح طاعاتِ ضروریہ میں بالکل خرچ نہ کرنے کی مذمت لَمْ يَقْتُرُوْا سے مفہوم ہو گئی کیونکہ جب خرچ میں کمی کرنا جائز نہیں تو عدم انفاق تو بدرجۂ اَولیٰ ناجائز ہوگا پس یہ شبہ نہ رہا کہ خرچ میں کمی کرنے کی تو نفی اور نہی ہو گئی لیکن عدم الانفاق بالکلیہ کی نفی اور نہی نہ ہوئی۔ غرض وہ انفاق میں افراط و تفریط دونوں سے مبرّا ہیں) اور ان کا خرچ کرنا اس (افراط و تفریط) کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے (اور یہ حالتِ مذکورہ تو طاعات کی ادائیگی سے متعلق تھی) اور جو (گناہ سے بچنے میں یہ شان رکھتے ہیں) کہ اللہ تعالیٰ کیساتھ کسی اور معبود کی پرستش نہیں کرتے (جو معصیت متعلق عقائد کے ہے) اور جس شخص (کے قتل کرنے) کو اللہ تعالیٰ نے (قواعد شرعیہ کی رو سے) حرام فرمایا ہے اس کو قتل نہیں کرتے ہاں مگر حق پر (یعنی جب قتل کے وجوب یا اباحت کا کوئی سبب شرعی پایا جاوے اسوقت اور بات ہے) اور وہ زنا نہیں کرتے (کہ یہ قتل و زنا اعمال کے متعلقہ گناہوں میں سے ہیں) اور جو شخص ایسے کام کریگا (کہ شرک کرے یا شرک کیساتھ قتل ناحق بھی کرے یا زنا بھی کرے جیسے مشرکین مکہ تھے) تو سزا سے اس کو سابقہ پڑیگا کہ قیامت کے روز اسکا عذاب بڑھتا چلا جائیگا (جیسا کفار کے حق میں دوسری آیات میں آیا ہے زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ) اور وہ اس (عذاب) میں ہمیشہ ہمیشہ ذلیل (و خوار) ہو کر رہے گا (تاکہ عذابِ جسمانی کے ساتھ ذلت کا عذاب روحانی بھی ہو اور شدتِ عذاب یعنی تضاعف کیساتھ مقدار کی زیادتی یعنی خلود بھی ہو اور مراد اس وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ سے کفار و مشرکین ہیں بقرینۂ يُضٰعَفْ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا وَ اٰمَنَ کیونکہ مؤمن گناہگار کے لئے عذاب میں زیادتی اور خلود نہ ہوگا بلکہ اسکا عذاب اس کو پاک صاف کرنے کے لئے ہوگا نہ کہ اہانت کے لئے، اور اس کے لئے تجدید ایمان کی ضرورت نہیں صرف توبہ

کافی ہے جسکا آگے بیان ہے وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ الخ نیز قرائن مذکورہ کے سوا صحیحین میں ابن عباسؓ سے شان نزول بھی اسکا یہی منقول ہے کہ مشرکین کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی) مگر جو (شرک معاصی سے) توبہ کرلے اور (اس توبہ کے قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ) ایمان (بھی) لے آوے اور نیک کام کرتا رہے (یعنی ضروری طاعات کو بجالاتا رہے) تو (اس کو جہنم میں خلود تو کیا ہوتا جہنم سے ذرا بھی مس نہ ہوگا بلکہ) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں (کو محو کرکے ان) کی جگہ (آئندہ) نیکیاں عنایت فرمائیگا (یعنی چونکہ گزشتہ کفر و گناہ زمانہ کفر کے بعد اسلام کی برکت سے معاف ہو جاویں گے اور آئندہ بوجہ اعمال صالحہ کے حسنات لکھی جاتی رہیں گی اور ان پر ثواب ملیگا اس لئے جہنم سے ان کا کچھ تعلق نہ ہوگا، پس اِلَّا استثنار منقطع ہے اور مَنْ تَابَ کی خبر فَاُولٰٓئِكَ الخ ہے اور مقصود باالحکم تبدیل سیئات بالحسنات ہے جو مجموعۂ ایمان و توبہ و عمل صالح پر مرتب ہے اور جہنم کی آگ سے محفوظ رہنا اسکا لازمی اثر ہے اور جہنم میں دخول ہی نہیں تو خلود نہ ہونا ظاہر ہے، یا استثنار متصل ہو اور عدم خلود کے لئے مجموعۂ ایمان و توبہ و عمل صالح شرط نہ ہو مگر مجموعہ کے ساتھ عدم خلود کا پایا جانا اس آیت میں مذکور ہوا اور صرف ایمان پر عدم خلود کا مرتب ہونا دوسرے دلائل سے ثابت ہو) اور (یہ محو سیئات و ثبت حسنات اسلئے ہوا کہ) اللہ تعالیٰ غفور ہے (اسلئے سیئات کو محو کردیا اور) رحیم ہے (اسلئے حسنات کو قایم فرمایا۔ یہ تو تائب عن الکفر کا بیان تھا) اور (آگے اُس مؤمن کا ذکر ہے جو گناہ سے توبہ کرے تاکہ مضمون توبہ کا پورا ہو جائے (نیز مقبول بندوں کے بقیہ اوصاف کا بیان ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ طاعات کے پابند اور سیئات سے پرہیز کے عادی رہتے ہیں لیکن اگر احیاناً صدورِ معصیت ہو جائے تو توبہ کرلیتے ہیں اس لئے تائبین کا حال ارشاد فرمایا یعنی) جو شخص (جس معصیت سے) توبہ کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے (یعنی آئندہ معصیت سے بچتا ہے) تو وہ (بھی عذاب سے بچا رہیگا کیونکہ وہ) اللہ تعالیٰ کی طرف خاص طور پر رجوع کر رہا ہے (یعنی خوف و اخلاص کیساتھ کہ شرط توبہ ہی آگے پھر عباد رحمٰن کے اوصاف بیان فرماتے ہیں یعنی) اور (ان میں یہ بات ہے کہ وہ بیہودہ باتوں میں (جیسے لہو و لعب خلاف شرع) شامل نہیں ہوتے اور اگر (اتفاقاً بلا قصد) بیہودہ مشغلوں کے پاس کو ہو کر گزریں تو سنجیدگی (و شرافت) کے ساتھ گزر جاتے ہیں (یعنی نہ اس کی طرف مشغول ہوتے ہیں اور نہ ان کے آثار سے گناہگاروں کی تحقیر اور اپنا ترفع اور تکبر ظاہر ہوتا ہے) اور وہ ایسے ہیں کہ جس وقت ان کو اللہ کے احکام کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے تو ان (احکام) پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے (جس طرح کافر قرآن پر ایک نئی بات سمجھ کر تماشے کے طور پر اور نیز اسمیں اعتراضات پیدا کرنے کے لئے اسکے حقائق و معارف سے اندھے بہرے ہو کر اندھا دھند بے ترتیب ہجوم کرلیتے تھے جیسا کہ دوسری جگہ قرآن کا ارشاد ہے كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا (علی بعض التفاسیر) سو عباد مذکورین ایسا نہیں کرتے، بلکہ عقل و فہم کے ساتھ قرآن پر متوجہ اور اُس کی طرف دوڑتے ہیں جسکا ثمرہ زیادہ ایمان

دخل بالاحکام ہے پس مقصود آیت میں اندھے بہرے ہونے کی نفی کرنا ہے نہ کہ قرآن کیطرف شوق کے ساتھ متوجہ ہونے اُس پر گرنے کی، کیونکہ وہ عین مطلوب ہے۔ اور اس سے کفار کے لئے بھی قرآن پر گرنا تو ثابت ہوتا ہے مگر وہ مخالفت اور مزاحمت کے طور پر اور اندھے بہروں کی طرح تھا اسلئے وہ مذموم ہے) اور وہ ایسے ہیں کہ (خود جیسے دین کے عاشق ہیں اسی طرح اپنے اہل و عیال کے لئے بھی اسکے ساعی اور داعی ہیں، چنانچہ عملی کوشش کے ساتھ حق تعالیٰ سے بھی) دُعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیبیوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک (یعنی راحت) عطا فرما (یعنی ان کو دیندار بنادے اور ہم کو ہماری اس سعی دینداری میں کامیاب فرما کہ ان کو دینداری کی حالت میں دیکھکر راحت اور سرور ہو) اور (تو نے ہم کو ہمارے خاندان کا افسر تو بنایا ہی ہے مگر ہماری دُعا یہ ہے کہ ان سب کو متقی کر کے) ہم کو متقیوں کا افسر بنادے (تو اصل مقصود افسری مانگنا نہیں ہے گو اسمیں بھی قباحت نہیں مگر مقام دلالت نہیں کرتا بلکہ اصل مقصود اپنے خاندان کے متقی ہونے کی درخواست ہے یعنی بجائے اس کے کہ ہم صرف خاندان کے افسر ہیں ہمکو متقی خاندان کا افسر بنا دیجئے، یہانتک عباد رحمان کے اوصاف کا بیان تھا آگے ان کی جزا ہے یعنی) ایسے لوگوں کو (بہشت میں رہنے کو) بالاخانے ملیں گے بوجہ انکے (دین و طاعت پر) ثابت قدم رہنے کے اور ان کو اس (بہشت) میں (فرشتوں کی جانب سے) بقا کی دعا اور سلام ملیگا (اور) اس (بہشت) میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، وہ کیسا اچھا ٹھکانا اور مقام ہے (جیسا جہنم کے بارے میں ساءت مستقرا و مقاما فرمایا ہے، اے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم) آپ (عام طور پر لوگوں سے) کہدیجئے کہ میرا رب تمہاری ذرا بھی پروا نہ کریگا اگر تم عبادت نہ کروگے سو (اس سے سمجھ لینا چاہیئے کہ اے کفار) تم تو (احکام الٰہیہ کو) جھوٹا سمجھتے ہو تو عنقریب یہ (جھوٹا سمجھنا تمھارے لئے) وبال (جان) ہو کر رہے) گا، (خواہ دُنیا میں جیسے واقعہ بدر میں کفار پر مصیبت آئی یا آخرت میں اور وہ ظاہر ہے)۔

معارف و مسائل

سُورہ فرقان کے بیشتر مضامین رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کے ثبوت اور کفار و مشرکین جو اس پر اعتراض کرتے تھے اُنکے جوابات پر مشتمل تھے اُسمیں کفار و مشرکین اور احکام کی نافرمانی کرنے والوں پر عذاب و سزا کا بھی ذکر تھا۔ آخر سورت میں اپنے اُن مخصوص اور مقبول بندوں کا ذکر فرماتے ہیں جنکا رسالت پر ایمان بھی مکمل ہے اور اُن کے عقائد، اعمال، اخلاق، عادات سب اللہ و رسُول کی مرضی کے تابع اور احکام شرعیہ کے مطابق ہیں۔

قرآن کریم نے ایسے مخصوص بندوں کو عِبَادُ الرَّحْمٰن کا لقب عطا فرمایا جو اُن کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ یُوں تو ساری ہی مخلوق تکوینی اور جبری طور پر اللہ کی بندگی اور اسکی مشیت و ارادہ

کے تابع ہے اسکے ارادے کے بغیر کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ مگر یہاں بندگی سے مراد تشریعی اور اختیاری بندگی ہے یعنی اپنے اختیار سے اپنے وجود اور اپنی تمام خواہشات اور تمام کاموں کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع بنا دینا ایسے مخصوص بندے جن کو حق تعالیٰ نے خود اپنا بندہ کہہ کر عزت بخشی ہے اُنکے اوصاف آخر سورت تک بیان کئے گئے ہیں درمیان میں کفر و معصیت سے توبہ اور اسکے اثرات کا ذکر آیا ہے۔

یہاں ان مخصوص بندوں کو اپنا بندہ فرما کر انکو اعزازی لقب دینا تھا مگر اپنی طرف نسبت کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے سب اسماءِ حسنیٰ اور صفاتِ کمال میں سے اس جگہ لفظ رحمٰن کا انتخاب شاید اس لئے کیا گیا کہ مقبولین کی عادات و صفات اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کی ترجمان اور مظہر ہونا چاہئیں اس کی طرف اشارہ کرنا منظور ہے۔

اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی مخصوص صفات و علامات آیات مذکورہ میں اللہ کے مخصوص اور مقبول بندوں کی تیرہ صفات و علامات کا ذکر آیا ہے جن میں عقائد کی درستی اور اپنے ذاتی اعمال ہیں خواہ وہ بدن سے متعلق ہوں یا مال سے، سب میں اللہ و رسول کے احکام اور مرضی کی پابندی۔ دوسرے انسان کے ساتھ معاشرت اور تعلقات کی نوعیت، رات دن کی عبادت گزاری کے ساتھ خوفِ خدا۔ تمام گناہوں سے بچنے کا اہتمام اور اپنے ساتھ اپنی اولاد و ازواج کی اصلاح کی فکر وغیرہ شامل ہیں۔

ان کا سب سے پہلا وصف عباد ہونا ہے۔ عباد عبد کی جمع ہے عبد کا ترجمہ ہے بندہ جو اپنے آقا کا مملوک ہو، اسکا وجود اور اسکے تمام اختیارات و اعمال آقا کے حکم و مرضی پر دائر ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا بندہ کہلانے کا مستحق وہی شخص ہو سکتا ہے جو اپنے عقائد و خیالات کو اور اپنے ہر ارادے اور خواہش کو اور اپنی ہر حرکت و سکون کو اپنے رب کے حکم اور مرضی کے تابع رکھے ہر وقت گوش برآواز رہے کہ جس کام کا حکم ہو وہ بجا لاؤں۔

دوسری صفت: يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا، یعنی چلتے ہیں وہ زمین پر تواضع کیساتھ لفظ ہَوْن کا مفہوم اس جگہ سکینت و وقار اور تواضع ہے کہ اکڑ کر نہ چلے، قدم متکبرانہ انداز سے نہ رکھے بہت آہستہ چلنا مراد نہیں، کیونکہ وہ بلا ضرورت ہو تو خلافِ سنت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چلنے کی جو صفت شمائلِ نبویہ میں منقول ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا چلنا بہت آہستہ نہیں بلکہ کسی قدر تیزی کے ساتھ تھا۔ حدیث میں ہے کانما الارض تطوی لہٗ، یعنی آپ ایسا چلتے تھے کہ گویا زمین آپکے لئے سمٹتی ہے (ابن کثیر) اسی لئے سلف صالحین نے تکلف مریضوں کی طرح آہستہ چلنے کو علامتِ تکبر و تصنع ہونے کے سبب مکروہ قرار دیا ہے۔ فاروق اعظمؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ بہت آہستہ چل رہا ہے، پوچھا: کیا تم بیمار ہو۔ اُسنے کہا نہیں، تو آپنے اُس پر دُرّہ اُٹھایا اور حکم دیا کہ قوت کیساتھ چلا کرو۔ (ابن کثیر)

حضرت حسن بصریؒ نے اس آیت یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا، کی تفسیر میں فرمایا کہ مؤمنین مخلصین کے تمام اعضاء و جوارح آنکھ، کان، ہاتھ پاؤں سب اللہ کے سامنے ذلیل و عاجز ہوتے ہیں ناواقف اُن کو دیکھ کر معذور عاجز سمجھتا ہے حالانکہ نہ وہ بیمار ہیں نہ معذور بلکہ تندرست قوی ہیں مگر اُن پر حق تعالیٰ کا خوف ایسا طاری ہے جو دوسروں پر نہیں ہے۔ اُن کو دُنیا کے دھندوں سے آخرت کی فکر نے روکا ہوا ہے۔ اور جو شخص اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا اور اسکی ساری فکر دُنیا ہی کے کاموں میں لگی رہتی ہے تو وہ ہمیشہ حسرت ہی حسرت میں رہتا ہے (کہ دُنیا تو ساری ملتی نہیں اور آخرت میں اُسنے حصہ نہیں لیا) اور جس شخص نے اللہ کی نعمت صرف کھانے پینے کی ہی چیزوں کو سمجھا اور اعلیٰ اخلاق کی طرف دھیان نہیں دیا، اُس کا علم بہت تھوڑا ہے اور عذاب اُس کیلئے تیار ہے۔ (از ابن کثیر ملخصاً)

تیسری صفت: وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا، یعنی جب جہالت والے اُنسے خطاب کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں، سلام۔ یہاں جاہلون کا ترجمہ جہالت والوں سے کر کے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ مُراد اس سے بے علم آدمی نہیں بلکہ وہ جو جہالت کے کام اور جاہلانہ باتیں کرے خواہ واقع میں وہ ذی علم بھی ہو۔ اور لفظ سلام سے مراد یہاں عرفی سلام نہیں بلکہ سلامتی کی بات ہے۔ قرطبی نے نحاس سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ سلام تسلیم سے مشتق نہیں بلکہ تَسَلُّم سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں سلامت رہنا۔ مُراد یہ ہے کہ جاہلوں کے جواب میں وہ سلامتی کی بات کہتے ہیں جس سے دوسروں کو ایذا نہ پہنچے اور یہ گناہگار نہ ہو۔ یہی تفسیر حضرت مجاہد، مقاتل وغیرہ سے منقول ہے۔ (مظہری)

حاصل یہ ہے کہ بے وقوف جاہلانہ باتیں کرنے والوں سے یہ حضرات انتقامی معاملہ نہیں کرتے بلکہ اُن سے درگزر کرتے ہیں۔

چوتھی صفت: وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا، یعنی وہ رات گزارتے ہیں اپنے رب کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے۔ عبادت میں شب بیداری کا ذکر خصوصیت سے اسلئے کیا گیا کہ یہ وقت سونے آرام کرنے کا ہے اسمیں نماز و عبادت کے لئے کھڑا ہونا خاص مشقت بھی ہے اور اسمیں ریاء و نمود کے خطرات بھی نہیں ہیں۔ منشاء یہ ہے کہ ان کا لیل و نہار اللہ کی اطاعت میں مشغول ہے دن کو تعلیم و تبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ کے کام ہیں رات کو اللہ کے سامنے عبادت گزاری کرنا ہے۔ تہجد کی نماز کی حدیث میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ ترمذی نے حضرت ابو امامہؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیام اللیل، تہجد کی پابندی کرو کیونکہ وہ تم سے پہلے بھی سب نیک بندوں کی عادت رہی ہے اور وہ اللہ تعالےٰ سے تم کو قریب کرنے والی اور سیئات کا کفارہ ہے اور گناہوں سے روکنے والی چیز ہے۔ (مظہری)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جس شخص نے عشار کے بعد دو یا زیادہ رکعتیں پڑھ لیں وہ بھی اس حکم میں داخل ہے کہ بات للّٰہ ساجدا وقائما (مظہری از بغوی) اور حضرت عثمان غنی رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے عشار کی نماز جماعت کیساتھ ادا کرلی تو آدھی رات عبادت میں گزارنے کے حکم میں ہوگیا اور جس نے صبح کی نماز جماعت سے ادا کرلی وہ باقی آدھی رات بھی عبادت میں گزارنے والا سمجھا جائیگا (رواہ احمد ومسلم فی صحیحہ از مظہری)

پانچویں صفت: وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ الآیہ یعنی یہ مقبولین بارگاہ شب و روز عبادت وطاعت میں مصروف رہنے کے باوجود بے خوف ہوکر نہیں بیٹھ رہتے بلکہ ہر وقت خدا کا خوف اور آخرت کی فکر رکھتے ہیں جس کے لئے عملی کوشش بھی جاری رہتی ہے اور اللہ تعالےٰ سے دُعائیں بھی۔

چھٹی صفت: وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا الآیۃ، یعنی اللہ کے مقبول بندے مال خرچ کرنے کے وقت نہ اسراف اور فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل وکوتاہی، بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔ آیت میں اسراف اور اسکے بالمقابل اِقتار کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

اسراف کے لغوی معنے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ، ابن جریجؒ کے نزدیک اللہ کی معصیت میں خرچ کرنا اسراف ہے اگرچہ ایک پیسہ ہی ہو، اور بعض حضرات نے فرمایا، جائز اور مُباح کاموں میں ضرورت سے زائد خرچ کرنا جو تبذیر یعنی فضول خرچی کی حد میں داخل ہوجائے وہ بھی اسراف کے حکم میں ہے کیونکہ تبذیر یعنی فضول خرچی بنصِ قرآن حرام ومعصیت ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ اس لحاظ سے اس تفسیر کا حاصل بھی حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کی مذکورہ تفسیر ہوگیا، یعنی معصیت و گناہ میں جو کچھ خرچ کیا جائے وہ اسراف ہے۔ (مظہری)

اور اِقتار کے معنے خرچ میں تنگی اور بخل کرنے کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں اسکے معنے یہ ہیں کہ جن کاموں میں اللہ ورسول نے خرچ کرنیکا حکم دیا ہے اُن میں خرچ کرنے میں تنگی برتنا (اور بالکل خرچ نہ کرنا بدرجہ اولیٰ اسمیں داخل ہے) یہ تفسیر بھی حضرت ابن عباسؓ، قتادہ وغیرہ سے منقول ہے (مظہری) آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ کے مقبول بندوں کی صفت مال خرچ کرنے میں یہ ہوتی ہے کہ اسراف اور اقتار کے درمیان اعتدال اور میانہ روی پر عمل کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مِنْ فِقْهِ الرَّجُلِ قَصْدُهٗ فِيْ مَعِيْشَتِهٖ، یعنی انسان کی دانشمندی کی علامت یہ ہے کہ خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرے (نہ اسراف میں مبتلا ہو نہ بخل میں)۔ (رواہ الامام احمد عن ابی الدرداء۔ ابن کثیر)

ایک دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ما عال من اقتصد، یعنی جو شخص خرچ میں میانہ روی اور اعتدال پر قائم رہتا ہے وہ کبھی فقیر و محتاج نہیں ہوتا (رواہ الامام احمد۔ ابن کثیر)

ساتویں صفت: وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ، پہلی چھ صفات میں طاعت و فرمانبرداری کے اصول آگئے ہیں اب معصیت و نافرمانی کے اصولِ مہمہ کا بیان ہے جنہیں پہلی چیز عقیدہ سے متعلق ہے کہ یہ لوگ اللہ کے ساتھ کسی اور کو عبادت میں شریک نہیں کرتے جس سے شرک کا سب سے بڑا گناہ ہونا معلوم ہوا۔

آٹھویں اور نویں صفت: لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الآیہ، یہ عملی گناہوں میں سے بڑے بڑے اور سخت گناہوں کا بیان ہے کہ اللہ کے مقبول بندے ان کے پاس نہیں جاتے، کسی کو ناحق قتل نہیں کرتے اور زنا کے پاس نہیں جاتے۔ یہ تین عقیدہ اور عمل کے بڑے گناہ بیان فرمانے کے بعد آیت میں ارشاد ہے وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا، یعنی جو شخص ان مذکورہ گناہوں کا مرتکب ہوگا وہ اسکی سزا پائے گا۔ ابو عبیدہ نے اس جگہ لفظ اثام کی تفسیر سزائے گناہ سے کی ہے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اثام جہنم کی ایک وادی کا نام ہے جو سخت و شدید عذابوں سے پُر ہے۔ بعض روایاتِ حدیث بھی اسکی شہادت میں لکھی ہیں (تفسیر مظہری)

آگے اُس عذاب کا بیان ہے جو جرائم مذکورہ کے کرنے والوں پر ہوگا اور آیات کے سیاق و سیاق سے یہ بات متعین ہے کہ یہ عذاب کفار کے لئے مخصوص ہے جنھوں نے شرک کفر بھی کیا اور اسکے ساتھ قتل و زنا میں بھی مبتلا ہوئے کیونکہ اول تو يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ کے الفاظ مسلمان گنہگاروں کے لئے نہیں ہوسکتے کیونکہ اُنکے ایک گناہ پر ایک ہی سزا کا وعدہ قرآن و سُنت میں منصوص ہے۔ سزا میں تضاعف یعنی کیفیت یا کمیت میں زیادتی مؤمنین کے لئے نہیں ہوگی۔ یہ کفار کی خصوصیت ہے کہ کفر پر جو عذاب ہونا تھا اگر کفر کے ساتھ اور گناہ بھی کئے تو عذاب دوہرا ہو جاویگا۔ دوسرے اس عذاب میں یہ بھی مذکور ہے وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا، یعنی ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اس عذاب میں ذلیل و خوار ہوکر۔ کوئی مؤمن ہمیشہ ہمیشہ عذاب میں نہیں رہے گا، کتنا ہی بڑا گناہگار ہو اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد جہنم سے نکال لیا جاویگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ شرک کفر میں بھی مبتلا ہوئے اور قتل و زنا میں بھی، اُن کا عذاب مضاعف یعنی دوہرا، شدید بھی ہوگا اور پھر یہ عذاب دائمی بھی رہے گا۔ آگے یہ بیان ہے کہ ایسے سخت مجرم جنکا عذاب یہاں مذکور ہوا ہے اگر وہ توبہ کرلیں اور ایمان لاکر نیک عمل کرنے لگیں تو اللہ تعالیٰ اُنکے سیئات کو حسنات سے یعنی بُرائیوں کو بھلائیوں سے تبدیل کردیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس توبہ کے بعد انکے اعمال نامہ میں حسنات ہی حسنات رہ جائیں گی کیونکہ شرک کفر سے توبہ کرنے پر

اللہ تعالیٰ کا وعدہ یہ ہے کہ بحالتِ شرک و کفر جتنے گناہ کئے ہوں اسلام و ایمان قبول کر لینے سے وہ پچھلے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں اسلئے پچھلے زمانے میں جو ان کا نامۂ اعمال سیئات اور معاصی ہی سے لبریز تھا اب ایمان لانے سے وہ تو سب معاف ہو گئے آگے ان معاصی اور سیئات کی جگہ ایمان اور اسکے بعد کے اعمالِ صالحہ نے لے لی۔ سیئات کو حسنات میں تبدیل کرنے کی یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ حسن بصریؒ، سعید بن جبیرؒ، مجاہد وغیرہ ائمۂ تفسیر سے منقول ہے (مظہری)

ابن کثیرؒ نے اسکی ایک دوسری تفسیر یہ بھی نقل کی ہے کہ انھوں نے جتنے گناہ زمانۂ کفر و جاہلیت میں کئے تھے، ایمان لانے کے بعد ان سب گناہوں کے بجائے نیکیاں لکھدی جاویں گی۔ اور وجہ اسکی یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد جب کبھی ان لوگوں کو اپنے پچھلے گناہ یاد آویں گے تو اُن پر نادم ہوں گے اور توبہ کی تجدید کریں گے ان کے اس عمل سے وہ گناہ نیکیوں میں تبدیل ہو جاویں گے، اس کی دلیل میں بعض روایاتِ حدیث بھی پیش فرمائی ہیں۔

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا، بظاہر یہ اسی مضمون کا تکرار ہے جو اس سے پہلے آیت میں آیا ہے إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا۔ اور قرطبی نے قفال سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ توبہ پہلی توبہ سے مختلف اور الگ ہے کیونکہ پہلا معاملہ کفار و مشرکین کا تھا جو قتل و زنا میں بھی مبتلا ہوئے تھے، پھر ایمان لے آئے تو اُن کی سیئات حسنات سے بدل دی گئیں، اور یہاں مسلمان گناہگاروں کی توبہ کا ذکر ہے اسی لئے پہلی توبہ کے ساتھ وَآمَنَ یعنی اسکے ایمان لانے کا ذکر تھا اس دوسری توبہ میں وہ مذکور نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ توبہ اُن لوگوں کی ذکر کی گئی ہے جو پہلے سے مؤمن ہی تھے مگر غفلت سے قتل و زنا میں مبتلا ہو گئے تو اسکے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی کہ ایسے لوگ اگر توبہ کر لینے کے بعد صرف زبانی توبہ پر اکتفا نہ کریں بلکہ آئندہ کے لئے اپنے عمل کو بھی صالح اور درست بنا لیں تو اُن کا توبہ کرنا صحیح اور درست سمجھا جائیگا۔ اسی لئے بطور شرط کے توبہ کر لینے کے ابتدائی حال ذکر کرنے کے بعد اسکی جزا میں پھر يَتُوبُ کا ذکر کرنا صحیح ہو گیا کیونکہ شرط میں جس توبہ کا ذکر ہے وہ صرف زبانی توبہ ہے اور جزا میں جس توبہ کا ذکر ہے وہ عمل صالح پر مرتب ہے۔ مطلب یہ ہو گیا کہ جس نے توبہ کر لی پھر اپنے عمل سے بھی اُس توبہ کا ثبوت دیا تو وہ صحیح طور پر اللہ کیطرف رجوع کرنے والا سمجھا جائیگا بخلاف اسکے جس نے پچھلے گناہ سے توبہ تو کی مگر آئندہ عمل میں اسکا کوئی ثبوت نہ فراہم کیا تو اُس کی توبہ گویا توبہ ہی نہیں۔ خلاصۂ مضمون اس آیت کا یہ ہو گیا کہ جو مسلمان غفلت سے گناہ میں مبتلا ہو گیا پھر توبہ کر لی اور اس توبہ کے بعد اپنے عمل کی بھی ایسی اصلاح کر لی کہ اسکے عمل سے توبہ کا ثبوت ملنے لگا تو یہ توبہ بھی عند اللہ مقبول ہو گی اور بظاہر اسکا فائدہ بھی وہی ہو گا جو پہلی آیت میں بتلایا گیا ہے کہ اسکے سیئات کو حسنات سے بدل دیا جائے گا۔

اللہ کے مخصوص اور مقبول بندوں کی خاص صفات کا بیان اوپر سے ہو رہا تھا، درمیان میں گناہ کے بعد توبہ کر لینے کے احکام کا بیان آیا اسکے بعد باقی صفات کا بیان ہے۔

دسویں صفت: وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ، یعنی یہ لوگ جھوٹ اور باطل کی مجلسوں میں شریک نہیں ہوتے، سب سے بڑا جھوٹ اور باطل تو شرک و کفر ہے اُسکے بعد عام جھوٹ اور گناہ کے کام ہیں۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ایسی مجلسوں میں شرکت سے بھی گریز کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد مشرکین کی عیدیں اور میلے ٹھیلے ہیں۔ حضرت مجاہد اور محمد بن حنفیہ نے فرمایا کہ اس سے مراد گانے بجانے کی محفلیں ہیں۔ عمرو بن قیس نے فرمایا کہ بے حیائی اور ناچ رنگ کی محفلیں مُراد ہیں۔ زہری، امام مالک نے فرمایا کہ شراب پینے پلانے کی مجلسیں مراد ہیں (ابن کثیر) اور حقیقت یہ ہے کہ ان اقوال میں کوئی اختلاف نہیں، یہ ساری ہی مجلسیں مجلسِ زُوْر کی مصداق ہیں۔ اللہ کے نیک بندوں کو ایسی محفلوں ہی سے پرہیز کرنا چاہیئے کیونکہ لغو و باطل کا بالقصد دیکھنا بھی اس کی شرکت کے حکم میں ہے (مظہری) اور بعض حضرات مفسرین نے لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ میں یشہدون کو شہادت بمعنے گواہی سے لیا ہے اور معنی آیت کے یہ قرار دیئے کہ یہ لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ جھوٹی گواہی کا گناہِ کبیرہ اور وبالِ عظیم ہونا قرآن سنت میں معروف و مشہور ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی گواہی کو اکبر کبائر فرمایا ہے۔

حضرت فاروقِ اعظمؓ نے فرمایا کہ جس شخص کے متعلق ثابت ہو جائے کہ اُسنے جھوٹی شہادت دی ہے تو اس کو چالیس کوڑوں کی سزا دی جائے اور اسکا منہ کالا کر کے بازار میں پھرایا جائے اور رُسوا کیا جائے پھر طویل زمانے تک قید میں رکھا جائے۔ (رواہ ابن ابی شیبہ عبدالرزاق۔ مظہری)

گیارھویں صفت: وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا، یعنی اگر لغو اور بیہودہ مجلسوں پر کبھی ان کا گزر اتفاقاً ہو جائے تو وہ سنجیدگی اور شرافت کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی مجلسوں میں یہ لوگ جس طرح بقصد و ارادہ شریک نہیں ہوتے اسی طرح اگر کہیں اتفاقی طور پر ان کا کسی ایسی مجلس پر گزر ہو جاوے تو اس فسق و فجور اور گناہ کی مجلس پر سے شرافت کیساتھ گزرے چلے جاتے ہیں۔ یعنی اُن کے اس فعل کو بُرا اور قابلِ نفرت جانتے ہوئے، نہ گناہوں میں مبتلا لوگوں کی تحقیر کرتے ہیں اور نہ خود اپنے آپ کو اُن سے افضل و بہتر سمجھ کر تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا اتفاق سے ایک روز کسی بیہودہ لغو مجلس پر گزر ہو گیا تو وہاں ٹھہرے نہیں گزرے چلے گئے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا تو فرمایا کہ ابن مسعود کریم ہو گئے اور یہ آیت تلاوت فرمائی جسمیں بیہودہ مجلس سے کریموں شریفوں کی طرح گزر جانے کا حکم ہے (ابن کثیر)

بارھویں صفت، وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا

یعنی ان مقبول بندوں کی یہ شان ہے کہ جب ان کو اللہ کی آیات اور آخرت کی یاد دلائی جاتی ہے تو وہ ان آیات کیطرف اندھے بہروں کی طرح متوجہ نہیں ہوتے بلکہ سمیع و بصیر انسان کی طرح ان میں غور کرتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ غافل اور مغفل لوگوں کی طرح ایسا معاملہ نہیں کرتے کہ اُنھوں نے سُنا ہی نہیں یا دیکھا ہی نہیں۔ اس آیت میں دو چیزیں مذکور ہیں ایک آیاتِ الٰہیہ پر گر پڑنا یعنی اہتمام کے ساتھ متوجہ ہونا یہ تو امر محمود و مقصود اور بہت بڑی نیکی ہے۔ دوسرے اندھے بہروں کی طرح گرنا کہ قرآن کی آیات پر توجہ تو دیں مگر یا تو اُس پر عمل کرنے میں معاملہ ایسا کریں کہ گویا اُنھوں نے سُنا اور دیکھا ہی نہیں اور یا آیاتِ قرآن پر عمل بھی کریں مگر اُن کو اُصولِ صحیحہ اور تفسیر صحابہؓ و تابعینؒ کے خلاف اپنی رائے یا سُنی سُنائی باتوں کے تابع کر کے غلط عمل کریں یہ بھی ایک طرح سے اندھے بہرے ہو کر ہی گرنے کے حکم میں ہے۔

احکامِ دین کا صرف مطالعہ کافی نہیں بلکہ اسلاف کی تفسیر کے مُطابق سمجھ کر عمل کرنا ضروری ہے

آیاتِ مذکورہ میں جس طرح اس امر کی سخت مذمت ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کی طرف توجہ ہی نہ دیں، اندھے بہروں کا سا معاملہ کریں، اسی طرح اسکی بھی مذمت ہے کہ توجہ تو دیں اور عمل بھی کریں مگر بے سمجھے بے بصیرتی کیساتھ اپنی رائے سے جس طرح چاہیں عمل کرنے لگیں۔ ابن کثیرؒ نے ابنِ عون سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے حضرت شعبیؒ سے پوچھا کہ اگر میں کسی مجلس میں پہنچوں جہاں لوگ سجدہ میں پڑے ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ کیسا سجدہ ہے تو کیا میں بھی اُنکے ساتھ سجدہ میں شریک ہو جاؤں۔ حضرت شعبیؒ نے فرمایا نہیں۔ مومن کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ بے سمجھے کسی کام میں لگ جائے بلکہ اُس پر لازم ہے کہ بصیرت کیساتھ عمل کرے۔ جب تم نے وہ آیتِ سجدہ نہیں سُنی جس کی بناء پر یہ لوگ سجدہ کر رہے ہیں اور تمھیں انکے سجدہ کی حقیقت بھی معلوم نہیں تو اس طرح انکے ساتھ سجدہ میں شریک ہونا جائز نہیں۔

اس زمانے میں یہ بات تو قابلِ شکر ہے کہ نوجوان اور نو تعلیم یافتہ طبقہ میں قرآن پڑھنے اور اسکے سمجھنے کی طرف کچھ توجہ پیدا ہوئی ہے اور اسکے تحت وہ بطور خود قرآن کا ترجمہ یا کسی کی تفسیر دیکھ کر قرآن کو خود سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مگر یہ کوشش بالکل بے اُصول ہے اسلئے قرآن کو صحیح سمجھنے کے بجائے بہت سے مغالطوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اُصول کی بات یہ ہے کہ دُنیا کا کوئی معمولی سے معمولی فن بھی نری کتاب کے مطالعہ سے کسی کو معتد بہ نہیں حاصل ہو سکتا جبتک اسکو کسی استاد سے نہ پڑھے معلوم نہیں قرآن اور علومِ قرآن ہی کو کیوں ایسا سمجھ لیا گیا ہے کہ جسکا جی چاہے خود ترجمہ دیکھکر جو چاہے اسکی مُراد متعین کرلے۔ یہ بے اصول مطالعہ جسمیں کسی ماہر استاد کی رہنمائی شامل نہو یہ بھی آیاتِ الٰہیہ پر اندھے بہرے ہو کر گرنے کے مفہوم میں شامل ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم

کی توفیق بخشیں ۔

تیرھویں صفت، وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا، اس میں اپنی اولاد اور ازواج کے لئے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ہے کہ اُن کو میرے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک بنانے سے مراد حضرت حسن بصریؒ کی تفسیر کیمطابق یہ ہے کہ اُن کو اللہ کی طاعت میں مشغول دیکھے یہی ایک انسان کیلئے آنکھوں کی اصلی ٹھنڈک ہے اور اگر اولاد و ازواج کی ظاہری صحت و عافیت اور خوشحالی بھی اسمیں شامل کیجائے تو وہ بھی درست ہے۔

یہاں اس دعا سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے مقبول بندے صرف اپنے نفس کی اصلاح اور اعمالِ صالحہ پر قناعت نہیں کرلیتے بلکہ اپنی اولاد اور بیبیوں کی بھی اصلاحِ اعمال و اخلاق کی فکر کرتے ہیں اور اسکے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی کوشش میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُن کی صلاحیت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا رہے۔ اس آیت کے اگلے جملے میں دعا کا یہ جز بھی ہے وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا، یعنی ہمیں متقی لوگوں کا امام اور پیشوا بنا دے، اسمیں بظاہر اپنے لئے جاہ و منصب اور بڑائی حاصل کرنے کی دعا ہے جو دوسری نصوصِ قرآن کی رُو سے ممنوع ہے جیسے قرآن کا ارشاد ہے تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا، یعنی ہم نے دارِ آخرت کو مخصوص کر رکھا ہے اُن لوگوں کے لئے جو زمین میں اپنا علو اور بڑائی نہیں چاہتے اور نہ زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔ اسلئے بعض علماء نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ہر شخص اپنے اہل و عیال کا قدرتی طور پر امام و پیشوا ہوتا ہی ہے اسلئے اس دعا کا حاصل یہ ہوگیا کہ ہمارے اولاد اور اہل و عیال کو متقی بنا دیجئے اور جب وہ متقی ہو جاویں گے تو طبعی طور پر یہ شخص متقین کا امام و پیشوا کہلائیگا جسکا حاصل یہ ہے کہ یہاں اپنی بڑائی کی دعا نہیں بلکہ اولاد و ازواج کے متقی بنانے کی دعا ہے۔ اور حضرت ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا کہ اس دعا میں اپنے لئے کوئی ریاست و امامت اور پیشوائی طلب کرنا مقصود نہیں بلکہ مقصود اس دعا کا یہ ہے کہ ہمیں ایسا بنا دیجئے کہ لوگ دین و عمل میں ہماری اقتدا کیا کریں اور ہمارے علم و عمل سے اُن کو نفع پہنچے تاکہ اسکا ثواب ہمیں حاصل ہو۔ اور حضرت مکحول شامیؒ نے فرمایا کہ دعا کا مقصود اپنے لئے تقویٰ کا ایسا اعلیٰ مقام حاصل کرنا ہے کہ دنیا کے متقی لوگوں کو بھی ہمارے عمل سے فائدہ پہنچے۔ قرطبی نے یہ دونوں قول نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ ان دونوں کا حاصل ایک ہی ہے کہ ریاست و امامت کی طلب جو دین کے لئے اور آخرت کے فائدہ کے لئے ہو وہ مذموم نہیں بلکہ جائز ہے۔ اور آیت لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا میں اس ریاست و اقتدار کی خواہش کی مذمت ہے جو دنیوی عزت و جاہ کے لئے ہو۔ واللہ اعلم۔ یہاں تک عِبَادُ الرَّحْمٰنِ، یعنی مومنین کاملین کی اہم صفات کا بیان پورا ہوگیا، آگے اُن کی جزا اور آخرت کے درجات کا ذکر ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ، غرفہ کے لغوی معنی بالاخانہ کے ہیں۔ جنت میں مقربین خاص کے لئے ایسے غرفات ہونگے جو عام اہل جنت کو ایسے نظر آئیں گے جیسے زمین والے ستاروں کو دیکھتے ہیں۔ (رواہ البخاری ومسلم وغیرھما۔ مظہری) مسند احمد، بیہقی، ترمذی، حاکم میں حضرت ابو مالک اشعری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں ایسے غرفے ہونگے جنکا اندرونی حصہ باہر سے اور بیرونی حصہ اندر سے نظر آتا ہوگا۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ، یہ غرفے کن لوگوں کے لئے ہیں، آپ نے فرمایا، جو شخص اپنے کلام کو نرم اور پاک رکھے اور ہر مسلمان کو سلام کرے اور لوگوں کو کھانا کھلائے، اور رات کو اسوقت تہجد کی نماز پڑھے جب لوگ سو رہے ہوں (مظہری)

وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا، یعنی جنت کی دوسری نعمتوں کے ساتھ ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوگا کہ فرشتے اُن کو مبارکباد دیں گے اور سلام کریں گے۔ یہاں تک مؤمنین مخلصین کی خصوصی عادات و اعمال اور اُن کی جزاء و ثواب کا ذکر تھا، آخری آیت میں پھر کفار و مشرکین کو عذاب سے ڈرا کر سورت کو ختم کیا گیا ہے۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ، اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں زیادہ واضح اور سہل وہ ہے جسکو خلاصۂ تفسیر میں اوپر لکھا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک تمہاری کوئی وقعت و حیثیت نہ ہوتی اگر تمہاری طرف سے اللہ کو پکارنا اور اسکی عبادت کرنا نہ ہوتا۔ کیونکہ انسان کی تخلیق کا منشا ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے جیسے دوسری آیت میں ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ، یعنی میں نے انسان اور جن کو اور کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا بجز اسکے کہ وہ میری عبادت کریں۔ یہ تو ایک عام ضابطہ بیان ہوا کہ بغیر عبادت کے انسان کی کوئی قدر و قیمت اور وقعت و حیثیت نہیں ہے اسکے بعد کفار و مشرکین جو رسالت اور عبادت ہی کے منکر ہیں اُن کو خطاب ہے فَقَدْ كَذَّبْتُمْ، یعنی تم نے تو سب چیزوں کو جھٹلا ہی دیا ہے اب تمہاری کوئی وقعت اللہ کے نزدیک نہیں، فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا، یعنی اب یہ تکذیب کفر تمہارے گلے کا ہار بن چکے ہیں اور تمہارے ساتھ لگے رہیں گے یہاں تک کہ جہنم کے دائمی عذاب میں مبتلا کر کے چھوڑیں گے۔ ونعوذ باللہ من حال اہل النار۔

تم بحمد اللہ سبحانہ تفسیر سورۃ الفرقان یوم الاحد لثالث عشر من صفر المظفر ۱۳۹۱ھ وباتمامہ تم بعون اللہ وکرمہ الحزب الرابع من الاحزاب السبعۃ القرآنیۃ واللہ سبحانہ وتعالیٰ ارجو واسأل اتمام الباقی وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

سُورَةُ الشُّعَرَاءِ

سُورَةُ الشُّعَرَاءِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَتَانِ وَسَبْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّاِحْدٰى عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۂ شعراء مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی دو سو ستائیس آیتیں اور گیارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

طٰسٓمّٓ ﴿١﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿٢﴾ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ

یہ آیتیں ہیں کھلی کتاب کی — شاید تو گھونٹ مارے اپنی جان اس

اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٣﴾ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ

بات پر کہ وہ یقین نہیں کرتے — اگر ہم چاہیں اُتاریں اُن پر آسمان سے ایک

اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴿٤﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ

نشانی پھر رہ جائیں اُن کی گردنیں اُسکے آگے نیچی — اور نہیں پہنچتی انکے پاس کوئی نصیحت

مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ﴿٥﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْا

رحمٰن سے نئی جس سے منہ نہیں موڑتے — سو یہ تو جھٹلا چکے

فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٦﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى

اب پہنچے گی اُن پر حقیقت اس بات کی جس پر ٹھٹھے کرتے تھے — کیا نہیں دیکھتے وہ

الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴿٧﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

زمین کو کتنی اُگائیں ہم نے اسمیں ہر ایک قسم کی خاصی چیزیں — اس میں البتہ نشانی ہے

وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٨﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٩﴾

اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے — اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

ع ۱

خلاصۂ تفسیر

طٰسٓمّٓ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (مضامین جو آپ پر نازل ہوتے ہیں) کتاب

واضح (یعنی قرآن) کی آیتیں ہیں (اور یہ لوگ جو اس پر ایمان نہیں لاتے تو آپ اتنا غم کیوں کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ) شاید آپ اُن کے ایمان نہ لانے پر (تاسف کرتے کرتے) اپنی جان دے دیدیجئے (اصل یہ ہے کہ یہ عالم ابتلاء ہے اس میں حق کے اثبات پر وہی دلائل قائم کئے جاتے ہیں جن کے بعد بھی ایمان لانا بندہ کے اختیار میں رہتا ہے ورنہ) اگر ہم (جبراً واضطراراً ان کو مومن کرنا) چاہیں تو اُن پر آسمان سے ایک (ایسی) بڑی نشانی نازل کر دیں (کہ ان کا اختیار ہی بالکل سلب ہو جاوے) پھر اُن کی گردنیں اس نشانی (کے آنے) سے پست ہو جاویں (اور بالاضطرار مومن بنجاویں لیکن ایسا کرنے سے آزمایش باقی نہ رہے گی اسلئے ایسا نہیں کیا جاتا اور معاملہ جبر و اختیار کے درمیان رہتا ہے) اور (اُن کی یہ حالت ہے کہ) اُن کے پاس کوئی تازہ فہمائش (حضرت) رحمان (جل شانہٗ) کیطرف سے ایسی نہیں آتی جس سے یہ بے رُخی نہ کرتے ہوں سو (اس بے رُخی کی یہانتک نوبت پہنچی کہ) انھوں نے (دینِ حق کو) جھوٹا بتلا دیا (جو اعراض کا انتہائی درجہ ہے اور صرف اسکے ابتدائی درجہ یعنی بے التفاتی پر اکتفاء نہیں کیا اور پھر تکذیب بھی خالی نہیں بلکہ استہزار کے ساتھ) سو اب عنقریب انکو اس بات کی حقیقت معلوم ہو جاویگی جس کے ساتھ یہ استہزار کیا کرتے تھے (یعنی جب عذاب الٰہی کا موت کے وقت یا قیامت میں معائنہ ہوگا، اسوقت قرآن کے اور مافی القرآن یعنی عذاب وغیرہ کے حق ہونیکا انکشاف ہو جاویگا) کیا انھوں نے زمین کو نہیں دیکھا (جو اُن سے بہت قریب اور ہر وقت پیشِ نظر ہے) کہ ہمنے اس میں کسقدر عمدہ عمدہ قسم قسم کی بُوٹیاں اُگائی ہیں (جو مثل جمیع مصنوعات کے اپنے بنانے والے کے وجود اور اُس کی یکتائی اور کمالِ قدرت پر دلالت کرتی ہیں کہ) اس میں (توحیدِ ذاتی و صفاتی و افعالی کی) ایک بڑی نشانی (عقلی) ہے (اور یہ مسئلہ بھی عقلی ہے کہ خدائی کے لئے کمالِ ذاتی و صفاتی شرط ہے اور کمال مذکور کے لوازم میں سے ہے کہ وہ خدائی میں اکیلا ہو) اور (باوجود اسکے) ان میں کے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے (اور شرک کرتے ہیں، غرض شرک کرنا انکارِ نبوت سے بھی بڑھ کر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان کے عناد نے ان کی فطرت کو بالکل مختل کر دیا پھر ایسوں کے پیچھے کیوں جان کھوئی جاوے) اور (اگر ان کو شرک کے مذموم عند اللہ ہونے میں یہ شبہ ہو کہ ہم پر عذاب فوراً کیوں نہیں آجاتا تو اسکی وجہ یہ ہے کہ) بلاشبہ آپ کا رب (باوجود اس کے کہ غالب (اور کامل القدرت) ہے (مگر اسکے ساتھ ہی) رحیم (بھی) ہے (اور اسکی رحمت عامّہ دنیا میں کفار سے بھی متعلق ہے اسکا اثر یہ ہے کہ ان کو مہلت دے رکھی ہے ورنہ کفر یقیناً مذموم اور عذاب کا مقتضی ہے)

معارف و مسائل

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ الآیۃ، باخع بخع سے مشتق ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ذبح کرتے کرتے

بخاع تک پہنچ جائے جو گردن کی ایک رگ ہے۔ اور اس جگہ باخع سے مُراد اپنے آپ کو تکلیف اور مشقت میں ڈالنا ہے۔ علامہ عسکری نے فرمایا کہ اس جیسے مقامات میں اگرچہ صورت جملہ خبریہ کی ہے مگر حقیقۃً اس سے مُراد نہی اور ممانعت کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر، اپنی قوم کے کفر اور اسلام سے انحراف کے سبب اتنا رنج نہ کیجئے کہ جان گھلنے لگے۔ اس آیت سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ کسی کافر کے بارے میں اگر یہ معلوم بھی ہوجائے کہ اس کی تقدیر میں ایمان لانا نہیں ہے تب بھی اس کو تبلیغ کرنے سے رُکنا نہیں چاہیئے، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ شفقت میں اعتدال چاہیئے اور جو شخص ہدایت نہ پائے اُس پر زیادہ حزن وغم نہ کیا جائے۔

اِنۡ نَّشَاۡ نُنَزِّلۡ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتۡ اَعۡنَاقُهُمۡ لَهَا خٰضِعِيۡنَ، علامہ زمخشری نے فرمایا کہ اصل کلام فظلوا لھا خاضعین ہے۔ یعنی کفار اس بڑی نشانی کو دیکھ کر تابع ہوجاویں اور جھک جائیں لیکن یہاں اعناق کا لفظ یہ ظاہر کرنے کے لئے لایا گیا ہے کہ موضع خضوع ظاہر ہوجائے کیونکہ جھکنا وغیرہ اور عاجزی کرنا سب سے پہلے گردن پر ظاہر ہوتا ہے۔ مضمون اس آیت کا یہ ہے کہ ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ اپنی توحید اور قدرتِ کاملہ کی کوئی نشانی ظاہر کر دیں جس سے احکامِ شرعیہ اور حقائقِ الٰہیہ بدیہی ہوکر سامنے آجائیں اور کسی کو مجال انکار نہ رہے مگر حکمت کا مقتضا یہ ہے کہ یہ احکام و معارف بدیہی نہیں بلکہ نظری رہیں کہ غور وفکر پر موقوف رہیں اور یہی غور وفکر انسان کی آزمایش ہے اسی پر ثواب وعذاب مرتب ہے۔ بدیہی چیزوں کا اقرار تو ایک طبعی اور ضروری امر ہے اسمیں تعبّد اور اطاعت کی شان نہیں (قرطبی)

زَوۡجٍ كَرِيۡمٍ، زوج کے لفظی معنے جوڑے کے ہیں اسی لئے مرد و عورت، نر و مادہ کو زوج کہا جاتا ہے بہت سے درختوں میں بھی نر و مادہ ہوتے ہیں اُن کو اس مناسبت سے بھی زوج کہا جاسکتا ہے اور کبھی لفظ زوج ایک خاص نوع اور صنف کے معنی میں بھی آتا ہے اس معنے کے لحاظ سے درختوں کی ہر نوع کو زوج کہا جاسکتا ہے اور کریم کے معنی ہیں عمدہ اور پسندیدہ چیز۔

وَاِذۡ نَادٰى رَبُّكَ مُوۡسٰٓى اَنِ ائۡتِ الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۰﴾ قَوۡمَ فِرۡعَوۡنَ

اور جب پکارا تیرے رب نے موسیٰ کو کہ جا اس قوم گنہگار کے پاس قوم فرعون کے پاس

اَلَا يَتَّقُوۡنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىۡۤ اَخَافُ اَنۡ يُّكَذِّبُوۡنِ ﴿۱۲﴾ وَيَضِيۡقُ

کیا وہ ڈرتے نہیں بولا اے رب میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھٹلائیں اور رُک جاتا ہے

صَدۡرِىۡ وَلَا يَنۡطَلِقُ لِسَانِىۡ فَاَرۡسِلۡ اِلٰى هٰرُوۡنَ ﴿۱۳﴾ وَلَهُمۡ عَلَىَّ

میرا جی اور نہیں چلتی ہے میری زبان سو پیغام دے ہارون کو اور اُن کو مجھ پر ہے

ذَنۡۢبٌ فَاَخَافُ اَنۡ يَّقۡتُلُوۡنِ ﴿۱۴﴾ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذۡهَبَا بِاٰيٰتِنَاۤ اِنَّا

ایک گناہ کا دعویٰ، سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں فرمایا کبھی نہیں تم دونوں جاؤ لے کر ہماری نشانیاں ہم

مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾

ساتھ تمہارے سُنتے ہیں سو جاؤ فرعون کے پاس اور کہو ہم پیغام لے کر آئے ہیں پروردگار عالم کا

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا

یہ کہ بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بولا کیا نہیں پالا ہم نے تجھ کو اپنے اندر لڑکا سا

وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ

اور رہا تو ہم میں اپنی عمر میں سے کئی برس اور کر گیا تو اپنی وہ کرتوت جو

فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾

کر گیا اور تو ہے ناشکر کہا کیا تو تھا میں نے وہ کام اور میں تھا چوکنے والا

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ

پھر بھاگا میں تم سے جب تمہارا ڈر دیکھا پھر بخشا مجھ کو میرے رب نے حکم اور ٹھہرایا مجھ کو پیغام

الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ

پہنچانے والا اور کیا وہ احسان ہے جو تو مجھ پر رکھتا ہے کہ غلام بنایا تو نے بنی

اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ

اسرائیل کو بولا فرعون کیا معنی پروردگار عالم کا کہا پروردگار آسمان اور

وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ

زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے اگر تم یقین کرو بولا اپنے گرد والوں سے

اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾ قَالَ

کیا تم نہیں سُنتے ہو کہا پروردگار تمہارا اور پروردگار تمہارے اگلے باپ دادوں کا بولا

اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ

تمہارا پیغام لانے والا جو تمہاری طرف بھیجا گیا ضرور باؤلا ہے کہا پروردگار

الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَ

مشرق کا اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے، اگر تم سمجھ رکھتے ہو بولا

لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ

اگر تو نے ٹھہرایا کوئی اور حاکم میرے سوائے تو مقرر ڈالوں گا تجھ کو قید میں کہا

اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ

اور اگر لے آیا ہوں تیرے پاس ایک چیز کھول دینے والی بولا تو وہ چیز لا اگر تو

الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۲﴾ وَّنَزَعَ

سچا ہے پھر ڈال دیا اپنا عصا، سو اسی وقت وہ اژدہا ہو گیا صریح اور اندر سے

يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۳۳﴾

نکالا اپنا ہاتھ، سو اسی وقت وہ سفید تھا دیکھنے والوں کے سامنے

خلاصۂ تفسیر

اور (ان لوگوں سے اس وقت کا قصہ ذکر کیجئے) جب آپ کے رب نے موسیٰ (علیہ السلام) کو پکارا (اور حکم دیا) کہ تم ان ظالم لوگوں کے یعنی قوم فرعون کے پاس جاؤ (اور اے موسیٰ دیکھو) کیا یہ لوگ (ہمارے غضب سے) نہیں ڈرتے (یعنی ان کی حالت عجیب اور شنیع ہے اسلئے ان کی طرف تم کو بھیجا جاتا ہے) انھوں نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار، (میں اس خدمت کے لئے حاضر ہوں لیکن اس خدمت کی تکمیل کے لئے ایک مددگار چاہتا ہوں کیونکہ) مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو (اپنی پوری بات کہنے سے پہلے ہی) جھٹلانے لگیں اور (طبعی طور پر ایسے وقت میں) میرا دل تنگ ہونے لگتا ہے اور میری زبان (اچھی طرح) نہیں چلتی اس لئے ہارون کے پاس (بھی وحی) بھیج دیجئے (اور ان کو نبوت عطا فرما دیجئے کہ اگر میری تکذیب کی جاوے تو وہ تصدیق کرنے لگیں تاکہ دل شگفتہ اور زبان رواں رہے اور اگر میری زبان کسی وقت بند ہو جاوے تو وہ تقریر کرنے لگیں اور ہر چند کہ یہ غرض ویسے بھی ہارون علیہ السلام کو بلا نبوت عطا ہوئے ساتھ رکھنے سے حاصل ہو سکتی تھی مگر عطائے نبوت میں اور زیادہ باکمل وجوہ پوری ہوئی) اور (ایک امر یہ قابل عرض ہے کہ) میرے ذمہ ان لوگوں کا ایک جرم بھی ہے (کہ میرے ہاتھ سے ایک قبطی قتل ہو گیا تھا جسکا قصہ سورۂ قصص میں آویگا) سو (اسلئے) مجھ کو (ایک) یہ اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھ کو (قبل تبلیغ رسالت) قتل کر ڈالیں (تب بھی تبلیغ نہ کرسکوں گا تو اس کی بھی کوئی تدبیر فرما دیجئے) ارشاد ہوا کہ کیا مجال ہے (جو ایسا کرسکیں اور ہم نے ہارون کو بھی پیغمبری دی، اب تبلیغ کے دونوں مانع مرتفع ہوگئے) سو (اب) تم دونوں میرے احکام لے کر جاؤ (کہ ہارون بھی نبی ہوگئے اور) ہم (نصرت و امداد سے) تمہارے ساتھ ہیں (اور جو گفتگو تمہاری اور ان لوگوں کی ہوگی اُس کو) سنتے ہیں سو تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور (اس) سے کہو کہ ہم رب العالمین کے فرستادہ ہیں (اور دعوت الی التوحید کے ساتھ یہ حکم بھی لائے ہیں) کہ تو بنی اسرائیل کو (اپنے بیگار اور ظلم سے رہائی دے کر ان کے اصلی وطن ملک شام کیطرف) ہمارے ساتھ جانے دے (خلاصہ اس دعوت کا حقوق اللہ اور حقوق العباد میں ظلم و تعدی کا ترک کرنا ہے، چنانچہ یہ دونوں حضرات گئے اور فرعون سے سب مضامین کہدیئے) فرعون (یہ سب باتیں سُن کر اول موسیٰ علیہ السلام کی طرف ان کو پہچان کر متوجہ ہوا اور) کہنے لگا کہ (اہا تم ہو) کیا ہم نے تم کو بچپن میں پرورش نہیں کیا اور تم اپنی (اس) عمر میں برسوں ہم میں رہا سہا کئے اور تم نے اپنی وہ حرکت بھی کی تھی جو کی تھی (یعنی قبطی کو قتل کیا تھا) اور تم بڑے ناسپاس ہو (کہ میرا ہی کھایا، میرا ہی آدمی قتل کیا اور

پھر مجھ کو اپنا تابع بنانے آئے ہو، چاہیئے تو یہ تھا کہ تم میرے سامنے دب کر رہتے) موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ (واقعی) اسوقت وہ حرکت میں کر بیٹھا تھا اور مجھ سے غلطی ہو گئی تھی (یعنی عمداً میں نے قتل نہیں کیا، اُس کی ظالمانہ رَوِش سے اس کو روکنا مقصود تھا اتفاق سے وہ مر گیا) پھر جب مجھ کو ڈر لگا تو میں تمھارے ہاں سے مفرور ہو گیا، پھر مجھ کو میرے رب نے دانشمندی عطا فرمائی اور مجھ کو پیغمبروں میں شامل کر دیا (اور وہ دانشمندی اسی نبوت کے لوازم سے ہے۔ خلاصۂ جواب یہ ہے کہ میں پیغمبری کی حیثیت سے آیا ہوں جس میں دبنے کی کوئی وجہ نہیں اور پیغمبری اس واقعہ قتل خطاء کے منافی نہیں کیونکہ یہ قتل خطاءً صادر ہوا تھا جو نبوت کی اہلیت وصلاحیت کے منافی نہیں۔ یہ تو جواب ہے اعتراض قتل کا) اور (رہا احسان جتلانا پرورش کا سو) وہ یہ نعمت ہے جسکا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو سخت ذلت (اور ظلم) میں ڈال رکھا تھا (کہ اُنکے لڑکوں کو قتل کرتا تھا جس کے خوف سے میں صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈالا گیا اور تیرے ہاتھ لگ گیا اور تیری پرورش میں رہا تو اس پرورش کی اصلی وجہ تو تیرا ظلم ہی ہے تو ایسی پرورش کا کیا احسان جتلاتا ہے بلکہ اس سے تو تجھے اپنی ناشائستہ حرکات کو یاد کر کے شرمانا چاہیئے) فرعون (اس بات پر لاجواب ہوا اور گفتگو کا پہلو بدل کر اُس) نے کہا کہ (جس کو تم) رَبُّ العالمین (کہتے ہو بقولہ تعالیٰ اِنَّا رَسُوۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ اس) کی ماہیت (اور حقیقت) کیا ہے موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ (مخلوقات) اُن کے درمیان میں ہے اس (سب) کا اگر تم کو یقین (حاصل) کرنا ہو (تو یہ پتہ بہت ہے، مطلب یہ کہ اس کی حقیقت کا ادراک انسان نہیں کر سکتا اس لئے جب ان کا سوال ہو گا صفات سے ہی جواب ملیگا) فرعون نے اپنے اردگرد (بیٹھنے) والوں سے کہا کہ تم لوگ (کچھ) سنتے ہو (کہ سوال کچھ جواب کچھ) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہ پروردگار ہے تمہارا اور تمہارے پہلے بزرگوں کا (اس جواب میں مکرر تنبیہ ہے اس مطلب پر مگر) فرعون (نہ سمجھا اور) کہنے لگا کہ یہ تمھارا رسول جو (بزعم خود) تمھاری طرف رسول ہو کر آیا ہے مجنون (معلوم ہوتا) ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہ پروردگار ہے مشرق اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اسکا بھی اگر تم کو عقل ہو (تو اسی سے مان لو) فرعون (آخر مجبور ہو کر) کہنے لگا کہ اگر تم میرے سوا کوئی اور معبود تجویز کرو گے تو تم کو جیل خانہ بھیجدوں گا۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کیا اگر کوئی میں صریح دلیل پیش کروں تب بھی (نہ مانے گا) فرعون نے کہا اچھا تو وہ دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو، تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی لاٹھی ڈالدی تو دفعۃً ایک نمایاں اژدہا بن گیا (اور دوسرا معجزہ دکھلانے کے لئے) اپنا ہاتھ (گریبان میں دے کر) باہر نکالا تو وہ دفعۃً سب دیکھنے والوں کے روبرو بہت ہی چمکتا ہوا ہو گیا (کہ اس کو بھی سب نے نظر حسی سے دیکھا)۔

معارف و مسائل

اطاعت کے لئے معاون اسباب کی طلب بہانہ جوئی نہیں قَالَ رَبِّ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ ○ وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي فَأَرْسِلْ إِلَىٰ هَارُونَ ○ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ○ ان آیاتِ مبارکہ سے ثابت ہوا کہ کسی حکم کے بجالانے میں کچھ ایسی چیزوں کی درخواست کرنا جو تعمیلِ حکم میں مددگار ثابت ہوں کوئی بہانہ جوئی نہیں ہے بلکہ جائز ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم خداوندی پا کر اس کی بجاآوری کو سہل اور مفید کرنے کے لئے خدائے ذوالجلال سے درخواست کی۔ لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم خداوندی کو بلا توقف بسر و چشم قبول کیوں نہ کیا؟ اور توقف کیوں فرمایا؟ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کیا وہ تعمیلِ حکم ہی کے سلسلہ میں کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں لفظ ضلال کا مفہوم قَالَ فَعَلْتُهَا إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ ۔ فرعون کے اس سوال پر کہ تم نے اے موسیٰ ایک قبطی کو قتل کیا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواباً فرمایا کہ ہاں میں نے قتل ضرور کیا تھا لیکن وہ قتل ارادۃً اور قصد سے نہ تھا بلکہ اس قبطی کو اس کی خطا پر متنبہ کرنے کے لئے گھونسہ مارا جس سے وہ ہلاک ہوگیا۔ خلاصہ یہ کہ نبوت کے منافی قتل عمد ہے اور یہ قتل بلا ارادہ ہوا تھا جو منافی نبوت نہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ یہاں "ضلال" کا مطلب "بے خبری" ہے اور اس سے مراد قبطی کا بلا ارادہ قتل ہو جانا ہے۔ اس معنی کی تائید حضرت قتادہ رحؒ اور ابن زیدؒ کی روایات سے بھی ہوتی ہے کہ دراصل عربی میں ضلال کے کئی معنی آتے ہیں، اور ہر جگہ اسکا مطلب گمراہی نہیں ہوتا۔ یہاں بھی اسکا ترجمہ "گمراہ" کرنا درست نہیں۔

خدائے ذوالجلال کی ذات و حقیقت کا علم انسان کے لئے ناممکن ہے قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ ، اس آیتِ مبارکہ سے ثابت ہوا کہ خدائے ذوالجلال کی کنہ و حقیقت کا جاننا ممکن نہیں کیونکہ فرعون کا سوال خدا تعالیٰ کی حقیقت، ماہیت کے متعلق تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بجائے ماہیتِ باری تعالیٰ بتلانے کے خدا تعالیٰ کے اوصاف بیان فرمائے جس سے اشارہ فرما دیا کہ خدا تعالیٰ کی کنہ اور حقیقت کا ادراک ناممکن ہے اور ایسا سوال ہی کرنا بیجا ہے۔ (کذا فی الروح)

أَنْ أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ ، بنی اسرائیل ملک شام کے باشندے تھے، وہاں جانا چاہتے تو فرعون ان کو جانے نہ دیتا تھا اس طرح چار سو سال سے وہ اسکی قید میں غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے ان کی تعداد اسوقت چھ لاکھ تیس ہزار تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو پیغامِ حق پہنچانے کے ساتھ ہی بنی اسرائیل پر جو ظلم اس نے کر رکھا تھا اس سے باز آنے اور ان کو آزاد چھوڑ دینے کی ہدایت فرمائی۔ (قرطبی)

پیغمبرانہ مناظرہ کا ایک نمونہ مناظرے کے مؤثر آداب

دو مختلف الخیال شخصوں اور جماعتوں میں نظریاتی بحث و مباحثہ جسکو اصطلاح میں مناظرہ کہا جاتا ہے، زمانۂ قدیم سے رائج ہے مگر عام طور پر مناظرہ ایک ہار جیت کا کھیل ہو کر رہ گیا ہے۔ لوگوں کی نظر میں مناظرہ کا حاصل اتنا ہی ہے کہ اپنی بات اونچی ہو، چاہے اس کی غلطی خود بھی معلوم ہو چکی ہو، اُس کو صحیح اور قوی ثابت کرنے کیلئے دلائل اور ذہانت کا سارا زور خرچ کیا جائے۔ اسی طرح مخالف کی کوئی بات سچی اور صحیح بھی ہو تو بہرحال رَد ہی کرنا اور اسکی تردید میں پوری توانائی صرف کرنا ہے۔ اسلام ہی نے اس کام میں خاص اعتدال پیدا کیا ہے اُسکے اصول و قواعد اور حدود متعین کر کے اسکو ایک مفید و مؤثر آلۂ تبلیغ و اصلاح بنایا ہے۔

آیاتِ مذکورہ میں اسکا ایک مختصر سا نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے جب فرعون جیسے جبّار خُدائی کے مدعی کو اُس کے دربار میں دعوتِ حق پہنچائی تو اُسنے مخالفانہ بحث کا آغاز اوّل دو ایسی باتوں سے کیا جنکا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات سے تھا۔ جیسا ہوشیار مخالف عموماً جب اصل بات کے جواب پر قادر نہیں ہوتا تو مخاطب کی ذاتی کمزوریاں ڈھونڈا اور بیان کیا کرتا ہے تاکہ وہ کچھ شرمندہ ہو جائے اور لوگوں میں اُس کی ہوا اُکھڑ جائے، یہاں بھی فرعون نے دو باتیں کہیں۔ **اوّل** تو یہ کہ تم ہمارے پروردہ ہمارے گھر میں پلکر جوان ہوئے ہو۔ ہم نے تم پر احسانات کیے ہیں۔ تمھاری کیا مجال ہے کہ ہمارے سامنے بولو۔ **دوسری** بات یہ ہے کہ تم نے ایک قبطی شخص کو بلاوجہ قتل کر ڈالا ہے جو علاوہ ظلم کے حق ناشناسی اور ناشکری بھی ہے کہ جس قوم میں پلے اور جوان ہوئے اُسی کے آدمی کو مار ڈالا۔ اسکے بالمقابل حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیغمبرانہ جواب دیکھئے کہ اوّل تو جواب میں سوال کی ترتیب کو بدلا یعنی قبطی کے قتل کا قصہ جو فرعون نے بعد میں بیان کیا تھا اُسکا جواب پہلے آیا۔ اور خانہ پروردہ ہونے کے احسان کا ذکر جو پہلے کیا تھا اُسکا جواب بعد میں۔ اس ترتیب بدلنے میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ واقعہ قبطی میں ایک اپنی کمزوری ضرور واقع ہوئی تھی آجکل کے مناظروں کے طرز پر تو ایسی چیز کے ذکر ہی کو رَلا بلا دیا جاتا ہے اور دوسری باتوں کی طرف توجہ پھیرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کے رسُول نے اُسی کے جواب کو اولیت دی۔ اور جواب بھی فی الجملہ اعترافِ کمزوری کے ساتھ دیا۔ اسکی قطعاً پرواہ نہ کی کہ مخالف لوگ کہیں گے کہ انھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے ہار مان لی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسکے جواب میں اسکا تو اعتراف کر لیا کہ اس قتل میں مجھ سے غلطی اور خطا ہو گئی مگر ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ یہ غلطی قصداً نہیں تھی ایک صحیح اقدام تھا جو اتفاقاً غلط انجام پر پہنچ گیا کہ مقصد تو قبطی کو اسرائیلی شخص پر ظلم سے روکنا تھا اسی قصد سے اس کو ایک ضرب لگائی تھی اتفاقاً وہ اسی سے مرگیا اسلئے یہ فعل خطا ہونے کے باوجود ہمارے اصل معاملہ یعنی نبوت کے دعوے اور اُس کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ مجھے اس غلطی پر تنبہ ہوا اور قانونی گرفت

کے خوف سے شہر سے نکل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر کرم فرمایا اور نبوت و رسالت سے سرفراز فرمادیا۔

غور کیجئے کہ اسوقت دشمن کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام کا سیدھا صاف جواب یہ تھا کہ مقتول قبطی کو واجب القتل ثابت کرتے، اسپر ایسے الزامات لگاتے جس سے اُسکا واجب القتل ہونا ثابت ہوتا۔ کوئی دوسرا آدمی تکذیب کرنے والا بھی وہاں موجود نہ تھا جس سے تردید کا اندیشہ ہوتا، اور اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اسکا جواب اسکے سوا کچھ نہوتا مگر وہاں تو خدا تعالیٰ کا ایک اولوالعزم رسول صدقِ مجسم تھا جو حق وصدق اور حقیقت کے اظہار ہی کو اپنی فتح سمجھتا تھا۔ دشمن کے بھرے دربار میں اپنی خطا کا اعتراف بھی کرلیا اور اُس سے جو نبوّت و رسالت پر شبہ ہوسکتا تھا اسکا جواب بھی دیدیا۔ اسکے بعد پہلی بات یعنی خانہ پروردہ ہونیکے احسان جتلانے کے جواب کیطرف توجہ فرمائی تو اسکے اس ظاہری احسان کی اصل حقیقت کیطرف توجہ دلادی کہ ذرا سوچو، میں کہاں اور دربارِ فرعون کہاں ؟ میری پرورش تمھارے گھر میں ہونیکے سبب پر غور کرو تو یہ حقیقت کُھل جائے گی کہ تم جو پوری قوم بنی اسرائیل پر یہ خلافِ انسانیت ظلم توڑ رہے تھے کہ انکے بے گناہ معصوم لڑکوں کو قتل کردیتے تھے، بظاہر تو تمھارے اس ظلم وستم سے بچنے کے لئے میری والدہ نے مجھے دریا میں ڈالا اور تمنے اتفاقی طور پر میرا تابوت دریا سے نکال کر گھر میں رکھ لیا اور حقیقۃً یہ اللہ تعالیٰ کا حکیمانہ انتظام اور تمھارے ظلم کی غیبی سزا تھی کہ جس بچے کے خطرہ سے بچنے کے لئے تم نے ہزاروں بچے قتل کرڈالے تھے قدرت نے اُس بچے کو تمھارے ہی ہاتھوں پلوایا۔ اب سوچو کہ یہ میری پرورش تمھارا کیا احسان تھا۔ اسی پیغمبرانہ طرزِ جواب کا یہ اثر تو طبعی اور عقلی طور پر حاضرین پر ہونا ہی تھا کہ یہ بزرگ کوئی بات بنانے والے نہیں، سچ کے سوا کچھ نہیں کہتے، اسکے بعد جب معجزات دیکھے تو اور زیادہ اسکی تصدیق ہوگئی۔ اور گو اقرار نہیں کیا مگر مرعوب اتنا ہوگیا کہ یہ صرف دو آدمی جن کے آگے پیچھے کوئی تیسرا مددگار نہیں، دربار سارا اُسکا، شہر اور ملک اُسکا، مگر یہ خوف اس پر طاری ہے کہ یہ دو آدمی ہمیں اپنے اس ملک و مملکت سے نکالدیں گے۔

یہ ہوتا ہے خداداد رُعب اور صدق وحق اور سچائی کی ہیبت۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے مجادلات و مناظرات بھی صدق وسچائی اور مخاطب کی دینی خیر خواہی کے جذبات سے پُر ہوتے ہیں۔ وہی دِلوں میں گھر کرتے ہیں اور بڑے بڑے سرکشوں کو رام کرلیتے ہیں۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ

بولا اپنے گرد کے سرداروں سے یہ تو کوئی جادوگر ہے پڑھا ہوا چاہتا ہے کہ نکالدے تم کو تمھارے

مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ

دیس سے اپنے جادو کے زور سے، سو اب کیا حکم دیتے ہو بولے ڈھیل دے اسکو اور اسکے بھائی کو

وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾

اور بھیجدے شہروں میں نقیب لے آئیں تیرے پاس جو بڑا جادوگر ہو پڑھا ہوا

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ

پھر اکٹھے کیے جادوگر وعدہ پر ایک مقرر دن کے اور کہدیا لوگوں کو کیا تم بھی

مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَلَمَّا

اکٹھے ہوگے شاید ہم راہ قبول کرلیں جادوگروں کی اگر ہو وہ اُن کو غلبہ پھر جب

جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾

آئے جادوگر کہنے لگے فرعون سے بھلا کچھ ہمارا حق بھی ہے اگر ہو ہم کو غلبہ

قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا

بولا البتہ اور تم اس وقت مقربوں میں ہوگے کہا اُن کو موسیٰ نے ڈالو جو

مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ

تم ڈالتے ہو پھر ڈالیں اُنھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں اور بولے فرعون کے اقبال سے

اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا

ہماری ہی فتح ہے پھر ڈالا موسیٰ نے اپنا عصا پھر تبھی وہ نگلنے لگا جو سانگ انھوں

يَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

نے بنایا تھا پھر اوندھے گرے جادوگر سجدہ میں بولے ہم نے مان لیا جہان کے رب کو

رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ

جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا بولا تم نے اُس کو مان لیا ابھی میں نے حکم نہیں دیا تم کو،

اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لَاُقَطِّعَنَّ

مقرر وہ تمہارا بڑا ہے جس نے تم کو سکھلایا جادو سو اب معلوم کرلوگے البتہ کاٹوں گا

اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾

تمہارے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں اور سُولی پر چڑھاؤں گا تم سب کو

قَالُوْا لَا ضَيْرَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا

بولے کچھ ڈر نہیں ہم کو اپنے رب کی طرف پھر جانا ہے ہم غرض رکھتے ہیں کہ بخشدے ہمکو رب

رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۱﴾

ہمارا تقصیریں ہماری اس واسطے کہ ہم ہوئے پہلے قبول کرنے والے

ع ۳

خلاصۂ تفسیر

(حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو یہ معجزات ظاہر ہوئے تو) فرعون نے اہل دربار سے جو اسکے آس پاس (بیٹھے) تھے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بڑا ماہر جادوگر ہے اسکا (اصل) مطلب یہ ہے کہ اپنے جادو (کے زور) سے (خود رئیس ہو جاوے اور) تم کو تمھاری زمین سے باہر کردے (تاکہ بلا مزاحمت غیرے اپنی قوم کو لے کر ریاست کرے) سو تم لوگ کیا مشورہ دیتے ہو؟ درباریوں نے کہا کہ آپ انکو اور ان کے بھائی کو (چندے) مہلت دیجئے اور (اپنے ملک کے حدود کے) شہروں میں (گرداوروں کو یعنی) چپراسیوں کو (حکمنامے دیکر) بھیج بھیجئے کہ وہ (سب شہروں سے) سب ماہر جادوگروں کو (جمع کر کے) آپ کے پاس لاکر حاضر کردیں، غرض وہ جادوگر ایک معین دن کے خاص وقت پر جمع کر لئے گئے (معین دن سے مراد یوم الزینت ہے اور خاص وقت سے مراد وقت چاشت ہے جیسے سورۂ طٰہٰ کے شروع رکوع سوم میں مذکور ہے، یعنی اسوقت کے قریب تک سب لوگ جمع کر لئے گئے اور فرعون کو جمع ہونے کی اطلاع دیدی گئی) اور (فرعون کی جانب سے بطور اعلان عام کے) لوگوں کو یہ اشتہار دیا گیا کہ کیا تم لوگ (فلاں موقع پر واقعہ دیکھنے کے لئے) جمع ہوگے (یعنی جمع ہو جاؤ) تاکہ اگر جادوگر غالب آجاویں (جیسا کہ غالب توقع ہے) تو ہم انھیں کی راہ پر رہیں (یعنی وہی راہ جس پر فرعون تھا اور دوسروں کو بھی اس پر رکھنا چاہتا تھا۔ مطلب یہ کہ جمع ہوکر دیکھو، اُمید ہے کہ جادوگر غالب رہیں گے تو ہم لوگوں کے طریق کا حق ہونا حجت سے ثابت ہو جائے گا) پھر جب وہ جادوگر (فرعون کی پیشی میں) آئے تو فرعون سے کہنے لگے کہ اگر (موسیٰ علیہ السلام) پر ہم غالب آگئے تو کیا ہمکو کوئی بڑا صلہ (اور انعام) ملے گا، فرعون نے کہا ہاں (انعام مالی بھی بڑا ملیگا) اور (مزید برآں یہ مرتبہ ملیگا کہ) تم اس صورت میں (ہمارے) مقرب لوگوں میں داخل ہو جاؤ گے (غرض اس گفتگو کے بعد عین موقعۂ مقابلہ پر آئے اور دوسری طرف موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے اور مقابلہ شروع ہوا اور ساحروں نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ اپنا عصا پہلے ڈالئے گا یا ہم ڈالیں) موسیٰ (علیہ السلام) نے اُن سے فرمایا کہ تم کو جو کچھ ڈالنا (منظور) ہو (میدان میں) ڈالو، سو انھوں نے اپنی رسّیاں اور لاٹھیاں ڈالیں (جو جادو کے اثر سے سانپ معلوم ہوتے تھے) اور کہنے لگے کہ فرعون کے نصیب کی قسم بے شک ہم ہی غالب آویں گے، پھر موسیٰ (علیہ السلام) نے (بحکم خداوندی) اپنا عصا ڈالا، ڈالنے کیساتھ ہی (اژدہا بن کر) اُنکے تمام تر بنے بنائے دھندے کو نگلنا شروع کردیا سو (یہ دیکھ کر) جادوگر (ایسے متاثر ہوئے کہ) سب سجدہ میں گر پڑے (اور پکار پکار کر) کہنے لگے کہ ہم ایمان لے آئے رب العالمین پر جو موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کا بھی رب ہے۔ (فرعون بڑا گھبرایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری

رعایا ہی مسلمان ہو جاوے تو ایک مضمون گھڑ کر بصورت عتاب ساحروں سے) کہنے لگا کہ ہاں تم موسیٰ پر ایمان لے آئے بغیر اسکے کہ میں تم کو اجازت دوں ضرور (معلوم ہوتا ہے کہ) یہ (جادو میں) تم سب کا استاد ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے (اور تم اسکے شاگرد ہو اسلئے باہم خفیہ سازش کرلی ہے کہ تم یوں کرنا ہم یوں کریں گے پھر اس طرح ہار جیت ظاہر کریں گے تاکہ قبطیوں سے سلطنت لیکر بفراغ خاطر خود ریاست کرو کقولہ تعالیٰ (اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِی الْمَدِیْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا) سو اب تم کو حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے (اور وہ یہ ہے کہ) میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا اور تم سب کو سولی پر ٹانگ دونگا (تاکہ اوروں کو عبرت ہو) انہوں نے جواب دیا کہ کچھ حرج نہیں ہم اپنے مالک کے پاس جا پہنچیں گے (جہاں ہر طرح امن و راحت ہے پھر ایسے مرنے سے نقصان ہی کیا اور) ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہماری خطاؤں کو معاف کر دے اس وجہ سے کہ ہم (اس موقع پر حاضرین میں سے) سب سے پہلے ایمان لائے (پس اس پر یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ ان سے پہلے بعضے ایمان لا چکے تھے جیسے آسیہ اور مومن آلِ فرعون اور بنی اسرائیل)

معارف و مسائل

اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں سے کہا کہ آپ جو کچھ جادو دکھانا چاہتے ہو وہ دکھاؤ۔ اس پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن کو جادو کا حکم دے رہے ہیں، لیکن ذرا سے غور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے جادو دکھانے کا حکم نہیں تھا بلکہ جو کچھ وہ کرنے والے تھے اسکا ابطال مقصود تھا لیکن اسکا باطل ہونا بغیر اسکے ظاہر کرنے کے ناممکن تھا اسلئے آپ نے ان کو اظہار جادو کا حکم دیا جیسے کہ ایک زندیق کو کہا جائے کہ تم اپنے زندقہ اور بے دینی کے دلائل پیش کرو تاکہ میں ان کو باطل ثابت کر سکوں ظاہر ہے کہ اسے کفر پر رضامندی نہیں کہا جا سکتا۔

بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ، یہ کلمہ ان جادوگروں کے لئے بمنزلہ قسم ہے جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھی۔ افسوس کہ مسلمانوں میں بھی اب ایسی قسمیں رائج ہوگئی ہیں جو اس سے زیادہ شنیع اور قبیح ہیں مثلاً بادشاہ کی قسم، تیرے سر کی قسم، تیری ڈاڑھی کی قسم یا تیرے باپ کی قبر کی قسم، اس قسم کی قسمیں کھانا شرعاً جائز نہیں، بلکہ ان کے متعلق یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھانے میں جو گناہِ عظیم ہے ان ناموں کی سچی قسم بھی گناہ میں اُس سے کم نہیں (کمافی الشامی)

قَالُوْا لَا ضَیْرَ اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ، یعنی جب فرعون نے جادوگروں کو قبولِ ایمان پر قتل کی اور ہاتھ پاؤں کاٹنے اور سولی چڑھانے کی دھمکی دی تو جادوگروں نے بڑی بے پروائی سے یہ جواب

دیا کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو کر لو۔ ہمارا کوئی نقصان نہیں، ہم قتل بھی ہونگے تو اپنے رب کے پاس چلے جائینگے جہاں آرام ہی آرام ہے۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ جادوگر جو عمر بھر جادوگری کے کفر میں مبتلا، اُس پر مزید فرعون کے دعوائے خدائی کو ماننے والے اور اس کی پرستش کرنے والے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھکر اپنی پوری قوم کے خلاف فرعون جیسے ظالم جابر بادشاہ کے خلاف ایمان کا اعلان کر دیں یہی ایک حیرت انگیز چیز تھی مگر یہاں تو صرف ایمان کا اعلان ہی نہیں بلکہ ایمان کا وہ گہرا رنگ چڑھ جانے کا مظاہرہ ہے کہ قیامت و آخرت گویا انکے سامنے نظر آنے لگی۔ آخرت کی نعمتوں کا مشاہدہ ہونے لگا، جس کے مقابلے میں دُنیا کی ہر سزا اور مصیبت سے بے نیاز ہو کر (فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ) کہدیا یعنی جو تیرا جی چاہے کر لے ہم تو ایمان سے پھرنے والے نہیں۔ یہ بھی درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کا معجزہ ہے جو معجزہ عصا اور ید بیضا سے کم نہیں، اسی طرح کے بہت سے واقعات ہمارے رسول محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ظاہر ہوئے ہیں کہ ایک منٹ میں ستر برس کے کافر میں ایسا انقلاب آگیا کہ صرف مومن ہی نہیں ہو گیا بلکہ غازی بن کر شہید ہونے کی تمنا کرنے لگا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو کہ رات کو لے نکل میرے بندوں کو البتہ تمہارا پیچھا کریں گے

فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَاۗىِٕنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ لَشِرْذِمَةٌ

پھر بھیجے فرعون نے شہروں میں نقیب یہ لوگ جو ہیں سو ایک جماعت ہے

قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَاۗىِٕظُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾

تھوڑی سی اور وہ مقرر ہم سے دل جلے ہوئے ہیں اور ہم سارے اُن سے خطرہ رکھتے ہیں

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾

پھر نکال باہر کیا ہم نے اُن کو باغوں اور چشموں سے اور خزانوں اور عمدہ مکانوں سے

كَذٰلِكَ ۭ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ﴿۵۹﴾ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾

اسی طرح اور ہاتھ لگا دیں ہم نے یہ چیزیں بنی اسرائیل کے پھر پیچھے پڑے انکے سورج نکلنے کے وقت

فَلَمَّا تَرَاۗءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ

پھر جب مقابل ہوئیں دونوں فوجیں کہنے لگے موسیٰ کے لوگ ہم تو پکڑے گئے کہا

كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۶۲﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ

ہرگز نہیں، میرے ساتھ ہے میرا رب وہ مجھ کو راہ بتلائیگا پھر حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو کہ مار اپنے

بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ ﴿٦٣﴾ وَ

عصا سے دریا کو پھر دریا پھٹ گیا تو ہو گئی ہر پھانک جیسے بڑا پہاڑ اور

أَزْلَفْنَا ثَمَّ الْآخَرِينَ ﴿٦٤﴾ وَأَنجَيْنَا مُوسَىٰ وَمَن مَّعَهُ أَجْمَعِينَ ﴿٦٥﴾

پاس پہنچا دیا ہم نے اُسی جگہ دوسروں کو اور بچا دیا ہم نے موسیٰ کو اور جو لوگ تھے اسکے ساتھ سب کو

ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْآخَرِينَ ﴿٦٦﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم

پھر ڈبا دیا ہم نے اُن دوسروں کو اس چیز میں ایک نشانی ہے اور نہیں تھے بہت لوگ اُن میں

مُّؤْمِنِينَ ﴿٦٧﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٦٨﴾ ع

ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

خُلاصۂ تفسیر

اور (جب فرعون کو اس واقعہ سے بھی ہدایت نہ ہوئی اور اُس نے بنی اسرائیل کی آزادی نہ چھوڑی تو ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم بھیجا کہ میرے (ان) بندوں کو (یعنی بنی اسرائیل کو) شبا شب (مصر سے باہر) نکال لے جاؤ (اور فرعون کی جانب سے) تم لوگوں کا تعاقب (بھی) کیا جاویگا (چنانچہ وہ موافق حکم کے بنی اسرائیل کو لے کر رات کو چلدیئے صبح یہ خبر مشہور ہوئی تو) فرعون نے (تعاقب کی تدبیر کرنے کیلئے جا بجا آس پاس کے) شہروں میں چپراسی دوڑا دیئے (اور یہ کہلا بھیجا) کہ یہ لوگ (یعنی بنی اسرائیل ہماری نسبت) تھوڑی سی جماعت ہے (ان کے مقابلہ سے کوئی اندیشہ نہ کرے) اور انھوں نے (اپنی کارروائی سے) ہم کو بہت غصہ دلایا ہے (وہ کارروائی یہ ہے کہ خفیہ چالاکی سے نکل گئے یا یہ کہ زیور بھی ہمارا بہت سا عاریت کے بہانے سے لے گئے غرض ہم کو احمق بنا گئے ضرور ان کا تدارک کرنا چاہیئے) اور ہم سب ایک مسلح جماعت (اور باقاعدہ فوج) ہیں، غرض (دو چار روز میں جب سامان اور فوج سے درست ہو گیا تو لاؤ لشکر لے کر بنی اسرائیل کے تعاقب میں چلا اور یہ خبر نہ تھی کہ اب لوٹنا نصیب نہ ہوگا تو اس حساب سے گویا) ہم نے اُن کو باغوں سے اور چشموں سے اور خزانوں سے اور عمدہ مکانات سے نکال باہر کیا (ہم نے انکے ساتھ تو) یوں کیا اور اُن کے بعد بنی اسرائیل کو اُن کا مالک بنا دیا (یہ جملہ معترضہ تھا آگے قصہ ہے) غرض (ایک روز) سورج نکلنے کے وقت اُن کو پیچھے سے جا لیا (یعنی قریب پہنچ گئے اسوقت بنی اسرائیل دریائے قلزم سے اُترنے کی فکر میں تھے کہ کیا سامان کریں) پھر جب دونوں جماعتیں (باہم ایسی قریب ہوئیں کہ) ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں تو موسیٰ (علیہ السلام) کے ہمراہی (گھبرا کر) کہنے لگے کہ (اے موسیٰ) بس ہم تو اُن کے ہاتھ آگئے، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ ہرگز نہیں کیونکہ میرے ہمراہ میرا پروردگار ہے وہ مجھ کو ابھی (دریا سے نکلنے کا) رستہ بتلا دیگا (کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کو

روانگی کے وقت ہی کہدیا گیا تھا کہ سمندر میں خشک راستہ پیدا ہو جائیگا، فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَا تَخَافُ دَرَكًا وَلَا تَخْشَىٰ، گو خشک ہونیکی کیفیت اسوقت نہ بتلائی تھی پس موسیٰ علیہ السلام اسی وعدہ پر مطمئن تھے اور بنی اسرائیل کیفیت معلوم نہ ہونیسے مضطرب تھے) پھر ہمنے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ اپنے عصا کو دریا پر مارو چنانچہ (انھوں نے اس پر عصا مارا جس سے) وہ (دریا) پھٹ کر کئی حصے ہو گیا (یعنی پانی کئی جگہ سے ادھر ادھر ہٹکر بیچ میں متعدد سڑکیں کھل گئیں) اور ہر حصہ اتنا (بڑا) تھا جیسا بڑا پہاڑ (یہ لوگ دریا میں امن واطمینان سے پار ہو گئے) اور ہم نے دوسرے فریق کو بھی اس موقع کے قریب پہنچا دیا (یعنی فرعون اور فرعونی بھی دریا کے نزدیک پہنچے اور موافق پیشینگوئی سابق وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا، دریا اسوقت تک اسی حال پر ٹھہرا ہوا تھا، اسلئے کھلے رستہ کو غنیمت سمجھا اور آگا پیچھا کچھ سوچا نہیں، سارا لشکر اندر گھس گیا، اور چاروں طرف سے پانی سمٹنا شروع ہوا اور سارے لشکر کا کام تمام ہوا) اور (انجام قصہ کا یہ ہوا کہ) ہمنے موسیٰ (علیہ السلام) کو اور انکے ساتھ والوں سبکو (غرق ہونیسے) بچالیا، پھر دوسروں کو (یعنی انکے مخالفوں کو) غرق کر دیا (اور) اس (واقعہ) میں بھی بڑی عبرت ہے (یعنی اس قابل ہے کہ کفار اس سے استدلال کریں کہ مخالفتِ احکام درسل موجب عذابِ خداوندی ہے اور اس کو سمجھ کر مخالفت سے بچیں) اور (باوجود اسکے) ان (کفار مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور آپ کا رب بڑا زبردست ہے (اگر چاہتا دنیا میں ہی انکو عذاب دیتا لیکن اور) بڑا مہربان (بھی) ہے (اسلئے اپنی رحمتِ عامہ سے عذاب کی مہلت مقرر کر دی ہے، پس تعجیلِ عذاب سے بیفکر نہ ہونا چاہئے)۔

معارف و مسائل

وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ[۱]، اس آیت میں بظاہر یہ تصریح ہے کہ قوم فرعون کی چھوڑی ہوئی املاک اور جائداد، باغات و خزائن کا مالک غرقِ فرعون کے بعد بنی اسرائیل کو بنا دیا گیا، لیکن اسمیں ایک تاریخی اشکال یہ ہے کہ خود قرآن کی متعدد آیات اسپر شاہد ہیں کہ قوم فرعون کی ہلاکت کے بعد بنی اسرائیل مصر کیطرف نہیں لوٹے بلکہ اپنے اصلی وطن ارضِ مقدس شام کیطرف روانہ ہوئے، وہیں انکو ایک کافر قوم سے جہاد کرکے انکے شہر کو فتح کرنیکا حکم ملا، جسکی تعمیل سے بنی اسرائیل نے انکار کر دیا، اسپر بطور عذاب کے اس کھلے میدان میں جسمیں بنی اسرائیل جو تھے ایک قدرتی جیلخانہ بنا دیا گیا، کہ وہ اس میدان سے نکل نہیں سکتے تھے، اسی حال میں چالیس سال گذر گئے اور اسی وادیِ تیہ میں انکے دونوں پیغمبر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی وفات ہو گئی۔ اسکے بعد بھی کتبِ تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسیوقت بنی اسرائیل اجتماعی اور قومی صورت سے مصر میں داخل ہوئے ہوں کہ قوم فرعون کی جائداد و خزائن پر ان کا قبضہ ہوا ہو ——— تفسیر روح المعانی میں سورۂ شعراء کی اسی آیت کے تحت اسکے دو جواب بحوالہ تفسیر حضرت حسنؒ و قتادہؒ کے حوالہ سے نقل کئے ہیں، حضرت حسنؒ کا ارشاد ہے کہ آیت مذکورہ میں بنی اسرائیل کو فرعونی متروکہ جائیداد کا وارث بنانے کا ذکر ہے مگر یہ کہیں مذکور نہیں کہ یہ واقعہ ہلاکِ فرعون کے فوراً بعد ہو جائیگا، وادیِ تیہ کے واقعہ اور چالیس پچاس سال کے بعد بھی اگر وہ مصر میں داخل ہوئے ہوں تو آیت کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں آتا۔ رہا یہ امر کہ تاریخ سے انکا اجتماعی دخلِ مصر ثابت نہیں تو یہ اعتراض اسلئے قابلِ التفات نہیں ہے کہ اُس زمانہ کی تاریخ یہود و نصاریٰ کی لکھی ہوئی اکاذیب سے بھرپور ہے جو کسی طرح قابلِ اعتماد نہیں، اسکی وجہ سے آیتِ قرآن میں کوئی تاویل کرنیکی ضرورت نہیں ——— حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ اس واقعہ کے متعلق جتنی آیات قرآن کریم کی متعدد سورتوں میں آئی ہیں مثلاً سورۂ اعراف آیت ۱۲۹ و ۱۳۷ اور سورۂ قصص آیت ۵ اور سورۂ دخان کی آیات ۲۵ تا ۲۸ اور سورۂ شعراء کی آیت مذکورہ ۵۹ ان سب سے بظاہر اگرچہ ذہن اسطرف جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کو خاص انھیں باغات اور جائداد کا مالک بنایا گیا تھا جو قوم فرعون نے ارضِ مصر میں چھوڑی تھیں جس کیلئے بنی اسرائیل کا مصر کیطرف لوٹنا ضروری ہے۔ لیکن ان سب آیتوں کے الفاظ میں اسکی بھی واضح گنجائش موجود ہے کہ مراد انسے یہ ہو کہ بنی اسرائیل کو اسی طرح کے خزائن اور باغات وغیرہ کا مالک بنا دیا گیا جسطرح کے باغات قوم فرعون کے پاس تھے۔ جس کیلئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ارضِ مصر ہی میں پہنچکر حاصل ہوں بلکہ ارضِ شام میں بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔

[۱] یہ مضمون پہلی اشاعت میں لکھنے سے رہ گیا تھا طبع جدید کے وقت آج ۱۲ شعبان ۱۳۹۵ھ میں لکھا گیا جبکہ احقر کی عمر اسی سال پوری ہو رہی ہیں [illegible] ۱۲ منہ

اور سورۂ اعراف کی آیت میں اَلَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا کے الفاظ سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ارضِ شام مراد ہے کیونکہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں بٰرَکْنَا وغیرہ کے الفاظ اکثر ارضِ شام ہی کے بارے میں آئے ہیں اس لئے حضرت قتادہؓ کا قول یہ ہے کہ بلا ضرورت آیاتِ قرآن کو ایسے محمل پر محمول کرنا جو تاریخِ عام سے متصادم ہو درست نہیں ——— خلاصہ یہ ہے کہ اگر واقعات سے یہ ثابت ہو جائے کہ ہلاکِ فرعون کے بعد کسی وقت بھی بنی اسرائیل اجتماعی صورت سے مصر پر قابض نہیں ہوئے تو حضرت قتادہؓ کی تفسیر کے مطابق ان تمام آیات میں ارضِ شام اور اس کے باغات و خزائن کا وارث ہونا مراد لیا جا سکتا ہے۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم،

قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۝ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ۝ اسوقت جبکہ فرعونی لشکر جو انکے تعاقب میں تھا جب بالکل سامنے آگیا تو پوری قوم بنی اسرائیل چلا اٹھی کہ ہم تو پکڑ لئے گئے اور پکڑے جانیں شبہ اور دیر ہی کیا تھی کہ پیچھے یہ لشکر جرار اور آگے دریا حائل یہ صورت حال موسیٰ علیہ السلام سے بھی غائب نہ تھی مگر وہ کوہِ استقامت اللہ کے وعدہ پر یقین کر ہوئے اسوقت بھی بڑے زور سے کہتے ہیں کَلَّا ہرگز نہیں پکڑے جا سکتے اور وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ، میرے ساتھ میرا پروردگار ہے جو مجھے راستہ دیگا۔ ایمان کا امتحان ایسے ہی مواقع میں ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر ذرا ہراس نہیں تھا، وہ گویا راستہ بچنے کا آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ۔ اسیطرح کا بعینہ واقعہ ہجرت کیوقت غارِ ثور میں چھپنے کیوقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا تھا کہ دشمن جو آپکے تعاقب میں تھے اس غار کے دہانے پر آکھڑے ہوئے، ذرا نیچے نظر کریں تو آپ انکے سامنے آجائیں اسوقت صدیق اکبرؓ کو گھبراہٹ ہوئی تو آپ نے بعینہ یہی جواب دیا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا، کہ غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے ان دونوں واقعات میں ایک بات یہ بھی قابلِ نظر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تسلی دینے کے لئے کہا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ "میرے ساتھ میرا رب ہے" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوا مَعَنَا فرمایا کہ ہم دونوں کیساتھ ہمارا رب ہے، یہ امتِ محمدیہ کی خصوصیت ہے کہ اسکے افراد بھی اپنے رسولؐ کیساتھ معیتِ الٰہیہ سے سرفراز ہیں۔

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِیْمَ ﴿۶۹﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا

اور سنا دے انکو خبر ابراہیم کی جب کہا اپنے باپ کو اور اسکی قوم کو تم کس کو پوجتے ہو وہ بولے

نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیْنَ ﴿۷۱﴾ قَالَ هَلْ یَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾

ہم پوجتے ہیں مورتوں کو پھر سارے دن انہی کے پاس لگے بیٹھے رہتے ہیں، کہا کچھ سنتے ہیں تمہارا کہا جب تم پکارتے ہو،

اَوْ یَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ

یا کچھ بھلا کرتے ہیں تمہارا یا برا ، بولے نہیں، پر ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو یہی کام کرتے

قَالَ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۶﴾

کہا بھلا دیکھتے ہو جن کو پوجتے رہے ہو تم اور تمہارے باپ دادے اگلے

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۷﴾ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴿۷۸﴾ وَالَّذِیْ

سو وہ میرے دشمن ہیں مگر جہان کا رب جس نے مجھ کو بنایا سو وہی مجھ کو راہ دکھلاتا ہے اور وہ جو مجھ کو

هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ﴿۷۹﴾ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ﴿۸۰﴾ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ

کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوں تو وہی شفا دیتا ہے اور وہ جو مجھ کو مارے گا اور

ثُمَّ یُحْیِیْنِ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِیْۤ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴿۸۲﴾ رَبِّ

پھر جلائے گا اور وہ جو مجھ کو توقع ہے کہ بخشے میری تقصیر انصاف کے دن اے میرے رب

هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي

دے مجھ کو حکم اور ملا مجھ کو نیکوں میں اور رکھ میرا بول سچا

الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿۸۵﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ

پچھلوں میں اور کر مجھ کو وارثوں میں نعمت کے باغ کے اور معاف کر میرے باپ کو وہ تھا

مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾

راہ بھولے ہوؤں میں اور رسوا نہ کر مجھ کو جس دن سب جی کر اٹھیں جس دن نہ کام آئے کوئی مال اور نہ بیٹے

اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۹۰﴾ وَبُرِّزَتِ

مگر جو کوئی آیا اللہ کے پاس لے کر دل چنگا اور پاس لائیں بہشت کو واسطے ڈر والوں کے اور نکالیں دوزخ

الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۹۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

کو سامنے بے راہوں کے اور کہیں ان کو کہاں ہیں جن کو تم پوجتے تھے اللہ کے سوائے

هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿۹۴﴾ وَجُنُوْدُ

کیا کچھ مدد کرتے ہیں تمہاری یا بدلہ لے سکتے ہیں پھر اوندھے ڈالیں اس میں ان کو اور سب بے راہوں کو، اور ابلیس

اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿۹۵﴾ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۹۶﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ

کے لشکر کو سبھوں کو کہیں گے جب وہ وہاں باہم جھگڑنے لگیں قسم اللہ کی ہم تھے صریح غلطی

مُّبِيْنٍ ﴿۹۷﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۹۹﴾

میں جب ہم تم کو برابر کرتے تھے پروردگار عالم کے اور ہم کو راہ سے بہکایا سو ان گنہگاروں نے

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً

پھر کوئی نہیں ہماری سفارش کرنے والے اور نہ کوئی دوست محبت کرنے والا سو کسی طرح ہم کو پھر جانا ملے

فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ

تو ہم ہوں ایمان والوں میں اس بات میں نشانی ہے اور بہت لوگ ان میں

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ ع ۵

نہیں ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

خلاصۂ تفسیر

اور آپ ان لوگوں کے سامنے ابراہیم (علیہ السلام) کا قصہ بیان کیجئے (تاکہ ان کو شرک کی مذمت کے دلائل معلوم ہوں، خصوص ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہو کر کیونکہ یہ مشرکین عرب اپنے کو ملت ابراہیمیہ پر بتلاتے ہیں اور وہ قصہ اس وقت ہوا تھا) جبکہ انھوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے (جو کہ بت پرست تھی) فرمایا کہ تم کس (واہیات) چیز کی عبادت کیا کرتے ہو، انھوں نے کہا ہم بتوں کی عبادت کیا کرتے ہیں اور ہم انہی (کی عبادت)

پر جمے بیٹھے رہتے ہیں (ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انکو (اپنی عرض حاجت کیوقت) پکارا کرتے ہو یا (تم جو ان کی عبادت کرتے ہو تو کیا) یہ تم کو کچھ نفع پہنچاتے ہیں یا (اگر تم انکی عبادت ترک کردو تو کیا) یہ تمکو کچھ ضرر پہنچا سکتے ہیں (یعنی استحقاق الوہیت کیلئے علم اور قدرت کاملہ تو ضروری ہے) ان لوگوں نے کہا نہیں (یہ بات تو نہیں ہے کہ یہ کچھ سنتے ہوں یا نفع و ضرر پہنچا سکتے ہوں اور انکی عبادت کرنیکی یہ وجہ نہیں) بلکہ ہم نے اپنے بڑوں کو اسیطرح کرتے دیکھا ہے (اس لئے ہم بھی ویسا ہی کرتے ہیں) ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بھلا تم نے ان (کی حالت) کو (غور سے) دیکھا بھی جنکی تم عبادت کیا کرتے ہو تم بھی اور تمہارے پرانے بڑے بھی کہ یہ (معبودین) میرے (یعنی تمہارے لئے) باعث ضرر ہیں (یعنی اگر انکی عبادت کیجاوے خواہ نعوذ باللہ میں کروں یا تم کرو تو بجز ضرر کے اور کوئی نتیجہ نہیں) مگر ہاں رب العالمین (ایسا ہے کہ وہ اپنے عابدین کا دوست ہے اور اسکی عبادت سراسر نافع ہے) جسنے مجھکو (اور اسیطرح سب کو) پیدا کیا، پھر وہی مجھکو (میری مصلحتوں تک) رہنمائی کرتا ہے (یعنی عقل و فہم دیتا ہے جس سے نفع و ضرر کو سمجھتا ہوں) اور جو مجھکو کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں (جسکے بعد شفا ہو جاتی ہے) تو وہی مجھکو شفا دیتا ہے اور جو مجھکو (وقت پر) موت دیگا پھر (قیامت کے روز) مجھکو زندہ کریگا اور جس سے مجھ کو یہ امید ہے کہ میری غلط کاری کو قیامت کے روز معاف کر دیگا (یہ تمام صفات اسلئے سنائیں کہ قوم کو خدا تعالیٰ کی عبادت کی رغبت ہو پھر صفات کمال بیان فرماتے فرماتے غلبہ حضور سے حق تعالیٰ سے مناجات کرنے لگے کہ) اے میرے پروردگار مجھکو حکمت (یعنی جامعیت بین العلم والعمل میں زیادہ کمال) عطا فرما (کیونکہ نفس حکمت تو وقت دعا سے بھی حاصل ہے) اور (مراتب قرب میں) مجھکو (اعلیٰ درجہ کے) نیک لوگوں کے ساتھ شامل فرما (مراد انبیاء عالیشان ہیں) اور میرا ذکر آئندہ آنیوالوں میں جاری رکھ (تاکہ میرے طریقہ پر چلیں جس میں مجھ کو زیادہ ثواب ملے) اور مجھ کو جنت النعیم کے مستحقین میں سے کر اور میرے باپ (کو توفیق ایمان کی دیکر اس) کی مغفرت فرما کہ وہ گمراہ لوگوں میں ہے اور جس روز سب زندہ ہو کر اٹھیں گے اس روز مجھ کو رسوا نہ کرنا (آگے اس دن کے بعض واقعات ہائلہ کا بھی ذکر فرما دیا تاکہ قوم سنے اور ڈرے یعنی وہ ایسا دن ہوگا) جس دن میں کہ (نجات کے لئے) نہ مال کام آویگا نہ اولاد مگر ہاں (اسکو نجات ہوگی) جو اللہ کے پاس (کفر و شرک سے) پاک دل لیکر آویگا اور (اس روز) خدا ترسوں (یعنی ایمان والوں) کے لئے جنت نزدیک کر دیجاویگی (کہ اس کو دیکھیں اور یہ معلوم کرکے کہ ہم اسمیں جاویں گے خوش ہوں) اور ان گمراہوں (یعنی کافروں) کے لئے دوزخ سامنے ظاہر کیجاویگی (کہ اس کو دیکھ کر غمزدہ ہوں کہ ہم اسمیں جاوینگے) اور (اس روز) ان (گمراہوں) سے کہا جاویگا کہ وہ معبود کہاں گئے جن کی تم خدا کے سوا عبادت کیا کرتے تھے کیا (اسوقت) وہ تمہارا ساتھ دے سکتے ہیں یا اپنا ہی بچاؤ کر سکتے ہیں پھر (یہ کہہ کر) وہ (عابدین) اور گمراہ لوگ اور ابلیس کا لشکر سب کے سب دوزخ میں اوندھے منہ ڈالدیئے جاوینگے (بس وہ بت اور شیاطین نہ اپنے کو بچا سکے نہ اپنے عابدین کو) وہ کفار اس دوزخ میں گفتگو کرتے ہوئے (ان معبودین سے) کہیں گے کہ بخدا بے شک ہم صریح گمراہی میں تھے جبکہ تم کو (عبادت میں)

رب العالمین کے برابر کرتے تھے اور ہم کو تو بس ان بڑے مجرموں نے (جو کہ بانیٔ ضلالت تھے) گمراہ کیا سو (اب) نہ کوئی ہمارا سفارشی ہے (کہ چھڑالے) اور نہ کوئی مخلص دوست (کہ خالی دلسوزی ہی کرلے) سو کیا اچھا ہوتا کہ ہم کو (دُنیا میں) پھر واپس جانا ملتا کہ ہم مسلمان ہو جاتے (یہاں تک ابراہیم علیہ السلام کی تقریر ہو گئی آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) بیشک اس واقعہ (مناظرہ ابراہیمیہ نیز واقعہ قیامت) میں (بھی طالبانِ حق اور انجام اندیشوں کے لئے) ایک عبرت ہے (کہ مضامین مناظرہ میں غور کر کے توحید کا اعتقاد کریں اور واقعاتِ قیامت سے ڈریں اور ایمان لادیں) اور (باوجود اس کے) ان (مشرکین مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے بے شک آپکا رب بڑا زبردست رحمت والا ہے (کہ عذاب دے سکتا ہے مگر مہلت دے رکھی ہے)۔

معارف و مسائل

قیامت تک انسانوں میں ذکرِ خیر رکھنے کی دُعا وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ، اس آیۃ مبارکہ میں "لسان" سے مراد ذکر ہے اور "لی" کالام نفع کے لئے ہے آیۃ کے معنی یہ ہوئے کہ اے خدایا مجھے ایسے پسندیدہ طریقے اور عمدہ نشانیاں عطا فرما جس کی دوسرے لوگ قیامت تک پیروی کریں، اور مجھے ذکر خیر اور عمدہ صفت سے یاد کیا کریں (ابن کثیر و روح المعانی) خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دُعا قبول فرمائی۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ تک ملتِ ابراہیمی سے محبت والفت رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں، اگرچہ ان کا طریقہ ملتِ ابراہیمی کے خلاف کفر و شرک ہے مگر وہ دعویٰ یہی کرتے ہیں کہ ہم ملتِ ابراہیمی پر ہیں اور اُمّتِ محمدیہ تو بجا طور پر بھی ملتِ ابراہیمی پر ہونے کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتی ہے۔

حُبِّ جاہ مذموم مگر چند شرائط کیساتھ جائز ہے حُبِّ جاہ یعنی لوگوں سے اپنی عزت کرنے اور مدح کرنے کی خواہش شرعاً مذموم ہے قرآن کریم نے دارِ آخرت کی نعمتوں کو حُبِّ جاہ کے ترک پر موقوف قرار دیا ہے (قال تعالیٰ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا) اور جگہ آیت (وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعا کہ آنیوالی نسلوں میں میری تعریف و ثنا ہوا کرے بظاہر حبِّ جاہ میں داخل معلوم ہوتی ہے لیکن آیت کے الفاظ میں غور کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ اس دُعا کا اصل مقصد حبِّ جاہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے اسکی دُعا ہے کہ ایسے نیک اعمال کی توفیق بخشیں جو میری آخرت کا سامان بنیں اور اس کو دیکھکر دوسرے لوگوں کو بھی اعمالِ صالحہ کی رغبت ہو اور میرے بعد بھی لوگ اعمال صالحہ میں میری پیروی کرتے رہیں، جسکا خلاصہ یہ ہے کہ اس سے کوئی وجاہت کا فائدہ حاصل کرنا مقصود ہی نہیں،

جس کو حُبِّ جاہ کہا جا سکے۔ قرآن و حدیث میں جہاں طلبِ جاہ کو ممنوع اور مذموم قرار دیا ہے اسکی مراد وہی دُنیوی وجاہت اور اُس سے دُنیوی منافع حاصل کرنا ہے۔

امام ترمذی ونسائی نے حضرت کعبؓ بن مالک کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو بھوکے بھیڑیئے جو بکریوں کے گلے میں چھوڑ دیئے جاویں وہ بکریوں کے ریوڑ کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا دو خصلتیں انسان کے دین کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ ایک مال کی محبت دوسرے اپنی عزت وجاہ کی طلب (رواہ الطبرانی عن ابی سعید الخدریؓ والبزار عن ابی ہریرۃؓ) اور حضرت ابن عباسؓ سے بسند ضعیف دیلمی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ جاہ وثنا کی محبت انسان کو اندھا بہرا کر دیتی ہے۔ ان تمام روایات سے مراد وہ حُبِّ جاہ اور طلبِ ثناء ہے جو دُنیوی مقاصد کے لئے مطلوب ہو یا جس کی خاطر دین میں مداہنت یا کسی گناہ کا ارتکاب کرنا پڑے اور جب یہ صورت نہ ہو تو طلبِ جاہ مذموم نہیں۔ حدیث میں خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ دُعا منقول ہے (اللّٰھم اجعلنی فی عینی صغیرا وفی اعین الناس کبیرا یعنی یا اللہ مجھے خود اپنی نگاہ میں تو چھوٹا اور حقیر بنا دیجئے اور لوگوں کی نظر میں بڑا بنا دیجئے۔ یہاں بھی لوگوں کی نظر میں بڑا بنانیکا مقصد یہ ہے کہ لوگ نیک اعمال میں میری پیروی کریں۔ اسی لئے امام مالکؒ نے فرمایا کہ جو شخص واقع میں صالح اور نیک ہو، لوگوں کی نظر میں نیک بننے کے لئے ریاکاری نہ کرے اسکے لئے لوگوں کیطرف سے مدح وثنا کی محبت مذموم نہیں۔

ابن عربی نے فرمایا کہ آیتِ مذکورہ سے ثابت ہوا کہ جس نیک عمل سے لوگوں میں تعریف ہوتی ہو اُس نیک عمل کی طلب، خواہش جائز ہے۔ اور امام غزالیؒ نے فرمایا کہ دُنیا میں عزت وجاہ کی محبت تین شرطوں کے ساتھ جائز ہے۔ اوّل یہ کہ اس سے مقصود اپنے آپ کو بڑا اور اُسکے بالمقابل دوسرے کو چھوٹا یا حقیر قرار دینا نہ ہو بلکہ آخرت کے فائدہ کے لئے ہو کہ لوگ میرے معتقد ہو کر نیک اعمال میں میرا اتباع کریں۔ دوسرے یہ کہ جھوٹی ثنا خوانی مقصود نہ ہو کہ جو صفت اپنے اندر نہیں ہے لوگوں سے اسکی خواہش رکھے کہ وہ اس صفت میں اُسکی تعریف کریں۔ تیسرے یہ کہ اسکے حاصل کرنے کے لئے کسی گناہ یا دین کے معاملے میں مداہنت اختیار نہ کرنی پڑے۔

مشرکین کے لئے دُعائے مغفرت جائز نہیں وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ، قرآن مجید کے اس فرمان کے بعد (مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ) اب کسی ایسے شخص کے لئے جسکا کفر پر مرنا یقینی ہو استغفار اور دُعائے مغفرت طلب کرنا ناجائز اور حرام ہے کیونکہ آیتِ مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے کہ کسی نبی اور ایمانداروں کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لئے مغفرت طلب کریں خواہ وہ اسکے رشتہ دار اور قریبی ہی کیوں نہ ہوں جبکہ اُن کا جہنمی ہونا بالکل واضح ہو چکا ہو۔

ایک سوال و جواب اب یہاں یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ اس نہی اور ممانعت کے بعد پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مشرک باپ کے لئے کیوں دعائے مغفرت مانگی۔ اسکا جواب خود اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں دیدیا کہ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (توبہ)

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لئے انکی زندگی میں استغفار کی نیت اور خیال سے کی تھی کہ اللہ رب العزت ان کو ایمان لانے کی توفیق دے جس کے بعد مغفرت یقینی ہے یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ خیال تھا کہ میرا باپ خفیہ طور پر ایمان لے آیا ہے اگرچہ اسکا اظہار اور اعلان نہیں کیا لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معلوم ہو گیا کہ میرا باپ تو کفر پر مرا ہے تو انھوں نے اپنی پوری بیزاری اور براءۃ کا اظہار فرمایا۔ (فائدہ) اس بات کی تحقیق کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو باپ کا کفر اور شرک اپنے باپ کی زندگی میں معلوم ہو گیا تھا یا مرنے کے بعد یا قیامت کے روز ہوگا، اس کی پوری تفصیل سورہ توبہ میں مذکور ہے۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ یعنی قیامت کے اُس دن میں جس میں نہ کوئی مال کسی کو فائدہ دیگا نہ اُس کی نرینہ اولاد بجز اُس شخص کے جو اللہ کے پاس قلب سلیم لیکر پہنچے۔ اس آیت کی تفسیر بعض حضرات نے استثناء کو استثنائے منقطع قرار دیکر یہ کی ہے کہ اُس روز کسی کو نہ اسکا مال کام آدیگا نہ اولاد، ہاں کام آئیگا تو صرف اپنا قلب سلیم جس میں شرک و کفر نہ ہو۔ اور اس جملے کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص زید کے متعلق کسی سے پوچھے کہ کیا زید کے پاس مال اور اولاد بھی ہے وہ اسکے جواب میں کہے اسکا مال و اولاد تو اسکا قلب سلیم ہے۔ جسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مال و اولاد تو کچھ نہیں مگر ان سب کے بدلے اسکے پاس اپنا قلب سلیم موجود ہے۔ خلاصہ مضمون آیت کا اس تفسیر پر یہ ہوتا ہے کہ مال یا اولاد تو اُس روز کچھ کام نہ آئیں گے، کام صرف اپنا ایمان اور عمل صالح آئیگا جس کو قلب سلیم سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ اور مشہور تفسیر اکثر مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ استثناء متصل ہے اور معنے یہ ہیں کہ مال اور اولاد قیامت کے روز کسی شخص کے کام نہ آئیں گے بجز اُس شخص کے جسکا قلب سلیم ہے یعنی وہ مومن ہے اسکا حاصل یہ ہوا کہ یہ سب چیزیں قیامت میں بھی مفید و نافع ہو سکتی ہیں مگر صرف مومن کے لئے نفع بخش ہونگی کافر کو کچھ نفع نہ دیں گی۔ یہاں ایک بات یہ قابل نظر ہے کہ اس جگہ قرآن کریم نے وَلَا بَنُوْنَ فرمایا جس کے معنے نرینہ اولاد کے ہیں عام اولاد کا ذکر غالباً اس لئے نہیں کیا کہ آڑے وقت میں کام آنے کی توقع دنیا میں بھی نرینہ اولاد یعنی لڑکوں ہی سے ہو سکتی ہے لڑکیوں سے کسی مصیبت کے وقت امداد ملنے کا تو یہاں بھی احتمال شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اسلئے قیامت میں بالتخصیص لڑکوں کے غیر نافع ہونیکا ذکر کیا گیا جن سے دنیا میں توقع نفع کی رکھی جاتی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ قلب سلیم کے لفظی معنے تندرست دل کے ہیں۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ قلب ہے جو کلمہ توحید کی گواہی دے اور شرک سے پاک ہو، یہی مضمون مجاہد حسن بصری سعید بن مسیب سے بعنوان مختلف منقول ہے۔ سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ تندرست دل صرف مومن کا ہو سکتا ہے کافر کا دل بیمار ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ۔

مال و اولاد اور خاندانی تعلقات آخرت میں بھی بشرط ایمان نفع پہنچا سکتے ہیں۔ آیتِ مذکورہ کی مشہور تفسیر کے مطابق معلوم ہوا کہ انسان کا مال قیامت کے روز بھی اُسکے کام آسکتا ہے بشرطیکہ وہ مسلمان ہو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جس شخص نے دُنیا میں اپنا مال اللہ کی راہ اور نیک کاموں میں خرچ کیا تھا یا کوئی صدقہ جاریہ کر کے چھوڑا تھا، اگر اُسکا خاتمہ ایمان پر ہوا محشر میں مؤمنین کی فہرست میں داخل ہوا تو یہاں کا خرچ کیا ہوا مال اور صدقہ جاریہ کا ثواب اس کو میدانِ حشر اور میزانِ حساب میں بھی کام آدیگا۔ اور اگر یہ شخص مسلمان نہیں تھا یا خدانخواستہ مرنے سے پہلے ایمان سے نکل گیا تو اب دُنیا میں کیا ہوا کوئی نیک عمل اسکے کام نہ آویگا اور اولاد کا بھی یہی معاملہ ہے کہ اگر یہ شخص مسلمان ہے تو آخرت میں بھی اس کو اولاد کا فائدہ پہنچ سکتا ہے اس طرح سے کہ اسکے بعد اس کی اولاد اسکے لئے دُعائے مغفرت کرے یا ایصالِ ثواب کرے، اور اس طرح بھی کہ اُسنے اولاد کو نیک بنانے کی کوشش کی تھی اسلئے اُن کے نیک عمل کا ثواب اس کو بھی خود بخود ملتا رہا اور اسکے نامۂ اعمال میں درج ہوتا رہا۔ اور اس طرح بھی کہ اولاد محشر میں اسکی شفاعت کر کے بخشوالے جیسا کہ بعض روایات حدیث میں ایسی شفاعت کرنا اور اسکا قبول ہونا ثابت ہے خصوصاً نابالغ اولاد کا۔ اسی طرح اولاد کو ماں باپ سے بھی آخرت میں بشرط ایمان یہ نفع پہنچے گا کہ اگر یہ مسلمان ہوئے مگر اُن کے اعمالِ صالحہ ماں باپ کے درجے کو نہیں پہنچے تو اللہ تعالیٰ اُن کے باپ دادا کی رعایت کر کے ان کو بھی اُسی مقام بلند میں پہنچا دیں گے جو اُن کے باپ دادا کا مقام ہے قرآن کریم میں اس کی تصریح اس طرح مذکور ہے وَاَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ، یعنی ہم ملا دیں گے اپنے نیک بندوں کے ساتھ اُن کی ذریت کو بھی۔ اس آیت کی مذکورالصدر مشہور تفسیر سے معلوم ہوا کہ قرآن حدیث میں جہاں کہیں یہ مذکور ہے کہ قیامت میں خاندانی تعلق کچھ کام نہ آدیگا اس کی مُراد یہ ہے کہ غیر مؤمن کو کام نہ آوے گا، یہانتک کہ پیغمبر کی اولاد اور بیوی بھی اگر مؤمن نہیں تو ان کی پیغمبری سے ان کو قیامت میں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے اور لوط علیہ السلام کی بیوی اور ابراہیم علیہ السلام کے والد کا معاملہ ہے۔ آیاتِ قرآن فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ اور یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ) اور لَا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ) ان سب آیات کا یہی مفہوم ہو سکتا ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۰۵﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا

جھٹلایا نوح کی قوم نے پیغام لانے والوں کو جب کہا اُن کو اُنکے بھائی نوح نے کیا تم کو

تَتَّقُونَ ﴿۱۰۶﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿۱۰۷﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿۱۰۸﴾

ڈر نہیں میں تمہارے واسطے پیغام لانے والا ہوں معتبر سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۰۹﴾

اور مانگتا نہیں میں تم سے اس پر کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی پروردگار عالم پر

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوا أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ ﴿۱۱۱﴾

سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو بولے کیا ہم تجھ کو مان لیں اور تیرے ساتھ ہو رہے ہیں کمینے

قَالَ وَمَا عِلْمِي بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۱۲﴾ إِنْ حِسَابُهُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّي

کہا مجھ کو کیا جاننا ہے اسکا جو کام وہ کر رہے ہیں ان کا حساب پوچھنا میرے رب ہی کا کام ہے

لَوْ تَشْعُرُونَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۱۴﴾ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ

اگر تم سمجھ رکھتے ہو اور میں ہانکنے والا نہیں ایمان لانے والوں کو میں تو بس یہی ڈر سنا دینے والا

مُبِينٌ ﴿۱۱۵﴾ قَالُوا لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ ﴿۱۱۶﴾

ہوں کھول کر بولے اگر تو نہ چھوڑے گا اے نوح تو ضرور سنگسار کر دیا جائے گا

قَالَ رَبِّ إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ ﴿۱۱۷﴾ فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَ

کہا اے رب میری قوم نے تو مجھ کو جھٹلایا سو فیصلہ کر دے میرے انکے بیچ میں کسی طرح کا فیصلہ اور

نَجِّنِي وَمَنْ مَعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۱۸﴾ فَأَنْجَيْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي

بچا لے مجھ کو اور جو میرے ساتھ ہیں ایمان والے پھر بچا دیا ہم نے اسکو اور جو اسکے ساتھ تھے

الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ﴿۱۱۹﴾ ثُمَّ أَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبَاقِينَ ﴿۱۲۰﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ

اس لدی ہوئی کشتی میں پھر ڈبا دیا اسکے پیچھے ان باقی رہے ہوؤں کو البتہ اس بات میں

لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۲۱﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۱۲۲﴾

نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں ہیں ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

النصف ع ۱۰

خلاصۂ تفسیر

قوم نوح نے پیغمبروں کو جھٹلایا (کیونکہ ایک پیغمبر کی تکذیب سے سب کی تکذیب لازم آتی ہے) جبکہ اُن سے اُنکی برادری کے بھائی نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم (خدا سے) نہیں ڈرتے؟ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں (کہ بعینہٖ پیغام خداوندی بلاکمی بیشی پہنچا دیتا ہوں) سو

(اسکا مقتضی یہ ہے کہ) تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور (نیز) میں تم سے کوئی (دُنیوی) صلہ (بھی) نہیں مانگتا میرا صلہ تو بس رب العالمین کے ذمہ ہے سو (میری اس بے غرضی کا مقتضی بھی یہی ہے کہ) تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا ہم تم کو مانیں گے، حالانکہ رذیل لوگ تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں (جن کی موافقت سے شرفاء کو عار آتی ہے اور نیز اکثر ایسے کم حوصلہ لوگوں کا مقصد کسی کے ساتھ لگنے سے کچھ مال یا جاہ حاصل کرنا ہوتا ہے، ان کا دعوائے ایمان بھی قابلِ اعتبار نہیں۔) نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اُنکے (پیشہ ورانہ) کام سے مجھ کو کیا بحث (خواہ شریف ہوں یا ذلیل ہوں دین میں اس تفاوت کا کیا اثر رہا؟ یہ احتمال کہ انکا ایمان دل سے نہیں سو اس پر) ان سے حساب کتاب لینا بس خدا کا کام ہے۔ کیا خوب ہو کہ تم اس کو سمجھو اور (رذالت پیشہ لوگوں کو اپنے ایمان کا مانع قرار دینے سے جو اشارۃً یہ درخواست نکلتی ہے کہ میں ان کو اپنے پاس سے دُور کر دوں تو) میں ایمانداروں کو دُور کرنے والا نہیں ہوں (خواہ تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ میرا کوئی ضرر نہیں کیونکہ) میں تو صاف طور پر ایک ڈرانے والا ہوں (اور تبلیغ سے میرا فرضِ منصبی پورا ہو جاتا ہے، آگے اپنا نفع و نقصان تم لوگ دیکھ لو) وہ لوگ کہنے لگے اگر تم (اس کہنے سننے سے) اے نوح باز نہ آؤ گے تو ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے (غرض جب سالہا سال اسطرح گزر گئے تب) نوح (علیہ السلام) نے دُعا کی کہ اے میرے پروردگار میری قوم مجھ کو (برابر) جھٹلا رہی ہے سو آپ میرے اور ان کے درمیان ایک (عملی) فیصلہ کر دیجئے (یعنی ان کو ہلاک کر دیجئے) اور مجھ کو اور جو ایماندار میرے ساتھ ہیں ان کو (اس ہلاکت سے) نجات دیجئے تو ہم نے (ان کی دُعا قبول کی اور) ان کو اور جو اُن کے ساتھ بھری ہوئی کشتی میں (سوار) تھے اُن کو نجات دی پھر اسکے بعد ہم نے باقی لوگوں کو غرق کر دیا اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے اور (باوجود اسکے) ان (کفارِ مکہ) میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، بیشک آپ کا رب زبردست (اور) مہربان ہے (کہ باوجود عذاب پر قادر ہونے کے اُن کو مہلت دیئے ہوئے ہے)۔

معارف و مسائل

طاعات پر اُجرت لینے کا حکم | وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم اور تبلیغ پر اُجرت لینا درست نہیں ہے اسلئے سلف صالحین نے اُجرت لینے کو حرام کہا ہے لیکن متاخرین نے اس کو بحالتِ مجبوری جائز قرار دیا ہے۔ اس کی پوری تفصیل آیت لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا کے تحت میں بیان ہو چکی ہے۔

فائدہ ۔ اس جگہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ کی آیت دو دفعہ تاکید کے لئے اور یہ بتلانے کے لئے

لائی گئی ہے کہ اطاعتِ رسول اور خدا تعالیٰ سے ڈرنے کے لئے صرف رسول کی امانت و دیانت یا صرف تبلیغ و تعلیم پر اُجرت نہ طلب کرنا ہی کافی تھا لیکن جس رسول میں یہ سب صفتیں پائی جائیں اسکی اطاعت اور اسکے خدا سے ڈرنا تو اور لازمی ہو جاتا ہے۔

شرافت و رذالت اعمال و اخلاق سے ہے نہ کہ خاندان اور جاہ و حشم سے

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ۝ قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اس آیت میں اوّل مشرکین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے سے انکار کی وجہ یہ بیان کی کہ آپکے ماننے والے سارے رذیل لوگ ہیں ہم عزت دار شریف اُن میں کیسے مل جائیں؟ نوح علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ مجھے انکے اعمال کا حال معلوم نہیں۔ اسمیں اشارہ فرمادیا کہ تم لوگ جو خاندانی شرافت یا مال و دولت اور عزت و جاہ کو شرافت کی بنیاد سمجھتے ہو یہ غلط ہے بلکہ مدار عزت و ذلت یا شرافت و رذالت کا دراصل اعمال و اخلاق پر ہے۔ تم نے جن پر یہ حکم لگا دیا کہ یہ سب رذیل ہیں، یہ تمہاری جہالت ہے چونکہ ہم ہر شخص کے اعمال و اخلاق کی حقیقت سے واقف نہیں اسلئے ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ حقیقۃً کون رذیل ہے کون شریف۔ (قرطبی)

كَذَّبَتْ عَادُ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٢٣﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٢٤﴾

جھٹلایا عاد نے پیغام لانے والوں کو جب کہا اُن کو اُن کے بھائی ہود نے کیا تم کو ڈر نہیں

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٢٥﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٢٦﴾ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ

میں تمہارے پاس پیغام لانے والا معتبر ہوں سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور نہیں مانگتا میں تم

عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٢٧﴾ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ

سے اس پر کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی جہان کے مالک پر کیا بناتے ہو ہر اونچی

رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿١٢٨﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿١٢٩﴾

زمین پر ایک نشان کھیلنے کو اور بناتے ہو کاریگریاں شاید تم ہمیشہ رہو گے

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿١٣٠﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٣١﴾ وَ

اور جب ہاتھ ڈالتے ہو تو پنجہ مارتے ہو ظالم سے سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور

اتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٢﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ﴿١٣٣﴾

ڈرو اس سے جس نے تم کو پہنچائیں وہ چیزیں جو تم جانتے ہو پہنچائے تم کو چوپائے اور بیٹے

وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿١٣٤﴾ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٣٥﴾ قَالُوْا

اور باغ اور چشمے میں ڈرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کی آفت سے بولے

سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ اِنْ هٰذَآ

ہم کو برابر ہے تو نصیحت کرے یا نہ بنے تو نصیحت کرنے والا اور کچھ نہیں

اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ

یہ باتیں عادت ہے اگلے لوگوں کی اور ہم پر آفت نہیں آنے والی پھر اس کو جھٹلانے

فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

لگے تو ہم نے ان کو غارت کر دیا، اس بات میں البتہ نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۴۰﴾

اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

ع ۷ ۱۱

خلاصۂ تفسیر

قوم عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ اُن سے اُن کی (برادری کے) بھائی ہود (علیہ السلام) نے کہا کہ کیا تم (خدا سے) ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو، اور میری اطاعت کرو، اور میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی صلہ نہیں مانگتا، بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمّہ ہے کیا تم (علاوہ شرک کے تکبر و تفاخر میں بھی اس درجہ مصروف ہو کر) ہر اُونچے مقام پر ایک یادگار (کے طور پر عمارت) بناتے ہو (تاکہ خوب اُونچی نظر آوے) جس کو محض فضول (بلا ضرورت) بناتے ہو اور (اسکے علاوہ جو رہنے کے مکان ہیں جن کی ایک درجہ ضرورت بھی ہے اُن میں بھی یہ غلو ہے) کہ بڑے بڑے محل بناتے ہو (حالانکہ اس سے کم میں آرام مل سکتا ہے) جیسے دُنیا میں تم کو ہمیشہ رہنا ہے (یعنی توسیع مکانات اور ایسے بلند محل اور ایسی مضبوطی اور ایسی یادگار تعمیرات اُسوقت مناسب تھیں جبکہ دنیا میں ہمیشہ رہنا ہوتا، تو یہ خیال ہوتا کہ فراخ مکان بناؤ تاکہ آئندہ نسل میں تنگی نہ ہو کیونکہ ہم بھی رہیں گے اور وہ بھی رہیں گے اور بلند بھی بناؤ تاکہ نیچے جگہ نہ رہے تو ادھر رہنے لگیں گے اور مضبوط بناؤ تاکہ ہماری عمر طویل کے لئے کافی ہو اور یادگاریں بناؤ تاکہ ہمارے زندہ رہنے سے ہمارا ذکر زندہ رہے اور اب تو سب فضول ہے۔ بڑی بڑی یادگاریں بنی ہیں اور بنانیوالے کا نام تک نہیں موت نے سب کا نام مٹا دیا کسی کا جلدی اور کسی کا دیر میں) اور (اس تکبر کے سبب طبیعت میں سختی اور بے رحمی اس درجہ رکھتے ہو کر) جب کسی پر دار و گیر کرنے لگتے ہو تو بالکل جابر (اور ظالم) بن کر دار و گیر کرتے ہو (ان بُرے اخلاق کا اسلئے بیان کیا گیا کہ یہ بُرے اخلاق اکثر ایمان اور اطاعت کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں) سو (چونکہ شرک اور گزشتہ بُرے اخلاق خدا تعالیٰ کی ناخوشی اور عذاب کا سبب ہیں اسلئے) تم (کو چاہیئے کہ) اللہ سے ڈرو اور (چونکہ میں رسول ہوں اسلئے) میری اطاعت کرو اور اس (اللہ) سے ڈرو (یعنی جس سے ڈرنے کو میں کہتا ہوں وہ

ایسا ہے) جس نے تمہاری ان چیزوں سے امداد کی جن کو تم جانتے ہو (یعنی) چوپائے اور بیٹوں اور باغوں اور چشموں سے تمہاری امداد کی (تو منعم ہونے کا تقتضایہ ہے کہ اسکے احکام کی بالکل مخالفت نہ کی جائے) مجھ کو تمہارے حق میں (اگر تم ان حرکات سے باز نہ آئے) ایک بڑے سخت دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (یہ ترہیب ہے اور أمَدَّكُم بِأَنْعَامٍ الخ میں ترغیب تھی) وہ لوگ بولے کہ ہمارے نزدیک تو دونوں باتیں برابر ہیں خواہ تم نصیحت کرو اور خواہ ناصح نہ بنو (یعنی ہم دونوں حالتوں میں اپنے کردار سے باز نہ آوینگے اور تم جو کچھ کہہ رہے ہو) یہ تو بس اگلے لوگوں کی ایک (معمولی) عادت (ہے اور رسم) ہے (کہ ہر زمانہ میں لوگ مدعی نبوت ہو کر لوگوں کو یُوں ہی کہتے سُنتے رہے) اور (تم جو ہم کو عذاب سے ڈراتے ہو تو) ہم کو ہرگز عذاب نہ ہوگا غرض ان لوگوں نے ہود (علیہ السلام) کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو (سخت آندھی کے عذاب سے) ہلاک کر دیا، بیشک اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے (کہ احکام کی مخالفت کا کیا انجام ہوا) اور (باوجود اسکے) ان (کفار مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بیشک آپ کا رب زبردست اور مہربان ہے (کہ عذاب دینے پر قادر بھی ہے اور رحمت سے مہلت بھی دے رکھی ہے)

معارف و مسائل

چند مشکل الفاظ کی تشریح أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ○ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ○ (الریع) ابن جریر نے حضرت مجاہدؒ سے نقل فرمایا ہے کہ ریعؔ دو پہاڑوں کے درمیانی راستہ کو کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے اور جمہور سے منقول ہے کہ ریع بلند جگہ کو کہتے ہیں اور اسی سے ریع النبات نکلا ہے یعنی بڑھنے اور چڑھنے والی نباتات، (آيَةً) اسکے اصل معنی علامت کے ہیں اس جگہ بلند محل مُراد ہے۔ (تَعْبَثُونَ) یہ عبث سے ہے اور عبث اس کو کہتے ہیں جس میں نہ حقیقةً کوئی فائدہ ہو اور نہ حکماً۔ اس جگہ معنی یہ ہونگے کہ وہ بیفائدہ بلند بلند محلات بناتے تھے جن کی ان کو کوئی ضرورت نہیں تھی صرف فخریہ بناتے تھے۔ (مَصَانِعَ) مصنع کی جمع ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا کہ مصانع سے پانی کے حوض مراد ہیں لیکن حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ اس سے مضبوط محل مراد ہیں۔ (لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں بیان فرمایا کہ اس آیت میں لَعَلَّ تشبیہ کے لئے ہے اور حضرت ابن عباسؓ نے ترجمہ یہ فرمایا كَأَنَّكُمْ تَخْلُدُونَ یعنی گویا تم ہمیشہ رہوگے (کما فی الروح)

بلاضرورت عمارت بنانا مذموم ہے اس آیت سے ثابت ہوا کہ بغیر ضرورت کے مکان بنانا اور تعمیرات کرنا شرعاً بُرا ہے۔ اور یہی معنی ہیں اس حدیث کے جو امام ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ النفقة كلها في سبيل الله الا البناء فلا خير فيه، یعنی وہ عمارت جو ضرورت سے زائد بنائی گئی ہو اس میں کوئی بہتری اور بھلائی نہیں۔ اور اس معنی کی تصدیق حضرت انسؓ کی دوسری

روایت سے بھی ہوتی ہے کہ ان کل بناء وبال علی صاحبہ الا ما لا الا ما لا یعنی الا ما لا بد منہ (ابوداؤد) یعنی ہر تعمیر صاحب تعمیر کے لئے مصیبت ہے مگر وہ عمارت جو ضروری ہو وہ وبال نہیں ہے روح المعانی میں فرمایا کہ بغیر غرض صحیح کے بلند عمارت بنانا شریعت محمدیہ میں بھی مذموم اور برا ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٤١﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ أَلَا

جھٹلایا ثمود نے پیغام لانے والوں کو جب کہا ان کو ان کے بھائی صالح نے کیا

تَتَّقُونَ ﴿١٤٢﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٤٣﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٤٤﴾

تم ڈرتے نہیں میں تمہارے پاس پیغام لانے والا ہوں معتبر سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٤٥﴾

اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی جہان کے پالنے والے پر

أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هَاهُنَا آمِنِينَ ﴿١٤٦﴾ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿١٤٧﴾ وَزُرُوعٍ

کیا چھوڑے رکھیں گے تم کو یہاں کی چیزوں میں بے کھٹکے باغوں میں اور چشموں میں اور کھیتوں میں

وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ﴿١٤٨﴾ وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ ﴿١٤٩﴾

اور کھجوروں میں جن کا گابھا ملائم ہے اور تراشتے ہو پہاڑوں کے گھر تکلف کے

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٥٠﴾ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ﴿١٥١﴾

سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور نہ مانو حکم بے باک لوگوں کا

الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿١٥٢﴾ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ

جو خرابی کرتے ہیں ملک میں اور اصلاح نہیں کرتے بولے تجھ پر تو کسی

مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ﴿١٥٣﴾ مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا فَأْتِ بِآيَةٍ إِنْ

نے جادو کیا ہے تو بھی ایک آدمی ہے جیسے ہم سو لے آ کچھ نشانی

كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿١٥٤﴾ قَالَ هَٰذِهِ نَاقَةٌ لَهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ

اگر تو سچا ہے کہا یہ اونٹنی ہے اس کے لئے پانی پینے کی ایک باری اور تمہارے لئے

يَوْمٍ مَعْلُومٍ ﴿١٥٥﴾ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ

باری ایک دن کی مقرر اور مت چھیڑیو اس کو بری طرح سے پھر پکڑے تم کو آفت ایک بڑے

عَظِيمٍ ﴿١٥٦﴾ فَعَقَرُوهَا فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ ﴿١٥٧﴾ فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۗ

دن کی پھر کاٹ ڈالا اس اونٹنی کو پھر کل کو رہ گئے پچھتاتے پھر آ پکڑا ان کو عذاب نے

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٥٨﴾ وَإِنَّ

البتہ اس بات میں نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے اور تیرا

رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٥٩﴾

رب وہی ہے زبردست رحم کرنے والا

خُلاصۂ تفسیر

قوم ثمود نے (بھی) پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ اُن سے اُن کے بھائی صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم (اللہ سے) نہیں ڈرتے، میں تمھارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور میں تم سے اس پر کچھ صلہ نہیں چاہتا، بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے (اور تم جو خوشحالی کی وجہ سے اس درجہ اللہ سے غافل ہو تو) کیا تم کو ان ہی چیزوں میں بےفکری سے رہنے دیا جاوے گا جو یہاں (دُنیا میں) موجود ہیں، یعنی باغوں میں اور چشموں میں اور ان کھجوروں میں جن کے گپھے خوب گوندھے ہوئے ہیں (یعنی ان کھجوروں میں خوب کثرت سے پھل آتا ہے) اور کیا (اسی غفلت کی وجہ سے) تم پہاڑوں کو تراش تراش کر اتراتے (اور فخر کرتے) ہوئے مکانات بناتے ہو سو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور اُن حدود (بندگی) سے نکل جانے والوں کا کہنا مت مانو جو سرزمین میں فساد کیا کرتے ہیں اور (کبھی) اصلاح (کی بات) نہیں کرتے (مراد رؤسا کفار ہیں جو گمراہی پر لوگوں کو آمادہ کرتے تھے اور فساد اور عدم اصلاح سے یہی مراد ہے) ان لوگوں نے کہا کہ تم پر تو کسی نے بڑا بھاری جادو کر دیا ہے (جس سے عقل میں خرابی آگئی ہے کہ نبوت کا دعوی کرتے ہو حالانکہ) تم بس ہماری طرح کے ایک (معمولی) آدمی ہو۔ (اور آدمی نبی ہوتا نہیں) سو کوئی معجزہ پیش کرو اگر تم (دعوئ نبوت میں) سچے ہو، صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ ایک اونٹنی ہے (جو بوجہ خلافِ عادت پیدا ہونے کے معجزہ ہے جیسا کہ پارۂ ہشتم کے ختم کے قریب گزرا اور علاوہ اسکے کہ یہ میری رسالت پر دلیل ہے خود اسکے بھی کچھ حقوق ہیں چنانچہ ان میں سے ایک یہ ہے کہ) پانی پینے کے لئے ایک باری اسکی ہے اور ایک مقرر دن میں ایک باری تمھاری (یعنی تمھارے مواشی کی) اور (ایک یہ ہے کہ) اس کو برائی (اور تکلیف دہی) کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا کبھی تم کو ایک بھاری دن کا عذاب آپکڑے سو انھوں نے (نہ رسالت کی تصدیق کی نہ اونٹنی کے حقوق ادا کئے بلکہ) اس اونٹنی کو مار ڈالا، پھر (جب عذاب کے نشان ظاہر ہوئے تو اپنی حرکت پر) پشیمان ہوئے (مگر اول تو عذاب دیکھ لینے کے وقت پشیمانی بیکار، دوسرے خالی طبعی پشیمانی سے کیا ہوتا ہے جب تک اختیاری تدارک یعنی توبہ و ایمان نہ ہو) پھر (آخر) عذاب نے ان کو آلیا، بیشک اس (واقعہ) میں بڑی عبرت ہے اور (باوجود اسکے) ان (کفار مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بےشک آپ کا رب بڑا زبردست بہت مہربان ہے (کہ باوجود قدرت کے مہلت دیتا ہے)۔

معارف و مسائل

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ، حضرت ابن عباسؓ سے فارہین کی تفسیر بطرین منقول ہے یعنی اترانے اور تکبر کرنے والے، لیکن ابو صالح نے فرمایا، اور یہی امام راغب نے تفسیر کی ہے کہ فارہین کے معنی حاذقین ہے یعنی ماہرین کے ہیں، مُراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ نعمت فرمائی کہ تم کو ایسی صنعت کاری سکھلا دی کہ پہاڑوں کو مکانات بنانا تمھارے لئے آسان کر دیا۔ حاصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے انعامات کو یاد کرو اور زمین پر فساد نہ کرو۔

مفید پیشے خدائی انعامات ہیں بشرطیکہ اُن کو بُرے کاموں میں استعمال نہ کریں

اس آیت سے ثابت ہوا کہ عمدہ پیشے خدا تعالیٰ کے انعامات ہیں اور ان سے نفع اٹھانا جائز ہے لیکن اگر اُن سے کوئی گناہ یا حرام فعل یا بلا ضرورت اُن میں انہماک لازم آتا ہو تو پھر وہ پیشہ اختیار کرنا ناجائز ہے جیسے کہ ابھی اس سے پہلی آیتوں میں بلا ضرورت عمارت کی بلندی کی مذمت گزری ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا
جھٹلایا لُوطؑ کی قوم نے پیغام لانے والوں کو جب کہا اُن کو اُن کے بھائی لوطؑ نے کیا تم

تَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۶۲﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۶۳﴾
ڈرتے نہیں میں تمھارے لئے پیغام لانے والا ہوں معتبر سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۴﴾
اور مانگتا نہیں میں تم سے اس کا کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اُسی پروردگار عالم پر

اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ
کیا تم دوڑتے ہو جہان کے مَردوں پر اور چھوڑتے ہو جو تمھارے واسطے بنا دی ہیں

رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱۶۶﴾ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ
تمھارے رب نے تمھاری جوروئیں بلکہ تم لوگ ہو حد سے بڑھنے والے بولے اگر نہ چھوڑے گا

تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾ قَالَ اِنِّىْ لِعَمَلِكُمْ
تو اے لُوطؑ تو تُو نکال دیا جائے گا کہا میں تمھارے کام سے

مِّنَ الْقَالِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ رَبِّ نَجِّنِىْ وَاَهْلِىْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَنَجَّيْنٰهُ
البتہ بیزار ہوں اے رب خلاص کر مجھ کو اور میرے گھر والوں کو ان کاموں سے جو یہ کرتے ہیں پھر بچا دیا ہم نے

وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِى الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا
اسکو اور اسکے گھر والوں کو سب کو مگر ایک بڑھیا رہ گئی رہنے والوں میں پھر اُٹھا مارا ہم نے

الْاٰخَرِيْنَ ﴿١٧٢﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَاۗءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿١٧٣﴾

اُن دوسروں کو اور برسایا اُن پر ایک برساؤ سو کیا بُرا برساؤ تھا اُن ڈرائے ہوؤں کا

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٧٤﴾ وَاِنَّ

البتہ اس بات میں نشانی ہے اور ان میں بہت لوگ نہیں تھے ماننے والے اور تیرا

رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٧٥﴾

رب وہی ہے زبردست رحم والا

ع ۱۳

خلاصۂ تفسیر

قوم لُوط نے (بھی) پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ اُن سے ان کے بھائی لُوط (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم (اللہ سے) ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور میں تم سے اس پر کوئی صلہ نہیں چاہتا، بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے، کیا تمام دُنیا جہان والوں میں سے تم (یہ حرکت کرتے ہو کہ) مَردوں سے بدفعلی کرتے ہو اور تمہارے رب نے جو تمہارے لئے بیبیاں پیدا کی ہیں ان کو نظرانداز کئے رہتے ہو (یعنی اور کوئی آدمی تمہارے سوا یہ حرکت نہیں کرتا اور یہ نہیں ہے کہ اس کے قبیح ہونے میں کچھ شبہ ہے) بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) تم حد (انسانیت) سے گزر جانے والے لوگ ہو، وہ لوگ کہنے لگے کہ اے لُوط، اگر تم (ہمارے کہنے سُننے سے) باز نہیں آؤ گے تو ضرور (بستی سے) نکال دیئے جاؤ گے، لُوط (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (میں اس دھمکی پر اپنے کہنے سے نہ رکوں گا کیونکہ) میں تمہارے اس کام سے سخت نفرت رکھتا ہوں (تو کہنا کیسے چھوڑ دوں گا، جب کسی طرح اُن لوگوں نے نہ مانا اور عذاب آتا ہوا معلوم ہوا تو) لُوط (علیہ السلام) نے دُعا کی کہ اے میرے رب مجھ کو اور میرے (خاص) متعلقین کو ان کے اس کام (کے وبال) سے (جو اُن پر آنے والا ہے) نجات دے، سو ہم نے ان کو اور اُن کے متعلقین کو سب کو نجات دی سوائے ایک بڑھیا کے (مراد اس سے زوجہ ہے لُوط علیہ السلام کی) کہ وہ (عذاب کے اندر) رہ جانے والوں میں رہ گئی، پھر ہم نے اور سب کو (جو لُوطؑ اور ان کے اہل کے سوا تھے) ہلاک کر دیا اور ہم نے ان پر ایک خاص قسم کا (یعنی پتھروں کا) مینہ برسایا، سو کیا بُرا مینہ تھا جو ان لوگوں پر برسا جن کو (عذاب الٰہی سے) ڈرایا گیا تھا بے شک اس (واقعہ) میں (بھی) عبرت ہے اور (باوجود اس کے) ان (کفار مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، اور بے شک آپ کا رب بڑی قدرت والا بڑی رحمت والا ہے (کہ عذاب دے سکتا تھا مگر ابھی نہیں دیا)۔

معارف و مسائل

غیر فطری فعل اپنی بیوی سے بھی حرام ہے وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ، لفظ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ میں حرف مِنْ اصطلاحی الفاظ میں بیانیہ بھی ہوسکتا ہے جسکا حاصل یہ ہوگا کہ تمھاری خواہشِ نفسانی کے لئے جو اللہ نے بیویاں پیدا فرمائی ہیں تم اُن کو چھوڑ کر اپنے ہم جنس مردوں کو اپنی شہوتِ نفس کا نشانہ بناتے ہو جو خباثتِ نفس کی دلیل ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حرفِ مِنْ کو تبعیض کے لئے قرار دیں تو اشارہ اسطرف ہوگا کہ تمھاری بیبیوں کا جو مقام تمھارے لئے بنایا گیا اور جو امر فطری ہے اسکو چھوڑ کر بیویوں سے خلافِ فطرت عمل کرتے ہو جو کہ قطعاً حرام ہے۔ غرض اس دوسرے معنے کے لحاظ سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوگیا کہ اپنی زوجہ سے خلافِ فطرت عمل حرام ہے، حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص پر لعنت فرمائی ہے نعوذ باللہ منہ (کذا فی الروح)

اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ، عجوز سے مراد حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی ہے جو کہ قوم لوط کے اس فعل سے راضی تھی اور کافرہ تھی۔ لوط علیہ السلام کی یہ کافر بیوی اگر واقع میں بڑھیا تھی تو اسکے لئے لفظ عجوز استعمال کرنا ظاہر ہی ہے اور اگر یہ عمر کے لحاظ سے بڑھیا نہ تھی تو اس کو عجوز کے لفظ سے شاید اسلئے تعبیر کیا گیا کہ پیغمبر کی بیوی اُمت کے لئے ماں کی جگہ ہوتی ہے جو عورت کثیر الاولاد ہو اُس کو بڑھیا کہدینا کچھ مستبعد نہیں۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَاۗءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ، اس آیت سے ثابت ہوا کہ لوطی پر دیوار گرانے یا بلند مقام سے نیچے پھینکنے کی تعزیر جائز ہے جیسے حنفیہ کا مسلک ہے کیونکہ قوم لوط اسی طرح ہلاک کی گئی تھی کہ ان کی بستیوں کو اوپر اُٹھا کر اُلٹا زمین پر پھینک دیا گیا تھا۔ (شامی کتاب الحدود)

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

جھٹلایا بن کے رہنے والوں نے پیغام لانے والوں کو جب کہا اُن کو شعیب نے کیا تم ڈرتے نہیں

اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ وَمَاۤ اَسْئَلُكُمْ

میں تم کو پیغام پہنچانے والا ہوں معتبر سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور نہیں مانگتا میں

عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ اَوْفُوا الْكَيْلَ

تم سے اس پر کچھ بدلہ میرا بدلہ ہے اسی پروردگار عالم پر پورا بھر کر دو ماپ

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾

اور مت ہو نقصان دینے والے اور تولو سیدھی ترازو سے

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾

اور مت گھٹا دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت دوڑو ملک میں خرابی ڈالتے ہوئے

وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۸۴﴾ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ

اور ڈرو اس سے جس نے بنایا تم کو اور اگلی خلقت کو بولے تجھ پر تو کسی نے

الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۶﴾

جادو کر دیا ہے اور تو بھی ایک آدمی ہے جیسے ہم اور ہمارے خیال میں تو تو جھوٹا ہے

فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۷﴾ قَالَ

سو گرا دے ہم پر کوئی ٹکڑا آسمان کا اگر تو سچا ہے کہا

رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ

میرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو پھر اس کو جھٹلایا پھر پکڑ لیا ان کو آفت نے سائبان والے دن کی

اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ

بیشک وہ تھا عذاب بڑے دن کا البتہ اس بات میں نشانی ہے اور ان میں بہت

اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۱﴾ ع

لوگ نہیں ماننے والے اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

خلاصۂ تفسیر

اصحاب الایکہ نے (بھی جن کا ذکر سورۂ حجر کے اخیر میں گزر چکا ہے) پیغمبروں کو جھٹلایا، جبکہ ان سے شعیب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارا امانتدار پیغمبر ہوں سو تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور میں تم سے اس پر کوئی صلہ نہیں چاہتا، بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے تم لوگ پورا ناپا کرو اور (صاحب حق کا) نقصان مت کیا کرو اور (اسی طرح تولنے کی چیزوں میں) سیدھی ترازو سے تولا کرو (یعنی ڈنڈی نہ مارا کرو نہ باٹوں میں فرق کیا کرو) اور لوگوں کا ان کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو اور سرزمین میں فساد مت مچایا کرو اور اس (خدائے قادر) سے ڈرو جس نے تم کو اور تمام اگلی مخلوقات کو پیدا کیا وہ لوگ کہنے لگے کہ بس تم پر تو کسی نے بڑا بھاری جادو کر دیا ہے (جس سے عقل مختل ہوگئی اور نبوت کا دعویٰ کرنے لگے) اور تم تو محض ہماری طرح (کے) ایک (معمولی) آدمی ہو اور ہم تو تم کو جھوٹے لوگوں میں سے خیال کرتے ہیں، سو اگر تم سچوں میں سے ہو تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دو (تاکہ ہم کو معلوم ہو جاوے کہ واقعی تم نبی تھے تمہاری تکذیب سے ہم کو یہ سزا ہوئی) شعیب (علیہ السلام) بولے کہ (میں عذاب کا لانے والا یا اس کی کیفیت کی تعیین کرنے والا کون ہوں) تمہارے اعمال کو میرا رب (ہی)

خوب جانتا ہے (اور اس عمل کا جو مقتضاء ہے کہ کیا عذاب ہو اور کب ہو اس کو بھی وہی جانتا ہے اسکو اختیار ہے) سو وہ لوگ (برابر) ان کو جھٹلاتے رہے پھر ان کو سائبان کے واقعہ عذاب نے آپکڑا بیشک وہ بڑے سخت دن کا عذاب تھا اور) اس (واقعہ) میں (بھی) بڑی عبرت ہے اور (باوجود اس کے ان (کفار مکہ) میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بے شک آپ کا رب بڑی قدرت والا بڑی رحمت والا ہے (کہ عذاب نازل کر سکتا ہے مگر مہلت دے رکھی ہے)۔

معارف و مسائل

وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ، قسطاس کو بعض حضرات نے رومی لفظ قرار دیا جس کے معنے عدل وانصاف کے ہیں، بعض نے عربی لفظ قسط سے ماخوذ قرار دیا ہے قسط کے معنے بھی انصاف کے ہیں مراد یہ ہے کہ ترازو اور اسی طرح دوسرے ناپنے تولنے کے وسائل کو مستقیم اور سیدھے طور پر استعمال کرو جس میں کمی کا خطرہ نہ رہے۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ یعنی نہ کمی کرو لوگوں کی اپنی چیزوں میں۔ مراد یہ ہے کہ معاہدہ کے مطابق جتنا کسی کا حق ہے اس سے کمی کرنا حرام ہے خواہ وہ ناپنے تولنے کی چیز ہو یا کوئی دوسری۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی ملازم مزدور اگر اپنے مقررہ وقت میں چوری کرتا ہے وقت کم لگاتا ہے وہ بھی اس وعید میں داخل ہے۔ امام مالکؒ نے مؤطا میں روایت نقل فرمائی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز عصر میں شریک نہیں ہوا، وجہ پوچھی تو اس نے کچھ عذر کیا تو حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا طففت یعنی تو نے تولنے میں کمی کردی، چونکہ نماز کوئی تولنے کی چیز نہیں اسلئے یہ حدیث نقل فرما کر امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ وفاء و تطفیف یعنی حق کے مطابق کرنا یا کم کرنا ہر چیز میں ہے یعنی صرف ناپ تول ہی کے ساتھ یہ حکم مخصوص نہیں بلکہ کسی کے حق میں کمی کرنا خواہ کسی صورت سے ہو وہ تطفیف میں داخل ہے جسکا حرام ہونا وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ میں بیان فرمایا گیا ہے۔

فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ، عذاب یوم الظلہ، جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے اسکا واقعہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کی قوم پر سخت گرمی مسلط فرمائی کہ نہ مکان کے اندر چین آتا نہ باہر، پھر انکے قریبی جنگل میں ایک گہرا بادل بھیجدیا جسکے نیچے ٹھنڈی ہوا تھی، ساری قوم گرمی سے پریشان تھی سب دوڑ دوڑ کر اس بادل کے نیچے جمع ہوگئے جب ساری قوم بادل کے نیچے آگئی تو اس بادل نے ان پر پانی کے بجائے آگ برسادی جس سے سب بھسم ہو کر رہ گئے۔ (کذا روی عن ابن عباس۔ روح)

(خدا کا مجرم اپنے پاؤں چلکر آتا ہے اُسے وارنٹ کی ضرورت نہیں)

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى

اور یہ قرآن ہے اتارا ہوا پروردگار عالم کا لے کر اترا ہے اس کو فرشتہ معتبر تیرے

قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾ وَ

دل پر کہ تو ہو ڈر سنا دینے والا کھلی عربی زبان میں اور

اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا

یہ لکھا ہے پہلوں کی کتابوں میں کیا ان کے واسطے نشانی نہیں یہ بات کہ اس کی خبر رکھتے ہیں

بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۹۷﴾ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ

پڑھے لوگ بنی اسرائیل کے اور اگر اتارتے ہم یہ کتاب کسی اوپری زبان والے پر اور وہ اسکو

عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ

پڑھ کر سناتا تو بھی اس پر یقین نہ لاتے اسی طرح گھسا دیا ہم نے اس انکار کو گنہگاروں

الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۲۰۱﴾

کے دل میں وہ نہ مانیں گے اسکو جب تک نہ دیکھ لیں گے عذاب دردناک

فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ

پھر آئے ان پر اچانک اور ان کو خبر بھی نہ ہو پھر کہنے لگیں کچھ بھی ہم کو

مُنْظَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ

فرصت ملے گی کیا ہمارے عذاب کو جلد مانگتے ہیں بھلا دیکھ تو اگر فائدہ پہنچاتے رہیں ہم

سِنِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ

ان کو برسوں پھر پہنچے ان پر جس چیز کا ان سے وعدہ تھا تو کیا کام آئے گا ان کے

مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿۲۰۷﴾ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾

جو کچھ فائدہ اٹھاتے رہے اور کوئی بستی نہیں غارت کی ہم نے جس کے لئے نہیں تھے ڈر سنا دینے والے

ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۰۹﴾ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا

یاد دلانے کو اور ہمارا کام نہیں ظلم کرنا اور اس قرآن کو نہیں لے کر اترے شیطان اور نہ

يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾ فَلَا

ان سے بن آئے اور نہ وہ کر سکیں ان کو تو سننے کی جگہ سے دور کر دیا ہے سو

تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾ وَاَنْذِرْ

تو مت پکار اللہ کے ساتھ دوسرا معبود پھر تو پڑے عذاب میں اور ڈر سنا دے

عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ

اپنے قریب کے رشتہ داروں کو اور اپنے بازو نیچے رکھ ان کے واسطے جو تیرے ساتھ ہیں

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢١٥﴾ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٢١٦﴾

ایمان والے، پھر اگر تیری نافرمانی کریں تو کہہ دے میں بیزار ہوں تمہارے کام سے

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿٢١٧﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿٢١٨﴾ وَ

اور بھروسہ کر اس زبردست رحم والے پر، جو دیکھتا ہے تجھ کو جب اٹھتا ہے، اور

تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿٢١٩﴾ إِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٢٢٠﴾ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلٰى

تیرا پھرنا نمازیوں میں، بیشک وہی ہے سننے والا جاننے والا، میں بتلاؤں تم کو کس پر

مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿٢٢١﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيْمٍ ﴿٢٢٢﴾ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ

اترتے ہیں شیطان، اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار پر، لا ڈالتے ہیں سنی ہوئی بات

وَأَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿٢٢٣﴾ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿٢٢٤﴾ أَلَمْ تَرَ

اور بہت ان میں جھوٹے ہیں، اور شاعروں کی بات پر چلیں وہی جو بے راہ ہیں، تو نے نہیں دیکھا

أَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿٢٢٥﴾ وَأَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٢٢٦﴾

کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں، اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے

إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ

مگر وہ لوگ جو یقین لائے اور کام کئے اچھے اور یاد کی اللہ کی بہت اور بدلہ لیا اس کے

بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۭ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿٢٢٧﴾ ع ۱۱ / ۱۵

پیچھے کہ ان پر ظلم ہوا، اور اب معلوم کرلیں گے ظلم کرنے والے کہ کس کروٹ الٹتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور یہ قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے اس کو امانتدار فرشتہ لیکر آیا ہے آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں تاکہ آپ (بھی) منجملہ ڈرانے والوں کے ہو جاویں (یعنی جس طرح اور پیغمبروں نے اپنی امت کو احکام الٰہیہ پہنچائے آپ بھی پہنچائیں) اور اس (قرآن) کا ذکر پہلی امتوں کی (آسمانی) کتابوں میں (بھی) ہے (کہ ایک ایسی شان کا پیغمبر ہوگا اور اس پر ایسا کلام نازل ہوگا چنانچہ تفسیر حقانی کے اس مقام کے حواشی میں چند بشارتیں کتب سابقہ تورات و انجیل کی نقل کی ہیں۔ آگے اس مضمون وَإِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْأَوَّلِيْنَ کی توضیح ہے یعنی) کیا ان لوگوں کے لئے (اس پر) یہ بات دلیل نہیں ہے کہ اس (پیشین گوئی) کو علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں (چنانچہ ان میں جو لوگ اسلام لے آئے ہیں وہ تو علی الاعلان اسکا اعتراف کرتے ہیں اور جو اسلام نہیں لائے وہ بھی خاص خاص لوگوں کے سامنے اسکا اقرار کرتے ہیں جیسے کہ پارہ اول کے ربع پر آیت أَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ کی تفسیر میں اسکا بیان آچکا ہے اور ان

اقرار کرنے والوں کی تعداد اور کثرت اس وقت اگر خبر واحد تک بھی مان لیجائے تاہم قرائن کی وجہ سے معنوی تواتر حاصل تھا، اور یہ دلیل قائم کرنا ان پڑھ عربیوں کے لئے ہے ورنہ لکھے پڑھے لوگ خود اصل کتاب سے دیکھ سکتے تھے، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کتب سابقہ میں تحریف نہیں ہوئی، کیونکہ باوجود تحریف کے ایسے مضامین کا باقی رہ جانا اور زیادہ حجت ہے اور یہ احتمال کہ یہ مضامین ہی تحریف کا نتیجہ ہوں اسلئے غلط ہے کہ اپنے نقصان کے لئے کوئی تحریف نہیں کیا کرتا۔ یہ مضامین تو تحریف کرنے والوں کے لئے نقصان دہ ہیں جیسا کہ ظاہر ہے۔ یہاں تک تو دعوٰی وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ کی دو نقلی دلیلیں بیان فرمائی ہیں یعنی پہلی کتابوں میں ذکر اور بنی اسرائیل کا جاننا کہ ان میں بھی ثانی اوّل کی دلیل ہے اور آگے انکار کرنے والوں کے عناد کے بیان کے ضمن میں، اسی دعوٰی کی عقلی دلیل کی طرف اشارہ ہے یعنی اعجاز قرآن مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے معاند ہیں کہ) اگر (بالفرض) ہم اس (قرآن) کو کسی عجمی (غیر عربی) پر نازل کر دیتے پھر وہ (عجمی) ان کے سامنے اس کو پڑھ بھی دیتا (اسکا معجزہ ہونا اور زیادہ ظاہر ہوتا ہے کیونکہ جس پر نازل ہوا اس کو عربی زبان پر بالکل قدرت نہ ہوتی، لیکن) یہ لوگ (بوجہ انتہائی ضد کے) تب بھی اس کو نہ مانتے (آگے حضور کی تسلی کے واسطے ان کے ایمان لانے سے ناامیدی دلاتے ہیں یعنی) ہم نے اسی طرح (شدت و اصرار کے ساتھ) اس ایمان نہ لانے کو ان نافرمانوں کے دلوں میں ڈال رکھا ہے (یعنی کفر میں، اور اس پر مُصِر ہیں اور اس شدت و اصرار کیوجہ سے) یہ لوگ اس (قرآن) پر ایمان نہ لاویں گے جب تک کہ سخت عذاب کو (مرنے کے وقت یا برزخ میں یا آخرت میں) نہ دیکھ لیں گے جو اچانک ان کے سامنے آکھڑا ہوگا اور ان کو (پہلے سے) خبر بھی نہ ہوگی پھر (اسوقت جان کو بنے گی تو) کہیں گے کہ کیا (کسی طور پر) ہم کو (کچھ) مہلت مل سکتی ہے لیکن وہ وقت نہ مہلت کا ہے نہ قبول ایمان کا اور وہ کفار ایسے مضامین وعید و عذاب کے سنکر براہِ انکار عذاب کا تقاضا کیا کرتے تھے مثلاً کہتے تھے رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا اور وَاِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً، یعنی اے اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا اور مہلت کو، جو درحقیقت ڈھیل ہے، عذاب نہ واقع ہونے کی دلیل ٹھہراتے تھے، آگے اسکا جواب ہے کہ) کیا (ہماری وعیدوں کو سنکر) یہ لوگ ہمارے عذاب کی تعجیل چاہتے ہیں (جسکا منشاء انکار ہے یعنی باوجود قیام دلیل یعنی ایک سچے بزرگ کی خبر کے پھر بھی انکار کرتے ہیں؟ رہا مہلت کو بناء انکار قرار دینا سو یہ سخت غلطی ہے کیونکہ) اے مخاطب ذرا بتلاؤ تو اگر ہم ان کو (چند سال تک) عیش میں رہنے دیں پھر جس (عذاب) کا ان سے وعدہ ہے وہ ان کے سر آپڑے تو ان کا وہ عیش کس کام آسکتا ہے (یعنی یہ عیش کی جو مہلت دی گئی اس سے انکے عذاب میں کوئی خفت یا کمی نہیں ہوسکتی) اور (مہلت دینا حکمت کی وجہ سے چند روز تک خواہ کم یا زیادہ کچھ ان ہی کیساتھ خاص نہیں بلکہ اُمم سابقہ کو بھی مہلتیں ملی ہیں چنانچہ) جتنی بستیاں

(منکرین کی) ہم نے (عذاب سے) غارت کی ہیں سب میں نصیحت کے واسطے ڈرانے والے (پیغمبر) آئے (جب نہ مانے تو عذاب نازل ہوا) اور ہم (صورۃً بھی) ظالم نہیں ہیں (مطلب یہ کہ مہلت دینے سے جو مقصود ہے یعنی حجت پورا کرنا اور عذر کو ختم کرنا وہ سب کے لئے رہا، پیغمبروں کا آنا سمجھانا خود یہ بھی ایک مہلت ہی دینا ہے مگر پھر بھی ہلاکت کا عذاب آکر رہا۔ ان واقعات سے مہلت دینے کی حکمت بھی معلوم ہوگئی اور مہلت دینے اور عذاب میں تضاد نہ ہونا بھی ثابت ہوگیا اور صورۃً اس لئے کہا گیا کہ حقیقۃً تو کسی حالت میں بھی ظلم نہ ہوتا۔ آگے پھر مقصود اوّل یعنی مضمون وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ الخ کی طرف رجوع ہے۔ اور درمیان میں یہ مضامین منکرین کی حالت کے مناسب ہونے کیوجہ سے مذکور ہوئے تھے اور حاصل مضمون آئندہ آیات کا ان شبہات کا دفع کرنا ہے جو قرآن کی حقانیت کے متعلق تھے پس ایک شبہ تو قرآن کے اللہ کا کلام اور اس کی طرف سے بھیجا ہوا ماننے پر اسلئے تھا کہ عرب میں پہلے سے کاہن ہوتے آئے تھے وہ بھی کچھ مختلف قسم کے جملے بولا کرتے تھے نعوذ باللہ آپ کی نسبت بھی بعضے کفار یہی کہتے تھے (کما فی الدر عن ابن زید) اور بخاری میں ایک عورت کا قول نقل کیا ہے جس زمانہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے میں کچھ دیر ہوئی تو اس عورت نے کہا کہ آپ کو آپکے شیطان نے چھوڑ دیا ہے کیونکہ کاہنوں کو شیطان ہی کی تعلیم و تلقین سے کچھ حاصل ہوا کرتا تھا۔ اسکا جواب ہے کہ یہ رب العالمین کا نازل کیا ہوا ہے) اور اسکو شیاطین (جو کاہنوں کے پاس آیا کرتے تھے) لے کر نہیں آئے (کیونکہ اسکے دو مانع قوی موجود ہیں ایک اسکی صنعت شیطنت جس کے سبب) یہ (قرآن) ان (کی حالت) کے مناسب ہی نہیں (کیونکہ قرآن سب کا سب ہدایت۔ اور شیطان سب کا سب گمراہی ہے نہ ان کو ایسے مضامین کی آمد ہوسکتی ہے اور نہ ایسے مضامین شائع کرنے سے ان کی غرض یعنی مخلوق کو گمراہ کرنا پورا ہوسکتا ہے ایک مانع تو یہ ہوا) اور (دوسرا مانع یہ کہ وہ) اس پر قادر بھی نہیں کیونکہ وہ شیاطین (وحی آسمانی) سننے سے روک دیئے گئے ہیں (چنانچہ کاہنوں اور مشرکوں سے انکے جنات نے اپنی ناکامی کا خود اعتراف کیا جس کی انھوں نے اوروں کو بھی خبر دی۔ چنانچہ بخاری میں ایسے قصے باب اسلام عمرؓ میں مذکور ہیں پس شیطانوں کی تلقین کا کسی طرح احتمال نہ رہا اور اس جواب کا پورا ہوا اور ایک دوسرے شبہ کا جواب ختم سورت کے قریب آوے گا درمیان میں تنزیل من اللہ ہونے پر بطور تفریع کے ایک مضمون ہے یعنی جب اسکا منزل من اللہ ہونا ثابت ہے تو اس کی تعلیم واجب العمل ہوئی اور منجملہ اُس کے اہم امور اعظم توحید ہے) سو (اے پیغمبر ہم اسکے وجوب کی ایک خاص طریق سے تاکید کرتے ہیں کہ ہم آپ کو مخاطب بنا کر کہتے ہیں کہ) تم خدا کے ساتھ کسی اور معبود کی عبادت مت کرنا کبھی تم کو سزا ہونے لگے (حالانکہ آپ میں نعوذ باللہ نہ احتمال شرک کا ہے نہ تعذیب کا مگر لوگوں کو یہ بات جتلانا مقصود ہے کہ جب غیر اللہ کی عبادت پر آپ کے لئے بھی سزا کا حکم ہے تو اور بیچارے تو کس شمار میں ہیں؟ شرک سے ان کو کیسے منع نہ کیا جاوے اور شرک کرکے عذاب سے کیونکر بچیں گے) اور

(اسی مضمون سے) آپ (سب سے پہلے) اپنے نزدیک کے کنبہ کو ڈرائیے (چنانچہ آپ نے سب کو پکار کر
جمع کیا اور شرک پر عذابِ الٰہی سے ڈرایا جیسا حدیثوں میں ہے) اور (آگے انذار یعنی دعوتِ نبوت کو قبول
کرنے والے اور رَد کرنے والوں کے ساتھ معاملہ کا طرز بتلاتے ہیں یعنی) ان لوگوں کے ساتھ (تو مشفقانہ
فروتنی سے پیش آئیے جو مسلمانوں میں داخل ہو کر آپ کی راہ پر چلیں (خواہ کنبہ کے ہوں یا غیر کنبہ کے)
اور اگر یہ لوگ (جن کو آپ نے ڈرایا ہے) آپ کا کہنا نہ مانیں (اور کفر پر اڑے رہیں) تو آپ (صاف)
کہدیجئے کہ میں تمھارے افعال سے بیزار ہوں (ان دونوں امر یعنی اِخْفِضْ وَقُلْ الخ میں حب فی اللہ اور
بغض فی اللہ کی پوری تعلیم ہے اور کبھی ان مخالفین کیطرف سے ایذا اور نقصان دینے کا خطرہ نہ لائیے)
اور خدائے رحیم پر توکل رکھئے جو آپ کو جس وقت کہ آپ (نماز کے لئے) کھڑے ہوتے ہیں اور (نیز نماز
شروع کرنے کے بعد) نمازیوں کے ساتھ آپ کی نشست و برخاست کو دیکھتا ہے (اور نماز کے علاوہ
بھی وہ دیکھتا بھالتا ہے کیونکہ) وہ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے (پس جب اسکو علم بھی کامل ہے
جیسے یرٰیک اور سمیع، علیم اس پر دال ہیں اور وہ آپ پر مہربان بھی ہے، جیسا الرحیم اس پر دال ہے
اور اس کو سب قدرت ہے جیسا العزیز سے مفہوم ہوتا ہے تو ضرور وہ لائق توکل ہے وہ آپ کو ضرر
حقیقی سے بچاویگا اور جو متوکل کو ضرر پہنچتا ہے وہ صرف ظاہر کے اعتبار سے ضرر ہوتا ہے جس کے
تحت میں ہزاروں منافع ہوتے ہیں جن کا کبھی دُنیا میں کبھی آخرت میں ظہور ہوتا ہے آگے کہانت کے
شبہ کے جواب کا تتمہ ہے کہ اے پیغمبر لوگوں سے کہدیجئے کہ) کیا میں تم کو بتلاؤں کس پر شیطان اُترا
کرتے ہیں (سنو) ایسے شخصوں پر اُترا کرتے ہیں جو (پہلے سے) دروغ گفتار بڑے بدکردار ہوں اور جو (اخبارِ
شیاطین کے وقت اُن شیطانوں کیطرف) کان لگا دیتے ہیں اور (لوگوں سے اُن چیزوں کے بیان کرنے
کے وقت) وہ بکثرت جھوٹ بولتے ہیں (چنانچہ سفلی عاملوں کو اب بھی اسی حالت میں دیکھا جاتا ہے
اور وجہ اس کی یہ ہے کہ فائدہ لینے والے اور فائدہ دینے والے کے درمیان مناسبت ضروری ہے
تو شیطان کا شاگرد بھی وہ ہوگا جو جھوٹا اور گنہگار ہوگا، نیز شیطان کیطرف قلب سے متوجہ بھی ہو
کہ بغیر توجہ سے استفادہ نہیں ہوتا اور چونکہ اکثر یہ علوم شیطانی ناتمام ہوتے ہیں اس لئے ان کو رنگین اور
باوقعت کرنے کیلئے کچھ حاشیہ بھی ظن و تخمین سے چڑھانا پڑتا ہے جو کہ کہانت کے لئے عادۃً ضروری ہیں اور یہ
ساری باتیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم میں ہونیکا کوئی دُور کا بھی احتمال نہیں کیونکہ آپ کا سچا ہونا
سب کو معلوم ہے۔ آپ کا پرہیزگار ہونا اور شیاطین سے بغض رکھنے والا ہونا دشمن کو بھی مسلم تھا اور مشہور
و معروف تھا تو پھر کہانت کا احتمال کہاں رہا) اور (آگے شبہ شاعریت کا جواب ہے کہ آپ شاعر
بھی نہیں ہیں جیسا کفار کہتے تھے بَلْ هُوَ شَاعِرٌ یعنی ان کے مضامین خیالی غیر واقعی ہیں گو منظوم نہ ہوں
سو یہ احتمال اسلئے غلط ہے کہ) شاعروں کی راہ تو بے راہ لوگ چلا کرتے ہیں (مراد راہ سے شعر گوئی ہے

یعنی مضامین خیالی شاعرانہ نثر میں یا نظم میں کہنا ان لوگوں کا طریقہ ہے جو مسلک تحقیق سے دُور ہوں آگے اس دعویٰ کی وضاحت ہے کہ) اے مخاطب کیا تم کو معلوم نہیں کہ وہ (شاعر) لوگ (خیالی مضامین کے) ہر میدان میں حیران (ٹکریں مارتے تلاش مضامین میں) پھرا کرتے ہیں اور (جب مضمون بل جاتا ہے تو چونکہ اکثر خلافِ واقعہ ہوتا ہے اسلئے) زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں (چنانچہ شاعروں کی گپوں کا ایک نمونہ لکھا جاتا ہے ؎

اے رشکِ مسیحا تری رفتار کے قرباں ٭ ٹھوکر سے مری لاش کئی بار جلا دی

اے بادِ صبا ہم تجھے کیا یاد کریں گے ٭ اُس گُل کی خبر تو نے کبھی ہم کو نہ لا دی

؎ صبا نے اسکے کوچہ سے اڑا کر ٭ خدا جانے ہماری خاک کیا کی، وغیرہ وغیرہ، حتیٰ کہ کبھی کفریات بکنے لگتے ہیں۔ حاصل جواب کا یہ ہوا کہ مضامین شعریہ کے لئے خیالی اور غیر متحقق ہونا لازمی ہے اور مضامینِ قرآنیہ جس باب سے بھی متعلق ہیں سب کے سب تحقیقی، غیر خیالی ہیں اسلئے آپ کو شاعر کہنا سوائے جنونِ شاعرانہ کے اور کیا ہے، حتیٰ کہ اکثر چونکہ نظم میں ایسے ہی مضامین ہوا کرتے ہیں اسلئے اللہ تعالیٰ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو نظم پر قدرت بھی نہیں دی اور اوپر چونکہ شعراء کی مذمت ارشاد ہوئی ہے جس کے عموم میں بظاہر سب نظم کہنے والے آگئے، گو ان کے مضامین عینِ حکمت اور تحقیق ہوں اسلئے آگے ان کا استثناء فرماتے ہیں کہ) ہاں مگر جو لوگ (ان شاعروں میں سے) ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کئے (یعنی شرع کیخلاف نہ ان کا قول ہے نہ فعل، یعنی اُن کے اشعار میں بیہودہ مضامین نہیں ہیں) اور اُنھوں نے (اپنے اشعار میں) کثرت سے اللہ کا ذکر کیا (یعنی تائیدِ دین اور اشاعتِ علم میں ان کے اشعار ہیں کہ یہ سب ذکر اللہ میں داخل ہیں) اور (اگر کسی شعر میں بظاہر کوئی نامناسب مضمون بھی ہے جیسے کسی کی ہجو اور مذمت جو بظاہر اخلاقِ حسنہ کے خلاف ہے تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ) اُنھوں نے بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہو چکا ہے (اسکا) بدلہ لیا (ہے یعنی کفار یا فساق نے اول ان کو زبانی تکلیف پہنچائی، مثلاً ان کی ہجو کی یا دین کی توہین کی جو اپنی ہجو سے بھی بڑھ کر تکلیف کا سبب ہے، یا ان کے مال کو یا جان کو ضرر پہنچایا، یعنی یہ لوگ مستثنیٰ ہیں کیونکہ انتقامی طور پر جو شعر کہے گئے ہیں اُن میں بعض تو مُباح ہیں اور بعضے اطاعت و کارِ ثواب ہیں،) اور (یہاں تک رسالت کے متعلق شبہات کے جوابات پورے ہوئے اور اس سے پہلے رسالت دلائل سے ثابت ہو چکی تھی اب آگے ان لوگوں کی وعید ہے جو اس کے باوجود منکرِ نبوت رہے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ایذاء پہنچاتے ہیں یعنی) عنقریب ان لوگوں کو معلوم ہو جاوے گا جنھوں نے (حقوق اللہ، حقوق الرسول یا حقوق العباد میں) ظلم کر رکھا ہے کہ کیسی (بُری اور مصیبت کی) جگہ انکو لوٹ کر جانا ہے (مُراد اس سے جہنم ہے)۔

معارف و مسائل

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ۝

قرآن اُسکے الفاظ و معانی کے مجموعہ کا نام ہے

آیاتِ مذکورہ میں بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وہی ہے جو عربی زبان میں ہو، کسی مضمون قرآن کا ترجمہ خواہ کسی زبان میں ہو وہ قرآن نہیں کہلائے گا، اور اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ کے الفاظ سے بظاہر اسکے خلاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ معانی قرآن جو کسی دوسری زبان میں بھی ہوں وہ بھی قرآن ہیں، کیونکہ اِنَّهٗ کی ضمیر ظاہر یہ ہے کہ قرآن کیطرف راجع ہے اور زُبُر، زبور کی جمع ہے جس کے معنے ہیں کتاب۔ معنے آیت کے یہ ہوئے کہ قرآن کریم سابقہ کتابوں میں بھی ہے اور یہ ظاہر ہے پچھلی کتابیں تورات انجیل زبور وغیرہ عربی زبان میں نہیں تھیں تو صرف معانی قرآن کے اُنمیں مذکور ہونے کو اس آیت میں کہا گیا ہے کہ قرآن پچھلی کتابوں میں بھی ہے۔ اور حقیقت جس پر جمہور اُمت کا عقیدہ ہے وہ یہ ہے کہ صرف مضامینِ قرآن کو بھی بعض اوقات توسعاً قرآن کہدیا جاتا ہے کیونکہ اصل مقصود کسی کتاب کا اسکے مضامین ہی ہوتے ہیں۔ کتب اوّلین میں قرآن کا مذکور ہونا بھی اسی حیثیت سے ہے کہ بعض مضامینِ قرآنیہ اُن میں بھی مذکور ہیں، اسکی تائید بہت سی روایاتِ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

مستدرک حاکم میں حضرت معقل بن یسار رضؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے سورۂ بقرہ ذکر اوّل سے دی گئی ہے اور سورۂ طٰہٰ اور طواسین یعنی جتنی سورتیں طٰسٓ سے شروع ہوتی ہیں اور حوامیم یعنی جو سورتیں حٰمٓ سے شروع ہیں یہ سب سورتیں الواحِ موسیٰ میں سے دی گئی ہیں اور سورۂ فاتحہ مجھے تحت عرش سے دی گئی ہے۔ اور طبرانی، حاکم، بیہقی وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے روایت کیا ہے کہ سورۂ ملک تورات میں موجود ہے۔ الحدیث، اور سورۂ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى میں تو خود قرآن کی تصریح یہ ہے اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى، یعنی یہ مضامین سورت حضرت ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں بھی ہیں، لیکن تمام آیات و روایات کا حاصل یہی ہے کہ بہت سے مضامینِ قرآن کتبِ سابقہ میں بھی موجود تھے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان مضامین کی وجہ سے کتبِ سابقہ کے اُن حصوں کو جن میں یہ مضامینِ قرآن آئے ہیں قرآن کا نام دیدیا جائے۔ نہ اُمت میں کوئی اسکا قائل ہے کہ اُن صحیفوں اور کتابوں کو جن میں مضامین قرآن مذکور ہیں قرآن کہا جائے۔ بلکہ عقیدہ جمہور اُمت کا یہی ہے کہ قرآن نہ صرف الفاظِ قرآن کا نام ہے نہ صرف معانی قرآن کا۔ اگر کوئی شخص قرآن ہی کے الفاظ مختلف جگہوں سے چُن کر ایک عبارت بنادے مثلاً کوئی یہ عبارت بنائے الحمد للہ العزیز الرحیم۔ الذی لہ ملک السمٰوٰت وھو رب العٰلمین خالق کل شیٔ وھو المستعان

یہ سارے الفاظ قرآن ہی کے ہیں مگر اس عبارت کو کوئی قرآن نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح صرف معانی قرآن جو کسی دوسری زبان میں بیان کئے جائیں وہ بھی قرآن نہیں۔

نماز میں ترجمہ قرآن پڑھنا باجماعِ اُمت ناجائز ہے اسی وجہ سے اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ نماز میں فرض تلاوت کی جگہ قرآن کے الفاظ کا ترجمہ کسی زبان فارسی، اُردو، انگریزی میں پڑھ لینا بدون اضطرار کے کافی نہیں۔ بعض ائمہ سے جو اسمیں توسّع کا قول منقول ہے اُن سے بھی اپنے اس قول سے رجوع ثابت ہے۔

قرآن کے اُردو ترجمہ کو اُردو قرآن کہنا جائز نہیں اسی طرح قرآن کا صرف ترجمہ کسی زبان میں بغیر عربی متن کے لکھا جائے تو اسکو اس زبان کا قرآن کہنا جائز نہیں۔ جیسے آجکل بہت سے لوگ صرف اُردو ترجمہ قرآن کو اُردو کا قرآن اور انگریزی کو انگریزی کا قرآن کہدیتے ہیں یہ ناجائز اور بے ادبی ہے۔ قرآن کو بغیر متن عربی کے کسی دوسری زبان میں بنام قرآن شائع کرنا اور اسکی خرید و فروخت سب ناجائز ہے اس مسئلہ کی پوری تفصیل احقر کے رسالہ "تحذیر الاخوان عن تغییر رسم القرآن" میں مذکور ہے۔

اَفَرَءَيۡتَ اِنۡ مَّتَّعۡنٰهُمۡ سِنِيۡنَ، اس آیت میں اشارہ ہے کہ دُنیا میں کسی کو عمر دراز ملنا بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے لیکن جو لوگ اس نعمت کی ناشکری کریں ایمان نہ لائیں اُن کو عمر درازی کی عافیت و مہلت کچھ کام نہ آئے گی۔ امام زہری رح نے نقل فرمایا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رح روز صبح کو اپنی داڑھی پکڑ کر اپنے نفس کو خطاب کر کے یہ آیت پڑھا کرتے تھے اَفَرَءَيۡتَ اِنۡ مَّتَّعۡنٰهُمۡ الآیۃ اسکے بعد ان پر گریہ طاری ہو جاتا اور یہ اشعار پڑھتے تھے، نهارك يا مغرور سهو وغفلة، وليلك نوم والردى لك لازم۔ فلا انت فى الايقاظ يقظان حازم، ولا انت فى النوم ناج وسالم۔ وتسعى الى ما سوف تكره غبه، كذلك فى الدنيا تعيش البهائم (ترجمہ) اے فریب خوردہ تیرا سارا دن غفلت میں اور رات نیند میں صرف ہوتی ہے حالانکہ موت تیرے لئے لازمی ہے۔ نہ تو بیدار لوگوں میں ہوشیار بیدار ہے اور نہ سونے والوں میں اپنی نجات پر مطمئن ہے۔ تیری کوشش ایسے کاموں میں ہے جسکا انجام عنقریب ناگوار صورت میں سامنے آئیگا، دُنیا میں چوپائے جانور ایسے ہی جیا کرتے ہیں۔

وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ، عشیرہ کے معنے کنبہ اور خاندان اقربین کی قید سے انہیں سے بھی قریبی رشتہ دار مُراد ہیں۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر تبلیغ رسالت اور انذار پوری اُمت کے لئے فرض ہے اس جگہ خاندان کے لوگوں کی تخصیص میں کیا حکمت ہے؟ غور کیا جائے تو اسمیں تبلیغ و دعوت کے آسان اور مؤثر بنانے کا ایک خاص طریقہ بتلایا گیا ہے جس کے آثار دُور رس ہیں۔ وہ یہ کہ اپنے کنبہ اور خاندان کے لوگ اپنے سے قریب ہونے کی بناء پر اسکے حقدار بھی ہیں

کہ ہر خیر اور اچھے کام میں ان کو دوسروں سے مقدم کیا جائے اور باہمی تعلقات اور ذاتی واقفیت کی بناء پر ان میں کوئی جھوٹا دعویدار نہیں کھپ سکتا اور جس کی سچائی اور اخلاقی برتری خاندان کے لوگوں میں معروف ہے اسکی سچی دعوت قبول کرلینا انکے لئے آسان بھی ہے۔ اور قریبی رشتہ دار جب کسی اچھی تحریک کے حامی بن گئے تو ان کی اخوت و امداد بھی پختہ بنیاد پر قائم ہوتی ہے وہ خاندانی جمعیت کے اعتبار سے بھی انکی تائید و اخوت پر مجبور ہوتے ہیں اور جب قریبی رشتہ داروں، عزیزوں کا ایک ماحول حق و صداقت کی بنیادوں پر تیار ہوگیا تو روزمرہ کی زندگی میں ہر ایک کو دین کے احکام پر عمل کرنے میں بہت سہولت ہوجاتی ہے اور پھر ایک مختصر سی طاقت تیار ہوکر دوسروں تک دعوت و تبلیغ کے پہنچانے میں مدد ملتی ہے۔ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں ہے قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا، یعنی اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ اپنے اہل و عیال کے جہنم سے بچانے کی ذمہ داری خاندان کے ہر ہر فرد پر ڈالدی گئی ہے جو اصلاح اعمال و اخلاق کا آسان اور سیدھا راستہ ہے اور غور کیا جائے تو کسی انسان کا خود اعمال و اخلاق صالحہ کا پابند ہونا اور پھر اس پر قائم رہنا اسوقت تک عادۃً ممکن نہیں ہوتا جبتک اسکا ماحول اسکے لئے سازگار نہ ہو، سارے گھر میں اگر ایک آدمی نماز کی پوری پابندی کرنا چاہے تو اس پکے نمازی کو بھی اپنے حق کی ادائیگی میں مشکلات حائل ہونگی آجکل جو حرام چیزوں سے بچنا دشوار ہوگیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ فی الواقع اسکا چھوڑنا کوئی بڑا مشکل کام ہے بلکہ سبب یہ ہے کہ سارا ماحول ساری برادری جب ایک گناہ میں مبتلا ہے تو اکیلے ایک آدمی کو بچنا دشوار ہوجاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے تمام خاندان کے لوگوں کو جمع فرما کر پیغام حق سنایا اسوقت اگرچہ لوگوں نے قبول حق سے انکار کیا مگر رفتہ رفتہ خاندان کے لوگوں میں اسلام و ایمان داخل ہونا شروع ہوگیا اور آپکے چچا حضرت حمزہؓ کے اسلام لانے سے اسلام کو ایک بڑی قوت حاصل ہوگئی۔

شعر کی تعریف | وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ، اصل لغت میں شعر ہر اس کلام کو کہا جاتا ہے جس میں محض خیالی اور غیر تحقیقی مضامین بیان کئے گئے ہوں جس میں کوئی بحر، وزن، ردیف اور قافیہ کچھ شرط نہیں، فن منطق میں بھی ایسے ہی مضامین کو ادلہ شعریہ اور قضایا شعریہ کہا جاتا ہے۔ اصطلاحی شعر و غزل میں بھی چونکہ عموماً خیالات کا ہی غلبہ ہوتا ہے اسلئے اصطلاح شعراء میں کلام موزوں مقفّٰی کو شعر کہنے لگے۔ بعض مفسرین نے آیات قرآن بَلْ هُوَ شَاعِرٌ، شَاعِرٌ مَّجْنُوْنٌ، شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ وغیرہ میں شعر اصطلاحی کے معنی میں مراد لے کر کہا کہ کفار مکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وزن دار، قافیہ دار کلام لانے والے کہتے تھے لیکن بعض نے کہا کہ کفار کا مقصد یہ نہ تھا، اسلئے کہ وہ شعر کے طرز و طریق سے واقف تھے، اور ظاہر ہے کہ قرآن اشعار کا مجموعہ نہیں اسکا قائل تو ایک عجمی بھی نہیں ہوسکتا چہ جائیکہ فصیح بلیغ عرب۔ بلکہ کفار آپ کو شاعر شعر کے اصلی معنے یعنی خیالی مضامین کے لحاظ سے کہتے تھے مقصد ان کا دراصل آپکو نعوذ باللہ جھوٹا کہنا تھا کیونکہ شعر بمعنی کذب بھی استعمال ہوتا ہے اور شاعر کاذب کو کہا جاتا ہے اسلئے ادلہ کاذبہ

کو ادلۂ شعریہ کہا جاتا ہے خلاصہ یہ کہ جیسے موزوں اور مقفّٰی کلام کو شعر کہتے ہیں اسی طرح ظنی اور تخمینی کلام کو بھی شعر کہتے ہیں جو اہل منطق کی اصطلاح ہے۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ، اس آیت میں شعر کے اصطلاحی اور معروف معنے ہی مراد ہیں۔ یعنی موزوں و مقفّٰی کلام کہنے والے اس کی تائید فتح الباری کی روایت سے ہوتی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عبداللہ بن رَوَاحہؓ، حسان بن ثابتؓ اور کعب بن مالکؓ جو شعراء صحابہ میں مشہور ہیں روتے ہوئے سرکار دو عالم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ خدائے ذوالجلال نے یہ آیت نازل فرمائی ہے اور ہم بھی شعر کہتے ہیں، حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ آیت کے آخری حصّہ کو پڑھو۔ مقصد یہ تھا کہ تمہارے اشعار بیہودہ اور غلط مقصد کے لئے نہیں ہوتے اسلئے تم اس استثناء میں داخل ہو جو آخر آیت میں مذکور ہے اسلئے مفسرینؒ نے فرمایا کہ ابتدائی آیت میں مشرکین شعراء مراد ہیں کیونکہ گمراہ لوگ سرکش شیطان اور نافرمان جنّ ان ہی کے اشعار کی اتباع کرتے تھے اور روایت کرتے تھے (کذا فی فتح الباری)

شریعتِ اسلام میں شعر و شاعری کا درجہ آیاتِ مذکورہ کے شروع سے شعر و شاعری کی سخت مذمت اور اسکا عنداللہ مبغوض ہونا معلوم ہوتا ہے مگر آخر سورت میں جو استثناء مذکور ہے اس سے ثابت ہوا کہ شعر مطلقاً بُرا نہیں بلکہ جب جس شعر میں خدا تعالیٰ کی نافرمانی یا اللہ کے ذکر سے روکنا یا جھوٹ ناحق کسی انسان کی مذمت اور توہین ہو یا فحش کلام اور فواحش کے لئے محرک ہو وہ مذموم و مکروہ ہے۔ اور جو اشعار ان معاصی اور مکروہات سے پاک ہوں اُن کو اللہ تعالیٰ نے اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الآیۃ کے ذریعہ مستثنیٰ فرما دیا ہے! اور بعض اشعار تو حکیمانہ مضامین اور وعظ و نصیحت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے طاعت و ثواب میں داخل ہیں جیسا کہ حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت ہے کہ اِنَّ من الشعر حکمۃ، یعنی بعض شعر حکمت ہوتے ہیں (رواہ البخاری) حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ حکمت سے مراد سچی بات ہے جو حق کے مطابق ہو۔ ابن بطال نے فرمایا جس شعر میں خدا تعالیٰ کی وحدانیت، اسکا ذکر، اسلام سے اُلفت کا بیان ہو وہ شعر مرغوب ہے محمود ہے اور حدیث مذکور میں ایسا ہی شعر مراد ہے اور جس شعر میں جھوٹ اور فحش بیان ہو وہ مذموم ہے اس کی مزید تائید مندرجہ ذیل روایات سے ہوتی ہے (۱) عمر بن الشرید اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے مجھ سے اُمیہ بن ابی الصلت کے سَو قافیہ تک اشعار سُنے۔ (۲) مطرف فرماتے ہیں کہ میں نے کوفہ سے بصرہ تک حضرت عمران بن حصینؓ کے ساتھ سفر کیا اور ہر منزل پر وہ شعر سُناتے تھے۔ (۳) طبری نے کبارِ صحابہؓ اور کبار تابعین کے متعلق کہا کہ وہ شعر کہتے تھے سنتے تھے اور سُناتے تھے۔ (۴) امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ شعر کہا کرتی تھیں۔ (۵) ابو یعلیٰ نے ابن عمر سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ شعر ایک کلام ہے اگر اسکا مضمون اچھا اور مفید ہے تو شعر اچھا ہے اور مضمون بُرا یا گناہ کا ہے تو شعر بُرا ہے (فتح الباری)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ مدینہ منورہ کے فقہاء عشرہ جو اپنے علم و فضل میں معروف ہیں اُن میں سے عبیداللہ بن عتبہ بن مسعودؓ مشہور قادر کلام شاعر تھے اور قاضی زبیر بن بکار کے اشعار ایک مستقل کتاب میں جمع تھے۔ پھر قرطبی نے لکھا کہ ابو عمرؓ نے فرمایا ہے کہ اچھے مضامین پر مشتمل اشعار کو اہل علم اور اہل عقل میں سے کوئی بُرا نہیں کہہ سکتا، کیونکہ اکابر صحابہ جو دین کے مقتدا ہیں ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جس نے خود شعر نہ کہے ہوں یا دوسروں کے اشعار نہ پڑھے یا سُنے ہوں اور پسند کیا ہو۔

جن روایات میں شعر شاعری کی مذمت مذکور ہے ان سے مقصود یہ ہے کہ شعر میں اتنا مصروف و منہمک ہو جائے کہ ذکر اللہ، عبادت اور قرآن سے غافل ہو جائے۔ امام بخاری نے اسکو ایک مستقل باب میں بیان فرمایا ہے اور اس باب میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے۔ لَاَنْ يَمْتَلِئَ جَوْفُ رَجُلٍ قَيْحًا يَرِيْهِ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ يَّمْتَلِئَ شِعْرًا، یعنی کوئی آدمی پیپ سے اپنا پیٹ بھرے یہ اس سے بہتر ہے کہ اشعار سے پیٹ بھرے۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اسکے معنی یہ ہیں کہ شعر جب ذکر اللہ اور قرآن اور علم کے اشتغال پر غالب آجائے۔ اور اگر شعر مغلوب ہے تو پھر بُرا نہیں ہے اسی طرح وہ اشعار جو فحش مضامین یا لوگوں پر طعن و تشنیع یا دوسرے خلاف شرع مضامین پر مشتمل ہوں وہ باجماع اُمّت حرام ناجائز ہیں اور یہ کچھ شعر کیساتھ مخصوص نہیں جو نثر کلام ایسا ہو اسکا بھی یہی حکم ہے۔ (قرطبی)

حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے گورنر عدی بن نضلہ کو اُن کے عہدہ سے اسلئے برخاست کر دیا کہ وہ فحش اشعار کہتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے عمرو بن ربیعہ اور ابوالاحوص کو اسی جرم میں جلاوطن کرنے کا حکم دیا۔ عمرو بن ربیعہ نے توبہ کرلی وہ قبول کی گئی۔ (قرطبی)

خدا و آخرت سے غافل کردینے والا ہر علم اور فن مذموم ہے ابن ابی جمرہ نے فرمایا کہ بہت قافیہ بازی اور ہر ایسا علم و فن جو دلوں کو سخت کردے اور خدا تعالیٰ کے ذکر سے انحراف و اعراض کا سبب بنے اور اعتقادات میں شکوک و شبہات اور روحانی بیماریاں پیدا کرے اسکا بھی وہی حکم ہے جو مذموم اشعار کا حکم ہے۔

اکثر اتباع کرنے والوں کی گمراہی متبوع کی گمراہی کی علامت ہوتی ہے اَلشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ، اس آیت میں شعراء پر یہ عیب لگایا گیا ہے کہ انکے متبعین گمراہ ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گمراہ تو ہوئے متبعین اُن کے فعل کا الزام متبوعین یعنی شعراء پر کیسے عائد ہوا؟ وجہ یہ ہے کہ عموماً اتباع کرنے والوں کی گمراہی علامت اور نشانی ہوتی ہے متبوع کی گمراہی کی لیکن سیدی حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ حکم اسوقت ہے جب تابع کی گمراہی میں اس متبوع کے اتباع کا دخل ہو مثلاً متبوع کو جھوٹ اور غیبت سے بچنے بچانے کا اہتمام نہیں ہے اس کی مجلس میں اس طرح کی باتیں ہوتی ہیں وہ روک ٹوک نہیں کرتا اس سے تابع کو بھی جھوٹ اور غیبت کی عادت پڑگئی تو یہ تابع کا گناہ خود متبوع کے گناہ کی علامت قرار دیا جائیگا لیکن اگر گمراہی متبوع کی ایک وجہ

سے اور اتباع کسی دوسری وجہ سے ہو تو یہ تابع کی گمراہی متبوع کی گمراہی کی علامت نہیں ہوگی۔ مثلاً ایک شخص عقائد و مسائل میں کسی عالم کا اتباع کرتا ہے اور اُن میں کوئی گمراہی نہیں، اعمال و اخلاق میں اس عالم کا اتباع نہیں کرتا اُنھیں میں یہ گمراہ ہے تو اس کی عملی اور اخلاقی گمراہی اس عالم کی گمراہی پر دلیل نہیں ہوگی۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم ۞

تمت سورۃ الشعراء بعون اللہ وفضلہ لنصف الربیع الثانی ۱۳۹۱ھ

یوم الخمیس ویتلوہا ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ النمل

سُوْرَةُ النَّمْلِ

سُوْرَةُ النَّمْلِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثٌ وَّتِسْعُوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ نمل مکہ میں اتری اور اس کی ترانوے آیتیں اور سات رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ① هُدًى وَّبُشْرٰى

یہ آیتیں ہیں قرآن اور کھلی کتاب کی ہدایت اور خوشخبری

لِلْمُؤْمِنِيْنَ ② الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ

ایمان والوں کے واسطے جو قائم رکھتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور ان کو

بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ③ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ

آخرت پر یقین ہے جو لوگ نہیں مانتے آخرت کو

زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ④ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ

اچھے دکھلائے ہم نے انکی نظروں میں انکے کام سو وہ بہکے پھرتے ہیں وہی ہیں جن کے واسطے بری

سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ⑤ وَاِنَّكَ

طرح کا عذاب ہے اور آخرت میں وہی ہیں خراب اور تجھ کو تو

لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ⑥

قرآن پہنچتا ہے ایک حکمت والے خبردار کے پاس سے

خلاصۂ تفسیر

طٰسٓ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (آیتیں جو آپ پر نازل کی جاتی ہیں) آیتیں ہیں قرآن کی اور ایک واضح کتاب کی (یعنی اس میں دو صفتیں ہیں قرآن ہونا اور کتاب مبین ہونا) یہ (آیتیں) ایمان والوں کے لئے (موجب) ہدایت اور (اس ہدایت پر جزائے نیک کا) مژدہ سنانے والی ہیں جو (مسلمان) ایسے ہیں کہ (عملاً بھی ہدایت پر چلتے ہیں چنانچہ) نماز کی پابندی کرتے ہیں (جو کہ عبادات بدنیہ میں سب سے بڑی ہی

اور زکوٰۃ دیتے ہیں (جو کہ عبادات مالیہ میں سب سے بڑی ہے) اور (عقیدہ کے لحاظ سے بھی ہدایت یافتہ ہیں چنانچہ) وہ آخرت پر پُورا یقین رکھتے ہیں (یہ تو ایمان والوں کی صفت ہے اور) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں ہم نے اُن کے اعمال (بد) اُنکی نظر میں مرغوب کر رکھے ہیں سو وہ (اپنے جہلِ مرکب میں حق سے دُور) بھٹکتے پھرتے ہیں (چنانچہ نہ اُنکے عقائد درست ہیں نہ اعمال اسلئے وہ قرآن کو بھی نہیں مانتے تو جیسے قرآن اہلِ ایمان کو بشارت سُناتا تھا منکروں کو وعید بھی سُناتا ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے (دُنیا میں مرنے کے وقت بھی) سخت عذاب (ہونیوالا) ہے اور وہ لوگ آخرت میں (بھی) سخت خسارہ میں ہیں (کہ کبھی نجات ہی نہ ہوگی) اور (گو یہ منکر قرآن کو نہ مانیں مگر) آپکو بالیقین ایک بڑی حکمت والے علم والے کیطرف سے قرآن دیا جا رہا ہے (آپ اس نعمت کے سرور میں ان کے انکار سے غمگین نہ ہو جیئے)۔

معارف و مسائل

زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ ، یعنی جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہم نے اُنکے اعمالِ بد اُنکی نظروں میں مزین کر دیئے ہیں۔ اسلئے وہ اُنہی کو بہتر سمجھ کر گمراہی میں مبتلا رہتے ہیں اور بعض مفسرین نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے کہ اعمالھم سے مراد نیک اعمال ہیں اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے تو نیک اعمال کو مزین کر کے اُنکے سامنے رکھدیا تھا مگر ان ظالموں نے اُنکی طرف التفات نہ کیا بلکہ کفر و شرک میں مبتلا رہے اس لئے گمراہی میں بھٹکنے لگے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ واضح ہے، اول تو اسلئے کہ مزین کرنے کے الفاظ عموماً اعمالِ بد کے لئے استعمال ہوئے ہیں جیسے زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ، زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا، زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ الخ اور اچھے اعمال کے لئے اس لفظ کا استعمال بہت کم ہے جیسے حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ الآیۃ دوسرے آیت میں اعمالھم (ان کے اعمال) کا لفظ بھی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ مراد اعمالِ بد ہیں نہ کہ اعمالِ صالحہ۔

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ

جب کہا موسیٰ نے اپنے گھر والوں کو میں نے دیکھی ہے ایک آگ اب لاتا ہوں تمہارے پاس وہاں

آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ﴿٧﴾ فَلَمَّا جَاءَهَا نُودِيَ

سے کچھ خبر یا لاتا ہوں انگارا سُلگا کر شاید تم سینکو پھر جب پہنچا اسکے پاس آواز ہوئی

أَن بُورِكَ مَن فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٨﴾

کہ برکت ہے اس پر جو کوئی کہ آگ میں ہے اور جو اسکے آس پاس ہے اور پاک ہے ذات اللہ کی جو رب سارے جہان کا

يَا مُوسَىٰ إِنَّهُ أَنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٩﴾ وَأَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا

اے موسیٰ وہ میں اللہ ہوں زبردست حکمتوں والا اور ڈال دے لاٹھی اپنی پھر جب

رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۟

دیکھا اس کو پھنپھناتے جیسے سانپ کی شکل لوٹا پیٹھ پھیر کر اور مڑ کر نہ دیکھا اے موسیٰ مت ڈر

اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝۱۰ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا

میں جو ہوں میرے پاس نہیں ڈرتے رسول مگر جس نے زیادتی کی پھر بدلے میں نیکی کی

بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۱۱ وَاَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ

برائی کے پیچھے تو میں بخشنے والا مہربان ہوں اور ڈال دے ہاتھ اپنا اپنے گریبان میں کہ نکلے

بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ۟ فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا

سفید ہو کر نہ کسی برائی سے یہ دونوں مل کر نو نشانیاں لیکر جا فرعون اور اسکی قوم کیطرف بیشک وہ تھے

قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝۱۲ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝۱۳

لوگ نافرمان پھر جب پہنچیں انکے پاس ہماری نشانیاں سمجھانے کو بولے یہ جادو ہے صریح

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَیْفَ

اور اُن کا انکار کیا اور ان کا یقین کر چکے تھے اپنے جی میں بے انصافی اور غرور سے، سو دیکھ لے کیسا ہوا

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ۝۱۴ ع

انجام خرابی کرنے والوں کا

خلاصۂ تفسیر

(اس وقت کا قصہ ذکر کیجئے) جبکہ (مدین سے آتے ہوئے کوہِ طور کے قریب رات کو سردی کے وقت پہنچے اور مصر کی راہ بھی بھول گئے تھے تو) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں نے (طور کی طرف) آگ دیکھی ہے میں ابھی (جاکر) وہاں سے (یا تو راستہ کی) کوئی خبر لاتا ہوں یا تمہارے پاس (وہاں سے) آگ کا شعلہ کسی لکڑی وغیرہ میں لگا ہوا لاتا ہوں تاکہ تم سینک لو سو جب اُس (آگ) کے پاس پہنچے تو ان کو (منجانب اللہ) آواز دی گئی کہ جو اس آگ کے اندر ہیں (یعنی فرشتے) اُن پر بھی برکت ہو اور جو اس (آگ) کے پاس ہے (یعنی موسیٰ) اس پر بھی (برکت ہو، یہ دُعا بطور تحیۃ وسلام کے ہے جیسے ملاقاتی آپس میں سلام کرتے ہیں۔ چونکہ موسیٰ علیہ السلام جانتے نہ تھے کہ یہ نور انوار الٰہیہ سے ہے اسلئے خود سلام نہیں کرسکے تو منجانب اللہ ان کے اُنس کے لئے سلام ارشاد ہوا اور فرشتوں کو ملا لینا شاید اس لئے ہو کہ جس طرح فرشتوں کو سلام حق تعالیٰ کے قرب خاص کی علامت ہوتی ہے یہ سلام بھی موسیٰ علیہ السلام کو قرب خاص کی بشارت ہوگیا) اور (اس امر کے بتلانے کے لئے کہ یہ نور جو بشکلِ نار ہے خود حق تعالیٰ کی ذات نہیں ارشاد فرمادیا کہ) اللہ رب العالمین (رنگ،

جہات، مقدار اور حدبندی وغیرہ سے) پاک ہے (اور اس نور میں یہ چیزیں پائی جاتی ہیں، پس یہ نور ذاتِ خداوندی نہیں اور موسیٰ علیہ السلام اگر اس مسئلہ سے خالی الذہن ہوں تو اس کی تعلیم ہے اور اگر دلائلِ عقلیہ اور فطرتِ صحیحہ کی بنا پر ان کو پہلے سے معلوم ہو تو زیادہ سمجھانا ہے اسکے بعد ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ بات یہ ہے کہ میں (جو کہ بے کیف کلام کر رہا ہوں) اللہ ہوں زبردست حکمت والا اور (اے موسیٰ) تم اپنا عصا (زمین پر) ڈال دو (چنانچہ انھوں نے ڈالدیا تو وہ اژدہا بن کر لہرانے لگا) سو جب انھوں نے اس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا جیسے سانپ ہو تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی تو نہ دیکھا (ارشاد ہوا کہ) اے موسیٰ ڈرو نہیں (کیونکہ ہم نے تم کو پیغمبری دی ہے) اور ہمارے حضور میں (یعنی پیغمبری کا اعزاز عطا ہونے کے وقت) پیغمبر (ایسی چیزوں سے جو کہ خود اسکی پیغمبری کی دلیل یعنی معجزات ہوں) نہیں ڈرا کرتے (یعنی تم کو بھی ڈرنا نہ چاہیئے) ہاں مگر جس سے کوئی قصور (لغزش سرزد) ہو جاوے (اور وہ اس لغزش کو یاد کر کے ڈرے تو مضائقہ نہیں لیکن اس کی نسبت بھی یہ قاعدہ ہے کہ اگر قصور ہو جاوے اور) پھر برائی (ہو جانے) کے بعد برائی کی جگہ نیک کام کرے (توبہ کرے) تو میں (اسکو بھی معاف کر دیتا ہوں کیونکہ میں) مغفرت والا رحمت والا ہوں (یہ اسلئے فرمایا کہ عصا کے معجزہ سے مطمئن ہو جانے کے بعد کبھی اپنا قصہ قبطی کو قتل کرنے کا یاد کر کے پریشان ہوں اس لئے اس سے بھی مطمئن فرما دیا تاکہ وحشت جاتی رہے) اور (اے موسیٰ اس معجزۂ عصا کے سوا ایک معجزہ اور بھی عطا ہوتا ہے وہ یہ کہ) تم اپنا ہاتھ گریبان کے اندر لے جاؤ (اور پھر نکالو تو) وہ بلا کسی عیب (یعنی بغیر کسی مرض برص وغیرہ) کے (نہایت) روشن ہو کر نکلے گا (اور یہ دونوں معجزے اُن) نو معجزوں میں (سے ہیں جن کے ساتھ تم کو) فرعون اور اسکی قوم کی طرف (بھیجا جاتا ہے کیونکہ) وہ بڑے حد سے نکل جانے والے لوگ ہیں غرض جب اُن لوگوں کے پاس ہمارے (دیئے ہوئے) معجزے پہنچے (جو نہایت واضح تھے (یعنی ابتدائے دعوت میں دو معجزے دکھلائے گئے پھر وقتاً فوقتاً باقی دکھلائے جاتے رہے) تو وہ لوگ (ان سب کو دیکھ کر بھی) بولے یہ صریح جادو ہے اور (غضب تو یہ تھا کہ ظلم) اور تکبر کی راہ سے ان (معجزات) کے (بالکل) منکر ہو گئے حالانکہ (اندر سے) انکے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا سو دیکھئے کیسا (برا) انجام ہوا ان مفسدوں کا (دنیا میں غرق ہوئے اور آخرت میں جلنے کی سزا پائی)

معارف و مسائل

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ

انسان کو اپنی ضروریات کے لئے اسبابِ طبعیہ کو اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس جگہ دو ضرورتیں پیش آئیں ایک راستہ پوچھنا جو آپ بھول گئے تھے، دوسرا آگ سے گرمی

۳۶

حاصل کرنا کہ سردی کی رات تھی اس کے لئے آپ نے کوہ طور کی طرف جانے کی سعی و کوشش کی لیکن اسکے ساتھ ہی اس مقصد میں کامیابی پر یقین اور دعوی کرنے کے بجائے ایسے الفاظ اختیار فرمائے جس میں اپنی بندگی اور حق تعالیٰ سے اُمید ظاہر ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ضروریات کے حصول کے لئے جد و جہد توکل کے منافی نہیں۔ لیکن بھروسہ اپنی کوشش کے بجائے اللہ پر ہونا چاہیئے اور آگ آپ کو دکھلائے جانے میں بھی شاید یہی حکمت ہو کہ اس سے آپ کے دونوں مقصود پورے ہوسکتے تھے، راستہ کا مل جانا اور آگ سے گرمی حاصل کرنا۔ (کذافی الروح)

اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُمْكُثُوْٓا اور تَصْطَلُوْنَ جمع کے صیغے بولے حالانکہ آپکے ساتھ صرف آپ کی بیوی یعنی حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی تھیں انکے لئے لفظ جمع استعمال فرمانا بطور اکرام کے ہوا جیسے معزز لوگوں میں کسی ایک فرد سے بھی خطاب ہوتا ہے تو صیغہ جمع کا استعمال کیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی اپنی ازواج مطہرات کے لئے صیغہ جمع استعمال فرمانا روایات حدیث میں وارد ہوا ہے۔

عام مجالس میں تخصیص کیساتھ بیوی کا ذکر نہ کرنا بلکہ کنایہ سے کام لینا بہتر ہے۔ آیت مذکورہ میں قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ فرمایا گیا ہے لفظ اہل عام ہے جس میں بیوی اور گھر کے دوسرے افراد بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس مقام میں اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تنہا اہلیہ محترمہ ہی تھیں، کوئی دوسرا نہ تھا مگر تعبیر میں یہ عام لفظ استعمال کرنے سے اسطرف اشارہ پایا گیا کہ مجالس میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کا ذکر کرے تو عام لفظوں سے کرنا بہتر ہے جیسے ہمارے عرف میں کہا جاتا ہے میرے گھر والوں نے یہ کہا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آگ دیکھنے اور آگ کے اندر سے ایک ندا سُننے کی تحقیق۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ بہت سی سورتوں میں مختلف عنوانات کے ساتھ آیا ہے۔ سورۂ نمل کی مذکورہ آیات میں اس سلسلے کے دو جملے غور طلب ہیں۔ اول (نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ) دوسرا (اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ) اور سورۂ طٰہٰ میں جس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے اس واقعہ سے متعلق یہ الفاظ آئے ہیں (اِذْ رَاٰ نَارًا۔ الیٰ قولہ تعالیٰ نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ) ان آیات میں بھی دو جملے خاص طور سے غور طلب ہیں (اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ) اور (اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ الخ) اور سورۂ قصص میں اس واقعہ کے یہ الفاظ ہیں (نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى

اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ) ان تینوں مواقع میں عنوانِ تعبیر اگرچہ مختلف ہے مگر مضمون تقریباً ایک ہی ہے وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس رات میں کسی وجہ سے آگ کی ضرورت تھی حق تعالیٰ نے انکو کوہِ طور کے ایک درخت پر آگ دکھلائی۔ اُس آگ یا درخت سے یہ آواز سُنی گئی اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ ، اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ، اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا ، اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ، یہ ہوسکتا ہے کہ یہ ندا، بار بار ہوئی ہو کبھی ایک لفظ سے کبھی دوسرے لفظ سے۔ اور آواز سُننے کی جو کیفیت تفسیر بحر محیط میں ابو حیان نے اور روح المعانی میں آلوسی نے نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ آواز اس طرح سُنی کہ ہر جانب سے یکساں آرہی تھی جس کی کوئی جہت متعین نہیں ہوسکتی تھی۔ اور سُننا بھی ایک عجیب انداز سے ہوا کہ صرف کان نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں وغیرہ تمام اعضائے بدن اسکو سُن رہے تھے جو ایک معجزہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ ایک غیبی آواز تھی جو بلا کیف و بلا سمت سنی جا رہی تھی لیکن مبدا اسکا وہ آگ یا درخت تھا جس سے آگ کی شکل اُن کو دکھائی گئی۔ ایسے ہی مواقع عام طور پر لوگوں کے لئے مغالطے اور بُت پرستی کا سبب بنجاتے ہیں اسلئے ہر عنوان میں مضمون توحید کیطرف ہدایت اور تنبیہ ساتھ ساتھ کی گئی ہے زیر بحث آیت میں لفظ سُبْحٰنَ اللّٰهِ اسی تنبیہ کے لئے بڑھایا گیا۔ سورۂ طٰہٰ میں لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا اور سورۂ قصص میں اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ اسی مضمون کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ یہ آگ کی شکل حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسلئے دکھلائی گئی تھی کہ وہ اسوقت آگ اور روشنی کے حاجتمند تھے ورنہ اس کلامِ ربّانی اور ذاتِ ربّانی کا آگ سے یا شجرۂ طور سے کوئی تعلق نہ تھا۔ آگ اللہ تعالیٰ کی عام مخلوقات کی طرح ایک مخلوق تھی اسی لئے زیر بحث آیات میں جو یہ ارشاد ہے اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا یعنی مبارک ہے وہ جو آگ کے اندر ہے اور وہ جو اسکے آس پاس ہے۔ اسکی تفسیر میں ائمہ تفسیر کے مختلف اقوال ہیں جسکی تفصیل تفسیر روح المعانی میں ہے۔ ایک قول حضرت ابن عباسؓ مجاہد، عکرمہ سے منقول ہے کہ مَنْ فِی النَّارِ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوں کیونکہ آگ کوئی حقیقی آگ تو تھی نہیں جس بقعہ مبارکہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچ گئے تھے وہ دُور سے پورا آگ معلوم ہوتا تھا اسلئے موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے اندر ہوئے اور مَنْ حَوْلَهَا سے مراد فرشتے ہیں جو آس پاس وہاں موجود تھے اور بعض حضرات نے اسکے برعکس یہ فرمایا کہ مَنْ فِی النَّارِ سے فرشتے اور مَنْ حَوْلَهَا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں۔ تفسیر بیان القرآن کے خلاصہ تفسیر مذکور میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ آیاتِ مذکورہ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ اور حسن بصری کی ایک روایت اور اُس کی تحقیق

یہاں ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ حضرت حسن بصری اور سعید بن جُبیرؓ سے مَنْ فِی النَّارِ کی تفسیر میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ مَنْ فِی النَّارِ سے خود ذاتِ حق سُبحانہٗ و تعالیٰ مراد ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ

آگ ایک مخلوق ہے اور کسی مخلوق میں خالق کا حلول نہیں ہو سکتا، اس لئے اس روایت کا یہ مفہوم تو ہو نہیں سکتا کہ ذاتِ حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے آگ کے اندر حلول فرمایا تھا جیسا کہ بہت سے بت پرست مشرکین بتوں کے وجود میں ذاتِ حق کے حلول کے قائل ہیں اور یہ توحید کے قطعاً خلاف ہے بلکہ مراد ظہور ہے جیسا آئینہ میں جس چیز کو دیکھا جاتا ہے وہ آئینہ میں حلول کئے ہوئے نہیں ہوتی اس سے الگ اور خارج ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ ظہور جس کو تجلّی بھی کہا جاتا ہے خود ذاتِ حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی تجلّی نہیں تھی ورنہ اگر ذاتِ حق تعالیٰ کا مشاہدہ موسیٰ علیہ السلام نے کر لیا ہوتا تو بعد میں انکے اس سوال کی کوئی وجہ نہیں رہتی رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ (یعنی اے میرے پروردگار مجھے اپنی ذات پاک دکھا کہ میں دیکھ سکوں) اور اسکے جواب میں حق تعالیٰ کی طرف سے لَنْ تَرٰىنِیْ کا ارشاد بھی پھر کوئی معنے نہ رکھتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباسؓ کے اس قول میں حق تعالیٰ جل شانہٗ کا ظہور مراد ہے یعنی تجلّی جو آگ کی صورت میں ہوئی یہ جس طرح حلول نہیں تھا اسی طرح تجلّی ذات بھی نہیں تھی بلکہ لَنْ تَرٰىنِیْ الآیۃ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس عالمِ دنیا میں تجلّی ذاتی کا کوئی شخص مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ پھر اس ظہور و تجلّی کا کیا مفہوم ہوگا اسکا جواب یہ ہے کہ یہ تجلّی مثالی تھی جو حضرات صوفیہ کرام میں معروف ہے اس کی حقیقت کا سمجھنا تو انسان کے لئے مشکل ہے۔ بقدر ضرورت تقریب الی الفہم کے لئے احقر نے اپنی کتاب احکام القرآن زبان عربی سورۂ قصص میں اسکی کچھ تفصیل لکھی ہے اہل علم اسمیں دیکھ سکتے ہیں عوام کی ضرورت کی چیز نہیں۔

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا ۢ بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ، اس سے پہلی آیت میں موسیٰ علیہ السلام کے معجزۂ عصا کا ذکر ہے جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ عصا جب سانپ بن گیا تو موسیٰ خود بھی اس سے ڈر کر بھاگنے لگے۔ آگے بھی موسیٰ علیہ السلام کے دوسرے معجزہ ید بیضاء کا بیان ہے درمیان میں اس استثناء کا ذکر کس لئے کیا گیا اور یہ استثناء منقطع ہے یا متصل؟ اسمیں حضرات مفسرین کے اقوال مختلف ہیں بعض حضرات نے استثناء کو منقطع قرار دیا ہے تو مضمون آیت کا یہ ہوگا کہ پہلی آیت میں انبیاء علیہم السلام پر خوف نہ ہونیکا ذکر تھا بسبیل تذکرہ ان لوگوں کا بھی ذکر کر دیا جن پر خوف طاری ہونا چاہیے، یعنی وہ لوگ جن سے کوئی خطا سرزد ہوئی پھر توبہ کر کے نیک عمل اختیار کر لئے ایسے حضرات کی اگرچہ اللہ تعالیٰ خطا معاف کر دیتے ہیں مگر معافی کے بعد بھی گناہ کے بعض آثار باقی رہنے کا احتمال ہے اس سے یہ حضرات ہمیشہ خائف رہتے ہیں۔ اور اس استثناء کو متصل قرار دیں تو معنے آیت کے یہ ہونگے کہ اللہ کے رسول ڈرا نہیں کرتے بجز اُن کے جن سے کوئی خطا یعنی گناہ صغیرہ سرزد ہو گیا ہو پھر اس سے بھی توبہ کر لی ہو، تو اس توبہ سے یہ صغیرہ گناہ معاف ہو جاتا ہے اور صحیح تر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے جو لغزشیں ہوئی ہیں وہ درحقیقت گناہ ہی نہ تھے نہ صغیرہ نہ کبیرہ، البتہ صورت گناہ کی تھی اور درحقیقت وہ اجتہادی خطائیں ہوئی ہیں۔ اس مضمون میں اشارہ اس طرف پایا گیا کہ حضرت موسیٰ

سے جو ایک لغزش قبطی کے قتل کی ہو گئی وہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے معاف کردی مگر اسکا یہ اثر اب بھی رہا کہ موسیٰ علیہ السلام پر خوف طاری ہو گیا، اگر یہ لغزش نہ ہوتی تو یہ وقتی خوف بھی نہ ہوتا۔ (قرطبی)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ
اور ہم نے دیا داؤد اور سلیمان کو ایک علم اور بولے شکر اللہ کا جس نے ہم کو

فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ
بزرگی دی اپنے بہت سے بندوں ایمان والوں پر اور قائم مقام ہوا سلیمان

دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ
داؤد کا اور بولا اے لوگو ہم کو سکھائی ہے بولی اڑتے جانوروں کی اور دیا ہم کو ہر چیز

كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ
میں سے بیشک یہی ہے فضیلت صریح اور جمع کئے گئے سلیمان کے پاس

جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ حَتّٰٓى اِذَآ
اس کے لشکر جن اور انسان اور اڑتے جانور پھر ان کی جماعتیں بنائی جاتیں یہاں تک کہ جب

اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا
پہنچے چیونٹیوں کے میدان پر کہا ایک چیونٹی نے اے چیونٹیو گھس جاؤ اپنے

مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾
گھروں میں نہ پیس ڈالے تم کو سلیمان اور اسکی فوجیں اور ان کو خبر بھی نہ ہو

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ
پھر مسکرا کر ہنس پڑا اس کی بات سے اور بولا اے میرے رب میری قسمت میں دے کہ شکر

نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا
کروں تیرے احسان کا جو تو نے کیا مجھ پر اور میرے ماں باپ پر اور یہ کہ کروں کام نیک

تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾
جو تو پسند کرے اور ملا لے مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) اور سلیمان (علیہ السلام) کو (شریعت اور حکمرانی کا) علم عطا فرمایا اور ان دونوں نے (ادائے شکر کے لئے) کہا کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے سزاوار ہیں جس نے ہم کو

اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی اور داؤد (علیہ السلام کی وفات کے بعد ان) کے قائم مقام سلیمان (علیہ السلام) ہوئے (یعنی ان کو سلطنت وغیرہ ملی) اور انھوں نے (اظہار شکر کیلئے) کہا کہ اے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولی (سمجھنے) کی تعلیم کی گئی ہے (جو دوسرے بادشاہوں کو حاصل نہیں) اور ہم کو (سامان سلطنت کے متعلق) ہر قسم کی (ضروری) چیزیں دی گئی ہیں (جیسے فوج، لشکر، مال، اور آلات جنگ وغیرہ) واقعی یہ (اللہ تعالیٰ کا) کھلا ہوا فضل ہے اور سلیمان (علیہ السلام کے پاس سامان سلطنت بھی عجیب وغریب تھا چنانچہ ان) کے لئے (جو) ان کا لشکر جمع کیا گیا (تھا ان میں) جن بھی (تھے) اور انسان بھی اور پرندے بھی (جو کسی بادشاہ کے تابع نہیں ہوتے) اور (پھر تھے بھی اس کثرت سے کہ) ان کو (چلنے کے وقت) روکا جا (یا کر) تا تھا (تاکہ متفرق نہ ہو جاویں پیچھے والے بھی پہنچ جاویں یہ بات عادۃً نہایت کثرت میں ہوتی ہے کیونکہ تھوڑے مجمع میں تو اگلا آدمی خود ہی ایسے وقت رُک جاتا ہے اور بڑے مجمع میں اگلوں کو پچھلوں کی خبر بھی نہیں ہوتی اسلئے اسکا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ ایکبار اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ تشریف لئے جاتے تھے) یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کے ایک میدان میں آئے تو ایک چیونٹی نے (دوسری چیونٹیوں سے) کہا کہ اے چیونٹیو، اپنے اپنے سوراخوں میں جا گھسو، کہیں تم کو سلیمان اور ان کا لشکر بے خبری میں کچل نہ ڈالے سو سلیمان (علیہ السلام نے اس کی بات سنی اور) اس کی بات سے (متعجب ہو کر کہ اس چھوٹے وجود پر یہ ہوشیاری اور احتیاط) مسکراتے ہوئے ہنس پڑے اور (یہ دیکھ کر کہ میں اس کی بولی سمجھ گیا جو کہ معجزہ ہونے کی وجہ سے ایک نعمت عظیمہ ہے اور نعمتیں بھی یاد آ گئیں اور) کہنے لگے کہ اے میرے رب مجھ کو اس پر ہمیشگی دیجئے کہ میں آپ کی ان نعمتوں کا شکر کیا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں (یعنی ایمان اور علم سب کو اور نبوت خود کو اور اپنے والد داؤد علیہ السلام کو) اور (اس پر بھی ہمیشگی دیجئے کہ) میں نیک کام کیا کروں جس سے آپ خوش ہوں (یعنی عمل مقبول ہو کیونکہ اگر حقیقت میں عمل نیک ہو اور آداب شرائط کی کمی کی وجہ سے مقبول نہ ہو وہ مقصود نہیں ہے) اور مجھ کو اپنی رحمت (خاصہ) سے اپنے (اعلیٰ درجہ کے) نیک بندوں (انبیاء) میں داخل رکھئے (یعنی قرب کو بُعد میں تبدیل نہ کیجئے)۔

معارف و مسائل

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا، ظاہر ہے کہ اس سے مراد علوم انبیاء ہیں جو نبوت و رسالت سے متعلق ہوتے ہیں۔ اسکے عموم میں دوسرے علوم وفنون بھی شامل ہوں تو بعید نہیں جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت سکھا دی گئی تھی ۔ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام زمرۂ انبیاء میں ایک خاص امتیاز یہ رکھتے ہیں کہ ان کو نبوت و رسالت کے ساتھ سلطنت بھی دی گئی تھی اور سلطنت

بھی ایسی بے نظیر کہ صرف انسانوں پر نہیں بلکہ جنات اور جانوروں پر بھی ان کی حکمرانی تھی ان سب عظیم الشان نعمتوں سے پہلے حق تعالیٰ کے نعمتِ علم کا ذکر فرمانے سے اس طرف اشارہ ہوگیا کہ نعمتِ علم تمام دوسری نعمتوں سے فائق اور بالاتر ہے (قرطبی)

انبیاء میں مال کی وراثت نہیں ہوتی | وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ، وَرِثَ سے وراثتِ علم اور نبوت مُراد ہے وراثتِ مال نہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِيَاءِ لَا نَرِثُ وَلَا نُوْرَثُ) یعنی انبیاء نہ وارث ہوتے ہیں اور نہ مورث، حضرت ابوالدرداء رضی سے ترمذی اور ابوداؤد میں روایت ہے۔ العلماء ورثۃ الانبیاء وان الانبیاء لم یورثوا دینارًا ولا درھمًا ولکن ورثوا العلم فمن اخذہ اخذ بحظ وافر یعنی علماء انبیاء کے وارث ہیں، لیکن انبیاء میں وراثت علم اور نبوّت کی ہوتی ہے مال کی نہیں ہوتی۔

حضرت ابوعبداللہ جعفر صادق کی روایت اس مسئلہ کو اور زیادہ واضح کردیتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے اور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان علیہ السلام کے وارث ہوئے۔ (روح عن الکلینی) عقلی طور پر بھی یہاں وراثت مال مراد نہیں ہوسکتی کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات کے وقت آپ کی اولاد میں اُنیس بیٹوں کا ذکر آتا ہے اگر وراثتِ مال مراد ہو تو یہ بیٹے سب کے سب وارث ٹھہریں گے پھر وراثت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی تخصیص کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ وراثت وہ مُراد ہے جس میں بھائی شریک نہ تھے بلکہ صرف حضرت سلیمان علیہ السلام وارث بنے اور وہ صرف علم اور نبوت کی وراثت ہی ہوسکتی ہے اسکے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کا ملک و سلطنت بھی حضرت سلیمان کو عطا فرمادیا اور اسمیں مزید اضافہ اسکا کردیا کہ آپ کی حکومت جنات اور وحوش و طیور تک عام کردی، ہوا کو آپکے لئے مسخر کردیا، ان دلائل کے بعد طبرسی کی وہ روایت غلط ہوجائیگی جس میں انھوں نے بعض ائمہ اہل بیت کے حوالے سے مال کی وراثت مراد لی ہے (روح)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے درمیان ایک ہزار سات سو سال کا فاصلہ ہے اور یہود یہ فاصلہ ایک ہزار چار سو سال کا بتلاتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام کی عمر پچاس سال سے کچھ اوپر ہوئی ہے (قرطبی)

اپنے لئے جمع کا صیغہ بولنا جائز ہے بشرطیکہ تکبر نہ ہو | عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا الخ، حضرت سلیمان علیہ السلام نے باوجود خود اکیلے ہونے کے اپنے لئے جمع کا صیغہ شاہانہ محاورہ کے طور پر استعمال کیا ہے تاکہ رعایا پر رُعب پڑے اور رعایا اطاعتِ خداوندی اور اطاعتِ سلیمان علیہ السلام میں سُستی نہ کریں۔ اسی طرح امراء، حکام اور افسران کو اپنی رعایا کی موجودگی میں اپنے لئے جمع کا صیغہ استعمال کریں مضائقہ نہیں جبکہ وہ سیاسۃً اور اظہارِ نعمت کی غرض سے ہو تکبر و تعلّی کے لئے نہ ہو۔

پرندوں اور چوپاؤں میں بھی عقل و شعور ہے | اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ پرندے، چرندے اور تمام حیوانات

میں بھی عقل و شعور کسی درجہ میں موجود ہے۔ البتہ ان کی عقول اس درجہ کی نہیں کہ ان کو احکام شرع کا مکلف بنایا جاتا اور انسان اور جنات کو عقل و شعور کا وہ کامل درجہ عطا ہوا ہے جس کی بناء پر وہ اللہ تعالیٰ کے مخاطب ہو سکیں اور ان پر عمل کر سکیں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ کبوتر سب پرندوں میں زیادہ عقلمند ہے ابن عطیہ نے فرمایا کہ چیونٹی ذہین عقلمند جانور ہے اس کی قوتِ شامہ بڑی تیز ہے جو کوئی دانہ اس کے قبضہ میں آتا ہے اسکے دو ٹکڑے کر دیتی ہے تاکہ اگے نہیں اور سردی کے زمانے کے لئے اپنی غذا کا ذخیرہ جمع کرتی ہے۔ (قرطبی)

فائدہ :- آیت میں منطق الطیر یعنی پرندوں کی بولی کی تخصیص ہُدہُد کے واقعہ کی وجہ سے ہے جو پرندہ ہے ورنہ حضرت سلیمانؑ کو پرندے، چرندے اور تمام حشرات الارض کی بولیاں سکھائی گئی تھیں جیسا کہ اگلی آیت میں چیونٹی کی بولی سمجھنے کا ذکر موجود ہے۔ امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس مقام پر مختلف پرندوں کی بولیاں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا اس پر یہ فرمانا کہ یہ پرندہ یہ بات کہہ رہا ہے تفصیل سے نقل کیا ہے اور تقریباً ہر پرندہ کی بولی کوئی نصیحت کا جملہ ہے۔

وَاُوْتِیْنَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ، لفظ کُل اصل لغت کے اعتبار سے تمام افرادِ جنس کو عام ہوتا ہے مگر بسا اوقات عموم کُلی مراد نہیں ہوتا بلکہ کسی خاص مقصد کی حد تک عموم مراد ہوتا ہے جیسا یہاں مراد ان اشیاء کا عموم ہے جن کی سلطنت و حکومت میں ضرورت ہوتی ہے ورنہ ظاہر ہے کہ ہوائی جہاز، موٹر، ریل وغیرہ ان کے پاس نہ تھے۔ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ، وزع سے مشتق ہے جس کے لفظی معنے روکنے کے ہیں۔ مطلب اس جگہ یہ ہے کہ مجھے اس کی توفیق دیدیجئے کہ میں شکرِ نعمت کو ہر وقت ساتھ رکھوں اس سے کسی وقت جدا نہوں، جس کا حاصل مداومت اور پابندی ہے۔ اس سے پہلی آیت میں فَھُمْ یُوْزَعُوْنَ اسی معنی میں آیا ہے کہ لشکر کو کثرت کی وجہ سے انتشار سے بچانے کے لئے روکا جاتا تھا۔

وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ، یہاں رضا بمعنے قبول ہے۔ معنے یہ ہیں کہ یا اللہ مجھے ایسے عمل صالح کی توفیق دیجئے جو آپ کے نزدیک مقبول ہو۔ روح المعانی میں اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ عمل صالح کے لئے قبولیت لازم نہیں ہے بلکہ قبولیت کچھ شرائط پر موقوف ہوتی ہے، اور فرمایا کہ صالح اور مقبول ہونے میں نہ عقلاً کوئی لزوم ہے نہ شرعاً۔ اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے کہ اپنے اعمالِ صالحہ کے مقبول ہونے کی بھی دُعا کرتے تھے جیسے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کے وقت دُعا فرمائی، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو عمل نیک ہے صرف اس کو کر کے بے فکر ہونا نہیں چاہئے، اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دُعا کرے کہ اس کو قبول فرما دے۔

عمل صالح اور مقبول ہونے کے باوجود جنت میں داخل ہونا بغیر فضلِ خداوندی کے نہیں ہوگا

وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ، عمل صالح اور اسکے قبول ہونے کے باوجود جنت میں داخل ہونا خدا تعالیٰ کے فضل و کرم ہی سے ہوگا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ سلم نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے اعمال کے بھروسہ

پر جنت میں داخل نہیں ہوگا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ بھی، تو آپ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی، لیکن مجھے میرے خدا کی رحمت اور فضل گھیرے ہوئے ہے۔ (روح المعانی)

حضرت سلیمان علیہ السلام بھی ان کلمات میں دخولِ جنت کے لئے فضلِ ربی کی دعا فرما رہے ہیں یعنی اے اللہ، مجھے وہ فضل بھی عطا فرما جس سے جنت کا مستحق ہو جاؤں۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ أَرَى الْهُدْهُدَ ۖ أَمْ كَانَ مِنَ

اور خبر لی اڑتے جانوروں کی تو کہا کیا ہے، جو میں نہیں دیکھتا ہُدہُد کو یا ہے وہ

الْغَآئِبِينَ ﴿٢٠﴾ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَاذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي

غائب اس کو سزا دوں گا سخت سزا یا ذبح کر ڈالوں گا یا لائے میرے پاس

بِسُلْطَٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٢١﴾ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ فَقَالَ أَحَطتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ وَ

کوئی سند صریح پھر بہت دیر نہ کی کہ آکر کہا میں لے آیا خبر ایک چیز کی کہ تجھ کو اسکی

جِئْتُكَ مِن سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ ﴿٢٢﴾ إِنِّي وَجَدتُّ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَ

خبر نہ تھی اور آیا ہوں تیرے پاس سبا سے ایک خبر لیکر تحقیقی میں نے پایا ایک عورت کو جو ان پر بادشاہی کرتی ہے

أُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ﴿٢٣﴾ وَجَدتُّهَا وَقَوْمَهَا

اور اس کو ہر ایک چیز ملی ہے اور اس کا ایک تخت ہے بڑا میں نے پایا کہ وہ اور اسکی قوم

يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِن دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَٰنُ أَعْمَٰلَهُمْ

سجدہ کرتے ہیں سورج کو اللہ کے سوائے اور بھلے دکھلا رکھے ہیں ان کو شیطان نے انکے کام

فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ﴿٢٤﴾ أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ

پھر روک دیا ان کو رستہ سے سو وہ راہ نہیں پاتے کیوں نہ سجدہ کریں اللہ کو

الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَ

جو نکالتا ہے چھپی ہوئی چیز آسمانوں میں اور زمین میں اور جانتا ہے جو چھپاتے ہو اور

مَا تُعْلِنُونَ ﴿٢٥﴾ اللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۩ ﴿٢٦﴾ قَالَ

ظاہر کرتے ہو اللہ ہے کسی کی بندگی نہیں اسکے سوائے پروردگار تخت بڑے کا سلیمان نے کہا

سَنَنظُرُ أَصَدَقْتَ أَمْ كُنتَ مِنَ الْكَٰذِبِينَ ﴿٢٧﴾ اذْهَب بِّكِتَٰبِي

ہم اب دیکھتے ہیں تو نے سچ کہا یا تو جھوٹا ہے لے جا میرا یہ خط

هَٰذَا فَأَلْقِهْ إِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانظُرْ مَاذَا يَرْجِعُونَ ﴿٢٨﴾

اور ڈال دے ان کی طرف پھر ان کے پاس سے ہٹ آ پھر دیکھ وہ کیا جواب دیتے ہیں

خُلاصۂ تفسیر

(اور ایک بار یہ قصہ ہوا کہ) سلیمان (علیہ السلام) نے پرندوں کی حاضری لی تو (ہُد ہُد کو نہ دیکھا) فرمانے لگے کہ کیا بات ہے کہ میں ہُد ہُد کو نہیں دیکھتا کیا کہیں غائب ہو گیا ہے (اور جب معلوم ہوا کہ واقع میں غائب ہے تو فرمانے لگے کہ) میں اس کو (غیر حاضری پر) سخت سزا دُوں گا یا اس کو ذبح کر ڈالوں گا یا وہ کوئی صاف دلیل (اور غیر حاضری کا عذر) میرے سامنے پیش کرے (تو خیر چھوڑ دُوں گا) تھوڑی دیر بعد وہ آگیا اور سلیمان (علیہ السلام سے) کہنے لگا کہ ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں ہوئی اور (اجمالی بیان اسکا یہ ہے کہ) میں آپکے پاس قبیلۂ سبا کی ایک پختہ خبر لایا ہوں (جسکا تفصیلی بیان یہ ہے کہ) میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ ان لوگوں پر بادشاہی کر رہی ہے اور اس کو (بادشاہی کے لوازم میں سے) ہر قسم کا سامان حاصل ہے اور اسکے پاس ایک بڑا تخت ہے (اور مذہبی حالت اسکی یہ ہے کہ) میں نے اس (عورت) کو اور اسکی قوم کو دیکھا کہ وہ خدا (کی عبادت) کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے اُن کے (ان) اعمال (کفر) کو انکی نظر میں مرغوب کر رکھا ہے (اور ان اعمالِ بد کو مزین کرنے کے سبب) انکو راہ (حق) سے روک رکھا ہے اسلئے وہ راہِ (حق) پر نہیں چلتے کہ اس خدا کو سجدہ نہیں کرتے جو (ایسا قدرت والا ہے کہ) آسمان اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو (جن میں سے بارش اور زمین کی نباتات بھی ہیں) باہر لاتا ہے اور (ایسا جاننے والا ہے کہ) تم لوگ (یعنی تمام مخلوق) جو کچھ (دل میں) پوشیدہ رکھتے ہو اور جو کچھ (زبان اور جسم کے اعضاء سے) ظاہر کرتے ہو وہ سب کو جانتا ہے (اسلئے) اللہ ہی ایسا ہے کہ اسکے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے سلیمان (علیہ السلام) نے (یہ سُن کر) فرمایا کہ ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں کہ تو سچ کہتا ہے یا تو جھوٹوں میں سے ہے (اچھا) میرا یہ خط لے جا اور اسکو اُن کے پاس ڈال دینا پھر (ذرا وہاں سے) ہٹ جانا، پھر دیکھنا کہ آپس میں کیا سوال و جواب کرتے ہیں (پھر تو یہاں چلے آنا وہ لوگ جو کچھ کارروائی کریں گے اُس سے تیرا سچ جھوٹ معلوم ہو جاوے گا)۔

معارف و مسائل

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ، تَفَقَّدَ کے لفظی معنے کسی مجمع کے متعلق حاضر و غیر حاضر کی تحقیق کرنے کے ہیں، اسلئے اسکا ترجمہ خبر گیری اور نگہبانی سے کیا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے انسانوں کے علاوہ جنات اور وحوش و طیور پر حکومت عطا فرمائی تھی اور جیسا کہ حکمرانی کا اُصول ہے رعایا کے ہر طبقہ کی نگرانی اور خبر گیری حاکم کے فرائض میں سے ہے اسکے مطابق اس آیت میں بیان فرمایا تَفَقَّدَ الطَّيْرَ یعنی سلیمان علیہ السلام نے اپنی رعایا کے طیور کا معائنہ فرمایا اور یہ دیکھا کہ ان میں کون حاضر ہے کون

غیر حاضر۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بھی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ صحابۂ کرام کے حالات سے باخبر رہنے کا اہتمام فرماتے تھے جو شخص غیر حاضر ہوتا اگر بیمار ہے تو عیادت کے لئے تشریف لیجاتے تھے تیمارداری کرتے اور کسی تکلیف میں مبتلا ہے تو اسکے لئے تدبیر فرماتے تھے۔

حاکم کو اپنی رعیت کی اور مشائخ کو اپنے شاگردوں اور مریدوں کی خبرگیری ضروری ہے

آیتِ مذکورہ سے ثابت ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی رعایا کے ہر طبقہ پر نظر رکھتے اور انکے حالات سے اتنے باخبر رہتے تھے کہ ہدہد جو طیور میں چھوٹا اور کمزور بھی ہے اور اس کی تعداد بھی دُنیا میں بہ نسبت دوسرے طیور کے کم ہے وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا، بلکہ خاص ہُدہُد کے متعلق جو سوال آپنے فرمایا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ زمرۂ طیور میں کم تعداد اور کمزور ہے، اسلئے اپنی رعیت کے کمزوروں پر نظر رکھنے کا زیادہ اہتمام فرمایا۔ صحابۂ کرام میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اس سُنتِ انبیاء کو پوری طرح جاری کیا۔ راتوں کو مدینہ منورہ کی گلیوں میں پھرتے تھے کہ سب لوگوں کے حالات سے باخبر رہیں۔ جس شخص کو کسی مصیبت و تکلیف میں گرفتار پاتے اُس کی امداد فرماتے تھے جس کے بہت سے واقعات اُنکی سیرت میں مذکور ہیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر دریائے فرات کے کنارہ پر کسی بھیڑیئے نے کسی بکری کے بچے کو پھاڑ ڈالا تو اسکا بھی عمر سے سوال ہوگا۔ (قرطبی)

یہ تھے وہ اُصولِ جہانبانی و حکمرانی جو انبیاء علیہم السلام نے لوگوں کو سکھائے اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اُن کو عملاً جاری کرکے دکھلایا اور جس کے نتیجہ میں پوری مُسلم و غیر مُسلم رعایا امن و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتی تھی، اور اُن کے بعد زمین و آسمان نے ایسے عدل و انصاف اور عام دُنیا کے امن و سکون اور اطمینان کا یہ منظر نہیں دیکھا۔

مَا لِيَ لَآ أَرَى ٱلْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ ٱلْغَآئِبِينَ، سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے کیا ہوگیا کہ میں ہُدہُد کو مجمع میں نہیں دیکھتا۔

اپنے نفس کا محاسبہ

یہاں موقع تو یہ فرمانے کا تھا کہ ہُدہُد کو کیا ہوگیا کہ وہ مجمع میں حاضر نہیں، عنوان شاید اسلئے بدلا کہ ہدہد اور تمام طیور کا مسخر ہونا حق تعالیٰ کا ایک انعام خاص تھا۔ ہُدہُد کی غیر حاضری پر ابتداء میں یہ خوف دل میں پیدا ہوا کہ شاید میرے کسی قصور سے اس نعمت میں کمی آئی کہ ایک صنفِ طیور کی یعنی ہُدہُد غائب ہوگیا اسلئے اپنے نفس سے سوال کیا کہ ایسا کیوں ہوا؟ جیسا کہ مشائخ صوفیہ کا معمول ہے کہ جب اُن کو کسی نعمت میں کمی آئے یا کوئی تکلیف و پریشانی لاحق ہو تو وہ اسکے ازالہ کیلئے مادّی اسباب کیطرف توجہ کرنے سے پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کرتے تھے کہ ہم سے اللہ تعالیٰ کے حق شکر میں کونسی کوتاہی ہوئی جس کے سبب یہ نعمت ہم سے لے لی گئی۔ قرطبی نے اس جگہ بحوالہ ابن عربی ان بزرگوں کا یہ حال نقل کیا ہے۔

یعنی ان حضرات کو جب اپنی مراد میں کامیابی نہیں ہوتی تو یہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے ہیں کہ ہم سے کیا قصور سرزد ہوا۔	اذا فقدوا اٰمالھم تفقدوا اعمالھم

اس ابتدائی محاسبۂ نفس اور غور و فکر کے بعد فرمایا اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِیْنَ اس جگہ حرف اَمْ بمعنے بَلْ ہے (قرطبی) معنے یہ ہیں کہ یہ بات نہیں کہ ہُدہُد کے دیکھنے میں میری نظر نے خطا کی بلکہ وہ حاضر ہی نہیں ہے۔

طیور میں سے ہُدہُد کی تخصیص کی وجہ اور ایک اہم عبرت

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے سوال کیا گیا کہ تمام پرندوں میں ہدہد کی تفتیش کی کیا وجہ پیش آئی تو آپ نے فرمایا کہ سلیمان علیہ السلام نے کسی ایسے مقام میں قیام فرمایا جہاں پانی نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ نے ہُدہُد کو یہ خاصیت عطا فرمائی ہے کہ وہ زمین کے اندر کی چیزوں کو اور زمین کے اندر بہنے والے چشموں کو دیکھ لیتا ہے۔ مقصود حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ تھا کہ ہُدہُد سے یہ معلوم کریں کہ اس میدان میں پانی کتنی گہرائی میں ہے اور کس جگہ زمین کھودنے سے پانی کافی مل سکتا ہے۔ ہُدہُد کی اس نشاندہی کے بعد وہ جنات کو حکم دیدیتے کہ اس زمین کو کھود کر پانی نکالو وہ بڑی جلد کھود کر پانی نکال لیتے تھے۔ ہُدہُد اپنی تیز نظر اور بصیرت کے باوجود شکاری کے جال میں پھنس جاتا ہے اس پر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔

جاننے والو اس حقیقت کو پہچانو کہ ہدہد زمین کی گہرائی کی چیزوں کو دیکھ لیتا مگر زمین کے اوپر پھیلا ہوا جال اُس کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے جس میں پھنس جاتا ہے۔	قف یا وقاف کیف یری الھدھد باطن الارض وھو لا یری الفخ حین یقع فیہ (قرطبی)

مقصد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جو امر تکلیف یا راحت کا کسی کے لئے مقدر کر دیا ہے تو تقدیر الٰہی نافذ ہو کر رہتی ہے کوئی شخص اپنی فہم و بصیرت یا زور و زر کی طاقت کے ذریعہ اُس سے نہیں بچ سکتا۔

لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِیْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗۤ، ابتدائی غور و فکر کے بعد یہ حاکمانہ سیاست کا مظاہرہ ہے کہ غیر حاضر رہنے والے کو سزا دی جائے۔

جو جانور کام میں سستی کرے اسکو معتدل سزا دینا جائز ہے

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے حق تعالیٰ نے جانوروں کو ایسی سزائیں دینا حلال کر دیا تھا جیسا عام اُمتوں کے لئے جانوروں کو ذبح کر کے انکے گوشت پوست وغیرہ سے فائدہ اُٹھانا اب بھی حلال ہے۔ اسی طرح پالتو جانور گائے بیل، گدھا گھوڑا، اونٹ وغیرہ اپنے کام میں سستی کرے اُس کو تادیب کے لئے بقدرِ ضرورت مار کی معتدل سزا اب بھی جائز ہے۔ دوسرے جانوروں کو سزا دینا ہماری شریعت میں ممنوع ہے۔ (قرطبی)

اَوْ لَیَاْتِیَنِّیْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ، یعنی اگر ہُدہُد نے اپنی غیر حاضری کا کوئی عذر واضح پیش کر دیا تو وہ اس سزا سے محفوظ رہے گا۔ اسمیں اشارہ ہے کہ حاکم کو چاہیئے کہ جن لوگوں سے کوئی قصور عمل میں سرزد ہو جائے اُن کو عذر پیش کرنے کا موقع دے، عذر صحیح ثابت ہو تو سزا کو معاف کر دے۔

اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ، یعنی ہُدہُد نے اپنا عذر بتلاتے ہوئے کہا کہ مجھے وہ چیز معلوم ہے جو آپ کو معلوم نہیں، یعنی میں ایک ایسی خبر لایا ہوں جس کا آپ کو پہلے علم نہیں تھا۔

انبیاء علیہم السلام عالم الغیب نہیں ہوتے امام قرطبی نے فرمایا کہ اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام عالم الغیب نہیں ہوتے جس سے اُن کو ہر چیز کا علم ہو سکے۔

وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ، سَبَاء، یمن کا ایک مشہور شہر جس کا ایک نام مارب بھی ہے، اُسکے اور یمن کے دارالحکومت صنعاء کے درمیان تین دن کی مسافت تھی۔

کیا چھوٹے آدمی کو یہ حق ہے کہ اپنے بڑوں سے کہے کہ مجھے آپ سے زیادہ علم ہے ہُدہُد کی مذکورہ گفتگو سے بعض لوگوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ کوئی شاگرد اپنے استاد سے یا غیر عالم عالم سے کہہ سکتا ہے کہ اس مسئلہ کا علم مجھے آپ سے زیادہ ہے بشرطیکہ اس کو اس مسئلہ کا واقعی طور پر مکمل علم دوسروں سے زائد ہو۔ مگر روح المعانی میں فرمایا کہ یہ طرز گفتگو اپنے مشائخ اور بڑوں کے سامنے خلافِ ادب ہے اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اور ہُدہُد کے قول سے اس پر استدلال اس لئے نہیں ہو سکتا کہ اُسنے یہ بات اپنے آپ کو سزا سے بچانے اور عُذر کے قوی ہونے کے لئے کہی ہے تاکہ اسکی غیر حاضری کا عُذر پوری طرح حضرت سلیمانؑ کے سامنے آجائے ایسی ضرورت میں ادب کی رعایت رکھتے ہوئے کوئی بات کہیجائے تو مضائقہ نہیں۔

اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ، یعنی میں نے ایک عورت کو پایا جو قوم سبا کی مالک ہے یعنی اُن پر حکومت کرتی ہے۔ اس عورت یعنی ملکہ سبا کا نام تاریخ میں بلقیس بنت شراحیل بتلایا گیا ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ اس کی والدہ جنات میں سے تھی جسکا نام بلعمہ بنت شیصان بتلایا جاتا ہے (رواہ وہیب بن جریر عن الخلیل ابن احمد۔ قرطبی) اور اُن کا دادا ہُداہد پورے ملک یمن کا ایک عظیم الشان بادشاہ تھا جس کی اولاد میں چالیس لڑکے ہوئے سب کے سب مُلوک اور بادشاہ بنے۔ ان کے والد سراح نے ایک جنّیہ عورت سے نکاح کر لیا تھا اُسی کے بطن سے بلقیس پیدا ہوئی۔ جنّیہ سے نکاح کرنے کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ یہ اپنی حکومت وسلطنت کے غرور میں لوگوں سے کہتا تھا کہ تم میں کوئی میرا کفو نہیں اسلئے میں نکاح ہی نہ کرونگا کیونکہ غیر کفو میں نکاح مجھے پسند نہیں، اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے اسکا نکاح ایک جنّیہ عورت سے کرا دیا (قرطبی) شاید یہ اُسی فخر وغرور کا نتیجہ تھا کہ اسنے انسانوں کو جو درحقیقت کفو تھے حقیر وذلیل سمجھا اور اپنا کفو تسلیم نہ کیا تو قدرت نے اسکا نکاح ایک ایسی عورت سے مقدر کر دیا جو نہ اس کی کفو تھی نہ اس کی جنس وقوم سے تھی۔

کیا انسان کا نکاح جنی عورت سے ہو سکتا ہے اس معاملہ میں بعض لوگوں نے تو اس لئے شبہ کیا ہے کہ جنات کو انسان کی طرح توالد وتناسل کا اہل نہیں سمجھا۔ ابن عربی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ یہ خیال باطل ہے۔ احادیث صحیحہ سے جنات میں توالد وتناسل اور مرد وعورت کی تمام وہ خصوصیات جو انسانوں میں ہیں

جنات میں بھی موجود ہونا ثابت ہے۔

دوسرا سوال شرعی حیثیت سے یہ ہے کہ کیا عورت جنیہ کسی انسان مرد کے لئے نکاح کر کے حلال ہوسکتی ہے؟ اسمیں فقہاء کا اختلاف ہے بہت حضرات نے جائز قرار دیا ہے، بعض نے غیر جنس مثل جانوروں کے ہونے کی بناء پر حرام فرمایا ہے اس مسئلہ کی تفصیل "آکام المرجان فی احکام الجان" میں مذکور ہے اسمیں بعض ایسے واقعات بھی ذکر کئے ہیں کہ مسلمان مرد سے مسلمان جنیہ کا نکاح ہوا اور اُس سے اولاد بھی ہوئی۔ یہاں یہ مسئلہ اسلئے زیادہ قابل بحث نہیں کہ نکاح کرنے والا بلقیس کا والد مسلمان ہی نہ تھا اسکے عمل سے کوئی استدلال جواز یا عدم جواز پر نہیں ہوسکتا۔ اور چونکہ شرع اسلام میں اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہوتی ہے اور بلقیس کے والد انسان تھے اسلئے بلقیس انسان ہی قرار پائے گی۔ اسلئے بعض روایات میں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کا بلقیس سے نکاح کرنا مذکور ہے، اگر وہ روایت صحیح ہو تو بھی اس سے نکاح جنیہ کا کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا کیونکہ بلقیس خود جنیہ نہ تھیں اگرچہ اُن کی والدہ جنیہ ہو۔ واللہ اعلم اور نکاح سلیمان علیہ السلام کے متعلق مزید بیان آگے آئیگا۔

کیا کسی عورت کا بادشاہ ہونا یا کسی قوم کا امیر و امام ہونا جائز ہے؟

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی کہ اہل فارس نے اپنے ملک کا بادشاہ کسریٰ کی بیٹی کو بنا دیا ہے تو آپ نے فرمایا لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَّلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَاَةً، یعنی وہ قوم کبھی فلاح نہ پائے گی جس نے اپنے اقتدار کا مالک عورت کو بنا دیا۔ اسی لئے علماء اُمت اس پر متفق ہیں کہ کسی عورت کو امامت و خلافت یا سلطنت و حکومت سپرد نہیں کیجا سکتی، بلکہ نماز کی امامت کی طرح امامتِ کبریٰ بھی صرف مردوں کو سزاوار ہے۔ رہا بلقیس کا ملکۂ سبا ہونا تو اس سے کوئی حکم شرعی ثابت نہیں ہوسکتا جب تک یہ ثابت نہ ہوجائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے خود نکاح کیا اور پھر اسکو حکومت و سلطنت پر برقرار رکھا، اور یہ کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں جس پر احکامِ شرعیہ میں اعتماد کیا جاسکے۔

وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ، مراد یہ ہے کہ سب ضروری سامان جو کسی بادشاہ و امیر کو درکار ہوتا ہے اور اپنے زمانے کے مطابق ہوسکتا ہے موجود تھا جو چیزیں اُس زمانے میں ایجاد ہی نہ ہوئی تھیں اُن کا نہ ہونا اس آیت کے منافی نہیں۔

وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ، عرش کے لغوی معنے تختِ سلطنت کے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت میں ہے کہ عرشِ بلقیس کا طول اسّی ہاتھ اور عرض چالیس ہاتھ اور بلندی تیس ۳۰ ہاتھ تھی جس پر موتی اور یاقوت احمر زبرجد اخضر کا کام تھا اور اسکے پائے موتیوں اور جواہرات کے تھے اور پردے ریشم اور حریر کے اندر باہر یکے بعد دیگر سات مقفل عمارتوں میں محفوظ تھا۔

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ، معلوم ہوا کہ اس کی قوم نجوم پرست تھی آفتاب کی عبادت کرتی تھی، بعض نے فرمایا کہ مجوس میں سے تھی جو آگ اور ہر روشنی کی پرستش کرتے ہیں۔ (قرطبی)

اَلَّا يَسْجُدُوْا کا تعلق زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ یا صَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ سے ہے یعنی شیطان نے ان کے ذہنوں میں یہی بٹھلا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ نہ کریں یا یہ کہ ان کو حق کے راستہ سے اس طرح روک دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ نہ کریں۔

تحریر اور خط بھی عام معاملات میں حجتِ شرعیہ ہے اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کے نام خط بھیجنے کو اس پر اتمامِ حجت کے لئے کافی سمجھا اور اسی پر عمل فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ عام معاملات میں تحریر و خط قابلِ اعتبار ثبوت ہے۔ فقہاء رحمہم اللہ نے صرف ان مواقع میں خط کو کافی نہیں سمجھا جہاں شہادت شرعیہ کی ضرورت ہے کیونکہ خط اور ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ شہادت نہیں لیجا سکتی۔ شہادت کا مدار شاہد کا عدالت کے سامنے آکر بیان دینے پر رکھا گیا جسمیں بڑی حکمتیں مضمر ہیں، یہی وجہ ہے کہ آجکل بھی دُنیا کی کسی عدالت میں خط اور ٹیلیفون پر شہادت لینے کو کافی نہیں سمجھا جاتا۔

مشرکین کو خط لکھنا اور اُن کے پاس بھیجنا جائز ہے دوسرا مسئلہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس خط سے یہ ثابت ہوا کہ تبلیغ دین اور دعوتِ اسلام کے لئے مشرکین اور کفار کو خطوط لکھنا جائز ہے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی مختلف کفار کو خطوط بھیجنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

انسانی اخلاق کی رعایت ہر مجلس میں چاہیئے اگرچہ وہ مجلس کفار ہی کی ہو فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہُدہُد سے نامہ بری کا کام لیا تو اس کو یہ ادب مجلس بھی سکھایا کہ خط ملکۂ سبا کو پہنچا کر وہیں سر پر سوار نہ رہے بلکہ وہاں سے ذرا ہٹ جائے جو عام شاہی مجلسوں کا طریقہ ہے۔ اسمیں آدابِ معاشرت اور انسانی اخلاق کا عام مخلوقات کے ساتھ مطلوب ہونا معلوم ہوا۔

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنْ

کہنے لگی اے دربار والو میرے پاس ڈالا گیا ایک خط عزت کا وہ خط ہے سلیمان

سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ

کی طرف سے اور وہ یہ ہے شروع اللہ کے نام سے جو بےحد مہربان نہایت رحم والا ہے کہ زور نہ کرو میرے مقابلہ میں

وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ ع قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ

اور چلے آؤ میرے سامنے حکمبردار ہو کر کہنے لگی اے دربار والو مشورہ دو مجھ کو میرے کام میں

مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ

میں طے نہیں کرتی کوئی کام تمہارے حاضر ہونے تک وہ بولے ہم لوگ زور آور ہیں

وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾

اور سخت لڑائی والے اور کام تیرے اختیار میں ہے سو تو دیکھ لے جو حکم کرے

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ

کہنے لگی بادشاہ جب گھستے ہیں کسی بستی میں اس کو خراب کر دیتے ہیں اور کر ڈالتے ہیں وہاں

اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنِّىْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ

کے سرداروں کو بے عزت اور ایسا ہی کچھ کریں گے اور میں بھیجتی ہوں ان کی طرف کچھ تحفہ

فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا جَاۗءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ

پھر دیکھتی ہوں کیا جواب لے کر پھرتے ہیں بھیجے ہوئے پھر جب پہنچا سلیمان کے پاس بولا کیا تم میری اعانت

بِمَالٍ ۡ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾

کرتے ہو مال سے، سو جو اللہ نے مجھ کو دیا ہے بہتر ہے اس سے جو تم کو دیا ہے، بلکہ تم ہی اپنے تحفہ سے خوش رہو

اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ

پھر جا ان کے پاس اب ہم پہنچتے ہیں ان پر ساتھ لشکروں کے جن کا مقابلہ نہ ہو سکے ان سے اور نکال دیں گے انکو وہاں سے

اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

بے عزت کر کر اور وہ خوار ہوں گے

خلاصۂ تفسیر

(سلیمان علیہ السلام نے ہُدہُد سے یہ گفتگو کر کے بلقیس کے نام ایک خط لکھا جسکا مضمون آگے قرآن میں مذکور ہے اور ہُدہُد کے حوالہ کیا وہ اسکو چونچ میں لیکر چلا اور اکیلے یا مجلس میں بلقیس کے پاس ڈال دیا) بلقیس نے (پڑھ کر اپنے سرداروں کو مشورہ کے لئے جمع کیا اور) کہا کہ اے اہلِ دربار میرے پاس ایک خط (جسکا مضمون نہایت) باوقعت (اور عظیم الشان ہی) ڈالا گیا ہے (باوقعت اسلئے کہا کہ حاکمانہ مضمون ہے جس میں باوجود انتہائی اختصار کے اعلیٰ درجہ کی بلاغت ہے اور) وہ سلیمان کیطرف سے ہے اور اسمیں یہ (مضمون) ہے (اول) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (اور اسکے بعد یہ کہ) تم لوگ (یعنی بلقیس اور سب ارکانِ بادشاہت جن کے ساتھ عوام بھی وابستہ ہیں) میرے مقابلہ میں تکبر مت کرو اور میرے پاس تابعدار ہو کر چلے آؤ۔ (مقصود تمام کو دعوت دینا ہے اور یہ لوگ سلیمان علیہ السلام کا یا تو پہلے حال سن چکے ہونگے گو سلیمان علیہ السلام ان لوگوں کو نہ جانتے ہوں، اور اکثر ایسا ہوتا ہی کہ بڑے چھوٹوں کو نہیں جانتے اور چھوٹے بڑوں کو جانا کرتے ہیں اور یا خط آنے کے بعد تحقیق کر لیا ہوگا اور خط کے مضمون کی اطلاع دینے کے بعد) بلقیس نے (یہ) کہا کہ اے اہلِ دربار تم مجھ کو میرے

اس معاملہ میں رائے دو (کہ مجھ کو سلیمان کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیئے) اور میں (کبھی) کسی بات کا قطعی فیصلہ نہیں کرتی جب تک کہ تم میرے پاس موجود نہ ہو (اور اس میں شریک و مشیر نہ ہو) وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم (اپنی ذات سے ہر طرح سے حاضر ہیں، اگر مقابلہ اور لڑنا مصلحت سمجھا جاوے تو ہم) بڑے طاقتور اور بڑے لڑنے والے ہیں (اور آگے) اختیار تم کو ہے سو تم ہی (مصلحت) دیکھ لو جو کچھ (تجویز کرکے) حکم دینا ہو۔ بلقیس کہنے لگی کہ (میرے نزدیک لڑنا تو مصلحت نہیں کیونکہ سلیمان بادشاہ ہیں اور) بادشاہوں (کا قاعدہ ہے کہ وہ) جب کسی بستی میں (مخالفانہ طور پر) داخل ہوتے ہیں تو اسکو تہہ و بالا کر دیتے ہیں اور اسکے رہنے والوں میں جو عزت دار ہیں ان کو (ان کا زور گھٹانے کیلئے) ذلیل (و خوار) کیا کرتے ہیں اور (اُن سے لڑائی کیجاوے تو ممکن ہے کہ ان ہی کو غلبہ ہو تو پھر) یہ لوگ بھی ایسا ہی کریں گے (تو بے ضرورت پریشانی میں پڑنا خلاف مصلحت ہے لہٰذا جنگ کو تو ابھی ملتوی کیا جاوے) اور (سر دست یوں مناسب ہے کہ) میں ان لوگوں کے پاس کچھ ہدیہ (کسی آدمی کے ہاتھ بھیجتی ہوں) پھر دیکھوں گی کہ وہ بھیجے ہوئے (وہاں سے) کیا (جواب) لے کر آتے ہیں (اسوقت دوبارہ غور کیا جاویگا۔ چنانچہ ہدیوں اور تحفوں کا سامان درست ہوا اور قاصد اسکو لیکر روانہ ہوا) جب وہ قاصد سلیمان (علیہ السلام) کے پاس پہنچا (اور تمام ہدیے پیش کئے) تو سلیمان (علیہ السلام نے) فرمایا کیا تم لوگ (یعنی بلقیس اور بلقیس والے) مال سے میری امداد کر (نا چاہ) تے ہو (اسلئے ہدیئے لائے ہو) سو (سمجھ رکھو کہ) اللہ نے جو کچھ مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو تم کو دے رکھا ہے (کیونکہ تمھارے پاس صرف دُنیا ہے اور میرے پاس دین بھی اور دُنیا بھی تم سے زیادہ، لہٰذا میں تو ان چیزوں کا حریص نہیں ہوں) ہاں تم ہی اپنے ہدیئے پر فخر کرتے ہوگے (لہٰذا یہ ہدیئے ہم نہ لیں گے) تم (ان کو لے کر) ان لوگوں کے پاس لوٹ جاؤ (اگر وہ اب بھی ایمان لے آویں تو درست ورنہ) ہم ان پر ایسی فوجیں بھیجتے ہیں کہ ان لوگوں سے ان کا ذرا مقابلہ نہ ہو سکے گا اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل کرکے نکال دیں گے اور وہ (ذلت کیساتھ ہمیشہ کے لئے) ماتحت (اور رعایا) ہو جاویں گے (یہ نہیں کہ نکالنے کے بعد آزادی سے چھوڑ دیئے جاویں کہ جہاں چاہیں چلے جاویں بلکہ ہمیشہ کی ذلت ان کے لئے لازمی ہو جاوے گی)۔

معارف و مسائل

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ، کریم کے لفظی معنی معزز مکرم کے ہیں اور محاورہ میں کسی خط کو معزز مکرم جب کہا جاتا ہے جبکہ اُس پر مہر لگائی گئی ہو۔ اسی لئے اس آیت میں کِتٰبٌ كَرِيْمٌ کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ، قتادہؒ، زہیرؒ وغیرہ نے کتاب مختوم سے کی ہے جس

سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط پر اپنی مہر ثبت فرمائی تھی۔ ہمارے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو جب ملوکِ عجم کی یہ عادت معلوم ہوئی کہ جس خط پر مہر نہ ہو اُس کو نہیں پڑھتے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی بادشاہوں کے خطوط کے لئے مہر بنوائی اور قیصر و کسریٰ وغیرہ کو جو خطوط تحریر فرمائے اُن پر مہر ثبت فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خط پر مہر لگانا مکتوب الیہ کا بھی اکرام ہے اور اپنے خط کا بھی آجکل عادت خط کو لفافہ میں بند کر کے بھیجنے کی ہو گئی ہے یہ بھی مہر کے قائم مقام ہے۔ جس جگہ مکتوب الیہ کا اکرام منظور ہو، کھُلا خط بھیجنے کے بجائے لفافہ میں بند کر کے بھیجنا اقرب الی السنۃ ہے۔

حضرت سُلیمان علیہ السلام کا خط کس زبان میں تھا حضرت سلیمان علیہ السلام گو عربی نہ تھے لیکن عربی زبان جاننا اور سمجھنا آپ سے کوئی بعید بھی نہیں۔ جبکہ آپ پرندوں تک کی زبان جانتے تھے اور عربی زبان تو تمام زبانوں سے افضل و اشرف ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط عربی زبان میں لکھا ہو کیونکہ مکتوب الیہ (بلقیس) عربی النسل تھی اس نے خط کو پڑھا بھی اور سمجھا بھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط اپنی ہی زبان میں تحریر فرمایا ہو اور بلقیس کے پاس حضرت سلیمان علیہ السلام کی زبان کا ترجمان ہو جس نے پڑھ کر خط سُنایا اور سمجھایا ہو۔ (روح)

خط نویسی کے چند آداب اِنَّہٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّہٗ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، قرآن کریم نے انسانی زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جس پر ہدایات نہ دی ہوں۔ خط و کتابت اور مراسلت کے ذریعہ باہمی گفت و شنید بھی انسان کی اہم ضروریات میں داخل ہے۔ اس سورت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا مکتوب بنام ملکہ سبا (بلقیس) پُورا کا پُورا نقل فرمایا گیا۔ یہ ایک پیغمبر و رسول کا خط ہے اور قرآن کریم نے اس کو بطور استحسان کے نقل کیا ہے اسلئے اس خط میں جو ہدایات خط و کتابت کے معاملے میں پائی جاتی ہیں وہ مسلمانوں کے لئے بھی قابلِ اتباع ہیں۔

کاتب اپنا نام پہلے لکھے پھر مکتوب الیہ کا سب سے پہلی ایک ہدایت تو اس خط میں یہ ہے کہ خط کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے نام سے شروع کیا، مکتوب الیہ کا نام کس طرح لکھا قرآن کریم کے الفاظ میں وہ مذکور نہیں۔ مگر اتنی بات اس سے معلوم ہوئی کہ خط لکھنے والے کے لئے سُنتِ انبیاء یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنا نام لکھے جس میں بہت سے فوائد ہیں مثلاً خط پڑھنے سے پہلے ہی مکتوب الیہ کے علم میں آجائے کہ میں کس کا خط پڑھ رہا ہوں تاکہ وہ اُسی ماحول میں خط کے مضمون کو پڑھے اور غور کرے مخاطب کو یہ تکلیف نہ اُٹھانی پڑے کہ کاتب کا نام خط میں تلاش کرے کہ کس کا خط ہے کہاں سے آیا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے جتنے مکاتیب منقول اور شائع شدہ عالم میں موجود ہیں اُن سب میں بھی آپ نے یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے کہ (من محمد عبد اللہ و رسولہ) سے شروع فرمایا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب کوئی بڑا آدمی اپنے چھوٹے کو خط لکھے اسمیں تو اپنے

نام کی تقدیم پر کوئی اشکال نہیں، لیکن کوئی چھوٹا اپنے باپ، اُستاد، شیخ یا اور کسی بڑے کو خط لکھے اُسمیں اپنے نام کو مقدم کرنا کیا اسکے ادب کے خلاف نہ ہوگا اور اس کو ایسا کرنا چاہیئے یا نہیں؟ اس معاملے میں حضرات صحابہ کرام کا عمل مختلف رہا ہے اکثر حضرات نے تو اتباعِ سُنّتِ نبوی کو ادب پر مقدم رکھ کر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطوط لکھے اُن میں بھی اپنے نام کو مقدم لکھا ہے۔ رُوح المعانی میں بحر محیط کے حوالہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

ما کان احد اعظم حرمۃ من رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وکان اصحابہ اذا کتبوا الیہ کتابا بدأوا بانفسھم قلت وکتاب علاء الحضرمی یشھد لہ علی ما روی

رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو کوئی انسان قابلِ تعظیم نہیں، مگر صحابہ کرام جب آپ کو بھی خط لکھتے تو اپنا نام ہی شروع میں لکھا کرتے تھے اور حضرت علاء حضرمی کا خط جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نام معروف ہے وہ اس پر شاہد ہے۔

البتہ روح المعانی میں مذکورہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ سب کلام افضلیت میں ہے جواز میں نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنا نام شروع کے بجائے اخیر میں لکھدے تو یہ بھی جائز ہے۔ فقیہ ابواللیث کی بُستان میں ہے کہ اگر کوئی شخص مکتوب الیہ کے نام سے شروع کردے تو اسکے جواز میں کسی کو کلام نہیں کیونکہ اُمّت میں یہ طریقہ بھی چلا آرہا ہے اس پر نکیر نہیں کی گئی (روح المعانی و قرطبی)

خط کا جواب دینا بھی سُنّتِ انبیاء ہے | تفسیر قرطبی میں ہے کہ جس شخص کے پاس کسی کا خط آئے اُس کے لئے مناسب ہے کہ اُسکا جواب دے کیونکہ غائب کا خط حاضر کے سلام کے قائم مقام ہے اسی لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ وہ خط کے جواب کو جوابِ سلام کی طرح واجب قرار دیتے تھے (قرطبی)

خطوط میں بسم اللہ لکھنا | حضرت سلیمان علیہ السلام کے مذکورہ خط سے نیز رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام مکاتیب سے ایک مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ خط کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنا سنّتِ انبیاء ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ بسم اللہ کو اپنے نام سے پہلے لکھے یا بعد میں تو رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مکاتیب اس پر شاہد ہیں کہ بسم اللہ کو سب سے مقدم، اسکے بعد کاتب کا نام، پھر مکتوب الیہ کا نام لکھا جائے۔ اور قرآن کریم میں جو حضرت سُلیمان علیہ السلام کا نام پہلے اور بسم اللہ بعد میں مذکور ہے اسکے ظاہر سے جواز اسکا بھی معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ اپنے نام کے بعد لکھی جائے۔ لیکن ابن ابی حاتم نے یزید بن رومان سے نقل کیا ہے کہ دراصل حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خط میں اس طرح لکھا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من سلیمان بن داؤد الی بلقیس ابنۃ ذی شرح وقومھا۔ ان لا تعلوا الخ بلقیس نے جب یہ خط اپنی قوم کو سُنایا تو اُسنے قوم کی آگاہی کے لیے سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے ذکر کردیا، قرآنِ کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ بلقیس کا قول ہے قرآن کریم میں اس کی تصریح نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصل خط میں بسم اللہ مقدم تھی یا سلیمان علیہ السلام کا نام۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ

سلیمان علیہ السلام کا نام لفافہ کے اُوپر لکھا ہو اور اندر بسم اللہ سے شروع ہو، بلقیس نے جب اپنی قوم کو خط سنایا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے ذکر کر دیا۔

مسئلہ: خط نویسی کی اصل سنت تو یہی ہے کہ ہر خط کے شروع میں بسم اللہ لکھی جائے لیکن قرآن و سنت کے نصوص و اشارات سے حضرات فقہاء نے یہ کلیہ قاعدہ لکھا ہے کہ جس جگہ بسم اللہ یا اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لکھا جائے اگر اس جگہ اُس کاغذ کے بے ادبی سے محفوظ رکھنے کا کوئی اہتمام نہیں بلکہ وہ پڑھ کر ڈالدیا جاتا ہے تو ایسے خطوط اور ایسی چیز میں بسم اللہ یا اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لکھنا جائز نہیں کہ وہ اس طرح اس بے ادبی کے گناہ کا شریک ہو جائے گا۔ آجکل جو عموماً ایک دوسرے کو خطوط لکھے جاتے ہیں انکا حال سب جانتے ہیں کہ نالیوں اور گندگیوں میں پڑے نظر آتے ہیں، اس لئے مناسب یہ ہے کہ ادائے سنت کے لئے زبان سے بسم اللہ کہہ لے تحریر میں نہ لکھے۔

ایسی تحریر جس میں کوئی آیتِ قرآنی لکھی ہو، کیا کسی کافر مشرک کے ہاتھ میں دینا جائز ہے: یہ خط حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو اسوقت بھیجا جبکہ وہ مسلمان نہیں تھیں حالانکہ اس خط میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھا ہوا تھا جس سے معلوم ہوا کہ ایسا کرنا جائز ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط ملوک عجم کو لکھے ہیں اور وہ مشرک تھے، اُن میں بھی بعض آیاتِ قرآن لکھی ہیں۔ وجہ دراصل یہ ہے کہ قرآن کریم کا کسی کافر کے ہاتھ میں دینا تو جائز نہیں لیکن ایسی کوئی کتاب یا کاغذ جس میں کسی مضمون کے ضمن میں کوئی آیت آگئی ہے وہ عرف میں قرآن نہیں کہلاتا اسلئے اسکا حکم بھی قرآن کا حکم نہیں ہوگا وہ کسی کافر کے ہاتھ میں بھی دے سکتے ہیں اور بے وضو کے ہاتھ میں بھی (عالمگیری کتاب الحظر والاباحۃ)

خط مختصر، جامع، بلیغ اور مؤثر انداز میں لکھنا چاہئے: حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس والانامہ کو دیکھئے تو چند سطروں میں تمام اہم اور ضروری مضامین بھی جمع کر دیئے اور بلاغت کا اعلیٰ معیار بھی قائم ہے۔ کافر کے مقابلے میں اپنی شاہانہ شوکت کا اظہار بھی ہے۔ اسکے ساتھ حق تعالیٰ کی صفاتِ کمال کا بیان اور اسلام کی طرف دعوت بھی، اور ترفع و تکبر کی مذمت بھی۔ درحقیقت یہ خط بھی اعجاز قرآنی کا ایک نمونہ ہے۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ خط نویسی میں تمام انبیاء علیہم السلام کی سنّت بھی وہی ہے کہ تحریر میں طول نہو، مگر ضروری کوئی مضمون چھوٹے بھی نہیں۔ (روح المعانی)

اہم اُمور میں مشورہ کرنا سنت ہے اسمیں دوسروں کی رائے سے فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور لوگوں کی دلجوئی بھی ہوتی ہے: قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ، افتونی، فتویٰ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی خاص مسئلہ کا جواب دینا۔ یہاں مشورہ دینا اور اپنی رائے کا اظہار کرنا مُراد ہے۔ ملکہ بلقیس کو جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط پہنچا تو اُسنے اپنے ارکانِ حکومت کو جمع کر کے اس واقعہ کا اظہار کیا اور اُن سے مشورہ طلب کیا کہ مجھے کیا کرنا

چاہیئے۔ اس نے ان کی رائے دریافت کرنے سے پہلے اُن کی دلجوئی اور ہمت افزائی کے لئے یہ بھی کہا کہ میں کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہیں کرتی، اسی کا نتیجہ تھا کہ فوج اور وزراء نے اسکے جواب میں اپنی مستعدی کے ساتھ تعمیلِ حکم کے لئے ہر قسم کی قربانی پیش کردی (نَحْنُ أُولُوا قُوَّةٍ وَأُولُوا بَأْسٍ شَدِيدٍ وَالْأَمْرُ إِلَيْكِ) حضرت قتادہ نے فرمایا کہ ہم سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ بلقیس کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان تین سو تیرہ تھے اور انمیں سے ہر ایک آدمی دس ہزار آدمیوں کا امیر اور نمائندہ تھا۔ (قرطبی)

اس سے معلوم ہوا کہ اہم اُمور میں مشورہ لینے کا دستور پرانا ہے۔ اسلام نے مشورہ کو خاص اہمیت دی اور عمالِ حکومت کو مشورہ کا پابند کیا۔ یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو وحیِ الٰہی کے مورد تھے۔ اور آسمانی ہدایات آپ کو ملتی تھیں اس کی وجہ سے آپ کو کسی رائے مشورہ کی درحقیقت ضرورت نہ تھی، مگر اُمت کے لئے سُنت قائم کرنے کے واسطے آپ کو بھی حکم دیا گیا (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ) یعنی آپ اہم اُمور میں صحابۂ کرام سے مشورہ لیا کریں۔ اسمیں صحابۂ کرام کی دلجوئی اور عزت افزائی بھی ہے اور آئندہ آنے والے عمالِ حکومت کو اسکی تاکید بھی کہ مشورہ سے کام کیا کریں۔

مکتوبِ سلیمانی کے جواب میں ملکۂ بلقیس کا ردِ عمل ارباب حکومت کو مشورہ میں شریک کرکے ان کا تعاون حاصل کرلینے کے بعد ملکۂ بلقیس نے خود ہی ایک رائے قائم کی جسکا حاصل یہ تھا کہ وہ حضرت سلیمانؑ کا امتحان لے اور تحقیق کرے کہ وہ واقعی اللہ کے رسول اور نبی ہیں اور جو کچھ حکم دے رہے ہیں وہ اللہ کے احکام کی تعمیل ہے یا وہ ایک ملک گیری کے خواہشمند بادشاہ ہیں، اس امتحان سے اسکا مقصد یہ تھا کہ اگر واقعی وہ نبی و رسول ہیں تو انکے حکم کا اتباع کیا جائے اور مخالفت کی کوئی صورت اختیار نہ کی جائے اور اگر بادشاہ ہیں اور ملک گیری کی ہوس میں ہمیں اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں تو پھر غور کیا جائیگا کہ انکا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ اس امتحان کا طریقہ اُس نے یہ تجویز کیا کہ سلیمان علیہ السلام کے پاس کچھ ہدیے تحفے بھیجے اگر وہ ہدیے تحفے لیکر راضی ہوگئے تو علامت اس کی ہوگی کہ وہ ایک بادشاہ ہی ہیں، اور اگر وہ واقع میں نبی و رسول ہیں تو وہ اسلام و ایمان کے بغیر کسی چیز پر راضی نہ ہوں گے، یہ مضمون ابن جریر نے متعدد اسانید کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، ابن جُریجؒ، ابن وہبؒ سے نقل کیا ہے اسی کا بیان اس آیت میں ہے۔

وَإِنِّي مُرْسِلَةٌ إِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنَاظِرَةٌ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُونَ، یعنی میں حضرت سلیمان اور اُن کے ارکانِ دولت کے پاس ایک ہدیہ بھیجتی ہوں پھر دیکھوں گی کہ جو قاصد یہ ہدیہ لیکر جائیں گے وہ واپس آکر کیا صورتِ حال بیان کرتے ہیں۔

بلقیس کے قاصدوں کی دربارِ سلیمانی میں حاضری تاریخی اسرائیلی روایات میں بلقیس کی طرف سے آنیوالے قاصدوں اور تحفوں کی بڑی تفصیلات مذکور ہیں۔ اتنی بات پر سب روایات متفق ہیں کہ تحفہ میں

کچھ سونے کی اینٹیں تھیں کچھ جواہرات اور ایک سو غلام اور ایک سو کنیزیں تھیں مگر کنیزوں کو مردانہ لباس میں اور غلاموں کو زنانہ لباس میں بھیجا تھا اور ساتھ ہی بلقیس کا ایک خط بھی تھا جس میں سلیمانؑ کے امتحان کے لئے کچھ سوالات بھی تھے، تحفوں کے انتخاب میں بھی ان کا امتحان مطلوب تھا۔ حضرت سلیمانؑ کو حق تعالیٰ نے اسکے تحفوں کی تفصیلات اُن کے پہنچنے سے پہلے بتلادی تھیں۔ سلیمان علیہ السلام نے جنّات کو حکم دیا کہ دربار سے نو فرسخ تقریباً تیس میل کی مسافت میں سونے چاندی کی اینٹوں کا فرش کر دیا جائے اور راستہ میں دو طرفہ عجیب الخلقت جانوروں کو کھڑا کر دیا جائے جن کا بول و براز بھی سونے چاندی کے فرش پر ہو۔ اسی طرح اپنے دربار کو خاص اہتمام سے مزیّن فرمایا، دائیں بائیں چار چار ہزار سونے کی کرسیاں ایک طرف علماء کے لئے، دوسری طرف وزراء اور عمالِ سلطنت کے لئے بچھائی گئیں۔ جواہرات سے پورا ہال مزیّن کیا گیا۔ بلقیس کے قاصدوں نے جب سونے کی اینٹوں پر جانوروں کو کھڑا دیکھا تو اپنے تحفہ سے شرما گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ اپنی سونے کی اینٹیں وہیں ڈالدیں، پھر جُوں جُوں آگے بڑھتے گئے دو طرفہ وحوش و طیور کی صفیں دیکھیں، پھر جنّات کی صفیں دیکھیں تو بیحد مرعوب ہوگئے مگر جب دربار تک پہنچے اور حضرت سلیمانؑ کے سامنے حاضر ہوئے تو آپ خندہ پیشانی سے پیش آئے، اُن کی مہمانی کا اکرام کیا مگر اُن کے تحفے واپس کر دیئے اور بلقیس کے سب سوالات کے جوابات دیئے (ملخصاً از تفسیر قرطبی)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہدیۂ بلقیس کی واپسی

قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ، یعنی جب بلقیس کے قاصد اس کے ہدایا اور تحفے لیکر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچے تو انھوں نے قاصدوں سے فرمایا کہ کیا تم مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو۔ مجھے اللہ نے جو مال و دولت دیا ہے وہ تمھارے مال و سامان سے کہیں زیادہ بہتر ہے اسلئے میں یہ مال کا ہدیہ قبول نہیں کرتا اس کو واپس لیجاؤ اور اپنے ہدیہ پر تم ہی خوش رہو۔

کسی کافر کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے یا نہیں اس کی تفصیل وتحقیق

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کا ہدیہ قبول نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں یا بہتر نہیں — اور تحقیق اس مسئلے میں یہ ہے کہ کافر کا ہدیہ قبول کرنے میں اگر اپنی یا مسلمانوں کی کسی مصلحت میں خلل آتا ہو یا انکے حق میں رائے کی کمزوری پیدا ہوتی ہو تو انکا ہدیہ قبول کرنا درست نہیں۔ (روح المعانی) ہاں اگر کوئی دینی مصلحت اس ہدیہ کے قبول کرنے کی داعی ہو، مثلاً اسکے ذریعہ کافر کے مانوس ہو کر اسلام سے قریب آنے پھر مسلمان ہونے کی اُمید ہو یا اُسکے کسی شر و فساد کو اس کے ذریعہ دفع کیا جاسکتا ہو تو قبول کرنے کی گنجائش ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت اس معاملے میں یہی رہی ہے کہ بعض کفار کا ھدیہ قبول فرمالیا بعض کا رد کر دیا۔ عمدۃ القاری شرح بخاری کتاب الہبۃ میں اور شرح سیر کبیر میں حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ براء کا بھائی عامر بن ملک مدینہ طیبہ میں کسی ضرورت سے پہنچا

جبکہ وہ مشرک کافر تھا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو گھوڑے اور دو جوڑے کپڑے کا ہدیہ پیش کیا۔ آپ نے اسکا ہدیہ یہ فرما کر واپس کر دیا کہ ہم مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتے۔ اور عیاض بن حمار مجاشعی نے آپ کی خدمت میں ایک ہدیہ پیش کیا تو آپ نے اُس سے سوال کیا کہ تم مسلمان ہوئے اسنے کہا کہ نہیں آپ نے ان کا ہدیہ بھی یہ کہہ کر رَد فرما دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے عطایا لینے سے منع فرمایا ہے اس کے بالمقابل یہ روایات بھی موجود ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بعض مشرکین کے ہدایا قبول فرمائے۔ ایک روایت میں ہے کہ ابو سفیان نے بحالتِ شرک آپ کو ایک چمڑا ہدیہ میں بھیجا آپ نے قبول فرمالیا اور ایک نصرانی نے ایک ریشمی حریر کا بہت چمکتا ہوا کپڑا ہدیہ میں پیش کیا، آپ نے قبول فرمالیا۔

شمس الائمہ رح اس کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک سبب یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض کا ہدیہ رَد کر دینے میں اُسکے اسلام کی طرف مائل ہونے کی اُمید تھی وہاں رَد کر دیا اور بعض کا ہدیہ قبول کرنے میں اسکے مسلمان ہو جانے کی اُمید تھی تو قبول کر لیا۔ (از عمدۃ القاری کتاب الہبۃ)

اور بلقیس نے جو رد ہدیہ کو نبی ہونے کی علامت قرار دیا اسکا سبب یہ نہ تھا کہ نبی کے لئے ہدیہ قبول کرنا مشرک کا جائز نہیں بلکہ سبب یہ تھا کہ اُسنے اپنا ہدیہ درحقیقت ایک رشوت کی حیثیت سے بھیجا تھا کہ اسکے ذریعہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حملے سے محفوظ رہے۔

قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾

بولا اے دربار والو تم میں کوئی ہے کہ لے آوے میرے پاس اسکا تخت پہلے اس سے کہ وہ آئیں میرے پاس حکمبردار ہو کر

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ

بولا ایک دیو جنوں میں سے میں لائے دیتا ہوں وہ تجھ کو پہلے اس سے کہ تو اُٹھے اپنی جگہ سے

وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ

اور میں اس پر زور آور ہوں معتبر بولا وہ شخص جس کے پاس تھا ایک علم کتاب کا

اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا

میں لائے دیتا ہوں تیرے پاس اسکو پہلے اس سے کہ پھر آئے تیری طرف تیری آنکھ، پھر جب دیکھا اُسکو دھرا ہوا

عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ڜ لِيَبْلُوَنِيْۗ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ

اپنے پاس کہا یہ میرے رب کا فضل ہے میرے جانچنے کو کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری، اور جو

شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾ قَالَ

کوئی شکر کرے سو شکر کرے اپنے واسطے اور جو کوئی ناشکری کرے سو میرا رب بے پروا ہے کرم والا کہا

نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْۗ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾

روپ بدل دکھلاؤ اس عورت کے آگے اسکے تخت کا ہم دیکھیں سمجھ پاتی ہے یا ان لوگوں میں ہوتی ہے جن کو سمجھ نہیں

خلاصۂ تفسیر

(غرض وہ قاصد اپنے ہدایا لے کر واپس گیا اور سارا قصہ بلقیس سے بیان کیا تو حالات سے اسکو حضرت سلیمان علیہ السلام کے علم اور نبوت کے کمالات کا یقین ہو گیا اور حاضر ہونے کے ارادہ سے اپنے ملک سے چلی) سلیمان (علیہ السلام کو وحی سے یا اور کسی پرندے وغیرہ کے ذریعہ اسکا چلنا معلوم ہوا تو انھوں) نے (اپنے درباروالوں سے) فرمایا کہ اے درباروالو تم میں کوئی ایسا ہے جو اُس (بلقیس) کا تخت پہلے اس کے کہ وہ لوگ میرے پاس مطیع ہو کر آویں حاضر کر دے (مسلمین کی قید اظہار واقعہ کے لئے ہے کیونکہ وہ لوگ اسی قصد سے آ رہے تھے تخت کا منگانا غالباً اس غرض سے ہے کہ وہ لوگ میرا معجزہ بھی دیکھ لیں کیونکہ اتنا بڑا تخت اور پھر اسکا ایسے سخت پہروں میں اس طور پر اچانک آ جانا کہ اطلاع تک نہ ہو عادتِ بشریہ سے باہر ہے اگر جنوں کی تسخیر یعنی تابع ہونے سے ہو تب بھی جنوں کا خود بخود تابع ہو جانا بھی ایک معجزہ ہی ہے اور اگر کسی ولیِ اُمت کی کرامت کے ذریعہ ہے تو ولی کی کرامت بھی نبی کا معجزہ ہوتا ہے اور اگر بغیر کسی واسطہ کے ہے تو پھر معجزہ ہونا ظاہر ہے۔ بہرحال ہر طور پر یہ معجزہ اور نبوت کی دلیل ہے لہٰذا مقصود یہ ہوگا کہ اندرونی کمالات کیساتھ ساتھ یہ معجزہ کے کمالات بھی دیکھ لیں تاکہ ایمان واطمینان زیادہ ہو) ایک قوی ہیکل جن نے جواب (میں) عرض کیا کہ میں اس کو آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں گا پہلے اس کے کہ آپ اپنے اجلاس سے اٹھیں اور (گو وہ بہت بھاری ہے مگر) میں اس (کے لانے) پر طاقت رکھتا ہوں (اور گو بڑا قیمتی اور موتیوں سے مزیّن ہے مگر میں) امانت دار (بھی) ہوں (اس میں کوئی خیانت نہ کرونگا) جسکے پاس کتاب (الٰہی یعنی تورات کا یا اور وحی کی ہوئی کسی کتاب کا جس میں اللہ کے ناموں کی تاثیرات ہوں اُس) کا علم تھا (اقرب یہ ہے کہ اس سے خود سلیمان علیہ السلام مُراد ہیں غرض) اُس (علم والے) نے (اس جن سے) کہا کہ (بس تجھ میں تو اتنی ہی قوت ہے اور) میں اس کو تیرے سامنے تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے لا کر حاضر کر سکتا ہوں (کیونکہ معجزہ کی طاقت سے لاؤں گا، چنانچہ آپ نے حق تعالیٰ سے دُعا کی ویسے ہی یا کسی اسمِ الٰہی کے ذریعہ سے اور تخت فوراً سامنے آ موجود ہوا) جب سلیمان (علیہ السلام) نے اس کو اپنے روبرو رکھا دیکھا تو (خوش ہو کر شکر کے طور پر) کہنے لگے کہ یہ بھی میرے پروردگار کا ایک فضل ہے (کہ میرے ہاتھ سے یہ معجزہ ظاہر کیا) تاکہ وہ میری آزمائش کرے کہ میں شکر کرتا ہوں یا (خدانخواستہ) ناشکری کرتا ہوں اور ظاہر ہے کہ جو شخص شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لئے شکر کرتا ہے (اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع نہیں) اور (اسی طرح) جو ناشکری کرتا ہے (وہ بھی اپنا ہی نقصان کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) میرا رب غنی ہے کریم ہے (اس کے بعد) سلیمان (علیہ السلام) نے (بلقیس کی عقل آزمانے کے لئے) حکم دیا کہ اس (کی عقل آزمانے) کے

لیے اسکے تخت کی صورت بدل دو (جس کے بہت سے طریقے ہوسکتے ہیں مثلاً موتیوں کی جگہیں بدل دو یا کسی اور طرح) ہم دیکھیں اس کو اسکا پتہ لگتا ہے یا اُسکا اُنھیں میں شمار ہے جن کو (ایسی باتوں کا) پتہ نہیں لگتا (پہلی صورت میں معلوم ہوگا کہ وہ عقلمند ہے اور عقلمند سے حق بات سمجھنے کی زیادہ اُمید ہے اور اسکے حق کو پہچاننے کا اثر دُور تک بھی پہنچیگا اور دوسری صورتیں اس سے حق پہچاننے کی اُمید کم ہے)۔

معارف و مسائل

بلقیس کی حاضری دربارِ سلیمانی میں قرطبی نے تاریخی روایات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بلقیس کے قاصد خود بھی مرعوب و مبہوت ہو کر واپس ہوئے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا اعلانِ جنگ سُنا دیا تو بلقیس نے اپنی قوم سے کہا کہ پہلے بھی میرا یہی خیال تھا کہ سلیمان دُنیا کے بادشاہوں کی طرح بادشاہ نہیں بلکہ اللہ کیطرف سے کوئی خاص منصب بھی ان کو ملا ہے اور اللہ کے نبی و رسول سے لڑنا اللہ کا مقابلہ ہے، جس کی ہم میں طاقت نہیں۔ یہ کہہ کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضری کی تیاری شروع کر دی۔ بارہ ہزار سرداروں کو اپنے ساتھ لیا جن کے تحت ایک ایک لاکھ افواج تھیں[1] حضرت سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ایسا رعب و جلال عطا فرمایا تھا کہ اُن کی مجلس میں کوئی ابتداءً گفتگو کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ ایک روز حضرت سلیمان علیہ السلام نے دُور سے غبار اٹھتا ہوا دیکھا تو حاضرین سے سوال کیا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا: اے نبی اللہ! ملکہ بلقیس اپنے ساتھیوں کے ساتھ آرہی ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ اسوقت وہ دربارِ سُلیمانی سے ایک فرسخ یعنی تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھی۔ اُسوقت حضرت سُلیمان علیہ السلام نے اپنے جنود و عساکر کو مخاطب کر کے فرمایا:

يَاأَيُّهَا الْمَلَؤُا أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا قَبْلَ أَنْ يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ، حضرت سلیمان علیہ السلام کو چونکہ یہ اطلاع مل گئی تھی کہ بلقیس ان کی دعوت سے متاثر ہونے کی بناء پر مطیع بن کر آرہی ہے۔ تو ارادہ فرمایا کہ وہ شاہانہ قوت و شوکت کے ساتھ ایک پیغمبرانہ معجزہ بھی دیکھ لے تو اُس کے ایمان لانے کے لئے زیادہ معین ہوگا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے تسخیرِ جنات کا عام معجزہ عطا فرمایا ہوا تھا شاید حق تعالیٰ کیطرف سے اشارہ پاکر انھوں نے یہ ارادہ فرمایا کہ کسی طرح بلقیس کا تختِ شاہی اُسکے یہاں پہنچنے سے پہلے حاضر ہو جائے۔ اسلئے حاضرین کو جن میں جنات بھی تھے خطاب فرما کر یہ تخت لانے کیلئے فرمادیا اور اسکے تمام اموال و دولت میں تختِ شاہی کا انتخاب بھی شاید اسلئے کیا گیا کہ وہ اسکی سب سے زیادہ محفوظ چیز تھی جس کو سات محلاتِ شاہی کے وسط میں ایک محفوظ محل کے اندر مقفل کر کے رکھا تھا کہ اسکے اپنے آدمیوں کا بھی وہاں تک گزر نہ تھا۔ اُس کا بغیر دروازہ یا قفل توڑے ہوئے منتقل ہو جانا اور اتنی مسافتِ بعیدہ پر پہنچ جانا حق تعالیٰ

[1] حضرت مصنفؒ نے پہلے ہی فرمادیا ہے کہ یہ اسرائیلی روایات پ ۱۹ ہیں، جن پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، خاص طور سے یہ روایت بعید از عقل، اور علامہ آلوسیؒ کے فرمانے کے مطابق جھوٹ سے زیادہ قریب ہے۔ محمد تقی۔ ۱ر۱ر۲۳ھ

شانہٗ کی ہی قدرتِ کاملہ سے ہو سکتا ہے یہ اس کو حق تعالیٰ شانہٗ کی قدرت عظیمہ پر یقین کا سب سے بڑا ذریعہ ہو سکتا تھا اُس کیساتھ اس پر بھی یقین لازم تھا کہ سلیمان علیہ السلام کو حق تعالیٰ ہی کیطرف سے کوئی خاص منصب حاصل ہے کہ انکے ہاتھ پر ایسی خوارق العادت چیزیں ظاہر ہو جاتی ہیں (ذکرہ واختارہ ابن جریر)

قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ، مُسْلِمِيْنَ، مُسْلِم کی جمع ہے جس کے لغوی معنی مطیع و فرمانبردار کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں مؤمن کو مسلم کہا جاتا ہے یہاں بقول ابن عباسؓ اسکے لغوی معنے مراد ہیں، یعنی مطیع و فرمانبردار۔ کیونکہ ملکہ بلقیس کا اسلام لانا اسوقت ثابت نہیں بلکہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہونے اور کچھ گفتگو کر لینے کے بعد مسلمان ہوئی ہے جیسا کہ خود قرآن کریم کے آنیوالے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ، یعنی کہا اُس شخص نے جس کے پاس علم تھا کتاب میں سے یہ کون شخص تھا؟ اسکے متعلق ایک احتمال تو وہ ہی جو خلاصۂ تفسیر میں لکھا گیا ہے کہ خود حضرت سلیمان علیہ السلام مراد ہیں کیونکہ کتاب اللہ کا سب سے زیادہ علم انہیں کو حاصل تھا۔ اس صورت میں یہ سارا معاملہ بطور معجزہ کے ہوا اور یہی مقصود تھا کہ بلقیس کو پیغمبرانہ اعجاز کا مشاہدہ ہو جائے اور کوئی اشکال اس معاملے میں نہ رہے۔ مگر اکثر ائمۂ تفسیر قتادہ وغیرہ سے ابن جریر نے نقل کیا ہے اور قرطبی نے اسی کو جمہور کا قول قرار دیا ہے کہ یہ کوئی شخص حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھا۔ ابن اسحٰق نے اسکا نام آصف بن برخیا بتلایا ہے اور یہ کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا دوست تھا۔ اور بعض روایات کے اعتبار سے اُن کا خالہ زاد بھائی بھی تھا جس کو اسم اعظم کا علم تھا جسکا خاصہ یہ ہے کہ اسکے ساتھ اللہ تعالیٰ سے جو بھی دعا کیجائے قبول ہوتی ہے اور جو کچھ مانگا جائے اللہ کیطرف سے عطا کر دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اسم اعظم کا علم نہیں تھا کیونکہ یہ کچھ بعید نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مصلحت اسمیں دیکھی ہو کہ یہ عظیم کارنامہ ان کی اُمت کے کسی آدمی کے ذریعہ ظاہر ہو جس سے بلقیس پر اور زیادہ اثر پڑے اسلئے بجائے خود یہ عمل کرنے کے اپنے اصحاب کو خطاب فرمایا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ (کذا فی فصوص الحکم) اس صورت میں یہ واقعہ آصف بن برخیا کی کرامت ہوگی۔

معجزہ اور کرامت میں فرق

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح معجزہ میں اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا ہے وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى، اسی طرح کرامت میں بھی اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی کام ہو جاتا ہے۔ اور معجزہ اور کرامت دونوں خود صاحبِ معجزہ و کرامت کے اختیار میں بھی نہیں ہوتے۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایسا کوئی خارقِ عادت کام اگر کسی صاحبِ وحی نبی کے ہاتھ پر ہو تو معجزہ کہلاتا ہے غیر نبی کے ذریعہ اسکا ظہور ہو تو کرامت کہلاتی ہے اس واقعہ میں اگر یہ روایت صحیح ہے کہ یہ عمل حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں سے آصف

بن برخیا کے ذریعہ ہوا تو یہ اُن کی کرامت کہلائے گی اور ہر ولی کے کمالات چونکہ اُنکے رسُول پیغمبر کے کمالات کا عکس اور اُنہی سے مستفاد ہوتے ہیں اسلئے اُمت کے اولیاء اللہ کے ہاتھوں جتنی کرامتوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے یہ سب رسول کے معجزات میں شمار ہوتے ہیں۔

تخت بلقیس کا واقعہ کرامت تھی یا تصرف شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے اسکو آصف بن برخیا کا تصرف قرار دیا ہے۔ تصرف اصطلاح میں خیال و نظر کی طاقت استعمال کر کے حیرت انگیز کام صادر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کے لئے نبی یا ولی بلکہ مسلمان ہونا بھی شرط نہیں، وہ مسمریزم جیسا ایک عمل ہے۔ صوفیائے کرام نے اصلاح مریدین کے لئے کبھی کبھی اس کو استعمال کیا ہے۔ ابن عربی نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ تصرف کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اسلئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کام آصف بن برخیا سے لیا۔ مگر قرآن کریم نے اس تصرف کو عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ کا نتیجہ بتلایا ہے اس سے ترجیح اسکو ہی ہوتی ہے کہ کسی دُعا یا اسم اعظم کا اثر تھا جسکا تصرف سے کوئی واسطہ نہیں، وہ کرامت ہی کے مفہوم میں داخل ہے۔

رہا یہ شبہ کہ ان کا یہ کہنا کہ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ، یعنی میں یہ تخت آنکھ جھپکنے سے پہلے لادونگا۔ یہ علامت اس کی ہے کہ یہ کام اُن کے قصد و اختیار سے ہوا جو علامت تصرف کی ہے کیونکہ کرامت ولی کے اختیار میں نہیں ہوتی تو اسکا یہ جواب ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ اطلاع کر دی ہو کہ تم ارادہ کرو گے تو ہم یہ کام اتنی جلدی کر دیں گے۔ یہ تقریر حضرت سیدی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی ہے جو احکام القرآن میں سورۂ نمل کی تفسیر لکھنے کے وقت حضرت نے ارشاد فرمائی تھی۔ اور تصرف کی حقیقت اور اُسکے احکام پر حضرتؒ کا ایک مستقل رسالہ بنام التصرف عربی زبان میں تھا جسکا اُردو ترجمہ احقر نے لکھا تھا وہ جداگانہ شائع ہو چکا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا

پھر جب وہ آپہنچی کسی نے کہا کیا ایسا ہی ہے تیرا تخت بولی گویا یہ وہی ہے اور ہم کو معلوم

الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ

ہو چکا پہلے سے اور ہم ہو چکے حکم بردار اور روک دیا اس کو ان چیزوں سے جو

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾ قِيْلَ لَهَا

پوجتی تھی اللہ کے سوائے البتہ وہ تھی منکر لوگوں میں کسی نے کہا اس

ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ

عورت کو اندر چل محل میں پھر جب دیکھا اس کو خیال کیا کہ وہ پانی ہے گہرا اور کھولیں اپنی پنڈلیاں

قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ

کہا یہ تو ایک محل ہے جڑے ہوئے ہیں اسمیں شیشے بولی اے رب میں نے بُرا کیا ہے

تَفْسِیْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۴﴾

اپنی جان کا اور میں حکم بردار ہوئی ساتھ سلیمان کے اللہ کے آگے جو رب ہے سارے جہان کا

خلاصۂ تفسیر

(سلیمان علیہ السلام نے یہ سب سامان کر رکھا تھا، پھر بلقیس پہنچی) سو جب بلقیس آئی تو اس سے (تخت دکھاکر) کہا گیا (خواہ سلیمان علیہ السلام نے خود کہا ہو یا کسی سے کہلوایا ہو) کہ کیا تمہارا تخت ایسا ہی ہے؟ وہ کہنے لگی کہ ہاں ہے تو ویسا ہی (بلقیس سے اس طور پر اسلئے سوال کیا کہ ہیئت تو بدل دی گئی تھی اپنی اصل کے اعتبار سے تو وہی تخت تھا اور صورت وہ نہ تھی۔ اسلئے یوں نہیں کہا کہ کیا یہی تمہارا تخت ہے بلکہ یہ کہا کہ ایسا ہی تمہارا تخت ہے اور بلقیس اسکو پہچان گئی اور اسکے بدل دینے کو بھی سمجھ گئی اسلئے جواب بھی مطابق سوال کے دیا) اور (یہ بھی کہا کہ) ہم لوگوں کو تو اس واقعہ سے پہلے ہی (آپ کی نبوت کی) تحقیق ہو چکی ہے اور ہم (اسی وقت سے دل سے) مطیع ہو چکے ہیں (جب قاصد سے آپ کے کمالات معلوم ہوئے تھے اس معجزہ کی چنداں حاجت نہ تھی) اور (چونکہ اس معجزہ سے قبل تصدیق و اعتقاد کر لینا کمالِ عقل کی دلیل ہے اسلئے اللہ تعالیٰ اسکے عاقل ہونے کی تقریر فرماتے ہیں کہ فی الواقع وہ تھی سمجھدار مگر چند روز تک جو ایمان نہ لائی تو وجہ اسکی یہ ہے کہ) اس کو (ایمان لانے سے) غیر اللہ کی عبادت نے (جسکی اس کو عادت تھی) روک رکھا تھا (اور وہ عادت اسلئے پڑ گئی تھی کہ) وہ کافر قوم میں کی تھی (پس جو سب کو دیکھا وہی آپ کرنے لگی اور قومی عادات اکثر اوقات انسان کے سوچنے سمجھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں مگر چونکہ عاقل تھی اسلئے جب تنبیہ کی گئی تو سمجھ گئی۔ اسکے بعد سلیمان علیہ السلام نے یہ چاہا کہ علاوہ اعجاز و شانِ نبوت دکھلانے کے اس کو ظاہری شانِ سلطنت بھی دکھلا دی جائے تاکہ اپنے کو دنیا کے اعتبار سے بھی عظیم نہ سمجھے اسلئے ایک شیش محل بنواکر اسکے صحن میں حوض بنوایا اور اس میں پانی اور مچھلیاں بھر کر اسکو شیشہ سے پاٹ دیا۔ اور شیشہ ایسا شفاف تھا کہ ظاہر نظر میں نظر نہ آتا تھا اور وہ حوض ایسے موقع پر تھا کہ اس محل میں جانیوالے کو لامحالہ اُس پر سے عبور کرنا پڑے۔ چنانچہ اس تمام سامان کے بعد) بلقیس سے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو (ممکن ہے وہی محل قیام کے لئے تجویز کیا ہو، غرض وہ چلیں راہ میں حوض آیا) تو جب اسکا صحن دیکھا تو اس کو پانی (سے بھرا ہوا) سمجھا اور (چونکہ قرینہ سے پایاب گمان کیا اس لئے اسکے اندر گھسنے کے لئے دامن اُٹھائے اور) اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں (اسوقت) سلیمان (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ تو محل ہے جو (سب کا سب مع صحن) شیشوں سے بنایا گیا ہے (اور یہ حوض بھی شیشہ سے پٹا ہوا ہے۔ دامن اُٹھانے کی ضرورت نہیں اسوقت) بلقیس (کو معلوم ہو گیا کہ یہاں پر دنیوی صنعت کاری کے عجائب بھی ایسے ہیں جو آج تک میں نے آنکھ سے نہیں دیکھے تو اُن کے دل میں

ہر طرح سے سلیمان علیہ السلام کی عظمت پیدا ہوئی اور بے ساختہ) کہنے لگی کہ اے میرے پروردگار میں نے (ابتک) اپنے نفس پر ظلم کیا تھا (کہ شرک میں مبتلا تھی) اور میں (اب) سلیمان (علیہ السلام) کے ساتھ (یعنی ان کے طریق پر) ہو کر رب العالمین پر ایمان لائی۔

معارف و مسائل

کیا بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کے نکاح میں آگئی تھیں آیات مذکورہ میں بلقیس کا واقعہ اسی پر ختم ہو گیا کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہو کر مشرف باسلام ہو گئی۔ اسکے بعد کیا حالات پیش آئے؟ قرآن کریم نے اس سے سکوت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شخص نے جب عبداللہ ابن عیینہ سے پوچھا کہ کیا حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کے ساتھ نکاح کر لیا تھا تو اُنھوں نے فرمایا کہ اُسکا معاملہ اس پر ختم ہو گیا اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ مطلب یہ تھا کہ قرآن نے یہیں تک اسکا حال بیان کیا ہے اسکے بعد کا حال بتلانا قرآن نے چھوڑ دیا تو ہمیں بھی اسکی تفتیش میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ مگر ابن عساکر نے حضرت عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ اسکے بعد بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کے نکاح میں آگئی اور اسکو اسکے ملک پر برقرار رکھ کر یمن واپس بھیجدیا۔ ہر مہینے حضرت سلیمان علیہ السلام وہاں تشریف لیجاتے اور تین روز قیام فرماتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسکے لئے یمن میں تین عمدہ محلات ایسے تیار کرا دیئے تھے جس کی مثال و نظیر نہیں تھی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ

اور ہم نے بھیجا تھا ثمود کی طرف اُنکے بھائی صالح کو کہ بندگی کرو اللہ کی پھر وہ تو دو

فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ

فرقے ہو کر لگے جھگڑنے کہا اے میری قوم کیوں جلدی مانگتے ہو برائی کو پہلے

الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوا اطَّيَّرْنَا

بھلائی سے کیوں نہیں گناہ بخشواتے اللہ سے شاید تم پر رحم ہو جائے بولے ہم نے منحوس

بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾

قدم دیکھا تجھ کو اور تیرے ساتھ والوں کو کہا تمہاری بُری قسمت اللہ کے پاس ہے کچھ نہیں تم لوگ جانچے جاتے ہو

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا

اور تھے اُس شہر میں نو شخص کہ خرابی کرتے ملک میں اور

يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ

اصلاح نہ کرتے بولے کہ آپس میں قسم کھاؤ اللہ کی کہ البتہ رات کو جا پڑیں ہم اسپر اور اسکے گھر پر پھر کہدیں گے

لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا

اسکے دعویٰ کرنے والے کو ہم نے نہیں دیکھا جب تباہ ہوا اسکا گھر اور ہم بیشک سچ کہتے ہیں اور انھوں نے بنایا ایک

وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

فریب اور ہم نے بنایا ایک فریب اور اُن کو خبر نہ ہوئی پھر دیکھ لے کیسا ہوا انجام اُن کے

مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ

فریب کا کہ ہلاک کر ڈالا ہم نے اُن کو اور اُن کی قوم کو سب کو سو یہ پڑے ہیں اُن کے گھر

خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ

ڈھیر ہوئے بسبب اُن کے انکار کے البتہ اس میں نشانی ہے اُن لوگوں کے لئے جو جانتے ہیں اور

اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾

بچا دیا ہم نے اُن کو جو یقین لائے تھے اور بچتے رہے تھے

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (قوم) ثمود کے پاس انکے (برادری کے) بھائی صالح کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا (یہ پیغام دیکر) کہ تم (شرک کو چھوڑ کر) اللہ کی عبادت کرو (چاہیئے تو یہ تھا کہ سب ایمان لے آتے مگر خلاف توقع) اچانک ان میں دو فریق ہوگئے جو دین کے بارے میں باہم جھگڑنے لگے (یعنی ایک فرقہ تو ایمان لایا اور ایک نہ لایا اور ان میں جو جھگڑا اور کلام ہوا بعض اس میں کا سورۂ اعراف میں مذکور ہے قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا اور بعض آیت کا آگے مذکور ہے قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ الخ اور جب ان لوگوں نے کفر پر اصرار کیا تو صالح علیہ السلام نے موافق عادت انبیاء علیہم السلام کے ان کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا جیسا سورۂ اعراف میں ہے فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ، تو انھوں نے کہا کہ لاؤ وہ عذاب کہاں ہے جیسا سورۂ اعراف میں ہے قَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اس پر) صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اے بھائیو تم نیک کام (یعنی توبہ و ایمان) سے پہلے عذاب کیوں جلدی مانگتے ہو (یعنی چاہیئے تو یہ تھا کہ عذاب کی وعید سُن کر ایمان لے آتے نہ یہ کہ ایمان تو نہ لائے اور بالعکس اس عذاب ہی کی درخواست کرنے لگے بڑی بیباکی کی بات ہے۔ بجائے اس استعجالِ عذاب کے) تم لوگ اللہ کے سامنے (کفر سے) معافی کیوں نہیں چاہتے جس سے توقع ہو کہ تم پر رحم کیا جاوے (یعنی عذاب سے محفوظ رہو) وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم تو تم کو اور تمہارے ساتھ والوں کو منحوس سمجھتے ہیں (کہ جب سے تمنے یہ مذہب نکالا ہے اور تمہاری یہ جماعت پیدا ہوئی ہے قوم میں نااتفاقی ہوگئی اور نااتفاقی کی جو مضرتیں اور خرابیاں ہوتی ہیں وہ سب مرتب ہونے لگیں بس سبب ان تمام خرابیوں کے تم لوگ ہو) صالح (علیہ السلام)

نے (جواب میں) فرمایا کہ تمہاری (اس) نحوست (کا سبب) اللہ کے علم میں ہے (یعنی تمہارا اعمال کفریہ اللہ کو معلوم ہیں یہ خرابیاں ان ہی اعمال پر مرتب ہیں چنانچہ ظاہر ہے کہ نا اتفاقی مذموم وہی ہے جو حق کے خلاف کرنے سے ہو تو اسکا الزام ایمان والوں پر نہیں ہو سکتا بلکہ اہل کفر پر ہوگا۔ اور بعض تفاسیر میں ہے کہ ان پر قحط ہوا تھا اور تمہارے کفر کی مضرت کچھ ان شرور ہی تک ختم نہیں ہوئی) بلکہ تم وہ لوگ ہو کہ (اس کفر کی بدولت) عذاب میں مبتلا ہوگئے اور (یوں تو کافر اس قوم میں بہت تھے لیکن سرغنہ) اس بستی (یعنی حجر) میں نو شخص تھے جو سرزمین (یعنی بستی سے باہر تک بھی) فساد کیا کرتے تھے اور (ذرا) اصلاح نہ کرتے تھے (یعنی بعضے مفسد ایسے ہوتے ہیں کہ کچھ فساد کیا کچھ اصلاح کرلی مگر وہ ایسے نہ تھے بلکہ خالص مفسد تھے چنانچہ ایک بار یہ فساد کیا کہ) انہوں نے (ایک دوسرے سے) کہا کہ آپس میں سب (اس پر) اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم شب کے وقت صالح اور ان کے متعلقین (یعنی ایمان والوں) کو جا ماریں گے پھر (اگر تحقیق کی نوبت آئی تو) ہم ان کے وارث سے (جو خون کا دعویٰ کریگا) کہدیں گے کہ ان کے متعلقین کے (اور خود ان کے) مارے جانے میں موجود (بھی) نہ تھے (مارنا تو درکنار) اور (تاکید کے لئے یہ بھی کہدیں گے کہ) ہم بالکل سچے ہیں۔ (اور گواہ کوئی معائنہ کا ہوگا نہیں۔ بس بات دب دبا جاوے گی) اور (یہ مشورہ کرکے) انہوں نے ایک خفیہ تدبیر کی (کہ شب کے وقت اس کارروائی کے لئے چلے) اور ایک خفیہ تدبیر ہمنے کی اور ان کو خبر بھی نہ ہوئی (وہ یہ کہ ایک پہاڑ پر سے ایک پتھر ان پر لڑھک آیا اور وہ سب وہاں ہی کھیت رہے یعنی ہلاک ہوئے۔ کذا فی الدر المنثور) سو دیکھئے انکی شرارت کا کیا انجام ہوا کہ ہم نے ان کو (بطریق مذکور) اور (پھر) ان کی (باقی) قوم کو (آسمانی عذاب سے) سب کو غارت کر دیا (جسکا قصہ دوسری آیات میں ہے فَعَقَرُوا النَّاقَةَ الی فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ وَاَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ) سو یہ انکے گھر ہیں جو ویران پڑے ہیں انکے کفر کے سبب سے (جو اہل مکہ کو ملک شام کے سفر میں ملتے ہیں) بلاشبہ اس (واقعہ) میں بڑی عبرت ہے دانشمندوں کے لئے اور ہم نے ایمان اور تقویٰ والوں کو (اس قتل سے بھی جسکا مشورہ ہوا تھا اور عذاب قہری سے بھی) نجات دی۔

معارف و مسائل

تِسْعَةُ رَهْطٍ لفظ رهط، جماعت کے معنے میں آتا ہے، یہاں نو اشخاص میں سے ہر شخص کو رهط کے لفظ سے شاید اسلئے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنے مال و دولت اور جاہ و حشم کے سبب قوم کے بڑے مانے جاتے تھے اور ہر ایک کیساتھ الگ الگ جماعتیں تھیں اس لئے ان نو آدمیوں کو نو جماعتیں فرمایا۔ یہ لوگ قوم صالح علیہ السلام کی بستی یعنی حجر کے بڑے مانے جاتے تھے۔ حجر ملک شام میں معروف مقام ہے۔ لَنُبَیِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِیِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ،

مطلب یہ تھا کہ ہم سب مل کر رات کے اندھیرے میں ان پر اور ان کے متعلقین پر چھاپہ ماریں، سب کو ہلاک کر دیں، پھر انکے خون کا دعویدار وارث تحقیق و تفتیش کے لئے کھڑا ہوگا تو ہم یہ کہدیں گے کہ ہم نے تو فلاں آدمی کو نہ مارا، نہ مارتے کسی کو دیکھا۔ اور ہم اپنے اس قول میں اسلئے سچے ہونگے کہ رات کے اندھیرے میں یہ تعیین کہ کس نے کس کو مارا ہمیں معلوم نہیں ہوگی۔

اس میں ایک بات یہ قابلِ نظر ہے کہ یہ کفار اور ان میں سے بھی چیدہ بدمعاش جو فساد میں معروف تھے یہ سارے کام شرک کفر اور قتل و غارتگری کے کر رہے ہیں اور کوئی فکر نہیں، مگر ان کو بھی یہ فکر لاحق ہوئی کہ ہم جھوٹ نہ بولیں یا جھوٹے قرار نہ دیئے جاویں۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ جھوٹ کیسا بڑا گناہ ہے کہ سارے بڑے بڑے جرائم کے مرتکب بھی اپنی شرافتِ نفس اور عزت کی حفاظت کے لئے جھوٹ بولنے پر اقدام نہ کرتے تھے۔ دوسری بات اس آیت میں یہ قابلِ غور ہے کہ جس شخص کو ان لوگوں نے حضرت صالح علیہ السلام کا ولی قرار دیا ہے وہ تو انہی اہلِ صالح میں شامل تھا اس کو قتل کے ارادہ سے کیوں چھوڑ دیا۔ جواب یہ ہے کہ ممکن ہے وہ ولی خاندانی اعتبار سے ولی ہو مگر کافر ہو کافروں کیساتھ ملا ہوا ہو صالح علیہ السلام اور اُن کے متعلقین کے قتل کے بعد وہ ان کے خون کا دعویٰ اپنے نسبی تعلق کی بناء پر کرے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہی ہو مگر کوئی بڑا آدمی ہو جس کے قتل کرنے سے اپنی قوم میں اختلاف و انتشار کا خطرہ ہو اسلئے اسکو چھوڑ دیا۔ واللہ اعلم

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور لُوط کو جب کہا اس نے اپنی قوم کو کیا تم کرتے ہو بے حیائی اور تم دیکھتے ہو

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ

کیا تم دوڑتے ہو مردوں پر للچاکر عورتوں کو چھوڑ کر کوئی نہیں تم لوگ

تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا

بے سمجھ ہو پھر اور کچھ جواب نہ تھا اس کی قوم کا مگر یہی کہ کہتے تھے نکال دو

اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ

لُوط کے گھر کو اپنے شہر سے یہ لوگ ہیں ستھرے رہا چاہتے پھر بچادیا ہم نے اسکو اور

اَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۡ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ

اسکے گھر والوں کو مگر اس کی عورت مقرر کر دیا تھا ہم نے اسکو رہ جانے والوں میں اور برسادیا ہم نے اُن پر

مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۵۸﴾ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ

برساؤ پھر کیا بُرا برساؤ تھا اُن ڈرائے ہوؤں کا تو کہہ تعریف ہے اللہ کو اور سلام ہے

عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾

اس کے بندوں پر جن کو اس نے پسند کیا بھلا اللہ بہتر ہے یا جن کو وہ شریک کرتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو (پیغمبر کرکے ان کی قوم کے پاس) بھیجا تھا جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے فرمایا کیا تم یہ بے حیائی کا کام کرتے ہو حالانکہ سمجھدار ہو (کیا اس کی برائی نہیں سمجھتے، آگے اس بے حیائی کا بیان ہے یعنی) کیا تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر (اس کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی) بلکہ (اس معاملے میں) تم (محض) جہالت کر رہے ہو (اس تقریر کا) ان کی قوم سے کوئی (معقول) جواب نہ بن پڑا بجز اسکے کہ آپس میں کہنے لگے کہ لوط (علیہ السلام) کے لوگوں کو (یعنی ان پر ایمان لانیوالوں کو مع ان کے) تم اپنی بستی سے نکالدو (کیونکہ) یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں سو (جب یہاں تک نوبت پہنچ گئی تو) ہمنے (اس قوم پر عذاب نازل کیا اور) لوط (علیہ السلام) کو اور ان کے متعلقین کو (اس عذاب سے) بچالیا بجز ان کی بیوی کے کہ اس کو (بوجہ ایمان نہ لانیکے) ہمنے انہیں لوگوں میں تجویز کر رکھا تھا جو عذاب میں رہ گئے تھے اور (وہ عذاب جو ان پر نازل ہوا یہ تھا کہ) ہم نے ان پر ایک نئی طرح کا مینھ برسایا (کہ وہ پتھروں کی بارش تھی) سو ان لوگوں کا کیسا برا مینھ تھا جو (اول عذاب خدا سے) ڈرائے گئے تھے (جس پر انہوں نے التفات نہ کیا) آپ (بیان توحید کے لئے بطور خطبہ کے) کہئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے سزاوار ہیں اور اس کے ان بندوں پر سلام (نازل) ہو جن کو اس نے منتخب فرمایا ہے (یعنی انبیاء و صلحاء۔ آگے مضمون ہماری طرف سے بیان کیجئے وہ یہ کہ لوگو یہ بتلاؤ کہ) آیا (کمالات اور احسانات میں) اللہ بہتر ہے یا وہ چیزیں (بہتر ہیں) جن کو (الوہیت میں) شریک ٹھہراتے ہیں (یعنی ظاہر اور مسلم ہے کہ اللہ ہی بہتر ہے پس مستحق عبادت بھی وہی ہوگا)۔

معارف و مسائل

اس قصّے کے متعلق قرآن میں متعدد جگہ خصوصاً سورۂ اعراف میں ضروری مضامین بیان ہو چکے ہیں وہاں دیکھ لئے جاویں۔ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ، انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کے کچھ حالات اور ان پر عذاب آنے کے واقعات کا ذکر کرنے کے بعد یہ جملہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ آپ کی امت کو دنیا کے عذاب عام سے مامون کر دیا گیا ہے۔ اور انبیاء سابقین اور اللہ کے برگزیدہ بندوں پر سلام بھیجئے، جمہور مفسرین نے اسی کو اختیار کیا ہے اور بعض نے اسکا مخاطب بھی حضرت لوط علیہ السلام کو قرار دیا ہے۔ اس آیت میں اَلَّذِیْنَ اصْطَفٰی کے الفاظ سے ظاہر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام مراد ہیں جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ اور حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت میں ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ صلے اللہ علیہ کے صحابہ کرام ہیں، سفیان ثوری نے اسی کو اختیار کیا ہے (اخرجہ عبد بن حمید والبزار وابن جریر وغیرہم)

اگر آیت میں اَلَّذِیْنَ اصْطَفٰی سے مراد صحابۂ کرام لئے جائیں جیسا کہ ابن عباسؓ کی روایت میں ہے تو اس آیت سے غیر انبیاء پر سلام بھیجنے کے لئے اُنھیں علیہ السلام کہنے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کی پوری تحقیق سورۂ احزاب میں آیت صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا کی تفسیر میں آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ: اس آیت سے خطبہ کے آداب بھی ثابت ہوئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور انبیاء علیہم السلام پر درود و سلام سے شروع ہونا چاہیے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے تمام خطبات میں یہی معمول رہا ہے بلکہ ہر اہم کام کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام مسنون و مستحب ہے (کذا فی الروح)۔

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَأَنْۢبَتْنَا

بھلا کس نے بنائے آسمان اور زمین اور اُتار دیا تمھارے واسطے آسمان سے پانی پھر اُگائے ہم نے

بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ

اس سے باغ رونق والے تمھارا کام نہ تھا کہ اُگاتے اُن کے درخت اب کوئی اور

مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا

حاکم ہے اللہ کے ساتھ، کوئی نہیں وہ لوگ راہ سے مڑتے ہیں بھلا کس نے بنایا زمین کو ٹھہرنے کے لائق

وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ أَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ

اور بنائیں اسکے بیچ میں ندیاں اور رکھے اس کے ٹھہرانے کو بوجھ اور رکھا دو

الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾

دریا میں پردہ اب کوئی اور حاکم ہے اللہ کے ساتھ کوئی نہیں بہتوں کو ان میں سمجھ نہیں

أَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ

بھلا کون پہنچتا ہے بے کس کی پکار کو جب اسکو پکارتا ہے اور دُور کر دیتا ہے سختی اور کرتا ہے تمکو نائب

خُلَفَآءَ الْأَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ أَمَّنْ

اگلوں کا زمین پر اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ تم بہت کم دھیان کرتے ہو بھلا کون

يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ

راہ بتاتا ہے تم کو اندھیروں میں جنگل کے اور دریا کے اور کون چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانے والیاں اسکی

يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾ أَمَّنْ

رحمت سے پہلے اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ اللہ بہت اوپر ہے اس سے جسکو شریک بتلاتے ہیں بھلا

يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ

کون سرے سے بناتا ہے پھر اس کو دہرائے گا اور کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے اور زمین سے

ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶۴﴾

اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ تو کہہ لاؤ اپنی سند اگر تم سچے ہو

خلاصۂ تفسیر

(پچھلی آیت کے آخر میں فرمایا تھا آللّٰہُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِکُوْنَ، یعنی کیا اللہ بہتر ہے یا وہ بُت وغیرہ جن کو یہ لوگ اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں، یہ مشرکین کی بے وقوفی بلکہ کج فہمی پر نکیر تھی، آگے توحید کے دلائل کا بیان ہے، اے لوگو یہ بتلاؤ کہ) وہ ذات (بہتر ہے) جس نے آسمان اور زمین کو بنایا، اور اُس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اسکے ذریعہ ہم نے رونق دار باغ اُگائے (ورنہ) تم سے تو ممکن نہ تھا کہ تم اُن (باغوں) کے درختوں کو اُگا سکو (یہ سُنکر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (شریک عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (مگر مشرکین پھر بھی نہیں مانتے) بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ (دوسروں کو خدا کی برابر ٹھہراتے ہیں (اچھا پھر اور کمالات سُنکر بتلاؤ کہ یہ بُت بہتر ہیں) یا وہ ذات جس نے زمین کو (مخلوق کی) قرارگاہ بنایا اور اسکے درمیان درمیان نہریں بنائیں اور اس (زمین) کے (ٹھہرانے کے لئے پہاڑ بنائے اور دو دریاؤں کے درمیان حدِ فاصل بنائی (جیسا سورۂ فرقان میں مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ آچکا ہے یہ سُن کر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (خدائی کا شریک ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (مگر مشرکین نہیں مانتے) بلکہ اُن میں زیادہ تو (اچھی طرح) سمجھتے بھی نہیں (اچھا پھر اور کمالات سُنکر بتلاؤ کہ یہ بُت بہتر ہیں) یا وہ ذات جو بیقرار آدمی کی دُعا سنتا ہے جب وہ اُس کو پکارتا ہے اور (اُس کی) مصیبت کو دُور کر دیتا ہے اور تم کو زمین میں صاحب تصرف بناتا ہے (یہ سُنکر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (شریکِ عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (مگر) تم لوگ بہت ہی کم یاد رکھتے ہو (اچھا پھر اور کمالات سُنکر بتلاؤ کہ یہ بُت بہتر ہیں) یا وہ ذات جو تم کو خشکی اور دریا کی تاریکیوں میں رستہ سُوجھاتا ہے اور جو ہواؤں کو بارش سے پہلے بھیجتا ہے جو (بارش کی اُمید دلا کر دلوں کو) خوش کر دیتی ہیں (یہ سُنکر اب بتلاؤ) کیا اللہ کے ساتھ (شریکِ عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (ہرگز نہیں) بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے برتر ہے (اچھا پھر دوسرے کمالات و احسانات سُنکر بتلاؤ کہ یہ بُت بہتر ہیں) یا وہ ذات جو مخلوقات کو اوّل بار پیدا کرتا ہے پھر اس کو دوبارہ پیدا کر دیگا اور جو آسمان اور زمین سے (پانی برسا کر اور نباتات نکالکر) تم کو رزق دیتا ہے (یہ سُنکر اب بتلاؤ کہ) کیا اللہ کے ساتھ (شریکِ عبادت ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (اور اگر وہ یہ سُنکر بھی کہیں کہ ہاں اور معبود بھی مستحقِ عبادت ہیں تو) آپ کہئیے کہ (اچھا) تم (اُن کے استحقاقِ عبادت پر) اپنی دلیل پیش کرو اگر تم (اس دعویٰ میں) سچے ہو۔

معارف و مسائل

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ، اَلْمُضْطَرّ، اضطرار سے مشتق ہے کسی ضرورت سے مجبور و بے قرار ہونے کو اضطرار کہا جاتا ہے اور وہ جبھی ہوتا ہے جب اس کا کوئی یار و مددگار اور سہارا نہ ہو۔ اسلئے مضطر وہ شخص ہے جو سب دُنیا کے سہاروں سے مایوس ہو کر خالص اللہ تعالیٰ ہی کو فریاد رس سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہو۔ مضطر کی یہ تفسیر سُدی، ذوالنون مصری، سہل بن عبداللہ وغیرہ سے منقول ہے (قرطبی) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے لئے ان الفاظ سے دُعا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُوْا فَلَا تَكِلْنِیْٓ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَیْنٍ وَاَصْلِحْ لِیْ شَاْنِیْ كُلَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ (ترجمہ) یا اللہ میں تیری رحمت کا اُمیدوار ہوں اسلئے مجھے ایک لحظہ کے لئے بھی میرے اپنے نفس کے حوالہ نہ کیجئے اور آپ ہی میرے سب کاموں کو درست کر دیجئے آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (قرطبی)

مضطر کی دُعا اخلاص کی بنا پر ضرور قبول ہوتی ہے امام قرطبی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مضطر کی دُعا قبول کرنے کا ذمہ لے لیا ہے اور اس آیت میں اس کا اعلان بھی فرما دیا ہے جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ دُنیا کے سب سہاروں سے مایوس اور علائق سے منقطع ہو کر صرف اللہ تعالیٰ ہی کو کارساز سمجھ کر دُعا کرنا سرمایۂ اخلاص ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اخلاص کا بڑا درجہ ہے وہ جس کسی بندہ سے پایا جائے وہ مؤمن ہو یا کافر، اور متقی ہو یا فاسق فاجر اسکے اخلاص کی برکت سے اسکی طرف رحمتِ حق متوجہ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے کفار کا حال ذکر فرمایا ہے کہ جب یہ لوگ دریا میں ہوتے ہیں اور کشتی سب طرف سے موجوں کی لپیٹ میں آ جاتی ہے اور یہ گویا آنکھوں کے سامنے اپنی موت کو کھڑا دیکھ لیتے ہیں اس وقت یہ لوگ پورے اخلاص کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں کہ اگر ہمیں اس مصیبت سے آپ نجات دیدیں تو ہم شکر گزار ہونگے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ ان کی دُعا قبول کر کے خشکی پر لے آتے ہیں تو یہ پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (الیٰ قولہ) فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ، ایک صحیح حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین دُعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں جن میں کسی شک کی گنجائش نہیں، ایک مظلوم کی دُعا، دوسرے مسافر کی دُعا، تیسرے باپ جو اپنی اولاد کے لئے بد دُعا کرے۔ قرطبی نے اس حدیث کو نقل کر کے فرمایا کہ ان تینوں دُعاؤں میں بھی وہی صورت ہے جو دُعائے مضطر میں اوپر لکھی گئی ہے کہ جب کوئی مظلوم دُنیا کے سہاروں اور مددگاروں سے مایوس ہو کر دفع ظلم کے لئے اللہ کو پکارتا ہے وہ بھی مضطر ہی ہوتا ہے اسی طرح مسافر حالتِ سفر میں اپنے خویش و عزیز اور ہمدردوں غمگساروں سے الگ بے سہارا ہوتا ہے۔ اسی طرح باپ اولاد کے لئے اپنی فطرت اور پدری شفقت کی بنا پر کبھی بد دعا نہیں کر سکتا بجز اسکے کہ اسکا

دل بالکل ٹوٹ جائے اور اپنے آپ کو مصیبت سے بچانے کے لئے اللہ کو پکارے۔ امام حدیث آجری نے حضرت ابوذر رضؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ میں مظلوم کی دعا کو کبھی رد نہیں کرونگا اگرچہ وہ کسی کافر کے منھ سے ہو (قرطبی) اگر کسی مضطر یا مظلوم یا مسافر وغیرہ کو کبھی یہ محسوس ہو کہ اسکی دعا قبول نہیں ہوئی تو بدگمان اور مایوس نہ ہو بعض اوقات دعا قبول تو ہو جاتی ہے مگر کسی حکمت و مصلحت ربانی سے اسکا ظہور دیر میں ہوتا ہے۔ یا پھر وہ اپنے نفس کو ٹٹولے کہ اسکے اخلاص اور توجہ الی اللہ میں کمی کوتاہی رہی ہے۔ واللہ اعلم

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَ

تو کہہ خبر نہیں رکھتا جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں چھپی ہوئی چیز کی مگر اللہ اور

مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٦٥﴾ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۣ

ان کو خبر نہیں کب جلائے جائیں گے بلکہ تھک کر رہ گیا ان کا فکر آخرت کے بارے میں

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۣ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ

بلکہ ان کو شبہ ہے اس میں بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں اور بولے وہ لوگ جو

كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَاۗؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿٦٧﴾ لَقَدْ

منکر ہیں کیا جب ہم ہو جائیں مٹی اور ہمارے باپ دادے کیا ہم کو زمین سے نکالیں گے وعدہ

وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ

پہنچ چکا ہے اسکا ہم کو اور ہمارے باپ دادوں کو پہلے سے کچھ بھی نہیں یہ نقلیں ہیں

الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

اگلوں کی تو کہدے پھرو ملک میں تو دیکھو کیسا ہوا انجام کار

الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٦٩﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا

گناہگاروں کا اور غم نہ کر ان پر اور نہ خفا ہو ان کے فریب

يَمْكُرُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٧١﴾

بنانے سے اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو

قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَ

تو کہہ کیا بعید ہے جو تمہاری پیٹھ پر پہنچ چکی ہو بعضی وہ چیز جس کی جلدی کر رہے ہو اور

اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٧٣﴾

تیرا رب تو فضل رکھتا ہے لوگوں پر پر ان میں بہت لوگ شکر نہیں کرتے

وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٤﴾ وَمَا مِنْ

اور تیرا رب جانتا ہے جو چھپ رہا ہے ان کے سینوں میں اور جو کچھ کہ ظاہر کرتے ہیں اور کوئی چیز

غَآئِبَةٍ فِى السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٧٥﴾

نہیں جو غائب ہو آسمان اور زمین میں مگر موجود ہے کھلی کتاب میں

خُلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات اوپر نبوت کے بعد توحید کا ذکر ہو چکا، آگے معاد یعنی قیامت اور آخرت کا ذکر ہے جس کی طرف دلائل توحید میں اس قول سے اجمالی اشارہ بھی ہوا ہے (ثُمَّ يُعِيْدُهٗ) اور چونکہ کفار اس کی تکذیب کی ایک وجہ یہ بھی قرار دیتے تھے کہ قیامت کا معین وقت پوچھنے پر بھی نہیں بتلایا جاتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ یعنی وہ عدم تعیین کو عدم وقوع کی دلیل بناتے تھے اسلئے اس مضمون کو اس بات سے شروع کیا ہے کہ علم غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے فرمایا قُلْ لَّا يَعْلَمُ الخ (جس میں ان کے شبہ کا جواب بھی ہو گیا) قیامت کی تعیین کا علم اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ پھر ان کے شک و انکار پر تشنیع ہے (بَلِ ادّٰرَكَ) پھر ان کے ایک انکاری قول کی نقل ہے (وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا) پھر اس انکار پر تہدید ہے (قُلْ سِيْرُوْا) پھر اس انکار پر آپ کی تسلی ہے وَلَا تَحْزَنْ پھر اس تہدید کے متعلق انکے ایک شبہ کا جواب ہے (وَيَقُوْلُوْنَ الخ) پھر تہدید کی تاکید ہے وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ الخ جیسا تقریر ترجمہ سے ظاہر ہوگا۔

(یہ لوگ جو قیامت کا وقت نہ بتلانے سے اسکے عدم وقوع پر استدلال کرتے ہیں اسکے جواب میں) آپ کہہ دیجئے کہ (یہ استدلال غلط ہے کیونکہ اس سے زیادہ سے زیادہ اتنا لازم آیا کہ مجھ سے اور تم سے اس تعیین کا علم غائب رہا سو اس میں اسی کی کیا تخصیص ہے غیب کی نسبت تو قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ) جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین (یعنی عالم) میں موجود ہیں (ان میں سے) کوئی بھی غیب کی بات نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے اور (اسی وجہ سے) ان (مخلوقات) کو یہ خبر (بھی) نہیں کہ وہ کب دوبارہ زندہ کئے جاویں گے (یعنی اللہ تعالیٰ کو تو بے بتلائے سب معلوم ہے اور کسی کو بے بتلائے کچھ بھی معلوم نہیں مگر دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے امور جن کا پہلے سے علم نہیں ہوتا واقع ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کا علم نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز موجود ہی نہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی حکمت سے بعض علوم کا پردہ غیب میں رکھنا منظور ہے قیامت کی تعیین بھی انہی امور میں ہے اسی لئے مخلوق کو اسکا علم نہیں دیا گیا مگر اس سے عدم وقوع کیسے لازم آگیا اور یہ عدم علم بالتعیین تو سب میں امر مشترک ہے لیکن ان کفار منکرین میں صرف یہی نہیں کہ وہ بالتعیین قیامت

کو نہیں مانتے) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ) آخرت کے بارے میں (خود) ان کا (نفس) علم (بالوقوع ہی) نیست ہوگیا (یعنی خود اس کے وقوع ہی کا علم نہیں جو تعیین کے علم نہ ہونے سے بھی اشد ہے) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) یہ لوگ اس (کے وقوع) سے شک میں ہیں، بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) یہ اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں (یعنی جیسے اندھے کو راستہ نظر نہیں آتا اسلئے مقصود تک پہنچنا مستبعد ہے اسی طرح تصدیق بالآخرت کا جو ذریعہ ہے یعنی دلائلِ صحیحہ یہ لوگ انتہائی عناد کیوجہ سے ان دلائل میں غور و تأمل ہی نہیں کرتے اس لئے وہ دلائل ان کو نظر نہیں آتے جس سے مطلوب تک پہنچ جانے کی اُمید ہوتی۔ پس یہ شک سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ شک والا بعض اوقات دلائل میں نظر کرکے رفع شک کرلیتا ہے اور یہ نظر بھی نہیں کرتے) اور (اس تشنیع علی الکفار کے بعد آگے ان کا ایک انکاری قول نقل فرماتے ہیں کہ) یہ کافر یوں کہتے ہیں کہ کیا ہم لوگ جب (مرکر) خاک ہوگئے اور (اسی طرح) ہمارے بڑے بھی تو کیا (پھر) ہم (زندہ کرکے قبروں سے) نکالے جاویں گے اسکا تو ہم سے اور ہمارے بڑوں سے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے) پہلے سے وعدہ ہوتا چلا آیا ہے (کیونکہ تمام انبیاء کا یہ قول مشہور ہے لیکن نہ آج تک ہوا اور نہ کسی نے بتلایا کہ کب ہوگا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ) یہ بے سند باتیں ہیں جو اگلوں سے نقل ہوتی چلی آئی ہیں آپ کہدیجئے کہ (جب اس کے امکان پر دلائل عقلیہ اور وقوع پر دلائلِ نقلیہ جا بجا بار بار تم کو سُنا دیئے گئے ہیں تو تم کو تکذیب سے باز آنا چاہیئے ورنہ جو اور مکذبین کا حال ہوا ہے کہ عذاب میں گرفتار ہوئے وہی تمہارا حال ہوگا۔ اگر ان کی حالت میں کچھ شبہ ہو تو) تم زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرمین کا انجام کیا ہوا (کیونکہ اُن کے ہلاک ہونے اور عذاب آنے کے آثار ابتک باقی تھے) اور (اگر باوجود ان مواعظِ بلیغہ کے پھر مخالفت پر کمربستہ رہیں تو) آپ ان پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ شرارتیں کر رہے ہیں اس سے دل تنگ نہ ہوجیئے (کہ اور انبیاء کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے) اور (قُلْ سِيرُوا الخ میں اور اسکے امثال دوسری آیات میں جو ان کو وعیدِ عذاب سُنائی جاتی ہے تو چونکہ دل میں تصدیق نہیں اسلئے) یہ لوگ (بے باکانہ) یُوں کہتے ہیں کہ یہ وعدہ (عذاب و قہر کا) کب ہوگا اگر تم سچے ہو (تو بتلاؤ) آپ کہدیجئے کہ عجب نہیں کہ جس عذاب کی تم جلدی مچا رہے ہو اس میں سے کچھ تمہارے پاس ہی آ لگا ہو اور (اب تک جو دیر ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) آپ کا رب لوگوں پر (اپنا) بڑا فضل رکھتا ہے (اس رحمتِ عامّہ کی وجہ سے قدرے مہلت دے رکھی ہے) و لیکن اکثر آدمی (اس بات پر) شکر نہیں کرتے (کہ تاخیر کو غنیمت سمجھیں اور اس مہلت میں حق کی طلب کریں اور اس کو قبول کرلیں کہ عذاب سے نجات ابدی حاصل ہو بلکہ بالعکس انکار اور بطور استہزا کے جلد بازی کرتے ہیں) اور (یہ تاخیر چونکہ بمصلحت ہے اس لئے یہ نہ سمجھیں کہ ان افعال کی کبھی سزا ہی نہ ہوگی کیونکہ) آپ

کے رب کو سب خبر ہے جو کچھ اُن کے دلوں میں مخفی ہے اور جس کو وہ علانیہ کرتے ہیں اور (یہ صرف علم خداوندی ہی نہیں بلکہ دفتر خداوندی میں لکھا ہوا ہے جس میں کچھ ان ہی کے افعال کی تخصیص نہیں بلکہ) آسمان اور زمین میں ایسی کوئی مخفی چیز نہیں جو لوح محفوظ میں نہ ہو (اور دفتر خداوندی یہی لوح محفوظ ہے اور جب مخفی چیزیں جن کو کوئی نہیں جانتا اس میں موجود ہیں تو ظاہر چیزیں تو بدرجۂ اولیٰ موجود ہیں۔ غرض اُنکے اعمال کی اللہ تعالیٰ کو خبر ہے اور آسمانی دفتر میں بھی محفوظ ہیں اور وہ اعمال خود سزا کے مقتضی بھی ہیں اور سزا کے واقع ہونے پر سب انبیاء علیہم السلام کی دی ہوئی اخبار صادقہ بھی متفق ہیں۔ پھر یہ سمجھنے کی کیا گنجائش ہے کہ سزا نہ ہوگی، البتہ دیر ہونا ممکن ہے چنانچہ بعض سزائیں ان منکرین کو دُنیا میں بھی ہوئیں جیسے قحط، قتل، قید وغیرہ اور کچھ قبر و برزخ میں ہوں گی جو کچھ دُور نہیں، اور کچھ آخرت میں ہوں گی)۔

معارف و مسائل

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ آپ لوگوں کو بتلا دیں کہ جتنی مخلوق آسمانوں میں ہے جیسے فرشتے اور جتنی مخلوق زمین میں ہے جیسے بنی آدم اور جنات وغیرہ ان میں سے کوئی بھی غیب کو نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے۔ آیت مذکورہ نے پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ یہ بتلایا ہے کہ علم غیب اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے جس میں کوئی فرشتہ یا نبی و رسول بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ اس مسئلہ کی ضروری تفصیل سُورۂ انعام کی آیت نمبر ۵۹ کے تحت صفحہ ۳۵۲ جلد ۳ پر آچکی ہے۔ اسکے علاوہ اس موضوع پر احقر کا ایک مستقل رسالہ بنام کشف الریب عن علم الغیب احکام القرآن (عربی) کا جزء بنکر شائع ہو چکا ہے۔ اہل علم اس کی مراجعت فرما سکتے ہیں۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۚ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ، لفظ ادّٰرَكَ میں قراءتیں بھی مختلف ہیں اور اس کے معنی میں بھی کئی قول ہیں۔ اہل علم اس کی تفصیل تفاسیر میں دیکھ سکتے ہیں، یہاں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ ادّٰرَكَ کے معنے بعض مفسرین نے تکامل کے کئے ہیں اور فی الآخرہ کو ادّٰرَكَ سے متعلق کر کے معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ آخرت میں ان کا علم اس معاملہ میں مکمل ہو جائیگا کیونکہ اسوقت ہر چیز کی حقیقت کھل کر سامنے آجائیگی مگر اسوقت علم ہونا اُن کے کچھ کام نہ آئیگا کیونکہ دُنیا میں وہ آخرت کی تکذیب کرتے رہے تھے۔ اور بعض مفسرین نے لفظ ادّٰرَكَ کے معنے ضلّ و غاب کے لئے اور فی الآخرہ کو علمھم سے متعلق کیا کہ آخرت کے معاملہ میں اُن کا علم غائب ہوگیا اس کو نہ سمجھ سکے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِیْ هُمْ
یہ قرآن سُناتا ہے بنی اسرائیل کو بہت چیزیں جس میں
فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۶﴾ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ اِنَّ
وہ جھگڑ رہے ہیں اور بیشک وہ ہدایت ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے واسطے تیرا
رَبَّكَ يَقْضِیْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۸﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى
رب اُن میں فیصلہ کریگا اپنی حکومت سے اور وہی ہے زبردست سب کچھ جاننے والا سو تو بھروسہ کر
اللّٰهِ ۭ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿۷۹﴾
اللہ پر بیشک تو ہے صحیح کھلے رستہ پر

خلاصۂ تفسیر

بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل پر اکثر اُن باتوں (کی حقیقت) کو ظاہر کرتا ہے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور وہ ایمانداروں کے لئے (خاص) ہدایت اور (خاص) رحمت ہے (ہدایت باعتبار طاعات و اعمال کے اور رحمت باعتبار ثمرات و نتائج کے) بالیقین آپ کا رب اُن کے درمیان اپنے حکم سے (وہ عملی) فیصلہ (قیامت کے دن) کریگا (اُسوقت معلوم ہو جاویگا کہ دینِ حق کیا تھا اور باطل کیا، تو ایسے لوگوں پر کیا افسوس کیا جائے) اور وہ زبردست علم والا ہے (بدون اس کی مشیت کے کوئی کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتا) تو آپ اللہ پر توکل رکھئے (اللہ کی مدد ضرور ہوگی کیونکہ) آپ صریح حق پر ہیں۔

معارف و مسائل

پہلی آیات میں حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کو مختلف مثالوں سے ثابت کر کے یہ بات ثابت کر دی گئی ہے کہ قیامت کا وقوع اور اُسمیں مُردوں کا دوبارہ زندہ ہونا عقلاً ممکن ہے اس میں کوئی عقلی اشکال نہیں۔ عقلی امکان کے ساتھ اسکا ضرور واقع ہونا یہ انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کی نقل سے ثابت ہے اور کسی خبر کا صحیح اور ثابت ہونا اس پر موقوف ہے کہ اسکا ناقل مخبر اور روایت کرنے والا صادق اور سچا ہو۔ اسلئے اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ اسکا مخبر قرآن ہے اور اُسکا مخبر صادق ہونا ناقابلِ انکار ہے، یہاں تک کہ علماء بنی اسرائیل جن مسائل میں باہم سخت اختلافات رکھتے تھے اور وہ حل نہ ہوتے تھے۔ قرآن حکیم نے اُن مسائل میں محاکمہ کر کے صحیح فیصلوں کی ہدایت فرمائی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ علماء کے اختلاف میں محاکمہ اور فیصلہ کرنے والا ان سب علماء سے اعلم اور اعلیٰ ہونا ضروری ہے اسلئے قرآن کا مخبرِ صادق

ہوتا واضح ہوگیا، اسکے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ ان کی مخالفت سے تنگدل نہ ہوں، اللہ تعالیٰ خود آپ کا فیصلہ کرنے والا ہے آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد حق کے ساتھ ہے اور آپ کا طریق حق پر ہونا یقینی ہے۔

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ﴿٨٠﴾

البتہ تو نہیں سنا سکتا مُردوں کو اور نہیں سنا سکتا بہروں کو اپنی پکار جب لوٹیں وہ پیٹھ پھیر کر

وَمَا أَنتَ بِهَادِي الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِن تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ

اور نہ تو دکھلا سکے اندھوں کو جب وہ راہ سے بچلیں تو تو سناتا ہے اُس کو جو یقین رکھتا ہو

بِآيَاتِنَا فَهُم مُّسْلِمُونَ ﴿٨١﴾

ہماری باتوں پر، سو وہ حکمبردار ہیں

خلاصۂ تفسیر

آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی آواز سنا سکتے ہیں (خصوصاً) جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر چلدیں اور نہ آپ اندھوں کو اُن کی گمراہی سے (بچاکر) رستہ دکھانے والے ہیں، آپ تو صرف اُن ہی کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیتوں کا یقین رکھتے ہیں (اور) پھر وہ مانتے (بھی) ہیں۔

معارف و مسائل

ہمارے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کے ساتھ جو شفقت و ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے اُسکا تقاضا تھا کہ سب کو اللہ کا پیغام سنا کر جہنم سے بچالیں جو لوگ اس پیغام کو قبول نہ کرتے تو آپکو سخت صدمہ پہنچتا تھا اور آپ ایسے غمگین ہوتے تھے جیسے کسی کی اولاد اسکے کہنے کے خلاف آگ میں جارہی ہو۔ اسلئے قرآن نے جابجا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے مختلف عنوانات اختیار فرمائے ہیں۔ سابقہ آیات میں وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُن فِي ضَيْقٍ، اسی سلسلہ کا ایک عنوان تھا۔ مذکور الصدر آیت میں بھی تسلی کا مضمون دوسرے انداز سے بیان فرمایا ہے کہ آپ کا کام پیغام حق کو پہنچا دینے کا وہ آپ پورا کر چکے ہیں جن لوگوں نے اس کو قبول نہیں کیا اسمیں آپ کا کوئی قصور اور کوتاہی نہیں جس پر آپ غم کریں بلکہ وہ اپنی صلاحیتِ قبول ہی کو کھو چکے ہیں۔ ان کے گم کردہ صلاحیت ہونے کو اس آیت میں قرآن کریم نے تین مثالوں میں ثابت کیا ہے۔ اول یہ کہ یہ لوگ قبولِ حق کے معاملہ میں بالکل مُردہ لاش کی طرح ہیں جو کسی کی بات سن کر کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ دوسرے یہ کہ ان کی مثال اُس بہرے آدمی کی ہے جو

بہرا ہونے کے ساتھ بات سننا بھی نہیں چاہتا بلکہ جب کوئی سنانا چاہے تو اس سے پیٹھ موڑ کر بھاگتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان کی مثال اندھوں کی سی ہے کہ کوئی ان کو راستہ دکھانا بھی چاہے تو وہ نہیں دیکھ سکتے ان تین مثالوں کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں فرمایا۔

اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ، یعنی آپ تو صرف ایسے ہی لوگوں کو سنا سکتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان لائیں اور اطاعت قبول کریں۔ اس پورے مضمون میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس جگہ سننے سنانے سے مراد محض کانوں میں آواز پہنچانا نہیں بلکہ مراد اس سے وہ سماع اور سننا ہے جو نفع بخش ہو۔ جو سماع نافع نہ ہو اس کو قرآن نے مقصد کے اعتبار سے عدم سماع سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ آخر آیت میں یہ ارشاد کہ آپ تو صرف ان لوگوں کو سنا سکتے ہیں جو ایمان لائیں۔ اگر اس میں سنانے سے مراد محض ان کے کان تک آواز پہنچانا ہوتا تو قرآن کا یہ ارشاد خلاف مشاہدہ اور خلاف واقع ہو جاتا کیونکہ کافروں کے کانوں تک آواز پہنچانے اور ان کے سننے جواب دینے کی شہادتیں بے شمار ہیں کوئی بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس سے واضح ہوا کہ سنانے سے مراد سماع نافع ہے انکو مردہ لاش سے تشبیہ دیکر جو یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے اس کے معنے بھی یہی ہونگے کہ جیسے مُردے اگر کوئی بات حق کی سن بھی لیں اور اس وقت وہ حق کو قبول کرنا بھی چاہیں تو یہ انکے لئے نافع نہیں، کیونکہ وہ دنیا کے دار العمل سے گزر چکے ہیں جہاں ایمان و عمل نافع ہو سکتا تھا مرنے کے بعد برزخ یا محشر میں تو سبھی کافر منکر ایمان و عمل صالح کی تمنائیں کریں گے مگر وہ وقت ایمان و عمل کے قبول ہونے کا وقت نہیں۔ اس لئے اس آیت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مُردے کوئی کلام کسی کا سن ہی نہیں سکتے اسلئے سماع اموات کے مسئلہ سے درحقیقت یہ آیت ساکت ہے یہ مسئلہ اپنی جگہ قابل نظر ہے کہ مُردے کسی کلام کو سن سکتے ہیں یا نہیں؟

مسئلہ سماع اموات یہ مسئلہ کہ مُردے کوئی کلام سن سکتے ہیں یا نہیں ان مسائل میں سے ہے جنمیں خود صحابہ کرام کا باہم اختلاف رہا ہے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سماع موتی کو ثابت قرار دیتے ہیں اور حضرت ام المومنین صدیقہ عائشہؓ اس کی نفی کرتی ہیں۔ اسی لئے دوسرے صحابہ و تابعین میں بھی دو گروہ ہو گئے بعض اثبات کے قائل ہیں بعض نفی کے۔ اور قرآن کریم میں یہ مضمون ایک تو اسی موقع پر سورۂ نمل میں آیا ہے دوسرے سورۂ روم میں تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ دوسری آیت آئی ہے اور سورۂ فاطر میں یہ مضمون ان الفاظ سے آیا ہے وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ، یعنی آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو کہ قبروں میں ہیں۔

ان تینوں آیتوں میں یہ بات قابل نظر ہے کہ ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں فرمایا کہ مُردے سن نہیں سکتے بلکہ تینوں آیتوں میں نفی اس کی کی گئی ہے کہ آپ نہیں سنا سکتے۔ تینوں آیتوں میں اسی تعبیر و عنوان کو اختیار کرنے سے اس طرف واضح اشارہ نکلتا ہے کہ مُردوں میں سننے کی صلاحیت تو ہو سکتی ہے

مگر ہم باختیار خود اُن کو نہیں سُنا سکتے۔

ان تینوں آیتوں کے بالمقابل ایک چوتھی آیت جو شہدار کے بارے میں آئی ہے وہ یہ ثابت کرتی ہے کہ شہدار کو اپنی قبروں میں ایک خاص قسم کی زندگی عطا ہوتی ہے اور اس زندگی کے مطابق رزق بھی انکو ملتا ہے اور اپنے پسماندہ متعلقین کے متعلق بھی منجانب اللہ ان کو بشارت سُنائی جاتی ہے آیت یہ ہے وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ، یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ مرنے کے بعد بھی رُوح انسانی میں شعور اور ادراک باقی رہ سکتا ہے بلکہ شہدار کے معاملہ میں اسکے وقوع کی شہادت بھی یہ آیت دے رہی ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ یہ حکم تو شہیدوں کے ساتھ مخصوص ہے دوسرے اموات کے لئے نہیں، سو اسکا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے کم از کم اتنا تو ثابت ہوگیا کہ مرنے کے بعد بھی روح انسانی میں شعور و ادراک اور اس دُنیا کیساتھ علاقہ باقی رہ سکتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے شہدار کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ اُن کی ارواح کا تعلق انکے اجساد اور قبور کے ساتھ قائم رہتا ہے اسی طرح جب اللہ تعالیٰ چاہیں تو دوسرے اموات کو یہ موقع دے سکتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو سماعِ اموات کے قائل ہیں، انکا یہ قول بھی ایک صحیح حدیث کی بنار پر ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اسناد صحیح کے ساتھ منقول ہے وہ یہ ہے۔

ما من احد یمر بقبر اخیه المسلم کان یعرفه فی الدنیا فیسلم علیه الا رد اللہ علیه روحه حتی یرد علیه السلام (ذکرہ ابن کثیر فی تفسیرہ مصححا عن ابن عمرؓ)	جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کی قبر پر گزرتا ہے جس کو وہ دُنیا میں پہچانتا تھا اور وہ اس کو سلام کرے تو اللہ تعالیٰ اُس مُردے کی روح اسمیں واپس بھیجدیتے ہیں تاکہ وہ سلام کا جواب دے۔

اس سے بھی یہ ثابت ہوا کہ جب کوئی شخص اپنے مُردہ مسلمان بھائی کی قبر پر جاکر سلام کرتا ہے تو وہ مُردہ اسکے سلام کو سُنتا ہے اور جواب دیتا ہے اور اُس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس وقت اس کی رُوح اس دُنیا میں واپس بھیجدیتے ہیں۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں اول یہ کہ مُردے سُن سکتے ہیں دوسرے یہ کہ اُن کا سننا اور ہمارا سُنانا ہمارے اختیار میں نہیں البتہ اللہ تعالیٰ جب چاہیں سُنا دیں، جب نہ چاہیں نہ سُنائیں، مسلمان کے سلام کرنے کے وقت تو اس حدیث نے بتلا دیا کہ حق تعالیٰ مُردہ کی روح واپس لاکر اسکو سلام سُنا دیتے ہیں اور اس کو سلام کا جواب دینے کی بھی قدرت دیتے ہیں۔ باقی حالات و کلمات کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ مُردہ ان کو سُنے گا یا نہیں۔ اسی لئے امام غزالی اور علامہ سبکی وغیرہ کی تحقیق یہ ہے کہ اتنی بات تو احادیث صحیحہ اور قرآن کی آیت مذکورہ سے ثابت ہے کہ بعض اوقات میں مُردے زندوں کا کلام سُنتے ہیں لیکن یہ ثابت نہیں کہ ہر مُردہ

ہر حال میں ہر شخص کے کلام کو ضرور سنتا ہے اس طرح آیات و روایات کی تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مُردے ایک وقت میں اَحیاء کے کلام کو سن سکیں دوسرے وقت نہ سن سکیں، یہ بھی ممکن ہے کہ بعض کے کلام کو سنیں بعض کے کلام کو نہ سنیں، یا بعض مُردے سنیں بعض نہ سنیں، کیونکہ سورۂ نمل، سورۂ روم، سورۂ فاطر کی آیات سے بھی یہ ثابت ہے کہ مردوں کو سنانا ہمارے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں سنا دیتے ہیں اس لئے جن مواقع میں حدیث کی روایات صحیحہ سے سننا ثابت ہے وہاں سننے پر عقیدہ رکھا جائے اور جہاں ثابت نہیں وہاں دونوں احتمال ہیں اسلئے نہ قطعی اثبات کی گنجائش ہے نہ قطعی نفی کی۔ واللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اعلم

اس مسئلہ کی مکمل تحقیق میں احقر نے ایک مستقل رسالہ بنام تکمیل الحبور بسماع اہل القبور لکھا ہے جو احکام القرآن سورۂ روم حزب خامس میں بزبان عربی شائع ہوا ہے جس میں آیات و روایات اور اقوال سلف و خلف اور شرح الصدور وغیرہ سے بہت سے واقعات و مخاطبات اہل قبور کے نقل کئے گئے ہیں۔ اہل علم وہاں دیکھ سکتے ہیں عوام کے لئے یہاں اسکا ضروری خلاصہ لکھا گیا ہے۔

وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ

اور جب پڑ چکے گی اُن پر بات نکالیں گے ہم اُن کے آگے ایک جانور زمین سے اُن سے باتیں کریگا

أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ ﴿٨٢﴾

اسواسطے کہ لوگ ہماری نشانیوں کا یقین نہیں کرتے تھے

ع ۶

خلاصۂ تفسیر

اور جب وعدہ (قیامت کا) ان (لوگوں) پر پورا ہونے کو ہوگا (یعنی قیامت کا زمانہ قریب آپہنچیگا) تو ہم اُن کے لئے زمین سے ایک (عجیب) جانور نکالیں گے کہ وہ اُن سے باتیں کریگا کہ (کافر) لوگ ہماری (یعنی اللہ تعالیٰ کی) آیتوں پر (خصوصاً ان آیتوں پر جو قیامت کے متعلق ہیں) یقین نہیں لاتے تھے (مگر اب قیامت آپہنچی اس کی علامتوں میں ایک علامت میرا ظہور بھی ہے)۔

معارف و مسائل

دابۃ الارض کیا ہے اور کہاں اور کب نکلے گا

مسند احمد میں حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت اسوقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم اس سے پہلے دس نشانیاں نہ دیکھ لو۔ (۱) آفتاب کا جانب مغرب سے طلوع ہونا (۲) دخان (۳) دابۃ (۴)

خروج یاجوج ماجوج (۵) نزول عیسیٰ علیہ السلام (۶) دجال (۷، ۸، ۹) تین خسوف ایک مغرب میں دوسرا مشرق میں تیسرا جزیرۃ العرب میں ہوگا (۱۰) ایک آگ جو قعر عدن سے نکلے گی اور سب لوگوں کو ہنکا کر میدان حشر کیطرف لے آئیگی جس مقام پر لوگ رات گزارنے کے لئے ٹھہرینگے یہ آگ بھی ٹھہر جائے گی پھر اُن کو لے چلے گی (کذا رواہ مسلم واہل السنن من طرق وقال الترمذی حدیث حسن صحیح)

اس حدیث سے قرب قیامت میں زمین سے ایک ایسے جانور کا نکلنا ثابت ہوا جو لوگوں سی باتیں کرے گا۔ اور لفظ دابۃ کی تنوین میں اس جانور کے عجیب الخلقت ہونے کی طرف بھی اشارہ پایا گیا، اور یہ بھی کہ یہ جانور عام جانوروں کی طرح توالد وتناسل کے طریق پر پیدا نہیں ہوگا بلکہ اچانک زمین سے نکلے گا اور یہ بات بھی اسی حدیث سے سمجھ میں آتی ہے کہ دابۃ الارض کا خروج بالکل آخری علامات میں سے ہوگا جس کے بعد بہت جلد قیامت آجائے گی۔ ابن کثیر نے بحوالہ ابوداؤد طیالسی حضرت طلحہ بن عمرؓ سے ایک طویل حدیث میں روایت کیا ہے کہ یہ دابۃ الارض مکہ مکرمہ میں کوہِ صفا سے نکلے گا اور اپنے سر سے مٹی جھاڑتا ہوا مسجد حرام میں حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان پہنچ جائیگا لوگ اس کو دیکھ کر بھاگنے لگیں گے ایک جماعت رہ جائے گی یہ دابہ اُن کے چہروں کو ستاروں کی طرح روشن کردے گا۔ اسکے بعد وہ زمین کیطرف نکلے گا، ہر کافر کے چہرے پر کفر کا نشان لگا دے گا۔ کوئی اس کی پکڑ سے بھاگ نہ سکے گا یہ ہر مومن و کافر کو پہچانے گا (ابن کثیر) اور مسلم بن حجاج نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سُنی تھی جس کو میں کبھی بھولتا نہیں وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کی آخری علامات میں سب سے پہلے آفتاب کا طلوع مغرب کی طرف سے ہوگا اور آفتاب بلند ہونے کے بعد دابۃ الارض نکلے گا ان دونوں علامتوں میں سے جو بھی پہلے ہو جائے اسکے فوراً بعد قیامت آجائے گی۔ (ابن کثیر)

شیخ جلال الدین محلی نے فرمایا کہ خروج دابہ کے وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے احکام منقطع ہو جائیں گے اور اسکے بعد کوئی کافر اسلام قبول نہ کرے گا۔ یہ مضمون بہت سی احادیث و آثار سے مستنبط ہوتا ہے (مظہری) ابن کثیر وغیرہ نے اس جگہ دابۃ الارض کی ہیئت اور کیفیات و حالات کے متعلق مختلف روایات نقل کی ہیں جنمیں سے اکثر قابل اعتماد نہیں اسلئے جتنی بات قرآن کی آیات اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ عجیب الخلقت جانور ہوگا۔ بغیر توالد وتناسل کے زمین سے نکلے گا۔ اسکا خروج مکہ مکرمہ میں ہوگا پھر ساری دنیا میں پھرے گا۔ یہ کافر و مومن کو پہچانے گا۔ اور اُن سے کلام کریگا۔ بس اتنی بات پر عقیدہ رکھا جائے، زائد کیفیات و حالات کی تحقیق و تفتیش نہ ضروری ہے نہ اس سے کچھ فائدہ ہے۔

رہا یہ معاملہ کہ دابۃ الارض لوگوں سے کلام کرے گا اسکا کیا مطلب ہے، بعض حضرات نے فرمایا کہ

اُسکا کلام یہی ہوگا جو قرآن میں مذکور ہے اِنَّ النَّاسَ كَانُوا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ، یہ کلام وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو سنائے گا، بہت سے لوگ آج سے پہلے ہماری آیتوں پر یقین نہ رکھتے تھے اور مطلب یہ ہوگا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ان سب کو یقین ہو جائے گا مگر اسوقت کا یقین شرعاً معتبر نہیں ہوگا۔ اور حضرت ابن عباسؓ، حسن بصریؒ، قتادہؒ سے منقول ہے اور ایک روایت حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے بھی ہے کہ یہ دابۃ لوگوں سے خطاب اور کلام کرے گا جس طرح عام کلام ہوتا ہے (ابن کثیر)۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿۸۳﴾

اور جس دن گھیر بلائیں گے ہم ہر ایک فرقہ میں سے ایک جماعت جو جھٹلاتے تھے ہماری باتوں کو پھر ان کی جماعت بندی ہوگی

حَتّٰى إِذَا جَاءُوْ قَالَ أَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا أَمَّا

یہاں تک کہ جب حاضر ہو جائیں فرمائیگا کیوں جھٹلایا تم نے میری باتوں کو اور نہ آچکی تھیں تمہاری سمجھ میں یا بولو کہ

ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۵﴾

کیا کرتے تھے اور پڑ چکی اُن پر بات اسواسطے کہ انہوں نے شرارت کی تھی اب وہ کچھ نہیں بول سکتے

أَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا اللَّيْلَ لِيَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ إِنَّ فِي

کیا نہیں دیکھتے کہ ہم نے بنائی رات کہ اسمیں چین حاصل کریں اور دن بنایا دیکھنے کو البتہ اس میں

ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ

نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو یقین کرتے ہیں اور جس دن پھونکی جائے گی صور تو گھبرا جائے

مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ ۚ وَكُلٌّ

جو کوئی ہے آسمان میں اور جو کوئی ہے زمین میں مگر جس کو اللہ چاہے اور سب

أَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ

چلے آئیں اسکے آگے عاجزی سے اور تو دیکھے پہاڑوں کو سمجھے کہ وہ جم رہے ہیں اور وہ چلیں گے جیسے

السَّحَابِ ۚ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْ أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ إِنَّهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۸﴾

چلے بادل کاریگری اللہ کی جس نے درست کیا ہے ہر چیز کو اس کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ

جو کوئی لے کر آیا بھلائی تو اُس کو ملے اُس سے بہتر اور ان کو گھبراہٹ سے اس دن

اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾ وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ۚ

امن ہے اور جو کوئی لے کر آیا برائی سو اوندھے ڈالیں اُن کے منہ آگ میں

هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۰﴾

وہی بدلہ پاؤگے جو کچھ تم کیا کرتے تھے

خلاصۂ تفسیر

جس دن (قبروں سے زندہ کرنے کے بعد) ہم ہر اُمت میں سے (یعنی اُمم سابقہ میں سے بھی اور اس اُمت میں سے بھی) ایک ایک گروہ اُن لوگوں کا (حساب کے لئے) جمع کریں گے جو میری آیتوں کو جھٹلایا کرتے تھے (پھر اُن کو موقف کی طرف حساب کے لئے روانہ کیا جائیگا اور چونکہ یہ کثرت سے ہونگے اسلئے) اُن کو (چلنے میں پچھلوں سے آملنے کے واسطے) روکا جائے گا (تاکہ آگے پیچھے نہ رہیں سب ساتھ ہو کر موقف حساب کی طرف چلیں۔ مُراد اس سے کثرت کا بیان ہے کیونکہ بڑے مجمع میں عادۃً ایسا ہوتا ہے خواہ روک ٹوک ہو یا نہ ہو) یہاں تک کہ جب (چلتے چلتے موقف میں) حاضر ہو جاویں گے تو (حساب شروع ہوگا اور) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماویگا کہ کیا تم نے میری آیتوں کو جھٹلایا تھا حالانکہ تم اُن کو اپنے احاطۂ علمی میں بھی نہیں لاتے (جسکے بعد غور کرنے کا موقع ملتا اور غور کر کے اُس پر کچھ رائے قائم کرتے، مطلب یہ کہ سُنتے ہی بلا تدبر و تفکر، اُن کی تکذیب کر دی اور تکذیب ہی پر اکتفا نہیں کیا) بلکہ (یاد تو کرو اسکے علاوہ) اور بھی کیا کیا کام کرتے رہے (مثلاً انبیاء کو اور اہل ایمان کو ایذائیں دیں جو تکذیب سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسی طرح اور عقائدِ کفریہ اور فسق و فجور میں مبتلا رہے) اور (اب وہ وقت ہے کہ) اُن پر (بوجہ قائم ہو جانے جُرم کے) وعدہ (عذاب کا) پورا ہوگیا (یعنی سزا کا استحقاق ثابت ہوگیا) بوجہ اس کے کہ (دُنیا میں) انھوں نے (بڑی بڑی) زیادتیاں کی تھیں (جن کا آج ظہور ثابت ہوگیا) سو (چونکہ ثبوت قوی ہے اسلئے) وہ لوگ (عذر وغیرہ کے متعلق) بات بھی نہ کر سکیں گے (اور بعض آیات میں جو ان کا عذر پیش کرنا مذکور ہے وہ ابتداء میں ہوگا پھر بعد اقامتِ حجت کوئی بات نہ کہہ سکیں گے۔ اور یہ لوگ جو امکانِ قیامت کے منکر ہیں تو حماقتِ محضہ ہے کیونکہ علاوہ دلائلِ نقلیہ صادقہ کے اس پر دلیلِ عقلی بھی تو قائم ہے مثلاً) کیا انھوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہمنے رات بنائی تاکہ لوگ اس میں آرام کریں (اور یہ آرام مشابہ موت کے ہے) اور دن بنایا جس میں دیکھیں بھالیں (جو کہ موقوف ہے بیداری پر اور وہ مشابہ حیات بعد الموت کے ہے پس) بلاشبہ اس (روزانہ خواب بیداری) میں (امکانِ بعث پر اور ان آیات کے حق ہونے پر جو اس پر دال ہیں) بڑی دلیلیں ہیں (کیونکہ موت کی حقیقت یہ ہے کہ روح کا تعلق جسم سے زائل ہو جائے اور حیاتِ ثانیہ کی حقیقت یہ ہے کہ یہ تعلق پھر عود کر آئے، اور نیند بھی ایک حیثیت سے زوال ہے اس تعلق کا، کیونکہ نیند میں یہ تعلق ضعیف ہو جاتا ہے اور ضعف جبھی ہوتا ہے جبکہ اسکے مراتب وجود میں کوئی مرتبہ زائل ہو جائے، اور بیداری اس زائل شدہ مرتبۂ وجود کے عود کا نام ہے اس لئے دونوں میں تشابہ تام ہوگیا۔ اور نیند کے بعد بیداری پر اللہ تعالیٰ کی قدرت روزانہ مشاہدہ میں آتی ہے تو موت کے بعد زندگی بھی اُس کی نظیر ہے وہ کیوں اللہ کی قدرت سے خارج ہوگا، اور

یہ دلیل عقلی ہر شخص کے لئے عام ہے مگر باعتبار انتفاع کے) ان (ہی) لوگوں کے لئے (ہے) جو ایمان رکھتے ہیں (کیونکہ وہ غور و فکر کرتے ہیں، اور دوسرے تدبر نہیں کرتے اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لیے نظر و فکر ضروری ہے اسلئے دوسرے اس سے منتفع نہیں ہوتے) اور (ایک واقعہ ہولناک اس حشر مذکور سے پہلے ہوگا جسکا آگے ذکر ہے اس کی ہیبت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) جس دن صور میں پھونک ماری جاوے گی (یہ نفخۂ اولیٰ ہے اور حشر مذکور نفخۂ ثانیہ کے بعد تھا) سو جتنے آسمان اور زمین میں (فرشتے اور آدمی وغیرہ) ہیں سب گھبرا جاویں گے (اور پھر مر جاویں گے اور جو مر چکے ہیں ان کی روحیں بیہوش ہو جاویں گی) مگر جس کو خدا چاہے (وہ اس گھبراہٹ سے اور موت سے محفوظ رہے گا۔ مراد ان سے حسب حدیث مرفوع جبرئیل و میکائیل و اسرافیل و ملک الموت و حاملانِ عرش ہیں پھر ان سب کی بھی بدون اثر نفخہ وفات ہو جاویگی۔ کذا فی الدر المنثور۔ سورۃ الزمر) اور (دنیا میں جیسے عادت ہے کہ جس سے گھبراہٹ اور ڈر ہوتا ہے اس سے بھاگ جاتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ سے کوئی بھاگ نہ سکے گا بلکہ) سب کے سب اُسی کے سامنے دبے جھکے حاضر رہیں گے (یہاں تک کہ زندہ آدمی مُردہ اور مُردے بیہوش ہو جاویں گے) اور (نفخہ کی یہ تغییر و تاثیر جانداروں میں ہوگی اور آگے بے جان چیزوں میں جو تاثیر ہوگی اسکا بیان ہے وہ یہ کہ اے مخاطب) تو (اسوقت) پہاڑوں کو ایسی حالت میں دیکھ رہا ہے جس سے (ان کے ظاہری استحکام کے سبب بادی النظر میں) تجھ کو خیال ہوتا ہے کہ یہ (ہمیشہ یوں ہی رہیں گے اور کبھی اپنی جگہ سے) جنبش نہ کریں گے حالانکہ (اسوقت ان کی یہ حالت ہوگی کہ) وہ بادلوں کی طرح (متخلخل اور خفیف اور اجزاءِ منتشرہ ہوکر فضائے آسمانی میں) اُڑے اُڑے پھریں گے (کقولہ تعالیٰ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا، اور اس پر کچھ تعجب نہ کرنا چاہیئے کہ ایسی ثقیل اور سخت چیز کا یہ حال کیسے ہو جاویگا، وجہ یہ کہ) یہ خدا کا کام ہوگا جس نے ہر چیز کو (مناسب انداز پر) بنا رکھا ہے (اور ابتداء میں کسی شئ میں کوئی مضبوطی نہ تھی کیونکہ خود اس شئے کی ذات ہی نہ تھی، پس مضبوطی کی صفت تو بدرجۂ اولیٰ نہ تھی سو جیسے اس نے معدوم سے موجود اور ضعیف سے قوی بنایا اسی طرح اسکا عکس بھی کر سکتا ہے کیونکہ قدرتِ ذاتیہ کی نسبت تمام مقدورات کے ساتھ یکساں ہے، بالخصوص جو چیزیں ایک دوسرے کی نظیر اور مشابہ ہیں ان میں تو زیادہ واضح ہے۔ اسی طرح دوسری مخلوقات قویہ آسمان و زمین وغیرہ میں تغیر عظیم ہونا دوسری آیات میں مذکور ہے وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ الخ پھر اسکے بعد نفخۂ ثانیہ ہوگا جس سے ارواح ہوش میں آکر اپنے ابدان سے متعلق ہو جاویں گی اور پورا عالم نئے سرے سے درست ہو جاویگا اور اوپر جو حشر کا ذکر تھا وہ اسی نفخۂ ثانیہ کے بعد ہوگا۔ آگے اصل مقصود یعنی قیامت میں جزاء و سزا کا بیان ہے۔ پس اوّل اسکی تمہید کے طور پر ارشاد ہے کہ) یہ یقینی بات ہے

کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب افعال کی پوری خبر ہے (جو جزاء و سزا کی پہلی شرط ہے اور دوسری شرائط بھی مثل قدرت وغیرہا مستقل دلائل سے ثابت ہیں، پس مجازات کا ممکن ہونا تو اس سے ظاہر ہوا اور پھر حکمت مقتضی ہے وقوع مجازات کو، اس سے جزا و سزا کا واقع ہونا ثابت ہوگیا، تمہید کے بعد آگے اسکا وقوع مع اسکے قانون اور طریقہ کے بیان فرماتے ہیں کہ) جو شخص نیکی (یعنی ایمان) لاویگا سو (وہ ایمان لانے پر جس اجر کا مستحق ہے) اس شخص کو اس (نیکی کے اجر مذکور) سے بہتر (اجر) ملے گا اور وہ لوگ بڑی گھبراہٹ سے اس روز امن میں رہیں گے (جیساکہ سورۂ انبیاء میں ہے لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ الآیۃ) اور جو شخص بدی (یعنی کفر و شرک) لاویگا تو وہ لوگ اوندھے منہ آگ میں ڈالدیئے جاویں گے (اور اُن سے کہا جاوے گا کہ) تم کو تو اُنہی اعمال کی سزا دیجا رہی ہے جو تم (دُنیا میں) کیا کرتے تھے (یہ عذاب بے وجہ نہیں)۔

معارف و مسائل

فَهُمْ يُوزَعُونَ، وزع سے مشتق ہے جس کے معنے روکنے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اگلے حصّہ کو روکا جائیگا تاکہ پیچھے رہے ہوئے لوگ ساتھ ہو جاویں اور بعض حضرات نے وزع کے معنی یہاں دفع کے لئے ہیں یعنی ان کو دھکے دے کر موقف کی طرف لایا جائیگا وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا، اسمیں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب خود ایک بڑا جرم و گناہ ہے خصوصاً جبکہ سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی طرف توجہ کئے بغیر ہی تکذیب کرنے لگیں تو یہ جرم دوہرا ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ غور و فکر کرنے کے باوجود حق کو نہ پا سکیں اُن کی نظر و فکر ہی گمراہی کی طرف لے جائے تو انکا جرم کسی قدر ہلکا ہو جاتا ہے اگرچہ اللہ کے وجود اور توحید وغیرہ کی تکذیب پھر بھی کفر و ضلال اور دائمی عذاب سے نہیں بچائے گی کیونکہ یہ ایسے بدیہی اُمور ہیں جن میں نظر و فکر کی غلطی معاف نہیں۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ الخ، فزع کے معنے گھبرانے اور پریشان ہونے کے ہیں، اور ایک دوسری آیت میں اس جگہ فزع کے بجائے صعق آیا ہے جس کے معنے بیہوش ہونے کے ہیں۔ اگر یہ دونوں آیتیں پہلے نفخۂ صور کے متعلق قرار دی جائیں تو ان دونوں لفظوں کا حاصل یہ ہوگا کہ صور پھونکنے کے وقت اول تو سب گھبرائیں گے اور پریشان ہونگے پھر بیہوش ہو جائیں گے بالآخر مر جائیں گے۔ اور قتادہ وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس آیت کو نفخۂ ثانیہ کے متعلق قرار دیا ہے جس سے سب مُردے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ سب زندہ ہونے کے وقت گھبرائے ہوئے اُٹھیں گے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ صُور تین مرتبہ پھونکا جائے گا، پہلا نفخہ نفخۂ فزع ہوگا جس سے سب پریشانی گھبراہٹ اور اضطراب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ دوسرا نفخہ صعق ہوگا جس سے سب مر جائیں گے، تیسرا نفخہ نفخۂ حشر و نشر ہوگا جس سے سب مُردے زندہ ہو جاویں گے مگر

آیاتِ قرآن اور احادیث صحیحہ سے ثبوت دو ہی نفخوں کا ملتا ہے (قرطبی و ابن کثیر) ابن مبارک نے حضرت حسن بصری سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہوگا۔ (قرطبی)

اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ، یہ استثنار فزع سے ہے جس کے معنے گھبراہٹ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہونگے جن پر کوئی گھبراہٹ حشر کے وقت نہیں ہوگی۔ حضرت ابوہریرہ رضی کی ایک حدیث میں ہے کہ یہ لوگ شہدار ہونگے حشر کی دوبارہ زندگی کے وقت ان پر کوئی گھبراہٹ نہیں ہوگی (صحح الحدیث ابن العربی، قرطبی) سعید بن جبیرؒ نے بھی یہی فرمایا کہ مُراد اس سے شہدار ہیں جو حشر کے وقت اپنی تلواریں باندھے ہوئے عرش کے گرد جمع ہونگے اور قشیری نے فرمایا کہ انبیار علیہم السلام ان میں بدرجۂ اولی داخل ہیں کیونکہ انکو مقامِ شہادت بھی حاصل ہے اور مقام نبوت مزید براں ہے۔ (قرطبی)

اور سورۂ زمر میں آگے آیا ہے وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ، اس میں فزع کے بجائے صعق کا لفظ آیا ہے جس کے معنے بیہوش ہونے کے ہیں، اور مراد اس جگہ بیہوش ہونا پھر مرجانا ہے اور اسمیں بھی اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ کا استثنار ہے اور اس استثنار سے مراد مرفوع حدیث کے مطابق چھ فرشتے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، ملک الموت اور حملۃ العرش ہیں کہ یہ نفخۂ صُور سے نہ مریں گے، بعد میں حسب تصریح حدیث ان سب کو بھی موت آئے گی۔ جن حضرات مفسرین نے فزع اور صعق کو ایک ہی قرار دیا ہے، انھوں نے سورۂ زمر کی طرح یہاں بھی استثنار سے مراد مخصوص فرشتے لئے ہیں خلاصۂ تفسیر میں اسی کو اختیار کیا گیا اور جنھوں نے فزع اور صعق کو الگ الگ مانا ہے انکے نزدیک فزع سے مستثنیٰ شہدار ہیں جیسا کہ اوپر نقل کیا گیا۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ، مراد یہ ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ کر اس طرح چلیں گے جیسے بادل کہ دیکھنے والا اس کو اپنی جگہ جما ہوا سمجھتا ہے حالانکہ وہ تیزی سے چل رہے ہیں۔ تمام بڑے اجسام جن کی ابتدا و انتہار انسان کی نظر کے سامنے نہیں ہوتی جب وہ کسی ایک سمت کی طرف حرکت کریں تو خواہ حرکت کتنی بھی تیز ہو دیکھنے والوں کو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ وہ اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں جسکا مشاہدہ سب کو گہرے بادل اور دُور تک چھائی ہوئی گھٹا سے ہوتا ہے کہ یہ بادل اپنی جگہ جمے ہوئے دکھائی دیتے ہیں حالانکہ وہ چل رہے ہوتے ہیں مگر ان کی حرکت دیکھنے والوں کو اسوقت محسوس ہوتی ہے جب وہ اتنی دُور چلے جائیں کہ افق کا کنارہ اس سے کھل جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ پہاڑوں کا جامد ہونا دیکھنے والے کی نظر کے اعتبار سے ہے اور اسکا حرکت کرنا حقیقت کے اعتبار سے۔ عامۂ مفسرین نے آیت کا مطلب یہی قرار دیا ہے اور خلاصۂ تفسیر مذکور میں یہ اختیار کیا گیا ہے کہ یہ دو حال دو وقتوں کے ہیں۔ جامد ہونا اسوقت کے اعتبار سے جسکو دیکھ کر

ہر دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ کبھی اپنی جگہ سے نہ ہلیں گے، اور تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ قیامت کے دن کے اعتبار سے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ قرآن کریم میں قیامت کے روز پہاڑوں کے حالات مختلف بیان ہوئے ہیں۔ پہلا حال اندکاک اور زلزلہ ہے جو پوری زمین کے پہاڑوں کو محیط ہوگا۔ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا اور اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا، دوسرا حال اسکی بڑی بڑی چٹانوں کا دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہو جانا ہے وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ اور یہ اسوقت ہوگا جب اوپر سے آسمان بھی پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا زمین سے پہاڑ روئی کی طرح اوپر جائیں گے اُوپر سے آسمان نیچے آئیں گے اور دونوں مل جائیں گے یَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ۔ تیسرا حال یہ کہ وہ دھنکی ہوئی روئی کے ایک جسم متصل کے بجائے ریزہ ریزہ اور ذرّہ ذرّہ ہو جائے۔ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا۔ چوتھا حال یہ ہے کہ وہ ریزہ ریزہ ہو کر پھیل جائے فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا۔ پانچواں حال یہ ہے کہ یہ پہاڑ جو ریزہ ریزہ ہو کر غبار کی طرح زمین پر پھیل گئے ہیں ان کو ہوائیں اوپر اٹھا کر لیجائیں اور چونکہ یہ غبار ساری زمین پر چھایا ہوگا تو اگرچہ یہ بادل کی طرح تیز حرکت کرتا ہوگا مگر دیکھنے والا اسکو اپنی جگہ جما ہوا دیکھے گا تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ۔ ان میں سے بعض حالات صور کے نفخۂ اولیٰ کے وقت ہونگے اور بعض نفخۂ ثانیہ کے بعد اسوقت جبکہ زمین کو ایک سطح مستوی بنا دیا جائے کہ نہ اسمیں کوئی غار رہے گا نہ پہاڑ نہ کوئی عمارت نہ درخت۔ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا (از قرطبی و روح المعانی) واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ، صُنْع بمعنے صنعت ہے اور اتقن، اتقان سے مشتق ہے جس کے معنے کسی چیز کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے آتے ہیں۔ بظاہر یہ جملہ تمام مضامین سابقہ کے ساتھ متعلق ہے جن میں حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور صنعت عجیبہ کا ذکر ہے جس میں لیل و نہار کا انقلاب بھی ہے اور نفخ صور سے لے کر حشر و نشر تک کے سب حالات بھی اور مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں کچھ حیرت اور تعجب کی نہیں کیونکہ ان کا صانع کوئی محدود علم و قدرت والا انسان یا فرشتہ نہیں، بلکہ رب العالمین ہے۔ اور اگر اسکا تعلق قریبی جملے تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً الآیۃ سے کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ پہاڑوں کا یہ حال کہ دیکھنے والے ان کو جما ہوا دیکھیں اور وہ واقع میں چل رہے اور حرکت کر رہے ہوں کچھ مستبعد اور جائے تعجب نہیں کیونکہ یہ صنعت اللہ رب العزت کی ہے۔ جس کی قدرت میں سب کچھ ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا، یہ حشر و نشر اور حساب کتاب کے بعد پیش آنے والے انجام کا ذکر ہے اور حسنہ سے مراد کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے (کما قال ابراہیم) یا اخلاص ہے (کما قال قتادہ) اور بعض حضرات نے مطلق طاعت کو اسمیں داخل قرار دیا ہے۔ معنے یہ ہیں کہ جو شخص نیک عمل کرے گا

اور نیک عمل اُسی وقت نیک کہلانے کے قابل ہوتا ہے جبکہ اس کی پہلی شرط ایمان موجود ہو تو اُس کو اپنے عمل سے بہتر چیز ملے گی مراد اس سے جنت کی لازوال نعمتیں اور عذاب اور ہر تکلیف سے دائمی نجات ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ خیر سے مراد یہ ہے کہ ایک نیکی کی جزاء دس گُنے سے لے کر سات سو گُنے تک ملے گی (مظہری)

وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ، فزع، سے مراد ہر بڑی مصیبت اور پریشانی اور گھبراہٹ ہے مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں تو ہر متقی پرہیزگار بھی انجام سے ڈرتا ہی رہتا ہے اور ڈرنا ہی چاہئے جیسے قرآن کریم کا ارشاد ہے اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ، یعنی رب کا عذاب ایسا نہیں کہ اُس سے کوئی بے فکر اور مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ و اولیاء اُمت ہمیشہ خائف و لرزاں رہتے تھے مگر اس روز جبکہ حساب کتاب سے فراغت ہو چکے گی تو حسنہ لانے والے نیک لوگ ہر خوف و غم سے بے فکر اور مطمئن ہوں گے۔ واللہ اعلم

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ
مجھ کو یہی حکم ہے کہ بندگی کروں اس شہر کے مالک کی جس نے اس کو حرمت دی اور اسی

كُلُّ شَيْءٍ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَنْ اَتْلُوَا
کی ہے ہر ایک چیز اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں حکم برداروں میں اور یہ کہ سُنا دوں

الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ
قرآن پھر جو کوئی راہ پر آیا سو راہ پر آئے گا اپنے ہی بھلے کو اور جو کوئی بہکا رہا

فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ
تو کہدے کہ میں تو یہی ہوں ڈر سُنا دینے والا اور کہہ تعریف ہے سب اللہ کو آگے دکھائیگا تم کو

اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾
اپنے نمونے تو ان کو پہچان لوگے اور تیرا رب بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو

ع ۱۱

خُلاصۂ تفسیر

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہدیجئے کہ) مجھے تو یہی حکم ملا ہے کہ میں اس شہر (مکہ) کے مالک (حقیقی) کی عبادت کیا کروں جس نے اس (شہر) کو محترم بنایا ہے (کہ حرم ہونا اسی احترام پر مرتب ہے مطلب یہ ہے کہ عبادت میں کسی کو شریک نہ کروں) اور (اسکی عبادت کیوں نہ کیجاوے جبکہ) سب چیزیں اسی کی (ملک) ہیں اور مجھ کو یہ (بھی) حکم ہوا ہے کہ میں (عقائد و اعمال سب میں) فرمانبردار رہوں

(یہ تو توحید کا حکم ہوا) اور (مجھ کو) یہ (بھی حکم ملا ہے) کہ میں (تم کو) قرآن پڑھ پڑھ کر سناؤں (یعنی احکام الٰہیہ کی تبلیغ کروں جو نبوت کے لوازم میں سے ہے) سو (میری تبلیغ کے بعد) جو شخص راہ پر آویگا تو اپنے ہی فائدہ کے لئے راہ پر آویگا (یعنی اسکو عذاب سے نجات اور جنت کی لازوال نعمتیں ملیں گی، میں اس سے کسی اپنے مالی یا جاہی نفع کا خواہاں نہیں) اور جو شخص گمراہ رہے گا تو آپ کہہ دیجئے کہ (میرا کوئی ضرر نہیں کیونکہ) میں تو صرف ڈرانیوالے (یعنی حکم سنانیوالے) پیغمبروں میں سے ہوں (یعنی میرا کام تو حکم پہنچا دینا ہے، اسکے بعد میری ذمہ داری ختم ہے نہ مانوگے تو وبال تمھیں ہی بھگتنا پڑیگا) اور آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (تم جو قیامت کے آنے میں دیر کو اسکے نہونے کی دلیل سمجھ کر انکار کرتے ہو یہ تمھاری بیوقوفی ہے کسی چیز کے واقع ہونے میں دیر لگنا اسکی دلیل نہیں ہوسکتا کہ وہ کبھی واقع ہو ہی گی نہیں۔ اسکے علاوہ تم جو مجھ سے کہتے ہو کہ میں جلد قیامت لے آؤں یہ دوسری غلطی ہے کیونکہ میں نے یہ کب دعویٰ کیا ہے کہ قیامت کا واقع کرنا میرے اختیار میں ہے بلکہ) سب خوبیاں خالص اللہ ہی کیلئے ثابت ہیں (قدرت بھی علم بھی حکمت بھی۔ وہ جب اسکی حکمت کا تقاضا ہوگا قیامت کو واقع کر دیگا۔ ہاں اتنی بات ہمیں بھی تبلا دی گئی ہے کہ قیامت میں زیادہ دیر نہیں بلکہ) وہ تم کو عنقریب اپنی نشانیاں (یعنی قیامت کے واقعات) دکھلا دیگا سو تم (وقوع کے وقت) انکو پہچانوگے (جبکہ پہچاننے سے کوئی فائدہ نہوگا) اور (صرف یہ علامات دکھلانے پر اکتفا نہوگا بلکہ اپنے برے اعمال کی سزا بھی بھگتنا پڑیگی کیونکہ) آپکا رب ان کاموں سے بے خبر نہیں جو تم سب لوگ کر رہے ہو۔

معارف ومسائل

رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ، بلدہ سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک مکہ مکرمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ تو رب العالمین اور رب السموات والارض ہے مکہ مکرمہ کی تخصیص اس جگہ اسکی عظمت شان اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکرم و محترم ہونے کا اظہار ہے۔ لفظ حرم تحریم سے مشتق ہے اسکے معنے مطلق احترام واکرام کے بھی ہیں اور اس احترام واکرام کی وجہ سے جو خاص احکام شرعیہ مکہ مکرمہ اور ارض حرم سے متعلق ہیں وہ بھی اسمیں داخل ہیں مثلاً جو شخص حرم میں پناہ لے وہ مامون ہو جاتا ہے۔ حرم میں کسی دشمن سے انتقام لینا اور قتل کرنا جائز نہیں اور ارض حرم میں شکار کو قتل کرنا بھی جائز نہیں، درختوں کا کاٹنا جائز نہیں ان احکام کا بیان آیت وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا کے تحت میں اور کچھ سورۂ مائدہ کے شروع میں اور کچھ آیت لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ کے تحت پہلے بیان ہو چکا ہے۔

(الحمد للہ سورۂ نمل کی تفسیر آج شب دوشنبہ ۲۴ شوال ۱۳۹۱ھ میں تمام ہوئی جبکہ ۱۴ شوال سے ہندوستان کے ہندوؤں نے مغربی پاکستان پر بھرپور حملے میدانی اور بحری اور ہوائی کر دیئے ہیں، کراچی خاص طور سے اسکا نشانہ ہے ہر رات بمباری ہوتی ہے، شہری آبادی پر بھی بم گرتے ہیں، رات کل اندھیرا رکھنا پڑتا ہے اور بموں کے دھماکے سے مکان لرزتے ہیں، مگر اللہ کا فضل وکرم ہے کہ اسنے ان حالات میں بھی سلسلہ اس تفسیر کا جاری رکھا، اور اس جنگ کے دس روز میں بھی تفسیر کے تقریباً چالیس صفحات لکھے گئے۔)

سُوْرَةُ القَصَص

سُوْرَةُ الْقَصَصِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانٌ وَّثَمَانُوْنَ اٰيَةً وَّتِسْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ قصص مکی ہے اور اس کی اٹھاسی آیتیں اور نو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

طٰسٓمٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى

یہ آیتیں ہیں کھلی کتاب کی ہم سناتے ہیں تجھ کو کچھ احوال موسیٰ

وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳﴾ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ

اور فرعون کا تحقیقی ان لوگوں کے واسطے جو یقین کرتے ہیں فرعون چڑھ رہا تھا ملک میں

وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ

اور کر رکھا تھا وہاں کے لوگوں کو کئی فرقے کمزور کر رکھا تھا ایک فرقہ کو ان میں ذبح کرتا تھا اُن کے بیٹوں کو

وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴﴾ وَنُرِيْدُ اَنْ

اور زندہ رکھتا تھا انکی عورتوں کو بیشک وہ تھا خرابی ڈالنے والا اور ہم چاہتے ہیں کہ

نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ

احسان کریں ان لوگوں پر جو کمزور ہوئے پڑے تھے ملک میں اور کر دیں اُن کو سردار اور

نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵﴾ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ

کر دیں اُن کو قائم مقام اور جما دیں اُن کو ملک میں اور دکھا دیں فرعون

وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴿۶﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى

اور ہامان کو اور انکے لشکروں کو انکے ہاتھ سے جس چیز کا اُن کو خطرہ تھا اور ہم نے حکم بھیجا

اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَ

موسیٰ کی ماں کو کہ اس کو دودھ پلاتی رہ پھر جب تجھ کو ڈر ہو اسکا تو ڈال دے اس کو دریا میں اور

لَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷﴾

نہ خطرہ کر اور نہ غمگین ہو ہم پھر پہنچا دیں گے اسکو تیری طرف اور کر دیں گے اُس کو رسولوں سے

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ
پھر اُٹھا لیا اُس کو فرعون کے گھر والوں نے کہ ہو اُن کا دشمن اور غم میں ڈالنے والا بیشک فرعون اور

هَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ ﴿۸﴾ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ
ہامان اور اُن کے لشکر تھے چوکنے والے اور بولی فرعون کی عورت یہ تو آنکھوں کی

عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا
ٹھنڈک ہے میرے لئے اور تیرے لئے اسکو مت مارو، کچھ بعید نہیں جو ہمارے کام آئے یا ہم اسکو کرلیں بیٹا

وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹﴾ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ
اور ان کو کچھ خبر نہ تھی اور صبح کو موسیٰ کی ماں کے دل میں قرار نہ رہا قریب تھی کہ

لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰﴾
ظاہر کردے بیقراری کو، اگر نہ ہم نے گرہ دی ہوتی اسکے دل پر اسواسطے کہ رہے یقین کرنے والوں میں

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۫ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱﴾
اور کہدیا اسکی بہن کو پیچھے چلی جا پھر دیکھتی رہی اس کو اجنبی ہو کر اور اُن کو خبر نہ ہوئی

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى
اور روک رکھا تھا ہم نے موسیٰ سے دائیوں کو پہلے سے پھر بولی میں بتلاؤں تم کو ایک

اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ
گھر والے کہ اس کو پال دیں تمھارے لئے اور وہ اسکا بھلا چاہنے والے ہیں، پھر ہم نے پہنچا دیا اسکو اسکی ماں

كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ
کیطرف کہ ٹھنڈی رہے اسکی آنکھ اور غمگین نہ ہو اور جانے کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے پَر

اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾
بہت لوگ نہیں جانتے

ع ۱۳
ع ۱

خُلاصۂ تفسیر

طٰسٓمّٓ (اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (مضامین جو آپ پر وحی کئے جاتے ہیں) کتابِ واضح (یعنی قرآن) کی آیتیں ہیں (جن میں اس مقام پر) ہم آپ کو موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کا کچھ قصہ ٹھیک ٹھیک پڑھ کر (یعنی نازل کرکے) سُناتے ہیں ان لوگوں کے (نفع کے) لئے جو کہ ایمان رکھتے ہیں (کیونکہ مقاصدِ قصص کے یعنی عبرت اور ان سے نبوت پر استدلال وغیرہ یہ مومنین ہی کیساتھ خاص ہیں خواہ اسوقت مومن ہوں یا ایمان کا ارادہ رکھتے ہوں اور اجمال تو اس قصہ کا یہ ہے کہ) فرعون

سرزمین (مصر) میں بہت چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قسمیں کر رکھا تھا (اس طرح
کہ قبطیوں یعنی مصری لوگوں کو معزز بنا رکھا تھا اور سبطیوں یعنی بنی اسرائیل کو پست اور خوار کر رکھا تھا
جسکا آگے بیان ہے) کہ ان (باشندوں) میں سے ایک جماعت (یعنی بنی اسرائیل) کا زور گھٹا رکھا تھا
(اس طرح سے کہ) ان کے بیٹوں کو (جو نئے پیدا ہوتے تھے جلاّدوں کے ہاتھوں) ذبح کراتا تھا اور ان کی
عورتوں (یعنی لڑکیوں) کو زندہ رہنے دیتا تھا (تاکہ ان سے خدمت لیجاوے و نیز ان سے اندیشہ بھی نہ تھا)
واقعی وہ بڑا مفسد تھا (غرض فرعون تو اس خیال میں تھا) اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زمین (مصر) میں
زور گھٹایا جا رہا تھا ہم ان پر (دُنیوی و دینی) احسان کریں اور (وہ احسان یہ کہ) ان کو (دین میں)
پیشوا بنادیں اور (دُنیا میں) ان کو (اس ملک کا) مالک بنائیں اور (مالک ہونے کے ساتھ) انکو (تمکّن
بھی بنائیں یعنی) زمین میں ان کو حکومت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے تابعین کو ان (بنی اسرائیل)
کی جانب سے وہ (ناگوار) واقعات دکھلائیں جن سے وہ بچاؤ کر رہے تھے (مراد اس سے زوالِ سلطنت و
ہلاکت ہے کہ اسی سے بچاؤ کرنے کے لئے بنی اسرائیل کے بچوں کو ایک تعبیر خواب کی بنا پر جو فرعون نے
دیکھا تھا اور نجومیوں نے تعبیر دی تھی قتل کر رہا تھا (کذا فی الدر المنثور) پس ہمارے قضا و قدر
کے سامنے ان لوگوں کی تدبیر کچھ کام نہ آئی، یہ اجمال قصہ کا ہوا) اور (تفصیل اس کی اوّل سے یہ ہے
کہ جب موسیٰ علیہ السلام اسی پُرآشوب زمانہ میں پیدا ہوئے تو) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کو
الہام کیا کہ (جب تک ان کا اخفا ممکن ہو) تم ان کو دودھ پلاؤ پھر جب تم کو ان کی نسبت (جاسوسوں
کے مطلع ہونے کا) اندیشہ ہو تو (بے خوف و خطر) ان کو (صندوق میں رکھ کر) دریا (یعنی نیل) میں
ڈالدینا اور نہ تو (غرق سے) اندیشہ کرنا اور نہ (مفارقت پر) غم کرنا (کیونکہ) ہم ضرور ان کو پھر تمہارے
ہی پاس واپس پہنچادیں گے اور (پھر اپنے وقت پر) ان کو پیغمبر بنادیں گے (غرض وہ اسی طرح
دودھ پلاتی رہیں۔ پھر جب افشائے راز کا خوف ہوا تو صندوق میں بند کر کے اللہ کے نام پر نیل میں
چھوڑ دیا، اسکی کوئی شاخ فرعون کے محل میں جاتی تھی یا تفریحاً فرعون کے متعلقین دریا کی سیر کو نکلے
تھے۔ غرض وہ صندوق کنارے پر لگا) تو فرعون کے لوگوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (یعنی مع صندوق
کے) اٹھالیا تاکہ وہ ان لوگوں کے لئے دشمنی اور غم کا باعث بنیں، بلاشبہ فرعون اور ہامان اور ان کے
تابعین (اس بارہ میں) بہت چوکے (کہ اپنے دشمن کو اپنی بغل میں پالا) اور (جب وہ صندوق سے
نکال کر فرعون کے سامنے لائے گئے تو) فرعون کی بی بی (حضرت آسیہ) نے (فرعون) سے کہا کہ یہ
(بچہ) میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے (یعنی اس کو دیکھ کر جی خوش ہوا کریگا تو) اس کو قتل
مت کرو عجب نہیں کہ (بڑا ہوکر) ہم کو کچھ فائدہ پہنچادے یا ہم اس کو (اپنا) بیٹا ہی بنالیں اور
ان لوگوں کو (انجام کی) خبر نہ تھی (کہ یہ وہی بچہ ہے جس کے ہاتھوں فرعون کی سلطنت غارت ہوگی)

اور (ادھر یہ قصہ ہوا کہ) موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا دل (خیالات مختلفہ کے ہجوم سے) بیقرار ہوگیا (اور بیقراری بھی ایسی ویسی نہیں بلکہ ایسی سخت بیقراری کہ) قریب تھا کہ (غایت بیقراری سے) وہ موسیٰ (علیہ السلام) کا حال (سب پر) ظاہر کر دیتیں اگر ہم اُن کے دل کو اس غرض سے مضبوط نہ کئے رہتے کہ یہ (ہمارے وعدہ پر) یقین کئے (بیٹھی) رہیں (غرض بمشکل انھوں نے دل کو سنبھالا اور تدبیر شروع کی وہ یہ کہ) انھوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کی بہن (یعنی اپنی بیٹی سے) کہا ذرا موسیٰ کا سُراغ تو لگا سو (وہ چلیں اور یہ معلوم کرکے کہ صندوق محل میں کھلا ہے محل میں پہنچیں، یا تو ان کی آمد و رفت ہوگی یا کسی حیلہ سے پہنچیں، اور) انھوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو دُور سے دیکھا اور ان لوگوں کو یہ خبر نہ تھی (کہ یہ ان کی بہن ہیں اور اس فکر میں آئی ہیں) اور ہم نے پہلے ہی سے (یعنی جب سے صندوق سے نکلے تھے) موسیٰ (علیہ السلام) پر دودھ پلائیوں کی بندش کر رکھی تھی (یعنی کسی کا دودھ نہ لیتے تھے) سو وہ (اس حال کو دیکھ کر موقع پاکر) کہنے لگیں کیا میں تم لوگوں کو کسی ایسے گھرانے کا پتہ بتادوں جو تمہارے لئے اس بچّہ کی پرورش کریں اور وہ (اپنی جبلّت کے موافق دل سے) اس کی خیرخواہی کریں (ان لوگوں نے ایسے وقت میں کہ دودھ پلانے کی مشکل پڑ رہی تھی اس مشورہ کو غنیمت سمجھا اور ایسے گھرانے کا پتہ پوچھا انھوں نے اپنی والدہ کا پتہ بتلادیا چنانچہ وہ بُلائی گئیں اور موسیٰ علیہ السلام انکی گود میں دیئے گئے۔ جاتے ہی دودھ پینا شروع کر دیا اور ان لوگوں کی اجازت سے چین سے اپنے گھر لے آئیں اور گاہے گاہے لے جاکر ان کو دکھلا آتیں) غرض ہم نے موسیٰ (علیہ السلام کو اس طرح) انکی والدہ کے پاس (اپنے وعدہ کے موافق) واپس پہنچا دیا تاکہ (اپنی اولاد کو دیکھ کر) انکی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور تاکہ (فراق کے) غم میں نہ رہیں اور تاکہ (مرتبہ معائنہ میں) اس بات کو (اور زیادہ یقین کے ساتھ) جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہوتا ہے لیکن (افسوس کی بات ہے کہ) اکثر لوگ (اسکا) یقین نہیں رکھتے (یہ تعریض ہے کفّار پر)۔

معارف و مسائل

سورۂ قصص مکّی سورتوں میں سب سے آخری سُورت ہے جو ہجرت کے وقت مکہ مکرمہ اور جحفہ (رابغ) کے درمیان نازل ہوئی۔ بعض روایات میں ہے کہ سفرِ ہجرت میں جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جحفہ یعنی رابغ کے قریب پہنچے تو جبرئیل امین تشریف لائے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کیا آپ کو آپ کا وطن جس میں آپ پیدا ہوئے یاد آتا ہے تو آپنے فرمایا کہ ہاں ضرور یاد آتا ہے۔ اس پر جبرئیل امین نے یہ سورتِ قرآن سُنائی جس کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بشارت ہے کہ انجام کار مکہ مکرمہ فتح ہوکر آپکے قبضہ میں آئے وہ آیت یہ ہے اِنَّ

اَلَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ، سورۂ قصص میں سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ پہلے اجمال کے ساتھ پھر تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ نصف سورت تک موسیٰ علیہ السلام کا قصہ فرعون کے ساتھ اور آخر سورت میں قارون کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ پورے قرآن میں کہیں مختصر کہیں مفصل بار بار آیا ہے سورۂ کہف میں تو انکے اُس قصہ کی تفصیل آئی ہے جو حضر علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا، پھر سورۂ طٰہٰ میں پورے قصہ کی تفصیل ہے اور یہی تفصیل سورۂ نمل میں بھی کچھ آئی ہے پھر سورۂ قصص میں اسکا اعادہ ہوا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں جہاں موسیٰ علیہ السلام کے لئے ارشاد ربانی یہ آیا ہے کہ وَفَتَنّٰکَ فُتُوْنًا۔ حضرات محدثین امام نسائی وغیرہ نے اس پورے قصے کی مکمل تفصیل وہاں لکھی ہے احقر نے بھی ابن کثیر کے حوالہ سے یہ مکمل تفصیل سورۂ طٰہٰ میں بیان کردی ہے۔ اس قصہ کے متعلقہ اجزار کی تمام بحثیں اور ضروری مسائل اور فوائد کچھ سورۂ کہف میں باقی سورۂ طٰہٰ میں ذکر کر دیئے گئے ہیں، مسائل مباحث کے لئے اُن کو دیکھنا کافی ہوگا یہاں صرف الفاظ آیات کی مختصر تفسیر پر اکتفا کیا جائے گا۔

وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً الآیۃ، اس آیت میں تدبیر فرعونی کا بمقابلہ تقدیر الٰہی کے نہ صرف خائب و خاسر ہونا بلکہ فرعون اور اسکے سب اہل دربار کو انتہائی بے وقوف بلکہ اندھا بنانے کا ذکر ہے کہ جس لڑکے کے متعلق خواب اور تعبیر خواب کی بنار پر فرعون کو خطرہ لاحق ہوا تھا اور جس کی بنار پر بنی اسرائیل کے لاتعداد نوزائیدہ لڑکوں کو ذبح کرنے کا قانون جاری کیا تھا اس کو حق تعالیٰ نے اسی فرعون کے گھر میں اسی کے ہاتھوں پر ورش کرایا اور والدہ کے اطمینان کے لئے اُنہی کی گود میں حیرت انگیز طریقہ پر پہنچا دیا اور فرعون سے رضاعت کا خرچ جو بعض روایات میں ایک دینار روزانہ بتلایا گیا ہے مزید وصول کیا گیا۔ اور دودھ پلانے کا یہ معاوضہ چونکہ ایک کافر حربی سے اسکی رضامندی کے ساتھ لیا گیا ہے اسلئے اسکے جواز میں بھی کوئی اشکال نہیں۔ اور بالآخر جس خطرہ کے دُور کرنے کے لئے ساری قوم پر یہ مظالم ڈھائے تھے وہ اُسی کے گھر کے اندر سے ایک شدید لاوا بن کر پھوٹا اور خواب کی تعبیر اللہ تعالیٰ نے اُس کو آنکھوں سے دکھادی وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ اِلٰی مَا کَانُوْا یَحْذَرُوْنَ کا یہی حاصل ہے۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰی، وحی کا لفظ اس جگہ لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے، وحی نبوت مراد نہیں اسکی تحقیق سورۂ طٰہٰ میں گزر چکی ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓی اٰتَیْنٰهُ حُکْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَکَذٰلِکَ نَجْزِی

اور جب پہنچ گیا اپنے زور پر اور سنبھل گیا دی ہم نے اسکو حکمت اور سمجھ اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں

الْمُحْسِنِينَ ﴿١٤﴾ وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَىٰ حِينِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا

نیکی والوں کو اور آیا شہر کے اندر جس وقت بے خبر ہوئے تھے وہاں کے لوگ

فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِن شِيعَتِهِ وَهَٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ

پھر پائے اس میں دو مرد لڑتے ہوئے یہ ایک اس کے رفیقوں میں اور یہ دوسرا اسکے دشمنوں میں

فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِن شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ فَوَكَزَهُ

پھر فریاد کی اُس سے اُسنے جو تھا اسکے رفیقوں میں اسکی جو تھا اسکے دشمنوں میں پھر مُکا مارا

مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ ۖ قَالَ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّهُ عَدُوٌّ

اسکو موسٰی نے پھر اس کو تمام کر دیا بولا یہ ہوا شیطان کے کام سے بیشک وہ دشمن ہے

مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ﴿١٥﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي

بہکانے والا صریح بولا اے میرے رب میں نے برا کیا اپنی جان کا، سو بخش مجھ کو

فَغَفَرَ لَهُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿١٦﴾ قَالَ رَبِّ بِمَا أَنْعَمْتَ

پھر اسکو بخشدیا بیشک وہی ہے بخشنے والا مہربان بولا اے رب جیسا تو نے فضل

عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ ﴿١٧﴾ فَأَصْبَحَ فِي الْمَدِينَةِ

کر دیا مجھ پر پھر میں کبھی نہ ہونگا مددگار گنہگاروں کا پھر صبح کو اُٹھا اس شہر میں

خَائِفًا يَتَرَقَّبُ فَإِذَا الَّذِي اسْتَنصَرَهُ بِالْأَمْسِ يَسْتَصْرِخُهُ ۚ

ڈرتا ہوا انتظار کرتا ہوا پھر ناگہاں جس نے کل مدد مانگی تھی اُس سے آج پھر فریاد کرتا ہے اُس سے

قَالَ لَهُ مُوسَىٰ إِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِينٌ ﴿١٨﴾ فَلَمَّا أَنْ أَرَادَ أَن يَبْطِشَ

کہا موسٰی نے بیشک تو بے راہ ہے صریح پھر جب چاہا کہ ہاتھ ڈالے اُس پر

بِالَّذِي هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا قَالَ يَا مُوسَىٰ أَتُرِيدُ أَن تَقْتُلَنِي كَمَا

جو دشمن تھا ان دونوں کا بول اُٹھا اے موسٰی کیا تو چاہتا ہے کہ خون کرے میرا جیسے

قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْأَمْسِ ۖ إِن تُرِيدُ إِلَّا أَن تَكُونَ جَبَّارًا فِي

خون کر چکا ہے کل ایک جان کا تیرا یہی جی چاہتا ہے کہ زبردستی کرتا پھرے

الْأَرْضِ وَمَا تُرِيدُ أَن تَكُونَ مِنَ الْمُصْلِحِينَ ﴿١٩﴾ وَجَاءَ رَجُلٌ

ملک میں اور نہیں چاہتا کہ ہو صلح کرا دینے والا اور آیا شہر کے

مِّنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ قَالَ يَا مُوسَىٰ إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ

پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا کہا اے موسٰی دربار والے مشورہ کرتے ہیں تجھ پر

لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ إِنِّي لَكَ مِنَ النَّاصِحِينَ ﴿٢٠﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا

کہ تجھ کو مار ڈالیں سو نکل جا میں تیرا بھلا چاہنے والا ہوں پھر نکلا وہاں سے ڈرتا ہوا

يَتَرَقَّبُ ۡ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيۡ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۲۱﴾
راہ دیکھتا بولا اے رب بچالے مجھ کو اس قوم بے انصاف سے

خلاصۂ تفسیر

اور جب (پرورش پاکر) اپنی بھری جوانی (کی عمر) کو پہنچے اور (قوتِ جسمانیہ وعقلیہ سے) درست ہوگئے تو ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا فرمایا (یعنی نبوت سے پہلے ہی فہم سلیم و عقلِ مستقیم جس سے حسن و قبح میں امتیاز کر سکیں عنایت فرمائی) اور ہم نیکو کاروں کو یوں ہی صلہ دیا کرتے ہیں (یعنی عمل صالح سے فیضانِ علمی میں ترقی ہوتی ہے۔ اسمیں اشارہ ہے کہ فرعون کے مشرب کو موسیٰ علیہ السلام نے کبھی اختیار نہ کیا تھا بلکہ اس سے نفور رہے) اور (اسی زمانہ کا ایک واقعہ یہ ہوا کہ ایکبار) موسیٰ (علیہ السلام) شہر میں (یعنی مصر میں کذا فی الروح عن ابن اسحٰق کہیں باہر سے) ایسے وقت پہنچے کہ وہاں کے (اکثر) باشندے بے خبر (پڑے سو رہے) تھے (اکثر روایات سے یہ وقت دو پہر کا معلوم ہوتا ہے اور بعض روایات سے کچھ رات گئے کا وقت معلوم ہوتا ہے کذا فی الدر المنثور) تو انھوں نے وہاں دو آدمیوں کو لڑتے دیکھا، ایک تو ان کی برادری (یعنی بنی اسرائیل) میں کا تھا اور دوسرا ان کے مخالفین (یعنی فرعون کے متعلقین ملازمین) میں سے تھا (دونوں کسی بات پر الجھ رہے تھے اور زیادتی اس فرعونی کی تھی) سو وہ جو ان کی برادری کا تھا اس نے (جو) موسیٰ (علیہ السلام کو دیکھا تو ان) سے اسکے مقابلہ میں جو کہ انکے مخالفین میں سے تھا مدد چاہی (موسیٰ علیہ السلام نے اول اسکو سمجھایا جب اسپر بھی وہ باز نہ آیا) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے (تادیباً دفع ظلم کیلئے) اس کو (ایک) گھونسا مارا سو اسکا کام بھی تمام کر دیا (یعنی اتفاق سے وہ مر ہی گیا) موسیٰ (علیہ السلام اس خلاف توقع نتیجہ سے بہت پچھتائے اور) کہنے لگے کہ یہ تو شیطانی حرکت ہوگئی بیشک شیطان (بھی آدمی کا) کھلا دشمن ہے کسی غلطی میں ڈالدیتا ہے (اور نادم ہو کر حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھ سے قصور ہوگیا آپ معاف کر دیجئے سو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا، بلاشبہ وہ غفور رحیم ہے (گو ظہور اور علم اس معافی کا قطعی طور پر وقت عطاء نبوت کے ہوا کما فی النمل اِلَّا مَنۡ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسۡنًۢا بَعۡدَ سُوۡٓءٍ فَاِنِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ، اور اس وقت خواہ الہام سے معلوم ہوگیا ہو یا بالکل نہ معلوم ہوا ہو) موسیٰ (علیہ السلام) نے (توبہ عن الماضی کے ساتھ مستقبل کے متعلق یہ بھی) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار چونکہ آپنے مجھ پر (بڑے بڑے) انعامات فرمائے ہیں (جنکا ذکر طٰہٰ میں ہے وَلَقَدۡ مَنَنَّا عَلَیۡکَ مَرَّۃً اُخۡرٰۤی الیٰ قولہ وَلَا تَحۡزَنَ) سو کبھی میں مجرموں کی مدد نہ کرونگا (یہاں مجرمین سے مراد وہ ہیں جو دوسروں سے گناہ کا کام کرانا چاہیں، کیونکہ گناہ کرانا کسی سے یہ بھی جرم ہے پس اسمیں شیطان بھی داخل ہوگیا

کہ وہ گناہ کراتا ہے اور گناہ کرنیوالا اسکی مدد کرتا ہے خواہ عمداً یا خطاءً جیسے اس آیت میں ہے وکان الکافر
علیٰ ربہ ظہیراً ای للشیطان، مطلب یہ ہوا کہ میں شیطان کا کہنا کبھی نہ مانوں گا یعنی مواقع محتملہ خطاء
میں احتیاط و تیقظ سے کام لونگا اور اصل مقصود اتنا ہی ہے مگر شمول حکم کے لئے مجرمین جمع کا صیغہ
لایا گیا کہ اوروں کو بھی عام ہو جاوے بغرض اس اثناء میں اسکا چرچا ہو گیا مگر بجز اسرائیلی کے کوئی
واقفِ راز نہ تھا اور چونکہ اسی کی حمایت میں یہ واقعہ ہوا تھا اس لئے اُسنے اظہار نہیں کیا اسوجہ
سے کسی کو اطلاع نہوئی مگر موسیٰ علیہ السلام کو اندیشہ رہا، یہانتک رات گزری) پھر موسیٰ (علیہ السلام
کو شہر میں صبح ہوئی خوف اور دہشت کیحالت میں کہ اچانک (دیکھتے کیا ہیں کہ) وہی شخص جس
نے کل گزشتہ میں ان سے امداد چاہی ہے وہ پھر ان کو (مدد کے لئے) پکار رہا ہے کہ کسی اور سے
اُلجھ پڑا تھا) موسیٰ (علیہ السلام یہ دیکھ کر اور کل کی حالت یاد کر کے اس پر ناخوش ہوئے اور) اس
سے فرمانے لگے بیشک تو صریح بدراہ (آدمی) ہے کہ روز لوگوں سے لڑا کرتا ہے موسیٰ علیہ السلام
کو قرائن سے معلوم ہوا ہوگا کہ اس کی طرف سے بھی کوئی غصہ ہوا ہے لیکن زیادتی فرعونی کی
دیکھ کر اس کو روکنے کا ارادہ کیا) سو جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اسپر ہاتھ بڑھایا جو دونوں کا مخالف
تھا (مراد فرعونی ہے کہ وہ اسرائیلی کا بھی مخالف تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا بھی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام
بنی اسرائیل میں سے ہیں اور وہ لوگ سب بنی اسرائیل کے مخالف تھے گویا بالتعیین موسیٰ علیہ السلام
کو اسرائیلی نہ سمجھا ہو اور یا موسیٰ علیہ السلام چونکہ فرعون کے طریقہ سے نفور تھے یہ امر مشہور ہو گیا
ہو اسلئے فرعون والے ان کے مخالف ہو گئے ہوں۔ بہر حال جب موسیٰ علیہ السلام نے اس فرعونی
پر ہاتھ لپکایا اور اس سے پہلے اسرائیلی پر خفا ہو چکے تھے تو اس سے اس اسرائیلی کو شبہ ہوا کہ
شاید آج مجھ پر دار و گیر کرینگے تو گھبرا کر) وہ اسرائیلی کہنے لگا اے موسیٰ کیا (آج) مجھ کو قتل کرنا چاہتے
ہو جیسا کہ کل ایک آدمی کو قتل کر چکے ہو (معلوم ہوتا ہے کہ) بس تم دُنیا میں اپنا زور بٹھلانا چاہتے
ہو اور صلح (اور ملاپ) کروانا نہیں چاہتے (یہ کلمہ اس فرعونی نے سُنا، قاتل کی تلاش ہو رہی تھی
اتنا سُراغ لگ جانا بہت ہے فوراً فرعون کو خبر پہنچا دی۔ فرعون اپنے آدمی کے مارے جانے سے
برہم تھا یہ سُن کر آشفتہ ہوا اور شاید اس سے اسکا وہ خواب کا اندیشہ قوی ہو گیا ہو کہ کہیں وہ
شخص یہی نہ ہو، خصوصاً اگر موسیٰ علیہ السلام کا فرعونی طریقہ کو ناپسند کرنا بھی فرعون کو معلوم ہو تو
کچھ عداوت اس سبب سے ہوگی اس پر یہ مزید ہوا بہر حال اس نے اپنے درباریوں کو مشورہ کے
لئے جمع کیا اور اخیر رائے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی قرار پائی) اور (اس مجمع میں) ایک شخص
(موسیٰ علیہ السلام کے محب اور خیر خواہ تھے وہ) شہر کے (اس) کنارے سے (جہاں یہ مشورہ ہو رہا تھا
موسیٰ علیہ السلام کے پاس نزدیک کی گلیوں سے) دوڑتے ہوئے آئے (اور) کہنے لگے کہ اے موسیٰ

اہلِ دربار آپکے متعلق مشورہ کر رہے ہیں کہ آپ کو قتل کر دیں سو آپ (یہاں سے) چلدیجئے میں آپ کی خیر خواہی کر رہا ہوں پس (یہ سُن کر) موسیٰ (علیہ السلام) وہاں سے (کسی طرف کو) نکل گئے، خوف اور وحشت کی حالت میں (اور چونکہ راستہ معلوم نہ تھا دُعا کے طور پر) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو ان ظالم لوگوں سے بچا لیجئے (اور امن کی جگہ پہنچا دیجئے)۔

معارف ومسائل

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى، اَشُدّ کے لفظی معنے قوت وشدت کی انتہا پر پہنچنا ہے یعنی انسان بچپن کے ضعف سے تدریجاً قوت وشدت کی طرف بڑھتا ہے ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اسکے وجود میں جتنی قوت وشدت آسکتی تھی وہ پوری ہو جائے اسوقت کو اَشُدّ کہا جاتا ہے اور یہ زمین کے مختلف خطوں اور قوموں کے مزاج کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے کسی کا اَشُدّ کا زمانہ جلد آجاتا ہے کسی کا دیر میں۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد سے بروایت عبد ابن حمید یہ منقول ہے کہ اَشُدّ عمر کے تینتیس سال میں ہوتا ہے اسی کو سِن کمال یا سِن وقوف کہا جاتا ہے جسمیں بدن کا نشو ونما ایک حد پر پہنچکر رُک جاتا ہے اسکے بعد چالیس کی عمر تک توقف کا زمانہ ہے اسی کو استویٰ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے چالیس سال کے بعد انحطاط اور کمزوری شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمر کا اَشُدّ تینتیس سال کی عمر سے شروع ہو کر چالیس سال تک رہتا ہے۔ (روح وقرطبی)

اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا، حکم سے مراد نبوت ورسالت ہے اور علم سے مراد احکام الٰہیہ شرعیہ کا علم ہے۔ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا، المدینۃ سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک شہر مصر ہے۔ اسمیں داخل ہونے کے لفظ سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام مصر سے باہر کہیں گئے ہوئے تھے پھر ایک روز اس شہر میں ایسے وقت داخل ہوئے جو عام لوگوں کی غفلت کا وقت تھا۔ آگے قتل قبطی کے قصہ میں اسکا بھی تذکرہ ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی نبوت و رسالت کا اور دینِ حق کا اظہار شروع کر دیا تھا اسی کے نتیجہ میں کچھ لوگ انکے مطیع وفرمانبردار ہو گئے تھے جو انکے متبعین کہلاتے تھے مِنْ شِيْعَتِهٖ کا لفظ اس پر شاہد ہے۔ ان تمام قرائن سے اس روایت کی تائید ہوتی ہے جو ابن اسحٰق اور ابن زید سے منقول ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے ہوش سنبھالا اور دینِ حق کی کچھ باتیں لوگوں سے کہنے لگے تو فرعون ان کا مخالف ہو گیا اور قتل کا ارادہ کیا مگر فرعون کی بیوی حضرت آسیہ کی درخواست پر انکے قتل سے باز آیا مگر ان کو شہر سے نکالنے کا حکم دیدیا۔ اسکے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر سے کسی جگہ رہنے لگے اور کبھی کبھی چھپ کر مصر شہر میں آتے تھے، اور عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک دوپہر کا وقت ہے جبکہ لوگ قیلولہ میں تھے۔ (قرطبی)

فَوَکَزَہٗ مُوْسٰی، وکز کے معنے مُکّا مارنے کے ہیں فَقَضٰی عَلَیْہِ، قضاہ اور قضیٰ علیہ کا محاورہ اُس وقت بولا جاتا ہے جب کسی شخص کا بالکل کام تمام کر دے اور فارغ ہو جائے۔ اسی لئے یہاں اسکے معنی قتل کر دینے کے ہیں۔ (مظہری)

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَغَفَرَ لَہٗ، اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ اس قبطی کافر کا قتل جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بلا ارادہ صادر ہوگیا تھا موسیٰ علیہ السلام نے اسکو بھی اپنے منصب نبوت و رسالت اور پیغمبرانہ عظمتِ شان کے لحاظ سے اپنا گناہ قرار دیکر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کی اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا۔ یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ قبطی کافر شرعی اصطلاح کے لحاظ سے ایک حربی کافر تھا جسکا قتل عمداً بھی مباح اور جائز تھا کیونکہ نہ یہ کسی اسلامی حکومت کا ذمی تھا نہ موسیٰ علیہ السلام سے اسکا کوئی معاہدہ تھا پھر موسیٰ علیہ السلام نے اسکو عملِ شیطان اور گناہ کیوں قرار دیا؟ اسکا قتل تو بظاہر موجبِ اجر ہونا چاہیئے تھا کہ ایک مسلمان پر ظلم کر رہا تھا اسکو بچانے کے لئے یہ قتل واقع ہوا۔

جواب یہ ہے کہ معاہدہ جیسے قولی اور تحریری ہوتا ہے جیسے عموماً اسلامی حکومتوں میں اہلِ ذمہ سے معاہدہ یا کسی غیر مسلم حکومت سے صلح کا معاہدہ اور یہ معاہدہ باتفاق واجب العمل اور اسکی خلاف ورزی غدر اور عہد شکنی کے سبب حرام ہوتی ہے اسی طرح معاہدہ عملی بھی ایک قسم کا معاہدہ ہی ہوتا ہے اس کی بھی پابندی لازمی اور خلاف ورزی عہد شکنی کے مرادف ہے۔

معاہدہ عملی کی صورت یہ ہے کہ جس جگہ مسلمان اور کچھ غیر مسلم کسی دوسری حکومت میں باہمی امن و اطمینان کے ساتھ رہتے بستے ہوں، ایک دوسرے پر حملہ کرنا یا لوٹ مار کرنا طرفین سے غداری سمجھا جاتا ہو تو اس طرح کی معاشرت اور معاملات بھی ایک قسم کا عملی معاہدہ ہوتے ہیں انکی خلاف ورزی جائز نہیں اسکی دلیل حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی وہ طویل حدیث ہے جس کو امام بخاری نے کتاب الشروط میں مفصل روایت کیا ہے اور واقعہ اسکا یہ تھا کہ حضرت مغیرہ ابن شعبہ قبل از اسلام اپنے زمانۂ جاہلیت میں ایک جماعت کفار کے ساتھ مصاحبت اور معاشرت رکھتے تھے پھر انکو قتل کر کے انکے اموال پر قبضہ کر لیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیخدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے اور جو مال ان لوگوں کا لیا تھا وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا اس پر آپ نے ارشاد فرمایا، اما الاسلام فاقبل واما المال فلست منہ فی شیٔ اور ابو داؤد کی روایت میں اسکے الفاظ یہ ہیں، اما المال فمال غدر لاحاجۃ لنا فیہ، یعنی آپ کا اسلام تو ہمنے قبول کر لیا اور اب آپ مسلمان ہیں مگر یہ مال ایسا مال ہے جو غدر اور عہد شکنی سے حاصل ہوا ہے اسلئے ہمیں اس مال کی کوئی حاجت نہیں۔

شارح بخاری حافظ ابن حجر نے شرح میں فرمایا کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ کفار کا مال حالتِ امن میں لوٹ لینا حلال نہیں کیونکہ ایک بستی کے رہنے والے یا ایک ساتھ کام کرنے والے

ایک دوسرے سے اپنے کو مامون سمجھتے ہیں اُن کا یہ عملی معاہدہ بھی ایک امانت ہے جس کا صاحب امانت کو ادا کرنا فرض ہے چاہے وہ کافر ہو یا مسلم۔ اور کفار کے اموال جو مسلمانوں کے لئے حلال ہوتے ہیں تو وہ صرف محاربہ اور مغالبہ کی صورت میں حلال ہوتے ہیں، حالتِ امن و امان میں جبکہ ایک دوسرے سے اپنے کو مامون سمجھ رہا ہو کسی کافر کا مال لوٹ لینا جائز نہیں اور قسطلانی نے شرح بخاری میں فرمایا

ان اموال المشرکین ان کانت مغنومة عند القھر فلا یحل اخذھا عند الامن فاذا کان الانسان مصاحبا لھم فقد امن کل واحد منھم صاحبہ فسفك الدماء واخذ المال مع ذلك غدر وحرام الا ان ینبذ الیھم عھدھم علی سواء

بیشک مشرکین کے اموال جنگ اور جہاد کے وقت مغنوم و مباح ہیں لیکن امن کی حالت میں حلال نہیں اسلئے جو مسلمان کفار کے ساتھ رہتا سہتا ہو کہ عملی طور پر ایک دوسرے سے مامون ہو تو ایسی حالت میں کسی کافر کا خون بہانا یا مال زبردستی لینا غدر حرام ہے جب تک کہ اُن کے اس عملی معاہدہ سے دستبرداری کا اعلان نہ کردے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قبطی کا قتل اس عملی معاہدہ کی بناء پر اگر بالقصد ہوتا تو جائز نہیں تھا مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسکے قتل کا ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ اسرائیلی شخص کو اسکے ظلم سے بچانے کے لئے ہاتھ کی ضرب لگائی جو عادۃً سبب قتل نہیں ہوتی مگر قبطی اس ضرب سے مرگیا تو موسیٰ علیہ السلام کو احساس ہوا کہ اسکو دفع کرنے کے لئے اس ضرب سے کم درجہ بھی کافی تھا یہ زیادتی میرے لئے درست نہ تھی، اسی لئے اسکو عمل شیطان قرار دے کر اُس سے مغفرت طلب فرمائی۔

فائدہ یہ تحقیق حکیم الامۃ مجدد الملۃ سیدی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی ہے جو آپ نے بزبانِ عربی احکام القرآن سورۂ قصص لکھتے وقت ارشاد فرمائی تھی اور یہ آخری علمی تحقیق ہے جس کا استفادہ احقر نے حضرت رحمہ سے کیا کیونکہ آپ نے یہ ارشاد ۲ رجب ۱۳۶۲ھ میں فرمایا تھا اس کے بعد مرض کی شدت بڑھی اور ۱۶ رجب کو یہ آفتاب عالم غروب ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اگرچہ قبطی کا قتل مباح تھا مگر انبیاء علیہم السلام مباحات میں بھی اہم معاملات میں اسوقت تک اقدام نہیں کرتے جب تک خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کیطرف سے اجازت و اشارہ نہ ملے، اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خصوصی اجازت کا انتظار کئے بغیر یہ اقدام فرمایا تھا اسلئے اپنی شان کے مطابق اس کو گناہ قرار دیکر استغفار کیا (کذا فی الروح وغیرہ ولہ وجہ)

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ اَکُوْنَ ظَہِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس لغزش کو جب حق تعالیٰ نے معاف فرما دیا تو آپ نے اس نعمت کے شکر میں یہ عرض کیا کہ میں آئندہ کسی مجرم کی مدد نہ کروں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس اسرائیلی کی مدد کے لئے یہ اقدام کیا تھا دوسرے واقعہ سے یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ وہ خود ہی جھگڑالو ہے، جھگڑا لڑائی اسکی عادت ہے

اسلئے اس کو مجرم قرار دے کر آئندہ کسی ایسے شخص کی مدد نہ کرنے کا عہد فرمایا۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے اس جگہ مجرمین کی تفسیر کافرین کے ساتھ منقول ہے اور قتادہ نے بھی تقریباً ایسا ہی فرمایا ہے اس تفسیر کی بناء پر واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسرائیلی جس کی امداد موسیٰ علیہ السلام نے کی تھی یہ بھی مسلمان نہ تھا مگر اُس کو مظلوم سمجھ کر امداد فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد سے دو مسئلے ثابت ہوئے۔

مسئلہ: اوّل یہ کہ مظلوم اگرچہ کافر یا فاسق ہی ہو اُس کی امداد کرنا چاہیئے۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ کسی مجرم ظالم کی مدد کرنا جائز نہیں۔ علماء نے اس آیت سے استدلال فرما کر ظالم حکام کی ملازمت کو بھی ناجائز قرار دیا ہے کہ وہ بھی اُن کے ظلم کے شریک سمجھے جائیں گے اور اس پر سلف صالحین سے متعدد روایات نقل کی ہیں (کما فی روح المعانی) کفار یا ظالموں کی امداد و اعانت کی مختلف صورتیں ہیں اور انکے احکام کتب فقہ میں مفصّل مذکور ہیں۔ احقر نے احکام القرآن میں بزبان عربی اسی آیت کے ذیل میں اس مسئلہ کی پوری تحقیق و تنقیح لکھدی ہے اہل علم اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ
اور جب منہ کیا مدین کی سیدھ پر بولا اُمید ہے کہ میرا رب لے جائے مجھ کو سیدھی

السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ
راہ پر اور جب پہنچا مدین کے پانی پر پایا وہاں ایک جماعت کو لوگوں کی

يَسْقُوْنَ ۠ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا
پانی پلاتے ہوئے، اور پایا اُن سے ورے دو عورتوں کو کہ روکے ہوئے کھڑی تھیں اپنی بکریاں، بولا تمھارا

خَطْبُكُمَا ۭ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٧ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ
کیا حال ہے بولیں ہم نہیں پلاتیں پانی چرواہوں کے پھیرلے جانے تک اور ہمارا باپ بوڑھا ہے

كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ
بڑی عمر کا پھر اُسنے پانی پلا دیا انکے جانوروں کو پھر ہٹ کر آیا چھاؤں کی طرف، بولا اے رب تو جو چیز

اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى
اُتارے میری طرف اچھی میں اُسی کا محتاج ہوں پھر آئی اسکے پاس ان دونوں میں سے ایک چلتی تھی

اسْتِحْيَآءٍ ۡ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ
شرم سے بولی میرا باپ تجھ کو بُلاتا ہے کہ بدلے میں دے حق اسکا کہ تونے پانی پلا دیا ہمارے جانوروں

لَنَا ۭ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ
کو پھر جب پہنچا اسکے پاس اور بیان کیا اُس سے احوال، کہا مت ڈر بچ آیا تو

مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ؗ

اس قوم بے انصاف سے بولی ان دونوں میں سے ایک اے باپ اس کو نوکر رکھ لے

اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ

البتہ بہتر نوکر جس کو تو رکھنا چاہے وہ ہے جو زور آور ہو امانتدار کہا میں چاہتا ہوں کہ

اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ

بیاہ دوں تجھ کو ایک بیٹی اپنی ان دونوں میں سے اس شرط پر کہ تو میری نوکری کرے آٹھ

حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ

برس پھر اگر تو پورے کرے دس برس تو وہ تیری طرف سے ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر

اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ

تکلیف ڈالوں، تو پائے گا مجھ کو اگر اللہ نے چاہا نیک بختوں سے بولا

ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ

یہ وعدہ ہو چکا میرے اور تیرے بیچ جونسی مدت ان دونوں میں پوری کر دوں، سو زیادتی نہ ہو مجھ پر

وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۲۸﴾ ع

اور اللہ پر بھروسہ اس چیز کا جو ہم کہتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور جب موسیٰ (علیہ السلام یہ دُعا کر کے ایک سمت کو توکلاً علی اللہ چلے اور بتائید غیبی) مدین کی طرف ہولئے (چونکہ راستہ معلوم نہ تھا اسلئے تقویت و توکل اور نفس کو تسکین دینے کے لئے آپ ہی آپ) کہنے لگے کہ اُمید ہے کہ میرا رب مجھ کو (کسی مقام امن کا) سیدھا رستہ چلا دیگا (چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مدین جا پہنچے) اور جب مدین کے پانی (یعنی کنوئیں) پر پہنچے تو اس پر (مختلف) آدمیوں کا ایک مجمع دیکھا جو (اس کنوئیں سے کھینچ کھینچ کر اپنے مواشی کو) پانی پلا رہے تھے اور ان لوگوں سے ایک طرف (الگ) دو عورتیں دیکھیں کہ وہ (اپنی بکریاں) روکے کھڑی ہیں، موسیٰ (علیہ السلام) نے (ان سے) پوچھا تمہارا کیا مطلب ہے وہ دونوں بولیں کہ (ہمارا معمول یہ ہے کہ) ہم (اپنے جانوروں کو) اسوقت تک پانی نہیں پلاتے جب تک کہ یہ چرواہے (جو کنوئیں پر پانی پلا رہے ہیں) پانی پلا کر (جانوروں کو) ہٹا کر نہ لے جاویں (ایک تو حیا کے سبب، دوسرے مردوں سے مزاحمت ناتوانوں سے کب ہو سکتی ہے) اور (اس حالت میں ہم آتے بھی نہیں مگر) ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں (اور گھر پر اور کوئی کام کرنے والا ہی نہیں اور کام ضروری ہے اس مجبوری کو ہم کو آنا پڑتا ہے) پس (یہ سنکر)

موسیٰ (علیہ السلام کو رحم آیا اور اُنھوں نے) ان کے لئے پانی (کھینچ کر انکے جانوروں کو) پلایا (اور ان کو انتظار اور پانی کھینچنے کی تکلیف سے بچایا) پھر (وہاں سے) ہٹ کر (ایک) سایہ (کی جگہ) میں جا بیٹھے (خواہ کسی پہاڑ کا سایہ ہو یا کسی درخت کا) پھر (جناب باری میں) دُعا کی کہ اے میرے پروردگار (اس وقت) جو نعمت بھی (قلیل یا کثیر) آپ مجھ کو بھیجدیں میں اسکا (سخت) حاجتمند ہوں (کیونکہ اس سفر میں کچھ کھانے پینے کو نہ ملا تھا۔ حق تعالیٰ نے اسکا یہ سامان کیا کہ وہ دونوں بیبیاں اپنے گھر لوٹ کر گئیں تو باپ نے معمول سے جلدی آجانے کی وجہ دریافت کی، اُنھوں نے موسیٰ علیہ السلام کا پورا قصہ بیان کیا انھوں نے ایک لڑکی کو بھیجا کہ اُن کو بلا لاؤ) موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس ایک لڑکی آئی کہ شرماتی ہوئی چلتی تھی (جو کہ اہل شرف کی طبعی حالت ہے اور آکر) کہنے لگی کہ میرے والد تمکو بلاتے ہیں تاکہ تم کو اسکا صلہ دیں جو تمنے ہماری خاطر (ہمارے جانوروں کو) پانی پلا دیا تھا (یہ ان صاحبزادی کو اپنے والد کی عادت سے معلوم ہوا ہوگا کہ احسان کی مکافات کیا کرتے ہونگے۔ موسیٰ علیہ السلام ساتھ ہولئے گو مقصود موسیٰ علیہ السلام کا بالیقین اپنی خدمت کا معاوضہ لینا نہ تھا، لیکن مقام امن اور کسی رفیق شفیق کے ضرور باقتضائے وقت جویاں تھے، اور اگر بھوک کی شدت بھی اس جانے کا ایک جزو علت ہو تو مضائقہ نہیں اور اس کو اُجرت سے کچھ تعلق نہیں اور ضیافت کی تو استدعا بھی بالخصوص حاجت کے وقت اور خصوصاً کریم و شریف آدمی سے کچھ ذلت نہیں چہ جائیکہ دوسرے کی استدعا پر ضیافت کا قبول کر لینا، راہ میں موسیٰ علیہ السلام نے ان بی بی سے فرمایا کہ تم میرے پیچھے ہو جاؤ میں اولاد ابراہیم سے ہوں، اجنبیہ کو بے وجہ بے قصد دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا، غرض اسی طرح ان بزرگ کے پاس پہنچے) سو جب اُن کے پاس پہنچے اور ان سے تمام حال بیان کیا تو اُنھوں نے (تسلی دی اور) کہا کہ (اب) اندیشہ نہ کرو تم ظالم لوگوں سے بچ آئے (کیونکہ اس مقام پر فرعون کی عملداری نہ تھی کذا فی الروح، پھر) ایک لڑکی نے کہا کہ ابا جان (آپ کو آدمی کی ضرورت ہے اور ہم سیانی ہوگئیں اب گھر میں رہنا مناسب ہے تو) آپ ان کو نوکر رکھ لیجئے، کیونکہ اچھا نوکر وہ شخص ہے جو مضبوط (ہو اور) امانت دار (بھی) ہو (اور ان میں دونوں صفتیں ہیں، چنانچہ قوت انکے پانی کھینچنے سے اور امانت ان کے برتاؤ سے، خصوصاً راہ میں عورت کو پیچھے کر دینے سے ظاہر ہوتی تھی اور اپنے باپ سے بھی بیان کیا تھا اس پر) وہ (بزرگ موسیٰ علیہ السلام سے) کہنے لگے میں چاہتا ہوں کہ ان دو لڑکیوں میں سے ایک کو تمھارے ساتھ بیاہ دوں اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو (اور اس نوکری کا بدلہ وہی نکاح ہے، حاصل یہ کہ آٹھ سال کی خدمت اس نکاح کا مہر ہے) پھر اگر تم دس سال پورے کر دو تو یہ تمھاری طرف سے (احسان) ہے (یعنی میری طرف سے جبر نہیں) اور میں (اس معاملہ میں) تم پر کوئی مشقت ڈالنا نہیں چاہتا (یعنی

کام لینے اور وقت کی پابندی وغیرہ معاملہ کی فروعات میں آسانی برتوں گا اور) تم مجھ کو انشاء اللہ تعالیٰ خوش معاملہ پاؤ گے موسیٰ (علیہ السلام رضامند ہو گئے اور) کہنے لگے کہ (بس تو) یہ بات میرے اور آپکے درمیان (پکی) ہو چکی، میں ان دونوں مدتوں میں سے جس (مدت) کو بھی پورا کر دوں مجھ پر کوئی جبر نہ ہوگا اور ہم جو (معاملہ) کی بات چیت کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اسکا گواہ (کافی) ہے (اسکو حاضر ناظر سمجھ کر عہد پورا کرنا چاہیے)۔

معارف و مسائل

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ، مَدْيَنَ ملک شام کے ایک شہر کا نام ہے جو مدین بن ابراہیمؑ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ علاقہ فرعونی حکومت سے خارج تھا۔ مصر سے مدین کی مسافت آٹھ منزل کی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعونی سپاہیوں کے تعاقب کا طبعی خوف پیش آیا، جو نہ نبوت و معرفت کے منافی ہے نہ توکل کے، تو مصر سے ہجرت کا ارادہ کیا اور مدین کی سمت شاید اسلئے متعین کی کہ مدین بھی اولاد ابراہیم علیہ السلام کی بستی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اُن کی اولاد میں تھے۔

اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام بالکل بے سروسامانی کے ساتھ اسطرح مصر سے نکلے کہ نہ کوئی توشہ ساتھ تھا نہ کوئی سامان اور نہ راستہ معلوم، اسی اضطرار کی حالت میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کیطرف متوجہ ہوئے اور فرمایا عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ، یعنی امید ہے کہ میرا رب مجھے سیدھا راستہ دکھائے گا، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی۔ مفسرینؒ کا بیان ہے کہ اس سفر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غذا صرف درختوں کے پتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سب سے پہلا ابتلاء اور امتحان تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے ابتلاءات اور امتحانات کی تفصیل سورۂ طٰہٰ میں ایک طویل حدیث کے حوالہ سے بیان ہو چکی ہے۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ، مَآءَ مَدْيَنَ سے مُراد وہ کنواں ہے جس سے اس بستی کے لوگ اپنے مواشی کو پانی پلاتے تھے وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ، یعنی دو عورتوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بکریوں کو پانی کیطرف جانے سے روک رہی تھیں تاکہ اُن کی بکریاں دوسرے لوگوں کی بکریوں میں رَل نہ جائیں۔

قَالَ مَا خَطْبُكُمَا قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ سکتہ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ، لفظ خطب شان اور حال کے معنے میں جبکہ وہ کوئی اہم کام ہو۔ معنے یہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان دونوں عورتوں سے پوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے کہ تم اپنی بکریوں کو روکے کھڑی ہو دوسرے لوگوں کی طرح کنوئیں کے پاس لاکر پانی نہیں پلاتیں؟ ان دونوں نے یہ جواب دیا کہ ہماری عادت یہی ہے کہ ہم مردوں

کے ساتھ اختلاط سے بچنے کے لئے اسوقت تک اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلاتیں جب تک یہ لوگ کنویں پر ہوتے ہیں، جب یہ چلے جاتے ہیں تو ہم اپنی بکریوں کو پلاتے ہیں اور اسمیں جو یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا تمھارا کوئی مرد نہیں جو عورتوں کو اس کام کے لئے نکالا؟ اسکا جواب بھی ان عورتوں نے ساتھ ہی دیدیا کہ ہمارے والد بوڑھے ضعیف العمر ہیں وہ یہ کام نہیں کرسکتے اسلئے ہم مجبور ہوئے۔

اس واقعہ سے چند اہم فوائد حاصل ہوئے۔ اوّل یہ کہ ضعیفوں کی امداد انبیاء کی سنت ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دو عورتوں کو دیکھا کہ بکریوں کو پانی پلانے کے لئے لائی ہیں مگر اُن کو لوگوں کے ہجوم کے سبب موقع نہیں مل رہا تو ان سے حال دریافت کیا۔ **دوسرا** یہ کہ اجنبی عورت سے بوقت ضرورت بات کرنے میں مضائقہ نہیں جب تک کہ کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔ **تیسرا** یہ کہ اگرچہ یہ واقعہ اُس زمانے کا ہے جبکہ عورتوں پر پردہ لازم نہیں تھا جسکا سلسلہ اسلام کے بھی ابتدائی زمانہ تک جاری رہا۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد عورتوں کے لئے پردہ کے احکام نازل ہوئے، لیکن اسوقت بھی پردہ کا جو اصل مقصد ہے وہ طبعی شرافت اور حیا کے سبب عورتوں میں موجود تھا کہ ضرورت کے باوجود مردوں کے ساتھ اختلاط گوارا نہ کیا اور تکلیف اُٹھانا قبول کیا۔ **چوتھا** یہ کہ عورتوں کا اس طرح کے کاموں کے لئے باہر نکلنا اسوقت بھی پسندیدہ نہیں تھا اسی لئے اُنھوں نے اپنے والد کے معذور ہونے کا عذر بیان کیا۔

فَسَقٰى لَهُمَا، یعنی موسیٰ علیہ السلام نے ان عورتوں پر رحم کھا کر کنویں سے پانی نکال کر ان کی بکریوں کو سیراب کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ چرواہوں کی عادت یہ تھی کہ اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے بعد کنویں کو ایک بھاری پتھر سے بند کر دیتے تھے اور یہ عورتیں اپنی بکریوں کے لئے بچے کچے پانی پر اکتفا کرتی تھیں۔ یہ بھاری پتھر ایسا تھا جس کو دس آدمی مل کر اُٹھاتے تھے مگر موسیٰ ؑ نے اس کو تنہا اٹھا کر الگ کر دیا اور کنویں سے پانی نکالا۔ شاید اسی وجہ سے ان عورتوں میں سے ایک نے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اپنے والد سے یہ کہا کہ یہ قوی ہیں۔ (قرطبی)

ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سات روز سے کوئی غذا نہیں چکھی تھی، اسوقت ایک درخت کے سائے میں آکر اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حالت اور حاجت پیش کی جو دُعا کرنے کا ایک لطیف طریقہ ہے۔ لفظ خیر کبھی مال کے معنے میں آتا ہے جیسا اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ میں ہے، کبھی قوت کے معنے میں آتا ہے جیسے اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ میں کبھی کھانے کے معنے میں بھی آتا ہے جو اس جگہ مراد ہے (قرطبی)

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِىْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ، قرآنی اسلوب کے مطابق یہاں قصہ کو مختصر کر دیا گیا ہے۔ پورا واقعہ یہ ہوا کہ یہ عورتیں اپنے مقررہ وقت سے پہلے جلدی سے گھر پہنچ گئیں تو انکے والد نے وجہ دریافت کی، لڑکیوں نے واقعہ بتلایا۔ والد نے چاہا کہ اس شخص نے احسان کیا ہے

اسکی مکافات کرنا چاہیئے اسلئے انھیں لڑکیوں میں سے ایک کو ان کے بلانے کے لئے بھیجا۔ یہ حیاء کے ساتھ چلتی ہوئی پہنچی۔ اس میں بھی اشارہ ہے کہ باوجود پردہ کے باقاعدہ احکام نازل نہ ہونے کے نیک عورتیں مردوں سے بے محابا خطاب نہ کرتی تھیں ضرورت کی بنا پر یہ وہاں پہنچی تو حیاء کے ساتھ بات کی جسکی صورت بعض مفسرین نے یہ بیان کی ہے کہ اپنے چہرہ کو آستین سے چھپا کر گفتگو کی۔ روایاتِ تفسیر میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اسکے ساتھ چلنے لگے تو لڑکی سے کہا کہ تم میرے پیچھے ہو جاؤ اور زبان سے مجھے راستہ بتاتی رہو۔ مقصد یہ تھا کہ ان کی نظر لڑکی پر نہ پڑے شاید اسی سبب سے لڑکی نے اپنے والد سے ان کے متعلق انکے امین ہونے کا ذکر کیا۔ ان لڑکیوں کے والد کون تھے اسمیں مفسرین نے اختلاف نقل کیا ہے مگر آیاتِ قرآن سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعیب علیہ السلام تھے جیسا کہ قرآن میں ہے وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا (قرطبی)

اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْکَ، یہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لڑکی خود ہی اپنی طرف سے ان کو دعوت دیتی مگر ایسا نہیں کیا بلکہ اپنے والد کا پیغام سنایا کیونکہ کسی اجنبی مرد کو خود دعوت دینا حیاء کے خلاف تھا۔

اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ، یعنی شعیب علیہ السلام کی ایک صاحبزادی نے اپنے والد سے عرض کیا کہ آپ کو گھر کے کاموں کے لئے ملازم کی ضرورت ہے آپ ان کو نوکر رکھ لیجئے کیونکہ ملازم میں دو صفتیں ہونا چاہئیں ایک کام کی قوت و صلاحیت دوسرے امانتداری۔ ہمیں ان کے پتھر اٹھا کر پانی پلانے سے ان کی قوت و قدرت کا اور راستہ میں لڑکی کو اپنے پیچھے کر دینے سے امانتداری کا تجربہ ہو چکا ہے۔

کوئی ملازمت یا عہدہ سپرد کرنے کے لئے اہم شرطیں دو ہیں حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے بڑی حکمت کی بات جاری فرمائی۔ آجکل سرکاری عہدوں اور ملازمتوں کے لئے کام کی صلاحیت اور ڈگریوں کو تو دیکھا جاتا ہے مگر دیانت و امانت کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عام دفتروں اور عہدوں کی کارروائی میں پوری کامیابی کے بجائے رشوت خوری، اقربا پروری وغیرہ کی وجہ سے قانون معطل ہو کر رہ گیا ہے۔ کاش لوگ اس قرآنی ہدایت کی قدر کریں تو سارا نظام درست ہو جائے۔

قَالَ اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ اُنْکِحَکَ اِحْدَی ابْنَتَیَّ ھٰتَیْنِ، یعنی لڑکیوں کے والد حضرت شعیب علیہ السلام نے خود ہی اپنی طرف سے اپنی لڑکی کو ان کے نکاح میں دینے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لڑکیوں کے ولی کو چاہیئے کہ کوئی مرد صالح ملے تو اسکا انتظار نہ کرے کہ اسی کی طرف سے نکاح کے معاملہ کی تحریک ہو، بلکہ خود بھی پیش کر دینا سنتِ انبیاء ہے جیسا کہ عمر بن خطابؓ نے اپنی صاحبزادی حضرت حفصہؓ کے بیوہ ہو جانے کے بعد از خود ہی صدیق اکبرؓ اور عثمان غنیؓ سے ان کے نکاح کی پیش کش کی تھی۔ (قرطبی)

اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ، حضرت شعیب علیہ السلام نے دونوں لڑکیوں میں سے کسی کو متعین کر کے گفتگو نہیں فرمائی بلکہ اس کو مبہم رکھا کہ انہیں سے کسی ایک کو آپ کے نکاح میں دینے کا ارادہ ہے مگر چونکہ یہ گفتگو باقاعدہ عقد نکاح کی گفتگو نہ تھی جسمیں ایجاب و قبول گواہوں کے سامنے ہونا شرط ہے بلکہ معاملہ کی گفتگو تھی کہ آپ کو آٹھ سال کی نوکری اس نکاح کے عوض میں منظور ہو تو ہم نکاح کر دیں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر معاہدہ کر لیا۔ آگے یہ خود بخود ظاہر ہے کہ باقاعدہ نکاح کیا گیا ہوگا۔ اور قرآن کریم عموماً قصہ کے اُن اجزاء کو ذکر نہیں کرتا جن کا وقوع سیاق و سباق سے ظاہر اور یقینی ہو۔ اس تحقیق کی بنا پر یہاں یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ زوجہ منکوحہ کو متعین کئے بغیر نکاح کیسے ہو گیا یا گواہوں کے بغیر کیسے ہو گیا (کذا فی الروح و بیان القرآن)

عَلٰٓی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ، یہ آٹھ سال کی ملازمت و خدمت نکاح کا مہر قرار دیا گیا اس میں ائمہ فقہاء کا اختلاف ہے کہ شوہر اپنی بیوی کی خدمت و ملازمت کو اسکا مہر قرار دے سکتا ہے یا نہیں؟ اس کی مکمل تحقیق مع دلائل کے بزبان عربی احکام القرآن سورۂ قصص میں مفصل لکھدی گئی ہے اہل علم وہاں دیکھ سکتے ہیں عوام کے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اگر یہ معاملہ مہر کا شریعتِ محمدیہ کے لحاظ سے درست نہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ شریعت شعیب علیہ السلام میں درست ہو اور شرائع انبیاء میں ایسے فروعی فرق ہونا نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ سے ظاہر الروایت میں یہی صورت منقول ہے کہ خدمتِ زوجہ کو مہر نہیں بنایا جا سکتا مگر ایک روایت جس پر علماء متاخرین نے فتویٰ دیا ہے یہ ہے کہ خود بیوی کی خدمت کو مہر بنانا تو شوہر کی تکریم و احترام کے خلاف ہے مگر بیوی کا کوئی ایسا کام جو گھر سے باہر کیا جاتا ہے جیسے مواشی چرانا یا کوئی تجارت کرنا اگر اسمیں شرائط اجارہ کے مطابق مدت معین کر دی گئی ہو جیسا کہ اس واقعہ میں آٹھ سال کی مدت معین ہے تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ اس مدت کی ملازمت کی تنخواہ جو بیوی کے ذمہ لازم ہو تو اس تنخواہ کو مہر قرار دینا جائز ہے (ذکرہ فی البدائع عن نوادر ابن سماعہ)

ہاں ایک دوسرا سوال یہاں یہ ہوتا ہے کہ مہر تو بیوی کا حق ہے بیوی کے باپ یا کسی عزیز کو بغیر اجازت زوجہ مہر کی رقم نقد بھی دے دی جائے تو مہر ادا نہیں ہوتا۔ اس واقعہ میں اَنْ تَاْجُرَنِیْ کے الفاظ اس پر شاہد ہیں کہ والد نے ان کو اپنے کام کے لئے ملازم رکھا تو ملازمت کا جو معاوضہ ہے وہ والد کو ملا، تو یہ زوجہ کا مہر کیسے بن گیا؟ اسکا جواب یہ ہے کہ اوّلاً تو یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بکریاں لڑکیوں ہی کی ملک ہوں اور یہ ملازمت کا فائدہ اس حیثیت سے خود لڑکی کو پہنچا۔ دوسرے اگر باپ ہی کا کام انجام دیا اور اس کی تنخواہ والد کے ذمہ لازم ہوئی تو یہ زرِ مہر لڑکی کا ہو گیا لڑکی کی اجازت سے والد کو بھی اسکا استعمال درست ہے۔ یہاں ظاہر ہے کہ یہ معاملہ لڑکی کی اجازت سے ہوا ہے۔

مسئلہ لفظ اُنْكِحَكَ سے ثابت ہوا کہ نکاح کا معاملہ والد نے کیا ہے باجماع فقہاء ایسا ہی ہونا چاہئے کہ لڑکی کا ولی اُسکے نکاح کے معاملہ کی کفالت کرے، لڑکی خود اپنا نکاح نہ کرے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی لڑکی نے خود اپنا نکاح کسی ضرورت ومجبوری سے کرلیا تو وہ منعقد ہوجاتا ہے یا نہیں؟ اس میں ائمہ فقہاء کا اختلاف ہے امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک نکاح منعقد ہوجاتا ہے اور یہ آیت اسکے متعلق کوئی فیصلہ نہیں دیتی۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ

پھر جب پوری کرچکا موسیٰ وہ مدت اور لیکر چلا اپنے گھر والوں کو دیکھی کوہ طور کی طرف سے ایک

نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا

آگ کہا اپنے گھر والوں کو ٹھہرو میں نے دیکھی ہے ایک آگ شاید لے آؤں تمہارے پاس وہاں

بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّآ اَتٰىهَا

کی کچھ خبر یا انگارا آگ کا تاکہ تم تاپو پھر جب پہنچا اسکے

نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ

پاس آواز ہوئی میدان کے داہنے کنارے سے برکت والے تختہ میں ایک

الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۰﴾ وَاَنْ اَلْقِ

درخت سے کہ اے موسیٰ میں ہوں میں اللہ جہان کا رب اور یہ کہ ڈالدے

عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ

اپنی لاٹھی پھر جب دیکھا اس کو پھنپھناتے جیسے سانپ کی سٹک اُلٹا پھرا منہ موڑ کر اور نہ دیکھا پیچھے پھر کر

يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۣ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾ اُسْلُكْ يَدَكَ

اے موسیٰ آگے آ اور مت ڈر تجھ کو کچھ خطرہ نہیں ڈال اپنا ہاتھ اپنے

فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاۗءَ مِنْ غَيْرِ سُوْۗءٍ ۡ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ

گریبان میں نکل آئے سفید ہو کر نہ کہ کسی بُرائی سے اور ملالے اپنی طرف اپنا بازو ڈر سے

الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا

سو یہ دو سندیں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اسکے سرداروں پر بیشک وہ تھے

قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ

لوگ نافرمان بولا اے رب میں نے خون کیا ہے اُن میں ایک جان کا سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو

يَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾ وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ

مار ڈالیں گے اور میرا بھائی ہارون اسکی زبان چلتی ہے مجھ سے زیادہ سو اس کو بھیج میرے ساتھ

رِدْاً يُّصَدِّقُنِیْۤ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ

مدد کو کہ میری تصدیق کرے میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھوٹا کریں فرمایا ہم مضبوط کردیں گے تیرے بازو کو

بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ

تیرے بھائی سے اور دیں گے تم کو غلبہ پھر وہ نہ پہنچ سکیں گے تم تک ہماری نشانیوں سے

اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾

تم اور جو تمہارے ساتھ ہو غالب رہو گے

خلاصۂ تفسیر

غرض جب موسیٰ (علیہ السلام) اس مدت کو پورا کر چکے اور (باجازت شعیب علیہ السلام کے) اپنی بی بی کو لے کر (مصر کو یا شام کو) روانہ ہوئے تو (ایک شب میں ایسا اتفاق ہوا کہ سردی بھی تھی اور راہ بھی بھول گئے اسوقت) ان کو کوہ طور کی طرف سے ایک (روشنی بشکل) آگ دکھلائی دی، انہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم (یہاں ہی) ٹھہرے رہو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے (میں وہاں جاتا ہوں) شاید میں تمہارے پاس وہاں سے (رستہ کی) کچھ خبر لاؤں یا کوئی آگ کا (دہکتا ہوا) انگارا لے آؤں تاکہ تم سینک لو، سو وہ جب اس آگ کے پاس پہنچے تو ان کو اس میدان کے داہنی جانب سے (جوکہ موسیٰ علیہ السلام کی داہنی جانب تھی) اس مبارک مقام میں ایک درخت میں سے آواز آئی کہ اے موسیٰ میں رب العالمین ہوں اور یہ (بھی آواز آئی) کہ تم اپنا عصا ڈال دو (چنانچہ انہوں نے ڈال دیا اور وہ سانپ بن کر چلنے لگا) سو انہوں نے جب اس کو لہراتا ہوا دیکھا جیسا پتلا سانپ (تیز) ہوتا ہے تو پشت پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا (حکم ہوا کہ) اے موسیٰ آگے آؤ اور ڈرو مت (ہر طرح) امن میں ہو (اور یہ کوئی ڈر کی بات نہیں بلکہ تمہارا معجزہ ہے اور دوسرا معجزہ اور عنایت ہوتا ہے کہ) تم اپنا ہاتھ گریبان کے اندر ڈالو (اور پھر نکالو) وہ بلا کسی مرض کے نہایت روشن ہو کر نکلے گا اور (اگر مثل انقلاب عصا کے اس معجزہ سے بھی طبعاً خوف اور حیرت پیدا ہو تو) خوف (رفع کرنے) کے واسطے اپنا (وہ) ہاتھ (پھر) اپنے گریبان اور بغل) سے (بدستور سابق) ملا لینا (تاکہ وہ پھر اصلی حالت پر ہو جائے اور پھر طبعی خوف بھی نہ ہوا کرے) سو یہ (تمہاری نبوت کی) دو سندیں (اور دلیلیں) ہیں تمہارے رب کی طرف سے فرعون اور اسکے سرداروں کے پاس جانے کے واسطے (جسکا تم کو حکم کیا جاتا ہے کیونکہ) وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں، انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب (میں جانے کے لئے حاضر ہوں مگر آپ کی خاص امداد کی ضرورت ہے کیونکہ میں نے ان میں سے ایک آدمی کا خون کر دیا تھا سو مجھ کو اندیشہ ہے کہ (کہیں پہلے ہی) وہ لوگ مجھ کو قتل کر دیں (تبلیغ بھی نہ ہونے پاوے)

اور (دوسری بات یہ ہے کہ زبان بھی زیادہ رواں نہیں ہے اور) میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ رواں ہے تو اُن کو بھی میرا مددگار بنا کر میرے ساتھ رسالت دیدیجئے کہ (وہ میری تقریر کی تائید اور) تصدیق (مفصل اور مکمل طور سے) کریں گے (کیونکہ) مجھ کو اندیشہ ہے کہ وہ لوگ (فرعون اور اسکے درباری) میری تکذیب کریں (تو اسوقت مناظرہ کی ضرورت ہوگی اور زبانی مناظرہ کے لئے عادۃً وہ آدمی زیادہ مفید ہوتا ہی جو رواں زبان ہو) ارشاد ہوا کہ (بہتر ہے) ہم ابھی تمھارے بھائی کو تمھارا قوت بازو بنائے دیتے ہیں (ایک درخواست تو یہ منظور ہوئی) اور (دوسری درخواست کی منظوری اس طرح ہوئی کہ) ہم تم دونوں کو ایک خاص شوکت (وہیبت) عطا کرتے ہیں جس سے ان لوگوں کو تم پر دسترس نہ ہوگی (پس) ہمارے معجزے لیکر جاؤ تم دونوں اور جو تمھارا پیرو ہوگا (اُن لوگوں پر) غالب رہوگے۔

معارف ومسائل

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ، یعنی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدت معینہ ملازمت کی پوری کردی جو آٹھ سال لازمی اور دو سال اختیاری تھی سو یہاں سوال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے صرف آٹھ سال پورے کئے یا دس سال۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے یہ سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اُنھوں نے زیادہ مدت یعنی دس سال پورے کئے کہ انبیاء علیہم السلام کی یہی شان ہے کہ جو کچھ کہتے ہیں اس کو پورا کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بھی عادت شریفہ تھی کہ حقدار کو اُسکے حق سے زائد ادا فرماتے تھے اور اُمت کو اسی کی ہدایت فرمائی ہے کہ ملازمت، اُجرت اور خرید و فروخت میں مسامحت اور ایثار سے کام لیا جائے۔

نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ (الیٰ) اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ، یہ مضمون بضمن قصہ موسیٰ علیہ السلام سورۂ طٰہٰ اور سورۂ نمل میں گزرا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ اور سورۂ نمل میں ہے نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ اور اس سورت میں ہے اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ یہ الفاظ اگرچہ مختلف ہیں مگر معنی تقریباً ایک ہی ہیں، واقعہ کی حکایت ہر مقام کے مناسب الفاظ سے کی گئی ہے (کذا قال الامام) اور یہ تجلی بشکل نار تجلی مثالی تھی کیونکہ تجلی ذاتی کا مشاہدہ اس دُنیا میں کسی کو نہیں ہوسکتا اور خود موسیٰ علیہ السلام کو اس تجلی ذاتی کے اعتبار سے لَنْ تَرٰىنِیْ فرمایا گیا ہے یعنی آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے مراد مشاہدہ ذات حق ہے۔

نیک عمل سے جگہ بھی متبرک ہوجاتی ہے

فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ، کوہ طور کے اس مقام کو قرآن کریم نے بُقعہ مبارکہ فرمایا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ اسکے مبارک ہونے کا سبب یہ تجلی خداوندی ہے جو اس مقام پر بشکل نار دکھائی دی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس مقام میں کوئی نیک عمل اہم واقع

ہوتا ہے وہ مقام بھی متبرک ہوجاتا ہے۔

وعظ میں اچھی خطابت اور فصاحت مطلوب ہے: هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا، اس سے معلوم ہوا کہ وعظ و تبلیغ میں فصاحتِ کلام اور مقبول طرزِ خطابت محمود اور مطلوب ہے۔ اسکی تحصیل میں کوشش بھی مذموم نہیں۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ

پھر جب پہنچا ان کے پاس موسیٰ لے کر ہماری نشانیاں کھلی ہوئی بولے اور کچھ نہیں یہ جادو ہے

مُفْتَرًى وَمَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ﴿٣٦﴾ وَقَالَ

باندھا ہوا اور ہم نے سنا نہیں یہ اپنے اگلے باپ دادوں میں اور کہا

مُوسَىٰ رَبِّي أَعْلَمُ بِمَنْ جَاءَ بِالْهُدَىٰ مِنْ عِنْدِهِ وَمَنْ

موسیٰ نے میرا رب تو خوب جانتا ہے جو کوئی لایا ہے ہدایت کی بات اس کے پاس سے اور جس کو

تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿٣٧﴾ وَقَالَ

ملے گا آخرت کا گھر بیشک بھلا نہ ہوگا بے انصافوں کا اور بولا

فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي فَأَوْقِدْ لِي

فرعون اے دربار والو مجھ کو تو معلوم نہیں تمہارا کوئی حاکم ہو میرے سوا سو آگ دے اے

يَا هَامَانُ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَلْ لِي صَرْحًا لَعَلِّي أَطَّلِعُ إِلَىٰ إِلَٰهِ

ہامان میرے واسطے گارے کو پھر بنا میرے واسطے ایک محل تاکہ میں جھانک کر دیکھوں موسیٰ

مُوسَىٰ وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٣٨﴾ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَ

کے رب کو اور میری اٹکل میں تو وہ جھوٹا ہے اور بڑائی کرنے لگے وہ اور

جُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا

اس کے لشکر ملک میں ناحق اور سمجھے کہ وہ ہماری طرف پھر کر نہ

يُرْجَعُونَ ﴿٣٩﴾ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ ۖ فَانْظُرْ

آئیں گے پھر پکڑا ہم نے اسکو اور اسکے لشکروں کو، پھر پھینک دیا ہمنے انکو دریا میں سو دیکھ لے

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ﴿٤٠﴾ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ

کیسا ہوا انجام گنہگاروں کا اور کیا ہم نے ان کو پیشوا کہ بلاتے ہیں دوزخ

إِلَى النَّارِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا يُنْصَرُونَ ﴿٤١﴾ وَأَتْبَعْنَاهُمْ فِي هَٰذِهِ

کی طرف اور قیامت کے دن ان کو مدد نہ ملے گی اور پیچھے رکھدی ہم نے ان پر اس

الدُّنْيَا لَعْنَةً ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ هُمْ مِنَ الْمَقْبُوحِينَ ﴿٤٢﴾

دُنیا میں پھٹکار اور قیامت کے دن اُن پر بُرائی ہے

ع

خلاصۂ تفسیر

غرض جب ان لوگوں کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) ہماری صریح دلیلیں لے کر آئے تو ان لوگوں نے (معجزات دیکھ کر) کہا کہ یہ تو محض ایک جادو ہے کہ (خواہ مخواہ خدا تعالیٰ پر) افترا کیا جاتا ہے (کہ یہ اسکی جانب سے معجزات اور دلیل رسالت ہیں) اور ہم نے ایسی بات کبھی نہیں سنی کہ ہمارے اگلے باپ دادوں کے وقت میں بھی ہوئی ہو اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (اسکے جواب میں) فرمایا کہ (جب باوجود دلائل صحیحہ قائم ہونے کے اور اسمیں کوئی شبہ معقول نہ نکال سکنے کے بعد بھی نہیں مانتے تو یہ ہٹ دھرمی ہے اور اسکا اخیر جواب یہی ہے کہ) میرا پروردگار اس شخص کو خوب جانتا ہے جو صحیح دین اسکے پاس سے لے کر آیا ہے اور جسکا انجام (یعنی خاتمہ) اس عالم (دنیا) سے اچھا ہونے والا ہے (اور) بالیقین ظالم لوگ (جو کہ ہدایت اور دین صحیح پر نہ ہوں) کبھی فلاح نہ پاویں گے (کیونکہ ان کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ مطلب یہ کہ خدا کو خوب معلوم ہے کہ ہم میں اور تم میں کون اہل ہدیٰ ہے اور کون ظالم اور کون محمود العاقبت ہے اور کون محروم عن الفلاح پس ہر ایک کی حالت اور ثمرہ کا جلد ہی مرنے کے ساتھ ہی ظہور ہو جاوے گا اب نہیں مانتے تم جانو) اور (دلائل موسویہ دیکھ کر اور سن کر) فرعون (کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ہمارے معتقدین ان کی طرف مائل نہ ہو جاویں تو لوگوں کو جمع کر کے) کہنے لگا اے اہل دربار مجھ کو تو تمہارا اپنے سوا کوئی خدا معلوم نہیں ہوتا (اسکے بعد تلبیس کے واسطے اپنے وزیر سے کہا کہ اگر اس سے ان لوگوں کا اطمینان نہ ہو تو) اے ہامان تم ہمارے لئے مٹی (کی اینٹیں بنوا کر ان) کو آگ میں پزاوہ لگا کر پکواؤ پھر (ان پختہ اینٹوں سے) میرے واسطے ایک بلند عمارت بنواؤ تاکہ (میں اس پر چڑھ کر) موسیٰ کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو (اس دعوی میں کہ کوئی اور خدا ہے) موسیٰ کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں اور فرعون اور اسکے تابعین نے ناحق دنیا میں سر اٹھا رکھا تھا اور یوں سمجھ رہے تھے کہ انکو ہمارے پاس لوٹ کر آنا نہیں ہے تو ہم نے (اس تکبر کی سزا میں) اس کو اور اسکے تابعین کو پکڑ کر دریا میں پھینک دیا (یعنی غرق کر دیا) سو دیکھئے ظالموں کا انجام کیسا ہوا (اور موسیٰ علیہ السلام کے قول کا ظہور ہو گیا مَنْ تَكُونُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ) اور ہم نے ان لوگوں کو ایسا رئیس بنایا تھا جو (لوگوں کو) دوزخ کی طرف بلاتے رہے اور (اسی واسطے) قیامت کے روز (ایسے بے کس رہ جاویں گے کہ) انکا کوئی ساتھ نہ دے گا اور (یہ لوگ دونوں عالم میں خائب و خاسر ہوئے چنانچہ) دنیا میں بھی ہم نے اسکے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے دن بھی بد حال لوگوں میں سے ہوں گے۔

معارف و مسائل

فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ، فرعون نے بہت اونچا بلند محل تیار کرنے کا ارادہ کیا

تو اپنے وزیر ہامان کو اسکی تیاری کے لئے پہلے یہ حکم دیا کہ مٹی کی اینٹوں کو پکا کر پختہ کیا جائے کیونکہ کچی اینٹوں پر کوئی بڑی اور اونچی بنیاد قائم نہیں ہوسکتی۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ فرعون کے اس واقعہ سے پہلے پختہ اینٹوں کی تعمیر کا رواج نہ تھا سب سے پہلے فرعون نے یہ ایجاد کرائی۔ تاریخی روایات میں ہے کہ ہامان نے اس محل کی تعمیر کیلئے پچاس ہزار معمار جمع کئے مزدور اور لکڑی لوہے کا کام کرنے والے انکے علاوہ تھے اور محل کو اتنا اونچا بنایا کہ اُس زمانے میں اس سے زیادہ بلند کوئی تعمیر نہیں تھی۔ پھر جب یہ تیاری مکمل ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو حکم دیا، اُنھوں نے ایک ضرب میں اس محل کے تین ٹکڑے کرکے گرا دیا جس میں فرعونی فوج کے ہزاروں آدمی دب کر مر گئے (قرطبی)

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ، یعنی فرعون کے درباریوں کو اللہ تعالیٰ نے انکی قوم کا پیشوا بنا دیا تھا مگر یہ غلط کار پیشوا اپنی قوم کو آگ یعنی جہنم کی طرف دعوت دیتے رہے تھے یہاں اکثر مفسرین نے آگ کیطرف دعوت دینے کو ایک استعارہ اور مجاز قرار دیا ہے کہ مراد آگ سے وہ اعمال کفریہ ہیں جنکا نتیجہ جہنم کی آگ میں جانا تھا مگر اُستاذِ محترم نادرہ روزگار حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کی تحقیق تبعاً لابن عربی یہ تھی کہ آخرت کی جزا عین عمل ہے۔ انسان کے اعمال جو وہ دُنیا میں کرتا ہے برزخ پھر محشر میں اپنی شکلیں بدلیں گے اور جوہری صورتوں میں نیک اعمال گل و گلزار بن کر جنت کی نعمتیں بن جائیں گے اور اعمال کفر و ظلم آگ اور سانپ بچھوؤں اور طرح طرح کے عذابوں کی شکل اختیار کرلیں گے اسلئے جو شخص اس دُنیا میں کسی کو کفر و ظلم کیطرف بلا رہا ہے وہ حقیقۃً اس کو آگ ہی کیطرف بُلا رہا ہے۔ اگرچہ اس دُنیا میں اسکی شکل آگ کی نہیں مگر حقیقت اسکی آگ ہی ہے۔ اسی طرح آیت میں کوئی مجاز یا استعارہ نہیں، اپنی حقیقت پر محمول ہے۔ یہ تحقیق اختیار کیجائے تو قرآن کی بے شمار آیات میں مجاز و استعارہ کا تکلف نہیں کرنا پڑے گا۔ مثلاً وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا اور مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وغیرہ

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ، مَقْبُوْحِيْنَ، مقبوح کی جمع ہے جس کے معنے ہیں بگاڑا ہوا۔ مُراد یہ ہے کہ قیامت کے روز انکے چہرے مسخ ہوکر سیاہ اور آنکھیں نیلی ہوجائیں گی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى

اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب بعد اس کے کہ ہم غارت کرچکے پہلی جماعتوں کو

بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾ وَمَا

سمجھانے والی لوگوں کو اور راہ بتانے والی اور رحمت تاکہ وہ یاد رکھیں اور تو نہ

كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ

تھا غرب کی طرف جب ہم نے بھیجا موسیٰ کو حکم اور نہ تھا

مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ

تو دیکھنے والا۔ لیکن ہم نے پیدا کیں کئی جماعتیں پھر دراز ہوئی اُن پر مدت

وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا

اور تو نہ رہتا تھا مدین والوں میں کہ اُن کو سُناتا ہماری آیتیں پر ہم رہے ہیں

كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ

رسول بھیجتے اور تو نہ تھا طور کے کنارے جب ہم نے آواز دی لیکن

رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ

یہ انعام ہے تیرے رب کا تاکہ تو ڈر سُنا دے اُن لوگوں کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈر سُنانے والا تجھ سے پہلے

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا

تاکہ وہ یاد رکھیں اور اتنی بات کے لئے کہ کبھی آن پڑے اُن پر آفت اُن

قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ

کاموں کی وجہ سے جن کو بھیج چکے ہیں انکے ہاتھ تو کہنے لگیں اے رب ہمارے کیوں نہ بھیجا ہمارے پاس کسی کو پیغام دے کر

اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ

تو ہم چلتے تیری باتوں پر اور ہوتے ایمان والوں میں پھر جب پہنچی اُن کو ٹھیک بات ہمارے

عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ۭ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا

پاس سے کہنے لگے کیوں نہ ملا اس رسول کو جیسا ملا تھا موسیٰ کو کیا ابھی منکر نہیں ہو چکے

بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۣ وَقَالُوْٓا

اس سے جو موسیٰ کو ملا تھا اس سے پہلے کہنے لگے دونوں جادو ہیں آپس میں موافق اور کہنے لگے

اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى

ہم دونوں کو نہیں مانتے تو کہہ اب تم لاؤ کوئی کتاب اللہ کے پاس کی جو ان دونوں سے

مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ

بہتر ہو کہ میں اس پر چلوں، اگر تم سچے ہو پھر اگر نہ کر لائیں تیرا کہا

فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ۭ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ

تو جان لے کہ وہ چلتے ہیں نری اپنی خواہشوں پر اور اس سے گمراہ زیادہ کون جو چلے اپنی خواہش پر بدون

هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۰﴾ ع وَلَقَدْ

راہ بتلائے اللہ کے بیشک اللہ راہ نہیں دیتا بے انصاف لوگوں کو اور ہم پے در پے

وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۱﴾

بھیجتے رہے ہیں اُن کو اپنے کلام تاکہ وہ دھیان میں لائیں

خلاصۂ تفسیر

اور (رسالت کا سلسلہ خلق کے محتاج اصلاح ہونے کے سبب ہمیشہ سے چلا آیا ہے چنانچہ) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (جن کا قصہ ابھی پڑھ چکے ہو) اگلی اُمتوں (یعنی قوم نوح و عاد و ثمود) کے ہلاک کرنے کے پیچھے (جبکہ ان زمانوں کے انبیاء کی تعلیمات نایاب ہوگئی تھیں اور لوگ ہدایت کے سخت حاجتمند تھے) کتاب (یعنی توراۃ) دی تھی جو لوگوں کے (یعنی بنی اسرائیل کے) لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت اور رحمت تھی تاکہ وہ (اس سے) نصیحت حاصل کریں (طالب حق کی اوّل فہم درست ہوتی ہے یہ بصیرت ہے، پھر احکام قبول کرتا ہے یہ ہدایت ہے، پھر ہدایت کا ثمرہ یعنی قرب و قبول عنایت ہوتا ہے یہ رحمت ہے) اور (اسی طرح جب یہ دورہ بھی ختم ہوچکا اور لوگ پھر محتاج تجدید ہدایت ہوئے تو اپنی سُنتِ مستمرہ کے موافق ہم نے آپ کو رسول بنایا جس کے دلائل میں سے ایک یہی واقعہ موسویہ کی یقینی خبر دینا ہے کیونکہ قطعی خبر دینے کے لئے کوئی طریق علم کا ضروری ہے اور وہ طریق منحصر ہے چار میں، اُمور عقلیہ میں عقل، سو یہ واقعہ اُمور عقلیہ میں سے تو ہے نہیں، اور اُمور نقلیہ میں یا سماع اہل علم سے جو کہ دوسرا طریق ہے سو یہ بھی بوجہ عدم مخالطت و عدم مدارست اہل اخبار کے منتفی ہے اور یا اپنا مشاہدہ جو کہ تیسرا طریق ہے سو اس کی نفی نہایت ہی اظہر ہے چنانچہ ظاہر ہے کہ) آپ (طور کے) مغربی جانب میں موجود نہ تھے جبکہ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو احکام دیئے تھے (یعنی توراۃ دی تھی) اور (وہاں خاص تو کیا موجود ہوتے) آپ (تو) ان لوگوں میں سے (بھی) نہ تھے جو (اس زمانہ میں) موجود تھے (پس احتمال مشاہدہ کا بھی نہ رہا) ولیکن (بات یہ کہ) ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کے بعد) بہت سی نسلیں پیدا کیں پھر ان پر زمانہ دراز گزر گیا (جس سے پھر علوم صحیحہ نایاب ہوگئے اور پھر لوگ محتاجِ ہدایت ہوئے اور گو درمیان درمیان انبیاء علیہم السلام آیا کئے مگر ان کے علوم بھی اس طرح نایاب ہوئے اسلئے ہماری رحمت مقتضی ہوئی کہ ہم نے آپ کو وحی و رسالت سے مشرف فرمایا جو کہ چوتھا طریق ہے خبر یقینی کا اور دوسرے طُرق علم ظنی کے ہیں جو بحث ہی سے خارج ہے کیونکہ آپ کی یہ خبریں بالکل یقینی اور قطعی ہیں حاصل یہ کہ علم یقینی کے چار طریقے ہیں اور تین منتفی بس چوتھا متعین اور یہی مطلوب ہے) اور (جیسے آپ نے عطاء توراۃ کا مشاہدہ نہیں کیا اور صحیح و یقینی خبر دے رہے ہیں اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے قیام مدین کا مشاہدہ نہیں فرمایا چنانچہ ظاہر ہے کہ) آپ اہل مدین میں بھی قیام پذیر نہ تھے کہ آپ (وہاں کے حالات دیکھ کر ان حالات کے متعلق) ہماری آیتیں (اپنے) ان (معاصر) لوگوں کو پڑھ پڑھ کر سنا رہے ہوں ولیکن ہم ہی (آپ کو) رسول بنانے والے ہیں (کہ رسول بنا کر یہ واقعات وحی سے بتلا دیئے) اور (اسی طرح

آپ طور کی جانب (غربی مذکور) میں اسوقت بھی موجود نہ تھے جب ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کو) پکارا تھا کہ "یٰمُوسٰىٓ اِنِّىٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ" جو کہ ان کو نبوت عطا ہونے کا وقت تھا) ولیکن (اسکا علم بھی اسی طرح حاصل ہوا کہ) آپ اپنے رب کی رحمت سے نبی بنائے گئے تاکہ آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا (نبی) نہیں آیا، کیا عجب ہے کہ نصیحت قبول کرلیں (کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین بلکہ انکے آباء اقربین نے بھی کسی نبی کو نہیں دیکھا تھا گو بعض شرائع بالخصوص توحید بواسطہ ان تک بھی پہنچی تھی پس وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا سے تعارض نہ رہا) اور (اگر یہ لوگ ذرا تامل کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ پیغمبر بھیجنے سے ہمارا کوئی فائدہ نہیں بلکہ ان ہی لوگوں کا فائدہ ہے کہ یہ لوگ حُسن و قبح پر مطلع ہو کر عقوبت سے بچ سکتے ہیں ورنہ جن امور کا قبح عقل سے دریافت ہو سکتا ہے اس پر عذاب بلا ارسالِ رسول بھی ہونا ممکن تھا لیکن اسوقت انکو ایک گونہ حسرت ہوتی کہ ہائے اگر رسول آجاتا تو ہمکو زیادہ تنبہ ہوجاتا اور اس مصیبت میں نہ پڑتے اسلئے رسول بھی بھیجدیا تاکہ اس حسرت سے بچنا ان کو آسان ہو ورنہ احتمال تھا کہ) ہم رسول نہ بھی بھیجتے اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ان پر ان کے کرداروں کے سبب (جو عقلاً قبیح ہیں) کوئی مصیبت (دُنیا یا آخرت میں) نازل ہوتی (جس کی نسبت ان کو عقل کے یا فرشتے کے ذریعہ سے یقین ہوجاتا کہ یہ سزائے اعمال ہے) تو یہ کہنے لگتے کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے ہمارے پاس کوئی پیغمبر کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم آپکے احکام کا اتباع کرتے اور (ان احکام اور رسُول پر) ایمان لانے والوں میں سے ہوتے سو (اس امر کا مقتضا تو یہ تھا کہ رسول کے آنے کو غنیمت سمجھتے اور اسکے دینِ حق کو قبول کرتے لیکن ان کی یہ حالت ہوئی کہ) جب ہماری طرف سے ان لوگوں کے پاس امرِ حق (یعنی رسولِ حق اور دینِ حق) پہنچا تو (اس میں شبہ نکالنے کے لئے یوں) کہنے لگے کہ ان کو ایسی کتاب کیوں نہ ملی جیسی موسیٰ (علیہ السلام) کو ملی تھی (یعنی قرآن دفعۃً مثل توراۃ کے کیوں نہ نازل ہوا، آگے جواب ہے کہ) کیا جو کتاب موسیٰ (علیہ السلام) کو ملی تھی اسکے قبل یہ لوگ اسکے منکر نہیں ہوئے (چنانچہ ظاہر ہے کہ مشرکین موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ کو بھی نہ مانتے تھے کیونکہ وہ سرے سے اصل نبوت ہی کے منکر تھے) یہ لوگ تو (قرآن اور توراۃ دونوں کی نسبت) یُوں کہتے ہیں کہ دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کے موافق ہیں (یہ اسلئے کہا کہ اصولِ شرائع میں دونوں متفق ہیں) اور یُوں بھی کہتے ہیں کہ ہم تو دونوں میں کسی کو نہیں مانتے (خواہ یہی عبارت ان کا مقولہ ہو اور خواہ انکے اقوال سے لازم آتا ہو اور خواہ ایک ہی ساتھ دونوں کا انکار کیا ہو یا مختلف قول جمع کئے گئے ہوں تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہ کا منشار قصد ایمان بالقرآن بصورت تماثل توراۃ کے نہیں بلکہ یہ بھی ایک حیلہ اور شرارت ہے آگے اس کا جواب ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہدیجئے کہ اچھا تو (علاوہ توراۃ و قرآن کے) تم کوئی اور کتاب اللہ

کے پاس سے لے آؤ جو ہدایت کرنے میں ان دونوں سے بہتر ہو میں اسی کی پیروی کرنے لگوں گا، اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو کہ سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا، جس سے مقصود ان دونوں کتابوں کا نعوذ باللہ مفتری اور غلط ہونا ہے۔ یعنی مقصود تو اتباع حق کا ہے پس اگر کتب الٰہیہ کو حق مانتے ہو تو ان کی پیروی کرو، قرآن کی تو مطلقاً اور توراۃ کی توحید و بشاراتِ محمدیہ میں اور اگر ان کو حق نہیں مانتے تو تم کوئی حق پیش کرو اور اسکا حق ہونا ثابت کردو جس کو ہادی ہونے سے اسلئے تعبیر کیا گیا ہے کہ مقصود حق سے اسکا وسیلہ ہدایت ہونا ہے۔ اگر فرضاً ثابت کردو گے تو میں اسکی پیروی کروں گا، غرض یہ کہ میں حق ثابت کردوں تو تم اسکا اتباع کرو، اور اگر تم حق ثابت کردو تو میں اتباع کے لئے آمادہ ہوں اور چونکہ قضیہ شرطیہ میں محض حکم اتصال کا ہوتا ہے اسلئے اتباع غیر کتب الٰہیہ کا اشکال لازم نہیں آتا) پھر (اس احتجاج کے بعد) اگر یہ لوگ آپ کا (یہ) کہنا (کہ فَأْتُوا بِكِتَابٍ الخ) نہ کرسکیں (اور ظاہر ہے کہ نہ کرسکیں گے کقولہ تعالیٰ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا اور پھر بھی آپ کا اتباع نہ کریں) تو آپ سمجھ لیجئے کہ (ان سوالات کا منشار کوئی اشتباہ و تردد و حق جوئی نہیں ہے بلکہ) یہ لوگ محض اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں (ان کا نفس کہتا ہے کہ جس طرح بن پڑے انکار ہی کرنا چاہیئے، پس یہ ایسا ہی کررہے ہیں گو حق بھی واضح ہوجاوے) اور ایسے شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہو بدون اسکے کہ منجانب اللہ کوئی دلیل (اسکے پاس) ہو (اور) اللہ تعالیٰ ایسے ظالم لوگوں کو (جو کہ وضوحِ حق کے بعد بدون کسی متمسک صحیح کے بھی اپنی گمراہی سے باز نہ آوے) ہدایت نہیں کیا کرتا (جسکا سبب اس شخص کا خود قصد کرنا ہے اپنے گمراہ رہنے کا اور قصد کے بعد خلقِ فعل عادت ہے اللہ تعالیٰ کی اسلئے ایسا شخص ہمیشہ گمراہ رہتا ہے، یہاں تک تو جواب الزامی تھا انکے اس قول کا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى) اور (آگے تحقیقی جواب ہے جسمیں قرآن کے دفعۃً واحدۃً نازل نہ ہونے کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ) ہم نے اس کلام (یعنی قرآن) کو ان لوگوں کیلئے وقتاً فوقتاً یکے بعد دیگرے بھیجا تاکہ یہ لوگ (باربار تازہ بتازہ سننے سے) نصیحت مانیں (یعنی ہم تو دفعۃً واحدۃً بھیجنے پر بھی قادر ہیں مگر ان ہی کی مصلحت سے تھوڑا تھوڑا نازل کرتے ہیں پھر اندھیر ہے کہ اپنی ہی مصلحت کی مخالفت کرتے ہیں)۔

معارف و مسائل

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ،

قرونِ اُولیٰ سے اقوام نوح و ہود و صالح و لوط علیہم السلام مراد ہیں جو موسیٰ علیہ السلام سے پہلے اپنی سرکشی کی وجہ سے ہلاک کی گئی تھیں، اور بصائر، بصیرت کی جمع ہے جس کے لفظی معنے تو دانش و

بینش کے ہیں۔ مراد اس سے وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ انسانوں کے قلوب میں پیدا فرماتے ہیں جن سے وہ حقائق اشیاء کو دیکھ سکیں اور حق و باطل کا امتیاز کر سکیں۔ (مظہری)

بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ میں اگر لفظ ناس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت ہے تو بات صاف ہی اُس اُمت کے لئے کتاب توراۃ ہی مجموعہ بصائر تھی۔ اور اگر لفظ ناس سے تمام انسان مراد ہیں جن میں اُمت محمدیہ بھی داخل ہے تو یہاں سوال یہ پیدا ہوگا کہ اُمت محمدیہ کے زمانے میں جو تورات موجود ہے وہ تحریفات کے ذریعہ مسخ ہو چکی ہے تو ان کے لئے اسکا بصائر کہنا کیسے درست ہوگا، اور یہ کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ مسلمانوں کو بھی تورات سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے حالانکہ حدیث میں یہ واقعہ معروف ہی کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسکی اجازت طلب کی کہ وہ تورات میں جو نصائح وغیرہ ہیں انکو پڑھیں تاکہ انکے علم میں ترقی ہو، اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غضبناک ہو کر فرمایا کہ اگر اسوقت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو بھی میرا ہی اتباع لازم ہوتا (جسکا حاصل یہ ہوتا ہے کہ آپ کو صرف میری تعلیمات کو دیکھنا چاہیئے، تورات و انجیل کا دیکھنا آپکے لئے درست نہیں)، مگر اسکے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تورات کا جو اسوقت اہل کتاب کے پاس نسخہ تھا وہ تحریف شدہ تھا اور زمانہ ابتداء اسلام کا تھا جس میں نزول قرآن کا سلسلہ جاری تھا، اسوقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی مکمل حفاظت کے پیش نظر اپنی احادیث لکھنے سے بھی بعض حضرات کو روک دیا تھا کہ ایسا نہ ہو لوگ قرآن کے ساتھ احادیث کو جوڑ دیں، ان حالات میں کسی دوسری منسوخ شدہ آسمانی کتاب کا پڑھنا پڑھانا ظاہر ہے کہ احتیاط کے خلاف تھا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مطلقاً تورات و انجیل کے مطالعے اور پڑھنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ ان کتابوں کے وہ حصے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشین گوئیوں پر مشتمل ہیں انکا مطالعہ کرنا اور نقل کرنا صحابہ کرام سے ثابت اور معروف و مشہور ہی حضرت عبداللہ بن سلام اور کعب احبار اس معاملہ میں سب سے زیادہ معروف ہیں، دوسرے صحابہ کرام نے بھی ان پر نکیر نہیں کیا۔ اسلئے حاصل آیت کا یہ ہو جائے گا کہ تورات و انجیل میں جو غیر محرف مضامین اب بھی موجود ہیں اور بلاشبہ بصائر ہیں، ان سے استفادہ درست ہے مگر ظاہر ہے کہ ان سے استفادہ صرف ایسے ہی لوگ کر سکتے ہیں جو محرف اور غیر محرف میں فرق کر سکیں اور صحیح و غلط کو پہچان سکیں وہ علماء ماہرین ہی ہو سکتے ہیں، عوام کو بے شک اس سے اجتناب اسلئے ضروری ہی کہ وہ کسی مغالطے میں نہ پڑ جائیں، یہی حکم اُن تمام کتابوں کا ہے جنمیں حق کے ساتھ باطل کی آمیزش ہے کہ عوام کو انکے مطالعہ سے پرہیز کرنا چاہیئے علماء ماہرین دیکھیں تو مضائقہ نہیں۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ، یہاں اس قوم سے عرب مراد ہیں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں ہیں اور انکے بعد سے خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک انمیں کوئی پیغمبر

مبعوث نہ ہوا تھا یہی مضمون سورۂ یٰس میں بھی آنے والا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوسری جگہ قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ کہ کوئی امت ایسی نہیں جس میں اللہ کا کوئی پیغمبر نہ آیا ہو یہ اس آیت کے منافی نہیں کیونکہ مراد اس آیت کی یہ ہے کہ زمانہ دراز سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد انہیں کوئی نبی نہیں آیا مگر نبی و رسول کے آنے سے بالکل خالی یہ اُمت بھی نہیں رہی۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ، وَصَّلْنَا، توصیل سے مشتق ہے جس کے اصلی لغوی معنے رسّی کے تاروں میں اور تار ملا کر اسکے مضبوط کرنے کے ہیں مُراد یہ ہے کہ قرآن حکیم میں حق تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کا سلسلہ یکے بعد دیگرے جاری رکھا اور بہت سے نصیحت کے مضامین کا بار بار تکرار بھی کیا گیا تاکہ سُننے والے متاثر ہوں۔

تبلیغ و دعوت کے بعض آداب اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ کا اہم پہلو یہ تھا کہ وہ حق بات کو مُسلسل کہتے اور پہنچاتے ہی رہتے تھے۔ لوگوں کا انکار و تکذیب اُن کے اپنے عمل اور اپنی لگن میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا تھا بلکہ وہ حق کو اگر ایک مرتبہ نہ مانا گیا تو دوسری مرتبہ، پھر بھی نہ مانا گیا تو تیسری چوتھی مرتبہ برابر پیش کرتے ہی رہتے تھے کسی کے دل میں ڈال دینا تو کسی ناصح ہمدرد کے بس میں نہیں مگر اپنی کوشش کو بغیر کسی تکان اور اکتاہٹ کے جاری رکھنا جو ان کے قبضہ میں تھا اسکو مُسلسل انجام دیتے۔ آج بھی تبلیغ و دعوت کے کام کرنے والوں کو اس سے سبق لینا چاہئے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذَا يُتْلٰى

جن کو ہم نے دی ہے کتاب اس سے پہلے وہ اس پر یقین کرتے ہیں اور جب اُن کو

عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ

سُنائیے تو کہیں ہم یقین لائیں اس پر یہی ہے ٹھیک ہمارے رب کا بھیجا ہوا ہم ہیں اس سے پہلے

مُسْلِمِيْنَ ﴿۵۳﴾ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ

کے حکمبردار وہ لوگ پائیں گے اپنا ثواب دوہرا اس بات پر کہ قائم رہے اور

يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاِذَا

بھلائی کرتے ہیں بُرائی کے جواب میں اور ہمارا دیا ہوا کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں اور جب

سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ

سُنیں نکمّی باتیں اس سے کنارہ کریں اور کہیں ہم کو ہمارے کام اور تم کو تمہارے کام،

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿۵۵﴾

سلامت رہو ہم کو نہیں چاہئیں بے سمجھ لوگ

النصف

خلاصۂ تفسیر

(اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت اُن بشارتوں سے بھی ثابت ہے جن کی اُن علمار نے تصدیق کی ہے جن کو تورات و انجیل میں ان بشارتوں کا علم ہے۔ چنانچہ) جن لوگوں کو ہم نے قرآن سے پہلے (آسمانی) کتابیں دی ہیں (اُن میں جو منصف ہیں) وہ اُس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب قرآن اُن کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے بے شک یہ حق ہے (جو) ہمارے رب کی طرف سے (نازل ہوا ہے اور) ہم تو اس (کے آنے) سے پہلے بھی (اپنی کتابوں کی بشارتوں کی بنار پر) مانتے تھے (اب نزول کے بعد تجدید عہد کرتے ہیں۔ یعنی ہم ان لوگوں کی طرح نہیں جو نزولِ قرآن سے پہلے تو اسکی تصدیق کرتے تھے بلکہ اسکے آنے کے منتظر اور شائق تھے مگر جب قرآن آیا تو اسکے منکر ہوگئے (فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهٖ) اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ تورات و انجیل کی بشارتوں کے مصداق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی تھے جیسا کہ سورۂ شعرا کے آخر میں فرمایا ہے اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ - یہاں تک رسالتِ محمدیہ پر علمار بنی اسرائیل کی شہادت کا بیان ہوا آگے مؤمنین اہلِ کتاب کی فضیلت کا بیان ہے کہ) اُن لوگوں کو اُن کی پختگی کی وجہ سے دوہرا ثواب ملے گا (کیونکہ وہ پہلی کتاب پر ایمان رکھنے کے ضمن میں بھی قرآن پر ایمان رکھتے تھے اور بعد نزول کے بھی اس پر قائم رہے اور اس کی تجدید کی، یہ تو انکے اعتقاد اور جزار کا بیان تھا آگے اعمال و اخلاق کا ذکر ہے کہ) اور وہ لوگ نیکی (اور تحمل) سے بدی (اور ایذار) کا دفعیہ کر دیتے ہیں اور ہم نے جو کچھ اُن کو دیا ہے اُس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور (جس طرح یہ لوگ عملی ایذاؤں پر صبر کرتے ہیں اسی طرح) جب کسی سے (اپنے متعلق) کوئی لغو بات سنتے ہیں (جو قولی ایذا ہے) تو اس کو (بھی) ٹال جاتے ہیں اور (سلامت روی کے طور پر) کہدیتے ہیں کہ (ہم کچھ جواب نہیں دیتے) ہمارا عمل ہمارے سامنے آئے گا اور تمہارا عمل تمہارے سامنے (بھائی) ہم تو تم کو سلام کرتے ہیں (ہم کو جھگڑے سے معاف رکھو) ہم بے سمجھ لوگوں سے اُلجھنا نہیں چاہتے۔

معارف و مسائل

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ، اس آیت میں اُن اہلِ کتاب کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت و نبوت اور نزولِ قرآن سے پہلے ہی تورات و انجیل کی دی ہوئی بشارتوں کی بنار پر نزولِ قرآن اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر یقین رکھتے تھے۔ پھر آپ مبعوث ہوئے تو اپنے سابق یقین کی بنار پر ایمان لے آئے۔ حضرت ابنِ عباس سے روایت ہے

کہ نجاشی بادشاہ حبشہ کے درباریوں میں سے چالیس آدمی مدینہ طیبہ میں اسوقت حاضر ہوئے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر میں مشغول تھے یہ لوگ بھی جہاد میں شریک ہوگئے، بعض کو کچھ زخم بھی لگے مگر ان میں سے کوئی مقتول نہیں ہوا۔ اُنھوں نے جب صحابہ کرام کی معاشی تنگی کا حال دیکھا تو آپ سے درخواست کی کہ ہم اللہ کے فضل سے مالدار اصحاب جائداد ہیں ہم اپنے ملک واپس جاکر صحابہ کرام کے لئے مال فراہم کرکے لائیں آپ اجازت دیدیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ (الیٰ قولہ) وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ (اخرجہ ابن مردویہ والطبرانی فی الاوسط۔ مظہری) اور حضرت سعید بن جبیرؓ کی روایت ہے کہ حضرت جعفرؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب ہجرت مدینہ سے پہلے حبشہ گئے تھے اور نجاشی کے دربار میں اسلام کی تعلیمات پیش کیں تو نجاشی اور اسکے اہلِ دربار جو اہلِ کتاب تھے اور تورات و انجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور علامتیں دیکھے ہوئے تھے ان کے دلوں میں اسی وقت اللہ نے ایمان ڈالدیا (مظہری)

لفظ مسلمین اُمتِ محمدیہ کا مخصوص لقب ہے یا تمام اُمتوں کے لئے عام ہے اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ، یعنی ان حضرات اہلِ کتاب نے کہا کہ ہم تو قرآن کے نازل ہونے سے پہلے ہی مسلمان تھے

یہاں لفظ مسلم اگر اپنے لغوی معنے میں لیا جائے یعنی مطیع و فرمانبردار تو بات صاف ہے کہ ان کو جو یقین قرآن اور نبی آخر الزماں پر اپنی کتابوں کی وجہ سے حاصل تھا اس یقین کو لفظ اسلام اور مسلمین سے تعبیر فرمایا کہ ہم تو پہلے ہی سے اس کو مانتے تھے۔ اور اگر لفظ مسلمین اس جگہ اُس معنے میں لیا جائے جس کے لحاظ سے اُمتِ محمدیہ کا لقب مسلمین ہے تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ اسلام اور مسلمین کا لفظ صرف اُمتِ محمدیہ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین اسلام ہی تھا اور وہ سب مسلمین ہی تھے مگر قرآن کریم کی بعض آیات سے اسلام اور مسلمین کا اس اُمت کے لئے مخصوص لقب ہونا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول خود قرآن نے نقل کیا ہے هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ، اور علامہ سیوطی اسی خصوصیت کے قائل ہیں اور اس مضمون پر اُن کا ایک مستقل رسالہ ہے انکے نزدیک اس آیت میں مسلمین سے مراد یہ ہے کہ ہم تو پہلے ہی سے اسلام کو قبول کرنے کے لئے آمادہ اور تیار تھے۔ اور اگر غور کیا جائے تو ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں کہ اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کے دین کا مشترک نام بھی ہو اور اس اُمت کے لئے مخصوص لقب بھی۔ کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ اسلام اپنے معنی وصفی کے اعتبار سے سب میں مشترک ہو مگر مسلم کا لقب صرف اس اُمت کے لئے مخصوص ہو جیسے صدیق اور فاروق وغیرہ کے القاب ہیں جنکا مصداقِ خاص اس اُمت میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں، حالانکہ اپنے معنے وصفی کے اعتبار سے دوسرے حضرات بھی صدیق اور فاروق ہوسکتے ہیں

(ہذا ما سنح لی واللہ اعلم)

اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَھُمْ مَّرَّتَیْنِ، یعنی مؤمنین اہلِ کتاب کو دو مرتبہ اجر دیا جائے گا۔
قرآن کریم میں اسی طرح کا وعدہ ازواج مطہرات کے متعلق بھی آیا ہے وَمَنْ یَّقْنُتْ مِنْکُنَّ لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِہَآ اَجْرَہَا مَرَّتَیْنِ، اور صحیح بخاری کی ایک حدیث میں تین شخصوں کے لئے دوہرے اجر کا ذکر فرمایا ہے ایک وہ اہلِ کتاب جو پہلے اپنے سابق نبی پر ایمان لایا، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر، دوسرا وہ شخص جو کسی کا مملوک غلام ہو اور وہ اپنے آقا کی بھی اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہو اور اللہ اور اسکے رسول کی بھی، تیسرا وہ شخص جس کی ملک میں کوئی کنیز تھی جس سے بلا نکاح صحبت اسکے لئے حلال تھی اس نے اس کو اپنی غلامی سے آزاد کر دیا پھر اس کو منکوحہ زوجہ بنالیا۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ان چند قسموں کو دو مرتبہ اجر دینے کی علت کیا ہے اگر کہا جائے کہ ان دونوں کے دو عمل اس دوہرے اجر کا سبب ہیں کیونکہ مؤمنین اہلِ کتاب کے دو عمل یہ ہیں کہ پہلے ایک نبی اور اس کی کتاب پر ایمان لائے پھر دوسرے نبی اور اس کی کتاب پر، اور ازواج مطہرات کے دو عمل یہ ہیں کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و محبت بحیثیت رسول بھی کرتی ہیں اور بحیثیت شوہر بھی، اور مملوک غلام کے دو عمل اسکی دوہری اطاعت و فرمانبرداری ہے، اللہ و رسول کی بھی اور آقا کی بھی، اور کنیز کو آزاد کر کے اس سے نکاح کرنے والے کا ایک عمل صالح اسکو آزاد کرنا دوسرا اسکو منکوحہ زوجہ بنالینا ہے۔ مگر اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دو عمل کے دو اجر ہونا تو مقتضائے عدل و انصاف ہونے کی وجہ سے سب کے لئے عام ہے اسمیں مؤمنین اہلِ کتاب یا ازواج مطہرات وغیرہ کی کیا خصوصیت ہے جو شخص بھی دو عمل کریگا دو اجر پائے گا؟ اس سوال کے جواب کی مکمل تحقیق احقر نے احکام القرآن سورۂ قصص میں لکھی ہے اسمیں جو بات خود الفاظِ قرآن کی دلالت سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان تمام اقسام میں مراد صرف دو اجر نہیں، کیونکہ وہ تو ہر عمل کرنے والے کے لئے عام ضابطہ قرآنیہ ہے لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ، یعنی اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا بلکہ وہ جتنے نیک عمل کرے گا اُسی کے حساب سے اجر پائے گا۔ بلکہ ان اقسام مذکورہ میں دو اجر سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان کے ہر عمل کا دوہرا ثواب ملے گا۔ ہر نماز پر اسکا دوہرا، ہر روزہ پر اسکا دوہرا، ہر صدقہ اور حج و عمرہ پر اسکا دوہرا ثواب پاویں گے۔ قرآن کے الفاظ پر غور کریں تو دو اجر دینے کے لئے مختصر لفظ اجرین کا تھا مگر قرآن نے اسکو چھوڑ کر اجر مرتین کا لفظ اختیار کیا جس میں صاف اشارہ اسکا پایا جاتا ہے کہ اجر مرتین سے مراد یہ ہے کہ ان کا ہر عمل مکرر لکھا جائیگا اور ہر عمل پر دوہرا ثواب ملے گا۔

رہا یہ معاملہ کہ ان کی اتنی بڑی فضیلت اور خصوصیت کا سبب کیا ہے تو اس کا

واضح جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ کسی خاص عمل کو دوسرے اعمال سے افضل قرار دیدے اور اسکا اجر بڑھا دے، کسی کو اس سوال کا حق نہیں ہے کہ روزہ کا ثواب اللہ تعالیٰ نے اتنا زیادہ کیوں کر دیا، زکوٰۃ و صدقہ کا کیوں ایسا نہ کیا؟ ہو سکتا ہے کہ یہ اعمال جنکا ذکر آیات مذکورہ اور حدیث بخاری میں ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا درجہ دوسرے اعمال سے ایک حیثیت میں بڑھا ہوا ہو اس پر یہ انعام فرمایا۔ اور بعض اکابر علماء نے جو اسکا سبب ان لوگوں کی دوہری مشقت کو قرار دیا ہے وہ بھی اپنی جگہ محتمل ہے اور اسی آیت کے آخر میں لفظ بِمَا صَبَرُوْا سے اس پر استدلال ہو سکتا ہے کہ علت اس دوہرے اجر کی اُن کا مشقت پر صبر کرنا ہے۔ واللہ اعلم

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ، یعنی یہ لوگ بُرائی کو بھلائی کے ذریعہ دُور کرتے ہیں۔ اس بُرائی اور بھلائی کی تعبیر میں ائمہ تفسیر کے بہت سے اقوال ہیں بعض نے فرمایا کہ بھلائی سے طاعت اور بُرائی سے معصیت مُراد ہے کیونکہ نیکی بدی کو مٹا دیتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل سے فرمایا اَتْبِعِ الْحَسَنَةَ السَّيِّئَةَ تَمْحُهَا، یعنی بدی اور گناہ کے بعد نیکی کرو تو وہ گناہ کو مٹا دے گی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا حسنہ سے مراد علم و حلم اور سیئہ سے مراد جہل و غفلت ہے یعنی یہ لوگ دوسروں کی جہالت کا جواب جہالت کے بجائے حلم و بُردباری سے دیتے ہیں اور درحقیقت ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ لفظ حسنہ اور سیئہ یعنی بھلائی اور بُرائی کے الفاظ ان سب چیزوں کو شامل ہیں۔

اس آیت میں دو اہم ہدایتیں ہیں اول یہ کہ اگر کسی شخص سے کوئی گناہ خطا سرزد ہو جائے تو اسکا علاج یہ ہے کہ اسکے بعد نیک عمل کی فکر کرے تو نیک عمل اُس گناہ کا کفارہ ہو جائیگا جیسا کہ حدیث معاذ رض کے حوالہ سے اوپر بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو شخص کسی کے ساتھ ظلم اور برائی سے پیش آئے اگرچہ قانون شرع کی رُو سے اسکو اپنا انتقام لے لینا جائز ہے بشرطیکہ انتقام برابر سرابر ہو کہ جتنا نقصان یا تکلیف اسکو پہنچائی ہے اُتنا ہی یہ اپنے حریف کو پہنچا دے مگر اولیٰ اور احسن یہ ہے کہ انتقام کے بجائے بُرائی کے بدلہ میں بھلائی اور ظلم کے بدلہ میں احسان کرے کہ یہ اعلیٰ درجہ مکارم اخلاق کا ہے اور دُنیا و آخرت میں اسکے منافع بیشمار ہیں۔ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں یہ ہدایت بہت واضح الفاظ میں اس طرح آئی ہے اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ، یعنی بُرائی اور ظلم کو ایسے طریقہ سے دفع کرو جو کہ بہتر ہے۔ (یعنی ظلم کے بدلہ میں احسان کرو) تو جس شخص کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے وہ تمہارا مخلص دوست بن جائے گا۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ، یعنی ان لوگوں کی ایک عمدہ خصلت یہ ہے کہ جب

یہ کسی جاہل دشمن سے لغو بات سُنتے ہیں تو اسکا جواب دینے کے بجائے یہ کہدیتے ہیں کہ ہمارا سلام لو ہم جاہل لوگوں سے اُلجھنا پسند نہیں کرتے۔ امام جصاصؒ نے فرمایا کہ سلام کی دو قسمیں ہیں، ایک سلام تحیہ جو مسلمان باہم ایک دوسرے کو کرتے ہیں، دوسرا سلام مسالمت و متارکت یعنی اپنے حریف کو یہ کہدینا کہ ہم تمھاری لغویات کا کوئی انتقام تم سے نہیں لیتے، یہاں سلام سے یہی دوسرے معنے مُراد ہیں۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ

تو راہ پر نہیں لاتا جس کو چاہے پر اللہ راہ پر لائے جس کو

يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿٥٦﴾

چاہے اور وہی خوب جانتا ہے جو راہ پر آئیں گے

خلاصۂ تفسیر

آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت کر دیتا ہے (اور ہدایت کرنے کی قدرت تو کسی کو کیا ہوتی اللہ کے سوا کسی کو اسکا علم تک بھی نہیں کہ کون کون ہدایت پانے والا ہے بلکہ) ہدایت پانے والوں کا علم اُسی کو ہے۔

معارف و مسائل

لفظ ہدایت کئی معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک معنے صرف راستہ دکھا دینے کے ہیں، جس کے لئے ضروری نہیں کہ جس کو راستہ دکھایا گیا وہ منزل مقصود پر پہنچے اور ایک معنی ہدایت کے یہ بھی آتے ہیں کہ کسی کو منزلِ مقصود پر پہنچا دیا جائے۔ پہلے معنے کے اعتبار سے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام انبیاء کا ہادی ہونا اور یہ ہدایت اُن کے اختیار میں ہونا ظاہر ہے کیونکہ یہ ہدایت ہی اُن کا فرضِ منصبی ہے اگر اس کی اُن کو قدرت نہ ہو تو فریضہ رسالت و نبوت کیسے ادا کریں۔ اس آیت میں جو آپ کا ہدایت پر قادر نہ ہونا بیان فرمایا ہے اس سے مراد دوسرے معنے کی ہدایت ہے، یعنی مقصود پر پہنچا دینا۔ اور مطلب یہ ہے کہ اپنی تبلیغ و تعلیم کے ذریعہ آپ کسی کے دل میں ایمان ڈالدیں اس کو مؤمن بنادیں یہ آپ کا کام نہیں یہ تو براہِ راست حق تعالےٰ کے اختیار میں ہے۔ ہدایت کے معنی اور اُس کی اقسام کی مکمل تحقیق سورۂ بقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ آپ کی بڑی تمنا یہ تھی کہ وہ کسی طرح ایمان قبول کرلیں اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتلایا گیا

کسی کو مومن بنا دینا آپ کی قدرت میں نہیں۔ تفسیر روح المعانی میں ہے کہ ابوطالب کے ایمان و کفر کے معاملے میں بے ضرورت گفتگو اور بحث و مباحثہ سے اور اُن کو بُرا کہنے سے اجتناب کرنا چاہئے کہ اس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طبعی ایذاء کا احتمال ہے۔ واللہ اعلم۔

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَلَمْ

اور کہنے لگے اگر ہم راہ پر آئیں تیرے ساتھ اُچک لئے جائیں اپنے ملک سے کیا ہم نے

نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ

جگہ نہیں دی اُن کو حرمت والے پناہ کے مکان میں کھنچے چلے آتے ہیں اسکی طرف میوے ہر چیز کے روزی ہماری

لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ

طرف سے پر بہت ان میں سمجھ نہیں رکھتے اور کتنی غارت کردیں ہم نے بستیاں

بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ

جو اترا چلی تھیں اپنی گزران میں اب یہ ہیں اُن کے گھر آباد نہیں ہوئے اُن کے پیچھے

اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ

مگر تھوڑے اور ہم ہیں آخر کو سب کچھ لینے والے اور تیرا رب نہیں غارت کرنے والا

الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا

بستیوں کو جب تک نہ بھیج لے انکی بڑی بستی میں کسی کو پیغام دے کر جو سُنائے انکو ہماری باتیں اور ہم ہرگز نہیں

مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ

غارت کرنے والے بستیوں کو مگر جبکہ وہاں کے لوگ گنہگار ہوں اور جو تم کو ملی ہے کوئی چیز

فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ؕ

سو فائدہ اُٹھا لینا ہے دُنیا کی زندگی میں اور یہاں کی رونق ہے، اور جو اللہ کے پاس ہے سو بہتر ہے اور باقی رہنے والا

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع

کیا تم کو سمجھ نہیں

ع ۶ ۹

خلاصۂ تفسیر

(اُوپر دُور سے کفار کے ایمان نہ لانے کا ذکر چلا آرہا ہے ان آیات میں اُن موانع کا ذکر ہے جو کفار کو ایمان لانے کی راہ میں حائل سمجھے جاتے تھے، مثلاً ایک مانع کا بیان یہ ہے کہ) اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر آپ کے ساتھ ہو کر (اس دین کی) ہدایت پر چلنے لگیں تو فی الفور اپنے مقام سے مار کر نکال دیئے

جاویں (کہ بے وطنی کی بھی مضرت ہو اور معاش کی پریشانی الگ ہو، لیکن اس عذر کا بطلان ہی بالکل ظاہر ہے) کیا ہم نے ان کو امن و امان والے حرم میں جگہ نہیں دی جہاں ہر قسم کے پھل کھچے چلے آتے ہیں جو ہمارے پاس سے (یعنی ہماری قدرت اور رزاقی سے) کھانے کو ملتے ہیں (پس حرم ہونے کی وجہ سے جس کا سب احترام کرتے ہیں مضرت کا بھی اندیشہ نہیں اور اس مضرت کے منتفی ہونے کی وجہ سے احتمال فوتِ منفعتِ رزق کا بھی نہیں، پس ان کو چاہئے تھا کہ اس حالت کو غنیمت سمجھتے اور اسکو نعمت سمجھ کر قدر کرتے اور ایمان لے آتے) ولیکن ان میں اکثر لوگ (اس کو) نہیں جانتے (یعنی اسکا خیال نہیں کرتے) اور (ایک سبب اُن کے ایمان نہ لانے کا یہ ہے کہ یہ اپنی خوش عیشی پر نازاں ہیں لیکن یہ بھی حماقت ہے کیونکہ) ہم بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کر چکے ہیں جو اپنے سامانِ عیش پر نازاں تھے، سو (دیکھ لو) یہ انکے گھر (تمہاری آنکھوں کے سامنے پڑے) ہیں کہ ان کے بعد آباد ہی نہ ہوئے مگر تھوڑی دیر کے لئے (کہ کسی مسافر وارد وصادر کا ادھر کو اتفاقاً گزر ہو جاوے اور وہ تھوڑی دیر وہاں ستانے کو یا تماشا دیکھنے کو بیٹھ جاوے یا شب کو رہ جاوے) اور آخر کار (انکے ان سب سامانوں کے) ہم ہی مالک رہے (کوئی ظاہری وارث بھی ان کا نہ ہوا) اور (ایک شبہ انکو یہ ہوتا ہے کہ اگر ان لوگوں کی ہلاکت بسبب کفر کے ہے تو ہم مدت سے کفر کرتے آرہے ہیں ہمکو کیوں نہ ہلاک کیا جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ الخ اور اس شبہ کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے سو اسکا حل یہ ہے کہ) آپکا رب بستیوں کو (اول ہی بار میں) ہلاک نہیں کیا کرتا جبتک کہ (بستیوں) کے صدر مقام میں کسی پیغمبر کو نہ بھیج لے اور (پیغمبر کو بھیجنے کے بعد بھی فوراً) ہم ان بستیوں کو ہلاک نہیں کرتے مگر اسی حالت میں کہ وہاں کے باشندے بہت ہی شرارت کرنے لگیں (یعنی ایک مدتِ معتدبہ تک بار بار کی تذکیر سے تذکر قبول نہ کریں تو اس وقت ہلاک کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جن بستیوں کی ہلاکت کا اوپر ذکر تھا وہ بھی اسی قانون کے موافق ہلاک ہوئیں سو اسی قانون کے موافق تمہارے ساتھ عملدرآمد ہو رہا ہے اسلئے نہ رسول سے پہلے ہلاک کیا اور نہ بعد رسول کے ابھی تک ہلاک کیا مگر چند روز گزرنے دو۔ اگر تمہارا یہی عناد رہا تو سزا ہو ہی گی چنانچہ بدر وغیرہ میں ہوئی) اور (ایک وجہ ایمان نہ لانے کی یہ ہے کہ دُنیا نقد ہے اسلئے مرغوب ہے اور آخرت اُدھار ہے اسلئے غیر مرغوب ہے، پس دُنیا کی رغبت سے دل خالی نہیں ہوتا کہ اسمیں آخرت کی رغبت سماوے پھر اس کی تحصیل کا طریقہ تلاش کیا جاوے جو کہ ایمان ہے سو اکی نسبت یہ سُن رکھو کہ) جو کچھ تم کو دیا دلایا گیا ہے وہ محض (چند روزہ) دُنیوی زندگی کے برتنے کے لئے ہے اور یہیں کی (زیب و) زینت ہے (کہ خاتمہ عمر کے ساتھ اسکا بھی خاتمہ ہو جائیگا) اور جو (اجر و ثواب) اللہ کے ہاں ہے وہ بدرجہا اس سے (کیفیۃً بھی) بہتر ہے اور (کمیۃً بھی) زیادہ (یعنی ہمیشہ) باقی رہنے والا ہے سو کیا تم لوگ (اس تفاوت کو یا اس تفاوت کے اقتضاء کو) نہیں سمجھتے (غرض تمہارے اعذار اور اسباب پر

اصرار علی الکفر سب محض بے بنیاد اور لغو ہیں سمجھو اور مانو)

معارف و مسائل

وَقَالُوٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا، یعنی کفار مکہ حارث بن عثمان وغیرہ نے اپنے ایمان نہ لانے کی ایک وجہ یہ بیان کی کہ اگرچہ ہم آپ کی تعلیمات کو حق مانتے ہیں مگر ہمیں خطرہ یہ ہے کہ اگر ہم آپ کی ہدایات پر عمل کر کے آپکے ساتھ ہوجاویں تو سارا عرب ہمارا دشمن ہوجائیگا اور ہمیں ہماری زمین مکہ سے اُچک لے گا (اخرجہ النسائی وغیرہ) قرآن کریم نے انکے اس عذر لنگ کے تین جواب دیئے اول یہ کہ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ، یعنی اُن کا یہ عذر اسلئے باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ اہلِ مکہ کی حفاظت کا ایک قدرتی سامان پہلے سے یہ کر رکھا ہے کہ ارضِ مکہ کو حرم بنا دیا اور پورے عرب کے قبائل کفر و شرک اور باہمی عداوتوں کے باوجود اس پر متفق تھے کہ زمین حرم مکہ میں قتل و قتال سخت حرام ہے۔ حرم میں باپ کا قاتل بیٹے کو ملتا تو انتہائی جوشِ انتقام کے باوجود کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ حرم کے اندر اپنے دشمن کو قتل کردے یا اُس سے کوئی انتقام لے لے، اسلئے ایمان لانے میں اُن کو یہ خطرہ محسوس کرنا کسقدر جہالت ہے کہ جس مالک نے اپنے رحم و کرم سے اُنکے کفر و شرک کے باوجود اس زمین میں امن دے رکھا ہے تو ایمان لانے کی صورت میں وہ اُن کو کیسے ہلاک ہونے دیگا۔ یحییٰ بن سلام نے فرمایا کہ معنے آیت کے یہ ہیں کہ تم حرم کی وجہ سے مامون و محفوظ تھے، میرا دیا ہوا رزق فراخی کے ساتھ کھا رہے تھے اور عبادت میرے سوا دوسروں کی کرتے تھے اپنی اس حالت سے تو تمہیں خوف نہ ہوا اُلٹا خوف اللہ پر ایمان لانے سے ہوا۔ (قرطبی) آیتِ مذکورہ میں حرم مکہ کے دو وصف بیان فرمائے ہیں ایک یہ کہ وہ جائے امن ہے۔ دوسرے یہ کہ وہاں اطرافِ دُنیا سے ہر چیز کے ثمرات لائے جاتے ہیں تاکہ مکہ کے باشندے اپنی تمام ضروریات آسانی سے پوری کرسکیں۔

حرم مکہ میں ہر چیز کے ثمرات کا جمع ہونا خاص آیاتِ قدرت میں سے ہے: مکہ مکرمہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بیت کے لئے ساری دُنیا میں سے منتخب فرمایا ایک ایسا مقام ہے کہ وہاں دُنیا کی معیشت کی کوئی چیز آسانی سے نہ ملنا چاہیئے کیونکہ گیہوں، چنا، چاول وغیرہ جو عام انسانی غذا ہے، ان چیزوں کی پیداوار بھی وہاں نہ ہونے کے حکم میں تھی۔ پھل اور ترکاریوں وغیرہ کا تو کہنا کیا ہے مگر یہ سب چیزیں جس افراط کے ساتھ مکہ مکرمہ میں ملتی ہیں عقل حیران رہ جاتی ہے کہ موسم حج کے موقع پر مکہ کی دو تین لاکھ کی آبادی پر بارہ پندرہ لاکھ مسلمانوں کا اضافہ ہر سال ہوجاتا ہے جو اوسطاً دو ڈھائی مہینے تک رہتا ہے۔ کبھی نہیں سُنا گیا کہ ان میں سے کسی کو کسی

زمانے میں غذائی ضروریات نہ ملی ہوں بلکہ رات دن کے تمام اوقات میں تیار شدہ غذا ہر وقت ملتے رہنے کا مشاہدہ ہر شخص کرتا ہے۔ اور قرآن کریم کے لفظ (ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ) میں غور کریں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عرفِ عام کے اعتبار سے ثمرات کا تعلق درختوں کے ساتھ ہے مقام اسکا تھا کہ ثمرات کل شجر فرمایا جاتا، اسکے بجائے ثمرات کل شئ فرماتے ہیں بعید نہیں کہ اشارہ اس طرف ہو کہ لفظ ثمرات یہاں صرف پھلوں کے معنے میں نہیں بلکہ مطلقاً حاصل اور پیداوار کے معنی میں ہے ملوں اور کارخانوں کی مصنوعات بھی اُنکے ثمرات ہیں، اس طرح حاصل اس آیت کا یہ ہوگا کہ حرم مکہ میں صرف کھانے پینے ہی کی چیزیں جمع نہیں ہوں گی بلکہ تمام ضروریاتِ زندگی جمع کر دی جائیں گی جسکا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہو رہا ہے کہ شاید دُنیا کے کسی بھی ملک میں یہ بات نہو کہ ہر ملک اور ہر خطے کی غذائیں اور وہاں کی مصنوعات اس افراط کے ساتھ وہاں ملتی ہوں جیسی مکہ مکرمہ میں ملتی ہیں۔ یہ تو کفار مکہ کے عذر کا ایک جواب ہوا کہ جس مالک نے تمہاری حالتِ کفر و شرک میں تم پر یہ انعامات برسائے کہ تمہاری زمین کو ہر خطرہ سے مامون و محفوظ کر دیا اور باوجودیکہ اس زمین میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی، ساری دُنیا کی پیداوار یہاں لاکر جمع کر دی تو تمہارا یہ خطرہ کیسی بڑی جہالت ہے کہ خالقِ کائنات پر ایمان لانے کی صورتمیں تم سے یہ نعمتیں سلب ہو جائیں گی۔

اس کے بعد دوسرا جواب اس عذر کا یہ ہے وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا، جسمیں یہ بتلایا گیا ہے کہ دنیا کی دوسری کافر قوموں کے حالات پر نظر ڈالو کہ اُن کے کفر و شرک کے وبال سے کس طرح اُن کی بستیاں تباہ ہوئیں اور مضبوط و مستحکم قلعے اور حفاظتی سامان سب خاک میں مل گئے تو اصل خوف کی چیز کفر و شرک ہے جو تباہی و بربادی کا سبب ہوتا ہے۔ تم کیسے بے خبر بے وقوف ہو کہ کفر و شرک سے خطرہ محسوس نہیں کرتے ایمان سے خطرہ محسوس کرتے ہو۔

تیسرا جواب اس آیت میں دیا گیا وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا الآیۃ جس میں یہ بتلایا کہ اگر بالفرض ایمان لانے کے نتیجہ میں تمھیں کوئی تکلیف پہنچ ہی جائے تو وہ چند روزہ ہے اور جس طرح دُنیا کی عیش و عشرت مال و دولت سب چند روزہ متاع ہے کسی کے پاس ہمیشہ نہیں رہتی، اسی طرح یہاں کی تکلیف بھی چند روزہ ہے جلد ختم ہو جانے والی ہے اسلئے عقلمند کا کام یہ ہے کہ فکر اُس تکلیف و راحت کی کرے جو پائیدار اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ ہمیشہ رہنے والی دولت و نعمت کیخاطر چند روزہ تکلیف و مشقت برداشت کر لینا ہی عقلمندی کی دلیل ہے۔

لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا، یعنی پچھلی قوموں کی جن بستیوں کو عذاب الٰہی سے برباد کیا گیا تھا، اب تک بھی اُن میں آبادی نہیں ہوئی بجز قدر قلیل کے۔ اس قدر قلیل سے مراد اگر مساکن اور مقامات قلیلہ لئے جاویں جیسا کہ زجاج کا قول ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ ان تباہ شدہ

بستیوں میں کوئی مقام اور کوئی مکان پھر آباد نہیں ہو سکا بجز عدد قلیل کے کہ وہ آباد ہوئے مگر حضرت ابن عباس سے آیت کی یہ تفسیر منقول ہے کہ قدر قلیل سے مقامات اور مکانات قلیلہ کا استثناء نہیں بلکہ زمانِ سکونت کا استثناء مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر ان بستیوں میں کوئی رہتا بھی ہے تو بہت تھوڑی دیر کے لئے جیسے کوئی راہگیر مسافر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جائے جسکو بستیوں کی آبادی نہیں کہا جا سکتا۔

حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا، لفظ اُمّ کے مشہور معنے والدہ اور ماں کے ہیں اور ماں چونکہ تخلیقِ انسانی کی بنیاد ہے اسلئے لفظ اُمّ اصل اور اساس کے معنے میں بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ اُمّھا کی ضمیر قُرٰی کی طرف راجع ہے اُمّھا سے مراد اُمّ القریٰ ہے یعنی بستیوں کی اصل اور مدار کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اُسوقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک اُس قوم کے بڑے شہروں میں اپنے کسی رسُول کے ذریعہ پیغامِ حق نہ پہنچا دے، جب دعوتِ حق پہنچ جائے اور لوگ اُس کو قبول نہ کریں اُسوقت ان بستیوں پر عذاب آتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کے انبیاء اور رُسُل عموماً بڑے شہروں میں مبعوث ہوتے ہیں وہ چھوٹے قصبات و دیہات میں نہیں آتے کیونکہ ایسے قصبات و دیہات عادۃً شہر کے تابع ہوتے ہیں اپنی معاشی ضروریات میں بھی اور تعلیمی ضروریات میں بھی۔ اور شہر میں جو بات پھیل جائے اس کا تذکرہ ملحقہ قصبات و دیہات میں خود بخود پھیل جاتا ہے اسی لئے جب کسی بڑے شہر میں رسُول مبعوث ہوا اور اُس نے دعوتِ حق پیش کردی تو یہ دعوت ان قصبات و دیہات میں بھی عادۃً پہنچ جاتی ہے اس طرح ان سب پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور انکار و تکذیب کیا جائے تو سب پر عذاب آتا ہے۔

احکام و قوانین میں قصبات و دیہات شہروں کے تابع ہوتے ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ جیسے معاشی ضروریات میں چھوٹی بستیاں بڑے شہر کے تابع ہوتی ہیں وہیں سے اُن کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اسی طرح جب کسی حکم کا اعلان شہر میں کر دیا جائے تو اس حکم کی تعمیل اس کی ملحقہ بستیوں پر بھی لازم ہو جاتی ہے، نہ جاننے یا نہ سُننے کا عذر مسموع نہیں ہوتا۔

ہلالِ رمضان وعید کے مسئلے میں بھی فقہاء نے یہی فرمایا ہے کہ ایک شہر میں اگر شہادتِ شرعیہ کے ساتھ قاضی شہر کے حکم سے چاند کی رؤیت ثابت ہو جائے تو ملحقہ بستیوں کو بھی اُس پر عمل کرنا لازم ہے۔ لیکن دوسرے شہر والوں پر اُسوقت تک لازم نہیں ہوگا جبتک خود اس شہر کا قاضی شہادت کو تسلیم کر کے اسکا حکم نہ دے۔ (کذا فی الفتاوی الغیاثیہ)

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى، یعنی دنیا کا مال و متاع اور عیش و عشرت سب فانی ہے اور یہاں کے اعمال کا جو بدلہ آخرت میں ملنے والا ہے وہ یہاں کے مال و اسباب اور عیش و

عشرت سے اپنی کیفیت کے اعتبار سے بھی بہت بہتر ہے کہ دُنیا کی کوئی بڑی سے بڑی راحت و لذت بھی اسکا مقابلہ نہیں کر سکتی اور پھر وہ ہمیشہ باقی رہنے والی بھی ہے بخلاف متاعِ دُنیا کے کہ وہ کتنا ہی بہتر ہو مگر بالآخر فانی اور زائل ہونے والا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی عقلمند آدمی ایسے عیش کو جو کم درجہ بھی ہو اور چند روزہ بھی اُس عیش و آرام پر ترجیح نہیں دے سکتا جو راحت و لذت میں اس سے زیادہ بھی ہو اور ہمیشہ رہنے والا بھی ہو۔

عقلمند کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ دُنیا کے دھندوں میں زیادہ منہمک نہ ہو بلکہ آخرت کی فکر میں لگے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنے مال و جائیداد کے متعلق یہ وصیت کر کے مر جائے کہ میرا مال اُس شخص کو دیدیا جائے جو سب سے زیادہ عقلمند ہو تو اس مال کے مصرف شرعی وہ لوگ ہونگے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت و طاعت میں مشغول ہوں، کیونکہ عقل کا تقاضا یہی ہے اور دُنیا داروں میں سے سب سے زیادہ عقل والا وہی ہے۔ یہی مسئلہ فقہ حنفیہ کی مشہور کتاب دُرِّ مختار باب الوصیت میں بھی مذکور ہے۔

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِیْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ

بھلا ایک شخص جس سے ہم نے وعدہ کیا ہے اچھا وعدہ سو وہ اُس کو پانے والا ہے برابر ہے اسکے جس کو ہم نے فائدہ

الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ثُمَّ هُوَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ ﴿۶۱﴾ وَیَوْمَ

دیا دُنیا کی زندگی کا پھر وہ قیامت کے دن پکڑا ہوا آیا اور جس دن

یُنَادِیْهِمْ فَیَقُوْلُ اَیْنَ شُرَكَآءِیَ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۶۲﴾

اُن کو پکارے گا تو کہے گا کہاں ہیں میرے شریک جن کا تم دعویٰ کرتے تھے

قَالَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَغْوَیْنَا ۚ

بولے جن پر ثابت ہو چکی بات اے رب یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکایا

اَغْوَیْنٰهُمْ كَمَا غَوَیْنَا ۚ تَبَرَّاْنَاۤ اِلَیْكَ ۫ مَا كَانُوْۤا اِیَّانَا یَعْبُدُوْنَ ﴿۶۳﴾

اُن کو بہکایا جیسے ہم آپ بہکے ہم منکر ہوئے تیرے آگے وہ ہم کو نہ پوجتے تھے

وَقِیْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهُمْ وَ

اور کہیں گے پکارو اپنے شریکوں کو پھر پکاریں گے اُن کو تو وہ جواب نہ دیں گے اُن کو اور

رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا یَهْتَدُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَیَوْمَ یُنَادِیْهِمْ

دیکھیں گے عذاب کسی طرح وہ راہ پائے ہوئے ہوتے اور جس دن اُن کو پکارے گا

فَيَقُولُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶۵﴾ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْبَآءُ

تو فرمائے گا کیا جواب دیا تھا تم نے پیغام پہنچانے والوں کو پھر بند ہو جائیں گی ان پر باتیں

يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَ

اُس دن سو وہ آپس میں بھی نہ پوچھیں گے سو جس نے کہ توبہ کی اور یقین لایا اور

عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ﴿۶۷﴾

عمل کئے اچھے سو اُمید ہے کہ ہو چھوٹنے والوں میں

خُلاصۂ تفسیر

بھلا وہ شخص جس سے ہم نے ایک پسندیدہ وعدہ کر رکھا ہے پھر وہ شخص اُس (وعدہ کی چیز) کو پانے والا ہے کیا اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جس کو ہم نے دُنیوی زندگی کا چند روزہ فائدہ دے رکھا ہے پھر وہ قیامت کے روز ان لوگوں میں ہوگا جو گرفتار کر کے لائیں جائیں گے (مُراد پہلے شخص سے مؤمن ہے جس سے جنت کا وعدہ ہے اور دوسرے سے مراد کافر جو مجرم ہو کر آئے گا اور چونکہ متاعِ دُنیا ہی ان لوگوں کی بھول کا سبب ہے اسلئے اسکی تصریح فرمادی، ورنہ ان دونوں کا برابر نہ ہونا تو دراصل اسوجہ سے ہے کہ وہ گرفتار کر کے حاضر کئے جاویں گے یہ جنت کی نعمتوں سے سرفراز ہونگے) اور (آگے اس تفاوت اور کیفیت احضار کی تفصیل ہے کہ وہ دن قابل یاد کرنے کے ہے) جس دن خدا تعالیٰ ان کافروں کو (بطور سزا کے) پکار کر کہے گا کہ وہ میرے شریک کہاں ہیں جن کو تم (ہمارا شریک) سمجھ رہے تھے (مراد اس سے شیاطین ہیں کہ اُنہی کی اطاعت مطلقہ سے شرک کرتے تھے اس لئے ان کو شرکا کہا اسکو سنکر شیاطین) جن پر (لوگوں کو گمراہ کرنے کی وجہ سے) خدا کا فرمودہ (یعنی استحقاق عذاب اس قول سے کہ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ) ثابت ہو چکا ہوگا وہ (بطور عذر کے) بول اُٹھیں گے کہ اے ہمارے پروردگار بیشک یہ وہی لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکایا (یہ جواب کی تمہید ہے اس حکایت کی تصریح اسلئے فرمائی گئی کہ جن کی شفاعت کی ان کو اُمید ہے وہ برعکس انکے خلاف شہادت دیں گے اور آگے جواب ہے کہ ہم نے بہکایا تو ضرور لیکن) ہم نے اُن کو ویسا ہی (بلا جبر و اکراہ) بہکایا جیسا ہم خود (بلا جبر و اکراہ) بہکے تھے (یعنی جس طرح ہم خود اپنے اختیار سے گمراہ ہوئے کسی نے ہمیں مجبور نہیں کیا اسی طرح ہمکو اُن پر جابرانہ تسلط نہ تھا ہمارا کام صرف بہکانا تھا پھر اسکو انھوں نے اپنی رائے اور اختیار سے قبول کر لیا جیسا سُورۂ ابراہیم میں ہے وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ الآیۃ، مطلب یہ ہے کہ ہم بھی مجرم ہیں مگر یہ بھی بری نہیں) اور ہم آپکی پیشی میں انکے (تعلقات) سے دستبرداری کرتے ہیں (اور) یہ لوگ (درحقیقت صرف) ہم کو (ہی) نہ پُوجتے تھے (یعنی

جب یہ اپنے اختیار سے بہکے ہیں تو یہ خود خواہش پرست ہوئے نہ کہ صرف شیطان پرست، مقصود اس سب حکایت سے یہ ہے کہ جن کے بھروسے بیٹھے ہیں وہ قیامت کے روز ان سے دست بردار ہوجائیں گے اور (جب وہ شرکاء اس طرح ان سے بیزاری دے کر رُخی کریں گے تو اسوقت ان مشرکین سے) کہا جائیگا کہ (اب) اپنے ان شرکاء کو بلاؤ چنانچہ وہ (فرط حیرت سے بالاضطرار) ان کو پکاریں گے سو وہ جواب بھی نہ دیں گے اور (اسوقت) یہ لوگ (اپنی آنکھوں) سے عذاب کو دیکھ لیں گے، اے کاش یہ لوگ دُنیا میں راہ راست پر ہوتے (تو یہ مصیبت نہ دیکھتے) اور جس دن ان کافروں سے پکار کر پوچھے گا کہ تم نے پیغمبروں کو کیا جواب دیا تھا سو اس روز ان (کے ذہن) سے سارے مضامین گُم ہو جائیں گے تو وہ (خود بھی نہ سمجھ سکیں گے اور) آپس میں پوچھ پاچھ بھی نہ کر سکیں گے البتہ جو شخص (کفر و شرک سے دنیا میں) توبہ کرے اور ایمان لے آئے اور نیک کام کیا کرے تو ایسے لوگ اُمید ہے کہ (آخرت میں) فلاح پانیوالوں سے ہونگے (اور ان آفات سے محفوظ رہیں گے)۔

معارف و مسائل

محشر میں کفار و مشرکین سے پہلا سوال شرک کے متعلق ہوگا کہ جن شیاطین وغیرہ کو تم ہمارا شریک کہا کرتے تھے اور اُن کا کہا مانتے تھے آج وہ کہاں ہیں، کیا وہ تمہاری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟ اسکے جواب میں ظاہر یہ تھا کہ مشرکین یہ جواب دیں کہ ہمارا کوئی قصور نہیں، ہم نے از خود شرک نہیں کیا بلکہ ہمیں تو ان شیاطین نے بہکایا تھا۔ اسلئے اللہ تعالیٰ خود ان شیاطین کی زبانوں سے کہلوا دیں گے کہ ہم نے بہکایا ضرور تھا مگر مجبور تو ہم نے نہیں کیا۔ اس لئے مجرم ہم بھی ہیں مگر جُرم سے بَری یہ بھی نہیں کیونکہ جس طرح ہم نے اُن کو بہکایا تھا اسکے بالمقابل انبیاء علیہم السلام اور اُن کے نائبوں نے انکو ہدایت بھی تو کی تھی اور دلائل کے ساتھ ان پر حق واضح کر دیا تھا، اُنھوں نے اپنے اختیار سے انبیاء کی بات نہ مانی ہماری مان لی تو یہ کیسے بری ہو سکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے سامنے حق کے دلائل واضحہ موجود ہوں اور وہ حق کی طرف دعوت دینے والوں کے بجائے گمراہ کرنے والوں کی بات مان کر گمراہی میں پڑ جائے تو یہ کوئی عذر معتبر نہیں۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ سُبْحٰنَ

اور تیرا رب پیدا کرتا ہے جو چاہے اور پسند کرے جس کو چاہے اُن کے ہاتھ میں نہیں پسند کرنا، اللہ

اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٨﴾ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ

نرالا ہے اور بہت اُوپر ہے اس چیز سے کہ شریک بتلاتے ہیں، اور تیرا رب جانتا ہے جو چھپ رہا ہے انکے سینوں میں

وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى

اور جو کچھ کہ ظاہر میں کرتے ہیں، اور وہی اللہ ہے کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، اسی کی تعریف ہے دنیا اور

وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۷۰﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ

آخرت میں اور اسی کے ہاتھ حکم ہے اور اسی کے پاس پھیرے جاؤ گے۔ تو کہہ دیکھو تو اگر اللہ

اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ

رکھ دے تم پر رات ہمیشہ کو قیامت کے دن تک کون حاکم ہے اللہ کے سوائے

يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿۷۱﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ

کہ لائے تم کو کہیں سے روشنی، پھر کیا تم سنتے نہیں تو کہہ دیکھو تو اگر رکھ دے اللہ

عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ

تم پر دن ہمیشہ کو قیامت کے دن تک کون حاکم ہے اللہ کے سوائے کہ لائے تم کو

بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ

رات جس میں آرام کرو، پھر کیا تم نہیں دیکھتے اور اپنی مہربانی سے بنا دیئے تمہارے واسطے

الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

رات اور دن کہ اس میں چین بھی کرو اور تلاش بھی کرو کچھ اس کا فضل اور تاکہ تم شکر کرو

خلاصۂ تفسیر

اور آپ کا رب (بالانفراد صفاتِ کمال کے ساتھ موصوف ہے چنانچہ وہ) جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے (تو تکوینی اختیارات بھی اسی کو حاصل ہیں) اور جس حکم کو چاہتا ہے پسند کرتا ہے (اور انبیاء کے ذریعہ سے نازل فرماتا ہے پس تشریعی اختیارات بھی اسی کو حاصل ہیں) ان لوگوں کو تجویز (احکام) کا کوئی حق (حاصل) نہیں (کہ جو حکم چاہیں تجویز کرلیں جیسے یہ مشرک اپنی طرف سے شرک کو جائز تجویز کر رہے ہیں اور اس خصوصی اختیار سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے (کیونکہ جب تکویناً و تشریعاً خالق اور مختار ہونے میں وہ منفرد ہے تو عبادت کا بھی تنہا وہی مستحق ہے کیونکہ معبود ہونا صرف اسکا حق ہے جو تکوینی اور تشریعی دونوں اختیار رکھتا ہو) اور آپ کا رب (علم ایسا کامل رکھتا ہے کہ وہ) سب چیزوں کی خبر رکھتا ہے جو ان کے دلوں میں پوشیدہ رہتا ہے اور جس کو یہ ظاہر کرتے ہیں (اور کسی کا ایسا علم بھی نہیں اس سے بھی انفراد ثابت ہوا) اور (آگے اس کی تصریح ہے کہ) اللہ وہی (ذات کامل الصفات) ہے اسکے سوا کوئی معبود (ہونے کے قابل) نہیں حمد (وثناء) کے لائق دنیا و آخرت میں وہی ہے (کیونکہ اسکے تصرفات دونوں عالم میں ایسے ہیں جو اسکے جامع کمالات اور مستحق حمد

ہونے پر شاہد ہیں) اور (اختیارات سلطنت اسکے ایسے ہیں کہ) حکومت بھی (قیامت میں) اسی کی ہوگی اور (قوت و وسعت سلطنت اسکی ایسی ہے) کہ تم سب اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے (یہ نہیں کہ بچ جاؤ یا اور کہیں جاکر پناہ لے لو اور اسکے اظہار قدرت کے لئے) آپ (ان لوگوں سے) کہئے کہ بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک رات ہی رہنے دے تو خدا کے سوا وہ کونسا معبود ہے جو تمہارے لئے روشنی کو لے آوے (پس قدرت میں بھی وہی منفرد ہے) تو کیا تم (توحید کے ایسے صاف دلائل کو) سنتے نہیں (اور اسی اظہار قدرت کے لئے) آپ (ان سے اسکے عکس کی نسبت بھی) کہئے کہ بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک دن ہی رہنے دے تو خدا کے سوا وہ کونسا معبود ہے جو تمہارے لئے رات کو لے آوے جس میں تم آرام پاؤ کیا تم (اس شاہد قدرت کو) دیکھتے نہیں (قدرت میں اسکا منفرد ہونا بھی اس کو مقتضی ہے کہ معبودیت میں بھی وہی منفرد ہو) اور (وہ منعم ایسا ہے کہ) اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا تاکہ تم رات میں آرام کرو اور تاکہ دن میں اس کی روزی تلاش کرو اور تاکہ (ان دونوں نعمتوں پر) تم (اللہ کا) شکر کرو (تو انعام و احسان میں بھی وہی منفرد ہے یہ بھی اسکی دلیل ہے کہ معبودیت میں بھی وہی منفرد ہو)۔

معارف و مسائل

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ وَيَخْتَارُ، اس آیت کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو خلاصہ تفسیر میں لیا گیا کہ یختار سے مراد اختیار احکام ہے کہ حق تعالیٰ جبکہ تخلیق کائنات میں منفرد ہے کوئی اسکا شریک نہیں تو اجرائے احکام میں بھی منفرد ہے جو چاہے اپنی مخلوق میں حکم نافذ فرمائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح اختیار تکوینی میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں اسی طرح اختیار تشریعی میں بھی کوئی شریک نہیں اور اسکا ایک دوسرا مفہوم وہ ہے جو امام بغوی نے اپنی تفسیر میں اور علامہ ابن قیم نے زاد المعاد کے مقدمہ میں بیان کیا ہے کہ اس اختیار سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہیں اپنے اکرام و اعزاز کے لئے انتخاب فرمالیتے ہیں اور بقول بغوی یہ جواب ہے مشرکین مکہ کے اس قول کا کہ لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰي رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَـتَيْنِ عَظِيْمٍ، یعنی یہ قرآن اللہ کو نازل ہی کرنا تھا تو عرب کے دو بڑے شہروں مکہ اور طائف میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل فرماتا کہ اسکی قدر و منزلت پہچانی جاتی، ایک یتیم مسکین پر نازل فرمانے میں کیا حکمت تھی؟ اسکے جواب میں فرمایا کہ جس مالک نے تمام مخلوقات کو بغیر کسی شریک کی امداد کے پیدا فرمایا ہے یہ اختیار بھی اُسی کو حاصل ہے کہ اپنے کسی خاص اعزاز کے لئے اپنی مخلوق میں سے کسی کو منتخب کرے اسمیں وہ تمہاری تجویزوں کا کیوں پابند ہو کہ فلاں اسکا مستحق ہے فلاں نہیں۔

ایک چیز کو دوسری چیز پر یا ایک شخص کو دوسرے پر فضیلت کا معیار صحیح اختیار خداوندی ہے

حافظ ابن قیم نے اس آیت سے ایک عظیم الشان ضابطہ اخذ کیا ہے کہ دُنیا میں جو ایک جگہ کو دوسری جگہ پر یا ایک چیز کو دوسری چیز پر فضیلت دی جاتی ہے یہ اُس چیز کے کسب عمل کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ وہ بلا واسطہ خالق کائنات کے انتخاب و اختیار کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اُس نے سات آسمان پیدا کئے اُنمیں سے سماءِ عُلیا کو دوسروں پر فضیلت دیدی حالانکہ مادہ ساتوں آسمانوں کا ایک ہی تھا، پھر اُس نے جنّت الفردوس کو دوسری سب جنتوں پر اور جبرئیل و میکائیل و اسرافیل وغیرہ خاص فرشتوں کو دوسرے فرشتوں پر، اور انبیاء علیہم السلام کو دوسرے سارے بنی آدم پر اور اُن میں سے اولوالعزم رسولوں کو دوسرے انبیاء پر اور اپنے خلیل ابراہیم اور حبیب محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو دوسرے سب اولوالعزم رسولوں پر، پھر اولادِ اسماعیل علیہ السلام کو دوسری ساری دُنیا کے لوگوں پر پھر قریش کو اُن سب پر اور بنی ہاشم کو سب قریش پر اور سید ولد آدم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب بنی ہاشم پر پھر اسی طرح صحابۂ کرام اور دوسرے اسلافِ اُمت کو دوسروں پر فضیلت دینا یہ سب حق تعالیٰ جل شانہٗ کے انتخاب و اختیار کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح زمین کے بہت سے مقامات کو دوسرے مقامات پر اور بہت دنوں اور راتوں کو دوسرے دنوں اور راتوں پر فضیلت دینا یہ سب اُسی اختیار اور انتخاب حق جل شانہٗ کا اثر ہے غرض افضلیت و مفضولیت کا اصل معیار تمام کائنات میں یہی انتخاب و اختیار ہے البتہ افضلیت کا ایک دوسرا سبب انسانی اعمال و افعال بھی ہوتے ہیں اور جن مقامات میں نیک اعمال کئے جاویں وہ مقامات بھی ان اعمال صالحہ یا صالحین عباد کی سکونت سے متبرک ہو جاتے ہیں۔ یہ فضیلت کسب و اختیار اور عمل صالح سے حاصل ہو سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دُنیا میں مدارِ فضیلت دو چیزیں ہیں ایک غیر اختیاری یعنی جو صرف حق تعالیٰ کا انتخاب ہے دوسرا اختیاری جو اعمال صالحہ اور اخلاقِ فاضلہ سے حاصل ہوتا ہے۔ علامہ ابن قیم نے اس موضوع پر بڑا تفصیلی کلام کیا ہے اور آخر میں صحابہ کرام میں سے خلفاء راشدین کو تمام دوسرے صحابہ پر اور خلفاء راشدین میں صدیقِ اکبر انکے بعد عمر بن خطاب ان کے بعد عثمان غنی انکے بعد علیِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کی ترتیب کو ان دونوں معیاروں سے ثابت کیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک مستقل رسالہ فارسی زبان میں اس موضوع پر ہے جسکا اردو ترجمہ احقر نے بنام تعبیر التفصیل لمسئلۃ التفضیل شائع کر دیا ہے اور احکام القرآن سورۂ قصص میں بھی اس کو بزبان عربی مفصل لکھدیا ہے۔ اہل علم کے ذوق کی چیز ہے وہاں مطالعہ فرمائیں۔

أَرَءَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم بِضِيَاءٍ ۖ أَفَلَا تَسْمَعُونَ ۝ الی قولہ بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ فِيهِ ۖ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ اس

آیت میں حق تعالیٰ نے رات کے ساتھ تو اُسکا ایک فائدہ ذکر فرمایا، بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ، یعنی رات میں انسان کو سکون ملتا ہے اسکے بالمقابل دن کے ذکر میں بضیاء کے ساتھ کوئی فائدہ ذکر نہیں فرمایا سبب ظاہر ہے کہ دن کی روشنی اپنی ذات میں فضل ہے اور ظلمت سے روشنی کا بہتر ہونا معلوم معروف ہے۔ روشنی کے بیشمار فوائد اتنے معروف ہیں کہ اُن کے بیان کی ضرورت نہیں، بخلاف رات کے کہ وہ ظلمت اور اندھیری ہے جو اپنی ذات میں کوئی فضیلت نہیں رکھتی بلکہ اسکی فضیلت لوگوں کے سکون و آرام کے سبب سے ہے اسلئے اسکو بیان فرمادیا۔ اور اسی لئے دن کے معاملہ کا ذکر کر کے آخر میں فرمایا: اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ اور رات کا معاملہ ذکر کر کے فرمایا اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ اسمیں یہ اشارہ ہو سکتا ہے کہ دن کے فضائل و برکات اور اسکے فوائد و ثمرات بیشمار ہیں جو احاطۂ بصر میں نہیں آسکتے البتہ سُنے جاسکتے ہیں اسلئے اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ فرمایا۔ کیونکہ انسانی علم و ادراک کا بڑا ذخیرہ کانوں ہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، آنکھوں سے دیکھی ہوئی اشیاء ہمیشہ کانوں سے سُنی ہوئی اشیاء سے بہت کم ہوتی ہیں اور رات کے فوائد بہ نسبت دن کے فوائد کے کم ہیں وہ دیکھے بھی جاسکتے ہیں اسلئے یہاں اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کا کلمہ اختیار فرمایا۔ (مظہری)

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۷۴﴾

اور جس دن اُن کو پکارے گا تو فرمائے گا کہاں ہیں میرے شریک جن کا تم دعویٰ کرتے تھے

وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ

اور جُدا کر دیں گے ہم ہر فرقے میں سے ایک احوال بتلانے والا، پھر کہیں گے لاؤ اپنی سند تب جان لیں گے کہ

الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۷۵﴾

سچ بات ہے اللہ کی اور کھوئی جائیں گی اُن سے جو باتیں وہ جوڑتے تھے

ع ۱۵ / ۱۰

خلاصۂ تفسیر

اور جس دن اللہ تعالیٰ اُن کو پکار کر فرمائے گا (تاکہ سب لوگ اُن کی رُسوائی سُن لیں) کہ جن کو تم میرا شریک سمجھتے تھے وہ کہاں گئے اور (اگرچہ حجت تمام کرنے کے لئے خود اسکا اقرار کافی تھا مگر مزید تاکید کے لئے ان پر شہادت بھی قائم کر دی جاوے گی اس طرح کہ) ہم ہر اُمت میں سے ایک ایک گواہ (بھی) نکال کر لائیں گے (مُراد اس سے انبیاء ہیں جو اُنکے کفر کی گواہی دیں گے) پھر ہم (ان مشرکین سے) کہیں گے کہ (اب) اپنی کوئی دلیل (شرک کے دعوے کی صحت پر) پیش کرو سو (اُسوقت) اُن کو (بعین الیقین) معلوم ہو جاوے گا کہ سچی بات خدا کی تھی (جو انبیاء کے ذریعہ بتلائی گئی تھی

اور شرک کا دعویٰ جھوٹا تھا) اور (دنیا میں) جو کچھ باتیں گھڑا کرتے تھے (آج) کسی کا پتہ نہ رہے گا۔ (کیونکہ انکشافِ حق کے لئے باطل کا غائب ہو جانا لازم ہے)۔

فائدہ اس سے پہلی آیت میں جو سوال مَاذَآ اَجَبْتُمُ میں کیا گیا اس میں کفار سے انبیاء کو جواب دینے کے متعلق باز پرس تھی اور یہاں خود انبیاء علیہم السلام سے شہادت دلوانا مقصود ہے اسلئے سوال میں کوئی تکرار نہیں۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۪ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ

قارون جو تھا سو موسیٰ کی قوم سے پھر شرارت کرنے لگا ان پر اور ہم نے دیئے تھے اسکو خزانے

مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ

اتنے کہ اسکی کنجیاں اٹھانے سے تھک جاتے کئی مرد زور آور جب کہا اس کو اسکی قوم نے

لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿۷۶﴾ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ

اترا مت اللہ کو نہیں بھاتے اترانے والے اور جو تجھ کو اللہ نے

اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ

دیا ہے اس سے کما لے پچھلا گھر اور نہ بھول اپنا حصہ دنیا سے اور بھلائی کر جیسے

اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

اللہ نے بھلائی کی تجھ سے اور مت چاہ خرابی ڈالنی ملک میں اللہ کو بھاتے نہیں

الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۷۷﴾ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ ۭ اَوَلَمْ يَعْلَمْ

خرابی ڈالنے والے بولا یہ مال تو مجھ کو ملا ہے ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے کیا اُسنے یہ نہ جانا

اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً

کہ اللہ غارت کر چکا ہے اس سے پہلے کتنی جماعتیں جو اس سے زیادہ رکھتی تھیں زور

وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ۭ وَلَا يُسْـَٔــلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾ فَخَرَجَ عَلٰي

اور زیادہ رکھتی تھیں مال کی جمع، اور پوچھے نہ جائیں گنہگاروں سے اُن کے گناہ پھر نکلا اپنی

قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ

قوم کے سامنے اپنے ٹھاٹھ سے، کہنے لگے جو لوگ طالب تھے دنیا کی زندگی کے اے کاش

لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۷۹﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ

ہم کو ملے جیسا کچھ ملا ہے قارون کو بیشک اسکی بڑی قسمت ہے اور بولے جن کو

اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ

ملی تھی سمجھ اے خرابی تمہاری اللہ کا دیا ثواب بہتر ہے انکے واسطے جو یقین لائے اور کام کیا بھلا

وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ

اور یہ بات انہی کے دل میں پڑتی ہے جو سہنے والے ہیں، پھر دھنسا دیا ہم نے اسکو اور اسکے گھر کو زمین میں

فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۖ وَمَا كَانَ

پھر نہ ہوئی اس کی کوئی جماعت جو مدد کرتی اس کی اللہ کے سوائے اور نہ وہ

مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ

خود مدد لا سکا اور صبح کو لگے کہنے جو کل شام آرزو کرتے تھے اس کا سا

يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ

درجہ اے خرابی یہ تو اللہ کھول دیتا ہے روزی جس کو چاہے اپنے بندوں میں اور تنگ کردیتا ہے

لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۖ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع ۱۱

اگر نہ احسان کرتا ہم پر اللہ تو ہمکو بھی دھنسا دیتا، اے خرابی یہ تو چھٹکارا نہیں پاتے منکر

خُلاصۂ تفسیر

قارون (کا حال دیکھ لو کہ کفر و خلاف کرنے سے اس کو کیا ضرر پہنچا اور اسکا مال و متاع کچھ کام نہ آیا بلکہ اسکے ساتھ اسکا مال و متاع بھی برباد ہوگیا، مختصر اسکا قصہ یہ ہے کہ وہ) موسیٰ (علیہ السلام کی برادری میں سے (یعنی بنی اسرائیل میں سے بلکہ ان کا چچازاد بھائی) تھا کذا فی الدر) سو وہ کثرت مال کی وجہ سے) ان لوگوں کے مقابلہ میں تکبر کرنے لگا اور (مال کی اسکے پاس یہ کثرت تھی کہ) ہمنے اس کو اسقدر خزانے دیئے تھے کہ اُن کی کنجیاں کئی کئی زور آور شخصوں کو گرانبار کر دیتی تھیں (یعنی اُن سے بتکلف اُٹھتی تھیں تو جب کنجیاں اس کثرت سے تھیں تو ظاہر ہے کہ خزانے بہت ہی ہونگے اور یہ تکبر اسوقت کیا تھا) جبکہ اس کو اس کی برادری نے (سمجھانے کے طور پر) کہا کہ تو (اس مال و حشمت پر) اترا مت واقعی اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور (یہ بھی کہا کہ) تجھ کو خدا نے جتنا دے رکھا ہے اس میں عالم آخرت کی بھی جستجو کیا کر اور دُنیا سے اپنا حصہ (آخرت میں لیجانا) فراموش مت کر اور (مطلب اِبْتَغِ وَلَا تَنْسَ کا یہ ہے کہ) جس طرح خدا تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی (بندوں کے ساتھ) احسان کیا کر اور (خدا کی نافرمانی اور حقوق واجبہ ضائع کر کے) دنیا میں فساد کا خواہاں مت ہو (یعنی گناہ کرنے سے دُنیا میں فساد ہوتا ہے کقولہ تعالیٰ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ بالخصوص متعدی گناہ) بیشک اللہ تعالیٰ اہل فساد کو پسند نہیں کرتا (یہ سب نصیحت مسلمانوں کی طرف سے ہوئی غالباً یہ مضامین موسیٰ علیہ السلام نے اول فرمائے ہونگے پھر مکرر دوسرے مسلمانوں نے ان کا اعادہ کیا ہوگا) قارون (یہ سُن کر) کہنے لگا کہ

مجھ کو یہ سب کچھ میری ذاتی ہنرمندی سے ملا ہے (یعنی میں وجوہ وتدابیر معاش کی خوب جانتا ہوں اس سے میں نے یہ سب جمع کیا ہے پھر میرا تفاخر بیجا نہیں اور نہ اس کو غیبی احسان کہا جاسکتا ہے اور نہ کسی کا اسمیں کچھ استحقاق ہوسکتا ہے آگے اللہ تعالیٰ اسکے اس قول کو رد فرماتے ہیں کہ) کیا اُس (قارون) نے (اخبار متواترہ سے) یہ نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے اُمتوں میں ایسے ایسوں کو ہلاک کرچکا ہے جو قوت (مالی) میں (بھی) اس سے کہیں بڑھے ہوئے تھے اور مجمع (بھی اس سے) اُن کا زیادہ تھا اور (صرف یہی نہیں کہ بس ہلاک ہوکر چھوٹ گئے ہوں بلکہ بوجہ اُن کے ارتکاب جرم کفر اور اللہ تعالیٰ کو یہ جرم معلوم ہونے کے قیامت میں بھی معذب ہونگے جیسا وہاں کا قاعدہ ہے کہ) اہلِ جرم سے اُن کے گناہوں کا (تحقیق کرنے کی غرض سے) سوال نہ کرنا پڑے گا (کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ سب معلوم ہے گو زجر وتنبیہ کے لئے سوال ہو لقولہ تعالیٰ لَنَسْئَلَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ، مطلب یہ کہ اگر قارون اس مضمون پر نظر کرتا تو ایسی جہالت کی بات نہ کہتا کیونکہ پچھلی قوموں کے حالاتِ عذاب سے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور مؤاخذۂ اخرویہ سے اُسیکا احکم الحاکمین ہونا ظاہر ہے، پھر کسی کو کیا حق ہے کہ اللہ کی نعمت کو اپنی ہنرمندی کا نتیجہ بتلائے اور حقوق واجبہ سے انکار کرے) پھر (ایکبار ایسا اتفاق ہوا کہ) وہ اپنی آرائش (اور شان) سے اپنی برادری کے سامنے نکلا جو لوگ (اُس کی برادری میں) دُنیا کے طالب تھے (گو مؤمن ہوں جیسا اُن کے اگلے قول وَيْكَأَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الخ سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے وہ لوگ) کہنے لگے کیا خوب ہوتا کہ ہم کو بھی وہ سازوسامان ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہے واقعی وہ بڑا صاحبِ نصیب ہے (یہ تمنا حرص کی تھی، اس سے کافر ہونا لازم نہیں آتا، جیسا اب بھی بعضے آدمی باوجود مسلمان ہونے کے شب وروز دوسری قوموں کی ترقیاں دیکھ کر للچاتے ہیں اور اسکی فکر میں لگے رہتے ہیں) اور جن لوگوں کو (دین کی) فہم عطا ہوئی تھی وہ (ان حریصوں سے) کہنے لگے ارے تمہارا ناس ہو (تم اس دُنیا پر کیا جاتے ہو) اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب (اس دُنیوی کروفر سے) ہزار درجہ بہتر ہے جو ایسے شخص کو ملتا ہے کہ ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور (پھر ایمان وعمل صالح والوں میں سے بھی) وہ (ثواب کامل طور پر) ان ہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو (دنیا کی حرص وطمع سے) صبر کرنے والے ہیں (پس تم لوگ ایمان کی تکمیل اور عمل صالح کی تحصیل میں لگو اور حد شرعی کے اندر دنیا حاصل کرکے زائد کی حرص وطمع سے صبر کرو) پھر ہم نے اس قارون کو اور اسکے محل سرائے کو (اس کی شرارت بڑھ جانے سے) زمین میں دھنسا دیا سو کوئی ایسی جماعت نہ ہوئی جو اس کو اللہ (کے عذاب) سے بچا لیتی (گو وہ بڑی جماعت والا تھا) اور نہ وہ خود ہی اپنے کو بچا سکا اور کل (یعنی پچھلے قریب زمانہ میں) جو لوگ اس جیسے ہونے کی تمنا کر رہے تھے وہ (آج اسکے خسف کو دیکھ کر) کہنے لگے بس جی یوں معلوم ہوتا ہے کہ (رزق کی فراخی

اور تنگی کا مدار خوش نصیبی یا بدنصیبی پر نہیں ہے بلکہ یہ تو محض حکمتِ تکوینیہ سے اللہ ہی کے قبضہ میں ہے بس) اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے زیادہ روزی دے دیتا ہے اور (جسکو چاہے) تنگی سے دینے لگتا ہے (یہ ہماری غلطی تھی کہ اس کو خوش نصیبی سمجھتے تھے ہماری توبہ ہے اور واقعی) اگر ہم پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی نہ ہوتی تو ہم کو بھی دھنسا دیتا (کیونکہ حرص اور حُبِّ دُنیا کی معصیت کے ہم بھی مرتکب ہوئے تھے) بس جی معلوم ہوا کہ کافروں کو فلاح نہیں ہوتی (گو چند روز مزے لوٹ لیں مگر انجام پھر خسران ہے بس فلاح معتد بہ اہلِ ایمان ہی کے ساتھ مخصوص ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ قصص کے شروع سے یہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ قصہ مذکور تھا جو اُن کو فرعون اور آلِ فرعون کے ساتھ پیش آیا، یہاں انکا دوسرا قصہ بیان ہوتا ہے جو اپنی برادری کے آدمی قارون کے ساتھ پیش آیا اور مناسبت اسکی سابقہ آیتوں سے یہ ہے کہ پچھلی آیت میں یہ ارشاد ہوا تھا کہ دُنیا کی دولت و مال جو تمھیں دیا جاتا ہے وہ چند روزہ متاع ہے اس کی محبت میں لگنا دانشمندی نہیں۔ وَمَآ أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا، الآیۃ، قارون کے قصہ میں یہ بتلایا گیا کہ اُسنے مال و دولت حاصل ہونے کے بعد اس نصیحت کو بُھلا دیا اسکے نشہ میں مست ہوکر اللہ تعالیٰ کی ناشکری بھی کی اور مال پر جو حقوق واجبہ اللہ تعالیٰ کیطرف سے فرض ہیں انکی ادائیگی سے منکر بھی ہوگیا جس کے نتیجہ میں وہ اپنے خزانوں سمیت زمین کے اندر دھنسا دیا گیا۔

قارون ایک عجمی لفظ غالباً عبرانی زبان کا ہے اسکے متعلق اتنی بات تو خود الفاظِ قرآن سے ثابت ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برادری بنی اسرائیل ہی میں سے تھا۔ باقی یہ کہ اسکا رشتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا اسمیں مختلف اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباس رضؓ کی ایک روایت میں اسکو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی قرار دیا ہے اور بھی کچھ اقوال ہیں۔ (قرطبی و روح)

رُوح المعانی میں محمد بن اسحٰق کی روایت سے نقل کیا ہے کہ قارون تورات کا حافظ تھا اور دوسرے بنی اسرائیل سے زیادہ اس کو تورات یاد تھی مگر سامری کی طرح منافق ثابت ہوا اور اسکی منافقت کا سبب دُنیا کے جاہ و عزت کی بیجا حرص تھی۔ پورے بنی اسرائیل کی سیادت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل تھی اور اُنکے بھائی ہارون اُنکے وزیر اور شریکِ نبوت تھے اس کو یہ حسد ہوا کہ میں بھی تو ان کی برادری کا بھائی اور قریبی رشتہ دار ہوں میرا اس سیادت و قیادت میں کوئی حصہ کیوں نہیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام سے اسکی شکایت کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے مجھے اسمیں کچھ دخل نہیں مگر وہ اس پر مطمئن نہ ہوا اور حضرت

موسیٰ علیہ السلام سے حسد رکھنے لگا۔

فَبَغٰى عَلَيْهِمْ، لفظ بغی چند معانی کے لئے آتا ہے۔ مشہور معنے ظلم کے ہیں، یہاں یہ معنی بھی مُراد ہوسکتے ہیں کہ اس نے اپنے مال و دولت کے نشہ میں دوسروں پر ظلم کرنا شروع کیا، یحییٰ بن سلام اور سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ قارون سرمایہ دار آدمی تھا، فرعون کی طرف سے بنی اسرائیل کی نگرانی پر مامور تھا، اس امارت کے عہدے میں اُسنے بنی اسرائیل کو ستایا۔ (قرطبی)

اور دوسرے معنے تکبر کے بھی آتے ہیں۔ بہت سے مفسرین نے اس جگہ یہی معنی قرار دیئے ہیں کہ اسنے مال و دولت کے نشہ میں بنی اسرائیل پر تکبر شروع کیا اور اُن کو حقیر و ذلیل قرار دیا۔

وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ، کنوز، کنز کی جمع ہے، مدفون خزانہ کو کہا جاتا ہے اور اصطلاحِ شرع میں کنز وہ خزانہ ہے جسکی زکوٰۃ نہ دی گئی ہو۔ حضرت عطاء سے روایت ہے کہ اسکو حضرت یوسف علیہ السلام کا ایک عظیم الشان مدفون خزانہ مل گیا تھا۔ (روح)

لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ، نَاءَ کا لفظ بوجھ سے جُھکا دینے کے معنی میں آتا ہے اور عصبہ کے معنی جماعت کے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ اسکے خزانے اتنے زیادہ تھے کہ اُن کی کنجیاں اتنی تعداد میں تھیں کہ ایک قوی جماعت بھی ان کو اُٹھائے تو بوجھ سے جُھک جائے۔ اور ظاہر ہے کہ قفل کی کنجی بہت ہلکے وزن کی رکھی جاتی ہے جسکا اُٹھانا اور پاس رکھنا مشکل نہ ہو مگر کثرتِ عدد کے سبب یہ اتنی ہوگئی تھیں کہ ان کا وزن ایک قوی جماعت بھی آسانی سے نہ اُٹھا سکے (روح)

لَا تَفْرَحْ، فرح کے لفظی معنے اُس خوشی کے ہیں جو انسان کو کسی لذتِ عاجلہ کے سبب حاصل ہو۔ قرآن کریم نے بہت سی آیات میں فرح کو مذموم قرار دیا جیساکہ ایک اسی آیت میں ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ اور ایک آیت میں لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ اور ایک آیت میں ہے فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اور بعض آیات میں فرح کی اجازت بلکہ ایک طرح کا امر بھی وارد ہوا ہے جیسے يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ میں اور آیت فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا میں ارشاد ہوا ہے۔ ان سب آیات کے مجموعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذموم اور ممنوع وہ فرح ہے جو اِترانے اور تکبر کرنے کی حد تک پہنچ جائے اور وہ جبھی ہوسکتا ہے کہ اس لذت و خوشی کو وہ اپنا ذاتی کمال اور ذاتی حق سمجھے اللہ تعالیٰ کا انعام و احسان نہ سمجھے۔ اور جو خوشی اس حد تک نہ پہنچے وہ ممنوع نہیں بلکہ ایک حیثیت سے مطلوب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی شکر گزاری ہے۔

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا، یعنی مسلمانوں نے قارون کو یہ نصیحت کی کہ اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت تجھے عطا فرمایا ہے اسکے ذریعہ آخرت کا سامان فراہم کر، اور دُنیا میں جو تیرا حصہ ہے اُس کو نہ بھول۔

دُنیا کا حصّہ کیا ہے اس کی تفسیر اکثر مفسّرین نے یہ کی ہے کہ اس سے مراد دُنیا کی عمر اور اُسمیں کئے ہوئے وہ اعمال ہیں جو اُس کو آخرت میں کام آویں جس میں صدقہ خیرات بھی داخل ہے اور دوسرے اعمالِ صالحہ بھی۔ حضرت ابن عباسؓ اور جمہور مفسّرین سے یہی معنے منقول ہیں کما فی القرطبی) اس صورت میں دوسرا جملہ پہلے جملہ کی تاکید و تائید ہوگی۔ پہلے جملے میں جو کہا گیا کہ جو کچھ تجھے اللہ نے دیا ہے یعنی مال و دولت اور عمر و قوت و صحت وغیرہ ان سب سے وہ کام لے جو دار آخرت میں تیرے کام آئے اور درحقیقت دُنیا کا یہی حصّہ تیرا ہے جو آخرت کا سامان بن جائے باقی دُنیا تو دوسرے وارثوں کا حصّہ ہے۔ اور بعض مفسّرین نے فرمایا کہ دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ نے تمھیں دیا ہے اُس سے اپنی آخرت کا سامان بھی کرو مگر اپنی ضروریاتِ دُنیا کو بھی نہ بھلاؤ کہ سب صدقہ خیرات کر کے کنگال بن جاؤ بلکہ بقدر ضرورت اپنے لئے بھی رکھو۔ اس تفسیر پر نصیبِ دُنیا سے مراد اُس کی معاشی ضروریات ہونگی واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ، بعض مفسّرین نے فرمایا کہ یہاں علم سے مراد علم تورات ہے جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ قارون تورات کا حافظ اور عالم تھا اور اُن ستر اصحاب میں سے تھا جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے میقات کے لئے منتخب فرمایا تھا، مگر اس کو اپنے اس علم پر ناز و غرور پیدا ہو گیا اسکو اپنا ذاتی کمال سمجھ بیٹھا اور اسکے اس کلام کا مطلب یہی تھا کہ مجھے جو کچھ مال و دولت ملا ہے میرے اپنے ذاتی کمالِ علمی کے سبب ملا ہے اسلئے میں اسکا خود حقدار ہوں اس میں مجھ پر کسی کا احسان نہیں۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ یہاں علم سے مُراد معاشی تدبیروں کا علم ہے مثلاً تجارت صنعت وغیرہ کا جن سے مال حاصل ہوتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو مال مجھے حاصل ہوا ہے اسمیں اللہ تعالیٰ کے احسان کا کیا دخل ہے یہ تو میں نے اپنی ہوشیاری اور کارگزاری کے ذریعہ حاصل کیا ہے اور جاہل نے یہ نہ سمجھا کہ یہ ہوشیاری اور کارگزاری اور صنعت یا تجارت کا تجربہ اور علم بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا تھا اسکا کوئی ذاتی کمال نہ تھا۔

اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ، قارون کے اس قول کا کہ میرا مال و دولت میرے ذاتی علم و ہنر سے حاصل کردہ ہے اصل جواب تو وہ تھا جو اُوپر لکھا گیا ہے کہ اگر یہی تسلیم کر لیا جائے کہ اسکا سبب کوئی خاص علم و ہنر تھا تو بھی اللہ تعالیٰ کے احسان سے کیسے بری ہوا کیونکہ یہ علم و ہنر اور قوتِ کسب بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کی بخشی ہوئی ہے مگر اسکا جواب بوجہ غایت ظہور کے نظر انداز فرما کر قرآن نے یہ بتلایا کہ یہ مال و دولت فرض کرو کہ اس کو اپنے ہی ذاتی کمال سے حاصل ہوا ہو مگر خود اس مال و دولت کی کوئی حقیقت نہیں، مال کی فراوانی کسی انسان کے لئے نہ کوئی کمال اور فضیلت ہے اور نہ وہ ہر حال میں اسکے کام آتا ہے اسکے ثبوت میں پچھلی اُمتوں کے بڑے سرمایہ داروں

کی مثال پیش فرمائی کہ جب اُنھوں نے سرکشی کی تو اللہ تعالیٰ کے عذاب نے ان کو اچانک پکڑ لیا مال و دولت اُن کے کچھ بھی کام نہ آیا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ الآیۃ، اس آیت میں، اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ یعنی علماء کا مقابلہ اَلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا سے کیا گیا ہے جسمیں واضح اشارہ اسطرف ہے کہ متاعِ دُنیا کا ارادہ اور اس کو مقصود بنانا اہلِ علم کا کام نہیں اہلِ علم کی نظر ہمیشہ آخرت کے دائمی فائدہ پر رہتی ہے، متاعِ دُنیا کو بقدرِ ضرورت حاصل کرتے ہیں اور اُسی پر قناعت کرتے ہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ					
وہ گھر پچھلا ہے ہم دیں گے وہ ان لوگوں کو جو نہیں چاہتے اپنی بڑائی ملک میں					
وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾ مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ					
اور نہ بگاڑ ڈالنا اور عاقبت بھلی ہے ڈرنے والوں کی جو لے کر آیا بھلائی اسکو ملنا ہے اس سے					
مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ					
بہتر اور جو کوئی لے کر آیا بُرائی سو بُرائیاں کرنے والے اُن کو وہی سزا ملے گی					
اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾					
جو کچھ وہ کرتے تھے					

خُلاصۂ تفسیر

یہ عالمِ آخرت (جس کے ثواب کا مقصود ہونا اُوپر (ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ) میں بیان ہوا ہے) ہم اُنہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دُنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا (یعنی نہ تکبر کرتے ہیں جو باطنی گناہ ہے اور نہ کوئی ظاہری گناہ ایسا کرتے ہیں جس سے زمین میں فساد برپا ہو) اور صرف ان باطنی اور ظاہری بُرائیوں سے بچنا کافی نہیں بلکہ) نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے، (جو بُرائیوں سے اجتناب کے ساتھ اعمالِ صالحہ کے بھی پابند ہوں اور کیفیت اعمال پر جزا و سزا کی یہ ہوگی کہ) جو شخص (قیامت کے دن) نیکی لے کر آئے گا اُس کو اُس (کے مقتضا) سے بہتر (بدلہ ملے گا (کیونکہ نیک عمل کا اصل مقتضیٰ تو یہ ہے کہ اُس کی حیثیت کے موافق عوض ملے مگر وہاں اُس سے زیادہ دیا جائے گا جس کا کم سے کم درجہ اس کی حیثیت سے دس گنا ہے) اور جو شخص بدی لے کر آئے گا سو ایسے لوگوں کو جو بدی کا کام کرتے ہیں اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنا وہ کرتے تھے (یعنی اسکے مقتضیٰ سے زیادہ بدلہ سزا کا نہ ملے گا)۔

معارف و مسائل

اَلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا، اس آیت میں دار آخرت کی نجات و فلاح کو صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص فرمایا گیا ہے جو زمین میں عُلُو اور فساد کا ارادہ نہ کریں۔ عُلُو سے مراد تکبر ہے یعنی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا بنانے اور دوسروں کو حقیر کرنے کی فکر۔ اور فساد سے مراد لوگوں پر ظلم کرنا ہے (سفیان ثوری) اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ ہر معصیت فساد فی الارض ہے کیونکہ گناہ کے وبال سے دُنیا کی برکت میں کمی آتی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ تکبر اور ظلم کا یا مطلق معصیت کا ارادہ کریں اُن کا آخرت میں حصہ نہیں۔

فائدہ: تکبر جس کی حُرمت اور وبال اس آیت میں ذکر کیا گیا وہ وہی ہے کہ لوگوں پر تفاخر اور انکی تحقیر مقصود ہو، ورنہ اپنے لئے اچھے لباس اچھی غذا اچھے مکان کا انتظام جب وہ دوسروں کے تفاخر کے لئے نہ ہو مذموم نہیں، جیسا کہ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں اس کی تصریح ہے۔

معصیت کا پختہ عزم بھی معصیت ہے: اس آیت میں علو اور فساد کے ارادہ پر دار آخرت سے محروم ہونے کی وعید ہے اس سے معلوم ہوا کہ کسی معصیت کا پختہ ارادہ جو عزمِ مصمّم کے درجہ میں آجائے وہ بھی معصیت ہی ہے (کما فی الروح) البتہ اگر پھر وہ خدا کے خوف سے اس ارادہ کو ترک کر دے تو گناہ کی جگہ ثواب اُسکے نامۂ اعمال میں درج ہوتا ہے اور اگر کسی غیر اختیاری سبب سے اُس گناہ پر قدرت نہ ہوئی اور عمل نہ کیا مگر اپنی کوشش گناہ کے لئے پوری کی تو وہ بھی معصیت اور گناہ لکھا جائیگا (کما ذکرہ الغزالیؒ) آخر آیت میں فرمایا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ اسکا حاصل یہ ہے کہ آخرت کی نجات اور فلاح کے لئے دو چیزوں عُلُو اور فساد سے اجتناب بھی لازم ہے اور تقویٰ یعنی اعمالِ صالحہ کی پابندی بھی۔ صرف ان دو چیزوں سے پرہیز کر لینا کافی نہیں بلکہ جو اعمال از روئے شرع فرض و واجب اُن پر عمل کرنا بھی نجاتِ آخرت کی شرط ہے۔

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ۭ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ

جس نے حکم بھیجا تجھ پر قرآن کا وہ پھیر لانے والا ہے تجھ کو پہلی جگہ، تو کہہ میرا رب خوب جانتا ہے

مَنْ جَاۗءَ بِالْهُدٰى وَمَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۸۵﴾ وَمَا كُنْتَ

کون لایا ہے راہ کی سُوجھ اور کون پڑا ہے صریح گمراہی میں اور تو توقع

تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا

نہ رکھتا تھا کہ اُتاری جائے تجھ پر کتاب مگر مہربانی سے تیرے رب کی سو تو

تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكٰفِرِينَ ﴿۸۶﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ

مت ہو مددگار کافروں کا اور نہ ہو کہ وہ تجھ کو روک دیں اللہ کے حکموں سے

بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ

بعد اسکے کہ اُتر چکے تیری طرف اور بُلا اپنے رب کی طرف اور مت ہو شریک

الْمُشْرِكِينَ ﴿۸۷﴾ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

والوں میں اور مت پکار اللہ کے سوائے دوسرا حاکم، کسی کی بندگی نہیں اسکے سوائے

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۸۸﴾

ہر چیز فنا ہے مگر اسکا منہ اسی کا حکم ہے اور اُسی کیطرف پھر جاؤ گے

خلاصۂ تفسیر

(اور آپکے ان مخالفین نے جو آپ کو پریشان کرکے ترکِ وطن پر مجبور کیا ہے جسکی اضطراری مفارقت کا آپ کو صدمہ ہے تو آپ تسلّی رکھیں) جس خدا نے آپ پر قرآن (کے احکام پر عمل اور اسکی تبلیغ) کو فرض کیا ہے (جو مجموعاً دلیل ہے آپکی نبوّت کی) وہ آپکو (آپکے) اصلی وطن (یعنی مکہ) میں پھر پہنچادے گا (اور اُس وقت آپ آزاد اور غالب اور صاحبِ سلطنت ہونگے، اور ایسی حالت میں اگر دوسری جگہ قیام کے لئے تجویز کیجاتی ہو بمصلحت و باختیار ہوتی ہے جس سے رنج نہیں ہوتا، اور باوجود آپکے تحقق نبوت کے جو یہ لوگ آپ کو غلطی پر اور اپنے کو حق پر سمجھتے ہیں تو) آپ (ان سے) فرمادیجئے کہ میرا رب خوب جانتا ہے کہ کون سچا دین لیکر (منجانب اللہ) آیا ہے اور کون صریح گمراہی میں (مبتلا) ہے (یعنی میرے حق پر ہونے اور تمہارے باطل پر ہونے کے دلائل قطعیہ موجود ہیں مگر جب ان سے کام نہیں لیتے تو اخیر جواب یہی ہے کہ خیر، خدا کو معلوم ہے وہ بتلادے گا) اور (آپ کی یہ دولت نبوت محض خداداد ہے حتیٰ کہ خود) آپ کو (نبی ہونے کے قبل) یہ توقع نہ تھی کہ آپ پر یہ کتاب نازل کی جاوے گی مگر محض آپکے رب کی مہربانی سے اسکا نزول ہوا، سو آپ (ان لوگوں کی خرافات کیطرف توجہ نہ کیجئے اور جس طرح ابتک ان سے الگ تھلگ رہے آئندہ بھی اسی طرح) ان کافروں کی ذرا تائید نہ کیجئے، اور جب اللہ کے احکام آپ پر نازل ہوچکے تو ایسا نہونے پاوے (جیسا ابتک بھی نہیں ہونے پایا) کہ یہ لوگ آپکو اُن احکام سے روکدیں اور آپ (بدستور) اپنے رب (کے دین) کی طرف (لوگونکو) بُلاتے رہیئے اور (جس طرح ابتک مشرکوں سے کوئی تعلق نہیں رہا، اسی طرح آئندہ ہمیشہ) ان مشرکوں میں شامل نہو جیئے اور (جس طرح ابتک شرک سے معصوم ہیں اسی طرح آئندہ بھی) اللہ کے ساتھ کسی معبود کو نہ پکارنا (ان آیتوں میں کفار و مشرکین کو انکی درخواستوں سے نااُمید کرنا ہے اور رُوئے سخن اُن ہی کی طرف ہے کہ تم جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے دین میں

موافق ہونے کی درخواست کرتے ہوں اسمیں کامیابی کا کبھی احتمال نہیں، مگر عادت ہے کہ جس شخص پر زیادہ غصہ ہوتا ہے اُس سے بات نہیں کیا کرتے اپنے محبوب سے باتیں کر کے اُس شخص کو سنایا کرتے ہیں۔ معالم میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ خطاب ظاہر میں آپؐ کو ہے اور مقصود آپ نہیں۔ یہاں تک رسالت کے متعلق مضمون قصداً تھا، گو توحید کا بھی ضمناً آگیا، آگے توحید کا مضمون قصداً ہے کہ) اُس کے سوا کوئی معبود (ہونے کے قابل) نہیں (اسلئے کہ) سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں، بجز اسکی ذات کے پس اسکے سوا کوئی مستحق عبادت نہ ٹھہرا، یہ مضمون توحید کا ہوگیا، آگے معاد کا مضمون ہے کہ) اُسی کی حکومت ہے (جسکا ظہور کامل قیامت میں ہے) اور اُسی کے پاس تم سب کو جانا ہے (پس سب کو اُن کے کیے کی جزا دیگا۔ یہ معاد کا مضمون بھی ختم ہوگیا)۔

معارف و مسائل

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ۔ آخر سورت میں یہ آیات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور اپنے فریضۂ رسالت و نبوت پر پوری طرح قائم رہنے کی تاکید کے لئے ہیں، اور مناسبت اسکی سابقہ آیات سورت سے یہ ہے کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی قصہ فرعون اور اسکی قوم کی دشمنی اور اُس سے خوف کا، پھر اپنے فضل سے انکو قوم فرعون پر غالب کرنے کا ذکر فرمایا تو آخر سورت میں خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے ایسے ہی حالات کا خلاصہ بیان فرمایا کہ کفار مکہ نے آپکو پریشان کیا، قتل کے منصوبے بنائے، مسلمانوں کی زندگی مکہ میں اجیرن کر دی مگر حق تعالیٰ نے اپنی عادت قدیمہ کے مطابق آپ کو سب پر فتح اور غلبہ نصیب فرمایا اور مکہ مکرمہ جہاں سے کفار نے آپ کو نکالا تھا وہ پھر مکمل طور پر آپکے قبضہ میں آیا۔ اَلَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ، جس ذات پاک نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے یعنی اُسکی تلاوت اور تبلیغ اور اس پر عمل آپ پر فرض فرمایا ہے وہ ہی ذات آپ کو پھر معاد پر لوٹائے گی۔ معاد سے مراد مکہ مکرمہ ہے جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ سے معاد کی یہ تفسیر منقول ہے مطلب یہ ہے کہ اگرچہ چند روز کے لئے آپ کو اپنا وطن عزیز خصوصاً حرم اور بیت اللہ چھوڑنا پڑا مگر قرآن کا نازل کرنے والا اور اُسپر عمل کو فرض کرنے والا خدا تعالیٰ آخر کار آپ کو پھر مکہ میں لوٹا کر لائیگا۔ ائمہ تفسیر میں سے مقاتل کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غار ثور سے رات کے وقت نکلے اور مکہ سے مدینہ جانے والے معروف راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستوں سے سفر کیا کیونکہ دشمن تعاقب میں تھے۔ جب مقام جحفہ پر پہنچے جو مدینہ طیبہ کے راستہ کی مشہور منزل رابغ کے قریب ہے اور وہاں سے وہ مکہ سے مدینہ کا معروف راستہ ملجاتا ہے اسوقت مکہ مکرمہ کے راستہ پر نظر پڑی تو بیت اللہ اور وطن یاد

آیا، اُسی وقت جبرئیل امین یہ آیت لے کر نازل ہوئے جس میں آپ کو بشارت دی گئی ہے کہ مکہ مکرمہ سے یہ جدائی چند روزہ ہے اور بالآخر آپ کو پھر مکہ مکرمہ پہنچا دیا جائیگا جو فتح مکہ کی بشارت تھی۔ اسی لئے حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ یہ آیت جحفہ میں نازل ہوئی ہے نہ کی ہے نہ مدنی (قرطبی)

قرآن دشمنوں پر فتح اور مقاصد میں کامیابی کا ذریعہ ہے اس آیت میں آپ کو دوبارہ مکہ مکرمہ میں فاتحانہ واپسی کی بشارت اس عنوان سے دی گئی ہے کہ جس ذات حق نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے آپ کو دشمنوں پر غالب کر کے دوبارہ مکہ مکرمہ لوٹائے گا، اسمیں اشارہ اسطرف بھی ہے کہ قرآن کی تلاوت اور اُس پر عمل ہی اس نصرتِ خداوندی اور فتح مبین کا سبب ہوگی۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ط اس آیت میں وجہہ سے مراد ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ ہے اور معنے یہ ہیں ذات حق سبحانہ وتعالیٰ کے سوا ہر چیز ہلاک و فنا ہونے والی ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ وجہہ سے مراد وہ عمل ہے جو خالص اللہ کے لئے کیا جائے، تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ جو عمل اللہ تعالیٰ کے لئے اخلاص کے ساتھ کیا جائے وہ ہی باقی رہنے والا ہے باقی سب فانی ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

الحمد للہ سورۂ قصص آج ۹ ذیقعدہ ۱۳۹۱ھ کو ایسے حالات میں تمام ہوئی کہ پاکستان پر ہندوستان اور دوسری بڑی طاقتوں کے گٹھ جوڑ سے شدید حملہ ہوا اور چودہ روز کراچی پر روزانہ بمباری ہوتی رہی، شہری آبادی کو جابجا سخت نقصان پہنچا، سیکڑوں مسلمان شہید اور مکانات منہدم ہوئے، اور چودہ دن کی جنگ اس حادثہ جانکاہ پر ختم ہوئی کہ مشرقی پاکستان پاکستان سے کٹ گیا اور تقریباً نوے ہزار پاکستانی فوج نے ہاں محصور ہو کر ہتھیار ڈالدیئے اور اسوقت تک وہاں مسلمانوں کا قتل عام جاری ہے، ہر مسلمان کا دل اس صدمہ سے پاش پاش اور دماغ ماؤف ہے، فانا للہ وانا الیہ راجعون

وَإِلَيْهِ الْمُشْتَكَىٰ وَلَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَّسِتُّوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ عنکبوت مکہ میں نازل ہوئی اس کی انہتر آیتیں ہیں اور سات رکوع ،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ

کیا یہ سمجھتے ہیں لوگ کہ چھوٹ جائیں گے اتنا کہہ کر کہ ہم یقین لائے اور ان کو

لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿۲﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ

جانچ نہ لیں گے ، اور ہم نے جانچا ہے ان کو جو ان سے پہلے تھے سو البتہ معلوم کرے گا اللہ

الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ

جو لوگ سچے ہیں اور البتہ معلوم کرے گا جھوٹوں کو ، کیا یہ سمجھتے ہیں جو لوگ

يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۴﴾ مَنْ

کرتے ہیں برائیاں کہ ہم سے بچ جائیں ، بُری بات طے کرتے ہیں ، جو کوئی

كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۵﴾

توقع رکھتا ہے اللہ کی ملاقات کی سو اللہ کا وعدہ آرہا ہے ، اور وہ ہے سننے والا جاننے والا ،

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶﴾

اور جو کوئی محنت اٹھائے سو اٹھاتا ہے اپنے ہی واسطے اللہ کو پروا نہیں جہان والوں کی ،

۴۳

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ
اور جو لوگ یقین لائے اور کئے بھلے کام ہم اُتار دیں گے اُن پر سے بُرائیاں انکی اور

لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝
بدلہ دیں گے ان کو بہتر سے بہتر کاموں کا

خلاصۂ تفسیر

الٓمّٓ، اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں، (بعضے مسلمان جو کفار کی ایذاؤں سے گھبرا جاتے ہیں تو) کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے میں چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو (انواع مصائب سے) آزمایا نہ جائے گا، (یعنی ایسا نہ ہوگا بلکہ اس قسم کے امتحانات بھی پیش آئیں گے) اور ہم تو (ایسے ہی واقعات سے) ان لوگوں کو بھی آزما چکے ہیں جو ان سے پہلے (مسلمان) ہو گذرے ہیں (یعنی اور امتوں کے مسلمانوں پر بھی یہ معاملے گذر چکے ہیں) سو (اسی طرح ان کی آزمائش بھی کی جاوے گی اور اس آزمائش میں) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو (ظاہری علم سے) جان کر رہے گا جو (ایمان کے دعوئی میں) سچے تھے، اور جھوٹوں کو بھی جان کر رہے گا (چنانچہ جو صدق و اعتقاد سے مسلمان ہوتے ہیں وہ ان امتحانات میں ثابت رہتے ہیں بلکہ اور زیادہ پختہ ہو جاتے ہیں اور جو دفع الوقتی کے لئے مسلمان ہو جاتے ہیں وہ ایسے وقت میں اسلام کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ یعنی یہ ایک حکمت ہے امتحان کی کیونکہ مخلص اور غیر مخلص کے خلط ملط میں بہت سی مضرتیں ہوتی ہیں، خصوص ابتدائی حالات میں۔ یہ مضمون تو مسلمانوں کے متعلق ہوا آگے ان ایذا دینے والے کفار کی نسبت فرماتے ہیں کہ) ہاں کیا جو لوگ بُرے بُرے کام کر رہے ہیں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم سے کہیں نکل بھاگیں گے، ان کی یہ تجویز نہایت ہی بیہودہ ہے (یہ جملہ معترضہ کے طور پر تھا جس میں کفار کی بدانجامی سنا کر مسلمانوں کی ایک گونہ تسلی کر دی کہ ان ایذاؤں کا ان سے بدلہ لیا جائے گا، آگے پھر مسلمانوں کی طرف روئے سخن ہے کہ) جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو سو (اس کو تو ایسے ایسے حوادث سے پریشان ہونا ہی نہ چاہئے کیونکہ) اللہ (کے ملنے) کا وہ معین وقت ضرور ہی آنے والا ہے (جس سے سارے غم غلط ہو جائیں گے، کقولہ تعالیٰ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ) اور وہ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے (نہ کوئی قول اس سے مخفی نہ کوئی فعل پس لقاء کے وقت تمہاری سب طاعات قولیہ و فعلیہ کا صلہ دے کر سب غم دور کر دے گا) اور (یاد رکھو کہ ہم جو تم کو ترغیب دے رہے ہیں مشقتوں کے برداشت کرنے کی، سو اس میں ظاہر

اور مسلّم ہے کہ ہماری کوئی منفعت نہیں بلکہ) جو شخص محنت کرتا ہو وہ اپنے ہی (نفع کے) لئے محنت کرتا ہے (ورنہ) خدا تعالیٰ کو (تو) تمام جہان والوں میں کسی کی حاجت نہیں (اس میں بھی ترغیب ہے تحمل مشاق کی کیونکہ اپنے نفع پر متنبہ ہونے سے وہ فعل زیادہ آسان ہو جاتا ہے) اور (وہ نفع جو طاعت سے پہنچتا ہے اس کا بیان یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں ہم ان کے گناہ ان سے دور کر دیں گے (جس میں بعض گناہ جیسے کفر و شرک تو ایمان سے زائل ہو جاتے ہیں، اور بعض گناہ توبہ سے کہ اعمالِ صالحہ میں داخل ہے اور بعضے گناہ صرف حسنات سے اور بعضے گناہ محض فضل سے معاف ہو جائیں گے اور کوئی گناہ بعد قدرے سزا کے یہاں تکفیر سب کو عام ہے) اور ان کو ان کے (ان) اعمال (ایمان و اعمالِ صالحہ) کا (استحقاق سے) زیادہ اچھا بدلہ دیں گے، (پس اتنی ترغیبات پر طاعت اور مجاہدہ پر استقامت کا اہتمام ضروری ہے)۔

معارف و مسائل

وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ، فتنہ سے مشتق ہے جس کے معنی آزمائش کے ہیں، اہلِ ایمان خصوصاً انبیاء و صلحاء کو دنیا میں مختلف قسم کی آزمائشوں سے گذرنا ہوتا ہے پھر انجام کار فتح اور کامیابی ان کی ہوتی ہے، یہ آزمائشیں مخالفین کبھی کفار و فجار کی دشمنی اور ان کی طرف سے ایذاؤں کے ذریعہ ہوتی ہیں، جیسا کہ اکثر انبیاء اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے اصحاب کو اکثر پیش آیا ہے، جس کے بے شمار واقعات سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں، اور کبھی یہ آزمائش امراض اور دوسری قسم کی تکلیفوں کے ذریعہ ہوتی ہے جیسا حضرت ایوب علیہ السلام کو پیش آیا، اور بعض کے لئے یہ سب قسمیں جمع بھی کر دی جاتی ہیں۔

شانِ نزول اس آیت کا اگرچہ از روئے روایات وہ صحابہ ہیں جو ہجرتِ مدینہ کے وقت کفار کے ہاتھوں ستائے گئے، مگر مراد عام ہے ہر زمانے کے علماء و صلحاء اور اولیاءِ امت کو مختلف قسم کی آزمائشیں پیش آتی ہیں، اور آتی رہیں گی۔ (قرطبی)

فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ، یعنی ان امتحانات اور شدائد کے ذریعہ مخلص اور غیر مخلص اور نیک و بد میں ضرور امتیاز کریں گے۔ کیونکہ مخلصین کے ساتھ منافقین کا خلط ملط بعض اوقات بڑے نقصانات پہنچا دیتا ہے، مقصد اس آیت کا نیک و بد اور مخلص و غیر مخلص کا امتیاز واضح کر دینا ہے، جس کو اس طرح تعبیر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جان لے گا صادقین کو اور کاذبین کو، اللہ تعالیٰ کو تو ہر انسان کا صادق یا کاذب ہونا اس کے پیدا ہونے سے پہلے بھی معلوم ہے، امتحانات اور آزمائشوں کے جان لینے کے معنی یہ ہیں کہ اس امتیاز کو

دوسروں پر بھی ظاہر فرمادیں گے۔

اور حضرت سیدی حکیم الامت تھانویؒ نے اپنے شیخ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے اس کی توجیہ یہ بھی نقل فرمائی ہے کہ بعض اوقات عوام کے درجۂ علم پر تنزل کر کے بھی کلام کیا جاتا ہے، عام انسان مخلص اور منافق میں فرق آزمایش ہی کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں، ان کے مذاق کے مطابق حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ان مختلف قسم کے امتحانات کے ذریعہ ہم یہ جان کر رہیں گے کہ کون مخلص ہے کون نہیں، حالانکہ اس کے علم میں یہ سب کچھ ازل سے ہے۔ واللہ اعلم

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ

اور ہم نے تاکید کردی انسان کو اپنے ماں باپ سے بھلائی سے رہنے کی، اور اگر وہ تجھ سے زور کریں کہ تو شریک کرے

بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ

میرا جس کی تجھ کو خبر نہیں تو ان کا کہنا مت مان، مجھی تک پھر آنا ہے تم کو سو میں بتلادوں گا تم کو

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٨﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

جو کچھ تم کرتے تھے، اور جو لوگ یقین لائے اور بھلے کام کئے

لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ﴿٩﴾

ہم ان کو داخل کریں گے نیک لوگوں میں۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، اور (اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ) اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کا زور ڈالیں کہ تو ایسی چیز کو میرا شریک ٹھہرائے جس (کے معبود ہونے) کی کوئی (صحیح) دلیل تیرے پاس نہیں ہے، (اور ہر چیز ایسی ہی ہے کہ کل اشیاء کے ناقابل عبادت ہونے پر دلائل قائم ہیں) تو (اس باب میں) ان کا کہنا نہ ماننا، تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے سو میں تم کو تمہارے سب کام (نیک ہوں یا بد) جتلا دوں گا اور (تم میں) جو لوگ ایمان لائے ہوں گے ہم ان کو نیک بندوں (کے درجہ) میں (جو کہ بہشت ہے) داخل کردیں گے (اور اسی طرح اعمال بد پر ان کے مناسب سزا دیں گے، پس اسی بناء پر جس نے والدین کی اطاعت کو ہماری اطاعت پر مقدم رکھا ہوگا

وہ سزا پائے گا، اور جس نے اس کا عکس کیا ہوگا نیک جزا پائے گا، حاصل یہ ہوا کہ واقعہ بالا میں ماں باپ کی نافرمانی سے وسوسہ گناہ کا نہ کیا جائے)۔

معارف و مسائل

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ، وصیت کہتے ہیں کسی شخص کو کسی عمل کی طرف بلانے کو جبکہ وہ بلانا نصیحت و خیر خواہی پر مبنی ہو (مظہری)

بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا، لفظ حُسن مصدر ہے بمعنی خوبی، اس جگہ خوبی والے طرزِ عمل کو مبالغہ کے لئے حُسن سے تعبیر کیا ہے۔ مراد واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ وصیت فرمائی کہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي، یعنی والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے حکم کی اطاعت اسی حد تک کی جائے کہ وہ حکم اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف نہ ہو، وہ اگر اولاد کو کفر و شرک پر مجبور کریں تو اس میں ان کی اطاعت ہرگز نہ کی جائے جیسا کہ حدیث میں ہے: لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ، (رواہ احمد والحاکم وصحّحہ) یعنی خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

یہ آیت حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ صحابہ کرام میں سے اُن دس حضرات میں شامل ہیں جن کو آپ نے بیک وقت جنتی ہونے کی بشارت دی ہے جن کو عشرۂ مبشرہ کہا جاتا ہے۔ یہ اپنی والدہ کے بہت فرمانبردار اور ان کی راحت رسانی میں بڑے مستعد تھے۔ ان کی والدہ حمنہ بنت ابی سفیان کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کے بیٹے سعدؓ مسلمان ہوگئے تو انھوں نے بیٹے کو تنبیہ کی اور قسم کھالی کہ میں اس وقت تک نہ کھانا کھاؤں گی نہ پانی پیوں گی جب تک کہ تم پھر اپنے آبائی دین پر واپس آجاؤ۔ یا میں اسی طرح بھوک پیاس سے مرجاؤں، اور ساری دنیا میں ہمیشہ کے لئے یہ رسوائی تمھارے سر رہے کہ تم اپنی ماں کے قاتل ہو۔ (مسلم، ترمذی) اس آیت قرآن نے حضرت سعدؓ کو ان کی بات ماننے سے روک دیا۔

بغوی کی روایت میں ہے کہ حضرت سعدؓ کی والدہ ایک دن رات اور بعض اقوال کے مطابق تین دن تین رات اپنی قسم کے مطابق بھوکی پیاسی رہی۔ حضرت سعدؓ حاضر ہوئے، ماں کی محبت واطاعت اپنی جگہ تھی، مگر اللہ تعالیٰ کے فرمان کے سامنے کچھ نہ تھی، اس لئے والدہ کو خطاب کرکے کہا کہ اماں جان اگر تمھارے بدن میں سو روحیں ہوتیں اور ایک ایک کرکے نکلتی رہتی میں اس کو دیکھ کر بھی کبھی اپنا دین نہ چھوڑتا، اب تم چاہو کھاؤ پیو یا مرجاؤ، بہرحال

اپنے دین سے نہیں ہٹ سکتا، ماں نے ان کی اس گفتگو سے مایوس ہو کر کھانا کھا لیا،

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ

اور ایک وہ لوگ ہیں کہ کہتے ہیں یقین لائے ہم اللہ پر پھر جب اسکو ایذا پہنچے اللہ کی راہ میں کرنے

فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ وَلَىِٕنْ جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ

لگے لوگوں کے ستانے کو برابر اللہ کے عذاب کی اور اگر آ پہنچے مدد تیرے رب کی طرف سے

لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ

تو کہنے لگیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، کیا یہ نہیں کہ اللہ خوب خبردار ہے جو کچھ سینوں میں ہے

الْعٰلَمِيْنَ ⑩ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ⑪

جہان والوں کے۔ اور البتہ معلوم کرے گا اللہ ان لوگوں کو جو یقین لائے ہیں اور البتہ معلوم کر یگا جو لوگ دغاباز ہیں

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ

اور کہنے لگے منکر ایمان والوں کو تم چلو ہماری راہ اور ہم اٹھالیں گے

خَطٰيٰكُمْ ۭ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اِنَّهُمْ

تمہارے گناہ، اور وہ کچھ نہ اٹھائیں گے اُن کے گناہ بے شک وہ

لَكٰذِبُوْنَ ⑫ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۡ

جھوٹے ہیں، اور البتہ اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور کتنے بوجھ ساتھ اپنے بوجھ کے،

وَلَيُسْـَٔــلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ⑬ ع

اور البتہ ان سے پوچھ ہو گی قیامت کے دن جو باتیں کہ جھوٹ بناتے تھے۔

خُلاصۂ تفسیر

اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں جو کہدیتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے پھر جب ان کو راہِ خدا میں کچھ تکلیف پہنچائی جاتی ہے تو لوگوں کی ایذا رسانی کو ایسا (عظیم) سمجھ بیٹھتے ہیں جیسے خدا کا عذاب (جس سے آدمی بالکل ہی مجبور ہو جائے) حالانکہ کسی مخلوق کو ایسے عذاب پر قدرت ہی نہیں

اب تو ان کا یہ حال ہی) اور (اگر کبھی) کوئی مدد (مسلمانوں کی) آپ کے رب کی طرف سے آپہنچتی ہو (مثلاً جہاد ہوا اور اس میں ایسے لوگ ہاتھ آجائیں) تو (اس وقت) کہتے ہیں کہ ہم تو (دین اور عقیدہ میں) تمہارے ساتھ تھے (یعنی مسلمان ہی تھے گو کفار کے اکراہ اور زبردستی کی وجہ سے کفار کے ساتھ ہو گئے تھے، اس پر حق تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ) کیا اللہ تعالیٰ کو دنیا جہان والوں کے دلوں کی باتیں معلوم نہیں ہیں (یعنی انکے دل ہی میں ایمان نہ تھا) اور (یہ واقعات اس لئے ہوتے رہتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو معلوم کرکے رہیگا، اور منافقوں کو بھی معلوم کرکے رہیگا اور کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم (دین میں) ہماری راہ چلو اور (قیامت میں) تمہارے گناہ (جو کفر و معاصی سے ہوں گے) ہمارے ذمہ (اور تم سبکدوش) حالانکہ یہ لوگ ان کے گناہوں میں سے ذرا بھی (اس طور پر کہ وہ سبکدوش ہو جائیں) نہیں لے سکتے یہ بالکل جھوٹ بک رہے ہیں اور (البتہ یہ تو ہوگا کہ) یہ لوگ اپنے گناہ (پورے پورے) (اپنے اوپر لادے ہونگے اور اپنے گناہوں کے ساتھ کچھ گناہ اور بھی (لادے ہوں گے اور یہ گناہ وہ ہیں جن کے لئے یہ سبب بنتے تھے، اور یہ گناہ ان پر لادنے سے اصل گناہگار سبکدوش نہیں ہوں گے، غرض دوسرے تو ہلکے نہ ہوئے مگر یہ لوگ ان کو گمراہ کرنے کے سبب اور زیادہ بھاری ہو گئے) اور یہ لوگ جیسی جیسی جھوٹی باتیں بناتے تھے قیامت میں ان سے باز پرس (اور پھر اس پر سزا) ضرور ہوگی۔

معارف و مسائل

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، کفار کی طرف سے اسلام کا راستہ روکنے اور مسلمانوں کو بہکانے کی تدبیریں مختلف طریقوں سے ہوتی رہی ہیں، کبھی زور و زر کی نمائش سے کبھی شکوک شبہات پیدا کرنے سے، اس آیت میں بھی ان کی ایک ایسی ہی تدبیر مذکور ہے، کہ کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم لوگ بلا وجہ عذاب آخرت کے خوف سے ہمارے طریقہ پر نہیں چلتے، لو ہم ذمہ داری لیتے ہیں کہ اگر تمہاری ہی بات سچی ہوئی کہ اس طریقہ پر چلنے کی وجہ سے آخرت میں عذاب ہوگا تو تمہارے گناہوں کا بوجھ ہم اٹھالیں گے جو کچھ عذاب، تکلیف پہونچے گی ہمیں پہونچے گی تم پر آنچ نہ آئے گی۔

اسی طرح کا ایک شخص کا واقعہ سورۂ نجم کے آخری رکوع میں ذکر کیا گیا ہے أَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى وَأَعْطٰى قَلِيْلًا وَّأَكْدٰى، جس میں مذکور ہے کہ ایک شخص کو اس کے کافر ساتھیوں نے یہ کہہ کر دھوکا دیا کہ تم ہمیں کچھ مال یہاں دیدو تو ہم قیامت اور آخرت کے دن تمہارے عذاب کو اپنے ذمہ لے کر تمہیں بچا دیں گے، اس نے کچھ دینا بھی شروع کر دیا پھر بند کر دیا۔

اس کی بیوقوفی اور اس کے عمل کے لغو ہونے کا بیان سورۃ نجم میں تفصیل سے مذکور ہے۔

اسی طرح کا ایک قول کفار کا عام مسلمانوں سے یہاں مذکور ہے، یہاں حق تعالیٰ نے ان کے جواب میں ایک تو یہ فرمایا کہ ایسا کہنے والے بالکل جھوٹے ہیں، یہ قیامت میں ان لوگوں کے گناہوں کا کوئی بوجھ نہ اٹھائیں گے، وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ، یعنی وہاں کے ہولناک عذاب کو دیکھ کر ان کو ہمت نہ ہوگی کہ اس کے اٹھانے کے لئے تیار ہو جائیں، اس لئے یہ وعدہ ان کا جھوٹا ہے۔ اور سورۃ نجم میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ کچھ بوجھ اٹھانے کو تیار بھی ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اس کا اختیار نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ قانونِ عدل کے خلاف ہے کہ ایک کے گناہ میں دوسرے کو پکڑ لیا جائے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ ان لوگوں کا یہ کہنا تو غلط اور جھوٹ ہے کہ وہ تمہارے گناہوں کا بوجھ اٹھا کر تمہیں سبکدوش کر دیں گے، البتہ یہ ضرور ہوگا کہ تمہارا بہکانا اور تمہیں راہِ حق سے ہٹانے کی کوشش کرنا خود ایک بڑا گناہ ہے جو ان کے اپنے اعمال کے عذاب کے علاوہ اُن پر لاد دیا جائے گا۔ اس طرح اُن پر اپنے اعمال کا بھی وبال ہوگا اور جن کو بہکایا تھا اُن کا بھی۔

گناہ کی دعوت دینے والا بھی گناہگار ہے، گناہ کرنے والے کو جو عذاب ہوگا وہی اس کو بھی ہوگا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی دوسرے کو گناہ میں مبتلا کرنے کی تحریک کرے یا گناہ میں اس کی مدد کرے وہ بھی ایسا ہی مجرم ہے جیسا یہ گناہ کرنے والا۔ ایک حدیث جو حضرت ابو ہریرہؓ اور انس بن مالکؓ سے روایت کی گئی ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہدایت کی طرف لوگوں کو دعوت دے تو جتنے لوگ اس کی دعوت کی وجہ سے ہدایت پر عمل کریں گے ان سب کے عمل کا ثواب اس داعی کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جائے گا، بغیر اس کے کہ عمل کرنے والوں کے اجر و ثواب میں کوئی کمی کی جائے۔ اور جو شخص کسی گمراہی اور گناہ کی طرف دعوت دے تو جتنے لوگ اس کے کہنے سے اس گمراہی میں مبتلا ہوں گے ان سب کا گناہ اور وبال اس شخص پر بھی پڑے گا بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے وبال و عذاب میں کوئی کمی ہو (مسلم عن ابی ہریرہؓ وابن ماجہ عن انس، قرطبی)۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا

اور ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کے پاس پھر رہا ان میں ہزار برس پچاس

خَمْسِيْنَ عَامًا ۭ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ

برس کم پھر پکڑا ان کو طوفان نے اور وہ گنہگار تھے، پھر بچا دیا ہم نے اس کو

وَاَصْحٰبَ السَّفِیْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۵﴾ وَاِبْرٰهِیْمَ اِذْ قَالَ

اور جہاز والوں کو اور رکھا ہم نے جہاز کو نشانی جہان والوں کے واسطے، اور ابراہیم کو جب کہا

لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾

اس نے اپنی قوم کو بندگی کرو اللہ کی اور ڈرتے رہو اس سے یہ بہتر ہی تمہارے حق میں اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ

تم تو پوجتے ہو اللہ کے سوائے یہی بتوں کے تھان اور بناتے ہو جھوٹی باتیں، بے شک

الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا

جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے وہ مالک نہیں تمہاری روزی کے

فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَیْهِ

سو تم ڈھونڈو اللہ کے یہاں روزی اور اس کی بندگی کرو اور اس کا حق مانو اسی کی طرف

تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ

پھر جاؤ گے۔ اور اگر تم جھٹلاؤ گے تو جھٹلا چکے ہیں بہت فرقے تم سے پہلے،

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۸﴾

اور رسول کا ذمہ تو بس یہی ہے پیغام پہنچا دینا کھول کر۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف (پیغمبر بنا کر) بھیجا سو وہ ان میں پچاس سال کم ایک ہزار برس رہے (اور قوم کو سمجھاتے رہے) پھر (جب اس پر بھی وہ لوگ ایمان نہ لائے تو) ان کو طوفان نے آدبایا اور وہ بڑے ظالم لوگ تھے (کہ اتنی مدت دراز کی فہمائش سے بھی متاثر نہ ہوئے) پھر (اس طوفان آنے کے بعد) ہم نے ان کو اور کشتی والوں کو (جو ان کے ساتھ سوار تھے، اس طوفان سے) بچالیا اور ہم نے اس واقعہ کو تمام جہان والوں کے لئے (جن کو تواتر کے ساتھ خبر پہنچی) موجب عبرت بنایا (کہ غور کر کے سمجھ سکتے ہیں کہ مخالفت حق کا کیا انجام ہے) اور ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے (جو کہ بت پرست تھے) فرمایا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو (اور ڈر کر شرک چھوڑ دو) یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر

اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو (بخلاف طریقۂ شرک کے کہ محض بیوقوفی ہے کیونکہ) تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر محض بتوں کو (جو بالکل عاجز اور ناکارہ ہیں) پوج رہے ہو اور (اس کے متعلق) جھوٹی باتیں تراشتے ہو، (کہ ان سے ہماری روزی روزگار کی کاربرآری ہوتی ہے، اور یہ محض جھوٹ ہے کیونکہ) تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پوج رہے ہو وہ تم کو کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے، سو تم لوگ رزق خدا کے پاس سے تلاش کرو، (یعنی اس سے مانگو، مالک رزق وہی ہے) اور (جب مالکِ رزق وہی ہو تو) اسی کی عبادت کرو اور (چونکہ پچھلا رزق بھی اسی کا دیا ہوا ہے تو) اسی کا شکر کرو (ایک تو سبب وجوب عبادت کا یہ ہے کہ وہ مالک نفع کا ہے) اور (دوسرا سبب یہ ہے کہ وہ مالک ضرر کا بھی ہے چنانچہ) تم سب کو اسی کی طرف لوٹ جانا ہے (اس وقت کفر پر تم کو سزا دے گا) اور اگر تم (ان باتوں میں) مجھ کو جھوٹا سمجھو تو (یاد رکھو کہ میرا کوئی ضرر نہیں) تم سے پہلے بھی بہت سی اُمتیں (اپنے پیغمبروں کو) جھوٹا سمجھ چکی ہیں (مگر ان پیغمبروں کا کوئی ضرر نہیں ہوا) اور (وجہ اس کی یہ ہے کہ) پیغمبر کے ذمہ تو صرف (بات کا) صاف طور پر پہنچا دینا ہے (منوانا اس کا کام نہیں پس سب انبیاء تبلیغ کے بعد سبکدوش ہوگئے، اسی طرح میں بھی، پس ہم کو کوئی ضرر نہیں پہنچا، البتہ ماننا تمہارے ذمہ واجب تھا اس کے ترک سے تمہارا ضرر ضرور ہوا)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں کفار کی مخالفت اور ان کی ایذاؤں کا بیان تھا جو مسلمانوں کو پہونچتی رہتی ہیں آیاتِ صدر میں اس طرح کے واقعات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کے کچھ حالات کا بیان ہے، کہ قدیم سے یہ سلسلہ اہلِ ہدایت کو کفار کی طرف سے ایذاؤں کا جاری ہے۔ مگر ان تکلیفوں کی وجہ سے انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری، اس لئے آپ بھی ایذاءِ کفار کی پرواہ نہ کریں، اپنے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں مضبوطی سے کام کرتے رہیں۔

انبیاءِ سابقین میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا، اوّل تو اس وجہ سے کہ وہ ہی سب سے پہلے پیغمبر ہیں جن کو کفر و شرک کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دوسرے اس لئے بھی کہ جتنی ایذائیں اپنی قوم سے ان کو پہونچیں وہ کسی دوسرے پیغمبر کو نہیں پہنچیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عمر طویل دینے کا خصوصی امتیاز عطا فرمایا، اور ساری عمر کفار کی ایذاؤں میں بسر ہوئی۔ ان کی عمر قرآن کریم میں جو نو سو پچاس سال مذکور ہے، وہ تو قطعی اور یقینی ہے ہی، بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ یہ عمر زمانہ تبلیغ و دعوت کی ہے اور اس سے پہلے اور طوفان کے بعد مزید عمر کا ذکر ہے۔ واللہ اعلم

بہرحال اتنی غیر معمولی طویل عمر مسلسل دعوت و تبلیغ میں صرف کرنا اور ہر تبلیغ و دعوت کے وقت کفار کی طرف سے طرح طرح کی ایذائیں مار پیٹ اور گلا گھونٹنے کی سہتے رہنا اور ان سب کے باوجود کسی وقت ہمت نہ ہارنا یہ سب خصوصیات حضرت نوح علیہ السلام کی ہیں۔

دوسرا قصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا جو بڑے بڑے سخت امتحانات سے گذرے ہیں۔ آتش نمرود، پھر ملک شام سے ہجرت کرکے ایک لق و دق جنگل بے آب و گیاہ کا قیام، پھر صاحبزادے کے ذبح کرنے کا واقعہ وغیرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے قصہ کے ضمن میں حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی امت کے واقعات اور آخر سورۃ تک دوسرے بعض انبیاء اور ان کی سرکش امتوں کے حالات کا سلسلہ یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امت محمدیہ کی تسلی کے لئے اور ان کو دین کے کام پر ثابت قدم رکھنے کے لئے بیان ہوا ہے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا کَیْفَ یُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی

کیا دیکھتے نہیں کیوں کر شروع کرتا ہے اللہ پیدائش کو پھر اس کو دہرائے گا، یہ اللہ پر آسان

اللّٰهِ یَسِیْرٌ ﴿۱۹﴾ قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَاَ

ہے، تو کہہ ملک میں پھرو پھر دیکھو کیوں کر شروع کیا ہے پیدائش

الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ یُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ

کو پھر اللہ اٹھائے گا پچھلا اٹھان، بے شک اللہ ہر چیز کر سکتا

قَدِیْرٌ ﴿۲۰﴾ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَرْحَمُ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَاِلَیْهِ

ہے، دکھ دے گا جس کو چاہے اور رحم کرے گا جس پر چاہے، اور اسی کی طرف پھر

تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ؗ

جاؤ گے، اور تم عاجز کرنے والے نہیں زمین میں اور نہ آسمان میں،

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۲۲﴾ ع ۲ وَالَّذِیْنَ

اور کوئی نہیں تمہارا اللہ سے ورے حمایتی اور نہ مددگار، اور جو لوگ

كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖۤ اُولٰٓئِكَ یَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ

منکر ہوئے اللہ کی باتوں سے اور اس کے ملنے سے وہ ناامید ہوئے میری رحمت سے

وَاُولٰۤئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾
اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

خُلاصۂ تفسیر

کیا ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح مخلوق کو اوّل بار پیدا کرتا ہے، (عدم محض سے وجود میں لاتا ہے) پھر وہی اس کو دوبارہ پیدا کرے گا، یہ اللہ کے نزدیک بہت ہی آسان بات ہے (بلکہ ابتدائی نظر میں دوبارہ پیدا کرنا اوّل آفرینش سے زیادہ سہل ہی، گو قدرت ذاتیہ کے اعتبار سے دونوں مساوی ہیں، اور یہ لوگ امر اول یعنی اللہ تعالیٰ کے خالق کائنات ہونے کا تو اعتراف کرتے تھے، لقولہ تعالیٰ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ الخ اور امر ثانی یعنی دوبارہ پیدا کرنا اسی کے مماثل ہی، اس کا داخل قدرت ہونا اور زیادہ واضح ہے، اس لئے اَوَلَمْ يَرَوْا اس سے بھی متعلق ہو سکتا ہے اور زیادہ اہتمام کے لئے آگے پھر یہی مضمون قدرے تفاوت عنوان سے سنانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہیں کہ) آپ (ان لوگوں سے) کہئے کہ تم لوگ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ خدا تعالیٰ نے مخلوق کو کس طور پر اوّل بار پیدا کیا ہے، پھر اللہ پچھلی بار بھی پیدا کرے گا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے (پہلے عنوان میں ایک عقلی استدلال ہے اور دوسرے عنوان میں حسّی جس کا تعلق احوال کائنات کے مشاہدہ سے ہے، یہ تو قیامت کا اثبات تھا آگے جزا کا بیان ہے کہ بعد بعث کے) جس کو چاہے گا عذاب دے گا (یعنی جو اس کا مستحق ہوگا) اور جس پر چاہے رحمت فرما دے گا، (یعنی جو اس کا اہل ہوگا) اور (اس تعذیب و رحمت میں اور کسی کا دخل نہ ہوگا کیونکہ) تم سب اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے، (نہ کہ اور کسی کے پاس) اور (اس کی تعذیب سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے) تم نہ زمین میں (چھپ کر خدا کو) ہرا سکتے ہو (کہ اس کے ہاتھ نہ آؤ) اور نہ آسمان میں (اڑ کر) اور نہ خدا کے سوا تمہارا کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مددگار، (پس نہ اپنی تدبیر سے بچ سکے نہ دوسرے کی حمایت سے) اور (اوپر جو ہم نے کہا تھا يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۤءُ اب قاعدۂ کلیہ سے اس کا مصداق بتلاتے ہیں کہ) جو لوگ خدا تعالیٰ کی آیتوں کے اور (بالخصوص) اس کے سامنے جانے کے منکر ہیں وہ لوگ (قیامت میں) میری رحمت سے ناامید ہوں گے (یعنی اس وقت مشاہدہ ہو جائے گا کہ ہم محل رحمت نہیں ہیں) اور یہی ہیں جن کو عذاب دردناک ہوگا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ

پھر کچھ جواب نہ تھا اس کی قوم کا مگر یہی کہ بولے اس کو مار ڈالو یا جلا دو پھر اس کو بچا دیا

اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ وَقَالَ

اللہ نے آگ سے اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو یقین لاتے ہیں، اور ابراہیم بولا

اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ

جو ٹھہرائے ہیں تم نے اللہ کے سوائے بتوں کے تھان سو دوستی کر کر آپس میں دنیا کی زندگانی

الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ

میں، پھر دن قیامت کے منکر ہو جاؤ گے ایک سے ایک اور لعنت کرو گے

بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝

ایک کو ایک، اور ٹھکانا تمہارا آگ ہے اور کوئی نہیں تمہارا مددگار

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّىْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ

پھر مان لیا اس کو لوط نے اور وہ بولا میں تو وطن چھوڑتا ہوں اپنے رب کی طرف بیشک وہی ہے زبردست

الْحَكِيْمُ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ

حکمت والا، اور دیا ہم نے اس کو اسحٰق اور یعقوب اور رکھ دی اس کی اولاد میں

النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي

پیغمبری اور کتاب اور دیا ہم نے اس کو اس کا ثواب دنیا میں، اور وہ

الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

آخرت میں البتہ نیکوں سے ہے۔

خلاصۂ تفسیر

سو (ابراہیم علیہ السلام کی اس تقریر دلپذیر کے بعد) ان کی قوم کا (آخری) جواب بس یہ تھا کہ (آپس میں) کہنے لگے کہ ان کو یا تو قتل کر ڈالو یا ان کو جلا دو (چنانچہ جلانے کا سامان کیا) سو اللہ نے ان کو اس آگ سے بچا لیا (جس کا قصہ سورۂ انبیاء میں گزر چکا ہے)

بیشک اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان رکھتے ہیں کئی نشانیاں ہیں (یعنی یہ واقعہ کئی چیزوں کی دلیل ہے، اللہ کا قادر ہونا، ابراہیم علیہ السلام کا نبی ہونا، کفر و شرک کا باطل ہونا اس لئے یہ ایک ہی دلیل متعدد دلائل کے قائم مقام ہوگئی) اور ابراہیم (علیہ السلام) نے (وعظ میں یہ بھی) فرمایا کہ تم نے جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو (معبود) تجویز کر رکھا ہے، بس یہ تمہارے باہمی دنیا کے تعلقات کی وجہ سے ہے (چنانچہ مشاہدہ ہے کہ اکثر آدمی اپنے تعلقات اور دوستی اور رشتہ داروں کے طریق پر رہتا ہے اور اس وجہ سے حق بات میں غور نہیں کرتا، اور حق کو سمجھ کر بھی ڈرتا ہے کہ سب دوست اور رشتہ دار چھوٹ جاویں گے) پھر قیامت میں (تمہارا یہ حال ہوگا کہ) تم میں ایک دوسرے کا مخالف ہوجاوے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا، (جیسا کہ سورۂ اعراف میں ہے لَعَنَتْ اُخْتَهَا اور سورۂ سبا میں ہے یَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ اِلْقَوْلَ اور سورۂ بقرہ میں ہے اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا الخ خلاصہ یہ ہے کہ آج جن احباب و اقارب کی وجہ سے تم گمراہی کو اختیار کئے ہوئے ہو قیامت کے روز یہی احباب تمہارے دشمن بن جائیں گے) اور (اگر تم اس بت پرستی سے باز نہ آئے تو) تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور تمہارا کوئی حمایتی نہ ہوگا سو (اتنے وعظ و پند پر بھی انکی قوم نے نہ مانا، صرف لوط (علیہ السلام) نے انکی تصدیق فرمائی اور ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ میں (تم لوگوں میں نہیں رہتا، بلکہ) اپنے پروردگار کی (بتلائی ہوئی جگہ کی) طرف ترک وطن کرکے چلا جاؤں گا بیشک وہ زبردست حکمت والا ہے (وہ میری حفاظت کرے گا اور مجھ کو اس کا ثمرہ دے گا) اور ہم نے (ہجرت کے بعد) ان کو اسحٰق (بیٹا) اور یعقوب (پوتا) عنایت فرمایا اور ہم نے ان کی نسل میں نبوت اور کتاب (کے سلسلہ) کو قائم رکھا اور ہم نے ان کا صلہ ان کو دنیا میں بھی دیا اور آخرت میں بھی (بڑے درجہ کے) نیک بندوں میں ہوں گے (اس صلہ میں مراد قرب و قبول ہے، کقولہ تعالیٰ فی البقرۃ لَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا الخ)۔

معارف ومسائل

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ، حضرت لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھانجے تھے، آتش نمرود میں ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر سب سے پہلے انہوں نے تصدیق کی۔ یا اور آپ کی اہلیہ حضرت سارہ جو آپ کی چچازاد بہن بھی تھیں اور مسلمان ہو چکی تھیں ان دونوں کو ساتھ لے کر ابراہیم علیہ السلام نے وطن سے ہجرت کا ارادہ کیا، ان کا وطن مقام کوثا تھا، جو کوفہ کی ایک بستی ہے، اور فرمایا اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ، یعنی میں وطن کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف جاتا ہوں۔ مراد یہ ہے کہ کسی ایسے مقام کی طرف جاؤں گا جہاں رب کی عبادت میں رکاوٹ نہ ہو

حضرت نخعیؒ اور قتادہؒ نے اِنِّیْ مُھَاجِرٌ کا قائل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد وَوَھَبْنَا لَہٗۤ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ تو یقیناً انہی کا حال ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے اِنِّیْ مُھَاجِرٌ کو حضرت لوط علیہ السلام کا قول قرار دیا ہے، خلاصۂ تفسیر کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے، مگر سیاقِ کلام سے پہلی تفسیر راجح معلوم ہوتی ہے، اور حضرت لوط علیہ السلام بھی اگرچہ اس ہجرت میں شریک ضرور تھے مگر جیسا حضرت سارہ کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تابع تھیں اسی طرح لوط علیہ السلام کی ہجرت کا ذکر مستقلاً نہ ہونا کچھ بعید نہیں۔

دنیا میں سب سے پہلی ہجرت حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے پیغمبر ہیں جن کو دین کے لئے ترکِ وطن اور ہجرت اختیار کرنا پڑی، ان کی یہ ہجرت پچھتر سال کی عمر میں ہوئی (یہ سب بیان قرطبی سے لیا گیا ہے)۔

بعض اعمال کی جزاء دنیا میں بھی مل جاتی ہے، وَاٰتَیْنٰہُ اَجْرَہٗ فِی الدُّنْیَا، یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی اللہ کی راہ میں قربانیوں اور دوسرے اعمالِ صالحہ کی جزاء دنیا میں بھی دیدی کہ ان کو تمام مخلوق میں مقبول امام بنادیا، یہودی، نصرانی، بت پرست سبھی ان کی عزت کرتے ہیں، اور اپنا مقتداء مانتے ہیں، اور آخرت میں وہ صالحین اہلِ جنت میں سے ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعمال کی اصل جزاء تو آخرت میں ملے گی مگر اس کا کچھ حصہ دنیا میں بھی نقد دیا جاتا ہے، جیسا کہ احادیث معتبرہ میں بہت سے اچھے اعمال کے دنیوی فوائد اور بُرے اعمال کے دنیوی مفاسد کا بیان آیا ہے، ایسے اعمال کو سیدی حضرت حکیم الامتؒ نے ایک مستقل رسالہ "جزاء الاعمال" میں جمع فرمادیا ہے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ؗ مَا سَبَقَكُمْ

اور بھیجا لوط کو جب کہا اپنی قوم کو تم آتے ہو بےحیائی کے کام پر تم سے پہلے نہیں کیا

بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ

وہ کسی نے جہان میں، کیا تم دوڑتے ہو مردوں پر اور تم راہ

السَّبِیْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ

مارتے ہو اور کرتے ہو اپنی مجلس میں بُرا کام، پھر کچھ جواب نہ تھا اس کی قوم کا

اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۲۹﴾

مگر یہی کہ بولے لے آ ہم پر عذاب اللہ کا اگر تو ہے سچا،

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۳۰﴾ وَلَمَّا جَاۤءَتْ

بولا اے رب میری مدد کر ان شریر لوگوں پر ، اور جب پہنچے ہمارے

رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ

بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر ، بولے ہم کو غارت کرنا ہے اس بستی والوں کو

اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ

بیشک اس بستی کے لوگ ہو رہے ہیں گنہگار ، بولا اس میں تو لوط بھی ہے وہ بولے ہم کو خوب معلوم ہے

بِمَنْ فِيْهَا ڭ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۤ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

جو کوئی اس میں ہے ہم بچالیں گے اس کو اور اس کے گھر والوں کو مگر اس کی عورت کہ رہے گی رہ جانے والوں میں

وَلَمَّآ اَنْ جَاۤءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْۗءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا

اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس ناخوش ہوا ان کو دیکھ کر اور تنگ ہوا دل میں اور وہ بولے

لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۣ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ

مت ڈر اور غم نہ کھا ، ہم بچالیں گے تجھ کو اور تیرے گھر کو مگر عورت تیری

كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ

رہ گئی رہ جانے والوں میں ، ہم کو اتارنی ہے اس بستی والوں پر

رِجْزًا مِّنَ السَّمَاۤءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ

ایک آفت آسمان سے اس بات پر کہ وہ نافرمان ہو رہے تھے ، اور چھوڑ رکھا ہم نے اس کا نشان

اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۳۵﴾

نظر آتا ہوا سمجھ دار لوگوں کے واسطے ،

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو کہ تم سے پہلے کسی نے دنیا جہان والوں میں نہیں کیا کیا تم مردوں سے بُرا فعل کرتے ہو (وہ بے حیائی کا کام یہی ہے) اور (اس کے علاوہ دوسرا

نامعقول حرکتیں بھی کرتے ہو، مثلاً یہ کہ، تم ڈاکہ ڈالتے ہو (کذا فی الدر عن ابن زید) اور غضب یہ ہے کہ، اپنی بھری مجلس میں نامعقول حرکت کرتے ہو (اور معصیت کا اعلان یہ خود ایک معصیت و قبح عقلی ہے) سو ان کی قوم کا (آخری) جواب بس یہ تھا کہ ہم پر اللہ کا عذاب لے آؤ اگر تم (اس بات میں) سچے ہو (کہ یہ افعال موجب عذاب ہیں)، لوط (علیہ السلام) نے دعا کی کہ اے میرے رب مجھ کو ان مفسد لوگوں پر غالب (اور ان کو عذاب سے ہلاک) کر دے اور (ان کی دعا قبول ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے عذاب کی خبر دینے کے لئے فرشتے معین فرمائے، اور دوسرا کام ان فرشتوں کو یہ بتلایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو اسحٰق علیہ السلام کے تولد کی بشارت دیں چنانچہ) ہمارے (وہ) بھیجے ہوئے فرشتے جب ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس (ان کے فرزند اسحٰق کے تولد کی) بشارت لے کر آئے تو (اثنائے گفتگو میں جس کا مفصل بیان دوسرے موقع پر ہے قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ الخ) ان فرشتوں نے (ابراہیم علیہ السلام سے) کہا کہ ہم اس بستی والوں کو (جس میں قوم لوط آباد ہے) ہلاک کرنے والے ہیں (کیونکہ) وہاں کے باشندے بڑے شریر ہیں، ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہاں تو لوط (علیہ السلام بھی موجود) ہیں (وہاں عذاب نہ بھیجا جائے کہ ان کو گزند پہنچے گا) فرشتوں نے کہا کہ جو جو وہاں رہتے ہیں ہم کو سب معلوم ہیں ہم ان کو اور ان کے خاص متعلقین کو (یعنی ان کے خاندان والوں کو اور جو مومن ہوں اس عذاب سے) بچالیں گے (اس طرح سے کہ نزول عذاب کے قبل ان کو بستی سے باہر نکال لے جائیں گے) بجز ان کی بی بی کے کہ وہ عذاب میں رہ جانے والوں میں سے ہوگی (جس کا ذکر سورۂ ہود اور سورۂ حجر میں گذر چکا ہے، یہ گفتگو تو ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی) اور (پھر وہاں سے فارغ ہو کر) جب ہمارے وہ فرستادے لوط (علیہ السلام) کے پاس پہونچے تو لوط (علیہ السلام) ان (کے آنے) کی وجہ سے (اس لئے) مغموم ہوئے (کہ وہ بہت حسین جوانوں کی شکل میں آئے تھے اور لوط علیہ السلام نے ان کو آدمی سمجھا اور اپنی قوم کی نامعقول حرکت کا خیال آیا) اور (اس وجہ سے) ان (کے آنے) کے سبب تنگ دل ہوئے اور (فرشتوں نے جو یہ حال دیکھا تو) وہ فرشتے کہنے لگے (آپ کسی بات کا) اندیشہ نہ کریں اور نہ مغموم ہوں (ہم آدمی نہیں ہیں بلکہ عذاب کے فرشتے ہیں، كقوله تعالىٰ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ اور اس عذاب سے) ہم آپ کو اور آپ کے خاص متعلقین کو بچالیں گے بجز آپ کی بی بی کے کہ وہ عذاب میں رہ جانے والوں میں ہوگی (اور آپ کو مع متعلقین کے اس سے بچا کر) ہم اس بستی کے (بقیہ) باشندوں پر ایک آسمانی عذاب (یعنی اسباب طبعیہ غیر ارضیہ سے) ان کی بدکاریوں کی سزا میں نازل کرنے والے ہیں (چنانچہ وہ بستی اُلٹ دی گئی، اور غیبی پتھروں سے سنگباری کی گئی)،

اور ہم نے اس بستی کے کچھ ظاہر نشان (اب تک) رہنے دیئے ہیں ان لوگوں (کی عبرت) کے لئے جو عقل رکھتے ہیں (چنانچہ اہل مکہ سفر شام میں ان ویران مقامات کو دیکھتے تھے اور جو اہل عقل تھے وہ منتفع بھی ہوتے تھے کہ ڈر کر ایمان لے آتے تھے)۔

معارف ومسائل

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ، اس جگہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں کے تین سخت گناہوں کا ذکر کیا ہے، اوّل مرد کی مرد کے ساتھ بدفعلی، دوسرے قطع طریق یعنی مسافروں پر ڈاکہ زنی، تیسرے اپنی مجلسوں میں اعلانًا سب کے سامنے گناہ کرنا۔ قرآن کریم نے اس تیسرے گناہ کی تعیین نہیں فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ ہر گناہ جو اپنی ذات میں گناہ ہے اگر اس کو علانیہ بے پروائی سے کیا جائے تو یہ دوسرا مستقل گناہ ہو جاتا ہے وہ کوئی بھی گناہ ہو، بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ ان گناہوں کو شمار کیا ہے جو یہ بے حیا اپنی مجلسوں میں سب کے سامنے کیا کرتے تھے، مثلاً راستہ چلتے لوگوں کو پتھر مارنا اور ان کا استہزاء کرنا جیسا کہ اُم ہانی رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث میں اس کا ذکر ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ جو بے حیائی ان کی مشہور تھی اس کو وہ کہیں چھپ کر نہیں کھلی مجلسوں میں ایک دوسرے کے سامنے کرتے تھے۔ العیاذ باللہ۔

جن تین گناہوں کا اس آیت میں ذکر ہے ان سب میں اشد پہلا گناہ ہے، جو اس سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا تھا، اور جنگل کے جانور بھی اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ باتفاقِ اُمت یہ گناہ زنا سے زیادہ شدید ہے (کذا فی الروح)

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَ

اور بھیجا مدین کے پاس اس کے بھائی شعیب کو پھر بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی اور

ارْجُوا الْيَوْمَ الْآخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٣٦﴾

توقع رکھو پچھلے دن کی اور مت پھرو زمین میں خرابی مچاتے،

فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ

پھر اس کو جھٹلایا تو پکڑ لیا ان کو زلزلہ نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھروں میں

جٰثِمِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۠ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ

اوندھے پڑے ، اور ہلاک کیا عاد کو اور ثمود کو اور تم پر حال کھل چکا ہے ان کے گھروں سے

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ

اور فریفتہ کیا ان کو شیطان نے ان کے کاموں پر پھر روک دیا ان کو راہ سے اور

كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَلَقَدْ

وہ تھے ہوشیار ، اور ہلاک کیا قارون اور فرعون اور ہامان کو اور ان کے

جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا

پاس پہنچا موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر، پھر بڑائی کرنے لگے ملک میں اور نہیں تھے

سٰبِقِيْنَ ﴿۳۹﴾ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ

ہم سے جیت جانے والے ، پھر سب کو پکڑا ہم نے اپنے اپنے گناہ پر ، پھر کوئی تھا کہ اس پر ہم نے بھیجا

حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا

پتھراؤ ہوا سے اور کوئی تھا کہ اس کو پکڑا چنگھاڑ نے ، اور کوئی تھا کہ اس کو دھنسا دیا

بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ

ہم نے زمین میں ، اور کوئی تھا کہ اس کو ڈبا دیا ہم نے ، اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے

وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۰﴾ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا

پر تھے وہ اپنا آپ ہی برا کرتے ، مثال ان لوگوں کی جنھوں نے پکڑے اللہ

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ

کو چھوڑ کر اور حمایتی جیسے مکڑی کی مثال بنا لیا اس نے ایک

بَيْتًا ۚ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا

گھر اور سب گھروں میں بودا سو مکڑی کا گھر اگر ان کو

وقف لازم

يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ

سمجھ ہوتی ، اللہ جانتا ہے جس جس کو وہ پکارتے ہیں اس کے سوائے کوئی

شَیْءٍ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴿۴۲﴾ وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا

چیز ہو، اور وہ زبردست ہے حکمتوں والا ، اور یہ مثالیں بٹھلاتے ہیں ہم لوگوں کے

لِلنَّاسِ ۚ وَمَا یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ

واسطے اور ان کو سمجھتے وہی ہیں جن کو سمجھ ہے ، اللہ نے بنائے آسمان

وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً

اور زمین جیسے چاہئیں ، اس میں نشانی ہے یقین لانے

لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۴﴾

والوں کے لئے ۔

ع ۴
۱۶

خُلاصۂ تفسیر

اور مدین والوں کے پاس ہم نے ان (کی برادری) کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا سو انھوں نے فرمایا کہ اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو (اور شرک چھوڑ دو) اور روزِ قیامت سے ڈرو (اور اس کے انکار سے باز آؤ) اور سرزمین میں فساد مت پھیلاؤ (یعنی حقوق اللہ و حقوق العباد کو ضائع مت کرو، کیونکہ یہ لوگ کفر و شرک کے ساتھ کم ناپنے کم تولنے کے بھی خوگر تھے، جس سے فساد پھیلنا ظاہر ہے) سو ان لوگوں نے شعیب (علیہ السلام) کو جھٹلایا پس زلزلہ نے ان کو آپکڑا، پھر وہ اپنے گھروں میں گھر کر رہ گئے۔ اور ہم نے عاد و ثمود کو بھی (ان کے عناد و خلاف کی وجہ سے) ہلاک کیا، اور (یہ ہلاک ہونا تم کو ان کے رہنے کے مقامات سے نظر آرہا ہے (کہ ان کی ویران بستیوں کے کھنڈرات ملکِ شام کو جاتے ہوئے تمہارے راستہ پر ملتے ہیں) اور حالت ان کی یہ تھی کہ) شیطان نے ان کے (اعمالِ (بد) کو ان کی نظر میں مستحسن کر رکھا تھا اور (اس ذریعہ سے) ان کو راہِ (حق) سے روک رکھا تھا اور وہ لوگ (ویسے) ہوشیار تھے (مجنون و بیوقوف نہ تھے، مگر اس جگہ انھوں نے اپنی عقل سے کام لیا)، اور ہم نے قارون اور فرعون اور ہامان کو بھی (ان کے کفر کے سبب) ہلاک کیا اور (ان تینوں) کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) کھلی دلیلیں (حق کی) لے کر آئے تھے، پھر ان لوگوں نے زمین میں سرکشی کی اور (ہمارے عذاب سے) بھاگ نہ سکے تو ہم نے (ان پانچوں میں سے) ہر ایک کو اس کے گناہ کی سزا میں پکڑ لیا، سو ان میں بعضوں پر تو ہم نے سخت ہوا بھیجی (مراد اس سے قوم عاد ہے)

اور ان میں بعضوں کو ہولناک آواز نے آدبایا (مراد اس سے قوم ثمود ہے لقولہ تعالیٰ فی سورۃ ہود، وَاَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَۃُ) اور ان میں بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا (مراد اس سے قارون ہے) اور ان میں بعض کو ہم نے (دریا میں) ڈبو دیا (مراد اس سے فرعون وہامان ہے) اور (ان لوگوں پر جو عذاب نازل ہوئے تو) اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا (یعنی بلاوجہ سزا دیتا جو ظاہراً مشابہ ظلم کے ہے گو واقع میں بوجہ اپنی ملک میں تصرف کرنے کے یہ بھی ظلم نہ تھا) لیکن یہی لوگ (شرارتیں کرکے) اپنے اوپر ظلم کیا کرتے تھے (کہ اپنے کو مستحق عذاب بنایا، اور غارت ہوئے تو اپنا ضرر خود کیا) جن لوگوں نے خدا کے سوا اور کارساز تجویز کر رکھے ہیں ان لوگوں کی مکڑی کی سی مثال ہے جس نے ایک گھر بنایا اور کچھ شک نہیں کہ سب گھروں میں زیادہ بودا مکڑی کا گھر ہوتا ہے، (پس جیسا اس مکڑی نے اپنے زعم میں ایک اپنی جائے پناہ بنائی ہے، مگر واقع میں وہ پناہ انتہائی کمزور ہونے کے سبب کالعدم ہے، اسی طرح یہ مشرک لوگ معبودات باطلہ کو اپنے زعم میں اپنی پناہ سمجھتے ہیں، مگر واقع میں وہ پناہ کچھ نہیں ہے) اگر وہ (حقیقت حال کو) جانتے تو ایسا نہ کرتے (یعنی شرک نہ کرتے، لیکن وہ نہ جانیں تو کیا ہوا) اللہ تعالیٰ (تو) ان سب چیزوں (کی حقیقت اور ضعف) کو جانتا ہے جس جس کو وہ لوگ خدا کے سوا پوج رہے ہیں (پس وہ چیزیں تو نہایت ضعیف ہیں) اور وہ (خود یعنی اللہ تعالیٰ) زبردست حکمت والا ہے (جس کا حاصل قوت علمیہ وعملیہ میں کامل ہونا ہے) اور (چونکہ ہم ان چیزوں کی حقیقت کو جانتے ہیں اسی لئے) ہم ان (قرآنی) مثالوں کو (جن میں سے ایک مثال اس مقام پر مذکور ہے) لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے بیان کرتے ہیں، اور (ان مثالوں سے چاہیے تھا کہ ان لوگوں کا جہل علم سے بدل جاتا مگر) ان مثالوں کو بس علم والے ہی سمجھتے ہیں (خواہ بالفعل عالم ہوں یا انجام کے اعتبار سے، یعنی علم اور حق کے طالب ہوں اور یہ لوگ عالم بھی نہیں طالب بھی نہیں، اس لئے جہل میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن ان کے جہل سے حق حق ہی رہے گا جس کو خدا جانتا ہے، اور اپنے بیان سے ظاہر فرماتا ہے، پس غیر اللہ کا مستحق عبادت نہ ہونا تو ثابت ہوا۔ آگے اللہ تعالیٰ کے مستحق عبادت ہونے کی دلیل ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو مناسب طور پر بنایا ہے، (چنانچہ وہ بھی تسلیم کرتے ہیں) ایمان والوں کے لئے اس میں (اس کے استحقاق عبادت کی) بڑی دلیل ہے ۰

معارف و مسائل

ان آیات میں جن انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے واقعات اجمالاً بیان کئے گئے ہیں وہ پچھلی سورتوں میں مفصل آچکے ہیں، مثلاً شعیب علیہ السلام کا قصہ سورۂ اعراف اور ہود میں، اسی طرح عاد و ثمود کا قصہ بھی اعراف اور ہود میں گذر چکا ہے، اور قارون، فرعون، ہامان کا قصہ سورۂ قصص میں ابھی گذرا ہے۔

وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ، استبصار سے مشتق ہے جو بصیرت کے معنی میں ہے، اور مستبصر بمعنی مبصر، مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جو کفر و شرک پر اصرار کر کے عذاب میں اور ہلاکت میں مبتلا ہوئے کچھ بیوقوف یا دیوانے نہ تھے، دنیا کے کاموں میں بڑے مبصر اور ہوشیار تھے، مگر اُن کی عقل اور ہوشیاری اسی مادی دنیا میں مقید ہو کر رہ گئی یہ نہ پہچانا کہ نیک و بد کی جزاء و سزا کا کوئی دن آنا چاہئے، جس میں مکمل انصاف ہو۔ کیونکہ دنیا میں تو اکثر مجرم ظالم دندناتے پھرتے ہیں اور مظلوم و مصیبت زدہ مجبور ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی انصاف کے دن کا نام قیامت اور آخرت ہے، اس کے معاملہ میں ان کی عقل ماری گئی۔

یہی مضمون سورۂ روم میں بھی آگے آنے والا ہے، يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ، یعنی یہ لوگ دنیاوی زندگی کے کاموں کو تو خوب جانتے ہیں مگر آخرت سے غافل ہیں۔

اور بعض ائمہ تفسیر نے وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ کے معنی یہ بتلائے کہ یہ لوگ ایمان اور آخرت پر بھی دل میں تو یقین رکھتے تھے اور اس کا حق ہونا خوب سمجھتے تھے، مگر دنیوی اغراض نے ان کو انکار پر مجبور کر رکھا تھا۔

وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ، عنکبوت مکڑی کو کہا جاتا ہے، اسکی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض ان میں سے زمین میں گھر بناتی ہیں، بظاہر وہ یہاں مراد نہیں، بلکہ مراد وہ مکڑی ہے جو جالا تانتی ہے، اور اس میں معلق رہتی ہے۔ اس جالے کے ذریعہ مکھی کو شکار کرتی ہے، یہ ظاہر ہے کہ جانوروں کی جتنی قسم کے گھونسلے اور گھر معروف ہیں، یہ جالے کے تار ان سب سے زیادہ کمزور ہیں کہ معمولی ہوا سے بھی ٹوٹ سکتے ہیں۔ اس آیت میں غیر اللہ کی پرستش کرنے والوں اور ان پر اعتماد کرنے والوں کی مثال مکڑی کے اس جالے سے دی ہے جو کہ نہایت کمزور ہے۔ اسی طرح جو لوگ اللہ کے سوا بتوں پر یا کسی انسان وغیرہ پر بھروسہ کرتے ہیں ان کا بھروسہ ایسا ہی ہے جیسا یہ مکڑی اپنے جالے کے تاروں پر بھروسہ کرتی ہے۔

مسئلہ: مکڑی کو مارنے اور اس کے جالے صاف کر دینے کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض حضرات اس کو پسند نہیں کرتے، کیونکہ یہ جانور بوقت ہجرت غار ثور کے دہانے پر جالا تان دینے کی وجہ سے قابل احترام ہوگیا، جیسا کہ خطیب نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اس کے قتل کی ممانعت نقل کی ہے۔ مگر ثعلبی نے اور ابن عطیہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی سے یہ روایت نقل کی ہے طَهِّرُوْا بُيُوْتَكُمْ مِّنْ نَسْجِ الْعَنْكَبُوْتِ فَاِنَّ تَرْكَهٗ يُوْرِثُ الْفَقْرَ، یعنی مکڑی کے جالوں سے اپنے مکانات کو صاف رکھا کرو، کیونکہ اس کے چھوڑ دینے سے فقر و فاقہ پیدا ہوتا ہے"، سنداً ان دونوں روایتوں کی قابلِ اعتماد نہیں، اور دوسری روایت کی دوسری احادیث سے تائید ہوتی ہے جن میں مکانات اور فناءِ دار کو صاف رکھنے کا حکم ہے۔ (روح المعانی)

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ، مشرکین کے خداؤں کی کمزوری کی مثال مکڑی کے جالے سے دینے کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ ہم ایسی ایسی واضح مثالوں سے توحید کی حقیقت کا بیان کرتے ہیں، مگر ان مثالوں سے بھی سمجھ بوجھ صرف علماءِ دین ہی حاصل کرتے ہیں، دوسرے لوگ تدبّر اور غور و فکر ہی نہیں کرتے، کہ حق ان پر واضح ہو جاوے۔

اللہ کے نزدیک عالم کون ہے؟ امام بغوی ؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر ؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرما کر فرمایا کہ عالم وہی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام میں غور و فکر کرے، اور اس کی طاعت پر عمل کرے، اور اس کو ناراض کرنے والے کاموں سے بچے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث کے محض الفاظ سمجھ لینے سے اللہ کے نزدیک کوئی شخص عالم نہیں ہوتا، جب تک قرآن میں تدبّر اور غور و فکر کی عادت نہ ڈالے، اور جب تک کہ اپنے عمل کو قرآن کے مطابق نہ بنائے۔

مسند احمد میں حضرت عمرو بن عاص ؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ہزار امثال سیکھی ہیں، ابن کثیر ؒ اس کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہ حضرت عمرو بن عاص ؓ کی بہت بڑی فضیلت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت مذکورہ میں عالم انہی کو فرمایا ہے جو اللہ و رسول کی بیان کردہ امثال کو سمجھیں۔

اور حضرت عمرو بن مرۃ ؓ نے فرمایا کہ جب میں قرآن کی کسی آیت پر پہونچتا ہوں جو میری سمجھ میں نہ آئے تو مجھے بڑا غم ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (ابن کثیر)

أُتْلُ مَآ أُوْحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ ط

تو پڑھ جو اُتری تیری طرف کتاب اور قائم رکھ نماز

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ط وَلَذِكْرُ اللّٰهِ

بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بُری بات سے اور اللہ کی یاد ہے

أَكْبَرُ ط وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾

سب سے بڑی اور اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

خُلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آپ رسول ہیں، اس لئے) جو کتاب آپ پر وحی کی گئی ہے آپ (تبلیغ کے واسطے) اس کو (لوگوں کے سامنے) پڑھا کیجئے (اور تبلیغ قولی کے ساتھ تبلیغ عملی بھی کیجئے کہ دین کے کام ان کو عمل کرکے بھی بتلایئے، خصوصاً) نماز کی پابندی رکھئے (کیونکہ تمام اعمال میں نماز اعظم عبادت بھی ہے اور اس کے اثرات بھی دوررس ہیں کہ) بیشک نماز (اپنی وضع کے اعتبار سے) بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی رہتی ہے، (یعنی بزبانِ حال کہتی ہے کہ تو جس معبود کی انتہائی تعظیم کر رہا ہے اور اس کی اطاعت کا اقرار کر رہا ہے، فحشاء اور منکر میں مبتلا ہونا اس کی شان میں بے ادبی ہے) اور (اسی طرح نماز کے سوا جتنے نیک کام ہیں سب پابندی کے لائق ہیں، کیونکہ وہ سب قولاً یا فعلاً اللہ کی یاد ہیں) اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور (اگر تم اللہ کی یاد میں غفلت کرو تو یہ بھی سن لو کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو جانتا ہے (جیسا کرو گے ویسا بدلہ ملے گا)۔

معارف و مسائل

أُتْلُ مَآ أُوْحِيَ إِلَيْكَ، سابقہ آیات میں چند انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کا ذکر تھا، جن میں چند بڑے بڑے سرکش کفار اور ان پر طرح طرح کے عذابوں کا بیان تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنینِ امت کے لئے تسلی بھی ہے کہ انبیاء سابقین نے مخالفین کی کیسی کیسی ایذاؤں پر صبر کیا، اور اس کی تلقین بھی کہ تبلیغ و دعوت کے کام میں کسی حال میں ہمت نہیں ہارنا چاہئے۔

اصلاح خلق کا مختصر جامع نسخہ

مذکور الصدر آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت الی اللہ کا ایک مختصر جامع نسخہ بتلایا گیا ہے، جس پر عمل کرنے سے پورے دین پر عمل کرنے کے راستے کھل جاتے ہیں، اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں عادۃً پیش آتی ہیں وہ دور ہو جاتی ہیں، اس نسخۂ اکسیر کے دو جزء ہیں، ایک تلاوتِ قرآن، دوسرے نماز کی اقامت۔ اور اس جگہ اصل مقصود تو یہی ہے کہ لوگوں کو ان دونوں چیزوں کا پابند کیا جائے، لیکن ترغیب و تاکید کے لئے ان دونوں چیزوں کا حکم اولاً خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے، تاکہ امت کو اس پر عمل کرنے کی زیادہ رغبت ہو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی تعلیم سے ان کو خود عمل کرنا بھی آسان ہو جائے۔

ان میں تلاوتِ قرآن تو سب کاموں کی روح اور اصل بنیاد ہے، اس کے بعد دوسری چیز اقامتِ صلوٰۃ ہے، جس کو تمام دوسرے فرائض اور اعمال سے ممتاز کر کے بیان کرنے کی یہ حکمت بھی بیان فرما دی کہ نماز خود اپنی ذات میں بھی بہت بڑی اہم عبادت اور دین کا عمود ہے، اس کے ساتھ اس کا یہ بھی فائدہ ہے کہ جو شخص نماز کی اقامت کرے تو نماز اس کو فحشاء اور منکر سے روک دیتی ہے۔ فحشاء، ہر ایسے بُرے فعل یا قول کو کہا جاتا ہے جس کی بُرائی کھلی ہوئی اور ایسی واضح ہو کہ ہر عقل والا مومن ہو یا کافر اس کو بُرا سمجھے، جیسے زنا، قتلِ ناحق، چوری، ڈاکہ وغیرہ، اور منکر وہ قول و فعل ہے جس کے حرام و ناجائز ہونے پر اہلِ شرع کا اتفاق ہو، اس لئے ائمہ فقہاء کے اجتہادی اختلافات میں کسی جانب کو منکر نہیں کہا جا سکتا۔

فحشاء اور منکر کے دو لفظوں میں تمام جرائم اور ظاہر و باطنی گناہ آگئے، جو خود بھی فساد ہی فساد ہیں اور اعمالِ صالحہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی ہیں۔

نماز کا تمام گناہوں سے روکنے کا مطلب

متعدد مستند احادیث کی رُو سے یہ مطلب ہے، کہ اقامتِ صلوٰۃ میں بالخاصہ تاثیر ہے کہ جو اس کو ادا کرتا ہے اس سے گناہ چھوٹ جاتے ہیں بشرطیکہ صرف نماز پڑھنا نہ ہو، بلکہ الفاظِ قرآن کے مطابق اقامتِ صلوٰۃ ہو۔ اقامت کے لفظی معنی سیدھا کھڑا کرنے کے ہیں جس میں کسی طرف جھکاؤ نہ ہو۔ اس لئے اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم یہ ہوا کہ نماز کے تمام ظاہری اور باطنی آداب اس طرح ادا کرے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر ادا کر کے بتلایا، اور عمر بھر ان کی زبانی تلقین بھی فرماتے رہے کہ بدن اور کپڑے اور جائے نماز کی مکمل طہارت بھی ہو، پھر نماز جماعت کا پورا اہتمام بھی اور نماز کے تمام اعمال کو سنت کے مطابق بنانا بھی، یہ تو ظاہری آداب ہوئے۔ باطنی یہ کہ مکمل خشوع خضوع سے اس طرح اللہ کے سامنے کھڑا ہو کہ گویا وہ حق تعالیٰ سے عرض و معروض کر رہا ہے۔ اس طرح

اقامت صلوٰۃ کرنے والے کو منجانب اللہ خود بخود توفیق اعمال صالحہ کی بھی ہوتی ہے، اور ہر طرح کے گناہوں سے بچنے کی بھی، اور جو شخص نماز پڑھنے کے باوجود گناہوں سے نہ بچا تو سمجھ لے کہ اس کی نماز ہی میں قصور ہے۔ جیسا کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ کا کیا مطلب ہے، آپ نے فرمایا مَنْ لَّمْ تَنْھَهُ صَلٰوتُهٗ عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ فَلَا صَلٰوۃَ لَهٗ (رواہ ابن ابی حاتم بسندہ عن عمران بن حصین والطبرانی من حدیث ابی معاویۃ) یعنی جس شخص کو اس کی نماز نے فحشاء اور منکر سے نہ روکا اس کی نماز کچھ نہیں۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یُطِعِ الصَّلٰوۃَ (رواہ ابن جریر بسندہ) یعنی اس شخص کی نماز ہی نہیں جس نے اپنی نماز کی اطاعت نہ کی اور نماز کی اطاعت یہی ہے کہ فحشاء اور منکر سے باز آجائے۔

اور حضرت ابن عباسؓ نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا کہ جس شخص کی نماز نے اس کو اعمال صالحہ پر عمل اور منکرات سے پرہیز پر آمادہ نہیں کیا تو ایسی نماز اس کو اللہ سے اور زیادہ دور کر دیتی ہے۔

ابن کثیرؒ نے ان تینوں روایتوں کو نقل کر کے ترجیح اس کو دی ہے کہ یہ احادیث مرفوعہ نہیں، بلکہ عمران بن حصین اور عبداللہ بن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے اقوال ہیں جو ان حضرات نے اس آیت کی تفسیر میں ارشاد فرمائے ہیں۔

اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ فلاں آدمی رات کو تہجد پڑھتا ہے اور جب صبح ہو جاتی ہے تو چوری کرتا ہے، آپ نے فرمایا کہ عنقریب نماز اس کو چوری سے روک دے گی۔ (ابن کثیر) بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بعد وہ اپنے گناہ سے تائب ہو گیا۔

ایک شبہ کا جواب

یہاں بعض لوگ یہ شبہ کیا کرتے ہیں کہ ہم بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ نماز کے پابند ہونے کے باوجود بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں جو بظاہر اس آیت کے ارشاد کے خلاف ہے۔

اس کے جواب میں بعض حضراتؒ نے تو یہ فرمایا کہ آیت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ نماز نمازی کو گناہوں سے منع کرتی ہے، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ جس کو کسی کام سے منع کیا جائے وہ اس سے باز بھی آجائے۔ آخر قرآن و حدیث سب لوگوں کو گناہ سے منع کرتے ہیں،

مگر بہت سے لوگ اس منع کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے، اور گناہ سے باز نہیں آتے۔

خلاصۂ تفسیر مذکور میں یہی توجیہ لی گئی ہے۔

مگر اکثر حضرات مفسرین نے فرمایا کہ نماز کے منع کرنے کا مفہوم صرف حکم دینا نہیں بلکہ نماز میں بالخاصہ یہ اثر بھی ہے کہ اس کے پڑھنے والے کو گناہوں سے بچنے کی توفیق ہوجاتی ہے، اور جس کو توفیق نہ ہو تو غور کرنے سے ثابت ہوجائے گا کہ اس کی نماز میں کوئی خلل تھا، اور اقامتِ صلوٰۃ کا حق اس نے ادا نہیں کیا، احادیث مذکورہ سے اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے۔

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ، "یعنی اللہ کا ذکر بہت بڑا ہے، اور وہ تمہارے سب اعمال کو خوب جانتا ہے"، یہاں ذکر اللہ کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ بندے جو اللہ کا ذکر نماز یا خارج نماز میں کرتے ہیں وہ بڑی چیز ہے، اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ بندے جب اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے ذاکر بندوں کا ذکر فرشتوں کے مجمع میں کرتے ہیں (فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ) اور یہ عبادتگذار بندوں کو اللہ کا یاد کرنا سب سے بڑی نعمت ہے۔ بہت سے صحابہ و تابعین سے اس جگہ ذکر اللہ کا یہی دوسرا مفہوم منقول ہے، ابن جریر اور ابن کثیر نے اسی کو ترجیح دی ہے، اور اس مفہوم کے لحاظ سے اس میں اس طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ نماز پڑھنے میں گناہوں سے نجات کا اصل سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اس کا ذکر فرشتوں میں کرتے ہیں اور اس کی برکت سے اس کو گناہوں سے نجات مل جاتی ہے۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ

اور جھگڑا نہ کرو اہل کتاب سے مگر اس طرح پر جو بہتر ہو، مگر جو اُن میں

ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ

بے انصاف ہیں اور یوں کہو کہ ہم مانتے ہیں جو اترا ہم کو اور اترا تم کو

وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَكَذٰلِكَ

اور بندگی ہماری اور تمہاری ایک ہی کو ہے اور ہم اسی کے حکم پر چلتے ہیں، اور ویسی ہی

اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ

ہم نے اتاری تجھ پر کتاب، سو جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو مانتے

بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۗ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾

ہیں اور ان (مکہ والوں) میں بھی بعضے ہیں کہ اس کو مانتے ہیں اور منکر وہی ہیں ہماری باتوں سے جو نافرمان ہیں

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا

اور تو پڑھتا نہ تھا اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ لکھتا تھا اپنے داہنے ہاتھ سے تب تو

لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ

البتہ شبہ میں پڑتے یہ جھوٹے ، بلکہ یہ (قرآن) تو آیتیں ہیں صاف ان لوگوں کے سینوں میں جن کو

اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَقَالُوْا لَوْلَآ

ملی ہے سمجھ ، اور منکر نہیں ہماری باتوں سے مگر وہی جو بے انصاف ہیں اور کہتے ہیں کیوں

اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ

نہ اُتریں اس پر کچھ نشانیاں اس کے رب سے تو کہہ نشانیاں تو ہیں اختیار میں اللہ کے اور میں تو بس

اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ

سنا دینے والا ہوں کھول کر ، کیا اُن کو یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر اُتاری کتاب کہ اُن پر

يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾

پڑھی جاتی ہے ، بیشک اس میں رحمت ہے اور سمجھانا اُن لوگوں کو جو مانتے ہیں ،

ع ۵/۷

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ

تو کہہ کافی ہے اللہ میرے اور تمہارے بیچ گواہ جانتا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین

الْاَرْضِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ

میں اور جو لوگ یقین لاتے ہیں جھوٹ پر اور منکر ہوئے اللہ سے ، وہی ہیں

هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَلَوْلَآ اَجَلٌ

نقصان پانے والے ، اور جلدی مانگتے ہیں تجھ سے آفت ، اور اگر نہ ہوتا ایک

مُّسَمًّى لَّجَاۗءَهُمُ الْعَذَابُ ۭ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ

وعدہ مقررہ تو آپہنچتی اُن پر آفت ، اور البتہ آئے گی اُن پر اچانک اور ان کو خبر

لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ

نہ ہوگی، جلدی مانگتے ہیں تجھ سے عذاب اور دوزخ گھیر رہی ہے

بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ

منکروں کو، جس دن گھیر لے گا ان کو عذاب ان کے اوپر سے اور

تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾

پاؤں کے نیچے سے اور کہے گا چکھو جیسا کچھ تم کرتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت ہوگئی تو اے مسلمانوں منکرین رسالت میں سے جو اہل کتاب ہیں ہم ان سے طریقہ گفتگو بتلاتے ہیں، اور یہ تخصیص اس لئے کہ اول تو وہ بوجہ اہل علم ہونے کے بات کو سنتے ہیں اور مشرکین تو بات سننے سے پہلے ہی ایذاء کے درپے ہوجاتے ہیں، دوسرے اہل علم کے ایمان لے آنے سے عوام کا ایمان زیادہ متوقع ہوجاتا ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ) تم اہل کتاب کے ساتھ بجز مہذب طریقے کے مباحثہ مت کرو ہاں جو ان میں زیادتی کریں (تو اُن کو جواب ترکی بہ ترکی دینے کا مضائقہ نہیں، گو افضل جب بھی طریقہ احسن ہی) اور (وہ مہذب طریقہ یہ ہے کہ مثلاً ان سے) یوں کہو کہ ہم اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوئی اور ان کتابوں پر بھی (ایمان رکھتے ہیں) جو تم پر نازل ہوئیں، (کیونکہ مدار ایمان کا منزل من اللہ ہونا ہے، پس جب ہماری کتاب کا منزل من اللہ ہونا تمہاری کتب سے بھی ثابت ہے تو پھر تم کو قرآن پر بھی ایمان لانا چاہئے) اور (یہ تم بھی تسلیم کرتے ہو کہ) ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے (کقولہ تعالیٰ اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا الخ جب توحید متفق علیہ ہے اور اپنے احبار و رہبان کی اطاعت کی وجہ سے نبی آخر الزمان پر ایمان نہ لانا خلاف توحید ہے، تو تم کو ہمارے نبی پر ایمان لانا چاہئے کقولہ تعالیٰ وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا الخ) اور (اس گفتگو کے ساتھ اپنا مسلمان ہونا تنبیہ کے لئے سنا دو کہ) ہم تو اس کی اطاعت کرتے ہیں (اس میں عقائد و اعمال سب آگئے یعنی اسی طرح تم کو بھی چاہئے جب کہ مقتضی موجود ہے کقولہ تعالیٰ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ) اور (جس طرح ہم نے پہلے انبیاء پر کتابیں نازل کیں) اسی طرح ہم نے آپ پر کتاب نازل فرمائی (جس کی بناء پر مجادلہ بالاحسن کی تعلیم کی گئی) سو جن لوگوں کو ہم نے کتاب (کی نافع سمجھ) دی ہے وہ اس

(آپ والی) کتاب پر ایمان لے آتے ہیں (اور ان سے مجادلہ کی بھی نوبت شاذ و نادر آتی ہے) اور ان (اہل عرب مشرکین) میں بھی بعض ایسے (منصف) ہیں کہ اس کتاب پر ایمان لے آتے ہیں (خواہ خود سمجھ کر یا اہل علم کے ایمان سے استدلال کر کے) اور (وضوح دلائل کے بعد) ہماری (اس کتاب کی) آیتوں سے بجز (ضدی) کافروں کے اور کوئی منکر نہیں ہوتا (اور مجادلہ کی تقریر دلیل نقلی تھی جس سے خاص اہل نقل کو تخاطب تھا آگے دلیل عقلی ہے جس میں عام تخاطب ہے یعنی) اور (جو لوگ آپ کی نبوت کے منکر ہیں، ان کے پاس کوئی منشاء اشتباہ بھی تو نہیں، کیونکہ) آپ اس کتاب (یعنی قرآن) سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھے ہوئے تھے اور نہ کوئی کتاب اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے کہ ایسی حالت میں یہ ناحق شناس لوگ کچھ شبہ نکالتے (کہ یہ لکھے پڑھے آدمی ہیں آسمانی کتابیں دیکھ بھال کر ان کی مدد سے مضامین سوچ کر فرصت میں بیٹھ کر لکھ لئے اور یاد کر کے ہم لوگوں کو سنا دیتے یعنی اگر ایسا ہوتا تو کچھ تو منشاء اشتباہ کا ہوتا، گو جب بھی یہ شبہ کرنے والے مبطل ہوتے، کیونکہ اعجاز قرآنی پھر بھی دلالت علی النبوۃ کے لئے کافی تھا، لیکن اب تو اتنا منشاء اشتباہ بھی نہیں اس لئے یہ کتاب محل ارتیاب نہیں) بلکہ یہ کتاب (باوجود واحد ہونے کے چونکہ ہر حصہ اس کا معجزہ ہے، اور حصص کثیر ہیں، اس لئے وہ تنہا گویا) خود بہت سی واضح دلیلیں ہیں ان لوگوں کے ذہن میں جن کو علم عطا ہوا ہے اور (باوجود ظہور اعجاز کے) ہماری آیتوں سے بس ضدی لوگ انکار کئے جاتے ہیں (ورنہ منصف کو تو ذرا شبہ نہیں رہنا چاہئے) اور یہ لوگ (باوجود عطاء معجزہ قرآن کے محض براہ تعنت و عناد) یوں کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر ان کے رب کے پاس سے (ہماری فرمائشی) نشانیاں کیوں نہیں نازل ہوئیں، آپ یوں کہہ دیجئے کہ وہ نشانیاں تو خدا کے قبضہ (قدرت) میں ہیں اور (میرے اختیار کی چیزیں نہیں) میں تو صرف ایک صاف صاف (عذاب الٰہی سے) ڈرانے والا (یعنی رسول) ہوں (اور رسول ہونے پر صحیح دلیلیں رکھتا ہوں جن میں سب سے بڑی دلیل قرآن ہے۔ پھر خاص دلیل کی کیا ضرورت ہے، خصوصاً جبکہ اس کے واقع نہ ہونے میں حکمت بھی ہو۔ آگے قرآن کا اعظم فی الدلالۃ ہونا فرماتے ہیں) کیا (دلالت علی النبوۃ میں) ان لوگوں کو یہ بات کافی نہیں ہوئی کہ ہم نے آپ پر یہ کتاب (معجز) نازل فرمائی ہے جو ان کو (ہمیشہ) سنائی جاتی رہتی ہے، (کہ اگر ایک بار سننے سے اعجاز ظاہر نہ ہو تو دوسری بار میں ہو جائے یا اس کے بعد ہو جائے، اور دوسرے معجزات میں تو یہ بات بھی نہ ہوتی، کیونکہ اس کا خارق ہونا دائمی نہ ہوتا جیسا ظاہر ہے اور ایک ترجیح اس معجزہ میں یہ ہے کہ) بلاشبہ اس کتاب میں (معجزہ ہونے کے ساتھ) ایمان لانے والے لوگوں کے لئے بڑی رحمت اور نصیحت ہے (رحمت یہ کہ تعلیم احکام کی ہے جو نفع محض ہے اور نصیحت

ترغیب و ترہیب سے ہے، اور یہ بات دوسرے معجزات میں کب ہوتی، پس ان ترجیحات سے تو اس کو غنیمت سمجھتے، اور ایمان لے آتے، اور اگر اس وضوح دلائل کے بعد بھی ایمان نہ لائیں تو آخری جواب کے طور پر) آپ کہدیجئے کہ (خیر بھائی مت مانو) اللہ میرے اور تمہارے درمیان (میری رسالت کا) گواہ بس ہے اس کو سب چیز کی خبر ہے جو آسمان میں ہے اور زمین میں ہے اور (جب میری رسالت اور اللہ کا علم محیط ثابت ہوا تو) جو لوگ جھوٹی باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور اللہ (کی باتوں) کے منکر ہیں (جن میں رسالت بھی داخل ہے) تو وہ لوگ بڑے زیاں کار ہیں (یعنی جب اللہ کے ارشاد سے میری رسالت ثابت ہے تو اس کا انکار کفر باللہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے تو اس کو اس انکار و کفر کی بھی خبر ہے، اور اللہ تعالیٰ کفر پر سزائے خسارہ دیتے ہیں، پس لامحالہ ایسے لوگ خاسر ہوں گے) اور یہ لوگ آپ سے عذاب (واقع ہونے کا) تقاضا کرتے ہیں (اور فوراً عذاب نہ آنے سے آپ کی نبوت و رسالت میں شبہ و انکار کرتے ہیں)، اور اگر (علم الٰہی میں عذاب آنے کے لئے) میعاد معین نہ ہوتی تو (ان کے تقاضہ کے ساتھ ہی) ان پر عذاب آچکا ہوتا اور (جب وہ میعاد آجا دے گی تو) وہ عذاب اُن پر دفعۃً آپہونچے گا، اور ان کو خبر بھی نہ ہوگی (آگے ان لوگوں کی جہالت کے اظہار کے لئے ان کی جلد بازی کو مکرر ذکر کرکے عذاب کی میعاد معین اور اس میں پیش آنے والے عذاب کا ذکر کرتے ہیں کہ) یہ لوگ آپ سے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں اور (عذاب کی صورت یہ ہو کہ) اس میں کچھ شک نہیں کہ جہنم ان کافروں کو (چاروں طرف سے) گھیرلے گا جس دن اُن پر عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے نیچے سے گھیرلے گا اور (اس وقت ان سے) حق تعالیٰ فرمائے گا کہ جو کچھ (دنیا میں) کرتے رہے ہو (اب اس کا مزہ) چکھو۔

معارف و مسائل

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا، یعنی اہل کتاب سے بحث و مباحثہ کی نوبت آوے تو مجادلہ بھی ایسے طریقہ سے کرو جو بہتر ہو مثلاً سخت بات کا جواب نرم الفاظ سے، غصہ کا جواب بردباری سے، جاہلانہ شور و شغب کا جواب باوقار گفت گو سے، اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا، مگر وہ لوگ جنھوں نے تم پر ظلم کیا کہ تمھاری باوقار نرم گفتگو اور دلائل واضحہ کے مقابلہ میں ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیا تو وہ اس احسان کے مستحق نہیں رہے، بلکہ ایسے لوگوں کا جواب ترکی بہ ترکی دیا جائے تو جائز ہے، اگرچہ اولیٰ اور بہتر اس وقت بھی یہی ہے کہ ان کی بدخوئی کا جواب بدخوئی سے اور ظلم کا جواب ظلم سے نہ دیں۔

بلکہ کج خلقی کے جواب میں خوش خلقی کا اور ظلم کے جواب میں انصاف کا مظاہرہ کریں۔ جیسا کہ دوسری آیاتِ قرآن میں اس کی تصریح ہے وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ، یعنی اگر ظلم وجور کا بدلہ تم ان سے برابر سرابر لے لو تو تمھیں اس کا حق ہے، لیکن صبر کرو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔"

اس آیت میں اہل کتاب سے مجادلہ میں جو ہدایت طریقہ حسنہ کے ساتھ کرنے کی دی گئی ہے یہی سورۂ نحل میں مشرکین کے متعلق بھی ہے۔ اس جگہ اہل کتاب کی تخصیص اُس کلام کی وجہ سے ہے جو بعد میں آرہا ہے، کہ ہمارے اور تمہارے دین میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں تم غور کرو تو ایمان اور اسلام کے قبول کرنے میں تمھیں کوئی مانع نہ ہونا چاہئے جیسا کہ ارشاد فرمایا قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ، یعنی تم اہل کتاب سے مجادلہ کے وقت ان کو اپنے قریب کرنے کے لئے یہ کہو کہ ہم مسلمان تو اس وحی پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف بواسطہ ہمارے رسول کے بھیجی گئی ہے، اور اس وحی پر بھی جو تمھاری طرف تمھارے پیغمبر کے ذریعہ بھیجی گئی ہے، اس لئے ہم سے مخالفت کی کوئی وجہ نہیں۔

کیا اس آیت میں موجودہ تورات وانجیل کے مضامین کی تصدیق کا حکم ہے: اس آیت میں اہلِ کتاب کی طرف آنے والی کتابوں تورات وانجیل پر مسلمانوں کے ایمان کا تذکرہ جن عنوان سے کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم ان کتابوں پر اجمالی ایمان رکھتے ہیں بایں معنی کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں میں نازل فرمایا تھا اس پر ہمارا ایمان ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ موجودہ تورات وانجیل کے سب مضامین پر ہمارا ایمان ہو، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بھی بہت تحریفات ہو چکی تھیں اور اس وقت سے اب تک ان میں تحریف کا سلسلہ چل ہی رہا ہے۔ ایمان صرف ان مضامینِ تورات وانجیل پر ہے جو اللہ کی طرف سے حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئے تھے، تحریف شدہ مضامین اس سے خارج ہیں۔

موجودہ تورات وانجیل کی مطلقاً تصدیق کی جائے نہ مطلقاً تکذیب: صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ اہلِ کتاب تورات وانجیل کو ان کی اصلی زبان عبرانی میں پڑھتے تھے، اور مسلمانوں کو ان کا ترجمہ عربی زبان میں سناتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق مسلمانوں کو یہ ہدایت دی کہ تم اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب کرو، بلکہ یوں کہو اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ، یعنی ہم اجمالاً اس وحی پر ایمان لاتے ہیں جو تمھارے انبیاء پر نازل ہوئی ہے، اور جو تفصیلات تم بتلاتے ہو وہ ہمارے نزدیک قابلِ اعتماد نہیں۔ اس لئے ہم اسکی تصدیق و تکذیب سے اجتناب کرتے ہیں۔

تفسیروں میں جو عام مفسرین نے اہل کتاب کی روایات نقل کی ہیں ان کا بھی یہی درجہ ہے۔ اور نقل کرنے کا منشاء بھی صرف اس کی تاریخی حیثیت کو واضح کرنا ہے، احکام حلال حرام کا ان سے استنباط نہیں کیا جا سکتا، مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ، یعنی نزول قرآن سے پہلے نہ آپ کوئی کتاب پڑھتے تھے، نہ کچھ لکھ سکتے تھے بلکہ آپ اُمّی تھے، اگر ایسا ہوتا اور آپ لکھے پڑھے ہوتے تو اہل باطل کے لئے شک و شبہ کی گنجائش نکل آتی کہ یہ الزام لگاتے کہ آپ نے پچھلی کتابیں تورات و انجیل پڑھی ہیں یا نقل کی ہیں آپ جو کچھ قرآن میں فرماتے ہیں وہ انہی پچھلی کتابوں کا اقتباس ہے، کوئی وحی اور نبوت و رسالت نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا آپ کی بڑی فضیلت اور بڑا معجزہ ہے

حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر جس طرح بہت سے واضح اور کھلے ہوئے معجزات ظاہر فرمائے انہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو پہلے سے اُمّی رکھا، نہ کچھ لکھا ہوا پڑھ سکتے تھے، نہ خود کچھ لکھ سکتے تھے، اور عمر کے چالیس سال اسی حال میں تمام اہل مکہ کے سامنے گذرے۔ آپ کا اختلاط اہل کتاب سے بھی کبھی نہیں ہوا کہ ان سے کچھ سن لیتے۔ کیونکہ مکہ میں اہل کتاب تھے ہی نہیں، چالیس سال ہونے پر یکایک آپ کی زبان مبارک سے ایسا کلام جاری ہونے لگا جو اپنے مضامین اور معانی کے اعتبار سے بھی معجزہ تھا، اور لفظی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی۔

بعض علماء نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آپ کا اُمّی ہونا ابتداء میں تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا تھا اور اس کی دلیل میں واقعہ حدیبیہ کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس میں یہ ہے کہ جب معاہدۂ صلح لکھا گیا تو اس میں مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اوّل لکھا تھا، اس پر مشرکین مکہ نے اعتراض کیا کہ ہم آپ کو رسول مانتے تو یہ جھگڑا ہی کیوں ہوتا، اس لئے آپ کے نام کے ساتھ "رسول اللہ" کا لفظ ہم قبول نہیں کریں گے۔ لکھنے والے حضرت علی مرتضیٰؓ تھے، آپ نے ان کو فرمایا کہ یہ لفظ مٹا دو، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے ادب سے مجبور ہو کر ایسا کرنے سے انکار کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ خود اپنے ہاتھ میں لیا اور یہ لفظ مٹا کر یہ لکھ دیا، مِنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ۔

اس روایت میں لکھنے کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے جس سے کچھ حضرات نے استدلال کیا ہے کہ آپ لکھنا جانتے تھے، مگر صحیح بات یہی ہے کہ کسی دوسرے سے لکھوانے کو بھی عرف میں یہی کہا جاتا ہے کہ "اس نے لکھا" جیسا کہ محاورات میں عام

ہے، اس کے علاوہ یہ بھی امکان ہے کہ اس واقعہ میں بطور معجزہ آپ کے نام مبارک بھی اللہ تعالیٰ نے لکھوا دیا، اس کے علاوہ صرف اپنے نام کے چند حروف لکھ دینے سے کوئی آدمی لکھا پڑھا نہیں کہلا سکتا، اس کو اَن پڑھ اور اُمّی ہی کہا جائے گا، جب لکھنے کی عادت نہ ہو اور بلا دلیل کتابت کا آپ کی طرف منسوب کرنا آپ کی فضیلت کا اثبات نہیں، غور کریں تو بڑی فضیلت اُمّی ہونے میں ہے۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

اے بندو میرے جو یقین لائے ہو میری زمین کشادہ ہے سو مجھ ہی کی بندگی کرو

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۣ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ

جو جی ہے سو چکھے گا موت پھر ہماری طرف پھر آؤ گے، اور جو لوگ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ

یقین لائے اور کئے بھلے کام ان کو ہم جگہ دیں گے بہشت میں جھروکے نیچے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۵۸﴾

بہتی ہیں ان کے نہریں سدا رہیں ان میں، خوب ثواب ملا کام والوں کو

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَاۗبَّةٍ

جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر بھروسہ رکھا، اور کتنے جانور ہیں جو اٹھا نہیں

لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ڰ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ڮ وَهُوَ السَّمِيْعُ

رکھتے اپنی روزی، اللہ روزی دیتا ہے ان کو اور تم کو بھی، اور وہی ہے سننے والا

الْعَلِيْمُ ﴿۶۰﴾ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

جاننے والا، اور اگر تو لوگوں سے پوچھے کہ کس نے بنایا ہے آسمان اور زمین کو

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور کام میں لگایا سورج اور چاند کو تو کہیں اللہ نے، پھر کہاں سے اُلٹ جاتے ہیں،

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ

اللہ پھیلاتا ہے روزی جس کے واسطے چاہے اپنے بندوں میں اور ماپ کر دیتا ہے جس کو چاہے

إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٦٢﴾ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ

بیشک اللہ ہر چیز سے خبردار ہے ۔ اور جو تو پوچھے اُن سے کس نے اُتارا آسمان

السَّمَآءِ مَآءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ

سے پانی پھر زندہ کر دیا اس سے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد تو کہیں

اللّٰهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٦٣﴾

اللہ نے تو کہہ سب خوبی اللہ کو ہے پر بہت لوگ نہیں سمجھتے

خلاصۂ تفسیر

اے میرے ایمان دار بندو (جب یہ لوگ غایتِ عداوت و عناد سے تم کو اقامتِ شرائع واختیار دین پر ایذاء پہونچاتے ہیں تو یہاں رہنا کیا ضرور) میری زمین فراخ ہے، سو (اگر یہاں رہ کر عبادت نہیں کر سکتے تو اور کہیں چلے جاؤ اور وہاں جا کر) خالص میری ہی عبادت کرو (کیونکہ یہاں اہلِ شرک کا زور ہے، تو ایسی عبادت جو توحید محض پر مبنی ہو اور شرک سے خالی ہو، یہاں مشکل ہے، البتہ خدا کے ساتھ غیر خدا کی بھی عبادت ہو یہ ممکن ہے مگر وہ عبادت ہی نہیں اور اگر تم کو ہجرت میں احباب و اوطان کی مفارقت شاق معلوم ہو تو یہ سمجھ لو کہ ایک نہ ایک روز یہ تو ہونا ہی ہے، کیونکہ) ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا (ضرور) ہے (آخر اس وقت سب چھوٹیں گے اور) پھر تم سب کو ہمارے پاس آنا ہے (اور نافرمان ہو کر آنے میں خوف سزا کا ہے) اور (یہ مفارقت اگر ہماری رضا کے واسطے ہو تو ہمارے پاس پہنچنے کے بعد اس وعدہ کے مستحق ہو جاؤ اور وہ وعدہ یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کئے (جن پر عمل کرنا بعض اوقات ہجرت پر موقوف ہوتا ہے تو ایسے وقت میں ہجرت بھی کی) ہم ان کو جنت کے بالاخانوں میں جگہ دیں گے، جن کے نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے (اور ان نیک) کام کرنے والوں کا کیا اچھا اجر ہے، جنھوں نے (واقع شدہ سختیوں پر جن میں ہجرت کی سختی بھی داخل ہو گئی) صبر کیا، اور (دوسرے ملک یا شہر میں جا کر جو تکالیف کا اور گذارے کی مشکلات کا اندیشہ تھا اس میں) وہ اپنے رب پر توکل کیا کرتے تھے اور (اگر ہجرت میں تم کو یہ وسوسہ ہو کہ پردیس میں کھانے کو کہاں سے

ملے گا تو یہ سمجھ لو کہ) بہت سے جانور ایسے ہیں جو اپنی غذا اٹھا کر نہیں رکھتے (یعنی جمع نہیں کرتے گو بعضے جمع بھی کرتے ہیں مگر بہت سے نہیں بھی کرتے) اللہ ہی ان کو (مقدر) روزی پہنچاتا ہے اور تم کو بھی (مقدر روزی پہنچاتا ہے خواہ تم کہیں ہو پھر ایسا وسوسہ مت لاؤ، بلکہ دل قوی کر کے اللہ پر بھروسہ رکھو) اور (وہ بھروسہ کے لائق ہے کیونکہ) وہ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے (اسی طرح دوسری صفات میں کامل ہے اور جو ایسا کامل الصفات ہو وہ ضرور بھروسہ کے قابل ہے) اور (توحید فی الالوہیت کا جو مبنیٰ ہے یعنی توحید فی التخلیق وہ تو ان لوگوں کے نزدیک بھی مسلّم ہے چنانچہ) اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ (بھلا) وہ کون ہے جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور جس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے، تو وہ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ اللہ ہے پھر (جب توحید فی التخلیق کو مانتے ہیں تو توحید فی الالوہیت کے بارے میں) کدھر الٹے چلے جا رہے ہیں (اور جیسا خالق اللہ ہی ہے اسی طرح اللہ ہی رازق بھی ہے چنانچہ) وہ اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہے روزی فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہے تنگ کر دیتا ہے، بیشک اللہ ہی سب چیز کے حال سے واقف ہے (جیسی مصلحت دیکھتا ہے ویسی ہی روزی دیتا ہے غرض رازق وہی ٹھہرا، اس لئے رزق کا اندیشہ ہجرت سے مانع نہ ہونا چاہئے) اور (جیسا کہ تخلیقِ کائنات میں اللہ کی توحید ان کے نزدیک بھی مسلّم ہے، اسی طرح کائنات کے باقی رکھنے اور ان کا نظام چلانے میں بھی توحید کو تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ) اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ وہ کون ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کو بعد اس کے کہ خشک (ناقابل نبات) پڑی تھی تر و تازہ (قابل نبات) کر دیا تو (جواب میں) وہ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ بھی اللہ ہی ہے آپ کہئے کہ الحمد للہ (اتنا تو اقرار کیا جس سے توحید فی الالوہیت پر استدلال بھی بدیہی ہے، مگر یہ لوگ مانتے نہیں) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) ان میں اکثر سمجھتے بھی نہیں (نہ اس وجہ سے کہ عقل نہیں، بلکہ عقل سے کام نہیں لیتے اور غور نہیں کرتے، اس لئے بدیہی بھی خفی رہتا ہے)۔

معارف و مسائل

شروع سورت سے یہاں تک مسلمانوں کے ساتھ کفار کی عداوت اور توحید و رسالت سے مسلسل انکار اور حق اور اہلِ حق کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹوں کا بیان تھا، مذکور الصدر آیات میں مسلمانوں کے لئے ان کے شر سے بچنے اور حق کو شائع کرنے اور حق و انصاف

کو دنیا میں قائم کرنے کی ایک تدبیر کا بیان ہے جس کا اصطلاحی نام ہجرت ہے، یعنی وہ وطن اور ملک چھوڑ دینا جس میں انسان خلافِ حق بولنے اور کرنے پر مجبور کیا جائے۔

ہجرت کے احکام اور اس کی راہ میں پیش آنے والے شکوک و شبہات کا ازالہ

اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میری زمین بہت وسیع ہے، اس لئے کسی کا یہ عذر قابلِ سماعت نہیں کہ فلاں شہر یا فلاں ملک میں کفار غالب تھے، اس لئے ہم اللہ کی توحید اور اس کی عبادت سے مجبور رہے۔ ان کو چاہئے کہ اس سرزمین کو جہاں وہ کفر و معصیت پر مجبور کئے جائیں اللہ کے لئے چھوڑ دیں، اور کوئی ایسی جگہ تلاش کریں جہاں آزادی سے اللہ تعالیٰ کے احکام پر خود بھی عمل کر سکیں اور دوسروں کو بھی تلقین کر سکیں۔ اسی کا نام ہجرت ہے۔

وطن سے ہجرت کر کے کسی دوسری جگہ جانے میں دو قسم کے خطرات انسان کو عادۃً پیش آیا کرتے ہیں، جو اس کو ہجرت سے روکتے ہیں۔ پہلا خطرہ اپنی جان کا ہے کہ جب اس وطن کو چھوڑ کر کہیں جائیں گے تو یہاں کے کفار اور ظالم لوگ راہ میں حائل ہوں گے، اور مقابلہ و مقاتلہ کے لئے آمادہ ہوں گے۔ نیز راستہ میں ممکن ہے کہ دوسرے کفار سے بھی مقابلہ کرنا پڑے جس میں جان کا خطرہ ہے۔ اس کا جواب اگلی آیت میں یہ دیا گیا کہ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ یعنی ہر ایک جان چکھنے والی ہے مزہ موت کا جس سے کسی کو کسی جگہ کسی حال مفر نہیں۔ اس لئے موت سے خوف اور گھبراہٹ مؤمن کا کام نہیں ہونا چاہئے۔ وہ تو ہر شخص کو ہر حال میں پیش آئیگی۔ اپنی جگہ میں کیسے ہی حفاظت کے سامان کر کے رہے، پھر بھی آئیگی۔ اور مؤمن کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے موت نہیں آسکتی۔ اس لئے اپنی جگہ رہنے یا ہجرت کر کے دوسری جگہ جانے میں موت کا خوف حائل نہ ہونا چاہئے، خصوصاً جبکہ احکامِ الٰہیہ کی اطاعت کرتے ہوئے موت آجانا دائمی راحتوں اور نعمتوں کا ذریعہ ہے جو ان کو آخرت میں ملیں گی جس کا ذکر بعد کی دو آیتوں میں فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا الآیۃ۔

دوسرا خطرہ ہجرت کی راہ میں یہ پیش آتا ہے کہ دوسرے وطن دوسرے ملک میں جا کر رزق کا کیا سامان ہوگا، اپنی جگہ تو کچھ آبائی میراث سے کچھ اپنی کمائی سے آدمی کوئی زمین جائداد یا صنعت و حرفت و تجارت وغیرہ کے سامان کئے رہتا ہے، ہجرت کے وقت یہ سب تو یہیں چھوٹ جائیں گے، آگے گذارہ کس طرح ہوگا؟ اس کا جواب بعد کی تین آیتوں میں اس طرح دیا گیا ہے کہ تم ان حاصل کردہ سامانوں کو رزق کی علت اور کافی سبب قرار

دیتے ہوئے تمہاری بھول ہے، رزق دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے وہ جب چاہتا ہے تو بغیر کسی ظاہری سامان کے بھی رزق پہنچا دیتا ہے، اور وہ نہ چاہے تو سب سامان و اسباب کے ہوتے ہوئے بھی انسان رزق سے محروم ہوسکتا ہے۔ اس کے بیان کے لئے پہلے تو یہ فرمایا:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ، یعنی اس پر غور کرو کہ زمین پر چلنے والے کتنے ہزاروں قسم کے جانور ہیں جو اپنے رزق جمع کرنے اور رکھنے کا کوئی انتظام نہیں کرتے نہ تحصیلِ رزق کے اسباب جمع کرنے کی کوئی فکر کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ان کو روزانہ اپنے فضل سے رزق مہیا کرتے ہیں۔ علماء نے فرمایا ہے کہ عام جانور ایسے ہی ہیں۔ ان میں صرف چیونٹی اور چوہا تو ایسے جانور ہیں جو اپنی غذا کیلئے اپنے بلوں میں جمع کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ چیونٹی سردی کی موسم میں باہر نہیں آتی، اس لئے گرمی کے ایام میں کھانے کا سامان اپنے بل میں جمع کرتی ہے۔ اور مشہور ہے کہ پرندہ جانوروں میں سے عقعق (کوا) بھی اپنی غذا اپنے گھونسلے میں جمع کرتا ہے مگر وہ رکھ کر بھول جاتا ہے۔ بہرحال دنیا کے تمام جانور جن کی انواع و اصناف کا شمار بھی انسان سے مشکل ہے، وہ بیشتر وہی ہیں جو آج اپنی غذا حاصل کرنے کے بعد کل کے لئے نہ غذا مہیا کرتے ہیں نہ اس کے اسباب ان کے پاس ہوتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ یہ پرندے جانور صبح کو اپنے گھونسلوں سے بھوکے نکلتے ہیں، اور شام کو پیٹ بھرے واپس ہوتے ہیں۔ نہ اُن کی کوئی کھیتی باڑی ہے نہ کوئی جائداد و زمین، نہ یہ کسی کارخانے یا دفتر کے ملازم ہیں جہاں سے اپنا رزق حاصل کریں۔ خدا تعالیٰ کی کھلی زمین میں نکلتے ہیں اور سب کو پیٹ بھرائی رزق ملتا ہے۔ اور یہ ایک دن کا معاملہ نہیں جب تک وہ زندہ ہیں یہی سلسلہ جاری ہے۔

اس کے بعد کی آیات میں رزق کا اصلی ذریعہ بتلایا ہے جو حق تعالیٰ کی عطاء ہے، اور فرمایا ہے کہ خود ان منکروں کافروں سے سوال کرو کہ آسمان زمین کس نے پیدا کئے؟ اور شمس و قمر کس کے تابع فرمان چل رہے ہیں؟ بارش کون برساتا ہے؟ پھر اس بارش کے ذریعہ زمین سے نباتات کون اُگاتا ہے؟ تو مشرکین بھی اس کا اقرار کریں گے کہ یہ سب کام ایک ذات حق تعالیٰ ہی کا ہے۔ تو ان سے کہئے کہ پھر تم اللہ کے سوا دوسروں کی پوجا پاٹ اور ان کو اپنا کارساز کیسے سمجھتے ہو۔ اگلی آیات وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ سے آخر رکوع تک اسی کا بیان ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہجرت سے روکنے والی دوسری فکر معاش کی ہے، وہ بھی انسان کی بھول ہے۔ معاش کا مہیا کرنا اس کے یا اس کے جمع کردہ اسباب و سامان کے

قبضہ میں نہیں، وہ بلا واسطہ حق تعالیٰ کی عطا ہے۔ اسی نے اس وطن میں یہ سامان جمع فرما دیئے تھے وہ دوسری جگہ بھی سامانِ معاش دے سکتا ہے۔ اور بغیر کسی سامان کے بھی ضروریات معاش فراہم کر سکتا ہے۔ اس لئے یہ دوسرا خطرہ بھی ہجرت سے مانع نہ ہونا چاہئے۔

ہجرت کب فرض یا واجب ہوتی ہے۔ ہجرت کے معنے اور تعریف اور اس کے فضائل و برکات سورۂ نساء کی آیات نمبر ۹۷ تا ۱۰۰ میں اور شرعی احکام میں تبدیلی اسی سورت کی آیت نمبر ۸۹ کے تحت میں معارف القرآن کی جلد دوم صفحہ ۵۲۵ تا ۵۲۹ اور کچھ صفحہ ۵۱۰ میں بیان ہو چکے ہیں، ایک مضمون وہاں بیان کرنے سے رہ گیا تھا وہ یہاں لکھا جاتا ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بامر الٰہی مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی، اور سب مسلمانوں کو بشرطِ قدرت ہجرت کا حکم فرمایا اس وقت مکہ معظمہ سے ہجرت کرنا فرضِ عین تھا جس سے کوئی مرد و عورت مستثنیٰ نہیں تھا، بجز ان لوگوں کے جو ہجرت پر قدرت نہ رکھتے ہوں۔

اور اس زمانے میں ہجرت صرف فرض ہی نہیں، بلکہ مسلمان ہونے کی علامت اور شرط بھی سمجھی جاتی تھی، جو باوجود قدرت کے ہجرت نہ کرے، اس کو مسلمان نہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا تھا جو کفار کے ساتھ ہوتا ہے، جس کا بیان سورۂ نساء کی آیت نمبر ۸۹ میں ہے، حَتّٰی یُهَاجِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ اس وقت ہجرت کا مقام اسلام میں وہ تھا جو کلمۂ شہادت لا الٰہ الا اللہ کا ہے، کہ یہ شہادت خود بھی فرض ہے اور مسلمان ہونے کی شرط اور علامت بھی کہ جو شخص باوجود قدرت کے زبان سے ایمان کا اقرار اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت نہ دے اگرچہ دل میں یقین اور تصدیق رکھتا ہو وہ مسلمان نہیں سمجھا جاتا۔ عاجز جس کو اس کلمہ کے بولنے پر قدرت نہ ہو وہ مستثنیٰ ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کو ہجرت پر قدرت نہ تھی وہ مستثنیٰ سمجھے گئے جس کا ذکر سورۂ نساء کی آیت نمبر ۹۸ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ میں آیا ہے، اور جو لوگ باوجود ہجرت پر قادر ہونے کے مکہ میں مقیم رہے، ان کیلئے جہنم کی سخت وعید آیت نمبر ۹۷ ــــــ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (الی) فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ، میں مذکور ہے۔

جب مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تو ہجرت کا یہ حکم بھی منسوخ ہو گیا۔ کیونکہ اس وقت مکہ خود دارالاسلام بن گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت حکم جاری فرما دیا: لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ، یعنی فتح مکہ کے بعد مکہ سے ہجرت کرنے کی ضرورت

نہیں، مکہ مکرمہ سے ہجرت کا فرض ہونا پھر منسوخ ہونا قرآن و سنت کی نصوص سے ثابت ہوگیا، جو ایک واقعہ جزئیہ تھا۔ فقہاء امت نے اس واقعہ سے یہ مسائل مستنبط کئے:۔

مسئلہ: جس شہر یا ملک میں انسان کو اپنے دین پر قائم رہنے کی آزادی نہ ہو، وہ کفر و شرک یا احکام شرعیہ کی خلاف ورزی پر مجبور ہو وہاں سے ہجرت کر کے کسی دوسرے شہر یا ملک میں جہاں دین پر عمل کی آزادی ہو چلا جانا بشرطیکہ قدرت ہو واجب ہے، البتہ جس کو سفر پر قدرت نہ ہو یا کوئی ایسی جگہ میسر نہ ہو جہاں آزادی سے دین پر عمل کر سکے وہ شرعاً معذور ہے۔

مسئلہ: جس دار الکفر میں عام احکام دینیہ پر عمل کرنے کی آزادی ہو وہاں سے ہجرت فرض و واجب تو نہیں، مگر مستحب بہر حال ہے اور اس میں دار الکفر ہونا بھی ضروری نہیں، دار الفسق جہاں احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی اعلاناً ہوتی ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اگرچہ وہاں کے حکمران کے مسلمان ہونے کی بناء پر اس کو دار الاسلام کہا جاتا ہو۔

یہ تفصیل حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں تحریر فرمائی ہے اور قواعد حنفیہ میں کوئی چیز اس کے منافی نہیں۔ اور مسند احمد کی ایک روایت جو حضرت ابو یحییٰ مولیٰ زبیر ابن عوامؓ سے منقول ہے وہ بھی اس پر شاہد ہے، حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْبِلَادُ بِلَادُ اللّٰهِ وَالْعِبَادُ عِبَادُ اللّٰهِ حَيْثُمَا اَصَبْتَ خَيْرًا فَاَقِمْ (ابن کثیر)	"یعنی سب شہر اللہ کے شہر ہیں اور سب بندے اللہ کے بندے ہیں، اس لئے جس جگہ تمہارے لئے اسباب خیر جمع ہوں وہاں اقامت کرو۔"

اور ابن جریرؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت سعید بن جبیرؓ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ جس شہر میں معاصی اور فواحش عام ہوں اس کو چھوڑ دو۔ اور امام تفسیر حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ جب تمھیں کسی شہر میں معاصی کے لئے مجبور کیا جائے تو وہاں سے بھاگ کھڑے ہو۔ (ابن جریر طبری فی التفسیر)

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ

اور یہ دنیا کا جینا تو بس جی بہلانا اور کھیلنا ہے اور پچھلا گھر جو

الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾ فَاِذَا رَكِبُوْا فِی

ہے سو وہی ہے زندہ رہنا اگر ان کو سمجھ ہوتی، پھر جب سوار ہوئے

الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ

کشتی میں پکارنے لگے اللہ کو خالص اسی پر رکھ کر اعتقاد پھر جب بچا لایا ان کو

اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ لِیَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَیْنٰهُمْ ۚۙ

زمین کی طرف اسی وقت لگے شریک بنانے، تاکہ مکرتے رہیں ہمارے دیئے ہوئے سے

وَلِیَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا

اور مزے اڑاتے رہیں، سو عنقریب جان لیں گے، کیا نہیں دیکھتے کہ ہم نے رکھ دی ہے

حَرَمًا اٰمِنًا وَّیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ

پناہ کی جگہ امن کی، اور لوگ اُچکے جاتے ہیں ان کے آس پاس سے کیا جھوٹ پر یقین

یُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَكْفُرُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ

رکھتے ہیں اور اللہ کا احسان نہیں مانتے، اور اس سے زیادہ بے انصاف کون

افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَیْسَ

جو باندھے اللہ پر جھوٹ یا جھٹلائے سچی بات کو جب اس تک پہنچے، کیا دوزخ

فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِیْنَ ﴿۶۸﴾ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا

میں بسنے کی جگہ نہیں منکروں کے لئے، اور جنھوں نے محنت کی ہمارے واسطے ہم

لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۶۹﴾

سمجھا دیں گے ان کو اپنی راہیں، اور بیشک اللہ ساتھ ہے نیکی والوں کے۔

وقف لازم

ع ۷

خلاصۂ تفسیر

اور (وجہ ان کے غور نہ کرنے کی انہماک ہے مشاغل دنیا میں حالانکہ) یہ دنیوی زندگی (جس کے یہ تمام تر اشتغال ہیں فی نفسہٖ) بجز لہو و لعب کے اور کچھ بھی نہیں اور اصل زندگی عالم آخرت (کی) ہے (چنانچہ دنیا کے فانی ہونے اور آخرت کے باقی ہونے

سے یہ دونوں مضمون ظاہر ہیں پس فانی میں اس قدر انہماک کہ باقی کو بھول میں ڈال کر اس سے محروم ہو جائے خود یہ بے عقلی کی بات ہے) اگر ان کو اس کا کافی علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے (کہ فانی میں منہمک ہو کر باقی کو بھلا دیتے اور اس کے لئے سامان نہ کرتے بلکہ یہ لوگ دلائل میں غور کرتے ... اور ایمان لے آتے جیسا کہ خود ان کو یہ تسلیم ہے کہ تخلیق کائنات اور اس کے باقی رکھنے میں خدا کا کوئی شریک نہیں) پھر (جیسا کہ ان کے اس اقرار و تسلیم کا مقتضی ہے کہ خدائی اور عبادت میں اسی کو منفرد مانتے اور اس کا بھی کبھی اظہار و اقرار کرتے چنانچہ) جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں (اور وہ کشتی زیر و زبر ہونے لگتی ہے) تو (اس وقت) خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں (کہ لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ای الموحدین جس میں خدائی اختیارات اور معبودیت میں بھی توحید کا اقرار ہے، مگر یہ حالت بوجہ انہماک فی الدنیا کے دیرپا نہیں ہوتی، چنانچہ اس وقت تو سب قول و اقرار توحید کے ہو چکے ہیں مگر) پھر جب ان کو (اس آفت سے) نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو وہ فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے جو نعمت (نجات وغیرہ) ان کو دی ہے اس کی ناقدری کرتے ہیں اور یہ لوگ (عقائد شرکیہ و اعمال فسقیہ میں ہوائے نفسانی کا اتباع کر کے) چندے اور حظ حاصل کرلیں پھر قریب ہی ان کو سب خبر ہوئی جاتی ہے، (اور اب اس انہماک فی الدنیا کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آتا، سو ایک مانع تو ان کو توحید سے یہ انہماک ہے، اور دوسرا ایک اور نامعقول حیلۂ مانعہ نکالا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا یعنی اگر ہم مسلمان ہو جائیں تو ہمیں عرب کے لوگ مار دیں گے۔ حالانکہ مشاہدہ سے ان کو خود لغویت اس کی معلوم ہو سکتی ہے) کیا ان لوگوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ ہم نے (ان کے شہر مکہ کو) امن والا حرم بنایا ہے اور ان کے گرد و پیش (کے مقامات) میں (جو خارج حرم ہیں) لوگوں کو (مار دھاڑ کر ان کے گھروں سے) نکالا جا رہا ہے (بخلاف ان کے کہ امن سے بیٹھے ہیں اور یہ بات خود محسوسات میں تو یہ بہانے سے گذر کر محسوسات میں بھی خلاف کرتے اور خوف ہلاکت کو ایمان لانے میں عذر مانع بتاتے ہیں اور) پھر (وضوح حق کے بعد اس حماقت اور ضد کا) کیا (ٹھکانا ہے کہ) یہ لوگ جھوٹے معبود (وں) پر تو ایمان لاتے ہیں (جن پر ایمان لانے کا کوئی مقتضی نہیں اور موانع بہت سے ہیں) اور (اللہ (جن پر ایمان لانے کے بہت سے مقتضی اور دلائل صحیحہ ہیں اس کی) نعمتوں کی ناشکری (یعنی اللہ کے ساتھ شرک) کرتے ہیں (کیونکہ شرک سے بڑھ کر کوئی ناشکری نہیں کہ نعمت تخلیق و ترزیق و ابقاء و تدبیر وغیرہ تو وہ عطا فرماوے اور عبادت

جو کہ ان نعمتوں کا شکر ہے دوسرے کے لئے تجویز کی جاوے) اور (واقعی بات یہ ہے کہ) اس شخص سے زیادہ کون ناانصاف ہوگا جو (بلا دلیل) اللہ پر جھوٹ افترا کرے (کہ وہ شریک رکھتا ہے) اور جب سچی بات اس کے پاس (دلیل کے ساتھ) پہنچے وہ اس کو جھٹلا دے (بے انصافی ظاہر ہے کہ بلا دلیل بات کی تو تصدیق کرے اور دلیل والی بات کی تکذیب) کیا ایسے کافروں کا (جو اس قدر ناانصافی کریں) جہنم میں ٹھکانا نہ ہوگا (یعنی ضرور ہے۔ کیونکہ سزا مناسب جرم کے ہوتی ہے۔ پس جیسا جرم عظیم ہے ایسی ہی سزا بھی عظیم ہے۔ اوپر انکا حال تھا جو اہل کفر و نفس پرست ہوں) اور (اب انکے اضداد کا بیان ہے کہ) جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم انکو اپنے (قرب و ثواب یعنی جنت) کے راستے ضرور دکھادیں گے (جس سے وہ جنت میں جا پہنچیں گے کو قولہ تعالیٰ وقالوا الحمد للّٰہ الذی ہدانا الآیۃ) اور بیشک اللہ تعالیٰ (کی رضا و رحمت) ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں کفار و مشرکین کا یہ حال مذکور ہوا کہ آسمان و زمین کی پیدائش شمس و قمر کا نظام، بارش نازل کرنے اور اس سے نباتات اگانے کا سارا نظام یہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہونے پر یقین رکھتے ہیں اس میں کسی بت وغیرہ کی شرکت نہیں مانتے، مگر پھر بھی وہ خدائی میں بتوں کو شریک ٹھہراتے ہیں اسکی وجہ یہ کہ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (یعنی ان میں بکثرت لوگ وہ ہیں جو سمجھتے نہیں)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ مجنون دیوانے تو نہیں ہوشیار سمجھدار ہیں، دنیا کے بڑے بڑے کام خوب کرتے ہیں پھر ان کے بے سمجھ ہوجانے کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں یہ دیا گیا کہ ان کو دنیا اور اس کی مادی اور فانی لذات و خواہشات کی محبت نے آخرت اور انجام میں غور و فکر کرنے سے اندھا اور بے سمجھ بنا دیا ہے، حالانکہ یہ دنیا کی زندگی لہو و لعب یعنی وقت گذاری کا مشغلہ اور کھیل کے سوا کچھ نہیں، اور اصلی زندگی جو جاودانی ہے وہ آخرت کی زندگی ہے۔ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ، اس جگہ حیوان کا لفظ بمعنی حیات مصدری معنی میں ہے۔ (قرطبی)

اس میں حیات دنیا کو لہو و لعب فرمایا ہے، مطلب یہ ہے کہ جیسے کھیلوں کا کوئی ثبات و قرار نہیں اور کوئی بڑا مقصد ان سے حل نہیں ہوتا، تھوڑی دیر کے بعد سب تماشہ ختم ہوجاتا ہے یہی حال اس دنیا کا ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ان مشرکین کا ایک اور برا حال یہ بتلایا گیا کہ جیسے یہ لوگ تخلیق کائنات میں اللہ تعالیٰ کو منفرد ماننے کے باوجود اس جہالت کے شکار ہیں کہ بتوں کو خدائی کا ساجھی بناتے ہیں۔ اس سے زیادہ عجب یہ ہے کہ جب ان پر کوئی بڑی مصیبت

آپڑتی ہے تو اس مصیبت کے وقت بھی ان کو یہ یقین اور اقرار ہوتا ہے کہ اس میں کوئی بت ہمارا مددگار نہیں بن سکتا۔ مصیبت سے رہائی صرف اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔ اس کے لئے بطور مثال کے فرمایا کہ یہ لوگ جب دریا کے سفر میں ہوتے ہیں اور ڈوبنے کا خطرہ ہوتا ہے، تو اس خطرہ کو ٹالنے کے لئے کسی بت کو پکارنے کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کے مضطر اور بیقرار ہونے اور وقتی طور پر دنیا کے سارے سہاروں سے منقطع ہونے کی بنا پر ان کی دعا قبول کر کے ان کو دنیا کے مہلکہ سے نجات دے دیتا ہے۔ مگر یہ ظالم جب خشکی پر پہونچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں تو پھر بتوں کو خدا کا شریک کہنے لگتے ہیں۔ آیت فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ کا یہی مطلب ہے۔

فائدہ:۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کافر بھی جس وقت اپنے آپ کو بے سہارا جان کر صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے اور اس وقت یہ یقین کرتا ہے کہ خدا کے سوا مجھے اس مصیبت سے کوئی نہیں چھڑا سکتا، تو اللہ تعالیٰ کافر کی بھی دعا قبول فرما لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ مضطر ہے اور اللہ تعالیٰ نے مضطر کی دعا قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے (قرطبی وغیرہ)

اور ایک آیت میں جو یہ ارشاد آیا ہے وَمَا دُعَاءُ الْكٰفِرِيْنَ إِلَّا فِي ضَلٰلٍ یعنی کافروں کی دعا نا قابل قبول ہے، یہ حال آخرت کا ہے، کہ وہاں کافر عذاب سے رہائی کی دعا کریں گے تو قبول نہ ہوگی۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا الاٰیۃ۔ اوپر کی آیات میں مشرکین مکہ کی جاہلانہ حرکتوں کا ذکر تھا کہ سب چیزوں کا خالق و مالک خدا تعالیٰ کو یقین کرنے کے باوجود پتھر کے خود تراشیدہ بتوں کو اس کی خدائی کا شریک بناتے ہیں، اور صرف تخلیق کائنات ہی کا خدا تعالیٰ کو مالک نہیں سمجھتے بلکہ آڑے وقت میں مصیبت سے نجات دینا بھی اسی کے اختیار میں جانتے ہیں مگر نجات کے بعد پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کے کفر و شرک کا ایک عذر بعض مشرکین مکہ کی طرف سے یہ بھی پیش کیا جاتا تھا کہ ہم آپ کے دین کو تو حق و درست مانتے ہیں لیکن اس کی پیروی کرنے اور مسلمان ہو جانے میں ہم اپنی جانوں کا خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ سارا عرب اسلام کے خلاف ہے، ہم اگر مسلمان ہو گئے تو باقی عرب ہمیں اُچک لے جائیں گے اور مار ڈالیں گے (کما روی عن ابن عباسؓ، روح)

اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کا یہ عذر بھی لغو ہے۔ کیونکہ اہل مکہ کو تو حق تعالیٰ نے بیت اللہ کی وجہ سے وہ شرف اور بزرگی دی ہے جو دنیا میں کسی مقام کے لوگوں کو حاصل نہیں ہے۔ ہم نے مکہ کی پوری زمین کو حرم بنا دیا ہے۔ عرب کے باشندے

مؤمن ہوں یا کافر سب کے سب حرم کا احترام کرتے ہیں، اس میں قتل و قتال کو حرام سمجھتے ہیں، حرم میں انسان تو انسان وہاں کے شکار کو قتل کرنا اور وہاں کے درختوں کو کاٹنا بھی کوئی جائز نہیں سمجھتا، باہر کا کوئی آدمی حرم میں داخل ہو جائے تو وہ بھی قتل سے مامون ہو جاتا ہے۔ تو مکہ مکرمہ کے باشندوں کو اسلام قبول کرنے سے اپنی جانوں کا خطرہ بتلانا بھی ایک عذر لنگ ہے۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا، جہاد کے اصلی معنی دین میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے میں اپنی پوری توانائی صرف کرنے کے ہیں، اس میں وہ رکاوٹیں بھی داخل ہیں جو کفار و فجار کی طرف سے پیش آتی ہیں، کفار سے جنگ و مقاتلہ اس کی اعلیٰ فرد ہے، اور وہ رکاوٹیں بھی داخل ہیں جو اپنے نفس اور شیطان کی طرف سے پیش آتی ہیں۔

جہاد کی ان دونوں قسموں پر اس آیت میں یہ وعدہ ہے کہ ہم جہاد کرنے والوں کو اپنے راستوں کو ہدایت کر دیتے ہیں۔ یعنی جن مواقع میں خیر و شر یا حق و باطل یا نفع و ضرر میں التباس ہوتا ہے عقلمند انسان سوچتا ہے کہ کس راہ کو اختیار کروں، ایسے مواقع میں اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کو صحیح، سیدھی، بے خطر راہ بتا دیتے ہیں۔ یعنی ان کے قلوب کو اسی طرف پھیر دیتے ہیں جس میں ان کے لئے خیر و برکت ہو۔

علم پر عمل کرنے سے علم میں زیادتی

اور حضرت ابوالدرداءؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ کی طرف سے جو علم لوگوں کو دیا گیا ہے جو لوگ اپنے علم پر عمل کرنے میں جہاد کرتے ہیں ہم ان پر دوسرے علوم بھی منکشف کر دیتے ہیں جو اب تک حاصل نہیں۔ اور فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا کہ جو لوگ طلب علم میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کے لئے عمل بھی آسان کر دیتے ہیں۔ (مظہری) واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم ؏

تمت سورۃ العنکبوت

سُوۡرَةُ الرُّوۡمِ

سُوۡرَةُ الرُّوۡمِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتُّوۡنَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوۡعَاتٍ

سورۂ روم مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ساٹھ آیتیں ہیں اور چھ رکوع

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ۙ﴿۲﴾ فِيۡۤ اَدۡنَى الۡاَرۡضِ وَهُمۡ مِّنۡۢ

مغلوب ہوگئے ہیں رومی ، ملتے ہوئے ملک میں اور وہ اس مغلوب

بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ سَيَغۡلِبُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ فِيۡ بِضۡعِ سِنِيۡنَ ؕ لِلّٰهِ الۡاَمۡرُ

ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوں گے چند برسوں میں ، اللہ کے ہاتھ ہیں

مِنۡ قَبۡلُ وَمِنۡۢ بَعۡدُ ؕ وَيَوۡمَئِذٍ يَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۴﴾

سب کام پہلے اور پچھلے اور اس دن خوش ہوں گے مسلمان ،

بِنَصۡرِ اللّٰهِ ؕ يَنۡصُرُ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ۙ﴿۵﴾

اللہ کی مدد سے مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے اور وہی زبردست رحم والا ،

وَعۡدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخۡلِفُ اللّٰهُ وَعۡدَهٗ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ

اللہ کا وعدہ ہو چکا ، خلاف نہ کریگا اللہ اپنا وعدہ لیکن بہت لوگ

لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶﴾ يَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۖۚ

نہیں جانتے ، جانتے ہیں اوپر اوپر دنیا کے جینے کو

وَهُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَةِ هُمۡ غٰفِلُوۡنَ ﴿۷﴾

اور وہ لوگ آخرت کی خبر نہیں رکھتے ۔

خُلاصۂ تفسیر

الٓمّٓ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) اہل روم ایک قریب کے موقع میں (یعنی ارض روم کے ایسے مقام میں جو بہ نسبت فارس کے عرب سے قریب تر ہے، مراد اس سے اذرعات و بصرٰی ہے، جو ملک شام میں دو شہر ہیں۔ کذا فی القاموس، اور حکومت روم کے تحت میں ہونے سے ارض روم میں داخل ہیں۔ اس موقع پر اہل روم اہل فارس کے مقابلہ میں) مغلوب ہوگئے (جس سے مشرکین خوش ہوئے) اور وہ (رومی) اپنے (اس) مغلوب ہونے کے بعد عنقریب (اہل فارس پر دوسرے مقابلہ میں) تین سال سے لے کر نو سال کے اندر اندر غالب آجائیں گے (اور یہ مغلوب اور غالب ہونا سب خدا کی طرف سے ہے، کیونکہ مغلوب ہونے سے) پہلے بھی (اللہ ہی کو اختیار تھا جس سے مغلوب کر دیا تھا) اور (مغلوب ہونے سے) پیچھے بھی (اللہ ہی کو اختیار ہے جس سے غالب کر دے گا) اور اس روز (یعنی جب اہل روم غالب آئیں گے) مسلمان اللہ تعالیٰ کی اس امداد پر خوش ہوں گے (اس امداد سے یا تو یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے قول میں سچا اور غالب فرما دے گا۔ کیونکہ اس پیشینگوئی کو مسلمانوں نے کفار پر ظاہر کیا اور انھوں نے تکذیب کی تو اس کے وقوع سے مسلمانوں کی جیت ہو جائیگی۔ اور یا یہ مراد ہے کہ مسلمانوں کو مقابلہ میں بھی غالب کر دے گا۔ چنانچہ وہ وقت جنگِ بدر میں منصور ہونے کا تھا، اور بہر حال میں نصرت کا محل اہلِ اسلام ہی ہیں، اور مسلمانوں کی حالت ظاہری مغلوبیت کی دیکھ کر یہ بات مستبعد نہ سمجھی جاتے کہ یہ مغلوب مسلمان مقابلہ کے وقت کفار پر غالب آجائیں گے، کیونکہ نصرت اللہ کے قبضے میں ہے) وہ جس کو چاہے غالب کر دیتا ہے اور وہ زبردست ہے (کفار کو جب چاہے قولاً یا فعلاً مغلوب کرا دے اور) رحیم (بھی) ہے (مسلمانوں کو جب چاہے غالب کر دے) اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے (اور) اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو خلاف نہیں فرماتا (اس واسطے یہ پیشینگوئی ضرور واقع ہوگی) ولیکن اکثر لوگ (اللہ تعالیٰ کے تصرفات کو) نہیں جانتے (بلکہ صرف ظاہری اسباب کو دیکھ کر ان اسباب پر حکم لگا دیتے ہیں، اس لئے اس پیشینگوئی میں استبعاد کرتے ہیں حالانکہ مسبّب الاسباب اور مالکِ اسباب حق تعالیٰ ہے، اس کو اسباب بدلنا بھی آسان ہے اور اسباب کے خلاف مسبب کا واقع کرنا بھی آسان۔

اور جس طرح پیشینگوئی کے واقع ہونے سے پہلے اسباب ظاہرہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کرتے ہیں اسی طرح پیشین گوئی کو پورا ہوتا ہوا دیکھ کر بھی اس کو ایک اتفاقی

امر قرار دیتے ہیں، وعدۂ الٰہیہ کا ظہور نہیں سمجھتے اس لئے لفظ لَا يَعْلَمُوْنَ میں یہ دونوں چیزیں آگئیں ان لوگوں کا اللہ تعالیٰ اور نبوت سے غافل و جاہل رہنا اس سبب سے ہے کہ) یہ لوگ صرف دنیوی زندگانی کی ظاہر (حالت) کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے (بالکل ہی) بے خبر ہیں (کہ وہاں کیا ہوگا، اس لئے ان کو دنیا میں نہ اسباب عذاب سے بچنے کی فکر ہے نہ اسباب نجات ایمان اور عمل صالح کی تلاش ہے)۔

معارف و مسائل

قصہ نزولِ سورت روم اور فارس کی جنگ سورۂ عنکبوت اس آیت پر ختم ہوئی ہے جس میں حق تعالیٰ نے اپنے راستہ میں جہاد و مجاہدہ کرنے والوں کے لئے اپنے راستے کھول دینے اور ان کے لئے مقاصد میں کامیابی کی بشارت دی تھی۔ سورۂ رُوم کی ابتداء جس قصہ سے ہوئی ہے وہ اسی نصرتِ الٰہیہ کا ایک مظہر ہے، اس سورت میں جو واقعہ روم اور فارس کی جنگ کا مذکور ہے یہ دونوں کفار ہی تھے، ان میں سے کسی کی فتح کسی کی شکست بظاہر اسلام اور مسلمانوں کے لئے کوئی دلچسپی کی چیز نہیں، مگر ان دونوں کفار میں اہلِ فارس مشرکین آتش پرست تھے اور روم و نصاریٰ اہل کتاب۔ اور ظاہر ہے کہ دونوں قسم کے کفار میں اہلِ کتاب مسلمانوں سے نسبتاً قریب ہیں۔ کیونکہ بہت سے اصولِ دین آخرت پر ایمان، رسالت اور وحی پر ایمان، ان کے ساتھ قدر مشترک ہے۔ اسی قدر مشترک سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مکتوب میں کام لیا جو روم کے بادشاہ کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے بھیجا تھا کہ تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الآیۃ، اہلِ کتاب کے ساتھ مسلمانوں کا ایک گونہ قرب ہی اس کا سبب بنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام مکہ مکرمہ کے زمانہ میں فارس نے روم پر حملہ کیا۔ حافظ ابن حجر وغیرہ کے قول کے مطابق ان کی یہ جنگ ملکِ شام کے مقام اذرعات اور بصریٰ کے درمیان واقع ہوئی۔ اس جنگ کے دوران میں مشرکینِ مکہ یہ چاہتے تھے کہ فارس غالب آجائے، کیونکہ وہ بھی شرک و بت پرستی میں ان کے شریک تھے۔ اور مسلمان یہ چاہتے تھے کہ روم غالب آئیں، کیونکہ وہ دین و مذہب کے اعتبار سے اسلام کے قریب تھے۔ مگر ہوا یہ کہ اس وقت فارس روم پر غالب آگئے، یہاں تک کہ قسطنطنیہ بھی فتح کرلیا، اور وہاں اپنی عبادت کے لئے ایک آتشکدہ تعمیر کیا۔ اور یہ فتح کسریٰ پرویز کی آخری فتح تھی، اس کے بعد اس کا زوال شروع ہوا، اور پھر مسلمانوں کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہو لدا (از قرطبی)

اس واقعہ پر مشرکین مکہ نے خوشیاں منائیں اور مسلمانوں کو عار دلائی کہ تم جس کو چاہتے تھے وہ ہار گیا، اور جیسا کہ روم اہل کتاب کو بمقابلہ فارس شکست ہوئی ہمارے مقابلہ میں تم کو شکست ہوگی۔ اس سے مسلمانوں کو رنج ہوا (ابن جریر، ابن ابی حاتم)

قرآن میں سورۂ روم کی ابتدائی آیتیں اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئیں جن میں یہ پیشین گوئی اور بشارت دی گئی ہے کہ چند سال بعد پھر روم فارس پر غالب آجائیں گے۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے جب یہ آیات سنیں تو مکہ کے اطراف اور مشرکین کے مجامع اور بازار میں جا کر اس کا اعلان کیا کہ تمہارے خوش ہونے کا کوئی موقع نہیں۔ چند سال میں پھر روم فارس پر غالب آجائیں گے۔ مشرکین مکہ میں سے اُبی بن خلف نے مقابلہ کیا، اور کہنے لگا کہ تم جھوٹ بولتے ہو، ایسا نہیں ہو سکتا۔ صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ خدا کے دشمن تو ہی جھوٹا ہے، اور میں تو اس واقعہ پر شرط کرنے کو تیار ہوں کہ اگر تین سال کے اندر روم غالب آگئے تو دس اونٹنیاں میں تمہیں دوں گا اور وہ غالب آگئے تو دس اونٹنیاں تمہیں دینا پڑیں گی (یہ معاملہ قمار کا تھا مگر اس وقت قمار حرام نہیں تھا) یہ کہہ کر صدیق اکبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس واقعہ کا ذکر کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تو تین سال کی مدت متعین نہیں کی تھی۔ کیونکہ قرآن میں اس کے لئے لفظ بِضْعِ سِنِيْنَ مذکور ہے، جس کا اطلاق تین سے نو سال تک ہو سکتا ہے، تم جاؤ اور جس سے یہ معاہدہ ہوا ہے اس سے کہدو کہ میں دس اونٹنیوں کے بجائے سو کی شرط کرتا ہوں، مگر مدت تین سال کے بجائے نو سال اور بعض روایات کی رو سے سات سال) مقرر کرتا ہوں۔ صدیق اکبرؓ نے حکم کی تعمیل کی، اور اُبی بن خلف اس نئے معاہدہ پر راضی ہو گیا (ابن جریر بسندہ عن مجاہد وروی القصۃ الترمذی عن ابی سعید الخدری و دینار بن مکرم الاسلمی بتغیر یسیر)

روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے پانچ سال پہلے پیش آیا تھا، اور پورے سات سال ہونے پر غزوۂ بدر کے وقت روم دوبارہ فارس پر غالب آگئے اس وقت اُبی بن خلف مر چکا تھا، صدیق اکبرؓ نے اس کے وارثوں سے اپنی شرط کے مطابق سو اونٹنیوں کا مطالبہ کیا، انھوں نے اونٹنیاں دے دیں۔

بعض روایات میں ہے کہ ہجرت سے پہلے اُبی بن خلف کو جب اندیشہ ہوا کہ ابو بکرؓ بھی شاید ہجرت کر کے چلے جائیں تو اس نے کہا کہ میں آپ کو اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک آپ کوئی کفیل پیش نہ کریں، کہ میعاد معین تک روم غالب نہ آئے تو سو اونٹنیاں وہ مجھے دیدے گا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے صاحبزادے عبدالرحمٰن کو اس کا کفیل بنا دیا تھا۔

جب شرط کے مطابق صدیق اکبرؓ جیت گئے اور سو اونٹنیاں اُن کو ہاتھ آئیں تو وہ سب لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ان اونٹنیوں کو صدقہ کردو۔ اور ابو یعلی، ابن عساکر میں حضرت براء بن عازب کی روایت سے اس میں یہ الفاظ منقول ہیں ھٰذَا السُّحْتُ تَصَدَّقْ بِہٖ، یہ تو حرام ہے اس کو صدقہ کردو (روح المعانی)

مسئلہ قمار قمار یعنی جوا از روئے نصوص قرآن حرام قطعی ہے۔ ہجرت مدینہ کے بعد جس وقت شراب حرام کی گئی اسی کے ساتھ قمار بھی حرام کردیا گیا، اور اس کو شیطانی عمل قرار دیا۔ آیت اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ میں میسر اور ازلام جوے (قمار) ہی کی صورتیں ہیں جن کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

اور یہ دو طرفہ لین دین اور ہار جیت کی شرط جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اُبَیّ بن خلف کے ساتھ ٹھہرائی یہ بھی ایک قسم کا جوا اور قمار ہی تھا، مگر یہ واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے جب قمار حرام نہیں تھا۔ اس لئے اس واقعہ میں جب یہ قمار کا مال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو کوئی مال حرام نہیں تھا۔

اس لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپؐ نے اس کے صدقہ کردینے کا حکم کیوں فرمایا، خصوصاً دوسری روایت میں جو اس کے متعلق لفظ سُحت آیا ہے جس کے مشہور معنی حرام کے ہیں یہ کیسے درست ہوگا؟ اس کا جواب حضرات فقہاء نے یہ دیا ہے کہ یہ مال اگرچہ اس وقت حلال تھا مگر قمار کے ذریعہ اکتساب مال اس وقت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہ تھا، اس لئے صدیق اکبرؓ کی شان کے مناسب نہ سمجھ کر ان کو صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ اور یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے شراب حلال ہونے کے زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ نے کبھی استعمال نہیں فرمائی۔

اور لفظ سُحت جو بعض روایات میں آیا ہے اوّل تو اس روایت کو محدثین نے صحیح تسلیم نہیں کیا، اور اگر صحیح بھی مانا جائے تو یہ لفظ بھی کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے بمعنے حرام مشہور ہے، دوسرے معنی اس کے مکروہ و ناپسندیدہ کے بھی آتے ہیں۔ جیسا ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کَسْبُ الْحَجَّامِ سُحْتٌ یعنی پچھنے لگانے والے کی کمائی سحت ہے۔ یہاں جمہور فقہاء نے اس کے معنی ناپسندیدہ اور مکروہ کے لئے ہیں۔ اور امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں اور ابن اثیر نے نہایہ میں لفظ سحت کے یہ مختلف معانی محاورات عرب اور احادیث نبویہ سے ثابت کئے ہیں۔

حضرات فقہاء کا یہ کلام اس لئے بھی واجب القبول ہے کہ اگر واقع میں یہ مال حرام تھا تو شرعی اصول کے مطابق یہ مال اسی شخص کو واپس کرنا لازم تھا جس سے لیا گیا ہے، مالِ حرام کو صدقہ کرنے کا حکم صرف اُن صورتوں میں ہوتا ہے جبکہ اس کا مالک معلوم نہ ہو یا اس کو پہنچانا مشکل ہو، یا اس کو واپس کرنے میں کوئی اور شرعی قباحت ہو۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ، یعنی اس روز (جبکہ روم فارس پر غالب آئیں گے) مسلمان خوش ہوں گے اللہ کی مدد سے۔ نظمِ عبارت کے اعتبار سے ظاہر یہ ہے کہ یہاں نصر اور مدد سے رومیوں کی نصرت و امداد ہے، وہ اگرچہ کافر تھے مگر دوسر کے مقابل کافروں کے اعتبار سے کفر میں ہلکے تھے، اس لئے ان کی نصرت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا کوئی امر مستبعد نہیں، خصوصاً جبکہ ان کی نصرت سے مسلمانوں کو بھی خوشی حاصل ہو اور کفار کے مقابلہ میں ان کی جیت بھی ہو۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ نصرت سے مراد یہاں مسلمانوں کی نصرت ہو جو دو وجہ سے ہوسکتی ہے، اوّل تو یہی کہ مسلمانوں نے رومیوں کے غلبہ کو قرآن کی سچائی اور اسلام کی حقانیت کی دلیل بنا کر پیش کیا تھا، اس لئے رومیوں کا غلبہ درحقیقت مسلمانوں کی نصرت تھی، دوسری وجہ نصرتِ مسلمین کی یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس زمانے میں کفار کی بڑی طاقتیں بھی دو فارس اور روم تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو باہم بھڑا کر دونوں کو کمزور کر دیا، جو آئندہ مسلمانوں کی فتوحات کا پیش خیمہ بنی۔ کذا فی الروح)

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ یعنی یہ لوگ دنیا کی زندگی کے ایک پہلو کو تو خوب جانتے ہیں، کہ تجارت کس طرح کریں، کس مال کی کریں، کہاں سے خریدیں، کہاں بیچیں، اور کھیتی کس طرح کریں، کب بیج ڈالیں کب کاٹیں، تعمیرات کیسی کیسی بنائیں، سامانِ عیش و عشرت کیا کیا مہیا کریں۔ لیکن اسی حیاتِ دنیا کا دوسرا پہلو جو اس کی حقیقت اور اس کے اصلی مقصد کو واضح کرتا ہے کہ دنیا کا چند روزہ قیام درحقیقت ایک مسافرانہ قیام ہے، انسان یہاں کا مقامی آدمی (نیشنل) نہیں، بلکہ دوسرے ملک آخرت کا باشندہ ہے، یہاں کچھ مدت کے لئے ویزا پر آیا ہوا ہے، اس کا اصلی کام یہ ہے کہ اپنے اصلی وطن کے لئے یہاں سے سامانِ راحت فراہم کر کے وہاں بھیجے، اور وہ سامانِ راحت ایمان اور عمل صالح ہے، اس دوسرے رُخ سے بڑے بڑے عاقل کہلانے والے بالکل غافل اور جاہل ہیں۔

قرآن کریم کے الفاظ میں غور کیجئے کہ يَعْلَمُوْنَ کے ساتھ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

فرمایا ہے جس میں لفظ ظاہراً کو تنوین کے ساتھ نکرہ لاکر قواعد عربیت کی رُو سے اس طرف اشارہ ہے کہ درحقیقت یہ لوگ حیاتِ ظاہر کو بھی پورا نہیں جانتے، اس کے صرف ایک رُخ کو جانتے ہیں دوسرے رُخ سے غافل ہیں اور آخرت سے بالکل ہی غافل و جاہل ہیں۔

دنیا کے فنونِ معاش اگر آخرت سے غفلت کے ساتھ حاصل ہوں تو وہ کوئی دانشمندی نہیں

قرآن کریم اقوامِ دنیا کے عبرتناک قصوں سے بھرا ہوا ہے، جو مکاسبِ دنیا اور عیش و عشرت کے سامان جمع کرنے میں بڑے نام آور تھے، پھران کا انجام بد بھی دنیا ہی میں لوگوں کے سامنے آیا، اور آخرت کا دائمی عذاب ان کا حصہ بنا، اس لئے ان کو کوئی سمجھدار آدمی عقلاء یا حکماء نہیں کہہ سکتا۔ افسوس ہے کہ آجکل عقل و حکمت کا سارا انحصار اسی میں سمجھ لیا گیا ہے کہ جو شخص زیادہ سے زیادہ مال جمع کرے اور اپنی عیش و عشرت کا سامان سب سے بہتر بنالے وہ سب سے بڑا عقلمند کہلاتا ہے، اگرچہ اخلاقِ انسانیت سے بھی کورا ہو۔ عقل و شرع کی رُو سے اس کو عقلمند کہنا عقل کی توہین ہے، قرآن کریم کی زبان میں عقل والے صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ کو اور آخرت کو پہچانیں، اس کے لئے عمل کریں۔ دنیا کی ضروریات کو بقدرِ ضرورت رکھیں، اپنی زندگی کا مقصد نہ بنائیں۔ آیتِ قرآن اِنَّ فِیْ ...... لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا الآیۃ کا یہی مفہوم ہے۔

اَوَلَمْ یَتَفَكَّرُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ ۫ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ

کیا دھیان نہیں کرتے اپنے جی میں کہ اللہ نے جو بنائے آسمان

وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَاِنَّ

اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے سو ٹھیک سادھ کر اور وعدہ مقرر پر اور

كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝۸ اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا

بہت لوگ اپنے رب کا ملنا نہیں مانتے، کیا انھوں نے سیر نہیں کی

فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ

ملک کی جو دیکھیں انجام کیسا ہوا ان سے پہلوں کا،

كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَاۤ

ان سے زیادہ تھے زور میں اور جوتا انھوں نے زمین کو اور بسایا اس کو

أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ	
ان کے بسانے سے زیادہ اور پہنچے ان کے پاس رسول ان کے کھلے حکم لے کر سو اللہ نہ	
اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٩﴾ ثُمَّ	
تھا ان پر ظلم کرنے والا لیکن وہ اپنا آپ برا کرتے تھے ، پھر	
كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَاءُوا السُّوأَىٰ أَن كَذَّبُوا بِآيَاتِ	
ہوا انجام برا کرنے والوں کا برا اس واسطے کہ جھٹلاتے تھے اللہ کی	
اللَّهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِئُونَ ﴿١٠﴾	ع ۴
باتیں اور ان پر ٹھٹھے کرتے تھے ۔	

خلاصۂ تفسیر

کیا (دلائل وقوعِ آخرت کے سن کر بھی ان کی نظر دنیا ہی پر مقصور رہی اور) انھوں نے اپنے دلوں میں یہ غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان میں ہیں کسی حکمت ہی سے اور ایک میعاد معین (تک) کے لئے پیدا کیا ہے (جیسا اس نے آیات میں خبر دی ہے کہ ان حکمتوں میں سے ایک حکمت جزاء وسزا کی ہے۔ اور میعاد معین قیامت ہے۔ اگر اپنے دلوں میں غور کرتے تو ان واقعات کا امکان عقل سے اور ان کا وقوع نقل یعنی قرآن سے اور اس نقل کا صدق صفتِ اعجاز سے منکشف ہو جاتا، اور آخرت کے منکر نہ ہوتے، مگر غور نہ کرنے سے منکر ہو رہے ہیں)۔ اور (یہی کیا اور) بہت سے آدمی اپنے رب کے ملنے کے منکر ہیں کیا یہ لوگ (کبھی گھر سے نہیں نکلے اور) زمین میں چلے پھرے نہیں، جس میں دیکھتے بھالتے کہ جو (منکر) لوگ ان سے پہلے ہو گذرے ہیں ان کا (آخری) انجام کیا ہوا (کیفیت ان کی یہ تھی کہ) وہ ان سے قوت میں بڑھے ہوئے تھے اور انھوں نے زمین کو بھی (ان سے زیادہ) بویا تھا اور جتنا انھوں نے (سامان اور مکان سے) اس کو آباد کر رکھا ہے اس سے زیادہ انھوں نے اس کو آباد کیا تھا اور ان کے پاس بھی ان کے پیغمبر معجزے لے کر آئے تھے (جن کو انھوں نے نہیں مانا اور عذاب سے ہلاک ہوئے جن کی ہلاکت کے آثار ان کے ویران مکانات سے جو طریقِ شام میں ملتے ہیں نمودار ہیں) سو (اس ہلاکت میں) خدا تعالیٰ ایسا نہ تھا کہ ان پر

ظلم کرتا وہ تو خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے (کہ انکار پیغمبروں کا کر کے مستحق ہلاکت ہوئے یہ تو ان کی حالت دنیا میں ہوئی اور) پھر (آخرت میں) ایسے لوگوں کا انجام جنھوں نے (ایسا) بُرا کام (یعنی رسل کا انکار) کیا تھا بُرا ہی ہوا (محض) اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو (یعنی احکام و اخبار کو) جھٹلایا تھا اور (تکذیب سے بڑھ کر یہ کہ) ان کی ہنسی اڑاتے تھے (وہ انجام سزائے دوزخ ہے)۔

معارف و مسائل

مذکور الصدر دونوں آیتیں مضمون سابق کا تکملہ اور اس پر بطور شہادت کے ہیں کہ یہ لوگ دنیا کی چند روزہ چمک دمک اور فانی لذتوں میں ایسے مست ہو گئے کہ اس کارخانے کی حقیقت اور انجام سے بالکل غافل ہو گئے، اگر یہ خود بھی ذرا اپنے دل میں سوچتے اور غور کرتے تو ان پر یہ راز کائنات منکشف ہو جاتا کہ خالق کائنات نے یہ آسمان و زمین اور ان دونوں کے درمیان کی مخلوقات کو فضول اور بیکار پیدا نہیں کیا۔ ان کی تخلیق کا کوئی بڑا مقصد اور بڑی حکمت ہے، اور وہ یہی ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ان بے شمار نعمتوں کے ذریعہ ان کے پیدا کرنے والے کو بھی پہچانیں، اور اس کی تلاش میں لگ جائیں کہ وہ کن کاموں سے راضی ہوتا ہے کن سے ناراض، تاکہ اس کی رضا جوئی کا سامان کریں، اور ناراضی کے کاموں سے بچیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان دونوں قسموں کے کاموں کی کچھ جزاء و سزاء بھی ہونا ضروری ہے، ورنہ نیک و بد کو ایک ہی پلڑے میں رکھنا عدل و انصاف کے خلاف ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ دنیا دار الجزاء نہیں ہے جس میں انسان کو اس کے اچھے یا بُرے عمل کی پوری جزاء ضرور مل ہی جائے، بلکہ یہاں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جرائم پیشہ آدمی خوش خرم اور بامراد نظر آتا ہے، اور بُرے کاموں سے پرہیز کرنے والا مصائب اور تنگی کا شکار دیکھا جاتا ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ کوئی ایسا وقت آئے جب یہ سب کارخانہ ختم ہو اور اچھے بُرے اعمال کا حساب ہو، اور ان پر جزاء و سزا مرتب ہو، جس کا نام قیامت اور آخرت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ اگر غور و فکر کرتے تو یہی آسمان و زمین اور ان کی مخلوقات اس کی شہادت دے دیتیں کہ یہ چیزیں دائمی نہیں، کچھ مدت کے لئے ہیں، اور ان کے بعد دوسرا عالم آنے والا ہے جو دائمی ہوگا۔ مذکورہ دو آیتوں میں سے پہلی آیت کا یہی حاصل ہے اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ الآیۃ، یہ مضمون تو ایک عقلی استدلال کا ہے۔ اگلی آیت

میں دنیا کی محسوسات ومشاہدات اور تجربات کو اس کی شہادت میں پیش کیا گیا ہے، اور اہل مکہ کو خطاب کرکے فرمایا ہے کہ:

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ، یعنی یہ اہل مکہ تو ایک ایسی زمین کے باشندے ہیں جہاں نہ زراعت ہے نہ صنعت نہ تجارت کے مواقع اور نہ بلند وبالا حسین تعمیرات، مگر ملک شام اور یمن کے سفر ان لوگوں کو اپنے تجارتی مقاصد کے لئے پیش آتے ہیں۔ کیا ان سفروں میں ان لوگوں نے اپنے سے پہلی اقوام دنیا کے انجام کا مشاہدہ نہیں کیا جنکو اللہ تعالیٰ نے زمین میں بڑے بڑے تصرفات کرنے کا سلیقہ دیا تھا کہ زمین کو کھود کر اس سے پانی نکالنا اور اس سے باغات اور کھیتوں کو سیراب کرنا اور چھپے ہوئے معادن سے سونا چاندی اور دوسری قسم کی معدنی دھاتیں نکالنا اور ان سے انسانی فوائد کے لئے مختلف قسم کی مصنوعات تیار کرنا ان کا وظیفہ زندگی تھا اور یہ اپنے زمانے کی متمدن قومیں سمجھی جاتی تھیں۔ مگر انھوں نے اسی مادی اور فانی عیش وعشرت میں مست ہوکر اللہ کو اور آخرت کو بھلا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یاد دلانے کے لئے اپنے پیغمبر اور کتابیں بھیجیں، مگر انھوں نے کسی کی طرف التفات نہیں کیا، اور بالآخر دنیا میں بھی مبتلائے عذاب ہوئے۔ جس پر ان کی بستیوں کے ویران کھنڈرات اس وقت تک شہادت دے رہے ہیں۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ غور کرو کہ کیا اس عذاب میں ان پر اللہ کی طرف سے کوئی ظلم ہوا ہے یا انھوں نے خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ اسباب عذاب جمع کر لئے۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾

اللہ بناتا ہے پہلی بار پھر اس کو دہرائے گا پھر اسی کی طرف پھر جاؤ گے،

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَمْ يَكُنْ

اور جس دن برپا ہوگی قیامت آس توڑ کر رہ جائیں گے گنہگار، اور نہ ہوں گے

لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

ان کے شریکوں میں کوئی ان کے سفارش کرنے والے اور وہ ہو جائیں گے اپنے شریکوں سے منکر

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ

اور جس دن قائم ہوگی قیامت اس دن لوگ ہوں گے قسم قسم، سو جو لوگ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿۱۵﴾

یقین لائے اور کئے بھلے کام سو باغ میں ہوں گے ان کی آؤ بھگت ہوگی،

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ

اور جو منکر ہوئے اور جھٹلائیں ہماری باتیں اور ملنا پچھلے گھر کا

فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ

سو وہ عذاب میں پکڑے آئیں گے، سو پاک اللہ کی یاد کرو جب شام

تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ

کرو اور جب صبح کرو، اور اسی کی خوبی ہے آسمان میں

وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ يُخْرِجُ الْحَيَّ

اور زمین میں اور پچھلے وقت اور جب دوپہر ہو، نکالتا ہے زندہ کو

مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ

مُردے سے اور نکالتا ہے مُردہ کو زندہ سے اور زندہ کرتا ہے زمین کو

بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾

اس کے مرنے کے پیچھے، اور اسی طرح تم نکالے جاؤ گے

ع ۲ / ۵

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ خلق کو اوّل بار بھی پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ بھی اس کو پیدا کرے گا پھر (پیدا ہونے کے بعد) اس کے پاس (حساب کتاب کے لئے) لائے جاؤ گے اور جس روز قیامت قائم ہوگی (جس میں اعادہ مذکور ہونے والا ہے) اس روز مجرم (یعنی کافر) لوگ (بادِ پُرس کے وقت) حیرت زدہ رہ جائیں گے (یعنی کوئی معقول بات ان سے نہ بن پڑے گی) اور ان کے (تراشے ہوئے) شریکوں میں سے (جن کو شریکِ عبادت بناتے تھے) ان کا کوئی سفارشی نہ ہوگا اور (اس وقت خود) یہ لوگ (بھی) اپنے شریکوں سے منکر ہو جاویں گے (کہ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ) اور جس روز قیامت قائم ہوگی اس روز (علاوہ واقعہ مذکورہ کے ایک واقعہ یہ بھی ہوگا کہ مختلف طریقوں کے) سب آدمی جدا جدا ہو جاویں گے

یعنی جو لوگ ایمان لائے تھے اور انھوں نے اچھے کام کئے تھے وہ تو (بہشت کے) باغ میں مسرور ہوں گے، اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا، اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کے پیش آنے کو جھٹلایا تھا وہ لوگ عذاب میں گرفتار ہوں گے (یہ معنی ہیں جدا جدا ہونے کے، جب ایمان و عمل صالح کی فضیلت تم کو معلوم ہوگئی) سو تم اللہ کی تسبیح (اعتقاداً و قلباً بھی جس میں ایمان آگیا اور قولاً و لساناً بھی جس میں اقرار و دیگر اذکار آگئے اور عملاً و ارکاناً بھی جس میں تمام عبادتیں عموماً اور نماز خصوصاً آگئیں، غرض تم اللہ کی تسبیح ہر وقت کیا کرو (اور خصوصاً) شام کے وقت اور صبح کے وقت اور (اللہ کی تسبیح کرنے کا جو حکم ہوا ہے تو وہ واقع میں اس کا مستحق بھی ہے، کیونکہ) تمام آسمانوں اور زمین میں اسی کی حمد ہوتی ہو (یعنی آسمان میں فرشتے اور زمین میں بعض اختیاراً اور بعض اضطراراً اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ کقولہ تعالیٰ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ، پس جب وہ ایسا محمود الصفات کامل الذات ہے تو تم کو بھی ضرور اس کی تسبیح کرنی چاہئے) اور بعد زوال (بھی تسبیح کیا کرو) اور ظہر کے وقت (بھی تسبیح کیا کرو کہ یہ اوقات تجددِ نعمت و زیادت ظہور آثار قدرت کے ہیں ان میں تجدید تسبیح کی مناسب ہی بالخصوص نماز کے لئے یہی اوقات مقرر ہیں، چنانچہ مسا میں مغرب و عشاء آگئی اور عشی میں ظہر اور عصر دونوں داخل تھے، مگر ظہر صراحۃً مذکور ہے، اس لئے صرف عصر مراد رہ گئی، اور صبح بھی تصریحاً مذکور ہے، اور اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، کیونکہ اس کی ایسی قدرت ہے کہ) وہ جاندار کو بے جان سے باہر لاتا ہو اور بے جان کو جان دار سے باہر لاتا ہے (مثلاً نطفہ اور بیضہ سے انسان اور بچہ اور انسان اور پرندہ سے نطفہ اور بیضہ) اور زمین کو اس کے مردہ (یعنی خشک) ہونے کے بعد زندہ (یعنی تازہ و شاداب) کرتا ہے اور اسی طرح تم لوگ (قیامت کے روز) قبروں سے نکالے جاؤ گے۔

معارف و مسائل

فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ، يُحْبَرُوْنَ، حبور سے مشتق ہے، جس کے معنی سرور اور خوشی کے ہیں۔ اور اس لفظ کے عموم میں ہر طرح کا سرور داخل ہے جو نعمائے جنت سے اہل جنت کو حاصل ہوگا۔ قرآن کریم میں اس کو یہاں بھی عام رکھا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ یہ ارشاد ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ، یعنی کسی شخص کو دنیا میں معلوم نہیں کہ اس کے لئے جنت میں آنکھوں کی ٹھنڈک (اور راحت و سرور)

کے کیا کیا سامان جمع ہیں۔ بعض مفسرین نے جو خاص خاص سرور کی چیزوں کو اس آیت کے تحت میں ذکر کیا ہے وہ سب اسی اجمال میں داخل ہیں۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ، لفظ سُبْحٰنَ اللّٰهِ مصدر ہے، اس کا فعل محذوف ہے یعنی سَبِّحُوا اللّٰهَ سُبْحَانًا، حِيْنَ تُمْسُوْنَ، یعنی جب تم شام کے وقت میں داخل ہو، اور وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ، یعنی جب تم پر صبح کا وقت آئے، وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، یہ جملہ درمیان میں بطور دلیل کے لایا گیا ہے کہ صبح شام اللہ کی تسبیح اس لئے ضروری ہے کہ آسمان و زمین میں صرف وہی مستحق حمد ہے اور تمام آسمان و زمین والے اس کی حمد کرنے میں مشغول ہیں۔ اور جس طرح شروع آیت میں صبح شام کی تسبیح کا حکم ہے، آخر آیت میں عَشِيًّا اور حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ سے اور دو وقتوں میں تسبیح کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ایک وقت عشی جو دن کے آخری حصّہ کو کہا جاتا ہے، جو عصر کا وقت ہے۔ دوسرا وقت ظہر یعنی بعد زوالِ آفتاب کے۔

اور ترتیب بیان میں جس طرح شام کو صبح سے مقدم کر کے بیان کیا گیا ہے، اسی طرح دن کے آخری حصہ کو ظہر پر مقدم کر کے بیان کیا گیا ہے، شام یعنی رات کو مقدم کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اسلامی تاریخ میں رات مقدم ہوتی ہے، اور تاریخ غروب آفتاب سے بدلتی ہے۔ اور عشی یعنی وقتِ عصر کو ظہر سے مقدم کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عصر کا وقت عموماً کاروبار کی مشغولیت کا وقت ہوتا ہے، اس میں کوئی دعاء، تسبیح یا نماز عادۃً مشکل ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں صَلٰوۃِ وُسْطٰی جس کی تفسیر جمہور کے نزدیک نماز عصر ہے، اس کی خصوصی تاکید آئی ہے۔ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى۔

آیت مذکورہ کے الفاظ میں نماز یا صلوٰۃ کی تصریح نہیں۔ اس لئے ہر قسم کے ذکر اللہ قولی اور عملی کو شامل ہے، جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں بیان کیا گیا ہے۔ اور ذکر اللہ کی تمام اقسام میں چونکہ نماز سب سے اعلیٰ اور افضل ہے، اس لئے وہ اس میں بدرجۂ اولیٰ داخل ہے۔ اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں پانچوں نمازوں کا مع ان کے اوقات کے ذکر آ گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا قرآن میں پانچ نمازوں کا ذکر صریح ہے؟ تو فرمایا ہاں! اور استدلال میں یہی آیت پیش کر کے فرمایا کہ حِيْنَ تُمْسُوْنَ میں نماز مغرب اور حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ میں نماز فجر اور عَشِيًّا میں نماز عصر اور

حِیْنَ تُظْهِرُوْنَ میں نمازِ ظہر کا ذکر صریح موجود ہے۔ اب صرف ایک نمازِ عشاء رہی، اس کے ثبوت میں دوسری آیت کا جملہ ارشاد فرمایا مِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ۔

اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ حِیْنَ تُمْسُوْنَ میں نمازِ مغرب و عشاء دونوں داخل ہیں۔

فائدہ عظیمہ: یہ آیت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ دعاء ہے جس کی وجہ سے قرآن کریم نے ان کو وفاءِ عہد کا خطاب دیا ہے، ارشاد فرمایا وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤی، حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ کلمات صبح شام پڑھا کرتے تھے جیسا کہ اسانید صحیحہ کے ساتھ حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف وفاءِ عہد سے کرنے کا سبب اُن کی یہ دُعاء تھی۔

اور ابوداؤد، طبرانی، ابن سنی وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ، یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَیُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ، ان دو آیتوں کے متعلق فرمایا کہ جس شخص نے صبح کو یہ کلمات پڑھ لئے تو دن بھر میں اس کے عمل میں جو کوتاہی ہوگی وہ ان کلمات کی برکت سے پوری کر دی جائے گی، اور جس نے شام کے وقت یہ کلمات پڑھ لئے تو اس کے رات کے اعمال کی کوتاہی اس کے ذریعے پوری کر دی جائے گی (درمنثور)

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ کہ تم کو بنایا مٹی سے پھر اب تم انسان ہو

تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ

زمین میں پھیلے پڑے، اور اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ کہ بنا دیئے تمہارے واسطے تمہاری قسم سے

اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ

جوڑے کہ چین سے رہو ان کے پاس اور رکھا تمہارے بیچ میں پیار اور مہربانی، البتہ

فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ

اس میں بہت پتے کی باتیں ہیں ان کیلئے جو دھیان کرتے ہیں، اور اس کی نشانیوں میں سے ہے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ

آسمان اور زمین کا بنانا اور طرح طرح کی بولیاں تمہاری اور رنگ ،

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ﴿۲۲﴾ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ

اس میں بہت نشانیاں ہیں سمجھنے والوں کو ، اور اس کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا

بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ

سونا رات اور دن میں اور تلاش کرنا اس کے فضل سے اس میں بہت

لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ

پتے ہیں ان کو جو سنتے ہیں ، اور اس کی نشانیوں سے ہے یہ کہ دکھلاتا ہے تم کو بجلی

خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ

ڈر اور امید کے لئے اور اتارتا ہے آسمان سے پانی پھر زندہ کرتا ہے اس سے زمین کو

بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمِنْ

مر گئے پیچھے اس میں بہت پتے ہیں ان کے لئے جو سوچتے ہیں ، اور اس کی

اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ

نشانیوں سے یہ ہے کہ کھڑا ہے آسمان اور زمین اس کے حکم سے پھر جب پکارے گا تم کو

دَعْوَةً ۖۗ مِّنَ الْاَرْضِ ۖۗ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَلَهٗ مَنْ

ایک بار زمین میں سے اسی وقت تم نکل پڑو گے ، اور اسی کا ہے جو

فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَهُوَ الَّذِیْ

کوئی ہے آسمان اور زمین میں سب اس کے حکم کے تابع ہیں ، اور وہی ہے جو

یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ ؕ وَلَهُ الْمَثَلُ

پہلی بار بناتا ہے پھر اس کو دہرائے گا اور وہ آسان ہے اس پر اور اس کی شان

الْاَعْلٰی فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۷﴾ ع

سب سے اوپر ہے آسمان اور زمین میں اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا ۔

ع ۳ ۸ پارہ

خلاصۂ تفسیر

اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے ایک یہ (امر) ہے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا (یا تو اس طرح کہ آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے جو مشتمل تھے تمام ذریت پر اور یا اس طرح کہ نطفہ کی اصل غذا ہے اور اس کی اصل عناصر ہیں جن میں جزو غالب مٹی ہے) پھر تھوڑے ہی روز بعد (کیا ہوا کہ) تم آدمی بن کر (زمین پر) پھیلے ہوئے پھرتے (نظر آتے) ہو اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ (امر) ہے کہ اس نے تمہارے (فائدے کے) واسطے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں (اور وہ فائدہ یہ ہے کہ) تاکہ تم کو اُن کے پاس آرام ملے اور تم میاں بی بی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس (امر مذکور) میں (بھی) ان لوگوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں (کیونکہ استدلال کے لئے فکر کی ضرورت ہے اور نشانیاں جمع اس لئے فرمایا کہ امر مذکور کئی امر پر مشتمل ہے) اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا بنانا ہے اور تمہارے لب ولہجہ اور رنگتوں کا الگ الگ ہونا ہے (لب ولہجہ سے مراد یا لغات ہوں یا آواز وطرز گفتگو) اس (امر مذکور) میں (بھی) دانشمندوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں (یہاں بھی صیغۂ جمع لانے کی وہی توجیہ مذکور ہو سکتی ہے) اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے تمہارا سونا لیٹنا ہے رات میں اور دن میں (گو رات کو زیادہ اور دن کو کم ہو) اور اس کی روزی کو تمہارا تلاش کرنا ہے (دن کو زیادہ اور رات کو کم، اسی لئے دوسری آیات میں نیند کو رات کے ساتھ اور تلاشِ معاش کو دن کے ساتھ خاص کر کے بیان کیا گیا ہے) اس (امر مذکور) میں (بھی) ان لوگوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں جو (دلیل کو توجہ سے) سنتے ہیں اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ (امر) ہے کہ وہ تم کو (بارش کے وقت) بجلی (چمکتی ہوئی) دکھلاتا ہے جس سے (اس کے گرنے کا) ڈر بھی ہوتا ہے اور (اس سے بارش کی) امید بھی ہوتی ہے اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ (یعنی خشک) ہو جانے کے بعد زندہ (یعنی تر وتازہ) کر دیتا ہے اس (امر مذکور) میں (بھی) ان لوگوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں جو عقل (نافع) رکھتے ہیں) اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ (امر) ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم (یعنی ارادہ) سے قائم ہیں (اس میں بیان ہے کہ ان کے ابقاء کا، اور اوپر خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں ذکر تھا ان کی ابتداء آفرینش کا اور یہ تمام نظامِ عالم جو مذکور ہوا، یعنی تمہارا سلسلہ توالد وتناسل کا جاری ہونا اور

باہم ازدواج ہونا اور آسمان و زمین کا بہیئت کذائیہ موجود و قائم ہونا اور زبانوں اور رنگتوں کا اختلاف اور لیل و نہار کے انقلاب میں خاص مصلحتوں کا ہونا اور بارش کا نزول اور اس کے مبادی و آثار کا ظہور وہ سب اسی وقت تک باقی ہیں جب تک دنیا کو باقی رکھنا مقصود ہے اور ایک روز یہ سب ختم ہو جائے گا) پھر (اس وقت یہ ہوگا کہ) جب تم کو پکار کر زمین میں سے بلا دے گا تو تم یکبارگی نکل پڑو گے (اور دوسرا انتظام شروع ہو جائے گا جو مقصود مقام ہے) اور (اوپر دلائل قدرت سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ) جتنے (فرشتے اور انسان وغیرہ) آسمان اور زمین میں موجود ہیں سب اسی کے (مملوک) ہیں (اور) سب اسی کے تابع (یعنی مسخر قدرت) ہیں اور (اس ثبوت و اختصاص قدرت کاملہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ) وہی ہے جو اوّل بار پیدا کرتا ہے (چنانچہ یہ مخاطبین کے نزدیک بھی مسلّم تھا) پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا (جیسا کہ دلائل مذکورہ کے ساتھ خبر صادق کے مل جانے سے معلوم ہوا) اور یہ (دوبارہ پیدا کرنا) اس کے نزدیک (باعتبار مخاطبین کے بادی النظر کے بہ نسبت اوّل بار پیدا کرنے کے) زیادہ آسان ہے (جیسا قدرت بشریہ کے اعتبار سے عادت غالبہ یہی ہے کہ کسی چیز کو پہلی بار کے بنانے سے دوسری بار بنانا سہل تر ہوتا ہے) اور آسمان اور زمین میں اسی کی شان (سب سے) اعلیٰ ہے (یعنی نہ آسمانوں میں کوئی ایسا بڑا ہے اور نہ زمین میں کقولہ تعالیٰ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ) اور وہ زبردست (یعنی قادر مطلق اور) حکمت والا ہے (چنانچہ اوپر کے تصرفات سے قدرت اور حکمت دونوں ظاہر ہیں، پس وہ اپنی قدرت سے اعادہ کرے گا، اور اس اعادۂ تخلیق میں جتنا توقف ہو رہا ہے اس میں حکمت و مصلحت ہے، پس قدرت و حکمت کے ثبوت کے بعد فی الحال واقع نہ ہونے سے انکار کرنا جہل ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ روم کے شروع میں روم و فارس کی جنگ کا ایک واقعہ سنانے کے بعد منکرین اور کفار کی گمراہی اور حق بات کے سننے سمجھنے سے بے پروائی کا سبب ان کا صرف دنیا کی فانی زندگی کو اپنا مقصدِ حیات بنالینا اور آخرت کی طرف کوئی توجہ نہ دینا قرار دیا گیا تھا، اس کے بعد قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے اور حساب کتاب اور جزا و سزا کے واقع ہونے پر جو سطحی نظر والوں کو استبعاد ہو سکتا ہے، اس کا جواب مختلف پہلوؤں سے دیا گیا ہے، پہلے خود اپنے نفس میں غور و فکر کی پھر گرد و پیش میں گزرنے والی اقوام

کے حالات اور ان کے انجام میں نظر کرنے کی دعوت دی گئی۔ پھر حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ مطلقہ کا ذکر فرمایا جس میں اس کا کوئی سہیم و شریک نہیں، ان سب شواہد و دلائل کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مستحق عبادت صرف اس کی یکتا ذات کو قرار دیا جائے۔ اور اس نے جو اپنے انبیاء کے ذریعہ قیامت قائم ہونے اور تمام اوّلین و آخرین کے دوبارہ زندہ ہو کر حساب کتاب کے بعد جنت یا دوزخ میں جانے کی خبر دی ہے اس پر ایمان لایا جائے۔ مذکور الصدر آیات میں اسی قدرت کاملہ اور اس کے ساتھ حکمت بالغہ کے چھ مظاہر آیاتِ قدرت کے عنوان سے بیان فرمائے گئے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی بے مثال قدرت و حکمت کی نشانیاں ہیں۔

پہلی آیتِ قدرت: انسان جیسے اشرف المخلوقات اور حاکم کائنات کو مٹی سے پیدا کرنا ہے جو اس دنیا کے عناصر ترکیبیہ میں سب سے زیادہ ادنیٰ درجہ کا عنصر ہے جس میں حس و حرکت اور شعور و ادراک کا کوئی قسمہ نظر نہیں آتا، کیونکہ مشہور چار عناصر آگ، پانی، ہوا، اور مٹی، میں سے مٹی کے سوا اور سب عناصر میں کچھ نہ کچھ حرکت تو ہے مٹی اس سے بھی محروم ہے، قدرت نے تخلیق انسانی کے لئے اس کو منتخب فرمایا۔ ابلیس کی گمراہی کا سبب یہی بنا کہ اس نے آگ کے عنصر کو مٹی سے اشرف و اعلیٰ سمجھ کر تکبر اختیار کیا، اور یہ نہ سمجھا کہ شرافت اور بزرگی خالق و مالک کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے بڑا بنا سکتا ہے۔

اور انسان کی تخلیق کا مادہ مٹی ہونا حضرت آدم علیہ السلام کے اعتبار سے ظاہر ہی ہے۔ اور وہ چونکہ تمام بنی آدم کے وجود کی اصل بنیاد ہیں اس لئے دوسرے انسانوں کی تخلیق بالواسطہ اُن ہی کی طرف منسوب کرنا کچھ بعید نہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ عام انسان جو توالد و تناسل کے سلسلہ سے نطفہ کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی نطفہ جن اجزاء سے مرکب ہوتا ہے ان میں مٹی کا جزء غالب ہے۔

دوسری آیتِ قدرت: یہ ہے کہ انسان ہی کی جنس میں اللہ تعالیٰ نے عورتیں پیدا کر دیں جو مردوں کی بیبیاں بنیں، ایک ہی مادہ سے ایک ہی جگہ میں ایک ہی غذا سے پیدا ہونے والے بچوں میں یہ دو مختلف قسمیں پیدا فرما دیں جن کے اعضاء و جوارح، صورت و سیرت، عادات و اخلاق میں نمایاں تفاوت و امتیاز پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کمالِ قدرت و حکمت کے لئے یہ تخلیق ہی کافی نشانی ہے۔ اس کے بعد عورتوں کی اس خاص نوع کی تخلیق کی حکمت و مصلحت یہ بیان فرمائی لِتَسْكُنُوٓا اِلَيْهَا، یعنی ان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ تمہیں ان کے پاس پہونچ کر سکون ملے۔ مرد کی جتنی ضروریات عورت سے متعلق ہیں ان سب میں غور کیجئے تو سب کا حاصل سکونِ قلب اور راحت و

اطمینان نکلے گا، قرآن کریم نے ایک لفظ میں ان سب کو جمع فرما دیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ازدواجی زندگی کے تمام کار و بار کا خلاصہ سکون و راحتِ قلب ہی، جس گھر میں یہ موجود ہے وہ اپنی تخلیق کے مقصد میں کامیاب ہے، جہاں قلبی سکون نہ ہو اور رہا ہے سب کچھ ہو وہ ازدواجی زندگی کے لحاظ سے ناکام و نامراد ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ باہمی سکونِ قلب صرف اسی صورت سے ممکن ہے کہ مرد و عورت کے تعلق کی بنیاد شرعی نکاح اور ازدواج پر ہو، جن ممالک اور جن لوگوں نے اس کے خلاف کی حرام صورتوں کو رواج دیا اگر تفتیش کی جائے تو ان کی زندگی کو کہیں پر سکون نہ پائیں گے، جانوروں کی طرح وقتی خواہش پوری کر لینے کا نام سکون نہیں ہو سکتا۔

ازدواجی زندگی کا مقصد سکون ہی جس کے لئے باہمی الفت و محبت اور رحمت ضروری ہے

اس آیت نے مرد و عورت کی ازدواجی زندگی کا مقصد سکونِ قلب قرار دیا ہے، اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ طرفین ایک دوسرے کا حق پہچانیں اور ادا کریں، ورنہ حق طلبی کے جھگڑے خانگی سکون کو برباد کر دیں گے۔ اس ادائے حقوق کے لئے ایک صورت تو یہ تھی کہ اس کے قوانین بنا دینے اور احکام نافذ کر دینے پر اکتفا کیا جاتا، جیسے دوسرے لوگوں کے حقوق کے معاملہ میں ایسا ہی کیا گیا ہے، کہ ایک دوسرے کی حق تلفی کو حرام کر کے اس پر سخت وعیدیں سنائی گئیں سزائیں مقرر کی گئیں، ایثار و ہمدردی کی نصیحت کی گئی۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ صرف قانون کے ذریعہ کوئی قوم اعتدال پر نہیں لائی جا سکتی جب تک اس کے ساتھ خدا کا خوف نہ ہو، اسی لئے معاشرتی معاملات میں احکامِ شرعیہ کے ساتھ ساتھ پورے قرآن میں ہر جگہ اِتَّقُوا اللّٰهَ ، وَاخْشَوْا وغیرہ کے کلمات بطور تکملہ کے لائے گئے ہیں۔

مرد و عورت کے باہمی معاملات کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ ان کے حقوق باہمی پورے ادا کرانے پر نہ کوئی قانون حاوی ہو سکتا ہے نہ کوئی عدالت ان کا پورا انصاف کر سکتی ہے۔ اسی لئے خطبۂ نکاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی وہ آیات انتخاب فرمائی ہیں جن میں تقویٰ اور خوفِ خدا و آخرت کی تلقین ہے کہ وہی درحقیقت زوجین کے باہمی حقوق کا ضامن ہو سکتا ہے۔

اس پر ایک مزید انعام حق تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ازدواجی حقوق کو صرف شرعی اور قانونی نہیں رکھا بلکہ طبعی اور نفسانی بنا دیا۔ جس طرح ماں باپ اور اولاد کے باہمی حقوق کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ فرمایا، کہ ان کے قلوب میں فطرۃً ایک ایسی محبت پیدا فرما دی کہ ماں باپ اپنی جان سے زیادہ اولاد کی حفاظت کرنے پر مجبور ہیں۔ اور اسی

طرح اولاد کے قلوب میں بھی ایک فطری محبت ماں باپ کی رکھ دی گئی ہے۔ یہی معاملہ زوجین کے متعلق بھی فرمایا گیا۔ اس کے لئے ارشاد فرمایا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً، یعنی اللہ تعالیٰ نے زوجین کے درمیان صرف شرعی اور قانونی تعلق نہیں رکھا بلکہ ان کے دلوں میں مودّت اور رحمت پیوست کردی۔ وُدّ اور مَوَدَّت کے لفظی معنی چاہنے کے ہیں، جس کا ثمرہ محبت و الفت ہے۔ یہاں حق تعالیٰ نے دو لفظ اختیار فرمائے، ایک مودّت، دوسرے رحمت۔ ممکن ہے اس میں اشارہ اس طرف ہو کہ مودّت کا تعلق جوانی کے اس زمانے سے ہو جس میں طرفین کی خواہشات ایک دوسرے سے محبت و الفت پر مجبور کرتی ہیں، اور بڑھاپے میں جب یہ جذبات ختم ہو جاتے ہیں تو باہمی رحمت و ترحم طبعی ہو جاتا ہے، کذا ذکرہ القرطبی عن البعض،

اس کے بعد فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ، یعنی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں، یہاں ذکر تو ایک نشانی کا کیا گیا ہے اور اس کے آخر میں اس کو آیات اور نشانیاں فرمایا، وجہ یہ ہے کہ ازدواجی تعلق جس کا ذکر اس میں کیا گیا اس کے مختلف پہلوؤں پر اور ان سے حاصل ہونے والے دینی اور دنیوی فوائد پر نظر کی جائے تو یہ ایک نہیں بہت سی نشانیاں ہیں۔

تیسری آیت قدرت: آسمان و زمین کی تخلیق اور انسانوں کے مختلف طبقات کی زبانیں اور لب و لہجہ کا مختلف ہونا اور مختلف طبقات کے رنگوں میں امتیاز ہونا ہے، کہ بعض سفید ہیں بعض سیاہ بعض سرخ بعض زرد۔ اس میں آسمان و زمین کی تخلیق تو قدرت کا عظیم شاہکار ہے ہی، انسانوں کی زبانیں مختلف ہونا بھی ایک عجیب کرشمۂ قدرت ہے، زبانوں کے اختلاف میں لغات کا اختلاف بھی داخل ہے، عربی، فارسی، ہندی، ترکی، انگریزی وغیرہ کتنی مختلف زبانیں ہیں، جو مختلف خطوں میں رائج ہیں۔ اور ایک دوسرے سے بعض تو ایسی مختلف ہیں کہ کوئی باہمی ربط و مناسبت بھی معلوم نہیں ہوتی۔ اور اس اختلافِ السنہ میں لب و لہجہ کا اختلاف بھی شامل ہے کہ قدرتِ حق نے ہر فرد انسان مرد، عورت، بچے، بوڑھے کی آواز میں ایسا امتیاز پیدا فرمایا ہے کہ ایک فرد کی آواز کسی دوسرے فرد سے ایک صنف کی آواز دوسری صنف سے پوری طرح نہیں ملتی، کچھ نہ کچھ امتیاز ضرور رہتا ہے۔ حالانکہ اس آواز کے آلات زبان، ہونٹ، تالو، حلق، سب میں مشترک اور یکساں ہیں۔ تبارک اللہ احسن الخالقین۔

اسی طرح الوان کا اختلاف ہے۔ کہ ایک ہی ماں باپ سے ایک ہی قسم کے

حالات میں دو بچے مختلف رنگ کے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تو تخلیق و صنعت گری کا کمال تھا، آگے زبانیں اور لہجے مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کے رنگ مختلف ہونے میں کیا کیا حکمتیں مستور ہیں، ان کا بیان طویل ہے۔ اور بہت سی حکمتوں کا معمولی غور و فکر سے سمجھ لینا مشکل بھی نہیں۔

اس آیتِ قدرت میں متعدد چیزیں آسمان، زمین، اختلافِ اَلْسِنَہ، اختلافِ اَلْوَان، اور ان کے ضمن میں اور بہت سی قدرت و حکمت کی نشانیاں ہیں، اور وہ ایسی کھلی ہوئی ہیں کہ کسی مزید غور و فکر کی بھی ضرورت نہیں، ہر آنکھوں والا دیکھ سکتا ہے، اس لئے اس کے ختم پر ارشاد فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ، یعنی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں سمجھ رکھنے والوں کے لئے۔

چوتھی آیت قدرت: انسانوں کا سونا رات میں اور دن میں، اسی طرح ان کی تلاش معاش ہے رات میں اور دن میں۔ اس آیت میں تو نیند کو بھی دن رات دونوں میں بیان فرمایا ہے اور تلاشِ معاش کو بھی، اور بعض دوسری آیات میں نیند کو صرف رات میں اور تلاش معاش کو دن میں بتلایا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رات میں اصل کام نیند کا ہے، اور کچھ تلاش معاش کا بھی چلتا ہے، اور دن میں اس کے برعکس اصل کام تلاش معاش کا ہے، اور کچھ سونے آرام کرنے کا بھی وقت ملتا ہے۔ اس لئے دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں، بعض مفسرین نے تاویل کرکے اس آیت میں بھی نیند کو رات کے ساتھ اور تلاش معاش کو دن کے ساتھ مخصوص کیا ہے مگر اس کی ضرورت نہیں۔

سونا اور تلاش معاش زہد و توکل کے منافی نہیں اس آیت سے ثابت ہوا کہ سونے کے وقت سونا اور جاگنے کے وقت تلاش معاش انسان کی فطرت بنائی گئی ہے، اور ان دونوں چیزوں کا حاصل کرنا انسانی اسباب و کمالات کے تابع نہیں، بلکہ درحقیقت یہ دونوں چیزیں خاص عطاءِ حق ہیں۔ جیسا کہ رات دن کا مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات نیند اور آرام کے سارے بہتر سے بہتر سامان جمع ہونے کے باوجود نیند نہیں آتی، بعض اوقات ڈاکٹری گولیاں بھی نیند لانے میں فیل ہو جاتی ہیں، اور جس کو مالک چاہتا ہے کھلی زمین پر دھوپ اور گرمی میں نیند عطا فرما دیتا ہے۔

یہی حال تحصیل معاش کا رات دن مشاہدہ میں آتا ہے کہ دو شخص یکساں علم و عقل والے برابر کے مال والے، برابر کی محنت والے تحصیلِ معاش کا یکساں ہی کام لے کر بیٹھتے ہیں ایک ترقی کر جاتا ہے دوسرا رہ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو عالمِ اسباب بڑی حکمت و مصلحت سے بنایا ہے۔ اس لئے تلاشِ معاش اسباب ہی کے ذریعہ کرنا

لازم ہے مگر عقل کا کام یہ ہے کہ حقیقت شناسی سے دور نہ ہو ان اسباب کو اسباب ہی سمجھے اور اصل رازق اسباب کے بنانے والے کو سمجھے۔

اس آیتِ قدرت کے ختم پر ارشاد فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ یعنی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو بات کو دھیان دے کر سنتے ہیں" اس میں سننے پر مدار رکھنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ دیکھنے میں تو نیند خود بخود آجاتی ہے جب آدمی ذرا آرام کی جگہ کر کے لیٹ جائے۔ اسی طرح معاش کا حصول محنت مزدوری تجارت وغیرہ سے ہوجاتا ہے۔ اس لئے دستِ قدرت کی کارسازی ظاہری نظروں سے مخفی رہتی ہے، وہ اللہ کا پیام لانے والے انبیاء بتلاتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ یہ نشانیاں انہی کو کارآمد ہوتی ہیں جو بات کو دھیان دے کر سنیں، اور جب سمجھ میں آجائے تو تسلیم کرلیں، ہٹ دھرمی اور ضد نہ کریں۔

پانچویں آیت قدرت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو بجلی کا کوندنا دکھاتے ہیں جس میں اس کے گرنے اور نقصان پہونچانے کا خطرہ بھی ہوتا ہے، اور اس کے پیچھے بارش کی امید بھی اور پھر بارش نازل فرماتے ہیں۔ اور اس خشک بے جان زمین کو زندہ تر و تازہ کر کے اس میں طرح طرح کے درخت اور پھل پھول اگاتے ہیں۔ اس کے آخر میں فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ، یعنی اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے، کیونکہ برق و باراں اور ان کے ذریعہ حاصل ہونے والی نباتات اور ان کے پھل پھول کی تخلیق منجانب اللہ ہونا یہ عقل و حکمت ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

چھٹی آیت قدرت یہ ہے کہ آسمان و زمین کا قیام اللہ ہی کے امر سے ہے، اور جب اس کا امر یہ ہوگا کہ یہ نظام توڑ پھوڑ دیا جائے تو یہ سب مضبوط مستحکم چیزیں جن میں ہزاروں سال چل کر بھی کہیں کوئی نقصان یا خلل نہیں آتا، دم کے دم میں ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہوجائیں گی، اور پھر اللہ تعالیٰ ہی کے امر سے دوبارہ سب مُردے زندہ ہو کر میدانِ حشر میں جمع ہوجائیں گے۔

یہ چھٹی آیت قدرت درحقیقت پہلی سب آیات کا ماحصل اور مقصد ہے، اسی کے سمجھانے کے لئے اس سے پہلی پانچ آیتیں بیان فرمائی ہیں، اور اس کے بعد کئی آیات تک اسی مضمون کا ذکر فرمایا ہے۔

لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى، لفظ مَثَل بفتح میم و ثاء، ہر ایسی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو دوسرے سے کچھ مماثلت اور مناسبت رکھتی ہو بالکل اس جیسی ہونا اس کے مفہوم میں

داخل نہیں، اسی لئے حق تعالیٰ کے لئے مثل ہونا تو قرآن میں کئی جگہ آیا ہے، ایک جگہ نہیں، دوسرے فرمایا مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ، لیکن مثل اور مثال سے حق تعالیٰ کی ذات پاک اور وراء الوراء ہے۔ واللہ اعلم

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ

بتلائی تم کو ایک مثل تمہارے اندر سے دیکھو جو تمہارے ہاتھ کے مال ہیں

اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ

ان میں ہیں کوئی ساجھی تمہارے ہماری دی ہوئی روزی میں کہ تم سب اس میں برابر ہو

تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

خطرہ رکھو ان کا جیسے خطرہ رکھو اپنوں کا، یوں کھول کر بیان کرتے ہیں ہم نشانیاں

لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ

ان لوگوں کے لئے جو سمجھتے ہیں، بلکہ چلتے ہیں یہ بے انصاف اپنی خواہشوں پر

بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا لَهُمْ مِّنْ

بن سمجھے، سو کون سمجھائے جس کو اللہ نے بھٹکایا، اور کوئی نہیں اُن کا

نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ

مددگار، سو تو سیدھا رکھ اپنا منہ دین پر ایک طرف کا ہو کر وہی تراش اللہ کی

الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ

جس پر تراشا لوگوں کو بدلنا نہیں اللہ کے بنائے ہوئے کو یہی ہے

الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

دین سیدھا، ولیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے،

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا

سب رجوع ہو کر اس کی طرف اور اس سے ڈرتے رہو اور قائم رکھو نماز اور مت ہو

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ

شرک کرنے والوں میں، جنھوں نے کہ پھوٹ ڈالی اپنے دین میں اور ہوگئے ان میں بہت فرقے

كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ

ہر فرقہ جو اس کے پاس ہو اس پر غش ہے، اور جب پہنچے لوگوں کو کچھ سختی

دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً

تو پکاریں اپنے رب کو اس کی طرف رجوع ہو کر پھر جہاں چکھائی ان کو اپنی طرف سے کچھ مہربانی

اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ

اسی وقت ایک جماعت ان میں اپنے رب کا شریک لگی بتانے، کہ منکر ہو جائیں ہمارے دیئے ہوئے سے

فَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا

سو مزے اڑا لو اب آگے جان لوگے، کیا ہم نے ان پر اتاری ہے کوئی سند

فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ

سو وہ بول رہی ہے جو یہ شریک بتاتے ہیں، اور جب چکھائیں ہم لوگوں کو

رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ

کچھ مہربانی اس پر پھولے نہیں سماتے، اور اگر آپڑے اُن پر کچھ برائی اپنے ہاتھوں کے

اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ

بھیجے ہوئے پر تو آس توڑ بیٹھیں، کیا نہیں دیکھ چکے کہ اللہ پھیلا دیتا ہے

الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

روزی جس پر چاہے اور ماپ کر دیتا ہے جس کو چاہے اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کو

يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ

جو یقین رکھتے ہیں، سو تو دے قرابت والے کو اس کا حق اور محتاج کو اور

السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ؗ وَ

مسافر کو، یہ بہتر ہے اُن کے لئے جو چاہتے ہیں اللہ کا منہ اور

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٣٨﴾ وَمَا آتَيْتُم مِّن رِّبًا لِّيَرْبُوَ فِي

وہی ہیں جن کا بھلا ہے ، اور جو دیتے ہو بیاج پر کہ بڑھتا رہے لوگوں

أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُو عِندَ اللَّهِ ۖ وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ

کے مال میں سو وہ نہیں بڑھتا اللہ کے یہاں اور جو دیتے ہو پاک دل سے

تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ ﴿٣٩﴾ اللَّهُ

چاہ کر رضامندی اللہ کی سو یہ وہی ہیں جن کے دُونے ہوئے ، اللہ

الَّذِي خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ۖ

وہی ہے جس نے تم کو بنایا پھر تم کو روزی دی پھر تم کو مارتا ہے پھر تم کو جلائے گا ،

هَلْ مِن شُرَكَائِكُم مَّن يَفْعَلُ مِن ذَٰلِكُم مِّن شَيْءٍ ۚ سُبْحَانَهُ

کوئی ہے تمہارے شریکوں میں جو کر سکے ان کاموں میں سے ایک کام وہ نرالا ہے

وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٤٠﴾

اور بہت اوپر ہے اس سے کہ شریک بتلاتے ہیں۔

ع ۴

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ (شرک کو مذموم و باطل ثابت کرنے کے لئے) تم سے ایک مضمون عجیب تمہارے ہی حالات میں سے بیان فرماتے ہیں (وہ یہ کہ غور کرو) کیا تمہارے غلاموں میں کوئی شخص تمہارا اس مال میں جو ہم نے تم کو دیا ہے شریک ہے کہ تم اور وہ (باعتبار اختیارات کے) اس میں برابر ہوں جن کا تم (تصرفات کے وقت) ایسا خیال کرتے ہو جیسا اپنے آپس (کے شریک وسہیم آزاد خود مختار کا) خیال کیا کرتے ہو (اور ان سے اجازت لے کر تصرفات کیا کرتے ہو یا کم از کم اندیشۂ مخالفت ہی ان سے رہتا ہے، اور ظاہر ہے کہ غلام اس طرح شریک نہیں ہوتا۔ پس جب تمہارا غلام جو نوع بشر اور بہت سی چیزوں میں تمہارا شریک ہے اور تمہیں جیسا ہے، فرق صرف ایک چیز میں ہے کہ تم مال و دولت کے مالک ہو وہ نہیں اس کے باوجود جب وہ تمہارے خاص حق تصرف میں تمہارا شریک نہیں ہو سکتا تو تمہارے قرار دیئے ہوئے معبودات باطلہ جو کہ حق تعالیٰ کے غلام ہیں اور کسی کمال ذاتی یا وصفی میں

خدا تعالیٰ کے مماثل نہیں، بلکہ بعض تو ان میں سے مخلوقاتِ الٰہیہ کے مصنوع ہیں۔ یہ معبود دین حق تعالیٰ کے خاص حق معبودیت میں کس طرح اس کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں اور ہم نے جس طرح یہ دلیل شافی کافی بطلانِ شرک کی بیان فرمائی، ہم اسی طرح سمجھداروں کے لئے دلائل صاف صاف بیان کرتے رہتے ہیں (اور مقتضا یہ تھا کہ وہ لوگ حق کا اتباع اختیار کر لیتے اور شرک چھوڑ دیتے مگر وہ حق کا اتباع نہیں کرتے) بلکہ ان ظالموں نے بلا کسی صحیح) دلیل (کے محض اپنے خیالات (فاسدہ) کا اتباع کر رکھا ہے سو جس کو (اس کی ہٹ دھرمی اور عناد و اصرار علی الباطل کی وجہ سے) خدا (ہی) گمراہ کرے اس کو کون راہ پر لاوے (اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ معذور ہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ آپ غم نہ کریں آپ کا جو کام تھا وہ آپ کر چکے، اور جب ان گمراہوں کو عذاب ہونے لگے گا تو) ان کا کوئی حامی نہ ہوگا اور جب اوپر کے مضمون سے توحید کی حقیقت واضح ہوگئی) تو (مخاطبین میں سے ہر ہر شخص سے کہا جاتا ہے کہ) تم (ادیان باطلہ سے) یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین (حق) کی طرف رکھو اور سب) اللہ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو جس (قابلیت) پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے (مطلب فطرۃ اللہ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں خلقۃً یہ استعداد رکھی ہے کہ اگر حق کو سننا اور سمجھنا چاہے تو وہ سمجھ میں آجاتا ہے، اور اس کے اتباع کا مطلب یہ ہے کہ اس استعداد اور قابلیت سے کام لے، اور اس کے مقتضا پر عمل کرے غرض اس فطرت کا اتباع چاہئے اور) اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے بدلنا نہ چاہئے پس سیدھا (رستہ) دین (کا) یہی ہے لیکن اکثر لوگ (اس کو بوجہ عدم تدبر کے) نہیں جانتے (اس لئے اس کا اتباع نہیں کرتے غرض) تم خدا کی طرف رجوع ہو کر (فطرتِ الٰہیہ کا اتباع کرو اور اس (کی مخالفت اور مخالفت کے عذاب) سے ڈرو اور (اسلام قبول کر کے) نماز کی پابندی کرو (جو توحید کا عملی اظہار ہے) اور شرک کرنے والوں میں سے مت رہو، جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا (یعنی حق تو یہ ایک تھا اور باطل بہت ہیں انھوں نے حق کو چھوڑ دیا اور باطل کی مختلف راہیں اختیار کر لیں، یہ ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے کہ ایک نے ایک راہ لے لی دوسرے نے دوسری) اور بہت سے (مختلف) گروہ ہوگئے (اور اگر حق پر رہتے تو ایک گروہ ہوتے اور باوجود اس کے کہ ان حق کے چھوڑنے والوں میں سب کے طریقے باطل ہیں، مگر پھر بھی غایت جہل سے ان میں) ہر گروہ اپنے اس طریقے پر نازاں ہیں جو ان کے پاس ہے اور (جس توحید کی طرف ہم بلاتے ہیں باوجود اس کے انکار اور خلاف کرنے کے اضطرار کے وقت عام طور پر

لوگوں کے حال و قال سے اس کا اظہار و اقرار بھی ہونے لگتا ہے جس سے مضمون توحید کے فطری ہونے کی بھی تائید ہوتی ہے، چنانچہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ) جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہونچتی ہے (اس وقت بے قرار ہوکر) اپنے رب (حقیقی) کو اسی کی طرف رجوع ہوکر پکارنے لگتے ہیں (اور سب معبودین کو چھوڑ دیتے ہیں مگر) پھر (قریب ہی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ) جب اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے کچھ عنایت کا مزہ چکھا دیتا ہے تو بس ان میں سے بعض لوگ (پھر) اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے جو (آرام و عیش) ان کو دیا ہے اس کی ناشکری کرتے ہیں (جو عقلاً بھی قبیح ہے) سو (خیر) چند روز اور حظ حاصل کرلو پھر جلدی تم (حقیقت) معلوم کرلو گے (اور یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں خصوصاً اقرار توحید کے بعد تو ان سے کوئی پوچھے کہ اس کی کیا وجہ ہے) کیا ہم نے ان پر کوئی سند (یعنی کوئی کتاب) نازل کی ہے کہ وہ ان کو خدا کے ساتھ شرک کرنے کو کہہ رہی ہو (یعنی ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نقلی بھی نہیں، اور مقتضائے بداہت عقل کے خلاف ہونا خود ان کی تسلیم سے حالت اضطرار میں ظاہر ہو جاتا ہے، پس سرتاسر باطل ٹھہرا) اور (آگے مضمون بالا کا تتمہ ہے اور وہ یہ کہ) ہم جب (ان) لوگوں کو کچھ عنایت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو وہ اس سے (اس طرح) خوش ہوتے ہیں (کہ خوشی میں مست ہوکر شرک کرنے لگتے ہیں جیسا اوپر ذکر آیا) اور اگر ان کے اعمال (بد) کے بدلے میں جو پہلے اپنے ہاتھوں کرچکے ہیں ان پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو بس وہ لوگ ناامید ہو جاتے ہیں (اس مقام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تتمہ میں اصل مقصود پہلا جملہ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ ہے کہ اس میں ان کے مبتلائے شرک ہونے کا سبب بدمست اور غافل ہونا مذکور ہے، دوسرا جملہ محض تقابل کی مناسبت سے ذکر کر دیا ہے۔ کیونکہ ان دونوں حالتوں میں اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے بہت کم اور ضعیف ہے، ذرا ذرا سی چیز اس تعلق کو فراموش کر دیتی ہے۔ آگے اسی کی دوسری دلیل ہے کہ یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں تو) کیا ان کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے زیادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہے کم دیتا ہے (اور مشرکین کے نزدیک یہ مسلم بھی تھا کہ روزی کا گھٹانا بڑھانا اصل میں خدا ہی کا کام ہے، لقولہٖ تعالیٰ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ) اس (امر) میں (بھی توحید کی) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں (یعنی وہ سمجھتے ہیں اور دوسرے بھی سمجھ سکتے ہیں کیونکہ جو شخص ایسا قادر ہوگا مستحق عبادت کا وہی ہوگا) پھر (جب دلائل توحید میں معلوم ہوا کہ رزق میں

بسط وقبض اللہ ہی کی طرف سے ہے تو اس سے ایک بات اور بھی ثابت ہوئی کہ بخل کرنا مذموم ہے، کیونکہ بخل کرنے سے جتنا رزق مقدر ہے اس سے زیادہ نہیں مل سکتا، اس لئے نیک کاموں میں خرچ کرنے سے بخل نہ کیا کر بلکہ) قرابت دار کو اس کا حق دیا کر اور (اسی طرح مسکین اور مسافر کو بھی (ان کے حقوق دیا کر جن کی تفصیل دلائل شرعیہ سے معلوم ہے) یہ ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور (ہم نے جو یہ قید لگائی کہ یہ مضمون بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی رضا کے طلب گار ہوں، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے نزدیک مطلق مال خرچ کر دینا موجب فلاح نہیں ہے بلکہ اس کا قانون یہ ہے کہ) جو چیز تم (دنیا کی غرض سے خرچ کرو گے مثلاً کوئی چیز) اس غرض سے کسی کو) دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں (شامل ہو کر یعنی ان کے ملک و قبضہ میں) پہونچ کر (تمہارے لئے) زیادہ ہو (کر آ) جاوے (جیسا نوتہ وغیرہ رسوم دنیویہ میں اکثر اسی غرض سے دیا جاتا ہے کہ یہ شخص ہمارے موقع پر کچھ اور زائد شامل کرکے دے گا) تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا (کیونکہ خدا کے نزدیک پہونچنا اور بڑھنا اس مال کے ساتھ خاص ہے جو اللہ کی خوشنودی کے لئے خرچ کیا جاوے جیسا آگے آتا ہے، اور حدیث میں بھی ہے کہ ایک تمرہ مقبولہ اُحُد پہاڑ سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے، اور اُس میں نیت تھی نہیں، لہٰذا نہ مقبول ہوا نہ زائد ہوا) اور جو زکوٰۃ (وغیرہ) دو گے جس سے اللہ کی رضا طلب کرتے ہو گے تو ایسے لوگ (اپنے دیئے ہوئے کو) خدا تعالیٰ کے پاس بڑھاتے رہیں گے (جیسا ابھی حدیث کا مضمون گذرا اور یہ مضمون اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت رزاق پر دلالت کرنے کی وجہ سے توحید کی تاکید کا ذریعہ ہے اس لئے یہ تبعاً آگیا، اصل مقصود توحید کا بیان ہے، اسی لئے آگے پھر اسی توحید کا ذکر ہے)۔

اللہ ہی وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو رزق دیا پھر تم کو موت دیتا ہے پھر (قیامت میں) تم کو جلائے گا (ان میں بعض امور تو مخاطبین کے اقرار سے ثابت ہیں، اور بعض دلائل سے، غرض کہ وہ ایسا قادر ہے، اب یہ بتلاؤ کہ) کہ تمہارے شرکا میں بھی کوئی ایسا ہے جو ان کاموں میں سے کچھ بھی کر سکے (اور ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں، اس لئے ثابت ہوا کہ) وہ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے (یعنی اس کا کوئی شریک نہیں)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں مضمون توحید کو مختلف شواہد اور دلائل اور مختلف عنوانات میں بتلایا گیا ہے جو ہر انسان کے دل میں اُتر جائے۔ پہلے ایک مثال سے سمجھایا کہ تمہارے غلام نوکر جو تمہارے ہی جیسے انسان ہیں شکل وصورت، ہاتھ پاؤں مقتضیاتِ طبعیہ سب چیزوں میں تمہارے شریک ہیں، مگر تم ان کو اپنے اقتدار واختیار میں اپنی برابر نہیں بناتے کہ وہ بھی تمہاری طرح جو چاہیں کیا کریں جو چاہیں خرچ کریں، بالکل اپنی برابر تو کیا بناتے ان کو اپنے مال و اختیار میں ادنیٰ سی شرکت کا بھی حق نہیں دیتے، جیسے کسی جزوی اور معمولی شریک سے آپ ڈرتے ہیں کہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی تصرف کر لیا تو وہ اعتراض کرے گا۔ غلاموں نوکروں کو یہ درجہ بھی نہیں دیتے، تو غور کرو کہ تمام مخلوقات جن میں فرشتے، انسان اور دوسری کائنات سبھی داخل ہیں، یہ سب کے سب اللہ کی مخلوق اور اسی کے بندے اور غلام ہیں ان کو تم اللہ کے برابر یا اس کا شریک کیسے یقین کرتے ہو۔

دوسری آیت میں اس پر تنبیہ ہے کہ یہ بات تو سیدھی اور صاف ہے مگر مخالف لوگ اپنی اہوارِ نفسانی کے تابع ہو کر کوئی علم و حکمت کی بات نہیں مانتے۔

تیسری آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا عام مخاطب کو حکم دیا ہے کہ جب شرک کا نامعقول اور ظلمِ عظیم ہونا ثابت ہو گیا تو آپ سب خیالاتِ مشرکانہ کو چھوڑ کر اپنا رُخ صرف دینِ اسلام کی طرف پھیر لیجئے۔ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا۔

اس کے بعد اس دینِ اسلام کا مطابق اور مقتضائے فطرت ہونا اس طرح بیان فرمایا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، یہ جملہ پہلے جملے فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا کی توضیح اور دینِ حنیف جس کے اتباع کا حکم پہلے جملے میں دیا گیا ہے اس کی ایک مخصوص صفت کا بیان ہے کہ وہ دینِ فطرت ہے۔ اور فِطْرَتَ اللّٰهِ کی ترکیب نحوی میں منصوب ہونے کی وجہ مفسرین نے مختلف لکھی ہیں کہ لفظ اِتَّبِعْ یہاں محذوف ہے، یا لفظ اَعْنِیْ، بہر حال یہ متعین ہے کہ دینِ حنیف جس کا اتباع کا پہلے جملے میں حکم دیا گیا ہے اس کو اس جملے میں فِطْرَتَ اللّٰهِ قرار دیا ہے اور معنی اس کے خود اگلے جملے میں یہ بتلائے کہ اللہ کی فطرت سے مراد یہ ہے کہ جس فطرت پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

فطرت سے کیا مراد ہے؟ اس معاملہ میں مفسرین کے متعدد اقوال منقول ہیں انہیں دو زیادہ مشہور ہیں

اول یہ کہ فطرت سے مراد اسلام ہے اور مطلب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان اپنی فطرت اور جبلّت کے اعتبار سے مسلمان پیدا کیا ہے۔ اگر اس کو گرد وپیش اور ماحول میں کوئی خراب کرنے والا اخراب نہ کردے تو ہر پیدا ہونے والا بچہ مسلمان ہی ہوگا۔ مگر عادۃً ہوتا یہ ہے کہ ماں باپ اس کو بعض اوقات اسلام کے خلاف چیزیں سکھا دیتے ہیں، جس کے سبب وہ اسلام پر قائم نہیں رہتا۔ جیسا کہ صحیحین کی ایک حدیث میں مذکور ہے۔ قرطبی نے اسی قول کو جمہور سلف کا قول قرار دیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہو کہ فطرت سے مراد استعداد ہے۔ یعنی تخلیقِ انسانی میں اللہ تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ ہر انسان میں اپنے خالق کو پہچاننے اور اس کو ماننے کی صلاحیت واستعداد موجود ہے جس کا اثر اسلام کا قبول کرنا ہوتا ہے، بشرطیکہ اس استعداد سے کام لے۔

مگر پہلے قول پر متعدد اشکالات ہیں، اوّل یہ کہ خود اسی آیت میں یہ بھی آگے مذکور ہے لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ اور یہاں خلق اللہ سے مراد وہی فطرۃ اللہ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا تو اس لئے معنی اس جملے کے یہ ہیں کہ اللہ کی اس فطرت کو کوئی تبدیل نہیں کرسکتا، حالانکہ حدیث صحیحین میں خود یہ آیا ہے کہ پھر ماں باپ بعض اوقات بچے کو یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔ اگر فطرت کے معنی خود اسلام کے لئے جائیں جس میں تبدیلی نہ ہونا خود اسی آیت میں مذکور ہے تو حدیث مذکور میں یہودی، نصرانی بنانے کی تبدیلی کیسے صحیح ہوگی، اور یہ تبدیلی تو عام مشاہدہ ہے کہ ہر جگہ مسلمانوں سے زیادہ کافر ملتے ہیں، اگر اسلام ایسی فطرت ہے جس میں تبدیلی نہ ہوسکے تو پھر یہ تبدیلی کیسے اور کیوں؟

دوسرے حضرت خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کو قتل کیا تھا اس کے متعلق صحیح حدیث میں ہے کہ اس لڑکے کی فطرت میں کفر تھا، اس لئے خضر علیہ السلام نے اس کو قتل کیا، یہ حدیث بھی اس کے منافی ہے کہ ہر انسان اسلام پر پیدا ہوتا ہو۔

تیسرا شبہ یہ ہو کہ اگر اسلام کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کی فطرت میں اس طرح رکھ دیا گیا ہے جس کی تبدیلی پر بھی اس کو قدرت نہیں تو وہ کوئی اختیاری فعل نہ ہوا پھر اس پر آخرت کا ثواب کیسا؟ کیونکہ ثواب تو اختیاری عمل پر ملتا ہے۔

چوتھا شبہ یہ ہے کہ احادیثِ صحیحہ کے مطابق فقہاءِ امت کے نزدیک بچہ بالغ ہونے سے پہلے ماں باپ کے تابع سمجھا جاتا ہے، اگر ماں باپ کافر ہوں تو بچے کو بھی کافر قرار دیا جائے گا۔ اس کی تجہیز وتکفین اسلامی طرز پر نہیں کی جائے گی۔

یہ سب شبہات امام تورپشتی نے شرح مصابیح میں بیان کئے ہیں۔ اور اسی بنا پر

انھوں نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ اس خلقی استعداد کے متعلق یہ بھی صحیح ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، جو شخص ماں باپ یا کسی دوسرے کے گمراہ کرنے سے کافر ہوگیا اس میں استعداد اور قابلیت حق یعنی اسلام کی حقانیت کے پہچاننے کی ختم نہیں ہوتی۔ غلام خضر کے واقعہ میں اس کے کفر پر پیدا ہونے سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ اس میں حق کو سمجھنے کی استعداد ہی نہ رہی تھی، اور چونکہ اس خداداد استعداد و قابلیت کا صحیح استعمال انسان اپنے اختیار سے کرتا ہے، اس لئے اس پر ثواب عظیم کا مرتب ہونا بھی واضح ہوگیا، اور حدیث صحیحین میں جو یہ مذکور ہے کہ بچے کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں، اس کا مفہوم بھی اس دوسرے معنی کے اعتبار سے واضح اور صاف ہوگیا، کہ اگرچہ اس میں استعداد اور قابلیت فطری ہے جو اللہ نے اس کی تخلیق میں رکھی تھی وہ اسلام ہی کی طرف لے جانے والی تھی، مگر عوارض اور موانع حائل ہوگئے اور اس طرف نہ جانے دیا۔ اور حضرات سلف سے جو پہلا قول منقول ہے بظاہر اس کی مراد بھی اصل اسلام نہیں، بلکہ یہی استعدادِ اسلام اور اس کی قابلیت وصلاحیت ہے۔ محدث دہلوی نے لمعات شرح مشکوٰۃ میں جمہور کے قول کا یہی مطلب بیان فرمایا ہے۔

اور اسی کی تائید اس مضمون سے ہوتی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بے شمار قسم کی مخلوقات مختلف طبائع اور مزاج کی بنائی ہیں، ہر مخلوق کی فطرت اور جبلت میں ایک خاص مادہ رکھ دیا ہے، جس سے وہ مخلوق اپنی تخلیق کے منشاء کو پورا کرسکے قرآن کریم میں اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ جس مخلوق کو خالق کائنات نے کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اس کو اس مقصد کے لئے ہدایت بھی دے دی ہے، وہ ہدایت یہی مادہ اور استعداد ہے، شہد کی مکھی میں یہ مادہ رکھ دیا کہ وہ درختوں اور پھولوں کو پہچانے اور انتخاب کرے پھر اس کے رس کو اپنے پیٹ میں محفوظ کرکے اپنے چھتے میں لاکر جمع کرے، اسی طرح انسان کی فطرت و جبلت میں ایسا مادہ اور استعداد رکھ دی ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کو پہچانے، اس کی شکرگذاری اور اطاعت شعاری کرے، اسی کا نام اسلام ہے۔

لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ، مذکور الصدر تقریر سے اس جملے کا مطلب بھی واضح ہوگیا کہ اللہ کی دی ہوئی فطرت یعنی حق کو پہچاننے کی صلاحیت و استعداد میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ اس کو غلط ماحول کافر تو بنا سکتا ہے مگر اس کی استعدادِ قبولِ حق کو بالکل فنا

نہیں کرسکتا۔

اور اسی سے اُس آیت کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں ارشاد ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ، یعنی ہم نے جن اور انسان کو اور کسی کام کے لئے نہیں پیدا کیا، بجز اس کے کہ وہ ہماری عبادت کیا کریں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی فطرت میں ہم نے عبادت کی رغبت اور استعداد رکھ دی ہے، اگر وہ اس استعداد سے کام لیں تو بجز عبادت کے کوئی دوسرا کام اس کے خلاف ہرگز سرزد نہ ہو۔

اہل باطل کی صحبت اور غلط ماحول سے الگ رہنا فرض ہے: آیت مذکورہ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ کا جملہ اگرچہ بصورت خبر ہے یعنی اللہ کی اس فطرت کو کوئی بدل نہیں سکتا، لیکن اس میں ایک معنی اَمر کے بھی ہیں، کہ بدلنا نہیں چاہئے۔ اس لئے اس جملے سے یہ حکم بھی مستفاد ہوا کہ انسان کو ایسے اسباب سے بہت پرہیز کرنا چاہئے جو اس قبولِ حق کی استعداد کو معطل یا کمزور کردیں۔ اور وہ اسباب بیشتر غلط ماحول اور بُری صحبت ہے، یا اہل باطل کی کتابیں دیکھنا جب کہ خود اپنے مذہب اسلام کا پورا عالم اور مبصر نہ ہو۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، پچھلی آیت میں انسان کی فطرت کو قبولِ حق کے قابل اور مستعد بنانے کا ذکر تھا۔ اس آیت میں اول قبولِ حق کی صورت یہ بتلائی گئی کہ نماز قائم کریں کہ وہ عملی طور پر ایمان واسلام اور اطاعتِ حق کا اظہار ہے اس کے بعد فرمایا وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، یعنی شرک کرنے والوں میں شامل نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنی فطرت اور قبولِ حق کی استعداد سے کام نہ لیا، آگے ان کی گمراہی کا ذکر ہے:۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا، یعنی یہ مشرکین وہ لوگ ہیں جنھوں نے دینِ فطرت اور دینِ حق میں تفریق پیدا کردی، یا یہ کہ دینِ فطرت سے مفارق اور الگ ہوگئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مختلف پارٹیوں میں بٹ گئے۔ شِيَعًا، شیعہ کی جمع ہے، ایسی جماعت جو کسی مقتدا کی پیرو ہو، اس کو شیعہ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دینِ فطرت توحید تھا جس کا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ سب انسان اس کو اختیار کرکے ایک ہی قوم ایک ہی جماعت بنتے مگر انھوں نے اس توحید کو چھوڑا، اور مختلف لوگوں کے خیالات کے تابع ہوگئے اور انسانی خیالات اور رایوں میں اختلاف ایک طبعی امر ہے، اس لئے ہر ایک نے اپنا اپنا ایک مذہب بنالیا، عوام ان کے سبب مختلف پارٹیوں میں بٹ گئے، اور شیطان نے ان کو اپنے اپنے خیالات ومعتقدات کو حق قرار دینے میں ایسا لگادیا کہ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ، یعنی ان کی ہر پارٹی اپنے اپنے اعتقادات وخیالات پر مگن اور خوش ہے اور

دوسروں کو غلطی پر بتاتی ہے، حالانکہ یہ سب کے سب گمراہی کے غلط راستوں پر پڑے ہوئے ہیں۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ، اس سے پہلی آیت میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ رزق کا معاملہ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو پھیلا دیتا ہے اور زیادہ کر دیتا ہے، اور جس کا چاہتا ہے رزق سمیٹ کر تنگ کر دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اس کے مصارف میں خرچ کرتا رہے تو اس سے اس میں کمی نہیں آتی، اور اگر کوئی خرچ کرنے میں بخل کرے اور جو کچھ اپنے پاس ہے اس کو جمع کر کے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے اس سے مال میں وسعت نہیں ہوتی۔

اس مضمون کی مناسبت سے آیت مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور بقول حسن بصریؒ ہر مخاطب انسان کو جس کو اللہ نے مال میں وسعت دی ہو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جو مال اللہ نے آپ کو دیا ہے اس میں بخل نہ کرو بلکہ اس کو ان کے مصارف میں خوش دلی کے ساتھ خرچ کرو اس سے تمہارے مال اور رزق میں کمی نہیں آئے گی۔ اور اس حکم کے ساتھ اس آیت میں مال کے چند مصارف بھی بیان کر دیئے، اول ذوی القربیٰ دوسرے مساکین تیسرے مسافر، کہ خدا تعالیٰ کے عطا کئے ہوئے مال میں سے ان لوگوں کو دو اور ان پر خرچ کرو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ یہ ان لوگوں کا حق ہے جو اللہ نے تمہارے مال میں شامل کر دیا ہے اس لئے ان کو دینے کے وقت ان پر کوئی احسان نہ جتلاؤ، کیونکہ حق والے کا حق ادا کرنا مقتضائے عدل وانصاف ہے کوئی احسان وانعام نہیں ہے۔

اور ذوی القربیٰ سے مراد ظاہر یہ ہے کہ عام رشتہ دار ہیں، خواہ ذو رحم محرم ہوں یا دوسرے رکما ہو قول الجمہور من المفسرین، اور حق سے مراد بھی عام ہے خواہ حقوق واجبہ ہوں جیسے ماں باپ، اولاد اور دوسرے ذوی الارحام کے حقوق یا محض تبرع واحسان ہو جو رشتہ داروں کے ساتھ بہ نسبت دوسروں کے بہت زیادہ ثواب رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا کہ جس شخص کے ذوی الارحام رشتہ دار محتاج ہوں وہ ان کو چھوڑ کر دوسروں پر صدقہ کرے تو اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔ اور ذوی القربیٰ کا حق صرف مالی امداد ہی نہیں ان کی خبر گیری، جسمانی خدمت اور کچھ نہ کر سکے تو کم از کم زبانی ہمدردی اور تسلی وغیرہ جیسا کہ حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ ذوی القربیٰ کا حق اس شخص کے لئے جس کو مالی وسعت حاصل ہو یہ ہے کہ مال سے ان کی امداد کرے اور جس کو یہ وسعت حاصل

نہ ہو اس کے لئے جسمانی خدمت اور زبانی ہمدردی ہے (قرطبی)

ذوی القربیٰ کے بعد مسکین اور مسافر کا حق بتلایا گیا ہے یہ بھی اسی طرح عام ہے، وسعت ہو تو مالی امداد نہ ہو تو اچھا سلوک۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ، اس آیت میں ایک بُری رسم کی اصلاح کی گئی ہے، جو عام خاندانوں اور اہل قرابت میں چلتی ہے۔ وہ یہ کہ عام طور پر کنبہ رشتہ کے لوگ جو کچھ دوسرے کو دیتے ہیں اس پر نظر رکھتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے وقت میں کچھ دے گا بلکہ رسمی طور پر کچھ زیادہ دے گا، خصوصاً نکاح، شادی وغیرہ کی تقریبات میں جو کچھ دیا لیا جاتا ہے اس کی یہی حیثیت ہوتی ہے جس کو عرف میں نوتہ کہتے ہیں۔ اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ اہل قرابت کا جو حق ادا کرنے کا حکم پہلی آیت میں دیا گیا ہے ان کو یہ حق اس طرح دیا جائے کہ نہ اُن پر احسان جتائے اور نہ کسی بدلے پر نظر رکھے۔ اور جس نے بدلے کی نیت سے دیا کہ ان کا مال دوسرے عزیز رشتہ دار کے مال میں شامل ہونے کے بعد کچھ زیادتی لے کر واپس آئے گا تو اللہ کے نزدیک اس کا کوئی درجہ اور ثواب نہیں اور قرآن کریم نے اس زیادتی کو لفظ ربٰو سے تعبیر کر کے اس کی قباحت کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ ایک صورت سود کی سی ہوگئی۔

مسئلہ: ہدیہ اور ہبہ دینے والے کو اس پر نظر رکھنا کہ اس کا بدلہ ملے گا یہ تو ایک بہت مذموم حرکت ہے، جس کو اس آیت میں منع فرمایا گیا ہے۔ لیکن بطور خود جس شخص کو کوئی ہبہ عطیہ کسی دوست عزیز کی طرف سے ملے اس کے لئے اخلاقی تعلیم یہ ہے کہ وہ بھی جب اس کو موقع ملے اس کی مکافات کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہی تھی کہ جو شخص آپ کو کوئی ہدیہ پیش کرتا تو اپنے موقع پر آپ بھی اس کو ہدیہ دیتے تھے۔ (کذا روی عن عائشہ رض، قرطبی) ہاں اس مکافات کی صورت ایسی نہ بنائے کہ دوسرا آدمی یہ محسوس کرے کہ یہ میرے ہدیہ کا بدلہ دے رہا ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ

پھیل پڑی ہے خرابی جنگل میں اور دریا میں لوگوں کے ہاتھ کی کمائی سے

لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۱﴾ قُلْ

چکھانا چاہئے ان کو کچھ مزہ ان کے کام کا تاکہ وہ پھر آئیں ، تو کہہ

سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ

پھرو ملک میں تو دیکھو کیسا ہوا انجام پہلوں

قَبْلُ ؕ كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُشْرِكِينَ ﴿۴۲﴾ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ

کا بہت ان میں تھے شرک کرنے والے، سو تو سیدھا رکھ اپنا منہ سیدھی

الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ يَوْمَئِذٍ

راہ پر اس سے پہلے کہ آپہنچے وہ دن جسکو پھرنا نہیں اللہ کی طرف سے اس دن

يَصَّدَّعُونَ ﴿۴۳﴾ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا

لوگ جدا جدا ہوں گے، جو منکر ہوا سو اس پر پڑے اس کا منکر ہونا اور جو کوئی کرے بھلے کام

فَلِأَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ ﴿۴۴﴾ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

سو وہ اپنی راہ سنوارتے ہیں، تاکہ وہ بدلہ دے ان کو جو یقین لائے اور کام کئے

الصَّالِحَاتِ مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ﴿۴۵﴾

بھلے اپنے فضل سے بے شک اس کو نہیں بھاتے انکار والے

خلاصۂ تفسیر

(شرک و معصیت ایسی بری چیز ہے کہ) خشکی اور تری (یعنی تمام دنیا) میں لوگوں کے (برے) اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں (مثلاً قحط و وبا و طوفان) تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بعضے اعمال (کی سزا) کا مزہ ان کو چکھا دے تاکہ وہ (اپنے ان اعمال سے) باز آجائیں (جیسا دوسری آیت میں ہے وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ اور بعض اعمال کا مطلب یہ ہے کہ اگر سب اعمال پر یہ عقوبتیں مرتب ہوں تو ایک دم زندہ نہ رہیں، کقولہ تعالیٰ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ اسی معنی سے آیت بالا میں وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ فرمایا ہے، یعنی بہت سے گناہوں کو تو اللہ تعالیٰ معاف ہی کر دیتے ہیں، بعض ہی اعمال کی سزا دیتے ہیں۔ غرض جب اعمال بد مطلقاً سبب وبال ہیں تو شرک و کفر تو سب سے بڑھ کر موجب عذاب ہوگا اور اگر مشرکین کو اس کے ماننے میں تردد ہو تو) آپ (ان سے) فرما دیجئے کہ ملک میں چلو

پھر دیکھو کہ جو دکافر دمشرک) لوگ پہلے ہو گذرے ہیں ان کا اخیر کیسا ہوا ان میں اکثر مشرک ہی تھے (سو دیکھ لو وہ عذاب آسمانی سے کس طرح ہلاک ہوئے جس سے صاف اثنح ہوا کہ شرک کا بڑا وبال ہے اور بعضے کفر کی دوسری انواع میں مبتلا تھے، جیسے قوم لوط اور قارون اور جو لوگ مسخ ہو کر بندرا ور خنازیر ہو گئے تھے، کیونکہ آیات کی تکذیب اور نہی کی مخالفت کر کے مبتلائے کفر دلعن ہوئے۔ اور شاید شرک کا بالتخصیص ذکر اس لئے ہو کہ کفار مکہ کی خاص اور مشہور حالت یہی تھی اور جب شرک کا موجب وبال ہونا محقق ہو گیا) سو (اے مخاطب) تم اپنا رخ اس دین راست (یعنی توحید اسلامی) کی طرف رکھو قبل اس کے کہ ایسا دن آئے جس کے واسطے پھر خدا کی طرف سے ہٹنا نہ ہوگا (یعنی جیسے دنیا میں خاص عذاب کے وقت کو اللہ تعالیٰ قیامت کے وعدہ پر ہٹاتا جاتا ہے، جب وہ موعود دن آجائے گا پھر اس کو نہ ہٹائے گا اور توقف واہمال نہ ہوگا۔ اس جملہ میں شرک کے وبالِ اخروی کا ذکر ہو گیا جیسا اوپر ظَهَرَ الْفَسَادُ الخ اور كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الخ میں وبالِ دنیوی مذکور تھا اور) اس دن (یہ ہوگا کہ) سب (عمل کرنے والے) لوگ (باعتبار جزاء کے) جدا جدا ہو جائیں گے (اس طور پر کہ) جو شخص کفر کر رہا ہے اس پر تو اس کا (وبال) کفر پڑے گا اور جو نیک عمل کر رہا ہے سو یہ لوگ اپنے (نفع کے) لئے سامان کر رہے ہیں جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اپنے فضل سے (نیک) جزا دے گا جو ایمان لائے اور (انھوں نے اچھے عمل کئے (اور اس سے کفار محروم رہیں گے جیسا اوپر فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ سے معلوم ہوا جس کی وجہ یہ ہے کہ) واقعی اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند نہیں کرتا (بلکہ ان کے کفر پر ان سے ناخوش ہے) ؛

معارف ومسائل

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ، یعنی خشکی اور دریا میں سارے جہان میں فساد پھیل گیا لوگوں کے اعمالِ بد کی وجہ سے" تفسیر روح المعانی میں ہے کہ فساد سے مراد قحط اور وبائی امراض اور آگ لگنے اور پانی میں ڈوبنے کے واقعات کی کثرت اور ہر چیز کی برکت کا مٹ جانا، نفع بخش چیزوں کا نفع کم نقصان زیادہ ہو جانا وغیرہ آفات ہیں۔ اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان دنیوی آفات کا سبب انسانوں کے گناہ اور اعمالِ بد ہوتے ہیں جن میں شرک وکفر سب سے زیادہ اشد ہیں، اس کے بعد دوسرے گناہ ہیں۔

اور یہی مضمون دوسری ایک آیت میں اس طرح آیا ہے وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ

مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ، یعنی تمھیں جو بھی مصیبت پہونچتی ہے وہ تمھارے ہی ہاتھوں کی کمائی کے سبب سے ہے۔ یعنی ان معاصی کے سبب جو تم کرتے رہتے ہو اور بہت سے گناہوں کو تو اللہ تعالیٰ معاف ہی کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جو مصائب اور آفات تم پر آتی ہیں ان کا حقیقی سبب تمھارے گناہ ہوتے ہیں، اگرچہ دنیا میں نہ ان گناہوں کا پورا بدلہ دیا جاتا ہے اور نہ ہر گناہ پر مصیبت و آفت آتی ہے، بلکہ بہت سے گناہوں کو تو معاف کر دیا جاتا ہے، بعض بعض گناہوں پر ہی گرفت ہوتی اور آفت و مصیبت بھیج دی جاتی ہے۔ اگر ہر گناہ پر دنیا میں مصیبت آیا کرتی، تو ایک انسان بھی زمین پر زندہ نہ رہتا۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ بہت سے گناہوں کو تو حق تعالیٰ معاف ہی فرما دیتے ہیں اور جو معاف نہیں ہوتے ان کا بھی پورا بدلہ دنیا میں نہیں دیا جاتا، بلکہ تھوڑا سا مزہ چکھایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اسی آیت کے آخر میں فرمایا لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا، یعنی تاکہ چکھا دے اللہ تعالیٰ کچھ حصہ ان کے بُرے اعمال کا۔ اور اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اعمالِ بد اور گناہوں کی وجہ سے جو مصیبت و آفت دنیا میں بھیجدی جاتی ہے وہ بھی غور کرو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت ہی ہے۔ کیونکہ مقصود اس دنیا کی مصیبت سے یہ ہوتا ہے کہ غافل انسان کو تنبیہ ہو جائے اور وہ اپنے گناہوں اور نافرمانیوں سے باز آجائے جو انجام کار اس کے لئے مفید اور بڑی نعمت ہے، جیسا کہ آخر آیت میں فرمایا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔

دنیا کی بڑی بڑی آفتیں اور مصائب انسانوں کے گناہوں کے سبب آتے ہیں

اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ جو انسان کوئی گناہ کرتا ہے وہ ساری دنیا کے انسانوں چوپایوں اور چرندے پرندے جانوروں پر ظلم کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے گناہوں کے وبال سے جو بارش کا قحط اور دوسرے مصائب دنیا میں آتے ہیں اس سے سب ہی جاندار متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے قیامت کے روز یہ سب بھی گناہگار انسان کے خلاف دعویٰ کریں گے۔

اور شقیق زاہد نے فرمایا کہ جو شخص حرام مال کھاتا ہے وہ صرف اس پر ظلم نہیں کرتا جس سے یہ مال ناجائز طور پر حاصل کیا ہے، بلکہ پورے انسانوں پر ظلم کرتا ہے (روح)، کیونکہ اول تو ایک کے ظلم سے دوسرے لوگوں میں ظلم کرنے کی رسم پڑتی ہے، اور یہ سلسلہ ساری انسانیت کو محیط ہو جاتا ہے۔ دوسرے اس کے ظلم کی وجہ سے دنیا میں آفتیں اور مصائب آتے ہیں جس سے سب ہی انسان متاثر ہوتے ہیں۔

ایک شبہ کا جواب احادیث صحیحہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات بھی موجود ہیں کہ دنیا مؤمن کے لئے جیل خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے، اور یہ کہ کافر کو اس کے نیک اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں بصورتِ مال و دولت وصحت دے دیا جاتا ہے، اور مؤمن کے اعمال کا بدلہ آخرت کے لئے محفوظ کر دیا جاتا ہے، اور یہ کہ مؤمن کی مثال دنیا میں ایک نازک شاخ کی سی ہے، کہ ہوائیں اس کو کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف جھکا دیتی ہیں، کبھی سیدھا کر دیتی ہیں یہاں تک کہ اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، اور یہ کہ اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِیَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ، یعنی دنیا میں بلائیں نسبۃً زیادہ انبیاء پر آتی ہیں پھر جو اُن کے قریب ہو پھر جو اُن کے قریب ہو"

یہ تمام احادیث صحیحہ بظاہر اس آیت کے مضمون سے مختلف ہیں۔ اور عام دنیا کے مشاہدات بھی یہی بتلاتے ہیں کہ دنیا میں عام طور پر مؤمن مسلمان تنگی اور تکلیف میں اور کفار فجار عیش و عشرت میں رہتے ہیں۔ اگر آیت مذکورہ کے مطابق دنیا کے مصائب اور تکلیفیں گناہوں کے سبب سے ہوتیں تو معاملہ برعکس ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں گناہوں کو مصائب کا سبب ضرور بتلایا ہے مگر علتِ تامہ نہیں فرمایا کہ جب کسی پر کوئی مصیبت آئے تو گناہ ہی کے سبب سے ہوگی۔ جس پر کوئی مصیبت آئے اس کا گناہگار ہونا ضروری ہو بلکہ عام اسباب کا جو دنیا میں دستور ہے کہ سبب واقع ہونے کے بعد اس کا مسبب اکثر واقع ہو جاتا ہے، اور کبھی کوئی دوسرا سبب اس کے اثر کے ظاہر ہونے سے مانع ہو جاتا ہے تو اس سبب کا اثر ظاہر نہیں ہوتا، جیسے کوئی مسہل یا مُلیّن دوا، کے متعلق یہ کہے کہ اس سے اسہال ہوں گے، یہ اپنی جگہ صحیح ہے، مگر بعض اوقات کسی دوسری دوا، غذا، یا ہوا وغیرہ کے اثر سے اسہال نہیں ہوتے، جو دوائیں بخار اُتارنے کی ہیں بعض اوقات ایسے عوارض پیش آجاتے ہیں کہ اُن دواؤں کا اثر ظاہر نہیں ہوتا، خواب آور گولیاں کھا کر بھی نیند نہیں آتی۔ جس کی ہزاروں مثالیں دنیا میں ہر وقت مشاہدہ کی جاتی ہیں۔

اس لئے حاصل آیت کا یہ ہوا کہ اصل خاصہ گناہوں کا یہ ہے کہ ان سے مصائب و آفات آئیں، لیکن بعض اوقات دوسرے کچھ اسباب اس کے منافی جمع ہو جاتے ہیں، جن کی وجہ سے مصائب کا ظہور نہیں ہوتا، اور بعض صورتوں میں بغیر کسی گناہ کے کوئی آفت و مصیبت آجانا بھی اس کے منافی نہیں کیونکہ آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ بغیر گناہ کے کوئی تکلیف و مصیبت کسی کو پیش نہیں آتی، بلکہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو کوئی مصیبت و

آفت کسی دوسرے سبب سے پیش آجائے جیسے انبیاء و اولیاء کو جو مصیبتیں اور تکلیفیں پیش آتی ہیں ان کا سبب کوئی گناہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی آزمائش اور آزمائش کے ذریعہ ان کے درجات کی ترقی اس کا سبب ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ قرآن کریم نے جن آفات و مصائب کو گناہوں کے سبب سے قرار دیا ہے اس سے مراد وہ آفات و مصائب ہیں جو پوری دنیا پر یا پورے شہر یا بستی پر عام ہوجائیں، عام انسان اور جانور اُن کے اثر سے نہ بچ سکیں۔ ایسی مصائب و آفات کا سبب عموماً لوگوں میں گناہوں کی کثرت خصوصاً علانیہ گناہ کرنا ہی ہوتا ہے۔ شخصی اور انفرادی تکلیف و مصیبت میں یہ ضابطہ نہیں بلکہ وہ کبھی کسی انسان کی آزمائش کرنے کے لئے بھی بھیجی جاتی ہے، اور جب وہ اس آزمائش میں پورا اترتا ہے تو اس کے درجاتِ آخرت بڑھ جاتے ہیں۔ یہ مصیبت درحقیقت اس کے لئے رحمت و نعمت ہوتی ہے۔ اس لئے انفرادی طور پر کسی شخص کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بہت گناہگار ہے۔ اسی طرح کسی کو خوش عیش بعافیت دیکھ کر یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ بڑا نیک صالح بزرگ ہے۔ البتہ عام مصائب و آفات جیسے قحط، طوفان، وبائی امراض، گرانی اشیاءِ ضرورت، چیزوں کی برکت مٹ جانا وغیرہ اس کا اکثر اور بڑا سبب لوگوں کے علانیہ گناہ اور سرکشی ہوتی ہے۔

فائدہ:۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں فرمایا کہ اس دنیا میں خیر و شر یا مصیبت و راحت، مشقت و سہولت کے اسباب دو طرح کے ہیں۔ ایک ظاہری، دوسرے باطنی، ظاہری اسباب تو وہی مادی اسباب ہیں جو عام دنیا کی نظر میں اسباب سمجھے جاتے ہیں۔ اور باطنی اسباب انسانی اعمال اور ان کی بناء پر فرشتوں کی امداد و نصرت یا اُن کی لعنت و نفرت ہیں۔ جیسے دنیا میں بارش کے اسباب اہلِ فلسفہ و اہلِ تجربہ کی نظر میں سمندر سے اُٹھنے والے بخارات (مان سون) اور پھر اوپر کی ہوا میں پہونچ کر ان کا منجمد ہونا، پھر آفتاب کی شعاعوں سے پگھل کر برس جانا ہیں، مگر روایاتِ حدیث میں ان چیزوں کو فرشتوں کا عمل بتلایا گیا ہے۔ درحقیقت ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، ایک چیز کے اسباب متعدد ہوسکتے ہیں۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ ظاہری اسباب یہی ہوں، اور باطنی سبب فرشتوں کا تصرف ہو۔ یہ دونوں طرح کے اسباب جمع ہوجائیں تو بارش امید اور ضرورت کے مطابق ہوا اور جہاں یہ دونوں اسباب جمع نہ ہوں وہاں بارش کے وقوع میں اختلال رہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اسی طرح دنیا کے مصائب و آفات کے کچھ اسباب طبعیہ مادیہ ہیں جو نیک و بد کو نہیں پہچانتے۔ آگ جلانے کے لئے ہے وہ بلا امتیاز متقی اور فاجر کے سب کو جلائے ہی گی بجز اس کے کسی خاص فرمان کے ذریعہ اس کو اس عمل سے روک دیا جائے، جیسے نار نمرود ابراہیم علیہ السلام کے لئے "برد و سلام بنا دی گئی" پانی وزنی چیزوں کو غرق کرنے کے لئے ہے وہ یہی کام کرے گا، اسی طرح دوسرے عناصر جو خاص خاص کاموں کے لئے ہیں وہ اپنی مفوضہ خدمت میں لگے ہوئے ہیں، یہ اسباب طبعیہ کسی انسان کے لئے راحت و سہولت کے سامان بھی فراہم کرتے ہیں، اور کسی کے لئے مصیبت و آفت بھی بن جاتے ہیں۔

انہی اسباب ظاہرہ کی طرح مصائب و آفات اور راحت و سہولت میں مؤثر انسان کے اپنے اعمال خیر و شر بھی ہیں۔ جب دونوں ظاہری اور باطنی اسباب کسی فرد یا جماعت کی راحت و آرام اور سہولت و خوش عیشی پر جمع ہو جاتے ہیں تو اس فرد یا جماعت کو دنیا میں عیش و راحت مکمل طور پر حاصل ہوتی ہے جس کا مشاہدہ ہر شخص کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل جس فرد یا جماعت کے لئے اسباب طبعیہ مادیہ بھی مصیبت و آفت لا رہے ہوں اور اس کے اعمال بھی مصیبت و آفت کے مقتضی ہوں تو اس کی مصیبت و آفت بھی مکمل ہوتی ہے جس کا عام مشاہدہ ہوتا ہے۔

اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسباب طبعیہ مادیہ تو مصیبت و آفت پر مجتمع ہیں، مگر اس کے اعمال حسنہ باطنی طور پر راحت و سکون کے مقتضی ہیں ایسی صورت میں یہ اسباب باطنہ اس کی ظاہری آفتوں کو دور کرنے یا کم کرنے میں صرف ہو جاتے ہیں اس کی عیش و راحت مکمل طور پر سامنے نہیں آتی۔ اسی طرح اس کے برعکس بعض اوقات اسباب مادیہ عیش و آرام کے مقتضی ہوتے ہیں مگر اسباب باطنیہ یعنی اس کے اعمال بُرے ہونے کی وجہ سے ان کا تقاضا مصیبت و آفت لانے کا ہوتا ہے، تو ان متضاد تقاضوں کی وجہ سے نہ عیش و راحت مکمل ہوتی ہے اور نہ بہت زیادہ مصیبت و آفت ان کو گھیرتی ہے۔

اسی طرح بعض اوقات مادی اسباب طبعیہ کو کسی بڑے درجہ کے نبی و رسول اور ولی و مقبول کے لئے ناساز گار بنا کر اس کی آزمائش و امتحان کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، اس تفصیل کو سمجھ لیا جائے تو آیات قرآن اور مذکورہ احادیث کا باہم ارتباط اور اتفاق واضح ہو جاتا ہے تعارض و تضاد کے شبہات رفع ہو جاتے ہیں واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

مصائب کے وقت ابتلاء و امتحان یا سزا و عذاب میں فرق۔ مصائب و آفات کے ذریعہ جن لوگوں کو ان کے گناہوں کی کچھ سزا دی جاتی ہے، اور جن نیک لوگوں کو رفع درجات یا کفارۂ سیئات کے لئے بطور امتحان مصائب میں مبتلا کیا جاتا ہے، ظاہری صورت ابتلاء کی ایک ہی سی ہوتی ہے، ان دونوں میں فرق کیسے پہچانا جائے؟ اس کی پہچان حضرت شاہ ولی اللہؒ نے یہ لکھی ہے کہ جو نیک لوگ بطور ابتلاء و امتحان کے گرفتار مصائب ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے قلوب کو مطمئن کر دیتے ہیں، اور وہ ان مصائب و آفات پر ایسے ہی راضی ہوتے ہیں جیسے بیمار کڑوی دوا، یا آپریشن پر باوجود تکلیف محسوس کرنے کے راضی ہوتا ہے، بلکہ اس کے لئے مال بھی خرچ کرتا ہے، سفارشیں مہیا کرتا ہے۔ بخلاف ان گنہگاروں کے جو بطور سزا مبتلا کئے جاتے ہیں ان کی پریشانی اور جزع و فزع کی حد نہیں رہتی، بعض اوقات ناشکری بلکہ کلماتِ کفر تک پہونچ جاتے ہیں۔

سیدی حکیم الامت تھانوی قدس سرہ نے ایک پہچان یہ بتلائی کہ جس مصیبت کے ساتھ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اپنے گناہوں پر تنبہ اور توبہ و استغفار کی رغبت زیادہ ہو جائے وہ علامت اس کی ہے کہ یہ قہر نہیں بلکہ مہر اور عنایت ہے، اور جس کو یہ صورت نہ بنے بلکہ جزع و فزع اور معاصی میں اور زیادہ انہماک بڑھ جائے وہ علامت قہرِ الٰہی اور عذاب کی ہے۔ واللہ اعلم

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانے والی اور تاکہ چکھائے تم کو کچھ مزہ

مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ

اپنی مہربانی کا اور تاکہ چلیں جہاز اس کے حکم سے اور تاکہ تلاش کرو اس کے فضل سے

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٤٦﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا

اور تاکہ تم حق مانو، اور ہم بھیج چکے ہیں تجھ سے پہلے کتنے رسول

اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَاۗءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ

اپنی اپنی قوم کے پاس سو پہنچے ان کے پاس نشانیاں لے کر پھر بدلہ لیا ہم نے ان سے جو

أَجْرَمُوا ۚ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٧﴾ اللَّهُ الَّذِي

گنہگار تھے اور حق ہے ہم پر مدد ایمان والوں کی، اللہ ہے جو

يُرْسِلُ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ

چلاتا ہے ہوائیں پھر وہ اٹھاتی ہیں بادل کو پھر پھیلا دیتا ہے اس کو آسمان میں جس طرح چاہے

وَيَجْعَلُهُ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ ۖ فَإِذَا أَصَابَ

اور رکھتا ہے اس کو تہ بہ تہ پھر تو دیکھے مینہ کو نکلتا ہے اس کے بیچ میں سے پھر جب اس کو پہنچاتا

بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿٤٨﴾ وَإِنْ

ہے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں تب ہی وہ لگتے ہیں خوشیاں کرنے، اور پہلے سے

كَانُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمُبْلِسِينَ ﴿٤٩﴾

ہو رہے تھے اس کے اترنے سے پہلے ہی نا امید

فَانْظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ

سو دیکھ لے اللہ کی مہربانی کی نشانیاں کیونکر زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مرگئے پیچھے،

إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٥٠﴾ وَلَئِنْ

بیشک وہی ہے مُردوں کو زندہ کرنے والا اور وہ ہر چیز کر سکتا ہے، اور اگر ہم

أَرْسَلْنَا رِيحًا فَرَأَوْهُ مُصْفَرًّا لَظَلُّوا مِنْ بَعْدِهِ يَكْفُرُونَ ﴿٥١﴾

بھیجیں ایک ہوا پھر دیکھیں وہ کھیتی کو کہ زرد پڑ گئی تو لگیں اس کے پیچھے ناشکری کرنے

فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا

سو تو سنا نہیں سکتا مُردوں کو اور نہیں سنا سکتا بہروں کو پکارنا جب کہ پھیریں

مُدْبِرِينَ ﴿٥٢﴾ وَمَا أَنْتَ بِهَادِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِنْ تُسْمِعُ

پیٹھ دے کر، اور نہ تو راہ سمجھائے اندھوں کو ان کے بھٹکنے سے، تو تو سنائے

إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ ﴿٥٣﴾ ع

اسی کو جو یقین لائے ہماری باتوں پر سو وہ مسلمان ہوتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

اور اللہ تعالیٰ کی (قدرت و وحدت و نعمت کی) نشانیوں میں سے ایک یہ (بھی) ہے کہ وہ (بارش سے پہلے) ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ (بارش کی) خوش خبری دیتی ہیں (پس ان کا بھیجنا ایک تو جی خوش کرنے کے لئے ہوتا ہے) اور (نیز اس واسطے) تاکہ (اس کے بعد بارش ہو اور) تم کو اپنی (اس) رحمت (بارش) کا مزہ چکھا دے (یعنی بارش کے فوائد عنایت فرما دے) اور (نیز اس واسطے ہوا بھیجتا ہے) تاکہ (اس کے ذریعے سے بادبانی) کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تاکہ (اس ہوا کے ذریعہ سے بواسطۂ کشتی دریا کے سفر سے) تم اس کی روزی تلاش کرو (یعنی کشتیوں کا چلنا اور روزی تلاش کرنا دونوں ارسالِ ریاح سے حاصل ہوتے ہیں اول بلا واسطہ اور ثانی بواسطۂ کشتی کے) اور تاکہ تم شکر کرو اور (ان دلائلِ بالغہ اور نعمِ سابغہ پر بھی یہ مشرکین حق تعالیٰ کی جو ناشکریاں کرتے ہیں، یعنی شرک اور مخالفتِ رسول ؐ، اور ایذاءِ مؤمنین وغیرہ، تو آپ اس پر غمگین نہ ہوں، کیونکہ ہم عنقریب ان سے انتقام لینے والے اور اس میں ان کو مغلوب اور اہلِ حق کو غالب کرنے والے ہیں جیسا کہ پہلے بھی ہوا ہے چنانچہ) ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبران کی قوموں کے پاس بھیجے اور وہ ان کے پاس دلائل (ثبوتِ حق کے) لے کر آئے (جس پر بعضے ایمان لائے اور بعضے نہ لائے) سو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو مرتکب جرائم کے ہوئے تھے (اور وہ جرائم تکذیبِ حق و مخالفتِ اہلِ حق ہیں اور اس انتقام میں ہم نے ان کو مغلوب اور اہلِ ایمان کو غالب کیا) اور اہلِ ایمان کو غالب کرنا (حسب وعدہ و عادت) ہمارے ذمہ تھا (وہ انتقام عذابِ الٰہی تھا اور اس میں کفار کا ہلاک ہونا یا ان کا مغلوب ہونا ہے اور مسلمانوں کا بچ جانا اور ان کا غالب آنا ہے غرض اسی طرح ان کفار سے انتقام لیا جائے گا، خواہ دنیا میں خواہ بعد موت اور یہ مضمون تسلی کا بطور جملہ معترضہ کے تھا آگے ارسالِ ریاح کے بعضے آثار مذکورہ بالاجمال کی تفصیل ہے کہ) اللہ ایسا (قادر و حکیم و منعم) ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے پھر وہ (ہوائیں) بادلوں کو (جو کہ کبھی ان ہواؤں سے پہلے بخارات اٹھ کر بادل بن چکے ہیں اور کبھی وہ بخارات انہی ہواؤں سے بلند ہو کر بادل بن جاتے ہیں پھر وہ ہوائیں بادلوں کو ان کی جگہ سے یعنی فضائے آسمانی سے یا زمین سے) اٹھاتی ہیں پھر اللہ تعالیٰ اس (بادل) کو (کبھی تو) جس طرح چاہتا ہے آسمان (یعنی فضائے آسمانی) میں پھیلا دیتا ہے، اور (کبھی) اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے (بسط کا مطلب یہ ہے کہ مجتمع کر کے دور تک پھیلا دیتا ہے اور کَیۡفَ یَشَآءُ کا

مطلب یہ ہے کہ کبھی تھوڑی دور تک کبھی بہت دور تک اور کِسَفًا کا مطلب یہ کہ مجتمع نہیں ہوتا متفرق رہتا ہے) پھر (دونوں حالت میں) تم مینھ کو دیکھتے ہو کہ اس (بادل) کے اندر سے نکلتا ہے (مجتمع بادل سے برسنا تو بکثرت ہے اور بعض موسموں میں اکثر بارش متفرق بدلیوں سے بھی ہوتی ہے) پھر (بادل سے نکلنے کے بعد) جب وہ (مینھ) اپنے بندوں میں سے جسکو چاہے پہونچا دیتا ہے تو بس وہ خوشیاں کرنے لگتے ہیں اور وہ لوگ قبل اس کے کہ ان کے خوش ہونے سے پہلے اُن پر برسے (بالکل ہی) ناامید (ہو رہے) تھے (یعنی ابھی ابھی ناامید تھے اور ابھی خوش ہوگئے۔ اور ایسا ہی مشاہدہ بھی ہے کہ انسان کی کیفیت ایسی حالت میں بہت جلدی جلدی بدل جاتی ہے) سو (ذرا) رحمتِ الٰہی (یعنی بارش) کے آثار (تو) دیکھو کہ اللہ تعالیٰ (اس کے ذریعہ سے) زمین کو اس کے مُردہ (یعنی خشک) ہونے کے بعد کس طرح زندہ (یعنی تر و تازہ) کرتا ہے (اور یہ بات نعمت اور دلیلِ وحدت ہونے کے علاوہ اس کی بھی دلیل ہے کہ اللہ کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر پوری قدرت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس خدا نے مردہ زمین کو زندہ کر دیا) کچھ شک نہیں کہ وہی (خدا) مردوں کو زندہ کرنے والا ہے (بس عقلاً ممکن ہوتے میں دونوں برابر اور قدرت ذاتی دونوں کے ساتھ برابر اور مشاہدہ میں دونوں کاموں کا یکساں ہونا یہ سب چیزیں اس استبعاد کو دفع کرنے والی ہیں کہ مرنے کے بعد پھر کیسے زندہ ہوں گے) اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے (یہ مضمون احیارِ موتیٰ کا بمناسب حیاتِ ارض کے جملۂ معترضہ تھا) اور (آگے پھر بارش و ریاح کے متعلق مضمون ہے جس میں اہلِ غفلت کی ناشکری کا بیان ہے۔ یعنی اہلِ غفلت ایسے حق ناشناس و ناسپاس ہیں کہ اتنی بڑی بڑی نعمتوں کے بعد) اگر ہم ان پر اور (قسم کی) ہوا چلادیں پھر (اس ہوا سے) یہ لوگ کھیتی کو (خشک اور) زرد دیکھیں (کہ اس کی سبزی اور شادابی جاتی رہی) تو یہ اس کے بعد ناشکری کرنے لگیں (اور پچھلی نعمتیں سب طاقِ نسیاں میں رکھ دیں) سو (جب ان کی غفلت اور ناشکری پر اقدام اس درجہ میں ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ بالکل ہی بے حس ہیں تو ان کے عدمِ ایمان و عدمِ تدبر پر غم بھی بیکار ہے کیونکہ) آپ مُردوں کو (تو) نہیں سنا سکتے اور بہروں کو (بھی) آواز نہیں سنا سکتے (خصوصاً) جب کہ پیٹھ پھیر کر چل دیں (کہ اشارہ کو بھی نہ دیکھیں) اور (اسی طرح) آپ (ایسے) اندھوں کو (جو کہ بصیر کا اتباع نہ کریں) اُن کی بے راہی سے راہ پر نہیں لا سکتے (یعنی یہ تو مادّت الحواس والحیٰوۃ کے مشابہ ہیں) آپ تو بس ان کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیتوں کا یقین رکھتے ہیں (اور) پھر وہ مانتے (بھی) ہیں (اور جب یہ لوگ مُردوں بہروں اندھوں کے مشابہ ہیں پھر اُن سے توقع ایمان کی رکھنے اور غم کیجئے

معارف و مسائل

وَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ "ہم نے مجرموں کافروں سے انتقام لے لیا اور ہمارے ذمہ تھا کہ ہم مؤمنین کی مدد کرتے"۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مؤمنین کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اس کا تقاضا بظاہر یہ تھا کہ مسلمانوں کو کفار کے مقابلہ میں کبھی شکست نہ ہو، حالانکہ بہت سے واقعات اس کے خلاف بھی ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا جواب خود اسی آیت میں موجود ہے کہ مؤمنین سے مراد وہ مجاہدین فی سبیل اللہ ہیں جو خالص اللہ کے لئے کفار سے جنگ کرتے ہیں، ایسے لوگوں کا ہی انتقام اللہ تعالیٰ مجرمین سے لیتے ہیں اور ان کو غالب کرتے ہیں، جہاں کہیں اس کے خلاف کوئی صورت پیش آتی ہے وہاں عموماً مجاہدین کی کوئی لغزش ان کی شکست کا سبب بنتی ہے جیسے غزوہ احد کے متعلق خود قرآن کریم میں ہے اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا "یعنی شیطان نے ان لوگوں کو لغزش دے دی، ان کے بعض اعمال کی غلطی کے سبب" اور ایسے حالات میں بھی انجام کار اللہ تعالیٰ پھر انہی کو غلبہ اور فتح عطا فرما دیتے ہیں، جبکہ ان کو اپنی غلطی پر تنبہ ہو جائے جیسا غزوہ احد میں ہوا۔ اور جو لوگ محض اپنا نام مؤمن مسلمان رکھ لیں، احکامِ خداوندی سے غفلت و سرکشی کے عادی ہوں، اور غلبہ کفار کے وقت بھی اپنے گناہوں سے تائب نہ ہوں وہ اس وعدہ میں شامل نہیں، وہ نصرت الٰہیہ کے مستحق نہیں ہیں۔ یوں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بغیر کسی استحقاق کے بھی نصرت و غلبہ عطا فرما دیتے ہیں، اس کی امید رکھنا اور اس سے دعا مانگنا ہر حال میں مفید ہی مفید ہے۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى، اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے رہا یہ معاملہ کہ مُردوں میں سننے کی صلاحیت ہے یا نہیں اور عام مُردے زندوں کا کلام سنتے ہیں یا نہیں؟ اس مسئلہ کی مختصر تحقیق معارف القرآن سورۂ نمل کی تفسیر میں گذر چکی ہے، اور مکمل تحقیق احقر کے مستقل رسالہ بزبانِ عربی میں ہے جس کا نام "تکمیل الحبور بسماع اہل القبور" ہے، اور جو احکام القرآن بزبان عربی کے حزب خامس کا جز ہو کر شائع ہو چکا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً

اللہ ہی جس نے بنایا تم کو کمزوری سے پھر دیا کمزوری کے پیچھے زور

ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَ هُوَ

پھر دے گا زور کے پیچھے کمزوری اور سفید بال بناتا ہے جو کچھ چاہے اور وہ

الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ ﴿۵۴﴾ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۬

ہر سب کچھ جانتا کر سکتا ، اور جس دن قائم ہوگی قیامت قسمیں کھائیں گنہگار ،

مَا لَبِثُوْا غَیْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ قَالَ الَّذِیْنَ

کہ ہم نہیں رہے تھے ایک گھڑی سے زیادہ اسی طرح تھے الٹے جاتے ، اور کہیں گے جن کو

اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِیْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰی یَوْمِ

ملی ہے سمجھ اور یقین تمھارا ٹھہرنا تھا اللہ کی کتاب میں جی اٹھنے کے

الْبَعْثِ ؗ فَهٰذَا یَوْمُ الْبَعْثِ وَ لٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

دن تک سو یہ ہے اٹھنے کا دن پر تم نہیں تھے جانتے ،

فَیَوْمَئِذٍ لَّا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَا هُمْ

اس دن کام نہ آئے گا ان گنہگاروں کو تصور بخشوانا اور نہ ان سے

یُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ لَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ

کوئی منانا چاہے ، اور ہم نے بتلائی ہے آدمیوں کے واسطے اس قرآن میں

مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَ لَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ لَّیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا

ہر ایک طرح کی مثل ، اور جو تو لائے ان کے پاس کوئی آیت تو ضرور کہیں وہ منکر

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا

تم سب جھوٹ بناتے ہو ، یوں مہر لگا دیتا ہے اللہ ان کے دلوں پر جو سمجھ

یَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لَا یَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع ۶ ۹

نہیں رکھتے ، سو تو قائم رہ بیشک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے اور اکھاڑ نہ دیں تجھ کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے

خلاصۂ تفسیر

اللہ ایسا ہے جس نے تم کو ناتوانی کی حالت میں بنایا (مراد اس سے ابتدائی حالت بچپن کی ہے) پھر (اس) ناتوانی کے بعد توانائی (یعنی جوانی) عطا کی پھر (اس) توانائی کے بعد ضعف اور بڑھاپا کیا (اور) وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ (ہر تصرف کو) جاننے والا (اور اس تصرف کے نافذ کرنے پر) قدرت رکھنے والا ہے (پس جو ایسا قادر ہو اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ یہ تو بیان تھا بعث کے امکان کا) اور (آگے اس کے وقوع کا بیان ہے یعنی) جس روز قیامت ہوگی مجرم (یعنی کافر) لوگ (وہاں کی ہول و ہیبت و پریشانی کو دیکھ کر قیامت کی آمد کو غایت درجہ ناگوار سمجھ کر) قسم کھا بیٹھیں گے کہ (قیامت بہت جلدی آگئی اور) وہ لوگ (یعنی ہم لوگ عالم برزخ میں) ایک ساعت سے زیادہ نہیں رہے (یعنی جو میعاد قیامت کے آنے کی مقرر تھی وہ بھی پوری نہ ہونے پائی کہ قیامت آپہنچی جیسا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ اگر پھانسی والے کی میعاد ایک ماہ مقرر کی جائے تو جب مہینہ گذر چکے گا تو اس کو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا مہینہ نہیں گذرا اور مصیبت جلدی آگئی، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) اسی طرح یہ لوگ (دنیا میں) اُلٹے چلا کرتے تھے (یعنی جس طرح یہاں آخرت میں قیامت کے قبل از وقت آجانے پر قسمیں کھانے لگے، اسی طرح دنیا میں قیامت کے وجود ہی کے منکر تھے اور نہ آنے پر قسمیں کھایا کرتے تھے) اور جن لوگوں کو ایمان اور علم عطا ہوا ہے (مراد اہل ایمان ہیں کہ اخبار شرعیہ کا علم ان کو حاصل ہے) وہ (ان مجرمین کے جواب میں) کہیں گے کہ (تم برزخ میں میعاد سے کم تو نہیں رہے، تمہارا یہ دعویٰ غلط ہے بلکہ) تم تو (میعاد) نوشتہ خداوندی کے موافق قیامت کے دن تک رہے، سو قیامت کا دن یہی ہے، (جو میعاد مقرر تھی برزخ میں رہنے کی) ولیکن (وجہ اس بات کی کہ قیامت کو میعاد سے پہلے آیا ہوا سمجھتے ہو یہ ہے کہ) تم (دنیا میں قیامت کے وقوع کا) یقین (اور اعتقاد) نہ کرتے تھے (بلکہ تکذیب و انکار کیا کرتے تھے اس انکار کے وبال میں آج پریشانی کا سامنا ہوا اس وجہ سے گھبرا کر یہ خیال ہوا کہ ابھی تو میعاد پوری بھی نہیں ہوئی اور اگر تصدیق کرتے اور ایمان لے آتے تو اس کے وقوع کو جلدی نہ سمجھتے بلکہ یوں چاہتے کہ اس سے بھی جلدی آجائے، کیونکہ انسان جب اس سے کسی راحت و آرام کا وعدہ ہو تو طبعی طور پر اس کا جلدی آنا چاہتا ہے اور انتظار شاق اور اس کی مدت طویل معلوم ہوا کرتی ہے۔ جیسا حدیث میں بھی ہے

کہ کافر قبر میں کہتا ہے رَبِّ لَا تُقِمِ السَّاعَۃَ اور مؤمن کہتا ہے رَبِّ اَقِمِ السَّاعَۃَ، اور مؤمنین کے اس جواب سے بھی جو یہاں مذکور ہے کہ مقامِ برزخ کو انھوں نے بہت سجھا ہے، یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ مشتاق تھے، اس لئے چاہتے تھے کہ جلد آجاوے) غرض اس روز ظالموں (یعنی کافروں کی پریشانی اور مصیبت کی یہ کیفیت ہوگی کہ ان) کو ان کا (کسی قسم کا جھوٹا سچا) عذر کرنا نفع نہ دے گا اور نہ اُن سے خدا کی خفگی کا تدارک چاہا جاوے گا (یعنی اس کا موقع نہ دیا جاوے گا کہ توبہ کرکے خدا کو راضی کرلیں) اور ہم نے لوگوں (کی ہدایت) کے واسطے اس قرآن (کے مجموعہ یا اس کے اس خاص جزو یعنی اس سورۃ) میں ہر طرح کے عمدہ (اور عجیب) مضامین (ضروریہ) بیان کئے ہیں (جو اپنی بلاغت اور کمال کی وجہ سے مقتضی اس کو ہیں کہ ان کافروں کو ہدایت ہو جاتی، مگر ان لوگوں نے غایتِ عناد سے اس کو قبول نہ کیا اور اس سے منتفع نہ ہوئے) اور (قرآن کی کیا تخصیص ہے ان لوگوں کا عناد اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ) اگر (قرآن کے علاوہ ان معجزات سے جن کی یہ خود فرمائش کیا کرتے ہیں) آپ اُن کے پاس کوئی نشان لے آئیں تب بھی یہ لوگ جو کہ کافر ہیں یہی کہیں گے کہ تم سب (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین جو آیات تشریعیہ و تکوینیہ کی تصدیق کرتے ہیں) نرے اہلِ باطل ہو (پیغمبر کو سحر کی تہمت لگا کر صاحب باطل کہیں اور مسلمانوں کو سحر کی تصدیق کرنے سے اہلِ باطل کہیں اور ان لوگوں کے اس عناد کے بارے میں اصل بات یہ ہے کہ) جو لوگ (باوجود تکرر نشانیاں اور دلائلِ حق ظاہر ہونے کے) یقین نہیں کرتے (اور نہ اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں) اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر یوں ہی مہر کردیا کرتا ہے (جیسا کہ ان کے دلوں پر ہو رہی ہے، یعنی روزانہ استعداد قبولِ حق کی مضمحل و ضعیف ہوتی جاتی ہے، اس لئے انقیاد میں ضعف اور عناد میں قوت بڑھتی جاتی ہے) سو (جب یہ ایسے معاندین ہیں تو ان کی مخالفت اور ایذاء رسانی اور بدکلامی وغیرہ پر) آپ صبر کیجئے بیشک اللہ تعالیٰ کا وعدہ (کہ آخر میں یہ ناکام اور اہلِ حق کامیاب ہوں گے) سچا ہے (وہ وعدہ ضرور واقع ہوگا پس صبر و تحمل تھوڑے ہی دن کرنا پڑتا ہے) اور یہ بدیقین لوگ آپ کو بے برداشت نہ کرنے پائیں (یعنی ان کی طرف سے خواہ کیسی ہی بات پیش آئے مگر ایسا نہ ہو کہ آپ برداشت نہ کریں) ۔

معارف و مسائل

اس سورت کا بڑا حصہ منکرین قیامت کے شبہات کے ازالہ سے متعلق ہے جس کے لئے حق تعالیٰ کی قدرت مطلقہ کاملہ اور حکمت بالغہ کی بہت سی آیات اور نشانیاں دکھلا کر غافل انسان کو غفلت سے بیدار کرنے کا سامان کیا گیا ہے۔ مذکور الصدر پہلی آیت میں ایک نئے انداز سے اسی مضمون کا اثبات ہے وہ یہ کہ انسان اپنی طبیعت سے جلد باز واقع ہوا ہے اور سامنے کی چیزوں میں لگ کر ماضی و مستقبل کو بھلا دینے کا عادی ہے، اور اس کی یہی عادت اس کو بہت سی مہلک غلطیوں میں مبتلا کرتی ہے۔ جس وقت انسان جوان ہوتا ہے اس کی قوت اپنے شباب پر ہوتی ہے، یہ اپنی قوت کے نشہ میں کسی کو کچھ نہیں سمجھتا، حدود پر قائم رہنا اس کو دوبھر معلوم ہوتا ہے۔ اس کو متنبہ کرنے کے لئے اس آیت میں قوت و ضعف کے اعتبار سے انسانی وجود کا ایک مکمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں دکھلایا ہے کہ انسان کی ابتداء بھی کمزور ہے، اور انتہا بھی، درمیان میں بہت تھوڑے دنوں کے لئے اس کو ایک قوت ملتی ہے۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس چندروزہ قوت کے زمانہ میں اپنی پہلی کمزوری اور آنے والی کمزوری سے کبھی غافل نہ ہو، بلکہ اپنی اس کمزوری کے مختلف درجات کو ہمیشہ سامنے رکھے جن سے گذر کر یہ قوت و شباب تک پہونچا ہے۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ میں انسان کو یہی سبق دیا گیا کہ اپنی اصل بنیاد کو دیکھ کس قدر ضعیف بلکہ عین ضعف ہے کہ ایک قطرہ بے جان، بے شعور، ناپاک، گھناؤنی چیز ہے۔ اس میں غور کر کہ کس کی قدرت و حکمت نے اس گھناؤنے قطرہ کو ایک خون منجمد کی صورت میں پھر خون کو گوشت کی صورت میں پھر اس گوشت کے اندر ہڈیاں پیوست کرنے میں تبدیل کیں۔ پھر اس کے اعضاء و جوارح کی نازک نازک مشینیں بنائیں کہ یہ ایک چھوٹا سا وجود ایک چلتی پھرتی فیکٹری بن گیا، جس میں سیکڑوں عجیب و غریب خودکار مشینیں لگی ہوئی ہیں اور زیادہ غور سے کام لو تو ایک فیکٹری نہیں بلکہ ایک عالم اصغر ہے کہ پورے جہان کے نمونے اس کے وجود میں شامل ہیں، اس کی تخلیق و تکوین بھی کسی بڑے ورکشاپ میں نہیں، بلکہ بطن مادر کی تین اندھیریوں میں ہوئی۔ اور نو مہینے اسی تنگ و تاریک جگہ میں بطن مادر کے خون اور آلائشوں سے غذا پاتے ہوئے حضرت انسان کا وجود تیار ہوا۔

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ظہور کے لئے رستہ آسان فرما دیا اس عالم میں آئے تو ان کی شان یہ تھی کہ آخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

شَيْئًا، یعنی تمہیں شکمِ مادر سے اللہ تعالیٰ نے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے، اب قدرت نے تعلیم و تلقین کا سلسلہ شروع کیا، سب سے پہلا ہنر رونے کا سکھلایا جس سے ماں باپ متوجہ ہو کر اس کی بھوک پیاس اور ہر تکلیف کو دور کرنے پر لگ جائیں۔ پھر ہونٹوں، مسوڑوں کو دبا کر ماں کی چھاتیوں سے دودھ نکالنے کا ہنر سکھلایا جس سے وہ اپنی غذا حاصل کرے۔ کس کی مجال تھی جو اس لایعقل بچے کو یہ دونوں ہنر سکھادے جو اس کی موجودہ ساری ضرورتوں کی کفالت کرتے ہیں، بجز اس قدرت کے جو اس کی تخلیق کی مالک ہے۔ اب ضعیف بچہ ہے ذرا ہوا لگ جائے تو پژمردہ ہو جائے، ذرا سردی یا گرمی لگ جائے تو بیمار ہو جائے نہ اپنی کسی ضرورت کو مانگ سکتا ہے، نہ کسی تکلیف کو دور کر سکتا ہے۔ یہاں سے چلئے اور جوانی کے عالم تک اس کی تدریجی منازل تک غور کرتے جائیے تو قدرتِ حق جل شانہٗ کا ایسا عظیم شاہکار سامنے آئے گا کہ عقل حیران رہ جائے گی۔

ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً، اب یہ قوت کی منزل میں پہونچے تو زمین آسمان کے قلابے ملانے لگے، چاند اور مریخ پر کمند پھینکنے لگے، بحر و بر اپنے قبضے جانے لگے، اپنے ماضی و مستقبل سے غافل ہو کر مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (ہم سے زیادہ کون قوی ہو سکتا ہے) کے نعرے لگانے لگے۔ یہاں تک کہ اسی قوت کے نشہ میں اپنے پیدا کرنے والے کو بھی بھول گئے اور اس کے احکام کی پیروی کو بھی۔ مگر قدرت نے اس کو بیدار کرنے کے لئے فرمایا:۔ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً، کہ غافل! خوب سمجھ لے کہ یہ قوت تیری چند روزہ ہے۔ پھر اسی ضعف کے عالم کی طرف لوٹنا ہے، اور اسی تدریج سے ضعف بڑھنا شروع ہوگا جس کا اثر ایک وقت کے بعد شَيْبَة بالوں کی سفیدی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اور پھر سب ہی اعضاء و جوارح کی شکل و صورت میں تبدیلیاں لائے گا۔ دنیا کی تاریخ اور دوسری کتابیں نہیں خود اپنے وجود میں لکھی ہوئی اس مخفی تحریر کو پڑھ لو تو اس یقین کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے گا کہ يَخْلُقُ مَا يَشَاۤءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ، کہ یہ سب کارسازی اس رب العزت کی ہے جو پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، جس طرح چاہتا ہے اور علم میں بھی سب سے بڑا ہے اور قدرت میں بھی۔ کیا اس کے بعد بھی اس میں کچھ شبہ کی گنجائش رہ گئی کہ وہ جب چاہے مُردوں کو دوبارہ بھی زندہ کر سکتا ہے۔

آگے پھر منکرینِ قیامت کی لغو گوئی اور ان کی جہالت کا بیان ہے، وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ۔ یعنی جس روز قیامت قائم ہوگی تو یہ منکرینِ قیامت اس وقت کے ہولناک مناظر سے مدہوش ہو کر یہ قسمیں کھانے لگیں گے

کہ ہمارا قیام تو ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہا۔ مراد اس قیام سے ہو سکتا ہے کہ دنیا کا قیام ہو کیونکہ ان کی دنیا آرام و عیش سے گذری تھی اور اب مصائب شدیدہ سامنے آئے تو جیسے انسان کی طبعی عادت ہے کہ راحت کے زمانے کو بہت مختصر سمجھا کرتا ہے اس لئے قسمیں کھا جائیں گے کہ دنیا میں تو ہمارا قیام بہت ہی مختصر ایک گھڑی کا تھا۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس قیام سے مراد قبر و برزخ کا قیام ہو، اور مطلب یہ ہو کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ قبر یعنی عالم برزخ میں قیام بہت طویل ہوگا اور قیامت بہت زمانہ کے بعد آئے گی، مگر معاملہ برعکس ہو گیا، کہ ہم برزخ میں تھوڑے ہی دیر ٹھہرنے پائے تھے کہ قیامت آگئی۔ اور یہ جلدی آنا ان کو اس بناء پر محسوس ہوگا کہ قیامت میں ان کے لئے کوئی خوشی و راحت کی چیز تو تھی نہیں، مصیبت ہی مصیبت تھی۔ اور انسانی فطرت یہ ہے کہ مصیبت آنے کے وقت پچھلی راحت کے زمانے کو بہت مختصر سمجھنے لگتا ہے اور کافروں کو اگرچہ قبر و برزخ میں بھی عذاب ہوگا مگر قیامت کے عذاب کے مقابلہ میں وہ بھی راحت محسوس ہونے لگے گا، اور اس زمانے کو مختصر سمجھ کر قسم کھائیں گے کہ قبر میں ہمارا قیام بہت مختصر ایک گھڑی کا تھا۔

کیا محشر میں اللہ کے سامنے کوئی جھوٹ بول سکے گا؟

اس آیت سے معلوم ہوا کہ محشر میں کفار قسم کھا کر یہ جھوٹ بولیں گے کہ ہم تو دنیا میں یا قبر میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے، اسی طرح ایک دوسری آیت میں مشرکین کا یہ قول مذکور ہے کہ وہ قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم مشرک نہیں تھے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ۔ وجہ یہ ہے کہ محشر میں رب العالمین کی عدالت قائم ہوگی وہ سب کو آزادی دیں گے کہ جو چاہے بیان دے، جھوٹ بولے یا سچ بولے۔ کیونکہ رب العزت کو ذاتی علم بھی پورا پورا ہے، اور عدالتی تحقیقات کے لئے وہ ان کے اقرار کرنے نہ کرنے کا محتاج نہیں، جب انسان جھوٹ بولے گا تو اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی، اور اس کے ہاتھ پاؤں اور کھال و بال سے شہادت لی جاوے گی وہ سچ سچ سارا واقعہ بیان کر دیں گے، جس کے بعد اس کو کوئی حجت باقی نہ رہے گی، اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ الآیۃ کا یہی مطلب ہے۔ اور قرآن کریم کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں مختلف مواقف ہوں گے، ہر موقف کے حالات الگ ہیں۔ ایک موقف وہ بھی ہوگا جس میں بغیر اذنِ الٰہی کسی کو بولنے کا اختیار نہ ہوگا اور وہ صرف سچ اور صحیح بات ہی بول سکے گا، جھوٹ پر قدرت نہ ہوگی، جیسا ارشاد ہے: لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ

صوابًا۔

قبر میں کوئی جھوٹ نہ بول سکے گا

اس کے برخلاف قبر کے سوال و جواب میں احادیث صحیحہ میں مذکور ہے کہ جب کافر سے پوچھا جائے گا کہ تیرا رب کون ہے اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ تو وہ کہے گا، ھَاہْ ھَاہْ لَا اَدْرِیْ، یعنی ہائے ہائے میں کچھ نہیں جانتا۔ اگر وہاں جھوٹ بولنے کا اختیار ہوتا تو کیا مشکل تھا، کہہ دیتا کہ میرا رب اللہ ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ تو یہ ایک عجیب بات ہے کہ کافر لوگ اللہ کے سامنے تو جھوٹ بولنے پر قادر ہوں اور فرشتوں کے سامنے جھوٹ نہ بول سکیں۔ مگر غور کیا جائے تو کچھ تعجب کی بات نہیں، وجہ یہ ہے کہ فرشتے نہ تو عالم الغیب ہیں، نہ ان کو یہ اختیار ہے کہ ہاتھ پاؤں کی گواہی لے کر اس پر حجت تمام کر دیں، اگر ان کے سامنے جھوٹ بولنے کا اختیار ہوتا تو سب کافر فاجر عذاب قبر سے بے فکر ہو جاتے، بخلاف اللہ جل شانہ کے کہ وہ دلوں کے حال سے بھی واقف ہیں۔ اور اعضاء و جوارح کی شہادت سے اس کا جھوٹ کھول دینے پر قادر بھی ہیں، اس لئے محشر میں یہ آزادی دے دینا عدالتی انصاف میں کوئی خلل پیدا نہیں کرتا۔ واللہ اعلم۔

تمّت

سورۃ الرّوم بحمد اللہ فی یوم السبت ۲۸ ذیقعدہ ۱۳۹۱ھ